
ساقی

مرد ہے۔ ایک عورت۔ دونوں حسین۔

(میوزک بلند ہو کر پھر بیک گراؤنڈ میں چلا جائے۔)

فیروزہ۔ (جذبات بھری آواز میں) آج کی رات کتنی حسین ہے شہباز۔

شہباز۔ تم اس سے کہیں زیادہ حسین ہو فیروزہ۔

فیروزہ۔ جی چاہتا ہے یہ ناؤ عمر بھر چلتی رہے۔ اور میں تمہاری گود میں سر رکھے چاند کی ساری ٹھنڈک آنکھوں کے ذریعے اپنے اندر جذب کئے جاؤں۔

شہباز۔ میں چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری فیروزہ کی پیاری آواز یونہی میرے کانوں میں آتی رہے۔ حتیٰ کہ دوسری آوازوں سے بالکل بے خبر ہو جاؤں۔ اس دھندلی روشنی میں تم کتنی حسین معلوم ہوتی ہو فیروزہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا ہی کوئی تخیل محبت کے جادو سے بول پڑا ہے۔ بولتی جاؤ فیروزہ، بولتی جاؤ۔ میری روح ان سرخ ہونٹوں سے ابھرتے ہوئے سُروں میں کھو جانا چاہتی ہے۔ سرود۔ سرود۔ اپنا سرود اٹھاؤ فیروزہ۔ آج میں نغموں کے سمندر میں ڈبکیاں لگانا چاہتا ہوں۔ آواز کی لہروں پر ناچنا چاہتا ہوں۔

(فیروزہ سرود کے ساتھ فارسی کی کوئی غزل گائے)

شہباز۔ لیکن فیروزہ کہاں ہے۔ فیروزہ کہاں ہے۔

نادرہ۔ اسی شہر میں جس کا تم نے محاصرہ کر رکھا ہے۔

شہباز۔ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔

نادرہ۔ اپنے ہم وطنوں کی طرح موت کا انتظار۔ اسے اپنے دشمنوں میں تمہاری موجودگی کا علم ہے۔ اس نے مجھے تمہارے پاس اپنا آخری سلام دے کر بھیجا ہے۔ شہر میں کال پڑا ہے۔ دوسروں کی طرح اب وہ بھی موت کی راہ دیکھ رہی ہے۔ چند دنوں کے بعد وہی فیروزہ جس کی آواز تمہارے لئے فردوسِ گوش تھی، وہی فیروزہ جس کی پازیب کی جھنکار سے تمہارے سخت دل کے تار بھی لرز اٹھتے تھے۔ وہی فیروزہ جس نے قلندر خان آفریدی کے بیٹے کے سخت دل میں بھی محبت کے کئی نگینے جڑ دیے تھے، اب چند ہی دنوں میں فاقوں سے نڈھال ہو کر موت کی آغوش میں چلی جائیگی۔

شہباز۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ فیروزہ کبھی نہیں مر سکتی۔ فیروزہ کبھی نہیں مرے گی۔ شہباز یہ کبھی نہیں ہونے دیگا۔ کبھی نہیں ہونے دیگا۔

نادرہ۔ آہستہ بولو آہستہ بولو۔ اگر قلندر خان کو اس بات کا علم ہو گیا تو ہم دونوں کی خیر نہیں۔

شہباز۔ شہ نہیں۔ شہباز بھی قلندر خان ہی کا بیٹا ہے۔ اسکے بازوؤں میں بھی بل ہے — ٹھہرو، خشک گوشت کا یہ تھیلا تم پکڑ لو۔ دودھ کا مشکیزہ میں اٹھاتا ہوں۔ اور اب چلو مجھے فیروزہ کے پاس لے چلو۔ چلو۔ چلو۔ جلدی کرو۔ ٹھہرو۔ میں پنیر کی یہ گٹھری بھی اٹھا لوں۔

(قدموں کی چاپ)

نادرہ۔ (سرگوشی میں) اس طرف۔ میرا ہاتھ پکڑ لو۔ بس چلے آؤ۔

(وقفہ۔ ہماہمی پیدا کی جائے۔ اور ذیل کی آوازیں آئیں)

شہباز خان مغلوں کے ساتھ مل گیا۔

شہباز خان غداری کر گیا۔

وہ ہمارے سب راز جانتا ہے۔

اب ہمیں محاصرہ اٹھانا پڑیگا۔

ہماری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

(وقفہ)

سنا ہے کہ ایک عورت کے عشق نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ فیروزہ نامی ایک حسین مغنیہ نے شہباز کے پر قینچ کر دئے ہیں —،

وہ فیروزہ کو بہت چاہتا ہے۔

وہ بھی تو ہزار جان سے اس پر فدا ہے۔

اس عورت کے لئے وہ گوشت، پنیر اور نہ جانے کیا کیا کچھ یہاں سے لے گیا ہے۔

(وقفہ)

شیر خان۔ تمہارا بیٹا غدار نہیں تو کیا ہے۔ ایک رقاصہ کی خاطر وہ ہمیں چھوڑ کر دشمن کے ساتھ جا ملا۔

(وقفہ)

چپ کیوں ہو گئے۔ سر کیوں جھکا لیا۔ اب کیوں نہیں گرجتے۔ شاید اس لئے کہ یہ غدار اتفاق سے تمہارا بیٹا ہے۔ دوست نہیں ہے۔

قلندر۔ شہباز میرا بیٹا ہے۔ میں کب اس سے انکار کرتا ہوں۔ اسکے علاوہ تمہیں کچھ اور بھی کہنا ہے۔

شیر خان۔ غدار بیٹے کے باپ سے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

قلندر۔ اب تم جا سکتے ہو۔

(وقفہ)

(اپنے آپ سے) چپ کیوں ہو گئے۔ سر کیوں جھکا لیا۔ اب کیوں نہیں بولتے۔ شاید اس لئے کہ غدار تمہارا بیٹا ہے' دوست نہیں ہے۔ میں کیا کروں۔ اے خدا میں کیا کروں۔ شہباز سچ مچ میرا بیٹا ہے،



بدہ چندہ چھ روپے
ششماہی تین روپے آٹھ آنے
محصول ڈاک فی پرچہ ...
...غیر سے ۱۲ شلنگ

جرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص
نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل
خریداروں سے انکی قیمت
الگ نہیں لی جاتی۔

جلد ۲۶ | ساقی دہلی۔ بابت ستمبر ۱۹۴۲ء | نمبر ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

جناب خان بہادر محمد مسیح پال "امین حزیں" کا ایک بصیرت افروز مکتوب درج ذیل ہے۔ اُمید ہے کہ شعرا حضرات اِسے غور سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

"تسلیم۔ حال ہی میں "زندگی میری نظر میں" کے زیرِ عنوان جناب اختر شیرانی نے پیر ہندکا مرحوم و مغفور سے متعلق کچھ زہر چکانی کی ہے۔ یہ مضمون پہلے ساقی میں شائع ہوا اور پھر آواز اور ادبی دنیا لاہور میں تھوڑی سی حاشیہ آرائی سے اُس کی نقل ہوئی۔ میں جب سے پنجاب میں مستقل طور پر مقیم ہوں ان زہر چکانیوں کو بُری طرح محسوس کر رہا ہوں۔ پنجاب کے اکثر و بیشتر "برعکس نہند نام زنگی کافور" قسم کے ادبی رسالے (بہ استثنائے چند) اپنی معاشی اور بعض دوسری مصلحتوں کے زیر اثر "فحش نویسی اور عریانیات" کو فروغ دینے میں دن بدن بیباک ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ حال ہی میں گورنمنٹ کو بھی اس "فیشن ایبل بے لگام تخریب آفرینی" کی طرف توجہ کرنا پڑی ہے۔

مانا جوانی اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ مگر آخر انسان کی جوانی ہے حیوانات کی تو نہیں۔ انسان کی فوقیت اس میں ہے کہ وہ حیوانات کی طرح میلانِ جنسی کے طوفانی جذبات کی رَو میں بے دست و پا ہو کر بہہ نہ جائے۔ بلکہ اس کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اور اس پر قابو پا کر استکمالِ شخصیت کا لطف اٹھائے۔ مغرب زدہ نوجوانوں کو خدا جانے کیوں تعجب نہیں آتا کہ اہلِ مغرب زندگی کے دوسرے مردانہ شعبوں میں "جنگل کے قانون" کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کے درپے ہیں مگر دوسری طرف جب میلانِ جنسی کا سوال اُٹھتا ہے وحوش کی بدترین صورتِ پیروی کو بھی جائز اور مطابقِ فطرت قرار دیتے ہیں۔ کیا کبھی انہیں اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق ملی کہ کیوں وحوش میں فطرت نے میلانِ جنسی کے اوقات مقرر کر کے ایک ایسی کڑی حد لگا دی ہے جسے وحوش کبھی توڑنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اور کیوں یہ "دو ٹانگ کے درندے" اس کلیہ کی استثناء ہیں؟ اس حقیقت سے تو کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ ذی حیات میں فطرت نے میلانِ جنسی "حفظِ جنس" کے لئے رکھا ہے۔ انسانوں میں بھی حفظِ جنس کی ضرورت مقدم ہے۔ مگر یہ حضرتِ انسان ہی ہے جس نے اس کے غلط استعمال کی عادت ڈال لی ہے۔ فطرت نے تو انسان کو مآل اندیش شعور دیکر وہ پابندی جو دیگر تمام وحوش پر عاید ہے مصلحتاً اُٹھا دی۔ کیونکہ مآل اندیشی کا تقاضہ یہی تھا کہ انسان جذبات کے ناجائز استعمال کے خلاف قوانین بناتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اہلِ مذہب چونکہ ایک ہستی بالاتریں کے قائل ہیں اُنہوں نے سوسائٹی کے ڈر کے علاوہ "خوفِ خدا" کا مسئلہ پیش کر کے اس رَو کو اپنے کناروں کے اندر بہنے پر زور دیا۔ اور خدا کے خوف یعنی خشیۃ اللہ کی گویا ایک بریک جذبات کے "لاتعداد ہارس پاور" کی موٹر پر لگا دی۔ سوسائٹی کا ڈر بھی بڑی حد تک مؤثر چیز ہے۔ مگر خشیۃ اللہ اور فقط خشیۃ اللہ ہی وہ مؤثر ترین بریک ہے جو اس موٹر کار کو بے قابو ہونے سے روک سکتی ہے۔ یورپ زدہ سفلی نظر رکھنے والے بندۂ جذبات اور مقلدینِ مغرب لوگ ان نکات کو کیا سمجھیں۔ انہیں تو آسکر وائلڈ اور موپساں ایسے بدکرداروں کے کردار ہی پسند آسکتے ہیں۔ اور وہ یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ زندگی اگر ہے تو یہی۔ اس قماش کے لوگ ہیں جو علامہ اقبال مرحوم پر اعتراض کرنے اُٹھے ہیں کہ مرحوم نے کیوں جوانوں کے "جذبات" (جن سے اُن کی مراد یہی سفلی جذبات ہیں) کو مدِنظر نہ رکھا۔ اور یہ ایک ایسی فروگذاشت ہے جو ان مدعیانِ شاعری کے خیال میں ناقابلِ عفو فروگذاشت ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جو کفارِ عرب رسولِ عربی فداہٗ امی و ابی سے کہا کرتے تھے کہ بیشک توحید الٰہی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اگر ہمارے لات و منات کا ذکرِ خیر بھی تھوڑا بہت ہوا کرے تو ہمیں کوئی شکوہ یا اعتراض نہ رہے۔ کیا علامہ اقبال مرحوم نے اپنی عمر کے بڑے بوڑھوں کے لئے ہی سب کچھ لکھا ہے؟ آپ کی طرح جوانانہ سوچی تھے یا اکثر و بیشتر نژادِ نو کے لئے؟ کیا مندرجہ ذیل اشعار کسی اور کے ہیں؟

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن
دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا (جاوید نامہ [illegible])

کیا محرومی، خود نگری، اور خودگری کی تعلیم سے آشنائی و [illegible]

باتیں

(۲۲)

ایک مدت کی بات ہے کہ مجھے علیگڈھ یونیورسٹی کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ طرح تھی مصرع، جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ یہ مشاعرہ تو اس سے قبل نا کامیاب رہا کہ توقع ضرورت سے زیادہ کامیاب ہو گیا یعنی چار پانچ سو آدمی جس ہال میں سما سکتے تھے اس ہال میں آٹھ نو سو آدمیوں کی بھیڑ ہو گئی اور آدمیوں کی یہ وہ قسم تھی جسے طلبا کہتے ہیں اور طلبا کی بھی وہ زندہ دل قسم جسے علی گڈھ یونیورسٹی کے طلبا کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مشاعرہ تو شور و غل سے شروع ہو کر تکیوں اور مسندوں کی مار پر ختم ہوا۔ احسن مارہروی مرحوم، رشید احمد صدیقی (صدر مشاعرہ) آل احمد سرور وغیرہ اور کچھ اور لوگ تو بد مستی ہوش و حواس کچھ ہی دیر کے بعد کچھ عزت آبرو گنوا کر اور کچھ عزت آبرو لیکر صحیح سلامت واپس آ گئے۔ دوسرے روز یونیورسٹی کے کچھ پروفیسر و طلبا نے خاکسار کو احسن مارہروی مرحوم کے مکان پر جہاں میں مہمان تھا مجھے نوازا اور مجھ سے پھر مشاعرے کی غزل سننے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے جب یہ مطلع پڑھا ؎

اے ساکنانِ دہر یہ کیا اضطراب ہے　　اتنا کہاں خراب جہانِ خراب ہے

تو حاضرین میں ایک صاحب نے مطلع کی بہت داد دی اور فرمایا واہ فراق صاحب کس قدر سچی بات آپ نے کہی ہے۔ واقعی دنیا اتنی خراب جگہ کہاں ہے۔ میں نے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کرتے ہوئے گذارش کی کہ اپنے لحاظ سے اور اپنے بھرسک تو میں نے اس مطلع کو کافی پُر درد بنانے کی کوشش کی ہے اور جس لہجے میں ساکنانِ دہر کو تشفی دینے کی کوشش کی ہے اس لہجے میں تشفی بخش الفاظ کو ایک ناقابلِ بیان سوز و گداز کا حامل بنانے کی کوشش کی ہے پھر بھی اگر کوئی محتسبانہ انداز سے "اتنا" کے لفظ سے یہ فائدہ اٹھانا چاہے کہ جہانِ خراب خراب ہے۔ لیکن اتنا کہاں خراب ہے تو میں بے بس ہوں۔ یہ سنکر ایک صاحب نے فرمایا کہ "آخر شعر کے الفاظ تو نشاطیہ یا طربیہ ہیں پھر سوز و گداز کی گنجائش شعر میں کہاں سے پیدا ہوئی" بہرحال بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن ناظرین سناتی اپنے طور پر غور کریں کہ میرے دوسرے مصرع میں استفہام انکاری اس جانِ گسل آزمائش کا پردا ہے یا نہیں جس کا نام زندگی ہے اور جس کی جولانگاہ دنیا ہے۔ میں نے یہ طرزِ بیان اس شعر کے لئے کہاں سے حاصل کیا؟ بے پڑھے لکھے غریب مفلسوں سے۔ جب کسی بیکس کو کوئی گالیاں دیتا ہے، مارتا ہے، ستاتا ہے اور وہ روتا ہے یا بہت اداس ہو جاتا ہے تو اس کے بے بس ہمدرد بسا اوقات یہ کہکر سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جانے دو۔ اتنے دکھی نہ ہو آخر انہوں نے تمہیں کیا کہا، کیا کیا۔ کچھ اسی قسم کی بات میرے مندرجہ بالا مطلع میں ہے۔

ایک اور موقع پر چند احباب کو میں نے جب اپنا یہ شعر سنایا ؎

بلندیوں سے جو دیکھے تو ہو تجھے معلوم　　کہ یہ زمیں بھی چمکتا ستارہ ہے کہ نہیں

شعر کا مضمون مشہور روسی ادیب میکسم گورکی کے ایک فقرے کا ترجمہ ہے۔ سننے والوں میں دو مسلمان حضرات تھے جو اس شعر سے کئی بار وجد میں آ گئے اور کھلے دل سے انہوں نے کئی بار شعر کی تعریف کی۔ مجھ سے بار بار یہ شعر پڑھنے کو کہا۔ میں نے برسبیل گفتگو اُن سے کہا کہ ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے اور اگر ہم لاکھوں میل کی بلندی سے زمین کو دیکھ سکیں تو اور ستاروں کی طرح یہ زمین بھی چمکتے ہوئے ستارے کی طرح نظر آئے گی۔ میرے اس بیان کو ان میں سے ایک صاحب نے غالباً لامذہبیت سمجھا۔ مسکرائے اور کہا کہ "ایسا نہیں بھی ہو تو بھی شعر لاجواب ہے۔" مجھے اور انہیں دونوں کو بڑا لطف آیا۔

(۲۳)

عشقیہ شاعری کا مستقبل کیا ہے؟ یہ منحصر ہے اس بات پر کہ عشقیہ زندگی کا مستقبل کیا ہے آج بھی دنیا میں اگر ان لیے سب لوگ اردو شاعری سمجھ سکیں اور اس سے ہماشما کی طرح لطف اندوز ہو سکیں تو کتنے لوگ ہیں جو میر، درد، مومن، غالب، داغ، جگر، فانی وغیرہ کی عشقیہ شاعری سے

متاثر ہوسکیں گے۔ اور کیا اُردو داں حلقوں میں ایسے لوگ ہزاروں کی تعداد میں نہیں ہیں جو اگر میر کی عشقیہ شاعری سے متاثر ہیں تو داغ کی عشقیہ شاعری سے بیزار ہیں۔ ایک صاحب کی شادی ہوئی، بی بی تعلیم یافتہ تھیں اور میر و غالب کے اشعار گنگنایا کرتی تھیں۔ ایک دن وہ ایک عجیب کیفیت سے غالب کا یہ شعر گارہی تھیں ؎

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں　　تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

اُن کے رفیقِ حیات فرمانے لگے۔ ارے بھئی یہ کیا گارہی ہو کچھ ایسے شعر سناؤ ؎

اِدھر آ او زلفوں کے لٹکانے والے　　مرے دل کو گلیوں میں بھٹکانے والے

یہ حال تو اسی زمانے میں میاں بی بی کا ہے۔ پھر عشقیہ شاعری کے مستقبل پر حکم لگانا نو راجات کا کام ہے۔ خود دورِ حاضر میں غزل کے کچھ چوٹی کے شعراء مشکل سے دس پانچ فی صدی شعر عشقیہ کہے ہیں بقیہ کلام ان کا دیگر مسائلِ حیات سے متعلق ہے۔ میرزا یگانہ، اصغر گونڈوی، اقبال نے محو تاثیر عشقیہ غزلیں کہیں۔ آتش کے یہاں بھی دس ہی پانچ فی صدی اشعار عشقیہ ہیں اور ان کا بھی عنوان بہت بدلا ہوا ہے۔ عجب کیا کہ آئندہ کی تہذیب و تمدن میں انسان جنسیات سے کچھ معرّا اور بلند تر ہوجائے۔ اب تک تو عام طور پر جنسیات کی ادب پر حکومت رہی ہے۔ جب ہم سوچتے ہیں کہ نئی تہذیب میں سائنس، فلسفہ، سیاسیات، ادب، صنعت و حرفت اور مشین کے استعمال کی اعلیٰ تعلیم عام ہوگی اور عورت و مرد سب بارو زگار ہوں گے، بے شمار نئی دلچسپیوں اور نئے مشاغل سے ہماری زندگی بھرپور ہوگی تو یہ امر محلِ غور ہوجاتا ہے کہ اس ہوا میں عشق و جنسیات کا کیا عالم ہوگا۔ یہ بھی قابلِ توجہ امر ہے کہ اب سے سو ڈیڑھ سو برس بعد عجب نہیں کہ عام طور پر لوگ ڈیڑھ سو برس کی عمر تک زندہ رہیں اور جوانی دیوانی ہوتی ہے، والی بات اُن کی زندگی میں صرف ایک مختصر وقفہ ہو۔ کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کی عشقیہ شاعری بہت بلند ہوگی یعنی اس میں انسانی زندگی کے چھچھلے پن کے ساتھ آفاقی وسعتیں، پُر رمز گہرائیاں، بے پایانی، اور ایسی مفکرانہ سنجیدگی ہوگی جس کی عظمت کا ہم آج بہت دھندلا احساس کرسکتے ہیں۔ وہ یقیناً ایسی شاعری ہوگی جس میں انسانی زندگی اور دیوتاؤں کی زندگی کا امتزاج ہوگا۔

(۲۴)

اُردو زبان میں وسعت و گہرائی اور زیادہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آجکل کے ہندی ادب اور ہندی شاعری میں اور ہندی لغت میں ڈیڑھ دو ہزار الفاظ سنسکرت کے ایسے مل جائیں گے جن کا تلفظ بہت نرم ہے جن میں رس اور جس ہے اور نغمگی ہے۔ اُن کی ایک فہرست مرتب کرلینا چاہیئے۔ ان تمام الفاظ کو فارسی حروف میں شائع کرکے ایک الگ لغت مرتب کرنا چاہیئے اور اُردو کے نثر و نظم نگار حضرات سے سفارش کرنا چاہیئے کہ وہ اپنی تصنیفوں میں ان الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑنا شروع کردیں۔ اس سے اُردو زبان میں نئے امکانات پیدا ہوجائیں گے۔ جب ہندی کے طرفدار ادبی اور مروجہ اُردو میں یہ سینکڑوں سنسکرت الفاظ دیکھیں اور سُنیں گے تو اُردو اُن کے من کو موہ لے گی اور اس طرح بہت نیک نتائج اور اہم اثرات پیدا ہوں گے۔ اب اُردو چھوٹی موٹی زبان نہیں رہی اس کا قوتِ ہاضمہ بڑھ چکا ہے اب اسے غالب، اقبال، جوش، حالی، شبلی، آزاد، چکبست اور پریم چند کی لغت سے وسیع تر ہونا ہے۔ یاد رہے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو اُردو ہندستان بھر کی ہمہ گیر زبان نہ ہوسکے گی۔ اُردو کے اربابِ قضا و قدر سوچیں کہ وہ ہزار ڈیڑھ ہزار خوش آہنگ و خوش آئند سنسکرت الفاظ کو اپنا کے اور کثرت سے انہیں رائج کرکے اُردو کو ایک ایسی طاقت بنادیں گے جس کا مقابلہ کرنا مخالفینِ اُردو کے لئے ناممکن ہوجائے یا اُسے ایک محدود اثر و طاقت کی چیز ہی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

(۲۵)

ابھی حال میں کچھ ہندی کتب فروش میرے پاس کچھ ہندی کتابیں لائے۔ انہی کتابوں میں اکبر الٰہ آبادی کے کلام کا ایک اچھا خاصا انتخاب تھا جو ناگری حروف میں شائع ہوا تھا۔ قیمت تقریباً دو روپے تھی۔ زیادہ تر ہندی کتابیں جو اُن کے پاس تھیں اُن کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آگئی تھی۔ لیکن اکبر کے کلام کے اس ہندی ایڈیشن پر تر تیہ بار (یعنی بار سوم) یا تیسرا ایڈیشن لکھا ہوا تھا۔ میں نے شاید فروری کے ساقی میں یہ لکھا تھا کہ ہندی دُنیا اُردو ادب کے جواہر پاروں کیلئے مشتاق اور منتظر ہے۔ لیکن انجمن ترقی اُردو یا اُردو کے دیگر ادارے اس طرف سے غافل بیٹھے ہوئے ہیں کہ ناگری حروف میں اُردو نثر و نظم کی کتابوں کا ایک دیدہ زیب سلسلہ شائع کردیں۔ صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ اُردو ہماری مشترکہ زبان ہے۔ نہ صرف ہمارے ادیب اور دیگر ارکانِ وطن کے بیانوں کے پوسٹر تیار کرنے سے کام چلے گا۔ کام چلیگا صرف ایک طریقہ سے یعنی ناگری حروف میں بھی اُردو کتب کا سلسلہ شائع کرنے سے۔

ارمغانِ شوق بدرگاہِ حقیقتِ منتظر

۱

اے کاش بن سکے وہ مری جنتِ نگاہ
جس کو لئے ہوتے ہوں کنارِ خیال میں
یعنی سوادِ دل میں بھی آئے براہِ چشم
میں جس کو دیکھتا ہوں دیارِ خیال میں

۲

دل میں تو بس رہا ہے تمنا کی شکل میں
پوری مگر یہ میری تمنا بھی ہو کبھی!
پنہاں تو جلوہ پاش نقابِ سحر میں ہے
خورشیدِ زندگی مرا پیدا بھی ہو کبھی

۳

اے لے کے جس کا نام سجتے جا رہا ہوں میں
یعنی ہے جس سے وقفِ نوا زندگی کا ساز
کب تک چھپا رہے گا نگاہِ تلاش سے؟
وہ "مطربِ جمیل" جو ہے انتہائے راز

۴

اے جانِ آرزو مری اے جانِ آرزو!
اپنے نیاز مند سے یہ بے نیازیاں!
سُن کر قبول کر انہیں سُن کر قبول کر
ہیں "ارمغانِ شوق" مری بے نوازیاں

خودی

۱

"خودی" خدا کے مقابل میں گو نہیں کچھ بھی
تری یہ تیغ ہے تسخیرِ ماسوا کے لئے
اِسی سے کام چلے گا حضورِ فطرت میں
خودی ہے نطق ترا عرضِ مدعا کے لئے

۲

نمو خودی سے ترے دانۂ وجود کی ہے
اسی کے فیض سے گلشن میں جھومنا ہو تجھے
خودی کمندِ فلک گیر ہے امیں تیری
اسی کے بل پہ ستاروں کو چومنا ہو تجھے

۳

خودی ہے چشمۂ آبِ حیات پہلو میں
تو ہی خضر بھی ہے جس کا تو ہی سکندر بھی
خودی وہ ظلمتِ ہستی کا ہو چراغِ نمود"
کہ جس سے کعبہ بھی روشن ہو اور مندر بھی

۴

حیات زورِ خودی سے حیات ہے ناداں
وہ زمہ زندہ ہے جس میں یہ بات ہوتی ہے
مقامِ کن فیکوں کی بلندیوں کی قسم
خودی کے زیرِ نگیں کائنات ہوتی ہے

امین حزیں

سُرخرُو

اسلام کا ابرِ رحمت مختلف قوموں کی صورتوں میں دُنیا پر برستا رہا ہے۔ سب سے آخر میں جو قوم ابرِ رحمت بن کے برسی وہ ترکانِ عثمانیہ کی تھی۔ وہ ترکستان سے ایک چھوٹے سے ترک قبیلے کا چشمۂ ابر اُٹھا اور اس طرح برسا کہ قریب قریب نصف دُنیا بارانِ رحمت سے لبریز ہو گئی۔ یہ سیلابِ رحمت تیزی سے بڑھتا گیا۔ دُشمنوں کے روکے نہ رُکتا تھا۔ روم اور ویئنا [illegible] فتح ہوا چاہتے تھے اور ساری خدائی خدائے لم یلد ولم یولد کی ماننے والی بنا چاہتی تھی کہ موروثی شخصی حکومت کی خرابیوں نے بند باندھنے شروع کر دئے۔ جس دھارے کو غیر نہ روک سکتے تھے اُسے اپنوں نے روکا۔ بارانِ رحمت بند ہو گیا سیلاب رفتہ رفتہ گھٹنے لگا۔ لیکن کہیں کہیں اپنی نشانیاں چھوڑتا گیا۔ انہیں نشانیوں میں ایک البانیہ ہے۔ عیسائیستان کی زمین سے گھِرا ہوا اسلام کا چشمۂ صافی۔

یہ ملک کچھ دن آگے تک آتا رہا تھا۔ یہاں مغربی اقوام کی نہ تو ہیں آئی تھیں نہ پروفیسر، نہ بسولا نہ رندا، وہ کندۂ ناتراش تھے۔ ایسے کندے جو سقفِ اسلام کے ستون تو بن سکتے تھے لیکن دُشمنوں کی گاڑی کا پہیہ بننے پر راضی نہ تھے۔ اسی ملک میں ایک غریب کسان ابراہیم بیگ رہتا تھا۔ اُس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام اُس نے اسمٰعیل رکھا تھا۔ یہ خالی خولی شیخی نہ تھی بلکہ ابراہیم بیگ کے تمام جاننے والوں کو یقین تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو وہ خوشی سے اسمٰعیل کو اللہ کی راہ میں قربان کر دے گا، اور قربان کرنے کے بعد اُس کی آنکھوں میں بجائے غم کے خوشی کے آنسو ہوں گے۔ ابراہیم بیگ کم سخن تھا لیکن اس کی خاموشی گویائی سے بڑھ کر ہوا کرتی۔ وہ غریب کسان تھا مگر ہر شخص اُس کی عزت کرتا تھا۔ جب گاؤں کی مسجد کا امام نماز پڑھانے کی حالت میں ایک دن یکایک گر پڑا تو ابراہیم بیگ فوراً اُس کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز میں وہ خشوع و خضوع تھا اور ایسی تڑپ کہ نمازیوں کو پہلے پہل لطفِ نماز آیا۔ اُس دن سے ابراہیم بیگ برابر امامت کرنے لگا۔

اسمٰعیل کی ماں اُسے چھ مہینے کا چھوڑ کے مر گئی تھی، ابراہیم بیگ نے اس کے بعد کوئی شادی نہ کی۔ اسمٰعیل کو خالد بن ولید، طارق، موسیٰ اور سلطان محمد فاتح وغیرہ کے کارنامے سنایا کرتا۔ اسمٰعیل مارے شوق کے کبھی اُس کی آستین زور سے پکڑ کے کھینچتا کبھی پیروں سے لپٹ جاتا۔ اس کا تمتماتا ہوا چہرہ، اس کی شوق سے چھلکتی ہوئی نگاہیں، اُس کی بیقراریاں گویا اس بات کا اعلان کرتیں کہ وہ بھی اسی قسم کے کارنامے کرنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ پوچھ بیٹھتا: "کیوں ابا، اب ہم لوگ کیوں اس طرح کے کارنامے نہیں کرتے، کیا اب وہ دن پھر نہ آئیں گے؟"

ابراہیم بیگ جواب دیتا: "بیٹا اب ہم میں نہ وہ قوتِ ایمان ہے نہ وہ جذبۂ ایثار۔ پہلے ہمارا مرنا جینا اسلام کی عظمت کے لئے تھا اب اپنے لئے ہے۔ وہ دن پھر آ سکتے ہیں اور آ کے رہیں گے اگر ہم میں پھر وہی بات پیدا ہو جائے، میں تجھے اسی دن کے لئے پال رہا ہوں۔"

اسمٰعیل نے صرف ایک دفعہ حضرت اسمٰعیل کی قربانی کا واقعہ ابراہیم کے منہ سے سُنا تھا اُس دن سے وہ اپنے نام سے اتنا خوش تھا جیسے دُنیا کی سب سے بڑی دولت اس کے باپ نے اُسے دی ہے۔ وہ اکثر اپنے ہاتھ سے چھری تیز کرتا نظر آتا، اس وقت اس کے چہرے پر شوق کی وہ کیفیت ہوتی کہ تماشائی اکٹھا ہو جاتے اور اُسے متحیر ہو کر پوچھتے: "اسمٰعیل اس طرح چھری کس کے لئے تیز کی جا رہی ہے؟" اس سوال کا جواب تو وہ نہ دیتا لیکن اس کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگتے جب وہ اپنے انہماک سے چونکتا تو "کچھ نہیں" کہہ کے اپنے گھر چلا جاتا۔ لوگ سمجھتے کہ لڑکے کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔

اسمٰعیل جب بڑا ہوا تو کسبِ معاش کی فکر ہوئی۔ ابراہیم بیگ کا خیال تھا کہ یا تو کسانی کرے یا فوج میں بھرتی ہو جائے۔ گاؤں کے لوگوں نے مشورہ دیا کہ اسے موٹر ڈرائیوری سکھائی جائے، اسمٰعیل اس کے لئے زیادہ موزوں ہوگا۔"

ابراہیم نے کہا: "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اسمٰعیل [illegible] بسر کرے اور اسلام کے کام آئے۔ ڈرائیوری میں یہ [illegible]"

لوگوں نے کہا: "اب مشینوں کی لڑائی کا زمانہ ہے [illegible] بجائے موٹروں سے حملہ ہوا کرے گا۔ جہاد کی صورت میں [illegible] حیثیت موٹر ڈرائیور کے بہت مفید ثابت ہوگی۔ دشمنوں پر [illegible] سے حملہ کر سکے گا یا مجاہدوں کو جلد جلد محاذ پر پہنچا سکے گا۔"

لہ [illegible] روفیسر آتے نہ حب نسولا بسٹا تو رندا ... (اکبر الٰہ آبادی)

ابراہیم بیگ نے یہ سنتے ہی فیصلہ کر لیا کہ اسمٰعیل کے لئے موٹر ڈرائیوری سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اسمٰعیل بھی یہ گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا۔ باپ کے فیصلے سے بے انتہا خوش ہوا اور اس شوق سے اس نے موٹر ڈرائیوری کا کام سیکھا کہ بڑے بڑے تجربہ کاروں کو گرد کر دیا، پہاڑی پُر پیچ راستوں سے وہ موٹر اس صفائی سے لے جاتا جیسے سانپ زنّاٹے سے نکلا جا رہا ہو۔ ابراہیم بیگ سے جب لوگوں نے اسمٰعیل کی موٹر ڈرائیوری کی تعریف کی تو اس نے آہستہ سے الحمد للہ کہا اور چپ ہو گیا۔

ایک دن بجلی کی کڑک کی طرح یکایک یہ اطلاع آئی کہ اطالویوں نے بلاوجہ البانیہ پر اچانک حملہ کر دیا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ اس چھوٹے سے اسلامی آزاد ملک کو غلام بنا لیں۔ گاؤں والوں میں سے کچھ کے چہرے اُتر گئے اور کچھ کے جوش میں چمکنے لگے۔ ابراہیم بیگ نے دبی زبان میں اسمٰعیل سے صرف اتنا کہا کہ: بیٹا خدا کا شکر ہے کہ سرخرو ہونے کا موقع آگیا، آج ہی کے دن کے لئے تمہیں پال پوس کر بڑا کیا تھا!

اسمٰعیل کے چمکتے ہوئے چہرے اور خوشی کے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں نے اس کا جو جواب دیا اس سے ابراہیم بیگ کا چہرہ بھی چمکنے لگا۔ اب سوال یہ تھا کہ کرنا کیا چاہیئے۔ یہ طے پایا کہ مجاہد جوق جوق ترانا دار السلطنت میں جا کے فوج میں بھرتی ہوں۔ اسمٰعیل اپنی بس لیکر موجود ہو گیا تاکہ مجاہدین کو جلد جلد پہونچا سکے۔ بیس آدمیوں کی جگہ تھی لیکن تیس چل پڑے۔ اسمٰعیل گاڑی روانہ ہی کرنے جا رہا تھا کہ سامنے سے اطالوی فوجوں کا ایک پیدل دستہ پہونچ گیا، اُس نے مجاہدوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ گاؤں کے لوگ غریب نہتے تھے۔ وہاں مشین گنیں تھیں۔ اطالویوں نے گاؤں والوں سے کہا: ہمیں تم سے کوئی تعرض نہیں ہم صرف یہ گاڑی لینا چاہتے ہیں تاکہ ہمارے دستے دار السلطنت کی طرف جلد پہونچ سکیں۔ اور یہ کہکے اسمٰعیل سے مخاطب ہوئے: لڑکے یہ ملک اب ہمارا ہو گیا ہے تم ہمیں جلد ترانا پہونچا دو ہم تمہیں مالا مال کر دیں گے۔ راضی نہ ہو گے تو ہم ابھی تمہیں گولی سے مار کے گاڑی چھین لیں گے لیکن ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے، ابھی تمہارے لطف زندگی اٹھانے کے دن ہیں، ہمارے ساتھ ہو جاؤ تو ہم تمہاری شادی ایک خوبصورت اطالوی حسینہ سے کر دیں گے۔

اسمٰعیل خاموش سنتا رہا۔ ابراہیم بیگ بھی سن رہا تھا۔ اس کا دل [illegible] ہو گیا لیکن وہ [illegible] کچھ بولا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اسمٰعیل کے دل میں ایک خوفناک جنگ جاری ہے جس کے آثار اس کی چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ، جھکی ہوئی نگاہوں اور پیشانی کے پسینے میں جھلک رہے تھے، سب کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں ہر ایک مضطرب تھا کہ دیکھیں اس جنگ میں کس کی فتح ہوتی ہے۔ یزداں کی یا اہرمن کی۔ اسمٰعیل کی زہر خند نگاہوں نے بالآخر اعلان کیا کہ جنگ ختم ہو گئی۔ نتیجہ جاننے کے لئے مجاہدین کی روح نگاہوں میں کھچ آئی۔ اسمٰعیل نے آہستہ سے سر ہلایا اور رو..... رضامندی میں۔ تمام گاؤں والے ہکا بکا ہو گئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ابراہیم بیگ اپنی جگہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اسمٰعیل کے بغل میں جو مجاہد بیٹھا تھا اس نے چاہا کہ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دے۔ ہاتھ گلے پر رکھا تھا کہ اطالوی سپاہی نے سنگین اس کے سینے میں ایسی ماری کہ آر پار ہو گئی۔ اس کا ہاتھ اسمٰعیل کے گلے سے پھسل کر جھولنے لگا۔ اس کے سینے سے جو خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا اس نے اسمٰعیل کی صورت ایک خونی کی سی بنا دی۔ گاؤں والوں کے دل کہہ رہے تھے کہ کاش یہ سنگین اسمٰعیل کے سینے سے پار ہوئی ہوتی اور وہ خود اپنے خون میں نہایا ہوتا۔ اس واقعہ کے بعد سارے مجاہدوں کو سنگینوں کی مدد سے اتار دیا گیا۔ اسمٰعیل دم بخود بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی اس کی [illegible] کی طرف اٹھ جاتیں ورنہ اور کسی طرف نہ دیکھتا یہاں تک کہ [illegible] بیگ پر بھی نظر نہ ڈالی۔ اطالوی جلد جلد سوار ہونے لگے۔ بس کھچا کھچ بھر گئی۔ اسمٰعیل نے سر جھکا کر انجن چلایا، موٹر بھرا بھرا کر روانہ ہو گئی لیکن اب وہ مجاہدین کے بجائے دشمنان اسلام کے کام آرہی تھی اور اسی اسمٰعیل کے ہاتھوں سے جس سے مسلمانوں کی اور خاصکر اس کے باپ کی امیدیں آرزوئیں وابستہ تھیں۔

بس پہاڑی کے پیچدار راستوں میں نظروں سے غائب ہو گئی۔ مجاہد ایک دوسرے کو خاموش دیکھتے رہے کسی نے زبان سے ایک حرف نہ نکالا لیکن ان کی خاموشی ابراہیم بیگ سے وہ کہہ رہی تھی جو ہزار طعن و تشنیع نہ کہہ سکتے۔ ابراہیم بیگ کی نگاہیں جواب دیتی تھیں کہ: جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو وہ سب تسلیم ہے بلکہ اس سے زیادہ بھی جو کچھ کہو وہ کم ہے۔ اسمٰعیل غدار نکل جائے تو نکل جائے لیکن اس کا باپ ایسا نہیں وہ دکھا دیگا کہ سچا مسلمان کیسا ہوتا ہے: نگاہوں سے یہ پیغام سناتا ہوا ابراہیم بیگ تیز مگر مضبوط قدم سے سیدھا گھر گیا اور اس خنجر کو جسے اسمٰعیل اپنے لئے تیز کیا کرتا تھا، لیکر باہر نکل آیا۔ اس نے سیدھا اس طرف کا رخ کیا جدھر بس گئی تھی۔ ایک نے کہا: بیٹے کو مارنے جا رہا ہے کیا؟ دوسرے نے کہا: یہ بھی دکھاوا ہے، بیٹے سے [illegible]

سمجھو اور کیا جس کا بیٹا ایسا ہو اُس کا باپ جیسا ہوگا معلوم ہے۔ یہ تیسرا الیا ۔یوں زبانی جمع خرچ تو سب ہی کرتے ہیں، انسان کا اصل پتہ آزمائش کے وقت چلتا ہے۔

ابراہیم بیگ تیز قدم بڑھاتا ہوا پہاڑوں میں غائب ہو گیا۔ دو ایک گاؤں کے نوجوان بھی تماشہ دیکھنے کے لئے ساتھ ہو گئے۔ سب خاموش دم بخود چلے جا رہے تھے۔ ابراہیم بیگ کبھی سڑک کو گھور گھور کر دیکھتا تھا سڑک جس پر سے اس کا اسمٰعیل دشمنانِ اسلام کو مجاہدین پر حملہ کرنے کے لئے لے گیا تھا اور جوش ہوکے آسے نکل نہ گئی۔ اور کبھی آسمان کے بیکراں سینے کو اس کی نگاہیں چیرتی نظر آتیں۔ وہ آسمان جہاں سے خدا خاموشی کے ساتھ تماشہ دیکھتا رہا اور جس نے اس کے بیٹے پر کلی نہ گرائی۔ پہاڑی بلند ہوتی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ ابراہیم بیگ کا عزم و استقلال بھی۔ اس کے ساتھی ہانپنے لگے۔ مگر ابراہیم بیگ میں کوئی فرق نہ تھا سوائے اس کے کہ اس کا چہرہ زیادہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں زیادہ سرخ ہو گئی تھیں اور نگاہوں کے نشتر زیادہ تیز ہو گئے تھے۔

یکایک ایک بلند موڑ پر موٹر کے پہیوں کے نشانوں نے بتایا کہ موٹر کھڈ میں گر گئی ہے، ابراہیم بیگ نے جونہی یہ دیکھا اس کے منہ سے بے اختیار الحمد للہ نکل گیا۔ پھر نگاہیں تشکر و امتنان میں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں کہ منتقم حقیقی کا شکر ادا کریں جس نے اتنی جلدی انتقام لیا اور اس کے بیٹے کو غدار ملت بننے سے بچا لیا۔ جھک کے دیکھا تو بس کھڈ میں دور پڑی ہوئی تھی اور کچھ لوگ کرب و جانکنی کی حالت میں نظر آ رہے تھے۔ اُسے خیال ہوا کہ چل کے دیکھے اور اگر اسمٰعیل زندہ ہو تو اپنے ہاتھ سے اس کا کام تمام کر دے۔ جب بس کے پاس پہونچا تو دیکھا کہ کچھ لوگ مر چکے ہیں، کچھ سسک رہے ہیں، کچھ تڑپ رہے ہیں۔ اس کا بیٹا نظر نہ آیا، ایک اطالوی کچھ کہہ رہا تھا۔ ابراہیم بیگ رک کے سننے لگا۔ اطالوی آنکھ بند کئے آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی آخری پیغام سنا رہا ہے۔ ابراہیم بیگ کے کانوں میں آواز آئی: "بدمعاش، دغاباز، غدار" ابراہیم بیگ نے اس طرح سر ہلایا جیسے "بیشک" کہہ رہا ہے۔ "میں اُس کی بغل میں بیٹھا تھا، چاہتا تھا کہ موٹر کا رُخ بدل دوں، لیکن اُس نے زبردستی گرا دی، اپنی جان بھی دی اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے سپاہیوں کی جانیں لیں"۔ ابراہیم بیگ کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں "ہیں" نکلی اور وہ فوراً سجدۂ شکر میں گر پڑا۔ وہ اور کچھ تو کہہ نہ سکتا لیکن اُسکے ساتھیوں نے اطالوی کو یہ کہتے سنا: "اس ملک سے مسلمانوں کو نکال دو، اُن کے گھروں کو آگ لگا دو، اُن کو زندہ جلا دو، یہ یاد رکھو کہ جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے وہ اطالویوں سے دلی نفرت کرے گا اور حتی المقدور کبھی ہماری سلطنت کو مضبوط نہ ہونے دیگا۔" ابراہیم بیگ کے ساتھی مارے خوشی کے چیخ اُٹھے اور بے اختیار رقص کرتے ہوئے دوڑنے لگے۔

ابراہیم بیگ دیر تک حالتِ سجود میں پڑا رہا۔ اُس کے سر میں ایک اضطراری جنبش تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اس پر رقت طاری ہے۔ جب اُس نے سر اُٹھایا تو اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اُس کے ساتھیوں نے پکار کے کہا: "اسمٰعیل یہاں ہے۔"

ابراہیم بیگ نے جا کے دیکھا تو بس کے نیچے دبا ہوا تھا، چہرہ خون سے تر بتر تھا۔ جانکنی کا عالم تھا، ابراہیم بیگ کو دیکھ کے چلا اٹھا: "جان کیا آپ مجھے غدار سمجھ رہے تھے، دیکھئے آپ کا بیٹا سرخرو ہے۔"

ابراہیم بیگ کی عمر بھر میں پہلے پہل آواز بھرائی۔ اس کے منہ سے صرف ایک لفظ "شاباش" نکلا۔ اس کے چہرے میں انتہائی شجاعت اور انتہائی مسرت اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ اس کی تصویر بڑے سے بڑا مصور بھی نہیں کھینچ سکتا۔ اسمٰعیل نے اس چہرے کو دیکھا اور اس لفظ کو سنا، اس کے چہرے پر خوشی کا نور چھا گیا اور یہ مسکراتا ہوا چہرہ ہمیشہ کی مسکراہٹ میں ساکت ہو گیا۔ بڈھے باپ نے بیٹے کے خون کو نہاتے چہرے کو پیار کیا۔ خون اب بھی گرم تھا۔ یہ گرمی اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل و دماغ، رُوح از سرِ نو جوان ہو گئے۔ جوان بیٹے نے مر کے انہیں اپنی جوانی بخش دی، ابراہیم بیگ بیٹے کی لاش کو کندھے پر لے کے پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ اس کے ساتھی دم بخود رہ گئے ہاتھ لگانے کی بھی کسی کی ہمت نہ ہوتی۔ ابراہیم بیگ گاؤں کی طرف لاش اس طرح لئے جا رہا تھا جیسے کوئی اپنے محبوب کے لئے انمول تحفہ لئے جا رہا ہو۔

بعد میں گاؤں والوں پر کیا گذری یہ تو معلوم نہیں، سنا ہے کہ اس واقعہ کے کئی دن بعد تک اس گاؤں پر چیل کوّے اور گدھ بکثرت منڈلاتے رہے اور اب اس جگہ ایک گرجا بن رہا ہے۔ کوئی مسلمان وہاں نظر نہیں آتا۔ مجاہد پہاڑیوں میں چلے گئے ہیں۔ ابراہیم بیگ اُن کا سردار ہے۔ نماز کی صفوں کا بھی امام ہے اور جنگی صفوں کا بھی۔ وہ نماز کے خطبوں میں کہا کرتا ہے کہ اگر بالفرض دشمن اپنی مادی قوتوں سے ہمارے جسموں کو غلام بنا بھی لے [illegible] ہماری روح کو غلام نہ بننے دیں [illegible]

تو ہم کو بھی ایک نہ ایک دن آزاد کرالیں گے۔ انہیں آزاد رکھنے کے لئے مسلسل قربانیوں کی ضرورت ہے۔ یہی قربانیاں ایک دن کام آئیں گی خونِ شہیداں رنگ لائیگا، شہیدوں کے لہو سے ایک نئی قوم کا خمیر تیار ہوگا جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے کارنامے دُہرا سکے گی۔

اسمٰعیل کی قربانی اور ابراہیم بیگ کے خطبوں نے لوگوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی ہے۔ بڑے بڑے اور ننھے ننھے مجاہدوں کی تمنا بھی یہی ہے کہ وہ اسمٰعیل کی طرح سرخرو بنیں۔ بے سروسامانی کی حالت میں بھی جنگ کئے جارہے ہیں۔ جو مجاہد شہید ہوتا ہے وہ عموماً اپنی جان کے نقصان سے زیادہ دشمنوں کا نقصان کرکے جان دیتا ہے۔ کبھی پٹرول کے خزانوں میں آگ لگا دیتا ہے، کبھی ریل کی پٹڑی اکھاڑ دیتا ہے، کبھی بارود خانے اُڑا دیتا ہے، کبھی شبخون مارتا ہے۔ تائیدِ غیبی بھی ان کے شاملِ حال ہوتی جاتی ہے اطالوی پریشان ہیں کچھ بنائے نہیں بنتی۔ انہیں ڈر ہے کہ کہیں ترکی کی طرح یہاں بھی کوئی مصطفےٰ کمال پیدا نہ ہو جائے جو انہیں یونانیوں کی طرح نکال باہر کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت دُور نہیں جب یہ اسلامی ملک پھر آزاد ہو جائیگا۔ خدا بھی قربانیاں رائیگاں نہیں کرتا۔ مجاہد ایک نہ ایک دن ضرور سرخرو ہوتا ہے۔

فضل احمد کریم فضلی

گلبانگِ حیات

از خان بہادر محمد مسیح پال۔ امین حزیں سیالکوٹی

امین حزیں کی شاعری رسمی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے لئے ایک نئی اور انوکھی راہ نکالی ہے جو نتیجہ ہے فطرتِ انسانی کے نہایت گہرے مطالعے اور شدید تاثرات کا۔ آپ زندگی کے حقائق کی تفسیر اپنے خاص رنگ میں کرتے ہیں۔ اور جو کچھ کہتے ہیں [illegible] احساسات اور وسیع تجربے کی بنا پر۔ آپ کے کلام میں [illegible] کے ساتھ ایک پُرخلوص [illegible] کی تعلیم ہے دو سو سے زائد صفحات پر شائع شدہ مجلد کتاب ہے۔ جیسے شروع میں [illegible] صاحب [illegible] کا مقدمہ بھی ہے۔ کتاب مصنف کی تصویر سے مزین ہے [illegible] قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ۔ ساقی بک ڈپو دہلی

دُنیائے خام

سکونِ دل جراحت خوردۂ اوہام ہے ابتک
الٰہی! نسلِ آدم کُشتۂ آلام ہے ابتک

شبوں کو زندگی اک جلس سا معلوم ہوتی ہو
اگرچہ بزمِ انجم زحمتِ یک گام ہے ابتک

زمانہ جانتا ہے۔ امن ہے جوہر تمدن کا
مگر شمشیرِ استبداد خوں آشام ہے ابتک

اگرچہ حریت کے نور سے روشن ہیں دل سب کے
زمیں پر شیوۂ انساں فروشی عام ہے ابتک

گرہیں کھولی ہیں ہم نے کس قدر اسرارِ عالم کی
حقائق پر مگر چھایا ہوا ابہام ہے ابتک

زمانہ ساغرِ زہر ہر گھڑی جب کھنکھناتا ہے
مرے ہاتھوں میں کیوں ٹوٹا ہوا اک جام ہے ابتک

اگر لوح و قلم کے بس میں ہے تقدیر انساں کی
تو مجبوری مری کیوں موردِ الزام ہے ابتک

جسے خارا شگافی کے طریقے تو نے سکھلائے
وہی مردِ قلندر لرزہ بر اندام ہے ابتک

اُٹھے تھے جس کی خاطر کہکشاں کے نقرئی پردے
وہی بیباک شاعر [illegible] زیرِ دام ہے ابتک

نظامِ دو جہاں کو ایک کروٹ کی ضرورت ہو
بالہام خدائے محکم تیری دُنیا خام ہے ابتک

[illegible] قاسمی

ڈاکٹر گراہم بیلی

جون ۱۹۳۹ء میں لندن یونیورسٹی نے مجھے اُردو کا لکچرار مقرر کیا۔ اور اس کے چند دن بعد ہندوستان ہی میں مجھے ایک دن ڈاکٹر گراہم بیلی کا خط ملا۔ ڈاکٹر بیلی نے یہ خط مجھے لندن سے لکھا تھا۔ اور میرے تقرر پر مجھو مبارکباد دی تھی۔ اس سے پہلے میں نے ان کا نام تو ضرور سُنا تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ لندن میں مجھے ان کے ماتحت کام کرنا پڑے گا۔ مگر سچ پوچھئے تو میں اپنے دل میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ جس طرح عام طور سے انگریز ہندوستانی زبان کی دو چار کتابیں پڑھکر ٹوٹی پھوٹی اُردو لکھ پڑھ لیتے ہیں اور دو چار غلط سلط جملے بول لیتے ہیں یہی حال ڈاکٹر بیلی کا بھی ہوگا لیکن ان کے خط نے مجھے چونکا سا دیا۔ یہ خط آج بھی میرے سامنے رکھا ہے اور اب بھی جب کبھی میں یہ خط دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی پہلی رائے پر شرم آتی ہے۔ انہوں نے مجھے خط تو انگریزی میں لکھا تھا۔ مگر اس میں دو چار باتیں ایسے پتے کی تھیں کہ انہیں پڑھتے ہی میری آنکھیں کھل گئیں۔ اور ڈاکٹر بیلی کے متعلق مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا۔

> "جب آپ لندن آئیں گے تو میں آپ سے ہندی اور اُردو گرامر کے چند قاعدوں کے بارے میں بحث کرونگا بہت سی ایسی باتیں ہیں کہ ان کے متعلق اب تک کوئی عام قاعدہ نہیں بن سکا۔ مثلاً "کو" علامت مفعول ہے۔ مگر کبھی "کو" استعمال کرتے ہیں اور کبھی نہیں کرتے بعض لفظوں کے ساتھ "کو" کبھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ جھوٹ بولنا۔ مار کھانا۔ بے عزت کرنا تو سب بولتے ہیں۔ لیکن جھوٹ کو بولنا۔ مار کو کھانا۔ بے عزتی کو کرنا کبھی نہیں سُنا۔ اسکی کیا وجہ ہے۔ اور غیر زبان داں کس قاعدے پر چل سکتے ہیں؟"

اِسکے بعد ڈاکٹر بیلی نے ہندوستان ہی میں مجھے اپنے ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھیجا۔ اور اس میں سے چند مضمون پڑھنے کی مجھے خاص طور سے ہدایت کی۔ یہ مضمون پڑھکر میں ان کی زبان دانی کا نہیں تو کم سے کم اُنکی تحقیق اور اُنکے ادبی انہماک کا ضرور قائل ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں میں لندن پہونچا۔ چونکہ ہمارا کالج لڑائی کی وجہ سے کیمبرج چلا گیا تھا۔ اس لئے میں بھی سیدھا لندن سے کیمبرج پہنچ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بیلی ابھی تک کیمبرج نہیں آئے۔ آٹھ دن بعد آ پہنچے۔ یہ ایک ہفتہ میں نے بہت بے چینی سے گذارا۔ کیونکہ اُن سے ملاقات کا اشتیاق بڑھتا چلا جا رہا تھا آخر ایکدن مجھے معلوم ہوا کہ کل صبح کے دس بجے فلاں کمرے میں میری اُن سے ملاقات ہوگی۔ دوسرے دن وقت سے پہلے ہی میں اُس کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اِدھر کالج کے گھنٹے نے ٹن ٹن دس بجائے اور اُدھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ نکلتا ہوا قد، بھرا ہوا جسم، سُرخ و سفید چہرہ، سفید بڑی بڑی مونچھیں، چھوٹے شیشوں کی عینک۔ پُرانی وضع کا چھوٹا سخت سفید کالر۔ ساٹھ ستر سال کے قریب عمر۔ گلے میں گیس کی ٹوپی کا کیس، ہاتھ میں موٹی سی لکڑی۔ ایک لمحہ میں ان کا یہ حلیہ میرے ذہن میں اتر گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹوپی اُتاری اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے انگریزی میں گڈ مارننگ کہا۔ مگر میرے سلام کا جواب انہوں نے نہایت صاف اُردو زبان میں دیا۔ ان کا پہلا جملہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ "آخر آپ ولایت پہونچ گئے۔ میں تو سمجھا تھا کہ ہمارے اشرف صاحب لڑائی کی وجہ سے نہیں آسکیں گے۔" میرے کانوں کو یقین نہیں آیا۔ میں کیسے مان سکتا تھا کہ کیمبرج میں بھی ایسی صحیح زبان سننے میں آسکتی ہے۔ اپنا شک دُور کرنے کے لئے میں نے اُن سے کچھ اُردو میں کہا۔ اور اس کا جواب ڈاکٹر بیلی نے پھر نہایت بامحاورہ اور صحیح زبان میں دیا۔ پھر تو ہم دونوں آتشدان کے سامنے کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ اور پہلی ہی ملاقات میں ایسی گھل کر باتیں ہوئیں جیسے برسوں کی دوستی ہو۔

ایک بات کا اندازہ میں نے چند منٹ میں کر لیا وہ یہ کہ اگرچہ ڈاکٹر بیلی اور مجھ میں تیس چالیس سال کا فرق تھا مگر اِن کا برتاؤ مجھ سے بالکل برابر والوں جیسا تھا۔ کوئی ڈھائی تین گھنٹے تک ہم بیٹھے دُنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ بیچ بیچ میں یہ مجھ سے اکثر یہ بھی کہتے جاتے تھے۔ ابھی آپ نے اس لفظ کا تلفظ یوں ادا کیا ہے۔ میرے ایک شاگرد حیدرآباد دکن سے آتے تھے وہ تو اسے یوں بولتے تھے۔ ایک صاحب یو۔ پی کے رہنے والے تھے۔ ان کا تلفظ یہ تھا۔ الدوڈپٹی نذیر احمد کو میں نے یوں بولتے سُنا ہے۔ مجھے ان کی یادداشت پر بہت تعجب ہوا۔ ایک بجے کے قریب کھانے کا وقت آیا تو بیلی کو گاڑی

نکال کر بولے۔ اب مجھے اپنے گھر جانا چاہیئے۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہونگی۔ ڈاکٹر بیلی کی زبان سے کیمبرج میں "وہ" کا لفظ سُن کر مجھے ہندوستان یاد آ گیا۔ اسکے بعد بھی جب کبھی انہوں نے اپنی بیوی کا ذکر کیا ہمیشہ ان کے متعلق "وہ" کا لفظ ہی استعمال کیا۔

اکثر باتوں میں ڈاکٹر بیلی پر مشرقیت کا اثر بہت غالب تھا۔ اور اُردُو بولتے وقت تو ہمیشہ سیدانشا کا یہ مقولہ یاد رکھتے تھے کہ جو لفظ اُردو میں آگیا اس کا تلفظ اردو ہی کے لحاظ سے کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اپنی گفتگو میں پلیٹ فارم۔ پوسٹ کارڈ۔ اسکول اور اسٹول وغیرہ کے لفظ ہمیشہ ہندستانیوں کی طرح ادا کرتے تھے۔

ایک سال تک مجھے ڈاکٹر بیلی کے ساتھ کیمبرج میں اُردو اور ہندی پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ اور ان سے میں نے ہندی کی دو چار کتابیں بھی پڑھیں۔ گھنٹوں ان سے علمی اور ادبی باتوں پر بحث بھی کی۔ اور ہمیشہ میں نے یہی محسوس کیا کہ ڈاکٹر بیلی کو ہندی اور اُردو ادب سے حقیقی معنوں میں دلچسپی تھی۔ یہ زبان کو زبان سمجھ کر پڑھتے تھے۔ اور اس کا لطف بھی اُٹھاتے تھے۔ انہیں ہر محاورے کی سند یاد تھی۔ ان کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ ہر بات کی سند میں اساتذہ کے شعر یا مستند ادیبوں کے فقرے کے فقرے نقل کر دیتے تھے۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ جو بہت کم ہندستانیوں کو نصیب ہوگی۔ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادب پر انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ دونوں زبانوں کے مصنفوں اور شاعروں کی تصانیف ان کی نظر میں تھیں۔ اور اب تک جتنی اچھی اچھی کتابیں ہندستان میں چھپی تھیں یہ انہیں پڑھ چکے تھے۔

ایک سال تک برابر تقریباً ہر روز میری اُن سے دو تین گھنٹے تک ملاقات ہوتی رہی۔ اور ایک بات پر مجھے بیحد تعجب ہوا۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں لڑائی کی حالت بہت نازک ہو گئی۔ فرانس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہر شخص کی زبان پر جنگ کا ذکر تھا۔ مگر ڈاکٹر بیلی نے کبھی مجھ سے لڑائی کا ذکر نہیں کیا۔ جس دن فرانس نے ہتھیار ڈالے ہیں اُس روز ان کے چہرے پر ایک حد تک پریشانی کے آثار ضرور تھے۔ مگر ٹھیک دس بجے آتے ہی انہوں نے پھر وہی تذکیر و تانیث، محاوروں اور افعال پر بحث شروع کر دی۔ اگست ۱۹۴۰ء میں جب لندن پر زبردست بمباری شروع ہوئی تو ایک دن تیسرے پہر یہ مجھ سے ملنے کے لئے بی بی سی میں آئے۔ ایکا ایکی ہوائی حملے کے سائرن بجنے لگے۔ ہم سب پناہ خانے میں چلے گئے۔ دُور سے بموں کی دہشتناک آوازیں چلی آتی تھیں۔ سب لوگ بموں کا ذکر کر رہے تھے۔ مگر ڈاکٹر بیلی نے مجھ سے پوچھا کہ بم گرنے سے کھڑکیوں میں جو آواز پیدا ہوتی ہے اُسے آپ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ بم کے دھماکے سے کھڑکیاں جھنجھنا اٹھتی ہیں۔ اسکے بعد جب تک ہم پناہ خانے میں بیٹھے رہے یہ برابر زبان کے متعلق ہی مجھ سے باتیں پوچھتے رہے۔

ڈاکٹر بیلی نے آخری زمانے میں اُردو پڑھانے کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ اور میں اسے اپنے لئے بہت بڑا فخر سمجھتا ہوں کہ اپنے چالیس پچاس برس کے تجربے کا نچوڑ انہوں نے میرے حوالے کر دیا تاکہ میں اس کی نظر ثانی کروں۔ اس کے ایک ایک لفظ کو ہم دونوں نے بیٹھ کر جانچا۔ ان کے بتاتے ہوئے قاعدوں پر بحث کی۔ ان کے جملے کے جملے بدل دیئے۔ کچھ باتوں میں مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں ہوا۔ اور میں نے صاف صاف ان سے کہہ بھی دیا۔ مگر انہیں اس بات کا کبھی رنج نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ یہ اپنی غلطی نہایت خندہ پیشانی سے مان لیتے تھے۔ اور میرے نزدیک طالب علم کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ یہ آخر دم تک علم کی تلاش کرتا رہے۔ اور دوسروں سے کوئی نئی بات سیکھنا عار نہ سمجھے۔ اسقدر علم اور فضیلت کے باوجود یہ بچوں کی طرح کھود کھود کر باتیں پوچھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی اسی جرح سے زبان کے بہت سے نکتے میری سمجھ میں آ گئے۔ اور میں نے بہت کچھ اِنکے سوالوں ہی سے سیکھ لیا۔

اگست ۱۹۳۸ء میں ۲۵ سال تک لندن یونیورسٹی میں اُردو پڑھانے کے بعد ڈاکٹر بیلی نے پنشن لے لی۔ گذشتہ دس پندرہ سال سے سرکار نظام کی طرف سے لندن یونیورسٹی میں نظام ریڈر آف اُردو کی تنخواہ ملتی تھی اور اس عہدے پر ڈاکٹر بیلی ممتاز تھے۔ پنشن لینے کے بعد بھی یونیورسٹی نے انہیں اعزازی طور پر سے اسی عہدے پر قائم رکھا۔ لندن سے یہ اڈنبرا چلے گئے۔ مگر وہاں بھی زبان کا شوق باقی رہا۔ آخر تک میری ان سے خط و کتابت جاری تھی۔ اور ہر خط میں یہ محاورہ، افعال، اور بندشوں کے متعلق مجھ سے بہت باریک باریک باتیں پوچھا کرتے تھے۔ مرنے سے چند ہفتے پہلے انہوں نے چار صفحے کے خط میں کوئی سو ڈیڑھ سو محاورے مجھے لکھ کر بھیجے تھے اور دریافت کیا تھا کہ ان میں کیا کیا فرق ہے۔

میری درخواست پر ڈاکٹر بیلی نے بی بی سی کیلئے چھ تقریریں ہندستانی زبان میں بند کی تھیں اور خوش قسمتی سے ہم نے ان کا ریکارڈ بنا لیا تھا۔ یہ سب تقریریں انہوں نے خود لکھی تھیں۔ البتہ کہیں کہیں مجھ سے مشورہ لیا تھا۔ یہ سب تقریریں ہندستان میں بہت سے لوگوں نے ریڈیو پر سنی ہونگی۔ اور اندازہ لگا لیا ہوگا کہ زبان پر انہیں کسقدر

قدرت تھی۔ عام طور سے انگریز ق، ڑ وغیرہ حروف کا تلفظ نہیں کر سکتے مگر ڈاکٹر بیلی کو میں نے یہ غلطی کرتے کبھی نہیں سنا۔ چونکہ یہ ایک مدت تک پنجاب میں رہے تھے اسلئے قدرتی طور پر انکی زبان پر پنجاب کا اثر تھا۔ اگر پردے کے پیچھے سے یہ بولتے تو سننے والا یہی سمجھتا کہ کوئی پنجابی بیٹھا اُردو بول رہا ہے۔ ڈاکٹر بیلی نے مجھ سے خود بیان کیا کہ ایک دفعہ پنجاب کے کسی گاؤں میں یہ جا رہے تھے کہ رات ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں یہ راستہ بھول گئے۔ دُور سے روشنی دیکھکر یہ اس طرف چلے۔ قریب جا کر دیکھا تو چار پانچ پنجابی آگ کے چاروں طرف بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ انہوں نے جا کر پنجابی میں ان سے راستہ پوچھا۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے وہ انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اسلئے یہی سمجھے کہ کوئی راستہ بھول گیا ہے۔ چنانچہ گاؤں والوں نے انہیں اپنے ہاں رہنے کی دعوت دیدی۔ اور پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ انہوں نے وہیں دُور سے کھڑے کھڑے کہا: بیلی۔ پنجاب میں عام طور سے بیلی کا نام رکھا جاتا ہے۔ اسلئے گاؤں والے اب بھی انہیں پنجابی سمجھتے رہے۔ ڈاکٹر بیلی کہا کرتے تھے۔ اس بات کا مجھے بہت لطف آیا۔

میں نے انہیں پنجابی بولتے بھی سنا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ان جیسی پنجابی شاید ہی کوئی اور غیر پنجابی بول سکتا ہوگا۔ جوانی کے زمانے میں یہ پادری کی حیثیت سے ہندوستان گئے تھے۔ اور ایک مدت تک پنجاب کے علاقے میں سکول میں پڑھاتے رہے۔ چھٹیوں کے زمانے میں ہمیشہ یہ پہاڑوں کا دورہ کرتے تھے۔ اور اس طرح انہوں نے تبتی، نیپالی، کشتواڑی، اور علاقہ دردو کی زبانیں بھی سیکھ لیں۔ فارسی اور سنسکرت سے بھی انہیں شُدبُد ہو گئی۔ ان زبانوں کے متعلق انہوں نے سب ملا کر سولہ کتابیں لکھیں۔ اسکے علاوہ انگریزی کے اخباروں اور رسالوں میں بھی ہندوستانی زبانوں پر بہت دلچسپ مضمون لکھتے رہتے تھے۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر گلکرسٹ کے بعد انگریزوں میں ہندوستانی زبان کی خدمت سب سے زیادہ ڈاکٹر گراہم بیلی نے کی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ڈاکٹر گلکرسٹ کو میر امن، میر شیر علی افسوس، مظہر علی ولا اور للوجی لال جیسے ادیب مددگار کی حیثیت سے مل گئے۔ ڈاکٹر بیلی کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکی۔ اسلئے ان کا نام شاید اردو ادب میں زندہ نہ رہ سکے، مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ ان کے دم سے لندن یونیورسٹی میں اردو اور ہندی کا نام زندہ تھا۔ اور اب انکی کرسی ایسی خالی ہوئی ہے کہ اس عہدے کیلئے ایسا موزوں شخص مشکل سے ہی ملے گا۔

(باجازت بی بی سی لندن)

آغا محمد اشرف

زندگی کے دروازے پر

پا برہنہ و سراسیمہ سا اک جمِ غفیر
اپنے ہاتھوں میں لئے مشعل بے شعلہ و دود
مضطرب ہو کے گھروندوں سے نکل آیا ہے
جیسے اب توڑ ہی ڈالے گا یہ صدیوں کا جمود

ان پپوٹوں میں یہ پتھرائی ہوئی سی آنکھیں
جن میں فردا کا کوئی خواب جاگ رہا ہی نہیں
کیسے ڈھونڈیں گی در زیست کہاں سوئیں گی؟
ان کو تو تشنگیٔ شوق میسر ہی نہیں

جیسے صدیوں کے چٹانوں پہ تراشے ہوئے بت
ایک ناکارہ مصور کی طبیعت کا اُبال
ناچتے ناچتے غاروں سے نکل آتے ہوں
اور واپس نہیں غاروں میں ہو جانے کا خیال!

زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
اور یہ رقصِ طلسمانہ کے رنگیں ساتے
اس کی نظروں کو دئے جاتے ہیں پیہم دھوکا
جیسے بس آنکھ جھپکنے میں وہ آ کر آئے!

شپرِ موت کسی غول بیاباں کی طرح
قہقہے بھرتا ہے، خاموش فضاؤں میں صدا
اپنے پر تول کے اکبار سمٹ جاتی ہے
ایک تاریک سا پردہ یونہی آویزاں رہا

کوئی دروازے پہ دستک نہ تقدیر کا سراغ
بند تھے بند ہیں اک بھی نہ کھلا ان کا دہن
اور اس گوشۂ زنجیر میں جنبش نہ ہوئی
جسکے ساتھ میں لرزتے ہیں کئی چاند گہن!

ناچتا رہتا ہے دروازے کے باہر یہ ہجوم
اپنے ہاتھوں میں لئے مشعل بے شعلہ و دود
زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
کیا خبر ٹوٹ ہی جائے نہ کبھی قفلِ جمود!

اختر الایمان

ایک شوہر کی خاطر

اور یہ سب کچھ بس ذرا سی بات پر ہوا مصیبت آتی ہے تو کہہ کر آتی۔ پتہ نہیں وہ کونسی گھڑی تھی کہ ریل میں قدم رکھا کہ ابھی ابھی زندگی بت ہو گئی۔ بات یہ ہوئی کہ اگلے نومبر میں جودھپور سے بھی آ رہی تھی۔ نے کہا: "دیکھو پچھتاؤ گی۔ مت جاؤ" مگر جب چیونٹی کے پر نکلتے تو موت ہی آتی ہے۔

سفر لمبا اور ریل زیادہ ہلنے والی، نیند دور اور ریت کے کے، اوپر سے تنہائی۔ سارا کا سارا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ جیسے قبرستان میں جی قبریں ہوں۔ دل گھبرانے لگا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے تنگ آ گئی۔ لیا اس میں بھی وہی خبریں! دل لوٹ گیا۔ کاش میں قبرستان میں رتی، بلا سے مُردے ہی نکل پڑتے۔ بچوں کو دیکھ دیکھ کر جی ہول رہا! کاش کوئی آ جائے — کاش — کاش — میں نے دعا مانگی ع کی۔

ایکدم سے ریل جو رکی تو ایکدم سے جیسے ٹیڑیاں ٹوٹ پڑیں۔ ان تو کم آتے بچے اور پٹلیاں زیادہ۔ بچے ایسے جو قحط زدہ گاؤں کو تھے کہ آتے ہی خود اک پر تل پڑے۔ دودھ پینے والوں کو تو خیر تیار مل گیا اور وہ جٹ گئے۔ باقی کے تلملانے اور تڑپنے لگے۔ پٹلیاں اس ہنگم اور فضول جگہ گھیرنے والی وضع سے بندھی تھیں کہ کسی کل سی نہ تھیں، ایک سنبھالی تو دوسری تیار۔ میں جس برتھ پر اس اوپر سے بیٹھی تھی کہ گٹھری گرے تو میری ریڑھ کی ہڈی بچ جائے۔ مجھے اپنے جسم میں بس ریڑھ کی ہڈی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کہتے ہیں ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے تو آدمی لوتھڑا ہو جاتا ہے۔

"کہاں جا رہی ہو!" بیچاری ہمسفر نے گٹھریوں کی طرف سے غیر مطمئن ہوتے ہوئے بھی نہایت فکرمند ہو کر پوچھا۔

میں نے جلدی سے بتایا اور پھر ان کی توجہ اس بھی گٹھری کی طرف منعطف کی جو شاید برتنوں کی تھی اور ذرا سی ٹھیس سے گرنے کو تیار تھی۔ برا اتفاقیہ ذرا سا ہاتھ لگ جاتا تو برتن اس تیزی سے آپس میں ٹکراتے کہ ... گھبرا اٹھتا۔

"کہاں سے آ رہی ہو —"

میں نے ... سے بتایا۔

"میکے جا رہی ہو؟"

جب تک شادی نہ ہوئی ہو جب تک جگت میکہ ہی ہے اور کبھی بھی نہیں یعنی میکے اور سسرال کا سوال ہی نہیں لہٰذا میں ذرا چکرائی سچا اندازہ کس صورت میں شادی ہونے کا خطرہ ہے۔

"میاں کے پاس جا رہی ہو؟"

"نہیں!" میں نے چاہا موضوع بدل جاتا تو اچھا ہوتا۔ خواہ مخواہ کون ہمدردی وصول کرے۔

"تو پھر سسرال جا رہی ہو گی — کیوں؟" ذرا ان سوالوں کے جواب بہت فلسفیانہ ہو گئے ہیں۔

"نہیں — تو — میں کہیں جا رہی ہوں — شادی — شادی تو نہیں ہوئی" میں نے ذرا دل میں کچھ حقیر ہو کر کہا حالانکہ شادی کے خلاف کالج کے مباحثہ میں مجھے اوّل انعام ملا تھا اور طلب بھی — خیر اب تو — ہاں تو میں نے کہا۔

وہ متحیر ہو کر اتنی زور سے اچھلیں کہ بچے کے منہ سے دودھ چھوٹ گیا اور وہ مذبوحہ بکری کی طرح چیخا میں نے دھیان بٹانے کو ان کی توجہ بچے کی طرف کرنا چاہی۔ مگر وہ ٹٹول ٹٹول کر بچے کی ناک میں دودھ ٹھونسنے لگیں۔ اور میں یہاں لکھنا نہیں چاہتی کہ مجھے انہوں نے کس رحم اور مہربانی بھری آنکھوں سے دیکھا۔ انہیں مجھ پر محبت سی آنے لگی اور میں ڈری کہ وہ کہیں مجھے چمٹا کر رو نہ پڑیں۔ ان کا دل بہلانے کے لئے میں نے چنے والے کو بلایا۔ مگر وہ ویسی ہی اداس رہیں۔ انہوں نے مجھے دو ایک داؤں پیچ ایک اچھا سا شوہر پھانسنے کے بتائے جو بعد میں تجربہ سے قطعی بیکار ثابت ہوتے۔

میری دعا شاید ضرورت سے قبول ہو گئی۔ یا شاید میری خدا کے حضور میں کاتبین کی غلطی سے دوبارہ عرضی پیش ہو گئی۔ کہ ایک موج انسانوں کی پھر آ گئی۔ اس موج میں بڑے بڑے ریشمی برقعے اور چھتریاں زائد تعداد میں تھیں۔ ان کے ساتھ کئی بھی تھے جن کے گٹھڑے ناپ ناپ کر اتنے بڑے کئے گئے تھے کہ ریل کے کسی کونے میں ٹھیک سے نہ رکھے جا سکیں۔ ان کے بستر اور صندوق بھی کچھ ایسے تھے جو کسی پٹڑی کے اوپر نیچے کسی انداز سے بھی نہ رکھے جا سکتے تھے۔ ان بیویوں نے آتے ہی ریل پر

چلا چلی مچا دی۔ صندوق اور بلندے گھسیٹ کر تباہ کر دیا۔ پہلے والی مسافرہ کی ٹھنڈی پوٹلیاں جو شاید تاک میں تھیں بچوں اور عورتوں پر گریں اور وہ ایک دوسرے پر گرے۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ بھی کچھ پریشان تھیں۔

بتایا۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" بولیں۔ حالانکہ ابھی ٹھیک سے جمی بھی نہ تھیں۔ بُرقعہ پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر بتایا۔

"میکے جا رہی ہو یا سسرال؟" کاش مجھے معلوم ہوتا۔ مگر جھجکنے کا موقع نہ تھا۔

"سسرال!" ایسے کہا کہ وہ ہمسفر جو پہلے جرح کر چکی تھیں نہ سُن پائیں۔

"کیا کرتے ہیں میاں؟"

اب میں نے سوچا کچھ تو کرتے ہی ہونگے۔ بیکار تو کاہے کو پھرتے ہونگے۔ مگر کاش وہ مجھے بھی بتا دیتے تو اچھا ہی تھا۔ بہرحال نکھٹو تو نہ ہوں گے، پھر ــــ

وہ خود ہی بولیں "ریلوے میں ہیں؟"

"ہاں ــ ہاں" میں نے پُرشوق لہجہ سے انہیں یقین دلایا۔

"یہ ٹھیک رہا" میں نے سوچا۔ ریلوے کا آدمی خوب رہے گا۔ مزے سے مفت کے ٹکٹ تو ملیں گے۔ ہندوستان بھر میں گھوم لو۔ اور مجھے وردی بھی اِن کمبختوں کی کچھ پسند ہے۔ خصوصاً وہ ٹوپی اور سیٹی ــ لال ہری جھنڈی۔ اچھا ہی ہوا جو یہ بیچاری مل گئیں ورنہ اپنے کو تو کبھی گارڈ بابو وغیرہ کا خیال بھی نہیں آیا۔ لے ہاں سچ تو ہے۔

"کون کام پہ ہیں ــــ وہ ریل میں؟"

"کسی ٹھیک ہی کام پر ہونگے ــ اور کیا؟" مجھے خیال ہی نہ آیا کہ گارڈ بابو کی بیوی بننا آسان ہے مگر یہ تفصیل تو ذرا بھاری خوراک ہے۔

"پھر بھی ــ کیا کام کرتے ہیں، ریل میں تو ہزار سے زیادہ کام ہیں۔"

"اے ... سیٹی ــ قُلی ــ" میں ایسی بولائی کہ کچھ بن نہ پڑا۔ سامنے ایک قُلی بڑا سا بنڈل، ایک بستر، آدھی درجن صراحیوں کی سیڑھی اور دو لوٹے لئے چلا آ رہا تھا۔ اور ایسے بن رہا تھا جیسے بہت بھاری ہیں۔

"قُلی ــ تمہارا میاں قُلی ہے؟" حسرت کا ایک دورہ اُن پر بھی پڑا۔ میں چاہتی تھی کہ ذرا ہم آہستہ آہستہ گفتگو کریں ورنہ کہیں پہلی ہم سفر نہ سُن لیں۔ اُن کا بچہ سکون سے دودھ پی رہا تھا۔ مگر ایک دفعہ بات نکل جائے تو پھر میں بھی اس پہ ہی جم جاتی ہوں۔ اور یہاں تو جینے کے ویسے ہی لالے پڑے تھے۔

"ہاں ــ آں قُلی ہی سہی پھر تمہیں کیا۔" میں نے ذرا بُرا مان کر کہا۔

"تمہارا میں ... میاں قُلی ــ"

"ہاں پھر ــ تم کیوں جلو ــ تمہارا جی چاہے بھئی تم بھی قُلی سے کر لو ــ دس قُلیوں سے کرو۔ کون روکتا ہے۔ اچھے تو ہوتے ہیں قُلی۔" مگر میں ذرا چُپ رہی اور مظلوم سی صورت بنالی۔

بولیں "کیسے ہو گئی تمہاری شادی قُلی سے؟"

اور میں سوچنے لگی قُلیوں سے کس طرح شادیاں ہوتی ہیں۔ میں نے چاہا دل سے کچھ گڑھوں کسی قُلی کی شادی کا حال، مگر اس قدر غیر دلچسپ معلوم ہوا۔

پھر میں نے کہا "ایک قُلی تھا ــــ"

اُنہوں نے توجہ سے سُنا۔

"وہ رہا کرتا تھا ــ" میں چاہتی تھی وہ میری ہر بات پہ "ہوں" کریں یا کم از کم سر ہلائیں۔

"پھر کیا ہوا کہ ایک دن ــ کہ ــ" کاش مجھے معلوم ہوتا ــ اس وقت کوئی قصہ بھی تو نہ یاد آیا۔

"وہ لے جا رہا تھا سامان ــــ" میں نے چاہا وہ پوچھیں کس کا اور اُنہوں نے پوچھا۔

"ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کا ــ پھر وہ لڑکی ــ وہ لڑکی عاشق ہو گئی ــ"

"کون لڑکی؟"

ارے یہ تو معلوم ہی نہیں پڑا۔ خیر کیا مضائقہ ہے۔ کوئی ہے نہیں۔ یقیناً ہوگی ہی کوئی لڑکی ــ کوئی خوبصورت سی لڑکی ہوگی۔

"تو وہ قُلی پہ کیوں عاشق ہو گئی؟"

"وہ عاشق یوں ہو گئی کہ ــ کہ ــ ارے بھئی اب یہ کیا معلوم کوئی تو وجہ ہے ہی عاشق ہونے کی۔ وہ مسکرایا ہوگا اُسے دیکھ کر۔" اتنے میں ایک نہایت بھیانک قسم کا بابو مجھے دیکھ کر مسکرایا اور میں ڈری کہ کہیں سچ مچ عاشق نہ ہونا پڑے۔ ابھی انٹرویو میں جانا ہے۔ سنتے ہیں عشق میں بڑی حالت خراب ہوتی ہے۔ بھلا یہ جیسے ہیں

یہاں عاشق ہوتی پھروں گی۔ ویسے بھی جسیم بھائی کے یہاں جانا ہے اور بیٹھ کے بعد میں عشق سے گھبراتے ہیں۔ خیریت کٹی گذری ہوگئی۔

"اے بہن یہ کیا کہہ رہی ہو — کون لڑکی کس کا عشق۔ میں کہتی ہوں تمہاری شادی کیسے ہوئی؟"

"ہاں — ابھی بیچاری کی شادی نہیں ہوئی" آخر کو پہلی مسافرہ پتہ چل ہی گیا نا۔ کتنا مُردی سے کہا آہستہ بول آہستہ — مگر — لیجئے وہ قلعی بھی ہاتھ سے گیا۔

"جب نہیں ہوئی تھی —" میں نے چاہا شاید مان جائیں۔

"اوئی — تو کیا ریل میں بیٹھے بیٹھے ہوگئی"

کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش گرما گرم چائے کے بجائے لوگ بیرا میر کماؤ شوہر بیچتے ہوتے، تو سفر کے لئے تو میں ضرور لے لیتی۔ ہر چاہے — پھر دیکھا جاتا۔ اور میں نے ارادہ کرلیا کہ بھئی ایک ایک مناسب قسم کا میاں ڈھونڈنا چاہئے۔ اب اس میں کیا لوٹتا ہے اپنا۔ ایک ہی رہے گا۔ بلا سے ہر مسافر سے نئے نئے جھوٹ تو نہ بولنے پڑیں گے کہ بھئی کسی نے پوچھا فوراً میاں حاضر۔

"ارے بھئی اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں" وہ میرے مستقبل سے ناامید ہو کر بولیں "موٹر مانگتے ہیں۔ گاڑی گھوڑا دو — اور کمائی کماؤ ہوں جب ہی نا — ایسے ملے جاتے ہیں کماؤ لڑکے"

میں رنجیدہ ہوگئی۔ آخر یہ لڑکے کماؤ کیوں نہیں ہوتے۔ لعنت اچھے لڑکے پہلے زمانے میں کتنے ہوتے تھے، مولی گاجر کی طرح۔ پر اب چاہو کہ آنکھ میں لگانے کے لئے اچھا لڑکا مل جائے نہیں۔ اس لڑائی نے تو اُجاڑ کر رکھ دیا۔ چلو بھئی پہلے لڑکے تو نئے کماؤ تھے یا نکھٹو، پر اب تو جسے دیکھو لڑائی پر چلا جا رہا ہے۔ صاحب یہاں تو بیویاں طعنے دے رہی ہیں اور لڑکے ہیں کہ لڑنے کٹنے پر تلے ہیں۔

"تم پھر شادی کیوں نہیں کرلیتیں" ایک بولی۔

"جیسے آپ کی مرضی" میں نے اس معصوم لڑکی کی طرح جس سے والدین شادی طے کرنے کے بعد روشن خیال بننے کے لئے رائے لیتے ہیں۔

"کب کروگی پھر اب نہیں کروگی تو؟"

"اب — یعنی ابھی — میرے خیال میں — تو اگر جنکشن پر ٹھہر جاتے تو اچھا تھا"

"کیا؟"

"یہی کہ — جب آپ کی مرضی ہے تو پھر کیوں اس نیک کام میں دیر کی جائے"

"کیسا نیک کام؟ کیا کہہ رہی ہے لڑکی؟" بہت ہی گھبرا گئیں۔

"میں نے پوچھا بھئی شادی کیوں نہیں کرتیں تم" دوسری بولیں۔

"تم کیوں نہیں کرتیں شادی — بس؟" میں اب کافی جل اُٹھی تھی۔ حالانکہ ان کا بچہ مسلسل دودھ پی رہا تھا۔ مگر میں نے اُسے نظرانداز کر دیا۔

"اوئی — معلوم ہوتا ہے کچھ دماغ بھی خراب ہے" وہ بچے کو اور واضح طور پر سامنے لائیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ صرف گود میں سو رہا ہے۔

"تو — اچھا تمہاری شادی ہو گئی — کب کی تم نے شادی؟" میں نے بہت بے تکلفی سے پوچھا۔

"ہمارے ماں باپ نے کی ہماری شادی۔ ہم خود کیوں کرتے —"

"تو آپ شادی کے خلاف ہیں — ٹھیک ہے — بالکل ٹھیک — میرے ماں باپ نے شادی کی — جاہل انسان!" اسکے بعد وہ کچھ مکدر ہو گئیں اور غمگین ہو کر ناشتہ دان میں سے امرتیاں نکال کر غم غلط کرنے لگیں۔

اے خدا تو جب دعائیں قبول کرنے پر آتا ہے تو یوں دعا قبول کرتا ہے؟ تیرے بندوں کو کسی کل چین نہیں۔ یہ تیری ناچیز بندی تنہا تھی۔ اس نے دوسرا یت چاہی تو تو نے یوں عذاب کی طرح مسافر نازل کرنا شروع کئے! اور مسافروں سے زیادہ اسباب ویسے بھئی ہمیں کیا حق کہ بے بات تیری مصلحت میں دخیل ہوں۔ مگر پروردگار اتنا تو سوچا ہوتا کہ انسان میں تولے جتنی برداشت دی ہو اتنا ہی بوجھ لاد۔ کہتے ہیں ہم تو بس۔

اور میں دل میں ڈری کہ اگر دعاؤں کے قبول ہونے کا یہی ڈھنگ رہا تو کہیں وہ شوہر کے لئے جو ابھی ابھی دعا مانگی تھی اس کا بھی کچھ ایسا ہی قصہ نہ ہو جائے۔ اور لے چلا چل ایک پہ ایک! میرا تو دم لوٹ جائے گا! میں ایک کے ہی قمیص میں بٹن لگا دوں اور چائے بنا دوں تو بہت جانو۔ مجھ سے بھلا اتنے کا ہے کو جھیلے جائیں گے بجست مٹی ویسے ہی ہوں۔ اب اتنے میاؤں کو کون

میرے جیتے جی کے بکتے گا۔ کہتے ہیں کہ ڈاک خانے میں اگر بھولے سے کوئی غلط خط پڑ جاتے تو تھوڑی سی رشوت دے کر واپس لے سکتے ہیں کاش دعاؤں کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی انتظام ہوتا۔ مگر دعا ایک دفعہ مانگی جا چکی تھی اور سپے در سپے قبول ہو رہی تھی۔

نئی ہمسفر بہت ہی خلیق معلوم ہوتی تھیں اور ضرورت سے زیادہ رقیق القلب۔ کچھ نازک سی شاعرانہ بیماری کچھ آہستہ بولنے کی عادی۔ مجھے اُن پر بے ہات پیار آنے لگا۔

"حیدرآباد جا رہی ہیں آپ؟" انہوں نے بڑے وثوق سے پوچھا کہ میں ڈری کہ انکار کروں گی تو خفا ہو جائیں گی۔ لہٰذا بڑی عاجزی سے انکار کیا اور بتایا کہ بمبئی جا رہی ہوں۔

"احمد آباد سے آئی ہوں گی؟" کس ہوشیاری سے وہ پرانی بوتلوں میں نئی دوا بھر بھر کر سر سہلا سہلا کر پلا رہی تھیں مگر ان کا چہرہ استقدر دو یا ہوا سا کہ دل توڑنے کی ہمت نہ پڑی۔

میں نے بتایا۔

"پڑھتی ہیں وہاں؟"

"جی نہیں انٹرویو کے لئے جا رہی ہوں۔"

"میرے ایک چچا کے سالے کی خالہ بھی بمبئی میں رہتی ہیں — ان سے ملئے گا؟"

میں نے وعدہ کر لیا۔ بھلا میں کہاں اُن کے چچا کے سالے کی خالاؤں کو ڈھونڈتی!

"وہاں آپ کے والد والدہ ہیں؟"

"نہیں — میرے ..." بولنے ہی نہ دیا خود بولیں۔

"اچھا آپ کے شوہر ہوں گے!"

گھن! وہ دیکھئے کھما پھرا کر وہی ایک ٹانگ مرغے کی۔ شوہر — شوہر۔ ہندوستان کے شوہر اس قدر مرکھنے ناکیں کاٹ لیں، طلاقیں دیدیں، بڑی مشکل سے ملیں اور ملیں تو نکھٹو! رنڈی بازی کریں، جوا کھیلیں مگر بیویاں ہیں کہ واری جا رہی ہیں۔ جسے دیکھئے شوہر کے ذکر میں غلطاں، جسے دیکھئے اپنے یا پرائے شوہر کا رونا رو رہی ہے۔ کنواریاں ہیں شوہر کے گیت گا رہی ہیں، بیاہیاں ہیں پریتم پریتم اور یہ پریتم کے تے خوب ٹھکوا تے دے رہے ہیں۔ ان مظالم معشوقانہ پر تو یہ حال ہے، اگر خدا لاڈ کر لیتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں نے سوچا میاؤں کے ظلم میں بھی کچھ مصلحت ہے۔

"کہاں رہتی ہیں آپ بمبئی میں — بچے ہیں آپ کے —

میں تو سوچ میں پڑی تھی اور وہ میاں کے بعد بچوں کی تعداد پر اُتر آئیں۔

"آٹھ" میں نے پلیٹ فارم پر کتے گنتے ہوئے کہا۔ یہ ریلوں کے ساتھ مسافروں سے زیادہ کتے کہاں سے آتے ہیں!

"آٹھ؟"

"ہاں — کیوں آپ کیوں برا مانتی ہیں؟ یقین نہ آتے تو آ کر گن لیجئے۔"

"اب میں راستہ میں کیسے اُتروں — ہاں انشاء اللہ کبھی آنا ہوا میرا چچا کے سالے کی خالہ کے یہاں تو — خیر — مگر بہن معلوم تو نہیں ہوتا منہ سے —"

"منہ سے معلوم ہی کیا ہوتا ہے؟" میں نے فلسفیوں کے انداز میں کہا۔ جب دنیا سے مجھے نفرت ہونے لگتی ہے اور ہر چیز تم مردہ اور اُداس سی معلوم ہوتی ہے تو میرے دماغ میں فلسفہ بھرنے لگتا ہے۔

"شادی کو کتنے برس ہوتے؟" انہوں نے کچھ دیر بعد پوچھا

"چار برس تین مہینے اور —"

"اور آٹھ بچے؟ — اے بہن میں سمجھی تھی چلو ہوں گے — مگر —"

وہ بہت غمزدہ سی ہو گئیں۔ مجھے رحم آگیا مگر میں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ہو جائے اب اور نہیں ولوں گی ورنہ بچوں کے بعد یہ نواسے پوتے بھی میرے سر پر منڈھ دیں گی۔ اور وہ بیویاں جو میرے حال زار سے واقف ہیں آنکھ نہ جھکیں — پھر خواہ مخواہ کی لے دے پڑے گی۔ آٹھ بچوں سے ویسے ہی روح قبض ہوئی جا رہی تھی۔

"ہاں ہاں بچے تو ہوں — آٹھ —"

"ماشاء اللہ سب زندہ ہیں — مگر بہن یہ ہوتے کیسے؟"

"کیسے ہوتے، جیسے دنیا جہان میں ہوتے ہیں ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔"

"میرا مطلب ہے — چار سال میں —"

"ہاں میں بھی — اچھا یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں آپ تو — یہ کہ کبھی دو کبھی تین — اور —"

"ہے ہے" وہ لرزیں۔ اور مجھے برا لگا کہ آخر یہ کون ہوتی ہیں برا ماننے والی۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، آخر انہیں کیا چاہے کوئی ایک بچہ دے چاہے ایک دم دس۔ وہی ہوا جس کا [illegible] جاگ اُٹھے۔

(بقیہ بر صفحہ [illegible])

کرن محل کا بھوت

کرن محل کو کون نہیں جانتا ۔ وہ ہیبتناک اور عظیم الشان ...ن جو ساون گڑھ کے جنوب مغرب میں اس کچی سڑک پر واقع ہے ...گڑھ پور کو جاتی ہے ساون گڑھ سے کوسوں دور ہی کرن محل کے سیاہ ...وس اور قد آدم مینار اور گنبد نظر آنے لگتے ہیں اور راہگیر محسوس ...تے ہیں کہ سامنے الف لیلیٰ کا کوئی منظر اپنے دیووں اور جنوں سمیت ...ن کا انتظار کر رہا ہے۔ دل پر اک بوجھ سا چھا جاتا ہے۔ جسم کی نسیں ...ن جاتی ہیں اور سینے میں دھک دھک ہونے لگتی ہے۔

محل ہیبت رُخ اُس تاریک محرابی صدر دروازے سمیت اک عظیم الجثہ حبشی دکھائی دیتا ہے جو ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان ٹانگ پسارے سو رہا ہو۔ دروازے کے دونوں جانب نانک چندی اینٹوں کی مسلسل دیواریں۔ سیاہ رنگتی ہوئی دیواریں جن میں کہیں کہیں عجیب وضع کی تنگ کھڑکیاں گویا دیواروں پر بڑی بڑی چمگادڑیں لٹکی ہوئی ہوں۔ اور ان دیواروں پر ایک چھایا ہوا گنبد اور اس گنبد پر چیختی ہوئی منڈلاتی ہوئی چیلیں اور گدھ۔

ہاں — کرن محل کون نہیں جانتا۔

حالانکہ محل کا بیشتر حصہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے لیکن اس سے اُن کی عظمت میں ذرا فرق نہیں آیا بلکہ اسی وجہ سے وہ اور بھی ہیبت دکھائی دیتا ہے۔ اور بڑے بڑے صاحب دُور دُور سے اُسے دیکھنے آتے ہیں۔ وہ سارا سارا دن اُن کھنڈرات میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اس کی بناوٹ، دروازوں کی محرابیں، گنبد کی گولائی اور اس کے حمام کی پُراسرار تعمیر کو دیکھتے اور سراہتے ہیں۔ اور پھر ساون گڑھ کے واحد فوٹوگرافر گھنشیا مل کی دُکان سے کرن محل کی تصاویر خرید کر لے جاتے ہیں۔ گھنشیا مل کی دکان پر ان تصاویر کے کارڈ نمائش کیلئے ہر سمت لگے رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے چمکدار کارڈ۔ بڑی بڑی تصاویر کرن محل کا بیرونی منظر۔ پچھواڑے کے کھنڈرات۔ حمام کا اندرونی حصہ [illegible] حمام [illegible] ایک [illegible] کی مدد سے گرم رہتا ہے۔

[illegible] سے [illegible] ہے۔ اس کا مالک [illegible] سے [illegible] تھا کہ کوئی ایک سرداروں سے وہاں [illegible] کرن محل کے مالک [illegible] کہ کوئی [illegible]

لیکن کوئی بھی محل میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اکثر لوگ تو ایک ہی دن کے بعد وہاں سے بھاگ آئے اور اگر کوئی کچھ دیر رہا بھی تو اُسے کسی نہ کسی بدقسمتی سے دوچار ہونا پڑا۔ سردار اندر سنگھ جو ساون گڑھ کے چوہدری تھے اُن کا تو تمام کنبہ دو ماہ کے اندر اندر فنا ہو گیا۔ دو بیٹے ایک بیٹی اور بیوی۔ جبھی تو یہ مشہور ہو چکا تھا کہ کرن محل میں رہنا موت کو دعوت دینا ہے، کہ محل میں جنات اور دیو رہتے ہیں جو اپنی آبادی میں مخل اندازی گوارا نہیں کرتے۔ اس بارے میں کئی ایک روایات اور چشم دید واقعات مشہور تھے۔ "محل میں آدھی رات دیئے جلتے ہیں۔" "کھڑکیاں کھڑکتی ہیں، کٹ گیر چلتے ہیں۔ گانا اور ناچ ہوتا ہے۔ چیخوں کی آواز آتی ہے۔" اور جانے کیا کیا۔

محل کے پچھواڑے پھوس کی جھونپڑی میں محل کا چوکیدار رہا کرتا تھا۔ اُس بڈھے کی شکل بےحد ڈراؤنی تھی۔ گویا کرن محل کی دہشت اُس کے دل سے نکل کر چہرے پر کندہ ہو گئی تھی۔ ملگجے جھرّیوں کے گنبد۔ بھووں تلے گہری اور سیاہ محرابیں۔ اور گالوں پر نانک چندی اینٹوں کی درزیں۔ وہ بڈھا بذات خود ایک جیتا جاگتا اسرار تھا۔ چونکہ ساون گڑھ والے اُس کا نام تک بھی نہ جانتے تھے۔ نہ جانے وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ ساون گڑھ میں وہ مہینے میں صرف ایک مرتبہ آتا۔ اور شام کے دھندلکے میں سودا لیکر چلا جاتا۔ اور بس۔ اُس کی کسی سے میل ملاقات نہ تھی۔ سال میں صرف ایک مرتبہ چٹھی رساں کو اُس کا منی آرڈر دینے کو اُس کی جھونپڑی تک جانا پڑتا۔ صرف ایک دفعہ اس کی سلامتی کا [illegible] سے آئی تھی۔ گاؤں والوں کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُسے چوکیداری کے لئے کیا معاوضہ ملتا ہے۔ لوگ اُس محل کی نسبت اُس بڈھے چوکیدار سے زیادہ خائف تھے۔ البتہ صاحب لوگ جو دور دور سے محل دیکھنے کے لئے آتے تھے وہ بڈھے کو ساتھ لے کر محل میں گھومتے رہتے اور پھر جانے کیا کیا [illegible] محل کے آسیب کے متعلق [illegible]

[illegible] دس سال ساون گڑھ کے [illegible]
[illegible]

قریب سے نہ دیکھا تھا۔ البتہ کبھی کبھار ہم مدرسے کی گراؤنڈ میں سے پڑھے کو محل کے مینار پر یا کوٹھے پر دیکھتے۔ گویا ایک کبڑا سا سایہ متحرک ہو۔ اس سے لڑکے چلا اٹھتے وہ دیکھو "کرن کا بھوت۔ کرن محل کا بھوت" "اسے وہ توجو کیدار ہے چوکیدار" لیکن عجیب بات یہ تھی کہ جب لڑکے اُسے دیکھتے تو وہ سب جوش میں چلاتے اور جب تک وہ سایہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتا وہ اپنی نگاہیں ادھر سے ہٹا نہ سکتے لیکن اس سے میری نگاہیں جھک جاتیں دل دھک دھک کرنے لگتا اور جسم پر منوں بوجھ محسوس ہوتا۔

اپنے گاؤں گرپور سے آتے جاتے ہوئے محل میرے راستے میں پڑتا تھا۔ ہر روز مدرسے جاتے آتے ہوتے دو مرتبہ مجھے کرن محل کے مقابل سے گزرنا پڑتا تھا۔ اوّل تو میں اُس کچی سڑک سے کبھی گزرتا ہی نہ تھا۔ اس کی بجائے میں کھیتوں میں کسی پگڈنڈی سے ہو کر گھر جایا کرتا۔ گو اس طرح مجھے آدھ ایک منزل کی مسافت زائد پڑ جاتی۔ بہرحال محل کے سامنے پہونچکر میری نگاہیں جھک جاتیں۔ میرا دل دھڑکنے لگتا، اور ماتھا پسینے سے بھیگ جاتا۔ اور میں کوشش کرتا کہ مجھ لیول سے ادھر ادھر کی بات کر کے کرن محل کے قرب کے احساس کو بھلا سکوں۔ شام کے بعد تو میں کبھی ادھر سے گزرا ہی نہ تھا اور اسی بات سے بچنے کے لئے میں نے سکول کے کھیلوں میں بھی حصّہ نہ لیا تھا۔

ایک روز نہ جانے کس وجہ سے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمیں مدرسے میں روک لیا۔ شاید انسپکٹر صاحب کی آمد کے لئے تیاری کرنا تھی یا میٹرکلیشن کے لئے زائد لکچر ہونا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں کہ کیا بات تھی۔ مختصر یہ کہ میں نے کئی ایک بہانے کئے منتیں کیں لیکن وہ نہ مانے۔ اس روز ہمیں اندھیرے میں اس سڑک سے گزرنا پڑا۔ اندھیرے میں اور اُس کچی سڑک سے کرن محل کے مقابل سے گزرنے کا وہ میرا پہلا دن تھا۔

اس رات ہوا زوروں پر تھی۔ محل کے آس پاس کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے اور دُور ساون گرہ کی چکی سسکیاں بھر رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہوا محل کے پاس پہونچکر میں نے ایک دہشت سی محسوس کی۔ میری نگاہیں اوپر اٹھیں، معاً محل کی ایک کھڑکی کھلی اور ایک نگوری جیتی شکل نے باہر جھانکا۔ "کرن سنگھ۔ کرن سنگھ" ___ وہ مجھے آوازیں دے رہی تھی، بلا رہی تھی۔ آپ شاید اسے میرا وہم سمجھیں۔ لیکن میں نے ان کانوں سے وہ آوازیں سنیں۔ اُس کی آواز میں اک تڑپ تھی تڑپ۔ ہوس اور قدرے وہ کراہنے لگی۔ اور پھر ___ پھر مجھے معلوم نہیں میں سر پر پاؤں رکھے گاؤں کی طرف بھاگ رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا اور اُس کی آوازیں میرا پیچھا کر رہی تھیں "کرن سنگھ ___ کرن سنگھ نہ جاؤ ___ نہ جاؤ" حالانکہ میں نے مڑ کر نہ دیکھا۔ مڑ کر دیکھنے کی تو مجھ میں ہمت ہی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی اس کے خط و خال مکمل تفصیلات سمیت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ گویا وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ پریشان بال، لمبی سی حساس ناک۔ پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ۔ بیضوی اداس چہرہ اور گہری سیاہ نیم وا آنکھیں۔ میں ڈر کے مارے بھاگ رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود محسوس کر رہا تھا کہ وہ ابھی آکر مجھ سے لپٹ جائے گی۔ ابھی۔ اور اسی احساس پر میرے بدن میں دہشت کے علاوہ عجیب سی کیفیات رواں دواں تھیں۔ ایک بے نام پُر کیف وحشت۔ ایک پُر لذت تناؤ۔ جسم میں چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ گویا میں کسی رنگین "چانی" میں ملوہا جا رہا تھا۔ اُف وہ رات۔ اسی رات سے نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ گویا مجھ میں کوئی رنگین فتنہ جاگ اٹھا۔ میرے سوتے ہوئے جسم میں یوں بیداریاں جاگ اٹھیں جیسے برکھا کے بعد دھنک۔ جیسے دھوئیں کے بعد شعلے۔

اس کے بعد کرن محل اور اُس کی حسینہ میرے دماغ پر مسلط ہو گئے۔ میں نے دُور سے جانا بند کر دیا اور ویسے بھی ہمیں امتحان کی تیاری کے لئے چھٹیاں ہونے ہی والی تھیں۔ میں نے اپنے گھر کے کوٹھے پر چڑھنا بھی بند کر دیا تاکہ مجھے وہ بھیانک گنبد دکھائی نہ دے۔ لیکن اس کے باوجود ہر سمے محل میری آنکھوں کے سامنے منڈلاتا اور وہ آواز میرے کانوں میں گونجتی رہتی۔ گاؤں کی ہر لڑکی کو کسی نہ کسی خط و خال میں مجھے کرن محل کی حسینہ کی جھلک دکھائی دیتی۔ پڑھنے بیٹھتا تو کتاب کی تصاویر کسی طلسم کے زیر اثر کرن محل کے بیرونی منظر میں بدل جاتیں [illegible] کہ محل کی ہر معمولی تفصیل بھی واضح ہو جاتی اور پھر کوئی [illegible] اور کرن محل کی حسینہ اپنا سر نکال کر مجھے اشارے کرتی۔ ہوس ناک اشارے اور پھر ایک تڑپ سے کراہنے لگتی۔ کتاب کے صفحات اس سمے آہوں اور کراہ کی آواز سے گونجتے۔ گویا دور کوئی فاحشہ کراہ رہی ہو یا ہو رہی ہو۔ نہ جانے اُس کی کراہ کو سنکر مجھے فاحشہ کا خیال کیوں آتا تھا مگر [illegible] ایک واضح خیال۔ اس خیال پر میرا جسم [illegible] کی طرح [illegible] کرنے لگتا اور نہ جانے کتنے سوئے ہوئے فتنے بیدار [illegible]

سے میں دیوانہ وار ادھر اُدھر پھرتا۔ مجھے یقین نہ آتا کہ آیا میں خواب
...ہوں یا حقیقت۔ ایک دفعہ اسی وحشت میں شاید میں نے زمانے
سے میں نے اپنا سر دیوار سے دے مارا اور پھر آپ ہی آپ درد
شدت سے بلبلا اٹھا۔

ایک دن جب میں مرحوم پتا جی کے کاغذات کی پڑتال کر
رہا تھا مجھے ان کی بڑی صندوقچی میں سے ایک تصویر ملی جسے دیکھکر
حیران ہو گیا۔ کرن محل کی تصویر۔ اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ
تصویر پر کھڑکی میں ایک لڑکی کی تصویر کاٹ کر چسپاں کی گئی
تھی گویا کسی نے کسی اخبار سے کتر کر گوند سے لگائی ہو۔ وہی لڑکی
کرن محل کی حسینہ۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ میں نے
سمجھا جانے کونسی تصویر ہے جسے میں زبردستی کرن محل دیکھ رہا ہوں۔
لیکن اسی وقت ماتا جی آ گئیں۔ انہوں نے اس تصویر کو دیکھکر آہ
بھری اور پھر نمناک آنکھوں سے آپ ہی آپ بولیں: "بڑے شوق سے
خریدی تھی انہوں نے یہ تصویر"

"کس نے؟" میں نے شوق سے پوچھا۔

"تمہارے پتا جی نے اور کس نے؟" وہ ایک آہ بھر کر بولیں۔

"ماتا جی کس جگہ کی تصویر ہے یہ؟"

"بیٹے یہ اسی کرن محل کی جو اپنے ساون گڑھ میں ہے۔
گھنٹا مل کی دکان سے خرید کر لائے تھے وہ۔"

"اور یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے
پوچھا۔

"بڑے چودھری کی بیوی ہے۔"

"بڑے چودھری؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں ہاں کرن محل کے سردار کرن سنگھ ـــ جنہوں نے
محل بنوایا تھا۔"

"کرن سنگھ" میں نے حیرانی سے چیخ کر کہا۔

"ہاں بیٹے" وہ بولیں "کرن سنگھ کیا صرف تیرا ہی نام ہے۔"

"لیکن ماتا جی یہ چھوٹی تصویر کرن محل پر لگائی کس نے تھی
ـــ پتا جی نے؟"

"تو نے ہی لگائی تھی۔ اس بات پر تو وہ بڑے ناراض ہوئے
تھے۔ بلکہ میں نے کہا تھا ان سے۔ لے بیچارے دیکھئے اب بچہ ہے
تصویر پر کاٹ کر لگا دیا تو کونسی قیامت آ گئی ـــ پھر میں اسے
[illegible] منع کر دیا [illegible] چلو جانے دو آپ، اگر

کرن کی خوشی اسی میں ہے کہ محل کی کھڑکی میں سے یہ لڑکی جھانکتی دکھائی
دے تو میرا کیا ہرج ہے۔ رہنے دو۔ اُکھیڑو نہیں۔"

یہ کہہ کر ماتا جی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ تصویر
اٹھا کر چلی گئیں۔

اگلے روز اسی تصویر کو کمرے میں ٹنگا ہوا دیکھ کر میں چونک
گیا لیکن میں نے ماتا جی سے اسے اتارنے کے لئے نہ کہا۔ اگر ماتا جی
کی خوشی اس بات میں ہے تو میرا کیا ہرج ہے۔ میں نے سوچا آخر
کرن محل کو سامنے ٹنگا ہوا دیکھنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ جب ہر وقت
میں کرن محل میری نظروں کے سامنے پھرا کرتا تھا۔

اسکے بعد اٹھتے بیٹھتے میں اس تصویر کو دیکھتا رہتا۔ گھر والوں کو
لئے وہ تصویر تو ایک ساکن منظر تھا لیکن میرے لئے۔ میرے لئے وہ
متحرک تصاویر کی چادر سے کم نہ تھی۔ اکثر پڑے پڑے جب میں اس
تصویر کو غور سے دیکھتا تو تصویر کا کرن محل پھیلنا شروع ہو جاتا اور
سامنے دیوار پر چھا جاتا اور پھر ـــ پھر وہ کمرہ اور اسکے مکین میری
نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے۔ محل کی حسینہ کی آوازیں صاف سنائی
دیتیں گویا مجھے بلا رہی ہو۔ پھر محل کا صدر دروازہ کھل جاتا اور میں
اس میں داخل ہو جاتا۔ اور اندر پُر اسرار راستوں، برآمدوں اور کمروں
میں کسی کی تلاش میں سرگرداں پھرتا۔ اس سمے میرے بدن میں ہی
وحشت موجیں مارتی۔ وہی پُر لذت تناؤ۔ میری رگ رگ کسی نشتر
کے زیر اثر پھڑکتی۔ اس سمے ماتا جی پریشان ہو کر کہتیں: "کرن،
تمہیں کیا ہو گیا ہے بیٹے، کیسی خوفناک نگاہوں سے دیکھ رہے ہو تم
ضرور پی آئے ہو تم کہیں سے" اور میں چونک اٹھتا اور اپنی وحشت
کو چھپانے کی کوشش میں ادھر ادھر سرک جاتا۔

ان دنوں کرن محل کا سایہ مجھ پر مکمل ہو چکا تھا۔

ایک رات میری وحشت اس حد تک پہنچ گئی کہ میرے
دل میں خوف نام کو نہ رہا۔ میں آپ ہی آپ اٹھ بھاگا ـــ اُف وہ
خوفناک رات۔ جب کبھی مجھے وہ رات یاد آتی ہے تو میرے رونگٹے
کھڑے ہو جاتے ہیں۔

وہ ویران اور مہیب کرن محل کے کھنڈرات اور گنبد۔
گویا کسی مہیب اژدہا کا جھوٹا ہوا پھن۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے
سہمے ہوئے کھیل۔ وہ ساون گڑھ کی عمارتوں کا اک ڈھیر وحشت
کے مارے سمٹا ہوا ڈھیر اُف!

میں اس کی [illegible] محل سے [illegible] پہنچ

سنائی دی۔ ہوس کی دھار میری رگ رگ پر چل گئی۔ اس سے جانے کیا ہوا۔ کوئی میری بغل سے نکل کر میرے سامنے جا کھڑا ہوا۔ شاید میں اسے کوئی راہگیر سمجھ کر کھڑا رہتا۔ مگر جب اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میری چیخ میرے حلق میں سوکھ کر رہ گئی۔ میرے اللہ وہ کون تھا۔ اگر وہ میں تھا تو میں کون ——— میں کون؟ اس کا منہ شہوانیت اور حقارت سے سوجا ہوا تھا۔ اور اس کا وہ فاتحانہ قہقہہ۔ پھر وہ اس محل کی طرف چل پڑا۔ جس کی کھڑکیاں کسی فاحشہ عورت کی طرح ڈرا رہی تھیں، بلا رہی تھیں۔ صدر دروازے کے پٹ کھل گئے اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس گاڑھے اندھیرے میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ کھیتوں میں دبی دبی سرگوشیاں ہو رہی تھیں اور دور ساون گڑھ کا ڈھیر لرز رہا تھا۔ پھر اس محل سے ایک باریک مدھم چیخ سنائی دی۔ گویا کوئی فاحشہ کراہ رہی تھی، چاہ رہی تھی۔ پھر مجھے یاد نہیں اس گاڑھے اندھیرے نے لپک کر مجھے دبا لیا۔ لپیٹ لیا۔

اس واقعہ کے کئی ایک ماہ بعد مجھے اپنے دوست نارنجن سنگھ کا خط ملا۔ وہ اپنے دوستوں سمیت کرن محل دیکھنے کے لئے ساون گڑھ آ رہے تھے۔ لازماً وہ مجھے کرن محل میں لے جائیں گے۔ میں نے سوچا اور اسی ڈر کے مارے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جوں جوں ان کے آنے کا دن قریب ہوتا جاتا میرے دل میں بے چینی بڑھتی جاتی۔

تعجب کی بات ہے کہ میں اس روز ٹھیک وقت پر اسٹیشن کیسے پہونچ گیا۔

جوں جوں ہم محل کے قریب پہونچتے گئے میرے بدن کے بند بند کا تناؤ بڑھتا گیا۔ پُرلذت تناؤ۔ حتیٰ کہ میری وحشت جنون کی حد تک پہونچ گئی۔ پھر میں بھاگ اٹھا۔ "ضرور پی کر آئے ہو تم کرن سنگھ۔" نارنجن نے چیخ کر کہا۔ لیکن میں جواب دینے کے لئے نہ رکا۔ سامنے محل کا دروازہ کھلا تھا۔ یوں کھلا تھا گویا کسی ڈراؤنے محبوب کی آنکھ میں رضامندی کی سیاہی لہریں لے رہی تھی۔ میری رگ رگ اور بھی تن گئی۔ بھویں سر کے بالوں کو چھونے لگیں۔ وہ دیواریں میری نظروں میں سرخ ہو گئیں۔ وہی تنگ و تاریک راستے ——— وہی دالان ——— وہی جالے سے اَٹے ہوئے کمرے ——— اور ——— اور وہی ہال ——— اور ہال میں اس کی قدِ آدم تصویر ——— محل کی حسینہ ——— وہی بکھرے ہوئے بال۔ بھینچے ہوئے ہونٹ اور ——— اور ہوس بھری اداس آنکھیں۔ تصویر میں ایک حرکت ہوئی۔ آنکھیں خوشی تعجب یا خواہش سے چمکیں۔ "تم آ گئے کرن سنگھ۔ تم آ گئے۔"

حنا کوئی مجھ سے لپٹ گئی ———

وہ محل جھول رہا تھا۔ دیواریں گری جا رہی تھیں، ٹکرا رہی تھیں۔ کسی تنی ہوئی سارنگی کے ٹوٹتے ہوئے تاروں میں سے نغمے چیخ رہے تھے۔ پُر کیف بھیانک نغمے۔ پھر میں دھم سے نیچے گر گیا گویا کسی مدہوش کن کیف نے مجھے پچھاڑ دیا ہو۔

سیڑھیوں میں پاؤں کی چاپ سن کر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "اُف میں کہاں ہوں؟" سیڑھیوں میں وہ باتیں کر رہے تھے ———

"سچ کہیار کیا تم نے کرن محل کے بھوت کو دیکھا ہے؟"

"جی میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے، اسے میں اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔ وہ یہاں کسی کو رہنے نہیں دیتا۔ وہ اس محل کا واحد مالک ہے۔ اور ——— اور ———"

بڈھا، نارنجن سنگھ کے سمیت ہال میں آ پہونچا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ منہ زرد پڑ گیا۔ ہاتھ کانپنے لگے ——— "بھوت۔ کرن محل کا بھوت!" اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر بصد مشکل کہا اور پھر دھم سے نیچے گر پڑا ———

"کرن سنگھ؟" نرنجن نے چیخ کر کہا اور وہ سب سیڑھیوں پر گڈمڈ ہو گئے۔

بھوت، میرے دل میں وہ آوازیں گونجیں اور ایک وحشت بھرا قہقہہ میرے منہ سے نکل گیا۔

ہا ہا ہا ہا۔ سارا محل میرے آنے پر ہنس رہا تھا۔ خوش تھا۔

"ممتاز مفتی"

پُجاری

افراد

رانی

مصاحبہ

عاشق

(بلند نعرے اور چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ گویا کوئی حادثہ ہو رہا ہو۔ آہستہ آہستہ شور کم ہوتا جاتا ہے۔ رانی اور مصاحبہ اندر آتی ہیں۔)

رانی۔ نہیں، رہنے دو۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں..... ہمیں کچھ نہیں ہوا۔

مصاحبہ۔ رانی صاحبہ۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟

رانی۔ نہیں۔ بالکل نہیں۔

مصاحبہ۔ لیکن وہ صدمہ! وہ دہشت! ـــ بیٹھ جائیے رانی صاحبہ۔ لیجئے میں آپ کا درباری لباس اتار دیتی ہوں۔ (درباری لباس اتار دیتی ہے۔) آپ کو آرام ضرور کرنا چاہئیے۔ کم از کم پانی کا ایک گلاس تو پی لیجئے۔

رانی۔ اچھا تو پانی لے آؤ۔ لیکن اس میں اور کچھ نہ ہو۔ صرف سادہ پانی ـــ!

(پاس دھری ہوئی میز پر سے مصاحبہ پانی لاتی ہے۔ پانی انڈیلنے کی آواز۔)

مصاحبہ۔ لیکن رانی صاحبہ یہ تو ٹھنڈا ہے۔ اور آپ گرمی سے....

رانی۔ گلاس ہمیں دیدو ـــ تم کانپ رہی ہو۔

مصاحبہ۔ رانی صاحبہ۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ جس وقت گھوڑے بدکے تھے اور اپنے پچھلے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ تو میں کتنی ڈر گئی تھی ـــ ہم سب ڈر گئے تھے۔ خیال تو کیجئے ـــ گاڑی کا الٹ جانا ـــ ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ـــ آپ کا زمین پر گر جانا اور.....

رانی۔ لیکن اتفاق سے ہمیں سنبھالنے والا کوئی وہاں موجود تھا کتنی خوش قسمتی تھی کہ وہ ـــ وہ انسان (ہنستے ہوئے) ہمارا جانثار ـــ ہمارے بالکل قریب تھا۔

مصاحبہ۔ (ناراض ہو کر) درست ہے رانی صاحبہ۔

رانی۔ (تھوڑی دیر خاموش رہتی ہے پھر یکلخت گرمجوشی سے ہنستے ہوئے) ہم اُسے شاہی تمغہ عطا فرمائیں گے۔

مصاحبہ۔ رانی صاحبہ۔

رانی۔ تم ناک بھوں کیوں چڑھا رہی ہو۔

مصاحبہ۔ رانی صاحبہ۔ وہ آدمی غیر مہذب اور گستاخ تھا آپ برا نہ مانیں۔ اس کا رویہ بہت ناروا تھا حضور کی اجازت بغیر آپ کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

رانی۔ لیکن اگر وہ میری گردن کو ٹوٹنے دیتا تو اس کا رویہ زیادہ درست سمجھا جاتا۔ خوب! لیکن یاد رکھو۔ ہر روز ایسا نہیں ہوتا کہ ایک عورت چاہے وہ رانی ہی کیوں نہ ہو ایک جوان مرد کے بازوؤں کی مدد سے اپنی جان کو بچ جانے کا تجربہ حاصل کر سکے۔

مصاحبہ۔ رانی صاحبہ یہ تو ایک دل بہلاوا تھا۔

رانی۔ شاید! ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم اتنے بے مروت نہیں ہیں۔ بیچارہ! ـ اچھا، جو تمہارے جی میں آئے کہو، اسے بدنام کرو۔ تمہیں کون روکنے والا ہے۔

مصاحبہ۔ رانی صاحبہ میں اسے بدنام نہیں کر رہی ہوں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ اس شخص کا، جہاں کہیں آپ جائیں، آپ کا پیچھا کرنا درست نہیں ہے۔

رانی۔ (ہنستے ہوئے) ہمارے سایہ کی طرح۔

مصاحبہ۔ نہیں رانی صاحبہ، ایک جاہل اور بدتمیز انسان کی طرح۔ جو شرافت اور آداب سے واقف نہیں۔ آپ محل سے باہر نکلتی ہیں کہ وہ دوسری جانب پٹڑی پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ آپ مندر میں، تھیٹر میں، باغ میں یا کسی قومی جلسہ میں تشریف لے جائیں وہ وہاں موجود ہوتا ہے پہلی قطار میں ـــ یا اپنی قطار سے بھی آگے۔ جیسے کہ وہ

آج صبح بھی موجود تھا۔
رانی۔ (نرمی سے) ہاں جب گھوڑے بدکے تھے تو ہم نے دیکھا تھا کہ چھ سات درباری بھاگ رہے تھے۔ لیکن نہایت شائستہ انداز میں۔ یہ شائستگی انہیں ہمارے پاس آنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ تہذیب کی گٹھڑیاں جکڑے ہوئے یہ لوگ اچھی طرح بھاگ بھی نہ سکتے تھے۔ اور ہمارا شاہی وجود سخت خطرے میں تھا۔ (ہنستے ہوئے) بیشک اگر وہ آج وہاں موجود نہ ہوتا ــــ
مصاحبہ۔ (طنز سے) ایک کانٹے دار جھاڑی میں دبکا ہوا کسی مزاحیہ ڈرامے کے عاشق کی طرح۔
رانی۔ (نرمی سے) لیکن محبت کانٹے دار جھاڑیوں کا لحاظ نہیں کرتی۔ مزاحیہ ڈراموں کے عاشقوں پر بھی ہنسنا حماقت ہے۔ اس کے علاوہ وہ خاردار جھاڑی ہمیں زعفران کے پودے کی طرح نرم و نازک محسوس ہوتی ہے۔ اس کے کچھ پتے ہمارے ریشمی لباس میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اور انسان اب بھی زعفران کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں جتنی راجپوت کیا کرتے تھے۔ یہ لو۔ تین چار تو یہ رہے۔ ہمارے عاشق کا تاج بنانے کیلئے کافی ہیں۔
مصاحبہ۔ کہیں آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ آدمی آپ کا عاشق ہے؟
رانی۔ کیوں نہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو؟
مصاحبہ۔ وہ بالکل نادار اور اجنبی سا شخص ہے۔ لیکن کیا کہا جا سکتا ہے! شاید وہ ایک ــــ
رانی۔ حکومت کا دشمن ہو۔ (ہنستی ہے) کیسا بیہودہ خیال ہے! ان بیس سالوں میں جن میں وہ ہمارا پیچھا کرتا رہا ہے۔ کیا اُسے ایک موقع بھی ایسا نہیں ملا کہ وہ ــــ
مصاحبہ۔ (سہمی ہوئی) رانی صاحبہ۔
رانی۔ (ہنستے ہوئے) بے ادبی کا اظہار کر سکے۔
مصاحبہ۔ رانی صاحبہ۔ کیا آپ کے خیال میں اس طرح ناجائز طریقے سے آپ کا پیچھا کرنا بے ادبی کا اظہار نہیں۔

(وقفہ)

رانی۔ وہ ہے کہاں؟
مصاحبہ۔ اُسے حراست میں لے لیا گیا ہے۔
رانی۔ بھلا وہ کس جرم کی سزا میں؟
مصاحبہ۔ بغیر اجازت شاہی باغ میں داخل ہونے پر۔
رانی۔ (تیز ہو کر) نہیں بلکہ اپنی رانی کی جان بچانے پر۔

مصاحبہ۔ رانی صاحبہ، قبل از وقت تو اُسے یہ الہام نہیں ہو گیا تھا کہ آپ کی گاڑی اُلٹ جائیگی۔ اور وہ بھی خاص اس جگہ پر....
رانی۔ تو کیا تمہیں یقین نہیں کہ آنے والے واقعات کسی آدمی کو پہلے ہی سے خبردار کر دیتے ہیں؟
مصاحبہ۔ نہیں رانی صاحبہ، میں ایسی باتوں کے لئے اب بہت بوڑھی ہو چکی ہوں۔
رانی۔ (غم آگیں لہجے میں) ہم بھی بوڑھے ہو چکے ہیں، ایسی باتوں کے لئے۔
مصاحبہ۔ رانی صاحبہ!
رانی۔ نہیں تو ــــ ہم کس قدر بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ہم دونوں جانتے ہیں اور دُنیا بھی جانتی ہے۔ اپنی عمر پر حکمرانی کرنا ملکہ کے شاہی اختیار میں نہیں۔ دیکھو، (آئینے کی طرف جا کر) اس آئینے میں ہم کتنے بدصورت دکھائی دیتے ہیں۔
مصاحبہ۔ نہیں رانی صاحبہ۔ آپ حیرت انگیز طور پر جوان ہیں۔
رانی۔ درست ہے۔ لیکن حیرت انگیز باتیں زیادہ دیر تک نہیں رہتیں۔ جب ہم آئینے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں آنے والی جھریوں کا خیال ڈراتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کس کس جگہ پر ظاہر ہوں گی ــــ دیکھو۔ ہماری آنکھوں کی طرف دیکھو۔ ہمارے چہرے کی طرف دیکھو۔ ہم ہنستے ہیں تو وہ اب بھی نمودار ہو جاتی ہیں۔ جب عورت بیس برس کی ہوتی ہے تو کس قدر بے پروائی سے کھلکھلاتی ہے۔ لیکن جب ہم ہنستے ہیں تو اپنے چہرے کو پنکھے سے ڈھانپ لیتے ہیں ــــ (وقفہ) جب ہم چالیس برس کے ہو جائینگے تو حکم دیجئے کہ شاہی محل کے تمام آئینوں کو چکنا چور کر دیا جائے....

(خاموشی...... آہستہ آہستہ گنگناتی ہے)

جسم کے ذرّے ہیں اب سہمے سہمے اور اداس
آشائیں۔ جیسے سوکھے پھولوں کی روکھی باس
رینگ رہا ہے موت کے سایوں کا خاموش ہراس
ہنسنا کیسا گانا کیسا۔ کیسی مست جوانی
سوکھ گیا ہے جوبن کی ندیا کا ہنستا پانی

.... (آہ بھر کر) ہمیں اولاد کی خوشی بھی نصیب نہ ہو سکی۔
مصاحبہ۔ رانی صاحبہ (ہمارے تاپسندیگی کا اظہار کرتے ہوئے) آپ کو ان باتوں کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔
رانی۔ نہیں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن ... (خوشی کے لہجے میں) کیا

(کو)ن شاعر ہو سکتا ہے؟
مصاحبہ۔ شاعر؟!
رانی۔ کیوں نہیں۔ بہرحال ہم معلوم کرلیں گے۔
مصاحبہ۔ معلوم کرلیں گے! وہ کیسے؟
رانی۔ ہم اس سے پوچھیں گے۔ اور اس کا جواب سنیں گے۔
مصاحبہ۔ رانی صاحبہ آپ کا یہ منشا تو نہیں کہ اس سے....
رانی۔ ملاقات کی جائے۔ یقیناً۔
مصاحبہ۔ لیکن رانی صاحبہ وہ ایک حقیر انسان ہے۔
رانی۔ یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ ہم اس سے زیادہ آسانی سے واقفیت پیدا کرسکیں گے ہم اس کا شکریہ ادا کرینگے۔
مصاحبہ۔ رانی صاحبہ۔ آپ کی حکومت سرکاری طور پر اس کا شکریہ ادا کر سکتی ہے۔
رانی۔ لیکن اس نے ہمیں خود بچایا تھا۔ اور ہم اس کا خود ہی شکریہ ادا کرینگے۔ ہم اُسے شرفِ باریابی بخشیں گے۔
مصاحبہ۔ رانی صاحبہ۔
رانی۔ اگر کوئی اور تجویز پیش نہیں کرنا چاہتی ہو تو ـــ
مصاحبہ۔ نہیں جب تک آپ اپنا ارادہ نہیں تبدیل کر دیتیں۔
رانی۔ نہیں نہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ کوئی خطرہ نہیں۔ ہم اس سے تخلیے میں ملاقات کریں گے۔
مصاحبہ۔ جیسا آپ کا حکم۔
(مصاحبہ چلی جاتی ہے۔ رانی آہستہ آہستہ گنگناتی ہے۔)

جب بھی سورج ننھی ننھی کرنیں پھیلاتا ہے
جب بھی رات کو چاند ستاروں کا جھرمٹ آتا ہے
جب بھی ساون کا بادل بھی دھرتی پر منڈلاتا ہے
لیکن میرا جیون ہے شعلے مایوس کہانی....
سوکھ گیا ہے جوبن کی ندی کا ہنستا پانی

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ خادمہ آتی ہے۔)
رانی۔ اندر آنے دو۔
(خادمہ کے جانے کی آواز)
عاشق۔ رانی صاحبہ۔
رانی۔ اندر آجاؤ۔
عاشق۔ رانی صاحبہ۔
رانی۔ ذرا قریب ہو جاؤ۔

عاشق۔ رانی صاحبہ۔
رانی۔ ہم نے تمہیں بلایا ہے۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے کیلئے۔
عاشق۔ میں شکریہ کا مستحق نہیں ہوں رانی صاحبہ آپ حکم دیجئے۔
رانی۔ حسن اتفاق سے تم اسوقت باغ میں چلے گئے....
عاشق۔ ہاں، رانی صاحبہ۔
رانی۔ ہم تمہارے بہت شکرگزار ہیں۔
عاشق۔ نہیں، رانی صاحبہ، نہیں۔
رانی۔ کیوں نہیں۔ ہم تمہارے بہت شکرگزار ہیں۔
عاشق۔ رانی صاحبہ۔
رانی۔ لیکن تم شاہی باغ میں داخل کیسے ہوئے۔
عاشق۔ نہایت آسانی سے۔
رانی۔ اور ہمارے پہریداروں کو پتہ نہ چلا۔
عاشق۔ ہاں رانی صاحبہ، لیکن آپ کے پہریداروں کا قصور نہیں۔ میں پہریداروں کی نظروں سے دور ایک چنار کے درخت کے پیچھے سے دیوار پر چڑھ گیا تھا۔
رانی۔ دن کی روشنی میں۔
عاشق۔ نہیں رانی صاحبہ۔ پچھلی رات۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ لیکن ـــ
رانی۔ لیکن دیوار بہت اونچی ہے۔ تمہیں چوٹ آئی ہوگی؟
عاشق۔ نہیں رانی صاحبہ۔ مجھے دیوار پر چڑھنے کی عادت ہو چکی ہے ـــ!
رانی۔ عادت ہو چکی ہے؟
عاشق۔ ہاں۔ رانی صاحبہ۔ ہر سنیچر کو، کارخانہ اتوار کو بند ہوتا ہے۔ جہاں جی چاہے جاکر سو سکتا ہوں۔
رانی۔ تم رات کھلی ہوا میں گذارتے ہو؟۔ باغ میں ـــ؟
عاشق۔ ہاں گرمی کے موسم میں یہ جگہ بہت خوشگوار ہوتی ہے۔
رانی۔ تو تمہارا مطلب ہے کہ سردیوں میں بھی ـــ
عاشق۔ ہاں بالکل اسی طرح رانی صاحبہ۔ صرف جب بہت ٹھنڈ ہو تو میں بن مانس کے پنجرے میں چلا جاتا ہوں۔ اب آپ نے ان پھولوں کے تختوں کی دوسری طرف رکھا ہی ہے نا۔ آپ گھبرائیں نہیں رانی صاحبہ۔ ہم دونوں، یعنی میں اور بن مانس، گہرے دوست بن گئے ہیں۔ اُسے میٹھے میوے اور بھنے ہوئے چلغوزے بہت بھاتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔
رانی۔ اوہ! کیا یوں بھی ہو سکتا ہے؟ کیا تم خوش رہتے ہو؟

عاشق۔ ہاں رانی صاحبہ۔
رانی۔ لیکن سردی کے موسم میں یوں اپنے آپ کو اس وحشی ساتھی کو، ساتھ خطرے میں ڈالنے کا کیا مقصد ہے؟
عاشق رانی صاحبہ۔۔۔۔ دراصل ـــ میں نہیں جانتا کہ آپ کو بتانا چاہیئے یا نہیں۔
رانی۔ لیکن تمہیں بتانا پڑیگا۔
عاشق۔ رانی صاحبہ۔ ہر رات سونے سے پہلے اور ہر صبح جاگنے کے بعد آپ چبوترے پر تشریف لاتی ہیں۔ شام کے وقت آپ چمکتے ہوئے ستاروں کی جانب دیکھتی ہیں۔ اور صبح کے وقت سفید فاختاؤں کو دانہ ڈالتی ہیں۔
رانی۔ ہاں ہم ایسا کرتے ہیں۔ بیچارے پرندے! ہم اُنکے لئے چند مٹھیاں اناج کی بکھیرنا پسند کرتے ہیں۔
عاشق۔ باجرے کی۔
رانی۔ تم کیسے جانتے ہو؟
عاشق۔ ہوا عموماً کچھ دانوں کو اُڑا لاتی ہے۔
رانی۔ اور تم انہیں چن لیتے ہو۔
عاشق۔ ہاں رانی صاحبہ۔ میرے پاس بہت سی یادداشت کی چیزیں موجود ہیں۔ اناج کے دانے، آپ کے پھولوں کے ہار کی چند پتیاں، جو پچھلے روز جھڑکر گر گئی تھیں۔ ریشم کا ننھا سا ٹکڑا، جو ننھا نقش میں لوہے کی باڑ میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ ایک روپیہ، جسے آپ نے اپنی گاڑی میں سے، ایک چلاتے ہوئے گداگر لڑکے کی طرف پھینکا تھا۔ کچھوے کی ہڈی کا ایک بالوں میں لگانے والا پن، جو ایک صبح کو اناج کے ساتھ باغ میں گر پڑا تھا۔ ایک جوڑا دستانوں کا۔ اور رہ جانے کیا کیا۔ یہ ہے میرا چھوٹا سا عجائب گھر۔ ایک انگریز ایک دفعہ مجھے اسکے عوض تین ہزار روپے دینے کیلئے تیار تھا۔
رانی۔ تو تم نے کیا کیا؟
عاشق۔ رانی صاحبہ۔ دل بیچنے کیلئے نہیں ہوتا۔
رانی۔ تو تم بہت امیر ہو؟
عاشق۔ نہیں رانی صاحبہ۔ ہوں نہیں ـــ تھا ـــ کافی امیر تھا۔ ابھی تھوڑا تھا لیکن اب تو غریب ہوں۔
رانی۔ کیسے تم نے سب سرمایہ کھو دیا ہے؟
عاشق۔ ہاں رانی صاحبہ۔ لیکن اس کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

رانی۔ کیوں نہیں، ہمیں بہت دلچسپی ہے۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ۔۔۔۔
عاشق۔ میں نے سرمایہ کیسے کھو دیا۔ ہاں رانی صاحبہ۔ یہ کوئی بھید نہیں۔ اگر ہو بھی تو رانی صاحبہ۔ میں نے سب کچھ ریلوے کے ٹکٹوں، سمندری سفروں اور ہوٹل کے کمروں پر صرف کر دیا۔ رانی صاحبہ آپ بڑی سیاح ہیں۔
رانی۔ کیا تم میرا پیچھا کرتے رہے ہو؟ لیکن یہ باور نہیں ہو سکتا۔
عاشق۔ نہیں، رانی صاحبہ نہیں۔ سفر بہت مہنگا پڑتا ہے۔ جب تک آپ ہندوستان میں رہیں اتنی دقت نہ تھی۔ لیکن جب آپ انگلستان گئیں۔ اور پھر فرانس کے ملوں پر، اور اسکے بعد امریکہ۔۔۔۔
رانی۔ تو تم بھی ہمارے ساتھ گئے۔
عاشق۔ ہاں رانی صاحبہ۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سفرِ یورپ آپ نے اپنی صحت کی خاطر کیا تھا۔ آپ شاید نہیں جانتیں لیکن ڈاکٹر کہتے تھے کہ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ آپ کیلئے آب و ہوا کا تبدیل کرنا نہایت ضروری تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی صحت بحال ہو گئی۔ شاید آپ سفر ہی میں مر جاتیں ـــــ رانی صاحبہ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ ان حالات کے ماتحت میرا ہندوستان میں رہنا ناممکن تھا۔
رانی۔ ناممکن؟
عاشق۔ ہاں رانی صاحبہ۔
رانی۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ تم اپنا سرمایہ یوں برباد کرتے رہو۔
عاشق۔ رانی صاحبہ آپ اس کا خیال نہ کریں۔ میرے پاس کوئی سونے کی کان تو تھی نہیں۔ چند ایک ہزار۔۔۔ بس یہی کچھ۔ وہ کارخانہ جس کا نام تھا۔ "دودھ اور مکھن کا بہترین کارخانہ" اور جہاں سے آپ کے رسد خانے میں رسد وغیرہ جاتی تھی۔ بیشک۔ تب وہ میرا تھا۔ اب دوسرے کے پاس ہے۔ بس یہی کچھ ہوا۔
رانی۔ لیکن تم ـــ
عاشق۔ میں اب وہاں کا نائب خزانچی ہوں۔ اور حساب کتاب کی پڑتال کرتا ہوں۔
رانی۔ تو تمہاری آمدنی بہت کم ہے؟
عاشق۔ جانے دیجئے، آپ اس کا ذکر کیوں کرتی ہیں۔ یہ ایک ادنیٰ حیثیت ہے۔ ہاں دیکھئے رانی صاحبہ میں اس سے کہیں بہتر حیثیت میں آپ کو دیکھنے کے قابل ہوں۔ اگر مالک نہیں تو کم از کم [illegible] رتبہ اپنے لئے حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن۔۔۔۔۔
رانی۔ لیکن۔۔۔۔۔

شق۔ رانی صاحبہ گستاخی معاف ہیں اپنے کچھ وقت کا مالک آپ
ہا چاہتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے.... خیر، میں نے یہ حیثیت اس
اختیار کر رکھی ہے۔ کیونکہ اس سے مجھے کھانے کو روٹی اور شریفوں
طرح پہننے کو کپڑا مہیا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مجھے اس کام کی خاطر صرف
گھنٹے روزانہ صرف کرنے پڑتے ہیں۔ صبح ساڑھے نو بجے سے لیکر
اڑھے گیارہ بجے تک جس وقت آپ اپنے وزیروں سے مشورہ کرتی
ں۔ رانی صاحبہ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ.....
نی۔ (ہنستے ہوئے) بیشک اس وقت ہم دونوں اپنے اپنے دفتروں
ں کام کرتے ہیں۔
شق۔ نہیں نہیں رانی صاحبہ، آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ مجھ
ی یہ سوچنے کی جرات نہیں ہوتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ اس وقت
ا ذہن زیادہ آزاد ہوتا ہے۔ اور میں اپنا کام کسی دماغی الجھن کے
بر کر سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کہیں باہر نہیں
نیں۔
نی۔ تم کب تک اس قسم کی زندگی بسر کرو گے؟
شق۔ جب تک ہو سکے رانی صاحبہ، اور جب تک آپ منع نہ کریں۔
پ میری باتوں سے ناراض تو نہیں ہو گئیں؟
نی۔ ناراض نہیں۔ لیکن.... تم بہت ناخوش ہو گے۔
اشق۔ نہیں رانی صاحبہ، بالکل نہیں۔ میں بہت.... بہت ہی
ش ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ اتنا خوش نہیں جتنا کہ پہلے تھا۔ کیونکہ
ہ جب آپ راجدھانی سے باہر جاتی ہیں تو میں سفر نہیں کر سکتا۔
فت روپیہ! لیکن خوش قسمتی سے اب آپ سفر کم کرتی ہیں۔ اور
تدیر سے اس سے زیادہ کچھ مانگنا بیکار ہے۔ میں... میں....
یا میں جو تکلیفیں میں نے برداشت کی ہیں آج صبح کے حادثے
ے بعد مجھے ان سب کا صلہ مل گیا ہے۔ رانی صاحبہ، آپ خیال
یں کر سکتیں۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے اس حادثے سے۔ حالانکہ
ں اپنی زندگی نچھاور کر سکتا تھا اس حادثے کو روکنے کے لئے۔
ن میرا مطلب ہے.... رانی صاحبہ.... آپ میرا مطلب سمجھ
ہیں نا؟
نی۔ ہاں ہاں ہم سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ کو رنجیدہ نہ کرو۔ ہم بھی خوش ہیں
تم مجھے مل گئے —
شق۔ رانی صاحبہ
ں۔ کیونکہ... ہم کئی سال سے تمہارے چہرے سے آشنا ہیں۔ ہم

تمہیں بہت مدت سے دیکھ رہے ہیں۔
عاشق۔ آپ مجھے دیکھ رہی ہیں؟
رانی۔ ہاں!
عاشق۔ غالباً آپ نے یہ سمجھا ہوگا کہ میں کسی اخبار کا فوٹوگرافر ہوں۔
رانی۔ نہیں ہم تمہیں ایک شاعر سمجھتے رہے۔
عاشق۔ نہیں رانی صاحبہ، کبھی نہیں۔
رانی۔ کیا تم نے کبھی شعر لکھے ہیں۔
عاشق۔ (مایوس لہجے میں) کیا آپ شعر پسند کرتی ہیں؟
رانی۔ ہاں، ہم پسند کرتے ہیں۔
عاشق۔ اوہ! خدایا! نہیں رانی صاحبہ، نہیں۔ کبھی نہیں۔ (پُرامید لہجے میں) لیکن مجھے یاد ہیں سب نظمیں جو آپ کی بابت چھپی ہیں۔ سالگرہ کی نظمیں، فتوحات کی نظمیں، خیرات کی نظمیں، اور اسی قسم کی کئی اور — بے شمار نظمیں۔ رانی صاحبہ۔ آپ کو بھی یاد ہونگی؟
رانی۔ نہیں وہ نظمیں یاد نہیں۔
عاشق۔ خدایا! تیرا شکر ہے۔
رانی۔ لیکن فکر نہ کرو۔ شعر لکھنے سے ہی آدمی شاعر نہیں ہو سکتا۔
عاشق۔ آپ کا یہ خیال ہے۔
رانی۔ یقیناً۔ ہم شعر لکھیں یا شاعروں کی زندگی بسر کریں۔ (جذبات سے متاثر ہو کر) جاں نثاری، خود فراموشی، سنہری سپنے اور خواب و خیال، اپنی زندگی لٹا دینا، ایک آدرش کے لئے، ناممکنات کے لئے۔ کیا یہ سب چیزیں شاعری — سچی شاعری کا حاصل نہیں —؟
عاشق۔ بیشک رانی صاحبہ، آپ جو کہتی ہیں درست ہے۔
رانی۔ اور تم اس زندگی کے بہت بڑے شاعر ہو۔
عاشق۔ آپ جو کہتی ہیں.....
رانی۔ اور ہم۔ چونکہ تم شاعر ہو۔ ہم اس دن کی یاد میں، اس واقعے کی یاد میں، جو ہماری زندگی کا سب سے نرالا اور خوبصورت واقعہ ہے، تمہارے اس ذخیرے میں جس کا ذکر تم نے کیا ہے، ایک اور چیز کا اضافہ کریں گے۔ ہم نہیں جانتے، تمہاری پاکیزگی تمہاری جاں نثاری یقیناً..... کیا تم یہ ہیرا یادگار کے طور پر ہم سے قبول کرو گے۔
عاشق۔ نہیں نہیں رانی صاحبہ کسی طرح بھی نہیں۔ دراصل، یہ ہیرا — تمہیں نہیں —

"امبوا کی ڈار کوئیلیا بولے"

"بن میں بولے مور — پپیہا —"

"ساجن کیوں نہیں آئے رین"

ساجن کو اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب پاکر متمدن بیوی نے اٹھلا کر پوچھا۔

"تمہیں تو میرا اصلی نام تک معلوم نہیں۔ بھلا تم مجھ سے پوچھتے ہی کیوں۔ اس میں شاید تمہاری شان گھٹ جاتی"۔

"نہیں، بھلا یہ کیا خیال کیا۔ کیا تم مجھے ایسا سطحی آدمی سمجھتی ہو — ہا"

"تو پھر تم نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا کہ میرا نام کیا ہے؟"

"مسز احمد۔ بس اور کیا"

"لیکن یہ تو ایسا نام ہے جو اونٹ کی نکیل کی طرح باندھنا ہی پڑتا ہے۔ عام دیکھنے والے اونٹ کم اور رسی زیادہ دیکھتے ہیں۔ لیکن جنہیں خاص ربط ہوتا ہے وہ اونٹ کی ناک بھی دیکھتے ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ میرا اپنا بھی ایک نام ہے۔ تم مجھے اسی نام سے یاد کیا کرو۔ ہیں۔ نہ"

"ضرور۔ ضرور"

"تو پھر بتا دوں اپنا نام"

"اب بھی انتظار کراؤ گی۔ پریتی"

"ذرا نرالی قسم کا نام ہے۔ شاید تم اسے پسند کرو۔ اس وقت کوئل کے چیخنے سے مجھے اس کا دھیان آگیا۔ میرا — ہاں میرا نام "کوکیلا" ہے"

"کوکیلا!"

"کیوں کیا ناپسند ہے؟ اگر ناپسند ہو تو بدل دو"

"نہیں پریتی یہ نام بڑا رومانٹک ہے۔ میرے دل کو بھاتا ہے"

چاند اور کئی سیڑھیاں اوپر چڑھ گیا تھا۔ شاید کوشش عرش میں کوئی پتے کی بات کہنے کے لئے — مگر چاند تو امین راز ہے۔ کسی کا راز الفت اس نے طشت از بام نہیں کیا۔ گو زمین پر بسنے والوں کے عشق کی نامرادیوں کو دیکھ دیکھ کر اس کا ننھا سا دل کڑھتے کڑھتے داغدار ضرور ہو گیا ہے۔

برساتی گھمس کی وجہ سے پیڑ کے پتے خاموش تھے جیسے مغل عہد میں حاجب و دربان مؤدب و دست بستہ احکام کے منتظر کھڑے ہوں۔

کوئل اپنی وہ تنک چنیں سناتے جا رہی تھی۔

"اچھا اب تمہارا نام تو معلوم ہو گیا۔ کوکیلا — اُف یہ کس قدر سہانا نام ہے۔ اب کچھ اپنی زندگی کے دو چار راز اور بتاؤ مجھے نہ سمجھو۔ پروفیسر صاحب مجھ پر بہت مہربان ہیں وہ مجھ پر کسی طرح گمان نہیں کر سکتے وہ بہت چاہتے ہیں مجھے کوکیلا"

تاریخ حاضرہ کے پروفیسر کی بیوی نے کہا کہ کوئی خاص بات تو اس کی زندگی میں ایسی ہے نہیں جو بتائی جائے، سوائے اس کے کہ اس کے شوہر کی عمر اس سے کوئی پندرہ سال بڑی ہے۔ ان دونوں کی ملاقات یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک ہاکی میچ کے وقت ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور وہ اس طرح یکجا ہو گئے جیسے ایک برج میں دو سعد ستارے جمع ہو جائیں مگر شادی کے بعد بہت جلد انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ ٹوٹنے والے ستاروں کے مانند ہیں جو جلد ٹکرا کر ایک دوسرے سے، ٹوٹ کر زمین پر آ رہتے ہیں۔

پروفیسر ایک خشک طبع، منطقی مزاج اور عالم قسم کا آدمی تھا جسے کتابوں، لکچروں، لڑکوں اور یونیورسٹی کی دو چار گٹ بندیوں کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ کوکیلا پروفیسر کے دوستوں اور ان کی بیویوں کو اپنے ہاں چاء پر بلاتے بلاتے تھک گئی تھی۔ کالج کی سوشل سروس لیگ کی رکنیت سے وہ بہت عرصے سے اکتا چکی تھی ان سب چیزوں میں اسکے دل بہلاوے کا کوئی عنصر نہ تھا۔

پروفیسر کی بیوی نے برجیس (اس کا یہی نام تھا) کے رقابت کے خوف کو ذرا کم کرنے کے لئے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس سے قبل وہ اور کہیں جگہ دل بہلا چکی ہے اس لئے پس و پیش کا صحیح اندازہ ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بس اس سے زیادہ کوکیلا نے برجیس کو اور کچھ نہیں بتائی۔ ایسا کرنے سے چاندنی اور کوئل کی کوک کا سہانا منظر بدل سکے، وہ "اسپائل" ہو جاتا!

برجیس پوری سنجیدگی کے ساتھ عشق کے سمندر میں — یہ جانتے ہوئے کہ تیرنا کیا چیز ہے — غوطے کھا رہا تھا اور ڈوبنے کے خوف سے بے فکر تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ کوکیلا کی ملاقت [illegible] غرق نہیں ہونے دیگی۔ کاش جدید تاریخ کا کوئی پروفیسر یا کوئی [illegible] بیوی اُسے سمجھا سکے کہ تریاق کے بھروسے پہ زہر کھانا عقلمندی نہیں ہے۔

"پروفیسر صاحب ہماری ملاقات پر — میرا مطلب یہ ہے کہ — غصہ تو انہیں نہیں آتا ہوگا۔ کلاس میں تو انہیں غصہ کبھی نہیں آتا۔ گھر کا حال معلوم نہیں"

"غصہ! ہاں کہہ لو ایسا کچھ بہت زیادہ غصہ بھی نہیں آتا،

لیکن اس کی حالت کیسیانی بلّی کی مانند ہے جو دودھ تک نہ پہونچنے پر اُسے گرا دیتی ہے۔ ایسی ہی حالت اس کی بھی ہے۔ اوہ! اگر وہ مجھے اور تمہیں یہاں اس حالت میں دیکھ لے تو بس غضب ہی ہو جائے"

"غضب ہو جائیگا۔ تو پھر میں کیا کروں؟"

"ڈارلنگ تم کس قدر بچے ہو! بس اتنی سی بات میں ڈر گئے۔ بیشک وہ فراخ قلم قسم کا آدمی ہے اور میرے چلن پر شُبہ نہ کرتے ہوئے بھی تجسس نظر ضرور رکھتا ہے۔ خیر، احتیاط اچھی چیز ہے"

"اس وقت بھلا اسے کیا شُبہ ہو سکتا ہے، تم تو ڈاکٹر ماتھر کی وائف کے یہاں آج مدعو ہو نا۔ ایسی شہادت کی موجودگی میں بھلا کیا بدگمانی ہو سکتی ہے"

"بڑی اچھی لڑکی ہے مسز ماتھر۔ کبھی ملائیگے تم سے، برجیس"

خاموشی پھر چھا گئی۔ کوئل نے پھر کوکنا شروع کیا۔

"پیاری کوکیلا — کوکیلا پیاری!" کہتے کہتے برجیس نے اپنے لمبے ہاتھ محبوبہ کی کمر کے گرد اس طرح ڈال دئے جیسے جنبیلی میں عشق پیچاں کی بیل اُلجھ جاتی ہے۔ بعض حلقے کس قدر دوامی اور بعض قیدیں بہ حقیقت ہونے کے باوجود، کس قدر سہانی ہوتی ہیں!۔

دوسرے روز صبح کو جب برجیس دیر سے اُٹھا تو اس کا جسم بادۂ شبانہ کی سرمستی سے چُور چُور تھا۔ بڑی مشکل سے وہ کپڑے بدل کر باہر نکلا اور خیال آیا کہ چلتے چلتے اُسے کوکیلا نے یاد دلایا تھا کہ ٹیلیفون کر کے وقت لے لینا۔

ہوسٹل سے نکل کر اسٹیشن کے پبلک ٹیلیفون پر پہونچکر اس نے جیبیں تلاش کرنی شروع کیں اور کس قدر ستم ہے کہ خود پروفیسر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ٹیلیفون نمبر نکل آیا جو اس نے برجیس کو فسٹ ایر میں آنے کے دو روز بعد ایک پُرانے لفافے پر پنسل سے گھسیٹ کر دیدیا تھا اور کہا تھا کہ "اگر کوئی ضروری کام ہو تو اس نمبر پر رِنگ کرنا" اُسے یہ معلوم کر کے کس قدر اطمینان ہوا کہ "رنگ" کا جواب کوکیلا کی سُریلی آواز نے دیا۔

"ہیلو کوکیلا؟ کیسی ہو میری پرتی؟"

"سُنو، برجیس!" اس کی آواز ذرا سنجیدہ سی تھی، کچھ خوفزدہ سی "میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس وقت تم سے بات نہیں کر سکتی۔ ابھی ابھی وہ کیمپس کی طرف گئے ہیں، لیکن شاید پھر واپس آ جائیں تم ابھی ایک دو روز تک نہ میرے پاس آنا اور نہ فون کرنا — سمجھے نا — میں خود تمہیں فون کروں گی۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے، مجھے کچھ ایسا یقین سا ہو رہا ہے کہ اسکو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔

"ارے! تو غضب ہی ہو گیا!"

برجیس نے محسوس کیا کہ اُسے ایک منٹ کی دق ہو گئی ہے اور جسم کا سارا خون سوکھ گیا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے والے واقعات کی ایک بھیانک تصویر کھنچ گئی۔ جب اس کا باپ سُنے گا تو دوڑا ہوا آئے گا ..... آئے گا اور اسٹیشن سے اُتر کر سیدھا کالج کے ہوسٹل کا رُخ کریگا۔ ملتے ہی جھلّائے گا "ارے برجی! یہ تو نے کیا غضب کیا۔ نالائق تو نے سادات کی عزت خاک میں ملادی، خاندان کو بے آبرو کر دیا۔ اب یونیورسٹی سے نکالا جائے گا" برجیس سوچ رہا تھا کہ اس کا باپ یونیورسٹی سے خارج شدہ بیٹے کو لیکر جب گھر پہونچے گا تو ماں روتے روتے اپنا بُرا حال کر چکی ہوگی! یاخدا یہ کیا ہو گیا — !

"برجیس، ممکن ہے یہ سب میرا واہمہ ہو۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ اُسے شُبہ ہے اور ہے تو پتہ کیسے چلا۔ لیکن آج صبح وہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ چاء پی کر اخبار دیکھنے لگا پھر چہرے پر اخبار کر کے مجھ سے کہنے لگا "میری پیاری! تم بُرا نہ ماننا۔ ایک چیز میں اپنے گھر میں ہرگز نہیں دیکھ سکتا اور وہ ایک ایسی ہستی کی موجودگی ہے جو بچوں کو ورغلائے یا اغوا کرے۔ بچے — خاص کر بڑے بچے۔ ہماری مقدس امانت ہوتے ہیں اور انہیں اچھی طرح رکھنا اور خرچ نہ ہونے دینا ہمارا فرض ہے — خیر۔ اب تو میں جا رہا ہوں گاڑی نکالوں جا کر — پھر مفصل بات کرونگا" — تو بس اتنی بات ہوئی ہے۔ پتہ نہیں کہ آخر معاملہ کیا ہے — اور تو — ہاں! — ایک بات اور یاد آئی۔ ذرا "مہتاب باغ" کی طرف پھر جانا۔ میں وہاں اپنا ہینڈ بیگ رات کو چھوڑ آئی ہوں، وہ اگر مل جائے تو ضرور اپنے پاس رکھ لینا۔ پیارے برجیس! کیا تم یہ تکلیف میرے لئے کرو گے۔ آج اور ابھی ہی جاؤ ورنہ پھر وہ نہ ملے گا اور اس کا ملنا ازحد ضروری ہے۔ میں جب خود تم سے لے لونگی۔ اچھا اب رخصت لوو پروفیسر تا رہا آ رہا ہے! برجیس! خیال رہے کہ جب تک میں اطلاع نہ دوں تم مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا — اچھا کیا تم نے مجھے "رِنگ" کر دیا میرے دل سے ایک بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا — اچھا ڈارلنگ ..... "چیریو!"

برجیس اس جگہ گیا جہاں رات کو وہ آموں کے جھنڈ میں بیٹھے تھے۔ کون ہو سکتا ہے جس نے پروفیسر کو اس کے خلاف رپورٹ دی ہو۔ ممکن ہے اس کے کسی دوست نے اُسے سمجھایا ہو کہ تمہاری بیوی اکثر تو عمر لڑکوں

گریجویٹ لڑکیوں کی اپنے ملکان پہ ضرورت سے زیادہ خاطر تواضع کرتی ہے۔ اگر ایسا کسی نے کہا بھی تو کہا ہے۔ خاص اس کی ذات پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ ابھی اُسے یہاں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ کوکیلا نے خوب اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ جس میں ان کا کوئی جاننے والا تو نہیں تھا۔ اور اگر کسی نے دیکھا بھی تو بھلا رات کو دس گیارہ بجے یا صبح سویرے کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ایسی بات کرنے کے لئے پروفیسر کو فون کرے گا۔ جہاں تک دُنیا کے باقی لوگوں کا تعلق ہے وہ عمر اور صورت سے اس کا بھانجہ، بھتیجہ، لگتا تھا۔

رہ گیا یہ امکان کہ رات کو آم کے پیڑ کے پیچھے پروفیسر تاریخ بیٹھا ہوا ان کے عشق کا تماشہ دیکھتا رہا تھا اور صبح کو طنزاً اس نے اپنی بیوی کو "پیاری" کے لفظ سے خطاب کیا تھا۔ یہ سب خیال بالکل غلط تھے۔ پروفیسر کا اس دور دراز باغ تک بلا وجہ آنا بالکل ناقابلِ تسلیم ہے۔

یہ سب باتیں سوچنے سے برجیس کا دل ذرا ٹھہر گیا۔

جس درخت کے نیچے وہ لوگ رات کو جا کر بیٹھے تھے اس کا معلوم کر لینا کچھ زیادہ دُشوار نہ تھا۔ جھاڑیوں کے قریب ایک ٹوٹی ہوئی بائیسکل پڑی ہوئی تھی، نہ جانے کون اُسے وہاں ڈال گیا تھا۔ حیران تھا کہ یہاں آئی کیسے۔ لیکن اس بائیسکل کی وجہ سے اُسے جگہ پہچاننے میں کتنی آسانی ہوئی۔ بائیسکلیں نہ ٹوٹیں تو لوگوں کو کس قدر تکلیف ہو جائے!

کوکیلا کا ہینڈ بیگ اس نے فوراً پڑا ہوا دیکھ لیا وہ اُسے جھک کر اُٹھا ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی:۔

"سلام حضور!"

"سلام!"

برجیس گھبرا سا گیا۔

سلام کرنے والے کا حلیہ چوکیدار کا سا تھا۔ مگر شکل سے وہ بھلا اور خوش مزاج سا دکھائی دیتا تھا ورنہ آموں کے رکھوالے میٹھے پھلوں کے درمیان رہنے کے باوجود بہت ترش اور کڑوے ثابت ہوتے ہیں!۔

"آج کا موسم صبح سے ہی اچھا ہے۔ شاید بارش پھر ہو!"

"ہاں۔ واقعی۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ میں بغیر اجازت اس باغ میں آگیا ہوں کوئی منع تو نہیں کریگا؟"

"نہیں صاحب! آپ فکر نہ کریں یہاں تو اکثر شوقین لوگ سیر تفریح کے لئے آتے رہتے ہیں مگر ذرا دور جگہ ہے۔ کل شام کو بھی بہت سے بابو لوگ لاری میں آئے تھے اور یہاں جہاں آپ کھڑے ہیں نا، وہ لوگ ریڈیو لگا کر چلے گئے۔ پھر ایک افسر آیا اُس نے بجلی وجلی سی لگائی۔ میں سمجھا آپ بھی شاید ریڈیو دیکھنے آئے ہیں۔"

برجیس نے اشارے کی طرف غور کر کے دیکھا تو آم کے جھنڈ میں ایک شاخ پر "اے۔ آئی۔ آر" چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک جگہ آم کی شاخ میں مائیکروفون بھی لٹک رہا تھا۔

"یہ ہے صاحب! یہ ــــ پتہ نہیں اِسے کیا کہہ رہے تھے وہ ــــ اکڑ فوں یا مکڑ فوں! رات سے یہ لٹک رہا ہے۔ کوئلیں یہاں بہت بولتی ہیں صاحب۔ ان کی آواز ریڈیو والے لینے آئے تھے ــــ میں نے تو اندر کوٹھی میں جا کر سُنا۔ سردار جی کہنے لگے کہ اتنی صاف آواز آ رہی ہے کہ جیسے کوئلیں ریڈیو ہی میں بیٹھی کوک رہی ہوں۔ اور پھر ادھر اُدھر کی آوازیں۔ جیسے جھینگروں کی، مینڈکوں کی، اور نہ جانے کیا کیا اناپ شناپ آوازیں ملی جلی آ رہی تھیں۔ مجھے تو ایسا مزا آیا کہ برابر سنے گیا۔ کمال کر دیا ہے انگریزوں نے۔ بابو جی آپ نے بھی سُنا تھا ریڈیو ــــ رات کو شاید آپ ریڈیو نہیں سنتے؟"

ظفر قریشی دہلوی!

ٹیگور

(مہارشی ٹیگور کی پہلی برسی پر)

تجھے ماں کہتے ہوئے عار مجھے آتی ہے
مادرِ ہند میں اب اور نہیں سُن سکتا
جا! کہ اغیار سے وابستہ ہے دامن تیرا
بوئے غیر آتی ہے ہر آب تیرے پسینے سے مجھے۔
کیا نہیں سات سمندر میں بھی اتنا پانی
کہ تجھے صفحۂ ہستی ہی سے ناپید کرے؟
تجھ کو آغوش میں تا حشر چھپائے رکھے؟
کیا ہمالہ کے دلِ سرد میں غیرت ہی نہیں
کہ ترے بس بھرے سینے پہ اُگل دے لاوا
اور مٹ جائے ترا نام ہمیشہ کے لئے؟
تو نجس ہے، تری عصمت، تری غیرت کیا ہے!
تجھ کو اپنوں کے تو آنسو ہی پسند آتے ہیں
اور غیروں کے شرارے بھی ستارے ہیں تجھے۔
دیکھتے ہی جسے کھِل جاتی ہیں باچھیں تیری
کون سی بات ہے اُس میں جو نہیں ہم میں ہیں؟
اُسکی ماں نے بھی کوئی ایسا جنا ہے ٹیگور
ایسا تھا کہ جو پرستش کرے اپنی ماں کی؟
زندگی کا وہ فلک سیر درخشندہ شہاب
جس سے دوچار نہ ہو سکتی ہوں آنکھیں اپنی؟
تیرے سوتیلوں میں ہوتا اگر ایسا انساں
جانئے کیا اُسے سرخاب کا پر لگ جاتا!

(۲)

سات اگست سے تھا بنگال کا ساحر شاعر
بیس اگست سے وہ روتوں کو ہنسانے والا
سات دن بیت چکے جہاں بھر کو رُلا دیا
ایک سے تھیں مری بھوک نہیں مٹ سکتی
کر دی تو نے مجھے وراثت میں بس ایک آنکھیں۔
اُف تری بھوک۔ تری بھوک نہیں مٹ سکتی۔

(۳)

مجھ پہ ناراض نہ ہو ماں میں ترا بیٹا ہوں
بھول تھی میری کہ میں نے تجھے اتنا کوسا
اور افسوس! تجھے اتنی سمجھ بھی تو نہ تھی
تیرے ہی بیٹے تجھے روتے ہی جتا تھا اُن کو
تیرے ہی آنکھ کے تارے تھے، جگر پارے تھے۔
دیکھ! وہ تارے ترے جاکے فلک پر چمکے
جگمگا اٹھا فلک اُن کی ضیا باری سے۔
وقت کی بات تھی وقت آیا وہ روپوش ہو۔
ماں ترے بچوں نے دنیا میں بڑا نام کیا
یہی تو ایک صفت دائم و قائم ہے تری
مونگ دلتے رہیں اغیار ترے سینے پر
تری عصمت، تری ناموس پہ حملے ہوں مگر
کوکھ سے تیری جنم لیتے ہیں ایسے بچے
جنکے ہمسایوں کو بھی موت نہیں چھو سکتی۔

یوسف ظفر

پژمردگی

آج احساس میں وہ پہلی سی شدت ہی نہیں!
بُجھ گیا جیسے میرے شوق کا پُر نور چراغ
شوق کیا۔۔ اب تو بجھی جاتی ہے خود شمعِ حیات؟
ایک سیلاب اُمنگوں میں بھی آتا تھا کبھی
ایک نغمہ سا تمنّا نے بھی گایا تھا کبھی
رشکِ فردوس تھی جب میری یہ پژمردہ حیات؟
لیکن اب اور ہی عالم میں ہے پرواز مری
وقت کے تند رو طوفان سے لڑتا ہوں میں
اک نئی دنیا بسانے کے لئے
ایسی حالت میں کہاں اب میرے دل بنا رہے ہیں!
وقد اک ستارہ نظر آتا ہے مجھے
[illegible]

جھلملاتا ہے جو اس طرح فضا میں ہر دم
جس طرح مسکیاں لیتا ہے چراغِ سحری،
دُور تک چھائی ہوئی تاریکی
جس کو آغوش میں بڑھ بڑھ کے لئے لیتی ہے!
میرے ارمانوں میں اک لرزش ہے
کپکپاتی ہے تمنا میری؟
پھر بھی اک چاندنی کی راگنی گاتی ہے
چوم لیتی ہے مری سرد سی پیشانی کو،
لیکن میں چُپ ہی رہا کرتا ہوں
ولولے موت کی آغوش میں ہی سوتے ہوئے
بجھ گیا جیسے مرے شوق کا پُر نور چراغ،
آج احساس میں وہ پہلی سی شدت ہی نہیں!

عبادت بریلوی

تضیع اوقات

آئے نہیں خوش پوش خوش اطوار مرے دوست
تکتا ہوں میں بیٹھا ہوا رہ دیر سے اُن کی
وعدہ تھا کہ ہوں گے سبھی ہوٹل میں اکٹھے
بھرتا ہوں میں، زنگش بلوننیڈہ کے دو گھونٹ
عشرت سے میں اس چیز کے پینے کا ہوں عادی
اکثر مجھے ہو جاتی ہے کھانسی کی شکایت
دلچسپی کے سامان نگاہوں سے ہیں اوجھل
جلتی ہوئی سڑکوں کی طرح آنکھیں ہیں ویران
آئے نہیں خوش پوش خوش اطوار مرے دوست
تکتا ہوں میں بیٹھا ہوا رہ دیر سے اُن کی

ہوٹل کی چمکتی ہوئی دیوارِ حسیں کو
چھوتی ہوئی بہتی ہے عفونت بھری نالی
مکروہ غلاظت سے سیہ رنگ ہے پانی
یہ پانی کبھی صاف تھا انوارِ سحر سے
بن سکتا تھا پیاسے کے لئے رحمتِ باری
جچتی نہیں اب اس کے تکدر پہ نگاہیں
ہر قسم کی، ہر رنگ کی ہے اس میں غلاظت
عصیاں کی طرح میلا ہے پانی کا مقدر
دنیا میں ہے بکھری ہوئی کس درجہ نجاست
پڑ جاتی ہے آئینے پہ کچھ گرد کدورت
جلتی ہوئی سڑکوں کی طرح آنکھیں ہیں ویراں
جلوت میں وہ خلوت ہے کہ کٹتا ہی نہیں وقت

پانی کو بڑے غور سے میں دیکھ رہا ہوں
طوفاں سے بھی ہے تیز تخیل کا بہاؤ
دلچسپی کے سامان ہوتے جاتے ہیں پیدا
جاری ہے مرے سامنے صد رنگ تعفن
اک چیتھڑا پانی میں ہے ڈوبا ہوا آدھا
جس پر ابھی تک خون کے دھبے ہیں نمایاں
کس درجہ طرب خیز ہے اعجازِ تصور
کیا دیکھتا ہوں شہر کی دوشیزۂ چالاک!!
جس پر ابھی چھایا ہے نیا رنگِ جوانی
حیراں ہے جو تیہ ملی ہر کیف پہ اپنی
کھڑکی میں سے لوگوں کی نگاہوں سے بچا کر
اک چیتھڑا شرماتی ہوئی پھینک رہی ہے
وہ چیتھڑا جس پہ ہیں جواں خون کے دھبے
پانی کو بڑے غور سے میں دیکھ رہا ہوں
دلچسپی کے سامان ہوتے جاتے ہیں پیدا

رنگین ہے پُر اسرار ہے پانی کا تعفن
پانی میں حسیں جسموں کا ہے میل بھی شامل
مہکی ہوئی زلفوں کا جھکتی ہوئی کچھ میل
کم کرتا ہے پانی کے بہاؤ کا تعفن
اعجازِ تصور ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں
گدرائے ہوئے، بھیگے ہوئے جسم نہاتے
میں قلعے بنائے چلا جاتا ہوں ہوا میں
بھرتا چلا جاتا ہوں نجاست میں کئی رنگ
بہتر نہیں اس شغل سے خلوت کا کوئی شغل
آئے نہیں خوش پوش، خوش اطوار مرے دوست
تکتا ہوں میں بیٹھا ہوا رہ دیر سے ان کی،
جلتی ہوئی سڑکوں کی طرح آنکھیں ہیں ویراں

مخمور جالندھری

مورتی کی آنکھ

افرادِ تمثیل

(۱) رام سنگھ
(۲) سکھدیو پرشاد
(۳) کنول کشور
(۴) پریم ناتھ
} سیاح

(۵) کلش دیوی کا پہلا پجاری
(۶) کلش دیوی کا دوسرا پجاری
(۷) کلش دیوی کا تیسرا پجاری
(۸) کلش دیوی

ویرانے میں ایک اُجاڑ سرائے کا کمرہ

(پریم ناتھ اور سکھدیو باتیں کر رہے ہیں۔ رام سنگھ اخبار پڑھ رہا ہے۔ کنول الگ ذرا فاصلہ سے بیٹھا ہے۔)

پریم۔ (آہستہ سے) سکھدیو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے —؟

سکھدیو۔ مجھے کیا معلوم۔ میں خود حیران ہوں، پریم۔

پریم۔ اور بھلا کب تک ہمیں یہاں اور ٹھہرانا چاہتا ہے؟

سکھدیو۔ آج تین دن تو ہو گئے ہمیں یہاں۔

پریم۔ سوائے ہمارے چڑیا کا بچہ تک بھی یہاں دکھائی نہیں دیا۔

سکھدیو۔ یہاں تنہائی میں دم گھٹا جاتا ہے۔ آخر کتنے دن ہمیں یہاں رہنا پڑے گا پریم؟

پریم۔ کچھ بتاتا ہی نہیں وہ۔

سکھدیو۔ پوچھو تو سہی اُس سے۔

پریم۔ (اونچی آواز میں) رام سنگھ! ہمیں یہاں اور کتنے دن ٹھہرنا ہوگا؟

سکھدیو۔ سنتا ہی نہیں۔ اخبار پڑھے جاتا ہے۔ بھی غضب کا آدمی ہے۔

پریم۔ بڑا سر پھرا ہے۔ کبھی چوکتا ہی نہیں۔

سکھدیو۔ یہ جو بڑے سر پھرے ہوتے ہیں نا یہی داؤ کھا جاتے ہیں اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ چالیں اور گھاتیں تو انہیں خوب آتی ہیں لیکن جب کام کا وقت آتا ہے تو سب کیا دھرا رکھا رہ جاتا ہے اور ہم تم سے بھی زیادہ نادانی کر جاتے ہیں۔ تم جیسے کہ سب ستیاناس ہو گیا تو پھر یہاں کام کیسے چلے گا؟

... مجھے بیٹھ پسند نہیں آتی۔

پریم۔ کیوں؟

سکھدیو۔ بس کچھ اس کا موقع ایسا ہے کہ مجھے ناپسند ہے۔

پریم۔ وہ ہمیں یہاں اس لئے لایا ہے کہ زرد شیطان ہمارا کھوج نہ نکال سکیں۔ وہی تین پجاری جو ہمارے پیچھے لگے ہوتے ہیں۔

کنول۔ (قریب آتے ہوئے) مگر سُنو تو سہی پریم، اس میں تو کوئی عقلمندی کی بات ہے نہیں۔

پریم۔ ہے کیوں نہیں کنول؟

کنول۔ کیونکہ میں نے تو کلکتہ ہی میں انہیں چکما دے دیا تھا۔

پریم۔ تم نے ان زرد شیطانوں کو چکما دے دیا تھا؟

کنول۔ ہاں اُن تینوں کو جن کے ماتھوں پر سفید ٹیکے لگا ہے مجھے جب کلکتہ میں انہیں چکما دیا ہے تو لعل میرے پاس تھا۔

پریم۔ لیکن تم اُن سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب کیسے ہوئے کنول؟

کنول۔ لعل میرے پاس تھا اور وہ میرا پیچھا کر رہے تھے...

پریم۔ اُن شیطانوں سے یہ کس نے کہا کہ لعل تمہارے پاس ہے؟ تم نے انہیں دکھایا تو نہیں تھا نا؟

کنول۔ نہیں، دکھایا تو نہیں تھا لیکن کچھ انہیں معلوم ہی تھا۔

سکھدیو۔ کیا کہا کنول، کچھ انہیں معلوم ہی تھا؟

کنول۔ ہاں، اگر تمہارے پاس ہو تو انہیں معلوم ہی ہو جاتا ہے۔ خیر تو وہ میرے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح لگے رہے۔ آخر میں نے ایک ٹیکسی والے سے کہا یہ تینوں آدمی مشتبہ ہیں جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہیں، مگر وہ کمبخت کہنے لگا "یہ تو غریب جاتری ہیں، ان سے کوئی اندیشہ نہیں کیا جا سکتا"۔ مجھے عجیب خیال آتا ہے کہ ... [illegible]

کے ساتھ کیا کیا تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیوں یاد ہے سکھدیو؟

سکھدیو۔ ہاں ہاں اور اُس سے پہلے لاسا میں سٹیشن پر کیا گزری تھا

اُفوہ!

پریم۔ کنول تم نے اُنہیں گرفتار کیوں نہیں کرا دیا؟

کنول۔ اور کیوں پریم، پھر لعل کیسے چھپتا؟

پریم۔ ہاں، پھر تو ہم کہیں کے بھی نہ رہتے۔

کنول۔ خیر میں نے ایک اس سے بھی اچھی تدبیر سوچی۔ میں نے بازار میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا اور جیسے ہی موڑ آیا کہ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ جو تکڑ دکھائی دیا وہیں سے مڑ گیا۔ کبھی مڑنے کے بجائے سیدھا ہی نکلا چلا گیا۔ غرض وہ چکر دیا ہے کہ پجاریوں کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلے۔ پھر میں ایک جگہ بیٹھ گیا کہ دیکھوں کہ وہ اب بھی آ رہے ہیں یا نہیں۔ نہ شیطان نہ فرشتے۔ کوئی بھی نہیں آیا۔

سکھدیو۔ کیا کہا؟

کنول۔ سفید ٹیکوں والے زرد شیطانوں میں سے ایک بھی نہیں آیا۔ کھا گئے چکما بس اور کیا۔

پریم۔ شاباش کنول شاباش۔

سکھدیو۔ (اطمینان کا سانس لیکر) تم نے ہم سے آجتک اس کا ذکر ہی نہیں کیا؟

کنول۔ کہتا کیا۔ رام سنگھ اپنے آگے کسی کی سنتا ہی نہیں۔ وہ اپنے ہی منصوبے گھڑا کرتا ہے اور ہم سب کو بے وقوف سمجھتا ہے۔ اپنے آگے تو کسی کو گردانتا ہی نہیں، حالانکہ میں نے وہ گھستا دیا ہے کہ پجاری بھی ساری عمر یاد ہی کریں گے۔ دعا دو میرے دم کو سب کی جان بچ گئی۔ جو میں کلکتہ میں اُن کو چکما نہ دوں تو اب تک رام سنگھ کے دل میں ایک چھری پیوست ہو چکی ہوتی۔

پریم۔ شاباش کنول شاباش۔

سکھدیو۔ (اونچی آواز میں) سنتے ہو رام سنگھ؟ کنول نے زرد شیطانوں کو گھستا دیدیا۔

رام سنگھ۔ ہاں سن رہا ہوں۔

سکھدیو۔ تو پھر کیا رائے ہے تمہاری؟

رام سنگھ۔ ہاں خوب کیا کنول۔

کنول۔ اور رام سنگھ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

رام سنگھ۔ انتظار۔

کنول۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انتظار کس کا ہے۔

سکھدیو۔ خراب جگہ ہے یہ۔

کنول۔ بیوقوف بنتا ہے اور کچھ نہیں پریم۔ ہمارا روپیہ پیسہ سب خرچ ہو چکا۔ اب ہمیں لعل بیچنا ہے۔ کسی شہر میں چلنا چاہیئے۔

پریم۔ لیکن رام سنگھ تو چلتا ہی نہیں۔

کنول۔ نہیں چلتا تو ہم اُسے چھوڑ جائیں گے۔

سکھدیو۔ اگر ہم کلکتہ سے دور ہی رہیں تو ٹھیک ہے۔

کنول۔ ہم دلی چلتے ہیں۔

پریم۔ لیکن رام سنگھ کو اُس کا حصّہ تو ملنا چاہیئے؟

سکھدیو۔ ضرور ملے گا۔ پہلے ہم یہاں سے چلیں تو سہی۔ (اونچی آواز میں) سنتے ہو رام سنگھ۔ ہمیں لعل دے دو۔ ہم دلی جا کر اُسے بیچتے ہیں۔

رام سنگھ۔ بالکل ٹھیک۔ یہ لو۔ (لعل دیتا ہے)

کنول۔ دیکھو سکھدیو، ذرا اِس کا رنگ تو دیکھو۔ پریم دیکھتے ہو؟ دیکھا ہے کبھی مرغی کے انڈے کے برابر لعل؟ کیا جلا ہے کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ چلو چلو سکھدیو۔ (کنول اور سکھدیو جاتے ہیں۔)

پریم۔ اچھا رام سنگھ رخصت۔ ہم تمہیں تمہارا پورا حصّہ دیں گے۔ تم اکیلے یہاں کیا کرو گے۔ کوئی دلچسپی کا سامان نہیں۔ نہ حسن نہ نغمہ ہمیں لعل فوراً بیچ ڈالنا چاہیئے۔

رام سنگھ۔ پریم، میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔

پریم۔ نہیں نہیں۔ یہ کون کہتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ تم نے تو ہماری بڑی مدد کی ہے۔ اچھا رخصت۔ لو میں بھی چلتا ہوں۔

رام سنگھ۔ رخصت۔ (پریم جاتا ہے)

(رام سنگھ گنگناتا ہے۔ بے معنی گانا)

(بھاگ کر آنے کی قدموں کی آواز)

سکھدیو۔ (ہانپ کر) ہم — ہم واپس آ گئے رام سنگھ۔

رام سنگھ۔ (مطمئن) اچھا! کیوں؟

کنول۔ رام سنگھ، وہ یہاں کیسے آ گئے؟

رام سنگھ۔ چل کر ہی آتے ہونگے۔

کنول۔ لیکن اسّی میل کا فاصلہ ہے!

سکھدیو۔ رام سنگھ کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں آن پہونچے ہیں؟

رام سنگھ۔ اُن کا انتظار کر رہا تھا۔

کنول۔ اسّی میل!

پریم۔ رام سنگھ بھیا۔ اب ہم کیا کریں؟
رام سنگھ۔ کنول سے پوچھو۔
پریم۔ اگر وہ اس طرح پیچھا کر سکتے ہیں تو ہم کسی طرح نہیں بچ سکتے
لیکن تم رام سنگھ —— مجھے ہمیشہ یہ یقین رہا ہے کہ تم بہت ہوشیار
اور عقلمند ہو۔ اب ہم کوئی بے وقوفی کی حرکت نہیں کریں گے۔ بس تمہارا
ہی کہنا مانیں گے رام سنگھ۔
رام سنگھ۔ تم لوگ کافی بہادر اور قوی ہو۔ ایسے کتنے آدمی ہیں جو
کسی مورتی کی پیشانی میں سے لعل کی آنکھ چرا لیں؟ اور مورتی بھی ایسی
کہ جسے دیکھنے سے خوف آئے۔ رات کی بھیانک تاریکی میں ایسا کام
کرنا معمولی دل گردے کے آدمی کا کام نہیں ہے۔ پریم تم کافی بہادر
ہو۔ لیکن تم تینوں کم عقل ہو۔ بلونت نے میری بات نہیں مانی۔ اور اب
بلونت کہاں ہے۔ اور ستیش نے میرا کہا نہیں مانا تو اس کا کیا
حشر ہوا؟۔
سکھدیو۔ رام سنگھ اس وقت تو ایسی باتیں مت کرو۔
رام سنگھ۔ تمہاری قوت بالکل بیکار ہے۔ دیکھ لیا تم نے؟ تمہیں عقل
کی ضرورت ہے۔ ورنہ تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو بلونت اور ستیش
کا ہوا۔
سب۔ آہ!
رام سنگھ۔ وہ زرد پجاری ساری دنیا میں تمہارے گرد تاوے
کاٹتے رہیں گے، مہینوں، برسوں، جب تک کہ مورتی کی آنکھ تم سے
واپس نہ لے لیں گے۔ اور اگر ہم مر جائیں گے تو ہماری اولاد اور اولاد
کی اولاد کا بھی پیچھا نہ چھوڑیں گے۔ یہ گدھا یہ سمجھتا ہے کہ کلکتہ کی تین
گلیوں میں سے بھاگ کر اِن خبیثوں سے چھٹکارہ پا لیا ہو۔
کنول۔ رام سنگھ آپ نے بالکل سچ کہا۔ ہم انہیں دھوکا نہیں دے
سکے۔ وہ یہاں آ گئے ہیں۔
رام سنگھ۔ یہ تو میں پہلے ہی سمجھا ہوا تھا۔
کنول۔ تمہیں معلوم تھا؟
رام سنگھ۔ ہاں، یہ ضروری نہیں کہ اُن کے آنے کی خبر اخباروں
میں شائع ہو تب ہی اُن کا صحیح خیر مقدم ہو سکے گا۔ زمین کھود دو تو یہاں
کافی گنجائش نکل سکتی ہے۔ آبادی سے دور یہ ویرانہ بہت مناسب
جگہ ہے۔ آج میں انہی کا منتظر تھا۔
پریم۔ بہت گہرے ہو تم رام سنگھ۔
رام سنگھ۔ اطمینان رکھو کہ تم میں اور تمہاری موت میں صرف میری

عقل حائل ہے۔ اس لئے اپنے بیکار منصوبوں کو اپنے تک رکھو تم نہیں
جانتے کہ ایک تعلیم یافتہ شریف کیا ہوتا ہے۔
کنول۔ اگر تم شریف ہو تو شریفوں میں کیوں نہیں جا ملتے۔ ہم جیسوں کے
ساتھ کیوں رہتے ہو؟
رام سنگھ۔ کیونکہ جیسے تم سے بہت زیادہ عقل رکھتا ہوں اُن سے بھی
زیادہ عقل رکھتا ہوں۔
کنول۔ اُن سے بھی زیادہ عقل؟
رام سنگھ۔ ہاں۔ میں اپنی عمر میں ایک دفعہ بھی تاش کی بازی نہیں ہارا۔
پریم۔ کبھی نہیں ہارے؟
رام سنگھ۔ جب شرط بھی لگائی گئی ہو تو کبھی نہیں ہارا۔
پریم۔ خوب، خوب۔
رام سنگھ۔ آؤ لگاتے ہو کچھ؟
سب۔ نہیں، نہیں۔
رام سنگھ۔ تو پھر جو تم سے کہا جائے اُسے مانو۔
پریم۔ ہاں ہاں رام سنگھ، ہم ضرور تمہارا کہا مانیں گے۔
سکھدیو۔ جب میں باہر نکلا تھا تو میں نے کچھ دیکھا ضرور تھا۔ کیوں نہ ہم
دروازے بند کر دیں؟
رام سنگھ۔ نہیں۔
سکھدیو۔ کیا؟۔
رام سنگھ۔ دروازے مت بند کرو۔
سکھدیو۔ اچھا اچھا۔
پریم۔ مگر سنو تو رام سنگھ۔ وہ ہمیں باہر سے دیکھ سکتے ہیں۔ دشمن
اتنا موقع کون دیتا ہے؟ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ دروازے۔۔۔
رام سنگھ۔ ہاں، تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔
پریم۔ اچھا اچھا رام سنگھ۔ چلو یونہی سہی۔ مگر ہم اپنے اپنے طمنچے تو
نکال لیں۔
رام سنگھ۔ نہیں۔ طمنچوں کا کوئی کام نہیں ہے۔ انہیں واپس اپنی
جیبوں میں رکھو۔
کنول۔ یہ کیوں؟
رام سنگھ۔ کیونکہ میں یہاں اودھم نہیں مچانا چاہتا۔ شور سن کر شاید
کوئی آ جائیں جنہیں ہم بلانا نہیں چاہتے۔ البتہ چھریوں کی اجازت ہے
ٹھہرو ٹھہرو۔ ابھی نہیں۔ لاؤ لعل مجھے دو۔
کنول۔ یہ لو رام سنگھ۔

پریم۔ رام سنگھ، رام سنگھ، وہ آ رہے ہیں۔
رام سنگھ۔ ابھی نہیں۔
کنول۔ پھر کب آئیں گے وہ؟
رام سنگھ۔ جب میں اُن کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں گا۔ اس سے پہلے نہیں۔
سکھدیو۔ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ قصہ جلد ختم ہو۔
رام سنگھ۔ یہ بات ہے تو لو انہیں ابھی بلائے لیتے ہیں۔
سکھدیو۔ ابھی؟
رام سنگھ۔ ہاں۔ میری بات سنو۔ جو کچھ میں کروں وہی تم کرو گے۔ تم سب بہانہ کر کے جیسے باہر چلے جاؤ گے۔ لعل میرے پاس ہے۔ جب وہ مجھے اکیلا دیکھیں گے تو مورتی کی آنکھ لینے آئینگے۔
پریم۔ انہیں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ہم میں سے کس کے پاس لعل ہے؟
رام سنگھ۔ میں مانتا ہوں کہ یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن انہیں معلوم ہو ہی جاتا ہے۔
سکھدیو۔ جب وہ اندر آجائینگے تو پھر تم کیا کرو گے؟
رام سنگھ۔ میں کچھ بھی نہیں کرونگا۔
سکھدیو۔ کیا کہا؟
رام سنگھ۔ وہ رینگتے رینگتے میری پُشت پر آئیں گے۔ بس پھر میرے دوست سکھدیو اور پریم اور کنول، جنہوں نے انہیں چکما دیا تھا جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کرینگے۔
پریم۔ ٹھیک ہے، رام سنگھ۔ باقی کام ہم پر چھوڑ دو۔
رام سنگھ۔ اگر تم نے ذرا بھی دیر کی تو وہی دلکش منظر تمہاری نظروں کے سامنے ہوگا جو بلونت کی موت کے وقت تم نے دیکھا تھا۔
سکھدیو۔ ایسا نہ کہو رام سنگھ، ہم چُوکنے والے نہیں ہیں۔
رام سنگھ۔ اچھا، لو اب مجھے دیکھو۔ یہ جو سیدھے ہاتھ کو دروازہ ہے میں اسے کھولونگا اور بجائے باہر جانے کے رینگ کر واپس آکر اس پلنگ کے نیچے چھپ جاؤں گا۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے سے دُور سے دیکھنے والے سمجھیں گے کہ کوئی باہر گیا ہے۔ سمجھ گئے نا؟ اچھا اب میں دروازے کی طرف اپنی پیٹھ کر کے بیٹھ جاؤں گا۔ اب تم ایک ایک کر کے جیسے باہر جاؤ گے۔ بہت جھک کر واپس آنا اتنے جُھکے جُھکے کہ تمہیں باہر سے نہ دیکھ سکیں۔ جب کوئی میری پُشت پر آئیگا تو اس کی پُشت تمہاری طرف ہوگی خبردار طمنچہ مت چلانا ورنہ پولیس کے شکاری کتے بُو پا جائیں گے۔

کنول۔ پہلے میں چلتا ہوں۔ پھر تم آنا پریم اور تمہارے بعد سکھدیو۔
(جاتے قدموں کی آواز۔ دروازہ کھلتا اور بند ہوتا ہے۔
پھر قدموں کی آواز۔ دروازہ کھلتا اور بند ہوتا ہے
تیسری دفعہ پھر جاتے قدموں کی آواز۔ دروازہ کھلتا اور بند ہوتا ہے)
کنول۔ (سرگوشی) رام سنگھ نے لعل نکال کر میز پر رکھ دیا۔
پریم۔ (سرگوشی) اب اور کیا نکال رہا ہے؟ اچھا سگریٹ۔ (دیا سلائی گھسنے اور جلنے کی آواز) لو اس نے پھر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔
سکھدیو۔ خاموش رہو۔
(خاموشی کا وقفہ)
(دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔ ہلکی ہلکی چر چرانے کی آواز
پہلا پجاری داخل ہوتا ہے اور پریم اُس کے چھری مارتا ہے
گھٹی ہوئی چیخ۔)
کنول۔ (سرگوشی) شاباش پریم کیا ہاتھ لگایا ہے۔
سکھدیو۔ (سرگوشی) اور دوسرے ہاتھ سے مُنہ خوب بند کیا۔ واہ واہ۔
پریم۔ (سرگوشی) رام سنگھ! یہ تو ایک ہی ہے۔ اب کیا کریں۔
رام سنگھ۔ (") اچھا ٹھہرو۔ مجھے ذرا سوچنے دو۔ (خاموشی کا وقفہ) ہاں ٹھیک ہے۔ تم واپس وہیں جاؤ۔ ہمیں اور مہمانوں کو بھی بلانا ہے۔ جاؤ جلدی کرو۔ اچھا اب تم تیار رہو نا؟
پریم۔ ہاں۔
رام سنگھ۔ اب جیسے اِس پجاری نے میرے چھری ماردی ہے اور میں تڑپ کر گرتا ہوں۔ مہمانوں کا استقبال تمہیں کرنا ہے۔ اچھا ہوشیار! وہ کھڑکی میں سے مجھے دیکھ رہے ہونگے۔
(چیخ مار کر گرنے کی آواز۔ طویل وقفہ۔ دروازہ چرچراتا ہے۔ دوسرا پجاری داخل ہوتا ہے اور قتل کر دیا جاتا ہے)
کنول۔ (سرگوشی) شاباش پریم۔
سکھدیو۔ (") شاباش۔
پریم۔ (") دو ہی آئے رام سنگھ۔
رام سنگھ۔ (") ایک اور آئیگا۔
پریم۔ اب کے کیا کریں؟
رام سنگھ۔ دیکھو سوچتے ہیں۔
پریم۔ یہ طریقہ سب سے اچھا ہے۔ ہاتھ مُنہ پر اور چھری دل میں۔
رام سنگھ۔ ہاں۔ لیکن اب نئی چال چلنی ہے۔ یہ بات ابھی [illegible]

...اچھا تو پھر؟
نگھ۔ سمجھ میں آگیا۔ دیکھو کنول تم اب کمرے میں جیسے داخل ہوگے
ح میں نے بتایا تھا سمجھ گئے نا؟
۔ ہاں۔
علہ۔ تم بھاگ کر اِس کھڑکی کے سامنے آ جاؤگے اور گویا ان دونوں
یوں سے لڑوگے۔
۔ لیکن رام سنگھ یہ تو ——
سنگھ۔ ہاں مُردہ ہیں۔ لیکن میں اور پریم انہیں زندہ دکھا دینگے۔
۔ لو اٹھاؤ ایک کو بغلوں میں ہاتھ دیکر پریم۔ ہاں یوں۔ ٹھیک
ایک کو میں اٹھاتا ہوں۔ ذرا جھکے رہو پریم۔ بس مُردہ پجاری
تھ ہلاتے رہو۔ جب کنول حملہ کرے تو کھڑکی میں سے یہ نظر آتا
ہے کہ ان دونوں پجاریوں نے کنول کو مار ڈالا۔ چلو کنول اب
پنا تماشہ شروع کرو۔ جلدی۔
(کنول چیخ مار کر گرتا ہے)
سنگھ۔ بس ٹھیک ہے۔ اب جیسے تم مُردہ ہو۔ جنبش نہ ہو۔ مُردہ
یوں کو پھینک دو۔ پریم دروازے کے پیچھے اور تم بھی سکھدیو۔
۔ میں اِس میز کے پیچھے ہوں۔
(دروازہ چرچراتا ہے۔ وقفہ۔ تیسرا پجاری داخل ہوتا ہے)
(دروازہ بند ہونے کی آواز اور اس کے ساتھ ہی ہم
سنگھ۔ لینا پریم، جانے نہ پائے۔
(رام سنگھ تیسرے پجاری کے چھری مار دیتا ہے)
م۔ شاباش رام سنگھ۔
ل۔ ارے یار بڑے گہرے ہو!
دیو۔ کیا کہنے ہیں۔ اچھا اب اور کوئی تو باقی نہیں ہے؟
سنگھ۔ نہیں دوست۔ اِس دنیا میں تو باقی ہے نہیں۔
م۔ ہاں۔ بس یہی تھے۔ مندر میں صرف تین ہی پجاری تھے۔ یہ تین
لی اور انکی خوفناک مورتی۔ بس۔
ل۔ کیوں رام سنگھ اس لعل کی کیا قیمت ہوگی؟ ہے کوئی دَس
کا مال؟
سنگھ۔ بیش قیمت چیز ہے۔ سارا جوہری بازار ایک طرف اور یہ
طرف۔ ہم جو قیمت سمجھے تھے اس سے کہیں کم ہے۔
ل۔ (خوشی سے) تو اب ہم لکھ پتی ہیں!
سنگھ۔ ہاں ہم سب یہاں پہنچ کر قیمت آنک دیں۔

پریم۔ اب اسکے بیچنے کا سوال ہے۔
کنول۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اگر ایک کے بدلے کئی چھوٹے چھوٹے
لعل ہوتے تو کوئی دقت نہ ہوتی۔ کیا مورتی میں بس یہی ایک لعل تھا؟
پریم۔ ہاں ایک ہی تھا۔ مورتی سنگ سبز کی تھی اور اس کی صرف ایک
آنکھ تھی۔ آنکھ ماتھے کے بیچ میں تھی اور اس میں یہ لعل جڑا ہوا تھا۔
مورتی اتنی بدشکل اور بدہیبت تھی کہ دنیا میں شاید ہی کوئی چیز اتنی
مکروہ ہو۔
سکھدیو۔ ہم سب کو رام سنگھ کا بہت شکرگزار ہونا چاہیئے۔
پریم۔ بیشک بیشک۔
کنول۔ اگر رام سنگھ کی مدد نہ ملتی تو ——
پریم۔ واقعہ تو یہی ہے کہ اگر رام سنگھ کی مدد نہ ملتی تو ——
سکھدیو۔ بڑے گہرے ہو یار رام سنگھ۔
رام سنگھ۔ سچی بات اصل میں یہ ہے کہ میں بہت آگے کی بات دیکھ
لیتا ہوں۔
سکھدیو۔ واقعی یہ بات تو اب ماننی پڑیگی۔
پریم۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید کوئی ایسی بات ہوتی ہو جسے ہمارا رام سنگھ
پہلے سے نہ تاڑ لیتا ہو۔ ہے نا رام سنگھ؟
رام سنگھ۔ ہاں، ایسا ہی ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔
پریم۔ زندگی تو ہمارے رام سنگھ کے لئے بس تاش کا ایک کھیل
ہے ——!
رام سنگھ۔ ہاں۔ ہم نے ان زرد شیطانوں کا شعبدہ پکڑ لیا۔
سکھدیو۔ دیکھوں کوئی اور تو اس طرف نہیں آرہا۔
رام سنگھ۔ اِدھر کوئی نہیں آتا۔ اس ویرانے میں بس ہم ہی ہم ہیں۔
پریم۔ اِن لاشوں کا کیا کیا جائے؟
رام سنگھ۔ یہیں زمین کھود کر گاڑ دو۔ لیکن ایسی جلدی کیا ہے؟
پریم۔ اچھا پھر اسکے بعد ہمیں کیا کرنا ہے رام سنگھ۔
رام سنگھ۔ بس پھر ہم دلی چلیں گے اور اس لعل کو بیچیں گے۔ واقعی
آج کا کام بہت ستھرا رہا۔
پریم۔ میری رائے میں تو سب سے پہلے ہمیں کچھ کھانا چاہیئے۔ ان لاشوں کو
رات کو گاڑ دیجئے۔
کنول۔ بالکل ٹھیک۔
سکھدیو۔ میرے دل کی بات کہہ دی تم نے تو۔
پریم۔ ہم سب رام سنگھ کا جام صحت پئیں گے۔

سکھدیو۔ رام سنگھ کو جنرل یا وزیر اعظم ہونا چاہیئے تھا۔

(گلاسوں کی جھنکار اور شراب انڈیلنے کی آواز۔)

پریم۔ رام سنگھ کا جام صحت جس نے آنے والے واقعات کو تاڑ لیا تھا۔

کنول اور سکھدیو۔ ہمارا محسن رام سنگھ۔

پریم۔ رام سنگھ، جس نے ہماری جان بچائی اور ہمیں لکھپتی بنا دیا۔

کنول اور سکھدیو۔ زندہ باد! زندہ باد!

رام سنگھ۔ اور یہ پریم ناتھ کا جام صحت ہے جس نے آج دو مرتبہ میری جان بچائی۔

پریم۔ سب کچھ تمہاری عقلمندی سے ہوا رام سنگھ۔

سکھدیو۔ زندہ باد۔ زندہ باد۔

کنول۔ رام سنگھ ہر آنیوالے واقعہ کو تاڑ جاتا ہے۔

پریم۔ رام سنگھ تقریر۔ ہمارے جنرل کی ایک تقریر ہو جائے۔

سب۔ ہاں۔ تقریر ضرور ہوگی۔

رام سنگھ۔ اچھا، مجھے تھوڑا سا پانی لا دو۔ یہ شراب بہت تیز ہے۔ اگر چڑھ گئی تو سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔ اور مجھے ابھی ہوش و حواس قائم رکھنے ہیں، جب تک کہ ہمارے یہ دوست زمین کی آغوش میں نہ پہونچ جائیں۔

پریم۔ پانی۔ ہاں ابھی لو۔ سکھدیو لانا بھئی پانی۔

سکھدیو۔ یہاں تو پانی ہم نے پیا نہیں، کہاں سے لاؤں؟

پریم۔ باہر باغ میں ہوگا۔

(سکھدیو باہر جاتا ہے)

کنول۔ دولت کا جام صحت۔

پریم۔ اور یہ عالی جناب کنول کشور کا جام صحت۔

کنول۔ اور یہ معلی القاب۔ پریم ناتھ جی۔ کا جام صحت۔

(سکھدیو واپس آجاتا ہے)

رام سنگھ۔ ہلو! رائے بہادر سکھدیو پرشاد۔ ایم۔ سی۔ واپس تشریف لے آئے ہیں۔

سکھدیو۔ (گھبراکر) رام سنگھ، میں سوچ رہا تھا کہ لعل میں میرا جو حصہ ہو وہ ـــ وہ مجھے نہیں چاہیئے۔

رام سنگھ۔ ہشت۔ سکھدیو کیا بک رہے ہو۔

سکھدیو۔ تم لیلو رام سنگھ۔ تم میرا حصہ بھی لے لو۔ بس صرف یہ کہدو کہ سکھدیو اس میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ کہدو رام سنگھ۔ کہدو۔

پریم۔ کیا ہمیں دھوکا دینا چاہتے ہو سکھدیو؟

سکھدیو۔ نہیں نہیں، بس یہ کہ، یہ کہ مجھے لعل نہیں چاہیئے۔ رام سنگھ

رام سنگھ۔ اس بکواس کو بند کرو سکھدیو۔ ہم سب اس کام میں شریک ہیں۔ اگر ایک کو پھانسی ملتی ہے تو سب کو ملے گی۔ لیکن پولیس مجھ سے بازی نہیں لے جا سکتی۔ اور پھر پھانسی کا معاملہ بھی نہیں ہے۔ اسکے علاوہ دیکھتے نہیں کہ ان سب کے پاس اپنی چھریاں تھیں۔

سکھدیو۔ رام سنگھ رام سنگھ۔ میں نے ہمیشہ تمہارا ساتھ دیا رام سنگھ۔ ہمیشہ میں نے تمہاری تائید اور طرفداری کی۔ میرا حصہ لیلو رام سنگھ۔

رام سنگھ۔ یہ بات کیا ہے آخر؟ کہنا کیا چاہتے ہو؟

سکھدیو۔ مجھ سے لیلو رام سنگھ۔

رام سنگھ۔ مجھے جواب دو۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔

سکھدیو۔ مجھے اب اپنا حصہ نہیں چاہیئے۔

پریم۔ سکھدیو، کیا پولیس آرہی ہے؟

رام سنگھ۔ چھری مت نکالو پریم۔

کنول۔ تو اور کیا بات ہے؟

رام سنگھ۔ کھلی عدالت میں ہم سچ سچ کہدینگے کہ ہم پر انہوں نے حملہ کیا تھا۔ لعل کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

سکھدیو۔ پولیس نہیں ہے۔

رام سنگھ۔ اچھا تو پھر کیا بات ہے؟

پریم۔ بول چکو۔

سکھدیو۔ میں پرماتما کی قسم کھا کر کہتا ہوں ـــ

کنول۔ کیا کہتے ہو؟

رام سنگھ۔ بیچ میں مت بولو۔

سکھدیو۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں، میں نے کوئی چیز ایسی دیکھی ہے جسے ـــ جسے میں دیکھنا نہیں چاہتا۔

رام سنگھ۔ کیا چیز ہے وہ جسے تم دیکھنا نہیں چاہتے؟

سکھدیو۔ (رو کر) رام سنگھ، رام سنگھ بھیا۔ تم لیلو۔ میرا حصہ لیلو۔ کہو تم نے میرا حصہ لے لیا۔

رام سنگھ۔ کیا دیکھا ہے اس نے؟

(خاموشی ـــ جس میں صرف سکھدیو کی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(مورتی آتی ہے اور میز پر سے لعل اٹھا کر اپنی اندھی آنکھ میں لگاتی ہے اور آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے۔)

سنگھ۔ آہ!
۔ (سہمی ہوئی آواز میں) یہ کیا تھا رام سنگھ؟
۔ کنول، وہی بھیانک موت ہے۔ تبت سے یہاں آگئی۔
۔ چلی گئی۔
۔ اپنی آنکھ سے لگی چیز ہے۔
ھدیو۔ ہم بچ گئے۔ ہم بچ گئے۔
ز۔ (دور سے۔ عجیب لہجہ) میسٹر پریم ناتھ سیاح۔
۔ (گھبرا کر) کنول، کنول، یہ کیا ہے؟ مجھے کون بلا رہا ہے؟ میں میں
کھنچا جا رہا ہوں۔
(پریم آواز پر کھنچا چلا جاتا ہے۔ وقفہ اور وقفہ کے بعد مرنے کی چیخ۔)
ھدیو۔ یہ چیخ کیسی تھی؟
(کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھتا ہے۔)
ل۔ (آہستہ سے) کیا ہے سکھدیو؟
ھدیو۔ (روتی آواز میں) میں نے دیکھا ہے۔ خود دیکھا ہے۔ آہ! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔
سنگھ۔ (نرم لہجہ میں) کیا دیکھا سکھدیو؟
سکھدیو۔ میں نے دیکھا ہے۔
نول۔ کیا دیکھا ہے؟
سکھدیو۔ اوہ!
واز۔ میسٹر کنول کشور سیاح۔
نول۔ کیا مجھے جانا چاہیئے رام سنگھ۔ رام سنگھ کیا مجھے جانا چاہیئے؟
سکھدیو۔ مت جاؤ۔ اپنی جگہ سے مت ہلو۔
نول۔ رام سنگھ۔ رام سنگھ۔ میں رک نہیں سکتا۔
(کنول آواز پر کھنچا چلا جاتا ہے۔ مرنے کی چیخ۔)
واز۔ میسٹر سکھدیو پرشاد سیاح۔
سکھدیو۔ میں نہیں جا سکتا رام سنگھ۔ میں نہیں جا سکتا۔ میں ۔ نہیں جا سکتا۔ (آواز پر کھنچا چلا جاتا ہے۔ وقفہ۔ مرنے کی چیخ۔)
واز۔ میسٹر رام سنگھ سیاح۔
رام سنگھ۔ جانا ہی پڑیگا مجھے بھی۔ میں اسے پہلے نہیں سمجھ سکا۔
(جاتا ہے۔ وقفہ۔ چیخ)

"شاھد"

(ماخوذ)

اپنی کہانی

سنانی ہے مجھکو عجب اک کہانی
نہ ایسی نئی ہے نہ ایسی پرانی

نہ سنیئے تو غیروں کا ہے یہ فسانہ
اگر دل سے سنیئے تو اپنی کہانی

کہیں ہم کو کوئی بھی باور کریگا
کہ ہم نے بھی کی تھی کبھی حکمرانی

خدا کی زمیں ملکیت تھی ہماری
خدا کی خلافت کے ہم تھے نشانی

زمیں پر ہی کرتے نہ تھے ہم حکومت
رعایا کے دل پر بھی تھی راجدھانی

وہ تھی آب تیغ نظر میں ہماری
جدھر پڑ گئی سارے دشمن تھے پانی

ہمارے امیروں میں عجز فقیری
ہمارے فقیروں میں شان کیانی

امیروں کے دل میں غریبوں کا غم تھا
غریبوں کے چہروں پہ تھی شادمانی

غلاموں کو بھی ہم نے آقا بنایا
اچھوتوں کو دی دولت حکمرانی

زمانے کے مردہ فنوں کو جلایا
جہاں ہم گئے جاگ اٹھی زندگانی

ہماری رگوں میں لہو اسلئے تھا
کہ ہو خدمت دین و ملت میں پانی

چلی پھر ہوا عیش و عشرت کی ایسی
کہ خود سو گئے کہتے کہتے کہانی

جو سوئے تو ایسے کہ اللہ اکبر
اذاں کی بھی آواز ہم نے نہ جانی

جگایا ہمیں کس نے ٹھوکر لگا کے
بڑی مہربانی، بڑی مہربانی

اسی مہربانی کی یہ ہے کرامت
کہ بوڑھی رگوں میں ہے جوش جوانی

جوانوں کا کیا ذکر، آخر جواں ہیں
بنیں گے وہ اک روز طارق ثانی

دلوں میں نہاں جذبۂ سرفروشی
عیاں ہے نگاہوں سے جذبہ نہانی

یہ جذبہ اگر جلد ہو کار فرما
تو مشکل نہیں اب بھی بگڑی بنانی

وہی پھر ہوا اقبال کا دور دورہ
لگے پھر قدم چومنے کامرانی

کرے کون نام اور دنیا کی پروا
نہ وہ جاودانی نہ یہ جاودانی

لہو سے شہیدوں کے بنتی ہیں قومیں
شہیدوں کی ہے زندگی غیر فانی

نہ ہو جس سے رخسار ملت کی رونق
وہ ہے خون یارب کہ رنگین پانی

پھر اک بار تو اپنا جلوہ دکھا دے
بڑی غیر کرنے لگے لن ترانی

مسلماں کو پھر کر دے اپنا بھکاری
بنا دے بھکاری کو شاہ زمانی

بس اب ختم کر لوگ گھبرا گئے ہیں
بہت سن چکے تیری فضلی کہانی

فضل احمد کریم فضلی

سپنے

وہ بستر مرگ پر پڑا زندگی کے دن ختم کر رہا تھا۔ اس کا اپنا کمرہ، مختصر مگر عجیب۔ دیواروں پر تصویریں آویزاں ـــــ تصویریں اُس کی اور اُس کے بچوں کی۔ انگیٹھی پر چھوٹی چھوٹی قسم کی اشیاء، ایک پرانا ٹائم پیس، سیاہ رنگ کے ٹرنک، سوٹ کیس، بوسیدہ اور پرانے ـــــ اس کی طرح ـــــ

یہ کمرہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شگفتگی کھو بیٹھا تھا۔ وہ اس بوڑھے درخت کی طرح تھا جو پر ہیبت تو ہوتا ہے مگر سرسبزی سے محروم رہتا ہے۔ اس کی شاخیں پھیل کر خود درخت بن جاتے ہیں مگر اسکا تنا ایک بھدی لکڑی ہوتی ہے۔

وہ اپنی جوانی کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ اُس کی کمزور آنکھیں اس تصویر کے نقوش کو اب بھی دیکھ سکتی تھی۔ چالیس برس گزرنے کے باوجود تصویر ابھی تک جوان تھی۔ مگر وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ بڑھاپا ـــــ اس لفظ سے اُسے کتنی نفرت تھی، نوجوانی کو وہ ابدی جانتا تھا۔ اس کا مقولہ تھا "دنیا میں جوانی کے سوا اور ہے بھی کیا" مگر اس کا خیال خام نکلا۔ وہ مسکرایا، بالکل اُس بچے کی طرح جو خواب میں کسی پری کی گود میں لوری سُن کر مسکرا رہا ہو ـــــ اُس کی جوانی خوب گزری، مگر اب! اب اُسے تصویر دیکھ کر حسرت ہونے لگتی تھی۔ اُس نے تصویر ضائع کیوں نہ کر دی۔ گذشتہ کی یاد حال کی تلخی سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر پھر بھی وہ تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ تندرست چہرہ، تنومند جسم، وجیہ نوجوان ـــــ خیالات کی مکڑی اس کے دماغ میں جالا بننے لگی، گزرے ہوئے واقعات کی تاریں مل کر ہلکے ہلکے نقوش پیدا کرنے لگیں ـــــ اس کے کمزور ہاتھ، جھریوں والا چہرہ، سفید بال، اُسے اُن سے خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ مگر نقوش پھر ابھرنے لگے۔ خوبصورت ہاتھ، حسین اور مضبوط ـــــ یادوں نے دماغ پر ندو رنگا۔ خیالات کی مکڑی برابر جالا بُنے جا رہی تھی۔ اُسکے ہاتھوں کی کئی بار تعریف کی گئی تھی۔ کئی نازک ہاتھوں نے اُسے پیار سے دبایا تھا۔ انہیں ہاتھوں نے حُسن کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ چند الفاظ لکھ کر یہی ہاتھ جادو کا کام کرتے تھے۔ سیاہ ٹرنک میں وہ عزمن بوسیدہ خطوط اب تک بھی محفوظ تھے بوڑھے کے دل کی طرح جہاں ہزار ہا

خیالات دب کر مدھم پڑ گئے تھے۔ اپنی جوانی اُس نے خوب گزاری۔ وہ حسین تھا، حُسن جادو ہوتا ہے۔ جادو نے اثر کیا۔ سماج کی پابندیاں تھیں۔ مگر وہ جوان تھا، انہیں پابندیوں میں اُس نے آزادی حاصل کی۔ اپنے ہی خاندان میں وہ کتنا مقبول تھا۔ مامی، چچی اور پھپھی سب اس پر جان نچھاور کیا کرتی تھیں۔ پھر ماموں زاد، چچا زاد اور پھپھی زاد بہنوں کے لئے وہ خوشی کا باعث بنتا تھا۔ جس گھر میں وہ جا نکلتا ایک زندگی پیدا ہو جاتی ـــــ بوڑھا پھر مسکرانے لگا، عمر رسیدہ درخت کی طرح جس کے خزاں دیدہ پتے ہوا کے جھونکے سے سرسر کرنے لگیں۔

اس کے حسین ہاتھ عشق اور محبت کے نقوش بناتے ہوئے آگے بڑھے۔ زندگی کی کشمکش میں یہ نرم و نازک ہاتھ لوہے سے زیادہ مضبوط تھے۔ زندگی کی کشتی کھینے کے لئے ان ہاتھوں نے بڑا کام کیا۔ وہ ہاتھ جن پر اکثر کسی کے سرد ہونٹ مس ہوتے تھے پھر تقدیر کی راہ میں حائل پتھر توڑتے رہے۔ اور اب کون کہہ سکتا تھا کہ ہڈیوں کا بدنما مجموعہ وہی ہاتھ ہیں جو ـــــ اس نے نیم وا آنکھوں سے کمرے کی ہر چیز کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اُس کی طرح بوسیدہ تھی۔ اس کی رفاقت میں وہ بھی گھس رہی تھی۔ اس کی بیوی وہ بھی تو۔ ہاں مگر اُس کی جوانی ابھی تک جوان تھی، اس کے سامنے اُسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ اُس نے بڑھاپے میں بھی کئی بار حماقتوں کا اعادہ کر کے جوانی کی یاد کو تازہ کیا تھا۔ مگر اب اُسے اپنی جوانی کو دیکھ کر زیادہ خوشی نہ ہوتی تھی ـــــ حسین سپنے کی یاد اُسے مغموم کر دیتی تھی۔ اس نے جاوداں کا لفظ اپنی جوانی کے لئے مختص کر رکھا تھا مگر اب اُسے معلوم ہُوا کہ جوانی کا جاوداں ہونا بجائے خود ایک درد سری ہے۔ بھلا اپنی حماقتوں کو کہاں تک کوئی کئے جا سکتا ہے ـــــ

"ابا جان! دوائی پی لیجئے" بیٹی نے کہا۔

بوڑھے کی آنکھیں کھلیں۔ کلاک ٹک ٹک کئے جا رہا تھا۔ تین گھنٹے گزر چکے تھے اور اب اُسے دوائی پینی تھی۔ بیٹی نے سہارا دیکر اُسے بٹھایا اور پھر دوائی اُس کے حلق میں انڈیل دی۔ کڑوی اور تلخ دوائی۔ بوڑھے نے مُنہ بند کر لیا اور پھر لیٹ گیا۔ [illegible]

جان! دوائی کڑوی ہے" وہ کہہ رہی تھی۔

دوائی — گرتی ہوئی عمارت کو ستون کا سہارا دیکر کچھ عرصہ کے لئے

لیا جاتا ہے۔ اب اُسے بھی دوائی کا سہارا دیا جا رہا تھا۔ زندگی کی حرکت

ستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ تاہم بیس کی مدھم ٹک ٹک بڑھے کو

ت کی آمد کی خبر دے رہی تھی — زندگی، وہ اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

نی سے وہ آگے نکلا۔ اس کے سامنے ایک گھنا جنگل تھا۔ جس میں راستہ

ش کرنا جان جوکھوں کا کام — مگر اس نے راستہ خوب تیار کیا —

ل صاف ہوا۔ اس کی جگہ ایک خوبصورت گلستان تھا۔ طرح طرح

پھول اُگ آئے۔ کلیاں نکلیں، پھول بنے — مگر کیا یہ سب کچھ جاودا

ما۔ وہ پھر مسکرایا — دیوار پر یہ کلیاں اور پھول اس کی طرح آویزاں تھے۔

راہیں وہ ہر وقت دیکھتا ہے۔ کلیاں چٹک کر کسی اور کا دماغ مہکائیں گی

۔ اس کا گلستان اُجڑ جائے گا۔ مگر ایسا ہونا ہی بقائے نسل انسانی ہے

۔ زندگی — ایک حسین سپنا ہے۔ جب تک سپنا جاری رہا زندگی حسین ہو

رہ — دوائی کی کڑواہٹ اسکے حلق میں زیادہ ہو گئی۔

اس نے ایکا ایک آنکھیں کھولیں — اِدھر اُدھر دیکھا۔ گویا وہ کوئی

ڈراونا خواب دیکھ کر جاگا ہو۔ مگر ارد گرد پھر اپنی پرانی چیزوں کو دیکھ کر اُسے

طمینان سا ہو گیا — ان سب چیزوں کو اُسے چھوڑنا ہو گا۔ بے جان چیزیں۔ مگر

یہ تو اس کی رفیق رہیں وہ ان کو چھوڑ رہا تھا — اُسے ان چیزوں سے کتنا پیار

تھا۔ اس کی جوانی کی یاد — اس کی عمر بھر کی ساتھی — اس کی بیوی، وہ بھی

تو اس کی عمر بھر کی ساتھی تھی۔ مگر وہ اُسے بھی تو — اس کی آنکھیں آب دیدہ

ہو گئیں۔

ٹن — اس کے قریب ہی آواز آئی۔ اس کا ننھا پوتا کمرے میں گھس

آیا تھا اس نے میز پر سے دوائی پلانے والا پیمانہ گرا کر توڑ دیا تھا۔ ننھا حیران تھا

میز ہلنے سے شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اُسے کیا معلوم — بوڑھے نے آنکھیں کھولیں۔

بچہ سہم گیا۔ بوڑھا مسکرایا۔ بچہ بھی مسکرانے لگا۔ اُسے کیا معلوم کہ اس کے

دادا کو زندہ رکھنے کے لئے یہ سب سامان تھے۔ ڈاکٹر۔ دوائی۔ ٹیکے۔ اسکی

بوسیدہ عمارت کو سہارا دیا جا رہا تھا۔

ٹک ٹک اب زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ عمر اپنا فاصلہ اور زیادہ سرعت

سے طے کرنے لگی۔

اس کی جوانی کی تصویر پھر اس کے سامنے روشن ہو گئی — وہ نہ

رہیگا مگر اس کی تصویر رہیگی۔ آنے والی نسلیں اپنے مورث اعلیٰ کو دیکھیں گی۔

ناز کریں گی۔ وہ کتنا خوبصورت تھا۔ جوان تھا۔ جب تک اس کا خون انسانی

رگوں میں گردش کرتا رہیگا وہ جوان رہیگا۔ اس کی اولاد اس کو جوان دیکھ کر

اس کے بارے میں سوچے گی۔ سپنے بنائے گی یہی حسین خواب ان کی خاندانی روایات

ہونگے، مقدس روایات — اس نے — وہ پھر گہرے اور مسلسل سپنے میں کھو

گیا اس نے دیکھا کہ اس کا لباس سفید ہے وہ خود بھی بہت سا سفید پھولوں

کی سیج پر سو رہا ہے۔ پریوں کا جھرمٹ آیا اور انہوں نے اس کی سیج کو اٹھا

لیا۔ وہ فضا میں اُڑنے لگا — وہ اٹھا جا رہا تھا — آسمانوں کی طرف۔ اگر

گرد ننھے ننھے حسین بچے تھے۔ پریاں سے بھی زیادہ خوبصورت، مدھم اور

اور پُرلطف نغمات سنائی دے رہے تھے — ابدی نغمہ گایا جا رہا تھا —

سفید بادل آتے اور اُس کے قدم چوم چوم کر پلٹ جاتے وہ خوش تھا اور

مطمئن —

اچانک اُسے انسانی آوازیں سنائی دیں — وہ چونکا۔ اس نے

آنکھیں کھولیں۔ اس کی چارپائی کے گرد اس کے بچے اور رفیقۂ حیات

بیٹھے تھے ان کے چہروں پر بھی اطمینان تھا۔ بوڑھے کے مطمئن چہرے نے

ان کو بھی مطمئن کر دیا۔ اس کا آخری خواب کتنا سچا نکلا — یہی بچے، پریاں

تھیں، اُن کے ہاتھوں سے ہی وہ ابدی نیند سُلا دیا جائے گا۔ اسکے اپنے

بچے — اپنا خون — جوان خون — جاوداں، اور — اور وہ ہمیشہ کیلئے

یہی سپنا دیکھے گا گہرا اور مسلسل —

شبیر محمد اختر

گوالیار

یہ مہاراجہ سندیا کی راجدھانی اور جی آئی پی ریلوے کا بڑا اسٹیشن ہے جہاں سے ریاست گوالیار کی چھوٹی لائن شروع ہوتی ہے اور ریاست کے مختلف حصوں میں جاتی ہے۔ یہ شہر آگرہ سے ۷۲ میل اور دہلی سے ۱۹۵ میل دکھن کی طرف واقع ہے۔ اسکے تین حصے ہیں۔

(۱) پُرانا حصہ شہر جو قلعہ گوالیار کے شمالی حصہ کے دامن میں آباد ہے۔

(۲) لشکر جو قلعے کے جنوبی حصے کے نیچے ہے اور یہاں کبھی مہاراج دولت راؤ کی فوج ٹھہری تھی۔

(۳) مرار جو قلعہ کے پورب میں واقع ہے اور برطانوی فوج اور ریذیڈنٹ کے رہنے کی جگہ ہے۔ شہر کے یہ تینوں حصے کبھی الگ تھے مگر اب کثرت آبادی کی وجہ سے ایک دوسرے سے ملتے جاتے ہیں۔

شہر کیسا ہے اور اس کی کیا خوبصورتی ہے اور اُس کی شخصی حکومت کس درجہ چست و چالاک ہے۔ مجھے ان باتوں سے کوئی بحث نہیں۔ آج کی نشست میں مَیں قلعہ گوالیار کا قلمی نقشہ پیش کرنا چاہتا ہوں جسکی قدامت اور شہرت کے چرچوں سے ہندوستان کی تاریخ بھری پڑی ہے اور یہ ہندوستان کے ان چند واقعی مضبوط قلعوں میں سے ہے جن کو فتح کرنے والا بجا طور سے فخر کر سکتا تھا۔ ہندوستان کا وہ کون فاتح ہے جس نے اس کو فتح کرنے کی خواہش ظاہر نہ کی اور اس کو فتح کر کے اطمینان کا سانس نہ لیا ہو۔ اس قلعہ کی موٹی موٹی کوہ پیکر دیواریں اور اس کے ٹوٹے پھوٹے سرنگوں محلات اپنے اندر انسانی حرص و ہوس کی بہت سی دلگداز داستانیں محفوظ رکھتے ہیں۔ جن کو سُننے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی سُرخ روشنی جب قلعہ کی پشت پر چلی جاتی ہے تو قلعہ کی اُونچی اُونچی دیواریں، بلند اور سربفلک محلات کے گنبد، مینار اور کنگرے قطار اندر قطار کھڑے نظر آتے ہیں اور جی آئی پی کا پنجاب میل جب ان ماضی کے مہیب دربانوں کی صف کو آنکھوں کے سامنے سے فرّاٹے بھرتا ہوا اوجھل کر دیتا ہے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ ہندوستان کے ایک نہایت خونی ورق کو طوفان کے جھونکوں نے اُلٹ دیا یا کوئی ڈراؤنا خواب تھا جو آیا اور چلا گیا۔ گوالیار سے جب کبھی میں گذرتا ہوں تو میری آنکھیں ٹکٹکی باندھے ہوئے اس قلعہ کو حدِ نظر تک اس اُمید میں دیکھتی رہتی ہیں کہ شاید کوئی اکبر یا اورنگ زیب نظر آئے یا پھر کسی مقتول شاہزادے کی لاش کا کوئی چپ چپاتا ہوا جنازہ مشعل کی روشنی میں جاتا ہوا دکھائی دے جس کے پیچھے نازک اندام شہزادیاں کے اُترے ہوئے ماتم زدہ چہرے کسی محل کے روزن سے آنسو بہاتے ہوئے دکھائی دیں......

یہ قلعہ ریلوے اسٹیشن سے دو میل پچھم کی طرف ایک ۳۰۰ فٹ بلند پہاڑی کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور اس کی دوہری فصیل پونے دو میل لمبی اور ڈیڑھ میل چوڑی ہے۔ یہ قلعہ نہیں بلکہ ایک شہر ہے جو ایک بلند پہاڑی پر آباد کیا گیا ہے اور اس کے اندر کی دُنیا ہماری کثیف اور نیچی دُنیا سے بہت لطیف اور ارفع ہے۔ قلعہ تک پہونچنے کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو پہاڑی کے پورب اور اتر حصہ سے شروع ہو کر دروازے میں داخل ہوتا ہے۔ اس راستے سے تانگے اور موٹر بھی قلعہ کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ اس سڑک کی تعمیر اور نگہداشت میں ریاست کافی رقم خرچ کرتی ہے۔ یہ سڑک بہت اچھی حالت میں ہے جس کے بالائی سرے کے دونوں طرف پہاڑ کو کاٹ کر مہابیر کی دیو پیکر مورتیں بنائی گئی ہیں۔ ایک مورتی جو مہابیر کو کھڑی ہوئی حالت میں دکھاتی ہے تقریباً ساٹھ فٹ بلند ہے۔ یہ مورتیاں پتھروں کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں کہیں چٹان کو نکال کر حجرے بنائے گئے ہیں اور ان حجروں میں مورتیں بنائی گئی ہیں۔ سالم پہاڑ کو کھود کر اس کے اندر مندر یا کوٹھری بنانے کا رواج چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں عام تھا بلکہ اس سے پہلے بھی یہ طریقہ رائج تھا چنانچہ اس قسم کے حجروں کے نادر نمونے ریاست گوالیار کے شہر بھلسا میں اب تک موجود ہیں جہاں ایک پہاڑی کو کھود کراکے کھوکھلا بنا دیا ہے۔ (اودیگری کے غار)

قلعہ گوالیار مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے بن چکا تھا۔ اس کے بننے یا بنانے والے کے کوئی حالات معلوم نہیں، صرف قیاس آرائیاں ہیں کہ یہ غالباً پانچویں صدی عیسوی کے لگ بھگ بنایا گیا تھا۔ قلعہ گوالیار جس پہاڑی پر آباد ہے اس کا پُرانا نام گوپ گری یا گوپاچل کی پہاڑی ہے۔ پُرانے سنسکرت کتبوں میں اس کا یہی نام ملتا ہے۔ تاریخ ہندوستان کے ہر دور نے اپنی کوئی نہ کوئی یادگار اس قلعہ کے اندر چھوڑی ہے مگر کچھ تو مرورِ ایام کے ہاتھوں مٹ چکی ہیں اور

ہ شکستہ حالت میں موجود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس
نے گپت، ہن، کچھوا ہا، پرا تی ہارا، تومار، پٹھان، مغل، انگریز اور
وں کے دور حکومت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اگر قدرت
کی دیواروں کو بولنے کی قوت عطا فرماتے تو بہت سے راز ہمیں
م ہو جاتے جن کو آج تک کسی نے نہ تو سنا اور نہ دیکھا۔ اس قلعہ کی
بت کبھی تو بہت ہوگی اور یہ کبھی ہندوستان کے وسطی حصہ کی
سمجھا جاتا ہوگا مگر آج تو پتھر اور اینٹ کا تودہ ہے جسکو حاصل کرنے کا
ل کسی دل میں بھی گذرتا نہ ہوگا۔

جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کی بنیاد رکھی جا رہی
ا تو قلعہ گوالیار مقامی راجپوت راجہ کے قبضہ میں تھا۔ قطب الدین
یک پہلا مسلمان فاتح ہے جس کے زوردار حملوں کے آگے قلعہ فتح
کیا اور مسلمانوں کا پرچم اس کی بلند و بالا فصیل سے لہرانے لگا۔ اس
د کی فتح پر دنیائے اسلام نے شکرانے کے کتنے سجدے ادا کئے ہونگے
ر کیا کیا خوشیاں نہ منائی ہونگیں مگر آج نہ تو فاتح رہے اور نہ مفتوح
رف قلعہ کی منہدم دیواریں رہ گئی ہیں اور بس۔ قطب الدین کے بعد جب
ی دہلی میں مسلمانوں کی قوت کم ہو جاتی تو یہ قلعہ کسی نہ کسی مقامی بندیلہ
ہیں کے قبضہ میں چلا جاتا اور اس کو از سر نو فتح کرنا پڑتا۔ چنانچہ پٹھان
ورِ حکومت کے ہر صاحب حوصلہ بادشاہ کو قلعہ گوالیار پر کم از کم ایک
بار حملہ کرنا پڑا۔ غیاث الدین بلبن، علاؤ الدین خلجی، سکندر لودھی
وغیرہ شاہان دہلی یہاں آئے اور اس کی فصیل کے نیچے دادِ شجاعت
دے گئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ قلعہ میں پٹھانوں کے وقت کی کوئی عمارت
نہیں۔ محلات اور مسجدیں اس طویل عرصہ میں بنی ضرور ہونگیں مگر زمانے
کے ردوبدل نے قلعہ گوالیار پر اپنی تباہ کاری کے اتنے گہرے نقوش
بٹھائے ہیں کہ آج ان عمارتوں کی ایک اینٹ بھی باقی نہیں۔ میں نے
پورے قلعہ کو چھان مارا مگر کہیں بھی کوئی ایسی عمارت یا پتھر نظر نہ آیا جسکو
پٹھان دورِ حکومت سے دور کا بھی لگاؤ ہو۔

پٹھانوں کے بعد مغل آئے اور بابر نے اس قلعہ کو اپنے
قبضہ میں کیا۔ ہمایوں نے جب دریا تیر کر اپنی جان بچائی اور ایران فرار
جا کر پناہ لی تو یہ قلعہ شیر شاہ کے قبضہ میں آگیا۔ شیر شاہ نے بندیلکھنڈ
کے علاقہ میں قلعہ کالنجر فتح کرتے وقت اپنی جان دی۔ اس کے بعد
تاریخ ہندوستان کا وہ زریں عہد آیا جس کو ہم عہد اکبری کہتے ہیں۔
اس دور میں سارا ہندوستان ایک بادشاہ کے زیر حکومت آگیا،
[illegible]

حکومت ہوگئی۔ اسی زمانہ میں قلعہ گوالیار کی بھی قسمت جاگی۔ اس کی فصیل
دروازے وغیرہ کی مکمل مرمت کرائی گئی اور قلعہ گویا پھر سے نیا ہو گیا۔
اکبر کے عہد میں اس قلعہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ یہاں سے بندیلکھنڈ
کے پہاڑی علاقہ پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے اکبر نے یہاں اپنی
فوج کی ایک زبردست چھاؤنی بنوائی۔ چونکہ اس قلعہ کی بلندی اور
فضا اکبر کو بہت پسند تھی اس لئے اس کے دربار کے اکثر وزرا نے
یہاں اپنے محلات بنوائے۔ ان محلوں میں سے ایک مان سنگھ کا محل
اب بھی اچھی حالت میں محفوظ ہے جو گوالیار دروازے کے اندرونی
پھاٹک کے بالکل قریب واقع ہے۔ مان سنگھ نے اپنی ایک رانی کے
لئے ایک دوسرا محل بھی تعمیر کرایا جس کو گجری محل کہتے ہیں۔ یہ رانی
گوجر قوم سے تھی۔ یہ محل قلعہ کے نیچے واقع ہے جہاں سے گوالیار دروازے
کا راستہ شروع ہوتا ہے۔ ان دنوں اس محل میں ریاست گوالیار کے
آثار قدیمہ کا میوزیم واقع ہے۔

اب آیئے قلعہ کی سیر کریں اور اسی دروازے سے داخل
ہو کر پہلے تیلی کا مندر دیکھیں۔ یہ مندر قلعہ کی سب سے بلند عمارت
ہے جس کی بلندی تقریباً سو فٹ ہے۔ اس مندر کی چوٹی گول نہیں بلکہ
چپٹی ہے جو دراوڑین طرز تعمیر ہے۔ مگر اس مندر کے اندرونی حصے
تمام و کمال آریئن طرز کے ہیں مثلاً دروازے، محراب، چھت، نقش و نگار
وغیرہ خالص انڈو آریئن ساخت کے ہیں۔ یہ مندر اس خیال کا نادر
نمونہ ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں شمالی و جنوبی ہند کی تہذیب و
خیالات بہت حد تک ایک دوسرے سے مخلوط ہو چکے تھے۔ یہ مندر
ایک بہت پر فضا مقام پر واقع ہے جہاں سے قلعہ کا نچلا حصہ اور
دور دور کی پہاڑیاں صاف نظر آتی ہیں۔

تیلی کے مندر سے چل کر قلعہ کی جنوبی حصہ کی طرف آیئے۔
یہاں سندھیا کالج کی عمارتیں ہیں جن میں پہلے ریاست گوالیار کے
جاگیرداروں کے لڑکے پڑھتے تھے، مگر اب یہ شرط ہٹا دی گئی ہے
اور عوام کے بچے بھی یہاں تعلیم پا سکتے ہیں۔ کالج سے ملحق ہوسٹل کی
عمارتیں ہیں اور قریب ہی کھیل کود کے لئے وسیع میدان اور لان ہیں۔
یہ کالج بہا دلکش ہے اور نہایت صاف ستھری جگہ میں واقع ہے۔ قریب
ہی پتھر کھود کر چھوٹے چھوٹے تالاب بنائے گئے ہیں جن میں برسات
کا پانی جمع ہو سکتا ہے۔ یہ تالاب بہت پرانے ہیں اور اب کچھ ایسے
کارآمد نہیں رہے کیونکہ اب طلبا کے لئے نلوں کے ذریعہ پانی قلعہ کی
بلندیوں پر چڑھایا جاتا ہے۔

قلعہ کی پوربی فصیل سے ملحق اس کے وسطی حصہ میں پتھر کے دو چھوٹے چھوٹے مندر ہیں جن کو ساس بہو کا مندر کہتے ہیں۔ یہ مندر غالباً کسی بڑے مندر کے باقی ماندہ حصے ہیں۔ مندروں میں متعدد پائے ہیں اور پتھر کی صاف ستھری سلیں ایک دوسرے پر قرینے سے سجا کر رکھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے وقت میں ان مندروں کو چونے اور گچ سے بھر دیا گیا تھا جو مہاراج گوالیار کے دور حکومت میں صاف کئے گئے ہیں۔ مندر پہاڑی کے ایسے حصے میں واقع ہیں جو باہر کی طرف نکلا ہوا ہے اس لئے یہاں سے پوربی فصیل شمال سے جنوب تک کوئی تین میل تک بالکل صاف نظر آتی ہے۔ شہر گوالیار کی تمام عمارتیں اس بلندی سے چھوٹی چھوٹی نظر آتی ہیں اور شہر کی سڑکیں کسی لکیر کی طرح ادھر سے ادھر جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ قلعہ کی شاید سب سے زیادہ پرفضا جگہ ہو جہاں دیر تک بیٹھے رہنے کو جی چاہتا ہے۔

ان مندروں سے آگے چل کر شمال کی طرف چند بزرگوں کے ٹوٹے پھوٹے مزارات ہیں جن پر ریاست کے شکستہ حال مسلمانوں نے قلعی کرائی ہے، پھول کے ہار چڑھاتے ہیں اور شاید سال میں ایک آدھ بار عرس بھی کرتے ہیں۔ یہ مزارات اینٹ اور پرانے پتھر کے ڈھیر ہیں جن میں کوئی خاص بات نہیں اور نہ کوئی کتبہ یا تختی ہے جن کو دیکھ کر پتہ چلے کہ یہ بزرگ کون تھے اور یہاں کب آئے؟ ان مزاروں کی خستہ حالی اور کس مپرسی دیکھ کر مسلمانوں کی عام پست حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اب قلعہ کی سب سے بڑی اور شاندار عمارت کو دیکھئے جو مان سنگھ کا محل کہلاتا ہے۔ یہ محل کئی منزلہ ہے جس کی لمبائی تین سو فٹ اور بلندی اسی فٹ ہے۔ محل قلعہ کی اندرونی پوربی فصیل سے ملحق ہے جس پر ہر پچاس فٹ کے فاصلے پر ایک خوبصورت گنبد ہے جن کی بلند چوٹیاں بیسوں میل کے فاصلے سے نظر آتی ہیں۔ محل کے اندرونی حصہ کے دو حصے ہیں جن کے بیچ مربع صحن ہیں۔ ان صحنوں کے چاروں طرف متعدد کمرے، دالان اور بارہ دریاں ہیں۔ محل کی دیواروں کی اندرونی اور بیرونی سطح پر رنگ برنگ کے ٹائل لگے ہیں اور ان ٹائلوں پر بط، ہاتھی، مگرمچھ، کیلے کے درخت اور دیگر اقسام کی تصویریں بنائی گئی ہیں جو دور سے آفتاب کی روشنی میں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس وجہ سے اس محل کو اکثر شیش محل بھی کہتے ہیں۔ محل جب نیا نیا بن کر تیار ہوا ہوگا تو یقیناً اپنی قسم کا آپ ہوگا۔ یہ محل دیکھ کر مان سنگھ کی نفاست مزاج کا پتہ چلتا ہے کہ یہ

تلوار کا دھنی سپہ سالار اگر ایک طرف اپنی بہادری کا سکہ کابل میں منواتا تھا تو دوسری طرف صاف ستھرے محل میں رہ کر اپنی رانیوں کے جھرمٹ میں زندگی کا لطف بھی اٹھاتا تھا۔ محل کا نچلا حصہ تہ خانہ ہے۔ جو غالباً شدت گرما سے بچنے کے لئے بنوایا گیا تھا۔ اس میں روشنی اور ہوا پہونچانے کا معقول انتظام تھا اور اب تک یہ تہ خانہ ٹھنڈا رہتا ہے اور یہاں باہر کی تمازت آفتاب سے پناہ ملتی ہے۔ اس تہ خانہ میں پہونچکر میرا دل مغموم ہو گیا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ یہ وہی تہ خانہ ہے جہاں مغل بادشاہ اپنے عزیز رشتہ داروں کو حبس دوام کی سزا دیتے تھے۔ اور اسی تہ خانہ میں مغلیہ خاندان کے وہ دردناک ڈرامے خاک و خون سے کھیلے گئے جن کو سن کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شہزادہ خسرو، خاندان مغلیہ کا سب سے لاڈلا شاہزادہ اور اکبر اعظم کی آنکھوں کا تارا تھا۔ دادا کے اٹھتے ہی بے رحم باپ نے نازوں کے پالے شاہزادے کو اس محل میں قید کر دیا۔ جہانگیر کے دوسرے بیٹے خرم کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ بھائی اپنے ماموں کے پر تکلف محل میں آرام سے رہے۔ اس نے خوشامد درآمد سے باپ کو راضی کیا کہ خسرو کو اس کے ساتھ برہان پور جانے دے جہاں مغموم بھائی کا دل دریا تاپتی کی سیر سے بہل جائیگا۔ بدقسمت خسرو بھائی کے ساتھ برہان پور گیا جہاں ایک رات جلادوں نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ خرم نے خوب غم کیا، مگرمچھ کے آنسو رویا اور مقتول بھائی کی لاش کا ایک شاندار جنازہ نکالا جو ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک شاہانہ تزک و احتشام سے لے جایا گیا اور آخرکار الہ آباد میں دفن کیا گیا۔ دکھیا ماں جو اس غم کو برداشت نہ کر سکی اور ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ دل شکستہ ماں کا مزار بھی بیٹے کے پاس ہی الہ آباد کے خسرو باغ میں موجود ہے۔ اس تہ خانہ کا دوسرا خونی منظر اورنگ زیب کے عہد کا واقعہ ہے جب ملک گیری کی ہوس نے خون سفید کر دیا تھا اور بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنے بڑے بھائی دارا کے لڑکے مرزا سلیمان شکوہ کو اور اپنے چھوٹے بھائی مراد کو یہاں قید کیا۔ ان کو کھانے پینے میں افیم کا ست ملا کر دیا جاتا تھا کہ آہستہ آہستہ زہر کے اثر سے ان کا کام تمام ہو جائے۔ یہ طریقہ کچھ صبر آزما تھا اس لئے ایک رات چپ چپاتے ان کے گلے گھونٹ دئے گئے اور اورنگ زیب کے لئے تخت و تاج حاصل کرنے کی راہ میں کوئی کانٹا باقی نہ رہا۔

ان شاہی قیدیوں کے دلوں پر کیا گذرتی ہوگی اور ان کے

آخری دم کے احساسات کیا ہونگے! وائے کاش اس تہ خانے کی دیواریں، فرش اور چھت بول سکتیں تو ہم آج کیسے دل ہلا دینے والے الفاظ سنتے جلاد کی ڈانٹ، مقتول کے قتل ہوتے وقت گلے کی گھٹی ہوئی چیخ، ظالم و مظلوم کی بھاگ دوڑ، تلوار کی جھنکار، موت و حیات کی آخری کشمکش، پرواز کرتی ہوئی رُوحوں کی حسرت بھری ہوئی آخری پکار.... الغرض یہ تہ خانے اپنے اندر ظلم و الم کی طویل داستان محفوظ کئے ہوئے ہیں... اے کاش! یہ کچھ بول سکتے۔

مان سنگھ کے محل کے بعد قلعہ کا شمالی حصّہ ہے جس میں مہاراج گوالیار کا پھریرا ہر وقت لہراتا رہتا ہے۔ یہ حصّہ موجودہ جنگ کے سبب سے زائرین کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ نہ جانے اِن کھنڈرات میں کیا ہیرے جواہرات بکھرے پڑے ہیں کہ یہیں ادھر جانے سے روکا جاتا ہے۔ دُور سے آنے والی ریل کی کھڑکی سے قلعہ کے اس حصّہ میں بھی چند مندر دکھائی دیتے ہیں اور بس۔ سارے قلعہ میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ یہاں کہیں بھی ایک مسجد یا مزار یا اسلامی طرز کی کوئی عمارت دکھائی نہیں دیتی حالانکہ اس قلعہ پر کم و بیش سات سَو سال تک ایسے مسلمانوں کی حکومت رہی جو مسجدیں بنوانا عین ثواب سمجھتے تھے اور جن کے رہنے کے لئے رہائشی مکانات ضرور ہونگے اور جب یہ مرتے ہونگے تو ان کی قبریں بھی پاس ہی کہیں بنوائی گئی ہونگی مگر آج اُن کی جڑ بنیاد تک کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ مسلمانوں نے سات سو سال تک یہاں راج کیا مگر آج بھی قلعہ کا چپّہ چپّہ ہندوؤں کے مندر سے پٹا پڑا ہے مگر کوئی سو سال سے اس قلعہ پر ہندوؤں کی حکومت ہے اور یہاں آج ایک بھی مسجد اور دیگر اسلامی عمارت کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔ اس سے کیا سمجھا جائے؟ مذہبی رواداری میں کون کس سے گوئے سبقت لے گیا ہے؟

گوالیار دروازے سے نیچے اُترتے وقت مان سنگھ کے محل کے نیچے پتھروں کو کاٹ کر بنایا تالاب بنایا گیا ہے جو ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے۔ یہ حصہ تالاب دو فصیلوں کے درمیان ہے اور پتہ نہیں اس میں پانی کہاں سے اور کب آتا ہے۔ اس راستے سے نیچے اُترتے وقت دو مندر اور بھی ملتے ہیں جن میں معمولی قسم کے سنگ مرمر کی مورتیاں [illegible] ہیں۔ جن کی اب تک پوجا ہوتی ہے اور شہر کے ہندو صبح شام ان میں آکر پھول چڑھاتے ہیں۔

قلعہ سے اُترنے کے بعد گوجری محل کی عمارت ہے جو کیا [illegible] نظر آتی ہے۔ اِس عمارت پر بھی کھنڈر ہیں اور محل دو منزلہ ہے۔ یہاں سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر شہر کے اندر اسلامی طرز عمارت کا نادر نمونہ محمد غوث گوالیاری کا مزار ہے۔ جس کے احاطہ میں تانسین کی قبر ہے۔ اوّل الذکر بزرگ دور اکبری کے ایک صاحب کرامات بزرگ تھے جو اکثر اکبر اعظم سے ملتے رہتے تھے اور اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی طرح بادشاہ کو اپنے سلسلۂ عقیدت میں شامل کرلیں۔ چنانچہ ایک دفعہ تو بات ہی بات میں حضرت نے بادشاہ کے ہاتھ پکڑ لئے اور بہ آواز بلند دعا پڑھنے لگے۔ بادشاہ مروت کا بھی بادشاہ تھا، ایک صاحب ریش و بروت بزرگ کو شرمندہ کرنا نہ چاہتا تھا، خوش رہا حضرت کے مریدوں نے مبارک مبارک کے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ خیر یہ باتیں تو اب بڑی پرانی ہوگئیں، نہ پیر رہے اور نہ اُن کے مُرید۔ البتہ پیر کے مزار پر مغلیہ طرز عمارت کا نادر جالی دار مقبرہ بن گیا جو آج تک قائم ہے اور ہمیں اس واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ مقبرے کی عمارت بڑی شاندار ہے اور آگرہ و دہلی کے مقبروں کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہے۔ مہاراج سندھیا کے دارالحکومت میں یہ خالص اسلامی عمارت کچھ یوں میں کھٹکتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک اجنبی دیارِ غیر میں آگیا ہے اور حیرت و حسرت سے کھڑا ایک ایک کا مُنہ تک رہا ہے۔ اس مقبرے کے احاطے میں تانسین کی بھی قبر ہے جس پر اُگے ہوئے املی کے درخت میں ایک پتہ بھی نہیں۔ جو یہاں آتا ہے ان پتوں کو توڑ کر اس اُمید میں چبانے لگتا ہے کہ اُس کی آواز بھی تانسین کی طرح سُریلی ہوجائے گی۔ تانسین ہندوستانی موسیقی کا خلاقِ اعظم، گوالیار کا رہنے والا، شیخ محمد غوث گوالیاری کے سلسلۂ عقیدت میں شامل تھا۔ ہندوستانی موسیقی کے اکثر شدہ راگ کا موجد تانسین تھا۔ چنانچہ درباری خیال کا موجد یہی تھا۔ وہ کون ہے جو اس شدہ راگ کو سنکر اپنے اندر ایک خاص کیفیت محسوس نہیں کرتا۔ جیسے وہ ایک بہت بڑا بادشاہ ہے اور اس کے سامنے گانے والا مؤدب ہو کر اپنی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے اظہارِ عقیدت و فرمانبرداری کر رہا ہے۔

تانسین کے درباری خیال کو سن کر ایک ہلکا سا خاکہ اس دربار کا کھنچ جاتا ہے جس میں ٹوڈرمل اور مان سنگھ، ابوالفضل، اور فیضی، بیربل، اور خانخاناں جیسے درباری ہوتے تھے اور ان موتیوں کا جوہری شہنشاہ اعظم اکبر بادشاہ جہاں تھا۔

محمد نصیر الدین

جب پیپل کے پیچھے سُورج چھُپ رہا تھا

ہلکا سا مدرسہ، ننھے ننھے طالب علم اور نوجوان مدرس، ایک نہایت ہی عجیب گروہ۔ محلے کے نکڑ پر ماسٹر جی کا مدرسہ تھا۔ ننھے ننھے طالب علم پڑھنے آتے اور بلند آوازوں سے اپنے سبقوں کو یاد کرنا شروع کر دیتے "ماں اپنے بادشاہ کی عزت کرو" "استاد کا حکم مانو" "دو اور دو چار ہوتے ہیں" "سورج مشرق سے نکلتا ہے" سفید تختیاں اور کالی کالی دواتیں جن میں سفید کھریا گھول کر روشنائی تیار کی گئی ہو۔ کچی لپی پتی زمین پر ماسٹر جی ٹاٹ کا ٹکڑا بچھاتے۔ اور ایک پنکھے کی سستی ستائی ڈنڈی لیکر پڑھانے کے لئے بیٹھ جاتے۔ کسی طالب علم سے ذرا غلطی ہوتی اور ماسٹر صاحب نے گرما گرم ضرب لگائی۔ علی الصباح ماسٹر جی پاس والے مندر میں نہانے کے لئے چلے جاتے۔ مندر میں پجاری دیوی دیوتاؤں کو سر لوا "جے سیتا رام، جے سیتا رام" کرتے واپس اپنی کوٹھری میں آن بیٹھتے کھانا خود پکاتے، چوکا صاف کرتے، برتن مانجھتے اور مدرسے کے آغاز کے وقت تک آرام سے تان کر سو رہتے۔

ماسٹر جی کے مکان کے آنگن میں ایک چھوٹا سا گلاب کا پودا تھا جس کی قلم ماسٹر جی بڑی منت سماجت سے مندر کے پجاری سے مانگ کر لائے تھے۔ اس پودے میں کبھی کبھی ایک ہلکی سی کلی نکلتی مگر پھول کبھی نہ کھلتا۔ ماسٹر جی نے لاکھ جتن کئے مگر گلاب کے پودے میں نہ پھول کھلنا تھا نہ کھلا۔ ماسٹر جی نے اپنے طالب علم موتی رام سے جس کا باپ باغبانی کے فن میں ید طولیٰ رکھتا تھا کئی بار مشورے کئے لیکن اس گلاب کے پودے میں پھول نہیں کھل پایا۔

ماسٹر جی کا مدرسہ آس پاس کے علاقے میں کافی مشہور تھا۔ اس واسطے اُن کی گذر اوقات اچھی طرح سے ہو جایا کرتی تھی۔ بدقسمتی سے ماسٹر جی دنیا میں بالکل اکیلے تھے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن۔ تنہا درخت پر تنہا پھل، ایک مجرد پتی، ایک اکیلی ٹہنی جس سے یہ بھی امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ آگے اپنا نشانی چھوڑیگی یا نہیں۔۔۔

"ماسٹر جی" موتی رام کہتا "اگلی بار برسات میں اس گلاب کے پودے کو ایک ایسا کھاد دوں گا کہ موسم میں بہت سارے پھول کھلینگے ہنسے زمانہ"

"اچھا بھئی دیکھیں تیری ترکیب" ماسٹر جی نہایت تسلی سے کہتے پھر اپنے دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔ گلاب میں کلی لگتی۔ ماسٹر جی غور سے اُسے دیکھتے۔ تھوڑا ذرا بڑا ہوتا، اس میں سرخ سرخ غلاف سا اندر ہی اندر بننے لگتا اور پھر ماسٹر جی تمنا لگا بیٹھتے کہ پھول اب کھلا اب کھلا۔ لیکن نہ معلوم قلم کون سے کمبخت دن زمین میں لگائی گئی تھی کہ کلی پھول میں تبدیل نہ ہو پاتی۔

ایک روز ایک صاحب ماسٹر جی سے ملنے آئے۔ گلاب کا پودا دیکھا۔

"کیوں صاحب اس میں کیسے پھول لگتے ہیں؟" نئے صاحب نے غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"ابھی پھول تو نہیں لگتے، کلی ضرور بندھتی ہے۔ اور جب پھول کھلنے کا زمانہ آتا ہے تو کلی مرجھا کر زمین پہ گر پڑتی ہے" ماسٹر جی نے رو کھا چہرہ بنا کر کہا۔

"پھر کلی بندھنا بیکار ہے جب تک پھول نہ کھلے۔ اس پودے کو اکھاڑ کر پھینک دیجئے دوسرا لگائیے صاحب۔ اگر کلی بندھتی رہی اور پھول نہ کھلا تو کیا فائدہ؟" ماسٹر جی کے ملاقاتی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"کبھی نہ کبھی تو کھلے گا صاحب" ماسٹر صاحب نے اطمینان سے فرمایا۔

"اچھا صاحب دیکھیئے" اور ملاقاتی چلے گئے۔ اور پھر۔۔۔

ماسٹر جی بیمار پڑ گئے۔ کھاٹ پر لیٹے رہے۔ طالب علم اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر پڑھتے رہے۔ ماسٹر جی کا پلنگ آنگن میں پڑا رہتا۔ سامنے کے مندر کے چبوترے پر چڑیاں باجرے کے دانے چن چن کر کھاتی تھیں۔ مندر کے صحن میں کھڑے بڑے پیپل کے درخت سے پیلے پیلے گرے ہوئے پتے اس چبوترے پر ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر سرکتے رہتے۔ چبوترے کے ایک کونے میں پانی کی کول رکھی رہتی اور پجاری کا لڑکا راہگیروں کو پانی پلاتا رہتا۔ ماسٹر جی کے طالب علم بھی مندر کے چبوترے والی پیاؤ سے پانی پی کر آیا کرتے تھے۔ مندر کے پاس ایک رتیلا سا میدان تھا گرمیوں کے دنوں میں رات کے وقت ٹھنڈے سو دہ ریت میں گھسے

اور بچے وہاں آن کر لیٹ جاتے تھے۔ اور اپنی بے ہنگم آوازوں کی ماسٹر جی اور مندر کے پجاری کے سکون میں خلل ڈالتے تھے۔ ...

ایک روز ماسٹر جی کھاٹ پر آرام فرما رہے تھے۔ لڑکے اپنے اپنے سبقوں کو نہایت بھونڈے انداز سے پڑھ رہے تھے۔ ایک لڑکے نے نہایت آرام کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ شاید وہ عبارت ایک سرے سے کتاب میں غائب تھی۔

"گلاب کے پودے میں کلی بند تھی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ کتنی ہی کلیاں، لیکن پھول نے کھلنے کا نام ہی نہ لیا۔ پھول کھلتا بھی تو کیسے۔ پودے میں ٹھیک کھاد بھی تو نہیں پڑتی تھی۔ اس واسطے گلاب کے پودے میں پھول ہی نہ کھلا۔"

"اِدھر آؤ۔" ماسٹر جی نے لڑکے کو اپنے پاس بُلایا۔

"کدھر لکھا ہے دکھاؤ۔"

"اس میں تو نہیں ہے۔" لڑکا سٹ پٹایا۔ کتاب اوندھی پڑی تھی۔

ماسٹر جی کو غصہ آیا کہ اُس لڑکے کو وہیں مسل کر رکھ دیں لیکن کسی جذبہ کے تحت وہ وہیں رُک گئے۔ مگر آخر غصہ تو تھا ہی تھوڑا یا زیادہ۔ کچھ نہیں تو اُس لڑکے کے کان اینٹھ دیے۔ لڑکا کان ملتا ملتا اپنی سیٹ پر پہونچا۔ شام ہو چلی تھی مندر میں کنوئیں کی مینڈھ پر عورتیں اور لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ پیپل کے پیچھے سورج چھپ رہا تھا۔ مندر کے چبوترے پر چڑیاں باجرے کے دانے چگنے میں مشغول تھیں۔ اور پجاری کا لڑکا راہگیروں کو پانی پلا رہا تھا۔ بچے اور گدھے سرِ شام سے ہی مندر کے پاس والے میدان میں لوٹ لگا رہے تھے۔ سزا یافتہ لڑکے کے کان کی لَو تڑپ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا مندر کے چبوترے تک پہونچا اور برابر کان مسلے جا رہا تھا۔

"کیا ہوا تجھے؟" ایک لڑکی نے گھڑا سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ ماسٹر جی کے گلاب کے پودے میں پھول نہیں کھلتا۔ میں بیٹھا بیٹھا یہی الاپ رہا تھا کہ کلی بند تھی مگر پھول نہیں کھلتا۔ بس ماسٹر جی نے لیا اور میرا کان مروڑ ڈالا... خوب رہی!"

کنوئیں کی مینڈھ پر ایک دم کتنے ہی سُرخ گلاب کے پھول کھل گئے، سُرخ، ہلکے، پیازی، سفید، کچھ قدرے سیاہی مائل، ایک دم کتنے سارے پھول۔ مندر کے چبوترے پر چڑیاں برابر باجرے کے دانے چگنے میں مشغول تھیں۔ ماسٹر جی آنگن میں لیٹے ہوئے تھے گلاب کے پودے میں ایک بجلی سی کلی چمک سی رہی تھی۔ شام سر پہ آن پہونچی تھی اور ماسٹر جی

کے طالب علم اپنے اپنے بستے سنبھالنے میں مشغول ہو چلے۔ ماسٹر جی گلاب کے پودے کی طرف دیکھ لیتے اور کبھی پنگھٹ پر ایک نظر مار لیتے تھے۔ شاید ماسٹر جی کا دل اتنا حسّاس نہیں تھا کہ وہ پنگھٹ پر آنے والی گلاب کی کلیوں کو چٹکتا دیکھ سکیں۔ سورج پیپل کے پیچھے چھپ رہا تھا، گدھے اور بچے ریتیلے میدان میں کروٹ لگا رہے تھے۔ ماسٹر جی گلاب کے پودے کی طرف دیکھتے دیکھتے سو رہے...

طالب علموں نے اُس روز سے قسم کھالی کہ وہ کبھی ماسٹر جی کے گلاب کے پودے کے بارے میں تذکرہ نہ کریں گے۔ لیکن جب شام اپنا ڈیرہ اس مندر کے پنگھٹ اور ریتیلے میدان میں جمانا شروع کرتی تو پنگھٹ پر پانی بھرنے والیاں اور عورتیں طالب علموں سے پوچھتیں "ماسٹر جی کے گلاب کے پودے میں پھول لگا یا نہیں؟"

گلاب کے پھول کی تمنا لڑکیوں کو کس لئے۔ جب ماسٹر جی کا دل ہی اتنا حساس نہیں تھا کہ وہ گلاب کے پھول کی تمنا کریں۔ اس مندر کے پنگھٹ پر سینکڑوں گلاب کے پھول کِھلکھلا کر ہنس دئے۔ مسرت انگیز خوشی میں ڈوبے۔ پھر قدرت نے انہیں اُن کی تر و تازگی سے محروم کر دیا اور وہ مُرجھا مُرجھا گئے۔ اُن کی جگہ نئے پھول لے لیتے۔ اُس مندر کے پنگھٹ پر نت نیا پھول کھلتا۔ وہ نیا پھول اپنے ساتھ نیا رنگ، نیا ڈھنگ، نیا انداز لاتا۔ مگر شاید ماسٹر جی کے دل میں اِن پھولوں کیلئے کوئی جگہ نہ تھی.... لیکن لڑکیوں کا اشتیاق روز بروز بڑھتا گیا۔ وہ شام کے وقت مندر کے پنگھٹ پر آتیں اور اُن کو کُریدنی سی لگتی اس بات کو پوچھنے کی، آیا ماسٹر جی کے گلاب کے پودے میں پھول کِھلا یا نہیں —

چڑیاں مندر کے چبوترے پر بکھرے باجرے کو چُنتی رہتیں۔ سورج پیپل کے درخت کے پیچھے چھپ جاتا۔ ریتیلے میدان میں گدھے اور بچے لوٹنا لگانا شروع کر دیتے۔ اور ماسٹر جی کے گلاب کے پودے میں کلی لگتی پھول نہیں کھلتا۔ ماسٹر جی نے لاکھ جتن کئے اُن کو آہستہ آہستہ معلوم ہو چلا تھا کہ پنگھٹ پر پانی بھرنے والیاں بھی اکثر ان کے طالب علموں سے دریافت کیا کرتی ہیں کہ گلاب کے پودے میں پھول کِھلا یا نہیں؟ اس وقت ماسٹر جی کے چہرے پر سُرخی سی دوڑ جاتی اور وہ گردن نیچی ڈال کر کچھ سوچنا شروع کر دیتے۔ "اب کے اس گلاب کے پودے میں پھول نہ کھلا تو اس کو ایک سرے سے اکھاڑ کر پھینک دونگا۔ لیکن ہر دفعہ یہی ارادہ تھا اگلی دفعہ وہ اس پودے میں ایسا کھاد دونگا کہ پھول ضرور کھلیں۔ اچھا اب ایک بار اور امتحان سہی۔"

— پنگھٹ پر کھلنے والے پھولوں سے ماسٹر جی کو دلی نفرت تھی

ہچکچاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے کئی بار اپنے طالب علموں کو منع کیا کہ وہ پڑھنے کے دوران میں کبھی پیاؤ پر نہ جائیں۔ اگر جائیں بھی تو صرف پانی پینے کے لئے۔ فضول وقت ضائع کرنے کے لئے نہیں۔ اگر ان کو زیادہ ہی پیاس لگتی ہے تو وہ اُن کے لئے ایک بڑا گھڑا خرید دینگے۔ اپنی جگہ سے اُٹھے اور جھٹ پانی پی لیا۔

شام ہوتی، پنگھٹ پر پیاسی آنکھیں ننھے طالب علموں کی طرف دیکھتیں لیکن ماسٹرجی کے ڈر کے مارے طالب علم اُن کے پاس تک نہ پہنچتے، ماسٹرجی دل ہی دل میں سوچتے آخر اُن لڑکیوں کو گلاب کے پودے کا کیوں خیال ہے۔ بیکار۔ اُن کو ان باتوں سے کیا مطلب۔ آخر وہ اس بارے میں پوچھتی کیوں ہیں۔ اگر پھول نہ کھلا تو نہ سہی، ہرج ہی کیا ہے۔ لیکن ماسٹرجی کو رہ رہ کر تعجب ہوتا تھا کہ آخر گلاب کے پھولوں کی تمنّا کیوں اُن پر غالب آتے جا رہی ہے۔ اُس تمنّا نے اُن کے دل و دماغ پر تسلّط کر لیا ہے اور اُنہوں نے تین چار دفعہ موتی رام سے بھی پوچھا تھا: "بھئی وہ کھاد کب ڈالوگے؟"

"ماسٹر صاحب ذرا موسم آنے دیجئے۔ میرے چاچا نے وہ کھاد استعمال کیا تھا تو کھیتی بہت زور کے ساتھ ہوئی" موتی رام نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

ماسٹرجی غور سے گلاب کے پودے کی طرف دیکھتے رہتے، ہری ہری کلی، بڑھتا ہوا ڈوڈا، سُرخ سُرخ ہلکے پیازی رنگ کا خول سا، نہایت ریشمی سا، ہلکے ہلکے نازک پتّے جو اُس خول کو سنبھالتے ہوئے ایک پھول، نہایت ہی شاندار گلاب کا پھول، نکھری ہوئی پتّیاں اور ... تمنّا کے پھول۔ گلاب کے پھول کی تمنّا نمودار ہو چلی۔ اُف کتنے پھول ... اتنے سارے مگر وہ جذبہ آہستہ آہستہ فرو ہوتا گیا۔ وہی گلاب کا فضول سا پودا، تنہا سی کلی، وہ بھی مُرجھائی سی، کچھ مری سی، اور موتی رام ... گلاب کے پھول کی تمنّا ... ایک ناقابلِ تکمیل تمنّا۔ لیکن جو برابر شعور کے تاروں میں جھنجھناہٹ پیدا کرتی رہتی۔ شاید روزِ ازل کا تاثر، جب خدا رُوح پھونکتا ہے تو پھولوں کی تمنّا بیدار ہوتی ہے۔ ماسٹرجی کو گلاب کے پھول کی تمنّا تھی۔ وہ ایک دوسری تمنّا کا غیر مرئی سایہ تھا۔ ایک ایسی تمنّا جو ماسٹرجی کے مستقبل میں جھانک رہی تھی اور حال میں صرف گلاب کے پھول میں جذب ہو چلی تھی۔ لیکن گلاب کا پھول کھلنے کا نام ہی نہ لیتا۔ انتظار ایک بے معنی انتظار۔

لڑکے موتی رام سے پوچھتے: "کیوں ابھی ماسٹرجی کے لئے کھاد نہیں لایا؟"

موتی رام کے دہن سے لعاب سا ٹپک پڑتا، پیشانی سُکڑ جاتی اور وہ راستے میں ہنسنا شروع کر دیتا۔ طالب علم بھی اس خوشی اور تبسّم میں شریک ہو جاتے اور شام کو جب سورج پیپل کے پتّوں کے پیچھے غروب ہوتا تو پنگھٹ پر پانی بھرنے والیاں پیاسی نگاہوں سے طالب علموں کی طرف دیکھتی رہتیں۔ اُنہیں ایک بیتابی سی ہوتی۔ ماسٹرجی نے گلاب کے پودے کے بارے میں گفتگو کی۔ اور ایک روز جب چڑیاں مندر کے چبوترے پر باجرے کے دانے چُگنے میں مصروف تھیں اور سورج پیپل کے پیچھے چُھپ رہا تھا، پنگھٹ پر پانی بھرنے والیاں ماسٹرجی کے کھلے ہوا والے مدرسے کے عین نزدیک سے گذریں۔

"موتی رام" ایک لڑکی بولی اور مُسکرا دی۔

"موتی رام گلاب کے پودے میں پھول کھلا؟" دوسری نے ذرا زور کے ساتھ کہا۔

"ماسٹرجی نمستے۔ آپ کے گلاب کے پودے میں پھول کِھلا؟" اور جھرمٹ کا جھرمٹ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

ماسٹرجی شرم کے مارے پانی پانی ہوتے جا رہے تھے۔ اُن کی گردن اور پیشانی پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے جمع ہو گئے۔ آخر اُن لڑکیوں کو ان کے گلاب کے پودے سے کیا سروکار ... بھولے سے مُنہ سے نکل گئی ہیں "موتی رام ... ماسٹرجی نمستے" اونہہ! اگر گلاب کے پودے میں پھول کھلا تو کھلا۔ اگر نہیں کِھلا تو نہ سہی۔ جائے گلاب کا پودا اور اُس میں آنیوالے پھول جہنّم میں۔

سورج پیپل کے درخت کے پیچھے چُھپ رہا تھا۔ ماسٹرجی کی نگاہیں گلاب کے پودے کی طرف دیکھتے دیکھتے تھک سی گئیں۔ وہ چپ چاپ کھڑے ہوئے اور میدان کی طرف چل دئے۔ اِدھر اُدھر کچے کچے کھنڈر سے کھڑے تھے اور مٹی کے ٹیلے ... ماسٹرجی نے دیکھا کہ اُن مٹی کے ٹیلوں میں خودرَو درخت ہیں اور اُن میں مختلف رنگ کے پھول کِھلے ہوئے ہیں۔ کتنے مست پھول ... لیکن ماسٹرجی گلاب کے پودے میں اتنی محنت کے باوجود بھی کیوں پھول نہ کھلا سکے۔ تھوڑا تھوڑا غصّہ اور شکست کا احساس۔ ماسٹرجی کے فلسفی دل نے کہا شاید وہ قدرت کے کاموں میں دخل نہیں دے سکتے۔ قدرت جس کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتی ہے وہ ہی نشوونما پاتے ہیں اور انسان جس پودے کو ترقی دینا چاہتا ہے وہ لاکھ جتن کرنے پر بھی نشوونما نہیں پاتا۔ ازل کا قانون۔ انسان قدرت کے سامنے بے بس ہے۔ مگر؟ ... ماسٹرجی نے پھر سوچا۔ آخر وہ لڑکیاں گلاب کے پھول کے بارے میں

یہاں اُگتے ہیں۔ اُنہیں کیا مطلب، ابھی دھرموری رام کے کمہار کی مدد سے خود پھول کھلیں گے۔ اور جب پنگھٹ پر آنیوالیاں گلاب کے پھول کے بارے میں دریافت کریں گی تو وہ خوشی خوشی اُن کو اپنے آنگن میں لے جائیں گے اور کہیں گے۔ یہ دیکھو گلاب کا پھول۔ گداز گداز باہیں، رنگ برنگی ساریاں، بغل میں گاگر، ہر قدم پر موسیقی کے سے ترنگ جگاتی ہوئی وہ آ کے آنگن میں روشنی پھیلا دیتی۔ وہ اُن سے کہیں گے: لو دیکھو گلاب کے پھول، کتنے سرخ اُن کے نازک ملائم رخساروں سے زیادہ سرخ۔ ماسٹر جی نمستے، کتنی شوخ اور طرار... سونا گھر، اکیلا دل، اور گلاب کا پھول... ایک سوتے ہوئے دل میں جاگتا ہوا احساس گلاب کے پھول کی تمنا، کل ہری ہری کلی، ایک ہلکے سرخ رنگ کا اندرونی خول اور ایک اُمید، کھلنے والی اُمید۔ "ماسٹر جی نمستے"۔ نمستے... اور وہ جوں جوں اس گلاب کے پودے میں پھول کھلیں گے توں توں وہ خوش ہوگا ایک پھولوں کی مالا... ماسٹر جی نمستے... نمستے! نمستے!!

"ماسٹر جی! ماسٹر جی!!" پجاری کا لڑکا چلا اٹھا۔ "ماسٹر جی آپ کا گلاب کا پودا بکری چبا گئی۔"

"ایں!" ماسٹر جی ہڑبڑا کر اُٹھے۔ "ایں!"

آنگن میں گلاب کا پودا زمین سے صرف دو انگل اونچا رہ گیا تھا۔ بکریوں نے اُس کا ستیاناس کر دیا تھا۔ ماسٹر جی کھڑے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں۔ اُن کو ایک عظیم رنج کا احساس ہو رہا تھا۔ گلاب کے پھول کی تمنا سرد پڑ چلی۔ وہ تمنا جو اب اصلی روپ میں جاگی تھی۔

دوسرے روز وہ لڑکیاں پھر ماسٹر جی کے مدرسے کے پاس سے گذریں۔

ایک لڑکی آگے بڑھی: "نمستے!"

ماسٹر جی کی نگاہ آنگن میں گھوم گئی۔ گلاب کا پودا صرف ایک پتوں سے خالی بھدی سی ڈنڈی رہ گیا تھا۔

"بکری کھا گئی" ماسٹر جی نے نہایت افسردگی سے فرمایا۔

لڑکیاں ہنستی ہنساتی پنگھٹ پر پانی بھرنے چلی گئیں۔ مندر کے چبوترے پر چڑیاں باجرے کے دانے چگنے میں مشغول تھیں۔ ماسٹر جی سوچ رہے تھے کہ شاید اب اُن کی تمنا کا پھول، گلاب کا پھول ضرور کھلے گا۔ آنگن میں پازیب کی جھنکار جنت کے نغمے، اور وہ ایک مالا تیار رکھے جائیں گے۔ اُس پازیب کی جھنکار کی حامل محبوبہ دیوی کو پہنانے کے لئے ... ماسٹر جی نمستے!

پنگھٹ پر لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں اور سورج پیپل کے پتوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔

پرتھوی ناتھ شرما

ایک شوہر کی خاطر

(بسلسلہ صفحہ ۱۲)

"شاید ان کے دو دو تین تین ساتھ ہوتے — بچے" انہوں نے وضاحت کی اور وہ گھبرا کر اپنے بچے گننے لگیں کیونکہ سوائے بچوں کے انہوں نے کچھ نہیں سنا۔

"کیا قصہ ہے" دوسری بولیں۔

جب معاملہ خوب سمجھا دیا گیا تو تینوں بگڑ کھڑی ہوئیں۔

"ابھی کہتی تھیں شادی نہیں ہوئی اور ابھی دو دو تین تین بچے ہونے لگے" ایک نے ڈانٹا۔

"میری کیوں نہ ہوتی شادی خدا نہ کرے۔ تمہاری ہی نہیں ہوئی ہوگی" بات بگڑنے لگی۔ پاس سے ایک ٹکٹ چیکر گذرے یا جانے کون تھے۔ مجھے تو ہر ریل کا نوکر ٹکٹ چیکر ہی سا لگتا ہے۔ میں نے جھک کر ان سے وقت پوچھا۔ وہ بتلانے کے بعد مسکرانے لگے اور مسکراتے ہی ہوئے چل دئے۔

"تم تو کہتی تھیں اکیلی جا رہی ہو۔ اور یہ تمہارے —"

"یہ میرا نواسہ ہے" قبل اسکے کہ وہ کوئی رونگٹک سا رشتہ قائم کرتیں میں نے خود ہی اپنے لئے فیصلہ کر لیا۔

"نواسہ؟" تینوں چیخیں۔

اللہ یہ آج ان لوگوں کو مجھ سے کہاں کا بیر پڑ گیا تھا کہ میرے کنبے کے ہر فرد کے ذکر پر بن بن کر چونک رہی تھیں۔

"کیا کہتی ہے لڑکی — یہ تیرا نواسہ کہ —"

"تو آپ کو کیا؟"

"بہن بال تو سفید رکھے تھے اُنکے" دوسری بولیں۔

"نزلہ سے ہو گئے ہونگے" میں بڑبڑائی۔

اور پھر میں بالکل کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ خودکشی کو دل نہ چاہا، چلتی ریل سے اترنے کی پریکٹس نہ کی۔ زمین سخت اور آسمان دور۔

ہونہار بات ہو کر رہتی ہے۔ جب زائد سامان تلوا کر بلٹی دینے لگا تو کلرک نے کہا: "آپ کا نام — شوہر کا نام؟"

"سجید!" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"جھکڑ؟ کیسا اچھا نام ہے" وہ آہستہ سے متعجب ہو کر کلرک کے کہنی ماری۔ یہ بتلانے کی شاید ضرورت نہیں کہ جب سے مجھے مسز جھکڑ بنا کر رسید دی گئی میں نے اسکے منہ پر اپنا بٹوہ مع ایک عدد موٹی کتاب کے کھینچ مارا۔ اور یہ سب کچھ تھا بس ایک شوہر کی خاطر!

عصمت چغتائی

نئی زندگی اور نیا ادب

ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہماری زندگی داخلی اضطراری اثرات کے دباؤ سے الٹی بدلتی رہتی ہے اور زندگی کے اس تغیر کا ادب پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔ اس طرح ادب اُن تمام ذہنی، احساساتی اور نظریاتی تغیرات کی عکاسی بھی کرتا ہے جو پس پردہ ہماری زندگی کو مختلف سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں اور جن کا تعلق براہِ راست ہمارے شعوری بہاؤ سے ہوتا ہے۔ ادب خواہ برائے ادب ہو یا برائے حیات دونوں صورتوں میں زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ محض فرق اتنا ہوتا ہے کہ اول الذکر بظاہر مسائلِ حیات کو چھوڑ کر فنی لطافتوں سے قریبی علاقہ ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت یہی تمام ادبی کاوشیں ہمارے شعور ذہنی سے تعلق رکھتی ہیں جو زندگی میں طرح طرح سے تغیر و تبدّل پیدا کرتا ہے، اور آخر الذکر ادب زندگی کے بکھیڑوں سے گریز کئے بغیر ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی قدروں کا تجزیہ کرتا ہے اور اُنہیں زمانے کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتا رہتا ہے۔ ہمارے حرکتی احساسات کے ماتحت جو تبدیلیاں ہمارے تصورات میں پیدا ہوتی رہتی ہیں وہی ہمارے نظریات زندگی کی تشکیل کرتی ہیں۔ ادب اگر ہمارے تفنن ہی ہو تو بھی اُس کی وجہ تحریک ہمارے نیچے درجے کے اساسِ ذہنی میں ہی ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ادب اور زندگی کو علیحدہ علیحدہ رکھتے ہوئے اُن کی حد بندی نہیں کر سکتے۔ ان میں سے کسی ایک کا منفرد مطالعہ مشکل نہیں جو ممکن ہوگا۔ کسی قوم کے ادبی ارتقا یا انحطاط کو سمجھے بغیر اس قوم کی سماجی زندگی کی تاریخ وار تفصیل پیش کرنا ایک لایعنی فعل ہے۔ بالکل اسی طرح ہم اپنے ادب کے ارتقائی احساسات سمجھے بغیر اپنی معاشرتی اور مجلسی زندگی میں کوئی قابل قدر انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔

ہمارے احساسِ عمل کے لئے روایتی تصورات اور ازلی حیاتیاتی نظریات کی رہبری نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ یہی تو ہماری تمام مساعی کو ایک واضح شکل دیتے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہونے چاہئیں کہ ہم اپنے ادب کی بنیادیں ان ازلی حیاتیاتی نظریوں اور کہنہ روایتی تصورات ہی پر رکھ دیں ایسا کرنے سے تو ہمارے ادب میں بہت بڑا ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا۔ ان کی رہبری تو ماضی اور حال کا فرق جانچنے اور مستقبل کی نئی راہیں نکالنے کے لئے ضروری ہے، اس لئے نہیں کہ ہم لکیر کے فقیر بن کر پرانی ڈگر پر چلتے رہیں اور زندگی کی رفتار کا احساس کئے بغیر آبائی تعیشِ ذہنی کے شکار رہیں اور اپنے جمالیاتی و روحانی ذوق کی تسکین کی خاطر ادب کو تفریح و تفنن کا ذریعہ بناتے رہیں۔ ہمارے اس زمانے نے جس میں زندگی کی گھڑیاں راحت و اطمینان کے ساتھ گذری ہیں ایسا ادب پیدا کیا ہے جو اپنی لطافتوں اور شیرینی کے سبب سے اونچا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ادب ایک خوشحال زندگی کا آئینہ دار اور اپنے دور کے رئیسانہ ٹھاٹ اور بے فکر زندگی کا مظہر ہے۔ بزم طرب۔ چنگ و رباب۔ ساقی، طرحدار معشوق۔ چست چولی۔ سرمگیں آنکھیں۔ کاکل پیچاں، مالیان خانے، غالیچے، قالین، مصاحب، دربان، پاسبان وغیرہ وغیرہ شاعروں یا ادیبوں کی تخلیق نہیں بلکہ اس زمانے کی زندگی کے لوازمات ہیں۔ بعینہٖ اُس زمانے کے ادب کی نوعیت، جب زندگی کو یہ تن آسانیاں میسّر نہیں تھیں بلکہ ہر چہار طرف کشت و خون کا بازار گرم تھا، ایک ریاست دوسری ریاست پر دانت لگائے بیٹھی تھی۔ ایک ملک دوسرے پر فوج کشی کر رہا تھا، جداگانہ ہے۔ اس زمانے کے شعرا میدانِ جنگ کے نقشے کھینچتے نظر آتے ہیں۔ کبھی فتح و ظفر کے شادیانے بجاتے ہیں اور کبھی حاکموں کی دلیری اور شجاعت کا راگ الاپ کر ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ رزمی ہے بزمی نہیں۔ اوّل تو وہ گیسو و رخسار اور بادہ و مینا کا ذکر ہی نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو وہی زبان وہ بھی محض غم غلط کرنے کے لئے۔ اصل یہ ہے کہ اُن کے نزدیک تلوار کی جھنکار اور تیروں کی سنسناہٹ، قلقلِ مینا اور رباب کے دلنشیں ترنم سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ ان کا ادب اس دور کی زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔

موجودہ دور جس پریشانی اور سراسیمگی سے گذر رہا ہے وہ بیک وقت تخلیت وہ بھی ہے اور اُمید افزا بھی۔ ہم عجیب و غریب ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں۔ ہمارے پہلے نظریے بدل رہے ہیں۔ اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل اس شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آ رہے ہیں کہ ہم اُن پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ مذہبی اور روحانی ادارے اپنی پرانی عظمت اور توانائی کھو چکے ہیں۔ سائنسی انکشافات نے ہماری زندگی کا رُخ ہی بدل دیا ہے۔ لہٰذا ہم جس فضا میں آنکھیں کھولتے اور چلتے پھرتے ہیں وہ ماضی سے بالکل مختلف [illegible]

رہنے سہنے کے ڈھنگ، سوچنے سمجھنے کے طریقے غیر معمولی طور پر بدل چکے ہیں۔ سیاسی بیداری نے جو سبق ہمیں سکھائے ہیں وہ پرانے ہونے کے باوجود ہمارے لئے بالکل نئے اور انوکھے ہیں۔ ہم صرف محکومی بے جا دباؤ کے خلاف نہیں بلکہ اس ادارے کی نوعیت اور ساخت کے بھی مخالف ہیں۔ اکثریت اور اقلیت کے سوالات ہمارے سامنے بار بار آ رہے ہیں۔ ہم اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے حقوق اور فرائض کی روشنی میں تمام سیاسی نظریات کی تشکیل چاہتے ہیں۔ ہماری فکر وطن کی چار دیواری سے آزاد ہو چکی ہے اور آہستہ آہستہ ایک عالمگیری تصور اس کی جگہ لے رہا ہے۔ آزادی جسے چند قومیں اب تک اپنا آبائی ترکہ سمجھے ہوئے ہیں نسلِ انسانی کی مشترکہ ملکیت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ قوم اور رنگ کے تفوق کا احساس پھیکا پڑتا جا رہا ہے۔ آزاد قومیں اگر اپنی آزادی برقرار رکھنے میں مصروف ہیں تو غلام قومیں اس کے حاصل کرنے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ یہ احساس تقویت پا رہا ہے کہ ملکی آزادی تمام عالم کی آزادی کا ایک جز ہے۔ ایسی صورت میں کسی ملک یا قوم کی آزادی کی بقا کے لئے عالمگیر آزادی کے تکمیل کا تحفظ لازمی ہے۔ وہ قومیں جو محض اپنے اقتدار اور اپنی آسانیوں کے پیشِ نظر سرپیکار ہیں اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہی ہیں۔ ہماری یہ وسیع النظری کسی ایک جذبے یا قوت کی پیداوار نہیں۔ یہ تو اُن تمام خارجی قوتوں کے دباؤ کا نتیجہ ہے جو تقریباً ہر ملک میں ایک ہی شدت اور ایک ہی اثر کے ساتھ کارفرما ہیں۔ ہمارے زاویہ ہائے نظر کی یکسانیت کا دار و مدار مشکلات کی مطابقت پر ہے۔ حقوقِ انسانی کے احساس نے صرف نسلی اور ذاتی امتیازات ہی کو نہیں مٹایا بلکہ مذہبی اختلافات کی آہنی دیواروں کے توڑنے کی کوشش بھی کی ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ خود مذہب نے جو سماجی اور اقتصادی قدریں قائم کی تھیں وہ موجودہ سائنسی دور میں تقریباً بیکار ہو چکی ہیں۔ ذرائع پیداوار کی پیدائش کی ملکیت نے جو زہر ہماری سماج میں پھیلایا ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ نظامِ موجودہ کی کہنگی اور روایتی تصورات کے بل بوتے پر مشینوں کی حکومت قائم ہی نہیں ہوئی بلکہ اپنے مضر اثرات کے ساتھ جاری ہے۔ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم جو مزدور، سرمایہ دار اور دلال کی صورت میں ہوئی ہے، سائنسی ایجادات کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ یہ تو ہمارے اس ذہنی ٹھہراؤ اور جعت پسندی کا نتیجہ ہے جو ہمیں زندگی کے پہلو بہ پہلو چلنے سے روکتی ہے۔ ہماری سب سے بڑی غلطی یہی ہوگی کہ ہم بدلی ہوئی دنیا میں پرانے اور فرسودہ نظریات کو قائم رکھیں اور اس نئے نظام کی اصلاح انہیں روایتی تعصبات اور مذہبی معتقدات کے ذریعے سے کریں جن کی استعمالی قدر وقت کے ساتھ ہی بدل چکی ہے۔ آمد و رفت کے سہل ذرائع نے ملکوں کی دوری مٹا کر مختلف تہذیبوں کے اجتماع کے لئے راستے کھول دیا ہے۔ خیالات کی نشر و اشاعت کے آسان اور ارزاں طریقوں نے زندگی کے سکونیاتی تصور کو مٹا کر ہماری شعوری زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ ہمارے تخیلات اور محسوسات نے دُنیا کو ایک نئے انداز میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ہمارے راستے نئے ہیں۔ ہماری منزلیں نئی ہیں۔ پرانے راستوں کے چھوڑنے سے پرانی منزلیں پیچھے رہ گئیں۔ نیا راستہ اختیار کرنا اور پرانی منزلوں کی جستجو کرنا ایک مضحکہ انگیز صورت ہوگی۔ غرضیکہ خارجی اور داخلی قوتوں کے عمل اور ردِ عمل نے مل ملا کر ہماری زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ہم ایک نئی زندگی کے حامل ہیں۔ ہمارا تصورِ حیات الہامی نہیں بلکہ زندگی کے دُکھ سکھ، تمنا، پستی اور ان کی بنیادی حقیقتوں کے مشاہدے کی عملی پیداوار ہے۔

ہماری موجودہ نئی زندگی اور ہمارے نئے حیاتیاتی نظریوں کی نمائندگی ہمارا نیا ادب کرتا ہے۔ قدیم و جدید اُردو ادب میں وہی فرق موجود ہے جو قدیم و جدید صورتِ زندگی میں ہے۔ موجودہ دور کے ادیب ناز و نیاز کی باتیں اس لئے درج نہیں کرتے کہ قارئین کی طبیعت بہلے، بلکہ وہ اُن کی جزئیات پر روشنی ڈال کر اُن کی نفسیاتی تحلیل کرتے ہیں اور اس طرح قارئین کو زندگی کے حقائق سے روشناس کرتے ہیں دلفریبیوں سے نہیں۔ یہ دلفریبیاں تو ضمنی ہوتی ہیں۔ جدید مصنفین کی رسمیات سے بغاوت مغربی ادیبوں کے اُس مطالعہ کی رہینِ منت ہے جو ہمیں انگریزی زبان کے توسل سے حاصل ہوا۔ مغربی ادب نے ہمارے تخیلات ہی پر اثر نہیں ڈالا بلکہ ہمارے اسالیبِ بیان، موضوعات کے چناؤ اور استدلال و استنباط کے طریقوں پر بھی اس کے گہرے نقوش پڑے ہیں۔ ہمارے نئے ادب کے تنوع کا دار و مدار قریباً تمام تر مغربی تحقیقات اور تجربات پر ہے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جا رہا ہے نئی نئی باتوں کا انکشاف ہو رہا ہے، نئی نئی بحثیں چھڑتی ہیں، نئے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اور ان نتائج کی روشنی میں زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ زندگی کی اس چھان بین کا بھرپور اثر ہماری ذہنی نشوونما پر پڑتا ہے۔ نیا ادب اس ارتقائے ذہنی کا انعکاس ہے۔ نئے ادب کی نشوونما جس فضا اور جن نظریات کے ماتحت ہو رہی ہے اُن کی تخلیق مارکس اور انجیلز جیسے ماہرینِ اقتصادیات، والٹیر اور روسو جیسے ماہرینِ عمرانیت اور جمیس اور فرائیڈ جیسے ماہرینِ نفسیات نے کی ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ قول کہ مغربی اور مشرقی زندگی کے درمیان جو

بعد المشرقین واقع ہے اُس کے پیشِ نظر ہم مغربی مفکرین کو اپنا رہبر کیسے تسلیم کرسکتے ہیں میرے نزدیک کچھ زیادہ درست نہیں۔ زندگی کی حقیقتیں ملک ملک اور شہر شہر کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتیں، زیادہ سے زیادہ اُنکی ہیئت ظاہری میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً جو اقتصادی اور سماجی اُلجھنیں یورپ والوں کا گلا گھونٹ رہی ہیں اور جن کا حل مارکس اور انجیلز نے پیش کیا ہے قریب قریب اُسی نوعیت کی مالی اور مجلسی مشکلات کا ہندوستانی بھی مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئے ادب کا گرانقدر سرمایہ عالمگیر معاشرتی اُصول ہیں۔ کسان، مزدور، قلی، سرمایہ دار، مل مالک، افلاس، بیکاری: حکومت، بغاوت، انقلاب وغیرہ وغیرہ ہمارے ترقی پسند ادباء و شعراء کے دلچسپ موضوعات ہیں۔ انقلاب کے فلک شگاف نعرے جس مستعدی کے ساتھ موجودہ نظم و نثر لکھنے والے لگا رہے ہیں اس سے پہلے شاید کبھی نہیں لگے۔ غیر ملکی حکومت کی جس شد و مد کے ساتھ آجکل مخالفت ہو رہی ہے اس کی مثال گذشتہ صدیوں کی ادبی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ اسی طرح سرمایہ داری، بیکاری اور مفلسی کے متعلق جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ لیکن تصویر کے دوسرے رُخ پر نظر ڈالے بغیر کسی آخری نتیجے پر پہونچنا ایک بڑی غلطی ہوگی۔ ہمیں یہ بغور دیکھنا چاہیئے کہ یہ شاعرِ انقلاب یا شعلہ فشاں ادیب اصطلاح اور فن کاری کے بھنور میں تو نہیں گر پڑے۔ ان کے نعرے اور ان کے انقلابی تصورات رسمی تو نہیں۔ ان کا احتجاج بجائے عوامی ہونے کے شخصی مفادات پر مبنی تو نہیں۔ ان سوالوں کا جواب ہمیں دوسرے طریقے سے ملے گا۔ جب ہم اپنی مدتوں کی کاوشوں اور ان کے افسوسناک نتائج پر نظر ڈالنے لگتے ہیں تو ہمارا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ ہمارے انقلابی ادب اور سرمایہ داری کے خلاف ہماری صدائے احتجاج نے ہماری سماج میں کچھ اُمید افزا تبدیلیاں پیدا نہیں کیں اس سلسلہ میں ہمارے نئے ادب کا سب سے بڑا کارنامہ ایک فضا کا قائم کرنا ہے اور بس۔ یہ کہنا کہ انقلاب بچوں کا کھیل نہیں اس میں صدیاں لگتی ہیں، پچھلے وقتوں کی باتیں ہیں، جب زندگی کی رفتار نہایت سُست اور احساسِ وقت نہایت مبہم اور مدھم تھا۔ موجودہ فضا میں پلنے بڑھنے والے جو زندگی کی تبدیلیوں اور وقت کی برق رفتاری کا کما حقہٗ احساس رکھتے ہیں۔ اس استدلال سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اصل بات یہ ہے ہمارے اکثر نظم و نثر لکھنے والوں کو محسوسات اور نظریات میں اصولی تضاد موجود ہے۔ اگر ہم کسی شاعرِ انقلاب کے دل کی گہرائی کو ٹٹولیں تو وہ بھی رجعت پسند نکلے گا۔ جب ہمارے قول اور فعل یا قول اور احساس میں فرق پیدا ہوجاتا ہے تو اس کا اثر قل

ہو جاتا ہے۔ اس کا کھوکھلا پن تو تھوڑا بہت چھپا رہتا ہے مگر اس کی اخلاقی حیثیت گر جاتی ہے۔ اس قسم کے شاعروں اور ادیبوں کا وقتی رجحانات کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے شور مچا مچا کر انقلاب اور بغاوت کے نعرے لگانا اور زندگی کی تشکیل میں ایمانداری کے ساتھ حصہ لینا دو متضاد چیزیں ہیں۔ ہمارے اکثر ادیب اور شاعروں کی یہ کوشش ہے کہ موجودہ دور کی ابتری سے فائدہ اُٹھا کر معاشرہ کے پُرانے گھروندے کو تو برباد کر دیا جائے مگر پُرانی بنیادوں کو قائم رکھتے ہوئے ان پر ایک نئی طرز کی عمارت استادہ کی جائے۔ جس میں گذشتہ نوابی ٹھاٹ دوبارہ جلوہ گر ہوں۔ حکومت کی مخالفت بھی کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ انہیں شخصی اور ذاتی تن آسانیاں میسر نہیں۔ نہ تو اب جاگیریں ہیں اور نہ آبائی ملک و میراث۔ حکومت کے پچھلے سو سال کے جبر و استبداد کا تذکرہ انہیں جن کوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کمپنی کے تشدد کا رونا رو کر پُرانے نوابی اور جاگیردارانہ نظام کی برمحل فضیلت ظاہر کرنا اُن کے احساسات پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ محض غیر ملکی حکومت کے مخالف ہیں اور جماعتی حکومت کے نہیں جس میں چند افراد لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہیں۔ وہ اُس حکومت کے بھی مخالف نہیں جو ہزاروں افراد کے خون پسینہ کی کمائی کو عشرت محلوں اور طوائفوں کے لئے زبردستی چھین لیتی ہے۔ اور ٹھیک بھی ہے اگر اُن کی مخالفت کریں تو وظائف کہاں سے ملیں۔ اُنکے نزدیک انقلاب کے زیادہ سے زیادہ معنی تبدیل حکومت ہے۔ وہ سماجی آزادی سے مطلق واسطہ نہیں رکھتے، انہیں تو اپنے رنگیلانہ تعیش کی زندگی کی آزادی درکار ہے۔ اُن کے نظریات کے مطابق اُن کے آزاد ملک میں حسین حسین عورتیں ہونگی۔ آبشار، رنگارنگ پھول، خوبصورت جھیلیں، چھوٹی چھوٹی کشتیاں، شراب اور پھلوں کے انبار ہونگے اور اُن آزاد لوگوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ کوئی صبح کی ہلکی ہلکی پھیلتی ہوئی روشنی میں ایک عورت کو آغوش میں لئے آہستہ آہستہ اپنی کشتی کھے رہا ہے۔ کوئی کسی پھلوں سے لدی پھندی وادی میں پڑا شراب پی رہا ہے، کوئی کسی چٹان کے سیاہ اور ڈراؤنے بڑھتے ہوئے سائے میں دُنیا و مافیہا سے بے فکر کسی شیریں دہن اور خوش الحان معشوق کا گانا سن رہا ہے اور کوئی کسی گل اندام کے عقیقی ہونٹوں اور مرمریں کلائیوں پر شعر کہہ رہا ہے۔ یہ انقلابی شاعروں کی دُنیا ان کے نزدیک آزادی ملنے اور سرمایہ داری کے برباد ہونے کے بعد بہشتی صورت اختیار کرلے گی۔ ان کی اس دنیا میں سوائے عاشقی کے کسی چیز کا چرچا ہی نہ ہوگا۔ نہ کام دھندے کی فکر ہوگی نہ فکرِ معاش۔ ان کے آزاد ملک کے پھلوں سے لدے پھندے باغات معاش

شفاف پانی کے چشمے اور فضا کی ہر ہر موج اُن کی رُوح کو بالیدگی بخشے گی۔ انکا عیش و نشاط جنّت کے وصول کو شرمائے گا۔ اس قسم کے ترقی پسند ادیب اور شاعر کلیتہً مذہبی اداروں سے برگشتہ نظر آتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ اُن کی افادی حیثیت اور اصلاحی قدروں کے مخالف ہیں، بلکہ اس لئے کہ اس قسم کے ارادے سے اُن کی تخیلی دُنیا تک پہونچنے یا اُس دنیا میں پہنچنے کے بعد اُن لذائذ سے محظوظ ہونے میں مانع ہیں جو اُن کی فکر و نظر کی انتہا ہے۔ ایسے شاعر سماج کی اصلاح زندگی کی نئی صورت سے تشکیل کر سکتے ہیں یا نہیں، کوئی مشکل سوال نہیں۔

نئے ادب میں ایک دوسرا گروہ ادیبوں اور شاعروں کا ایسا بھی ہے جو فن کاری اور حقیقت نگاری کے سبب سے ترجمانِ حقیقت کہلاتا ہے۔ رکشا، مزدور، قلی، کسان، فقیر، مہاجن، سود خوار وغیرہ وغیرہ ان کے مضامین کی جان ہیں۔ عموماً یہ لوگ ہماری سماجی، مالی اور معاشرتی اشکال کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ مگر خالصتاً اقتصادی، سماجی، مذہبی یا سیاسی تذکروں کے لئے علیحدہ شعبے موجود ہیں۔ مثلاً اقتصادی معاملات کا تذکرہ اور مالی مشکلات کا حل ہمیں علمِ اقتصادیات میں آسانی سے مل سکتا ہے اگر ہمیں عمرانی گتھیاں سلجھانی ہیں یا اُن کی بالتفصیل ومربوط شرح میں پیش کرنی ہیں تو لازم ہے کہ عمرانیات میں کریں۔ اسی طرح سیاست، فلسفہ، تصوف وغیرہ میں ہر منفرد موضوع کی تفصیل وار بحث ہو سکتی ہے۔ علم کی شعباتی تقسیم کی غرض و غایت یہی ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے عمیق نظر ڈالی جائے۔ یہ تقسیم موضوعات کی نوعیت پر مبنی ہے۔ ہر بحث اپنی مقررہ حدود میں رہتی ہے اور یہی صورت ادب اور سائنس کی تفریق کا باعث ہوتی ہے۔ جب ہم زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد مقررہ حدود سے نکلتے ہیں اور اپنے بالاستیعاب مشاہدے و مطالعہ کی روشنی میں نئی زندگی پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو نئے ادب کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ نیا ادب کسی ایک یا ایک سے زیادہ خارجی قوت کی نمائندگی نہیں کرتا۔ بلکہ ان تمام عمرانی، معاشری، معاشیاتی، نفسیاتی، روحانی اور مادّی طاقتوں اور اُنکے زندگی پر مجموعی اثرات کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر ہم صحیح پس منظر کا خیال رکھیں گے تو قدیم و جدید ادب کا فرق اور امتیاز ایک اضافی اصطلاح بن جائے گا۔

موجودہ شاعروں کی طرح میر اور تقی سے بھی زمانہ کی بے رُخی کا گلہ ہے۔ ان کی شاعری بھی طبیعت کی آزردگی، فقیروں کی توجہ نانی اور مزدوروں کی محنت اور نادِری سے نا آشنا نہیں۔ ہمارے موجودہ رکشا، مزدور، کسان اور قلی سے ہمدردی رکھنے والے شاعر بھی ذرا بدلے ہوئے انداز میں اُس افلاس اور زمانہ کی پریشانیوں کا حال بیان کرتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ تمام خارجی و داخلی قوتوں کا مجموعی حیثیت سے تجزیہ نہیں کرتے اور ماحول، زندگی اور موجودہ گوناگوں پیچیدگیوں کے ربط کو سمجھے بغیر مادّی مشکلات کو پس منظر قرار دیکر زندگی کے کسی ایک رُخ پر تنقید کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ قارئین اُن کے محسوسات اور تخیلات سے اثر پذیر نہیں ہوتے بلکہ اُن کی طبیعتوں پر صرف محاکات کا اثر پڑتا ہے۔ فنی لطافتیں، انوکھے استعارے، دلکش تشبیہیں اور لطیف اندازِ بیان اُن کی نظموں کو فنی اعتبار سے بہت اونچا کر دیتی ہیں لیکن تخیل اور احساس کی کمی، کسی خاص نظریۂ حیات کا فقدان اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قارئین زندگی کے نشیب و فراز اور اُسکی بنیادی حقیقتوں سے بیگانہ رہتے ہیں اور مصنفین کے لئے موضوعات کا سرمایہ نہایت قلیل رہ جاتا ہے۔ ایک ہی قسم کے مضامین مختلف اندازوں اور مختلف عنوانوں کے ساتھ پیش کرنے کے علاوہ ان کے لئے کوئی راہ ہی نہیں رہتی۔ درحقیقت نئے ادب کا دار و مدار افسانے کی ٹیکنیک، نظم کے ردیف و قوافی، الفاظ کے ترنم، تشبیہات کے لوچ وغیرہ پر اتنا نہیں جتنا کہ مصنف کے تخیلات اور محسوسات پر ہے۔

نئے ادب میں جنسیات کا بھی بڑا دخل ہے۔ جیمس جوئیز، ڈی۔ ایچ لارنس، الیگزینڈر کیرن کی طرح ہمارے ترقی پسند مختصر افسانہ نگاروں نے جنسیاتی معاملات کی تحلیل کی ہے۔ رنڈیوں، کسبیوں، کالج کی لڑکیوں، مغرب زدہ خواتین، فیشن ایبل عورتوں، دیہاتی الھڑ اور سادہ لوح لڑکیوں، غرضکہ ہر درجہ اور ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والی کمسن، ادھیڑ اور سن رسیدہ عورتوں کی زندگی اور اُن کے جنسی محسوسات کا اُنہوں نے بڑی کامیابی اور خوبی کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے۔ افسانوی حیثیت اور فن کے لحاظ سے بھی اُن کی کہانیاں اور نظمیں بہت اونچا درجہ رکھتی ہیں۔ واقعات اور جذبات کی نفسیاتی تحلیل اُن کی کوششوں کو بہت کامیاب بنا دیتی ہے۔ اس شعبۂ ادب میں مردوں کی طرح کچھ تعلیم یافتہ آزاد خیال عورتوں نے بھی نمایاں حصّہ لیا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو جنسی عریانی میں یہ عورتیں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا یہ خالص مغربی طریقۂ تنقید ہے۔ جہاں تک مغربی اور مشرقی نظریات کا سوال ہے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک حد تک ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں۔ ہمارے بہت سے مسائل زندگی بھی بہت کافی یکساں ہیں لیکن ہمارے معاشرہ کی موجودہ

صورت مغربی سوسائٹی سے بہت کافی مختلف ہے۔ مغربی ممالک میں جنسی تعلیم ایک طرح سے لازمی سی ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے ملک میں خانگی ہی بمشکل آٹھ فی صدی ہے۔ عام تعلیم، آزادیٔ خیال اور رسمیات سے آزادی نے وہاں کے ہر مرد و عورت کی کافی طور پر ذہنی نشوونما کر دی ہے۔ ہمارے ملک میں جہالت، توہم پرستی، غلامی، رسم و رواج کی پابندی اور روایتی تعصبات نے مل ملا کر عورت اور مرد دونوں کے خیالات کو حد درجہ ناپختہ کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں مغربی جنسی ادب کا موجودہ دور میں تتبع خلافِ مصلحت ہوگا۔ ناپختہ اور نیم تعلیم یافتہ نوجوانوں اور لڑکیوں کے کردار پر جو اثر اس قسم کے ادب کا پڑے گا وہ ہماری جنسی خرابیوں میں مزید اضافہ کرے گا۔ اس قسم کے ادب کی تخلیق سے پہلے لازم ہے کہ ہم تعلیم کو عام بنا کر عوام کی ذہنیت کو ایک اونچی سطح پر پہونچا دیں اور اپنے ادب کے شائقوں میں اتنی سکت پیدا کر دیں جو اس حقیقت نگاری کے بار کو برداشت کر سکے۔ ہماری ذہنیت کی باقاعدہ نشوونما اور عام تعلیم کا اثر ممکن ہے ہماری سماجی لعنتوں کا خاتمہ کر دے۔ جنسی بھوک اور جنسی معاملات ہماری اس بغاوت کا نتیجہ ہیں جو ہماری روح نظامِ کہنہ کے خلاف کرتی ہے۔ اگر یہ نظام بدل جاتا ہے تو جسمانی و روحانی بغاوتوں کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔

نئی زندگی، اُس کی رُوح اور اس کے تقاضات کو سمجھے بغیر نئے ادب کی تخلیق ناممکن ہے۔ نئے ادب کی بنیادیں پرانے تصورات پر قائم کرنا ایک بڑی غلطی ہے۔ اس کی بنیادیں اُن تصورات پر رکھنی چاہئیں جو زندگی کی نئی صورت اور اُس کے عناصر ترکیبی کا نتیجہ ہیں۔ ہم زندگی کے پہلو بہ پہلو چل کر ہی نیا ادب پیش کر سکتے ہیں۔

سید مسعود زاہدی

اِحساس

دن چڑھ آتا، اور وہ اپنے بستر پر بے جان سی پڑی رہتی۔ جیسے چینی کی کوئی مورت ہو، یا ربڑ کی کوئی گڑیا۔ جسے کھینچ کر مبا کر کے وہاں لٹا دیا گیا ہو۔ سفید چہرے پر اِدھر اُدھر کالے کالے بال بکھرے پڑے ہوتے۔ اور سورج کی کرنیں اُن پر ایک جال کا بُن دیتیں۔

پھر آہستہ آہستہ یہی جال ٹوٹ جاتا۔ اُس کے دھاگے بکھر کر سوئیاں بن جاتیں، اور اُن کی چبھن سے بے چین ہو کر وہ ایک دو مرتبہ پہلو بدلتی۔ اُس وقت ربڑ کی گڑیا سکڑ جاتی۔ اور سورج کی چبھتی ہوئی کرنیں اس سے کہتیں: "زینی۔ اب تو اُٹھ، رات تو کب کی جا چکی" اور اس کی نگاہوں کے سامنے ایک لمبا سا دن پھیل جاتا۔ ایک اُداس سا بے مصرف دن جس کا آخری سرا کہیں نظر ہی نہ آتا ہو۔ اور وہ یوں محسوس کرتی جیسے اُس کا دل بجھتا جا رہا ہے۔ اور روح پر کسی نے کوئی بوجھ رکھ دیا ہے۔ اور پھر اُسے یقین ہو جاتا کہ رات واقعی ختم ہو چکی ہے۔

پچھلے اٹھائی مہینے سے ہر روز یونہی ہوتا تھا۔

ساری رات وہ جیسے آسمانوں پر رہا کرتی تھی۔ جھیل کے کنارے زمیندار کا مکان، اُس کی دوسری چھت، نرم بستر، اُجلی چادریں، چنبیلی کے ہار، اور ہواؤں کے نرم و سرد جھونکے، جیسے دیوتا پنکھا جھل رہے ہوں۔ زمیندار کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں اور اُن میں اب سفیدی بھی جھلکنے لگی تھی۔ اُس کی چھاتی پر بالوں کا جو جنگل تھا، وہاں بھی سیاہی اور سفیدی ایک دوسرے سے لپٹی نظر آتی تھی۔ مگر اُس کے بازو اب تک فولادی تھے۔ اور جب راتوں کو یہ بازو زینی کی کمر کے گرد لپٹا کرتے تو اُسے کئی مرتبہ یہ خیال آتا کہ "بڑھاپا اور جوانی تو غریبوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ امیر جوان ہی پیدا ہوتا ہے اور جوان ہی مرتا ہے" پھر کھردری مونچھیں اُس کے نازک گال چھیلنے پر تل جاتیں۔ ہوا کے سرد جھونکے اُسے لوریاں دیتے۔ چنبیلی کی خوشبو مدہوش سا کر دیتی۔ اُجلی چادریں اُسے چھپ جاتے کہیں چھپا لیتیں۔ وقت کی رفتار کبھی مدھم ہو جاتی اور کبھی تیز۔ ستارے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے۔ ساری دنیا کو وہ بھول جاتی، اور کائنات پر جیسے نقاب سا کھنچ جاتا۔

مگر صبح ہوتے ہوتے یہ نقاب اُٹھ جاتا۔ ابھی آسمان پر ستارے چمک رہے ہوتے تھے کہ اُس کا بوڑھا باپ اُسے زمیندار کے ہاں سے واپس لے آتا۔ پھر جب وہ اپنے صحن میں قدم دھرتی تو اُسے اپنے پاؤں من من بھر کے معلوم ہونے لگتے۔ جیسے وہ میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہو۔ اور جب وہ تھکن سے چُور ہو کر اپنے آپ کو اُس بستر پر گراتی، جو ساری رات اس کا انتظار کرتا رہا تھا تو اُسے یوں معلوم ہوتا جیسے آسمان یہاں سے بہت دُور ہے اور زمین پر کانٹے ہی کانٹے بچھے ہیں۔ اور اُسے آسمانوں سے زمین پر پھینک دیا گیا ہے۔ پھر ستاروں کی چمک آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگتی۔ نیلا آسمان طرح طرح کے رنگ بدلتا دکھائی دیتا۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں بے جان سی ہو جاتیں اور ایک مرتبہ پھر اُسے دُنیا بھول جاتی۔

اِس بھول اور پہلی بھول میں کتنا فرق تھا؟ ۔۔۔ یہ صرف وہی جانتی تھی۔

پھر صبح کو جب وہ اُٹھتی تو اُس کے بدن پر سوئیاں چُبھ رہی ہوتیں۔ اور اُسے اپنے سامنے ایک لمبا، اُداس اور بے مصرف دن پھیلا ہوا دکھائی دیتا۔

وہ زمیندار کو تب سے جانتی تھی جب وہ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ اور زمیندار نے بھی شاید اُسے اسی زمانے سے دیکھ رکھا تھا۔ کیونکہ وہ اکثر کہا کرتا تھا: "زینی۔ تم ابھی چھوٹی ہی سی تھیں تو تمہاری آنکھوں نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا، میں تمہارے لئے قیامت تک جیتا رہوں گا؟" یہ کہتے کہتے وہ اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگتا۔ اور ہنستے ہنستے کہتا: "تمہارے انتظار نے یہ بال سفید کر دئے ہیں۔ زینی، سچ ہونا، تمہارے انتظار نے۔" اور اُسی وقت زمیندار کی آنکھیں زینی کو اس قلندر کی آنکھوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں جو سارا دن میاں سیدے کی خانقاہ میں بیٹھا، ہیر رانجھا، کے گیت الاپتا رہتا تھا۔

میاں سیدے کی خانقاہ کا زینی کی زندگی سے نہایت گہرا تعلق تھا۔ یوں تو وہ بچپن میں بھی اُسی سڑک پر کھیلا کرتی تھی۔ جو ضلع سے گاؤں کو آتی تھی۔ اور جس کے عین کنارے پر یہ خانقاہ تھی۔ مگر

کچھ عرصے سے تو وہ وہاں جانا اپنا فرض سمجھنے لگی تھی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ہی اُسے پتہ چلا تھا کہ اُن کی ڈیڑھ بیگھ زمین جس کے سہارے وہ اور اس کا باپ ابتک جیتے رہے تھے، زمیندار نے کسی وجہ سے چھین لی ہے۔ اور اب اُسکے باپ کی زندگی زیادہ کٹھن ہوگئی ہے۔ کیونکہ اس بڑھاپے میں اس کا کوئی سہارا بھی تو نہیں ——— وہ اکثر سوچا کرتی تھی "کاش میں اس کے دُکھ کو ہلکا کر سکتی"

وہ سمجھتی تھی۔ اس کے پاس صرف دعائیں ہیں۔ دُعائیں، جن میں زہر کو بھی تریاق بنا دینے کی تاثیر ہوتی ہے۔ اس لئے وہ یہ دعائیں میاں سینے کی خانقاہ پر نچھاور کرنے کیلئے ہر روز جایا کرتی تھی۔

اس کے پاس دُعاؤں کے سوا کچھ اور بھی تھا ——— یہ اُسے بہت بعد میں معلوم ہوا۔

ایک شام کو زمیندار کا آدمی اُن کے گھر آیا۔ اور اسکے بوڑھے باپ کو بلا کر لے گیا۔ دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ اور تیسرے دن بھی۔ اور چوتھے دن سے زینی نے یوں محسوس کیا جیسے اس کے باپ کا پیار اُس سے بڑھ گیا ہو۔ اس کا باپ جو پہلے ہمیشہ چُپ چاپ سا رہا کرتا تھا اب کچھ باتونی سا بن گیا تھا۔ اب وہ بیٹھے بٹھائے یونہی باتیں چھیڑ دیتا اور کہتا "دیکھو نا بیٹی۔ زندگی کی راہ بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ اس میں کانٹے ہی کانٹے بچھے ہیں۔ جب تک یہ کانٹے مسلے نہ جائیں آگے قدم بڑھانا ممکن نہیں۔ اور تم جانتی ہو جب کانٹے مسلے جائیں تو پاؤں کے تلوے دُکھتے ہیں" پھر وہ دُکھ اور سُکھ کا تذکرہ کرتا کہ ان کے بغیر زندگی کا توازن ہی نہیں رہ سکتا۔ پھر یونہی باتیں کرتے کرتے اُسے اپنی کھوئی زمین یاد آجاتی، اور زمیندار یاد آجاتا۔ اور وہ کہتا "زمیندار اتنا بُرا نہیں جتنا ہم نے اُسے سمجھ رکھا ہے۔ بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ وہ اب بھی ہماری زمین ہمیں واپس دے سکتا ہے۔ اگر تم ——— اگر تم ———"

اس کے بعد اُس کے گلے میں الفاظ جیسے چپک جاتے۔ وہ کھانسنے لگتا۔ اور پھر جیسے وہ گھبرا رہا ہو۔ اپنی بات وہ اُدھوری چھوڑ دیتا۔ اور باہر نکل جاتا۔

آخری بات سنتے سنتے نجانے کیوں زینی کی گردن جھک جاتی۔ پھر جب اس کا باپ باہر نکل جاتا تو وہ یوں محسوس کرتی جیسے اُس کے عضو عضو میں سُستی بس گئی ہو۔ اور اس وقت لمبی انگڑائیاں پھر انگڑائیاں آتیں۔

آہستہ آہستہ باپ کی ادھوری باتیں اسکے ذہن میں پھیلتی گئیں اس نے ان کا مطلب پالیا۔

آخر وہ شام آئی جب اُس نے پہلی مرتبہ تھرکتی ہوئی موچھیں دیکھیں۔ اور زمیندار سے سُنا "تمہارے انتظار نے یہ بال سفید کردیے ہیں زینی" سنتی ہو نا۔ تمہارے انتظار نے ——— اور پہلی مرتبہ اُس نے سوچا "جوانی اور بڑھاپا تو غریبوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ امیر جوان ہی پیدا ہوتا ہے اور جوان ہی مرتا ہے"

زندگی کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ ڈیڑھ بیگھ زمین میں زینی کے باپ کا ہل دوبارہ چلنے لگا۔ زندگی کی راہ پر بچھے ہوئے کانٹوں کو زینی مسلنے لگی۔ مگر اُسکے تلووں نے کوئی چبھن محسوس نہ کی۔

زخم جب تازہ ہو تو خُون کی گرمی درد کا احساس مٹا دیتی ہے۔ مگر جلد ہی وہ وقت بھی آتا ہے جب درد اپنی تمام شدت سے ظاہر ہوتا ہے۔

اڑھائی مہینے کے بعد ایک اور شام آئی۔

اُس شام کو زینی اپنے گھر میں تنہا تھی۔ اور اُس کے ذہن میں ایک خیال گھوم رہا تھا ——— اپنے باپ کا خیال ——— جو ابھی تک کھیتوں سے واپس نہ لوٹا تھا۔ "اتنی دیر لگا دی" اب کئی خیال اس کے ذہن میں تیرنے لگے۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ اُس کے دل نے اُس سے کہا "شاید کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہو" اور پھر خیال ہی خیال میں اُسے ایک مدھم سی آواز سُنائی دی "تم تیار ہو نا" اور لمبی انگڑائیاں سی آنے لگیں۔

ہر شام کو اُس کا باپ آتے ہی اُس سے یہی پوچھا کرتا تھا "تم تیار ہو نا" اور وہ جانتی تھی، یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز بہت مدھم ہوتی تھی۔ بے جان سی۔ مگر اُس شام کو جب وہ آیا تو اُس کی آواز مدھم نہ تھی۔ آج اُس میں زندگی کی دھڑکن تھی۔ اور پھر آج اُس نے آتے ہی وہ بات نہ پوچھی، جو وہ ہر روز پوچھا کرتا تھا۔ بلکہ آج اُس کا پہلا سوال تھا "کھانا پکا چکیں"

زینی کو یوں محسوس ہُوا جیسے کوئی راہی چلتے چلتے راستہ بھول گیا ہو۔

"ہاں ———"

کاش اس میں اتنی ہمت ہوتی کہ وہ بھولے بھٹکے راہی کو اصلی راستہ بتا سکتی۔

بات اصل میں یہ تھی کہ پانچ، چھ شہری لڑکے اُسی صبح کو جھیل دیکھنے آئے تھے، اُن کا خیال تھا کہ وہ شام کی گاڑی سے لوٹ جائیں گے، مگر گاڑی چھوٹ گئی اور وہ رہ گئے۔ اب شہر کی طرف جانے والی پہلی گاڑی رات کو بارہ بجے کے بعد وہاں سے چلتی تھی۔

اور وہ سب بھوکے تھے۔

بوڑھے کو کھیت سے آتے ہوئے وہ راستے میں ملے تھے اور انہوں نے اُس سے کسی ایسی دُکان کا پتہ پوچھا تھا جہاں سے انہیں کوئی کھانے پینے کی چیز مل سکے۔

مگر اُس چھوٹی سی بستی میں ایسی دُکان کوئی نہ تھی۔ جب بڈھے نے انہیں یہ بتایا تو اُن میں سے ایک چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا لڑکا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "بڑے میاں، تمہارا گھر تو یہیں ہے نا۔ بس ہمیں اپنے گھر سے کھانا کھلا دو، عمر بھر دُعائیں دیتے رہیں گے۔"

بوڑھے کا خیال تھا گھر میں جو چیز بچی ہوگی اُسے بھلا یہ شہری کب پسند کریں گے۔ اس کے علاوہ وہ مقدار میں بھی کم ہوگی مگر وہ شہری چھوکرے کہنے لگے: "ہمیں سب کچھ منظور ہے۔ تم جو بھی لاؤ گے ہم کھا لیں گے جتنا لاؤ گے ہم اُسی پر گزارہ کر لیں گے۔"

اور اب وہ سب کے سب باہر کھڑے تھے

گھر میں صرف دو باجرے کی روٹیاں تھیں اور تھوڑا سا ساگ تھا۔ زینی نے چپکے سے روٹی اور ساگ ایک تھال میں رکھ دیے جب وہ یہ تھال بوڑھے کے ہاتھ میں دینے لگی تو بڈھے نے کہا: "اگر تھوڑا سا گھی ہو تو وہ بھی اوپر ڈال دو۔" اور پھر شاید بیٹی کو خوش کرنے کے لئے وہ ہنسنے لگا: "بڑے گھروں کے معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں باجرے کی روٹی اُن کے نازک حلق کو چھیل نہ ڈالے۔" اور پھر ذرا رک کر کہنے لگا۔ "بڑے آدمیوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد بڈھا تھال اُٹھا کر باہر نکل گیا۔

اور پھر وہیں گلی میں دروازے کے قریب ہی ایک ہڑبونگ مچا۔ وہ سب کے سب اُس تھال پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے نہ وہاں باجرے کی روٹی رہی اور نہ ساگ۔ اب گلی میں صرف ہنسنے کی آوازیں سُنائی دینے لگی تھیں، اور یہ آوازیں صاف کہتی معلوم ہوتی تھیں کہ "ہمارے حلق نازک تھے مگر باجرے کی روٹی اِن سے بھی زیادہ نرم تھی، وہ یہاں سے پھسلتی ہوئی گذر گئی اور ہمیں پتہ بھی نہ چلا۔"

ایک کہہ رہا تھا: "مجھے خیال تک نہ تھا کہ باجرے کی روٹی بھی اتنی مزیدار ہو سکتی ہے۔"

اور ایک اور نے کہا: "ساری عمر میں اتنا لذیذ ساگ آج تک نہیں کھایا تھا۔"

اور اُن کا چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا ساتھی تو اچھل اچھل پڑتا تھا۔ "کھانا تو ہر کوئی پکا سکتا ہے، مگر پکانے کی تمیز کسی کسی کو ہی ہوتی ہے۔"

بوڑھا اُن کے پاس کھڑا خاموشی سے مسکراتا رہا اور دروازے کی اوٹ میں کھڑے کھڑے زینی کی نگاہیں دو تین بار اُن چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر جا کر اٹک گئیں۔ جو چاند کی روشنی میں سُنہری نظر آ رہی تھیں۔

زینی کو سُنہرا رنگ بہت پسند تھا۔

کچھ دیر کے بعد خالی تھال لئے بوڑھا جب گھر میں داخل ہونے کے لئے مڑا تو اسی چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے نے اپنی گردن ذرا آگے کو بڑھا کے اپنے ساتھیوں سے کہا: "یقین جانو۔ باجرے کی روٹی کے کنارے اتنے چٹپٹے اور لذیذ کبھی ہو ہی نہیں سکتے جب تک انہیں کسی حسین اور نازک ہاتھ نے نہ چھوا ہو۔"

اُس کے دوسرے ساتھیوں نے مسکرا کر جاتے ہوئے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ جو اپنے آپ میں مگن جا رہا تھا۔ اُس نے یہ بات شاید نہیں سُنی تھی۔ مگر دروازے کے پیچھے کھڑی زینی نے یہ بات سُن لی۔ اور یونہی بغیر سوچے سمجھے اُس نے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کو دبا ڈالا۔

اسی وقت بوڑھا گھر میں داخل ہوا۔ وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔ آتے ہی وہ کہنے لگا: "کبھی کبھی امیر بھی محتاج ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں غریبوں کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں۔"

یہ سنتے ہی زینی کی نگاہ نہ جانے کیوں اُس بڑے سے اونچے مکان پر جا پڑی، جو جھیل کے کنارے چاند کی روشنی میں کھڑا جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے باپ نے یہ کہہ کر اُن لاتعداد سیڑھیوں پر جو وہاں کی دوسری منزل تک جاتی ہیں، تھوک دیا ہے۔

مگر زینت نے اپنے باپ کو غلط سمجھا تھا۔ وہ اُن آدمیوں میں سے تھا جو بہت سی باتیں کہہ تو دیتے ہیں مگر سوچتے نہیں۔ جن کے دماغ میں بہت کم خیال آتے ہیں۔ اور اگر کوئی خیال آ بھی جائے تو اُس کی گرفت دماغ پر بہت نرم ہوتی ہے اور وہ بہت جلد کوئی اثر چھوڑے بغیر مٹ جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد بڈھا جب [illegible]

"اُف آج کتنی دیر ہو گئی ہے"

اور پھر وہی پُرانی بات ۔۔۔

"زینی بیٹا، تیار ہونا"

مگر زینی نے آج پہلے کی طرح نہ تو گردن ہی جھکائی اور نہ ہی اپنی جگہ سے اُٹھی۔ وہ ہلی تک نہیں۔ جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی بس کہا تو یہ کہا "نہیں میں آج نہیں جاؤنگی"

بوڑھے نے ایک مرتبہ اُس کی طرف گھور کے دیکھا "دیر تو ہو گئی ہے۔ مگر جو کام کرنا ہو سو کرنا ہے"

زینی کی گردن اکڑ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خوفناک شعلہ بھڑک رہا تھا "میں نہیں جا سکتی۔ میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے۔

بوڑھا تڑپ اُٹھا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"آخر کوئی بات بھی ہو"

"بات کچھ بھی نہیں، مگر میرا دل نہیں مانتا"

بوڑھا اس کے قریب آگیا اور سمجھانے لگا "دل ملنے یا نہ ملنے مگر وہاں جانا ہی ہوگا"

زمیندار، ڈیڑھ بیگھہ زمین، آنے والے دن، بوڑھے نے اُسے سب اُونچ نیچ سمجھائی۔ مگر وہ نہ مانی۔ پھر اس نے زینی کی منتیں کیں "اٹھو بھی، پچھتانہ کرو" مگر وہ اور زیادہ چڑ گئی۔ پھر بوڑھے کے نتھنے پھول گئے۔ اور اس کی سانس میں ایک تیزی سی آگئی۔ اُس نے اُسے ڈرایا، دھمکایا، دو ایک مرتبہ تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ بھی بڑھایا۔ پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اور پھر بوڑھا برداشت نہ کر سکا۔

اُس نے لاتوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مگر وہ چیخ چیخ کر یہی کہتی رہی "نہیں جاؤں گی۔ اب نہیں جاؤں گی۔ عمر بھر نہیں جاؤں گی"

آبلے پھوٹ پڑے تھے اور جلن سے وہ تڑپ رہی تھی۔

کاش بوڑھا یہ جان سکتا!

محمود ہاشمی

> **خریدارانِ ساقی سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر کریں ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہیں۔**
> (منیجر)

نگاہِ اوّلین ——— (بسلسلہ صفحہ ۲)

اور بدی کی تعلیم لگا سکتی ہے؟ اُن کا مشن تو گمراہ نوجوانوں کو راہ راست پر لانا تھا۔ آپ انہیں بگاڑنے کے لئے پیدا نہیں ہوتے تھے یہ کام تو "اسیر کمندِ ہوا" قسم کے شاعروں ہی سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس شتر بے مہاری کے بدترین دور میں یہ کام سنجام دیا جا رہا ہے۔ مگر ایک غلام قوم کے نیم مُردہ احساسات سے "مرے کو مارے شاہ مدار" ایسا سلوک ایک صحیح ادیب کے شایانِ شان نہیں۔

تمہید میں یہ جو تھوڑی بہت تعریف کر دی جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ لوگ علامہ مرحوم کی خوبیوں کے دل سے قائل ہیں بلکہ اس لئے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو عوام جن کی عقیدت مرحوم کی ذات اور کلام سے بدرجہ غایت ہے، بدک جائیں گے اور اُنہیں اس زہر چکانی کا موقع نہ مل سکے گا جو وہ آہستہ آہستہ کرنا چاہتے ہیں۔ دُنیائے ادب میں موجودہ طوفانِ بے ادبی علامہ مرحوم کی وفات کے بعد سے پنجاب میں بالخصوص بے طرح اُٹھ رہا ہے اس "تحریک بدی" کا مقصد بظاہر یہی ہو سکتا ہے کہ علامہ مرحوم کی حیات پرور تعلیم کے اثرات کو جو انکی زندگی میں دلوں میں پیدا ہو چکے تھے زائل کر دیا جائے مگر ان "آسکر وائلڈی" اور موپاسانی ادیبوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا ادب جو اُن کے غیر ذمہ دار قلم پیش کر رہے ہیں زیادہ دیر فروغ نہیں پا سکتا۔ قوم کا سنجیدہ طبقہ اور معقول عوام بھی جو نظر رکھتے ہیں ان بظاہر حسین عبارت آرائیوں کے جال میں پھنسنے کو تیار نہیں۔ اب وقت ہے کہ ادیب اپنے فرائض کو جو بحیثیت ادیب فطرت نے ان پر عائد کئے ہیں سمجھیں اور علامہ مرحوم کی تعلیم کی تخریب کے درپے ہونے کے بجائے اس کی ترویج کا سچے دل سے بیڑا اُٹھائیں۔ ورنہ معاف فرمائیں اگر کوئی شوخ طبع اہلِ درد اُن سے یہ سوال کر بیٹھے۔ ۔۔۔

ادیبوں کے بہو بیٹی نہیں کیا؟
چھپر کھٹ پر کوئی لیٹی نہیں کیا؟
ادیب اور بے ادب؟ استغفراللہ!
ہماری قسمتیں ہیٹی نہیں کیا! (امین حزیں)

جو نظم بعنوان "ادب طغیان و جنگ زندگی نیست" لف ہذا رسالہ خدمت ہے اس کی شانِ نزول اس خط میں مفصل عرض کر دی گئی ہے۔

——— **امین حزیں**

؎ نظم آئندہ کے ساقی میں شائع ہوگی۔ شاہد

تمہیدی مزاح

موج کی حالت ایک مخرف کن سطحی زندگی ہے جس میں کامیابی مذاق مگر ناکامی مضحک ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے محنتِ شاقہ اور جذبات کی شدت دیکھی ہے خوب جانتے ہیں کہ سنجیدہ زندگی میں ہم کس طرح اس روحانی حالت کی طرف اکثر انحراف کرتے ہیں۔ سنجیدہ سے سنجیدہ کوششوں میں بھی اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کسی اچھی اور خوش آہنگ سوسائٹی میں بہت سے افراد زندگی کا بیشتر حصہ خوشی سے گذار سکتے ہیں۔ کم از کم ایسے فارغ البال اور خوش مزاج لوگوں کی افزائش کے لئے ایک کوشش تو کر سکتے ہیں جو زندگی کے روزمرہ دھندوں میں نہ پڑتے تو ریل کی طرح ہر وقت خوش رہ سکتے۔ خیر اس حالت کو جانے دیجئے۔ ہماری اخلاقی غلامی اور مالی پریشانی کی ذلیل حالت میں بھی خوشی کے انکاری پہلو کی نشوونما ہوتی ہے۔ ذوقِ مزاح جو ہماری زندگی کا نقشہ بدل دیتا ہے اس حالت میں بھی پروان چڑھتا ہے۔ یہ ذوق مشکل ترین، پریشان کن اور پھیکے بے لطف کاموں میں ہمارا ساتھ دیتا ہے اور لطیف تفنن کی ڈھال سے ہمیں اُن چیزوں سے بچاتا ہے جو بصورتِ دیگر مایوسی کی تلخیوں کا معمولی مگر ایک برافروختہ کن سلسلہ بن جاتا۔ یہ ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہم نئے تجربے کر سکیں اور اپنی کوششوں میں متواتر مصروف رہیں اور اس عمل کو جاری رکھ سکیں جس کے ذریعے دماغ اپنے احساسات کو اشیائے خارجہ کی طرف من حیث العلت رجوع کرتا ہے۔ یہ ہماری جبلتوں کو لچکدار بنا دیتا ہے۔ یہ ایک ناگزیر چھوٹا سا داخلی جاذب صدمہ ہے۔ ایک جبلت ہے جو بُری بات کو حتی الامکان اچھا بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

اگر آدمی کافی ذکی الحس ہو تو خوشی سے ہنستے وقت ہر حالت میں اس کی ہنسی میں ایسا عنصر ضرور موجود ہوگا جس میں آنسوؤں کا بھی امکان ہو۔ ایسے شخص نے کوئی صدمہ سہا ہے یا کسی چیز میں ناکام رہا ہے۔ اگرچہ وہ آرٹسٹ کے مزاح میں علی رغم التوقع بہت کامیاب ثابت ہوتا ہے مگر روزمرہ زندگی کے مزاح میں وہ اکثر ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ اس کے مزاحیہ مفہوم کی اہم مستعدی اس ہوشیاری سے [illegible] ہوتی جس کے ساتھ وہ کبھی ہر کب سے [illegible] مسرت کو ڈھونڈ لیتا ہے بلکہ خوش آمدید کی اُس چالاک چمک سے جس کے ساتھ وہ کسی موقع پر متوقع خوشی کی غیر حاضری پر اس کے قطعی فقدان کا استقبال کرتا ہے۔

مثلاً جب آدمی غالیچہ میں ٹانکا بھرنا چاہتا ہے مگر اسکی بجائے اپنی انگلی میں سوئی چبھو لیتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک خوشی سے محروم رہ گیا ہے۔ اگر یہ موجی کیفیت سے بہت دور نہیں ہے اور ٹانکا نہایت ہی سنجیدگی سے نہیں لگا رہا تھا تو اس حالت میں بھی اُس کے لئے مُسکرانا ممکن ہے۔ کم از کم قدرت کا منشا یہی ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر مُسکرائے۔ کیونکہ اگر قدرت نے سنجیدہ زندگی میں انسان کو مزاح تک رسائی بخشی ہے تو اس کا مقصد یہی ہے کہ مفلوک الحالی، مصیبت، پریشانی اور بے چینی کے باوجود بھی اس کی قوت ہاضمہ برقرار رہے اور اس کے بال بچوں کی زندگی محفوظ رہے۔

چنانچہ مزاح سب جذبات سے زیادہ فلسفیانہ جذبہ ہے۔ یہ ہماری جبلی فطرت کی طرف سے ان باتوں کا اعتراف ہے جو ذہن کی پاکیزہ غور و فکر ہم تک پہونچاتی ہے۔ مسرت اور درد ہمیں برقرار رکھنے کے ضمنی مدد کے علاوہ اس معاملہ میں بالکل غیر جانبدار ہیں۔ ہمارے لئے ناکامی اتنی ہی دلچسپ ہے جتنی کامیابی۔ نیک و بد صرف اس لنز کا نام ہے جس سے ہمارا عزم الحیاۃ گرد و نواح کی چیزوں کو دیکھتا ہے اور چونکہ زندگی میں نیک و بد دونوں ہیں لہذا وہ عزم جو ان میں عملاً تمیز کرتا ہے وہ ان دونوں کی شاعرانہ تصدیق کرتا ہے۔ ذوقِ مزاح ظریفانہ حکمت سے ہمیں دعوت دیتا ہے کہ آؤ اس امتیاز کو بہت سنجیدگی سے نہ دیکھو!

جب زندہ دلی کارگر نہیں ہوتی تو وہ لوگ جن کی طبیعت میں اس جس کا غلبہ ہوتا ہے اقتدار کا سنجیدہ تخمینہ لگانے لگتے ہیں اور اس میں انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ ان کا تخمینہ شہابی ہوتا ہے مزاحیہ لوگوں کی سنجیدگی میں ایک ملال ہے۔ انہیں مقاصد یا لغہ میں آسانی سے سکون میسر نہیں ہوتا۔ اُن کی آنکھوں کی چمک کی وجہ ہے وہ اس دُنیا سے بلند ہیں۔ ایک سادھو کی طرح نہیں [illegible]

سے گریز کر کے کسی سنجیدہ مذہب سے ہی لگا لیتا ہے بلکہ ایک بچے کی طرح جاپتے کھلونوں سے بلند ہوتا ہے۔ وہ ان کی اصلی قدر جانتے ہوئے ایک لمحے کے لئے ان کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ مایوس نہیں ہوتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ کھلونے اُس کی نظر سے ہی اپنی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

مارک ٹوین جو تحریریں چھوڑ گیا ہے ان میں واقعی مایوسی کا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ مگر فلسفیانہ انداز سے لاتعداد انسانی زندگیوں کی بے حقیقی کے متعلق کہتا ہے کہ "یہ ایک غلطی، ایک ناکامی اور ایک بیوقوفی تھی" مگر یہ مذہب زدہ انسان امریکہ کے عقائد و توہمات اور مذہب کے معاملہ میں حد درجہ اعتقاد کا تحریری رد عمل ہے۔"

وہ لکھتا ہے: "ہر نئی نسل پہلی نسلوں کی تقلید کرتی ہے۔ اسی بے سود راستے پر گامزن ہوتی ہے اور اپنے اجداد کی طرح فنا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک، دو اور لاکھوں نسلیں ایک ہی ویران راستے سے اسی سفر سے گزرتی ہیں۔ اور وہی کچھ حاصل کرتی ہیں جو ان سے پہلے اور بعد کی نسلوں نے حاصل کیا۔۔۔ صفر!"

ظاہر ہے یہ بچہ اپنے اجداد کے خیالی تصنع سے تنگ آ چکا تھا مگر یہ تصنع کا نقطۂ نظر ہی تھا جس نے اس کے شعور کو اس قدر قنوطی اور افراطی فصاحت سے مالا مال کر دیا ہو۔

ایجابی طریقے سے اگر [illegible] کے نظریۂ زندگی کو دیکھا جائے تو اس میں لطافت کی بجائے جوانمردی اور دلیری زیادہ نظر آتی ہے۔

[illegible] ظریفوں کا فلسفی ہے۔ اس کا یہ مفروضہ کہ زندگی جو کچھ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور اشیا کی قدر کا کوئی خارجی یا ماورائے ادراک جواز نہیں؛ ذوقِ مزاح کے طبعی مفہوم کا نتیجہ ہے۔ وہ لوگ جن کی فطری قابلیت ہی ان اقدار کی عاملی تقلیب پذیری میں ہے کسی طرح بھی اس رائے سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ شاید دنیا نے کبھی ایسا بڑا ظریف نہ دیکھا ہو جس کی گہری الٰہیات میں بھی ایک بے باک اور عالی ظرف وسواس کی جھلک ہے۔

مزاح سب چیزوں سے زیادہ مذہب سے مختلف ہے۔ مگر ہماری اخلاقی تنظیم میں خود مزاح ایک ایسا ہی منصب ادا کرتا ہے اور مذہب انفرادی ارادوں کی ناقابل برداشت شدت سے نجات دلاتا ہے۔ مزاح جہاں یہ کام جذبات کی ایک ہلکی سی تخفیف سے [illegible]

طرز عمل سے ادا کرتا ہے۔ مذہب ہمارے جذبات کی سنجیدگی پر حاشیہ آرائی کر کے کسی ایسی چیز کی تلاش کرتا ہے جو ذات سے بالاتر یا محض خیالی ہو اور تقدیر کے انقلابات سے بالکل محفوظ ہو۔ تاکہ لوگوں کو وہ اس سے منسلک کر سکے اور ان سب کو یا ان میں سے اکثر کو اطمینان کی ایک متعین اور ناقابلِ منسوخ عادت میں جکڑ دے۔

صوفی اسی شاندار عادت سے اپنا صبر و تحمل حاصل کرتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ زمانے کی حقیقت کے تلخ دھارے کے نقص اور خامیاں خدا کی ابدی تکمیل کا ایک حصہ ہیں۔ اس سے وہ تکلیف اٹھا کر خوش ہوتا ہے۔ ظریف بھی اسی منزل پر پہنچتا ہے مگر ایک دوسرے راستے سے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام خامیاں مضحک ہیں کسی حد تک صوفی اور ظریف دونوں شاعر کے خالص زندگی کے تجرباتی نظریہ سے دور چلے جاتے ہیں اگرچہ دونوں متضاد سمتوں میں نکلتے ہیں۔

اس لئے تعجب کی بات نہیں کہ صوفی مزاح کے پاکیزہ جوہر سے بے بہرہ ہیں اور ظریف اکثر متقی اور زاہد مزاج نہیں۔

نماز اور ظریفانہ ہنسی میں بعد المشرقین ہے۔

[illegible]

اور دیگر زاہد فلسفیوں کا ادعا کہ وہ حضرت عیسیٰ کو ہنستا ہوا تصور نہیں کر سکتے خدا کی بابت اُن کے نظریہ کا صحیح اشاریہ ہے۔

جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے مزاح لازمی طور پر کینہ توز ضرر رساں یا بے ادب نہیں ہوتا لیکن طبعاً سنجیدہ احساس کے اس متعین اجتماع سے جسے ہم پارسائی کہتے ہیں، یہ متباین ہے۔ اس کا جوہر انجماد نہیں لچک ہے۔ اس کی غرض ایک وحدت نہیں تنوع ہے۔ وقت نئے انکشافات کسی مذہب سے یہ زیادہ آؤ بھگت کرتا ہے۔ سائنس کے لئے یہ ایک بہتر اور کارآمد ساتھی ہے۔ کسی مخصوص مذہب کی قید یا دماغی پابندیوں سے بالکل آزاد ہو۔ لہٰذا تحقیق سے اس کی کوئی دشمنی نہیں۔ بلکہ جذبات کی سختی کو ملائم کر کے مزاح عمل تصدیق کی راہ سے سب سے بڑی رکاوٹ دور کر دیتا ہے۔

کیا خالص پاکیزہ سائنس درحقیقت ان معانی کے درمیان جو منطقی سائنس نے کام کے مقاصد کے لئے بنا رکھے ہیں ایک سرگرم یا کشش کمیل نہیں ہے؟ [illegible] نے اپنا انکشافات

شلق سمجھا تھا کہ وہ ایک بچے کے انکشافات ہیں جو خیالوں سے بنا ہو۔

بہرحال خالص سائنس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ اس حد تک بھی ہو سکے انسانی اقدار سے اپنا دامن بچائے اور مزاح نے اقتدار کو قبول نہ کرنے کا حکم ہے یا یوں کہیے کہ یہ جارحانہ تسلیم مزاح کا دوسرا نام ہے۔

ہم پوری ہمت اور خوش تدبیری سے کوشش کرتے ہیں کہ دنیا سے ہمیں خوشی حاصل ہو لیکن جب دنیا ہمیں متواتر مایوس کرتی ہے تو ہم کہتے ہیں: بہت اچھا ہم اس مایوسی میں بھی ایک خوشی تلاش کریں گے۔ یہ ہے ہمارا ذوقِ مزاح۔ اس کا وجود ہی تقدیر سے ایک مذاق ہے۔

افضل اقبال

بنگالی نظم سے

شاعر کا پیغام

کیا یہ اللہ کی مہربانی نہیں ہے؟
کیا یہ اُسی کا سہارا نہیں ہے؟
جہاں شکست اور ہار کا دیو منھ پھاڑے استادہ تھا،
وہاں فتح و نصرت کی قندیل جوان اپنی شعاعیں منتشر کر رہی ہے ——!

اس سرزمین میں جو بحیرۂ احمر عبور کر کے آئے تھے —— آج لعنت و ملامت اُن کے گلے دبا رہی ہے، اُن کا خُون چوسنے کے لئے گریبان نکال رہی ہے۔ آج وہ شرم اور لاج کے دامن میں منھ چھپاتے ہوئے ہیں اور تم نے اللہ کی قوت سے اُس کا سہارا حاصل کیا ہے!

جس کے دل میں طمع اور حرص نے ڈیرے ڈالے ہیں، اُس کا کوئی مذہب نہیں، اُس کی کوئی ذات نہیں، اس کا صرف ایک ہی نام ہے —— راکشش! اسے دنیا کا ٹھکرایا ہوا۔

جو دنیا میں حسد اور بغض کے جال بچھاتا ہے، خانہ جنگی کی آہنی زنجیریں تیار کرتا ہے —— اس کی نجات نہیں ہے۔ وہ مسلمان ہو یا ہندو، بدھ ہو یا عیسائی! جو قوت حاصل کر کے بیکسوں اور کمزوروں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھاتا ہے —— وہ بھیانک دیو ہے، راکشش ہے —— اُسے اللہ کی بے آواز لاٹھی ہی دُنیا سے نیست و نابود کر سکتی ہے —— اُس کا جسم دوزخ کے لال لال انگاروں کے ڈھیر میں جل جل کر راکھ ہوگا۔ اُس کا وجود نیک انسانوں کے پاؤں کے نیچے ہے!

تمام قوتوں کا مالک وہی ایک اللہ ہے، اس کی طاقت لافانی ہے۔ وہ سب سے بالاتر ہے! اسکے برابر کوئی نہیں —— میں اُسی کی راہ میں اگر انسانوں کا رشتۂ اخوت استوار کروں گا۔ مجھے کسی کا خوف نہیں۔ میں نڈر ہوں، بیباک ہوں۔ جس کی کوئی ذات نہیں اس کا ایک اللہ ہے، کیونکہ وہ ذات پات کی بندشوں سے آزاد ہے —— وہ آہستہ آہستہ تمام ستم پروروں کا وجود اس صفحۂ ہستی سے دھو رہا ہے۔

جو اُس کی راہ میں بوسہ دیتا ہے، سجدۂ عبودیت پیش کرتا ہے وہی در حقیقت مسلمان ہے —— ہاں وہی مسلمان ہے جو خدا کے واحد کے فرمان کو سر آنکھوں پر رکھتا ہے

دھو ڈالو خود غرضی اور دور کر دو بغض و عناد۔
پھینک دو ان خس و خاشاک کے انباروں کو، آؤ اللہ کی شمشیر اُٹھائیں!

اُتار ڈالو گلے سے طوق غلامی کی زنجیریں، خشک کر دو شک و شبہات کے گندے نالے!

اے گونگے اور بہرے انسانو! گوش بر آواز ہو، سُنو! خالق ارض و سما تمہیں آواز دے رہا ہے —— گھبراؤ نہیں۔ لعل و گہر تمہاری راہ میں بچھا اور رکھے جائیں گے ابھی تم نے اس کی روشنی کی جھلک دیکھی ہے —— ایک دن یہی نورانی جھلک نظروں کے سامنے برہنہ پا ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے انسان کی راہ میں یہی روشنی رہنمائی کرے گی!

دیکھو! دیکھو! آگ کی بلند و بالا چنگاریاں اطراف عالم کو اپنے دامن میں لپیٹ کر اِدھر بڑھی چلی آ رہی ہیں —— ساری دُنیا غرق ہو گئی ہے۔ لیکن بندۂ خدا! سُنو، جو اپنی راہ میں عزم راسخ کے ساتھ گامزن ہے وہ اس کی چنگاریوں کا لقمہ نہیں بن سکتا۔ —— اُسی کی نجات ہے!

ہوشیار! ہوشیار!!
غافل آنکھیں کھول! دیکھ جنگ عظیم کے رُوپ میں اُس کا خوفناک "فرمان" ظاہر ہوا ہے! خواب گراں سے اُٹھ! اس کے نام کا ورد کر! دیکھ اُسی کی قوت و عظمت کی فتح ہوگی۔ نیند کے ماتے! غفلت کی زنجیریں پاش پاش کر ڈال —— اس کے فرمان کی تعمیل کر!

اُٹھ! اللہ کی شمشیر کو پکڑ —— پھر دیکھ لینا سارے خوف پل بھر میں دُور ہو جائیں گے!

سُن نادان! ماسوا کے سامنے کبھی سجدۂ عبودیت پیش نہ کرنا —— تیرے اس سجدے کی قیمت سوائے اس وحدۂ لاشریک کے کسی کو نہیں معلوم —— تو شہنشاہیت اور استعمار پرستی کا [illegible] ہو رہا ہے لیکن —— نہیں جانتا کہ استعمار پرستی راہ نجات نہیں [illegible] صرف اُسی کی راہ اختیار کر بیوقوف!

[illegible]

[illegible]

[illegible] اللہ ... وہی ہمیں عروسِ حریت سے ہمکنار کریگا!
وہی ... کا اسم ثابت ہے، وہی تیرآشوب دوپہر منزل کا محافظ ہے۔ وہی
راہِ مستقیم کی سمت ہمیں لے جائیگا!

ہمدم! اس کے عطا کردہ کرم کا شکرادا کر۔ اس کی
... لازوال ہے، غیر فانی ہے۔ لیکن آہ! کیا انسان کبھی آزادگی اور
... حاصل کرکے آستانِ حق میں جبہ سائی کرتا ہے؟ اس نے ہمیں
... جیسی دائم ابد دولت عنایت کی۔ اس نے جنت، جہنم اور دنیا
... اساس کھڑی کی!

مجھے کسی "ازم" پر اعتقاد نہیں، میں کسی شہنشاہ کو نہیں مانتا
— میں صرف اُسی کی پرستش کرتا ہوں، اُسی کا جام محبت میرے لبوں
سے پیوستہ ہے! جو لوگ "پھوٹ" اور "تقسیم" کا پرچار کرتے ہیں —
وہ پاپی ہیں، ملعون ہیں، شیطان کے بھائی ہیں —

ہمدم! وہ دن بہت قریب ہے جب ایسے بازیگروں کے
کھیل ختم ہو جائیں گے!

ہمیں معلوم ہیں اس دنیا میں زندہ رہ سکوں گا یا نہیں لیکن
ہمدم! تم دیکھ لینا کہ آخر میں پاپی انسان خدا کے آگے اشک فشاں
آنکھیں لیکر سجدہ کریں گے۔ اگر مجھ جیسے حقیر اور غلام انسان کی
پیشین گوئی حقیقت بن گئی تو میرے یوم پیدائش کی ساری تکالیف و
مصائب کی چنگاریاں سرد ہو جائیں گی!

انسان خدا کی محبت پاکر ہمیشہ تقدس کی زندگی بسر کرسکتا
ہے۔ اور اُس کی پاک روشنی سے اندھیری گھاٹیاں منور ہوسکتی
ہیں!

مترجمہ: محمد یونس احمر — قاضی نذرالاسلام

اور دہلی کے باکمال پیسہ پیسہ کو محتاج ہوگئے۔ تو وہ راز جو صدیوں سے

سینہ بسینہ چلے آتے تھے انھوں نے بھوک سے لاچار ہو کر بتلانے شروع

کردیئے۔ "جدید مکمل باورچی خانہ" مغلوں کے زمانہ کی کھانوں کی کتاب

ہے جس کو اب انگریزی کھانوں کی ترکیبیں ملا کر شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب

میں قورمہ۔ پلاؤ۔ متنجن۔ مرغ۔ شکار۔ پراٹھے۔ انڈے۔ بادام کا سالن

کباب مچھلی اور ہر قسم کے ذائقہ دار پکوان۔ حلوے بادام پستہ ہر

قسم کے مزیدار مٹھائیاں۔ کیک۔ بسکٹ۔ حلوہ سوہن۔ مربے چٹنی

مختلف قسم۔ ہر قسم کی چاء۔ انگریزی کھانے۔ ناشتے۔ شربت لسی آئس کریم

فالودہ۔ پوریاں۔ غرضکہ ہر قسم کے کھانوں کی آسان ترکیبیں اس کتاب میں ہیں۔

قیمت مجلد [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلین

[illegible] حضرت جو ازراہ کرم [illegible] طلب [illegible] سو ملتا ہے [illegible]
[illegible] علاوہ ہمارے لئے بھی آسانیاں مہیا کر سکیں گے جو مضمون ادارہ ساقی کی فرمائش پر [illegible]
[illegible] ادا کرنے کا ذمہ دار ادارہ ساقی ہے اور جو مسودات بے طلب موصول [illegible]
[illegible] تو ادارہ ساقی کو ان کی ذمہ داری قبول کرنے سے معذور رکھا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ [illegible]
[illegible] نہیں کی جاتی اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ مضمون میں کیا کیا خامیاں [illegible] کی وجہ سے [illegible]
[illegible] یہ بتا سکتے ہیں کہ مضمون شائع ہو سکتا ہے یا نہیں یہ نہیں بتا سکتے [illegible]
[illegible] ہماری کچھ مجبوریاں ہیں، جنہیں ہم ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں [illegible]
[illegible]

[illegible] پروفیسر فراق کی پر مغز باتیں [illegible] امین حزیں کی [illegible]
[illegible] امید ہے کہ بہت دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ فضل صاحب نے ایک بڑے دلچسپ [illegible]
[illegible] سراج حسین نقوی کا مضمون حسب معمول ایک خاص افادی حیثیت رکھتا ہے۔ ظفر قریشی [illegible] ترجمہ [illegible]
[illegible] افسانے لکھنے شروع کئے ہیں جو بہت مقبول ہو رہے ہیں۔ افضل اقبال نے [illegible] ڈرامہ لکھا ہے [illegible]
[illegible] کے علمی مضامین پسند کئے جا چکے ہیں۔ چندر کانت پہلی بار بزمِ ساقی میں شریک ہوئی ہیں [illegible]
[illegible] کے افسانوں سے وہ کمی پوری ہو رہی ہے جو کرشن چندر کے نہ لکھنے سے پیدا ہو گئی ہے۔ ابو سعید قریشی نے [illegible]
[illegible] امید ہے کہ آئندہ افسانوں میں بھی یہی دلکش طرز قائم رہے گی [illegible] صاحب نے [illegible] زدہ زندگی کی ایک
[illegible] ہے۔ حصہ نظم میں میراجی، ندیم قاسمی، راحت سعید، تابش، نہال، [illegible] کا تازہ ترین کلام
[illegible]

[illegible] کیلئے مضامین موصول ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے [illegible] پروفیسر [illegible]
[illegible] تحلیل، لندن سے آغا محمد اشرف نے [illegible] عوام [illegible] افسانہ [illegible]
[illegible] نے [illegible] ظفر قریشی نے [illegible] کہانی [illegible]
[illegible] کے علاوہ اور کون کون سے مضامین ہوں گے یہ آپ دسمبر کے ساقی میں ملاحظہ فرمائیں۔

[illegible] اکتوبر کے ساقی میں امین حزیں کی نظم [illegible] کی [illegible]
[illegible] پانچویں شعر [illegible] مصرع [illegible] اور [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] ساقی کی ضخامت [illegible] صفحے رہ گئی ہے جس کی وجہ سے [illegible]
[illegible] ممکن نہیں رہی۔

باتیں

۲۸ [illegible]

کہا جاتا ہے کہ محض مادی ضروریات کا پورا ہونا انسانی زندگی کی آسودگی اور اطمینان کے لیے کافی نہیں ہے۔ انسان محض روٹی سے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] لیکن انسان [illegible]
کہتے ہیں ؎

[illegible] گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

لیکن [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] انسان [illegible]

شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

۲۹ [illegible]

یہ سب [illegible]
[illegible]
آخری [illegible] ایک شعر [illegible] ؎

[illegible]

[illegible] ؎

[illegible]

خوشا کہ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی سے

سپاہیوں تباہیوں کے درمیاں بڑھے چلو ۔۔۔ مثالِ بادِ برشگال و خوفشاں بڑھے چلو

(۳)

ہاں تو کوئی مذہب کوئی پیغام کوئی عقیدہ اور ایمان ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا۔ اس تہذیب کے دن پورے ہو چکے ہیں اور کہئے کہ ہم تیرہ سو یا تیرہ ہزار برس پہلے بن چکے ہیں۔

ہزاروں مشعلیں گل کر چکا ہے وقت کا دامن ۔۔۔ تمام نورِ ایماں سر بسر ظلمت ہو چکا ہے

آج انسانیت مستقبل قریب کی اشتراکی تہذیب سے یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے، سے

جہاں میں تھی فقط افواہ تیرے آنے کی ۔۔۔ چراغ دیر و حرم جھلملاتے ہیں کیا کیا

یہ دنیا کچھ اس طرح بدلے گی یارو ۔۔۔ کہ دنیا کو پہچانتا ہوگا مشکل

انقلاب جہاں کی باری ہے ۔۔۔ آسمانوں پہ خوف طاری ہے

بہت دشوار گذار راستوں سے ہوتا ہوا نیا زمانہ آ رہا ہے۔ اس کی پیشانی پر اس کے خونِ جگر کے قطرے جھلک رہے ہیں، سے

نادیدہ فضاؤں میں تارے ہیں چمک کے ۔۔۔ یا چہرۂ فردا پر قطرے ہیں پسینے کے

آج وقت کی پکار یہ ہے، سے ۔۔۔ پوچھ مت کیفیتیں ان کی نہ پوچھ ان کا شمار ۔۔۔ چلتی پھرتی ہیں میرے سینے میں جو پرچھائیاں

انقلابِ فرانس پر رومان رولاں نے اپنے ایک ناٹک میں لکھا ہے کہ انقلاب جب آتا ہے تو کوئی چیز اتنی غیر متوقع نہیں ہوتی جتنا انقلاب۔ انقلاب سے ٹھیک قبل خواہ کسی اور چیز کی امید ہو یا نہ ہو لیکن انقلاب کی امید ہرگز نہیں ہوتی۔ انقلاب اپنے آپ سے لوگوں کو بے خبر و غافل بنا کر چپ چاپ آگے بڑھتا ہے۔ اس کے اچانک پن ہی میں انقلاب کی انقلابیت چھپی ہوتی ہے۔ انقلاب ایک ایسی بات ہے جسے ہم اپنی ٹھیٹ زبان میں آن ہونی بات کہتے ہیں۔ سے

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق ۔۔۔ کتنی آہستہ اور کتنی تیز ہے

(۳)

ہاں تو ذرا روحانیت و مادیت و دہریت، مذہبیت و لامذہبیت کے معاملے پر غور کیجئے۔ ایک زمانہ تھا جب مظلوم انسانیت اپنی روح کی فلاح کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنی تمام مادی و جسمانی ضرورتوں کے لئے بھی پیغمبران دین کی طرف آنکھیں اٹھاتی تھی۔ کرشن، بدھ، زرتشت، موسیٰ، عیسیٰ، محمد کی طرف دنیا کھنچ اٹھی تھی۔ اس لئے کہ ان کی چلائی ہوئی تحریکوں اور ان کے بنائے ہوئے نظام سے اہلِ دنیا کی مادی و جسمانی ضرورتیں پوری ہوں اور دنیاوی زندگی کسی گت کی بن سکے۔ یہ سب پیغمبر سیاسی بانی تھے اور غور کرو تو سب کے سب لامذہب تھے۔ لیکن کل تک جو کچھ بھی حال رہا ہو آج یہ حال ہے کہ نہ تو ان پیغمبروں کا مذہب آڑے آ سکتا ہے نہ ان کی لامذہبیت ہمارے کام آ سکتی ہے۔ ان کا قائم کردہ نظم زندگی آج بے فیض ہی نہیں ضرر رساں ہے۔ خدا کی عمر کتنی ہو چکی اس کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے۔ اب اس سے خدائی کا بوجھ نہیں سنبھل سکتا۔ نہ کوئی خدا والا دنیا کو بدل سکتا ہے۔ خدا اور خدا والوں کو اب دنیا کے بالاتفاق فیصلے سے پنشن دے دینا چاہیئے۔ انہوں نے بہت دنوں دنیا کی خدمت کی۔ اب آرام کریں۔ اب خدا لامذہبیت کو مٹ جانا چاہیئے۔ مادے کی جوت سے آنکھیں ملانا سہل نہیں۔ اس کے لئے جس طہارتِ قلب کی ضرورت ہے جس شرافتِ نفس کی ضرورت ہے وہ کمیاب ہے۔ سے

زمین و آسماں ہیں مادے کی جوت سے روشن ۔۔۔ مگر روحانیوں کی ظلمت انسانی نہیں جاتی

ذرا سوچئے تو جسے ہم مادہ پرستی یا دہریت کہتے ہیں، جسے ہم لامذہبیت کہہ کر ٹال دیتے ہیں، وہ ہے کیا چیز۔ دہریت کے صحیح مفہوم اور عمل پر مبنی تہذیب و تمدن کے امکانات کو شعور میں پیوست کرنے کے لئے غیر معمولی جرأت کی ضرورت ہے۔ بہت ممکن بلکہ یقینی ہے کہ یہی دہریت ہے نہ کہ روحانیت جو اس کرۂ ارض کو فردوس بہ روئے زمیں بنا دیگی۔

دلوں کو اب نہیں فردوسِ گمشدہ کی تلاش ۔۔۔ وہ نادکِ تم تو دھا چلاتے ہیں سے

(۱) دنیا کی تین ارب آبادی کے لئے اسّی کروڑ خوبصورت، پائدار، آرام دہ مکانات جن میں ضروریات کا سامان آسائش موجود ہو۔

(۲) بہترین اور خوشگوار ترین غذا، مناسب اور کافی لباس تین ارب انسانوں کے لئے فراہم ہوں۔

(۳) پھر ہر والدین پر بچوں کی تعلیم و تربیت کا بوجھ ہے سو اس صدی کی زندگی کی آسائش ملیں گی، ان کی تربیت، ان کی تندرستی اور ان کے خوش رہنے کے انتظام [illegible] اس [illegible] کی [illegible] تعلیم و تربیت [illegible] اشتراکی نظام حکومت کے ذریعے سے حاصل کر سکیں۔

(۴) پیٹ کا کام یا پیشے کے اوقات پر اکتفا کرنے کے بعد ہر شخص کو جس پیمانہ سے بیدار اور داخلی زندگی کے لئے ہر فرد کو کافی وقت ملتا ہے، کافی [illegible] ہیں اور اس تہذیب و تمدن کے لئے ایک زندہ فضا موجود ہے۔ ادب و شاعری، صحافت، فلسفہ، سائنس، دیگر علوم و فنون، موسیقی، ناٹک، [illegible] اور علمی مجلسیں، کھیل، سفر، سیر، [illegible] یہ وہ برکتیں ہیں جن سے کوئی بے بہرہ نہ رہے۔ ان برکتوں سے انسانیت کو یا انسانیت کے [illegible] کو بھی محروم کر کے سماج کا [illegible] تشدد، [illegible] کرنا، روزہ، نماز، حج اور مذہبی کتابوں کی تلاوت، مندر، مسجد، گرجا، اذان، [illegible] تعویذ، [illegible] اور قربانی کسی طرح اس نقصان کی تلافی نہیں کی جا سکتی۔

(۵) کسی شخص کو اپنے پیشے یا منصب کے فرائض کے لئے سال بھر میں چھ سات سو گھنٹوں سے زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔ یہاں اشتراکی نظام کے شروع کے دس پندرہ برسوں تک دو گھنٹے روزانہ کے بدلے آٹھ دس گھنٹے کام کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس مدت کے بعد ہرگز نہیں۔

(۶) خانہ داری کے فرائض اور اس کے چھوٹے چھوٹے کام اتنے کم ہو جائیں کہ روزانہ دس پندرہ منٹ کی توجہ ان کے لئے کافی ہو تاکہ ہر عورت [illegible] چار دیواری سے نکل کر مردوں کی طرح سماج کی خدمت کر سکے اور کھیل کود، سماجی جیون اور علوم و فنون میں مرد کے دوش بدوش چل سکے۔

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرق ناز و نیاز بھی ۔۔۔ کہ جہاں تھا عشق برہنہ پا، وہیں حسن خاک بسر بھی تھا

(۷) جن افراد سے قانونی جرم سرزد ہوں ان کے لئے بھی ایسے ہرگز [illegible] کے [illegible] سے کم آسائشیں نہ پائیں ان پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے پائے [illegible] جیسے افراد سے بھی ہمدردی کا برتاؤ ہو نہ کہ انتقام کا۔ سوشلسٹ صدی خوشحالی، تندرستی، تعلیم و تہذیب کی فضا میں جرائم پیشہ افراد ہوں گے ہی [illegible] ان سے جرائم اتنے کم کرتے ہوں گے کہ نہ ہونے کے برابر۔

یہ بہت نامکمل اور دھندلا عکس ہے اس دنیا کا جس کی تخلیق دہریت اور لامذہبیت کرنا چاہتی ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایسی دنیا بنانے میں جو [illegible] آدمیوں کی اخلاقی قوتیں مل جل کر کام کرنے کی صلاحیتیں (اور اخلاقی سماج کی داخلی و خارجی زندگی کے منظم ہو جانے کے علاوہ [illegible] بڑھ جائیں گی یا نہیں۔ ان کی زندگی کہاں سے کہاں پہونچ جائے گی۔ زندگی جو آج عذاب ہے وہ ثواب مطلق بن جائے گی یا نہیں۔ [illegible] یا [illegible] ایمان کی جگہ عقلیت لے لیگی، غور و فکر اور فلسفیانہ شعور عام صفات ہو جائیں گے۔ علم کی نعمت عام ہوگی۔ نہ کوئی غلام ہوگا نہ کوئی محکوم، نہ کوئی باغی [illegible] نہ کوئی سماج کی [illegible] اور اس کی فلاح سے بیگانہ۔ سماج کی سوشلسٹ صدی کا ہم آہنگ زندگی کی فضا میں ہر فرد کی انفرادیت اس کی نرالی خصوصیت [illegible] کی شخصیت کے خد و خال چمکنے کا موقع پائیں گے۔ ابھی تو یہ عالم ہے کہ:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ۔۔۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کیا جب سے دنیا قائم ہے کسی بھی مذہب نے اتنے عظیم امکانات سے انسان کو روشناس کرایا؟ سب نے ابھی زندگی کو "سکل" [illegible] [illegible] آسمان واس نہ گئے، اور فردوس و [illegible] کی تسکین کے ساتھ اپنی آنکھوں کو کچھ غنچے گئے۔

جنہیں حاصل ہے تیرا [illegible] ۔۔۔ بہشت بھی انہیں کو فردوس و عدہ کی تسکیں

[illegible] یہ سر پر چکر [illegible] اور ہر مذہب نے اپنی اپنی ایک [illegible] دہریت یا دنیا داری بھی اپنے تصور کردہ جنت کی [illegible] [illegible] جنت [illegible] دنیا ہی میں [illegible] دنیا کا [illegible] بھی نہیں تھی۔ روحانیت و مذہب نے دنیا کا نقشہ ہی [illegible] [illegible] کہ [illegible] کے لئے [illegible]

[illegible] ۔۔۔ [illegible] روحانیت [illegible] دہریت ہو جائے

[illegible]

[illegible] ۔۔۔ یہ اور [illegible]

[illegible]

[illegible]

باتوں کی گھاتیں

جناب پروفیسر فراق گورکھپوری ایم۔ اے کی "باتیں" جو آپ چند ماہ سے ساقی دہلی کے موقر ماہنامہ میں مسلسل کر رہے ہیں ہمیں ہمیشہ بغور سنتا رہا ہوں۔ آپ کی باتوں کے انداز سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہایت پاکیزہ ذوق رکھنے والے عالم ادیب شہیر ہیں۔ آپ کے اشعار جنہیں آپ باتوں کے دوران میں جا بجا "پڑھ" دیا کرتے ہیں میرے اس خیال کی قطعی دلیل ہیں کہ آپ خلاف جمہور قافیہ پیمائی کے نہیں بلکہ بڑی حد تک ... شاعری کے علمبردار ہیں۔ آپ کے علمی پایہ اور پاکیزہ ذوق ادب کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ اس لئے اس شان کی شخصیت اگرچہ ایسے "ہیچ میرز" (ایک ایرانی ادیب عالی نے یہ معنی حقیقت فقرہ خوب چست کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایشیائی شعراء کی اکثریت ہے بھی اسی قسم کی۔) اور ننگ ادب کو شرف خطاب بخشے تو میرے لئے صد افتخار ہے۔ فلہذا اس قدر دانی کا شکریہ عرض کرنے کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد میں آپ کے ان سوالات کی طرف رجوع کرتا ہوں جو آپ نے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے ساقی میں "باتیں" کے زیر عنوان مجھ سے پوچھے ہیں۔

مکرمی، معاف فرمایئے گا اگر میں عرض کروں کہ باتوں کا مزہ رُو در رُو ہی آ سکتا ہے۔ آپ نے ماہنامہ ساقی کی وساطت سے باتیں چھیڑ کر باتوں کی نوعیت ہی کو بدل دیا۔ اب تو یہ باتیں باتیں نہیں رہیں بلکہ بحث ہو گئیں۔ اور محترم ناظرین ساقی کے لئے اچھا خاصہ تفریح کا سامان۔ آپ ایسے اعلیٰ ذوق سے باتیں کرتے کو کس "ادب پسند" شخص کا جی نہ چاہیگا؟ مجھے تو جب مزہ آتا کہ آپ کے ڈرائنگ روم میں تخلیہ ہوتا اور میں اور آپ رُو در رُو بیٹھکر باتیں کرتے۔ آپ یہ مضمون چھپواتے ایک ایسی ادا کے ساتھ جسے اہل دل تحقیق حق کی ادا کہتے ہیں۔ آپ بے تکلفانہ سوال کرتے اور میں جواب عرض کرنے سے پیشتر ایک متبسم مگر غائر نگاہ آپ کے چہرے پر ڈالتا نگاہیں "معانقہ" کرتیں اور اس "معانقہ" کے دوران میں سوال کے پس منظر کو جس کا جاننا مسئول کے لئے از بس ضروری ہے میں تاڑ جاتا۔ اور یہ "نظری تعیش" کر چکنے کے بعد آپ کے سوال کے تشریح طلب پہلوؤں پر روشنی ڈالے جانے کے لئے عرض کرتا۔ آپ بھی وہی حربہ برتتے اور میرے چہرے سے میرے خلوص نیت کی شہادت کو پڑھکر کھل جاتے۔ سوال صاف ہو جاتا جس کا میں اپنی بساط بھر جواب عرض کرتا۔ آپ کی تسلی ہو جاتی تو فہو المراد۔ لیکن اگر آپ پھر بھی اپنی رائے پر قائم رہکر مزید تشریح چاہتے تو میں پھر عرض کرتا اور اپنے مافی الضمیر کو اور واضح کرنے کی آخری کوشش کرتا۔ لیکن اگر ایسا نہ کر سکتا تو مزید کچھ عرض کئے بغیر اتنا ہی عرض کر کے مضمون کو بدل دیتا کہ "کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ" (اس آیہ شریفہ کا ترجمہ ہے کہ دنیا کا ہر فرقہ اپنے مفروضات، مسلمات، اور معتقدات کی مسرت میں مگن ہے۔ جن پر صحیح یا غلط ان کا یقین مبنی ہے۔)

ایک بات اور عرض کر دوں۔ دوران مضمون میں کہیں کہیں مجھے آیات قرآن حکیم کو نقل کرنا پڑے گا۔ آپ کے سوالات میں مذہب، سیاست، معاشرت وغیرہ سبھی کچھ موجود ہیں۔ آپ نہ سہی مگر میں تو بفضل خدا مسلمان ہوں اور میری تربیت میں نہ صرف مذہبی فضا کا اثر ہے میں نے پرورش پائی، بلکہ اس مجتہدانہ مطالعہ کا بھی دخل ہے جس کا میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے عادی رہا ہوں۔ اس لئے جس طرح آپ اپنی مطالعہ کی ہوئی کتابوں کے حوالہ جات دینے میں مختار ہیں، مجھے بھی اس باب میں معذور سمجھا جائے۔ البتہ میں اپنی طرف سے یہی کوشش کروں گا کہ بلا ضرورت ایسے حوالہ جات کو مضمون کا حصہ نہ بننے دوں۔

ہاں تو موجودہ صورت باتوں کی نہ رہی بلکہ مضمون نگاری کی ہو گئی۔ چلئے یونہی سہی۔ مجبوری ہے کیا کیا جائے؟

اپنے جواب میں میں بھی وہی مسلک اختیار کر رہا ہوں جو آپ نے سوالات میں اختیار فرمایا ہے۔ یعنی ایک شذرہ (نمبر ۱) آپ نے بطور تمہید لکھا ہے اور دوسرے (۲۷) میں کئی پہلوؤں کو سامنے لا کر مثالی استفہامی صورت پیدا کر دی ہے۔ آپ کے سوالات تمام کے تمام شذرہ میں شہود کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے میں ان کا نچوڑ صاف الفاظ میں حسب ذیل عرض کرنے کی جرات کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے سوال کی اس شکل پر اعتراض نہ ہوگا۔

سوال: علامہ سر محمد اقبال مرحوم کا پیغام جو بھی ہے کیا وہ دنیا بھر کے انسانوں کو فائدہ نہیں پہونچا سکتا جب تک کہ ...

کیا وجہ ہے کہ ہندوستان اور دنیا (خاص کر یورپ اور امریکہ) کے دیگر حصص کے لوگ جو غیر مسلم ہیں اور اقبال پرست بھی نہیں۔ (آجکل کے مسلمانوں سے مقابلۃً زیادہ نیک نیت بھی، زیادہ روشن دماغ بھی اور ترقی اور آزادی کی راہ میں زیادہ پیش پیش بھی ہیں؟ اور کیا جدید دنیا کے علمی اور عقلی سرمایہ (جسکے نام مضمون زیر جواب میں گنائے گئے ہیں) کسی خاص مذہب و ملت کا نام نہیں لیتے تو علامہ اقبال مرحوم نے ایسا کیوں کیا؟؟

تمہیداً میں چند بنیادی اصول عرض کرتا ہوں جو بنا ہیں مذہب اسلام کی، کیونکہ علامہ اقبال کے مضمون شاعری اور پیش نظر مقاصد و مقام کو سمجھنے کے لئے ان کا بیان کر دینا ازبس ضروری ہے۔

الف۔ اسلام دیگر مذاہب کی طرح خیالی فلسفہ نہیں بلکہ خالصۃً عمل ہے۔ مذہب اسلام مسلک حیات پر گامزن ہونے کے وہ اٹل اور عالمگیر قوانین فطرت (جنہیں قرآن کی زبان میں سنۃ اللہ کہا گیا ہے) بیان کرتا ہے جن پر کیا دنیوی ترقی (اور کیا اخروی فلاح) کا دارومدار ہے۔ اور اسکا مقصد اصلی ہے انسان میں اعلیٰ اور پختہ کیرکٹر پیدا کرنا۔

مذہب کے حقیقی معنی ہیں مسلک حیات (a ...... code of conduct) اگر اس میں ایک مخالف یعنی خدا کی ہستی کا تخیل بطور جزو غالب ہے تو یہ آسمانی مذہب کہلائے گا۔ یعنی وہ مسلک حیات جو منسوب ہے ایسی ہستی بالا سے جو انسانی کل کی موجد مانی جاتی ہے اور جو فطرۃً اور اصولاً اس انسانی کل کے جوڑ جوڑ اور پرزے پرزے اور ہر پرزے کے مخصوص عمل کی ماہیت سے واقف ہے، اسی لئے قرآن حکیم میں آیا ہے "ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا اور ہم ہی خوب جانتے ہیں کہ اس کے دل میں کیا کیا وسوسے پیدا ہو سکتے ہیں" (ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ سورہ ق) اور اس کل کے ٹھیک چلنے کے ضروری اور اٹل قوانین و ہدایات بھی وہی بتا سکتی ہے۔ "مسالک حیات" جو عقل کی اختراع ہیں انہیں عقلی مذہب (......) کہا جائیگا۔ مثلاً کمیونزم اور اسی قبیل کے دوسرے "ازم" جن کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں خدا کے تخیل کو یا تو سرے سے نکال دیا گیا ہے یا اسے ثانوی اور برائے نام حیثیت دی گئی ہے۔ اندریں حالات گذارش ہے کہ مذہب کا نام آتے ہی چونک پڑنا درست نہیں۔ ایک شخص مثلاً زید ایسے مذہب کا پیرو ہے جس میں خدا کا تخیل جزو لاینفک ہے اور ایک شخص مثلاً بکر ایک دوسرے مذہب کا پیرو ہے جس میں خدا کے تخیل کی نفی کر دی گئی ہے۔ بکر کا یہ مسلک حیات ہے اور زید کا وہ۔

ب۔ موجودہ عالم اسلام قومیت بنکر رہ گیا ہے۔ اسلام قومیت نہیں دین ہے یعنی مسلک حیات۔ اسلام نے جو بنیادی عالمگیر اصول دنیا کے سامنے پیش کر کے ان پر عمل کی دعوت دی تھی وہ آج بھی اسی طرح اٹل اور کارفرما ہیں جس طرح وہ روز ازل سے تھے۔ ان اصولوں پر جو بھی کاربند ہوگا وہ اسلام کا ...... یعنی انسان کامل ہے۔ یا قرآن کی زبان میں مومن بن سکتا ہے۔ اور ایسے ہی انسانوں کے لئے خدائے اسلام نے یہ سچا وعدہ فرمایا ہے۔ انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ (دنیا میں تمہیں بلند ترین متمدن قوم ہو گے بشرطیکہ تم مومن بنو) تاریخ عالم بھی شاہد ہے جب یہ اصول ایک عرب کے امی نبی (فداہ امی و ابی) نے دنیا کے سامنے پیش کئے اور ان کی اس وقت کی مخاطب قوم نے جب ان پر عمل کیا تو وہ چند ہی سالوں میں کیا سے کیا ہو گئی۔ غالباً جناب ہر بچہ کا آخری مصرع حقیقت مصرع ہے۔

"ایک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا"

اور اب بھی جو قومیں ہاں ہیں کے بیشتر اصولوں پر قائم ہیں وہ آسمان وجاہت اور عرش اقبال پر پہونچی ہوئی ہیں۔ اندریں حالات میری یہ مخلصانہ گذارش ہے کہ مذہب اسلام کو فرقہ اسلام اور نام نہاد موجودہ عالم اسلام کی زبوں حالی کو پیش نظر رکھکر نہ جانچنا چاہیئے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم (اللہ کسی قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے) یہ انحطاط جو عالم اسلام پر آیا ہوا ہے اس سنۃ اللہ (قانون فطرت) کے ماتحت ظہور پذیر ہوا ہے۔ اور اس کا علاج بھی آسی حکیم نے بتا دیا ہے۔ ان عدتم عدنا (اگر کوئی قوم باز آجائے یعنی اپنی اصلاح قوانین فطرت پر عمل کرنے سے کرلے تو ہم بھی پھر اس پر ضرور نظر عنایت فرمائیں گے۔

مذکورہ بالا بنیادی اصول دس ہیں۔ قبلہ علامہ مشرقی نے انہیں بڑی خوبی سے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "تذکرہ" میں مجملاً اور پھر بالتشریح نہایت عالمانہ طریق پر بیان فرمایا ہے۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں۔ تشریح مطلوب ہو تو اصل کتاب کا مطالعہ فرمایا جائے۔

(۱) توحید الٰہیہ — Unity in action.

(۲) ...... — Solidarity and ....

(۳) اطاعت امیر۔ Implicit faith in and obedience of the Leader.

(۴) جہاد بالمال۔ Spending of money in the interest of the nation.

(۵) جہاد بالسیف والنفس۔ Participation in defensive war. (For the defence of the Nation and its vital interests.)

(۶) ہجرت۔ Migration from the place (even if it were one's place of birth) where one's faith, culture and national individuality can not be defended with success and may be in jeopardy.

(۷) استقامت فی السعی مع التوکل فی النتائج۔ Consistent effort and confidence in expected results.

(۸) علم۔ Knowledge

(۹) مکارم اخلاق۔ Good high morals:

(۱۰) ایمان بالآخرۃ۔ Implicit belief in the hereafter or the Doomsday.

اب میں آپ کے سوالات کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

آپ کے سوالات میں دو تین الفاظ جن کو میں نے نمایاں لکھا ہے، قابل تشریح ہیں۔ کاش آپ نے اُن کی تشریح فرمادی ہوتی۔ مگر سیاق و سباقِ مضمون سے میں اندازہ کرلیتا ہوں۔ "فائدہ" اور "ترقی" سے آپ کا مطلب دُنیوی فائدہ اور ترقی یعنی فراوانی مال و دولت اور جاہ ہی ہو سکتا ہے اور "آزادی" سے مُراد سیاسی آزادی۔

آپ نے یقیناً ان اقوام اور اشخاص کے حالات بالتفصیل پڑھے ہونگے جن کی ترقی، فائدہ اور آزادی نے آپ کو متحیر کر رکھا ہے۔ آپ کا تحیر فطری ہے۔ ہر زمانے میں قارونیت کی چمک دمک اور ٹھاٹ نے عوام پر ایسا ہی اثر کیا ہے۔ اور اُن کی آنکھیں جب ہی کھلی ہیں جب اس قوم و اشخاص نے اپنے کمال پر پہونچ کر پھر وہ مُنہ کی کھائی ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تباہ ہو کر نسیاً منسیاً ہو گئی۔ اہل نظر اب بھی وہ سین دیکھ رہے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ (اے آنکھوں والو اس سے عبرت حاصل کرو۔) اب مندرجہ بالا دس قوانین فطرت پر ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ کیا ان افراد یا اقوام کی اس ترقی کا راز جس نے آپ کو ہی نہیں بلکہ دنیائے مشرق کی اکثریت کو حیرت میں ڈال کر ان میں احساس کمتری inferiority complex پیدا کر رکھا ہے۔ انہیں دس قوانین فطرت یا ان میں کی اکثریت پر عمل کرنے کا نتیجہ نہیں؟ ان میں کے پہلے تو قوانین تو ایسے ہیں کہ عقل و فکر اور تدبر انسانی انہیں دریافت کرکے ان پر عمل پیرا ہو سکتا ہے اس لئے عقلیت نے اگر آج ایسے چکا چوند پیدا کر دینے والے نتائج پیدا کر دئے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ یہ عقل کا کمال نہیں بلکہ ان قوانین فطرت کی برکت ہے جو اوپر عرض کئے جا چکے ہیں۔ اور جن کے متعلق قرآن حکیم کا دعویٰ ہے فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ اور پھر لن تجد لسنت اللہ تبدیلا و لن تجد لسنت اللہ تحویلا۔ (ترجمہ یہ اللہ کے قانون ہیں جن پر فطرت انسانی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اللہ کے قوانین میں نہ تو اے انسان تُو کوئی رد و بدل دیکھے گا اور نہ ہی انہیں تُو بے عمل پائے گا۔ یعنی یہ اٹل ہیں تاقیامت ہیں اور نہایت موزوں طریق پر بنائے گئے ہیں۔) چلتے چلتے میں یہ بھی عرض کردوں کہ یہ قوانین قرآن حکیم نے اس وقت دنیا کے سامنے پیش کئے جس وقت دُنیا پر تاریکی ہی تاریکی مسلط تھی۔ دُنیا کی وسعت نامعلوم تھی اور کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا [illegible] کرجانے کے امکان ہیں بعثت اسلام انسانی تاریخ میں انسانی ترقی کا وہ موڑ ہے جس کے کُھلتے ہی ایک نیا دور ایک نئی دنیا ایک نیا انسان [illegible] کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ جناب ہر چند اختر کا یہ مصرع جو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں مجھے تو الہامی نظر آتا ہے۔ [illegible] اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ "اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا" زندہ باش اختر! آپ کا یہی مصرع سُنکر میں نے سنانے والے کی خدمت میں [illegible] عرض کیا تھا۔ "از ین سبب نامت ہر چند اختر است ۔ قلب تو مومن و طلعت کافر است۔" جی چاہتا ہے کہ اس [illegible] گستاخی کی معافی صاحب قلت اوراق اور گرانی کاغذ کا عذر پیش کر کے میری اس [illegible] کی داد دیجئے [illegible]

"جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا"[1]

میرا ایک شعر ہے ؎

شیریں خیالیوں ہی میں ہے لطفِ زندگی
جب اصلیت کو تلخ بہت پا رہا ہوں میں

ہمارے ترقی پسند ادیب ممکن ہے اسے فراری ذہنیت کا نتیجہ قرار دیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ زندگی کے تلخ حقائق سے یہی عارضی فراردہ آرز محفوظ ہے جو نہ محض انسان کے لطفِ زندگی کا ضامن ہو بلکہ اس کے دل و دماغ کی سلامتی کا بھی، اگر ایسا نہ ہو تو۔

نہیب حادثہ بنیاد ما زجا ببرد

جب غمِ زندگی کی چڑیلیں دانت نکالے ہر طرف کھڑی ہوں تو مفر کی سوائے اس کے اور کیا صورت ہو کہ ؎

پرواز پھر خیال کی دینے لگی مزا
دوشِ پری وشاں پہ اڑا جا رہا ہوں میں

یہ "دوشِ پری وشاں" "جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کا شاعرانہ نام ہے، میں اکثر اس طرح دوشِ پری وشاں پر اڑ کر ان چڑیلوں سے نجات حاصل کیا کرتا ہوں، اس غمِ زندگی میں ایک بڑا بارِ گراں اپنی سلاسلِ زرّیں کا بوجھ ہے، طبعِ شاعر کچھ ایسی نازک ہوتی ہے کہ سیم و زر کی جھنکار بھی اگر درشت صورت میں آئے تو اُسے زخم خوردہ کر دیتی ہے، میں باضابطہ شاعر نہ سہی لیکن طبعِ نازک ضرور رکھتا ہوں نتیجہ ظاہر ہے۔

ایک دفعہ کسی بات پر بہت زیادہ زخم خوردہ تھا، غم و غصہ کے عالم میں تھا کہ پھر بیٹھے بیٹھے دیکھتا ہوں جاگتے میں خواب سلسلہ چل نکلا، وہی "جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا" والا قصہ، خیالات کی رو کہاں سے کہاں لے گئی، سوچنے لگا اگر کہیں ہماری حکومت انگلستان میں ہوتی تو وہاں کا کیا نقشہ ہوتا، یہ خیال آنا تھا کہ غم و غصہ ہوا ہو گیا، بدن میں لہو یا شرابِ طہور کی کیفیت پیدا ہونے لگی، جذبات انگڑائیاں لینے لگے، یہ انگڑائیاں رگ و ریشہ میں سرایت کرنے لگیں، یہاں تک کہ میں خود بھی انگڑائی پہ انگڑائی لینے لگا، خیالات کی رو نے سیلاب کی صورت اختیار کی، سیلاب اور پھر وہ بھی شبِ مہتاب میں، دریائے آب دریائے نور کو موجزن ہوتے، پگھلی ہوئی چاندی پر آسمان سے پگھلے ہوئے سونے کی بارش، یہ دریائے سیمیں موجیں مار رہا تھا اور مجھے اپنی آغوشِ طرب میں بہائے لئے جا رہا تھا، نہ گریال یا خوف گھڑیال ڈبکنا، میرا اس وقت یہ حال تھا کہ ؎

اس وقت کس کو فکر ہے ساحل کی ہمنشیں
دریا بہا کے پر سے بہا جا رہا ہوں میں

دریائے سیمیں پردۂ سیمیں بننے لگا اور "جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا" والے واقعات کی تصویریں اس پردے پر نمایاں ہو ہو کے دلِ جہان کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگیں، جو دلنواز دلربا منظر سینما میں نے دیکھا اس کا ایک ٹکڑا نذرِ ناظرین ہے۔[2]

(۱)

ہیں! یہ کیا! یہ کون صاحب شربتی انگرکھا پہنے دوپلی ٹوپی لگائے آتشدان کے پاس بیٹھے کانپے جا رہے ہیں اور آگ تاپے جا رہے ہیں، وہ اپنی کپکپی کو چھپانا چاہتے ہیں لیکن وقت کبھی کبھی کٹکٹا جاتے ہیں، بوڑھی جوان عورتیں انہیں گھیرے ہوئے ہیں، وہ انہیں اس طرح دیکھ رہی ہیں گویا آنکھوں سے تعریف کر رہی ہیں، بچے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے حیرت سے بُت بنے کھڑے ہیں، معلوم ہوا ابھی ابھی آپ ہندوستان سے تشریف لائے ہیں

---

[1] اس افسانے کا مرکزی خیال ایک بنگالی افسانے سے ماخوذ ہے۔ [2] ظاہر ہے کہ پورے مناظر پیش کرنے کے لئے ایک پوری کتاب چاہیئے پھر ایسے عنوان کیا اسباب ہیں کہ شب بھر قلم یا دماغ بھی نہیں چل سکتا۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ ہر شخص اس کے متعلق خیال آرائی کر سکتا ہے، ناظرین سے استدعا ہے کہ جو ضروری مناظر چھوٹ گئے ہوں انہیں وہ اپنی طرف سے بڑھا لیں
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

مسٹر الگزینڈر نے گھر آ کر اپنے آپ کو منشی سکندر کہتے ہیں،
ایک لڑکی جو انکی چھوٹی بہن معلوم ہوتی ہے کہتی ہے الکس (Alex)
منشی سکندر۔ بڑی تہذیب کی بات، ہم تمہارا بڑا بھائی ہے ہمکو سکندر
بولو۔

لڑکی (بڑی) کمن ڈھرباتی۔
منشی سکندر۔ او بو، ڈھر نہیں، ڈرر ڈ ہہ کہتے وقت دانت کھٹکھٹا
گئے اور آواز نکلی ڈھررر)
لڑکی۔ "O, it is difficult, why change name"
(مگر یہ مشکل بات ہے فضول نام بدلنے سے فائدہ)
منشی سکندر کچھ بولے نہیں مگر انکی پیشانی اور بھویں
سکڑنے کی معلوم ہوتی ہیں کہ بیزار کیا جائے اور کا سواد،
دوسری لڑکی جو پہلی کی چھوٹی بہن معلوم ہوتی ہے بول اٹھتی ہے
"نائیں (نہیں) مسٹر الگزینڈر اچا (اچھا) نہیں لگتا مسٹر لوڈ لیسی
لوگ ہوتا ہے منشی سکندر بہت اچھا ہے ، بالکل ہندوستانی
نام "
ایک دوست کی لڑکی " اچا ، منشی سکندر ہندوستانی لوگ کو
سردی نہیں لگتا "
منشی سکندر۔ نائیں ، نائیں ، زندہ لوگ ، گرم لوگ ۔ خون
(یعنی خون کہتے وقت پہلے کھ نکلتا ہے لیکن کوشش کے بعد دو
دماغ میں بدل جاتا ہے)
دوست کی لڑکی (یہ dress) آپ کو بہت اچا لگتا ہے
(How smart) (کیسا چست و خوبصورت) منشی سکندر
کا سارا جسم مسکراتا معلوم ہوتا ہے ، فرماتے ہیں " ہم تم لوگ کے
لئے بھی پوشاک لایا ہے ، لکھنؤ کی بیگم لوگ کے پہننے کا hate
frock (مجھے فراک سے نفرت ہے)
جلدی سے جا کے بکس سے دو پٹے نکال لاتے ہیں اور اوڑھنا
سکھاتے ہیں ، لڑکیاں خوش خوش سیکھتی ہیں ، ایک بڑی خاتون
منشی صاحب کی نانی معلوم ہوتی ہیں آنکھوں میں خوشی کے
آنسو لا کے فرماتی ہیں۔

Good boy! He remained only four months in India and what a change! When did you go? Only June and returned in September

but you look every inch an Indian gentleman with what a perfect Indian accent. Only mummy catch chill in this dress. Does not suit our climate.

(کیسا اچھا لڑکا ہے ہندوستان میں صرف چار مہینے رہا اور اتنا انقلاب
تم کب گئے تھے ! جون میں اور ستمبر میں واپس آ گئے لیکن تم سر سے
پیر تک ہندوستانی معلوم ہوتے ہو اور لب و لہجہ بالکل ہندوستانی
صرف اس لباس میں سردی لگ جانے کا اندیشہ ہے ۔ ہماری
آب و ہوا کے موافق نہیں)
منشی صاحب No, Mummy سب عادت کا بات ہے ، کوئی
ڈر (دانت کٹ سے بولا) ڈھررر نہیں ،
پہلی لڑکی ۔ *These must be summer clothes! He went in summer and brought summer garments.*
(یہ ضرور گرمی کے کپڑے ہیں ، وہ گرمی میں گئے اور وہاں سے
گرمی ہی کے کپڑے لے آئے)
منشی صاحب (جامے سے باہر ہو کر) جب نہیں جانتا لوڈ لوسٹ
It is always summer there.
——— (وہاں ہمیشہ گرمی پڑتی ہے)

صبح کا وقت ہے منشی سکندر منہ میں لکڑی لگائے چلے
آ رہے ہیں انکے کونوں سے خون بہہ رہا ہے ۔ نانی صاحبہ
O my! my! What has happened to you?
(خدا کے لئے یہ تمہیں کیا ہوا ہے)
منشی سکندر ۔ او ! تم لوگ نہیں جانتا ، ڈسے ٹون ہو ڈسے ٹون
(داتون) اس سے ڈانٹ (دانت) بہت مضبوط (مضبوط) ہوتا
ہے ، ہندوستانی نیم کی لکڑی کا ، برش کھراب (خراب) چیز
نانی صاحبہ ۔ *But this blood* (مگر یہ خون !)
منشی سکندر ۔ کچھ پروا کا بات نہیں ، تھوڑا تھوڑا خون نکلنا
اچھا چیز !"
خادمہ آ کے اطلاع دیتی ہے کہ غسل خانہ کا سامان تیار ہے

منشی سکندر بیٹھے رہتے ہیں اور فوراً ہی چلا کر باہر نکل آتے ہیں "تم لوگ پاگل ہو گئے ہو" ... ضرور یہ پلسر کا پاؤچ ہے سب ڈر جاتے ہیں ناقی صاحب دبی زبان میں وجہ پوچھتی ہیں،

منشی سکندر پھر شب میں پانی بھر دیا، پولی تم کو یار ہم مجھتا ہیں نہیں نہانا کنٹ ایاٹ، ہم جھوکی پر نہانا مانگتا ہے، جھوکی پر، کیسا گٹ ٹولا گندا، لوگ، توبہ توبہ، اسی سے تو یہ حال ہو۔"

یکایک انہیں کچھ خیال آتا ہے، لپک کر کمرے میں جاتے ہیں اور وہاں سے تہمد باندھے، کندھے پر تولیہ ڈالے ہاتھ میں صابن لئے اسی میں بدستور لون لگائے کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ کرتے نکلتے ہیں اور بغیر کچھ کہے سنے باہر چلے جاتے ہیں، سب لوگ حیرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

خوب! مکان کے باہر سڑک پر زور شور سے غسل فرمایا جا رہا ہے، تماشائی اکٹھا ہوتے جاتے ہیں، پڑوس کے لوگ جنہیں منشی سکندر کے ہندوستان جانے کا حال معلوم ہے انگشت بدنداں ہیں، راہ چلتوں میں ایک بڑھا جینی اس تماشے کو دیکھ کے رک جاتا ہے اور اپنے پاس والے آدمی سے سنجیدگی کے ساتھ پوچھتا ہے [illegible] e mad? (اس کا کچھ دماغ خراب ہے کیا) وہ جواب دیتا ہے No, Indian returned. (نہیں ہندستان واپس شدہ)

بڈھا منشی سکندر کی طرف مخاطب ہو کے کہتا ہے۔

My dear young man! You will die of pneumonia. ——

—— (میرے پیارے نوعمر دوست تمہیں نمونیہ ہو جائیگا)

منشی سکندر جو سردی سے برف ہوئے جا رہے تھے، غصہ سے آگ بگولہ ہو جاتے ہیں "ایسی آگ جس پر پانی کے چھینٹے پڑ رہے ہوں اور چھوں چھن کر کے رہ جاتے، بمشکل گھٹی ہوئی کانپتی تھرتھراتی آواز نکلتی ہے، فرماتے ہیں چپ چپ (چپ) رہو، تم گندا لوگ شب کا نہانے کا کیا جانے، ہم — ہم — ہم — تم سمجھتا نہیں ... ہم ابھی ہندوستان سے آیا ہے، وہاں کا تمام لوگ ایسے ہی نہاتا ہے، ہم بھی ایسا نہاتا تھا، [illegible] ... جانور لوگ [illegible]

بدتر از بدتر)"

اتنے میں ایک ہندوستانی وضع قطع کا انگریز آ جاتا ہے وہ یہ تماشہ دیکھ کے مسکراتا ہے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ہندوستان میں غریب لوگ سڑک پر نہاتے ہیں، شریف نہیں۔ منشی صاحب کٹ حجتی کرنے لگتے ہیں، اس بحث کو کون سُنے، دوسرے دلچسپ مناظر دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔

(۲)

خیریت تو ہے؟ یہ تمام لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ سب قطار اندر قطار لنگوٹ باندھے دھوپ میں لیٹے ہوئے ہیں، ان کے بدن اتنے چمک کیوں رہے ہیں، یہ کڑوے تیل کی مالش کئے ہوئے ہیں، آخر کیوں؟ اس لئے کہ رنگ کچھ سانولا پڑے اور ہندوستانیوں سے قدرے مشابہت ہو جائے، ہر ایک اپنا رنگ دوسرے کو دکھا کے پوچھ رہا ہے کہ کچھ سانولا ہوا یا نہیں، جواب سُن کے مسکراتا ہے اور خوش ہو ہو کے تیل کی پیالی میں سے جو ہر ایک کے پاس رکھی ہوئی ہے تھوڑا اور تیل لے کے جسم میں ملنے لگتا ہے، اپنے گذشتہ رنگ کو یہ لوگ شلغم یا چقندر سے تشبیہ دے رہے ہیں، کچھ جو زیادہ جلے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ کوئلہ سے قریب تر پہنچ گئے تھے، اور بڑی خیریت ہوئی کہ بچ گئے۔

(۳)

یہ دو عالیشان مکانوں سے غمناک اور روشن جو کیوں کی آوازیں کیسی آ رہی ہیں، ایک مکان سر آئین فاکس کا ہے، معلوم ہوا انہیں آج خانصاحب کا رفیع الشان خطاب ملا ہے، دوسرا لیڈی ک آف لاک ہینڈ کا محل ہے، وہ میاں کے بے مثل و مخصوص خطاب سے مفتخر و ممتاز ہوتی ہیں جو آج تک کسی انگریز کو نہ ملا تھا، حکومت ہند کے حکم کے مطابق جسے میاں کا خطاب ملے اس کی بیوی کو خود بخود بی بی کا خطاب مل جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کو بابو اور لالہ کا خطاب بھی ملا ہے، وہ خوشی سے باغ باغ ہیں۔

کچھ لوگ سر جھکائے چلے جا رہے ہیں، انہیں سر کا خطاب ملا ہے، انہیں امید تھی کہ وہ کسی ہندوستانی خطاب سے سرفراز ہوں گے۔

خانصاحب سر آغین خاکس کا دیوان خانہ مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے "آداب بجا لاتا ہوں، آداب بجا لاتا ہوں، بہت بہت خوش، مبارک مبارک" کی آوازیں گونج رہی ہیں، خانصاحب نہایت پُرجوش طریقے سے شکریہ ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، یہ کوشش ہی اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ انھیں قدرے ملال ہے، اس بات کا نہیں کہ انھیں خاں صاحب کا خطاب کیوں ملا، اس کی عظمت کا انہیں اعتراف ہے، ابھی تک انگلستان بھر میں دو ہی تین آدمیوں کو یہ خطاب ملا ہے، انہیں جس چیز کا غم ہے وہ یہ کہ ڈیوک آف لاک ہینڈر کو "میاں" کا خطاب کیوں ملا، مانا کہ انگلستان کے دیسی لوگوں کی نظروں میں ڈیوک کا مرتبہ بہت زیادہ بلند ہے مگر سرکار ہند کو تو اس کا خیال نہ کرنا چاہیے تھا، ڈاکیہ ابھی ابھی ایک خط لایا، خانصاحب نے اس پر سرکاری مہر دیکھ کے خوشی سے کانپتے ہاتھوں سے اُسے کھولا، نائب السلطنت نے انہیں اپنے دست خاص سے خط لکھکے بھیجا ہے اور نور چشم طول عمرہ کے پیارے القاب سے مخاطب فرمایا ہے، نور چشم طول عمرہ کے مارے خوشی کے آنسو نکل پڑے، ساری گرد کلفت دُھل گئی، فوراً ایک اشرفی ڈاکیہ کو انعام دی اور حکم دیا کہ اس خط کو آج ہی سُنہرے چوکھٹے میں لگا کے سب سے نمایاں جگہ پر آویزاں کر دیا جائے تاکہ ہر آنے والا بہ آسانی پڑھ سکے اور پڑھ پڑھ کر مرعوب ہو۔

میاں ڈیوک آف لاک ہینڈر کے محل میں مبارکباد کا زور شور اور زیادہ ہے، وہ پھولوں سے لدے ہوئے ہیں لیکن خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے، بار بار اپنے خطاب کو اُردو اخبار میں پڑھ رہے ہیں، سب سے اوپر انہیں کا نام ہے اور اس نام کے ساتھ اور کسی کا نام نہیں، آج انہیں وحدہٗ لاشریک کی معنویت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے، نائب السلطنت نے انہیں راحت جان سلمہٗ کہہ کے مخاطب کیا ہے، اس وقت وہ واقعی مجسم راحت جان معلوم ہوتے ہیں!

مبارکباد دینے والوں میں منشی شعروال (سابق مسٹر شیکسپیئر) بھی ہیں جن کی اُردو دانی کا انگلستان میں ڈنکا بج رہا ہے، وہ ایک قصیدہ لکھ کے لائے ہیں کیا لحن ہے!

لے سبحان اللہ اے

ان کی آواز ہے کہ شہنائی بدمات ہو جائے جب مطلع ہوا ہے،

ہمارے ڈیوک صاحب کو میاں بننا مبارک ہو اور جناب

دو مصرعوں شیلہ زمین انگلستان کو آسماں بننا مبارک ہو

واہ، واہ کے شور میں اور کچھ سُنائی نہیں دیتا۔

میاں ڈیوک آف لاک ہینڈر دفتر کا دروازہ بند کئے ہوئے ایک خاص ہندوستانی مولوی صاحب سے اپنے خطاب کا صحیح تلفظ جاننے کی کوشش فرما رہے ہیں،

مولوی صاحب: "کہئے میاں"

ڈیوک: "ماں"

مولوی صاحب: "ماں نہیں جناب، کہئے میاں میاں"

ڈیوک: "میاؤں"

مولوی صاحب: "لاحول ولاقوۃ، عجیب کڑوے مغز لوگ ہیں، اجی جناب کہئے میاں، میاں، میاں... اچھا ابھی کچھ دن چنے چبایئے تاکہ زبان کھلے، میاں ڈیوک آف لاک ہینڈر چنوں سے شوق فرماتے نظر آ رہے ہیں۔

واہ یہ تو نئے میاں صاحب کی محلسرا نظر آ رہی ہے تمام فرش فروش اور گاؤ تکیوں سے آراستہ پیراستہ ہے لیکن تمام کو بھی کوئی انگریزی سامان نظر نہیں آتا۔ ایک پرانے زمانے کی عمدہ کرسی تھی، پائے توڑ کے اسے تخت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بی بی لاک ہینڈر ڈوپٹے اور کلیدار پاجامے میں تخت پر اکڑوں بیٹھی ایک مغلانی سے پان بنانا سیکھ رہی ہیں،

مغلانی "بی بی لکھنڈری، آپ پھر اکڑوں بیٹھ گئیں، تخت پر پلتھی مار کے بیٹھا جاتا ہے، اکڑوں نہیں"

بی بی: "ہم اوئی گوبہ، پول دھپول، جاتم... جی ہوں" پلتھی مار کے اس طرح بیٹھتی ہیں جیسے مکڑا بیٹھے۔

مغلانی: "ابھی تک آپکی زبان صاف نہیں ہوئی، خیر پان کھاتے کھاتے ہو جائے گی۔

بی بی: "پہلے دیکھ لے تو اچھا... چیز سوہی ہے"

مغلانی :- ہاں، ہاں پہلے سے بہت اچھی ہے۔

بی بی ایک کمرے کی طرف رخ کرکے خوشی میں کہتی ہیں۔

You hear something? (تم سن رہے ہو پیارے) اس کمرے سے کسی کے تھوڑا تھوڑا ہانپنے کی آواز آ رہی ہے کوئی جواب نہیں ملتا۔

مغلانی :- "دیکھئے پھوپو نے ... کہا، بڑی بدتہذیبی کی بات ہے"

بی بی۔ او! سوری (O, sorry ——)

مغلانی :- "اچھا تو اب اپنے ہاتھ سے پان بنائیے"

بی بی صاحبہ پان بناتے وقت ہاتھ میں تمام کتھا چونا بھر لیتی ہیں، چھالیہ کی چمچی کتنے میں اور کتھے کی چھینٹے میں ڈال دیتی ہیں، پان کے چاروں طرف بھی فرش پر گل بوٹے کھل جاتے ہیں۔

مغلانی :- پان عمدہ بنانا بہت ضروری ہے، اسی سے گھرانے کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے، آپ نے تو خیر بہت سیکھ لیا، مسماۃ لومڑی تو بیچی پکڑنا نہیں جانتیں۔

بی بی :- O, really! How sweet! (اور پھر کمرے کی رخ کرکے) Did you hear that?

مغلانی :- "ہوں"

بی بی صاحبہ ڈارلنگ پورا نہیں کر سکتیں، "ڈے" پر ہی رک جاتی ہیں، کمرے سے صرف تیز تنفس کی آواز سنائی دیتی ہے، مغلانی بی بی لاک ہینڈر کا ہاتھ پکڑ کے بیڑا موڑنا سکھاتی ہیں اور پھر اُسے منہ میں رکھنا، خود بھی ایک بیڑا نوش فرماتی ہیں اور مزے لے لے کر منہ میں پیک لئے باتیں کرتی ہیں۔

بی بی صاحبہ یہ دلنواز منظر دیکھ کے بے اختیار ہو جاتی ہیں اور بول اٹھتی ہیں O, how delicious to talk like this with syrup of Pan in your mouth. ——

—— (اس طرح منہ میں پان کا شربت لیکے بات چیت کرنا کتنا لذیذ ہے!)

بی بی صاحبہ بھی منہ میں پیک لیکے بات کرنے کی کوشش فرماتی ہیں، پیک کلی سے نکل پڑتی ہے، دوپٹہ، کرتا، پاجامہ فرش سب رنگ جاتے ہیں، بی بی صاحبہ خفیف ہو کے دوپٹہ سے منہ پونچھتی ہیں۔

مغلانی :- کوئی حرج نہیں، بی بی الکمندری، اسی طرح آتے آتے آ جائے گا، مسماۃ لومڑی تو ابھی منہ میں پیک بھی لینا نہیں جانتیں۔

بی بی صاحبہ O, thank you شکریہ، مگر مغلانی صاحبہ! آپ مسماۃ لومڑی کیوں کہتی ہیں، لیڈی کہیئے انہیں، مسماۃ کا خطاب (خطاب) کہاں ملا ہے"

اتنے میں کمرے کی طرف سے ہانپنے کی آواز آتی ہے اور یہ صدا "بچوں کی ماں، ذرا ادھر آؤ، ڈے (ڈے) جانا"

مغلانی (اچنبھے سے) ہیں! میاں الکمنڈر ہم کہاں ہے، ہیں کیا کہاں"

بی بی صاحبہ۔ اوہ، غسلخانے میں۔

مغلانی (ہنسی روکتے ہوئے) اچھا، غسلخانے میں آم کھانے کی مشق فرما رہے ہیں، یوں ہی سیکھا جاتا ہو گا اور کیا، یہ کہہ کے مسکراتی ہوئی بی بی صاحبہ کے ساتھ ساتھ غسلخانہ تک جاکے دیکھتی ہیں سخطاب یافتہ میاں صاحب تہمد باندھے اپنے بہاں آئینہ کے سامنے کھڑے ہانپتے جاتے ہیں اور گٹھلی چوستے جاتے ہیں، گٹھلی ہاتھ سے پھسل پھسل کر گری جاتی ہے، چہرہ زرد رنگ ہوا ہے، بھویں بھی زرد ہو رہی ہیں اور سر کے بال بھی۔

چھپرکھٹ میں میاں صاحب اور ان کی بی بی صاحبہ گرم اختلاط معلوم ہوتے ہیں، بنارسی ریشم کے پردے چاروں طرف پڑے ہوئے ہیں، خالی آواز سنائی دیتی ہے۔

بی بی صاحبہ۔ O, darling! How nice to be ...

(پیارے، بی بی بننا کتنی اچھی چیز ہے) —— ...

میاں۔ بچوں کی ماں، اب تم بی بی ہو گئیں، اب کم ... خالی اردو بولا کرو۔

بی بی صاحبہ But not in private talks of love ——

(لیکن تخلیہ کی پیار و محبت کی گفتگو میں نہیں) ——

۱؎ آم کھانے کا واقعہ بھی بنگالی فسانہ مذکور سے ماخوذ ہے مگر بڑے نگینے کا ہنر کی آمیزی ہے۔

میاں مٹھو: نائیں نائیں (نہیں نہیں) یہ ... کا ہاٹ تو اُردو میں بڑا اچھا لگتا ہے۔ منگلانی صاحب کہتا تھا اُردو جب اچھا آ جائے گا جب ٹِل بھی اُردو بولنے لگے۔"

(۴)

اُردو کے مکتب، مدرسے، دارالعلوم تمام قائم ہو گئے ہیں، ہر جگہ اُردو ذریعۂ تعلیم قرار دے دی گئی ہے، تمام لڑکے انہیں درسگاہوں میں پڑھنے پڑتے ہیں، آکسفرڈ اور کیمبرج نے اپنی قدامت پرستی میں اب بھی انگریزی ذریعۂ تعلیم رکھا ہے، وہاں صرف وہی مفلوک الحال لوگ جاتے ہیں جنہیں پادری وغیرہ بننا ہو، وہاں کے در و دیوار سے حسرت برستی ہے۔ اُردو کی تعلیم گاہیں زندگی کی لہر بہر سے مسکرا رہی ہیں، دہلی لکھنؤ سے اساتذہ علم و تہذیب سکھانے کے لئے بلائے جا رہے ہیں، تمام انگریز اساتذہ شیروانی، عبا چغا پہنے نظر آتے ہیں، سروں پر کم و بیش سامان فضیلت یعنی شملہ بمقدار علم رکھا ہے، البتہ خاص انگریزی پڑھانے والے استاد اِکّا دُکّا انگریزی لباس میں نظر آ جاتے ہیں لیکن ایسوں سے دوسرے انگریز اساتذہ ناک اٹھا کر بات کرتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب و شائستگی پھیلتی جا رہی ہے، اب لوگ ماشاءاللہ اُردو ٹھیک ٹھیک بولنے لگے ہیں، تلفظ میں فرق ضرور ہے لیکن ایسا کہ اسے لکھ کر نہیں بتایا جا سکتا، صرف کان ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، کبھی کبھی اُردو میں ت کی جگہ ٹ، د کی جگہ ڈ، البتہ نکل جاتا ہے یا تذکیر و تانیث میں گڑبڑ ہو جاتی ہے ہاں کچھ دقیانوسی خیال لوگ جو اب بھی مرحوم انگریزیت کے دلدادہ ہیں اُن کا تلفظ بھی بہت خراب ہے اور زبان بھی، اب اُردو صحیح بولنا ہی معیارِ تہذیب و شرافت بن گیا ہے، ہر ایک بڑے فخر سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ میں ہی صحیح اُردو بولتا ہوں اور دوسرے غلط، خوب خوب، ایک دوسرے پر نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں اور چونکہ سب ہی کی زبان ماشاءاللہ ہے اس لئے یہ نکتہ چینیاں بڑی پُرلطف معلوم ہوتی ہیں۔[1]

ایک مدرسے میں درجے کے باہر۔

ایک انگریز لڑکا (دوسرے سے، ... کا ترجمہ) یہ سی اُردو بولتے ہیں کہ خالی ان کا ... ہندستانی لوگ بھی سے تو نہیں کہنے ... کہہ سکتا کہ وہ انگریز ہیں۔"

دوسرا لڑکا (انگریزیت کا دلدادہ) "اُردو وہ کیسا بولتے یہ ہم نہیں جانتا، البتہ (البتہ) انگریزی جیسا بولتا ہے اس سے تو ہم بھی نہیں کہنے سکتا کہ وہ انگریز ہے۔"

ایک درجے میں مولوی نطخ پڑھا رہے ہیں، خوب زور شور اور سمجھا سمجھا کر کہتے ہیں۔

مذکر و مونث کا بیان

ہاہاہا! اس قوم کا علم دیکھ کے حیرانی ہوتا ہے، سائنس والا لوگ جو بات بہت کوشش کر کر کے جانا وہ یہ لوگ خود بخود جان گیا معنے ہر چیز میں مذکر مونث معنے مرد عورت ہوتا ہے، بے جان چیز میں بھی جیسے گھنٹا ... مرد، گھنٹی ... عورت۔

آخر میں الف ہونے سے مرد ہوتا ہے اور ی سے عورت، اچھا بتاؤ چینی مرد کہ عورت؟ لڑکے: عورت۔ مولوی نطخ: شاباش، شاباش اور اس کا مرد؟"

لڑکے: "چینا۔"

مولوی نطخ: نہیں، نہیں، اُردو اتنا آسان نہیں، بہت مشکل پسند قوم کا زبان ہے، چینی کا مرد گُڑ (گُڑ) یاد کر لو، بار بار کے یاد کرو، بل بل کے بلنے سے جلدی یاد ہوتا ہے۔ اچھا بتاؤ ... لڑکے: عورت۔

مولوی نطخ: پھر غلط، دہی مرد ہے مرد، ہم بات بات میں تم کو سمجھاتا بات بتایا گیا معنے کبھی قاعدے کے خلاف جسے مرد ہونا چاہئے وہ عورت اور جسے عورت ہونا چاہئے وہ مرد ہو جاتا ہے ... اور ہاں ایک اور بات سائنس ہم کو بولتا ہے کہ کچھ چیز میں عورت مرد دونوں ہونے سکتا ہے، اسی طرح کوئی کوئی اُردو لفظ بھی ہوتا ہے جیسے بلبل، بلبل عورت بھی ہونے سکتا ہے اور مرد بھی۔"

[1] اس کے مناظر بخیال طوالت نظر انداز کئے جاتے ہیں، اگر قارئین کرام نے ان شیریں خیالیوں کو پسند کیا تو یہ بھی اور مناظر بھی پیش کئے جا سکیں گے۔

ہیں۔ پھر ایک انگریز لڑکا دوسرے سے نہایت جوش سے کہہ رہا ہے

You know our Shakespeare is really great. I am now convinced. Molvi Hasan was saying he could even be compared with Ghalib! How wonderful! O! our dear Shakespeare, how we are proud of you! ——

—— (تم جانتے ہو ہمارا شیکسپیئر واقعی بڑا ہے۔ مجھے اب یقین ہو گیا۔ مولوی حسن کہہ رہے تھے اس کا مقابلہ غالب سے بھی کیا جا سکتا، اے ہمارے پیارے شیکسپیئر ہمیں تجھ پر کتنا ناز ہے)

دوسرا لڑکا (اردو کا دلدادہ) کیا نمرا نسیج پیر (شکسپیئر کی بھدی صورت) مولوی صاحب کو خوش (خوش) کرنے کو بولا ہوگا۔ غالب (غالب)۔ ایکسلاتن میں جو بول ڈیٹا ہے سیکسپیر دس صفحے میں نہیں بولنے سکتا! Be or not to be جیسا ٹکڑا (ٹکڑا) اس کا معنے شاہکار رہی (Masterpiece) غالب ایک شعر میں بول ڈیا[1]

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

نہیں ہم انصاف کا بات بولے گا۔ ہمارے انگریزی میں غالب کا مافک کوئی نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ ان لوگ کا ٹڈری (تمدن) ہزار برس سے زیادہ کا، ہم لوگ کا کھالی (خالی) دو تین سو برس کا۔ ہمیں ایسا ان کا بات بولنا چاہئے۔ جب تک ایسا ان کا بات بولنا نہیں سیکھے گا ترقی نہیں کر سکتا۔

یہ مختلف قسم کی غوغائیوں کی سی آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟ ان میں کی آوازیں سنائی نہیں دیتی، سکاٹ لینڈ کے لڑکے اپنی زبان میں باتیں کر رہے ہیں اور ویلز والے ویلش میں، آئرلینڈ والے آئرش میں اور خاص انگلستان والے انگریزی میں۔ اس انگریزی کی بھی مختلف قسمیں ہو گئی ہیں، لب و لہجہ اور محاورے کے تھوڑے بہت فرق جو انگلستان کے مختلف علاقوں کی زبان میں قدرتی طور پر پہلے سے موجود تھے بڑھ کر علیحدہ علیحدہ زبان کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ ہر زبان کا رسم الخط بھی مختلف ہو گیا ہے، کچھ لوگ جو اپنا تعلق قدیم نارمن قوم سے ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ صدیوں کے کفنائے دفنائے الفاظ کے مُردوں کو اکھاڑ اکھاڑ کر زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر کہیں سب لوگ اُردو نہ پڑھے ہوتے تو اس ملک کے مختلف حصوں کے باشندے ایک دوسرے سے بات چیت بھی نہ کر سکتے، کیسی مشکل ہوتی، ہر ایک اُردو کا شکر گزار ہے کہ اُس کے ذریعہ سے وہ لوگ آپس میں تبادلۂ خیالات کر سکتے ہیں، کچھ دُور اندیش اور بہی خواہ عوام حضرات اس بات پر مصر ہیں کہ اُردو ہی عام ملک کی قومی زبان بنا دی جائے، کسی دیسی زبان میں اس کی صلاحیت نہیں اور اگر ہو بھی تو اسے دوسری زبان والے تسلیم نہیں کریں گے۔ بڑی بھوج ہوگی، خون خچر تک کی نوبت آ جائے گی، پھر دیسی زبانوں میں ان علوم و فنون کے خزانے کہاں جن سے اُردو مالا مال ہے، کسی اور خیال سے نہیں تو کم سے کم تہذیب و شائستگی سیکھنے کے لیے سو دو سو برس تک تو اُردو کی عام تعلیم ضروری ہے، کچھ محتاط لوگ دبی زبان سے صرف اتنا ہی کہنے پر کفایت کر رہے ہیں کہ اگر اُردو قومی زبان نہیں بن سکتی تو کم سے کم اس کا رسم الخط ہی دیسی زبانوں کے لئے اختیار کر لیا جائے، اس سے ان دیسی زبانوں کی ترقی ہوگی، اور ملک کی بھی مثلاً جب سے جرمنوں نے اُردو رسم الخط اختیار کیا ہے تب سے بہت ترقی کر رہے ہیں، ہندوستانی حکمرانوں کو دیسی زبان کا سیکھنا بھی آسان ہو جائے گا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آپس میں جو رسم الخط کا جھگڑا بڑھتا جا رہا ہے وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ دیسی زبانوں کے حامی کہیں کہیں ان تجویزوں کی مخالفت کر رہے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ وہ اُردو کو بُرا بھی کہہ رہے ہیں تو اُردو ہی میں۔ اُردو کو قومی زبان بنانے

---

[1] جس شعر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ظاہر ہے کہ ذوق کا ہے، لیکن آخر ہم بھی تو انگریزی حوالے غلط سلط دیا کرتے ہیں اور عموماً تو ترجمہ کرکے۔

یا اس کے رسم الخط کو اختیار کرنے کے خلاف جو مضامین لکھے جا رہے ہیں وہ بھی اُردو اخباروں ہی میں، انگریزی اخبار زیادہ تر پڑیا بنانے کے کام آتے ہیں۔

(۵)

لندن کے تمام بازاروں میں بڑی بڑی دُکانیں لگی ہوئی ہیں، تمام اُردو ہی میں نام لکھے نظر آ رہے ہیں، کچھ ٹوٹی پھوٹی دُکانوں پر انگریزی میں بھی لکھے ہیں، وہاں وہی لوگ خریدنے جاتے ہیں جو ان دُکانوں کی طرح پھٹے حال ہیں، چند دُکانیں خاص طور پر توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔

ایک دُکان سے کچھ چیخ پکار کی آوازیں آ رہی ہیں، بڑی شاندار عمارت ہے، نام پر نظر پڑی، لکھا ہے۔

"مسماۃ نصیبن دلی والی کا مشہور سنگھار گھر"

خاص الخاص ہندوستانی مستورات کے دست نازک سے ناک کان چھدوائیے، چوڑیاں پہنئے، میموں کو یہاں ہندوستانی خواتین بنایا جاتا ہے۔ معلوم ہوا چیخ پکار کی آوازیں میموں کو ہندوستانی خواتین بنانے کے سلسلے سے آ رہی ہیں۔

اسی کے مقابل یہ دوسری دُکان کس کی ہے، دُکان کے باہر ہندوستانی وضع قطع کے نوعمر انگریز کھڑے ہوئے کوئی چیز منہ لے لے کر پڑھتے نظر آ رہے ہیں، لکھا ہے۔

بقاتی خاں شکار پوری — دکھاتا ہے بہار پوری
مشہور ہندوستانی حجام — کرتا ہے بڑے بڑے کام
سفید رنگ کا دشمن جانی — بناتا ہے سانولا ہندوستانی
انگریزو یہاں پر آؤ — ہندوستانی بن کے جاؤ

پڑھنے والوں کے چہرے ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ اس لطف قوافی سے بغایت خوش ہیں اور اسے ازبر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک لڑکا جوش تعریف ضبط نہیں کر سکتا، بول ہی اٹھتا ہے۔

Wonderful people! My word! Such fine poetry written on shops! This is culture! Marvellous!

(حیرت انگیز قوم! ایسی اعلیٰ درجے کی شاعری دُکانوں پر

کبھی ہوئی! تہذیب و تمدن اس کا نام ہے! واہ واہ واہ واہ!) کے اندر بڑی چہل پہل ہے، فرش فروش سے آراستہ تخت بچھے ہوئے ہیں جن پر ہمارے حجام بڑی آن بان سے ساتھ بیٹھے ہیں، دیسی لوگوں کی خوب خوب حجامت بنا رہے ہیں، بیچارے دیسی مصیبت میں گرفتار ہیں مگر ہندوستانی بننے کا شوق ایسا ہے کہ دم نہیں مار سکتے، مونڈ دیا ہے، کہیں کہیں کٹ گیا ہے، خون بھی بہہ رہا ہے، چہرہ لال پیلا ہوا جا رہا ہے، کبھی کبھار اُف اُف کی آواز بھی نکل جاتی ہے۔ گھٹے سر پر تیل کی اس طرح تھپک تھپک کر اور مزے لے لے کر حجام مالش کر رہے ہیں کہ ہتھیلی کھجلانے لگی، ہتھیلی میں تھوڑا کاجل ملا کے چہرے پر لگایا جا رہا ہے۔

ایک صاحب قریب قریب ہندوستانی نما ہو چکے ہیں یہ حجام اُن کے منہ میں کیا کارستانی کر رہا ہے؟ کتھا چونا مستی ملا کر ایک طشتری میں پاس رکھا ہے اس میں مو قلم ڈبو ڈبو کر ان کے دانتوں کو رنگ رہا ہے تاکہ شریفے کے بیج کی طرح ہو جائیں اور وہ حضرت پورے پن کھوا نظر آئیں، معلوم ہوا ان کا منہ ایک دفعہ بہت کٹ گیا تھا، اُس دن سے پان سے توبہ ہے لیکن یہ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتے کہ پان سے شوق نہیں، سامنے قدآدم آئینہ ہے، وہ اپنی ہندوستانی سج دھج دیکھ دیکھ کر اپنے آپ پر فریفتہ ہوئے جاتے ہیں۔

ایک اور بڑی شاندار دُکان نظر آئی، لکھا ہے۔

ہندوستان خاد منشی چمر لین — دل کی تسکین من کا چین
ہندوستانی انگلستان — ہر منشی چمر لین کی دُکان
ہندوستان سے بن کر آئی جان — آتا ہے یہاں سب سامان
سارا چیزیں ہندوستانی — دودھ دہی اور پانی
لے لے کریاں کا خالص چیز — بن جاؤ ہندوستانی خوش تمیز
ہندوستانیاں والا شان — کرتے ہیں تعریف بیدکان

(مصنفہ کیچڑ پلئے شعرا مشہور شاعر منشی چمبرلین المتخلص بہ چمچہ)

دکان کے اندر جا کے دیکھا کسی ہندوستانی امیر الامرا کا محل معلوم ہوتا ہے، ہندوستانی لباس میں ہمارے انگریز دُکاندار کھڑے ہیں، اُن کو دکان کے ملازم تین تین سلام کرتے ہیں کوئی ہندوستانی

پنجابی ہوتے ہیں تو جناب فرنگی سلام اُن کے استقبال کو منشی چرلین خود تشریف لاتے ہیں اگر کوئی انگریز خوشامد کا مارا انگریزی لباس میں آ جاتا ہے تو اسے چوہدار لے کیا مانگتا کہہ کے مخاطب کرتے ہیں،

سب دکانوں سے زیادہ شاندار منشی مکھن لال کیلا بنارسی کی دکان ہے، انواع اقسام کی چیزیں یہاں بکتی ہیں، دام ایک کا دو ضرور ہیں اور اسی وجہ سے دولتمند انگریز اس دکان سے چیزیں خریدنا فخر کی بات سمجھتے ہیں، جو شخص یہاں سے خریدتا ہے اسے لوگ خاص وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس دکان کو اندر سے دیکھنا ہی ایک طرح کی تعلیم سمجھی جاتی ہے مفلوک الحال شوقین یہاں آتے ہیں، چار آنے کا ایک بیڑا پان کھا کر چلے جاتے ہیں، اپنے دوسرے دوستوں کو اپنا منہ سنگھا سنگھا کر ان پر رعب جماتے ہیں۔

ایک صاحب دکان کے باہر اپنا منہ سنگھاتے نظر آتے ہیں۔ سونگھنے والا مست ہوا جا رہا ہے، پوچھتا ہے کہاں سے خریدا، کہتے ہیں مکھن لال کیلا کی دکان سے، وہ حیرت زدہ ہو کے قیمت پوچھتا ہے، جواب دیتے ہیں ایک روپیہ بیڑا۔

(۶)

خدا خیر کرے یہ تمام سی، سی کی آوازیں کیسی آ رہی ہیں! کیا مصیبت پیش آئی؟ کچھ لوگوں کے چہرے نظر آئے، لال بھبوکا، پسینے پسینے، آنکھیں بالکل ستارہ معلوم ہوتی ہیں یعنی پتلی وغیرہ کچھ نظر نہیں آتی خالی دو گول گول دائرے چم چم کر رہے ہیں، ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا آنسو چھلک رہے ہیں، آنکھوں سے ابلتے آ رہے ہیں اور ناک کی بغل سے نالیاں بنائے ہوئے بہتے چلے جا رہے ہیں، اب چہرے کا کچھ اور حصہ بھی نظر آیا، لوگوں کے منہ کھلے ہوئے ہیں مگر چل رہے ہیں، سی سی کی آواز کا منبع یہیں ہے، بے صد لالے کرب بدستور نکلی چلی آ رہی ہے، آخر کوئی وجہ؟ اچھا! یہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں، دسترخوان بچھا ہوا ہے، کچھ لوگ پلتھی مارے بیٹھے ہیں اور کچھ اکڑوں، کھانا ہاتھ سے کھایا جا رہا ہے، منہ کے چاروں طرف دور دور تک اور ہاتھ میں کلائی کے اوپر تک تمام کھانا ہی کھانا ہے، سب خاموشی کے ساتھ کھا رہے ہیں، سوائے سی، سی کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، یکایک ایک صاحب بول اٹھتے ہیں "اُف، بڑا مرچا۔"

دوسرے صاحب فرماتے ہیں "ہندوستانی جتنا آسان ہے (سی)، کھانے میں بھی وہ لوگ (سی)، مشکل کا مقابلہ کرنا سیکھتا ہے (سی)،.. تب کہیں جا کے (سی)، اتنی بڑی قوم بنا ہے (سی)، ہم ذرا مرچا کھا کر (سی)، بے حال ہو گیا... پہلے مرچا کھانا سیکھو مرچا ...سی...سی... پھر ہندوستانیوں کی برابری کا خیال کرنا. سی .سی...سی" بدحواس ہو کر پانی کا گلاس منہ میں الٹ لیتے ہیں،

تیسرے صاحب ٹوک دیتے ہیں کہ دسترخوان پر بات چیت کرنا بد تہذیبی بھی ہے اور مضر صحت بھی اور وہ یوں کہ بات کرنے میں لعاب دہن کے فوارے ایک دوسرے کے کھانے میں جا پڑتے ہیں۔

ایک صاحب کونے میں بیٹھے چھری کانٹے سے شغل فرما رہے ہیں، لوگ اُن کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کے مسکراتے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھو کے پان حقہ کا دور شروع ہوتا ہے، گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا لگا کر سب آن بان سے بیٹھ جاتے ہیں، حقوں کے کش سے فضا لطیف نغموں اور اور خوشبو سے بس جاتی ہے۔ کانٹے چھری سے کھانے والے صاحب کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

منشی شعروان (سابق مسٹر شیریڈن) "ارے مسٹر ٹکو گھبر (خبر) نہیں کہ زمانہ بدل گیا۔ ارے بابا چھری کانٹے میں کیا رکھا ہے، جب تک ہاتھ سے کھانا نہیں سیکھو گے ترقی نہیں کر سکتے"

بڑی زبردست بحث چھڑ جاتی ہے، ہر شخص بیک وقت بولنا چاہتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کیا کہہ رہا ہے، منشی چیریس جو ہندوستان میں مدتوں رہ چکے ہیں لیکن جن کی وطن پرستی اور اصابت رائے کا شہرہ ہے بالآخر بول اٹھتے ہیں "حضرات ذرا صبر سے کام لیجئے سب ایک ساتھ نہ بولئے ہندوستانی

لہ جب انگریز کا قیام ہندوستان میں زیادہ ہو جاتا ہے تو اُس کے اخلاق و عادات خود بخود بگڑ جاتے ہیں۔

ہماری اس حرکت پر ہنستے ہیں۔ ہمیں ہندوستان کی ہر چیز کو
اپنے وطن کی ہر چیز پر فخر ہے، وہ شیخی والا آدمی نہیں ہوں۔ ہر چیز نے
ہم نے اپنے نام کو ہندوستانی نہیں بنایا، ہندوستانی لوگوں
نے بہت مشق چاہا کہ پہنا، مگر میں نے اپنے کو مشق جیسا ہی کہا۔
کرسمس کے موقعہ پر لوگ شیروانی، انگرکھا پہننے لگے ہیں
لیکن میں نے سوٹ نہیں چھوڑا، روزمرہ کے کام کے لئے البتہ
ہندوستانی لباس پہنتا ہوں کیونکہ اس سے بدن میں چستی زیادہ
آتی ہے، ہندوستانی لوگ کتے کو برا کہتے ہیں لیکن میں اپنے
شیرا کو دستور پیار کرتا ہوں، اس سے میرا مطلب یہ ہے
کہ آپ لوگ مجھے ہندوستانیوں کی طرفداری کا الزام نہیں دے
سکتے، میں سچے دل سے اپنے وطن کا ہی خواہ ہوں اور چاہتا
ہوں کہ ہم لوگ بھی ترقی کر کے ان کے برابر ہو جائیں بلکہ ان
سے بھی بڑھ جائیں، یہ کب ہوگا جب ہم ہندوستانیوں کی
اچھی باتیں اختیار کریں گے جن کی وجہ سے وہ اتنی بڑی
قوم ہو گئے ہیں، میرا خیال ہے کہ ہندوستانیوں کو بڑا
بنانے میں ہاتھ سے کھانے کو بڑا دخل ہے، جس وقت انگلیوں
میں کھانے کی گرمی پہنچتی ہے تو وہ سارے جسم میں دوڑ جاتی ہے
اس سے کھانے کا مزا بڑھ جاتا ہے اور کھانا بدن میں لگتا ہے
چھری کانٹے میں یہ بات کہاں، پھر کانٹوں میں ہمیشہ گندگی
رہ جاتی ہے جس سے بیماری پیدا ہوتی ہے، میری عقل میں آتا
ہے کہ ہاتھ سے کھانا کھانا ہماری قوم کی بڑائی کے لئے ضروری
ہے۔

(۷)

بلند بڈ بلا ... بلا بلا بڈ بلا ... بلا بلا بڈ بلا، اچھا کبڈی ہو رہی
ہے۔ انگریز بڑی جانفشانی سے سیکھ رہے ہیں، ہندوستان
کے ایک دیہات سے بدھو خاں، ماہر کبڈی خاص طور سے بلایا
گیا ہے عمدہ کھیل سکھانے کے لئے ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ہے۔

بدھو۔ واہ، واہ، واہ، شاباش، شاباش (واہ، واہ، واہ، شاباش
شاباش)

لڑکے (خوش ہو کے) ہم کیسٹ ہیں نا؟ جناب بدھو،

بدھو۔ اور کیا؟ اب تم لوگ بہت سندر کھیلنے لگے ہو۔

لڑکے۔ تم لوگ ہندوستان جائے کے کھیل (کھیل) سکے گا؟

بدھو۔ ضرور، ضرور، ضرور (ضرور)

[illegible] مسٹر [illegible]
ایک ایک لڑکے کو منشی سبزی سے [illegible]
اسم گرامی ہے مسٹر گرین شاہ آرہ کے مطالعہ [illegible]
ہے، تمام مشرقی بڑی کتابیں پڑھ چکے ہیں، اب وہ ملکی سبزی
کہلاتے ہیں اور انہیں اپنی [illegible] پر ناز ہے۔
[illegible] کی طرف [illegible] منشی سبزی
کی طرف [illegible] منشی [illegible]
میں منہ [illegible] دیکھنے لگے [illegible] کیا، کیا؟
[illegible]
لوگ ہنستے ہوئے [illegible] بہت
[illegible] جناب [illegible] لیکن سیکھا ہے؟
پھر دونوں زور سے قہقہے لگاتے ہیں، ادھر قہقہے بڑھتے
جاتے ہیں اور ادھر منشی سبزی کی پریشانی و پشیمانی۔

بلے کا بجے کے ساتھ یہ جلوس کیسا [illegible] جناب بدھو
آگے آگے پھولوں سے لدے ہار پہنے [illegible] کے پیچھے اور
لڑکے بھی ہار پہنے چل رہے ہیں، تماشائیوں کی بڑی بھیڑ ہے
یہ ان کبڈی کے کھلاڑیوں کا جلوس ہے جو ہندوستان
مقابلے کے لئے جا رہا ہے۔ ملک کے تمام لوگ [illegible] حسرت بھری
نظر سے دیکھ رہے ہیں، سارا قومی جوش کبڈی میں منتقل
ہو گیا ہے!!

ارے یہ کیا! لوگ بھاگ کیسے رہے ہیں، معلوم ہوا ہندوستان
میں کبڈی کا مقابلہ تھا، ایک طرف سے [illegible] کی گئی
پھر کیا تھا [illegible] نکالی گئیں، [illegible]
چھریاں چل گئیں، زخمی لوگ [illegible]
بھی پڑی ہوئی ہیں، جو بچے والے [illegible] انہوں نے
بدلہ لینے کی قسم کھائی ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] چھریاں [illegible]
ہیں۔ [illegible]
وہاں کی [illegible]
کی عزت [illegible]

کو دشمنوں پر پھینکے گئے، جو پہلے تیار ہیں، کڑھائیاں چڑھی ہیں اور ان میں تیل کڑکڑا رہا ہے کہ ڈالا جائے، اچھوتوں پر ابلتا ہوا تیل بھی تیار ہے تاکہ وہ بھی دشمنوں کے سروں پر برسایا جا سکے گا۔

اچھا! گلی ڈنڈا بھی ہندوستان ہر جگہ اس کے اکھاڑے بھی نظر آتے ہیں، اچھے کھلاڑیوں میں خاص ہندوستانی ببول کے بہتر چھ گلی ڈنڈے استعمال کئے جاتے ہیں جن کا وزن تولا جاتا ہے۔ انگلستان میں ویسی لکڑی کہاں اور ہو بھی تو وہاں کے بڑھئی وہ صفائی کہاں پیدا کر سکتے ہیں جو ہندوستان کی دستکاری میں ہے۔ ایک ایک گلی دو دو روپے سے کر دس روپے تک، ڈنڈے کی قیمت پندرہ بیس سے لیکر سو ڈیڑھ سو تک، لکھنؤ اور دہلی کے بنے ہوئے فرانسیسی ڈنڈوں کی قیمت البتہ پانچ سو ہزار تک ہے۔

آج میاں ڈیوک آف ایک ہنٹر کے مکان پر بھیڑ بڑی تھی۔ معلوم ہوا انہوں نے ایک خاص طرح کا قیمتی ڈنڈا جس پر لکھنؤ کی بیگمات نے اپنے دست نازک سے نقش و نگار بنائے ہیں اور اسی کے لئے اصلی ستارہ کا ایک غلاف بھی تیار کیا ہے پانچ ہزار میں منگایا ہے، لوگ دور دور سے دیکھنے آ رہے ہیں۔

غریب لڑکے اپنے پرانے کرکٹ کے بیٹ اور ہاکی کے ڈنڈے نکال رہے ہیں جو مدتوں سے کباڑ خانہ میں پڑے ہوئے تھے اور انہیں چیر چیر کر گلی ڈنڈا بنا رہے ہیں۔

اُستاد گلو ہندوستان سے پندرہ سو روپے مہینے پر بلائے گئے ہیں، وہ تو بہت کم پر راضی ہو جاتے لیکن پندرہ سو انہیں خود پیش کیا گیا، محض اس لئے کہ کھلاڑی کے اُستاد جو خان کو ایک ہزار ملتے ہیں اور میاں ڈیوک آف لنکشائر چاہتے ہیں کہ گلی ڈنڈے کا مرتبہ کرکٹ سے بڑھ جائے۔

[illegible]

مٹھائی، کسی میں امرتی، کسی میں بالوشاہی، کسی میں برفی، لڑکے مزے لے لے کر کھا رہے ہیں اور سب کیک و چاکلیٹ کو برا کہہ رہے ہیں۔

(۸)

ایک نیم ہندوستانی و نیم انگریزی وضع کے مکان کے سامنے ایک تختے پر بڑے اہتمام کے ساتھ لکھا ہے یعنی مختلف رنگ کے صافوں سے یہ الفاظ لکھے گئے ہیں، اپنے میں ایک زبردست صافہ رکھا ہوا ہے۔

اندر ہمارے پرانے دوست منشی شعر دان (سابق مسٹر شیلڈ) بڑی تمکنت کے ساتھ نہایت ٹھاٹھ دار صافہ باندھے بیٹھے ہیں، اُن کا سر آسمان پر ہے اور اس پر قوس قزح کھلی ہوئی ہے۔ تمام نو عمر طرح طرح کے صافے باندھے ہوئے انہیں گھیرے ہیں، کچھ ادھیڑ عمر کے لوگ ہاتھوں میں بیٹھے ہیں، سر پر پگڑی، منشی شعر دان اپنے کو اسم با مسمی ثابت کرنے کے لئے بات بات پہ اردو فارسی شعر پڑھتے رہتے ہیں، ہر آنے والے سے مسکرا کے فرماتے ہیں، آیئے بھائی، آخیر میں سب کو ان مخاطب کرتے ہیں۔

"برادران (بھائیوں سے زیادہ برادران کہنا فصیح سمجھتے ہیں) لوگ ہمارے صافوں پر اعتراض کرتے ہیں ... کرتا ہے یہ ایمان کی بات نہیں ہے، ہم لوگ تو ایمان کی کہو نگا ایمان ہے تو سب کچھ "جو جو چیزیں ہندوستانیوں کی اچھی ہوا کرے ہم کو اس واسطے (واسطے) نہیں، خیر انصاف ہی لے صاحب الشاعر حکیم صافہ اچھا یا ہماری ہیٹ، صافے سے سر گرم رہتا ہے، ہم گرمی مانگتا ہے، چاہیئے گرمی ہمیں سردی نہیں، ڈر لگا رہتا ہے، سردی سے ہم مر گیا، ہم کہتا ہے۔ سکتے ہیں سر کو گرم بناؤ، دل کو گرم بناؤ، ملک کو گرم بناؤ، دیکھو ہم ہندوستانیوں کے برابر ہو جاتا ہے کہ نہیں، صافے میں کتنا آرام ملتا ہے اور کار ہونے سے ہم لوگ ... کے ہو سکتا ہے بازار سے ہمارا غریب بھائی ... لا سکتا ہے ... سستو ... سکتا ہے ... ہمارا بھائی لوگ ... [illegible]

صافہ پہنا ئیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

حاضرین صافہ زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں، کچھ لوگ جو ہاتھوں میں ہیٹ لئے تھے اسے پیچھے سے پھینک دیتے ہیں اور کچھ غصے میں اپنی میلی کچیلی ہیٹ کو زردوں سے پہن کر باہر چلے جاتے ہیں! لوگ ان کی اس حرکت پر ہنس دیتے ہیں۔

منشی شعرداں اپنے گھر میں ایک جھولا پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں، پلنگ کے پاس ایک ٹوٹے مٹی کے برتن میں راکھ بھری رکھی ہے جو پیک سے سرخ ہو رہی ہے، صافے سے تکیے کا کام لیا جا رہا ہے۔ دیوان غالب کی لحن داؤدی میں نغمہ سرائی فرما رہے ہیں، ایک دفعہ ذرا جمائی لے کے فرماتے ہیں "جان، ذرا ایک بیڑا پان۔" جواب ملتا ہے "اے دیکھ نہیں رہے ہو، مہندی لگائے بیٹھے ہیں۔" منشی جی پلٹ کر دیکھتے ہیں تو مسماۃ پیڑھی پر بیٹھی ہیں، صرف ہاتھ پاؤں ہی میں مہندی نہیں لگی ہوئی ہے بلکہ اس کے ٹکڑے گال اور بال میں بھی چپکے ہوئے ہیں، منشی جی دیکھ کر نہال و بہال ہو جاتے ہیں۔

کوئی باہر سے پکار رہا ہے "منشی شعرداں صاحب ہیں؟" منشی جی جلدی سے اٹھ کے صافہ باندھنا چاہتے ہیں دیکھتے کیا ہیں کہ صافے پر ان کے منہ کے کونے سے پیک بہہ کر اکٹھا ہوئی ہے، فرماتے ہیں "لاحول بلاقوۃ" اور بیگم کے مسماۃ کے سر سے دوپٹہ اتار کے اس کا صافہ باندھنے لگتے ہیں، مسماۃ شرم کے مارے گھٹنوں پر جھک جاتی ہیں "نوج ہم ایسے کیسے بیٹھیں، منشی جی۔ تم بکس سے دوسرا دوپٹہ نکال لو۔" باہر سے آواز آتی ہے "مشاعرے کو دیر ہو رہی ہے منشی شعرداں۔" "اوہ ہو" کہہ کے چونک پڑتے ہیں اور دوپٹہ واپس کر دیتے ہیں اور بکس سے دوسرا نکال کے سر پر باندھتے ہوئے فرماتے ہیں "دوپٹہ ہے کبھی صافہ، کبھی صافہ دوپٹہ ہے" لیا بانٹ صافے کی۔"

مسماۃ "ڈولی منگانا نہ بھول جانا، جلسے میں جانا ہے۔"

منشی جی ہاں ہاں کہتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں۔

---

(۹)

چھن من، چھن من چھن من.... چھن من چھن من

چھن من... کیا فردوس گوش آوازیں ایک بلند چہاردیواری کے اندر سے آ رہی ہیں، تان سین کی موسیقی بھی وہ کیفیت نہیں پیدا کر سکتی جو کرتے کو چھیڑنے سے بجاتی ہوئی مستورات پیدا کرتی ہیں، ہائے اکبر کا وہ شعر۔

پھیر سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

اور یہاں پازیب ہی پازیب، جھنکار ہی جھنکار، گورے کہار "اونچا ہے اونچا... ہاں، ہاں، سنبھلے سنبھلا ہاں ہاں" کہتے ہوئے پالکیاں اور ڈولیاں لا لا کے لگا رہے ہیں، دروازے پر موٹے موٹے الفاظ میں لکھا ہے۔

"انگریزی خواتین سیویلائزنگ [illegible] انجمن"

ان پالکیوں اور ڈولیوں کی جانیں چھم چھم قالب بدلتی ہیں، ادھر پالکیاں جسم بے جان ہوتی جاتی ہیں، ادھر پازیب کی جھنکاروں اور قہقہے کے آبشاروں سے نئی زندگی پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ صدائیں تو جان لئے لیتی ہیں، اب صبر نہیں ہوتا، جھانک کے دیکھنا چاہیئے۔

الٰہی خیر! تمام بجلیاں ہی بجلیاں گر رہی ہیں، غریب دل ان میں گھرا ہوا ہے، ہر بجلی دل ہی پر گرتی معلوم ہوتی ہے آنکھیں چکا چوند ہوئی جاتی ہیں، کس بجلی کی دنیا میں پہنچ گئے۔ معلوم ہوتا ہے تمام بجلیاں یہیں سے پیدا ہو ہو کے کائنات میں تقسیم ہوتی ہیں، اب لگا ہیں عادی ہو چلیں، برق کے ساتھ ساتھ برق سازی بھی نظر آنے لگے، ارے توبہ! وہ گوٹے ٹھپے ٹکے کلیدار پاجامے جنھیں پہننے والیاں دست نازک پر سنبھالے ہوئے ہیں، جالی کے کرتے جن کے اندر سے تن سیمیں جھلک رہے ہیں، اس پر شبنمی دوپٹے ـــــ ناکوں میں نتھیں کانوں میں جھمکے اور بالیاں پہنے، سروں پر جڑاؤ چھپکے، ماتھے پر ٹیکہ، پیروں میں لچھے، چھڑے، پازیب بھی کچھ، وہ اٹھلاتی اٹھلاتی چال کہ ہر قدم کے نیچے حضرت دل دبے معلوم ہوتے ہیں۔ ماتھے پر افشاں آنکھوں میں سرمہ، ہونٹوں پر مسی، ہو

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سب فرش پر بیٹھ جاتی ہیں، کچھ چاندی کے [illegible] پلتھی مار کے بیٹھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے، [illegible] شروع کر بیٹھ ہی جاتی ہیں۔ ایک صاحبہ کلغشانی [illegible]

ہیں، یہ تو وہی بی بی ہیں لاک ہینڈ یا بقول مغلانی کے بی بی کلمستفشی ہیں، مغلانی بڑبڑا رہی ہیں "آج بہت خوشی کا دن ہے کہ اتنی عورت لوگ اکٹھا ہیں، سب بالکل ہندوستانی بنا ہوا"۔ مغلانی صاحبہ کہتی ہیں یہ تو انگلستان نہیں معلوم ہوتا ہندوستان کا پرستان بن گیا، جب وہ ہندوستان خبر بھیجیں گے... گی تو وہاں کے لوگ بھی بہت خوش ہونگے، اور ہمیں مہذب سمجھیں گے، جب ہم سوچتا ہے... توبہ... سوچتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے کیسے تھے تو بہت شرم آتا ہے، توبہ، توبہ، کیسے بیوقوف تھے، ہمیں ہندوستانیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اب ہمارا مرد لوگ بھی کتنا خوش رہتے ہیں اور ہم بھی، ہمیں چاہیئے کہ گھر گھر ہندوستانی تہذیب پھیلائیں اور اپنی سب ہمشیرگانوں کو ہندوستانی عورت کے مانک بنا دیں تب ہمارا ملک ترقی کرے گا۔"

کچھ تالیاں بجتی ہیں اور کچھ مرحبا، مرحبا، کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، جی تو یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا بلکہ جی میں میرے آتا ہے یہیں عمر بسر کر لیکن یہ دوسرا دلنواز شور کیسا سنائی دیا۔

(۱۰)

یہ کیسا طوفان بے تمیزی مچا ہوا ہے، عجیب شور و غل ہے، کچھ کچھ سو بانل، سو بانل، آداب، آداب، مکرشا، مکرشا کی سی آوازیں بھی اس میں ملی جلی ہیں، اب سمجھا! یہ سبحان اللہ سبحان اللہ، آداب، آداب، مکرر ارشاد مکرر ارشاد کی خرابی ہے، کیا خوب! مشاعرہ ہو رہا ہے، اہل مشاعرہ کا لباس وضع قطع دیکھ کے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانِ لکھنؤ سے ایک پٹی کاٹ کے سرزمین انگلستان میں جکھوری گئی ہے، ایک مصرعہ بحرِ خفیف مخفیف میں ہوتا ہے تو دوسرا طویل الطویل میں، کچھ عجیب نئی نئی قسم کی بحریں بھی سننے میں آ رہی ہیں، جی چاہتا ہے شریکِ محفل ہو کے اس دعوتِ چشم و گوش سے پوری طرح لطف اندوز ہوں، مگر یہ مسخرا چپراسی کہاں آ کے سر پر کھڑا ہو گیا! اللہم ہتے تو سینا پھر شروع ہو گیا، بُرے وقت آیا، میں نے جھنجھلا کر کہا کیا ہے؟ اس وقت ہم کسی سے نہیں ملتے گا۔

اس نے کہا ایکسپریس ارجنٹ تار ہے، دیکھا تو خالی خوفناک گلابی رنگ کا تار تھا، کھسیا کے اٹھایا اور چاک کیا، ہیں! یہ تو ستم ہو گیا! سرکاری تار اور اس میں ایک سرکاری حکم ایسا کہ مر گئے بے موت، قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون کہاں کی شیریں خیالیاں اور کیسا سینما، زندگی کی ٹھوس حقیقت کے آگے سب ہوا ہو گئے، ہائے اب تو

جس راہ میں کہ خضر کو بھی عذر لنگ ہو
شل پاؤں ہیں تو سینے کے بل جا رہا ہوں میں

خدا انجام بخیر کرے۔

اب اگر آپ یہ کہیں کہ "سینے کے بل جانا" بھی جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا" ہی کا دوسرا نام ہے تو یہ آپ کی خوش مذاقی ہے۔

فضل احمد کریم فضلی

تعلیم بالغان

میں نے اکثر ایسے بچے دیکھے ہیں جو سات سال کی عمر تک اسکول نہیں بھیجے گئے لیکن ان کی قوت مشاہدہ بہت اچھی تھی۔ وہ اپنے گرد و نواح کی ہر شے کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن وہی بچے اسکول میں دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد جذبہ تحقیق کھو بیٹھے۔ مجھے یہ بھی دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ بیشتر نوجوان جو کالجوں میں آتے ہیں گرد و پیش کی چیزوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں اور نہ انہیں مشاہدہ اور تجسس کی طرف رجحان ہوتا ہے۔ وہ واقعات اور حالات کو براہ راست مطالعہ کرنے سے بیزار دکھائی دیتے ہیں بلکہ ہمیشہ کتابوں اور تقریروں کی مدد سے ہر چیز اور ہر فعل کے متعلق معلومات بہم پہونچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مگر اسکی ذمہ داری نوجوانوں پر نہیں، طریقہ تعلیم پر عائد ہوتی ہے۔

بنی نوع انسان میں حقیقت دریافت کرنے کا جذبہ فطری طور سے موجود ہوتا ہے۔ بچپن سے یہ ذوق تجسس مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں نمایاں ہوتا ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے سمجھ بڑھتی ہے معلومات حاصل کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

لیکن معلمین بالغان کو بچوں سے نہیں بلکہ ایسے لوگوں سے سابقہ ہوتا ہے جن کی سمجھ پختہ ہو چکی ہے جن کی ذہنی صلاحیتیں ارتقا کی بیشتر منزلیں طے کر چکی ہیں۔ ان کو اچھے برے کی تمیز اور اپنے مفاد سے کما حقہ واقفیت حاصل ہو چکی ہے یا یوں کہئے کہ ذہن اور عقل کے لحاظ سے وہ معلمین ہی کے ہم پلہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کا علم محض مشاہدات پر مبنی ہے اور بغیر کسی ہادی یا رہنما کے اس کا بہت کچھ امکان ہے کہ وہ اپنے مشاہدات سے خلاف فطرت نتائج پر پہونچکر توہمات میں مبتلا ہو جائیں۔ معلمین کو خوش قسمتی سے محققین کی رائیں اور واقعات کی تہہ تک پہونچنے کی صلاحیت ہوگئی ہے۔ وہ اپنے معلومات کا جائزہ کتابوں اور رسالوں میں شائع شدہ تصنیفوں کے مطالعہ سے لے سکتے ہیں اور اپنے شکوک کو رفع

کر سکتے ہیں۔ آپ نے اکثر غور کیا ہوگا کہ بہت سے واقعات میں آتے ہیں جو اصلیت سے کوسوں دور ہوتے ہیں بلکہ بالکل [illegible] ہیں مثلاً آپ دیکھتے ہیں کہ سورج روز صبح کو مشرق سے نکلتا اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ سورج زمین کے گرد دورہ کرتا ہے لیکن محققین نے تجربات سے ثابت کر دیا کہ واقعہ برعکس ہے۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور چونکہ ہم خود زمین کے ساتھ اسی رفتار سے گھوم رہے ہیں اس لئے ہمیں اس کی گردش کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً دو ریل گاڑیاں متوازی پٹریوں پر ایک ہی رفتار سے ایک سمت جا رہی ہوں تو ایک میں بیٹھے ہوئے شخص کو دوسری گاڑی ساکن معلوم ہوگی۔ اس قسم کی مثالوں [illegible] کا یقین ہونا بہت سہل ہو جاتا ہے۔ اور زندگی کے روزمرہ حالات کے ذریعہ بہتیرے پیچیدہ مسئلے آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ لیکن وہ افراد جنکو اتفاقات زندگی نے پڑھنے لکھنے کی صلاحیت سے محروم کر رکھا ہے ان معلومات سے بے بہرہ رہتے ہیں یا اپنی سمجھ اور مشاہدات کی بنا پر غلط عقائد اور توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اب جبکہ ملک میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ان بدقسمت انسانوں کو تاریکی سے نکالنے کی کوشش ہو رہی ہیں تو یہ مسئلہ نہایت قابل غور ہے کہ نفسیاتی رجحان کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے معلومات کو کیس طرح [illegible] کیا جا سکتا ہے اور کن کن ذرائع سے ان میں [illegible] ہے۔ واضح رہے کہ معلمین کو کبھی وقت بھی یہ احساس نہ ہونا چاہئے کہ وہ ذہن اور حافظہ کے اعتبار سے کسی طرح بھی اپنے متعلمین سے افضل اور برتر ہیں۔ [illegible] ضرور انہیں امتیاز حاصل ہے اور اسی [illegible] معاشرتی اور اقتصادی حالت [illegible] تعلیم کے مقاصد پر مختلف [illegible] تو سو [illegible]

[illegible] تھے تو اس کی قوت حافظہ کی
تعریف [illegible]۔ پروفیسر فلاں یا پرنسپل فلاں بہت
[illegible] استاد تھے جو اپنے طالب علموں کے
نام برسوں کے بعد ملاقات ہونے پر بھی یاد رکھتے تھے لیکن
ہو سکتا ہے [illegible] یادداشت دیکھ کر میں دنگ رہ گیا
اور مجھے [illegible] ہوا کہ ان بڑے بڑے پروفیسروں اور
پرنسپلوں [illegible] حافظہ اس ان پڑھ ٹیلر کے حافظہ کے مقابلے
میں بالکل [illegible] اس واقعہ سے نظریہ تعلیم پر روشنی بھی
کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ کئی سال ہوئے جب [illegible]
کا ایک اجلاس بمبئی میں ہوا تھا۔ اسی سلسلے میں [illegible]
[illegible] ہوٹل میں لنچ پر مدعو تھے۔ جو لوگ آئے [illegible]
ان کی ٹوپیاں لے کر مخصوص کمرہ میں [illegible] تھا۔ نہ
[illegible] کا نام پوچھا اور نہ ٹوپی پر نشانی لگائی کھانا
[illegible] جب لوگ جانے لگے تو اس ٹیلر نے ہر شخص کو
[illegible] دی۔ ہر شخص کو اچنبھا سا ہو گیا میں نے
[illegible] سے طالب ہو کر کہا کہ آپ سکولوں اور کالجوں
[illegible] نہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے معلمین
[illegible] بچوں کے نصاب کی بندشوں سے
آزاد ہیں۔ لہٰذا معلم بآسانی اپنے طلبا کے رجحان میلان
[illegible] کی مناسبت سے نصاب تعلیم خود مرتب کر سکتا
[illegible] احساس ہوا ہے کہ چار چھ مہینے کی قلیل
[illegible] سے طلبا کو لکھنا پڑھنا سکھایا
[illegible] جو مہارت یا صلاحیت
[illegible]

ان اغراض کو حاصل کرنے کے لئے وقت تھوڑا ہے لیکن کام بہت۔
ایک ذمہ دار انسان کا زیادہ وقت کسب معاش میں صرف
ہو جاتا ہے۔ محنت مشقت کے بعد جو تھوڑا وقت ملتا ہے
اس میں وہ تفریح بھی کرنا چاہتا ہے اور بال بچوں کے ساتھ
رہنا بھی چاہتا ہے۔ لہٰذا معلمین کو ایسے ذرائع عمل میں لانے
ہیں کہ طالب علم بور بھی نہ ہوں اور مقصد بھی پورا ہو جائے۔
گویا یہ تعلیم اور تفریح کو یکجا کر دیا جائے تاکہ سانپ بھی
مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ طالب علم کو لکھنے
اور پڑھنے سے رغبت ہو۔ اس مقصد کے لئے اسے ایسی کتابیں اور رسالے
دیئے جائیں جن میں [illegible] الفاظ اور خیالات قصے کہانیوں
نظموں اور گانوں کی صورت میں پیش کئے گئے ہوں۔ سچے واقعات
حالات کا دلچسپی کے ساتھ ذکر ہو جو اس کی روزمرہ زندگی میں
گرد و پیش ہوتے رہتے ہیں۔ جو واقعات اس کی آنکھوں کے
سامنے ہوتے رہتے ہیں دلچسپ مثالوں سے ان کے اسباب
و نتائج اسکو سمجھائے جائیں۔ افعال نیک سے الفت اور افعال
قبیح سے تنفر پیدا کرنے کا مقصد بھی ساتھ ساتھ شامل ہو۔ اس
کے بعد چند نئی باتیں اس کے سامنے رکھی جائیں جن کے سمجھنے
کے لئے سوچنے اور عقل پر زور دینے کی ضرورت ہو۔ ان
نئے مسئلوں پر اپنے اظہار خیال کا موقع بھی دینا چاہئے اور
پھر بعد استاد گفتگو میں [illegible]
کی تصحیح بھی ہوتی جائے۔ طالب علم کے [illegible]
افسانوں کی صورت میں پیش کر کے ذہن نشین کی جا سکتی ہیں۔
اور اس طرح [illegible] ذوق پیدا ہو سکتا ہے ترقی کر سکے [illegible]
سکے [illegible] حالات زندگی کے ذریعہ جغرافیہ اور [illegible]
سے واقفیت بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ مختلف حلقوں میں انجمنیں
قائم کر کے وقتاً فوقتاً کتھا یا میلاد کی محفلیں منعقد کی جائیں
اور ان میں مختلف مذاہب کی یکساں خصوصیتیں بیان کر کے
اتحاد و یگانگت کی تحریک کی جائے۔ اصول [illegible] واقفیت
اور [illegible]
[illegible] جو چیزیں عام طور سے مشاہدہ
میں نہیں آتیں ان کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی
[illegible]
[illegible]

ـــــــــــ ایسی جگہوں سے اکثر لوگ دلچسپی رکھتے ہیں اور وہاں تفریح کے لئے جاتے بھی ہیں لیکن ایسے موقعوں پر اگر کوئی سمجھانے والا ساتھ ہو تو سیر کے ساتھ ساتھ معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے ان مشاہدات کو اگر طالب علم اپنے الفاظ میں قلم بند کرے تو لکھنے، پڑھنے اور حافظہ کی استعداد کے لئے بہت مفید ثابت ہو۔

تختہ سیاہ اور فلمی تصویروں کے ذریعہ بہتری غیر دلچسپ باتیں دلچسپ بنائی جا سکتی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی کی مثالیں خوش اسلوبی کے ساتھ مانوس واقعات کو سمجھانے میں ہمیشہ مدد دیتی ہیں۔ بعض لوگ جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں ان پر کماحقہ غور کرتے ہیں۔ بعض جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر توجہ نہیں کرتے، اور بعض ایسے بھی ملیں گے جو نہ مشاہدے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں اور نہ غور و فکر کی۔ یہ معلموں کا فرض ہے کہ ان سب کو گرد و پیش سے آگاہ کریں اور اصلیت سمجھانے کی کوشش کریں تاکہ مضر چیزوں سے پرہیز اور مفید چیزوں سے الفت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے اور اس طرح ان کی زندگی ایک پُر سکون اور کامیاب زندگی بن جائے۔

سب جانتے ہیں کہ لوگوں کو واقعہ کا علم ہوتا ہے لیکن پھر بھی واقفیت کے مطابق عمل پیرا ہونے کی عادت پڑنے میں کافی مدت لگ جاتی ہے۔ مثلاً کیا ہر شخص جانتا ہے کہ ہوا سے آگ بھڑک اٹھتی ہے؟ قبل اس کے کہ اس کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا جائے آپ اس واقعہ کے متعلق کیا کہیں گے، اور ایسے سینکڑوں واقعے روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ گیس کے چولھے پر اپنے شوہر کیلئے کھانا تیار کرنے میں ایک عورت کی آستین کو آگ لگ گئی اور فوراً اس کی پوشاک سے شعلے بھڑک اٹھے۔

جس وقت اس کا شوہر باورچی خانہ کے دروازے تک پہونچا اس نے اپنی بیوی کو چیختے ہوئے بڑے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ عورت سیڑھیوں سے اترتی ہوئی نیچے بھاگتی ہوئی چلی گئی اور کپڑے کے جلتے ہوئے ٹکڑے ہر طرف پھیلتے گئے۔ شوہر اسے اس وقت پکڑ سکا جب وہ نیچے کی منزل پر پہونچ کر دروازہ کھول کر سڑک پر جانے والی تھی اس نے عورت کو فرش پر لٹا دیا اور پوشاک کے جلتے ہوئے حصوں کو اس کے جسم سے الگ کر دیا۔ لیکن اسی دوران میں سیڑھیوں اور کمروں میں پھیلے ہوئے جلتے ٹکڑوں نے تمام سامان کو مشتعل کر دیا اور ہر طرف دھواں بھر گیا۔ فلیٹ کے دوسرے لوگ دوڑ پڑے۔ ایک نے ایمبولینس کے لئے ٹیلیفون کیا اور دوسرے نے آگ بجھانے والے انجن کے لئے۔ معلوم ہوا کہ اسپتال میں اس عورت کی حالت بہت خطرناک ہے۔ ایسے بھی واقعات آپ نے سنے ہونگے کہ بہتیروں کی آنکھوں کے سامنے کوئی جل رہا ہے لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ کس طرح سے انکی مدد کی جائے۔ سوا اس کے کہ یا تو آگ بجھانے والے انجن یا پولیس کو اطلاع کر دی جائے۔ چھوٹے بچوں کے کپڑوں میں آگ لگتی ہے تو مائیں گود میں اٹھا کر گھبرائی ہوئی بھاگ نکلتی ہیں۔ اس طرح بجائے بجھانے کے آگ کو اور بھی ہوا دیکر مشتعل کر دیتی ہیں۔

اس قسم کے واقعات کو فلموں کے ذریعہ پیش کر کے لوگوں کو یہ بتایا جانا چاہئے کہ انہیں ایسے موقعوں کے وقت کیا کرنا چاہیئے اور کس طرح ایسی مصیبتوں میں ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں۔

ایک اور امر جو نہایت اہمیت رکھتا ہے اور جس سے با اوقات لوگ ناواقف نظر آتے ہیں، وہ حفظانِ صحت کے اصول ہیں۔ صحت اور بیماری کے متعلق تو عوام میں بے علمی کی وجہ سے اس قدر توہمات عام ہو رہے ہیں کہ انھیں دور کرنے اور خیالات کو صحیح راستے پر لگانے کے لئے مدت درکار ہے۔ بھوت، پریت، آسیب، پھونک جھاڑ، جنتر منتر وغیرہ پر اعتقاد اتنا مستحکم ہے کہ طبیبوں اور ڈاکٹروں کی طرف لوگ متوجہ نہیں ہوتے۔ زچائیں ہسپتال کے نام سے لرز جاتی ہیں۔ گندی کثیف اناڑی دائیاں انہیں خوب لوٹتی بھی ہیں اور طرح طرح کے امراض میں زندگی بھر کیلئے پھنسا دیتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شوہر اور بچوں کے لئے عورت وبالِ جان بن کر رہ جاتی ہے اور اپنی قلیل زندگی کی گھڑیاں بدقت گزار کر کاٹتی ہے۔ عورت کو اس کی جنسی خصوصیات اور ضروریات سے بالکل ناواقف رکھا جاتا ہے اور یہی بے علمی اس کی بہت سی تکالیف کی ذمہ دار ہے۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ کیوں نہ ... عورتوں کو کیوں نہیں ان اصولوں سے آگاہ کر ... [illegible]

[illegible] آدمی کے جسم سے جو عمل کرتی [illegible] اس مسئلہ پر گفتگو کرنا [illegible] بھی ہے۔ وہ طبیب کے پاس [illegible] اس غرض سے ہیں کہ مریض کو ایسے حالات ہو جائیں جیسے علاج کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ تیسرے یہ کہ اخبار یہ خیال کرتے ہیں کہ لڑکیوں کو ان کی مائیں جملہ [illegible] خصوصیات سے آگاہ کر دیتی ہوں گی حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

چوتھے یہ کہ طبیبوں کو مرض دور کرنے کی اُجرت دی جاتی ہے نہ کہ مرض سے بچائے رکھنے کی۔ اس لئے ڈاکٹروں کی بھی ذہنیت ویسی ہی ہو گئی ہے۔ مریض کو دوا دی فیس جیب میں ڈالی اور ان کا کام ختم ہو گیا۔ کچھ معلوم ہے کہ چین میں لوگ ڈاکٹروں کو اُجرت تندرستی کے دوران میں دیتے تھے۔ اگر بیمار ہو گئے تو ڈاکٹر کو مفت علاج کرنا ہوتا تھا۔ لباس، غذا، صفائی، پرورش اور [illegible] امور کے متعلق کما حقہ واقفیت، غلط طریقوں کے نقصانات اور ٹھیک طریقوں کے فوائد کو قلم کے ذریعہ دلچسپ طور پر سکھائی جا سکتی ہے۔ اور یادداشت کی خاطر مشاہدات کو قلمبند کرنے کے لکھنے اور پڑھنے کی مشق بھی جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح پر دوسرے اخلاقی اور اقتصادی اصولوں کی [illegible] کی تبلیغ سمجھدار طلباء کرتے رہیں گے۔ مضمون [illegible] معلمین کا یہ کام ہے کہ ان کو دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کریں۔ یہ بھی واضح رہے کہ شہر اور دیہات کی ضروریات مختلف ہیں۔ ان کے اصول زندگی میں بھی بڑا فرق ہے۔ [illegible] کا انتخاب لوگوں کی ضروریات اور پیشے کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ دیہات میں اگر کھیتی، ڈاک خانہ [illegible] دیا جاتا ہے تو شہر [illegible] کا رخ [illegible] دوسری مشینوں کی طرف [illegible] دی جانی چاہئے [illegible] دونوں [illegible] کے لئے [illegible]

[illegible] اساتذہ کی ایک [illegible] کے مطابق [illegible]

[illegible] اور لوگوں کے رجحان سے مختلف مضامین اپنی مطبوعات میں سے انتخاب کر سکیں۔

کوشش یہ ہونی چاہئے کہ مختلف مضامین سے ہر قسم کی تھوڑی واقفیت اور اپنے پیشہ یا شغل سے متعلق مضامین سے پوری طرح آگاہی ہو جائے تاکہ تہذیب کی روشنی، نعمتوں اور قدرت کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے مست ہو کر ہر شخص ایک اچھا اور تندرست فرد قوم بن سکے۔ میں جانتا ہوں کہ معلمین بالغان کا کام اسکول اور کالج کے اساتذہ سے کہیں زیادہ کٹھن ہے لیکن ان کو بہتر مواد ملتا ہے لہٰذا اگر طریقہ تعلیم رائج الوقت اصولوں سے مختلف ہو اور خدمت قوم کا جذبہ مشعل راہ ہو تو قوم و ملک کی بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے کا سہرا ان کے سر ہو گا۔ آنے والی نسلوں کو پھر اتنی دقتوں کا سامنا نہ کرنا ہو گا کیونکہ ان کی پرورش مناسب تعلیم پاتے ہوئے والدین کی آغوش عاطفت میں ہو گی۔

سراج حسین تقوی

مرنے کے بعد ایک گھنٹے زندہ رہنے کی اجازت

ایک بادشاہ اپنی خوابگاہ میں بستر پہ حالت نزاع میں پڑا ہے۔ کمرے میں خاموشی نہیں ہے۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری ہے۔ ہر شخص دبی چال سے آتا ہے اور بات بھی کان میں کرتا ہے۔ لیکن جہاں بہت سے آدمی اس کوشش میں ہوں کہ کسی قسم کا غل شور نہ ہو وہاں نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ تھوڑا سا شور ضرور پیدا ہو جائے۔ جو ایک حالت بلب بیمار کو شاق گزرتا ہے لیکن اس میں بھی کچھ مضائقہ نہ تھا کیونکہ طبیبوں نے کہدیا تھا کہ بادشاہ اب کچھ سن نہیں سکتا چہرے سے بھی کوئی علامت ایسی ظاہر نہیں ہوتی تھی جس سے معلوم ہو کہ سننے کی قوت باقی ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو کوئی علامت تو صورت سے ظاہر ہوتی۔

کچھ عرصہ سے ایسا انتظام کیا گیا کہ کمرے میں روشنی نہ آنے پائے کھڑکیوں اور روشن دانوں پر پردے ڈال دیے گئے تھے۔ لیکن اب پریشانی اور بدانتظامی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ کسی کو پردوں کے درست کرنے کا خیال کہ کہیں سے روشنی نہ آئے نہ رہا۔ اور نہ کسی کا خیال رہا کہ بیمار کی آنکھوں کو روشنی کی چمک نہ ستائے لیکن اب اس سے بھی کچھ نہ ہوتا تھا کیونکہ طبیبوں نے کہدیا تھا کہ بادشاہ کو اب کچھ سوجھتا نہیں۔

بہت دنوں سے سوائے شاہی ملازموں کے کوئی شخص بادشاہ کے بستر کے قریب نہ آسکتا تھا، لیکن اب جس کا جی چاہتا بے تکلف کمرے میں چلا آتا اب اس میں بھی کوئی ہرج نہ تھا کیونکہ طبیبوں نے کہہ دیا تھا کہ بادشاہ اب کسی کو پہچانتا نہیں۔

کئی دن سے بادشاہ بالکل نحیف و ناتواں پلنگ پر پڑا تھا ایک ہاتھ پلنگ سے باہر نکلا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی چیز کو ڈھونڈھ رہا ہے۔ ملکہ بادشاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اُسے دبا رہی تھی۔ مگر بادشاہ کو اس کا مطلق احساس نہ تھا۔ آخر کار نوبت یہ آئی کہ بادشاہ کا منہ بند اور آنکھیں پھر گئیں دل کی حرکت بند ہو گئی۔ جو لوگ اس وقت کمرے میں تھے وہ چپکے چپکے کہنے لگے دیکھو تو بادشاہ کی صورت کیسی حسین ہو گئی ہے۔

اب اتفاق ایسا ہوا کہ بادشاہ پھر جی اُٹھا۔ ہوش آ گئے۔ دیکھا کہ ہر طرف سکوت ہے یہ سکوت اُسے بہت معلوم ہوا۔ دل کو ایک راحت محسوس ہوئی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ جنت میں آسودہ ہے کمرے میں پھولوں کی خوشبو تھی کھڑکی کھل جانے سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ پلنگ کی پائنتیوں چند موم کی شمعیں روشن تھیں پلنگ پر ان کی ہلکی روشنی پڑتی تھی۔ سیاہ مخمل کی ایک اوپر پڑی تھی صرف چہرہ اور سر کھلا تھا، جو چار پانچ آدمی کہ پاس رہنے کے منتظر تھے وہ غافل پڑے سوتے تھے۔ اس وقت کچھ ایسا چین اور آرام محسوس ہوا کہ [illegible] ہلنے کو جی نہ چاہا۔ جب محل کے بڑے گھنٹے نے گیارہ بجائے بادشاہ کو کچھ جنبش ہوئی اور وہ ہنستا ہوا پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب کچھ کچھ یاد آیا کہ جب دم نکلنے کو ہوا تھا تو بہت ہی زاری اور الحاح کے ساتھ اس بے انصافی کے فریاد کی تھی کہ اُسے دنیا سے اس وقت اٹھایا جاتا ہے جبکہ اُس کی بہت ہی زیادہ ضرورت تھی یہ فریاد کی تھی کہ ایک آواز یہ کہتی ہوئی سنائی دی کہ [illegible] کی زندگی ہم تجھے اور دیتے ہیں اس وقت میں اگر تیرے ایسے نکلے جو تیرا زندہ رہنا چاہتے ہوں تو پھر یہ مہلت دی جائے گی۔

غرض یہ گھنٹا اب بادشاہ کا تھا جس میں مرنے کے بعد وہ زندہ رہے گا۔ گویا موت ہے اس وقت کو جھیلو یہ بتانا مشکل ہے کہ اس گھنٹے کا کتنا وقت گزر چکا تھا۔ اسپنسانہ کے اچھے فرمانرواؤں میں تھا۔ رعایا کی بھلائی کے لئے دن رات کوشش کرتا تھا کسی بات کا اُسے غرور نہ تھا یہ بھی جانتا تھا کہ زندہ رہنے میں بہت لطف و مزہ ہے [illegible] مزہ اب زندگی سے بھی زیادہ اسے محسوس ہونے لگا [illegible] کہ یہ بادشاہ خود غرض نہ تھا جب ہر وقت کا [illegible] جو کچھ تھا رعایا کا تھا کہ اپنا نام [illegible]

[illegible] کے دروازے کے پاس آیا۔ یہاں دیکھا [illegible] بے خبر ہو گئے ہیں۔ اب بادشاہ کو سب چیزیں [illegible] کے خیال سے جو تکلیف دل کو [illegible] ہو گئی۔ اب جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ اُسنے اپنی زندگی میں کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ دُنیا میں اُس سے کہیں بہتر لوگ موجود ہیں۔ دُنیا بڑی جگہ ہے۔ اس وقت دُنیا کی ہر چیز سے ایسی بڑی معلوم ہوئی کہ کبھی پہلے معلوم نہ ہوئی تھی۔ مگر آج مرنے کی رات کو معلوم ہوتا تھا اس کے مرنے کے ساتھ ملک اور وطن کی محبت بھی مٹ جائے گی۔ لیکن اب سمجھ میں آیا کہ ملک و وطن کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔

وہ قبر سے باہر آ کر سوچنے لگا کہ پہلے کہاں جاؤں۔ ملکہ کے رنج اور صدمے کے خیال سے اس کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوئی اور دل میں کہنے لگا کہ بس ملکہ سے تو اس وقت ملوں گا جبکہ دوبارہ زندگی مل چکی ہو گی۔ اور اُس سے کہنے لگا کہ کہوں گا کہ بس اب [illegible] کے آنسو نہ رو خوشی کے آنسو رو۔ محل کے گھنٹے میں بارہ بجنے پائیں گے کہ مجھے زندگی دوبارہ مل جائے گی۔ اب کچھ زیادہ دیر نہیں ہے۔ ایک ہی گھنٹے کی تو بات ہے۔ مجھے اس وقت کی باتیں ایک خواب کی طرح یاد آئیں گی۔ اس خیال کے ساتھ بادشاہ نے ایک ٹھنڈا سانس کھینچا۔

جب اپنا آج کا مرنا یاد آیا تو سوچا کہ ایک دن پھر ہمیشہ کے لئے مرنا پڑے گا۔

اس خیال کے آتے ہی چاہا کہ جس پلنگ پر لیٹا تھا پھر جا لیٹے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ میں نے کبھی نے مجھ سے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ اور اب جب اس آواز کا یہ کہنا یاد آیا کہ اگر تین آدمی بھی ایسے نکلے جو تیرا جینا چاہتے ہیں تو پھر تجھے دوبارہ زندگی مل جائے گی۔

اس وقت سارا شہر چاندنی میں نہایا بادشاہ کی نظر کے سامنے تھا۔ اس آواز سے تو تین آدمی کہے ہیں۔ میں تو تین ہزار تلاش کروں گا جو میرا پھر زندہ ہو جانا چاہتے ہیں کیا وہ سب میرے دوست اور خیر خواہ نہیں ہیں۔"

جب بادشاہ دروازے سے محل کے نیچے اترنے لگا تو دیکھا کہ [illegible] لڑکی سسکیاں لے کر رو رہی ہے [illegible]

تو کیوں روتی ہو۔ لڑکی نے سسکیاں بھر کر جواب دیا۔ "اماں اور بابا دونوں بادشاہ کے مرنے کی خبر سن کر محل میں گئے ہیں، ابھی تک نہیں آئے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ شام کو بھی میں نے کچھ نہیں کھایا تھا اور میری گڑیا بھی ٹوٹ گئی ہے۔ میں تو جب ہی خوش ہوتی کہ بادشاہ پھر زندہ ہو جاتا۔" اب پھر اُس لڑکی نے زار و قطار رونا شروع کیا۔

بادشاہ کو لڑکی کی یہ بات اچھی معلوم دی اور بولا "میری رعایا میں ایک لڑکی یہی ہے جو میرا زندہ ہو جانا چاہتی ہے۔"

بادشاہ اولاد نہ رکھتا تھا۔ بے اختیار جی چاہا کہ لڑکی کو تسلی تشفی کرے۔ مگر اس وقت اسے بہت کام کرنے تھے چنانچہ وہ سیدھا اپنے ایک پرانے دوست امیاس نامی کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس امیاس سے بادشاہ کو وہ محبت تھی کہ کسی دوسرے سے نہ تھی۔ جب سوچتا تھا کہ میری موت سے امیاس کو کیسا سخت صدمہ پہنچا ہو گا تو ایک قسم کی [illegible] خوشی محسوس ہوتی تھی۔

دل میں کہتا تھا، امیاس غریب کا جو حال اس وقت ہو گا وہ میں ہی خوب جانتا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ امیاس نہیں مرا ورنہ میں تو اس کے غم میں ختم ہی ہو جاتا۔

امیاس کے مکان پر جب پہنچا تو دیکھا وہاں خوب [illegible] ہے، لوگ روشنیاں لئے پھرتے ہیں۔ محفل میں گھوڑے سجے جا رہے ہیں۔ ہر طرف ایک ہڑبونگ سی مچی ہے لیکن امیاس کی صورت کہیں نظر نہ آئی، مکان کا کوئی کمرہ بغیر دیکھے نہ چھوڑا مگر امیاس کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اب یکایک یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں میرے مرنے کی خبر سن کر امیاس نے تو اپنا کام تمام نہیں کر لیا۔ تمام کمروں میں دوست کو ڈھونڈتا پھرا آخر کار وہ ایک کمرے میں آیا جہاں یہ دونوں تخلیے میں بیٹھ کر بڑے بڑے منصوبے اور مشکل سیاسی مسائل پر غور کرتے گفتگو کیا کرتے تھے مگر امیاس اس کمرے میں بھی نہ تھا گو کمرے کی حالت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ یہاں موجود تھا۔ میز پر کاغذ کتابیں الٹی سیدھی اور فرش پر بیٹھنے کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک تصویر بھی نیچے پڑی تھی۔ میز سے گرنے میں اس کا فریم ٹوٹ گیا تھا۔ فرش سے اسے اٹھایا تو دیکھا اپنی ہی تصویر تھی۔ تصویر اٹھانے سے ہاتھ کچھ جلنے سا لگا۔ فوراً

[illegible] پھینک دیا۔

تنقشدات میں آگ خوب جل رہی تھی۔ یہاں دیکھا تو ایک خط بچے کچھ پرندے جل چکے ہیں کچھ باقی ہیں۔ جو جلنے سے بچے تھے انہیں اٹھا کر دیکھا تو دیکھا اپنا ہی خط ہے جو آخر مرتبہ دوست کو لکھا تھا اتنا دیکھتے ہی ان پرندوں کو بھی آگ میں ڈال دیا۔ اتنے میں دو آدمی کمرے میں آ گئے ان میں ایک مرد تھا دوسری عورت تھی۔ مرد سفری کپڑے پہنے کہیں دور سے آیا ہوا معلوم ہوتا تھا اس مرد نے آتے ہی پوچھا "امیاس کہاں ہے؟"

وہ عورت بولی "نئے بادشاہ سلامت کی حضور میں اپنی خدمات پیش کرنے گیا ہے۔ آپکو کیا خبر ہے کہ آجکل ہم کس پریشانی اور تشویش میں ہیں۔ یہ نیا بادشاہ پہلے بادشاہ کی طرح سے عجیب و غریب خیالات کا آدمی نہیں ہے۔ امیاس کو بادشاہ سابق کی حضور میں جو رسوخ حاصل تھا اب وہی رسوخ اس نئے بادشاہ سے تقرب میں مخل ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس نئے دربار میں وقت پر پہنچکر وہ اس بادشاہ کا بھی مورد لطف و کرم ثابت ہوگا۔ امیاس بادشاہ وقت سے عرض کر سکتا ہے اور اس میں کوئی بات غلط نہ ہوگی کہ بادشاہ سابق جو اصلاحیں ملک میں کرنی چاہتا تھا وہ قطعی لغو اور مضحکہ خیز تھیں اور امیاس انہیں ہرگز پسند نہ کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ بادشاہ سابق سے اُسے ایک قسم کا دلی تعلق تھا مگر ہمیں اپنا خیال رکھنا بھی تو ضروریات سے ہے۔ بادشاہ سابق کے دم نکلتے ہی امیاس کو سب سے بڑی فکر یہی ہوئی کہ کسی طرح نئے بادشاہ کی خدمت میں رسوخ حاصل کرے۔ میں اب اس کے پیچھے کبھی اسی کے پاس بھیج رہی ہوں"

اس مرد نے کہا "خاتون آپنے جو کچھ کہا وہ بالکل بجا و درست ہے" بادشاہ نے اس مرد کی طرف غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جسے بادشاہ نے کسی ملک میں سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اب اس مرد نے کہا کہ میں بھی امیاس کی طرح اس نئے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں مشکل یہ ہے کہ یہ بادشاہ ناتجربہ کار اور نو عمر ہے کہ حکومت اور سیاست کے معاملات اس کی سمجھ میں آتے ہی نہیں۔ مجھے زبردستی اس غرض سے روانہ کر دیا کہ میں فلاں والیٔ ملک سے مصالحت کی گفتگو کروں حالانکہ یہ مصالحت ہمارے بہترین فوائد کے بالکل خلاف ہے۔ مگر خوشی کی بات ہے کہ ہم کچھ عرصے میں ایک سخت لڑائی میں مصروف ہو جائینگے اگر یہ لڑائی پیش نہ آئی تو فوج میں ترقیاں [illegible]

بادشاہ نے اس تقریر کو زیادہ سننا نہ چاہا [illegible] آگے بڑھا کہ میں اپنی غریب رعایا کے پاس جا کر [illegible] کبھی اس نئے آدمی کے بادشاہ ہونے پر راضی اور خوش [illegible] جتنے احسانات میں نے اپنی اس تنگدست اور مفلس رعایا پر کئے ہیں اتنی ہی شکر گزاری کے ساتھ وہ میری حمایت کریگی۔

اب محل کے کمرے میں سوا گیارہ کا گجر اس نے بجتے سنا۔ یہ بادشاہ بھی کچھ عجیب قماش کا آدمی تھا اسے اپنی ریاست میں مفلسوں غریبوں کے محلے اور مکانات خود یاد تھے بعض مقامات وہ تھے جن کی کسی اور کو خبر تک نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں۔ غریبوں پر جو جو مصیبتیں اور آفتیں گزرتی تھیں اور جس جس طرح سے ان بلاؤں کو اس نے دور کیا تھا آج تک کسی نے ایسا نہ کیا تھا۔

بادشاہ کی موت بھی تپ دق سے ہوئی تھی۔ مگر محل میں کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ مرض اُسے کہاں سے لگا تھا مگر خود وہ سمجھتا تھا کہ مفلسوں کے گندے غلیظ گھروں میں جانے سے یہ مرض لگا تھا جو آخر کار اس کی موت کا باعث ہوا۔ اب وہ پھر انہیں گندے اور غلیظ گھروں کو جا رہا تھا۔

سوچنے لگا اب بچارے دق میں کیا لیں گے۔

جب ان زدہ حال غریبوں میں پہنچا تو انہیں اسی حال میں دیکھا جس میں پہلے چھوڑا تھا۔ میلے کچیلے۔ گندے ناپاک جیسے پہلے تھے اب بھی وہی حال تھا۔ دو دو چار چار حلقہ باندھے گلیوں میں کھڑے تھے۔ اور بادشاہ کی موت کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ کوئی ایسا نہ تھا جس کی زبان پر بادشاہ کا نام نہ ہو اور یہ نہ پوچھ رہا ہوں کہ جنازہ کب اٹھے گا۔ سوائے ان باتوں کے کسی اور بات میں اس وقت انہیں دلچسپی نہ تھی۔

ایک بڑے پرانے شرابخانہ میں پانچ چھ آدمی میز کے گرد بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ بادشاہ چلتے چلتے ان کی باتیں سننے کو رکا۔

ان میں سے ایک آدمی نے جس سے بادشاہ خوب واقف تھا کہا۔ یوں کہو تا کہ اچھا ہی ہوا۔ ایسے بادشاہ سے کیا حاصل جو ایک مسیحی جب تک مجبور نہ ہو جنگ کرنا پسند نہ کرتا ہو بھلا ایسا آدمی شجاعت کو کیا [illegible]

[illegible] ... تھا اور [illegible] کی بات میں دخل نہ [illegible] وہ پہچانتا ہی
نہ تھا ہر وقت اُسکی زبان پر تھا کہ خود جانتا ہوں اپنے گھر والے
وہ جانتے ہیں ان باتوں کے سوا اسے کچھ کہنا آتا ہی نہ تھا۔
ملا کوئی [illegible] ہماری [illegible] میں دخل دینے سے کیا
مطلب؟

[illegible] تو یہی کہونگا کہ جتنے بادشاہ
[illegible] میں تو اس مرد کو پسند کرتا ہوں جو انہی
[illegible] اور جسے پارٹ [illegible] اور شیری [illegible]
[illegible]

[illegible] کہنے لگا۔ کچھ خبر بھی ہے۔ اُس نے تو پھانسی دینے
قاعدہ ہی توڑ ڈالا تھا۔ بھلا یہ کیوں۔ وہ سمجھتا تھا کہ جیل خانہ
[illegible] جس قدر قیدی زیادہ ہوں گے سرکاری کام بھی زیادہ
ہوگا۔ لیکن [illegible] جو اس کے [illegible] نیت ہو۔ جب تک
[illegible] کوئی غرض [illegible] عیب کی کون پروا کرتا ہے۔ اس
[illegible] سب [illegible] ہاں یار ٹھیک کہتے ہو۔ جیل کے [illegible]
اب آدمی کا گزر ہے۔ بادشاہ اب یہاں سے کچھ چلتا ہوا۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی دشمن گالیوں اور ملامتوں
ایک طوفان بھی اس کے سر پر لا کھڑا کرتا ان باتوں کے مقابلے
وہ اُسے [illegible] معلوم ہوتا۔

اب وہ [illegible] جیل خانہ کے اس حصہ میں پہنچا جہاں
پھانسی والے مجرم [illegible] ابھی تک پھانسی دینے کا قانون
[illegible] ہم سے کم ایک مجرم کے معاملے میں
[illegible] موت کا [illegible] نہ ہونا بادشاہ کی خوشی کا موجب تھا۔
مجرم صورت سے [illegible] اور پریشان معلوم ہوتا تھا اور
[illegible] بادشاہ نے اس آدمی کو
[illegible] ایک مرتبہ پہلے [illegible] دیکھا تھا۔ اس وقت مشکل سے پہچانا کہ یہ
[illegible] دشمن [illegible] سزائے [illegible] کا حکم دیا تھا اگر
داروغہ جیل [illegible]
جسے بادشاہ [illegible]
تھا۔ مجرم [illegible]
[illegible]

اس پر وہ مجرم کہنے لگا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ میں بزدل یا ڈرپوک ہوں
جو کچھ پیش آنے والا ہے میں اسکے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ یہ خط
مہربانی کرکے میری بیوی کو پہنچوا دیجیے۔"

مشیر نے کہا "بادشاہ جس نے تمہاری موت کا حکم دیا تھا
مر گیا۔ تم کو اب معافی مل جائیگی۔ اب جو بادشاہ ہوا ہے اسے تم
سے اتنی پرخاش نہیں ہے جتنی کہ پہلے بادشاہ کو تھی۔ غالباً تم
کل رہا کر دئے جاؤ گے۔" مجرم نے خوف زدہ ہو کر پوچھا "کیا وہ
بادشاہ مر گیا؟" مشیر نے بڑے ذوق سے کہا "ہاں وہ مر گیا۔"

مجرم [illegible] ہو گیا اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا "جناب والا
میں اس بادشاہ کی عزت دل سے کرتا ہوں جو کچھ بھی ہو مجھے
بادشاہ ہونے میں کلام نہیں۔ میرے ساتھ اس کا برتاؤ ایسا
ہی تھا جیسا کہ ایک شریف کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اس کی
بیوی کی جوانی [illegible] میں اول تو یہی چاہتا ہوں کہ وہ پھر زندہ ہو جائے۔"

مجرم جس وقت یہ باتیں کہہ رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں
آنسو تھے۔ بادشاہ یہ گفتگو سنکر جیل خانہ سے باہر آیا۔ بادشاہ
گھمنڈ کا [illegible] اب پہلی سی آن بان سب غائب ہو چکی تھی۔ ایک
دشمن کا اس کے حال پر رحم کھانا ایسی بات تھی جسکا برداشت
کرنا ہزار دوستوں کی ملامت برداشت کرنے سے زیادہ مشکل
تھا۔ لیکن چونکہ بادشاہ خود شریف تھا اس لئے دوسروں میں
شرافت دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ ایک دشمن کے منہ سے یہ سننا
کہ میں زندہ رہوں ہزار بار مرنے سے بدتر ہے۔ اب اس نے اپنے
دل میں سختی سے کہا کہ جو کچھ مجھ پر گذرا ہے وہ نہ گذرنا چاہیے
تھا۔ اپنی موجودہ حالت پر غور کرکے افسوس کرنے لگا۔ جس
محبت پر اسے اتنا بھروسہ تھا وہ محض خواب و خیال نکلا۔ جن
لوگوں کی ترقی کے لئے وہ اپنا خون پانی ایک کیا کرتا تھا ان
میں ترقی کرنے کی قابلیت ہی نہ تھی۔ ایک نادان لڑکی اور ایک
قیدی انہیں صرف اسکے دوست نکلے۔ سب کچھ ہونے ہوانے
کے بعد معلوم ہوا کہ نقصان کا خیال کرکے زندہ رہنے میں کوئی
نفع نہیں۔ اب تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ زندگی حاصل
کرنے کی کوشش سے ہاتھ کھینچ لوں اور بس چپ چاپ اپنی موت
کے بستر پر جا لیٹوں آرام کروں اور سو جاؤں۔ قضا و قدر نے
میری موت کا حکم سنا دیا ہے۔ میرے ساتھ بے انصافی نہیں کی
[illegible]

اصلی اور حقیقی صورت میں دیکھنے لگا۔

چاند پر گہرے بادل چھا گئے اور بادشاہ کو سردی محسوس ہونے لگی، یکایک خیال آیا کہ وہ بالکل تنہا ہے۔ کوئی ہمدرد، غمخوار نہیں، بالکل اکیلا ہے۔ کسی کو اس کی پروا نہیں۔ ایک محبت بھری نظر کا وہ بھوکا ہے۔ مہر و محبت کی ایک نگاہ، ہمدردی کے ایک لفظ کے لئے وہ سب کچھ دینے کو تیار ہے۔

وقت کے ختم ہونے میں اب چند منٹ باقی تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس انتظار کی مصیبت اس نے کیونکر کاٹی۔ بس اب یہی ایک آس باقی ہے۔ اور یہی اس کے لئے سب کچھ تھی۔ اسی خیال سے دل کو تسکین ہوئی۔ وہ سب کو معاف کر چکا تھا یا یہ سمجھئے کہ سب کچھ بھول چکا تھا مگر طبیعت ذلیل ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ ملکہ کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اب اسے تذبذب ہوا کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ ممکن ہو کہ یہ بھی ایک دھوکا ثابت ہو۔ کیا اس دھوکے کو معلوم کر لینے سے یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ واپس چلا جائے لیکن نہیں، میں نے کبھی کسی سے ڈر کر کوئی کام نہیں کیا۔ اندر گیا، ملکہ کو دیکھا آتشدان کے قریب اکیلی بیٹھی ہے۔ زلفیں بکھر کر چہرے پر نقاب بن گئی ہیں۔ اتنا دیکھ کر دل پر ایک چوٹ لگی کہ کیوں میں اس کی نسبت دل میں شبہ لایا۔

ملکہ ہاتھ میں انگوٹھی پہنے تھی، انگوٹھی کا نگینہ خوب چمک رہا تھا اور سوائے اس چمک کے یہاں کوئی اور چیز قابل دید نہ تھی۔

بادشاہ نے ملکہ کی تشفی کرنی چاہی۔ اسے تعجب ہوا کہ ملکہ کے پاس کوئی خادمہ نہیں ہے۔ حالانکہ آج ہی شب کو اس کے شوہر کا انتقال ہوا ہے یہ سب کہاں چلی گئیں۔ ملکہ کسی خیال میں غرق بیٹھی تھی۔ کاش وہ اس کا نام لے کر پکارتی اس سے بات کرتی، مگر وہ بالکل چپ چاپ بت بنی بیٹھی رہی۔

کچھ کھٹکا ہوا۔ بادشاہ چونک پڑا۔ دیوار میں ایک طرف کو چور دروازہ تھا۔ بادشاہ سمجھتا تھا کہ بجز اس کے اور ملکہ کے کوئی اس دروازے سے واقف نہیں۔ اب ایک مرد سامنے کھڑا نظر آیا۔ ملکہ نے لبوں پہ انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اسے اشارہ کیا اور پھر دوڑ کر اس کو لپٹ گئی۔

"تم آ گئے۔ جی خوش ہو گیا۔ جب وہ مرنے کو تھا تو میں چلی جانے لگی اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی رہی۔ یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے ڈر لگتا تھا۔ ڈر رہی تھی کہ کہیں پھر وہ زندہ نہ ہو اٹھے۔ مگر اب مر کر کیا زندہ ہوگا۔" ہم دونوں کی خوب چین سے گذرے گی۔

ملکہ نے انگلی سے انگوٹھی اتار کر اسے چوما، روتی رہی اور پھر وہ انگوٹھی اس مرد کو دیدی۔

جب بارہ بجے تو جو لوگ میت کی پاسبانی کرتے تھے دفعتاً چونکے اور دیکھا کہ بادشاہ اپنے بستر پر اسی طرح بے حس و حرکت سرد پڑا ہے جیسے کہ پہلے تھا مگر چہرے پر کچھ تغیر ہے۔

ان لوگوں نے ملکہ کو بادشاہ کی صورت دکھانی نہیں چاہی۔

عنایت اللہ

نادار

اب کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں — تنہائی ہے!
دن بیت چکا، اور شام گئی، رات آئی ہے،
اب نور مٹا — اور آگ بجھی،
سنسان سماں کیا سوگ منانے آیا ہے؟
اوپر آکاش کے جنگل میں
تاروں کا سا دن چھایا ہے
اور چاند نے روپ دکھایا ہے
میں کیسے کہوں اب کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں؟

اُس جھرمٹ سے
اس جگمگ سے
تنگ آکر نیچے آیا ہوں
تھک ہار کے لیٹا بستر میں،
کیا دن کا شور مٹا ہے — یہ جھوٹ ہے، شور تو باقی ہے سر میں،
کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے
سب اپنی دھن میں کھوئے ہیں،
کوئی تھک کر آنکھ ملاتا ہے
کیا دیکھتا ہے جو شرماتا ہے؟
رکتا ہے، جھجکتا ہے لیکن کب آگے پاؤں بڑھاتا ہے؟
رستے پر چلتا جاتا ہے،
ن، اوسکے، آن دیکھے سوچے ہیں،
رکی آنکھ سے جاگتے ہیں اور دل کی آنکھ سے سوتے ہیں،
بیداری کا سپنا ہے،
اپنے میں کوئی بھی نہیں جو اپنا ہے،
بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔

میز ہے ایک ہی کرسی ہے، اک الماری،
میز پہ کاغذ بکھرے ہیں اور میری چند کتابیں ہیں،
الماری میں — بند پڑے ہیں کچھ کپڑے ہیں،

کپڑے آخر پھٹ جائیں گے،
کاغذ؟ — ردی بھی بکتی ہے،
اور چند کتابیں بھی میری بک جائیں گی،
اک الماری رہ جائے گی،
اور کرسی بھی،
اور میز کی بات نہیں کہتے؟
کیا میز کی بات؟ — کہوں کیسے؟
یہ تینوں چیزیں کرائے کی ہیں، ان کی بات سے کیا ہوگا؟
ان تینوں میں کوئی بھی نہیں جو اپنا ہو،
کوئی بھی نہیں کوئی بھی نہیں،

یہ نیچے کیسی کھٹ کھٹ ہے؟
دن بیتا — رات کا جھنجھٹ ہے،
اس کھٹ کھٹ سے
اس جھنجھٹ سے
تنگ آکر اوپر جاتا ہوں،
اوپر آکاش کے جنگل میں
تاروں کا جادو چھایا ہے،
اور چاند نے رنگ جمایا ہے،
یہ چاند ہے جانے والوں کا،
یہ تارے آنے والوں کے،
اس اونچے نیلے منڈل میں
سب دور ہیں، دور ہیں، دور بہت،
کوئی بھی نہیں جو پاس آئے،
کوئی بھی نہیں جو میرا ہو،
کوئی بھی نہیں کوئی بھی نہیں،

میراجی

ایک بندر تھا!

ڈاکٹر شنکر کی ایک بیوی تھی اور دونوں کے تین بچے تھے، اور ان سب کی پرورش کرنے والی ایک پریکٹس تھی جو اس بستی میں انھوں نے بڑی عرق ریزی کے بعد پیدا کی تھی۔ اس بستی کے لوگ جہاں یہ بات جانتے تھے کہ ڈاکٹر شنکر ایک بہت اچھے طبیب ہیں وہاں یہ بھی جانتے تھے کہ ریلوے ہوٹل میں رہنے والی پارسن سے ڈاکٹر صاحب خاص طور پر ملتفت ہیں۔

یہ بات ہر شخص جانتا تھا، لیکن ڈاکٹر شنکر اپنی نجی زندگی کو خواہ مخواہ ظاہر کرتے نہیں پھرتے تھے اور نہ لوگوں کی رائے کی انہیں کوئی پرواہ تھی۔ لوگ بھی اس قماش کے ہوتے ہیں کہ جب تک گناہ یا عیب کو احتیاط سے روپوش کیا جا سکتا ہے اس وقت تک وہ کسی گناہ کو گناہ اور عیب کو عیب سمجھ کر جاننے اور محسوس کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

اس پارسن کے بارے میں آپا کو بھی سب کچھ پتہ تھا، مگر وہ دم بخود رہتی تھی، بعض عورتیں اپنے شوہروں کو ذرا آزاد چھوڑ کر پھر جھپٹتی ہیں جیسے بلی چوہے کو اپنے قبضے سے آزاد کرکے اچانک جھپٹا مارتی ہے اور مار کر اپنی چالاکی اور اس کی بے بسی پر ناز کرتی ہے۔

پارسن کا نام — ؟ جانے دیجئے۔ اسے کیکاؤس نوشیرواں کے خاندان سے سمجھ کر کوئی بھی بھلا سا ایرانی نام دے لیجئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں اسے پارسن ہی کہا جاتا تھا۔

"مس پارسن صاحب" کو یہاں آئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے لیکن کسی کو ٹھیک پتہ نہ تھا کہ وہ کس غرض سے اس بستی میں آئی ہوئی ہیں۔ اور ریلوے ہوٹل میں کیوں مقیم ہیں۔ ریلوے ہوٹل میں خرچ اسقدر زیادہ ہوتا ہے کہ اس سے آدھے داموں پر وہ بستی میں کوئی مکان لے کر آرام سے رہ سکتی تھیں۔

ڈاکٹر شنکر کا مطب قریب ہی تھا۔ آتے جاتے ان کی نظر ریلوے ہوٹل کی کھڑکی کی طرف اٹھ جایا کرتی تھی جہاں انہیں پارسن اکثر بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ ڈاکٹر شنکر کو اکثر ریلوے ہوٹل میں آنا پڑتا تھا جہاں دور دراز شہروں سے لوگ آ کر نفیس نفیس کمروں میں رہتے اور خراب خراب کھانے کھا کر قیمتیں دے کر ریلوں میں بیٹھ کر آگے نکل جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر شنکر کو یہ یقین تھا کہ کسی نہ کسی روز ریلوے ہوٹل سے کوئی مریض اسے ضرور بلائے گا اور جب وہ ہوٹل جائیگا تو اسے بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ یہ پارسن کون ہے۔ اس کے پاس اتنا قیمتی سامان کیوں ہے اور اس سے بڑھکر یہ کہ اس نے ایک بندر کیوں پال رکھا ہے۔ مس صاحب ہر وقت یہ بندر بغل میں دبائے کھڑکی میں بیٹھی بازار کی سیر کیا کرتی تھیں۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس بندر کو انھوں نے بچپن سے پالا تھا اور ایسا سدھا لیا تھا کہ بلی کی طرح دبک کر گود میں آ بیٹھتا تھا۔

اس بستی میں بہت کم لوگوں کو بندر اس قدر قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ بندر بھلا مانس تھا۔ قد کا چھوٹا۔ رنگ کا بھورا۔ آنکھوں میں شرارت کی سی چمک۔ بات بات سے ذہانت آشکارا۔ اس کو قدرت نے مذاق سلیم عطا کیا تھا یا صحبت لطیف کے باعث اس میں مذاق سمجھنے اور برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ بہت کم وہ چھیڑنے سے بھڑکتا تھا، مگر جب اسے غصہ آ جاتا تھا تو وہ بالکل بندر ہو جاتا تھا۔ بندر آخر کار بندر ہے۔

اس سے وہ بہت جلتا تھا کہ اس کی مالکہ کے پاس کوئی ملنے آئے اور وہ اس سے ہاتھ ملائے یا مصافحہ کرے۔ بندر پر ایک رقیبانہ جنون طاری ہو جاتا تھا۔ یہ کیفیت جلد ختم ہو جاتی تھی کیونکہ پارسن لڑکی اسے جلد گود میں اٹھا لیتی تھی اور وہ اس کے سوسن جیسے چہرہ کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا جیسے کسی موتی کو شنکر کے دونوں ہاتھوں کی پتیاں ڈھانپ کر رکھ دی جاتی ہوں۔

مس صاحب! [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر شنکر کو مس صاحب کے کمرہ تک پہنچا دیا گیا۔ وہ اپنا بیگ لیتے ہوئے داخل ہوئے۔ بستر پر ایک حسین مریضہ گرم کپڑوں میں لپٹی لپٹائی اس طرح پڑی تھی جیسے روئی کی پٹاری میں انگور، چہرہ نقاہت سے زرد مگر رسیلی جوانی اس کے پیچھے جھلکتی ہوئی۔ تکیہ پر سیاہ چمکدار بالوں کا ایک انتشار معطر اور ان کے بیچ میں ایک ننھا سا خوبصورت چہرہ اس طرح دمک رہا تھا جیسے سونے کو تاؤ دے کر رکھا گیا ہو۔ بخار نے اس کا چہرہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح سُرخی مائل سُنہری بنا دیا تھا۔

جونہی ڈاکٹر شنکر نے کمرہ میں قدم رکھا، ہدایت کے مطابق نوکر بندر کو اٹھا کر باہر لے گیا جو پاس ہی لیٹا ہوا تھا اس کھٹ پٹ سے بارن کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے لاپروائی سے دیکھا کوئی آیا ہے۔ ایک آدھ لمحہ غور سے دیکھا اور آنکھیں پھر بند کر لیں لیکن یکایک وہ آنکھیں جو ابھی بند ہوئی تھیں پھر کھل گئیں۔ اور زیادہ غور سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگیں۔ لاپروائی توجہ سے بدل گئی اور بہت مشکل سے انہوں نے اپنے چہرہ پر تبسم پیدا کیا۔

ڈاکٹر شنکر کو عادت ہوگئی تھی کہ گھر میں خواہ کیسی ہی سخت لڑائی ہوئی ہو اور بعض نادہند مریضوں نے اچھا ہونے کے بعد ان کے کئی بل خواہ کتنی ہی بے ایمانی سے ہضم کر لئے ہوں مگر جب کسی مریض کے پلنگ کے پاس پہنچیں تو ضرور مسکرا دیا کریں۔ چنانچہ وہ مسکرا کے معائنہ شروع کیا۔ نتیجہ بہت جلد معلوم ہوگیا۔ مس صاحب کو انفلوئنزا ہوگیا تھا۔ بخار تھا اور بہت تیز۔ سارے جسم، جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھیں کہ مجھے پروا نہیں ہے کہ مر جاؤں یا جیتی رہوں، یہ درد ضرور کم ہو جانا چاہیئے۔

لیکن وہ مری نہیں اور ان کا درد بھی دور ہو گیا۔ بعض ڈاکٹروں کا طریقہ علاج ایسا اچھا ہوتا ہے کہ آدمی مرتا بھی نہیں اور درد بھی جاتا رہتا ہے!

دوسرے روز جب ڈاکٹر شنکر مریضہ کو دیکھنے پہنچے تو بخار اتر گیا تھا۔ آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوگئی تھی جیسے فیل ہو جانے کے یقین کے باوجود کسی مضمون کی حسابی غلطی سے کوئی لڑکا پاس ہو جائے اور وہ خوشی سے کھل رہا ہو اس کی آنکھوں سے حیرت اور خوشی ملی ہوئی چمک نکل رہی ہو۔

مس صاحب کے بال سنورے ہوئے تھے۔ چہرے کی رنگت کو مصنوعات جمال کے استعمال نے اور بھی دلاویز بنا دیا تھا، گویا ہاتھی دانت کی چوڑیوں میں طلائی منبت کاری کر دی گئی تھی۔

ڈاکٹر شنکر کے لئے یہ نظارہ ایک قلبی اضطرار کا باعث بن گیا۔

ڈاکٹر کے ماتھے کی رگیں پھولنے لگیں۔ کنپٹیاں گرم ہوگئیں اور جسم میں خون فوارہ کی طرح اُچھلنے لگا۔ اس غیر معمولی کیفیت کو قابو میں رکھنا قطعی ضروری تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی مشکل سے ضبط سے کام لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ اب حواس بجا ہیں۔

مگر تیسرے روز جب وہ مریضہ کو دیکھنے آیا تو وہ مریضہ تو رہی ہی نہ تھی حسینہ ہی حسینہ رہ گئی تھی اس لئے وہ بھی ایک قلب حساس بن کر رہ گیا تھا اور ڈاکٹر ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر شنکر حواس بجا نہ رکھ سکا۔ بس پھر کیا — بس۔ ختم —!

ایک عرصہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب کبھی مس صاحب کو ڈاکٹر شنکر کی ضرورت ہوتی تو وہ بیمار ہو کر بستر پر لیٹ جاتیں اور ڈاکٹر شنکر کو علاج کے لئے بلاتیں۔ ڈاکٹر شنکر اطلاع ملتے ہی — اکثر نہایت عجلت کے ساتھ۔ ریلوے ہوٹل کی طرف چل پڑتے۔ چند منٹ میں وہاں پہنچ جاتے جہاں بندر اور ڈاکٹروں کے سوا اور کوئی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ جب وہ آتے بندر کمرے سے باہر نکال دیا جاتا۔ جب ڈاکٹر واپس مطب میں چلا جاتا تو بندر کمرے میں چھوڑ دیا جاتا۔ اس ترتیب عمل کے بعد مس صاحب کی طبیعت باہر کی دنیا کے لئے اچھی ہونی شروع ہو جاتی۔ اگر یہ "وزٹ" شام کے وقت ہوتی ہے تو وہ ساری رات آرام سے سوتیں۔ بستر پر بندر کو لٹاتیں اور اسے خوب زور سے بھینچ کر پیار کرتیں اور دونوں کھیلتے کھیلتے سو جاتے۔ وہ اچھی ہونے کے بعد شام کو سرکاری باغ میں، جو پاس ہی میں تھا، ٹہلنے کے لئے چلی جایا کرتی تھیں۔ ہوٹل کے لوگ یا بستی والے اگر ان کے بارے میں کچھ کہتے سنتے تو اس کی انہیں کوئی پروا نہ تھی۔

ہر شخص کو علم تھا کہ مس صاحب کے پاس ہوٹل کا کونسا کمرہ ہے۔ اس کا ایک دریچہ ترکاری کی منڈی کی طرف

گھٹتا تھا۔ یہ ترکاری کی منڈی ہوٹل کے عین نشیب میں تھی ادھر اُدھر پنسیری کی اور پھلوں کی دوکانیں تھیں، کچھ موزے بنیان والے اور اور بابو لوگوں کو ان کی بچی کچی تنخواہوں کے بوجھ سے اور بھی ہلکا کر دینے والے جنرل مرچنٹوں کی دوکانیں تھیں۔ بندر بھی اکثر اس کھڑکی میں آجاتا تھا اور اچھلتا کودتا رہتا تھا۔

بندر تھا بڑا بدمعاش۔ بلیوں اور کتوں کا اس نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ وہ نیچے سے پھل چرا کرلے جاتا تھا۔ کبھی غصہ میں آکے کترے ہوئے پھل اٹھا اٹھا کر راہگیروں اور اس کے کام میں مداخلت کرنے والے دوکانداروں کے تاک تاک کے مارا کرتا تھا۔ بستی کے لوگ اس طاعون سے سخت نالاں تھے مگر اس کی ہنسانے والی باتوں سے کبھی کبھی خوش بھی ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن سب لوگ اس بندر اور اس کی مالک پارسن اور کھڑکی کو خوب پہچانتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ساری بستی اس ہنگامہ عشق سے واقف تھی، سب جانتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے مگر لوگ کچھ زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔ بعض لوگ اچھی طبیعت کے ہوتے ہیں اور چپ چاپ دیکھتے رہتے ہیں کہ برائی ہو رہی ہے تو ہونے دو ہم تو الگ ہیں۔ مایا کو بھی کوئی پروا نہ تھی گو اسے سب کچھ معلوم تھا کہ پارسن لڑکی سے ڈاکٹر صاحب کا کیسا التفات ہے لیکن وہ طے کر چکی تھی کہ جب تک اسے مجبور کر کے نہیں بتایا جائیگا اس وقت تک وہ بھی کچھ نہیں کہے گی۔

مگر ایک روز خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک واقعہ ہو گیا! واقعات یونہی جایا کرتے ہیں۔ آپ کو یہ یقین ہوتا ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ کسی تردد کی ضرورت نہیں ہے اور سب کام حسب منشا ہو رہا ہے کہ یکایک کچھ رونما ہوتا ہے ایک پتنگ کا ایک دم سے اوپر آسمان کی طرف جاتا ہے اور وہاں جا کر پھٹتا ہے۔ سب کو پتہ چل جاتا ہے کہ نیچے کیا ہو رہا ہے!

اس موقع پر چند واقعات اتفاق سے یکجا ہو گئے جس نے معاملہ کو ختم ہی کر کے رکھ دیا۔ ڈاکٹر شنکر نے گھر کا سب سامان باندھا۔ اپنا مطب و طب اونے پونے بیچا، اپنی بیوی اور تین بچے کو لے کر کسی دوسرے شہر میں چلے گئے!

سب سے پہلی چیز تو یہ تھی کہ ان کو لڑائی کے بعد سے ٹیونک کوٹ پہننے کا خاص شوق پیدا ہو گیا تھا۔ خاکی رنگ کی چوڑی ڈھیلی والی پتلون ان پر بہت جچتی تھی اور وہ اسے اکثر پہنا کرتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ پارسن لڑکی جس کمرہ میں رہتی تھی اس کی کھڑکی سب پہچانتے لگے تھے کیونکہ وہ بازار کی طرف کھلتی تھی۔ تیسری چیز بندر تھا۔

جس وقت ڈاکٹر شنکر تشریف لاتے تھے جب بندر کو کمرے کے باہر دھکیل دیا جاتا تھا۔ اس خاص موقع کے دن چالاک بندر پہلے ہی سے کمرے کے کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا، نوکروں نے اسے ادھر ادھر دیکھا بھی اور جب وہ نہیں ملا تو اطمینان سے کمرہ بند کر دیا گیا۔ اور لوگ بھول گئے کہ بندر تھا کہ نہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ چھوٹا سا خصیل جانور بڑا جلتا ہے بعض باتوں سے۔

بہرحال کچھ بھی ہوا ہو واقعہ مختصر طور پر یہ ہے۔ شام کے کوئی چار بجے تھے۔ شام کے وقت سبزی والوں کی دوکانوں پر اور ہوزری والوں کے تختوں کے سامنے بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ سارے شہر کا آدمی وہیں چیزیں خریدنے آتا ہے۔ بس یہ سمجھئے کہ ساری بستی اس وقت وہاں موجود تھی، اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ اب سورج ڈوبنے کے قریب ہو چلا تھا۔ دوکانداروں کی زبانیں انجن کے پسٹن کی طرح چل رہی تھیں۔ خریداروں کے ہاتھ جیبوں میں جاتے تھے اور دوکانداروں کے ہاتھ سے مصافحہ کر کے تہی دست واپس آتے تھے۔ لوگ بہت مسرور و شاداں تھے۔ تہوار آنے والا تھا۔ طرح طرح کی رنگین اور گراں قیمت چیزیں خرید رہے تھے باتیں کر کر کے گرانی کے خیال کو دل سے مٹا رہے تھے۔ دکاندار اس گفت و شنید میں برابر کا حصہ لیتے تھے تاکہ خریداروں کو گرانی کا احساس کم از کم بازار میں تو نہ ہونے پائے۔ یہ "اپلائیڈ سائیکالوجی" بازار کے دوکاندار کانٹ اور ہیگل کو پڑھے اور جانے بغیر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ سب کچھ بازار میں ہو رہا تھا کہ یکایک ایک خاموشی سی چھا گئی۔ سارا چوک ریلوے ہوٹل کے ایک خاص کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ [illegible] سمندر تھا جو اس وقت ریلوے ہوٹل [illegible] آگ لگ گئی تھی کیا۔ [illegible]

رہے تھے۔

اس کھڑکی میں یکایک بندر نمودار ہوا۔

ڈاکٹر چتن شنکر کی زرد موٹر ریلوے ہوٹل کے باہر کھڑی ہوئی تھی حسب معمول لوگوں نے یہ سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب یا تو ہوٹل میں ہیں یا اس کے آس پاس۔

بندر کوئی چیز کھینچ کر باہر لا رہا تھا۔ کھینچنے کی حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ جس چیز کو وہ کھینچ کر لا رہا ہے قطعی طور پر بھاری ہے۔ یا اس کا سنبھالنا تو مشکل ہے ہی۔ وہ کھڑکی میں سے منہ نکال کر جھپکا پھر مجمع کو دیکھکر منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا اور برابر جھپکے گیا۔ وہ اسقدر جھپکا کہ اس کا سارا جسم اس چیز میں چھپ گیا۔ یہ چیز دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی لباس کی قسم سے ہے۔ یکایک بندر کے ہاتھ اس چیز کو جس میں وہ لپٹ سا گیا تھا چھوڑتے ہوئے باہر نکلا اور وہ چونٹیوں کی طرح پھر جھپکا۔ اس نے ایک قلابازی کھائی اور وہ معہ اس کپڑے کی گٹھڑی کے نیچے آ پڑا۔ لوگ دوڑے۔ وہ [illegible] ہیں کہ بندر نیچے گر کر مر چکا تھا اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ لوگوں نے اس کے زخمی جسم سے بڑی مشکل سے اس کپڑے کو چھڑایا۔ سب حیران ہو کر دیکھنے لگے کہ یہ بندر کس چیز میں پھنس کر نیچے گرا ہے۔

کبھی لوگ بندر کی طرف دیکھتے تھے کبھی کھڑکی کی طرف۔ کبھی کار کی طرف اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے تھے۔ سارا چوک کی پبلک اس چیز کو دیکھنے کے لئے ریلوے ہوٹل کے نیچے یا رین کی کھڑکی کے نیچے جمع ہو گئی۔

یہ ڈاکٹر چتن شنکر کی پتلون تھی!

ظفر قریشی!

آنسو

عالم عرفاں سا طاری تھا خس و خاشاک پر
عرش کے اسرار اتر آئے تھے فرش خاک پر
ظلمتوں میں جھلکیاں سی تھیں کسی فانوس کی
اور ہوا میں سرسراہٹ تھی کسی ملبوس کی
تیز رو جھرنوں سے آتی تھی صدا جھنکار کی
گنگناتی تھیں مقفّی چوٹیاں کوہسار کی
حشر سا برپا تھا ستر دشتِ ہوکی ذات میں
دیو اڑتے پھر رہے تھے عالم ظلمات میں
اک نوکے مخمصے میں تھا عناصر کا نظام
بام ہفت افلاک سے اونچا تھا شاعر کا مقام
خلوت دل میں کئی الجھے ہوئے رازوں کا شور
ناامیدی کی گھٹی آہیں، تمناؤں کا زور
پتلیوں میں چند گھبرائی ہوئی انگڑائیاں
عارضوں میں چند سنولائی ہوئی رعنائیاں
کانپتے ہونٹوں پہ اک بے نام لذت پرفشاں
دھونکنی کی طرح سانسیں برف کی سی انگلیاں
یکبیک سینے میں دل چیخا نگاہیں جھک گئیں
ہونٹ سمٹے، پتلیاں چکرائیں سانسیں رک گئیں
ایک آنسو روح سے رس کر مژہ پر تھم گیا
مے کا اک قطرہ لب ساقی پہ جیسے جم گیا
ایک لرزش سی ہوئی پیدا، ڈھلکا اور گر گیا
زرد سی اک دھند میں شاعر کا چہرہ گھر گیا
حشر تھا طوفاں کا پکتا حقیر انجام ہے
ناز کرتی ہے مشیت۔ آدمی جس کا نام ہے

احمد ندیم قاسمی

بات کا بتنگڑ

فراق صاحب نے اقبال پر جو اعتراضات کئے ہیں انکا جواب انھوں نے حزیں صاحب سے مانگا ہے. لیکن اقبال کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے بھی اس کا حق ہے کہ حزیں صاحب کے ساتھ ساتھ یا اُن کے بعد میں بھی کچھ کہوں۔

فراق صاحب نے اقبال کے سمجھنے میں کچھ بنیادی غلطیاں کی ہیں اور یہ سوءِ ظن اسی کا نتیجہ ہے. غالباً انھوں نے اقبال کے مطالعے کے بعد صرف اتنا غور کرنے کی ضرورت سمجھی کہ ان کے بتلائے ہوئے طریقوں اور اُن کی سجھائی ہوئی راہ پر چلنے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر فراق صاحب یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ اقبال نے جو کچھ اور جس پیرائے میں کہا ہے وہ موجودہ صورت میں کیوں ہے اور انھوں نے وہ راہ کیوں نہ اختیار کی جسے فراق صاحب بہتر سمجھتے ہیں اقبال کے فلسفے کو سمجھنے سے پہلے ان خیالات کو بھی سمجھ لینا چاہیئے جو اس فلسفہ اور اس خاص طرزِ تخیل کے محرک ہیں. فراق صاحب کی باتوں سے صاف جھلکتا ہے کہ وہ اقبال کا مطالعہ ایک غیر مسلم لامذہب اشتراکی کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ اسکے بجائے اگر وہ اقبال کے خیالات کی رد اور اس مد و جزر کا مطالعہ ایک منصف مزاج مصنف کی حیثیت سے کرتے اور اس کے خم و پیچ کو اس کی حقیقی حالت و ہیئت میں سمجھنے کی کوشش کرتے تو فراق صاحب کی رائے یقیناً کچھ اور ہوتی۔

اسلام اور اسلامیت کے متعلق اقبال کا تصور کچھ بھی ہو لیکن فراق صاحب نے اسلام کا جو تصور قائم کیا ہے اور ایک لامذہب کی حیثیت سے مذاہبِ عالم کی طرف سے جو بدگمانی، بددلی اور سوءِ ظن ان کے دماغ پر چھائی ہوئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے اسلام کو جیسا سمجھا ہے اور اس کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ بڑی حد تک غلط ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر وہ مذاہب کی طرف سے اپنی بدگمانی اندر [illegible] سے متاثر ہوئے بغیر اقبال کا مطالعہ کریں تو وہ اپنی رائے بدلنے کیلئے مجبور ہو جائیں گے۔

حالی نے اسلام کا مرثیہ لکھکر اُس کی کھوئی ہوئی عظمت اُجاگر کر دی۔ اقبال حالی سے بہت آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے ہمارے سامنے ایسی راہیں کھول دیں کہ ان پر چلنے سے تمام منزلیں گرد راہ ہو جاتی ہیں۔ اگر اقبال مسلمانوں سے خطاب نہ کرتے تو کسے مخاطب کرتے. موجودہ نظاموں میں صرف اشتراکیت ہی ایک ایسا نظام ہو سکتا تھا جس پر اقبال کی اُمید افزا نگاہیں پڑ سکتی تھیں. لیکن اشتراکیت خود (فراق صاحب برا نہ مانیں) ابھی تک ایک غیر یقینی چیز ہے۔ اور اس کا مستقبل ابھی تک بہت مبہم ہے. کیا معلوم عالمگیر خلفشار اور اس جنگ کے بعد جس کا عرصہ سے خطرہ تھا اشتراکیت کون سی شکل اختیار کرے۔ اس سے انکار نہیں کہ اشتراکیت کے خواب بہت خوش آیند اور حسین ہیں لیکن جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے وہ اتنی کامیاب نہیں ہوئی جتنی خوبی کے ساتھ مصنفین اسے اپنی کتابوں میں بیان کیا کرتے ہیں. بہر حال اشتراکیت میں اتنی کشش نہ تھی کہ وہ اقبال کی تمام توجہ جذب کر لیتی. یا ممکن ہے اقبال کی دور رس اور دور بیں نگاہیں اسے اتنی اچھی طرح نہ سمجھ سکی ہوں جتنی اچھی طرح فراق صاحب اسے سمجھتے ہیں۔ اس لئے اقبال مجبور تھے کہ اسلام کے اس نظام (میں اسے صرف مذہب نہیں کہتا) کو دوبارہ رائج کریں جس کے تحت عالمگیر امن و انصاف، صلح و آشتی اور بھائی چارہ دنیا میں پھیل چکا تھا۔ اقبال اگر اسلام کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش نہ کرتے تو اُن کی نظریں یونانیوں کی طرف جاتیں لیکن یونانیوں کے نظام میں بھی اتنی جامعیت اور آفاقیت نہیں تھی۔ اسی طرح کسی دوسرے پرانے مذہب یا پرانی ملت میں نشاۃ ثانیہ پیدا کرنا ایک بیکار کام تھا۔ ممکن ہے فراق صاحب فرمائیں کہ جنسیات وحسیات اور اسی طرح کے دوسرے امراض جو موجودہ سماج کے مدقوق جسم کو لاحق ہیں اور کرب و ابتلا کے رستے ہوئے ناسور اور آلام و مصائب کے گلتے اور سڑتے ہوئے زخم کے

علاج کے متعلق اسلام یا اسی قسم کا کوئی دوسرا پُرانا نظام خاموش ہے۔ میں اُن سے بہت مودبانہ عرض کروں گا کہ جناب عالی! یہ تمام بیماریاں صرف موجودہ نظام کے ساتھ ہیں اور اگر اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور اسکے بجائے نیا اور ستھرا نظام آجائے جو تمام نوع انسان کو ایک سمجھتا ہو اور جس کا وطن سارا جہان ہو تو یہ تمام شکایتیں بھی دور ہو جائیں گی۔ اقبال اگر تمام انسانوں سے خطاب کرتے اور بلا اسلام کو درمیان میں لائے ہوئے اسی عالی ہمتی اور عالی ظرفی کی تبلیغ کرتے جو عام طور سے ان کے کلام میں پائی جاتی ہے تو ان کو مجبوراً نئے اور بلا آزمائے ہوئے خود ساختہ اصول پیش کرنے ہوتے۔

مجھے یہ ماننے سے انکار ہے کہ اب الگ سے نہ ہندوؤں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے اور نہ مسلمانوں کی، اور صرف مسلمانوں یا صرف ہندوؤں میں ملی بیداری پیدا کرنے سے کسی میں بھی بیداری پیدا نہ ہوگی۔ اسلام نے جس عالی ظرفی اور وسعت نظری کی تعلیم دی ہے اور مسلمانوں کے جو حقوق اپنے پڑوسیوں، ہم وطنوں، دوستوں، ساتھیوں اور غیر مسلموں پر ہیں اگر وہ پوری طرح برتے جائیں تو اس میں صرف مسلمانوں یا ان کے ہم وطنوں کی بہبودی نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کا فائدہ ہے۔ مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں جہاں جہاں گئے اور جس ملک میں ان کی حکومت رہی وہاں صرف مسلمانوں نے نہیں بلکہ تمام لوگوں نے حیرت انگیز ترقی کی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ روشن دماغی، ایثار، نیک نیتی اور ترقی کا انحصار صرف اقبال کے فلسفے پر مبنی ہو لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن لوگوں میں روشن دماغی، نیک نیتی اور جذبۂ ایثار بدرجۂ اتم موجود ہے اگر وہ اقبال کا بھی مطالعہ کرتے تو دُنیا کو ان سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچ سکتا۔ اگر اسلام۔ اسلام کے سب سے بڑے شاعر اقبال، اور انسان کی فلاح و بہبودی کی فکر جو آسمانی مذاہب کی جڑ ہیں، ہندوستان کی بیداری سے پہلے شدت سے اثر انداز ہوتے تو وہاں کئی صدی قبل انقلاب ہو چکا ہوتا اور وہاں کے موجودہ نظام کی خامیوں کو بھی دُور ہوئے قصہ مختصر گزر گئی ہوتی۔

دُنیا میں بہت سے فلسفی آئے اور چلے گئے۔ بہت سے ہادی اور مصلحین اپنی اپنی راہ اور نئی زندگی کی نئی سبیلیں پیش کرتے رہے۔ لیکن کوئی شاعر، جسے پورا اور کامل شاعر کہا جا سکے، ایسا نہیں ہوا جو ہماری عملی زندگی اور ہماری دماغی نشو نما کے لئے راستہ دکھانے میں ایسی سرگرمی سے مشغول رہا ہو۔ اقبال فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی اور دونوں صفات یکجا کرنے پر ہم کو کوئی اُن کا ثانی نظر نہیں آتا۔ جو خلوص، جو صداقت اور جتنی سوجھ بوجھ کی باتیں اقبال کے یہاں ہیں اور زندگی سے جتنا قریب کا تعلق ان کے نظریۂ خودی کو ہے اتنا کسی شاعر کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ اِس لحاظ سے اقبال لاثانی ہیں۔ اقبال یہ سمجھتے تھے بلکہ اُن کو یقین تھا کہ ہم مادی ترقی تو کرتے جاتے ہیں لیکن ذہنی اور دماغی (روحانی کو جانے دیجئے) ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہماری نظروں میں وہ وسعت اور ہماری ذہنیت میں وہ علو نہیں جس کی متقضی ہماری ترقی اور تہذیب ہے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی قسمت بدلنے کے قبل اپنے دل و دماغ بدلنے کی کوشش کریں جس کے بغیر کوئی انقلاب ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی روشن دماغی، عالی ہمتی اور اور خلوص کا سبق ہم کو اقبال کے یہاں ملتا ہے۔

دُنیا جس راہ پر جا رہی ہے اور جو خطرناک راستہ اس نے اختیار کیا ہے اس نے اقبال کو مغربی تہذیب سے حد درجہ متنفر کر دیا۔ یہ جذبۂ نفرت سفر یورپ کے بعد کم ہونے کے بجائے شدید تر ہو گیا۔ یورپ سے جتنے نظام ہائے زندگی برآمد ہوئے سب کا نتیجہ کشت و خون کے سوا کچھ نہ ہوا۔ گذشتہ جنگ کے بعد یورپ سے اقبال کو جو کچھ بچا کھچا حسن ظن رہ گیا تھا وہ بھی رخصت ہو گیا۔ تمام انسانوں کے لئے ایک بالکل نئے نظام کی بنیاد ڈالنا یا اس کے عیوب و محاسن معلوم کرنے کے لئے اس نو زائیدہ نظام کی تشکیل اور اس کی داغ بیل ڈالنا آسان کام نہیں ہے خصوصاً ایسے موقع پر جب ناکامی کا اندیشہ زیادہ ہو۔ اس لئے اقبال کے پاس سوا اسکے کوئی سبیل نہ تھی کہ وہ اسی نظام کی نشاۃ ثانیہ کی کوشش کریں جس نے اپنے عروج کے زمانے میں عالمگیر آزادی اور ترقی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اب بھی یہ سوال

کیا جاسکتا ہے کہ اقبال نے اسلام کے بجائے کسی دوسرے مذہب کی ازسرِ نو زندگی کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ممکن ہو فراق صاحب کو اس سے اختلاف ہو لیکن اقبال کو اس کا یقین تھا کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو عالمگیر ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کی اشاعت سے تمام انسانوں کو یکساں فائدہ پہونچے گا۔ اقبال کی قوم پرستی رنگ و روپ نسل و قوم اور ملک و صوبے کے امتیاز سے پاک اور خودغرضانہ حب الوطنی بلکہ قوم اور وطن کے نام پر گلا کاٹنے والے جذبے سے بالاتر تھی۔ وہ تمام انسانوں میں یک جہتی ایک نظام اور ایک اصول کے ماتحت ایک برادری قایم کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انہیں اسلام سے زیادہ موزوں کوئی نظام نہیں نظر آیا جس میں زندگی کے ہر پہلو کے لئے ایک نظام اور اصول، اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی رہبری کیلئے قانون مقرر کر دئے گئے ہیں اور جن پر بلاکسی ذاتی یا شخصی یا نسلی تخصیص کے عمل کرنا ضروری ہی نہیں بلکہ فرض ہے۔

تمناؤں کی قلت، مقاصد کی محدودیت، نظر کی تنگی اور دریکا اقبال کو ناگوار تھا اور بہت ہی ناگوار۔ تاثر کا انفرادی یا وطن کے پیکر مادی تک محدود ہونا اقبال کے حوصلوں کے آگے بدترین پستی ہے۔

فراق صاحب غالباً صرف اشتراکیت ہی کو موجودہ دکھ درد کا علاج سمجھتے ہیں۔ اور اگر مارکس، لینن اور اسٹالن بھی اقبال سے اپنی تدبیروں اور اسکیموں کے متعلق مشورہ کرتے تو وہ اس صورت میں بھی وہی کہتے جو ہمیشہ کہتے آئے ہیں۔ اور ان کا فلسفہ بھی وہی ہوتا۔ یورپ میں جتنے نظام پیدا ہوئے ان کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ان کا مقصد صرف مادی ترقی ہوتا ہے۔ صرف پیٹ بھر کھانا کھا لینا انسان کو انسان نہیں بنا دیتا۔ ان نظاموں کی پشت پناہ کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ذہنی ارتقا کی بھی معین و معاون ہو سکے۔ موجودہ عالمگیر خلفشار زیادہ تر ہماری ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ اس کے اسباب معلوم کرنے والے اقتصادی پہلو پر اتنی زیادہ روشنی ڈالتے ہیں کہ ہماری آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں اور ان میں اتنی بصیرت نہیں رہ جاتی کہ وہ دوسرے پہلوؤں کا بھی مشاہدہ کریں اور ان پر غور و فکر کر سکیں۔ اشتراکیت نے غریبوں اور مزدوروں کی قسمت بدل دی، سرمایہ [illegible] سے چھٹکارا دلا دیا لیکن اس میں جنسی اور جسمی آسودگی بھی پیدا ہو گئی لیکن کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اور بہت سے جذبے بھی جو دوسرے شدید جذبوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں بالکل دب گئے۔ اگر روسیوں میں وہ عالی حوصلگی اور بلند ہمتی جس کا راگ اقبال گاتے ہیں پیدا ہو گئی ہوتی تو وہ آج معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے۔ اس سے انکار نہیں کہ اقبال انسان کو جس سطح پر لانا چاہتے ہیں وہ ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ لیکن اقبال اپنے معیار کو پست بھی نہیں کر سکتے تھے، اقبال کا رہنما بیچارہ دو رکعت کا امام نہیں ہے کم از کم ان کے پیغام عمل کو کسی پلیٹ فارم یا تحریک کی قید و بند کے اندر مقید اور محدود نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ ہم کسی طوفان سے آشنا ہو جائیں۔

موجودہ ہندوستان میں یہ کوشش عام طور سے پائی جاتی ہے کہ پرانے اور فرسودہ نظام کو مٹا کر ترقی کی راہیں صاف کر دی جائیں۔ یہ احساس بڑی حد تک ادب کے ذریعہ پیدا ہوا ہے۔ اور ادب میں اس اظہار کے بانی اقبال تھے۔ مدت ہوئی انہوں نے صدا لگائی تھی کہ دہقان کو جس کھیت سے روزی میسر نہیں ہوتی اس کے ہر خوشے کو جلا ڈالو۔ یہی آواز روز بروز بلند تر ہوتی جا رہی ہے اور اسی احساسِ خودی و خودداری میں دن بدن شدت پیدا ہو رہی ہے۔ رونا تو ہماری سرد مہری کا ہے کہ ہم نے اقبال کی قدر نہ کی اور ان کے پیغام کو اپنی زندگی میں اسکو موزوں جگہ نہ دی۔ دنیا میں یہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا کہ جو لوگ ہمیں گمراہی سے ہٹا کر راہ راست پر لگانا چاہتے ہیں ان کی باتیں بالکل اس طرح سنی جاتی ہیں جیسے کوئی مذاق کر رہا ہو۔ یہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے اور کیا تعجب اگر اقبال کی صدائے انقلاب کو لبیک کہتے ہوئے ہر مذہب اور ہر ملت کے لوگ ان کی طرف کارواں در کارواں نہیں بڑھے۔ خطا ہماری ہے اقبال کی نہیں۔

ملک احسن کلیم

کھیل

چلا ہوں اس جہانِ پُرفسوں سے کھیلتا ہوا
خرد سے کھیلتا ہوا جنوں سے کھیلتا ہوا

رواں ہے اپنی منزلِ عروج کیطرف بشر
بلندیِ فضائے نیلگوں سے کھیلتا ہوا

جہادِ زندگی میں دیکھ سخت کوشیاں مری
رواں دواں ہوں خاک و خوں سے کھیلتا ہوا

وہ مردِ زندہ دل ہوں خارزارِ غم سے بارہا
گذر گیا ہوں چنگ و ارغنوں سے کھیلتا ہوا

نگاہِ اہلِ دہر میں تبسم اک نشاط ہوں
ہزار شورشِ غم و دروں سے کھیلتا ہوا

ہر اک جفائے عالمِ زبوں پہ خندہ زن ہوں میں
ہر اک جفائے عالمِ زبوں سے کھیلتا ہوا

یہ سُرخ سُرخ کیوں ہو منظرِ افق دمِ سحر
یہ کون اٹھا شرابِ لالہ گوں سے کھیلتا ہوا

محبتوں کے مدعی اجیتوں کو عام کر
عداوتوں کے جذبۂ فزوں سے کھیلتا ہوا

کہاں سے آئی شوخ رنگ کی بہار لالہ کو
گذر گیا ہے کون اپنے خوں سے کھیلتا ہوا

ہر اک جہانِ بے عمل کو محشرِ حیات کر
اجل زدوں کے عالمِ سکوں سے کھیلتا ہوا

کسے خبر ہے کو شۂ دیار میں نکل گیا
نہالؔ اپنے عالمِ جنوں سے کھیلتا ہوا

نہالؔ سیوہاروی

غزل

تجزِ تماشائے وفا اب مجھے منظور نہیں
وہ مرے پاس چلے آئیں تو کچھ دور نہیں

تو وہ آتش خاموش ہے یہ طور نہیں
شعلۂ برقِ نظر سوز ہے یہ نور نہیں

خود پرستی کی تمنا ہے تمنائے نمود
نامرادی مری اچھی ہے کہ مشکور نہیں

توبہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پیمانۂ ہستی ٹکڑے
نشہ میں چور ہو ساقی اب مجھے منظور نہیں

پردہ داری لبِ خاموش کی کیجیے ورنہ
نغمۂ سوز کسی ساز میں مستور نہیں

نقش دیوار ہے افسانۂ حسن و الفت
اب یہاں کشمکشِ ناظر و منظور نہیں

حسن کی شان تلون تو ہے مشہور تپشؔ
فطرتِ عشق بدل جائے یہ دستور نہیں

عبداللطیف تپشؔ

اجنبی

۱

چاہتا [illegible] کہ سینے سے لگا لوں تجھکو
[illegible]

بے دھڑک دل کی تمناؤں کو باہر لا لے
[illegible]

لیکن افسوس کہ یہ تیری نگاہوں کی حیا
تھام لیتی ہے لپٹ جاتی ہے قدموں سے مرے
ایک زنجیر بنی جاتی ہے جس کی جھنکار
دل کی آواز کو بیکار کئے دیتی ہے

(۲)

روک لے روک لے! میں آج تو رک جاؤنگا
آج تو تیری حیا تھام ہی لے گی مجھکو
آج تو میری تمناؤں کے دل کی دھڑکن
تیری زنجیر کی جھنکار میں کھو جائیگی

لیکن اک روز یہ زنجیر گراں کی کڑیاں
خود بخود آتش اظہار سے گل جائیگی
ان کی یہ اجنبی جھنکار مرے کانوں میں
کوئی طوفاں نہ اٹھائے گی نہ روکے گی مجھے
آج تو تیری حیا تھام ہی لے گی مجھکو
لیکن اک روز تمناؤں کے بھڑکانے سے
آگ بنکر تپش شوق بجھا ڈالوں گا
پھر کہاں تیری نگاہوں کی یہ زنجیر حیا
پھر کسے روکے گی تو۔ کون مجھے روکے گا!

یوسف ظفر

"ایک عورت"

شبک دھانوں کے پیلے کھیت مغرب میں لچکتے ہیں
اور اک مشرقی گوشے میں شیشم کی قطاریں ہیں
شمالی جھاڑیوں میں جنگلی پودے جھکتے ہیں
اور اک جانب کسی چھوٹے سے دریا کی بہاریں ہیں

پرانے بانس کے دروازے مشرق ہی میں کھلتے ہیں
یہیں اکثر گلابی چوڑیاں کچھ گنگناتی ہیں

(۲)

سنا ہے ایک دن شیشم کے ان منحوس پیڑوں سے
کوئی سایہ اندھیرے میں سہاگن بن کے آیا تھا
اکیلے، اونچے اونچے خشک اور مایوس پیڑوں سے
اسی زرد اور پھیکے چاند نے اک گیت گایا تھا

ندی کے اس کنارے پر جہاں کوئی نہیں جاتا
گھڑا ابھرنے کی اب بھی نقرئی آواز آتی ہے

(۳)

یہ پیلے دھان میں نے نرم برساتوں میں دیکھا ہے
کوئی ساون کا نغمہ پتیوں پر رقص کرتا تھا
کوئی بھدا تخیل جھاڑیوں میں رنگ بھرتا تھا
تو اس کے بانس کے دروازے مشرق ہی میں کھلتے ہیں
شبک دیواریں مٹی کی کئی جانب سے نیچی ہیں

(۴)

ہر اک تہوار میں سجتی ہیں یہ مٹی کی دیواریں
بہت سے شوخ، زرد اور سبز گل بوٹے ابھرتے ہیں
سنائی پڑتی ہیں ہر صبح کو پائل کی جھنکاریں
بس اب دیوار اب بھی جو عطئے مل کر سنورتے ہیں

ہر اک برسات میں کھپریل کی چھاجن بدلی جاتی ہے
کرشمے جاڑوں میں باہر انگیٹھیاں گنگناتی ہیں

(۵)

شبک دھانوں کے پیلے کھیت اب بھی تھرتھراتے ہیں
کوئی نغمہ انہیں کے زرد تاروں پر مچلتا ہے
بہت سے جنگلی پودے نئی جھاڑی بساتے ہیں
وہی چھوٹا سا دریا آج بھی نرمی سے چلتا ہے

مگر اک صبح کو شیشم کے ان منحوس پیڑوں سے
گزرتی ہی چلی جاتی تھی جو صورت وہ پنہاں ہے!!!

سلام مچھلی شہری

ایک ریڈیائی تمثیلیہ

تجاہل ــــ؟

پروین ـ (بیٹھتے ہوئے) صغرا! ہم کیسے وقت پر پہنچے۔ مجھے تو کھٹکا تھا کہ ہماری جگہ کھوئی جائے گی۔ کتنی پیاری شام ہے!

صغرا۔ ذرا گرمی ہے۔

پروین۔ جوانوں کو ذرا زیادہ ہی گرمی لگتی ہے۔ آج تو میں بھی خلاف معمول تکان سی محسوس کر رہی ہوں، خیر تم گاڑی لے جاؤ اور منے کو گھما لاؤ۔

صغرا۔ بہت اچھا بیگم صاحب!

(بچہ گاڑی چلنے کی آواز)

پروین۔ دیکھو! دیر نہ لگانا۔ یہی دس منٹ میں لوٹ آنا۔ قریب ہی رہنا تاکہ میں تمہیں آواز دے سکوں ـــــ اور صغرا دیکھو، وہ کبوتروں کا دانہ تو تم ساتھ ہی لے چلی ہو۔ مجھے دیتی جاؤ۔

صغرا۔ (دور سے) آئی بیگم صاحبہ!

(دانہ دیکر چلی جاتی ہے)

پروین ـ یہ کبوتر بھی کتنے ہوشیار ہوتے ہیں، ان کی شکل کی طرف تو دیکھو بالکل بدھو نظر آتے ہیں مگر دانہ دیکھتے ہی آن موجود ہوتے ہیں۔ اور انہیں میرے آنے کا وقت کون بتاتا ہے؟ یہ گل گوتھنا ہمیشہ پہلے آتا ہے۔ اس کا سر کتنا بڑا ہے۔ اب تو مجھے ان سے کچھ اُنس ہونے لگا ہے ـــــ لو ایک اور آیا (پروں کی آواز) دو تین چار ـــ اب انہیں کون گنے؟ یہ چھوٹا تو بڑا شریر ہے اور وہ ـــــ وہ تو اکیلا سب سے دور اپنا پوٹا بھرتا رہتا ہے۔ فلسفی معلوم ہوتا ہے۔ اوہو! اوہو! ابھی لڑتے کیوں ہو؟ سب کے لئے کافی دانہ ہے۔ کل میں اور زیادہ لاؤں گی۔

(موٹر کا ہارن۔ کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ جاتے ہیں)

یہ کیا بیہودہ حرکت ہے۔ موقعہ بے موقعہ جہاں چاہے ہارن بجا دیا ـــــ بد تمیز کون تھا؟ (موٹر کا دروازہ بند ہونے کی آواز) موٹر سے اتر کر ادھر ہی آ رہا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ میں تو ضرور اس سے باز پرس کروں گی۔

(خفا خفا سے قدموں کی آواز)

(خفا ہو کر) دیکھئے!

اسلم:۔ آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟

پروین۔ جی ہاں۔ آپ سے!

اسلم۔ فرمایئے۔

پروین۔ میں کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ آپ نے خواہ مخواہ موٹر کا ہارن بجا کر انہیں اُڑا دیا۔

اسلم۔ (ہنس کر) ہاہاہا! کبوتر اڑ گئے تو کیا ہوا۔

پروین۔ (بگڑ کر) سب کچھ ہوا۔ یہی کہ سب کے سب اُڑ گئے، ایک بھی باقی نہ رہا۔

اسلم۔ آپ ناحق بگڑ رہی ہیں۔ یہ پبلک پارک ہے۔

پروین۔ ہوا کرے۔ لیکن پبلک پارک میں بھی چند آداب ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

اسلم۔ ہماری ملاقات آج تک کبھی نہیں ہوئی اور میں سمجھتا ہوں کہ آپکو مجھے اس طرح خطاب کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ـــ آؤ فیروزا!

(قدموں کی آواز)

پروین۔ کیا مزاج پایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ اس عمر کو پہنچ کر یوں چڑچڑے اور بد مزاج کیوں ہو جاتے ہیں خدا کرے کہ اسے بیٹھنے کے لئے کوئی بنچ خالی نہ ملے۔

(طنزیہ) ہاں ہاں۔ جگہ ملتی ہے تو ڈھونڈ لو! کبھی ملی نہ ہو!۔ اب تو غریب ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا ہے۔ لو اب پھر ادھر آ رہا۔ کچی سڑک پر لاری بھی اتنی گرد نہیں اڑاتی جتنی اس کے پاؤں اُڑا رہے ہیں۔

اسلم۔ فیروزا! ابھی وہ آدمی گئے کہ نہیں۔

فیروزا! نہیں حضور۔ ان کی تو باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آتیں۔

اسلم۔ موسم اچھا ہو تو کمیٹی کو چاہیے کہ یہاں زیادہ بنچ رکھوائے کمبخت سارے باغ میں ایک بنچ بھی تو ایسا نہیں جس پر تین چار آدمی نہ بیٹھے ہوں۔ اب اسکے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ (قدموں کی آواز)

(جھک کر) تسلیمات عرض ہے!

پروین۔ (چونک کر) آپ یہاں پھر... بنچ کے پیچھے کیوں کھڑے ہیں۔ سامنے آ جائیے نا۔

اسلم۔ میں آپ سے گفتگو کرنے کا خواہشمند نہیں بالجبر۔

پروین۔ لیکن میں تو آپ کے سلام کا جواب مجبوراً دے رہی ہوں۔

اسلم۔ آداب عرض کا جواب صرف آداب عرض ہونا چاہیے۔

پروین۔ (بگڑ کر) تو آپ کو چاہیے تھا کہ اس بنچ پر بیٹھنے سے پہلے اجازت مانگتے۔

اسلم۔ اجازت کیسی اجازت۔ کس کی اجازت؟ آپ بھولتی ہیں۔ یہ پبلک کے بنچ ہیں۔ مجھے زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا۔

پروین۔ اس کے باوجود آپ اطمینان رکھئے کہ میں یہ سارا بنچ آپ کے لئے خالی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔

اسلم۔ (جیب سے رومال نکال کر جوتوں سے گرد جھاڑتا ہے۔ بیٹھ کر) اگر زمین پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا تو کتنا اچھا تھا!

پروین۔ آپ اس طرح رومال کو جوتوں کے برش کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں؟

اسلم۔ (بے پرواہی سے) کیوں نہیں؟ اس میں حرج ہی کیا ہے؟

پروین۔ کچھ نہیں۔ تو پھر آپ جوتوں کے برش کو رومال کے طور پر استعمال کرتے ہوں گے۔

اسلم۔ میں سمجھتا ہوں کہ نکتہ چینی کرنے کا آپ کو کوئی حق حاصل نہیں۔

پروین۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمسائے کو ایسی نکتہ چینی کا حق حاصل ہوتا ہے۔

اسلم۔ فیروز! میری کتاب کہاں ہے؟ میں بولنے کی بجائے پڑھنا چاہتا ہوں۔

پروین۔ یہ کہنے کا کتنا خوبصورت طریقہ ہے کہ میں یہ بکواس سننا نہیں چاہتا ہوں۔

اسلم۔ آپ بات میں دخل دینا چاہتی ہیں۔ مجھے یہ عادت ناپسند ہے۔ فیروز! مجھے کتاب دو۔

فیروز۔ لیجئے حضور۔

اسلم۔ تم اب جا سکتے ہو۔

فیروز۔ بہت اچھا حضور!

(قدموں کی آواز)

پروین۔ میرا خیال تھا کہ آپ ڈنڈ بیٹھک لگائیں گے۔

اسلم۔ آپ دیکھتی نہیں کہ یہ عینک ہے؟

پروین۔ آپ کی نظر بہت تیز ہے!

اسلم۔ بہرحال آپ سے زیادہ تیز ہے۔

پروین۔ جی ہاں، یہ تو ظاہر ہے۔

اسلم۔ اگر میری نظر تیز نہ ہوتی تو میں ہرنوں اور تیتروں کا۔

پروین۔ (بات کاٹ کر) آپ شکار کا شوق بھی فرماتے ہیں؟

اسلم۔ کیوں نہیں۔ پہلے تو باقاعدہ شکار کیا کرتا تھا اور اب کبھی کبھی بندوق اور کتا لے کر جنگل جاتا ہوں۔ میری اسٹڈی میں بارہ سنگے کے دو سر ہیں۔

پروین۔ اس سے کیا ثابت ہوا! ہمارے ڈرائنگ روم میں شیروں کی کئی کھالیں ہیں۔

اسلم۔ ہو گی۔ آپ مجھے پڑھنے دیجئے۔

پروین۔ تو آپ اس طرف ہو جائیے۔

اسلم۔ لیکن پڑھنے سے پہلے میں چٹکی بھر نسوار لیا کرتا ہوں۔ اس سے ذرا دماغ صاف ہو جاتا ہے۔ کیا آپ بھی لیں گی؟

(ڈبیا بڑھاتا ہے)

پروین۔ اگر اچھی ہو تو!

اسلم۔ بہترین نسوار ہے۔ آپ اسے ضرور پسند کریں گی۔

پروین۔ شکریہ۔ بس اتنی کافی رہے گی۔ (وقفہ) کیا آپ نسوار سونگھنے کے بعد چھینکا کرتے ہیں؟

اسلم۔ دو یا تین دفعہ۔

پروین۔ عجیب اتفاق ہے۔ میں بھی دو یا تین دفعہ چھینکا کرتی ہوں۔

اسلم۔ (نسوار لینے کے بعد دونوں باری باری تین دفعہ چھینکتے ہیں) میرا دماغ تو صاف ہو گیا ہے۔

پروین۔ میرا بھی! (وقفہ) معاف کیجئے گا۔ مجھے آپ کی موٹی موٹی عینک دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔

اسلم۔ تو کیا آپ عینک کے بغیر پڑھ سکتی ہیں؟

پروین۔ کیوں نہیں؟

اسلم۔ اس عمر میں؟ یقیناً آپ مذاق کر رہی ہیں۔

پروین۔ تو نہیں مانتے آپ؟ [illegible]

(پڑھتی ہے)

کیا خبر تھی خلش ناز نہ جینے دے گی
یہ تری پیار کی آواز نہ جینے دے گی

(صفحہ الٹتی ہوا دپڑھتی ہے)

آہ وہ ہم سے جو تھا مدارِ حیات
وہ بھی اب گاہ گاہ ہوتی ہے۔

اور پڑھوں؟

رہ گئے محو یک نظر ہو کر ٭ اب کسے فرصتِ خیال بھی ہو
دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں ٭ کچھ خوشی بھی ہو کچھ ملال بھی ہو

اور؟

یہ جذبِ محبت یہاں تک تو پہنچا ٭ کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں

(کتاب دیتی ہے)

اب بھی آپ کو یقین آیا ہے کہ نہیں؟

اسلم۔ جی ہاں شاعری سے مجھے بے حد دلچسپی ہے بے حد۔ جوانی میں خود بھی شعر کہا کرتا تھا۔

پروین۔ اچھے شعر؟

اسلم۔ اچھے برے بہرحال کہہ ہی لیا کرتا تھا۔ لاہور کے کئی مشاعروں میں بھی شامل ہو چکا ہوں۔

پروین۔ آپ لاہور بھی گئے ہیں؟

اسلم۔ کئی دفعہ۔ پہلی بار جب میں وہاں گیا تو چھ برس کا تھا۔ میری پرورش لاہور ہی میں ہوئی ہے اور میں نے اپنی جوانی کا بیشتر حصّہ وہیں گزارا ہے۔ کیا آپ کو بھی وہاں رہنے کا اتفاق ہوا ہے؟

پروین۔ جی ہاں۔ ہمارا مکان اب بھی وہاں موجود ہے۔ اور اکثر برسات کے موسم میں ہم وہیں قیام ہوا کرتا ہے۔ یہ بہت پرانی جگہ ہے۔ یہ مکان نہر کے قریب ہے میلوں تک آبادی کا نشان نہیں۔ مسٹر شاہ اسے (مسکرا کر) کیا کہا کرتے تھے ۔۔ نشیمن!

اسلم۔ (حیران ہو کر) نشیمن؟

پروین۔ جی ہاں نشیمن۔ کیا آپ بھی یہ نام سن چکے ہیں؟

اسلم۔ جی ہاں۔ اگر میرا حافظہ دھوکا نہیں دیتا۔ حالانکہ آدمی جلدی بھول جاتا ہے۔ تو اس مکان میں ایک نہایت ہی خوبصورت عورت رہا کرتی تھی میں نے بہت سی خوبصورت عورتیں دیکھی ہیں مگر اس [illegible] عورت کو جو کسی سے کم نہیں

دیکھا۔ مجھے اس کا نام بھی یاد ہے جو اُس سے کم حسین نہیں تھا۔

۔ پروین!

پروین۔ (متعجب ہو کر) پروین۔

اسلم۔ جی ہاں۔ پروین! لیکن آپ۔۔۔

پروین۔ آپ نے مجھے میری بہترین سہیلی کی یاد دلا دی۔

اسلم۔ عجیب بات ہے۔ میں بھی اس وقت کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں گویا وہ میری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنی کھڑکی سے باہر کسی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔ آپ کو یاد ہے وہ کھڑکی؟

پروین۔ وہ کھڑکی اُسکے پڑھائی کے کمرے میں تھی۔

اسلم۔ جی ہاں۔ وہی جہاں وہ دن کا اکثر حصّہ گذارا کرتی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ اس زمانے میں۔

پروین۔ (آہ بھر کر) اُس زمانے میں۔

اسلم۔ عجیب و غریب عورت تھی۔ اُس کی سیاہ غلافی آنکھیں مجھے کبھی نہیں بھول سکتیں۔ اُس کی شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ جہاں جاتی محفل کی محفل پر چھا جاتی۔۔ کتنی خوبصورت تھی، پروین۔ (آہ بھر کے) اب تو یہ سب کچھ ایک خواب سا بن گیا ہے۔

پروین۔ (آہستہ) اس خواب کا ایک خیال اتنی مدت گزرنے پر بھی نہیں ٹوٹا۔

اسلم۔ کیا کہا آپ نے؟

پروین۔ میں نے کہا کہ وہ نہایت بدقسمت تھی۔ ناکامی بدقسمتی کا دوسرا نام ہی تو ہے۔

اسلم۔ آپ کا فرمانا بجا ہے۔

پروین۔ آپ نے اُس کے متعلق حال ہی میں کچھ سنا؟

اسلم۔ جی ہاں۔

پروین۔ اللہ میاں کے بھی ڈھنگ نرالے ہیں۔

اسلم۔ چنانچہ اُس کو اسی سلسلے میں۔۔۔۔۔

پروین۔ نہ پوچھئے بھئی کیسے؟ ہاں ۔۔ لڑائی پر جانا پڑا۔

اسلم۔ جی ہاں۔ لڑائی پر میں کہہ ہی کیوں نہ دوں کہ وہ شخص میرا چچا زاد بھائی تھا۔

پروین۔ آپ کا بھائی تھا تو میں بھی کیوں نہ آپ سے کہہ دوں کہ یہ ہمارا واقعہ میری ایک سہیلی [illegible]

تھا سُنا ہے کہ وہ — یعنی آپ کے بھائی چاندنی راتوں میں کھڑکی کے پاس اُس کا انتظار کیا کرتے تھے اور جب سب لوگ سو جاتے تو کھڑکی کھلتی۔ وہ یعنی آپکے بھائی اُسے پھولوں کا ایک گلدستہ دے کر واپس چلے جاتے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

اسلم۔ جی ہاں۔ اُس کے والدین اُس کی شادی ایک سوداگر سے کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ رضامند نہ ہوتی تھی۔ ایک رات میرا بھائی حسب معمول اُس کی کھڑکی کے نیچے انتظار کر رہا تھا کہ اچانک ایک اور آدمی وہاں آیا۔

پروین۔ اُس نے آپکے بھائی کو بُرا بھلا کہا؟

اسلم۔ جی ہاں۔ کچھ جھگڑا سا ہو گیا تھا۔

پروین۔ جو بعد میں لڑائی کی شکل اختیار کر گیا؟

اسلم۔ جی ہاں، کچھ ایسا ہی ہوا۔ اُس پہاڑی پر سوداگر بُری طرح زخمی ہوا۔ اس واقعہ کے بعد میرے بھائی کو لاہور سے بھاگ جانا پڑا۔

پروین۔ آپ کو تو یہ واقعہ خوب یاد ہے۔

اسلم۔ آپ کو بھی۔

پروین۔ میں عرض کر چکی ہوں کہ یہ سارا واقعہ میری سہیلی نے مجھے لکھ کر بھیجا تھا۔

اسلم۔ اور میں بھی عرض کر چکا ہوں کہ میرے بھائی نے یہ واقعہ مجھے بتایا تھا۔

پروین۔ معاف کیجیے گا۔ کیا اس حادثہ کے بعد آپ نے اپنے بھائی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پروین کو بالکل بھول جاتے؟

اسلم۔ جی نہیں۔ میرا بھائی آج تک پروین کو نہیں بھولا۔

پروین۔ آج کل کہاں ہے؟

اسلم۔ عرض کرتا ہوں۔ اس حادثہ کے بعد وہ میرے پاس بمبئی آگیا اور پھر کلکتہ بھاگ گیا۔ اُس نے پروین کو بے شمار خط لکھے مگر وہاں سے کوئی خبر نہ آئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُسکے والدین نے وہ خط اُس تک پہنچنے ہی نہیں دیئے۔ بالآخر مایوس ہو کر اسلم فوج میں بھرتی ہو گیا اور اس سلسلے میں اُسے فرانس جانا پڑا۔ محاذ سے دور وہ ایک مورچے میں لڑتا لڑتا مارا گیا جیسا کہ اُس کی آخری چٹھی سے ظاہر ہے وہ مرتے دم تک پروین کو نہیں بھولا۔

پروین۔ آپکو اس حادثہ پر صدمہ تو بہت ہوا ہوگا؟

اسلم۔ جی ہاں۔ بہت صدمہ ہوا اس لئے کہ وہ میرا بھائی تھا مگر زیادہ صدمہ کی بات یہ ہے کہ اسلم آخری دم تک وفادار رہا اور پروین دوسرے ہی دن اُسے بھول گئی۔

پروین۔ نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اسلم۔ عورتوں کا یہی شعار ہے!

پروین۔ معاف رکھئے گا مجھے اس معاملہ میں آپ سے اختلاف ہے بفرض محال عورتوں کا یہی شعار بھی ہو تو بھی پروین اس قسم کی عورت نہیں تھی۔ اسلم کے چلے جانے کے بعد اس کی حالت بالکل غیر ہو گئی۔ نہ رات کو آرام نہ دن کو چین۔ نہ کھانے کا دھیان نہ آرام کا خیال، جو کچھ کسی نے آگے رکھ دیا کھا لیا جو کپڑے خادمہ نے نکال دیئے پہن لئے۔ غرض کہ بیچاری کی بہت بُری حالت تھی۔ اُس کی سہیلیاں اُسے خط لکھتیں مگر وہ کسی کو جواب نہ دیتی۔ اسلم کے چلے جانے سے اُس کی دُنیا بالکل سونی ہو گئی۔ زندگی وہ زندگی نہ رہی۔ ہر بات کا مزہ جاتا رہا۔ پروین زیادہ عرصہ تک یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ ایکدن وہ سیر کے لئے نکلی۔ اُس کے والدین خوش تھے کہ پروین کا دل شاید یونہی بہل جائے گا اور وہ اسلم کو بھول جائے۔ پروین اکیلی شام کے وقت پہاڑی کی طرف روانہ ہوئی —— وہی پہاڑی جہاں اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہی پہاڑی جہاں اسلم کا رقیب زخمی ہوا تھا —— وہ شام کے وقت آسمان پر آہستہ آہستہ نکلتے ہوئے تاروں کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے دماغ میں بلا کا ہیجان تھا۔ پہاڑی پر قدم رکھتے ہی شکستہ محبت کی ساری المناک داستان یاد آگئی۔ وہ ان خیالات میں کھو گئی۔ آندھی آئی مگر پروین کو خبر تک نہ ہوئی۔ جُوں کی توں وہیں بیٹھی رہی۔ بجلی چمکی مگر پروین دُنیا و مافیہا سے بے نیاز گھٹنوں پر سر جھکائے وہیں کی وہیں بیٹھی رہی۔ آناً فاناً پہاڑی پر بجلی گری اور اُس کی لاش کا نشان تک نہ مل سکا۔

اسلم۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

پروین۔ بیچاری پروین!

اسلم۔ بیچارا اسلم!

پروین۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ آپ اور میں دونوں بالکل اجنبی ایک دوسرے سے ناواقف پہلی ہی ملاقات میں [illegible] دوستوں کی محبت کے تذکرے کر رہے ہیں [illegible]

[illegible] گر رہے تھے گویا مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

اسلم۔ جی ہاں۔ عجیب اتفاق ہے خاص طور پر جب یہ خیال آتا ہے کہ ہماری گفتگو کا آغاز بھی تلخ باتوں سے ہوا۔

پروین۔ آپ نے میرے کبوتر اڑا دئے تھے۔

اسلم۔ (معذرت کے انداز میں) جی ہاں۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی میں بہت شرمندہ ہوں۔

پروین۔ (پیار سے) کل آپ پھر آئیں گے۔

اسلم۔ یقیناً۔ شام اچھی ہوئی تو۔ اور آئندہ میں احتیاط کروں گا کہ آپ کے کبوتر نہ اُڑ جائیں۔

پروین۔ شکریہ! مجھے پرندوں سے بہت محبت ہے — نہ جانے میری خادمہ کہاں گئی۔ صغرا۔ صغرا (بلاتی ہے)

(قدموں کی آواز)

تو کہاں مر گئی تھی!

صغرا۔ بیگم صاحبہ میں پھول چُننے چلی گئی تھی۔

اسلم۔ فیروز۔ فیروز۔ تم نے دیر کیوں لگائی؟ تو بھی کیا پھول چُننے چلا گیا تھا؟

فیروز۔ نہیں سرکار۔ میں ننھے سے کھیل رہا تھا۔

اسلم۔ میری ٹوپی اٹھاؤ (پروین سے) اب رخصت چاہتا ہوں!

پروین۔ بس چلے جایئے گا!

اسلم۔ جی ہاں۔ شب بخیر!

پروین۔ شب بخیر — کل؟

اسلم۔ کل!

(قدموں کی آواز)

پروین۔ چلا گیا! کہاں کا بھائی اور کہاں کی سہیلی۔ وہی اسلم تھا اور وہی پروین۔ (آہ بھرتی ہے) ناکام محبت کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں سے اُتار کر ہم کس طرح اُن بھوتوں کے کندھوں پر [illegible] رہے ہے۔ آہ۔ یہ بھوت! — سچ ہے جب کوئی جگہ اُجاڑ ہو جائے تو بھوتوں کا مسکن بن جایا کرتی ہے!

افضل اقبال

غزل

حسن نے شوق کی نظروں سے ادھر دیکھ لیا
اب مفر کوئی نہیں موت نے گھر دیکھ لیا

تم نے جب چاہا مرا فرقِ نظر دیکھ لیا
آج میں نے بھی کہیں رنگِ سحر دیکھ لیا

ہم نے اپنا بھی تو خود ظرفِ نظر دیکھ لیا
دیکھ تو سکتے نہ تھے اُن کو مگر دیکھ لیا

کس نے انگرائی سی لی گوشۂ ہستی میں مری
کس نے اکبار بہ اندازِ دگر دیکھ لیا

دیکھنے والے پشیماں نگاہوں سے مجھے
اپنی دُنیا کو بھی خود زیر و زبر دیکھ لیا

سجدے بیتاب ہوئے جاتے ہیں بچھ جانیکو
تو نے اے میری جبیں کونسا در دیکھ لیا

جا رہا ہوں تری دُنیا سے غم و رنج لئے
اپنی آنکھوں سے مرا رختِ سفر دیکھ لیا

زندگی کیا ہے تخیل میں تمہا عکسِ جمیل
آج راحت نے اُسے خاک بسر دیکھ لیا

راحت سعید

کوٹ

نرمل غسل خانے سے نچڑتا باہر نکلا اور کمرے میں جا کر بدن پونچھنے کے لئے جب اس نے کھونٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو اچانک اس کا دل دھک سے رہ گیا ——— "کوٹ؟"

ویران اور تباہ حال کمرے کے خلا میں اس کی متعجب نگاہیں چاروں طرف گھومیں۔ اور پھر حیران سی اسی کھونٹی پر آ کر رک گئیں۔ "کوٹ کہاں گیا؟" ——— وہ پھر غسل خانے میں گیا، لیکن بے سود! واپس آ کر اس نے پھر کمرے کا جائزہ لیا، اور ایک ٹھنڈی اور گہری سانس اس کے دل کی گہرائی سے نکل گئی ——— "یہ کوٹ بھی گیا!"

اور اپنے تر بتر بالوں کو اس نے ہاتھوں سے نچوڑنا شروع کر دیا۔

نیچے فرش پر چوڑے سینے کی ایک پھٹی، پرانی اور ایک طرف سے گلی ہوئی چٹائی بچھی تھی۔ جو سگرٹ اور بیڑیوں کے جلتے ہوئے ٹکڑوں کی وجہ سے جل گئی تھی۔ اور جس کی درزوں میں چوہوں کی کالی کالی مینگنیاں بے تحاشا بکھری پڑی تھیں۔ جب پانی کے قطرے اس پر ٹپ ٹپ گرنے لگے تو نرمل کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے گرم، تپتی ہوئی ریت پر اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گر رہے ہیں۔

بالوں کو اچھی طرح نچوڑ کر اس نے چہرے کو بھی ہاتھوں ہی سے پونچھ لیا۔ لیکن اس لمس نے اس کے دل میں ایک عجب کپکپی سی پیدا کر دی اور اس کا جی بُری طرح متلانے لگا۔ اس کی ناک، منہ اور آنکھوں میں لاتعداد چھوٹے، بڑے بال لگ گئے تھے، جو سر کو نچوڑتے وقت اس کے ہاتھوں سے چپٹ رہے تھے۔ کوئی اور کپڑا تو تھا نہیں۔ اس نے لپک کر چٹائی پر ایک طرف گری ہوئی پتلون اٹھائی۔

اس پتلون کو وہ متواتر پچیس روز سے پہن رہا تھا۔ برسات کے دن تھے اور برسات بھی ایسی کہ پورے ڈیڑھ مہینے سے پانی لگاتار برس رہا تھا۔ یہ پتلون ان بارشوں میں بیسیوں مرتبہ بھیگی تھی، اور بیسیوں مرتبہ ہی اس نے اسے پڑوسیوں کی انگیٹھیوں پر سکھایا تھا۔ پہن پہن کے ایک ایک فٹ تک کیچڑ کے بڑے بڑے سخت دھبے اس کے پہنچوں کے پاس جم گئے تھے، جو داغوں سے معلوم ہوتے تھے۔ گھٹنے کے قریب ایک پوری ہتھیلی کی کالی سیاہی ایک مہاسا دھبہ بن کر رہ گئی تھی۔ کل جب نرمل پرانی انارکلی کی ایک تنگ و تاریک گلی میں سے گزر رہا تھا، تو سکول کے بچوں کی لڑائی میں ایک دوات دوسرے کے منہ پر پڑنے کے بجائے نرمل کی پتلون پر آ گری۔ اس کے اوپر کے حصے سے تو بارش اور پسینے کی ملی جلی خوشبو آتی تھی کہ ناک نہ دی جا سکتی تھی۔ اس نے پتلون کے اس خوشبودار حصے سے چہرہ صاف کر لیا۔ صرف چہرہ ہی نہیں بلکہ سارا بدن پونچھ ڈالا۔ اور پل بھر میں پتلون کا وہ بالائی حصہ باقی حصے کی طرح شرابور ہو گیا، جیسے کچھ دیر پہلے اس کا اپنا بدن!

پتلون کو سکھانے کے لئے اس نے کھونٹی پر پھیلا دیا اور خود انڈر ویئر پہن کر چٹائی کے ایک خستہ حصے پر اپنے دونوں گھٹنوں کو بانہوں میں باندھ کر بیٹھ رہا ——— سامنے دیوار میں چوہے کا ایک چھوٹا سا بل تھا۔ رسوئی خانے کی طرف سے ایک سوکھی، سڑی چھپا دوڑتی ہوئی آئی اور اس بل میں گھس گئی۔ اس تنگ و تاریک بل کی طرف دیکھتے دیکھتے نرمل کے منتشر خیالات اس کے پریشان ذہن سے نکل نکل کر خانہ بدوش، اکیلے جوڑے بنجاروں کی طرح خلا میں پھرنے لگے۔

کوٹ کے غائب ہو جانے سے اسے جو صدمہ ہوا وہ اس میں کھو سا گیا تھا۔ یہ کوٹ در حقیقت ایک پرانی امانت تھا اور اڑھائی سال سے اس نے اسے سنبھال سنبھال کر رکھا تھا ——— اس کا پہلا اور آخری دوست دلیپ جب ایک دفعہ اپنی محبوبہ کی تلاش میں دہلی جاتے وقت اس کے یہاں ٹھہرا تھا، تو وہ اپنے میلے کپڑے دھلوانے کی غرض سے یہیں نرمل کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ اور پھر جب وہ دہلی سے واپس آیا تھا تو اس نے آتے ہی اپنے اس کوٹ کے متعلق پوچھا

[illegible] بہت [illegible] سے [illegible] سے پیشتر [illegible] اس سے کہہ دیا [illegible] دیکھ لینا اور دیا تھا [illegible] آ جائے گا۔

دلیپ اس کوٹ کی [illegible] اس پر بری طرح ریجھ گیا تھا۔ دلیپ سے اس کے تعلقات آپس میں کچھ اس قسم کے تھے کہ تیرا میرا کی دیوار بھی ان کے درمیان حائل نہ ہوئی تھی۔ ایک دوسرے کی چیزیں انہوں نے بیسیوں مرتبہ بلا جھجک غائب کر لی تھیں، اس کے باوجود ان کے دل میں کبھی بدگمانی نہ پیدا ہوئی تھی۔ ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا، بے غرض دھوکا دینا اور بوقت ضرورت ایک دوسرے کی چوری تک کر لینا۔ ان کی دوستی میں جائز تھا۔ دلیپ کے جاتے وقت نرمل نے اسے پورا یقین دلا دیا تھا کہ وہ بہت جلد کوٹ کو پارسل کر کے لائل پور بھیج دے گا (ان دنوں دلیپ لائل پور میں [illegible] تھا) لیکن دلیپ کے جاتے ہی نرمل نے دھوبی کے ہاں سے [illegible] کر جیسا تھا ویسا ان سے خود زیب تن کر لیا تھا۔ اور پھر بعد میں اس طرح پہننے لگا تھا، جیسے لوگ خود کوٹ سلوا کر پہنا کرتے ہیں۔

چار سال سے خواہش ہونے کے باوجود بھی وہ خود کوئی کوٹ نہ سلوا سکا تھا۔ ایک نیا قیمتی کوٹ سلوانے کی ایک زبردست آرزو بے بس ہو کر اس کے دل میں دبی پڑی تھی۔ یہاں تک کہ بارہا وہ چاہا کرتا تھا کہ وہ ایک کوٹ سلوائے اور سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے، ہر وقت اسے پہنے رہے لیکن چونکہ اس کو گھر سے فارغ خطی لے پورے تین سال ہونے کو آتے تھے تمام عرصہ اس نے بیکاری میں گزارا تھا۔ اس لئے مالی کمزوری کا سبب اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہونے دی تھی۔ کئی بار وہ اس یا اس کمپنی میں نوکر بھی ہوا تھا اور اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ دفتر میں پہننے کے لئے ایک کوٹ سلوا لے۔ لیکن جب بھی وہ بازار میں کپڑا خریدنے کے لئے جاتا تھا [illegible] کپڑوں کے اچھے اچھے کپڑے [illegible] دیکھ کر ہی واپس آ جاتا تھا۔ [illegible] ایک مرتبہ اس نے لنڈے بازار میں سے ایک سیکنڈ ہینڈ کوٹ خرید بھی لیا تھا لیکن [illegible] تین روپے [illegible] شام کو اس نے وہ [illegible] دس روپے میں [illegible] لایا تھا۔ [illegible] کئی مرتبہ یہ بھی سوچا تھا کہ شیلا سندر کے سامنے اسپیشل [illegible] کے بجائے یہ لنڈے بازار سیکنڈ ہینڈ کوٹوں میں سے کوئی خرید لائے۔ یہ ارادہ کر کے وہ شیلا سندر کی طرف چل بھی پڑتا تھا، لیکن اس کے مہربان [illegible] نے ذہن کی یہ کیفیت زیادہ تر لنڈے کے دوستوں کو سفت سوچنے تک ہی محدود تھی) اسے صلاح دی تھی کہ اترا ہوا کپڑا پہننے سے کئی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔"

دلیپ کا یہ کوٹ پا کر اس نے گویا کوئی دبا ہوا خزانہ پا لیا تھا۔

کتنا سجتا تھا یہ کوٹ اس کے تن پر — سبز زمین پر سفید سفید دانے، اور گہرے سبز رنگ کی پتلی پتلی ابھری ہوئی دھاریاں، اس پر پیتل کے پالش کئے ہوئے موٹے موٹے اسفید، چمکیلے بٹن، اور پھر لاہور کی ایک مشہور فرم کے ہاں سے سلا ہوا۔ اس کے علاوہ اس کوٹ میں ایک اور بڑی خوبی یہ تھی کہ دیکھنے میں تو نہ سرد معلوم ہوتا تھا اور نہ گرم۔ گویا فیکٹری والے نے یہ کپڑا تیار کرتے وقت آجکل کے فیشن ایبل، میتھم کلرکوں کا خاص خیال رکھا تھا۔

اگرچہ اس کوٹ کو وہ ہمیشہ اپنی جان کے ساتھ رکھتا تھا کئی بار اسے پہنے پہنے سو بھی جاتا تھا لیکن کوٹ سے اس کی محبت اسے پہننے ہی پر موقوف نہ تھی بلکہ سیر و تفریح کے لئے جاتے وقت وہ بارہا اسے بائیں کندھے پر لٹکایا کرتا تھا۔ اتار کر [illegible] ایک چکر لگانا اس کی عادت سی بن گئی تھی۔ وہاں پھرتے پھرتے جب وہ تھک جاتا تھا تو اکثر اسی کوٹ سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھ لیا کرتا تھا یا جب وہ کسی بھی جگہ سے کمیٹی کے نل یا دھرم ارتھ پیاؤ سے پانی پیتا تھا، تو بھی اسی کوٹ سے ہاتھ منہ پونچھ لینے میں وہ کوئی برائی نہ سمجھتا تھا۔ کوٹ کے ہوتے ہوئے رومال رکھنا اس کی نظروں میں شاید فضول خرچی کے مترادف تھا۔

دفتر اور گھر کی لمبی [illegible] کاغذات، پنسلیں اور تیز نب والے قلم جیبوں میں ڈال ڈال کر اس نے [illegible] کر لئے تھے پھر آہستہ آہستہ جیبوں کا استر بھی پھٹ ہی گیا تھا۔ ایک بار وہ کمپنی کی بائیسکل سے گر جب [illegible]

چلنے لگا تھا، تو بائیسکل پر سوار ہوتے وقت بائیں ہاتھ کی جیب گدی سے اٹک کر (وہ اکثر الٹے ہاتھ ہی کی طرف سے بائیسکل پر سوار ہوتا تھا) کوٹ سے الگ ہو گئی تھی۔ اور اس نے وہ ٹکڑا اٹھا کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا۔ لیکن اس کو دوبارہ سلوانے کا خیال اسے کبھی نہ آیا۔ جب کبھی اس کے دوست اس کے کوٹ کا مذاق اڑاتے تو نہایت شان کے ساتھ جیب کا وہی ٹکڑا نکال کر وہ انہیں ایک چھوٹا موٹا لیکچر سنا دیتا۔۔۔ "تم اس کوٹ کی قدر کیا جانو حرامزادو۔ تمہارے باپ نے بھی کبھی ایسا کوٹ پہنا تھا؟۔۔۔ یہ دیکھو صرف یہ ٹکڑا ہی کم سے کم دس روپے کا ہوگا!"

بارہا جب اس کا دماغ پریشان ہوتا، وہ بٹنوں کے سوراخوں میں انگلیاں ڈالے گھومتا رہتا۔ جس سے سارے سوراخ کھل کر گریبان سے بن گئے تھے۔ رہے بٹن!۔۔۔ ان میں سے ایک بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہا تھا۔۔۔ عرصہ ہوا جب ایک دن پیسے نہ ہونے کی وجہ سے، اسنے پیتل کے وہ چمکیلے بٹن، جن کا پالش اس وقت صرف اتنا ہی باقی، جتنا کہ جوانی کا نور کسی بوڑھے آدمی کے چہرے پر نظر آتا ہے، کوٹ سے اتار کر گلیوں میں پھرنے والے کسی کے "لاکڑ ٹوٹا پھوٹا پیتل" کے ہاتھ ساڑھے چار پیسے میں بیچ ڈالے تھے اور ان پیسوں کی بیڑیاں بھی لے لی تھیں۔

جب سے یہ کوٹ اس کے پاس آیا تھا، بیچارے کوٹ کو صرف ایک ہی مرتبہ دھوبی کی زیارت کا موقع ملا تھا۔ اور وہ بھی اس حال میں کہ۔۔۔ ایک مرتبہ پھوار پڑنے سے "انارکلی" میں دلدل سی ہو گئی تھی، اور یہ کوٹ اچانک اسکے کندھے سے ڈھلک کر گر پڑا تھا۔ اور کیچڑ میں نہایت بری طرح لت پت ہو گیا تھا اس نے وہیں ہسپتال روڈ پر گھوڑوں کے پانی پینے والے حوض میں اسے دھو کر پھر کندھے پہ لٹکا لیا تھا۔ اور اگلے دن اسکو دھوپ میں سکھا کر کسی دھوبی کے ہاں سے دو پیسے میں پریس کرا لیا تھا۔

یہ کوٹ اس کے لئے ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ زندگی کے کئی واقعات اسکے ساتھ وابستہ تھے۔۔۔ ہو لیتے کہ اس کوٹ پر قبضہ جمائے اسے بہت دن نہ ہوئے تھے کہ ایک دن شام کو دفتر سے واپس آتے وقت اس نے تار گھر کے چھوٹے سے میدان میں کئی مرد عورتوں کو شور مچاتے دیکھا تھا۔ وہ لوگ چیخ چیخ کر ایک سیاہ کتے پر جو دیوانہ وار دوڑ دوڑ کر ان پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اینٹوں، پتھروں کی بارش کر رہے تھے۔ پھر اسنے دیکھتے ہی دیکھتے وہ باؤلا کتا پاس سے گزرتی ہوئی ایک نوجوان لڑکی پر جھپٹا تھا۔ نرگل نے اپنا ہی کوٹ اٹھا کر ایک دم کتے کے منہ پر دے مارا تھا اور آگے بڑھ کر اس نے اسی کوٹ سے اسی منہ کو اتنا دبا ڈالا تھا، کہ کتے کا بیرونی سانس باہر اور اندرونی اندر ہی رہ گیا تھا۔ "ممنون لڑکی" کا خاموش شکریہ، اس کو اتنا رس بھرا اور دلکش معلوم ہوا تھا، کہ پورے چھ مہینے تک صبح و شام وہ اس لڑکی کے مکان کے نیچے سے ہو کر گزرتا رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ جماعتی تفاوت کی وجہ سے آج بھی ان دونوں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا۔ اب جب کبھی اس کو اس لڑکی کی یاد آتی تھی، تو وہ اس کوٹ ہی کو اپنے سینے سے زور سے چمٹا لیتا تھا۔ اور اس طرح یہ کوٹ اس کے ناکام عشق کی پہلی اور آخری نشانی بھی تھا۔

پانچ چھ دن ہوئے کہ اسکے ہاں چوری ہو گئی تھی۔ اور چوری بھی ایسی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے اسے زحمت سے بچانے کے لئے، اس کی غیر حاضری ہی میں کسی شریف آدمی نے اسکا تمام سامان کسی دوسرے مکان میں بدل دیا ہو۔ کپڑے، بستر، برتن، کتابیں حتے کہ چارپائی بھی چلی گئی تھی۔ پرانے بلیڈ، ردی کاغذ، "تھام سوپ" کی نصف ٹکیہ گھسی ہوئی پنسلوں کے ہاتھ میں نہ آنے والے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تک اڑ گئے تھے۔ ہاں فرش پر بچھی ہوئی ایک پھٹی پرانی چٹائی چور کی نظروں میں شاید جچی نہ تھی۔ اور یا پھر ایک قمیص، پتلون اور یہی کوٹ بچ گئے تھے، جو اس دن وہ دفتر پہن کر گیا ہوا تھا۔ رہا بوٹ، تو وہ چرا لینا تو چور کی استعداد سے باہر تھا۔ کیونکہ وہ تو نرگل کے پاؤں کو زیب دے رہا تھا۔

گلی کے رہنے والے اور دوسرے واقفکار اچھی طرح جانتے تھے کہ اس کی تنخواہ پانچ چھ تاریخ تک قریب قریب ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر چوری تو گزشتہ تاریخ کو ہوئی تھی۔ اسکے پاس کیا بچا ہوگا۔۔۔ اس کو اس کس مپرسی میں دیکھ کر ساتھ [illegible]

…تھی کہ سامنے گلی والوں نے اس کو بستر اور چارپائی سے
…تھا اور ساتھ ہی یہ بھی پیشکش کی تھی کہ کرائی کمال چند
…سے کپڑے بنوانے کے واسطے وہ دس بیس روپے بھی لے
…لیکن اس نے تو پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جب
…کا احسان نہیں کر سکتا تو وہ دوسروں کا احسان کیوں
… — یہیں ماڈل ٹاؤن میں اس کا سگا بھائی رہتا
اور وہ بھی ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار پر ملازم! —
وہ چاہتا تو بھائی سے سو پچاس روپیہ بلا تکلف لے آتا۔ لیکن
…کی لاپرواہی تھی یا خودداری کا معیار، کہ سگے بھائی تک
…مدد لینا بھی وہ اپنی اخلاقی اور انسانی کمزوری سمجھتا تھا۔

اوروں کی مدد کا محتاج بننے کے بجائے اس رات اس
…اپنی اسی پھٹی پرانی چٹائی سے چارپائی جتنا ایک ٹکڑا کاٹ
تھا اور اسے بانوں میں بچھا کر، اپنا وہی کوٹ اوڑھ کر سو رہا
۔ اس رات مچھروں نے اسے اتنا کاٹا تھا کہ اگلی صبح اس کا
…ایک انگ نہ جانے کتنی جگہ سے سوج گیا تھا۔ اگر کوئی ہوتا
…اور اسے ملیریا ہو جاتا، مگر وہ ملیریا ہو جانے پر بھی ملیریا
…سمجھنے والا تھا — اس نے اس چٹائی پر سوتے ہوئے
اس کوٹ کو اوڑھ اوڑھ کر پانچ راتیں گزار دی تھیں۔
…مچھر اکثر پاؤں پر ہی زیادہ وار کرتا ہے، اس لئے
سوتے وقت کوٹ سے صرف پاؤں ہی ڈھانپ کر سو
…تھا۔ لیکن پھر جب رات کو مچھروں کی بھنبھناہٹ بدن
…اور حصوں پر سنائی دیتی تھی، تو وہ کوٹ کو پاؤں پر سے
…کر قابل حفاظت حصوں کو ڈھک لیتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا
ہوتا کہ مچھر اگر کہیں وار کر جاتا تھا، تو وہ اس وقت
…کر اس جگہ کو جیسے نچوڑ کر زہریلا مادہ نکال پھینکتا تھا۔
…کوٹ سے اس حصے کو اچھی طرح صاف کر کے پھر لیٹ
…جاتا تھا۔

ان دنوں میں اس کوٹ نے کتنا کام دیا تھا۔ رات
…مچھروں سے کہیں حد تک بچانے کے علاوہ، جب وہ صبح
…شام غسل خانے سے نہا کر نکلتا تھا تو وہی کوٹ اس کے
…بدن سے [illegible] اس طرح چمٹ جاتا تھا جیسے کسی کی
…ہمدردی کا دامن [illegible] انسان کے آنسوؤں کو اپنے
جذب کر لیتا ہے [illegible] اس کوٹ سے

پاؤں پونچھ کر جرابیں پہنتا تھا۔ اور دوسرے سیچ سکھے بوٹ کی
گرد بھی اس سے صاف کر لیتا تھا۔ پھر جب کبھی بارش آ گھیرتی
تھی تو وہ اسی کوٹ کو سر پر پھیلا کر بارش میں بے دھڑک چلتا
رہتا تھا۔ جس سے کئی مرتبہ اس کی قمیص اور دفتر کے کاغذ بھیگنے
ہونے سے بچ گئے تھے۔

اس دن غسل خانہ میں جاتے وقت وہ کوٹ کو کھونٹی پہ
لٹکا گیا تھا۔ لیکن جب نہا کر واپس آیا تھا تو کوٹ اس جگہ سے
غائب تھا — باہر گلی والا دروازہ چوپٹ کھلا تھا، جو
کہ غالباً باہر تھوکتے وقت اس سے کھلا رہ گیا تھا۔

اس سے پیشتر اس کی خدا معلوم کتنی چیزیں غائب ہوئی
تھیں، لیکن اس نے کبھی کسی بھی چیز کے کھو جانے پر افسوس نہ
کیا تھا۔ آج اس کوٹ کے چلے جانے پر اسے افسوس ہی نہ ہوا
تھا بلکہ اس کے دل میں ایک غم سا بیٹھ گیا تھا۔

اوپر والے کرایہ دار کے کھٹ اکھٹ، سیڑھیاں اترنے
سے وہ چونک گیا — ہر روز اسی وقت ان سیڑھیوں پر
کھٹ اکھٹ ہوا کرتی تھی۔ جس سے وہ سمجھ جاتا تھا کہ دفتر
جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس کی گھڑی شاید یہی کھٹ کھٹ
تھی۔

جلدی سے اٹھ کر اس نے پتلون پہننا چاہی، لیکن اس کا
بالائی حصہ بری طرح نچڑ رہا تھا۔ بھاگ کر اس نے مالک مکان
کی انگیٹھی پر پتلون کو سکھایا اور پہن کر دفتر چل دیا۔

لگاتار چھ مہینوں سے وہ دفتر جا رہا تھا۔ لیکن آج تک
اس نے اتنا سونا پن کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ اسے ایسا معلوم
ہوتا تھا، جیسے اس کا کوئی عزیز اس کا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔
اور زندگی کے اس وسیع و عریض ویرانے میں وہ تن تنہا
رہ گیا ہے۔

چندر کانت!

دُکھتی رگ

(۱)

"تم کیوں آئے ہو؟"
"سکون کی تلاش میں!"
"آخر تمہیں اپنے اوپر اتنا بھروسہ کیوں ہے!"

....

....

(۲)

"پھر آ گئے!"
"کیا کروں، وہ ہنس کے بڑھے تو سجدہ کرنا ہی پڑا!"
"آج موج میں ہو۔ ناکامی کا احساس پہلی مرتبہ ہو رہا ہے۔"

(۳)

"بہت تھکا ہوا ہوں۔ پناہ دے سکو گی!"
"یہاں وقتی خود فراموشی تو مل سکتی ہے۔ پناہ و ناہ کی باتیں چھوڑو۔ تم تو کافی سمجھدار آدمی تھے۔ جذبات کے دھارے پر بہنے کے کبھی بھی قائل نہ تھے۔"
"اچھا جاتا ہوں۔ شاید ابھی تم کو بھلانے میں کچھ کامیاب ہو سکوں۔"

(۴)

"اب کیوں آئے ہو؟ کچھ بدلے ہوئے نظر آ رہے ہو۔"
"دلچسپیاں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ خیال آتا ہے کہ تمہیں کو ان کا مرکز بنا دوں۔"
"تو کیا اب تک میں مرکز نہیں تھی۔ خود فریبی کا سہارا کب تک لئے رہو گے۔"

(۵)

"آج شہر میں گولی چلی ہے۔"
"ہوں!"
"سنا آج گولی چلی ہے۔ کیا سوچ رہے ہو۔"
"تمہیں اپنے اوپر اتنا بھروسہ کیوں ہے!"

(۶)

"پولیس دوڑ رہی ہے۔"

....

"میری طرف کیا گھور رہے ہو۔"
"کچھ پریشان سی نظر آتی ہو۔ خدا کے بندوں سے اتنا ڈر!"

(۷)

"بیٹھو! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"
"جلدی تو بالکل نہیں ہے۔ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑنا چاہتا ہوں۔"
"اچھا تو پھر جاؤ۔"
"آج کل بازار کیسا ہے۔"
"خریداروں کو اپنے گھروں کو سنبھالنے کی فکر ہے۔ سب تمہاری طرح آوارہ تھوڑی ہی ہیں۔"

(۸)

"شہر کی حالت اتنی خراب ہے۔ تم پھر آ گئے۔"
"بیکاری کا دلچسپ مشغلہ ہے۔"
"سب کچھ کھو بیٹھے ہو۔"
"نہیں، ورنہ یہاں نہ آتا۔"

(۹)

"کیا تم اب کسی چیز سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ تم تو بڑے حساس تھے۔ میں اتنا ہنگامہ ہوا اور تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔"
"کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے بارود کو پی کے اڑا دوں لیکن ہر کسی آخری کی تمنا بھی ہوتی ہے جسکے سکون میں سارے ہیجان اور تپش کو جذب کر دوں۔"
"شکست کا اعتراف اتنی جلدی!"

(۱۰)

"تم بار بار کیوں آتے ہو؟"
"میں نے اپنی کھوئی ہوئی شخصیت کو تمہارے اندر ڈھونڈھ پانے میں لگا رہا تھا۔ شاید تم مجھے جگانے میں کامیاب ہو سکتی ہو۔"
"مجھ سے اتنی امیدیں وابستہ ہیں۔" م م

بغاوت

اکثر وہ سوچتی رہتی، اور سوچتے سوچتے تھک جاتی، حتیٰ کہ اُس کا دماغ سوچنے سے انکار کر دیتا، لیکن دماغ پر انکار کی چوٹیں پڑتی رہتی، تب بھی وہ سوچتی رہتی۔ اور کبھی کبھی وہ سمجھتی، کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ لیکن پھر اُسے خیال آتا کہ ہر صحیح الدماغ انسان سوچتا ہے تو وہ کیوں نہ سوچے، وہ اپنے ماضی کے متعلق سوچتی۔ اور اسے معلوم ہوتا۔ کہ اُس کا ماضی واقعات سے اتنا خالی رہا ہے، کہ اس کے متعلق سوچنا وقت ضائع کرنا ہے اور پھر وہ مستقبل کے متعلق گھوڑے دوڑاتی، اور اسے معلوم ہوتا، کہ اسکا مستقبل ماضی سے زیادہ تاریک ہے، اور حال۔ صرف بے جان بے لذت اور بے کیف، تھا اُسے سوچنے سے کبھی چھٹکارا نہ ملی۔ اور ہوتی بھی کیسے، اُس کی زندگی کی شمع اکیلی جلتی رہی، اور کتنی عجیب بات تھی، کہ ایک پھول بھی نزدیک نہ پھٹکا جو اس کی رو کھی پھیکی زندگی کو پرکیف بنا سکتا، گھر سے اسکول۔ اور اسکول سے گھر یہی اس کی زندگی تھی، یہی اُس کا محور تھا۔ جسکے گرد اس کی بے لذت، زندگی ہچکولے کھاتی ہوتی، چکر لگا رہی تھی، اکثر دن کی روشنی میں اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا، اور جو کچھ وہ رات کو سوچتی۔ وہ سورج نکلتے ہی ہوا میں تحلیل ہو جاتا۔ لیکن رات ہوتے ہی اسکے احساسات میں ایک جان آجاتی، اس کا دماغ خیالات سے منور ہو اُٹھتا۔ اس کی پلکیں خوابوں سے بھاری ہو جاتیں اور تصورات کی ایک نئی دُنیا بن جاتی۔ لیکن کچھ عرصے اُسے ان خیالات سے نفرت سی ہو گئی وہ ہر اُس چیز سے انسان کو محبت ہوتی ہے۔ جب پہلی بار یہ تصورات، یہ رنگین دُنیا، یہ قوس وقزح اُس کی بے لذت دُنیا کے حصے بنے، تو اُس نے سمجھا۔ کہ وہ آبِ حیات پی رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں باریک خمار سا رہتا، اس کی پلکیں نیند سے بوجھل رہتیں اور آنکھوں میں شگفتگی اور چمک سی آجاتی۔ لیکن انسان پر دلکش خواب جلد ٹوٹ جاتا ہے، ہر قلعہ مسمار ہو جاتا ہے۔ اُس نے ہر طرح کوشش کی، یہ تصورات ٹوٹنے نہ پائیں، یہ خیالات کا لامتناہی سلسلہ ہمیشہ کے لئے چلتا رہے۔ لیکن جوں جوں وہ جوان ہوتی گئی یہ خیالات بھاری پتھر بن کر اُس کے سینے پر بوجھ ڈالنے لگے، اکثر وہ چاہتی کہ کسی طریقہ سے اُسے اُن خیالات سے رہائی مل جائے، لیکن خیالات کا بوجھ اُس کے کندھوں پر ایک مردہ لاش کی طرح بن کر گلنے اور سڑنے لگا۔ ان چند باتوں نے اُسے شدید طور پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شدت سے سوچے۔ لیکن آج کے واقعہ نے اُسے جاگنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ کچھ اور ہی سوچنا چاہتی تھی کچھ اور ——— جو اس سے پہلے اُس کے ذہن میں نہ آیا تھا، اگر آیا بھی تھا۔ تو لاشعوری طور پر، جسکا اُسے علم نہ تھا، وہ مبہم سے خیالات، وہ جو اُس کے دماغ کی چوکھٹ پر خفیف سی چوٹیں لگا رہے تھے۔ آج یکایک اُبھر آئے، اور اُس کے دل ودماغ پر چھا گئے۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی کروٹیں لینے لگی، تاکہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جائے، اور اُسے نیند آجائے لیکن آج نیند کہاں، اُس نے اپنی آنکھوں کو ملا اور پھر زور سے آنکھیں بند کیں۔ اور پھر اندھیرے میں آنکھیں کھول دیں لیکن خیالات برابر چکر لگا رہے تھے۔ اُس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا، پھر باہوں کو جھٹک دیا، اور زور زور سے پاؤں ہلانے شروع کئے۔ لیکن آج اُس کے خیالات ایک فیصلہ کن راستہ اختیار کر رہے تھے، وہ چلانا چاہتی تھی لیکن وہ ڈر گئی۔ ناگہاں گھر کے افراد جاگ اُٹھیں، اور لعنت ملامت کریں، اگر وہ چلائی اور گھر کے افراد جاگ اُٹھے تو وہ کیا جواب دے گی ———

——— کیا وہ ڈر گئی ہے، کیا وہ بچی تو نہیں، کہ وہ اکیلی بستر پہ لیٹی لیٹی ڈر جائے۔ اُس نے خیال کیا، کہ اُسے چپ چاپ بستر پر لیٹے رہنا چاہیے، اُس نے تاریکی کو آج پہلی بار دُور کرنا چاہا۔ اُس نے تصورات کو پھر بلانا چاہا۔ قوس قزح کی رنگینیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچتی رہیں، لیکن صرف پل بھر، اور دوسرے لمحے میں وہ فیصلہ کن راستہ تاریکی کو چیرتا ہوا آگے بڑھ جاتا، آج تاریکی خود اُسے درست دکھا رہی تھی، لیکن آج اُس میں لذت نہ تھی، اور بے حسی کا سامان نہ تھا سانس کی

دھانی تیز نہ تھی، نگاہوں میں حدت میں نہ تھی، لبوں پر لعاب نہ تھا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ برف کے گلیشیر سے ٹکرا رہی ہو، اس کا خون منجمد ہو رہا ہو، اور پھر اُسے خیال آیا کہ آج ایسا کیوں ہو رہا ہے، کہ وہ آج کیوں اِس پُرخطر راستہ کو اختیار کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اگر آج اُس نے اپنی ماں کے بڑھے ہوئے پیٹ کو نہ دیکھ لیا ہوتا تو شاید اُسے اتنا شدید دھکا محسوس نہ ہوتا، شاید وہ ان باتوں کو نہ سوچتی، شاید چندا خوابوں کی دُنیا میں بسی رہتی، لیکن ماں کے اِس بڑھے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر اُسے محسوس ہوا۔ کہ اس کی جوانی، اُمنگیں، خواہشیں، لذتیں اسی میں دفن ہیں، یہ پیٹ ہر سال بڑھتا اور کم ہوتا رہے گا، اور اُس کی خوشیوں، لذتوں اور کیفیتوں کو بے لذت بناتا رہے گا۔ اُسے اپنے باپ پر غصہ آیا، اُسے اپنی ماں پر غصہ آیا، جنہیں گھر کی اقتصادی حالت کا ذرا بھی خیال نہ تھا، اور ہر سال ایک بچہ کا اضافہ کر دیا کرتے تھے، کیا وہ کبھی نہیں سوچتے، کہ اتنے بچے پیدا کر کے وہ کیا کریں گے۔ اُس کے باپ کی اتنی قلیل تنخواہ تھی کہ مشکل سے صرف ان کا گذارہ ہو سکتا تھا اور اگر وہ برسرِ روزگار نہ ہوتی تو آج جنگ کے زمانہ میں وہ فاقے کرتے، اور کب کے راہیِ ملکِ عدم ہوتے لیکن اس کے والدین نے کبھی نہ سوچا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ شاید غریب آدمی کم سوچتے ہیں، یا انہیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ سوچ سکیں، دن بھر کے تھکے ماندے جب وہ گھر آتے ہیں تو نیند اُن کی پلکوں پر جمی ہوئی ہوتی ہے، اور رات کی تاریکی میں جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس کا انہیں علم نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں؟ اگر چندا کو اپنے والدین پر غصہ آتا، تو کچھ عجیب نہ تھا، لیکن آج تو اُسے ہر بات پر غصہ آ رہا تھا، اپنے باپ پر، اور اُس کے بنانے والے پر، زندگی میں ایک چیز تو دی ہوتی ہے، اگر غربت دی تھی، تو خوبصورتی کیوں چھین لی اور اگر بنانے والے نے خوبصورتی سے محروم کیا تھا تو رنگ ہی اچھا دیا ہوتا، یہ کیا دے دیا، بالکل کالا، سیاہ رنگ بالکل کوئل جیسا۔ کوئل سے اُسے نفرت تھی، کیونکہ کوئل کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ لیکن اُسے کوئل کے نغمہ سے محبت تھی، اُسے اپنے چہرے کی رنگت سے نفرت تھی، لیکن دل کے نغمہ سے محبت تھی، دل جو اکثر بے چین ہو جاتا ہے۔ آم کے بور اور چھوٹے چھوٹے [illegible] جن کی خوشبو سے اس کی جوانی کی اُمنگیں تازہ ہو جاتی تھیں، وہ ابھی تک بیاہی نہ گئی تھی، اُس کی عمر کیا ہوگی۔ یہی بیس برس۔ وہ ابھی تک بے حد حسین ہے گو وہ ان چند سالوں میں کمزور و دبلی ہو گئی تھی، لیکن دل کی اُمنگیں جوان ہیں، اُسے کسی کے جسم کی باس اچھی لگتی ہے۔ اُسے اُداس، تنہا چاند بھلا معلوم ہوتا ہے، اور جب کبھی چنبیلی اور موتیا کے پھول کھل جاتے ہیں، اور املی اور کھٹوں کے سبز پتے ہرے ہرے ہو جاتے ہیں، اور سورج کی کرنیں اُس باغ میں پھیل جاتی ہیں، تو اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، اور پھر اُس کے ذہن نے ماضی کی طرف زقند لگائی اور کسی کی آواز اس کے کانوں میں سُنائی دی۔

'بیٹی چندا!'

'پاپا!'

اور اُس کا باپ اُس کے قریب آ کر کہتا "بیٹی جب تمہارا شادی کرنے کو جی چاہے تو فوراً مجھ سے کہہ دینا، میں تمہارا بندوبست کر دونگا!"

اور پھر چندا کا چہرہ سرخ ہو جاتا، یا یوں کہیے کہ زیادہ سیاہ ہو جاتا، ٹھوڑی سے لے کر پیشانی تک خون لہریں مارنے لگتا، آنکھیں جگنو کی طرح چمکنے لگتیں، سر سے لیکر پاؤں تک خوشی اور انبساط کی لہریں دوڑ جاتیں، اور وہ شرم سے زمین کُریدنے لگتی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی، لیکن آواز حلق میں اٹک جاتی۔

چندا کے باپ پھکڑو نے کتنی بار یہ الفاظ کہے تھے، جب وہ چودہ سال کی تھی، بالکل سرسوں کے ساگ کی کونپل کی طرح۔ ہری ہری اور نیلی نیلی، تب ہی پھکڑو نے اُس کے کان میں آ کر کہا تھا، "بیٹی۔ ماں باپ کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جب تمہارا دل کسی پر آئے، تو مجھ سے چپکے چپکے کہہ دینا میں فوراً انتظام کر دونگا۔"

اور چندا سوچتی کہ اُسکے باپ کو اُس کا کتنا خیال ہے، اس وقت یہ الفاظ کتنے پیارے اور حسین لگتے تھے، چندا سمجھتی تھی کہ دنیا کی تمام خوشیاں ان لفظوں میں پنہاں ہیں۔ [illegible] کے باپ نے اُسے دسویں پاس کرا کے ٹریننگ میں داخل کرا دیا اور چند سالوں میں چندا سکول میں ہندوستانی پڑھانے لگی [illegible] تنخواہ پانے لگی، چندا کو اپنے باپ کی [illegible]

تنہا بستر پر لیٹے ہوئے چندا کے سامنے ماضی کے تمام واقعات پھر گئے۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے باپ کو اپنی عزت کا بہت پاس تھا، گو وہ تحصیل میں چپراسی کا کام کرتا تھا، اور اُسے صرف بارہ روپے تنخواہ ملتی تھی، لیکن وہ کسی کی پرواہ نہ کرتا تھا، وہ اپنے آپ کو کسی سے کم نہ سمجھتا تھا، وہ اکثر لوگوں سے کہتا کہ وہ مجسٹریٹ کی کچہری میں نوکر ہے۔ اس کی بڑی لڑکی اسکول میں اُستانی ہے۔ وہ کیوں کسی سے ڈرے، وہ کیوں کسی کی چاپلوسی کرے۔ وہ خود کماتا ہے اور کھاتا ہے۔ جب کبھی وہ چلتا، تو اُس کے پاؤں اچھل اچھل کر زمین پر پڑتے، عیسائی ہونے کے باوجود اُسے عیسائیوں سے نفرت تھی، وہ محلے کے ہر عیسائی سے لڑ چکا تھا، اُسے محلے کے نوجوان لڑکوں سے نفرت تھی، وہ سمجھتا تھا، کہ محلے کا ہر لڑکا اُس کی لڑکی پر آنکھ رکھتا ہے۔ کمینے۔ کمذات لڑکے اُس کی لڑکی کی طرف دیکھتے ہیں، وہ کیوں اس کی لڑکی کی طرف دیکھتے ہیں، عزت کا پاس نہیں، غیرت نام کو نہیں، اور پھر وہ چندا سے کہتا۔ "دیکھو تم اُن کے گھر مت جایا کرو۔ مجھے اُن کے لڑکے اچھے نہیں لگتے۔ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہاری طرف دیکھتے رہیں، اور وہ لمبا تڑنگا سا لڑکا جو اس گھر میں رہتا ہے نا۔ وہ تمہاری طرف ایک عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا، اور تم اُس کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔ کیوں ایسا کیوں ہو؟" اور پھر وہ اپنی چھوٹی چھوٹی چندھیائی ہوئی آنکھیں چندا کے چہرے پر گاڑ دیتا، اور اس کے چہرے کے خدوخال کا اس طرح ملاحظہ کرتا جیسے ایک ڈاکٹر خوردبین سے مرے ہوئے جراثیم کو دیکھ رہا ہو۔ اور چندا باپ کی مشکوک نگاہوں کو دیکھ کر گھبرا جاتی، اور اُسے اپنے باپ کی بیہودہ باتوں پر بہت غصہ آتا، وہ اکثر اپنی سہیلی کے گھر جاتی تھی، لیکن آج کسی نے اُسکی طرف مسکرا کر نہیں دیکھا۔ ہاں اس کی سہیلی کے بھائی ہیں خوبصورت اور جوان۔ اور خاص کر وہ لڑکا تو اُسے نہایت ہی اچھا لگتا ہے جو اکثر دالان میں آ جاتا تھا اور اپنی بہنوں سے [illegible] گفتگو کرتا تھا، لیکن اُس نے کبھی اُسکی طرف مسکرا کر نہیں دیکھا۔ شاید اس کی رنگت اتنی سیاہ تھی، کہ وہ اس کی طرف ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا تھا، [illegible] مسکرا دیتا۔ [illegible] مسکراتا،

تو وہ نہ مسکراتی، وہ کیوں نہ مسکراتی، اور چندا سوچتی کہ اُس کی زندگی مسکراہٹوں سے خالی رہی ہے۔

آج تک کسی نے اُسکی طرف مسکرا کر نہیں دیکھا، اور وہ درزی، جو دن رات ہارمونیم بجاتا تھا۔ اور گاتا تھا۔ کیا گاتا تھا وہ۔ ہاں یاد آیا۔ ساون کے نظارے ہیں، لا۔۔ لا لا لا۔۔ لا ۔۔ ساون کے نظارے ہیں۔ درزی کی چندیا پر [illegible] تھی، اور وہ اکثر اُس کا تعاقب بھی کیا کرتا تھا، گو اس کا باپ گھر سے بس کے اڈے تک چھوڑنے آتا تھا، اور وہ بس میں سوار ہو کر سکول چلی جاتی تھی۔ اور شام کو اُس کی ماں بس کے اڈے پر آجاتی تھی، لیکن وہ کالا، سانولا سا درزی بس میں کبھی نہ آیا، شاید وہ چندا کے باپ سے ڈرتا تھا، بیچارا لنگڑا تھا نا۔ ایک ٹانگ ہی نہ تھی، اور جس کی ایک ٹانگ نہ ہو وہ کس طرح لڑ سکتا ہے۔ یہی بات ہوگی۔ ورنہ وہ ضرور آتا، وہ اکثر چق کے پیچھے کھڑا ہو جاتا، اور دھیمی دھیمی آواز میں گایا کرتا تھا، نہ دل ہی دیا ہوتا، نہ پیار کیا ہوتا! بیچارا درزی، چندا کو اس لنگڑے درزی سے ہمدردی تھی، اور اگر چندا کو کبھی موقع ملتا تو وہ ضرور اس سے ملتی، اگر کبھی غلطی سے چندا چق کے پیچھے متحرک سائے کو دیکھتی تو پھر وہ [illegible] کی آنکھیں انگارہ ہو جائیں اور وہ چندا سے کہتا۔ "میں اس کی آنکھیں نکال دونگا۔ میں اس کی زبان کھینچ لوں گا۔ سالے نے سمجھا کیا ہے۔ محلے میں دن رات فحش گیت گاتا رہتا ہے۔ بے شرم کہیں کا۔" اور پھر چندا کو دبی زبان میں کہتا "چندا دیکھو۔ اگر تمہارا کسی پر دل آئے تو چپکے سے مجھ سے کہہ دینا۔ میں فوراً انتظام کر دوں گا۔"

اُس کے باپ نے کئی بار یہ الفاظ دہرائے تھے، لیکن آج تک اُن پر عمل نہ ہوا تھا، اور ان چند سالوں میں چندا نے محسوس کیا، کہ ان لفظوں کی سحر انگیزی مٹ چکی ہے، اب اُس کا دل ان لفظوں کو سُن کر دھڑکتا نہیں بلکہ دل کی دھڑکن مدھم ہو جاتی ہے۔ اگر چندا چاہتی، تو وہ کسی سے شادی کر لیتی، لیکن گھر کی اقتصادی حالت کچھ اس طرح بگڑی ہوئی تھی، کہ وہ کچھ عرصہ اور انتظار کرنا چاہتی تھی، تاکہ اس کی چھوٹی بہنیں جوان ہو جائیں اور کسی سکول میں نوکر ہو جائیں۔ تب وہ ـــــ تب وہ ـــــ کسی سے شادی کر لے گی۔ پھر وہ چندا کی بڑی بہن کو نصیحتیں دیا کرتا تھا،

تھی، حیا کہیں کی، ہم نے اُسے پالا، پوسا، پڑھایا، اور نوکری دلائی، جب وہ جوان ہوئی ۔"

" تو کیا ہوا بابا" چندا پوچھتی۔

" کیا ہوا۔ وہ گھر سے بھاگ گئی۔ ہماری عزت کو بٹہ لگایا۔ اور پھر اُس کے بعد کبھی نہ آئی، یہاں کبھی آئے تو آنکھیں توڑ دوں"۔ چندا دل میں کہتی بھاگ گئی، اور وہ نیم کے درخت پر بلبل نغمہ سرا تھی۔ آم کے بور۔ ہلکے ہلکے ذرات، ہوا میں تیرتے ہوئے، سوندھی سوندھی خوشبو ـــــ اُداس چاند ـــــ گھر سے سامنے۔ اور متحرک زندگی ـــــ اور اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی، اور وہ دل میں سوچتی کہ اُس کی بہن نے بہت دیر انتظار کیا ہوگا۔

" بدمعاش کہیں کی!" پھر وہ چلاتا،

چندا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا، اور اپنے بابا کی تقریر سننے لگتی۔

" ہم کیوں عیسائی بنے، ہم کیا تھے، یہ بھی جانتی ہو۔ ہم ہندو تھے، ہم چار دن کے بھوکے نہ تھے، کیا ہوا۔ پیٹ کی خاطر عیسائی ہو گئے، پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا، ہم اُن عیسائیوں کی مانند نہیں ہیں، جو جھٹ گرجا میں جا کر نام تبدیل کرا لیتے ہیں مسٹر آر ـــ آر۔ لاٹ، میڈم واٹ۔ میں کہتا ہوں ہم ہندو عیسائی ہیں۔ ہم خالص براہمن تھے ہماری رگ رگ میں ہندو دھرم رچا ہوا ہے، ہم شریف خاندان کے رکن ہیں کوئی ہماری بہو بیٹیوں کی طرف دیکھے تو سہی آنکھیں نکال دوں اُس کی، ان عیسائیوں کی طرف تم نے نہیں دیکھا، ہر ایک میم بن بیٹھی ہے، ان کی لڑکیاں اکیلی باہر جاتی ہیں، اور ـــ اور۔ ـــ "

" دھیرے دھیرے بات کرو، اماں کہتی ـــ"

" میں کسی سے نہیں ڈرتا، میں عیسائی ہوں، لیکن عیسائیوں سے میں نہیں ڈرتا، میں ہندو عیسائی ہوں، کوئی چمار نہیں، ہم عزت کے لئے مر سکتے ہیں۔" اور چندا کے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا اور وہ چندا کے قریب آ کر کہتا،

" چندا بیٹی۔ اگر تمہارا کسی پر دل آئے تو چپکے سے کہہ دینا، میں فوراً شادی کر دوں گا!"

' دل آئے'، چندا بڑبڑاتی، جیسے اُس کا جی نہیں چاہتا کہ وہ شادی کرے، اُس کا دل کب اور کس پر آئے گا، اس کے متعلق اُسے کچھ معلوم نہ تھا، ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی پر نہ آئے۔

لیکن ہو سکتا ہے۔ کہ اُس لنگڑے دنری پر ہی آ جائے، لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اس فرسودہ زندگی میں ایک نئی جان پیدا کر دے، یہ گھٹ گھٹ کر مر جانا اچھا نہیں، وہ دن رات والدین کی کوٹھی نگہبوں میں مقید رہتی ہے اُسے اجازت نہیں کہ وہ کسی سے ہنس کر اپنی روح کی گرانباری کو ہلکا کر سکے، آخر وہ بھی انسان ہے، اور خوش رہنا چاہتی ہے، اگر اس کے ماں باپ کو خوش رہنے کا حق حاصل ہے تو اُسے بھی حق حاصل ہے کہ وہ زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار ہو سکے، اس کے باپ نے پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر لی تھی، پہلی بیوی سے تین لڑکیاں تھیں، اور دوسری بیوی ہر سال ایک بچہ جنتی تھی۔ کیا اُس کے باپ نے کبھی نہ سوچا کہ وہ اتنے بچے پیدا کر کے کیا کریگا۔ اُن کی کس طرح پرورش کریگا، کاش اُس کا صرف ایک ہی بھائی ہوتا، یا صرف ایک بہن، وہ اُسے پڑھاتی، اور جب وہ جوان ہو جاتی تو اس کی شادی کر دیتی، لیکن یہاں تو بات ہی اور تھی، اتنے بچوں کو پالنا پوسنا، پڑھانا اور پھر شادی کرنا۔ ان باتوں کے لئے عمر درکار تھی اور آج بستر پر لیٹے لیٹے اس کے دل میں بغاوت کے خیالات سما گئے۔ اور وہ سوچنے لگی، کہ وہ اس دنیا میں کیوں پیدا ہوئی، کیا اس کا کام دن رات روزی کمانا ہی ہے، اور پھر زندگی کے ان گنت جھمیلوں میں ہمیشہ کے لئے سڑتی رہے، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ اس گھر سے چلی جائے۔ اور دور کسی شہر میں جہاں اس کا باپ نہ ہو۔ ماں نہ ہو اور نوکری کرے، اور پھر وہ خوشی کے چند لمحات خرید سکے گی، وہ چند لمحات جن کے لئے اُس کا رواں رواں بیقرار ہے۔ لیکن پھر اُسے خیال آتا، کہ اگر وہ گھر سے چلی گئی تو اس کی بہنوں کا کیا ہوگا۔ اُس کے بھائیوں کا کیا بنے گا۔ غرضیکہ عالمگیر حالات کو دیکھ کر اُس کا دل گھبرا جاتا، اور وہ سوچتی کہ اس کا فرض اُس کی جائز خوشی پر حاوی ہو رہا ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے فرض کو بھول جائے۔ آخر وہ کیوں ان بہن بھائیوں کی پالنا کرے، یہ اُس کا قصور نہیں ہے، کاش وہ اکیلی ہوتی، لیکن وہ آج اپنے باپ سے صاف لفظوں میں کہہ دیگی کہ وہ آج سے آزاد ہے، اُس کا جسم آزاد ہے، اُس کی روح آزاد ہے، اسے کوئی قید نہیں کر سکتا، اُسے لعنتیں اچھی نہیں لگتیں، وہ ان حقیقی اخلاقی مسرتوں کو نہیں مانے گی، وہ اپنے شباب کو یوں ضائع نہیں کرے گی، وہ سوچتے سوچتے باہر آ گئی، ان خیالات کے بوجھ سے اُس کے جسم

میں ایک حدت سی آگئی تھی، سر سے لیکر پاؤں تک خون کی روانی تیز ہوگئی تھی، اُس کے لب ایک غیر واضح جذبے سے کانپ رہے تھے، اس کی گھنی گھنی پلکیں اس کے کالے گالوں پر جھکی ہوئی تھیں اس نے اپنے خیالات کو سمیٹ ہوا دیا تھا اس لئے وہ ایک لذت آمیز تھکن سی محسوس کر رہی تھی، اگر چاند کی ٹھنڈی کرنوں نے اُسے آغوش میں نہ لے لیا ہوتا تو شاید وہ بے ہوش ہو جاتی، دھیرے دھیرے وہ چاند کی سیمیں کرنوں میں نہانے لگی، ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی، اس کے گھر کے سامنے باغ پر، دور لال کوٹھی پر، نیم کے درختوں پر، گرجا کے برج پر، دھوبیوں کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں پر، وہ چپ چاپ کھڑی رہی اور نیم کے درختوں پر خاموشی برستی رہی، چاندنی پھیلتی رہی، نیم کے درخت چپ چاپ استادہ تھے، اور چاند کی کرنیں نیم کے پتوں کو چوم رہی تھیں، وہ ہری ہری گھاس پر لیٹ گئی، گھاس نرم اور ملائم تھی، گھاس پر لیٹے ہوئے اُسے ایک جنسی آسودگی سی محسوس ہونے لگی، اُس کا مُنہ گھاس سے ہم آغوش تھا، زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کے نتھنوں میں سمانے لگی، اور اُس نے اپنا چہرہ گھاس میں چھپا لیا اور اُسے بار بار چومنے لگی، چومتے چومتے اُسکے جسم میں ایک نیم اضطراری لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف خاموشی تھی، صرف چاندنی برس رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم چکی ہے، اور حرکت خاموشی میں مدغم ہو چکی ہے، صرف اُس کے خیالات جاگ رہے تھے، اور دُور آسمان پر چاند اکیلا زندگی کی گردش کو پورا کر رہا تھا، کتنی گہری خاموشی تھی! ایک ناقابلِ برداشت خاموشی، اُس کے عضو عضو میں سما رہی تھی، خاموشی یا آگ۔ لیکن وہ خود اس آگ کا حصّہ تھی، اُسکے جسم میں آگ مشتعل تھی، لیکن وہ اس آگ کی موسیقیت میں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو غرق کرنا چاہتی تھی، تاکہ معلوم نہ ہو سکے کہ آگ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوئی، اُس رات اُس نے محسوس کیا، وہ پہلی سی عورت نہیں رہی ہے وہ ایک مختلف عورت ہے، بلکہ وہ عورت ہی نہیں، وہ کچھ اور ہے وہ صرف آگ کا شعلہ ہے۔ لیکن وہ آج تھکی تھی، بالکل تھکی، وہ کچھ سکون سی محسوس کر رہی تھی اور آہستہ آہستہ ریشمی گھاس پر ہاتھ پھیلے تھی، اُس کا دل دھڑک رہا تھا، اسکا گرم سانس تھنوں سے پھوٹ رہا تھا، وہ درخت پر الو چلایا اور

چاندنی ٹھٹھرا کر رہ گئی، یکایک اُس نے سوچا کہ یہ خاموشی کسی آنے والے طوفان کی پرتو ہے۔ طوفان جو اُس کے دل کے اندر بند ہے، اور جب صبح ہوگی، اور روشنی کا چشمہ پھوٹ نکلے گا، تو اس طوفان کو کوئی نہ روک سکے گا، اور یکبارگی اُسے محسوس ہوا کہ برآمدے میں سوتے ہوئے والدین اس بات سے ناآشنا تھے کہ اُنکی دوسری لڑکی نے بھی عزم آخری کر لیا ہے۔

مہندر ناتھ

ایک مریض کی ڈائری

آخر کئی دن کی جھک جھک کے بعد انھوں نے مجھے ہسپتال میں داخل کر لیا ہے۔ اگر میرا بہنوئی ڈاکٹر نہ ہوتا اور ہسپتال کے سٹاف سے اس کا میل جول نہ ہوتا تو شاید اب تک باری نہ آتی۔ یہاں بھی سفارش کے بغیر کام نہیں چلتا۔ بس سفارش یا ستر روپیہ فیس، اگر ۳۲ نہیں تو ۱۷۔

"ہیلو نمبر ۹" کمبختوں نے میرا نام بھی بدل دیا ہے۔ موٹروں تانگوں اور چھکڑوں کی طرح مریضوں کے بھی نمبر ہوتے ہیں — زندگی بھی تو ایک چھکڑا ہے۔ چرچراتا ہوا چھکڑا۔ ٹیڑھے دھرے والا۔ اور انسان۔ انسان بیل ہیں۔ جسے واقعات کے کوڑے کسی نامعلوم منزل کی طرف ہانک رہے ہیں۔

وارڈ کی بو نے جینا عذاب کر رکھا ہے (ابھی عادی نہیں ہوا) دواؤں میں بیماری کی بو ملی ہوتی ہے، کھانا نہیں کھا سکتا اس وجہ سے۔ اور پھر مریضوں کی چیخ پکار۔ جی چاہتا ہے بھاگ جاؤں۔ لیکن درد گردہ۔ اب تو دائیں گردے میں بھی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ مارفیا بھی اثر نہیں کرتا۔ مارفیئے کے بعد نرسوں کی ایڑیوں کی ٹھک ٹھک یہی محسوس ہوتا ہے جیسے دماغ پر ہتھوڑے سے ضربیں لگائی جا رہی ہیں۔ نرسوں کی ایڑیاں کاٹ دینی چاہئیں۔ لیکن ان کی پنڈلیاں خراب ہو جائیں گی۔ گوری گوری اور کالی کالی پنڈلیاں۔ گوری نرسوں کے مقابلے میں کالی نرسیں زیادہ اچھی ہوتی ہیں رعونت نہیں ہوتی چلنے والے کم ہوتے ہیں نا۔ لیکن آہ یہ درد۔ جانے کب ہوگا آپریشن۔

کل ہنڈمعارکر معائنہ کو آ رہا ہے۔ چیف سرجن .... ڈاکٹر ہنڈمعارکر۔ ۴۵۔۔۵۰ سے کیا کم عمر ہوگی۔ لیکن لنڈورا ہی کا لنڈورا ہے۔ کہتا ہے جب تازہ دودھ آسانی سے مل سکتا ہو تو گھر پہ گائے باندھنا حماقت ہے۔۔ لیکن نرسوں سے دور رہتا ہے۔ ڈسپلن خراب ہوتا ہے اس طرح۔ سننے میں آیا ہے کہ اسے پٹرول کی بو بہت پسند ہے۔ کمرے میں پٹرول کا ذکر کرتا ہے۔ Petrol Rationing-[illegible] کو خبر کرنی چاہئیے۔ طلباء کی تو اس سے جان جاتی ہے۔ کہنیاں مارتا ہے، سخت جان بنانا چاہتا ہے۔ فوج میں رہ چکا ہے نا۔ ہزاروں لاکھوں کو مرتا مارتا دیکھ کر دل پتھر ہو گیا ہے۔ گردے میں پتھر بہت تکلیف دیتا ہے...... طلباء کی ٹولی میری طرف آ رہی ہے۔ نو آموز بیچارے ہسٹری پوچھیں گے۔ لیکن میں انھیں بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ ساری کہانی خود ہی سنا دیتا ہوں، ریکارڈ کی طرح۔ دوسروں کو تو ادھ موا ہی کر دیتے ہیں۔ نرسوں کو بہت چھیڑتے ہیں۔ کئی بار گالیاں بھی سننا پڑتی ہیں، لیکن پھر بھی ہلتے رہتے ہیں۔ ڈھیٹ ہیں کے۔ جینے کے لئے ڈھیٹ ہونا لازمی ہے۔

نمبر ۵ کا بوڑھا سارے وارڈ کے لئے تفریح کا سامان ہے ۸۰۔۔۹۰ سے اوپر کا، سکھ جاٹ ہے۔ پلکیں بھی سفید ہو چکی ہیں لیکن ابھی اور جینے کی خواہش ہے۔ اپریشن کرا چکا ہے۔ چاء کا نشہ ہے، نرس کو دیکھتے ہی بی بی چاء بی بی چاء کی رٹ لگا دیتا ہے۔

"بی بی چاء" کی پکار بڑھتی جا رہی ہے۔ نرسوں نے توجہ دینا چھوڑ دی ہے کہتی ہیں They were taken ... بوڑھا انگریزی نہیں سمجھتا ہنس دیتا ہے کھسیانی ہنسی چائے کی درخواست لیکن چاء زیادہ نہیں مل سکتی۔ جنگی ہو گئی ہے۔ وطن کی عزت اور آزادی کی خاطر لڑنے والے بہادروں کی ضروریات سب سے مقدم ہیں۔ اور پھر چاء میں چینی بھی چاہئیے اور چینی پہ کنٹرول ہے۔ ہر چیز پر کنٹرول ہے۔ لیکن برتھ کنٹرول کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ برتھ کنٹرول ہوتا تو آبادی زیادہ نہ ہوتی اور آبادی زیادہ نہ ہوتی تو جنگ نہ ہوتی۔

آج صبح مہتر صفائی کے لئے آیا تو بوڑھا [illegible]

... ہوا ... کسی نے ... مگر ... موت ... کا انجکشن دے دیا
... شخص کو ہلاک ... نرسوں کی نیند ہو گئی۔ پتہ نہیں کب مرتا تھا۔
... کے لئے تو سب ایک برابر ہے ۔۔۔ بڈھے کی چارپائی خالی
مطلب ہے پلنگ دو ہیں کا وہیں پڑا ہے۔ اطلاع بغیر اٹھایا نہیں
سکتا۔ رجسٹروں میں اندراج ہونا لازمی ہے۔ ہر شے کا ریکارڈ
ہونا چاہئے۔ لاوارث تھا لاش تجربے کے لئے بھیج دی جائے
گی۔

انجکشن والی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ ہر طرف وہی
باتیں ہو رہی ہیں۔ دو تین مریض اسی ڈر سے بھاگ گئے ہیں
... ان کا بھی کہیں وہی حشر نہ ہو۔ ان افواہوں کی روک تھام
ہونی چاہئے۔ ان سے نظام بگڑتا ہے۔

میرے سامنے والے پلنگ پر ایک نیا مریض آیا ہے۔ عمر ۲۴
ہیں تو ۲۵، نکلتا ہوا قد۔ ورزشی جسم۔ گورا رنگ۔ خطرناک
طور پر بیمار ہے۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق دماغ میں غدود بڑھ
گیا ہے۔ ہندوستانی بڑی جلدی بے تکلف ہو جاتے ہیں (انگریز
برسوں میں بھی نہیں کھلتے)
اس کے باپ سے معلوم ہوا ہے کہ شادی کو ابھی چھ مہینے
ہوئے ہیں اور بیوی پیٹ سے ہے۔ بینائی تیزی سے زائل
ہو رہی ہے اور حافظے پر بھی نمایاں اثر نظر آ رہا ہے۔۔۔۔
یوں تو جینا مرنا خدا کے ہاتھ ہے لیکن ... میں کمپنڈر ... کرے
... کہ ہندوستان میں دوسرا سرجن نہیں۔۔۔ آپ کا کیا خیال
ہے۔ میں نے اس کا دل نہیں توڑا۔ ہاں میں ہاں ملا دی لیکن
میرا خیال ہے کہ اپریشن کامیاب نہیں ہو گا۔ میرے بہنوئی کا
بھی یہی خیال ہے۔ اور وہ تو ڈاکٹر ہے کوئی معمولی بات نہیں
ہوتی۔ خدا کرے ہمارا خیال غلط ثابت ہو۔

Brain Tumour۔ ہسپتال میں خوب گہما گہمی ہے۔
ہندوستان ... اپریشن ہو رہا ہے۔ اپریشن تھیٹر میں قلم
... ہیں مگر اپریشن کامیاب ہو گیا تو شہرہ ...
... سرجن ... ہو گا۔ ... کا خرچ
[illegible]

اپریشن ہو گیا ۔۔۔۔۔ کچھ نہیں نکلا۔ تھا ہی نہیں۔ کچھ
دنوں بعد دوبارہ اپریشن ہو گا۔ جوان کی بینائی بالکل جاتی رہی ہے
ایک ہاتھ اور ٹانگ بھی بیکار ہو گئے ہیں۔ اور پھر حافظہ۔ بیوی کی
آواز بھی نہیں پہچانتا۔ لیکن ڈاکٹر کا خیال ہے کہ چند دنوں بعد
یہ علامات جاتی رہیں گی۔ بیوی اور باپ کو بھی بڑی امید ہے۔
کاش انسان حقائق کو اپنی خواہشات کی نظروں سے نہ دیکھے
لیکن خود فریبی ہماری زندگی کا ایک ضروری جزو بن گئی ہے۔
اس کے بغیر جیا بھی تو نہیں جاتا۔

جوان مر گیا۔ اس کی بیوی کے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔
شاید اس کی شادی مرحوم نوجوان کے چھوٹے بھائی سے کر دی
جائے گی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی تو خراب نہیں کی جا سکتی۔
شکر ہے کہ میرا کوئی چھوٹا بھائی نہیں۔

نمبر ۱۰ کو بھی درد گردہ کی شکایت ہے۔ گردے ٹھیک کام
نہیں کرتے۔ پیلوس اور سبسٹنس ... stances ...
میں سٹون ہے۔ سرکاری مریض ہے۔ قیدی۔ اس لئے بڑی احتیاط
برتی جاتی ہے۔ سفید کپڑوں والا ایک سپاہی ہر وقت حاضر
رہتا ہے۔ بیڑیاں پلنگ کے نیچے بندھی ہوئی ہیں مقفل۔ کتنا
بھی دلیر ہو پلنگ کو اٹھا کر کہاں بھاگے گا۔ پلنگ بنانے والے
بڑے دور اندیش ہوتے ہیں۔ نرسوں کو بہت گھورتا ہے۔ دونوں
ایک دوسرے کی بولی نہیں سمجھتے۔ کاش ہمیں ایک دوسرے
کو اپنا مطلب سمجھانا آ جائے۔ لیکن شاید یہ کبھی نہیں ہو گا۔۔۔۔
آہ۔۔۔۔ یہ۔۔۔ درد۔۔۔ وہ گردہ۔۔۔۔ کوئی نرس بھی تو نظر
نہیں آ رہی۔ انجکشن کرا لیتا۔

قیدی کا اپریشن ہو گیا۔ ایک گردہ نکال دیا گیا ہے بالکل
نکما ہو گیا تھا۔ قاتل کا گردہ گوشت میں رکھا ہوا دیکھنے کے لائق
ہو گا۔ کھانے کے نہیں۔ کھاتے صرف بکرے کے گردے جاتے
ہیں گردے اور کپورے۔۔۔۔ لیکن یہ خلاف تہذیب باتیں
... ہوں۔ کھانے کی اور بات ہے ایسی باتیں لکھنے میں ... آتی
چاہئیں۔ ہو سکتا ہے یہ اوراق کسی اور کے ہاتھ لگ جائیں۔
قیدی کی بیڑیاں بدستور پلنگ کے نیچے لٹک رہی ہیں۔ ...

اور ابھی پٹیل پر بھی نہیں اُترے۔ خدا معلوم کہاں تک پہنچے ہے۔

جب سے ہوش آیا ہے کراہ رہا ہے۔ قاتل ہونے کے باوجود کراہ رہا ہے۔ لیکن قاتل بھی تو انسان ہوتے ہیں۔ صرف قتل کرتے وقت حیوان بنتے ہیں۔ اگر وکیل یہ ثابت کر دے کہ ارتکاب جرم کے وقت قاتل کے ہوش بجا نہ تھے۔ اور قتل عمداً یا ارادتاً نہیں بلکہ کسی فوری جذبے اور اشتعال کے ماتحت کیا گیا ہے تو جرم اور سزا دونوں کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ وکیلوں کی کارستانی ثبوت اور دلائل...... کراہنے کی آواز نے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا ہے اور ایسے نازک مسائل پر یکسوئی کے بغیر غور نہیں کرنا چاہیئے کراہے جاتا ہے۔ ہاؤس سرجن بھی اس سے تنگ آگیا ہے۔ سخت ناراض ہے۔ لیکن اس کی خفگی مریضوں کے انتظار سے ہیں ہے۔ کتنا خیال ہے اسے اپنے مریضوں کا۔ لیکن اس پر بھی وارڈ کے باسی اس سے خوش نہیں۔ بڑا سڑیل ہے ہر وقت تیوری چڑھی رہتی ہے۔ حکومت کا نشہ تیز ہوتا ہے۔ سر گھوم جاتے ہیں گردنیں اکڑ جاتی ہیں۔ ادھر ہی آ رہا ہے۔ نمبر ۱۰ کو خاموش کرے گا۔ رعب کا منظر رہا ہے۔ کس قدر سفلی آواز ہے۔ ۱۰ کا کراہنا بند نہیں ہوا بلکہ اور بلند ہو رہی ہے۔ پلنگ کے ساتھ لٹکتی ہوئی بوتل منہ تک بھری ہوئی ہے کراہے جاتا ہے کراہے جاتا ہے چپ ہی نہیں ہوتا۔ ہائیں جانتا...... "قیدی سمجھ کر بیٹھ لیا ہے نا" اس کی آنکھیں مندی گئی ہیں۔ بوتل سے خون چھلک رہا ہے۔ ہاؤس سرجن کے ڈانٹنے کا اثر عبرت انگیز ثابت ہوا۔ سارے وارڈ میں خاموشی چھا گئی ہے۔ کراہنے کی آوازیں گھٹ گئی ہیں۔ ہر ایک کو یہی ڈر ہے کہ کہیں اسے بھی ڈانٹ نہ لگ جائے۔ آہ یہ ڈر۔ زندگی کا ڈر۔ موت کا ڈر۔ پلنگ کے نیچے بیڑیاں گا ہے گا ہے جھنجھنا اٹھتی ہیں......

قیدی مر گیا۔ عمر قید ختم کرنے میں دو مہینے رہ گئے تھے۔ قبل از وقت رہا ہو گیا۔ بلکہ بھاگ گیا۔ لیکن پکڑا نہیں جا سکتا۔ کل میرا بھی اپریشن ہو رہا ہے۔

ابو سعید قریشی

غزل

بیتاب حصولِ غم کے لئے معلوم ہے کیوں ہو جاتا ہے؟
اس طرح تڑپتے رہنے میں کچھ دل کو سکوں ہو جاتا ہے!!

ناموسِ وفا میں اب بھی کسی کا دامن قیمت بنتا ہے
گو جو ہرِ غم آنکھوں سے ڈھلک کر اشک کا لہو ہو جاتا ہے

ہم وحشتِ دل سے در گزرے وہ عہدِ جنوں ہوش کہاں؟
اب دل پہ کچھ ایسا عالم ہے جب ہوش جنوں ہو جاتا ہے

مقسوم سہی محرومی لیکن اے تیرے کرم کی لاج رہے
اب عالمِ بیتابی میں دل کو آپ سکوں ہو جاتا ہے

کچھ تشنگیٔ دل کم نہ ہوئی اور گوہرِ غم بے آب رہا
اے دیدۂ تر یوں لٹنے سے ہر اشک کا خوں ہو جاتا ہے

احساسِ مسرت غم سے ہے جب غم ہی نہیں پھر راحت کیا
اور اک غمِ الفت سے یہاں غم اور فزوں ہو جاتا ہے

اب ضبطِ الم کی ہر کوشش اور آتشِ دل بھڑکاتی ہے
اب نالۂ دل بھی سینے میں گھٹ کر سوزِ دروں ہو جاتا ہے

ہاں چاک سہی پیراہن تا آلشِ حسن تعمیرِ شوق تو ہے
لوگ اس کو بہاراں کہتے ہیں جب مجھ کو جنوں ہو جاتا ہے

تابش

گدھے رینک رہے تھے

جب تک گھر پہ ہیں ہر قدم دھارا اور پانی میں جرم تراغ
اب موجود ہے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ انہی کی بدولت
ایک مخصوص اصول اور مختصر ماحول والے چار کے ورے مُردہ
جانوروں کی ہڈیاں بینر لاشوں کا انبار نظر آسکتا ہے جو چھوٹی
کے نواح میں مختلف جسامت والے فضلے کے پودے، کس پسند
برم عزیز گوبر کے ناہموار تودے، اتعفن نواز دو بدبو پہنچتے
ہوتے گندے جیتھڑے اور مُردہ مویشیوں کے پچھتے ہوئے
گوشت سے مہک کی پیکیں یہ خاص فضا تھی دھاپو کے باپ
کے گھر کی۔ دھاپو نے اسی خاص ماحول میں پرورش پائی تھی۔
جب گدھے رینکتے تو وہ معلوم کر لیتی کہ ایک پہر دن چڑھا ہے۔
جب رات کو گدھے رینکتے تو وہ اندازہ لگا لیتی کہ ایک پہر
رات جا چکی ہے۔ وہ نہایت ذہین تھی۔ گوبر کے اُپلے صفائی
سے بناتی کہ ان کو دیکھ کر شیرمال کا دھوکا ہوتا تھا۔ جانوروں
کی کھالیں اس عمدگی سے اُدھیڑتی تھی گویا کسی نے گاؤن جسم
سے علیحدہ کر کے ڈال دی ہے۔ ہڈیاں اس خوبی سے سمیٹی تھی
جیسے پودوں میں سے پھول جھاڑ لئے ہوں!

آج شام کو گدھے بہت زور زور سے ڈھیچوں ڈھیچوں
کر رہے تھے۔ دھاپو پر قدغن تھی کہ اپنے مخصوص ماحول سے
باہر قدم نہ رکھے لیکن نہ جانے کیوں آج اس کی سرگیں پسند
متعفن عاشق البیلی طبیعت میں گدھوں کے اس سامعہ پرور
الاپ سے رومانی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے علیحدہ
سے اپنی کونڈی کے پانی سے جس میں بہت سی "خودرو" قسم کی
ننھی مخلوق تیر رہی تھی ہاتھ دھوئے اور زیر تعمیر میونسپل مکان
کے احاطہ میں جلدی ہی آگئی۔ اسکے حوض میں صبح کے تئے پانی
بھرتا تھا۔ شفاف پانی اپنے حوض میں، اجلے مکان کیلئے۔

اندازہ مشکل ہے لیکن پاس ہی ایک گدھے نے گستاخانہ
دوسرے گدھے کی طرف قدم اٹھائے اتنے میں زور ڈھیچوں
کے بعد شام کی تاریکی جا اور میں آٹھ نا تھیں بہت قریب پہنچیں
اور کس کے ساتھ ہی [illegible] ڈھیچوں شروع
ہو گئی۔ سرسر رر رر حوض میں پانی پڑ رہا تھا۔ چونے کے سفید ٹکڑے
مردہ جانوروں کی ہڈیوں کے مانند ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ گیلی
گیلی بالو ریت میں کسی کے قدموں کے دھنسنے کی اتنی ہلکی آواز آئی
جیسے چڑیا کہیں اُڑ کر بیٹھ گئی ہو اور منشی جی کا جوان لڑکا تاتمام
مکان کے احاطہ میں چپکے سے داخل ہوا۔

گدھے رینکے جا رہے تھے۔ پاس والی گلی میں سے ایک
ذلیل سی بارات نکلی جس کے ساتھ صرف دو ڈھول اور ایک ہنڈا
تھا۔ گدھوں نے پھر رینکنا شروع کیا۔ دھاپو بالٹی رکھ کر بارات
دیکھنے لگی، ادھر اپنے اصول میں پکا منشی جی کا لڑکا جھپٹا اور
اُس نے جھٹ دھاپو کو گود میں اٹھا لیا۔

"دیکھو وہ بالٹی رکھی ہے سر پھاڑ ڈالونگی اس سے تمہارا"
مخصوص ماحول میں پلی ہوئی دھاپو نے کہا۔

"دیکھو تم میری گود میں ہو۔ چیخ کر دم نکال دونگا تمہارا"
خاص اصول کے مشاق منشی جی کے لڑکے نے کہا۔

"بابا سے کہدونگی"

"دادا کی بھی پرواہ نہیں کرتا ہوں۔"

"چیخوں؟"

"ماروں؟"

"ارے مری"

"آہا زندگی"

"کیا کروگے میرا؟"

"کھاؤنگا تجھے"

اپنے مخصوص ماحول میں پلی ہوئی دھاپو کو غصہ آنے لگا

"کھال اُدھیڑ دونگی"

"گوشت چبا جاؤنگا"

"اچھا چھوڑ دو"

"یہ لو" خرخم خرخم کی آواز آئی۔ ایک گدھے نے ایک دوسرے
گدھے کی پیٹھ پر لات کھایا۔ دوسرے گدھے نے [illegible]
سے بوسہ واپس کیا پھر دونوں مل کر رینکنے لگے۔

"بولو اب کیا کہتی ہو؟" منشی جی کے لڑکے کا ہاتھ گدھا والے کی گرفت میں پھنسا رہا تھا۔

"کاٹ کھاؤ گی؟"

"اس گدھی کی طرح؟"

"دیکھو آج تو مجھے حوض میں پانی بھرنا ہی۔ کل تم ہمارے گھر آنا" دھاپو نے وعدہ فردا کر کے منشی جی کے لڑکے کی آرزو کو اکساتے ہوئے کہا۔

اب اندھیرا چو طرف سمٹ کر دونوں کے دلوں پر چھا چکا تھا۔ گدھوں کی آوازنے اور ہر قسم کی آوازوں کو داب دیا تھا۔ احتیاط کا قانون اپنی تمام دفعات کے ساتھ خود بخود سب طرف چھا چکا تھا۔ مگر وہ ذلیل بارات ابھی اس کی دسترس سے باہر تھی۔ وہ پھر آئی اور اس کے ساتھ وہی بلکہ تنہا ہنسنا ابھی جس کے مسلسل ناخن اندھیرے میں سے موٹی موٹی چھپی ہوئی چیزوں کو کھرچ کھرچ کر روشنی میں لانے لگے اور ان موٹی موٹی اشیا میں منشی جی کا لڑکا اور دھاپو بھی اس کے ناخنوں میں لپٹ کر سامنے آپڑے۔

صبح مکان کی تعمیر شروع ہوئی اور منشی جی کے لڑکے کی مرمت۔ لیکن گدھوں سے کسی نے کچھ نہ کہا۔ جواب بھی ہر قسم کی کلیلیں کر رہے تھے اور ریکتے جا رہے تھے۔

دھاپو کے باپ کے کاندھے پر ایک موٹا سا لٹھ تھا۔ احتیاط کی دوشیزگی اگرچہ ملوث نہیں ہوئی تھی، حالانکہ اُسکے مخصوص ماحول کے سینے پر کوئی خطرناک مُکا نہیں پڑا تھا، لیکن پھر بھی وہ منشی جی کے لڑکے کی تلاش میں دانت پیستا ہوا دوڑا دوڑا پھر رہا تھا۔

جب منشی جی کا لڑکا دھاپو کے باپ کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کو پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں دو تین لڑکے پچھلی شب کے مشاعرہ کی کامیاب ترین غزل کے مطلع ؎

تم جو چھپ چھپ کر مری جاں گھر مرے آنے لگے
لوگ خطروں کی ہزاروں سمت لانے لگے

کو گنگناتے ہوئے جا رہے تھے۔

ایک لڑکے کو اس شعر پہ یہ اعتراض تھا کہ عاشق پختہ ... معلوم نہیں ہوتا ہے، متاع دل لٹا دینے کے بعد بھی وہ ... کہ ... سے ہم جانے کا عادی ہو ... ہیں پہنچانے میں ... تھا کی

... ستی تک ہو۔ منشی جی کے لڑکے نے اپنی مستعدی سے پشیمان کیا ... جو اس نے داد کے طور پر فرحت دل میں تیار کئے تھے، اُنکو زمین پر دے پٹکا۔

"دیکھ بے اب تیرے گلے کے لیں ... ہوں یا تو ... اس گھر میں رہ جوتے کا ... جانوروں کی کھال کا ... بھی بنکے رہ اور یا مرنے کے لئے تیار ہو جا۔ میں تو اپنے ... پوری کر چکا۔ پر بیٹا تو ابھی جوان ہے۔ مجھے جان پیاری ہے۔ ابھی ٹھہر تیری گردن کاٹ پھینکوں گا۔ بول کیا کہتا ہے" دھاپو کے باپ نے اپنے قوی ہاتھوں سے منشی جی کے نازک نوجوان لڑکے کا گلا دباتے ہوئے پوچھا۔ منشی جی کے لڑکے کے اصول کچھ اور ہوں گے مگر اس وقت دھاپو کا باپ اپنے مخصوص ماحول میں اپنی مختصر فضا میں اس کو گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس نے دھاپو کے باپ کی مخصوص فضا میں اپنے نا آہنگ اصولوں کا ہتھوڑا مارنے کی جرأت کی تھی۔

دھاپو چہرہ لال کر سامنے رکھتی جاتی تھی اور منشی جی کا لڑکا بڑی محنت دتندہی سے ادھوڑی کوٹنے میں مصروف تھا۔ یہ کئی دن کی بات ہے اسکے ایک میلی سی پھٹی ہوئی لنگوٹی لگی ہوئی تھی جس میں سے اس کے گھٹنے کو لہے نظر آ رہے تھے۔ سڑی ہوئی کھالوں پر مکھیوں کی طرح بھنک رہی تھی۔ وہ ... ہوکر اور ... چھوڑ رہے تھے۔ دھاپو کا باپ ... اور کمر پر ... رکھ رہا تھا اور گدھے جو بکے جا رہے تھے، ریکتے جا رہے تھے آزادی سے بلا بندش۔

قیصی رامپوری

باتوں کی کہانیاں ——— (سلسلہ [illegible])

حیات [illegible] کا عنصر ہے۔ قوت کا حصول [illegible] یہ اس کا روشن پہلو۔ اس کا دوسرا عنصر ہے حصول کے بعد اس پر [illegible] قائم [illegible] اپنی ہر قسم کی سیاسیات اور ممکنات کو پورا کرنے کے لئے ہے یہ اس کا وہ پہلو ہے جسے اپنے قائم کردار کے کارنامے تاریک کہا جاتا ہے یعنی قوت کے لئے تو پہلے دو حصول مذکورہ بالا ہیں اور خود کی معرفت یعنی بے راہروی کو سلامت روی کی ڈگر پر ڈالنے اور اس پر قائم رکھنے کے لئے ہے دوسرا اصول یعنی ایمان بالآخرۃ۔ ان دو لفظوں میں ایک دنیا کے معانی مضمر ہیں۔ انسان کی فطری خود سری اسی زبردست کرشمے [illegible] لیکن خود فریبی کی پٹی بصیرت کی آنکھوں پر باندھ کر اس بدیہی حقیقت کا انکار بے لاکھ کر لی جائے۔ اس ابلہ فریبی سے کچھ نہیں بن سکتا اور قدرت [illegible] جان جگر اس وقت آنکھیں کھول ہی دیتی ہے جب بالآخر فرعون کی طرح نیل ہلاکت میں موت اور تباہی سے سامنا ہو ہی جاتا ہے۔

علامہ سر محمد اقبال مرحوم مشرق و مغرب کے علوم، فلسفۂ مشرق و مغرب، علوم متعارفۂ یورپ اور خود یورپ والوں کی تہذیب و تمدن کا بنظر غائر مطالعہ کر چکے تھے اور یہ سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد انہیں اسلام کی زندہ اور زندگی بخش قوت کا حق الیقین ہو چکا تھا۔ یہ مقام محمود انہیں جب حاصل ہوا جب [illegible] بعد آپ یورپ سے [illegible] جرمنی کی ایک مثل ہے کہ برتن میں جو کچھ ہوتا ہے وہی اس سے ٹپکتا ہے۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ علامہ مرحوم کوئی سی بات کہہ سکتے تھے جو ان کے دل کی آواز نہ ہوتی۔ ایک اور عرض بھی سن لیجئے جب آپ پہنچتے تھے غالباً آپ اپنے گھر [illegible] بنا ڈالیں بیٹھتے تھے۔ جوں جوں آپ کی وسعت معلومات بڑھتی گئی، شہر سے ضلع، ضلع سے صوبہ، تا آنکہ سیاسیات ہند [illegible] آپ نے تمام ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنا شروع کر دیا لیکن اس حقیقت سے جس کا اظہار بھی قرآن حکیم نے کیا ہے: وفوق کل ذی علم علیم: علم کی انتہا نہیں۔ ایک سے ایک کا علم بڑھ کر سکتا ہے۔ وہ شخص جس نے اسلام کی عالمگیر روح حیات کو پا لیا ہو وہ یقیناً ایسی وطنیت کو جس کا موجد یورپ ہے اور جس کے بد نتائج کا آج [illegible] کو بھگتنا پڑ رہا ہے کم از کم غلط فہمی پر محمول کرے گا اور بے ساختہ بول اٹھے گا: مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اسلام اور انسانیت حقیقت میں دو مترادف لفظ ہیں۔ اور انسانیت ایک عالمگیر حقیقت ہے اسی لئے اسلام کا خدا رب العالمین ([illegible]) ہے [illegible] اسلام کا آخر الزمان رسول امی (فداہ امی و ابی) رحمۃ للعالمین ([illegible] Mercy) [illegible] اور مسلک حیات بھی ہے بر سنۃ اللہ ([illegible]) جس کے متعلق قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ [illegible] اسی عالمگیر اساس پر علامہ مرحوم کی یورپ سے مراجعت کے بعد کی شاعری کی [illegible] اور وطن [illegible] تعمیر کی گئی ہے۔ اب اگر علامہ اقبال ایسی وسعت نظر رکھنے والا وطن پرست [illegible] عالمگیر ماہیت سے نا آشنا شخص اعتراض کرتے تو اس کا اعتراض کیونکر [illegible] کیا جا سکے؟

نوٹ۔ دین اسلام کے متعلق بھی غیر مسلم اصحاب کو اکثر مغالطہ ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ کو کچھ یہاں عرض کئے دیتا ہوں۔ مذہب اسلام، اسلام اللہ [illegible] کی رو سے [illegible] آدم سے دنیا میں آیا ہے۔ [illegible] اس کی دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ قرآن حکیم میں [illegible] کے بعد کہ جنت میں سوائے یہود کے اور کوئی قوم بھی داخل ہونے کی مجاز نہیں لہٰذا اسلام صاف الفاظ میں فرماتا ہے: تلک امانیہم قل ہاتوا برہانکم ان کنتم صادقین۔ بلیٰ من اسلم وجہہ للہ وہو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔ سورہ بقرہ۔ ترجمہ: یہ ان کے [illegible] کے خیالی پلاؤ ہیں۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کہ اگر سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔ بلکہ واقعی بات تو یہ ہے کہ جس نے خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور وہ نیکوکار بھی ہے تو ایسے کے لئے اس کا اجر اس کے پروردگار کے ہاں موجود ہے۔ اور آخرت میں ایسے لوگوں پر نہ کسی قسم کا خوف طاری ہو گا نہ وہ کسی طرح سے آزردہ خاطر ہوں گے۔ (ترجمہ از مولانا حافظ نذیر احمد دہلوی مرحوم) اس آیہ کریمہ سے اسلام کی وسیع المشربی واضح ہو جاتی ہے۔ اسلام [illegible] اور اسلام میں کوئی چیز نہیں۔

[illegible] علامہ مرحوم کی کتابوں کے مطالعے سے [illegible] اپنے ایک شعر میں یوں عرض کیا ہے [illegible]

[illegible]

محمودی" کو کہتے ہیں دل کے جذبات بہتریں کی آتیں ناشر   غرور کا اس مقام محمود ہر جگہ میں گذر کہاں ہے!

علامہ مرحوم کی شاعری پر خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ ایسے نقاد کی رائے جو انہوں نے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے اقبال نمبر میں اپنے بہت ہی بصیرت افروز اور جامع مضمون "رومی نطشے اور اقبال" میں اظہار فرمائی ہے۔ بہ اظہار امتنان و تشکر یہاں نقل کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ آپ صفحہ ۲۸۰ پر فرماتے ہیں:-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ آخر میں ایک مفکر شاعر اور مبلغ شاعر کا رنگ اقبال میں نظر آتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کی شاعری میں جو جز نبوت کا ہوتا ہے وہ اقبال کی شاعری کے آخری دور میں بہت نمایاں ہو گیا۔"

اور غضب تو یہ ہے کہ اسی دور کی شاعری کہ نظروں کی نگاہوں میں کھٹک رہی ہے۔ اور "علاماتی یا اشاریاتی" قسم کے شاعر جو شاعری کا تمام رنگ و تراشیں نقابِ معانی ہی پر کرتے ہوئے ایک کو اصلی اور دوسری کو نقلی یا "جاپانی" کہہ کر ہی خوش ہوتے ہیں اُن سے التماس ہے کہ غلط اثر پیدا کیجیے۔ اور شاعری کی تقسیم معانی کے لحاظ سے کیجیے۔ معانی کے لحاظ سے ایک کا نام ہے حقیقی شاعری جو تلامیذ الرحمٰن کی ہوتی ہے دوسری شاعری تلامیذ الشیطان کی ہوتی ہے۔ جسے کہتے ہیں شیطان۔ یقین نہ آئے تو سورۂ شعرا ملاحظہ فرما لیجیے گا۔ ع:-

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

امینِ حزیں سیالکوٹی

عظیم بیگ چغتائی

خانم قیمت
کولتار
چکی
روح ظرافت
ابو محمود
پھریری
چغتائی کے افسانے
دیباچہ
دیکھا جائیگا
مسز کرشلے
روح لطافت
کمزوری
شہزوری
فل بوٹ
شریر بیوی
سوانح کی روحیں
مرزا جنگی
کھیل اور کھیلے
لفٹنٹ
ٹمر یا بہادر
چینی کی انگوٹھی
قرض
فرزند سرحد
قدر دان
تقویض
قرآن اور پردہ
حدیث اور پردہ
وضع مسرور
مضامین چغتائی

ایم۔ اسلم

نرگس قیمت
گنہگار
رقاصہ
طلسم سامری

بہزاد لکھنوی

نغمۂ نور قیمت
کیف و سرور
صبح ظہور
چراغ طور

مولانا عنایت اللہ

نجم السحر قیمت
سلامبو
ہیملٹ
ہردو پاس
العلوفی کلا بطرہ
عورت کا جہنم
خواب پریشان

مشہور مصنفین

دھواں قیمت
جنازے
کلیاں
منڈی
کہکشاں
ایشیا کے فیصلہ کن
اتاترک
دوسری جنگ عظیم

سنہ گوپال قیمت
نرگس محل
سرگذشت عروس
پروین و ثریا
فاؤسٹ
چندرا موہنی
نجمہ نوری
سلمیٰ
ریڈیو ڈرامے
تعلیم دہ بیوی
محبت و نفرت
لال قلعہ کی ایک جھلک
سلطنت مغلیہ کا آخری دیدار
اخوان الشیاطین
ید قدرت
چار چاند
نغمات موت
ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش
لالہ رخ
ریزۂ مینا
سات تارے
سوویٹ ریل
روح سیاست
انقلاب شکستہ کا دوسرا رخ
فرانسیسی افسانے
مسلمانوں کی حیات سیاسی
شعلے
ادب نذرانے
بیڈنگ

سب کاموں کی کامیابی

[illegible]

چند سرٹیفکیٹس

(۱) عبداللطیف صاحب ملڑی کنسٹرکیٹر ... [illegible] ... عامل صاحب کی عنایت ہے ... گمشدہ لڑکا ... گھر واپس آگیا۔

(۲) ... صاحب ... سے عمل سے میری ... [illegible]

(۳) ... صاحب ... عامل صاحب کے عمل سے حسب منشا بحالی ہو گئی۔

(۵) غلام حیدر صاحب ... بجنور ... عامل صاحب کے عمل سے میری دکان ... چل پڑی۔

[illegible]

عامل شاہ صاحب پوسٹ بکس نمبر 233 لاہور

مفت

[illegible]

الائیڈ ٹریڈرز بکس نمبر ۲۶۱ لاہور

سفید داغ برص پھلبہری کا مجرب علاج

[illegible]

قیمت فی شیشی صرف پانچ روپیہ

صرف سات روز میں مکمل آرام

[illegible] قیمت صرف دو روپیہ۔

سفید بالوں سے نجات ہتھیلی پر سرسوں

[illegible]

علاوہ محصول ڈاک بارہ آنہ۔

میلکوکونین

[illegible]

خوبصورتی آپ کا پیدائشی حق ہے

[illegible]

قیمت ... روپیہ۔

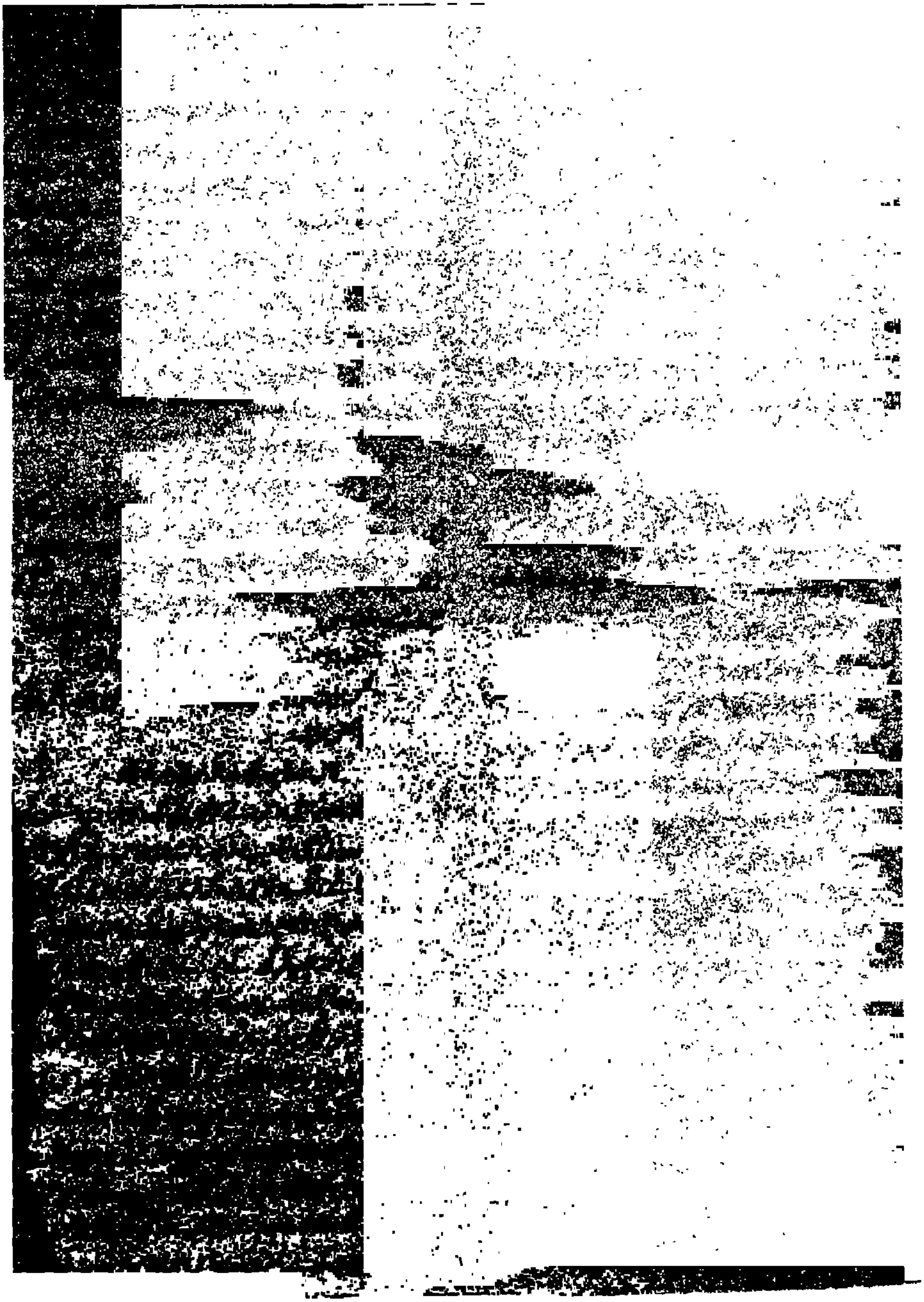
شرطیہ تریاق

[illegible]

آنکھیں

[illegible]

[illegible] (ایس پی) پوسٹ بکس نمبر [illegible]



"پھر اگر ایک چھوٹے بچے کے پاس بھی چار پیسے ہوتے تو کوئی اس کے منہ سے اب رزق بنکال لینے کی جرات نہیں کر سکتا لیکن مفلس ماں تو اس کو دودھ تک نہیں پلا سکتا۔ آخر بیت الشل کیوں نہ بچہ بہ حاجت منہ لگائے گی؟"

میں تعجب سے فراز کی طرف جس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا دیکھ رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"اب بولتے کیوں نہیں، بتلاتے کیوں نہیں کہ ایک بچہ ایک مدت تک ماں کے پیٹ میں رہ کر جب دنیا میں آتا ہے تو اس ننھی سی معصوم جان کا کیا قصور کہ اس کی پیشانی پر ناداری اور غربت کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ جس کی قسمت میں ہر چیز کے لئے ترسنا لکھ دیا جاتا۔ اب اگر یہی بچہ بعد ان بڑے ہوکر، جوان ہوکر خواہ کسی طرح سے اپنی قسمت کو پلٹ دے اور ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنے لگے تو کیا حق ہے تمہارے خدا کو کہ اس کے اس بہادرانہ فعل اس مجاہانہ عمل کو گناہ قرار دے کر مجرم گردانے۔ تو جناب! اگر آپ اور آپ کا خدا مجھے اس لئے گنہ گار سمجھتا ہے کہ میں نے ناجائز وسائل سے دولت پیدا کی تو پھر آپ ہی کے خدا کی قسم! میں آج بھی گنہگار ہوں اور کل بھی اور اگر قسمت میں ہے تو گنہگار ہی مروں گا۔ آپ بھی مجھے گنہگار سمجھ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیجئے۔"

شام ہو چکی تھی اور کہیں دور سے موذن کی آواز اللہ اکبر فضا میں گونج رہی تھی۔

فراز ہنسکر بولا۔ "جاؤ! تمہارا خدا تمہیں بلا رہا ہے۔"

"اور تم؟" میں نے ہنسکر پوچھا۔

"میں تو ذرا ریڈیو سنوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے جو سوئچ کھولا تو اس وقت لاہور ریڈیو اسٹیشن سے یہ آواز آئی۔ ۔ ۔

دھن والوں کی دنیا ہے یہ
نردھن کے بھگوان!

ایم اسلم

پھولوں کی مالا

یُنہیں کھیلتے کھیلتے توڑ ڈالا
کھلونا تھا اُن کا مرے دل کا کام

یہ کیا جانتا تھا بچاری کہ اک دن
وہی آپ ڈھا دیں گے اپنا رشتہ

ابھی یاد ہے دل کو وہ پیار اُن کا
کہ ایک ایک پتی تھی پھولوں کی

اُن آنکھوں میں ہر دم چھلکتی تھی چاہت
سمانا تھا دل میں دل کا اُچھالا

کہیں دل بھی ٹوٹا ہوا جڑ سکا ہے
اُسے چھیڑتے ہیں جسے مار ڈالا

وہ ہنس ہنس کے آنسو مرے پونچھتے ہیں
رلانے کا بھی ڈھنگ ہے کیا نرالا

سہارا نہ دینا تھا گرتے ہوئے کو
ہے اک موت بیمار کو اک سنبھالا

وہ پھر پوچھ کے اور چھیڑ کے لگاتے ہیں
ابھی دل کا بہلا ہی گھاؤ ہے آلا

انہیں ہر گھڑی دھیان رہتا ہے میرا
اُچھالا ڈبویا ڈبویا اُچھالا

کوئی ڈھب ہو جینے کا جیتے ہیں جب تک
بھلایا نہ جائے گا یاد آنے والا

دلاسا نہ دینا تھا اُس دل کو
چھُری گھونپ دی اور کانٹا نکالا

نہ جانے کوئی روگ ہے یہ کہ جیسا
دھڑکتا ہے دل یا چمکتا ہے چھالا

اُلجھتی ہے رہ رہ کے ہر سانس کی تب
اُترتا ہے جیسے گلے میں بھالا

رُباعیاتِ جوشؔ

قدِ موزوں

تابش سے فضا دمک رہی ہے گویا — ہیرے یہ کرن جھلک رہی ہے گویا
یہ قد کی بلندی یہ دمکتا مکھڑا — نیزے پہ انی چمک رہی ہے گویا

جنّتِ کشمیر

ممنوعِ طرب سے لطفِ پیہم لینے — عصیاں کو شجر کی چھاؤں میں دم لینے
آواز دو کاشمیر آپہونچا جوشؔ — اللہ سے انتقامِ آدم لینے

درسِ عمل

اے نوعِ بشر عقدہ کشائے فردا — اے مشعلِ محراب سرائے فردا
مردانہ قدم بڑھا سوئے اوجِ کمال — اے بندۂ امروز و خدائے فردا

جوشؔ ملیح آبادی

دیوانگی

انسان اپنے تمام ظاہری اور باطنی اثرات اور محسوسات کو حواس کے ذریعے سے محسوس کرتا ہے، یعنی اس کے گرد و پیش کی موجودات اور واقعات، ان کی ماہیت و حقیقت، بلکہ خود اپنی ہستی اور اپنے اثرات، اپنی قوتوں اور طاقتوں کے احساس کو بھی حواس خمسہ کے ذریعے ہی معلوم کیا جاتا ہے، بغیر حواس کے انسان کو کسی بات کا علم نہیں ہوتا۔ اگر حواس کلیتہً زائل ہو جائیں تو انسانی زندگی محال ہو جائے، چنانچہ منشیات یا سخت چوٹ لگنے سے بے ہوشی واقع ہوتی ہے تو حواس عارضی طور پر معطل ہو جاتے ہیں، اور اس وقت انسان پر کسی تاثر یا تحریک کا اثر نہیں ہوتا، بے ہوش آدمی بے خبر پڑا رہتا ہے اور اس کو نہ صرف اپنے [illegible] سے اپنی قسمت کو پلٹ دے [illegible]، اسی وجہ سے تکلیف دہ [illegible] آپریشن مریض کو بے ہوش کر کے عمل میں لائے جاتے ہیں اور اس وقت وہ اس تکلیف سے دوگنی تگنی تکلیف بلا کسی احساس کے برداشت کر لیتا ہے جو ہوش کی حالت میں اس کی قوت برداشت سے باہر ہوتی ہے لیکن حواس کا تعلق انسان کے دماغ سے ہے اور دماغ ہی عقل پر موثر ہے، دراصل دماغ ہی وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے، چنانچہ وہ لوگ جن کا دماغ اچھا ہوتا ہے دنیا میں بہت بڑے اور کامیاب آدمی بن جاتے ہیں۔ اور جن کا دماغ خراب ہوتا ہے وہ دنیا میں کسی کام کے نہیں ہوتے ______ دماغ کے اچھے یا برے ہونے میں خود دماغ کے وزن کا بھی بڑا دخل ہے ماہرین طب کا کہنا ہے کہ ایک اچھے اور تندرست آدمی کا دماغ جوانی کے زمانے میں ۴۸ اونس کے قریب ہونا چاہیئے۔ وہ لوگ جو پیدائشی پاگل یا دیوانے ہوتے ہیں ان کے دماغ کا وزن ۱۶ اونس اور بعض وقت اس سے بھی کم ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ نوزائیدہ بچوں کا دماغ ۱۰ سے ۱۴ اونس تک ہوتا ہے۔ عمر اور دوسرے جسمانی اعضا کی نشوونما کے ساتھ ساتھ دماغ بھی بڑھتا جاتا ہے، چنانچہ سات برس میں دماغ کا اوسط ۴۰ اور چودہ سال میں ۴۸ اونس تک پہنچ جاتا ہے چالیس سال کے بعد جس طرح انسان کے دوسرے اعضا میں انحطاط شروع ہوتا ہے اسی طرح دماغ کے وزن میں بھی ہر دسویں سال ایک اونس کی کمی ہونے لگتی ہے۔ عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے ہر حالت اور ہر عمر میں چھوٹا ہوتا ہے اور جوانی میں اس کا وزن مردانہ دماغ کے مقابلے میں ۵ اونس کم ہوتا ہے۔ غالباً اسی بنیاد پر عورت کو مردوں کے مقابلے میں کم عقل سمجھا گیا، اور اسی کلیہ سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کیوں ایک بچہ بہ نسبت جوان آدمی کے کم عقل رکھتا ہے، اور یہ مقولہ کہ بڑھاپے میں دماغ سٹھیا جاتا ہے، کس حد تک ٹھیک ہے، لیکن یہاں ایک بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ ہم انسانوں سے بحث کر رہے ہیں، اور ان میں مستثنیات پائے جا سکتے ہیں، لیکن اس سے عام اصولوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور ایسی خاص صورتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

عام طور پر انسانوں میں تین قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں۔ ایک
سمجھو، دل سی توڑا ہوا ابھر سکتا ہے
اچھے دماغ والے، دوسرے اوسط درجے کے اور تیسرے خراب دماغ والے۔ ان میں سے درمیانی قسم کے لوگوں کی تعداد بہت ہوتی ہے۔ اور پہلے اور تیسرے لوگوں کی تعداد بہت کم۔ یہاں ایک بات کا خیال رکھنا اور ضروری ہے کہ تعلیم، علم، واقفیت اور ماحول سے دماغ میں ایک قسم کی جلا پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ کام کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے اکثر ملکوں کے لوگوں کی دماغی صلاحیت کا معیار ہندوستانیوں سے اونچا ہے، یا ہندوستان کے شہری بہ نسبت دیہاتیوں کے اچھے دماغ رکھتے ہیں۔ یا متمدن اور تعلیم یافتہ قوموں کے مقابلے میں غیر متمدن اور وحشی اقوام کے دماغ کمتر ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ جن کے دماغ دوسرے ملکوں یا قوموں کے دماغ سے کمتر ہیں، ان میں ترقی کی صلاحیت ہی نہیں۔ آج سے سو سال پہلے جاپان ایک بہت ہی معمولی قوم تھی، لیکن آج وہ کس طرح یورپ کی کسی متمدن قوم سے پیچھے نہیں، وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان میں ہر قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں البتہ ان سے کام نہیں لیا گیا تھا جب ان میں جلا پیدا کر کے ان سے کام لیا گیا تو یہ فرق دور ہو گیا دراصل یہ ماحول ہے جو ہم میں فردوسی و شیکسپیئر، رستم و سہراب، اکبر و شیر شاہ، بو علی سینا و لقمان، [illegible] اور ہٹلر و چرچل پیدا کرتا ہے۔ ورنہ ہماری سوسائٹی میں ایسے بہت سے افراد ہیں جو ان لوگوں سے زیادہ دماغی قابلیت اور صلاحیت رکھتے ہیں، مگر ان کی یہ صلاحیتیں

...گرسنا یا بہت کمی یعنی کو صحیح کام نہیں ملتا۔ اس لئے وہ کو بہرے کی قیمت کا ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اس چیز کی وضاحت کے بمندرجہ بالا قسمیں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ہر سوسائٹی میں آج کل رائج معیار کے مطابق تین قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں۔ ایک اچھے دماغ والے دوسرے معمولی اور تیسرے خراب دماغ والے۔ اور اسی خرالذکر درجے میں وہ لوگ شامل ہیں جن کو ہم پاگل، مجنون، دیوانے یا فاتر العقل وغیرہ کہتے ہیں۔ ان کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ پہلے وہ جو فطری طور پر دیوانے پیدا ہوئے ہوں اور جن کی عام حالات میں اصلاح نا ممکن ہو۔ غالباً ماہرین طب اس درجے میں ان لوگوں کو شامل کریں گے جن کا دماغ پیدائشی طور پر چھوٹا ہو یا اس پر کوئی پردہ اور جھلی ایسی ہو جس سے وہ اپنی مقررہ صلاحیتوں کو انجام نہ دے سکے، دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جن کے دماغ پہلے اچھے تھے مگر بعد میں خراب ہو گئے۔ جس کے حسب ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:۔

(۱) کسی بیماری یا عارضہ کی وجہ سے دماغ کا خراب ہو جانا، مثلاً جب انسان کے دماغ پر فالج گر جاتا ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے، اور اگر دماغ بالکل ہی مفلوج ہو جائے تو ہلاکت واقع ہو جاتی ہے۔

(۲) کسی خاص صدمہ سے دماغ کا بیکار ہو جانا۔ مثلاً محترمہ ... کا دماغ اس لئے خراب ہو گیا کہ پہلے اُن کے شوہر کا انتقال ہوا، اس کے کچھ دنوں بعد ان کی اکلوتی بیٹی مر گئی۔ اور اس کے تیسرے روز اُن کے نواسے کا انتقال ہو گیا۔ یہ متواتر صدمے ان کا کمزور دماغ برداشت نہ کر سکا اور وہ دیوانی ہو گئیں۔ مالی صدمے سے بھی اس ذیل میں آجاتے ہیں۔ بہت سے کاروباری آدمی جب اپنے کاروبار میں دیوالیہ ہو جاتے ہیں تو اُن کا دماغ چل جاتا ہے۔ چوٹ یا حادثوں کے مریض بھی اسی ذیل میں آسکتے ہیں۔

(۳) کسی خاص خوشی سے بھی دماغ پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک مسمی کلو چمار کو ایک دم یہ اطلاع ملی کہ اس کو کسی لاٹری سے ایک لاکھ انعام ملا ہے تو اس کا دماغ خراب ہو گیا اور وہ ہر وقت ایک لاکھ ایک لاکھ چلایا کرتا تھا، اور باوجود علاج کے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مگر ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ورنہ خوشی میں آدمی شادی مرگ ہو جاتا ہے مگر دیوانہ کم ہوتا ہے۔

(۴) کسی خاص تعجب کا بھی بعض وقت دماغ پر اثر پڑتا ہے۔ ... کی محترمہ والدہ راجپوتانہ کے کسی حصہ میں سفر کر رہی تھیں، انہوں نے وہاں اونٹوں کی ایک قطار کو گزرتے ہوئے دیکھا، جس پر تمباکو کے بڑے بڑے گٹھے لدے ہوئے تھے۔ انہوں نے حیرت سے کہا: "ارے اتنی مسواکیں!" اس کے بعد سے ان کا دماغ چل گیا۔ بہت کچھ علاج کیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اتفاق سے دہلی کے ایک نامور طبیب کو انہیں دیکھنے کا موقع ملا، انہوں نے پوچھا کہ وہ کون سا حادثہ تھا جس سے ان کا دماغ متاثر ہوا۔ اب کسی کو خیال بھی نہ تھا، کسی نے کچھ بتایا اور کسی نے کچھ، اتفاق سے ان کے کسی عزیز نے اس ذیل میں اونٹوں کا واقعہ بھی سنایا۔ چنانچہ حکیم صاحب نے کہا: "بس اب یہ اچھی ہو جائیں گی۔" چنانچہ انہوں نے چیخ کر کہا: "وہ سب مسواکیں جل گئیں۔" مریضہ نے بھی یہ بات سنی اور پوچھا: "کونسی؟" انہوں نے جواب دیا: "ارے وہ اتنی مسواکیں جو اونٹوں پر لدی ہوئی تھیں۔" مریضہ نے کہا: "سب جل گئیں؟" حکیم صاحب نے اثبات میں جواب دیا۔ تو مریضہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد اُن کا دماغ آہستہ آہستہ کام کرنے لگا، اگرچہ وہ اگلی سی بات حاصل نہیں ہوئی مگر ان میں دیوانگی کے آثار بالکل باقی نہ رہے۔

(۵) بعض لوگوں کا دماغ عام حالات میں بالکل اچھا ہوتا ہے مگر خاص خاص چیزوں میں ان کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے، مثلاً بعض لوگ کسی خاص تذکرے کو سنتے ہی دیوانگی کی حرکات شروع کر دیتے ہیں۔ بعضوں پر کسی خاص چیز کے دیکھنے یا کسی خاص شخص کے سامنے آنے سے جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس تذکرے کے ختم ہوتے ہی یا اس چیز اور شخص کے سامنے سے ہٹتے ہی یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ وہ مخصوص کیفیات یا تاثرات ہوتے ہیں جو ایامِ گذشتہ میں انکو کسی خاص خوا بات یا فرد سے پیش آئے ہوں اور جن سے انکو روحانی اذیت اور دماغی شکایت پہنچی ہو اور ان نظاروں سے وہ احساسات تازہ ہو جاتے ہیں اس لئے وہ ایسی حرکات کرنے لگتے ہیں۔

(۶) بعض لوگوں پر خاص موسموں اور خاص اوقات میں جنونی کیفیت طاری ہوتی ہے، مثلاً مشرقی شعرا کی خیالی دنیا میں جنونی کیفیت اور چاک گریبانی کا زمانہ موسم بہار ہوتا ہے۔ یہ تخیل محض خیالی نہیں ہے، بلکہ اکثر دیوانوں کی وحشت بہار میں اپنا زور دکھاتی ہے۔ بعض مجنونوں کو گرمی کے موسم میں جنون کے دورے زیادہ سخت پڑتے ہیں، یا عام طور پر چاندنی راتوں کا اثر جنون کے اثرات میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس زمانے یا وقت میں انسان کے خون کی حدت بڑھ جاتی ہے اور اس کی مجنونانہ حرکات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۷) کسی خاص چیز کی دُھن بھی دراصل ایک قسم کا جنون ہے۔

چنانچہ دنیا کے اکثر بڑے بڑے فلسفی، سائنسداں اور موجدوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بڑی پریشانی کی حالت میں رہتے ہیں، نہ ان کو اپنے کھانے کا ہوش ہوتا ہے اور نہ پینے کا، نہ لباس کا خیال ہوتا ہے اور نہ آرائش کا۔ بال بکھرے ہوتے ہیں، ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہے، ناخن غیر تراشیدہ ہیں، ان کے پاس سوائے اپنے خاص مشغلے کے گفتگو کا اور کوئی موضوع ہی نہیں اور دنیا کے بڑے سے بڑے حادثہ سے ذرہ برابر متاثر نہیں ہوتے، اسی دھن میں بعض لوگ اپنے دماغی توازن کو خراب کر لیتے ہیں۔

(۸) اکثر مذہبی ریاضت اور عبادت کرنے والے بھی اپنے دماغی ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں، اور ان کو اصطلاح میں مجذوب یا سالک کہا جاتا ہے۔ منصور نے اسی حالت میں خدائی کا دعویٰ کیا اور دار پر کھینچا گیا۔ ان کے یہاں آخری درجہ ریاضت کا وہ ہے جہاں "من و تو" کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ مگر یہ چیز بڑی محنت اور ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے اور اکثر اسی دھن میں اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں، نیز فقراء کے یہاں یہ بھی دستور ہے کہ نئے لوگوں کو ایک دم تعلیم نہیں دی جاتی، بلکہ برسوں ان سے محنت ریاضت اور مجاہدے کرائے جاتے ہیں، اور اس کے بعد کچھ دیا جاتا ہے، فقراء کے تذکروں اور کتابوں میں جابجا ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اگر کسی صاحب کمال نے اپنے کسی نئے مرید کو خوش ہو کر فوراً سب کچھ دے دیا تو یا تو وہ مر گیا یا اس کا دماغ خراب ہو گیا۔

(۹) بعض وقت معمولی معمولی پریشانیاں بھی انسان کا دماغ ماؤف کر دیتی ہیں۔ خانگی، خاندانی اور مالی تفکرات، ازدواجی تلخیاں بھی دماغ پر اثر ڈالتی ہیں۔ جس طرح انسان کے دوسرے اعضا کو آرام کی ضرورت ہے اسی طرح دماغ کو بھی سکون کی ضرورت ہے اور یہ سکون نیند سے حاصل ہوتا ہے، چنانچہ ماہرین طب نے طبعی نیند کی تعریف یہ کی ہے کہ جس میں آدمی آرام و سکون سے سوئے اور کوئی خواب نہ دیکھے، کیونکہ خواب دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دماغ کے کچھ حصے بیدار ہیں اور وہ اپنے افعال میں مصروف ہیں، اور دماغ کو سکون نہیں مل رہا۔ مسلسل دماغی الجھنوں اور پریشانیوں سے سستی، کاہلی، درد سر، ضعف دماغ اور کم خوابی کی شکایت پیدا ہوتی ہے، مگر متواتر بے خوابی سے جنون اور دیوانگی کے اثرات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ خراب نیند میں جب دماغ کام کرتا رہتا ہے تو نہ صرف طرح طرح کے خواب نظر آتے ہیں بلکہ بعض وقت سام نمبولزم (خواب میں چلنا) کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے جس میں سوتا ہوا انسان چلتا پھرتا ہے بلکہ کبھی کبھی اپنے دوسرے مشق کئے ہوئے کام مثلاً لکھنا پڑھنا، باجہ بجانا، ٹائپ کرنا، دخل بھی کرتا ہے، اور جب حالت بیداری [illegible] کا اظہار کرتا ہے اور دراصل اس کو ان چیزوں کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ اس کا پورا دماغ بیدار نہیں ہوتا بلکہ اس کے کچھ حصے بیدار ہوتے ہیں۔

اب تک ہم نے جن لوگوں کا تذکرہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جن کے دماغ یا تو فطری طور پر عام انسانی دماغوں سے کمتر ہیں یا کسی سبب کی بنا پر کمزور ہو گئے ہیں، اس لئے وہ ایسی حرکات یا گفتگو کرتے ہیں جو عام انسانی معیار سے کم ہوتی ہے یا اس میں بعض خامیاں پائی جاتی ہیں، اور ان لوگوں کو ہم پاگل کہتے ہیں، ان میں سے بعض لوگ قابل اصلاح ہوتے ہیں اور اگر معقول طریقہ پر ان کا علاج معالجہ کیا جائے اور خور و پرداخت کی جانب خاص توجہ کی جائے تو وہ درست ہو سکتے ہیں۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا علاج ناممکن ہے، مگر دنیا میں مجموعی حیثیت سے ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں، لیکن دنیا میں پاگلوں کی صرف یہی قسمیں نہیں ہیں بلکہ ایک اور قسم بھی ہے اور یہ بہت ہی اہم ہے یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو عام انسانی سطح سے آگے ہیں اور جس طرح سطح سے کمتر لوگوں کی گفتگو غیر مربوط اور بے تکی ہوتی ہے اسی طرح ان لوگوں کی گفتگو اور باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں اور چونکہ یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اس لئے ہم ان کو جلدی سے پاگل کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد ملتی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت نہ تو سائنس نے اتنی ترقی کی تھی اور نہ لوگ اپنے قدیم عقائد کے خلاف کوئی نئی بات سننا چاہتے تھے اس لئے جب کسی نے کوئی نیا انکشاف کیا یا کوئی نئی حقیقت دریافت کی تو اس کو پاگل قرار دیا گیا۔ جب گلیلیو نے اپنی دوربین کی مدد سے سیاروں کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ قائم کیا کہ زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے تو عوام نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس کو پاگل قرار دیا۔ پادریوں اور مذہبی رہنماؤں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت ہی برہم ہوئے اور انہوں نے [illegible] سے جواب طلب کیا کہ وہ مذہبی تعلیمات کے خلاف ایک [illegible] بات کہنے کی جرأت کس طرح کر رہا ہے، اور وہ اس کو اس [illegible] کی سزا دینا چاہتے تھے۔ لیکن لوگوں کے کہنے سننے پر وہ [illegible] تیار ہو گئے کہ اگر یہ اپنے عقائد سے توبہ کر لے اور اپنے مشاہدے کے آلات توڑ دے تو اس کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ یہاں [illegible] ہے، لہٰذا اس نے اپنے قول کی تردید کی، اپنے [illegible]

[illegible] وقت ابد
[illegible] اس پر اعتقاد رکھتی ہے اسی
صاحب [illegible] ارتقاء کا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا
[illegible] نے اس کو مجنون کہا۔ اور کسی نے اس کی بات پر دھیان نہیں
[illegible] مگر وہ بد دل نہ ہوا اور اپنے خیالات کو طبع کر کے دنیا میں چھوڑ گیا۔
[illegible] لوگوں نے اس کی کتابیں پڑھیں اور اس کے خیالات پر غور
[illegible] اور آج اس کو علم فلسفہ کی صف اول میں جگہ حاصل ہے، اور
[illegible] جیسے ملک کا نظام اسی نظریہ پر کام کر رہا ہے۔

بعض وقت ہمارے ان ہی غلط تخیل کی بنیادوں پر بہت [illegible] نظریوں، ایجادوں اور اسکیموں کا سہرا ان کے حقیقی وضع کنندوں [illegible] موجدوں کے علاوہ دوسروں کو مل جاتا ہے، مثلاً آج ڈاروِن کا [illegible] ارتقاء بہت مشہور ہے۔ لیکن در اصل یہ ڈاروِن کی تحقیق نہیں [illegible] بلکہ اس سے پہلے کسی شخص نے اس اصول کو دریافت کیا، مگر [illegible] نے اس کو پاگل بتایا اور وہ غریب ڈر کے مارے خاموش ہو گیا [illegible] ڈارون کو اس کا علم ہوا تو وہ اس کے پیچھے پڑ گیا اور مزید تحقیقات [illegible] اس نے جانچ پڑتال کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور باوجود اس کے آج تک انسان اور بندر کے درمیان کی گمشدہ کڑی دستیاب نہیں [illegible] دنیا اس نظریہ پر یقین رکھتی ہے اور اس تحقیق کا سہرا ڈارون [illegible] سر باندھتی ہے۔ لیکن در اصل یہ خیال کس کے دماغ کی پیداوار تھا [illegible] کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ آج دنیا میں نوٹوں کو جو مقبولیت حاصل [illegible] وہ سب پر ظاہر ہے، اس کا ایک بڑا بدیہی فائدہ یہ ہے کہ اس سے [illegible] دھاتوں کی بچت ہو جاتی ہے۔ نوٹوں کی جو تاریخ بیان کی جاتی [illegible] اس میں بینک آف سویڈن کا ذکر ضرور آتا ہے کہ اس نے سب [illegible] نوٹ جاری کئے، اور اس کے بعد دوسرے ملکوں اور بینکوں کا [illegible] ہوتا ہے، مگر اس ذیل میں محمد تغلق کا نام کہیں نہیں لیا جاتا کہ اس [illegible] بھی چاندی کے بجائے تانبے کا سکہ چلایا تھا، ہندوستانی تاریخ [illegible] یہ غریب بادشاہ تو بہت ہی بدنام ہے، اور اس کو اس کے زمانہ [illegible] بلکہ بہت دیر تک پاگل ہی سمجھا جاتا رہا، تو اب کچھ مورخین اس کی [illegible] سراہنا کرتے نظر آتے ہیں۔ اور انہوں نے ثابت کیا [illegible] کہ اس کی کوئی [illegible] ہی نہ تھی بلکہ وہ بہت

مناسب اور ٹھیک تھی، البتہ اس میں بعض کوتاہیاں رہ گئی تھیں مگر کوتاہیاں اور خامیاں اکثر رہ جاتی ہیں۔ نپولین کو روس کے حملہ میں باوجود کامیابی کے جو ناکامی ہوئی اور جو نقصان اٹھانا پڑے وہ سب جانتے ہیں۔ مگر اس بنا پر نپولین کو کوئی پاگل نہیں کہتا بلکہ اس کا شمار دنیا کے بہترین جنرلوں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سب نقصان اس کو اپنی خامیوں کی وجہ سے اٹھانا پڑے تھے۔ پاکستان کا مسئلہ آج ہندوستانی سیاست میں بڑا اہم درجہ رکھتا ہے، اور مسلم لیگ کا سارا زور اسی پر ہے، ملک کے مختلف گوشوں میں اس پر اظہار خیال ہو رہا ہے، اس کی موافقت اور مخالفت میں کتابیں لکھی گئی ہیں مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ تخیل کس کے دماغ کی پیداوار ہے[1]

در اصل ہمیں مجنونوں کے مستند واقعات نہیں مل سکتے کیونکہ اگر ہم ان کو مستند سمجھتے تو پھر ان کو پاگل کیوں کہتے لہٰذا اس سلسلہ میں ہم کو روایات اور افسانوں ہی پر اکتفا کرنا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ بو علی سینا نے ایک مشہور دیوانے کا نام سنا، اس کو دیوانے سے ملنے کی خواہش ہوئی، چنانچہ جب وہ پاگل خانے کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ دیوانہ سلاخوں سے لگا کھڑا ایک طرف دیکھ رہا تھا، حکیم بھی اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہو کر اس کو گھورنے لگا، پاگل دوسری طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بو علی سینا بھی مڑ کر اس کے سامنے آگیا۔ پاگل تیسری جانب چلا گیا، بو علی نے بھی رخ بدلا اور پھر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اب تو پاگل سے ضبط نہ ہوا اور اس نے مسکرا کر کہا۔ "دیوانے تو آزاد ہیں اور جو دیوانے نہیں ان کو قید خانوں میں بند کر رکھا ہے۔"

ظاہر ہے کہ اگر دیوانے کی یہ حرکات دیوانگی تھیں تو بو علی سینا بڑا پاگل ہوا۔ مگر آج تک کسی نے حکیم کو دیوانہ نہیں بتایا۔

ایک افسانہ مشہور ہے، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر اقبال مرحوم ایک پاگل خانہ دیکھنے گئے، وہاں ان کو ایک فلسفی سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس کو جب یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اقبال ہیں تو وہ ان سے فلسفہ پر دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب اس کی گفتگو اور خیالات سے بہت محظوظ ہوئے اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسے سمجھدار شخص کو یہاں کیوں بند کیا گیا ہے۔ وہ انہیں خیالات میں رخصت ہو رہے تھے کہ دیوانے نے کہا، ڈاکٹر صاحب، ایک بات تو بتا دیجئے کہ اگر

[illegible] ہندوستانی مسلمانوں نے [illegible]
[illegible] خیالات کی [illegible]
[illegible]

انسان کی تیسری آنکھ ہوتی تو کہاں ہوتی ؟

ڈاکٹر صاحب اس سوال سے بہت سٹپٹائے اور بہت سوچ کر جواب دیا "گدی کے اوپر"۔

دیوانے سے وجہ پوچھی تو یہ بتائی کہ "اس طرح آدمی بغیر گردن موڑے پیچھے کی چیزیں بھی دیکھ لیا کرتا"۔

اس نے کہا "جی نہیں تیسری آنکھ انگلی کے اگلے حصہ پر ہوتی، اس طرح وہ اوپر نیچے، دائیں بائیں ہر طرف دیکھ سکتا۔ جیب میں اسے کسی کو تلاش کرنا ہے اس نے انگلی اٹھائی اور دیکھ لیا۔ ڈاکٹروں کو حلق کے اندر کوئی چیز دیکھنا ہے انہوں نے انگلی ڈالی اور دیکھ لی۔ جہاں آدمی اپنا سر نہ ڈال سکتا ہو انگلی کی مدد سے آسانی سے دیکھ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ"۔

بات ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب یہ سوچتے ہوئے واپس لوٹے کہ واقعی یہ شخص یہیں رہنے کے قابل ہے، گویا اس کے محض اس سوال نے اس کو دیوانہ بنا دیا۔ مانا کہ سوال مفروضہ تھا مگر دونوں جوابوں کو سامنے رکھکر یہ فیصلہ آپ خود کیجئے کہ کون زیادہ صحیح تھا۔ اور اس گفتگو کے بعد یہ رائے قائم کرنا کہ وہ پاگل ہے کہاں تک حق بجانب ہے ؟

اس بات کا ثبوت کہ ہم بعض عام معیار انسانی سے زائد سمجھ بوجھ والے انسانوں کو پاگل سمجھتے ہیں اس سے بھی ملتا ہے کہ دنیا میں ان افراد کو بھی پاگل، مجنون یا ساحر سمجھا گیا جو غیر معمولی خصوصیات رکھتے تھے، چنانچہ مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً تمام پیغمبروں کو ان کے زمانہ میں مجنون کہا گیا، لوگ ان کی باتوں پر اعتقاد نہ رکھتے تھے اور ان کی غیر معمولی خصوصیات کو سحر سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ یہاں تعصب، ضد اور پرانے عقائد کے خلاف نئے عقائد کی تعلیم بھی مخالفت کی جڑ ہوتی تھی۔ اور اگر واقعی یہ غیر معمولی خصوصیات کے حامل نہ ہوتے تو ان کا کامیاب ہونا بہت مشکل تھا۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنی باطنی قوتوں کو ترقی دیکر ان سے کام لینے لگتے ہیں اور ان کو بھی ساحر اور جادوگر کہا گیا، بلکہ عرصہ تک تو خود جنون کو بھی آسیب یا سحر کا شکار سمجھا جاتا رہا، مصر اور بابل کی تاریخوں میں بار بار اس امر کا اعادہ ہے کہ اس زمانہ میں ایسے مجنونوں کا جنا زور ہے جن پر آسیب یا جن کا اثر ہے۔ حضرت عیسوی کے ابتدائی دور میں یہ خیال عام [illegible] انسان کے برے اعمال اور گناہوں کا نتیجہ ہے۔ اور اس کا علاج تعویذ گنڈوں، منتر اور [illegible] سے کیا جا سکتا ہے۔ [illegible]

یہ خیال عام تھا اس لئے [illegible] یا ان کے جسم کو تکلیف پہنچائی جاتی تھی [illegible] سمجھا جاتا ہے ان مصیبتوں اور تکلیفات سے [illegible] یہ گمان بھی رائج تھا کہ ایسے لوگ جادوگری سحر [illegible] لہٰذا ان کو سولی دینا یا زندہ آتش کر دینا [illegible] کو کاٹ دینا، یا ان کو داغ دینا، یا ان کو [illegible] کی ایک اہم خدمت ہے۔ جنون کو قتل معالج یا [illegible] میں سمجھا گیا۔ اور اس میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ ہے [illegible] طب میں لکھتا ہے "عرب لوگ اپنے ہم [illegible] اور مجنونوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے ہیں [illegible] شفاخانے قائم کر رکھے ہیں"۔

بارھویں صدی میں بغداد میں ان کے لئے ایک [illegible] بنایا گیا، اور دوسرے اسلامی شہروں میں بھی ان کے [illegible] حالانکہ یورپ میں پہلا پاگل خانہ [illegible] میں بنا اور ان کے ساتھ ہمدردی کا آغاز انقلاب فرانس کے بعد ہوا۔ [illegible] صحیح طور پر ان کے علاج معالجے اور نگہداشت کی طرف توجہ [illegible]

موجودہ زمانے میں تو دور جہالت کے وہ [illegible] پاگلوں اور مجنونوں کو زندہ دفن کر دیا جاتے یا [illegible] یا پانی میں ڈبو دیا جائے۔ مگر حیات انسانی کے [illegible] بھی نظر آتی ہے کہ بہت سے آدمیوں کو پاگل [illegible] ایسے ہوتے ہیں جن کو قید خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے [illegible] جو آزاد رہتے ہیں مگر کوئی ان کی بات پر توجہ نہیں [illegible] کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی دھن میں لگے رہتے [illegible] نشر و اشاعت کرتے رہتے ہیں اور اتفاق سے [illegible] ہیں اور وہ کامیابی حاصل کر لیتے ہیں [illegible] کو کسی بات میں کامیابی ہوتی [illegible] ایک بڑے مصنف کو [illegible] کی عادت تھی اور اس کے بغیر کچھ نہیں [illegible] لیمپ کی روشنی میں لکھنے کا عادی تھا [illegible] بند کر کے لیمپ جلا کر [illegible] چلنے میں ہمیشہ اپنے قدم [illegible] نہ کوئی ایسی حرکت [illegible]

حیلہ ساز

[illegible] ایک ایسے شخص کے خیالات پیش کئے گئے ہیں جس کی محبت دوسروں کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو بھی دھوکا [illegible] اس نے سب سے پہلے کسی عورت کو دھوکا دیکر اسے اپنی رفیقِ حیات بنایا ہو پھر ایک مکارن سے محبت کر کے اپنی بیوی کو [illegible] کے راستے موت کے گھاٹ اتار چکا ہو پھر شاید اس مکارن کو بھی [illegible] اس سے [illegible] اور آخر کار جب وہ کسی تیسری عورت کی جستجو (تازہ آگ) میں نکل پڑا ہو تو [illegible] ایک [illegible] اپنی مرحومہ بیوی کی یاد کو بھی، جو ایک خوفناک کابوس بنکر گویا اسے ڈرا رہی ہے۔

کئی تنہا برس گذر گئے
کہ اس وادی میں ان سرسبز اونچے کوہساروں میں
اٹھا لایا تھا میں اس کو!
نظر آتا ہے کاٹج سے وہ [illegible] اب بھی
جہاں اس سے ہوئی تھیں آخری باتیں،
تجھے اے جان میری بیوفائی کا تو عرفاں تھی؟
محبت اس مکارن سے؟
وہ بیشک خوبصورت تھی
مگر اس سے محبت آہ نا ممکن!
محبت کر سکے اس [illegible] افسردہ پیکر سی؟
[illegible]

نہ آیا اعتماد اسکو مری اس حیلہ سازی پر
بس اپنی ناتواں دل دوز آنکھوں سے
پہاڑوں اور ان پر تند و سرافراز چیلوں
کو وہ تکتی رہی پیہم،
یہ دیکھو ایک اونچے پیڑ کا ٹہنا
پہاڑی میں بنا لی ہیں جس نے اپنی راہیں جیسے
چٹان اسکے لئے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی!
مرے ماضی پہ تاریکی سی چھائی ہے
مگر وہ یاد کے روزن سے آتی ہے نظر اب بھی
مجھے بھولی نہیں وہ بے بسی اسکی نگاہوں کی
اور اس کی آخری باتیں ہیں یاد اب تک!
تو کیا میں [illegible] کی [illegible] ہوں
کہ اس کی یاد [illegible] ہو جائے؟

[illegible]

نئی شلوار

پو پھٹ چکی تھی، لیکن سورج ابھی نکلا نہ تھا، بیگماں نے پہاڑ کی ڈھلوان سے جہاں گاؤں آباد تھا نیچے ندی کی تلیٹی پر نگاہ ڈالی، دھان کی پنیری کی ایک بڑی سی ٹکڑی میں اُسے اپنا خاوند کام کرتا ہوا دکھائی دیا، اتنے فاصلے سے وہ بالکل کھلونا سا دکھائی دیتا تھا، اُن کھلونوں کی طرح ننھا اور خوبصورت جن سے وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی، چیڑھ کے ٹھونٹوں کو اکٹھا کر کے ان میں لکڑی کی کھپچیاں آر پار پھنسا کر، وہ انہیں سروں پر اخروٹوں کو کھوکھلا کر کے لگا دیا کرتی تھی اور یوں کھلونے تیار ہو جاتے تھے، سردار اور اُن کے سپاہی اور اُن کی بیویاں، فرق صرف یہ ہوتا تھا کہ بیویوں کے مونچھیں نہیں ہوتی تھیں، اور جو مرد ہوتے تھے ان کے چہروں پر مکی کے بھٹوں کی نرم، ریشمیں کلغیاں لگا دی جاتی تھیں۔ اُسے یاد آیا کہ ایک دفعہ اس کی گل سے محض اس لئے لڑائی ہوئی تھی کہ گل مرد کھلونوں میں مکی کے بھٹوں کی کالی کلغیاں لگانا چاہتا تھا اور وہ سنہری کلغیاں پسند کرتی تھی، وہ دونوں بحث کرتے ہوئے گتھم گتھا ہو گئے تھے، اور بیگماں نے غصے میں آکر گل کا منہ نوچ لیا تھا۔ ہاں، اب گل کے چہرے پر وہ نشان نہیں تھا، گو ــــ اب گل اکثر اس کے چہرے پر ایسے نشان پیدا کر دیا کرتا تھا کہ چشمے پر جاتے ہوئے اُس کی سہیلیاں اسے چھیڑا کرتی تھیں، یہ سوچ کر اسے ہونٹ کانپے، اور اُس کے رخساروں پر ہلکی سی لالی دوڑ گئی، اسی طرح کی لالی اب مشرقی آسمان کے چہرے پر بھی دوڑ رہی تھی۔ جیسے سورج نے اپنی بیگماں کا منہ چوم لیا تھا، بیگماں چلتے چلتے لڑکھڑا سی گئی، اور ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور اپنے سنہری پریشان بالوں کو سنوارتے ہوئے نیچے ندی کی تلیٹی کی طرف تکنے لگی۔ دھان کی پنیری کا رنگ چمکیلا اور گہرا سبز تھا، ایسا سبز رنگ تو اُس نے گل خان بزاز کی دکان پر بھی نہ دیکھا تھا کہ جس کے پاس بڑے بڑے خوبصورت رنگ والے کپڑے تھے۔ پاس ہی دیوار کے دو نازک سے چنار بڑے مغرور انداز میں آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑے تھے، لیکن اُن کا رنگ بھی تو اتنا گہرا سبز نہ تھا۔ اس سبز رنگ میں تھوڑی سی نیلاہٹ بھی گھلی تھی جیسے اس چشمے کے پانی میں ہوتی ہے جو بہت گہرا ہو۔ پہاڑ اور گاؤں اور وادی اور ندی سب نیند میں کھوئے گئے تھے، جنگل خاموش تھے، جیسے سب چپ چاپ، وہ خود بھی بہت آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی، بڑے بڑے پتھروں سے بچتی ہوئی جو پگڈنڈی پر ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ پتھر بھی سوتے پڑے ہیں اور انہیں جگانا مناسب نہ ہوگا، خود اس کے جسم میں بھی تو ایک نشہ سا گھلتا سا دوڑ رہا تھا۔ اُس کے بچپن کی کنواری آرزوؤں کی تکمیل، یہ خیال آتے ہی اس کا دل دھڑکنے لگی، اُس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی رو دوڑنے لگی۔ یہ رو دراصل ندی کے پانی کی سی ملائمیت، بجلی کی سی تیزی اور اعصابی حرکت کی سی فطری گردش موجود تھی۔ اس کے دھڑ اور پیٹ اور چھاتیوں میں گھومتی پھرتی دو نقطوں پر ختم ہو جاتی تھی، مثبت اور منفی۔۔۔ مثبت اور منفی۔۔۔ بیگماں کو اپنا سانس پھولتا ہوا معلوم ہوتا۔ یکایک اُس کے کانوں میں آواز آئی، جیسے کوئی درخت کے تنے پر کلہاڑا چلا رہا ہو، کھٹ، کھٹ، کھٹ، اُس نے غلط سمجھا تھا کہ وہ یا اس کا خاوند ہی آج سب سے پہلے جاگے ہیں، گاؤں کا بوڑھا چوکیدار روشن دین ان سے بھی پہلے اٹھا تھا، اور اب ایک چیڑھ کے تنے میں سے سنہری اور پتلی پتلی دینیاں نکال رہا تھا، کھٹ، کھٹ، کھٹ۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ گھر میں تو دینیاں ختم ہو چکی ہیں، اور آج رات کو وہ دینیوں کے بغیر آگ کیسے جلائے گی، روشنی کیسے ہوگی؟ آج رات تو اُسے دینیوں کی سنہری روشنی کی بہت ضرورت تھی۔ آج رات وہ دینیوں کے شعلوں کی روشنی میں اپنی نئی شلوار پہن کر دیکھے گی، اس کا رنگ، اُس کی پھبن، وہ شلوار پہن کر اور بال پھیلا کر گل کے سامنے ایک ناچتی ہوئی تیتری کی طرح گھوم جائے گی، اور گل اسے گلے سے لگا لیگا۔ بیگماں کے لب کانپنے لگے اور اس کے چہرے پر لالی دوڑ گئی، اور وہ روشن دین کے بالکل قریب جا کھڑی ہو گئی۔ گاؤں کے بوڑھے چوکیدار نے ایک لمحہ کے لئے بیگماں کی طرف [illegible] دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا، وہ اپنی چھوٹی کلہاڑی کی مدد سے [illegible] تنے میں سے دینیاں نکال رہا تھا۔ تنے کے جسم [illegible] تھا اور قریب ہی دینیوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو، بیٹی؟" روشن دین نے اس [illegible] بغیر پوچھا۔

"نیچے، پنیری کے کھیت میں" [illegible]

[illegible] گل گھر میں نہ تھا، اُدھر سے گذر [illegible]

تمہارا یہ ہمیشہ سے ہوتا ہے جب بھی دھنیاں نکل رہا تھا، یہ تنا کمبخت بڑا سخت ہے، بیٹی! روشن دین نے کلہاڑی سے زور زور سے ٹھوکے لگاتے ہوئے کہا۔

بیگاں خاموش کھڑی رہی۔

روشن دین بولا: "اب کے دھان کی پنیری اچھی ہے، تمہارے کھیتوں کی پنیری بھی بہت عمدہ اور مضبوط نظر آتی ہے... گل کے ماہ کے بعد واپس آیا ہے!؟"

"تین ماہ کے بعد۔"

"بارہ مولے میں — کیا کرتا تھا؟ کسی لکڑی کے ٹھیکیدار کے ہاں ملازم تھا تا!؟"

"ہاں، پر یہاں دھان کا کام سنبھالنے والا کوئی نہ تھا، دیور بیمار ہے، اسی لئے میں نے بارہ مولے چٹھی لکھ بھیجی تھی۔"

"تم نے اپنے دیور کو میری جڑی کھلائی تھی؟"

"اور بھی کئی جڑی بوٹیاں کھلا چکی ہوں، اب جو دوا بارہ مولے سے آئی ہے وہ کھلا رہی ہوں۔"

"اللہ فضل کریگا..... لیکن تم اس وقت کھیتوں میں کیا کرنے چلی ہو!....؟"

"اور ____ پار والے گاؤں کے درزی کو شلوار سینے کے لئے دی تھی، آج اس نے دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔" بیگاں نے کمزور، مدھم، شرمیلی آواز میں کہا۔

"اخاہ! بڈھے روشن دین نے مڑ کر بیگاں کی طرف مسکراتے ہوئے کہا، "گل بہت اچھا لڑکا ہے ... بہت اچھا لڑکا ہے... نئی شلوار ... مجھے یاد ہے دکھاس کر جب میری بیوی نے ایک دفعہ مجھ سے ریشم کے کپڑے کی شلوار مانگی تھی، اور میں نے کہا تھا کہ میں تجھے سری نگر سے لادونگا... سری نگر میں میرے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے، اور میں ریشم کی شلوار نہ لا سکا... بڑی نیک بخت تھی وہ... اسے عمر بھر ریشم کی شلوار پہننا نصیب نہ ہوئی!... مرتے دم تک اس کے دل میں یہ حسرت رہی......"

بڈھے کسان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، کلہاڑی ہاتھ میں کانپ رہی تھی۔

بیگاں نے آہستہ سے پوچھا: "چاچا! جب ان میں سے تھوڑی سی دھنیاں ملے تو... یہاں آج ختم ہو گئی ہیں، اور....."

"ہاں ہاں، بیٹی، جتنی ضرورت ہوں لے جاؤ... میں بھی

تو ندی کے پار کی گھاٹی پر جاتا ہوں، آج کل تو پھر میلہ ہے، اور ٹرک پر ٹرک سے سیاح لاریوں اور تانگوں پر جاتے ہوئے ملیں گے، کمبخت کئی کی کئی دھنیاں بک جائیں گی۔"

بیگاں نے دھنیاں اٹھاتے ہوئے کہا: "سنا ہے کہ گلمرگ میں یہ سیاح لوگ دھنیوں کی مشعلیں جلاتے ہیں!"

"بیٹی، اگر یہ باہر کے لوگ کشمیر میں نہ آئیں تو ہم لوگ تو بھوکوں مر جائیں... اللہ بڑا کارساز ہے!"

بوڑھا پھر کھانسنے لگا، اور کلہاڑی سے کھٹ کھٹ کرنے لگا۔ بیگاں وہاں سے چل دی، دھنیوں کا گٹھا اس نے اپنے دوپٹے میں باندھ لیا تھا، تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ ندی کی ٹیلی پر پہنچ گئی۔ یکایک سورج نکل آیا، اور ساری وادی میں جیسے ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی، اکثر ٹھنڈے شبنمی لبادوں میں لپٹے ہوئے سہمے ہوئے پڑے تھے، جاگ کر پھدکنے لگے، کرنوں کو چھو کر دھان کی پنیری کا رنگ اور بھی چمکیلا ہو گیا، اور اس کے خوشے سنہری لہروں کی طرح کھیت کی گود میں ناچنے لگے، ندی کا پانی جو پہلے چپ چاپ معلوم ہوتا تھا، یکایک نغمے سے لبریز ہو گیا، موسیقی اور روشنی، نور اور نغمہ، حرکت اور زندگی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ سورج کی کرنوں میں کوئی ایسی اضطراری قوت چھپی ہوئی ہے، جو ہر ایک چیز کو بیدار کر دیتی ہے جس سے سورج کی کرنیں ہم آغوش ہو جائیں، گل نہایت تیزی سے کام کر رہا تھا، اس کے چہرے پر پسینے کی لکیریں تھیں اور ہاتھوں میں دھان کی پنیری۔ وہ گھٹنوں تک کھیت کے پانی اور کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا اور نہایت چابکدستی سے پنیری کا کٹھا اکھاڑ کر اسے بڑے کھیت میں مناسب فاصلے پر جما رہا تھا۔ بیگاں کھیت کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی، دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے، صبح کے پہلے اجالے کا سونا ان کی آنکھوں میں چمک رہا تھا، دلوں میں، ان کی روح کے گوشے گوشے میں!

"بہت جلد آن پہنچی ہو، ابھی تو میں آدھے کھیت میں بھی پنیری نہیں جما سکا۔" گل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ شکوہ نہیں اظہار تشکر تھا۔ بیگاں نے مسکرا کر اور مڑ کر پن چکی کی طرف دیکھا جو ندی کے دوسری طرف تھی، پھر اس کی نگاہ نے ندی کے پار اس اونچی گھاٹی کو چھو لیا جس کے دامن میں سڑک گزرتی تھی۔ گھاٹی کی سطح مرتفع سے گزر کر اس کی نگاہ چوٹی سے بھی پرے اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلے پر جا پہنچی، اور لمبے جنگل اور شمال کی طرف ایک چھوٹا سا...

چیک [illegible] گل نے بیگماں کے لئے ایک نئی شلوار سینے کو دی تھی۔ یہ مسکراہٹ گھوم کر پھر گل کے چہرے پر جا پہنچی، یہ مسکراہٹ، یہ [illegible] یہ روشنی کی کرن!

بیگماں بولی: "اور واپس بھی تو آنا ہے، اب چلو گے تو بڑی مشکل سے وقت پر لوٹ سکو گے!"

اس کی بات سنتے ہی گل نے پنیری ہاتھ سے چھوڑ دی اور کھیت سے باہر نکل آیا اور ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنی ننگی ٹانگوں سے کیچڑ اتارنے لگا۔

سوسی کی شلوار جس کی سرخ زمین پر سفید چمپئی پھول جھلملا رہے تھے پہن کر بیگماں بہت خوش ہوئی، بیس بائیس گز کپڑے کی شلوار ہوگی، گل نے تین ماہ کی کمائی۔ بیگماں نے شلوار کو درزی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اپنے خاوند کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا، کچھ پیار، کچھ غرور، کچھ شوخی، ہنس کر بولی: "اور قمیص؟ — چھینٹ کی لوگی؟"

گل بولا: "چھینٹ کی قمیص بھی سلوا دوں گا، دو تین مہینے اور ٹھہر جاؤ تب تک شاید ننھے کے لئے بھی کچھ سلوانا پڑے۔"

بیگماں شرم سے لال ہوگئی، نگاہیں نیچی کرکے بولی: "شرم تو نہیں آتی۔" گل مسکرانے لگا اور اس نے درزی کی طرف دیکھ کر ایک آنکھ [illegible]۔

راستے میں جنگل کی ایک بڑی سی جھاڑی نظر آئی جس پر نیلا دھاری کی [illegible] بیل پھیلی ہوئی تھی۔ اس جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر بیگماں نے شلوار تبدیل کی، راہ چلتے چلتے وہ نیفے کی چنٹ کو سنوارتی جاتی تھی، اور بیس بائیس گز کی شلوار کے متعلق گھیرے اور اس کے خوشنما پھولوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، نئی شلوار نے اس کی چال میں ایک نئی نزاکت اور شعریت پیدا کر دی اور اس کے قدموں میں رقص کا سا انداز آ گیا، پھر اس نے ایک عجیب ادا سے، جو گل کو بہت پیاری لگی، اپنا سر گل کے کاندھے پر رکھ دیا، وہ کچھ عرصہ اسی طرح چلتے رہے، باہوں میں باہیں ڈالے، درزی کا گھر اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ فرش زمین پہ چیڑھ کے پیلے پیلے نکیلے جھومر بچھے ہوئے تھے اور ان کے قدموں کے مس سے ریشمیں کترنوں کی طرح سرسرانے تھے، گویا زمین نے بھی ایک نئی شلوار پہن لی تھی، چیڑھ کے پیلے پیلے جھومروں کی شلوار جس پر جا بجا بنفشے کے پھولوں کی گلکاری تھی، درختوں کی شاخوں پہ جنگلی پرند نغمہ زن تھے، اور [illegible] دیودار اور چیڑھ کی چوٹیوں پر سے خراماں خراماں گزر رہے

تھی ایک پگڈنڈی سی تھی جو جنگل [illegible] [illegible] جس پر پہاڑوں میں بہنے والے نالے کا [illegible] شہزادیاں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے [illegible] خوشی سے ناچتے ہوئے جا رہے تھے، گل کا دل بھی نامعلوم مسرت سے لبریز ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا: "میں تمہیں چھینٹ کی قمیص اگلے مہینے سلوا دوں گا، یہ قمیص اب پرانی ہو گئی ہے اور اس نئی شلوار کے ساتھ اچھی نہیں لگتی۔"

بیگماں کے نیم وا لب پھول کی پنکھڑیوں کی طرح کانپ اٹھے اور گل نے جلدی سے انہیں اپنے سانس کی حلاوت اور ہونٹوں کی شہد آگیں شبنم سے بوجھل کر دیا..... پھر وہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھ گئے۔ اور گل نے شوخ لہجے میں کہا: "کتنے ماہ ہو گئے ہیں؟ — چار یا پانچ —؟"

بیگماں کمزور آواز میں بولی: "ہٹو بھی، تمہیں تو ہر وقت..."

گل اسے گدگداتے ہوئے پوچھنے لگا: "سچ سچ بتاؤ، چار یا پانچ؟ — چار یا پانچ؟"

بیگماں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی: "ہائے — اوئی — میں مری —"

گل نے اسے گدگدانا چھوڑ دیا۔ بولا: "میں بتاؤں، ایک ننھی سی لڑکی ہوگی۔"

بیگماں بولی: "چھوکرا ہوگا، ننھی کیا تمہارے کھیت میں ہل چلائے گی، چھوکرا ہوگا، میری تو مدت سے یہی آس ہے۔"

گل سنجیدہ ہو کر بولا: "اماں بھی یہی چاہتی ہیں۔"

کتنی ہی دیر تک وہ دونوں اس چشمے کے کنارے خاموش بیٹھے رہے، خوش آئند خیالوں میں ڈوبے ہوئے، چشمے کے نرم و نازک گیت، جنگل کا مسحور سناٹا، بادلوں کا رقص پیہم، ان سب چیزوں میں انہیں اپنے مستقبل کی سنہری تصویر نظر آئی۔ اس تصویر میں ایک ننھا سا بچہ بھی تھا، جو اپنی ماں کی گود میں کلکاریاں مار رہا تھا، چلتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے پہلا قدم اٹھا رہا تھا، کاتک کی سنہری [illegible] بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو جنگل میں چرانے [illegible] گھاس کاٹ رہا تھا، اپنے باپ کے لئے کھیتوں میں [illegible] اپنے باپ کے شانہ بشانہ کھیتوں میں ہل چلا رہا [illegible] شہنائی سی بج اٹھی اور بیگماں اور گل [illegible] کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید اس تصویر کو [illegible]

[illegible] ایک دوسرے کو پھر [illegible] کے سیزن میں گھر سے ہوسکے اُن بچوں کا ذکر [illegible] جو بہت بچے تھے اور اُن سیّاحوں کو دیکھتے ہوئے [illegible] تھے وہ وادی [illegible] تک یہاں پہونچے [illegible] کبھی کبھی اکا دکا لاری، تانگہ یا پیدل چلنے والے سیاحوں کی ٹولی نظر آجاتی تھی۔ گل نے بیگماں کو بتایا کہ کس طرح ان سیاحوں کی آمد سے کشمیر کے لوگوں کو ہر سال لاکھوں روپے کا فائدہ ہوتا ہے۔ سری نگر ایک بہت بڑا شہر ہے، جس کے بیچوں بیچ دریائے جہلم بہتا ہے، جس پر سات پل بنے ہیں، اور جب دھان کی فصل کٹ جائے گی تو وہ ضرور اپنی بیگماں کو سری نگر لے جائے گا، تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے اُن شاندار نظاروں کو دیکھ لے کہ جن کے لئے دُنیا بھر کے سیاح وہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ ... ایک چنار کے نیچے چار پانچ سیاح بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ بیگماں اور گل اُن کے قریب سے گزرے اور بیگماں اُن سیاحوں کے خوبصورت کپڑوں کی طرف حیرت سے دیکھتی رہی، اور وہ سیاح بیگماں کے مثالی حسن کو دیکھ کر محو حیرت ہو گئے۔

چنار کے آگے ایک چھوٹا سا نالہ تھا، اُسے پار کر کے وہ گھاٹی کی ڈھلوان کے قریب پہونچ گئے، دور نیچے ندی بہتی تھی، جس کے ایک طرف کھلونے جیسی پن چکی تھی، جس میں پانی کا جھاگ برف کے گالوں کی طرح اُڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا، ندی کے دوسری طرف دھان کے کھیت تھے، جہاں گل صبح کام کرتا رہا تھا، اس سے پرے پہاڑ کے اوپر اُن کا اپنا گاؤں تھا۔ سفید کوٹھے، کھڑیا مٹی سے لپے ہوئے، سیب کے کھلونوں کی طرح نظر آتے تھے، ان میں عورتیں نازک ننھی ننھی چڑیوں کی طرح اندر یا باہر جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ سورج کی کرنوں نے گاؤں کو کچھ چھپا لیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی بھی چڑیوں کا تماشہ ہو جن کی نازک ڈوریاں سورج کی کرنوں کے تاروں سے بنی ہیں۔

جس بلند و بالا گھاٹی پر بیگماں اور گل کھڑے تھے، اُس سے دو راستے نیچے کی طرف جاتے تھے، ایک تو سیدھا ڈھلوان راستہ ندی کے کنارے میں جاتا تھا، اور دوسرا ترچھا پیچ دار راستہ جو گھاٹی پر [illegible] گھماتا ہوا ندی کی تہ میں پہونچتا تھا۔ گل نے کہا: میں اس چھوٹے رستے سے نیچے جاؤں گا، [illegible] تمہارے لئے یہ راستہ خطرناک بھی ہے [illegible] بہت [illegible] تم دوسرے راستے کو [illegible] پن چکی پر [illegible]

«[illegible] تم سے پہلے وہاں پہونچوں گی۔»

«ایک دفعہ پہلے بھی تم مجھ سے ایسی شرط لگا کر ہار چکی ہو۔» گل نے ہنستے ہوئے کہا: «ایک پھر بد کر دیکھ لو۔»

«رہی۔» بیگماں نے یقین کے لہجے میں کہا: «دیکھو، اگر میں پن چکی پر پہلے پہونچ جاؤں تو تمہیں کل ہی نئی قمیص کے لئے کپڑا خریدنا ہوگا، اور اگر ...؟»

«اور اگر ...» گل نے شرط کا دوسرا رخ بتلاتے ہوئے کہا: «اگر تم ہار جاؤ، تو کل دن بھر میرے ساتھ پنیری کے کھیتوں میں، گھٹنے گھٹنے کیچڑ اور پانی میں ـــ کیوں منظور ہے!؟»

«منظور ہے، لیکن دیکھو دوڑنا نہیں ہوگا، بس چلنا ہوگا۔»

گل نے اثبات میں سر ہلا کر ڈھلوان کے راستے پر چھلانگ لگا دی، اور تیز قدموں سے نیچے کی طرف جانے لگا۔ بیگماں ایک لمحہ کے لئے ٹھٹکی پھر وہ بھی تیز تیز قدموں سے دوسرے راستے پر ہولی، اب کی بار وہ گل کو ضرور شکست دے دیگی۔ گل خوشی سے سیٹی بجاتا ہوا نیچے اتر رہا تھا، اُسے پورا یقین تھا کہ وہ بیگماں سے بہت پہلے پن چکی پر پہونچ جائیگا، بیوقوف لڑکی، اُس نے سوچا، بیگماں میں ابھی تک بچپن کی شوخی موجود ہے، یوں ہی بات بات پر جھگڑ پڑتی ہے، بھلا اس حالت میں کسے شرط جیتنی چاہیئے تھی، یکایک اُس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بیگماں کو آواز دے اور اُسے رک جانے کے لئے کہے، لیکن دوسرا راستہ اب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا اور اُس کی آواز وہاں تک نہ پہونچ سکتی تھی، اُس کے قدم آہستہ ہو گئے، اُس نے سوچا کہ اگر وہ شرط ہار جائے، اور بیگماں کو پن چکی پر پہلے پہونچ جانے دے، تو وہ شریر لڑکی کتنی خوش ہوگی۔ وہ مسکرا دیا، اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شرط ہار جائے گا، وہ نہایت دھیمے دھیمے قدموں سے چلنے لگا، اور آخر ایک بڑی چٹان کے قریب جا کر رک گیا۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ، اُس نے اپنے دل میں اندازہ لگایا کہ بیگماں اگر دھیمے قدموں سے بھی چلی ہو تو اس وقت پن چکی پر پہونچ گئی ہوگی؛ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور تیز تیز قدموں سے نیچے اترتا ہوا پن چکی کی طرف جانے لگا۔ پن چکی سامنے نظر آ رہی تھی، لیکن بیگماں ابھی تک وہاں نہ پہونچی تھی، اُس نے تو شرط ہارنے کی پوری کوشش کی تھی، مگر اب ـــ یہ بیگماں کا اپنا قصور تھا کہ وہ ابھی تک نہ پہونچی تھی۔ — یکایک اُس کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ مسکرانے لگا، شریر لڑکی، مجھے دھوکا دینا چاہتی ہے، پن چکی کی دیوار کی اوٹ میں چھپی بیٹھی ہے۔ وہ بھاگتا ہوا پن چکی کے دوسری جانب گیا، لیکن بیگماں وہاں نہ تھی۔

وہ بیچاری ابھی غالباً راستے ہی میں تھی۔ گل نے ایک بار گھاٹی کے اوپر نظر دوڑائی، اور پھر اُس نے دو انگلیاں کو منہ میں رکھ کر زور سے سیٹی بجائی وہ سیٹی جو وہ بچپن میں بیگاں کو بلانے کیلئے بجایا کرتا تھا۔

سیٹی کی آواز پہاڑوں میں گونج کر خاموش ہو گئی۔

چند لمحے اسی خاموشی میں گزرے۔ پھر گل نے زور سے آواز دی: "بیگاں! ——"

پہاڑوں کے سینوں میں اک گونج سی پیدا ہوئی اور پھر وہی سناٹا چھا گیا۔

گل کو بہت غصہ آیا، چیخ کر بولا: "یہ کیا شرارت ہے؟ جواب ہی نہیں دیتی ہو، کہاں چھپ کر بیٹھ گئی ہو، بس تمہاری یہی باتیں تو مجھے [illegible] کرتی ہیں۔ یہ کیسا مذاق ہے؟"

گل دوسرے راستے پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ غصہ سے دانت پیس رہا تھا، ہر ایک جھاڑی کو غور سے دیکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اگر اس وقت بیگاں مجھے کسی جھاڑی یا چٹان کی اوٹ میں دبکی ہوئی مل جائے تو ——

ایک بڑا سا پتھر اوپر سے لڑھکتا ہوا اُس کی طرف آیا، وہ فوراً ایک طرف کو سرک گیا، بس چند لمحوں کا فرق رہا، ورنہ اس کا سر یا ٹانگیں زخمی ہو جاتیں۔

"بیگاں!" اُس نے چلا کر کہا: "یہ کیا حماقت ہے؟"

آٹھ دس پتھر ایک دم نیچے لڑھکتے ہوئے آئے، اُس کا پاؤں پھسل گیا، اور وہ گھسٹتا ہوا نیچے ندی میں جا گرا، اُس کے ہاتھ پاؤں زخمی ہو گئے اور ماتھے سے خون نکل آیا۔

اُس نے چلا کر کہا: "بیگاں —— بیگاں ——"

دوسرے راستے کے درمیانی حصے میں ایک موڑ کے قریب جہاں انجیر کا درخت اُگا تھا، اور گھنی جھاڑیاں تھیں، اُسے دو آدمی دکھائی دئے، اُن کی ٹانگیں ننگی تھیں، اور وہ اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھر اُٹھائے ہوئے تھے۔

گل کو جیسے کسی نے گلے سے پکڑ لیا ہو، اُس کے خون کی روانی رکنے لگی، اس کی آنکھوں کے آگے شرارے ناچنے لگے، وہ بھاگ کر راستے پر گو پر چڑھنے لگا۔ لیکن اب اُن جھاڑیوں کے پیچھے سے تیسرا آدمی نمودار ہوا، اور پتھروں کی جیسے بارش شروع ہو گئی۔ گل نے پہچانا یہ وہی تین تھے جو تھوڑی دیر پہلے گھاٹی کے اوپر چنار کے نیچے تاش کھیل رہے تھے۔ ایک بہت بڑا پتھر تیزی سے نیچے لڑھکتا ہوا آیا اور اپنے ساتھ گل کو بھی گھسیٹتا ہوا لے گیا۔

گل ندی کے کنارے [illegible] تھا اور اب [illegible] سرگوشیوں میں چلا رہا تھا، گھاٹی کی طرف ہاتھ پھیلا کے [illegible] کہہ رہا تھا۔

"خدا کے لئے —— میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے —— خدا کے لئے —— میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے —— تمہیں خدا کا واسطہ —— اپنی بیوی بچوں کا واسطہ —— اللہ رسول کا واسطہ ...."

اوپر جھاڑیوں کی اوٹ میں سے چوتھا آدمی نمودار ہوا، اسکی ٹانگیں ننگی تھیں اور اُس کے ہاتھ میں سوسی کی نئی شلوار تھی۔

گل نے اُٹھنے کی کوشش کی، اس کے ہاتھوں نے اُس پاس کے پتھروں کو اپنی ہتھیلیوں میں پکڑنے کی کوشش کی، لیکن پتھر اُس کے لہو سے سرخ ہو چکے تھے اور اُس کی ہتھیلیوں میں سے پھسل گئے، اور وہ ندی کے کنارے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ یکایک چھینٹی سوسی کی نئی شلوار ایک ہوائی چھتری کی طرح بل کھاتی ہوئی اُس کے سامنے آن پڑی، اور تیلی جیسی سنہری دیگیاں پتھروں پر بکھر گئیں۔

کرشن چندر

دیسی زبان کی ترقی

(بسلسلہ صفحہ نمبر ۳۳)

قاف ذال ضاد طوئے ظوئے کی علامات کے اضافے کی دشواریاں بار بکار دیوناگری میں بھی ہیں۔ دوسرے انگریزوں کی عملداری میں انگریزی کی حرف شناسی ہر ہندوستانی کیلئے ضروری ہے، اس لئے رومن رسم اختیار کر لیا جائے تو ایک ہی وقت اور محنت میں دو مقصد حاصل ہو جائیں گے اور کسی نئے رسم خط کے سیکھنے سے بچ جائیں گے اور اوہام سے نجات پائیں گے۔ اگرچہ اصولاً میں ہر اردو داں کیلئے دیوناگری کا سیکھنا نہایت فائدہ مند اور ضروری سمجھتا ہوں۔

متعدد زبانوں اور رسوم خط کے سیکھنے سے ہمیں گھبرانا نہ چاہیئے یورپ میں درجنوں باتیں جاننے والے ماہرین السنہ سے قطع نظر کر کے سدھارن طور پر کوئی تعلیم یافتہ شخص مشکل سے مل سکتا ہے جو کم از کم تین زبانوں سے واقف نہ ہو۔ ایک کلاسیکی یونانی یا لاطینی ایک برِ یورپ کی فرانسیسی یا جرمن اور ایک انگریزی جنوبی و مشرقی یورپ والوں کو ان سے بھی زیادہ زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی عہد اقبال میں متعدد زبانوں کا ماہر ہوتا تھا۔ عام تہذیب و شائستگی کے علاوہ خود اپنی [illegible] زبان کی ترقی کا یہ بہت بڑا محرک ہے۔

محمد مسلم

کھیل سے پہلے

سامنے کہرے کی مانند ہے گو آویزاں
یہ غم آلودہ سا پل بھی ڈھلک جائے گی
شمع کی طرح کا پنی کبھی لہراتی ہوئی
مری تحسین جو اس وقت ہے اک کہانی ہوتا
ایک گلنار کی مانند مہک جائے گی
اور میں دیکھوں گا حقیقت کا نکھرا آویزاں

ہر فسانے میں حقیقت کا لہو لرزاں ہے
ہر فسانہ ہے غم آلودہ سا میں پنہاں
ہر فسانہ کسی بہانے کی آنچ ہے شاید
چشم شوق آتش نمناک بھی ہے شاید
چاہتی ہے کہ ہوا افسانہ فضا میں رقصاں
وہی افسانہ جو اس وقت کہیں پنہاں ہو

ایک دن اپنی جواں سوز حرارت لیکر
ذہن پر مانند فسوں چھایا تھا
بات کی طرز حکایت کا خیال آیا تھا
جس نے اک پل کے لئے ذہن کو بہلایا تھا
کیوں خیال آیا تھا کیوں مجھکو خیال آیا تھا
میں جو اس دہر میں آیا ہوں روایت لیکر

بات کی طرز حکایت کا فسوں ہے کچھ اور
بات کی طرز حکایت یہ فسانہ تو نہیں
جو حقیقت کا لہو بن کے نکھر آئے گا
تشنگی کو مری کچھ اور بڑھا جائے گا
میں جو کہتا ہوں وہ کمزور بہانہ تو نہیں
میں یہ کہتا ہوں حقیقت کا تقاضا ہے کچھ اور

بات کی طرز حکایت [illegible]

لیکن افسوس مرے پہلو میں خوابیدہ ہے
وہ روایت جسے ناکام فسانہ کہیئے
جسے تقدیر کا کمزور بہانہ کہیئے
آئینہ کہتا ہے یہ شکل ہی غم دیدہ ہے
اور میں سوچتا ہوں عمر گذر جائیگی یوں؟

اس طرح شام کی ہر روز در مے خانہ
جیسے گھستے مرے قدموں سے بہک جائیگا
چشم شوق آتش نمناک میں گھل جائیگی
گرد آلام کسی وجہ تو دھل جائے گی
پھر نئی بیلیں پہ افسانہ نظر آئے گا
ایک آئینہ کہ جذبات کا اک پیمانہ!

لیکن افسوس کہ افسانے کی بے رنگ شراب
در مے خانہ کے جادو کو مٹا ڈالے گی
اور میں سوچوں گا افسانہ نہیں یہ میرا
حسب معمول گیا آج بھی خالی سینہ
کیا ہمیشہ مجھے تقدیر یونہی ٹالے گی؟
کیا ہمیشہ ہی رہوں گا میں فسردہ بیتاب؟

کاش یہ تلخ حقیقت بھی فسانہ بن جائے
سامنے کہرے کی مانند ہے گو آویزاں
جب یہ غم آلودہ سا پل بھی ڈھلک جائے تمام
ایک گلزار کی مانند نظر آئے تمام
وہ روایت جو مرے دل میں دبی ہے پنہاں
اور یہ بات بھی جینے کا بہانہ بن جائے

[illegible]

شاعر اور الیکشن

ایک شاعر ایک ادارہ ہے، دو شاعر ایک مشاعرہ اور تین شاعر ایک ہنگامہ۔ اور اگر ترنم کو پیش نظر رکھا جائے ـــــ ترنم آپ جانتے ہیں کلام کی جان ہوتا ہے ـــــ تو کہہ سکتے ہیں کہ ایک شاعر ایک موسیقار ہے، دو شاعر قوالی کی چوکی اور تین شاعر آرکسٹرا۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ یہ تعریفیں یا یہ درجہ بندیاں مبالغہ آمیز ہیں یا وجہ دلآزاری ہیں۔ اگر آپ واقعی ایسا ہی سمجھتے ہیں تو پھر میں نیک نیتی کے پورے احساس کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ یہ مقولے شاید میرے نہیں ہیں، اور کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کسی بڑے مفکر کے ہیں جن کو میں نے بے سوچے سمجھے نقل کر دیا ہو۔ اور آپ کو معلوم ہے نقل کفر کفر نہ باشد!

مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ مضمون کی ابتدا اللہ غلط ہوئی۔ درحقیقت میں مضمون کو ذرا محتاط طریقے پر شروع کرکے محتاط طریقہ ہی پر ختم کرنا چاہتا تھا، یہ اور بات ہوتی کہ بیچ میں ایسی ویسی باتیں قلم سے نکل جاتیں۔ مگر یہاں تو مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات آپڑی ہو۔ اور مقطع تو ابھی بہت دور ہے۔ مگر خیر، میرا ضمیر مطمئن ہے۔ ضمیر کا اطمینان بڑی چیز ہے۔ مگر کچھ ایسی بڑی چیز بھی نہیں۔ اس لئے کہ تہذیب و شائستگی کے اس دور میں ہمارا آپ کا ضمیر بڑی آسانی سے مطمئن اور بے باک ہو جاتا ہے۔ فطرت میں لچک نہیں نہ سہی ضمیر میں لچک ضرور ہو۔ بس پھر بیڑا پار ہے دیکھئے نا، کتنا اعلیٰ تخیل ہے! افسوس ہے میں شاعر نہیں ہوں۔ ورنہ اس خیال کو رو کھی پھیکی نثر کے بجائے ایسے موثر انداز میں شعر میں ظاہر کرتا کہ معلمین اخلاق دنگ رہ جاتے اور میں قہقہہ لگا کر آگے بڑھ جاتا۔

ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میری طالب علمی کے زمانے میں ایک مباحثہ اسی موضوع پر ہوا کرتا تھا کہ بنی نوع انسان کی خدمت کون زیادہ کرتا ہے، سائنسداں یا شاعر؟ میں ہمیشہ شاعر کا مصرعہ اٹھایا کرتا تھا۔ واللہ! یہ میری نا سمجھی نہ تھی۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں شاعر کی ہتات کہاں تھی! لیکن دور حاضر کی بات اور ہے اور اب اگر مجھے اس مباحثہ میں حصہ لینے کو کہا جائے تو میں پہلی سی سرگرمی دکھانا ہرگز پسند نہ کروں گا بلکہ قطعاً غیر جانبدار رہوں گا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں منجملہ آفات سے بچنے کا ایک طریقہ غیر جانبدار بن جانا ہے،

گو بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کی غیر جانبداری کا کام تمام کر دیتی ہے اور آپ کام آجاتے ہیں۔

بعض دیوانوں کی دیوانگی کی مانند اس بحث میں میری غیر جانبداری بھی ایک قاعدہ ہی ہے تفصیل سے وضاحت کی گنجائش نہیں کیونکہ کاغذ بہت گراں ہو گیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ سائنس داں اب نوع انسانی کی خدمت نوع انسانی کو حتی الامکان قلیل التعداد بنا کر کر رہا ہے۔ وہ کس طرح؟ اجی صاحب! جنگ کے ذریعے سے! ایں سعادت بزور بازو نیست۔ ظاہر ہے تعداد انسانوں کی جتنی گھٹے گی، رنج و مصیبت اس دنیا سے اتنے ہی کم ہوں گے۔ اور مستقل فائدہ چونکہ مقصود دنیاوی ہے، اس لئے جنگ کی عارضی تباہی بربادی کو انگیز کر لینا چاہیئے۔ کہئے یہ انسانی خدمت نہیں تو پھر کیا ہے؟ سچ پوچھئے تو یہ ایک ترقی پسندانہ خیال ہے، اب آپ کی مرضی کہ اس کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔

اور شاعر؟ شاعر بنی نوع انسان کی خدمت یوں کر رہا ہے کہ ہر دوسرا آدمی شاعر بننے پر کمر بستہ ہے۔ یقیناً آپ اس سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے کہ شاعروں کی آبادی جتنی بڑھے گی انسانیت کا اتنا ہی بھلا ہوگا۔ چنانچہ آپ کو چاہیئے کہ اس حقیقت کو مان لیں کہ پہلے ایک مربع میل میں ایک شاعر تھا تو اب اتنے ہی رقبہ میں ایک ہزار ایک شاعر ہیں۔ استاد شاگرد کا جھگڑا ختم کر دیا جا رہا ہے اور مساوات کی اساس پر یہ کار عظیم انجام پا رہا ہے۔ سوچئے تو، ماضی میں انسانیت کے دن کیوں نہ پھر سکے تھے؟ وجہ یہی تھی کہ تب شاعر کم تھے اور کام زیادہ۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے۔ کام رضاکارانہ بنیاد پر ہو رہا ہے، جبری بھرتی کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اور یہ تقسیم کار کا اصول کارفرما ہے۔ ترقی کا وسیلہ بن گیا ہے۔ اب انسانیت کے دو صرف دن جگ، راتیں بھی پھر جائیں گی۔ ـــــ گو لوگ غلطی سے اس کو یوں کہہ دیتے ہیں کہ

غالب نے کہا تھا۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مگر اس زمانے میں

میں ہوتے تو نہیں یہ کہنا پڑتا۔

کیجیے شاعری نے بڑی عزت دی ہے مجھے
[illegible] جگ کو جا پہنچا۔

مطلب یہ ہے کہ شاعری اب ایک معزز پیشہ ہے۔ ملازمت کے لیے میٹرک پاس ہونا اور شرافت خاندانی کا مجسٹریٹ کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ضروری ہے مگر شاعری کا [illegible] ہو۔ الحمد للہ!

یہ انداز [illegible] مائی گھر میں [illegible] وقت عروج پر نظر آیا جب سرکاری طور پر وہاں کی اسمبلی میں اور چشموں کے علاوہ ایک نشست شاعر کے لئے مخصوص کر دی گئی۔

جس طرح اور شہروں میں مزدوروں کی نو آبادیاں یا ترک مکرات کی نو آبادیاں قائم ہیں۔ اسی طرح مائی گھر میں شاعروں کی نو آبادی قائم ہے۔ اور یہ نو آبادی کافی بڑی ہے بلکہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس نے آدھے سے زیادہ شہر کو گھیر رکھا ہے۔ جوں ہی کسی شخص میں شاعری کے آثار پائے جانے لگتے ہیں، اس کو فوراً سرکاری حکم سے وہاں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اس نو آبادی کی آبادی بڑھتی ہی جاتی ہے اس نو آبادی کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ حکومت کو شاعروں کی مردم شماری کا علیحدہ انتظام نہیں کرنا پڑا۔

جب یہ سرکاری اعلان ہوا کہ اس حلقے سے ایک شاعر کا الیکشن ہوگا تو سارے شہر میں جوش و خروش پھیل گیا اور اس نو آبادی میں تو جشن منایا گیا۔ شاعروں کا ایک جلسہ عام منعقد ہوا اور ایک قرارداد میں جو متفقہ طور پر منظور ہوئی حکومت کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا گیا کہ اس نے شاعری کے پیشے کو اور شاعروں کے حقوق اور مفادات کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا اور ان کے تحفظ کا انتظام کیا اور مجلس قانون ساز میں شاعر کو ایک نشست عطا کر کے دوسری حکومتوں کے لیے ایک قابل تقلید مثال قائم فرمائی۔

ایک دوسری قرارداد میں طے پایا کہ ہر سال عظیم الشان پیمانہ پر "شاعر ڈے" یا "یوم شاعر" منایا جائے ——— اس خوشی میں ایک عظیم الشان مشاعرہ بھی ترتیب دیا گیا جو اکثر کانفرنسوں کی طرح کئی دن اور رات جاری رہا۔

لیکن جب امیدوار کے انتخاب کا سوال پیش آیا تو شاعروں کی پارٹیاں بن گئیں۔ ابھی تک تنظیم اور ان کا اتحاد کئی تنظیموں اور کئی اتحادوں سے بدل گیا [illegible] کے فضل اور سرکاری عنایت سے کئی کہنہ مشق شعراء اس نو آبادی میں [illegible] موجود تھے آپ کو اس نشست کے لئے [illegible] لیکن بعض [illegible] و خفیہ احباب کی کوشش [illegible] البتہ وہ شاعروں سے کسی [illegible]

پھر بھی میدان سے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ ایک تو تھے حضرت استاد مائی گھری اور دوسرے تھے حضرت مزدور مائی گھری۔ چنانچہ مقابلہ کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں۔

حضرت استاد مسلم الثبوت غزل گو شعرا میں ہیں۔ ان کے اوصاف اور کمالات جو الیکشن کی مہم کے دوران میں پریس اور پلیٹ فارم سے منظر عام پر لائے گئے، ان میں سے خاص خاص درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ اور ان کی رحلت کے بعد ان کے اتنے جانشین ہوں گے کہ باید و شاید۔ وہ ملک کے بہترین غزلگو ہیں۔ اخبارات و رسائل میں ان کے کمال فن پر کئی طویل مضامین نکلے۔ ریڈیو پر بھی تقریریں کرانے کی کوشش کی گئی لیکن اجازت نہ ملی۔ مختصر یہ کہ چونکہ ان کی ٹکر کا کوئی غزل گو سارے ملک میں نہیں ہے اور نہ آئندہ پیدا ہونے کی توقع ہے، اس لئے پرزور اپیلیں کی گئیں کہ شاعروں کے حقیقی نمائندے حضرت استاد ہی ہو سکتے ہیں، اس لئے ووٹ ان ہی کو دیا جائے!

حضرت استاد کے حریف حضرت مزدور آزاد شاعر ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق کو ردیف، قافیہ اور بحر سے بے نیاز ہو کر پیش کرتے ہیں۔ پیچیدگی زندگی کی حقیقت پرستانہ ترجمانی کا یہ طریقہ موزوں بھی ہے۔ سرمایہ داری کا استیصال، مزدور کی ترقی، انقلاب زندہ باد وغیرہ ان کے خاص خاص موضوع ہیں جن پر طرح طرح سے طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں کبھی نہیں تھکتے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان کے سامعین اکثر تھک جاتے ہیں یا سو جاتے ہیں۔ خدا اور آسودہ حال ہو جائیں تو عام طور سے توقع ہے کہ اور زبردست انقلابی نظمیں لکھ سکیں گے۔ آپ نے انتخابی مہم کے وقت ایک نظم لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی تھی۔ اس کو ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

زندگی کا چاندنی چوک

زندگی کا چاندنی چوک آ گیا۔
گلی سے نکل کر میں فٹ پاتھ پہ
ٹھہرا ہوا ہوں، ٹھہرا ہوا ہوں۔
کیوں؟
مجھے خود بھی نہیں معلوم
وہ دیکھو وہ دیکھو!
دولت کی بیٹیاں ہیں رواں قہقہوں کے ساتھ
کیوں تم میں گھوروں [illegible]
حسرت بھری [illegible]!

ان چاروں طرف ہے ایک شور محشر
سرمایہ داری ! سب کمیں تیرے
یہ موٹریں یہ بنگلے ہیں
آہ !
چیخ کیسی میرے کانوں نے سنی ؟
کیا ہوا یہ کیا ہوا !
موٹر کی ٹکر !
لا تا تو میرا ہتھوڑا
یہ نظام زندگی، اس کو نہ کیوں ڈھا دوں ابھی ؟
موٹر کی زد میں آکر اس شاہراہ پر
مزدور کا خون بہہ رہا ہے
خون بھی کیسا، گرم اور تازہ
اور مجھے غش آگیا !

غرض یہ کہ الیکشن کا ہنگامہ بہار پر تھا فریقین نے اپنے اپنے [illegible]یدوار کی حمایت میں جلسے کئے۔ جلوس نکالے۔ نعرے لگائے "حضرت استاد زندہ باد" اور "حضرت مزدور زندہ باد" پوسٹر دیواروں پر چپکا[illegible] "شاعری گل و بلبل و شمع و پروانہ کی داستان کا نام نہیں" "شعر شاعری [illegible] دردوں کا کام نہیں" "بے معنی تک بندی شاعری کی توہین ہے" "[illegible] [illegible]اعری کو یوں [illegible] کی مانند ہے" "حضرت استاد کو ووٹ دو" "حضرت [illegible]ور کو ووٹ دو"

یہ گولہ باری دونوں طرف سے بڑی شدت سے جاری رہی اور [illegible]ریت کے اس دور میں آزادی تحریر و تقریر کے حق سے پورا استفادہ [illegible]ا۔ اس کے دوران میں عوام کی معلومات میں بڑا اضافہ ہوا۔ مثلاً یہ بتایا [illegible] حضرت استاد نے شاعری کو تجارت بنالیا ہے۔ لوگوں کو غزلیں [illegible] کر دیتے ہیں اور نرخ فی غزل پانچ روپے سے لیکر دس روپے [illegible] ہے جن سرمایہ داروں اور دولتمندوں کے دسترخوان پر وہ اکثر [illegible] ہیں، ان کو غزلیں لکھ کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح سرپرستی اور [illegible] تی سے بات بنتی آرہی ہے۔ الیکشن کے لئے ان ہی تو ابوں کو روپیہ [illegible] یا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت استاد کی شاعری پر سخت تنقیدیں [illegible] ت میں نکلنے لگیں۔ ان میں ان کے کلام سے غلطیاں چن چن کر دکھائی گئیں [illegible] ہیں اور وقت ضرورت کام آئیں۔

دوسری طرف حضرت مزدور پر خوب پھبتیاں کسی گئیں۔ آزاد [illegible] لو ایک نیا، ایک فیشن بتایا گیا تعلیم یافتہ نوجوانوں کے قلب و دماغ سے تعبیر کیا گیا۔ بتایا گیا کہ ایسے شاعر [illegible] [illegible] جاتے ہیں مگر مزدور کو [illegible] [illegible] بنا پر جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اور سب تو ہو سکتا ہے شاعری نہیں ہو سکتی۔ شاعری تو لطیف جذبات و احساسات کے موزوں اظہار کا نام [illegible] وغیرہ وغیرہ۔

قصہ مختصر [illegible] اور [illegible] [illegible] جانے والے دہندوں نے خوب دعوتیں اڑائیں، مشاعرے ہوتے [illegible] حضرت استاد کی غزلیں طوائفوں نے سنائیں جو اچھی تھیں۔ [illegible] ہو، غزلیں اچھی تھیں۔

آخر وہ دن آپہونچا جب رائے دہندوں کو اپنے حق کا استعمال کرنا تھا اور جب عشق و عاشقی کے راگ الاپنے والی شاعری اور دعوت عمل اور درس انقلاب دینے والی شاعری کی قسمت کا فیصلہ ہونے کو تھا۔ خدمت خلق اور حقیقی نمائندگی کے دعوے تو دونوں نے کئے تھے، مگر کون معیار پر پورا اترتا ہے، اس سوال کا جواب آج دیا جا رہا تھا۔ ووٹر شعر پڑھتے ہوئے پولنگ اسٹیشن کو موٹروں میں روانہ ہوئے۔ موٹروں کے انجن بھی شعر گنگناتے معلوم ہوتے۔ رائے دہی کے دوران میں غیر شاعرانہ حرکتیں بھی لوگوں سے سرزد ہوئیں۔ ایک آدھ دفعہ ہنگامہ کی صورت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر پولیس کا معقول انتظام تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو شاعری جامہ سے باہر ہوتی نظر آئے۔

دونوں طرف سے یہ شکایتیں بھی سننے میں آئی ہیں کہ رائے دہی میں کچھ گول مال ہوا ہے۔ فرضی ووٹ دلوائے گئے ہیں۔ ممکن ہے یہ شکایتیں صحیح ہوں، ممکن ہے نہ ہوں، اور اگر صحیح ہوں بھی تو جنگ اور محبت کی مانند الیکشن میں بھی سب کچھ روا ہے۔

بہر حال وہ دن بھی گذر گیا۔ اب سب کو نتیجے کا انتظار ہے۔ مقابلہ بہت سخت ہوا ہے، اس لئے پیش قیاسی بہت دشوار ہے کہ بازی کون لے جائے گا — استاد یا مزدور — ووٹروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اس لئے آراء کی جانچ اور گنتی میں کئی دن لگ جائیں گے ——— !

اب کاپی پریس کو جا رہی ہے۔ نتیجہ کا اعلان [illegible] [illegible] انتظار کرو اور دیکھو !

———

ناکارہ [illegible]

بھول بھلیاں

"لفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ کوئیک مارچ!" اڑا اڑا دھم!!
فوج کی فوج کرسیوں اور میزوں کی منحنی اور کمانیوں میں دب گئی۔ اور غل پڑا۔

کیا اندھیر ہے۔ ساری کرسیوں کا کچومر کئے دیتے ہیں۔ بیٹھی رقیہ زمانہ داری تو ان مارے بیٹوں کو پوچھی تھی کو وہ بڑبڑا رہی تھیں۔

میرا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ بمشکل بجو دین کو کھینچ کھانچ کر نکالا۔ فوج کا کپتان تو بالکل چوہے کی طرح ایک آرام کرسی اور دو اسٹولوں کے بیچ میں پچکا پڑا تھا۔

"آں ... آں صلو بھیا نے کہا تھا فوج فوج کھیلو" رشید اپنی کاغذ کی ٹوپی سیدھی کرنے لگے۔ اور منو اپنے چھلے ہوئے گھٹنے کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے گھور گھور کر سہلا رہے تھے۔ اچھن چچا جان کے کوٹ میں سے باہر نکلنے کے لئے پھڑپھڑا رہے تھے اور ان کا منظر بری طرح پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر کپتان صاحب ویسے ہی ڈٹے کھڑے تھے۔

"یہ ہو کیا رہا تھا؟" میں نے کپتان صاحب کی سیاہی سے بنی ہوئی مونچھوں کو دیکھ کر کہا۔

"صلاح الدین اعظم رچرڈ شیر دل پر چڑھائی کر رہا تھا۔ منو کو ہنسی آگئی اور وہ لپٹ گیا۔" پھر کالی کرسی کھسک گئی اور بس" کپتان صاحب نہایت احتیاط سے مونچھیں تھپکتے ہوئے بولے۔

"اچھا۔ اور یہ اچھن؟"

"یہی تو رچرڈ ہیں" اور کیا، شیر دل، یہ منظر دیکھو ان کا، یہ شیر کے بال ہیں۔"

"اور جناب؟" میں نے چار فٹ کے کپتان کو نظروں سے ناپا۔

"ہم صلاح الدین اعظم" اور وہ اکڑتے ہوئے چلے۔

"اور کمی یہ میرا کوٹ تو اتارو ... سیاہی لگ گئی تو خدا کی [illegible] کروں گی"

[illegible] آپ کا کوٹ ... بات یہ ہے کہ اس کے بالوں [illegible] کو ...
[illegible] کوٹ اپنا"

[illegible] سوال بنا دیجئے" صلو [illegible] سلیٹ میری

تک کے پاس اڑا کر بولے۔

"تا بھی میں اس وقت تھک رہی ہوں ذرا"

"پھر تم آپ کو بیٹھنے بھی نہیں دیتے" صلو نے میرے پیروں پر گدگدیاں کرنی شروع کیں۔

میں نے پیر سمیٹ لئے تو وہ میری کمر میں سر اڑا کر بیٹھ گیا اور بکنا شروع کیا "پھٹ جائے، اللہ کرے جھیر جھیر ہو جائے یہ کرتا سوال تو بتاتی نہیں ہیں کیسے کفن سے جا رہی ہیں اپنا۔"

"چلو یہاں سے باجی ورنہ شوقی آ کر دو نگی" اور وہ وہاں سے ہٹ کر میری البم الٹ پلٹ کرنے لگا۔

"یہ کون ہیں چڑیل جیسی ... کالی مائی ... اور یہ ... یہ ......؟"

"صلو بھیا رکھ دے میری چیزیں" میں نے سوچا جن ہے یہ تو۔

"تو پھر سوال بتاؤ" اور وہ پھر میرے پاس گھس کر بیٹھ گیا۔

"ارے ذرا ہٹ کے گرمی کے مارے ویسے ہی آبلے جا رہے ہیں۔"

"تو میں کیا کروں" اور وہ مجھ سے اور لپٹا۔

"میری باجی کیسی پیاری ... بتا دو پھر سوال"

مجبوراً میں نے سوال کرنا شروع کیا۔

"اب یہ سوال سمجھا جا رہا ہے یا میرے بیٹوں کا معائنہ ہو رہا ہے" اور وہ جلدی سے سلیٹ پر جھک گیا میں بتا رہی تھی اور وہ بیوقوفوں کی طرح میرا منہ دیکھ رہا تھا۔

"اونہہ، میں چڑ گئی" "تم رہے ہو یا منہ تکتے ہو، صلو دق نہ کرو ورنہ مجھی جان سے کہہ دونگی۔"

"آپ کی تصویر بنا رہا ہوں" یہ دیکھئے، آپ کے ہونٹ بولتے میں ایسے ہلتے ہیں جیسے ... جیسے ... پتہ نہیں کیا۔ بس ہلتے رہتے ہیں" شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

"بھاگ یہاں سے" اور میں نے سلیٹ دور پھینک دی۔

وہ بڑبڑاتا ہوا الگ بیٹھ گیا اور میں اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں کہ چلے آ رہے ہیں اپنا بستر لو رہا

تھامے۔ یا اللہ خیر!

"کیوں تم پھر آ گئے یہاں؟"

"اور کیا۔ وہاں دل جو گھبراتا تھا۔" اور وہ پھر میرے پاس بیٹھنے لگا۔

"صلو اگر تم مانو گے نہیں تو....؟"

"تو...تو...ای۔" اس نے منہ چڑایا۔ "ہم تمہارے پاس بیٹھتے ہیں تو اچھا پڑھا جاتا ہے۔"

"اچھا تو چپکے بیٹھو۔"

صلاح الدین میرے چچا کا اکلوتا سپوت تھا۔ پھوپی آنکھ کا ہی تو ایک تارا تھا۔ اتنی لڑکیاں پیدا ہوئیں کہ چچا چچی بولا گئے اور پھر آپ تشریف لائے۔ جناب کی انگلی دکھے تو بکرے صدقے کئے جائے، تکبیر پڑھیں مانی جائیں، گھر میں کوئی زور سے نہ بولے، جوتے اتار کر چلو۔ برتن کھڑکے لاڈلے کی آنکھ کھل جائے گی۔ گھر میں اسی لئے کوئی کتا نہ بلا مرغیاں نہ رکھی جائیں کہ ننھے میاں کی کبھی نیند نہ خراب کر دیں۔ ورہم بچارے نہ لاڈ جانیں نہ لاڈ کریں۔ پھر بھی ماں بہنوں کا لاڈ اسے کچھ کڑوا لگنے لگتا تھا۔ اور وہ سارے وقت مجھی سے الجھتا۔ لوگوں کے "نان وائلنس" سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ یہی بات تھی کہ وہ جان جان کے مجھے چھیڑتا کیونکہ میں اسے بری طرح ڈانٹ دیتی اور کبھی کبھی چپت بھی رسید کر دیتی۔

لاڈلے پوت دبلے اور سوکھے تو ہوتے ہی ہیں اور اوپر سے چپلا پاتس جیسا قد۔ اماں تو نظر بھر کے نہ دیکھتیں، انہیں ڈر تھا کہ کہیں آونٹ صاحب کو نظر نہ لگ جائے، اور یہاں یہ کہ جہاں لمبی لمبی ٹانگیں پھینکتے آئے اور چھیڑنے لگے۔ یہ عادت سی ہو گئی تھی کہ کالج سے لوٹے اور اماں کو بلائیں دیکھا اور دادا صاحب کو نبض دکھا کر سیدھے میری جان پر نزول۔ کیا مجال جو گھڑی بھر خود نچلا بیٹھے یا بیٹھنے دے۔ بہنوں کو چھیڑتا۔ کسی کے گدگدی کی کسی کے گلے میں جھول گئے۔ کسی کے کندھے میں کاٹ لیا۔ میرے پاس آئے اور میں نے ضد پٹر دیا۔

گھنٹوں ماں بہنیں بیٹھ کر ارمان بھرے ذکر کیا کرتیں۔ پھر دلچسپ اور پُر مسرت بات صلو میاں کی شادی کے لئے اٹھا کر رکھ دی جاتی۔

"صلو کی شادی میں بناؤں گی سب کی گوالیر کی چندیری کی ساڑھیاں۔ اور بمبئی میں تو دہلی جا کر کروں گی سہیل کی شادی کی طرح اپنے دونوں طرف کے جہان آ گئے اور بس۔ اس گھر میں تو...."

"اور اماں انہیں [illegible] کے بیلاڈی اسی کو تاج کے لئے۔" ایک بہن بولتیں۔

"بھئی ہم تو سہرا وغیرہ سب باندھیں گے۔ زربفت کی اچکن ابا جیسی اور....."

بہنوں کے لئے بھائی تھا گویا جگمگاتا ہیرا! میری اندھی آنکھوں میں جیسے اور چھ سات بھائی تھے، یہ بھی ایک لڑنے جھگڑنے تو تو میں میں کرنے اور بات بے بات رعب جمانے والی ایک ادنیٰ ہستی تھی۔ میں ان کے ارمان بھرے دلوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات سے کملا جاتی۔ کاش میرے بھی اتنے بھائیوں کے بجائے ایک ہی ہوتا۔ ایک دبلا پتلا، آئے دن کا مریض۔ چنچنا لڑاکو۔ کتنا رومانٹک معلوم ہوتا!

"باجی ذرا کرتے میں یہ بٹن ٹانک دو۔" وہ اپنی پتلی گردن آگے بڑھا کر بولا۔ "جٹ پٹ ٹانکو مجھے جلدی میں جانا ہے۔" میں ناول کے ایسے حصہ پر پہنچ گئی تھی جہاں ہیرو ہیروئن کے بازوؤں تک پہونچ چکا تھا۔ بھلا اس قدر غیر رومانی کام میں میرا کیا جی لگتا۔

"رابعہ سے کہو وہ ٹانک دیگی۔"

"نہیں ہم تو تم سے ہی ٹکوائیں گے۔"

"میرے پاس سوئی بھی نہیں۔" وہ دوڑ کر چچی جان کی بقچی اٹھا لایا۔

"لو یہ سوئی۔"

"تاگہ پرو۔"

"لاؤ میں پرو دوں۔" چچی سرو نہ چھوڑ کر بولیں۔

"میں تو انہیں سے ٹکواؤں گا۔ لو سوئی۔"

مجھے ضد آ گئی۔ "رابعہ سے ٹکواؤ۔" ہیرو آگے بڑھ رہا تھا۔

مجھے آخری دو لائنیں پھر سے پڑھنا پڑیں۔

"نہیں ہم تو تم سے ہی ٹکوائیں گے۔ رکھو کتاب، ورنہ پھاڑ دوں گا۔"

"پھاڑ دی۔ بھاگ جاؤ نہیں ٹانکتے۔" میں نے کتاب دوسری طرح موڑ لی۔ اسے بھی ضد آ گئی۔

"آج یا تو تم سے بٹن ٹکواؤں گا یا اپنا تمہارا خون بہا دوں گا۔"

"چل ہٹ بڑا وہ ہوتا۔ بہا تو نہ بہاؤ اپنا خون بہاؤ۔"

ہیرے کی کنی کے خون بہانے کے ارادے ہی کو [illegible] لڑ گئیں۔ ان کا بس چلتا تو بٹن کی جگہ اپنی آنکھیں [illegible] دیتیں۔

"صلو لاؤ میں ٹانک دوں تو ابھی دیر میں" راشدہ بولی۔
"کہہ دیا صلاح الدین اعظم ایک بات جو کہہ دیتے ہیں وہ ٹلتی نہیں، دیکھو [illegible] ٹانکی ہو یا......"
"یا! کیا؟" میں نے تیوریاں چڑھائیں۔
"یہی کہ پیچ دیکھتے نہیں جاؤں گا اور ایک لفظ کتاب کا نہیں پڑھنے دوں گا۔ اور موقع ملنے پر کتاب پار کر دوں گا ___ اور... اور..."
مجھے ہنسی آگئی۔
"اوہو۔ لو بس تو پھر بیاری سی بچے کی طرح ٹانک دو"
میں نے بھی سوچا وبال کا ٹلیں۔ میں نے تو بٹن ٹانکنا شروع کیا اور وہ مجھے چھوڑنے کرنے لگا۔
"دیکھو صلو میرا ہاتھ ہل جائے گا تو سوئی کلیجہ میں اتر جائیگی۔"
"اتر جانے دو" اور اس نے پھر گدگدی کی میں نے سوئی مذاق میں چبھونا چاہی۔ وہ جلدی سے ہٹا۔ دھکے سے نہ جانے کیسے سوئی کی نوک چبھ گئی، خون بھی نکلا اور غضب یہ کہ نوک غائب۔ سنتے ہیں کہ سوئی کی نوک خون میں کھو جاتی ہے۔ دل میں جا پہنچتی ہے۔ دم نکل جاتا ہے۔
"ارے نوک" میرے منہ سے پریشانی میں نکلا۔
"میرے سینے میں اتر گئی۔ اور اب خون میں چلی جائے گی۔ اور پھر... پھر دل میں آجائے گی.... لو اماں جان ہم تو چلے" چچی جان کو سکتہ ہو گیا مگر وہ سنبھلیں اور چیخیں۔ رابعہ چیخی اور راشدہ چیخی۔ میرا یہ حال کہ مجرم کی طرح سوئی پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ صلاح الدین سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور لاچاری سے گریبان ٹٹولنے لگا۔
پھر جو ہلڑ مچا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ مجھ پر کیا کچھ گذری۔ ڈاکٹر حکیم اور نمازیں۔ اور میرا دل چاہے ڈوب مروں۔ آخر میں نے مذاق کیا ہی کیوں اور وہ بھی اس کانچ کے گلاس سے۔
کیا بتاؤں کیسی پشیمانی ہو رہی تھی۔ ایکس رے ہوا۔ سارے جسم میں سوئی ڈھونڈ ڈالی۔ مگر خاک پتہ نہ چلا۔ اور یہی مصیبت، چچی جان کے آنسو اور رابعہ، راشدہ کا ٹہل ٹہل کر دعا گیر مانگنا اور ہر سے صلو کا انتہا ترکر مرنے کی دھمکیاں دینا۔ میرے آنسو نکل آئے [illegible] میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔
"لو اب تو یقین آگیا آپ کو؟"
میں نے سر جھکا لیا۔
"اچھا یہاں آئیے تو ذرا میرے سر میں تیل ٹھیک دیجئے"

"اب مجھ میں ہمت کہاں [illegible] جب جاہے سر میں تیل ڈالنا شروع کیا۔ صلو فتح مندانہ انداز سے مجھے آنکھیں چڑھا کر دیکھتا اور مسکراتا رہا۔
"دیکھا میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ؟" وہ میری انگلی میں چٹکی نوچ کر بولا "سوئی تو میرے گریبان ہی میں رہ گئی تھی"
غصہ کے مارے میرا خون کھول گیا۔
"اچھا جانے دو۔ اماں جان کا سیکو مائیں گی میں نے سوئی پھینک بھی دی" میرے ہاتھ پھر ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ اور ہنسا۔
"اچھا باجی تجھے بھی اس کی سزا نہ ملی تو.... خیر" میرا جی چاہا اس کے بال نوچ کر دور دھکیل دوں "خدا تجھے...."
"مجھے تم سے کام کروانے میں مزہ آتا ہے۔ جب میں نوکر ہوا تو تمہیں اپنے پاس رکھوں گا"
"ہوش میں، میری جوتی رہتی ہو تیرے پاس"
"دیکھ لینا۔ میں تمہیں لے لوں گا ___ گود لے لوں گا ___ ہنستی کیوں ہو؟"
مجھے ہنسی آگئی۔
"اور پھر تمہیں ہوائی جہاز میں بٹھاؤں گا۔ ہاں.... یا" وہ آنکھیں گھما کر بولا۔

میرے امتحان آگئے اور میں کمرہ بند کرکے پڑھا کرتی۔ مگر صلو کہیں مانتا تھا۔ جہاں میں پڑھنے چلی اور وہ بھی موجود۔ میں نے سنجیدگی سے منع کر دیا کہ "اگر تم نے دق کیا تو میں بورڈنگ چلی جاؤں گی" بورڈنگ کے خیال سے تو چچا میاں کے گھر رہنا پڑا تھا۔
وہ خاموش پڑھا کرتا مگر گھنٹہ آدھ گھنٹے بعد کھسپھسی ہونے لگتی۔
"اب بھی انٹرول ہوگا" وہ کتاب بند کرکے میرے پاس آن گھستا۔ اور دس منٹ تک وہ اودھم مچتا کہ خدا کی پناہ۔ شرارت میں اسے کاٹنے کا مرض ہو گیا تھا۔
"بات یہ ہے کہ جی چاہتا ہے تمہیں کھا جاؤں" وہ ہنس کر دانت پیستا۔
"خود اپنی بوٹیاں چبا ڈالو" مگر وہ بُری طرح لپٹ جاتا، اور باوجود دھکیلنے کے تنگ کئے جاتا۔ کبھی مجھے غصہ آجاتا۔ لیکن عموماً اگر وہ کمرے میں نہ ہوتا تو کسی چیز کی کمی سی محسوس ہوتی۔ گھر کی ساری چہل پہل اسی ایک انسان کے دم سے تھی۔ بچوں کو چھیڑنا بہنوں کو رلانا، کبھی

لپٹ کر پیار کرنا اور منا لینا۔

امتحان ختم ہو گئے۔ اور گھر جانے کے خیال سے خوشی کے ساتھ دکھ بھی ہو رہا تھا۔

"کیوں جا رہی ہو چھٹیوں میں؟" وہ ایک دن بولا۔

"واہ میری اماں بیچاری اکیلی ہیں؟"

"اکیلی ہیں! جیسے انہیں بڑی تمہاری پروا ہے؟"

"ہوں اور نہیں تو تمہیں پروا ہوگی؟"

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ "سچ کہتا ہوں تجو.... سچ کہتا ہوں رہ جاؤ؟" اس نے پیار سے میرے کندھے پر سر رکھ دیا اور اپنی سوکھی باہیں میرے گلے میں حائل کر دیں۔

"ہٹو تو.... خیر ہو گی تمہیں میری پروا۔ مگر اب تو جاؤ گی؟"

"مگر میں کہتا ہوں کہ مت جاؤ" وہ ذرا ہٹ کر بولا۔

"بکواس مت کرو۔ جاؤ ذرا کسی کو بھیجو میرا سامان باندھ دے؟"

"اور میں کہتا ہوں تم نہیں جا سکتیں؟"

"ہنھ! بڑے لاٹ صاحب ہو نا جو روک لو گے؟"

"یاد ہے وہ سوئی؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"مکار ہو تم.. کہیں کے؟"

دوسرے دن صلو کو بخار چڑھا۔ سارے گھر پر جیسے آفت ٹوٹ پڑی۔ ذرا سا ملیریا اور یہ ادھم! مگر دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔

"اماں جان تجو کو روک لیجئے۔ آپ سے اکیلے تیمار داری نہ ہو سکے گی؟" جیسے سور کو بڑی تیمار داری کی ضرورت تھی!۔

"اے میاں بھلا وہ کیوں رکیں گی!" چچی اماں طعن سے بولیں "حمیدہ کو تار دے کر بلا لوں گی؟"

"نہیں اماں وہ اپنے بچے لیکر آن دھمکیں گی تو اور غل مچے گا۔ تو خود رک رہی تھیں اسکول میں پارٹی ہے۔ دوسرے جب ہم اچھے ہو جائیں گے تو سنیما دیکھنے چلیں گے؟"

"رک جاؤ تو کیا ہرج ہے؟" رابعہ نے رائے دی۔ اسی چڑیل کو کیا پتہ کہ یہ مکاری کر رہا ہے۔ بخار تو اتفاق سے آ گیا ورنہ وہ کچھ اور بہانہ بناتا۔ رکنا ہی پڑا۔

"صلاح الدین اعظم کا حکم!" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "میرے میں نکل آئیں تب تمہارے اوپر اصلی رعب پڑا کرے گا۔ لو اسی بات

پر ذرا سی برف کچل کر تو کھلا دو" چچی جان نے ذرا تفتیشی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں جلدی سے تولیے میں برف توڑنے لگی۔ کبھی کا لاڈلا ہو تو ہو۔ تم کیوں بکتیں۔ مگر وہ تو جھلسنا پڑا۔

"تجو... تجو..." کسی نے آہستہ سے مجھے پکارا۔

"کیا ہے؟" میں اٹھ گئی۔

"ذرا سا پانی" صلو نے اپنے پلنگ سے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ میں جلدی سے اٹھی۔ اندھیرے میں تھرماس ٹٹول کر پانی نکالا۔

"اماں تھکی ہوئی ہیں... بیٹھ جاؤ" اس نے سرہانے مجھے بٹھا لیا اور آہستہ آہستہ گلاس میں بہت ہلانے لگا۔ اسے میری طرح پسینہ آ رہا تھا اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ پانی پی کر وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"تجو!"

"کیا؟"

"میرا دل گھبرا رہا ہے؟"

"چچی جان کو جگاؤں؟" میں نے چاہا آرام سے اس کا سر تکیے پر رکھ دوں۔

"نہیں.... ہو مت!" اس نے اپنے پتلے پتلے ہاتھ میری کمر میں ڈال دیئے "دل گھبرا رہا ہے تجو!" وہ تیزی سے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اپنے کو چھڑانے کی کوشش نہ کی اور اس کی پیشانی پونچھنے لگی۔ وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی میرا نام لیکر بڑبڑانا شروع کیا۔ سسکیاں! وہ سسکیاں بھرنے لگا۔ عجیب سوکھی سوکھی سی اکھڑی ہوئی سانسیں۔ میں بھی نہ جانے کمبخت کو سر سام ہو گیا یا کیا، اور آسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

"تجو جاؤ مت... میں مر جاؤں گا؟" اور بری طرح بچوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ اور اس کی آنکھیں! وہ جیسے.... نہ جانے آج مجھے ان آنکھوں میں کیا نظر آ رہا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ شوخی سے تھرکنے کے بجائے جھکی ہوئی اور گہری تھیں۔ کچھ پاگل سی! کچھ عجیب! مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم ہوا گویا اندھیرے پیچدار راستوں میں پریشان چکر لگا رہی ہوں، اور کوئی راستہ نہیں ہے

کوئی قریب کے پلنگ پر کلبلایا۔ اور وہ جلدی سے چونک کر چلانے لگا.... "رابعہ جاگ گئی!" اس نے خوفزدہ ہو کر

پھر جلدی سے ... چادر میں اٹک کے چھپ گیا۔

میں پریشان لیٹ گئی۔ یا اللہ کیا واقعی یہ پاگل ہو رہا ہے؟ یا پھر رابعہ بگڑ گئی اور تو کیا ہوا؟ مجھے بھی جان پر رحم کرتے رہنا چاہئے۔ خواہ مخواہ ... خیر ......

اور اس کے بعد سے اس میں ایک غیر معمولی انقلاب ہو گیا۔ ذرا ذرا سی بات سے وہ پاگل گھبری اور سہمی سہمی آنکھیں کبھی بغیر بخار اور ہذیان کے بھی کچھ عجیب ہو جاتیں۔ وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ چھیڑنے اور جلانے لگا۔ مجھ کو ہر وقت الجھتا اور پھر بالکل پاگل ہو جاتا۔ وہ میرے قریب میں رہنے کے بہانے تراشتا۔ ہر جگہ پیر کرے اور ہر موڑ اور کونے پر وہ میری تاک میں مجھے ڈرانے اور گدگدانے کے لئے چھپا رہتا۔ میں اس کی ضرورت سے زیادہ توجہ سے کبھی بے طرح پریشان ہو جاتی اور کبھی مجھے وہ سب ایک الھڑ لڑکے کی شرارتیں معلوم ہوتیں اور یہ شرارتیں کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں!

دو سال بعد جب میں رابعہ کی شادی پر آئی تو صلّو کو صلاح الدین اعظم کہنا پڑا۔ اُف وہ ایک چھوٹا سا لچکتا ہوا کملایا سا پودا نوخیز درخت بن گیا تھا۔ خون کی حدت سے چہرہ سانولا گیا تھا۔ اور پتلے سوکھے زرد ہاتھ سخت گٹھلیوں دار مضبوط شاخوں کی طرح جھلسے ہوئے بالوں سے ڈھک گئے تھے۔ اور آنکھیں تو بخدا بالکل ہی پاگل ہو گئی تھیں۔ پتلیاں ناچتی ہی رہتیں اور ایکدم سے جم کر گہری ہو جاتیں کہ فوراً آنکھ جھپک جاتے۔

"سچ مچ کچھ میری مونچھوں کا رعب پڑتا ہے!"

"خاک! اسقدر وحشی شکل ہو گئی ہے"

"اور تمہاری بڑی بیہودی ہے نا" اس نے مجھے گدگدانا چاہا۔
میں اس کے بڑے بڑے ہاتھ دیکھکر ہی لرز گئی۔

"ہٹو صلّو ... خدا کے لئے تم سے تو ڈر لگتا ہے۔ سچ مچ بھوت ہو بالکل"

"ہاں؟" اور وہ فوراً ہی سے اور نکل گیا۔

"ارے میں اور وہی بھی صلّو ....." اس نے زبردستی اپنا منہ ... میرے ہاتھ پر زور سے رگڑ دیا۔ سارا ہاتھ جھلا اٹھا ... کبھی آتی ... نہ جانے کیوں؟

... ہندوستانی طور طریق۔ گھر کیا ہوتا

یہ ایک بھول بھلیاں کا راستہ۔ جس میں مزے سے آنکھ مچولی کھیلو۔ سر کو پیر کی خبر نہیں رہتی۔ اور نہ جانے کتنے کھلاڑی آنکھ مچولیاں کھیل رہے ہوتے ہیں۔ کبھی دو چیلوں کی کسی کونے میں ٹکر ہو جاتی ہے تو پھر جھینپ! مزہ آجاتا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے ہر کونے ہر دیوار کی آڑ میں ہر زینہ پر کئی کئی صلاح الدین کھڑے ہیں۔ آپ کدھر بھی نکل جایئے ناممکن جو صلاح الدین نہ موجود ہو جائے۔ بعض وقت تو یہ معلوم ہوتا گویا آسمان سے ہی ٹپک پڑے۔ میں عاجز آکر رابعہ کے پاس گھس گئی۔ لو وہ تھوڑی دیر میں لاڈلا بھیا بہن کی صورت دیکھنے کو موجود! اور پھر یہ کہ ہم دونوں رضائی میں بمشکل سما رہے ہیں۔ کہ جناب مع اپنے بے ڈول ہاتھوں اور چوڑے کندھوں کے اسی رضائی میں گھسیں گے۔ کس سے شکایت کی جائے کس کے آگے گلا کریں؟ یعنی اُن جگر کے ٹکڑے، کلیجے کی کور، کی کس سے شکایت کی جائے؟ اور کیا شکایت ہو؟ گھرک دو۔ سنجیدگی سے ڈانٹ دو۔ آپ ہی شرم آئے گی۔ مگر وہ سنجیدہ ہونے کا موقع بھی دے۔

"جاؤ صلّو سر میں درد ہے" جو یہ بہانہ کیا تو۔

"سر میں درد؟ ارے اماں جان بام کہاں ہے۔ ڈرائیور کو بھیجئے ڈاکٹر سے اسپرو لائے۔ اور جو بھی کوئی شور کرے گا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ چلو رشو، حمید، منی کھسکو یہاں سے، بجّو کے سر میں درد ہے" دروازہ بند! یا اللہ! لیجئے سر کا درد غائب اور اماں جان سے ضروری کام نکل آیا۔

"کیوں بجّو جھوٹی! کہہ رہی تھی سر میں درد ہے اور یہ یہاں پوریاں تلی جا رہی ہیں" لیجئے باورچی خانے میں بھی موجود۔ اب بھاگئے! کبھی آنچ بگاڑ دی کبھی کچھ اور پھر وہی شرارتیں! باورچی جانتا ہے کہ میاں بے چین بوٹی ہیں۔

"بی بی آپ بھی جایئے اور صلّو میاں بھی۔ ورنہ مجھ سے کھانا پک چکا!"

"صلّو مجھے تم سے ایک بڑی ضروری بات کہنی ہے" میں نے سوچا آج انہیں سنجیدگی سے ڈانٹوں۔

"کس سے؟ مجھ سے؟ ... ارے میرے بھاگ!" ایسے خوش گویا تمغہ ملنے والا ہے۔

اب ضروری بات کہنے سے پہلے خود اس قدر ضروری خدمات انجام دینا شروع کیں کہ بھاگتے ہی بن پڑے۔

کیا لوگ اندھے ہوتے ہیں؟ دکھائی نہیں دیتا انہیں؟ آنکھ ...

میں تو بڑے بڑے شاہ پکڑ جاتے ہیں۔ اور یہ صلاح الدین صاحب بیچارہ! ان دہاڑ سے فاکر ڈالنے سے نہ چوکنے والے لوگ سمجھتے ہیں بچہ ہے!

سنیما میں لوگوں کو بس عورت ہی عورت دکھائی دیتی ہے خواہ ہزاروں مرد کام کر رہے ہوں۔ اور میں بھی عورت تھی۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ چند ایسے غیبدار بھی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت نہ کسی کے پیچھے کا حکم دیکھیں نہ جگر کی ٹھنڈک، کھڑی دھار پڑتی ہے تلوار کی۔ مجھی کو تو الزام دے گی دنیا! یہ تو کوئی دیکھتا نہیں کہ فتنہ...... ! غصے سے آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔

"ہٹ جاؤ صلاح الدین۔ حد ہوتی ہے بیہودگی کی۔ مجھے یہ بات پسند نہیں۔"

"ایں" اس کا منہ اتر گیا "کیا ہوا تجھ؟"

"کچھ نہیں... تمہیں معلوم ہے لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"میرا بولنا... میرا... آپ کو برا لگتا ہے؟"

"ہاں۔ مجھے بہت برا لگتا ہے۔ اچھی بات نہیں۔ لوگ... "

"لوگ؟... کون لوگ؟۔ کون لوگ ہیں وہ مجھے بھی بتاؤ خدا کے لیے"

"کوئی بھی ہوں وہ، میری اور تمہاری بہتری چاہنے والے"

"بہتری!" وہ سُرخ ہو گیا۔

"ہاں اسی میں بہتری ہے" اور میں تیزی سے چلی آئی۔ دل پر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ آخر کو میں نے کہہ ہی دیا۔ عزت کے تو ہاتھ میں ہو خواہ وہ بدنام ہو جائے خواہ عین موقع پر آنکھیں کھل جائیں اور اُسے عاقبت نظر آنے لگے۔ آنکھیں کھل گئیں اور خوب موقع پر کھلیں! میں دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔

صلاح الدین آیا میں حسب عادت چوکنی ہو گئی۔ مگر گذر اچلا گیا! اس نے مجھے دیکھا تک نہیں! میرے دل پر گھونسہ سا لگا۔ خیر۔ اونہہ... کیا ہے۔ بہتری اسی میں ہے۔ بلا سے جان چھوٹی۔ کسی وقت سکون ہی نہ تھا۔ اب تو...... خیر! اور گھر کے ہر کونے اور ہر موڑ پر آب کوئی بھی تھا؟ گویا امن، چین اور سکون! لیکن یہ پھر پریشانی کیسی؟ ایک فکر سی، ایک پستی، گویا کمان اتر گئی، دھار کُند ہو گئی۔ گویا کچھ بھی نہیں۔ اب کوئی آپ کو دیکھ کر کھنچا نہیں چلا آتا۔ کسی کو شرارتیں نہیں سوجھتیں، اب کسی کی عجیب اور پاگل آنکھیں آپ کے پیچھے نہیں دوڑتیں۔ جائیے شوق سے جائیے۔ اندھیری کوٹھڑی میں بھی چلے جائیے کوئی مزاحمت نہیں کرتا۔ چور ملتا بھی ہے تو آپ کو جھک کر آداب عرض

ہوتا ہے اور سر جھکا کر جلد چلا جاتا ہے ایک طرف۔ اب کوئی آپ کے پاس گھس کر بیٹھنے کا شوقین نہیں۔ بچہ تو وہ... وہ سامنے کس لڑکیوں کے جھرمٹ میں شرارت بھری آنکھیں چمکا کر خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ کبھی بھولے سے بھی اگر آنکھ مل جاتی ہے تو سر جھکا جاتا ہے۔ پہچانتا تک نہیں!

شادی کے گھر میں معلوم ہوتا ہے موت ہو گئی۔ ایک موت نہیں سینکڑوں موتیں۔ ہزاروں خیالات سینکڑوں جذبات اور ان گنت مسکراہٹیں مُردہ پڑی ہیں۔ گھر میں بجائیں بجائیں کر رہا ہے۔

اور کبھی تو معلوم ہوتا ہے کبھی تھیں ہی نہیں کوئی ایک رابعہ تو دولہا کے خیال میں مست۔ عقیدہ کا بچہ ضروریاتِ زندگی ہی سے فارغ نہیں ہو چکتا۔ جی چاہا بچہ شادی سے چلدوں کالج۔

دیکھنے والوں نے دیکھ لیا اور تاڑ بھی لیا۔

"ارے یہ صلو کی اور تمہاری کیا ان بن ہو گئی ہے؟" چچی بولیں۔

"نہیں تو" میں جلدی سے بولی۔

"جھوٹ" صلو نے دبی آواز میں کہا اور کھانے کی پلیٹ پر جھک گیا۔

"اوئی! چھوٹوں سے کیا غصہ۔ چلو صلو باجی سے معافی مانگو"

"جی نہیں... یہ خود مانگیں معافی" صلو اکڑے۔

"معافی وافی کیسی؟ کوئی لڑائی نہیں ہوئی" میں نے معاملے کو سیدھا کرنا چاہا۔

"جی نہیں میری تو ہے لڑائی"

"یہ کیوں آخر ہوا کیا؟"

"ہوا یہ... کہ خواہ مخواہ ڈانٹنے لگیں... " میں ڈری۔

"کچھ بھی نہیں چچی جان یہ مجھے چھیڑ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا مجھ سے مت بولو۔ بھلا میں اس سے لڑوں گی" میں جلدی سے بولی۔

"نہیں اماں جان... کیسی بھولی بن رہی ہیں۔ ایسے انہوں نے نہیں کہا تھا..." اور میں ڈری کہ کہیں اس نے کچھ دیا سب کے سامنے تو کیا ہو گا۔ مجھے خیال ہوا کہ میری غلط فہمی ہو گی۔ شاید یہ بھی اس کی شرارتیں ہیں اور...... اور شاید یہ شرارتیں ہی ہوں لعنت ہو کہ میں اسے اس قدر ذلیل سمجھی!

"مجھے ایسی بُری طرح جھڑکنے لگیں۔ ... جیسے میں کوئی... وہ ہوں..."

"ارے میں تو یونہی کچھ کہہ رہی تھی" یہ جیسے خواب ہو گیا! آپ یہ

ہوائی بات پر جھلا اٹھیں ۔۔۔ کس قدر سردی سے ساری
مسافر پہلو اٹھے پڑی پہرے پہ کہ کسی اور کو بھی اوڑھا ہو؟
داستانی میں گھس کر بیٹھ گیا اور میرے اتنی چٹکیاں لیں کہ
ہر طرف سے بھرا گیا۔

• منگو عالم ماسٹر یہ بھوگے میں نے یہ کہا اور وہ کہا۔ "جی
جان معصومیت سے مسکرا رہی تھیں۔

بتاؤ پھر کیسے تم نے پہلو بار ہی کہ نہیں؟

• ہاں میں تم سے جیتی اور نہ جیتنے کا شوق۔ بس وہ ہنسا؟
دنیا کی ہر چیز ہنس پڑی۔

اور پھر وہی آگ بھڑک اٹھی! وہی بھول بھلیاں! اور عاقبت؟
ایک دفعہ تو عاقبت بھی کھلکھلا پڑی۔ کوتا کوتا مسحور کن نغموں سے
گونج اٹھا۔ کان بھنک ہو گئے اور آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ میٹھی میٹھی
کھنک والی ریت!

اور اب قصور کس کا؟ قصور تو ہونا ہی ہوا کسی کا۔ تقدیر کا؟
بیچاری تقدیر! بات یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کی آزمائش
کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ۔۔۔ وہ تاکہ دیکھے ۔۔۔ یہی کہ بس دیکھی!
جیسے ہم سب تماشہ دیکھتے ہیں! ڈر ۔۔۔ دھڑکا۔ بدنامی، ذلت، پریشانی
بربادی، تباہی کا المیہ ۔۔۔ اور سب کچھ ایسے ہی موقع کی تاک میں رہتے
ہیں۔ کبھی تماشہ میں مجبور تو آپ ہی چھا جائے گی۔ کبھی پہلے خوب
ٹھوک بجا کر دیکھ لیتے ہیں کہ کہیں گزر تو نہیں۔ رسی تو کمبی کھینچتی
ہیں۔ ورنہ آپ ہی کھنچی آتی ہے۔

لڑائی کے چلنے سے چند دن پہلے تشریف لائے۔ ننھا بھی آ رہے
تھے والفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ کرتا تھا۔ آپ دیکھ کر ایسے سٹپٹائے
کہ بس۔

ملکی جنگ کا سے مجھے ہی ضرورت ہے میں نے سوچا۔ بڑے بڑے دل
جاتے ہیں اسے دیکھ کر۔

تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟

کیا ۔۔۔؟

[illegible] گھورنے لگے۔

[illegible] کی بات چھپا کیا تھی۔ میں نے
[illegible]
[illegible]

• کیا بتاؤں؟ ۔۔۔ ہاں تم اپنی کہو، میری جان! تمہارا قصے جیتے کو
کیسے لڑائی پر بھیج دیا؟ وہ میں نے بات پلٹی۔

• لڑائی پر ۔۔۔ وہ ۔۔۔ ہو گا ۔۔۔ تم پہلے یہ بتاؤ ۔۔۔ کہ ۔۔۔ وہ کس
طرف کی طرف سے۔

• سمجھ ہی میں نہیں آتا تمہاری تو ۔۔۔ کہاں تم تھے ۔۔۔؟

• ہوں، منگو کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ کچھ کھسیانی ہنسی سی
کھسیانی صورت۔

• جی گھبرا رہا ہے؟ میں نے چھیڑا۔

اور اُن کی رنگت بدلی۔ سمجھا بھی اور گیا اس کا جب شاید
تلخی سے کہا گیا۔

• خاک تمہارے منہ میں۔ خدا نہ کرے! میں نے ننھے کو
کلیجے سے لگا لیا۔

• ٹھائیں ۔۔۔ ننھے نے موقع پا کر بندوق چلائی۔

• ہائیں ۔۔۔ باجی ۔۔۔ ابا کو مارتا ہے؟ میں نے بندوق
چھین لی۔

اور پھر آنکھوں میں وہی شرارت تڑپی ۔۔۔ پھر ۔۔۔ بلا کی
گہری ہو گئیں ۔۔۔ کچھ پاگل! ۔۔۔ عجیب سی! ۔۔۔ ٹٹولنے کے باوجود
اس بھول بھلیاں میں راستہ نہ ملا۔

عصمت چغتائی!

دیوانگی

(بسلسلہ صفحہ [illegible])

ان حرکات کی بنا پر دیوانہ نہیں کہا گیا۔ مگر یہ ہمیشہ کامیابی کے بعد ہوا لیکن
کامیابی صلاحیت کا نتیجہ نہیں، بلکہ کامیابی کا انحصار ماحول اور موقع پر
ہے، لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ چونکہ ان میں صلاحیت تھی اس لئے ان کو
کامیابی ہوئی۔ اور اس سے اس نظریہ کی تائید نہیں ہوتی کہ دنیا میں اکثر
وہ انسان بھی پاگل کہے جاتے ہیں جن کی دماغی صلاحیتیں معمولی انسانی
معیار سے بلند ہوتی ہیں۔ اور یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کون شخص واقعی
میں پاگل ہے اور کون ایسا ہے جس کو ہم نے پاگل کہہ رکھا ہے حالانکہ
وہ پاگل نہیں کہا جا سکتا جیسے ہم سب پاگل ہیں۔

محمد احمد سبزواری!

[illegible] محراب سلطنت کہ ہو ماویٰ جہان میں
ہیں خاک میری نظروں میں [illegible]
ہوتا نہیں ہے حوصلۂ دل کا امتحاں
منزل بہ انس وحش کی یہ نامزا زمیں
ہرگز کوئی نظر میں سمانے کی شے نہیں
الفت سے دو دلوں کی عبارت ہے زندگی
قیمت بتاؤں کیا تمہیں تاج و تخت کی! (گلے لگاتا ہے)
ہو زندگی کا لطف وصال حبیب ہے
تم پاس ہو تو کیا نہیں میرے نصیب میں!

بطرہ۔ کیا خوب فن ہے۔ داد نہیں اس دروغ کی
حضرت کی فلویا سے محبت نہ نبھ سکی!
آجاؤں ایسی باتوں میں احمق نہیں ہوں میں
یہ مہرباں تو خیر رہیں گے وہی جو ہیں

ن۔ سوگند پاس الفت و ہنگام عیش کی
گھڑیاں نہ یوں تلف کرو باتوں میں طیش کی
بیکار کیوں گنواتی ہو کوئی لمحۂ حیات
کیا ہیں بتاؤ سیر کے سامان آج رات؟

بطرہ۔ بس آپ چھیڑتے ہیں نہ مجھ کو اڑائیے
روما سے آنے والوں کو جلدی بلائیے

لنی۔ (جھنجھلا کر، ذرا درشت لہجے میں، جو چند الفاظ سے زیادہ اس کا ساتھ نہیں دیتا۔)
بس شرم کر اے ملکۂ طناز۔ باز آ!
دیتا ہے زیب جس کو ہر انداز ہر ادا!!
کھلتی ہیں تجھ پہ زاریاں، دشنام، قہقہے
انداز کو نئے ہیں جو زیبا نہ ہوں تجھے
میں کیا کروں شگافتن کے کسی کے پیام کو
ملعون پیام جب ہے کہ میرا پیام ہو
پہلو میں تو اگر ہو تو پھر کیا کسی سے کام
تم پاس ہو تو کار رفتہ ہیں غلط تمام!!
ہم دونوں چل کے سیر کو جائیں گے آج رات
اور جب کے ایک گشت لگائیں گے آج رات
دیکھیں گے جا کے شہر میں خلقت کا رنگ ڈھنگ
دلچسپ ہوں گے عصر کے لوگوں کے طور ڈھنگ

[illegible]
[illegible]
(انطونی، قلوبطرہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ باہر چلے جاتے ہیں)

دمتریس۔ قیصر کا انطونی یوں ہی کہتے ہیں کیا وقعت؟!
فائیلو۔ جی اور کیا کریں یہ ہوں گے یہی ہیں اگر
غفلت میں بھول جاتے ہیں شائستگی بھی تو
گو یہ تماشا آج بھی حصہ انہیں کا ہے
دمتریس۔ افسوس سچ ہی ہوتی ہے ثابت وہ سب بیاں
روما میں لوگ کہتے ہیں جا کر جو چغلیاں
دیکھا ہے ہم نے آج تو نقشہ بہت ہی غیر
کل صبح دیکھو کیا رہے احوال۔ شب بخیر!

منظر ۲

(شارمین، اراس (کنیزیں)، الیکسس (قلوبطرہ کا ایک خادم) اور ایک نجومی داخل ہوتے ہیں۔)

شارمین۔ خوب الکس، حسین الکس، نوجوان الکس!
کیا بات خوبیوں کی تمہاری میاں الکس!!
اچھا تو وہ ہمارے نجومی یہی ہیں کیا
آیا تھا جن کا ملکۂ عالم سے تذکرہ؟
کیوں صاحب آپ غیب کی باتیں بتاتے ہیں؟
سنتی ہوں ہاتھ دیکھ کے سب جان جاتے ہیں!
نجومی۔ پڑھ لیتا ہوں میں دفتر قسمت کے چند حرف
الیکس۔ دکھلاؤ ان کو ہاتھ کریں علم صرف

(انوباربس، انطونی کا ایک مصاحب لئے ہوئے جام داخل ہوتا ہے)

انوباربس۔ مجلس جماؤ جلدی سے اور خوب ہی پیو
ہاں جام آج ملکہ کی صحت کا نوش ہو!
شارمین۔ اچھے نجومی اب کوئی فال سعد نکلوں
ہر روز تین شاہوں کی بیگم بنا کروں!
بس پہلے کر دو بچے بھی اس سال کو ہیں ہیں
نجومی۔ قسمت جناب کی تو کہیں دیکھتا ہوں میں
شارمین۔ اچھا تو پھر بچے کوئی اچھی سی دیکھ دو
ہر روز تین شاہوں سے بیاہا ہوا ہو
اک صبح، ایک دوپہر کو ایک شام کو

[illegible] حسین [illegible]
پھول [illegible] [illegible]
[illegible] جو [illegible] کے [illegible] کو
شاعری کی [illegible] قیصر ثانی سے دو [illegible]
[illegible] ہے کبھی [illegible] ہے [illegible]

نجومی۔ بیگم نے آپ [illegible] ہی پائیں گی
اراس۔ جی [illegible] کے جائیں گی
شارمین۔ ہاں [illegible] بھید پسند ہے
[illegible] کیا ہوں انجیر جیسی [illegible]
نجومی۔ [illegible] کے بڑی سرخرو میاں
اراس۔ [illegible] روغن و غازے کو چھڑیاں!
شارمین۔ پھر نکلیں دیکھیو میاں کیا بدزبان ہو
اُف مجھ کو چھڑیوں سے تو مالک بچائیو!
الوبارلیس۔ اچھا تو آؤ رات کو ہم بھی چڑھائیں گے
دو چار جام اپنے مقدر کے نام کے
نجومی۔ کچھ عشق کا بھی مزا ابھی ضرور آپ پائیں گی
چاہیں گے جتنا اتنی چاہی نہ جائیں گی
شارمین۔ لو میں کسی کے عشق کی دوزخ میں کیوں جلوں
گرمی شراب ہی کی جگر میں نہ کچھ کم [illegible]!
اچھا اب آپ دیکھیے قسمت اراس کی
بتلائیے یہ چھوکری کیا گل کھلائے گی
اراس۔ ہاں دیکھیو ہاتھ کی اپنی بھی ایک ہے
[illegible] ہے کہتی ہو یہ شخص نیک ہے!
اب اور کچھ نہ ہو تو مرا کیا قصور ہے
پھاگیہ تو ہاتھ میں نہ تا [illegible] ضرور ہے!
شارمین۔ دیتا ہے آبرو کا یہ جی ہاں یونہی پتا
جیسے نشاں ہے نیل کی طغیانی [illegible] کا [illegible]
[illegible] کی ایک بھی [illegible] سے نہ پوچھ لو
کیا بات ہے [illegible] بھی بدنصیب ہو
[illegible] کس [illegible] کا [illegible] ہو
[illegible] کی [illegible] ہو

اراس۔ جب چھوکری کہیں کی بڑی خوش بیاں نہیں
شارمین۔ لو دیکھو تو ہتھیلی جیسی ہوتی ہے ہیں!
"جنم پھر گو دو گیلی ہتھیلی نہیں جینا!"
یہ بات جھوٹ ہو تو مرے عشق پہ تھو کنا۔
نجومی۔ تھوڑا ہی فرق ہے گماں میں اور آپ میں
دونوں کی ایک ہی نظر آتی ہیں قسمتیں
اراس۔ میں اور یہ ایک ہو گئے کیا خوب واہ وا!
نجومی۔ مانو نہ مانو ہوگا وہی جو میں کہہ چکا۔
شارمین۔ اے لو تنک آنکھیں ذرا تو رے تو دیکھنا
ہاتھ ایک سا کہا تو انہیں عیب لگ گیا
دعا ہے ہمارے عیب خداوند عیب پوش
وہ آئے آقلتی نہیں شکر ہیں۔ بس خموش

(قلوپطرہ داخل ہوتی ہے)

قلوپطرہ۔ سرکار کو بھی دیکھا ہے تم نے؟
الوبارلیس۔ نہیں حضور!
قلوپطرہ۔ تو کیا وہ اس جگہ نہیں آئے؟
الوبارلیس۔ نہیں حضور!
قلوپطرہ۔ حاضر تھی آج ان کی طبیعت مگر ابھی
بیٹھے بٹھائے پھر انہیں روما کی پڑ گئی
دیکھو کہاں ہیں ان کو بلاؤ تو۔ تم چلو!
الیکس۔ لیجے حضور خود ہی چلے آرہے ہیں جی
قلوپطرہ۔ ہاں کیا تو ہے۔ وہ آئے۔ مگر کس کے ساتھ ہیں؟
بس آؤ میرے ساتھ چلو۔ پھر ملوں گی میں

(انطنی، ایلچی اور پہرہ داروں کے ساتھ داخل ہوتا ہے)

ایلچی۔ بیگم نے آپ ہی کی پہل کی تھی جنگ میں
انطنی۔ تو لوسیس نے لڑائی کی سوجھی تھی کیا انہیں؟
ایلچی۔ جی ہاں مگر یہ جنگ فقط چھڑ کے رہ گئی
تھی مصلحت اسی میں کہ کر لیتے دوستی
قیصر سے ان کی فوجوں کا پھر معرکہ ہوا
یونان کی سمت ان کو بالآخر بھگا دیا
انطنی۔ اچھا اس سے بھی کوئی منحوس تر خبر؟

علہ [illegible] حضرت عیسیٰ کی ولادت کے [illegible] سے [illegible] کو قتل کرا دینے کا حکم دے دیا تھا۔
علہ [illegible] خیال [illegible]

شبیکیس۔ قاصد پہ بد خبر کا مقرر ہے بد اثر!

انٹنی۔ ہاں جبکہ کوئی احمق و بزدل سُنے۔ کچھ
گزرا سو گزرا۔ رنج نہیں مجھکو۔ ہو سو ہو!
حق بات ہے جو ہوتے ہیں بہر ہم وہ اور ہیں
سُن لوں پیامِ موت بھی تحسیں کہہ کے میں

ایلچی۔ سرکار! لے بِنس نے۔ یہ ہے سخت سانحہ
ہے ایشیا فرات تلک فتح کر لیا۔
فوج اس کی ملکِ شام کو کب کی گزر چکی
اور اب تو آئیونیا کو بھی فتح کر چکی
جبکہ ——

انٹنی۔ (بات کاٹ کر۔)
ہاں جبکہ انٹنی ——یہی کہتا ہے تو ضرور

ایلچی۔ سرکار!

انٹنی۔ کہہ صاف صاف مجھ سے ترا آئیں کیا قصور
سچ سچ سنا۔ جو کچھ ہو دنیا وہی بتا
کہتے ہیں روم میں قلوپطرہ کو لوگ کیا؟
باتیں وہ فلویا کی زباں میں سُنا مجھے
جو انتہائے غیظ میں کوئی بنا سکے
اسکو بھی ایک طنز و قابہا سمجھتا ہوں میں وہاں نشتروں کا خوب مزا جانتا ہوں میں
انسان کو ابھارتی ہے عیب کی خلش
باقی ہے طبع طنز و ملامت سے پرورش
اچھا بس اب قیام کرو پھر ملوں گا میں
حاضر ہوں اب وہ لوگ جو یونان سے آئے ہیں
(ایک چوبدار تسلیم کر کے باہر جاتا ہے۔)

انٹنی (خود سے) ہائے اب اس مقام سے چلنا ہی خوب ہے
اس دامِ پر فسوں سے نکلنا ہی خوب ہے
حالت یہی جو اور بھی کچھ آن رہ گئی
پھر یا یہ شوقِ دل رہا یا جان رہ گئی
(دوسرا ایلچی داخل ہوتا ہے۔)

دوسرا ایلچی۔ ہو جان کی اماں تو کہے کچھ یہ کمتریں

انٹنی۔ یعنی؟

دوسرا ایلچی۔ حضور آپ کی بیگم گزر گئیں!

انٹنی۔ [illegible] سے لاتے خبر؟

دوسرا ایلچی۔ —— سا تھیاں سے
احوال سب ملاحظہ اس خط میں کیجئے
(ایک خط سامنے پیش کرتا ہے اور رخصت کر دیا جاتا ہے)

انٹنی۔ کیوں اے دلِ حزیں یہی تھا مدعا ترا!؟
لیکن ہے حق یہی کہ عجب شے تھی فلویا
قدر اُس کی آہ اٹھ لی مرحوم آب ہوئی
قیمت متاعِ بردہ کی معلوم اب ہوئی
انساں میں خو ہے وحشت کی تغیر پسند ہے
پیش نگہ اگر ہے تو ہر چیز ہیچ ہے
جب تک رہی نظر میں تو ناکارہ بن گئی!
پنہاں ہوئی تو حاصلِ نظارہ بن گئی!
یہ سانحے، یہ رنج یہ آفات۔ الاماں!
لے نازنینِ مصر تیرے طلسمات الاماں!
اس سحر کار ملکہ کے افسوں کو کیا کروں
بے اختیاری دلِ محزوں کو کیا کروں
لیکن اب اس طلسم کو توڑا ہی چاہیے
رُخ اس جہانِ عیش سے موڑا ہی چاہیے
فتنے ہزار ہا کہ نہ جن کا گمان ہو،
اُٹھتے ہیں اور بھی مری غفلت سے۔ کیوں انو؟
(انوبار بس داخل ہوتا ہے۔)

انوبار بس۔ ارشاد عالی![1]

انٹنی۔ مجھے فی الفور یہاں سے چل دینا چاہیئے۔

انوبار بس۔ تو پھر یہ ہماری حرم کی عورتیں تو مر مٹیں۔ دیکھتے نہیں آپ ذرا سی کج ادائی ان پر کیا ستم ڈھاتی ہے۔ پھر اگر ہماری جدائی کا منہ دیکھنا پڑا تو بس لیجیے قصہ ختم ہی ہے۔

انٹنی۔ مجھے چل دینا چاہیئے۔

انوبار بس۔ معاملہ ایسا ہی اہم ہو تو خیر ایسی تیسی میں جائیں حرم کی بیبیاں مگر بن بات کے ان کو چھوڑ کر جانا بھی ستم ہوگا۔ ہاں کسی بڑی مہم کے آگے ان کا کچھ شمار نہیں۔ لیکن قلوپطرہ نے جو کہیں بھنک بھی پالی تو وہیں جان دے دیگی۔ میں تو اُس کو اس سے کہیں ادنیٰ باتوں پر بیس دفعہ جان سے جاتے دیکھ چکا ہوں۔ میں تو جانوں موت [illegible]

---

[1] انگریزی نظم سے نثر کی طرف یہ گریز بالخصوص مزاحیہ [illegible] شیکسپیئر کے ہاں عام ہے۔

میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ لطیف جذبات موجود ہیں کیونکہ اس کے پاس جوڑ توڑ کے آلات ہیں۔

الکلنی۔ اسکے کمالات فہم سے بالاتر ہیں۔

انوبار ربس۔ یہ نہ سمجھئے بندہ پرور، اس کے جذبات کی ترکیب تو خالص محبت کے لطیف ترین اجزاء سے ہوئی ہے۔ ہم اس کے ان جھگڑوں اور جوار بھاٹوں کو فقط آہیں اور آنسو نہیں کہہ سکتے۔ جنتریاں ایسے طوفانوں کے بتے کم ہی دیتی ہیں۔ اب ایسا بھی کیا مگر اس میں ہوگا۔ اسکے طوفان خیزی کے اُٹھائے ہوئے طوفانوں سے کم نہیں۔

الکلنی۔ کاش میں نے اسے نہ دیکھا ہوتا۔

انوبار ربس۔ تو سارے سرکار ایک زبردست عجوبہ بن دیکھے رہ جاتا۔ جس کے نظارے کی سعادت سے محروم رہنا آپ کی ساری سیاحی پر پانی پھیر دیتا۔

الکلنی۔ قلوپطرہ مر گئی۔

انوبار ربس۔ جی حضور!

الکلنی۔ قلوپطرہ مر گئی!

انوبار ربس۔ قلوپطرہ!

الکلنی۔ مر گئی!

انوبار ربس۔ تو پھر کیا ہوا شکرانے میں دیوتاؤں کو کچھ بھینٹ دیجیے۔ جب اُن کی طبیعِ خداوندی کو کسی شخص سے اُس کی جورو چھین لینا مقصود ہوتا ہے تو وہ گویا ایک خیاطانہ اشارہ دیتے ہیں کہ پُرانا لباس گھس جاتے تو نیا لباس بنا لینا چاہیئے۔ اگر قلوپطرہ کے سوا کوئی عورت دُنیا میں موجود نہ ہوتی تو بیشک آپ کو داغ سخت لگا تھا اور واقعہ حسرت ناک تھا۔ لیکن اس غم کی تلافی تو ہو سکتی ہے۔ یہ سمجھیے کہ آپ کا یہ پُرانا جامہ تھا "جو نئے کے لانے کا سامان کر گیا! اس غم پر جو آنسو بہیں گے وہ فقط "پیازی" قسم کے ہو سکتے ہیں۔

الکلنی۔ جو معاملات پیدا کر گئی ہے میری عدم موجودگی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

انوبار ربس۔ اور جو معاملات آپ نے یہاں کھڑے کر لئے ہیں وہ آپکی عدم موجودگی کے متحمل کب ہو سکیں گے۔ خصوصاً قلوپطرہ والا کہ یہ جب ہی تک ہے جب تک آپ یہاں موجود ہیں!

الکلنی۔ بچھ میں غم کر دو بستر کو باندھ … … … سفر … … … اپنے رخت کار

اور ہیں ہماری ملک میں آمد کے خواستگار
خود قلوپطرہ کی موت میرے حق میں کم نہیں
یہ سب معاملات بھی کیا کچھ اہم نہیں۔
آمادۂ نبرد ہے قیصر سے پومپے
اور بڑھ گئے ہیں قوت بحری سے حوصلے
کیا قدرنا شناس ہیں ابنائے روزگار
ہے ہیچ ان کی الفت و نفرت کا اعتبار
جو کل نہ باپ ہی تھا وہ بیٹے میں آج ہے
اب اُسکے سر پہ شہرت و عظمت کا تاج ہے
اب یکسکس ہے فرو زمین و زمان میں
بازعم خود ہے فاتح اعظم جہان میں
انداز حوصلوں کا گر اس کے یہی رہا
معلوم سلطنت کے مقدر کا پھر لکھا
غفلت مگر نہ ہو تو ابھی کچھ گیا نہیں
بالِ بے بہ موئے اسپ[1] ابھی افعی بنا نہیں
لازم ہے ہم یہاں سے روانہ شتاب ہوں
کہدو سب افسروں سے کہ پا در رکاب ہوں

منظر ۳

(قلوپطرہ۔ شارمین۔ اراس اور الیکس داخل ہوتے ہیں۔)

قلوپطرہ۔ وہ کہاں ہیں؟

شارمین۔ جی میں نے اُن کو نہیں دیکھا۔

قلوپطرہ۔ دیکھے ہیں کسکے ساتھ ہیں کیا کر رہے ہیں، جاؤ
جلدی سے (جیسے میں نے نہیں بھیجا) دیکھ آؤ
مغموم ہوں تو کہنا کہ وہ محو رقص تھیں
خوش ہوں تو یہ بتانا کہ بیمار پڑ گئیں

شارمین۔ بیگم جو سچ ہے آپ کو اُن سے محبت ہی ہے تو ہیں
تو اس روش سے وہ نہیں آنیکے دام میں

قلوپطرہ۔ پھر کیا کروں میں؟ کیا نہیں کرتی؟ بتا مجھے

شارمین۔ محو جھگڑے بات بات پہ اُلجھا نہ کیجیے

قلوپطرہ۔ ناداں اُلٹے طور سکھاتی ہے تو مجھے!

[1] اشارہ ہے ایک قدیم توہم کی طرف کہ گھوڑے کا بال بے غوری سے ڈال دیا جائے تو افعی بن جاتا ہے۔

شارمین۔ اچھا ہے ان کو حد سے زیادہ نہ چھیڑئے
انجام رعب داب کا ہوتا ہے بد دلی
اتنا بھی مت جھکائیے۔ وہ آتے انطنی
(انطنی داخل ہوتا ہے)
قلوپطرہ۔ میں آج کچھ اداس ہوں۔ بیمار ہو چلی مرا
انطنی۔ افسوس، لب پہ لانا ہی پڑتا ہے مدعا
قلوپطرہ۔ (قطع کلام کرتے ہوئے)
جلدی سنبھال شارمین! بیہوش میں گری!
اب جان بے سہارا اس آفت کی ہو چکی
انطنی۔ کیوں خیریت تو ہے مری بیگم۔ مجھے بتاؤ!
قلوپطرہ۔ للہ مجھ سے دور ہو تم۔ پیش پاس نہ آؤ
نظریں بتا رہی ہیں کہ بجلی ہے غضب کی
کیا کہتی ہیں وہ "بیاہتا بیوی" جناب کی!
جائیں حضور آپ مگر کاش وہ کبھی
دیکھیں نہ رخصت آپ کو اس سمت قصد کی
وہ یہ کہیں نہ سمجھیں کہ تم میرے بس میں ہو
کیا زور تم پہ میرا۔ تم اُس کے ہو جس کے ہو
انطنی۔ دیوتا خوب جانتے ہیں [1]
قلوپطرہ۔ ملکہ ہوئی تھی کب کوئی اس جال کا شکار
اول ہی دن سے مجھ پہ یہ فتنے تھے آشکار
انطنی۔ قلوپطرہ۔
قلوپطرہ۔ قسموں سے تیری آج لرزتے ہیں دیوتا۔
کل عہد فلویا سے بھی شاید یہی تو تھا؟
کیسے یقین کروں کہ ہو تم باوفا ضرور،
ہے اس کھلے فریب میں آتا مجھ کو غرور
دیوانے جان، اور یہی قسموں کے دم میں آئیں
کیا قول ہیں کہ منہ سے نکلتے ہی ٹوٹ جائیں
انطنی۔ میری پیاری ملکہ!
قلوپطرہ۔ رخصت پہ کب بنی نہ بنائیں تمہارے
جانا ہی ہے تو جائیے۔ جم جم سدھاریے!
اخلاص جب بھلا تھا کہ تم طالب تھے
اس وقت کیوں نہ لیتے تھے جانے کا آپ نام؟

[illegible] [illegible] [illegible] ہے تمہاری
تھی [illegible] تمام جو زبان پہ ہیں تھی جب
تقریر لب پہ [illegible] تھی ملحو سلام کی
تھی [illegible] [illegible] ایک پیام تھی
کیا [illegible] میرے قامت و موزونی کی تھی
[illegible] [illegible] [illegible] تمہاری آنکھوں کی تھی
سب وہ خیال و خواب کی باتیں ہوا ہوئیں
تم نے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
بن جاتے [illegible] خبر نہ تھی نیرنگ [illegible] سے
جھوٹا جہاں کا "فاتح اعظم" کہیں جسے
انطنی۔ کیا کہہ رہی ہو بیگم!
قلوپطرہ۔ افسوس مجھ کو یہ قد و بالا نہیں ملا
تب کہتے کوئی صاحب دل مصر میں بھی تھا [2]
انطنی۔ بیگم سنو۔ ضرورت وقتی کا اقتضا،
کرتا ہے چند روز کو تم سے ہمیں جدا
چمکی ہوئی ہے روم میں اب پھر تیغ سرکشی
سیکٹس کی فوج ساحل روما تک آ گئی
[illegible] سپاہ کی [illegible] ہے آ چڑھی
پھیلی ہے جس سے ملک میں [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] تو قیر [illegible] ہو تاج
آئی ہے ایک اور بھی آفت مرے لئے
ہے فلویا کی موت قیامت مرے لئے
قلوپطرہ۔ گو سادگی سے کر نہ سکا سن مجھے ابھی
بچپن نہیں ہے اس کہ نہ سمجھے یہ دل لگی!
انطنی۔ ہاں مر چکی وہ۔ لو فرصت ہے تم ذرا
وہ [illegible] دیکھ لو [illegible] کر گئی ہے کیا
قلوپطرہ۔ اے داستان عشق تمام! اقرار ہے [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
انجام میرا فلویا مر کر بتا گئی
کیا [illegible] [illegible] پہ سینہ [illegible] [illegible]

[1] یہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
قد حاصل ہوتی تو تم کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[2] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔

انطنی۔ تم مصر کی ہو جنگ سے شوق التفات سے
کچھ بھی مشغلہ ہیں آپ کی سلطنت کے
کچھ گلشن میں عجب گل کے لب ہوں جیسے

بے رحمت ہو تم سے بہانہ ہو کہ ہو تم ہوں ہوں جیسے تمہارے لطف کا نغمہ

تم دیکھنا کہ تم سے باہر نہ ہوں گا میں
تسلیم ہو گا تمام ہوں اس میں کہ ننگ ہو
موقعت سے ہمیشہ ہاں ہو کہ جنگ ہو
سوگند اسی کی تابش میں روئے جمیل کی
تاکہ تم ہے حسن کے دام میں بہار زمین نیل کی [1]

قلوبطرہ۔ (قطع کلام کر کے)
سلطنت کی میرا بھتا۔ مگر غیرت آثار
ہوں تم میں اتنی وہم میں کہ جیسے ہی پیدا!

انطنی۔ میری حسین ملکہ تسلی سے کام لو
حاضر ہے میرا عشق سدا امتحان کو

قلوبطرہ۔ یہ ملکہ یا کہتی تھی۔ بہر خدا ذرا
آنسو تو چار تم یہ تم اس کے دو بہا!
مجھ سے پلٹ کے لیجئے پھر رخصت سفر
رکھئے ان آنسوؤں کا بھی احسان مصر کا
ہر لحظہ ایک داؤں نیا کھیلتے رہو
جب جاہو کر لو اور کرکے کہتے رہو

انطنی۔ ملکہ میرے لہو کو نہ کھولاؤ۔ بس کرو!
قلوبطرہ۔ شاباش اپنے فن کے تو تم بادشاہ ہو!
انطنی۔ (برافروختہ ہو کر) سوگند مجھ کا تیری!
قلوبطرہ۔ اور عشق نازکی!؟
کیا بات آپ کے لب افسوں طراز کی!
یہ برگ بھی دیکھی بے طرح سرداری دیکھنا
روما کے پہلواں کی اداکاری دیکھنا!

انطنی۔ میرے لئے محال ہے اب ٹھہرنا یہاں!
قلوبطرہ۔ ہاں جاتے ہوئے یہ بات تو اک سنتے جائیں
سعی کہ آپ بھی تو رخصت نہیں کچھ
جانتے ہم سے تو الفت نہیں کچھ اور
ہاں کچھ بھی تو نہیں یہ تمہاری ہی کی

[1] انطنی [illegible] مصر کی [illegible] ہے۔

اک بات تھی خیال میں آ کر چلی گئی
سیکھا ہوا کہ کہ نئے تمہارا شعار ہے
کمبخت یاد بھی مری بے اختیار ہے!

انطنی۔ اس دل لگی سے آپ کا کیا مدعا ہوا
جانے دو اب سمجھے کہ یہ طرز ہے کام کا

قلوبطرہ۔ بے مدعا سمجھتے ہیں اس دل لگی کو آپ
پہچانتے نہیں ابھی دل لگی کو آپ
باتیں ہماری خیر خرافات ہی سہی
ہم نے تو ابتک آپ کی ہر بات ہی سہی
آپ اپنی جان کے خیر سے عزت سنبھالتے
روما میں خوب حوصلے دل کے نکالتے
ان کلفتوں کو میرے لئے چھوڑ جائیے
شرط وفا یہی تھی کہ منہ موڑ جائیے
اچھا سدھارو، شاد رہو، کامراں رہو
دل سے مرے قریب ہو گے جہاں رہو
نصرت تمہاری راہوں میں گوہر فشاں رہے
لو جاؤ دیوتاؤں کی تم پر اماں رہے!

منظر ۴

روما۔ قیصر کا محل۔

قیصر (ایک خط پڑھتا ہوا) لے پدس اور اس کے مصاحب داخل ہوتے ہیں۔

قیصر۔ اب سمجھے لے پدس کہ یہ سب افترا نہ تھا
کچھ بیر انطنی سے مجھے مفت کا نہ تھا
بد عہد بد شعار کی شامت ہے آ رہی
کچھ آپ نے سنا بھی کہ قاصد سے کیا کہی؟!
کب چھوڑتی ہیں مصر کی خوش قسمتاں ہنیر
اس جانب التفات کی فرصت کہاں ہنیر
بس رات دن ہیں ناؤ نوش یہ سیر و شکار ہے،
سر پر بُری طرح سے نشہ سوار ہے!
احوال کچھ ادھر کا تو اصلا نہیں سنا،
قاصد سلام کو بھی ترستا ہی رہ گیا
(سنا ہے طلب ہے مصر کی ملکہ کا اختیار)
ہے ہر گھڑی وہی قلوبطرہ گلے کا ہار!

مردانگی شعار حسد اکی ہوئی ہے جو
وہ ان سے بڑھ کے زمانے میں [illegible]
کمزوریاں جو اصبت آدم میں، دیکھیے
وہ سب ہمارے بھی اعضا میں دیکھیے!!

لے بدس: یہ ٹھیک ہے مہربان مگر پھر کہوں گا میں
آخر ہمارے دوست میں کچھ خوبیاں بھی ہیں
جھلکیں شباب میں [illegible] سکے نہیں
کچھ وقت ہی بُرا ہے وہ ایسے بُرے نہیں
آتی بلا تو عیب نمایاں ہوتے ہیں سب
ستارے جس طرح چمک اٹھتے ہیں وقت شب
کچھ ملک کی تو لی ہی نہ ہوں گی یہ عادتیں
ہوتا ہے فرق خلقی و کسبی عیوب میں
اب ان سے کیا خصائل فطری کا ہو گلہ
مجبور ہیں وہ اپنی طبیعت سے اس جگہ

قیصر: بس کیجیے جناب رعایت کی حد بھی ہے
کچھ امتیاز فعل خوش و فعل بد بھی ہے
عیبوں کی خوابگہ میں یہ مستی بجا سہی [1]
ہر قہقہے پہ ملک لٹانا روا سہی!!
کچھ لیجیے کمینوں سے کشتی درست ہے
سفلوں کے ساتھ خندۂ بیجا درست ہے
اس کوچہ گردی و سیہ مستی کو چھوڑیے
بد صحبتی و بادہ پرستی کو چھوڑیے
— ہرچند اس روش پہ جو اک بار پڑ گیا
دنیا میں کون اس کو بتا دے گا بے خطا —
لیکن یہ دیکھیے کہ یہاں ہم تو خوار ہوں
اور آپ کے یہ مصر میں لیل و نہار ہوں!!
یوں ہی یہ شغل عیش اگر صبح و شام ہے
سنتا کہ کوئی روز میں ترکی تمام ہے
جھکتیں نہ گر نتیجۂ افراط تو سہی
رہ جائیں چند دن میں نہ لذات تو سہی
کب سے کوئی وقت جاتا [illegible] پاس
اور منصب و مقام لگائے ہیں آس

[illegible]
[illegible]
کس طرح اس کی [illegible] ملامت نہ کیجیے

لے بدس: تو گالی دی ہے [illegible] اور بھی کچھ غور ہیں [illegible] کیجیے!
(ایک سپاہی داخل ہوتا ہے)

ایلچی: پیغام لایا ہوں سب آپ کے فرمان ہیں
احوال [illegible] یہ کچھ [illegible] ہاں
اب تک حد و بحر [illegible] قابض [illegible]
ہو ان کے [illegible] ہیں [2]
فوج اجنبیوں کی [illegible] ساحل کو چھا دی
کل [illegible] آکے ساتھ [illegible] حادثے ہوئی

قیصر: ہاں یہ تو خیر ازل ہی سے دنیا کا ہے شعار
ہوتی ہے اس کے ساتھ جو رکھتا ہو اقتدار
رہتا ہے بہر خلق کو مرمان ازل سے
کرتا ہے جب ہی قدر کہ [illegible] پائیے
طوفان زندگی میں ہمارا یہ جسم زار
بیچارہ خس کی طرح سے بے قدر و اختیار
بحر جہاں میں بہتے ہیں محکوم ہر چند
جب تک کہ کوئی موج نہ کر دے فنا کی نذر

ایلچی: میدان جو نظر آتا ہے، لٹیرے جہان کے
پھرتے ہیں بحر روم کے سینے کو چیرتے
ساحل پہ آ کے کرتے ہیں اکثر چڑھائیاں
بے بس ہیں اہل بحر، تو سرکش ہیں نوجواں
جو بھی کبھی جہاز کو آتا ہے [illegible] لیا
برہم ہے ان کے ہاتھوں سے نظم مملکت
ہے [illegible] کے نام کا ان کا رعب چھا رہا
جتنا کسے پناہ نہ ہو اس کا سامنا

قیصر: اے [illegible] باز آ
پانی ہے سر سے اب بہت اونچا گزر چکا
جب [illegible]
[illegible] کی شکست [illegible] کی جگہ میں
ہاں یاد کر وہ [illegible] تھا

[1] او [illegible] منسوب ہے

[2] [illegible]

تحیت [illegible] تھی تب خدا
[illegible] بے خبر سے [illegible]
کہ [illegible] سے گزر جاتا ہی
بے صدائے [illegible] ناز تھا
لیکن ہر ایک تھی کو [illegible] کے بیگیا
غفلت تھی گری ہی ہو نہ مجھ پر گزر گئی
کس کس طرح کی تونے غذا زہر مار کی
گو سب [illegible] تھا سر ای [illegible] تھا ان کا
اور [illegible] کہ [illegible] نہ رکھیں زبان پر
یہ کچھ تھا اور — آہ کوئی آج کیا کہے
[illegible] دیا س کے آثار تک تھے!

لےپدس۔ افسوس کی جگہ ہے یہ کیا ہوگیا انہیں
غیرت [illegible] کاش انہیں [illegible]

قیصر۔ اب وقت ہے ہم آپ بھی میدان کا رخ کریں
یہ وقت سب گنوایا عبث انتظار میں
فی الفور رائے مجلس شوریٰ کی سو لیجئے
غفلت میں اپنی [illegible] بیا [illegible] ہے

لےپدس۔ لازم ہے اب کہ جا کے ہم دیکھ لیں ہم
اپنی قوت [illegible] و بحری کا کیت و کم
میں کائنات اپنی سبکی، جو کچھ بھی ہو
کل اطمینان کرکے بتاؤں گا آپ کو
ہاں اطلاعیں اور اگر کچھ کہیں سے آئیں
تو آپ بالضرور مجھے بھی خبر کرائیں

قیصر۔ ہی مجھکو خود خیال ہے اس کا کہے بغیر
لیپدس۔ بہتر ہے۔ [illegible] ہیں۔ تسلیم!
قیصر۔ شب بخیر!

منظر [illegible]

(اسکندریہ۔ قلوپطرہ کا محل۔)

قلوپطرہ۔ شارمین [illegible] اور ماردین (خواجہ سرا) داخل ہوتے ہیں۔

قلوپطرہ۔ [illegible] مجھے [illegible] کا جام دے
[illegible] کا قیام دے
[illegible]

میں لب [illegible] جب تلک جدا

شارمین۔ ہر وقت لب پہ آپکے رہتا ہو بس یہی
قلوپطرہ۔ گستاخ! کشتنی!!
شارمین۔ نہیں بیگم، خطا ہوئی!
قلوپطرہ۔ او [illegible] ماردین!
ماردین۔ (خواجہ سرا) صدقے۔ جی حضور!
قلوپطرہ۔ کمبخت تیرا آقا نا [illegible] ہے اب تو بے سرور
اچھا ذرا بتا تو وہ اسوقت ہیں کہاں
بیٹھے ہیں یا کھڑے ہیں کہ گھوڑے پہ ہیں رواں؟
اے اسپ تیز مرحبا! ہمت نہ ہار آج!
معلوم ہے کہ کون ہے تجھ پر سوار آج؟!
وہ انٹنی، وہ اطلس دوراں، وہ شہسوار
ہے کرۂ زمین کا کاندھا جس کے بار!
وہ انٹنی کہ دہر کی امید گاہ ہے
وہ انٹنی کہ خلق جہاں کی پناہ ہے
(تصور کی محویت میں)
کچھ کر رہے ہیں زیر لب اسوقت گفتگو
کہتے ہیں — میری نیل کی ناگن کہاں ہو تو؟!
کس درجہ خوش مزا ہے محبت کا زہر بھی
اللہ میرے منہ کو یہ کیا چیز لگ گئی!
وہ اور مرا خیال! جسے مہر آسماں
کب کا سیاہ کر چکا لے لے کے چٹکیاں
وہ میں جسے زمانے نے گلا دیا ہو آب
وہ میں کہ مجھکو عمر نے جھر یاد یا ہو آب
جب قیصر کشادہ جبیں کی نفس تھا تو
میں خسروانِ وقت کی تھی جانِ آرزو!
اور گھورتا تھا پومپے اس طرز کو مجھے
بس ہو تو آنکھیں میری جبیں کی ہی تاک سے
گویا ہیں نگاہ کو صدقے اتار دوں
اور جان اپنی جان کے لنگر پہ وار دوں
(الکسِس داخل ہوتا ہے۔)

سلہ جو دنیا کو اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے رکھا پایا جاتا ہے۔

الیکس۔ مرا سلام کیجئے لے تاجدار مصر!

پائندہ باد مملکتِ شہریارِ مصر!

قلوبطرہ۔ کس درجہ خوش ہوں میں کہ مرے انطنی سے تو

آیا ہے ساتھ لیکے مگر کچھ انہیں کی بو

پارس سے روم کے مجھے کندن بنا دیا

کس حال میں ہیں میرے جری انطنی بتا

الیکس۔ (اپنے بے ربط انداز میں)

آخر میں پیاری ملکہ انہوں نے پھر ایک بار

چوما وفور شوق میں یہ دُرِّ آبدار!

(ایک موتی پیش کرتا ہے۔)

بوسے لئے ہیں اسکے انہوں نے نجانے کے

تقریر انکی ساری مرے دل پہ نقش ہے

بولے کہ اچھے دوست، یہ کہنا کہ روم سے

بھیجا ہے ایک تحفۂ وفادار مصر سے

یہ اک غریب کرم کا ہے حاصل حیات

لیکن بہت بلند ہے اس سے کہ تیری ذات

یہ پرخلوص تحفہ فرومایہ ہے تو کیا

لے جاؤ اسکے ساتھ ہی یہ قول بھی مرا

کہدو بشوقِ زیست، یہ تسلیم جتنے ہیں۔

کر دوں گا ایک روز تیرے فرشِ راہ میں

سر ایک روز شرق کے ہر تاجدار کا

تیرے قدم ناز پہ لاکر جھکاؤں گا

یہ کہہ کے سر ہلایا اک انداز خاص سے

اور پھر وہ اک شتر پہ سوار ہو گئے

جو ایسا ہنہنایا کہ بس دل دہل گیا!

اور پھر جو باگ کھینچی تو دشمن گزر گیا

قلوبطرہ۔ اچھا وہ کچھ اداس تھے یا خوش تھے کیسے تھے

الیکس۔ جو دل ہیں جیسے گرمی و سردی سے

قلوبطرہ۔ کیا متوازن طبیعت ہے۔ دیکھنا!

یہ دیکھو اچھی شارمین یہ وہ فرد تھا!

اُس مرد بے مثال کا ملتا ہے یاں پتا

میں جانتی ہوں مطلب اس انداز فکر کا

معلوم یوں نہیں کہ شگفتہ رکھے انہیں

اُس کی نظر سے تو یہ طبیعت کی عادتیں

شائستہ لوگ ہیں کہ یہ اطوار ناشتاب ہیں

ملتی ہے دیار مصر کی آرام جان کے پاس!

غمگیں بھی ہو تو کہ شاد ہو زیبا ہے سب تجھے

آتا ہے عیش و غم کے مستانہ کا ڈھب تجھے

ہے بے پناہ تیرے غم و عیش کا اثر

ہے غم جوش رنج و طرب تیری ذات پر

اچھا الیکس یہ کہو کیسا رہا سفر؟

دیکھے تو ہونگے راہ میں کچھ اور نامہ بر؟

الیکس۔ جی ملکہ کوئی بیس مجھے راہ میں ملے

کیوں بھیجتی ہیں آپ لگاتار دوسرے!

قلوبطرہ۔ فاقے سے ہو مر جو مجھ سے اس گھڑی کرے

میں بھول جاؤں جس گھڑی خط بھیجنا اسے

لڑکی قلم دوات!۔ الیکس خوش آمدی!

قیصر کی بھی شارمین اتنی چاہ تھی؟

شارمین۔ اے وہ جوانمرد قیصر!

قلوبطرہ۔ چپ رہ زباں دراز اڑی کی منہ چڑھی

لے انطنی کا نام۔ جواں مرد انطنی!

شارمین۔ اے وہ جری قیصر! [1]

قلوبطرہ۔ کمبخت کاٹ لوں گی زباں تو نے اب اگر

ترجیح دی اُسے مرے فرد وفا پہ پر

شارمین۔ بیگم مگر قدم تو اٹھاتی تم ہی سے ہوں

تم آگے آگے چلتی ہو میں پیچھے پیچھے ہوں گا

قلوبطرہ۔ وہ کمسنی کے دن تھے جب کیا سمجھ تھی جب

باتوں کو جبکہ آنچ اُٹھتی ہی۔ او غضب!

چل لا قلم دوات۔ انہیں خط لکھوں گی میں

روز اک نیا سندیسہ روانہ کروں گی میں

ہر روز اک پیام ملے گا انہیں مرا

یا دیکھنا کہ مصر ہی سارا اجڑ گیا

شان الحق حقی دہلوی

[1] یہ قیصر اعظم سے قلوبطرہ کے سابقہ معاشقہ پر اشارہ ہے

پچیس منٹ

ہر روز صبح اکار بولک ایسڈ اور سپرٹ کی جراثیم کش بو سے میری روح لرز جایا کرتی۔ پھر جب ڈاکٹر اپنا ایپرن پہن کر، اور آستین چڑھا کر میری طرف بڑھتا، اور بڑی بے دردی سے میری کلائی کو تختۂ مشق بنانے پر تل جاتا، تو مجھے چکر سے آنے لگتے۔

کئی دنوں سے میری کلائی زخمی تھی۔ اس میں شیشے کا ایک ٹکڑا اتر گیا تھا۔ پھر زخم خراب ہو گیا۔ یہ زخم شاعروں کے "زخمِ دل" سے بالکل مختلف تھا۔ اور جب روئی کا پھاہا اُس پر رکھا جاتا تو ـــــ توبہ! اُس زمانے میں مَیں اکثر تذکرۂ انبیا میں حضرت ایوبؑ کے حالات بڑی شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ اور اس سے دل کو ڈھارس بندھتی تھی۔

جس صبح کلائی کا آپریشن کیا جانا تھا میری بُری حالت تھی۔ رات ہی سے مختلف وضع کے چھوٹے بڑے تیز اور تیز تر نشتر میری بدنصیب آنکھوں کے آگے ناچ رہے تھے۔

صبح ڈاکٹر مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ جیسے کسی کو جتلانے کرب دیکھتا ہو... ایسا ... وہ تبسم کر رہا ہو۔ "آپ اپنے ... سے آپریشن کیلئے بالکل تیار ہیں نا خاتون روحی؟"

"ہاں ہاں ـــــ" میں نے مسکرانے کی کوشش کی پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "نہیں نہیں"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا: "معلوم ہوتا ہے صرف ایک پل بھی آپکے نیک ارادے میں خلل انداز ہو سکتا ہے۔ ذرا کلائی تو دکھائیے"

جملہ ختم کرتے ہی ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو سامانِ جراحت تیار کرنے کو کہا اور ایک روشن اور لمبے دریچے کے آگے آناً فاناً میں آپریشن کا سامان تیار ہو گیا۔

میں نے اپنی کلائی کو مضبوطی سے پکڑے ہوتے ڈاکٹر سے کوئی آدھ گز کے فاصلے پر کمرے کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔ باہر باغیچے میں تندرست چڑیاں مصروفِ ... تھیں اور فوارے کے پاس ایک گل سوسن ... لگا رہا تھا۔

"... ڈاکٹر کی آواز آئی۔

"... کتنی ... لگے گی؟"

"... منٹ"

"... منٹ! ... سکتے ... بہت ... ڈاکٹر پانچ لمحوں میں نہیں ہو سکتا؟"

ڈاکٹر ہنس پڑا اور میری کلائی پکڑ کر دریچے کی روشنی میں لے بولا: "خاتون روحی! آپ کا زخم دیکھ کر مجھے آج سے سات سال قبل کا ایک خوفناک واقعہ یاد آ گیا۔ آپ اپنے ذرا سے زخم کو دیکھ کر ہراساں ہو گئیں اپنی کلائی میرے سپرد کر دیجئے اور آرام سے اس کرسی پر بیٹھ جائیے تو وہ خوفناک واقعہ سنیں گی؟"

"سنوں گی۔ بشرطیکہ وہ آپ کے کام میں خلل انداز نہ ہو" میں کہا۔

"آپ اطمینان رکھئے، کوئی خلل نہ پڑے گا۔ سات سال پہلے بات ہے میں میڈیکل کالج میں تھا۔ اس زمانے میں ہمیں اکثر بیکار لاشوں کو چیرنے پھاڑنے کا موقع مل جاتا تھا"

"اور آپ کو اس میں لطف آتا تھا؟" میں جل کر بولی۔

"مجھے اس شغل سے خاص شغف تھا خاتون روحی اور ـــــ"

"دیکھئے دیکھئے میری کلائی ـــــ"

"نہیں نہیں کوئی بات نہیں ـــــ میں عموماً رات کے سناٹے وقت، گھنٹوں اس شغل میں محو رہتا تھا اور دو دو بجے گھر لوٹتا تھا۔ جب میں گھر لوٹتا تو مجھے راستے میں گاؤں کے قبرستان پر سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔

ایک رات جب میں قبرستان پر سے گذر رہا تھا تو مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اس کے بعد ہر روز رات کے وقت جب میں قبرستان پہونچتا تو کراہنے کی آواز آنے لگتی لیکن نیند کا غلبہ اس قدر ہوتا کہ مجھے اس آواز کی تلاش کا نہ کبھی خیال آیا نہ وقت ملا۔

ایک رات میں خلافِ معمول ذرا جلدی یعنی کوئی بارہ ایک بجے اسی راستے پر سے گذر رہا تھا۔ گرمی شدید تھی اور تاریکی غیر معمولی۔ البتہ آسمان پر بوڑھے تارے چپ چاپ تھے۔ مگر چونکہ میں بید مجنوں اور ناشپاتی کے درختوں کے نیچے سے گذر رہا تھا اس لئے میرے اطراف تاریکی ہی تاریکی تھی۔

میں قبرستان کی دیوار تک پہونچا تو مجھے کراہنے کی آواز آئی۔

یہ آواز زیادہ قریب اور واضح تھی جیسے کوئی شخص انتہائی درد کو ضبط کرنے کی کوشش کے باوجود کراہنے پر مجبور ہو۔ آہ خاتون رو رہی۔ وہ درد کی [illegible] ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے حلق میں اتری جا رہی ہو"

"میری کلائی میں کوئی چیز اتری جا رہی ہے ۔۔۔ اُف ۔۔۔ [illegible]"

ڈاکٹر نے کوئی اوزار طشت میں چھن سے پھینکا اور [illegible] مجھے معلوم ہوا کہ یہ آواز قبرستان کے اندر سے آ رہی ہے۔ مجھے بڑا تعجب کہ دنیا گورستان کے اطمینان قلب اور سکون کی تعریف کرتی ہے یہ کون بد نصیب اس سکوت میں خلل انداز ہو رہا ہے! میرے دل نے کہا پھر میں نے قبرستان کی دیوار سے اپنے کان لگا دیئے۔ یہ آواز رقصاں تھا یعنی کراہنے والا اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا۔ وہ آواز کبھی قبرستان کے سامنے سے آتی تھی کبھی اُس حصے سے۔ میرے دل میں اس مبتلائے کرب بدنصیب کو دیکھنے کی خواہش چٹکیاں لینے لگی اور میں پنجوں پر کھڑے ہو کر اندر جھانکنے لگا۔ مگر اندر تاریکی تھی۔ صرف تاریکی۔ ناشپاتی اور بید مجنوں کے درخت کالی کالی قبروں پر چپ چاپ کھڑے تھے!

دفعتاً پھر کراہنے کی آواز آئی اور میں نے فوراً سر پھیر کر دیکھا ۔۔۔ خاتون رو رہی۔ تاروں کی چھاؤں میں میں نے ایسا خوفناک منظر دیکھا کہ لرز گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قبروں کے درمیان کوئی گوریلا ناچ رہا تھا۔"

"گوریلا؟"

"مجھے شبہ ہوا کہ گوریلا ہے مگر جب میں نے اس کی کراہ سنی تو مجھے انسان ہونے کا شبہ ہوا۔ اس رات میں پہچان نہ سکا کہ وہ انسان تھا یا کوئی جانور۔

دوسری رات میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ قبرستان کے اندر جا کر دیکھوں گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں قبرستان کی دیوار پھاند کر اندر جا پہنچا اور جنگلی گلاب کی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ رہا۔

کراہنے کی آواز آج زیادہ شدت اور زیادہ بے بسی کے ساتھ آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا قبروں کے درمیان انتہائی تکلیف کے مارے کوئی کراہ رہا اور ناچ رہا ہے۔ ذرا دیر بعد مجھے شبہ ہوا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے کیونکہ اس نے اپنی کراہ ضبط کر لی تھی اور پیچھے جھاڑیوں کی طرف جانے لگا تھا۔

میں نے فوراً ماچس جلائی اور روشنی پھیل گئی۔ وہ گھبرا کر قبروں کے درمیان کہیں غائب ہو گیا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔

[illegible] کے [illegible] سے [illegible] گورستان کی زمین سے ایک عجیب ہولناک خوشبو نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

میں نے ہر طرف ہو کر دیکھا مگر وہاں کوئی [illegible] کا قائل تو تھا نہیں کہ ہی [illegible] [illegible] اپنے احاطے پر [illegible] میں [illegible] ایک تھی آدمی! اس لئے ہر چیز کو عقل کی روشنی میں دیکھنا چاہتا تھا اس لئے میں نے ہر طرف ہر گوشے میں گھوم کر اطمینان کر لیا اور آخر مایوس ہو کر واپس جانے کی ٹھانی۔

میں جب واپس جانے لگا تو یکایک ایک آہ کی آواز آئی اور میں ٹھٹک گیا۔ سامنے یعنی میرے قدموں میں جو قبر تھی [illegible] وہیں سے کراہنے کی نہایت دھیمی آواز آ رہی تھی۔ میں بیٹھ گیا۔ بے شک یہ کسی مبتلائے کرب کی آواز تھی۔

میں چپ تھا۔ میں نے اپنی سانس تک روک لی تھی تاکہ کسی کو میری موجودگی کا علم نہ ہونے پائے۔ میں قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ کس قدر تعجب ہوا ہے جب یہ آواز بالکل میرے قدموں کے نیچے والی قبر میں سے آنے لگی! میں پنجوں کے بل چلنے لگا اور اس قبر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی جانور اس قبر میں گھس گیا ہے کیونکہ کراہ کی آواز آدھی انسانی تھی اور آدھی ۔۔۔۔ کیا بتاؤں غیر انسانی نہایت خوفناک!"

"تو کیا قبر کھلی ہوئی تھی؟"

"جی ہاں ۔۔۔۔ کیونکہ میرا ہاتھ ایک ناہموار جگہ پر ٹک گیا وہ قبر کا ایک کھلا ہوا کونہ تھا۔ جوں ہی میں نے اپنا چہرہ اس کے سامنے کیا تو میرا سر چکرا گیا۔ اندر سے ایک عجیب بو [illegible] اپنا چہرہ ہٹا لیا۔ اندر سے کسی کی سانس کی آہستہ آہستہ آواز آ رہی تھی ۔۔۔ خاتون رو رہی۔

میں نے فوراً ماچس جلائی اور قبر کے اندر دیکھا ۔۔۔ [illegible] ششدر رہ گیا۔ میں نے زندگی میں سینکڑوں انسانی لاشوں کا چیرا ہے بیسیوں خوفناک مناظر دیکھے مگر جو چیز اندر دیکھی اسے دیکھ کر جسم میں ایک جھرجھری سی آ گئی۔"

"تو اندر کیا دیکھا؟" میں بے چین ہو کر بولا۔

"اللہ ۔۔۔۔ کوئی [illegible]
[illegible] کے جسم پر [illegible] بال [illegible] [illegible]

[illegible]

جو انسان تھا خاتون روحی بیگم! انسان کہلائے جانے کا مستحق نہ تھا، مگر وہ خود اپنے آپ کو انسان کہتا۔ تو میں کبھی نہ سمجھ سکتی کہ وہ کیا تھا۔ وہ ... ہوتے ہیں کیسے کسی طرح کپڑے گلابی رنگ کا تھا جس جگہ پر ... کا خطرہ ہو سکتا تھا اُسی جگہ سے کراہنے کی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں دیر تک نہ سمجھ سکی کہ اُس نے مجھے دیکھا بھی یا نہیں؟ اور پھر ہمت کرکے پوچھا: تم کون ہو؟!

اس میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور جواب ملا: انسان!

... دھاڑیں مارتے رہے اور میں لرز گیا۔ پھر اُس نے اپنی سرگذشت مجھے سنائی۔ کیسے سنکر آپ کیا کریں گی؟ اس نے بیان کیا کہ ... ایک خوفناک دلدل میں پھنسنے کے بعد آج ایک جیل کی بیماری لاحق ہوئی اور رفتہ رفتہ اُس نے یہ شکل اختیار کرلی اور پھر دُنیا میں اس کے رہنے سہنے کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ پھر اُس نے ایک پرانی قبر کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ تمام دن اندر لیٹا رہتا اور رات کو وقت باہر نکلتا اور درخت سے ناشپاتی ـــ

اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے ایک تیز قینچی چمن سے طشت میں پھینکی اور بینڈیج کو گرہ دیتے ہوئے کہا: خاتون روحی خدا کا شکر ہے۔ بخیریت آپریشن ختم ہو گیا۔ پچیس منٹ لگے۔ مجھے ڈر تھا آپ ـــــــ خیر گذشتہ آپ سے ... آپ بے زبان معصیت زدہ لوگ اس دنیا میں بستے ہیں ـــ اور آپ کے آپریشن میں پچیس منٹ ہی لگے!

[illegible]

... نے ... کہا: بے چین ہوتے ہوئے بھی پوچھا، اور اس شخص کا کیا ہوا؟!

ڈاکٹر ... ہوئے بولا: کس شخص کا؟ ہاں وہ؟ ـــ وہ تندرست ہو گیا خاتون روحی ـــ جیسی آپ ہو گئیں! اور وہ زور سے ہنس پڑا۔

حجاب امتیاز علی

ظالم محبت ... [illegible] ... دہلی

پنگھٹ پر

دوش پر گاگر اُٹھائے ناز فرماتی ہوئی
آرہی ہے آج پنگھٹ کو وہ گھبراتی ہوئی

بج رہی ہیں گھاٹ پر پھر حُسن کی شہنائیاں
وجد کرتی ہو زمیں، مدہوش سا ہے آسماں

اپنی اپنی گاگروں کو بھر رہی تھیں دیویاں
یہ فضائے شام ہے یا کوئی نغموں کا جہاں

گنگناتی، مسکراتی، کیف برساتی ہوئی
ساری دُنیا جھومتی ساری فضا گاتی ہوئی

کیوں مجھے ہوتا ہے احساس تباہی کیا کروں
اک خلش سی ہو مرے دل میں الٰہی کیا کروں

اس قدر آخر طبیعت آج گھبراتی ہو کیوں
کچھ نہیں کھلتا کہ دل میں بات یہ آتی ہو کیوں

اپنے دل کی بات بھی اُس کو سنا سکتا نہیں
اُف رے محرومی اشارے سے بُلا سکتا نہیں

مست آنکھوں سے شبابِ روح برساتی ہوئی
جا رہی ہے وہ مرے ارماں کو ٹھکراتی ہوئی

جوہر فریادی

فرقانِ حمید

جب زیاں کاریٔ ابلیس سے پائی تکمیل
نہ کہیں رہبر باقی نہ کہیں اسرائیل
نہ تو لب پہ بیانِ صحفِ تورات و انجیل
تا بہ کے مقصد و دارو اسلوبِ عمل

عقل تحقیق میں اتر آئی تھی بے دینی کی
کون ہر رنگ میں سنتا تھا سخن جینوں کی

تھی نگاہوں میں وہ نیرنگیٔ افسونِ علیل
نہ براہین و دلائل نہ ثبوت و تاویل
نہ رہی دامِ ضلالت سے نکلنے کی سبیل
ہر مکاں بن گیا بت خانۂ آزر بہ مثیل

بحث گیا رشتۂ انسان و خدائے قدوس
پتھروں سے ہوتے تخلیق بتانِ محسوس

ان بتوں میں وہ جسارت کہ معاذ اللہ
بندگی اور وہ بدعت کہ معاذ اللہ
حسبِ موضوع وہ قوت کہ معاذ اللہ
یعنی یہ شانِ عقیدت کہ معاذ اللہ

نہ ہوا غم، جو خدا وقتِ سفر چھوٹ گیا
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

الغرض کفر سے معمور تھے اطرافِ زمیں
تھے نئے طرز پہ ہر ملک میں برگشتہ دیں
بخت مغزوں کے لئے تمام نہ تھا وہم یقیں
عجمی غاشیہ بردار، عرب صدر نشیں

بت اگر مینِ ہوئے لے تو پجاری ذی روح
ناطقہ سنگ سے تھا طالبِ امداد و فتوح

وہ دھواں دھار کہ تاریک تھا ہر گوشۂ دل
پوچھنے والے تھے نااہل، خدا ناقابل
خود پسندی کا مگر شرِ النفس تھی شامل
عقل سبیل دروغ وہم و گمانِ باطل

استخارے کی ضرورت پہ سہام اندازی
تیر تکوں کے بھروسے پہ حصص اندازی

عزت و شانِ بشری ورطۂ تاریک میں تھی
آبرو خاک بسر دیدۂ ادراک میں تھی
آدمیت کی قضا ساغرِ بیباک میں تھی
عصمت، زہد و حیا [illegible] مسلک میں تھی

امرء القیس کے اشعار زبانوں پہ تھے
بلکہ طاری وہی کردار جو اقوال پہ تھے

تھی ضرورت کہ زمانے کو حماقت سوجھے
تھا حقیقت میں، کھلے چشمِ بصیرت سوجھے
دور کج فہمیٔ احساس ہو ظلمت سے بچے
بعد ازاں [illegible] محمد صادق کی [illegible]

یعنی [illegible] محمد صادق [illegible]
[illegible] باطل کے [illegible]

[illegible] گے بیچ ہی ہیں [illegible] اور دل ابلنے لگے سرکس سیاہ گھوڑی [illegible] گھوڑی کو خوش تھا اس کا سر [illegible] اس کو گھاس دانہ دیتا۔ اس کی دوڑ۔ اس کی سواری اس کا کرتب ہزاروں آدمیوں کا حیرت سے دیکھنا۔ وہ تالیاں۔ وہ نالیاں۔ سب ہی دنیا کو تھی۔ دنیا حیرت کرتی تھی۔ یہ زندگی تھی۔ یہ زندگی کس طرح ختم ہوئی۔ سب تو آنکھیں دیکھ سکیں نہ کان سن سکے۔ لوگوں سے پنہاں۔ دنیا سے پنہاں۔ گمنامی کے دھوئیں میں بچہ اُڑتے ہوئے کالی کچھی ہنڈولیوں کو سرسوتی ندی کے سک راتوں میں ناچتے ہوئے نہ ملنے والی اور نہ ملنے والی یاد دہانی کو ستاتی تھی۔ جاڑوں میں کٹ کٹ کانپتے ہوئے۔ گرمی میں پسینے سے شرابور ہانپتے ہوئے۔ برسوں برس گونگی نے وہی گزرے ہوئے دن یاد کئے پر قسمت نے کسی پہلو کوئی پلٹا نہ کھایا اور نہ پلٹا بھی تو کیا پلٹا۔ نہ ماں باپ تھے نہ بھائی بہن۔ دور کے رشتہ دار تھے نہ ملنے والے۔ شوہر نہیں اولاد نہیں۔ اس کی زندگی میں کوئی تغیر ہو بھی کیا سکتا تھا۔ امید بھی کیا ہوتی تمنا ہی کیا ہوتی۔ بے آسرا بے آسرا دن کٹتے گئے۔ نواب محمود علی خاں نے سرکس چلا کے ندامت اور خجالت کا غصہ نوکروں پر اتار کے لڑکی کو کالے خاں باورچی کے سپرد کر دیا تھا۔ اور ہدایت کر دی تھی کہ گھر سے باہر نہ نکلنے دینا۔ آپ نواب صاحب کے ملازم بقدر حیثیت خود بھی آقا کے قدم بقدم چلتے تھے۔ زیادہ نہیں تو گھر میں دو بیویاں تھیں۔ لڑکی گو کم عمر ان دونوں نے اس خیال سے کہ کہیں سوتن بن کر نہ گھر کا چوخوب ہی مرمت بنائی۔ چڑھتے شباب میں لڑکی ان کے حوالے کی گئی تھی۔ مگر بیویوں نے سلیقے سے شباب کو بڑھاپے میں ملنا شروع کر دیا چند سال میں لڑکی سے بڑھیا ہو گئی۔ جوتے کھاتے خدمت کرتے پندرہ برس گذر گئے۔

ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ صبح کو کچی روشنی میں ہر چیز خوش حال تر و تازہ شاداب ہوتی ہے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلتے ہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ پھول مسکراتے ہیں۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ دوپہر جب ہی ڈھلتے بعد موذی دھوپ اپنی پوری گرمی دکھاتی ہے۔ کبھی ہوا بند [illegible] آوارہ جاتی ہے [illegible] کھولتے اور گرتے ہیں۔ [illegible] دن رات یہی قدرت کے [illegible] درست ہیا [illegible] [illegible] بیچھے والی گھوڑیا [illegible] دم کے پیچھے لگ گیا۔ اب

ٹخ ٹخ گھوڑیا! شاسٹ چابک۔ دن بھر شہر کی سڑکیں گلیاں اور اسٹیشن کے پھیرے ہونے لگے۔ دن بھر کی تھکی شام کو گھر آئی۔ ذرا سیری سلائی ہوئی تھوڑا دانہ تھوڑی گھاس ملی۔ رات بھر مچھروں نے کھایا۔ صبح ہوئی پھر چلی شہر بھر کی خاک چھاننے نہ شباب رکا نہ جوانی ہی آئی۔ اس مار اور محنت سے دونوں ہی بھاگ گئے بچپری سے یکے کی گھوڑیا ہو گئی۔ اسٹیشن پر جتی کسی گاڑی او گھ رہی ہے مزدوری مل گئی سامان رکھ گیا۔ سواریاں بیٹھ گئیں۔ تو یکے والے نے راس کو دو جھٹکے دئے۔ چابک چلایا۔ ٹخ ٹخ کی گھوڑیا نے دم ہلائی۔ سر اوپر نیچے اوپر نیچے ہلایا اور پھر منہ پیچھے کو اٹھا میں کھڑی ہو گئی۔ "او گھوڑی او گھوڑی۔ او تیرا ناس ہو چل! ٹخ ٹخ۔ ٹخ ٹخ۔" سٹ چابک سٹ چابک۔ گھوڑیا نے پھر دم ہلائی۔ سر ہلایا۔ دم ہلائی سر ہلایا۔ اور کھڑی ہے۔ پھر راس کو کراسے جھٹکے دئے گئے "او گھوڑی او گھوڑی چل تیرا ناس تجھے سنے۔ ٹخ۔ ٹخ ٹخ۔" اب پہروں سے زیادہ سر کو اوپر نیچے ہلاتی۔ ٹھمک ٹھمک گھوڑی چل پڑی تو اور شاسٹ شاسٹ چابک پڑنے لگے "چل۔ او گھوڑی چل چل چل! او گھوڑی سالی گھوڑی تیرا ناس ہو۔ ٹخ ٹخ۔ ٹخ ٹخ۔" اسی ٹخ ٹخ میں گھوڑی کی عمر کٹ گئی۔ پندرہ برس ہو گئے بوڑھی ہو گئی پیر کانپنے لگے راستہ چلنا دشوار ہو گیا۔ ایک روز حسب معمول گھوڑیا یکہ کھینچتی ٹھمک ٹھمک چلی جا رہی تھی۔ بازار میں ایک جگہ اسے روکا گیا۔ رک گئی۔ منہ لٹکائے نیچی کر کھڑی ہو گئی۔ یکے پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس میں دو زنانی سواریاں تھیں۔ ایک مرد ساتھ تھا۔ مرد وہی کالے خاں باورچی کے سوا کہ میں ایک بیوی دوسری گونگی ماما تھی۔۔۔ کالے خاں نے ایک دوکان پر سوزنانے زرکلابتو کے جوتے پردے کے اندر سر ڈال کے بیوی کو دکھائے ان میں سے دو چند آئے بیوی نے چھانٹ کر پھر ان دو میں سے ایک لینے کو بتا دیا۔ میاں جوتے کر دکان کی طرف چلے۔ بیوی کی نیت اس جوڑے سے اس جوڑے پر ڈانواں ڈول ہوئی۔ سو بیکیا کر فوراً گونگی سے اشارہ کیا بلا میاں کو بلا۔ وہ بیچاری اپنی زبان میں چلائی "آ۔ وا وا۔ وا۔ آ دا"۔ پژمردہ دل۔ بوڑھی گھوڑی نے برسہا برس کے بعد پھر وہی آواز سنی۔ وہی آواز جو کبھی محبت کا پیغام تھی۔ وہ آواز جس سے زندگی کی گذری ہوئی پُرمسرت گھڑیاں وابستہ تھیں۔ یکا یک یہ آواز جو آئی گھوڑی چونک دونوں کان پیچھے دبا خاموش کھڑی ہو گئی۔ بازار کی چیخ پکار میں میاں نے آواز نہ سنی۔ اس لئے گونگی نے پھر وہی آواز نکالی۔ گھوڑی نے کان آگے پیچھے ہلاتے ہوئے پھر آواز کو سنا۔ دنیا کی تمام آوازوں میں یہی ایک آواز تھی جو اس سے تعلق رکھتی تھی۔ برسوں برس اس کے لئے کان ترستے رہے تھے۔ برسوں ہوئے اس آواز کے پھر سننے کی نا امیدی ہو چکی تھی۔ یہ آواز۔ یہ آواز۔ لڑکی آ گئی مل گئی کہاں ہے ہائے جانے لگی پھر نہ سے گی۔ کیا کروں۔ کیا کروں۔ غالباً کچھ اسی قسم کے خیال گھوڑی کے دماغ میں آ رہے ہوں گے یا کچھ بھی۔ لیکن بیوا مہ

ہے کہ وہ سر کے بل گھوڑی سے نہیں اترا تو پھر یہ معلوم ہوا کہ اس بزرگ گھوڑی میں کسی نے بجلی بھر دی۔ اس نے ایک دفعہ جھٹکے سے تڑپ ماری۔ [illegible] پھینکتے ہوئے جنگلی ہرن کی طرح وہ تڑپی اور پھڑکی۔ دیکھتے دیکھتے ساز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ گھوڑی آزاد ہو کر لوگوں میں سے [illegible] کی طرف پھرنے لگی۔ وہ رکتی، بھاگتی، کبھی الف ہوتی۔ کبھی دولتیاں چلانے لگتی [illegible] سے سلامت نکالنے [?] کے گرد گھومنے لگی۔ چاروں طرف سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے تھے۔ لیکن سب خوفزدہ بھاگنے کے واسطے تیار رہ رہ کر تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان ہی میں یکے والا اور میاں کالے خان بھی شامل تھے جو کہ فاصلہ پر ہی سے نمایاں اچھل کود اور بلند تر چیخوں سے اپنی وابستگی اس [illegible] سے ظاہر کر رہے تھے۔ جبکہ اب شیرا [?] ابھی سر کو زمین پر لٹکائے نڈھال کی حالت میں خاموش کھڑا تھا۔ اور اس کے ارد گرد خوفناک، وحشی، جنگلی گھوڑی اس ارادہ سے علانیہ کہہ رہی تھی کہ اگر کوئی بھی پاس آیا تو جان ہی لے لوں گی۔

اور سفید پردے کا [illegible] میں عجیب مظلومیت سے ساکت شیرا [?] جھکا کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دعا مانگ رہا ہے۔ اس کے پردوں کے اندر بھی بالکل خاموشی تھی۔ بیوی ڈر کے مارے بیہوش ہو چکی تھی۔ [illegible] پردے کا ایک کونہ ہٹائے ایک کے [illegible] پکڑے خاموش بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو ایک کے بعد ایک گالوں پر سے بہہ کر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اس کے چاروں طرف دور دور ہزاروں آدمیوں کا ہیجان تھا اور ارد گرد گھوڑی کے وحشیانہ کرتب تھے اس وقت اس نے پھر ایک دفعہ اپنی پرانی دنیا کو زندہ ہوتے دیکھا۔ اس کے مردہ ہاتھ پیروں میں ایک روح سی دوڑی۔ وہ پردے ہٹا کے [illegible] پر لمحہ بھر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر ہزاروں ششدر آدمیوں کے سامنے وہ بدصورت [illegible] بیہوش [?] عورت گھوڑی کی طرف لپکی اور اچھل کر اس کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑی بھی جدھر اس کا منہ تھا ادھر ہی سیدھی سرپٹ دوڑ پڑی۔ لوگوں کی بھیڑ کائی کی طرح پھٹتی گئی اور گھوڑی تیر کی طرح نکلتی یہ جا وہ جا بھاگی چلی گئی۔

بوڑھی عورت کو لیے بوڑھی گھوڑی بے تحاشا بھاگی۔ جو راہوں پر ہوتی [illegible] بازاروں میں سے گزرتی۔ بھاگتی چلی گئی۔ کھیتوں پر سے گزر گئے۔ اور وہ بھاگتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ شہر کا کنارہ بھی آیا اور نکل گیا۔ اب بھی سیدھی [illegible] اس پر بھی وہ دونوں میلوں بیابان چلے گئے۔ [illegible] منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ [illegible] جا رہے ہیں۔ چند میل کے بعد [illegible] گھوڑی کے پیر لڑکھڑائے [illegible] سرپٹ بھاگتے [illegible]

کھائی بھنے کے بند میں پڑ گری۔ ممانی جی سر کے بل [illegible] گریں گھوڑی بھی بڑی [illegible] جس سے گھوڑی [illegible] نکالی تھی۔

[illegible] دوست اور رشتہ دار [illegible] آخری منزل مقصود [illegible] حاصل کرنے کے واسطے یہ دونوں جدا جدا [illegible] رہے تھے۔ [illegible] کس حصول کی تمنا تھی۔ شباب لٹ چکا تھا اور جوانی بیت چکی تھی۔ میں ایک کہیں، دوسرا کہیں کسی نہ کسی طرح راہی ملک عدم ہو گئے۔ [illegible] آخر کہانی پھر [illegible] شباب کا [illegible] نصیب [illegible] بھی نہ ہوا تھا کہ [illegible] ہوا۔

سید رفیق حسین

آنکھیں

آنکھیں! —— دو بڑی بڑی سیاہ و نشیلی آنکھیں! دنیا کے ہر تغیر سے بے نیاز۔ ہر فکر سے خالی! ماحول سے بیگانہ کھلی ہوئی گلاب کی سرخ پنکھڑیوں سے کھیل رہی تھیں۔ لمبی لمبی پلکوں کے درمیان معصوم زندگی جھانک رہی تھی۔ کسی کو ان کی جانب دیکھنے میں جھجک نہیں محسوس ہوتی تھی اور نہ انہیں کسی کو دیکھنے میں۔ وہ اس چشمہ کی طرح صاف و شفاف تھیں جس میں ابھی کسی چیز کا عکس نہ پڑا ہو۔ وہ اس محویت کے عالم میں ان نرم و نازک پنکھڑیوں کو دیکھ رہی تھیں گویا دنیا کی تمام دلکشی سمٹ کر ان میں سمو گئی ہے۔ یکایک وہ اٹھیں جس طرح ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے کلی کھل جائے —— سامنے ایک رنگین تتلی اچھل کے اس پھول تک اڑی جا رہی تھی وہ تعاقب کرنے لگیں سارا شوق کھنچ کر چھوٹی چھوٹی پتلیوں میں آ گیا تھا۔ تتلی پھول پر جا کر بیٹھ گئی —— آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی جیسے صبح دم کرن پھوٹے۔ وہ آہستہ آہستہ تتلی کی طرف بڑھنے لگیں۔ مگر وہ یونہی گھوم کر پیچھے دیکھنے لگیں جیسے کسی نے انہیں پکارا ہو۔ اب ان میں ایک بہت ہی معصوم خفگی کی جھلک نمایاں تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ تکتی ہیں گھورتی رہیں اور پھر آخری نظر تتلی پر ڈال کر واپس ہو گئیں —— جھکی ہوئی آنکھیں جن سے فرط بیزاری ٹپک رہی تھی —— تھوڑی دور چل کر وہ پھر اٹھیں اور سامنے گھورنے لگیں —— گویا وہ پوچھ رہی تھیں "کیا ہے؟ کیوں اٹھایا ہے؟"

آنکھیں! —— شگفتہ اور شاداب آنکھیں —— جدھر اٹھ جاتیں تازگی سی پیدا کر دیتیں جھکی ہوئی ایک کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھیں —— بڑی دلچسپ کتاب معلوم ہوتی تھی کیونکہ ایک سطر سے دوسری سطر تک پہنچنے میں جس بے چینی کا اظہار کیا تھا اس میں اشتیاق کی مسرت آمیز جھلک پائی جاتی تھی۔ پس منظر سے مختلف قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ زور زور سے باتیں کرنے میں مشغول تھے کوئی کپڑے کی مشین چلا رہا تھا کسی کی [illegible] جاتیں یکایک لمحہ کے لئے کتاب سے نظریں ہٹا کر [illegible] کی طرف جاتیں جس میں ایک طرح کی ناگواری کا شائبہ [illegible] گیا مگر کتاب نہ ختم ہوئی [illegible] آنکھوں میں ایک مسرت سی [illegible] تجربات کا مشاہدہ از حد پرلطف تھا۔ رفتہ رفتہ اندھیرا چھانے لگا تھوڑی ہی دور پر سوئچ تھا جس کو دبا روشنی کی جا سکتی تھی مگر اتنی فرصت کسے تھی۔ نظریں گڑا گڑا کر آنکھیں کتاب کے ایک ایک لفظ کو جذب کر لینے کی کوشش میں تھیں —— اندھیرا پورا ہو گیا —— آخرکار جبریہ بجلی کے بٹن تک نظریں پہنچیں اور کمرہ منور ہو گیا سفید اور صاف کمرہ میں یہ دو آنکھیں دور سے دیکھنے والے کے لئے وہی انداز رکھتی تھیں جو ایک سادہ اور چکنے کاغذ پر خوشخط لکھے ہوئے شعر کو پڑھنے میں ہوتی ہے —— کتاب ختم ہوئی اور قلبی کیفیت سے بوجھل وہ پتلیاں کھڑکی سے فضا کو تکنے لگیں —— نیلے آسمان پر دو تارے ایک ہی جگہ مسکرا رہے تھے!

آنکھیں! —— دو بڑی بڑی گہری آنکھیں —— اتنی گہری کہ ان میں نظر ڈالتے ہوئے ڈر معلوم ہونے لگے۔ اپنی وسعتوں میں کائنات کو لئے ہوئے کچھ سوئی ہوئی کچھ جاگتی ہوئی اس طرح دیکھتی ہوئی گویا پردوں کے پیچھے کوئی پیارا راز ہے جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتیں —— جب جھکتیں تو گمان گزرتا کہ کوئی نہایت میٹھے لہجے میں آہستہ آہستہ پریوں کی کہانی سنا رہا ہے۔ جب اٹھتیں تو معلوم ہوتا کہ کسی نے جھک کر ستارا اٹھا لیا ہے —— آج زندگی میں پہلی بار وہ چوری کر رہی تھیں —— ایک عجیب قسم کی چوری۔ دروازہ کے پردہ کے پیچھے چھپی ہوئی وہ کسی کو دیکھ رہی تھیں —— کچھ گھبرائی ہوئی کچھ شرمائی ہوئی —— ذرا دیر دیکھنے کے بعد وہ پردہ میں چھپ جاتیں گویا محسوسات کو سمجھنا چاہتی ہیں اور پھر مرضی کے خلاف باہر سے آنے والی آواز پر متوجہ ہو جاتیں۔ وہ اس کی آواز کو بغور سن رہی تھیں۔ کبھی وہ مسکرانے لگتیں۔ کبھی ہنسنے لگتیں اور کبھی گفتگو سے ہٹ کر خود اپنے جذبات میں کھو جاتیں۔ اس وقت ان سے عجیب طرح کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی گویا وہ کہہ رہی تھیں "آپ تو بڑے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی گفتگو میں بڑی دلکشی ہے۔ آپ کی آواز بڑی خوش آئند ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آپ اصلاحات میں اتنی گہری دلچسپی رکھتے ہیں" بعض اوقات کچھ سوچنے لگ جاتیں بالکل اسی طرح جیسے کوئی دلچسپ کہانی سنتے سنتے خود اپنے تاثرات میں گم ہو جائے اور پھر سننے لگے۔ پھر گم ہو جائے اور پھر چونک کر کہے "کیا کہا تم نے کیا کہا؟" —— یکایک وہ سننے لگے اور متوجہ ہو گئیں۔ شاید باب گفتگو ذرا دھیمے لہجے میں ہو رہی تھی۔ پتلیاں جھک کر کونے میں جا لگیں تھیں۔ رفتہ

[illegible] آنکھیں [illegible] مسکرانے لگیں یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے انھوں نے [illegible]
[illegible] سے کام لے کر اک ذرا پیچھے ہٹ گئیں۔ تھوڑی دیر [illegible]
حاصل کرنے کے بعد وہ دونوں آکر پڑھنے میں مشغول ہو گئیں۔ پڑھتے پڑھتے
جھکی پلکوں میں ایک بے معنی سی مسکراہٹ اور افسردگی کی جھلک نمایاں ہو گئی
تھیں وہ شرم میں [illegible] پھر اپنی جگہ پر آکر [illegible] کہہ رہی تھیں اچھا تو یہ
[illegible] ہے ——— انھوں نے دو تین بار مڑ کر پیچھا [illegible] خوف سے [illegible]
تھا شاید کوئی نہیں دیکھ رہا ہے وہ مطمئن ہو کر پردے سے لگ گئیں رفتہ رفتہ ان
کا جسم [illegible] شاید پھر کوئی دلچسپ بات سنی ——— وہ اندر چلی آئیں وہ عجیب
قسم کا سرور محسوس کر رہی تھیں کوئی نامعلوم سا جذبہ [illegible] آہستہ
آہستہ سنجیدہ ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ایک خواب آمادہ [illegible] گرد و پیش نظر
دوڑانا چاہتی تھیں وہ اپنی خیالات کی رو میں بہہ رہی تھیں جیسے ایک پھول لہروں
پہ جھکے کھاتا ہوا چلا جا رہا ہو۔ وہ کبھی معمول سے زیادہ کھل جاتیں اور کبھی اس طرح
سنجیدہ ہونے لگتیں جیسے کھجور کی پتیوں کے درمیان سے باریک سا چاند نظر آ رہا
ہو وہ سوچ رہی تھی کہ "جہاں [illegible] پایا ہے وہیں بھی نہ جاؤں؟" مگر ذرا ہی کوئی
آہٹ ہوتی کسی کی محسوس ہوئی اور وہ دوسری طرف متوجہ ہو جاتیں۔

دن گزرتے گئے اور اسی کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں کئی چیزیں ایک
نئے جھلکنے لگیں ——— آرزوئیں، امیدیں، تذبذب، تحیر اور الجھن ———
[illegible] بے خوابی بھی تھی۔ رات کی خاموشیوں میں وہ آسمان پر کسی گمنام ستارے
کی تلاش کیا کرتیں مگر وہاں کچھ نہ ہوتا ——— جھلملاتے ہوئے تارے مسکراتا ہوا چاند
——— بس! وہ پھر زمین پر جم جاتیں مگر انھیں تسکین کہیں نہیں ہوتی تھی۔ ایک خلش
[illegible] لرزتی کمرے کی طرف آ ہی جاتیں ——— وہاں کوئی آتا
اور وہ دیکھتی رہتیں ——— کوئی جانے لگتا اور وہ تعاقب کرتی [illegible] ان کا
روز کا معمول ہو گیا تھا مگر ادھر چند دنوں سے انھوں نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔
ان کی چوری پکڑی جا چکی تھی ——— اف وہ وقت!! وہ سہم گئیں۔ جھینپ گئیں
جیسے کوئی چیز ان سے ٹکرائی ہو۔ جیسے ہوا کا تیر جو [illegible] پتلیوں میں سما گیا ہو
انھیں محسوس ہوا ——— پہلی بار محسوس ہوا کہ کسی نے روح کی گہرائیوں میں ہاتھ
ڈال کر ایک خفتہ نغمہ بیدار کر دیا ہے جس کی موسیقی میں تمام دنیا لرزتی ہوئی [illegible]
رقص کرتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے ——— جیسے یکایک انھوں نے بہت
[illegible] کی جھنکار سنی ہو [illegible] پتلیوں کے سامنے ناچ رہے تھے ———
مگر اس دن وہ [illegible] کو سنبھال کر نہ جا سکیں تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ اس قدر
[illegible] ان میں لہریں اٹھنے لگتیں جس طرح گہرے نیلگوں سمندر میں ذرا دیر
کا تموج پیدا ہو جائے ——— اس دن تو ان کی حیرانی ہوئی [illegible]
[illegible] کوئی اور چیز بھی ان میں تبدیل ہو رہی ہے ——— [illegible] انھیں

[illegible] بہت [illegible] ہو گئی [illegible]
[illegible] سکیں [illegible] مگر بہت [illegible] بہت عجیب عجیب
ایک عجب تماشا نظر آنے لگا ——— پہلی طرف وہ اور [illegible] آنکھیں
دیے لگیں [illegible] آنکھیں [illegible] میں ایک شعلہ چھپا ہوا تھا [illegible]
تھا نہیں [illegible] ان آنکھوں میں [illegible] اضطراب
سوچتیں آخر یہ کیوں ہے؟ اور کب تک یہ [illegible] وہ دونوں [illegible]
وہ بالکل مسحور اور مجبور ہو گئیں ——— وہ [illegible] چلی جاتیں [illegible]
تھا کہ کوئی وہاں اس وقت آ جائے گا ——— [illegible] کرتے تھے
[illegible] کی محبت آمیز فضا میں کھڑی ہوتی تھیں کہ انھیں قدموں کی آہٹ [illegible]
کر پردے کے پیچھے چھپ جانا چاہتی تھیں ——— کر اتنے میں ...... کہ
اتنے میں کوئی آ گیا وہی جس کی آنکھوں میں ایک پیغام تھا ——— بالکل وہی پیغام
؟ وہ دنیا چاہتی تھیں وہ اس طرح اچانک سامنا ہو جانے سے گھبرا گئیں ایک لمحہ تک وہ
خاموش جھکی جھکی نظروں سے زمین پر جمی رہیں انھیں کمرہ کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی
مگر اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ آنے والے کی آنکھیں ان کا جائزہ لے رہی ہیں۔ مدھم
مدھم سا ایک سرخ رنگ کا پردہ ان کے سامنے اٹھتا اور گرتا معلوم ہو رہا تھا ———
ایک لمحہ تک کامل سکوت تھا پھر وہ نہ جانے کیسے پردے کے پیچھے جا کر چھپ گئی ———
کھوئی ہوئی گھبرائی ہوئی وہ جلد نیچے بہت نیچے زمین کے سینے میں کہیں دھنسی
چلی جا رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ ہوش میں آنے لگیں۔ وہ کمرہ کی طرف متوجہ ہوئیں
——— مگر وہاں بالکل خاموشی طاری تھی ——— کہیں اس قسم کی تو نہیں جو
یہاں ان پر طاری ہے ——— وہ پھر زور زور سے دھڑکنے لگیں ———
ابھی ابھی دھڑکنے لگیں ایسا معلوم ہوا کہ دل سینہ سے نکل کر آنکھوں کے حلقے میں آ گیا
ہے ——— !

آنکھیں! وہ بڑی بڑی پیاری آنکھیں [illegible] زمین پر گڑی ہوئی
تھیں یا انھیں سامنے دیکھنے میں [illegible] معلوم ہو رہا تھا۔ حجاب سا محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی
کبھی وہ لمحہ بھر کے لئے اٹھ جاتیں اور پھر زمین پر جم جاتیں گویا انھیں کسی نے طلب
کیا ہے اور اس کا جواب وہ یوں دے رہی ہیں۔ ان میں آج ایک والہانہ کیفیت
تھی! [illegible] دبانے کے چھلکی پڑتی تھی وہ جب چاپ کسی کی باتیں سن رہی [illegible]
[illegible] جا رہا تھا [illegible] کی ساری [illegible] صداقت [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] سامنے دیکھا ایک نقش تک وہ مبہوت چوکنا سی تھیں [illegible] ——— وہ ادھر آنکھیں سے تاثر مقدم کیا انھیں ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی ان کی ساری زندگی ان کے اندر انڈیل رہا ہو ——— وہ کانپ گئیں انھیں ایسا معلوم ہوا جسم سے روح کھنچ کر پتلیوں میں آ کر تھرتھرا رہی ہے اور بجنسہ یہی کیفیت انھوں نے ان آنکھوں میں بھی پائی ——— الٰہی توبہ! انھوں نے سوچا کیا یکایک کیا ہو رہا ہے ——— الٰہی! الٰہی! اور وہ پھر جھک گئیں بالکل پہرونگ کے انداز سے ان میں ایک عجیب قسم کا سرور پیدا ہو رہا تھا اور وہ مدہوش ہوئی جا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ سونے لگیں کوئی گرم گرم چیز ان کی پلکوں سے گذر کر پتلیوں کو بدمست کرتی دل تک اتری چلی جا رہی تھی ——— دونوں پلکوں سے گرم گرم تھرتھراتے لب مس ہو رہے تھے گویا وہ پیمان باندھ رہے ہیں کہ ہمیشہ یونہی! ——— یونہی! وہ اپنی پوری لرزشوں کو محو کر کے چند لمحوں کے بعد وہ پھر آہستہ آہستہ کھلیں اور جھک گئیں۔ انھیں تمام دنیا خواب تک دکھائی دے رہی تھی وہ جب تک سامنے رہیں جھکی رہیں اور اس کے بعد ——؟

آنکھیں! ——— عروسی آنکھیں جن سے شرم سے زیادہ غم اور غم سے زیادہ الجھن ٹپک رہی تھی۔ یوں جھکی ہوئی تھیں گویا "تن بہ تقدیر" ہیں۔ ان کے پھیکے پن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انھیں اس نئی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پلکیں یوں جھکی ہوئی تھیں جیسے اپنی بے بسی کا ماتم کر رہی ہیں جو یہ بتا رہی ہیں کہ مرضی کے خلاف وہ یہاں آنے پر مجبور کر دی گئی ہیں۔ آنکھوں سے اداسی ٹپک رہی تھی اور اسی انداز سے دیکھ رہی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سارے خواب یکبارگی چکنا چور کر دیئے گئے ہیں۔

بعض اوقات ایسا ظاہر ہوتا کہ کوئی جذبہ ان میں ہے ہی نہیں۔ وہ کہیں [illegible] رہی ہیں۔ کبھی کبھی وہ چھت کی طرف اس انداز سے اٹھ جاتیں جیسے کسی نے کتاب کے پچھلے ورق کھول دیئے ہوں اور وہاں اس وقت تک گڑی رہتیں جب تک کہ تھک نہ جاتیں۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ان آنکھوں کی چمک بھی مدھم پڑتی گئی۔ آ[illegible] دھیرے دھیرے [illegible] ہو گئیں ان کے نیچے سیاہ حلقے پڑتے گئے مگر کبھی [illegible] ایک دم سا [illegible] جیسے تندور کے سوئے ہوئے انگاروں پہ ہوا کا کوئی جھونکا [illegible] سے ایک آواز نکل کر تھوڑی دیر فضا میں گونج کے [illegible] اس وقت انھیں ایسا معلوم [illegible] ان کی آنکھیں [illegible] ہیں ———

تھوڑی دیر بعد وہاں سے نظر ہٹ کر پھر خلا پر جم جاتی۔ ان میں پھر زندگی کی ہلکی سی جھلک نمایاں ہو جاتی ——— وہ پھر سامنے دیکھنے لگتیں گویا کوئی انھیں یہاں سے بہت دور پکار رہا ہے۔ وہ دیکھتی رہیں یہاں تک کہ آنسو کے چند گرم گرم قطرے پلکوں پر تھرتھرا کر ان کے سامنے دھندلکا سا پیدا کر دیتے ——— اس قسم کا اتفاق انھیں کسی دوسرے تیسرے ہفتے پیش آتا ——— اب بھی وہی آنکھیں تھیں مگر ان کی گردش میں زندگی نہیں بلکہ احساسِ زندگی تھا!

آنکھیں! ——— بیمار۔ پژمردہ۔ بجھی ہوئی جن سے جھلک رہا تھا کہ کسی المیہ ناول کے اختتام پر پہنچ رہی ہیں وہ بہت کم ادھر ادھر نظر دوڑاتیں انھیں ہر شے بے رونق معلوم ہوتی۔ ان کا لنگر فریب کھنچا ڈھیلا پڑ گیا تھا اب اس کی جگہ سکڑی ہوئی دو شکست خوردہ آنکھیں تھیں۔ بے نور پتلیاں سیاہ حلقوں میں کبھی کبھی یوں چکر لگاتیں جیسے کوئی اندھیرے میں کسی چیز کو ٹٹول رہا ہو۔ زیادہ تر وہ پلکوں کے پیچھے ہوئے تھکن آلود بستر پر نیند کے انتظار میں کروٹیں بدل کرتیں۔ کبھی باہر بھی جھانک لیتیں مگر اس حسرتناک انداز میں جیسے کوئی مسافر گذرے ہوئے قافلہ کو دیکھ رہا ہو۔ سورج کی کرنوں سے انھیں خاص طور پر نفرت تھی۔ وہ اندھیرے میں کھلتیں اور بیٹھے بیٹھے تاریکی میں نہ معلوم کیا سوچا کرتیں ——— تاریکی اور تاریک آنکھیں!! اور ہر چند دنوں سے وہ معمول سے زیادہ کھل کھل کر کمرہ میں کسی کو تلاش کیا کرتیں جیسے انھیں کسی کا انتظار ہے مگر پھر مایوس ہو کر پلکوں میں سو جاتیں۔ وہ بے انتہا خفیف ہو رہی تھیں کسی سمت زیادہ دیر تک دیکھنے سے وہ دکھنے لگتیں ——— خصوصاً ——— آج تو وہ تھوڑی دور کی چیز بھی بمشکل دیکھ سکتی تھیں۔ آج انھیں کسی کا انتظار تھا وہ کھلتیں اور بند ہو جاتیں کھلتیں اور بند ہو جاتیں......

یکایک وہ چونک پڑیں! ان میں چمک آ گئی جیسے اندھیرے میں کسی نے موم بتی جلا دی ہو ——— وہ گھبرا اٹھیں بالکل اسی طرح جیسے پہلے ——— بہت پہلے ایک دن گھبرا اٹھیں۔ انھوں نے سامنے دیکھا اور نظریں جھکا لیں گویا اب وہ کوئی امانت لئے ہوئے تھیں جس کو انھوں نے سپرد کر دیا ہے اور اب مطمئن ہیں۔ ان کے گوشوں سے آنسو کے ننھے ننھے قطرے بہہ نکلے وہ آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ کمرہ میں تاریکی چھانے لگی۔ ...... میں تمہیں بند ہونے نہ دوں گا! ...... ہرگز نہیں بند ہونے دوں گا! .... تمہیں کھلنا پڑے گا ... صرف میرے لئے کھلنا پڑے گا......!'

آنکھیں! ——— وہ بڑی بڑی بند آنکھیں

مجتبیٰ حسین

چھ بجکر بیس منٹ پر

رضیہ کبھی کبھی سوچتی۔ کہ اس سے کیوں کوئی محبت نہیں کرتا۔ آخر اس میں کونسی کمی ہے اور پھر اس کی سہیلیاں کہاں کی خوبصورت ہیں۔ جو ہر روز اسے اپنی محبت کے قصے سناتی رہتی ہیں۔ کیا ان کے قصے سچے ہوتے ہیں یا من گھڑت۔ یا یہ کہ وہ اپنی سنہری آرزوؤں کو خوابوں کی دنیا میں دیکھ کر خوش ہو جاتی ہیں۔ اکثر جب وہ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتی۔ اسے کوئی خاص لطف نہ آتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ خوبصورت نہ تھی۔ اس میں اتنی کشش یا جاذبیت نہ تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک جاتے۔ یا خود بخود اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔ چھوٹا سا قد تھا گندمی رنگ۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ ہونٹ موٹے موٹے۔ چہرہ گول سا۔ اس کی پیشانی تنگ تھی۔ ہاں سر کے بال لمبے تھے۔ اس کے جسم میں کوئی خاص رعنائی نہ تھی۔ اور پھر اس کی عمر بھی کیا تھی یہی کوئی پندرہ سال۔ لیکن ان باتوں کے باوجود وہ بدصورت نہ تھی۔ بلکہ ہر وقت یہی خیال لگا رہتا تھا۔ اور یہ خیال یقین کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ کہ وہ بدصورت نہیں ہے اور پھر اس کی سہیلیاں اس سے بھی بدصورت تھیں۔ بنو کو دیکھ لو۔ نہایت پتلی۔ عمر کوئی سترہ برس کی ہو گی لیکن نہ سینے کا ابھار۔ نہ کولہوں میں ہی لچک۔ نہ چہرے پر رونق۔ لمبی موٹی سی ناک۔ ہاں اس کا قد لمبا تھا اور ہر سال لمبا ہوتا جاتا تھا۔ بنو کو اپنے قد پر ناز تھا۔ اور کبھی کبھی وہ کہتی "دیکھا اسے کہتے ہیں سرو قد۔" لیکن بنو کی آنکھیں دیکھ کر وہ دم بخود ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے پناہ بجلی کوندتی نظر آتی۔ جیسے وہ آنکھیں مردوں سے کہہ رہی ہیں: "مجھے لے لو۔" اکثر وہ سہیلیوں کے ساتھ آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کرتی۔ جیسے اسے اس طرح باتیں کرتے ہوئے خاص سرور حاصل ہو رہا ہے۔ عجیب قسم کی لڑکی تھی۔ وہ اکثر لڑکوں کے متعلق باتیں سنایا کرتی تھی۔ اور اس کی سہیلیاں نہایت انہماک سے اس کی گفتگو سنا کرتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بنو کو لڑکوں کے متعلق باتیں کرنے میں بڑا ہی مزا آتا تھا۔ اکثر باتیں کرتے کرتے اس کے گال تمتما اٹھتے۔ اس کے گالوں پر ہلکی سی لالی۔ اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک آ جاتی۔ اور کبھی کبھی تو اس کا سانس تیز ہو جاتا اور پھر وہ اپنے ہاتھوں پر سر رکھ کر لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگتی۔ بنو کی باتوں میں ایک قسم کی بھوک نمایاں تھی۔ ایک قسم کی پیاری سی پیاس۔ اور ہلکی سی تشنگی جو وہ خود محسوس کرتی تھی۔ لیکن اتنی شدت سے نہیں۔ گو رضیہ کو بنو کی باتیں سن کر لطف حاصل ہوتا۔ لیکن وہ اکثر رات بھر نہ سو سکتی تھی۔ رات کی تاریکی میں بنو کے کارنامے اور ان قصوں کے ہیرو اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے۔ اور اس کے دل و دماغ پر ایک لذت بھری بے چینی چھا جاتی۔ بنو شہر کے خوبصورت لڑکوں کے متعلق باتیں کیا کرتی کہ فلاں لڑکا اسے فلاں موڑ پر ملا تھا۔ اور دور تک اسے نہایت غور سے دیکھتا تھا اور پھر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ جب تک وہ اپنی سہیلی کے گھر چلی گئی۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو لڑکا اس گھر کے قریب گھوم رہا تھا۔ اس کا دل کس طرح دھک دھک کرنے لگ گیا تھا اور پھر وہ کس طرح اسے گھر تک پہنچا گیا تھا اور اس طرح وہ طرح طرح کے قصے سناتی۔ اکثر اس کی سہیلیاں بنو کو کہہ بیٹھیں۔ "بنو تو بہت بے شرم ہے۔ تجھے ایسی بات کرتے ہوئے ذرا لاج نہیں آتی۔"

"اس میں بے شرمی کی کیا بات ہے۔ میں جو محسوس کرتی ہوں کہہ دیتی ہوں۔ اور میں جانتی ہوں کہ تم بھی لڑکوں کو دیکھ کر اسی طرح محسوس کرتی ہو۔ لیکن تم کہتی نہیں۔"

"چل ہٹ۔ سب کو اپنے جیسا سمجھتی ہے۔ ہمارے دلوں میں ایسے بُرے خیال نہیں آتے۔" اور پھر ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ مبادا بنو ناراض نہ ہو جائے اور ہم اس کی روح پرور باتوں سے محروم ہو جائیں۔ بنو کی باتوں نے رضیہ کے دل میں طرح طرح کی امنگیں پیدا کر دیں جو شاید کچھ سال بعد پیدا ہوتیں۔ رضیہ اور بنو کی اب گاڑھی چھنتی تھی اور بنو رضیہ کے گھر ہر روز آیا کرتی۔ اب اس نے بہت سے لڑکوں کے متعلق باتیں کرنی چھوڑ دی تھیں اب وہ صرف ایک ہی لڑکے کے متعلق باتیں کیا کرتی۔ ایک ہی لڑکے کے قصے سنایا کرتی۔ اور جب کبھی اس کا کوئی خط آ جاتا۔ تو وہ دوڑی دوڑی رضیہ کے پاس آ جاتی۔ اور وہ دونوں اس خط کو پڑھا کرتیں۔ خط پڑھتے پڑھتے دونوں کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ بنو کا اس لئے کہ وہ اپنے محبوب کا خط پڑھ رہی ہوتی اور رضیہ کا اس لئے کہ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ جب بنو اپنا قصہ ختم کر لیتی۔ تو سعیدہ آ جاتی۔ سعیدہ اور بنو میں کافی فرق تھا۔ اگر بنو بدصورت تھی تو سعیدہ نہایت حسین۔ لڑکیوں کو اس پر رشک آتا تھا۔ سعیدہ کی باتیں سن کر وہ حیران ہو جایا کرتی تھیں۔ اس کی باتیں نہایت بیباک اور سلجھی ہوئی تھیں۔ انجان پن کی جھلک تھی۔ اسے بھلا کیا کہنے کی ضرورت تھی کہ اس کی نسبت رضیہ کے بھائی سے ہونے والی ہے۔ تو منگنی کی بات چیت ابھی تک ابتدائی تھی اور کیا معلوم کہ منگنی ہو یا نہ ہو۔ لیکن سعیدہ کچھ

اس ڈھنگ سے باتیں کرتی جیسے وہ رضیہ کے بھائی کو رفیقِ حیات بنا چکی ہو۔ اور اکثر اس کے گھر جب آتی تو ادھر ادھر دیکھتی جیسے کسی نامعلوم چیز کو ڈھونڈ رہی ہے۔ اور جب کبھی اسے معلوم ہو جاتا کہ بھائی صاحب گھر میں موجود ہیں تو سہم جاتی۔ تب وہ اس پرند کی طرح دکھائی دیتی جسے اپنے شکاری کی قربت کا احساس ہو جائے اور اگر کبھی بھائی اچانک اس کے سامنے آ جاتے تو وہ شرم سے آنکھیں نیچی کر لیتی اور پھر ہنس کر رضیہ کو چھیڑتی۔ سگائی کا معاملہ کچھ کھٹائی میں پڑ گیا۔ لیکن سعیدہ کا اشتیاق کم نہ ہوا۔ اور جب کبھی سعیدہ اسے اسکول میں ملتی۔ تو اس سے پوچھتی کہ بھائی صاحب کہاں ہیں۔ انھوں نے کونسے رنگ کا سوٹ پہن رکھا ہے اور ایک دن تو سعیدہ نے رضیہ سے صاف کہہ دیا کہ میں تو ان کی ہو چکی۔ آگے ان کی مرضی۔ سعیدہ نے کئی لڑکیوں کو اپنی محبت کا قصہ سنا دیا اور لڑکیوں کو یقین دلا دیا کہ اس کا بھی ایک محبوب ہے۔ رضیہ کی سب سہیلیاں یعنی بجز سعیدہ۔ یہ کاش شادی۔ سب کی سب "اپنے محبوب" کے متعلق باتیں کرتیں اور بیچاری رضیہ دانت پیس کر رہ جاتی کہ آخر کیا بات ہے کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ آخر اس میں کونسی خامی ہے۔ جس کی بدولت وہ لڑکوں کی نظر میں نہیں جچ رہتی۔ اس کی زندگی میں ایک چھوٹا سا خلا پیدا ہو گیا۔ ایک نامعلوم سی بے چینی اور اداسی۔ اس کے گھر کا ماحول بہت گھٹا گھٹا سا تھا۔ گھر میں ان کی سوتیلی ماں کا بہت رعب تھا۔

رضیہ کو یاد بھی نہ تھا کہ اس کی ماں کب فوت ہوئی تھی۔ وہ ماں کی ناز برداریوں سے آج تک محروم رہی تھی۔ اکثر لڑکیاں اپنی ماؤں کے متعلق تعریفی کلمات کہا کرتی تھیں۔ لیکن رضیہ بیچاری زندگی میں ماں کے خلوص اور پیار سے بیگانہ تھی۔ بچپن میں اسے ایک دایہ نے پالا۔ اور جب اس نے ہوش سنبھالا تو اس کے باپ نے دوسرا بیاہ کر لیا تھا۔ گو اس کی سوتیلی ماں نے اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا تھا۔ لیکن پھر بھی رضیہ کو اپنی سوتیلی ماں کی یاد ستاتی تھی۔ اس کے بچپن کی دایہ اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ لیکن سوتیلی ماں نے اسے رضیہ کا نگہبان بنا دیا تھا۔ بلکہ ایک طرح کی جاسوس۔ اکثر رضیہ کی سوتیلی ماں رضیہ کی باتوں میں کوئی نہ کوئی نقص نکالا کرتی اور کہتی بیٹی اب تو جوان ہو چکی ہے۔ تجھے سنبھل کر قدم رکھنا چاہئیے۔ اگر وہ اس پر اکتفا کرتی تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ لیکن اس کی ماں اسے ہر بات پر ٹوکتی اور کبھی جھڑکی لگتی: نہ کالا کرو، سرخ دوپٹہ نہ پہنا کرو، سر ننگا نہ کیا کرو۔ دروازے سے جھانکا نہ کرو۔ آنکھیں مٹکایا کرو۔ شوخی نہ ہوا کرو اور جب بھائی صاحب بیٹھک میں آ جائیں تو تمہیں فوراً اپنے کمرے میں آ جانا چاہیئے۔ کبھی کبھی جب رضیہ اپنے بھائی کے بستر پر بیٹھ جاتی تو اس کی ماں اسے فوراً جھڑک دیتی۔ بھائی کے بستر پر نہ بیٹھا کرے۔ وہ عجیب وہم میں پڑ جاتی تھی۔ کہ اس بستر میں کیا ہے۔ وہی رضائی۔ وہی کمبل۔ وہی چادریں۔ آخر ان تمام باتوں کا مطلب کیا ہے اور بہت غور و فکر کرنے کے بعد وہ چپ ہو جاتی۔ اور اگر ماں اسے ہر بات پر ٹوکتی تو اس کا باپ اسے کچھ نہ کہتا تھا اور جب کبھی رضیہ ماں کی جھڑکیوں سے تنگ آ کر باپ کے سامنے اپنا رونا روتی۔ تو باپ اس کو نہایت پیار کے لہجے میں کہتا۔ رضیہ بیٹی اپنی ماں کا کہا ماننا چاہیئے۔ وہ تمہارے بھلے کے لئے ہی تو کہتی ہیں اور رضیہ بیچاری یہ جواب سن کر جل بھن جاتی۔ اسے رہ رہ کر اپنے بھائی پر غصہ آتا تھا۔ جو ہمیشہ عورتوں کی آزادی کے متعلق ڈینگیں مارتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح آزادی ملنی چاہیئے۔ عورت اور مرد زندگی کے دو پہیئے ہیں۔ اگر ایک پہیئے کو زنجیر سے باندھ دیا گیا تو زندگی کی گاڑی کا چلنا دشوار ہو جائے گا اور یہاں مساوات تو کیا زندگی کے معمولی لوازمات سے لڑکیوں کو محروم کیا جاتا ہے اور بھائی صاحب ہیں کہ چوں تک نہیں کرتے اور پھر یہ جاسوس دایہ۔ یہ کب تک اس کا پیچھا کرے گی۔ رضیہ جس سہیلی کے گھر جاتی۔ یہ بھی لڑھکتی مرتی گرتی پڑتی ساتھ چلی جاتی ہے۔ اس نے کبھی بھی انکار نہیں کیا۔ کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ اب ٹانگوں میں سکت نہیں ہے۔ اب کی بار میں نہیں جا سکتی۔ انکار تو درکنار۔ یہ تو اور بھی نمک مرچ لگاتی ہے اور گھر میں طرح طرح کے طوفان مچاتی ہے۔ بی بی بہو۔ یہ مجھے پسند نہیں ہے۔ کبھی سن لی ہوں گی اس کی باتیں۔ بس پھر کیا تھا۔ جھٹ بڑی بی نے بی بی سے جا کر شکایت کر دی۔ جیسے ساری عمر اس نے مردوں کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ چڑیل نکتی ہے چڑیل۔ اللہ اسے جلد قبر میں جگہ دے۔ اتنی بوڑھی ہو گئی ہے مگر جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی رضیہ سوچتی یہ بھائی۔ اخوت اور آزادی کے پرستار حریت اور ڈیموکریسی کے علمبردار یہ جو عورتوں کے حقوق کے لیے بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں۔ یہ دراصل بڑے کمینے اور تنگ نظر ہیں۔ بھلا جب کبھی ان کے یار دوست آ جائیں تو ڈرائنگ روم کا دروازہ ایک دم بند۔ کہیں ان مردوں کا سایہ گھر کی صنف نازک پر نہ پڑ جائے۔ یا ہم کہیں ان سایوں کو نہ دیکھ لیں اور رضیہ کو معلوم تھا کہ بھائی اور ان کے دوست اکثر جوان لڑکیوں کے متعلق گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ ابھی اس دن کی بات ہے کہ ڈرائنگ روم میں اس کا بھائی اور ان کے دوست خوش گپیاں ہانک رہے ہیں۔ تو ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر ان کی تمام گفتگو سن رہی تھی۔ رضیہ کے بھائی بولے۔

"بھئی اصغر یہ جو تو عجیب ہی لڑکی ہے۔ اتنی بے باک اور شوخ لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی اور خدا کی قسم اس کی آنکھیں ---- کیا کہوں جو کی آنکھوں میں تم سب کچھ پڑھ سکتے ہو یعنی کہ یہ آنکھیں صاف صاف کہہ دیتی ہیں کہ ہم

چلتے ہو۔ تم سب کا مشغلہ تو یہ۔ نہیں لڑکیوں سے بات کرنا [illegible] کیا ہیں اور آپ لیجئے جس میں تم موجودہ تہذیب کی جھلک [illegible] دیکھ سکتے ہو۔

اس دن کی بات ہے کہ میں اور رشید کرسی [illegible] بیٹھے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ ہمارے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ کچھ دیر کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم نے سمجھا شاید اصغر بھیا آئے ہیں۔ جب دروازہ کھولا۔ تو سامنے جواد صاحب کی لڑکی کھڑی تھی۔ وہ سیدھی ہمارے کمرے میں چلی آئیں۔ ہم تو بالکل پاگل بنے کیا کریں۔ بڑی بھولی نگاہ ہمارے دل میں اتر گئی۔ میرا دل چاہا کہ ہو کو زور سے سینے سے چمٹا لوں۔ اتنے میں کسی کی آہٹ آئی۔ دیکھا تو اماں کھڑی تھیں۔ میں پانی پانی ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں۔ جھٹ منو بول اٹھی۔ بھائی صاحب رضیہ کہاں ہے۔ میں تو اسے آپ کے کمرے میں ڈھونڈنے آئی تھی۔ اور پھر دونوں کمرے کے باہر چلی گئیں۔

اور پھر یہ سعیدہ۔ رضیہ کے بھائی بولے "اس نے مجھے بدنام ہی کر دیا ہے۔ سارے شہر میں منگنی کا چرچا ہو رہا ہے۔ اس ظالم سعیدہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے۔ کہ میں تو اب ان کی ہو چکی۔ آگے ان کی مرضی۔ اور جب کبھی وہ راستے میں ملتی ہے۔ تو یوں ہی کھنکھارنے لگتی ہے۔ کل کی بات ہے کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ گزر رہی تھی۔ کہ مجھے دیکھ کر کچھ پیچھے ہو گئی۔ میں دم بخود ہو گیا۔ اور کیونکہ سعیدہ کے ساتھ اس کی ماں تھی۔ اس لئے میں کچھ جھجک سا گیا۔ لیکن پاس سے گزرا تو "ہش ہش" کی آواز آئی۔ اور پھر اپنی آنکھوں کا اشارہ کر کے سعیدہ نے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ تم ہی بتاؤ اصغر۔ کتنا پاگل پن ہے۔ اور میں اس کے پیچھے جا کر کیا کرتا؟

اور پھر یہ کاش جو ہر روز دیال کو ایک خط نوکر کے ہاتھ بھیج دیتی ہے اور بیچارا دیال کیا کرے۔ وہ بھی نوکر کے ہاتھ جواب بھیج دیتا ہے۔ بس خطوں کا سلسلہ جاری ہے۔ خط آتے ہیں۔ خط جاتے ہیں۔ لیکن ملنے کا نام تک نہیں۔ بھلا اس کھیل سے کیا حاصل۔ میں تو ان باتوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ یہ محبت نہیں مرض ہے۔ مرض اگر نہیں تو اس سے اختلاج قلب تو ضرور ہو جاتا ہے۔ ان تمام لڑکیوں نے اپنا اپنا محبوب چن لیا ہے۔ اور جب کہیں اکٹھی بیٹھتی ہیں تو خوب دل کھول کر ہم سب کو (DISCUSS) کرتی ہیں۔ خدا کی قسم ذرا بھی شرم و حیا نہیں آتی اور تو کیا صرف خط لکھنے پر زور۔ اور ملنے کا نام تک نہیں۔ بعد جب بھائی صاحب کی باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ تو ڈرائنگ روم سے کھسر پسر کی آواز آتی۔ اور کھسر پھسر کی سرگوشیاں اور کبھی کبھی قہقہے بلند ہوتے اور ڈرائنگ روم ہنسی سے گونج اٹھتا اور جب رضیہ کی سہیلیاں آ جاتیں تو بھائی صاحب جھٹ کسی نہ کسی بہانے رضیہ کے کمرے میں آ جاتے اور کہتے رضیہ۔ میری کتاب جو کل میں نے خریدی تھی وہ نہیں ملی۔ دیکھو تو کہیں تمہارے کمرے میں تو نہیں اور بھلا کیا دھوبی کپڑے

رہے گیا تھا۔ جیسے [illegible] ہوا ہے۔ [illegible] میں اچھا رہتے ہو۔ [illegible] ہے [illegible] کنکھیوں سے میری سہیلیوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ [illegible] قہقہوں کا زور۔ کبھی کبھی غالب کا شعر پڑھ دیتے ہیں۔

عشق نے غالب نکما کر دیا۔

اور جب وہ میرے کمرے میں نہ آتے تو شام ہونے پر پوچھتے کیوں رضیہ آج کون آئی تھی پیلے رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے کون تھی۔ میں نے تو اسے آج ہی دیکھا ہے۔ بھلا یہ کیوں تاکیں میری سہیلیوں کو کیا میں ان کے دوستوں کی طرف دیکھتی ہوں اور یہ دیکھنے کی کب اجازت دیتے ہیں۔ توبہ آئے پاک باز۔ پوچھتے وقت ایسی شکل بنا لیتے ہیں جیسے کوئی ریاضی کا سوال حل کر رہے ہیں۔ لیکن میں سب کچھ جانتی ہوں کہ اس وقت ان کے دل پر کیا گزر رہی ہے اور وہ کیوں یہ سوال پوچھ رہے ہیں۔

کیوں کیا نام ہے ان کا۔

کس کلاس میں پڑھتی ہیں کس اسکول میں۔

اوہو۔ مجھے مغالطہ ہوا۔ میں نے سمجھا۔ احمد میاں صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ یہ تو اور کوئی تھیں۔ خیر۔ اور چلے جاتے ہیں اور پھر یوں بنتے ہیں جیسے میں نے کچھ سمجھا ہی نہیں۔

اور پھر اسے وہ شام یاد آئی۔ جب وہ اپنی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ سورج کی الوداعی کرنیں دور افق کی لکیر پر کروٹیں لے رہی تھیں اور سامنے پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور ان کی چوٹیاں سونے کی کرچیوں کی طرح چمکتی تھیں۔ پہاڑوں کے دامن میں ندی کی سیدھی سفید سی لکیر نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی پہاڑی دوشیزہ کے بالوں کے درمیان ایک مانگ نکالی گئی ہو۔ دور شہر کے باہر کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ پھولوں کی [illegible] خوشبو ہوا میں سمائی ہوئی تھی۔ رات کے سائے جاگ رہے تھے اور وہ چپ چاپ کھڑکی میں کھڑی تھی۔ نیچے گلی میں کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی تو رضیہ نے دیکھا کہ نیچے ایک نوجوان گزر رہا تھا۔ یکایک اس کی آنکھیں اس سے [illegible] اور وہ نگاہیں نیم خاموش فضا کو چیرتی ہوئی اس کے دل میں پیوست ہو گئیں۔ وہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اب نوجوان گلی کے سرے پر پہنچ چکا تھا کہ [illegible] پھر اس نے رضیہ کی طرف دیکھا اور چند لمحے [illegible] نظروں سے [illegible] رضیہ کی رگ رگ میں طوفان سا برپا ہو گیا۔ صرف ایک [illegible] مجھے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اب [illegible] [illegible] لڑکی کیا ایسے بھی ہو سکتا ہے وہ [illegible]

سچی کہانی

ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں آپ سے۔ بتایئے گا؟

کیوں نہیں؟

سچ سچ بتایئے گا؟

بیشک۔

میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ مجھے بنا تو نہیں رہے ہیں۔

میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکتی!

واقعی؟

واقعی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کا التفات روز بروز بڑھتا جاتا ہے اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بار بار میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید آپ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ صرف مجھے ستانے کے لئے ورنہ میری طرف آپ کا میلانِ خاطر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں اپنے اندر کوئی بات بھی ایسی نہیں پاتی جو آپکی گرویدگی کا باعث ہو سکے۔ آج تک کسی نے مجھے "خوبصورت" نہیں کہا۔ انسان اپنے متعلق بہت خوش گمان ہوتا ہے مگر اس کے باوجود کبھی میں نے اپنے آپکو خوبصورت نہیں سمجھا، جب آئینہ دیکھا دل میں یہی آرزو پیدا ہوئی "کاش میں حسین ہوتی" اگر آپ مجھے بنا نہیں رہے ہیں تو شاید جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر خود اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں تمہارے سوال کا جواب دوں میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔

پوچھئے۔

تمہارے نزدیک حُسن کا معیار کیا ہے؟

وہی جو ساری دُنیا کے نزدیک ہے۔

مثلاً؟

مثلاً غزالی آنکھیں، ہلالی ابرو، گلابی ہونٹ، شہابی رخسار۔

بس بس، میں سمجھ گیا تمہارا مطلب۔ سلمیٰ! کس قدر غلط اور عامیانہ معیار تم نے قائم کیا ہے حُسن کا۔ یہ معیار اگر صحیح ہوتا تو ساری دُنیا صرف ان چند خوبصورتوں پر مرتی جن کی صفت تم نے بیان کی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ تمہارے نزدیک غزالی آنکھیں ہی انسان کو دیوانہ بنا سکتی ہیں۔ مگر بہت سے لوگ ان آنکھوں پر بھی جان دیتے ہیں جو نرگس کی طرح گول اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ تم سمجھتی ہو کہ ہلالی ابرو ہی کیوپڈ کی کمانیں ہیں مگر سیدھی بھنویں بھی بے پناہ تیر چلا سکتی ہیں۔ آؤ۔ میں تمہیں بتاؤں کہ حُسن کا حقیقی معیار کیا ہے۔

حُسن درحقیقت نام ہے پسند کا۔ اور دنیا میں پسند دو آدمیوں کی بھی یکساں نہیں ہوتی اس لئے دُنیا میں جتنے انسان ہیں اُتنے ہی حُسن کے معیار ہیں۔ تمہیں اگر کسی نے حسین نہیں کہا تو یہ تمہارا قصور نہیں یا قصور ہے دیکھنے والے کی نظر کا۔ ہر آنکھ میں یہ صلاحیت کہاں کہ وہ سطح کے پیچھے دیکھ سکے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جاپان کی بنی ہوئی سستی قسم کی رنگین تصویریں عوام الناس کس شوق سے خریدتے ہیں۔ اُن کے نزدیک رنگوں کی شوخی ہی بڑا حُسن ہے۔ نقوش کی لطافتوں اور خطوط کی نزاکتوں کو وہ نہیں سمجھتے لیکن ایک مُبصّر کسی آرٹسٹ کی ایک پنسل ڈرائنگ کو ایسی ہزار رنگین تصویروں سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے عوام الناس اگر اس پنسل ڈرائنگ کی طرف اعتنا نہ کریں تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اس نقشِ سادہ میں حُسن نہیں؟

سلمیٰ! تم اس بانسری کی مانند ہو جس میں ہزاروں میٹھے اور رسیلے نغمے بھرے ہوئے ہیں۔ ایسے نغمے جو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر روحوں کو آسمانوں پر لے جاتے ہیں۔ مگر جو شخص بانسری بجانا نہیں جانتا اس کے نزدیک یہ بانسری، یہ رس ساگر، بانس کا ایک ٹکڑا ہے اور بس جو جلانے کے سوا اور کسی کام کا نہیں۔ مگر اس کی قدر اُس سے پوچھو جو اپنے ہونٹوں کو اُس کے لبوں سے ملا کر آبِ حیات برساتا ہے اور کانوں کی راہ سے شراب پلا کر روح کو مست و بےخود بنا دیتا ہے۔

سلمیٰ! تم ایک شعر ہو۔ مگر ایسا شعر نہیں جو لفظی رعایتوں کا گورکھ دھندا ہو۔ جس میں گمراہ و بیمار تخیل نے ہوائی قلعے بنائے ہوں۔ بلکہ ایسا شعر ہو جو گنجینۂ معنی اور خزینۂ اسرار ہے۔ جو ایک نشتر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتا ہے۔ جسے سُن کر ذوقِ سلیم جھومنے لگتا ہے۔

شاید اب میرے اور دُنیا کے نقطۂ نظر کا فرق تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا۔ میں نے تمہیں ایک نقشِ سادہ کہا۔ مگر ایسا نقش جس میں آرٹسٹ نے اپنے موقلم کا کمال دکھایا ہے اور جو رنگوں کے بغیر ہی دلکش اور نظر

فریب ہے۔ بلکہ وہ لوگ جن کی نظریں فقط سستے قسم کے شوخ اور بھڑکیلے رنگوں ہی کو سب کچھ سمجھتی ہیں، تمہیں کیونکر حسین کہیں۔ تمہاری سادہ پکار کو سمجھنے کی صلاحیت قدرت نے مجھے عطا کی ہے اس لئے تم مجھے سراپا حُسن نظر آتی ہو۔

میں نے تمہیں بانسری سے تشبیہ دی۔ میں اس بانسری سے مست نغموں کا آبشار جاری کر سکتا ہوں۔ اس کے میٹھے اور رسیلے سُر میری رُوح کے لئے سکون و مسرت کے خزانے کھول دیتے ہیں۔ اس لئے میں اس کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتا ہوں۔ ناواقف دُنیا کو یہ پریم کی بنسی فقط ایک بانس کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے جو اندر سے خالی ہے۔ اور جس میں جا بجا سوراخ بھی ہیں۔ پھر وہ کیونکر اسے حسین کہے۔

میں نے کہا تم ایک سادہ و پرمعنی شعر ہو اور قدرت نے مجھے شعر فہمی کا ملکہ عطا کیا ہے۔ میں تمہارے حُسنِ معنی کو دیکھ کر بیتاب ہو جاتا ہوں۔ مگر ایک کور ذوق، لفظوں کی صنعت گری کا جویا اس شعر سے کیونکر لذت گیر ہو سکتا ہے۔ پھر وہ تمہیں کیونکر حسین کہے۔

سلمیٰ! میری نظر شراب پر ہے، جام پر نہیں۔ شراب اگر تیز ہے تو چاہے بلوریں ہو چاہے زریں، کچھ فرق نہیں۔ اور اگر شراب میں خود مستی نہیں تو میرے نزدیک سونے کا پیالہ بھی مٹی کا ٹھیکرا ہے۔

ظاہر پرستوں کی نظر فانوس کے نقش و نگار سے آگے نہیں بڑھتی اور میں اس شمع کا پروانہ ہوں جو فانوس کے اندر خاموشی کے ساتھ جل رہی ہے۔

لوگ فقط پنجرے کی تیلیوں کو دیکھتے ہیں کہ آہنی ہیں یا چوبی۔ نقرئی ہیں یا طلائی۔ اور میں اس خوش نوا طائر کے رس بھرے نغموں سے مست ہوں جو اس قفس کے اندر چہچہا رہا ہے۔

سلمیٰ! اب تم خود فیصلہ کر لو کہ میں تمہیں بنا رہا ہوں یا واقعی میری رُوح تمہاری لطافتوں کا صحیح ادراک کر کے اُن میں گم ہو گئی ہے۔ میں خود فریبی میں مبتلا ہوں یا میں نے کافوری بادلوں کے نقاب کے پیچھے واقعی چاند کا پُرضیا چہرہ دیکھ لیا ہے اور اُس کے انوار سے میری رُوح جگمگا اٹھی ہے۔

پریم پُجاری

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھا کیجئے۔ جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ ضرور روانہ کیجئے ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہ ہو گی۔

(مینیجر)

التجا

آج میرا ساتھ دے
دردِ میرے دل کے اُجلے چاند
آج میرا ساتھ دے
آج میرا ساتھ دے

کروٹوں پہ لے رہا ہوں کروٹیں
جانے غم کی یہ گھٹائیں کب چھٹیں
چھن گئی جو میٹھی نیند والی رات دے
وہ میری کائنات دے
دردِ میرے دل کے اُجلے چاند
آج میرا ساتھ دے
آج میرا ساتھ دے
دردِ میرے دل کے اُجلے چاند
آج میرا ساتھ دے
آج میرا ساتھ دے

زندگی کی کاہشوں میں موت ہو
یعنی میری خواہشوں میں موت ہو
مجھکو دے کے موت زندگی کو مار دے
کسی طرح نجات دے
دردِ میرے دل کے اُجلے چاند
آج میرا ساتھ دے
آج میرا ساتھ دے

قیوم نظر

تعویذ

میں جب مٹی کے گرد آلود آئینہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اُس کی دھندلی سطح پر وقت کے ہر ذرّے میں مجھے ایک ایسے انسان کی تصویر نظر آتی ہے جس کے ماتھے پر ناکامی کی مہر لگ چکی ہے۔ لیکن اس تاریک اور اُداس فضا میں دفعتہً میری نظریں روشنی کے ایک ٹکڑے پر آکے ٹھہر جاتی ہیں اور مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گرتے کو سہارا مل گیا، جیسے کسی قیدی کو کھلے آسمان کی جھلک نظر آگئی ہے گرد و غبار کی اُداس کرنے والی بوجھل ہوا کے درمیان ایکا ایکی میری ناک چیڑ اور دیودار کی خوشبو محسوس کرتی ہے اور میرا تصوّر بل کھاتی ہوئی راہوں سے ہوتا ہوا مجھے جُھلسے ہوئے میدانوں سے دُور پہاڑ کی سکوں ریز برگ پوش چوٹیوں پر لے جاتا ہے۔

ڈاکٹر نے میرے لئے چیڑ کے درختوں کی ہوا، کھلی فضا، بےفکری، دودھ دہی، مکھن، تازہ پھل، انڈے اور اسی طرح کی چیزوں کی ایک طویل فہرست تجویز کی تھی۔ اُردو اخبار کے نائٹ ایڈیٹر کی زندگی کا تصوّر کیجئے۔ اگر مجھے یہ چیزیں میسّر ہوتیں تو میں بیمار ہی کیوں ہوتا — جب میں نے ڈاکٹر سے ان چیزوں کے حاصل کرنے کا نسخہ طلب کیا تو وہ حیرانی سے میرا منہ تکنے لگا اور چیں بہ جبیں ہو کر بولا کہ ایسے سوالوں کا جواب دینا اُس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے، اور یہ کہ میں اُس کا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ اُس کا جواب انگریزی میں تھا۔ اس طرح شاید وہ اپنی پریشانی چھپانا چاہتا تھا۔ اُس کی گھبراہٹ پر مجھے ایک قسم کی روحانی خوشی محسوس ہوئی اور میں مسکراتا ہوا ہسپتال سے باہر آگیا۔

بظاہر میرے لئے پہاڑ پر جانے کی عیاشی ناممکن تھی لیکن اس کے باوجود میں ڈلہوزی پہونچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید صحت کے ساتھ مستقبل بھی سنور جائے۔ چنانچہ میں نے اپنی تمام کتابیں جو مجھے بے حد عزیز تھیں بیچ ڈالیں۔ طبی مشورے کے علاوہ لاہور چھوڑنے کے لئے میرے پاس ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں ہجوم سے اُکتا گیا تھا اور سکون چاہتا تھا۔

میرا مکان صدر بازار میں واقع تھا۔ کرایہ کے لحاظ سے جگہ بُری نہ تھی۔ میرے علاوہ کئی نوجوان وہاں پہلے ہی سے مقیم تھے۔ مکان کے چار کمروں میں سے ایک مجھے مل گیا۔ کمرہ بازار کے پچھلی طرف تھا۔ شیشوں کی چار کھڑکیوں کی وجہ سے روشنی اور ہوا کی کمی نہ تھی۔

دائیں ہاتھ کی دیوار میں دو کھڑکیاں ایک کیوریو ڈیلر (Curio dealer) یعنی عجائبات فروش کے مکان کی طرف کھلتی تھیں۔ اس مکان کی کھڑکیوں میں ہر وقت چقیں لٹکی رہتی تھیں۔ دائیں ہاتھ والی چق میں بعض اوقات لرزش پیدا ہوتی۔ سفید مخروطی چہرے کی جھلک سی نظر آتی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دھوئیں میں شعلے کی طرح چمکتیں اور چق پھر بے جان ہو جاتی۔

صحت اور حالات کی خرابی نے میرے دل میں رُومان کے خانے کو بھی بند کر دیا تھا۔ رگوں میں گرم گرم لہو نہ ہو تو عشق کے چہرے کی لالی ماند ہو جاتی ہے۔ بیماری اور اُس پر مفلسی۔ یہ دو زردیاں جب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو عشق کے اندر کوئی جاذبیت نہیں رہتی۔ وہ ایک بے رنگ بے کیف سی چیز بن کے رہ جاتا ہے۔ نظربازی کی خواہش بیمار آدمیوں میں بھی ہوتی ہے۔ یہ مجھ میں بھی تھی۔ مگر میں نے اسے اُبھرنے نہ دیا۔ لیکن اس کے باوجود میری نگاہیں بے اختیار چلمن کی طرف اُٹھ جاتیں۔ اُس کم بخت چلمن کی طرف جس کی تیلیوں سے میری بیمار جوانی اپنا نشیمن بنانا چاہتی تھی۔ بیٹھے بٹھائے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی میری طرف دیکھ رہا ہے۔ غور سے دیکھ رہا ہے۔ دیکھے جا رہا ہے۔ بانس کی پتلی پتلی روغن چڑھی تیلیوں سے شعاعیں نکل رہی ہیں اور میرے اندر دھنسی جا رہی ہیں۔ میں نے اکثر ارادہ کیا کہ اُن آنکھوں کی طرف نہ دیکھوں لیکن اُن میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ میرا زنگ آلود دل خود بخود اُن کی طرف کھچا چلا جاتا — چق کپکپاتی۔ میری نگاہیں بے اختیار اُس طرف اُٹھ جاتیں۔ دو جگنو سے چمکتے اور میری بیمار جوانی کی طرح وہ چق ایک لحظہ کے لئے زندہ ہو کر پھر بے جان ہو جاتی۔ میں نے بارہا ارادہ کیا کہ آئندہ کبھی اس طرف نہ دیکھوں گا۔ لیکن میرا سارا وجود اُس چق کی لرزش دیکھنے کے لئے ساکن بنا رہتا۔

ایک دن تیلیوں کا گھونگھٹ اُٹھا۔ وہ مجھے مسکراتی نظر آئی۔ اُس کے ہونٹ بیر بہوٹیوں کی طرح سُرخ تھے۔ مجھے ایسے معلوم ہوا جیسے کسی نے انار چیر کے رکھ دیا ہے۔ اُس وقت میرے دل میں عجیب غریب خواہش پیدا ہوئی کہ خوب کھل کھلا کر ہنسوں۔ شاید اس لئے کہ میں ایک مدّت سے نہیں ہنسا تھا۔ اپنے آپ پر بھی نہیں ہنسا۔

اُس کے مکان کے دائیں پہلو میں ایک بھٹیارے کی دوکان تھی جہاں میں نے اپنے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس دوکان کی چھت کے عین اوپر اُس کے مکان کی ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ یہاں کھڑی ہو کر وہ بندروں کو باسی روٹی کے ٹکڑے پھینکا کرتی تھی۔ روٹی کے ٹکڑوں پر جب بندر آپس میں لڑتے اور شور مچاتے تو اُس کے لبوں سے ہنسی کا چشمہ اُبلنے لگتا۔ وہ دوہری ہو ہو جاتی۔ ہر ٹکڑا پھینکنے کے بعد وہ داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتی۔ مجھے اُس کی اِس شرارت میں بڑا لطف آتا۔ میرا دل طفلانہ مسرت سے معمور ہو جاتا اور کچھ عرصے کے لئے اپنے تمام دُکھوں کا احساس میرے ذہن سے محو ہو جاتا۔ لیکن بعض اوقات اُس کی ہنسی ایکا ایکی افسردہ متانت میں بدل جاتی اور مجھے حیران چھوڑ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔ اِس طرح جیسے پھر کبھی نہ آئیگی۔ جیسے رات کے وقت کوئی دلچسپ کہانی پڑھتے پڑھتے بجلی ایکا ایکی فیل ہو گئی ہے اور دماغ میں دفعتاً جھینگروں کی اُداس آوازیں آنی شروع ہو گئی ہیں ——— میں سوچتا، وہ مجھے یقیناً بے وقوف بنا رہی تھی۔ مجھ سے کھیل رہی تھی، جیسے بندروں سے کھیلا کرتی ہے۔" اِس درد انگیز خیال کو بھلانے کے لئے میرے اندر یہ زبردست خواہش پیدا ہوتی کہ مجھے کھانسی کا شدید دورہ پڑے۔ میرا سینہ درد سے بالکل شل ہو جائے میں بے بس ہو جاؤں۔

لیکن دوسرے دن بھٹیار خانے کی چھت پر پھر بندر ناچنے لگتے۔ لڑتے جھگڑتے، غراتے منہ چڑاتے ۔ وہ کھڑکی میں کھڑی مسکراتی ہوتی اور میرا دل بچے کی طرح جسے پیار کا لفظ کہہ کر پھسلا دیتا ہے اُس کی طرف لپکنے لگتا۔

آہستہ آہستہ میں اُس کی طبیعت پا گیا۔ ہوٹل والے کی زبانی مجھے اس کے حالات معلوم ہوئے۔ اُس کا بھائی [illegible] جس سے میری صاحب سلامت تھی پرلے درجہ کا اوباش آدمی تھا۔ ڈر کے مارے کوئی کوئلہ والی اُس کے گھر میں نہیں گھستی تھی۔ اُس کے باپ کو مرے دو سال ہوتے تھے۔ اِس عرصے میں "میر نوردین اینڈ سنز، کیور ٹیلرز" کی دوکان نرسوں، شراب خانوں اور رنڈیوں کے پیٹ میں جا چکی تھی۔ اور اب صرف ایک بورڈ اور چند نکمی چیزیں باقی رہ گئی تھیں۔

ہوٹل والے نے مجھ سے کہا۔ "صاحب یہ کیسی دولت میں کھیلتے تھے۔ دو کوٹھیاں تو صرف کبوتروں کے لئے تھیں۔ بیلوں کی دوکانیں الگ تھیں ——— ڈلہوزی میں مانے ہوئے لوگ تھے۔ اللہ بخشے میاں نوردین جس طرف سے گذر جاتے لوگ اُٹھ اُٹھ کر سلام کرتے۔ خدا کا ہر طرح فضل تھا۔ لیکن صاحب شراب اور عورت کے چھوٹتے ہیں۔ باپ کی آنکھیں بند ہوتی تھی کہ صاحبزادے نے پرزے کرنے شروع کئے۔ کوٹھیاں، زمین، جائیداد کا مال سستے داموں جانا شروع ہوا۔ اپنے دیکھتے بیلوں کی دوکانیں گئی ہیں سو وہ بھی قرض خواہوں کی جھولی میں پڑا چاہتی ہیں۔ [illegible] باتوں سے کیا۔ نشہ تو اپنے عشق سے کام ہے۔ آگے [illegible] بلا سے ——— یہ نہیں دیکھتا کہ گھر میں جوان اور بہت نیک بیٹی ہے اُس کی شادی کرنی ہے۔ یہ تو شکر ہے کہ لڑکی نیک ہے ورنہ تو آفت ہی آجاتی وقت نماز، قرآن - جی ہاں۔ عورت کے روپ میں فرشتہ سمجھو۔ لیکن کیا کہیں اُس کے بھائی کو یہی کہتا ہے کہ نوکرانی مل گئی ہے۔۔ بیوی کے ہوتے ہوئے ایک لکھیائی کہیں پیچھے سے لا کے گھر میں ڈال رکھی ہے اور بیچاری زہرہ ہے کہ دن بھر اُس کی چاکری کرتی پھرتی ہے۔ کیا پوچھئے دل بڑا کڑھتا ہے۔"

ان حالات میں اُس کا ہنستے ہنستے ایکا ایکی چپ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اور میں تو حیران ہوں کہ ایسے حالات میں وہ ہنستی ہی کیوں تھی۔ لیکن شاید وہ فطرتاً ہنس مکھ تھی اور مصیبت کو خندہ پیشانی قبول کر لینا اُس کی عادت ہو گئی تھی۔

وقت گذرتا گیا اور ہمیں ایک دوسرے سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اُس کی اور میری حالت میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ اُس کی زندگی کو ایک ظالم بھائی آہستہ آہستہ ختم کر رہا تھا۔ میری زندگی کو وہ جراثیم چاٹ رہے تھے جنہیں گندھک کا تیزاب بھی نہیں مار سکتا۔ دونوں ہمدردی چاہتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ حجاب بھی دور ہو گیا جو ہم کبھی کبھی محسوس کیا کرتے تھے۔ جب میں اپنے ہونٹ کاٹتا سینے پہ ہاتھ رکھے درد کو دبانے کی کوشش میں لیٹ جاتا تو وہ چھت سے باہر نکل آتی۔ اُس کے چہرے پہ تشویش کے آثار پیدا ہو جاتے۔ اُس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ مجھ سے پوچھتے! "آپ کیا حال ہے؟ درد کم ہوا؟ آرام آیا؟" اُس کے الفاظ قریب قریب بے صدا ہوتے لیکن میں سمجھ جاتا۔ اُس وقت اپنی تکلیف میں بھی مجھے ایک خاص قسم کی راحت محسوس ہوتی۔ اُس کو اپنے متعلق پریشان دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی، جیسے میں نے دق کا علاج معلوم کر لیا ہے۔

اب [illegible] اُس کی [illegible] مجھے نیند سے جگانے لگی۔ جب میں [illegible] کھول کر کھڑکی کی طرف دیکھتا تو [illegible] کی تلاوت میں مصروف [illegible] نماز روزے کا کبھی پابند نہیں رہا۔ لیکن [illegible] بیٹھے [illegible] تلاوت کے بعد [illegible]

چہرہ مسکراتی ہوئی میری طرف دیکھ کر پھونک مارتی ۔ ہوا کے اس جھونکے سے میری روح میں ایک عجیب سی ٹھنڈک پیدا ہو جاتی۔ ایک قسم کا فرحت بخش مرہم میرے مجروح پھیپھڑوں کو ٹھنڈک پہونچاتا ۔ میرے لئے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔

"گھبراؤ نہیں" وہ کہتی "آپ ضرور آرام آجائیگا"۔ اس کی آنکھیں یقین سے چمک اٹھتیں۔

کاش میں نے بھی کبھی یقین کیا ہوتا۔ اپنے آپ پر بھی۔ اُس لڑکی کی طرح جو دعا کے اثر سے گندھک کے تیزاب تک بھی نہ مرنے والے جراثیم کو مارنا چاہتی تھی ــــــ کاش! کاش!

جب بھی اُسے موقع ملتا وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی۔ چپ کے ساتھ۔

بارش کے دن چق اُٹھا دی جاتی۔ کھڑکیاں بند ہو جاتیں۔ لیکن اس پر بھی ہم ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔ زہرہ کا چہرہ کھڑکی میں جڑے ہوئے شیشے کے ساتھ لگ جاتا۔ اُس کا سانس شیشے کی سطح پر پھیل جاتا۔ اس دھند میں سے اُس کا چہرہ جیسے برف میں ڈھکا ہوا دکھائی دیتا ــ بالکل بے جان مگر جوں کا توں محفوظ۔ کالی کالی انتظار بھری آنکھیں کہر میں لپٹی ہوئی جھیلیں بن جاتیں ــ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اپنے مستقبل کے دھوئیں میں ملفوف ہو گئی ہے ــــ کاش میں اُسے بچا سکتا۔ اُس کی کھلتی ہوئی جوانی کو بچا سکتا۔ لیکن جو شخص اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا وہ دوسرے کو کیا بچائیگا۔

کمرے کے ساتھی ہمارے راز سے آگاہ ہو گئے۔ اُن کے کمرے کی کھڑکیاں بھی زہرہ کے مکان کی طرف کھلتی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے کہنا شروع کیا۔ "واللہ خوب شکار پھانسا ہے۔ اب ایک دعوت اُڑ جائے اس خوشی میں۔ بھئی تجھے بھگت ہو تجھے جگت۔ تمہارے ہاتھ پر بیعت کرنا پڑے گی۔"

ایسی باتیں سُن کر مجھے سخت روحانی کوفت ہوتی۔ اکثر میرے دل میں آتی کہ انھیں ایسی ڈانٹ پلاؤں کہ آئندہ اس قسم کے پست خیالات کا اظہار کرنے کی جرأت ہی نہ کریں۔ لیکن میرے الفاظ جذبات کے بوجھ تلے دب کے رہ جاتے۔ تحت الشعور میں رسوائی کا خیال سر اُٹھانے لگتا ــــ زہرہ کی رسوائی کا ڈر ــ اس لئے ان ساتھیوں کے سامنے ایک گونگی خاموشی ہی میرا جواب ہوتا۔ لیکن میرے دل سے یہ دعا نکلتی کہ وہ کہیں راستے میں بھٹک جائیں۔ کسی کھائی میں گر جائیں یا کوئی ریچھ انھیں چیر پھاڑ کھائے۔

یہ تھے میرے ساتھی۔ پست قسم کے انسان۔ جن کی باتوں پر میں نے بالآخر توجہ دینا چھوڑ دی ــــــ میں اُس چیز کو نہیں کھونا چاہتا تھا جسے میں نے عمر میں پہلی بار حاصل کیا تھا۔ اُسے اپنے پاس محفوظ رکھنے کے لئے میں ہر طرح کی ذلت اُٹھانے کو تیار تھا۔ چنانچہ میں نے آہستہ آہستہ خاموشی اختیار کر لی۔

ایک دن وہ قصبہ جانے کے لئے تیار ہوئے۔ قصبے کا میلہ دُور دُور تک مشہور ہے۔ میرے ساتھیوں نے تعریف کے پُل باندھ دئے۔ کہنے لگے "تم بھی چلو، واللہ ایسی کراری چھوکریاں دکھائیں گے کہ اس کو بھی بھول جاؤگے"۔ وہ زہرہ کا مقابلہ اُن بیسواؤں کے ساتھ کر رہے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ میرے دل میں آئی کہ اُن کے چہروں پر اپنے جراثیم بھرے بلغم کا لیپ کر دوں۔ لیکن زہرہ کی بدنامی کے خیال نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور میں نے یہی کہنے پر اکتفا کیا۔ "قصبہ کی سیر تمہیں کو راس آئے گی"۔ اس پر وہ اپنی ظرافت کی پھلجھڑیاں اُڑاتے اپنا سامان باندھنے لگے اور دوسرے دن قصبے کی طرف چل دیئے۔

اُن کی روانگی کے دوسرے ہی روز میری طبیعت جو چند دنوں سے کچھ سنبھلی ہوئی تھی ایکا ایکی بگڑ گئی۔ کھانسی اور درد کے شدید دورے پڑنے لگے۔ تھوک میں گلابی چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ تیز بخار بھی تھا۔ میری طبیعت سخت گھبرا رہی تھی۔ تکلیف کے ساتھ اپنی تنہائی کا خیال مجھے بہت بے چین کر رہا تھا۔ گو اصل معنوں میں میری تیمارداری کبھی نہیں ہوئی تھی تاہم جب مجھے زیادہ تکلیف ہوتی تو میرے ساتھی میری خبر پوچھ ہی لیا کرتے۔ حالانکہ مجھے اُن سے نفرت تھی لیکن ساتھ والے کمرے میں اُن کی موجودگی کا علم میری تنہائی کے احساس کو قدرے کم کر دیتا تھا۔ اب کہ میں خاموشی میں گھبرا ہوا تھا، میرے کان آوازوں کی جستجو کر رہے تھے ــ آوازوں کی خواہ وہ میرے ساتھیوں ہی کی ہوں۔ بڑھتی ہوئی تکلیف کے ساتھ تنہائی کا احساس میرے داغدار پھیپھڑوں کو اور زیادہ چھلنی کر رہا تھا ــــــ

زہرہ؟ ــ زہرہ وہیں تھی، کھڑکی میں۔ وہ بار بار اضطراب بھری سرگوشیوں میں میرا حال پوچھتی۔ پر میں تو اُس وقت کسی کو اپنے قریب چاہتا تھا جو میرے کانوں کے پاس جھک کر مجھ سے پوچھے "کیا حال ہے تمہارا؟" جو میرے جلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھے اور احتیاط سے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ میرے دُکھتے ہوئے سینے پر تارپین کے تیل کی مالش کرے۔ کافور اور صابن ملے۔ تارپین کی مالش ــــ لیکن زہرہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اور یہ تعجب ہے کہ وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتی تھی؟

[illegible] کا [illegible]۔ رات کے سناٹے بڑھنے شروع ہوئے۔ دُور

دہقانوں کے جھونپڑوں اور اُمرا کی کوٹھیوں میں روشنیاں دُھند کے نقاب سے جھانکنے لگیں۔ بھُولی بسری یادوں، دبی ہوئی اُمنگوں کی طرح نظر آنے لگیں مگر بے کی فضا دھوئیں اور تارہ بینا کی بُو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ دن بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ بازار کے چمکتے ہوئے پتھر، سیڑھیاں، روشنیاں، ارد گرد کے مکان، بل کھاتی ہوئی سڑکیں اور درخت سب مل ملا کر کسی دیوانے مصوّر کے تخیل کی طرح نظر آ رہے تھے۔ آس پاس کے پہاڑوں کی تاریک چوٹیاں وہی جنہیں دیکھ کر مجھے بلندی کا احساس ہوا کرتا تھا اب مجھے اپنے اوپر جھکی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ میرا دم گھُٹ رہا تھا۔ اپنی بیکسی پر مجھے رونا آ رہا تھا۔ اس طرح کس مپرسی کی حالت میں مر جانا کس قدر الم انگیز ہے۔ دل ہی تو ہے۔ حرکت کرتے کرتے تھک جائے گا بیچارا۔ اور پھر — پھر — سب کچھ گم ہو جائے گا! — تشنۂ تکمیل آرزوئیں۔ یہ حسین دُنیا۔ وہ بیر بہوٹیوں کی طرح سُرخ ہونٹ۔ وہ بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں جن میں ہمدردی کی اُداس روشنی ٹمٹماتی ہے۔ چق کے ساتھ لگا ہوا وہ چہرہ جو ہمیشہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی وضو کر کے آئی ہے — یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا۔ نہ رہے گا ......"

میں یہی سوچ رہا تھا کہ کھانسی کا دورہ میرے جسم کو جھنجھوڑنے لگا — گونجتی ہوئی کھوکھلی کھانسی، مجروح پھیپھڑوں کی پُکار دیر تک رات کی خاموشی میں گونجتی رہی۔ پھر دفعتہً دستک ہوئی۔ میں سمجھا کوئی طبلے والا اپنا طبلہ ٹھیک کر رہا ہے — پھر خاموشی طاری ہو گئی — تھوڑی دیر کے بعد پھر دستک ہوئی "ٹھپ ٹھپ! ٹھپ!" میں دروازہ کھولنے کے لئے بڑھا۔

"تم!" .. وہ میرے سامنے دروازے میں کھڑی تھی۔ زہرہ! — نیلے منقّش سگّے دوپٹے میں اُس کا چہرہ تاروں بھری رات میں چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ دفعتہً مجھے ریاض کا خیال آیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ وہ میرے ساتھیوں کے ساتھ چھبے کی سیر کر رہا ہے۔

زہرہ نے میرے چہرے پر ایک پھیلتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"اب کیا حال ہے؟ بخار زیادہ تو نہیں؟ درد کو آرام ہے نا؟" اُس کی لانبی انگلیوں والا ہاتھ میری پیشانی کے ساتھ چھُوا اور ایک لمحہ کے بعد پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کا چہرہ فرطِ حیا سے سُرخ ہو گیا۔ حیا اور ہمدردی آپس میں گھُل مِل گئی۔ اور اُس کے گالوں پر دو آنسو ڈھلک آئے۔

زندگی کی ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کبھی بیمار ہی نہیں تھا۔ جیسے کسی منتر کے اثر سے میرے تمام دُکھ دور ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا "اب ...... اب مجھے آرام ہے ...... لیکن یہ آنسو کیسے؟"

اُس نے ایک اٹکتا ہوا سانس لیا جیسے وہ اپنے جذبات کو دبانا چاہتی ہے۔ اور دوپٹے کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی!

"آپکو اس حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ کاش میں آپکی کوئی خدمت کر سکتی"

اُسکی آنکھوں میں آنسو پھر اُمنڈ آئے۔

"گھبراؤ نہیں" میں نے اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر کہا۔ "مجھے آرام آجائے گا"

"خدا کرے ایسا ہی ہو!"

"تمہاری دعائیں رائیگاں نہیں جا سکتیں"

"اچھا تو اب میں جاتی ہوں" اُس نے ایک آہ بھری لیکن اپنا ہاتھ چھُڑانے کی اس نے کوئی کوشش نہ کی۔ شاید اُسے ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے مجھے دُکھ ہوگا۔ اور سچ پوچھئے تو اُس ہاتھ کو میں ہمیشہ کے لئے اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اُس کو چھوڑنا ہی پڑا۔ مجھے اس بات کا علم تھا کہ میری مزاج پُرسی کے لئے آنا اُسکے لئے کس قدر خوفناک ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے اُس پر کوئی مصیبت آئے۔ میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور "خدا حافظ!" کہتے ہوئے وہ جس تیزی سے آئی تھی اُسی تیزی سے لوٹ گئی — میری زندگی کی تاریک رات میں ایک جگنو چمکا اور اُس کی تمام گہرائیوں کو منور کر کے چلا گیا۔ اسکے بعد وہ پھر کبھی نہ آئی۔ چق کیساتھ لگ کر بھی کبھی کھڑی نہ ہوئی۔ معلوم نہیں کیوں؟

اِس بات کو آج ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ زندگی سے میری جنگ بدستور جاری ہے۔ لیکن اِس واقعہ کی یاد میرے سینے سے ایک تعویذ کی طرح لگی ہوئی ہے۔ زندگی کی تاریکیوں میں نئے اور پُرانے حادثات کے بھوت جب طرح طرح کی شکلیں اختیار کر کے مجھے ڈراتے ہیں تو زہرہ کی ہمدردی کا میری ڈھارس بندھاتی ہے — میرے تمام خوف دُور ہو جاتے ہیں اور میں ایکبار پھر خود کو زندگی سے نبرد آزما پاتا ہوں۔ وہ چند لمحوں کیلئے صرف ایکبار اِس کمرے میں آئی تھی لیکن وہ چہرہ اکثر آتی ہے ابھی اُس کا ایسے کالی کالی آنکھوں میں ہمدردی کے آنسو لئے۔ اور یہ یاد میری زندگی میں ہمیشہ آتی رہے گی۔

ابو سعید قریشی

سامانِ جنگ

(اس افسانہ کا میری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے)

ریلوے لائن سے سیلوں علیحدہ اور لاری کی سڑکوں سے دُور اُفتادہ پہاڑوں کی سنگین آغوش میں ریاست تسری واقع ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں ابھی شیاطین کا گذر نہیں ہوا تھا۔ ہاں فرشتے روز قلقاریاں مارتے ہوئے آتے تھے، حوریں خرام معصومانہ کرتی ہوئی نازل ہوا کرتی تھیں اور بعض مرتبہ خود دیوتا اُتر کر لوگوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

اس ریاست کا نظامِ حکومت بھی نہ تو جمہوریت کی گندگی سے آلودہ تھا اور نہ آمریت کی کثافت سے ملوث تھا۔ نہ یہاں نازی ازم کا فرعونانہ قہر تھا، نہ فاشلیت کا مجنونانہ جبر اور نہ اشتراکیت کی ساحرانہ مہر۔ ایک محسن راجہ چوپال میں رہا کرتا تھا جس کے قبضہ میں بیس آدمیوں کی زبردست فوج تھی، تین ذاتی ملازم اور دو سو روپیہ سالانہ کی آمدنی!

مشکل سے چار سو آدمی بستے ہوں گے سری میں۔ ہندو اور مسلمان ملا کر۔ لیکن نہ تو کبھی کوئی مندر جلایا گیا اور نہ کسی وقت کوئی مسجد ڈھائی گئی تھی۔ اُن کو باہمی فساد کے لئے کوئی مواد ہی نہیں ملتا تھا۔ مہاسبھا، کانگریس، مسلم لیگ، انگریز، سوراج، گائے اور باجہ وغیرہ کے "اسرار" اگر کوئی ان کو سمجھانے کی کوشش بھی کرتا تو شاید وہ اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ یہ الفاظ اُن کے لئے غیر ارضی تھے۔ وہ صرف دو باتوں کو سمجھتے تھے۔ کھیت جوتنا اور بارش کے لئے دعا کرنا، چنانچہ کھیتوں کی وسعت اور دعاؤں کی فراوانی ان کو اتنا غلہ بخش دیا کرتی تھی کہ اناج ان کے لئے سکّہ، نوٹ اور ہنڈی بن گیا تھا۔ سُود کی خون آشامی اور ساہوکار کی خشیت یہاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ ہر شے کا مبادلہ ہوتا تھا۔ اول تو یہاں اشیاء ہی کیا تھیں تھوڑا سا اناج تھا، لیکن نہ اتنا کم کہ اس کی قیمت یا رمل اُسے عشق ہی بھلا دے اور نہ اتنی کثرت کہ محض کھانے کے سِوا زندگی کی آرزو پیدا ہو جائے۔ حسبِ ضرورت گڑ اور بقدرِ احتیاج روئی بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی ایسی جنس نہیں تھی جس کا احتکار یا احتیاس سرمایہ داری کے بیج پیدا کر دیتا اور نہ مساوات کی [illegible] کہ اشتمالیت کو تولید کا موقع مل جاتا۔

میں جہاں تہاں جہاں گشت میں سے تو نہیں جو لے ہاں [illegible] آباد خطہ [illegible] سے مجھے شروع ہی سے دلچسپی ہے چنانچہ جب میں پہلی بار اس عظیم الشان ریاست میں گھوڑے پر سوار اور ہیٹ سر پر رکھے ہوئے داخل ہوا تو یہاں کے لوگوں کے لئے ایک تماشہ بن گیا تھا۔ جوان مجھے تیور بدل کر دیکھ رہے تھے، بوڑھے ہراس آمیز نظروں سے، بچے خوفزدہ آنکھوں سے اور عورتیں آشفتہ چتونوں سے دیکھ رہی تھیں۔

چند منٹ کے بعد مجھے ریاست کی پوری فوج نے جو بیس جرار سپاہیوں پر مشتمل تھی آگھیرا۔ ان کے بھیانک زنگ خوردہ بھالے، ان کی دندانہ دار پُرانی مہیب تلواریں اور اُن کی کُند چھوٹی چھوٹی سی کٹاریں میرے اوپر چھا گئیں۔ میں نے اپنی آتشبار بندوق کو دیکھا جو چند ہی فیر میں اس لشکر کو بآسانی منتشر کر دینے کا وعدہ کر رہی تھی۔ مگر سیاح کو جنگ سے کیا کام میں اطمینان سے گھوڑے پر بیٹھا رہا۔ آخر ریاست کا جری فیلڈ مارشل میرے قریب آیا اور گرج کر بولا۔ "تم کون ہو؟"

اس کے جواب میں میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا جس کے جواب میں بیس ہاتھ کٹھے میرے ہاتھ سے مس ہوئے اور مجھے فوراً شاہی دربار میں پہنچا دیا گیا۔

میری یہ کیفیت تھی گویا کوئی سفید آدمی [illegible] میں آگیا ہے۔ زنو خونخوار و مردم آزار قوم ہے اور یہ لوگ نہایت امن پسند تھے۔

مجھے یہاں کی سادہ زندگی اور قدرتی مناظر اس قدر بھائے کہ میں یہاں چند ماہ کے لئے رہ پڑا۔ سیر و شکار، کبھی باجرہ کی اور کبھی گیہوں کی روٹی اور گھی کی غیر معین مقدار وغیرہ کے تو کہنے ہی کیا تھے۔

زندگی کا ایک ہمہ رس معیار بنانا دراصل بہت بڑا مشکل ہے۔ ہر قوم، ہر ملک بلکہ انفرادی طور پر ہر انسان حیات کے چند اصول رکھتا ہے۔ بہت کم ایسے اصول ہیں جو تمام انسانوں میں مشترک ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیاتِ عامہ کے لئے کوئی مکمل ضابطہ یا لائحہ عمل بنانا انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے، اس میں صلاحیت نہیں ہے کہ قانون کے شدائد کا احترام کرے اور اس کی لیت سے جائز فائدہ اٹھائے۔

میں خمار گندم کے ازالہ میں زیادہ آداب ملحوظ رکھنے کا عادی نہیں تھا۔ مگر اس قریہ میں اس نشے سے مخمور رہنا ایک گناہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ "خمر"

جانتے طور پر بنا ہوا تھا اور چونکہ میں یہاں کا باشندہ تھا اس لئے اس سے [illegible] تھا۔ مجھے آلودہ لذت (آسودہ لذت تو کیسے کہہ سکتا ہوں) ہونے کیلئے [illegible] کرنے کی ضرورت تھی جس کے امکانات بھی یہاں پر تقریباً معدوم تھے۔

گاؤں سے باہر ایک بہت پرانا مندر واقع تھا جہاں میں شکار سے واپسی پر اکثر ٹھنڈا پانی پینے رک جایا کرتا تھا۔ اس مندر کے پروہت کے تین تنومند تندرست جوان لڑکے تھے اور ایک اسی قدر صحت مند لڑکی۔ مجھے پانی پلانے کی خدمت اسی کے سپرد تھی۔ لڑکے بالعموم کھیت پر ہوتے تھے صرف بوڑھا پروہت بالہرستی کے چبوترے پر پڑا رہتا تھا۔ میں اس کے پاس ضرور رکتا تھا۔ اگر کبھی سیدھا چلا جاتا تو وہ محبت سے گالیاں دینے لگتا تھا۔

ایک روز مندر پہ کوئی میلہ تھا۔ گاؤں کے بہت سے مرد و عورت جمع تھے اور پروہت بھی مع اپنے تینوں بیٹوں کے نہایت انہماک سے پوجا میں لگا ہوا تھا۔ میں شکار کو جا رہا تھا مگر گھوڑے پر سے اتر کر ستی کے چبوترہ پر تماشا دیکھنے ذرا بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ ایک جوان لڑکی تیزی سے مندر میں سے نکل کر آئی۔ اس کے تیور بدلے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا روشن آسمان پر گھناؤنے بادل گھر گئے ہوں۔ اس نے آتے ہی میرے پیر میں ایک ٹھوسا دیا اور غصہ سے اپنی زبان میں بولی "ارے تم ستی دیوی کے چبوترے پر جوتے سمیت بیٹھ گئے ہو۔ یا تو جوتے اتار دو یا نیچے اتر دو۔" اس کے چہرے سے صحت کا خون چھلک رہا تھا۔ میں نے پیار سے اس کی سادگی کو دیکھا اور بے پرواہی سے بولا "تم کون ہوتی ہو مجھے ٹوکنے والی؟ پروہت جی تو کچھ کہتے نہیں ہیں۔"

"میں کون ہوتی ہوں؟ میں پروہت جی کی بیٹی ہوں۔ بلاؤں بھیا کو وہ ابھی تمہاری ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیں گے۔" او ہو یہ وہ لڑکی تھی جو روز مجھے پانی پلاتی تھی لیکن شکل دیکھنے کی کبھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ آج اپنے مذہب سے مستحکم اعتقاد کی توہین کے انتقام میں بیباکانہ میرے سامنے کھڑی باز پرس کر رہی تھی۔ آخر میں نے ہنس کر کہا "اپنے بھائی کو کیوں تکلیف دیتی ہو تم ہی میری ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لو۔" اگر قاتل کے آگے سر جھکا دیا جائے تو ضرور اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں رعشہ کی ایک خفیف سی حرکت پیدا ہو جاتی ہوگی۔ اس لڑکی کے خشمگیں تیوروں میں بھی ملائمت کا خفیف سا بال پڑ گیا۔ تیز آواز سے بولی "کیا کروں روز تم کو پانی پلاتی ہوں نہیں تو کر بتاتی۔"

"آج تو تم نے نیا جوڑا بدلا ہے۔ یہ لال دوپٹہ تمہارے بدن پر کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے" میں نے مجھا نے کے [illegible] باتستہ صاف کر رہا تھا۔

"جاتی ہوں بھیا کو بلا کر لاتی ہوں" یہ کہہ کر اس نے سر سے آنچل [illegible] میں سرکا یا کر میں اس کے گلے میں اثل بہ جو کوڑیوں کی مالا بھی دیکھ لیا عورت کتنی کمزور ہوتی ہے اپنے حسن کی ستائش کے باب میں۔

"اور جو تمہارے گلے میں یہ مالا کیسی پیاری ہے۔ تم کتنی اچھی [illegible] ہو اس کو پہن کر۔" تیوروں پر غصہ تقریباً سو چکا تھا۔ ہاں اب [illegible] جا رہی تھی۔ حیا آتے ہی توہین مذہب کے انتقام کا مقدس فرض بھی نسائیت برداشت پیتا ہوا رخصت ہو گیا اور ایک منٹ بعد ہی میرے جانے سے گھونگھٹ نکال کر عورت چل دی۔

اب مندر کی پاک چہار دیواری میں ایک گناہ آلودہ نیا افق گرمایا ہوا دل معصیت کوشی کی راہ پر پڑ چکا تھا۔ مجھے تین دن تک منہ میں اس نے پانی نہیں پلایا تاکہ میں یہ سمجھ لوں کہ ستی کی بیمرمتی کی سزا ختم ہونے نہیں ہوئی ہے بڈھا ہی کراہتا ہوا اٹھتا اور اپنے لرزاں ہاتھوں سے مجھے پانی پلا دیتا۔

چوتھے روز میں جب شکار سے واپس آیا تو ایک مرا ہوا تیتر چپکے سے مندر کی سیڑھیوں پر پھینک دیا اور پروہت کے پاس چبوترہ پر آ بیٹھا۔ میری اس حرکت کو اگر کوئی مہاسبھائی دیکھ پاتا تو دہیں پہ چھوڑ دیتا یا جوابا فوراً مسجد میں گوشت پھینکنے کا ثواب عظیم حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اور اگر مسجد کے مولانا اس حرکت کو دیکھ لیتے تو فوراً ہی اعلان جہاد فرما دیتے۔

میری اس حرکت کو شاید مندر کی دیوی نے دیکھ لیا تھا۔ تیتر کی ٹانگ پکڑ کر اپنے باپ کے پاس لے آئی اور میری طرف اشارہ کر کے اپنے باپ سے بولی "یہ انھوں نے وہاں ڈال دیا تھا بابا۔"

بڈھے نے مردہ تیتر کو دیکھا اور ہنسکر بولا "جا تو اسے دیوی کے چرنوں میں جا کر ڈال دے۔ ان کی اچھا ہوگی تو اس کو جان دیدیں گی۔"

"مگر اس کا تو گلا کٹا ہوا ہے بابا جان کیسے پڑ گئی؟ [illegible]" لڑکی نے اپنے باپ سے کہا۔

"تمہارے پاس ستی [illegible] - [illegible] لگا۔"

[illegible]

"[illegible] کو ذرا پانی پلا" پروہت نے اپنی لڑکی سے کہا۔ میں نے تھوڑے سے پانی سے حسرت کے ابھرتا ہوا اور ڈھلتی ہوئی سے کھیلتا رہا۔ پروہت جی پانی سے مجھے دیکھنے لگا مگر اس کی لڑکی پیارو نے اس کھیل میں بدمزگی کا اظہار نہیں کیا۔

بڈھے کو آج کھانسی بہت تھی اس لئے میں اٹک گیا۔ اُس کو مندر میں لے گیا۔ سینے پر تیل وغیرہ کی مالش کی تو اس کو ذرا سکون ہوا۔ بڑی دعائیں دینے لگا۔

"بھیّا تم کہاں سے آئے ہو۔ کون ملک کے رہنے والے ہو تم" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا ملک یہاں سے بڑی دُور ہے بابا۔ کئی سو میل دُور۔ جہاں ریلیں چلتی ہیں۔ موٹریں دوڑی دوڑی پھرتی ہیں اور اُس میں اتنے آدمی بستے ہیں کہ اُن کی بھیڑ میں راستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"ہاں میں بھی ریل میں ایک بار بیٹھا تھا۔ اُس وقت رامو (اُس کا بڑا لڑکا) پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ بڑی بُری سواری ہے ریل۔ اُس میں اتنے آدمی بھر جاتے ہیں کہ کھڑے رہنے کو بھی جگہ نہیں ملتی ہے۔ دھرتی ماتا پہ کیسے کیسے بوجھ لاد رکھے ہیں لوگوں نے۔ جب ہی تو بھونچال آ جاتے ہیں۔"

"پروہت جی کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ تم کسی بڑی بستی میں جا کر بس جاؤ۔"

"نہیں بھیّا۔ بڑی بستیوں کی اُلجھنیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ وہاں لوگ بات بات پہ لڑتے ہیں۔ بھگوان کے مندر میں ہر ایک کو گھسنے دیتے نہیں۔"

"بابا روٹی کھا لو ٹھنڈی ہو جائے گی" پیارو نے آکر کہا۔

"بھیّا تم بھی کھا لو" پروہت نے مجھ سے کہا۔

"نہیں رامو میرا راستہ دیکھ رہے ہوں گے۔ اب مجھے چلنا چاہیئے۔ کافی اندھیرا ہو گیا ہے۔"

"پیارو بیٹی مجھے بھی ابھی بھوک نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں کھاؤنگا میں بھی۔"

"اچھا تو میں دودھ دوھ لاؤں" اُس نے اپنے باپ سے کہا۔

"میں بھی چلتا ہوں پروہت جی۔ تم آرام سے بیٹھے ہی رہنا۔ ہوا چلنا [illegible] آ جائے گی۔"

"اچھا بھیّا۔ بھگوان تیرا بھلا کریں۔ جا۔ بڑا اچھا آدمی ہے تو" میں جھونپڑے کے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ دُور سے گاؤں کی آگ جلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں مندر سے آگے بڑھ کر جھونپڑیوں کے احاطے کے قریب پہنچا تو وہاں پیارو ایک گائے کا دودھ نکال رہی تھی۔

"پیارو تم اب تک دودھ نہیں نکال چکیں؟" میں نے اُس کے قریب آکر کہا۔

"نہیں" لوٹے کو نیچے رکھ کر جواب دیا۔

"لاؤ ہم نکالیں دودھ" میں نے اُس کے پاس بیٹھ کر کہا۔

"تمہیں آتا ہے کیا؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" میں نے اُس کے جسم کو چھو کر کہا۔ معصیت کے بھبکولوں سے اندھیرا زیادہ کالا ہوتا جا رہا تھا جس میں معصومیت اتنی دھندلی پڑ گئی تھی جیسے گہرے کنویں میں پانی تارا نظر آتا ہے۔ آخر گناہ کی ایک پھنکار سے یہ تارا بھی غائب ہو گیا۔

آج کی شام میری لذت آلودگی کی شام تھی جس کی ضرب نے میرے اندر سے روزانہ کا جذباتی سکر بہت بڑی حد تک زائل کر دیا تھا۔ میری خو کی ضد پوری ہو چکی تھی۔ یہاں کی شریعتِ حیات میں یہ شاید پہلا کفر تھا جس کی عفونت سے میرے اسفل احساسات مست ہو رہے تھے۔

بیدینی معمولاتِ مسلمہ سے روگردانی کا نام ہے۔ لیکن "معمولات" مہذب بستیوں میں جا کر اپنی بدہیت کو بدل ڈالتے ہیں چنانچہ میں بھی اصول پرست مگر ناآشنا حقائق مخلوقات کی نگاہ میں ابھی بیدین نہیں ہوا تھا کیا ہوا اگر سری کی مختصر سی بستی کے قوانین کی رو سے میں کافر ہو گیا ہوں۔

یونہی ہم سماج کے قوانین بناتے آئے ہیں یونہی اپنے ہاتھوں پھر اُن کی توہین کرتے رہتے ہیں۔ اور جب تک سوسائٹی اور سیاست کی ایجاد انسان کے سپرد رہے گی یہی ہوتا چلا جائے گا۔ اگر انسانیت اس کی متحمل نہیں ہوتی ہے تو اُس کو آسمانی قانون و ضابطہ ڈھونڈھنا چاہیئے۔

میرا منحوس گناہ پیارو کے مستقبل کو سیاہ کر چکا تھا۔ پیارو کے اقربا میری جان کے لاگو بن چکے تھے۔ ریاست کی خوشگوار دلکشا وہ فضا میری گرد اذیت آفریں حصارِ تنگ میں تبدیل ہو چکی تھی چنانچہ ایک اندھیری رات سے فائدہ اٹھا کر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہاں سے نکل بھاگا۔

انسان اگر اپنے ہی جیسے انسانوں میں سیاہ کھیل کھیلتا رہے تو وہ تباہ ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ ناسازگار ماحول میں بھی اپنے طریق عمل پر قائم رہتا ہے تو اُس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ ابھی باتیں پھر بھی نامساعد

فضا میں زخم کھائی ہوئی زندہ رہجاتی ہیں مگر بُری باتیں اکثر اچھے ماحول میں دم توڑ دیتی ہیں۔ بوہیمیت کی شراندمیں محویت کا دم نہ گھٹ سکا تھا لیکن جب محویت کی خوشبو مندا گئی تو اس میں بوہیمیت کی تعفن نہ جی سکی تھی۔

اس ناقابلِ اعتنا واقعہ کے عرصہ دراز تک میں دُنیا میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا حتیٰ کہ ستری اور پیارو دونوں کو بھول گیا۔ بیس سال بعد میں ایک دفعہ جنوبی ہند کی طرف ایک پہاڑی علاقہ میں ریل کے اندر سفر کر رہا تھا کہ شام کے وقت ایک بڑا اسٹیشن آیا۔ میں نے باہر سر نکال کر جھانکا تو تختہ پر نظر پڑی۔ اسٹیشن کا نام ستری تھا۔ میں دیوانہ وار اُتر پڑا اور باہر نکل کر بیٹھے بیٹھے دیدوں سے ہر شے کو دیکھنے لگا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ تو وہی مقام تھا جہاں میں بیس سال پہلے شکار کے لئے آیا کرتا تھا میں لپک کر گاڑی میں آیا۔ جلد جلد اپنا اسباب اُتروایا اور ایک عمدہ سے تانگے میں شہر کی طرف روانہ ہوا۔ تانگے والے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہاں سے اٹھارہ سال سے ریلیں دھڑ دھڑاتی ہوئی گذر رہی ہیں۔ یہاں پر کانچ کی ریت کا زبردست خزانہ برآمد ہوا ہے چنانچہ گورنمنٹ نے تین عظیم الشان گلاس فیکٹریاں قائم کی ہیں جن میں سینکڑوں آدمی کام کرتا ہے۔ بہت سے انگریز آباد ہیں اور اب یہاں کی آبادی پچاس ہزار کے قریب ہے۔

میں کشادہ بازاروں، سربفلک عمارتوں اور اُن تمام تحیر خیز چیزوں کو دیکھتا ہوا گذر رہا تھا جنکو سرمایہ پیدا کر دیا کرتا ہے۔ میری نظروں سے مسلم ہائی اسکول، سناتن دھرم کالج، خالصہ ملیٹری اسکول، آریہ پرنٹنگ پریس وغیرہ گذر رہے تھے۔ میں نے یہاں آکر مسجدوں کے سامنے سے پولیس کی حفاظت میں مذہبی جلوس باجہ کے ساتھ نکلتے دیکھے۔ میں نے یہاں انقلاب زندہ باد کے نعرے سُنے۔ میں نے اپنے اس دوران قیام میں ہندو مسلم فسادات کے تماشے دیکھے۔ مجھے یہاں کلکتہ کے بہو بازار کی طرح طوائفوں کے بے شمار کوٹھے نظر آئے۔ اور جس ہوٹل میں میں مقیم تھا اُس کے منیجر نے مجھ سے پیارو چکلہ دار کی سب سے زیادہ تعریف کی جس کے ہاں ہر وقت تازہ اور نیا "مال" ملتا تھا!

یہاں ریل کی وجہ سے کھانے پینے اور پہننے کی اشیا کی اب بیحد فراوانی تھی۔ فینسی اشیا اور دیگر فضولیات کی بھی اسقدر بہتات تھی کہ مل کے مزدور سے لے کر گورنمنٹ آفیسر تک کے لئے وہ لازمۂ حیات بن گئی تھیں۔

یہاں اب رات دن دنگے فساد ہوتے رہتے تھے، روزانہ چوریاں ہوا کرتی تھیں، کثرت سے قتل و غارت گری تھی غرض انسانیت گریہوں میں تقسیم ہو کر ہر صنف تہذیب کا خاتمہ کر چکی تھی یہی وجہ تھی کہ یہاں پھر بجائے تہذیب لانے اور تہذیب سے پہلے کی فراوانی۔ اب ہر انسان کی روزانہ کی ضروریات سے زیادہ موجود تھی۔ کثرت سے تھا، بجائے کپڑا آگیا تھا اور پھر بجائے لائی جا چکی تھی۔ یعنی تہذیب نے شہر کے اندر با ہر سے لاکر سامانِ جنگ جمع کر دیا تھا۔

ستری کے باہر اب بھی وہ بوسیدہ مندر موجود تھا جہاں سال پہلے آکر میں گناہ کی منڈی کھول گیا تھا۔ بوڑھے پروہت تنومند لڑکے آتشک سے مر چکے تھے اور تیسرا کثرتِ عیاشی و شراب کی وجہ سے دق میں مُبتلا ہو کر مندر میں پڑا کھانسا کرتا تھا۔ غرض ہر شیطانی ناچ نظر آ رہا تھا۔ اب یہاں فرشتوں کے وجود کا کوئی نہ رہا تھا۔

قیسی رامپوری

چشمِ فسردہ

چندن اور سہیل شہ نشین میں آ بیٹھے۔ برابر کے کمرے میں خود بخود بجنے والا ارغن اپنے شیریں سُروں میں دلکش نغموں کی بارش کر رہا تھا۔ نچلی منزل کے آگے گھنے سے شاخسار میں رنگ برنگ شاداب پودے ہوا کی لہروں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے اور تھوڑے فاصلے پر سمندرِ اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندر بہکتی ہوئی رقاصہ کی طرح ہولے ہولے ہلکورے لے رہا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دل وجان سے چاہتے تھے۔ خصوصاً سہیل کو چندن سے بے حد محبت تھی ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مگر سہیل کی دارفتگی اس سطح پر تھی جہاں لوگ بالعموم اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ ایک مدت دراز گذارنے کے بعد پہنچتے ہیں۔ وہ ابھی نوجوان تھا اور اُس کی زندگی ہمیشہ سے پُر مسرت و مطمئن تھی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ اُسے چندن ہی کی بدولت ملا ہے۔ گویا انہوں نے بہت دنوں سے زندگی کے اندھیرے اور اُجالے یکجا بتائے ہیں۔ اور اب وہ زمانے کی گردشوں سے نکل کر چندن کی صحیح قدر و منزلت کرنے لگا ہے۔ اور چندن اس قدر و محبت کی تھی بھی مستحق کیونکہ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند ہونے کے باوجود اُس کی سیرت بے انتہا پسندیدہ تھی اور اسکا حُسن دلکش و دلفریب! بات بات میں مسکراہٹ، اور متانت آمیز شوخیاں اُس کا عام شیوہ تھا۔ خفگی اور بدمزاجی اُسے آتی نہیں تھی۔ غرض وہ سراپا تبسم زار اور با اخلاق و محبت کا ایک حسین پیکر تھی جس کی دل نشیں اداؤں سے سہیل کا سرمایۂ حیات صد درجہ پُر کیف و معمور رہتا۔ اس نے چندن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں محبت کی بے پناہ روشنی جگمگانے لگی۔

"وہ دیکھو!" سہیل نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ، جہاں سطحِ آب اور دامنِ فلک یکجان ہو رہے ہیں۔ بس اسی طرح ہماری روحیں آپس میں متحد ہو گئیں ہیں! خدا کرے یہ ملاپ ہماری تمام عمر قائم رہے۔ اور ہم دونوں کے دل ہمیشہ ایک دوسرے کی دھڑکن سُنتے رہیں۔"

چندن نے اُس کے بھولے بھالے مکھڑے کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ سوچنے لگی یہ خلوص و محبت آج کہاں سے آ گئی۔ آج تک انہوں نے اپنی اُلفت کا یوں کھل کر اظہار کبھی نہیں کیا۔ ہمیشہ چپ چاپ چاہتے رہے۔ اور مجھے ان کی بے پناہ چاہت کا اچھی طرح احساس ہے مگر یہ اظہار کیوں؟ اور جب اُس نے حسبِ معمول ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ ذرا لجا کر کہا "آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" تو وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ گویا اُسکے مُنہ سے کوئی عریاں بات نکل گئی ہے۔

سمندر کے کنارے ایک ناریل اٹھلاتا، ناچتا، گاہے ڈوبتا، گاہے اُبھرتا، شفق کے دُھندلکے میں سوئے مشرق چلا جا رہا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اُس کے چاروں طرف ننھے ننھے گرداب پڑنے لگے اور پہلو میں اچانک ایک بہت بڑی موج طوفانی شور و غل کے ساتھ ساحل سے آ کر ٹکرائی۔

سہیل کو بڑا لطف آیا اور وہ چندن کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ "آؤ اُدھر چلے چلیں، موجوں کی شوریدہ سامانی قریب سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔"

چندن کھڑی ہونے لگی۔ مگر عین اس لمحہ دُور کسی گوشے سے ایک وحشتناک آواز سن کر وہ رُک گئی۔ تاڑ کے کسی اُجاڑ جُھنڈ سے ایک ستمزدہ پرندہ چیختا، چلاتا، بار بار اس ڈوبتے ہوئے ناریل کو مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔

(۲)

سہیل کو آنند سے بڑی محبت تھی۔ وہ اِس کا عزیز ترین دوست تھا۔ دونوں نے بچپن کے کھیل ایک ساتھ کھیلے، اور لڑکپن کی شرارتیں اکٹھی کی تھیں۔ کالج میں بھی باوجود مختلف مضامین ہونے کے وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ المختصر دونوں ایک دوسرے کے سچے ہمدرد اور شریک راز تھے۔ ایک کے دل پر جو کچھ گذرتی دوسرے کو اس کا احساس ہوتا رنج میں رنج، خوشی میں خوشی، گویا دلی تعلق نے انہیں آپس میں بے حد قریب کر دیا تھا جب تک وہ زیرِ تعلیم اور کشمکشِ حیات سے آزاد رہے، اُس وقت تک انہیں کبھی کوئی خاص فکر دامنگیر نہیں ہوا۔ ہمیشہ خوش باش اور بڑی بڑی باتوں کو ہنس کر ٹالتے رہے، مگر غمِ روزگار تو ہنس کر نہیں ٹالا جاتا! غیرتمند شخص کے لئے خواہ وہ وراثتاً کتنا ہی دولت مند ہو۔ کمائی کا مسئلہ بھی مشکل ہے۔ وہ جب تک خود اپنی محنت سے روپیہ پیدا نہ کرے اُسے سچا آرام نہیں ملتا۔ اور فطرت کے اسی تقاضے نے دونوں دوستوں کو عیش و عشرت کے گہوارے سے نکال کر ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔

سہیل بمبئی میں ملازم تھا اور آنند کلکتہ میں، کسقدر طویل فاصلہ ہے یہ! مشرق و مغرب کی مسافت کتنی گراں معلوم ہوتی ہے! اسی لئے ان دونوں کو ملے ہوئے تین سال ہو گئے ——— اور اب وہ آرہا ہے! آنند وہی سہیل کا پیارا دوست! جس سے ملنے کے لئے وہ بار ہا تڑپا کیا، خصوصاً شادی کے موقع پر اس کی یاد کی کوئی انتہا نہیں تھی مگر وہ نہ آسکا۔ ملازمت کی پابندیاں جو تھیں! آخر انسان کی آزادیاں اسی قربان گاہ پر تو بھینٹ چڑھتی ہیں! ہاں، تو وہ شام کو آجائے گا۔ سہیل کی خوشی کا کوئی اندازہ نہیں۔ وہ مسرت سے دیوانہ ہوا جا رہا ہے، گویا سرچشمہ شادی سے سیم و زر کی ایک شفاف چمکدار کرن پھوٹی ہے۔ لیکن ...... لیکن اس شادمانی میں ایک سرخ لکیر بھی تو نظر آتی ہے۔ آنند ایک سراپا راز بن گیا ہے۔ اُس کے آخری خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا اور دنیا والوں سے بیزار ہے۔ اُسے کائنات کی کسی شے پر اعتماد نہیں رہا۔ اُس کے نزدیک ہر چیز بے اعتبار اور پُر فریب ہے۔ اُس نے نوکری بھی چھوڑ دی ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ، بس سفر کئے جاتا ہے۔ شاید اس کی کوئی عزیز ترین چیز کھو گئی ہے۔ اُسے اُسی کی تلاش ہے اور اسی عالم جنون میں وہ ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح سہیل کے پاس آرہا ہے۔ مگر یہ سہیل پر بھی پابندی کیوں؟ اُس نے یہ کیوں لکھا ہے کہ "جب تک میں تمہارے پاس رہوں (اور اس کا کوئی یقین نہیں کہ کب تک؟) تم مجھ سے کوئی سوال مت کرنا۔ کبھی کچھ نہ پوچھنا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے جو محبت ہے اُس کی بنا پر تم مجھے مفید مشورہ دو گے۔ مجھے راہ دکھانے کی کوشش کرو گے لیکن نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ تمہیں کسی قسم کی خیال آرائی تک کی اجازت نہیں!"

——— اور چندن حیران ہے کہ یہ آنند سہیل کا کیسا دوست ہے جو اتنی شرائط اور پابندیاں لگا کر آرہا ہے! پھر بھی سہیل بے حد مسرور ہے۔ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ وہ یہ تک بھول گیا ہے کہ آنند نے اُسے بہت سے پہرے بٹھا رکھے ہیں جنہیں اُسے توڑنے کی سخت ممانعت ہے۔ اس وقت صرف اُسی کے آنے کی خبر دینے دفتر سے آیا تھا اور سارا تفصیل سے سُنا کر پھر واپس چلا گیا ہے۔ شام کو پانچ بجے وہ اُسے سٹیشن لینے جائیگا۔ پھر دونوں دوست اکٹھے گھر آئیں گے۔

چندن، آنند کو دیکھکر ششدر رہ گئی۔ لمبا تڑنگا نوجوان، اکہرا جسم، گندمی رنگ، ابھرے ہوئے خدوخال، گویا حسن و جوانی کا اسے گر نہیں! اُسے اس چیز نے متعجب نہیں کیا کیونکہ اسکی آنکھیں منتظر حسن و جمال کی بہت سے عادی تھیں۔ سہیل آنند سے کم خوبصورت نہیں تھا جس بات سے وہ حیرت زدہ سی رہ گئی وہ آنند کی شکل و شباہت اور ہیئت کا قرینہ تھا۔ اس کی گفتگو میں بے ترتیبی اور خیالات میں اُلجھن تھی۔ اس کے بد وضع کپڑوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اُن کی طرف سے قطعی بے پروا ہے۔ اس کے سر کے بال بُری طرح بڑھے ہوئے تھے اور شیو بھی اُس نے کئی روز سے نہیں کیا تھا۔ پھر بھی چندن نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ یہ شخص اگرچہ مخبوط الحواس معلوم ہوتا ہے مگر زود حس اور شدید احساسات کا مالک ہے۔ اُس کی صحت بیشک تباہ ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے نقوش کہہ رہے ہیں کہ ہم تنومندی کے نقیب ہیں! اور ڈاڑھی کے ان بڑھے ہوئے بالوں کے پس پردہ ایک خوبصورت چہرہ ہے جس کی رونق کسی خاص وجہ سے زائل ہو گئی ہے۔ اور اس کی آنکھیں! ——— آنکھوں کا خیال آتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ اور ایک بار پھر اُس نے اُس کی آنکھوں کو دیکھا اور اُن کی ویرانی اس کے دل میں گھر کر گئی۔ اُسے ایک تیر سا لگا اور وہ زیادہ دیر انہیں نہ دیکھ سکی۔ اُس کے دماغ میں خیالات کا سیلاب امنڈ آیا۔ آہ! یہ آنکھیں کیسی اُجاڑ ہیں، گویا کسی ناکام محبت کا شکستہ مزار جسکے سرہانے ایک مدھم سا چراغ تک نہیں!

غرض اُس کی آنکھوں نے چندن پر بڑا اثر کیا۔ اس لئے اور بھی کہ جب اس نے پہلے پہل آنند کی ویران آنکھوں کو دیکھا فوراً اس کے سامنے سہیل کی خوبصورت آنکھیں آگئیں اور اُس کے تمام خیالات و احساسات اُس لمحے کے لئے رُک کر صرف اس موازنے پر مجتمع ہو گئے۔ ایک طرف سہیل کی چمکدار، شوخ اور پُر تبسم آنکھیں تھیں، اور دوسری طرف آنند کی خاموش، اُداس اور پُر حسرت نگاہیں! وہ اس زبردست تقابل کی تاب نہ لا سکی اور سوچنے لگی: "آنند کی آنکھیں بھی تو حسین ہیں۔ ان کی ساخت بھی تو اُسی سانچے میں ڈھلی ہے۔ پھر ان دونوں میں اس قدر فرق کیوں ہے؟ اس کی آنکھوں میں اتنی مایوسی اور حسرت کیوں بھری ہے؟ اُنکی مسکراہٹیں اور شوخیاں کہاں لُٹ گئیں؟"

اس کی حسرتناک نگاہوں کا خیال چندن کو ہر وقت ستانے لگا۔ جب بھی وہ اس سے گریز کرنے کی سعی کرتی، اُسے کوئی آواز کہتی ہوئی معلوم ہوتی: "کیوں ناکام کوشش کرتی ہو؟ یہ آنکھیں تمہارے من میں بس گئی ہیں! اس سے انکار ہے؟" اور وہ چپ ہو جاتی۔ اور اُسے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کے چاروں طرف وہی ویران آنکھیں، وہی حسرتناک نگاہیں فضا میں تیر رہی ہیں۔ وہ اُن سے بچکر بھاگ جانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اُس کا پیچھا کر رہی ہیں۔

ایک دوسرے میں جیتے جاگتے رہے تھے۔ سہیل پُرجوش اور محبت بھرے لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ آندر بھی کبھی کوئی مختصر سا جواب دے دیتا اور چندن اپنے خیالات میں گم، اُس کی آنکھوں کو تک رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ان پتلیوں میں ایک شعلہ نمودار ہوا اور آناً فاناً بجھ گیا —— اور ساتھ ہی اُس کے دل سے صدا بلند ہوئی۔ "آہ یہ ستایا ہوا معلوم ہوتا ہے! کہیں اس بیچارے کا کسی نے دل تو نہیں توڑ دیا!!"

(۳)

سہیل کی کوشش ناکام رہی۔ آندر نے اپنے دل کا بھید کسی طرح ظاہر نہیں کیا بلکہ سہیل جب بھی زیادہ مُصر ہوا، وہ یا تو بالکل خاموش ہو جاتا یا اُسے اپنا خط یاد دلا کر کہتا "کیا تم مجھ سے اُکتا گئے ہو؟ تم چاہتے ہو میں چلا جاؤں؟" اور پھر اُس کی آواز رقت انگیز ہو جاتی "سہیل! سچ جانو میں مجبور ہوں۔ میں نے بارہا چاہا کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں مگر میری زبان بند ہو جاتی ہے۔ اس لئے تم مجھے میری حالت پر چھوڑ دو۔"

سہیل کو اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ آندر کے کام نہ آ سکا۔ حالانکہ اس کی حالت اب ایسی ہی جیسی آدھی رات کو قبرستان میں کوئی سایہ متحرک ہو لیکن سہیل اس کا اتنا گہرا دوست ہوتے ہوئے بھی اس کو زندوں کی بستی میں نہیں لا سکتا۔ وہ دفتر کے اوقات کے علاوہ زیادہ تر آندر کے ساتھ رہتا بلکہ اس کا دل بہلانے کے لئے وہ دونوں میاں بیوی اکثر اُسے مختلف تفریح گاہوں میں لیجاتے تھے۔ کبھی چاندنی رات میں جوہو کے کنارے جہاں سمندر اور ساحل سمندر کے پُرکیف نظارے اور زندہ دل دولتمند مردوں اور عورتوں کی خوش فعلیاں حد درجہ دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ کبھی چوپاٹی کے کھلے میدان میں جہاں اوسط اور غریب طبقے کے لوگ اپنے جذبۂ سیر یا زبان کے چٹخارے کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی "باغ معلق" کے سرسبز اور اونچے قطعات میں جہاں کی روشیں اور باغبانوں کی معشوقانہ چابکدستیاں بے ساختہ داد کی طالب ہوتی ہیں۔ اور کبھی گیٹ آف انڈیا جہاں متلاطم موجوں پر سفینے اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ آندر اپنے میزبانوں کی مدارات کی خاطر ان سب تفریحوں میں حصہ لیتا تھا لیکن سہیل اور چندن سمجھ رہے تھے کہ درحقیقت قدرت کی یہ سب رنگینیاں اُس کا دل نہیں لُبھا سکیں۔

اور چندن کو یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح آندر کے دل کا راز پا جائے۔ آندر جتنا کہ اپنی دلی کیفیات سہیل سے چھپاتا، چندن کا ارادہ اور بھی مستحکم ہو جاتا کہ وہ اُس کے گریز سے کبھی ہار نہیں مانے گی۔ آخر چند روز کے بعد اُسے اپنی کوشش میں کامیابی کی جھلک نظر آنے لگی۔

جب تک سہیل دفتر میں رہتا، چندن کو آندر کے ساتھ وقت گذارنے کے زیادہ مواقع ملتے اور وہ محض اپنے دل کی خلش مٹانے کے لئے اس امر کی کوشاں ہوتی کہ وہ بے تکلف ہو جائے اور اُس سے کھل کر بات کرے۔ چنانچہ کبھی کبھی وہ اُسے ساحل سمندر پر لیجاتی جو اُن کے گھر کے بالکل قریب تھا اور وہاں کسی طویل قامت دیوار کے سائے میں دونوں بہت دیر تک بیٹھے رہتے۔ وہ کبھی اپنی اور سہیل کی زندگی کے مختلف واقعات سُناتی اور مُصر ہوتی کہ آندر ان پر تبصرہ کرے۔ آخر جب آہستہ آہستہ اُن دونوں میں مُغائرت ختم ہو گئی تو آندر کو محسوس ہونے لگا کہ اُس کا خمار اُتر چکا ہے اور وہ اب چند کروٹیں اور لیکر نیند سے بیدار ہو جائیگا۔ ایک دن جب چندن نے دیکھا کہ آندر موج میں ہے اور وہ آزادانہ گفتگو کر رہا ہے تو اس نے پھر اُس سے اس عجیب و غریب ہیئت اور حد سے زیادہ خاموشی کا سبب پوچھا —— سامنے سے ایک جواں سال اور خوش منظر جوڑا ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا —— چندن کا سوال سُنکر آندر کو ایسا محسوس ہوا کہ برسوں کا بند، پانی کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر ٹوٹ گیا ہے اور وہ اپنے غم و اندوہ کو مزید ضبط نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے روتے ہوئے دُکھی آواز میں سب کچھ سُنا دیا۔ اُس نے اُسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ اُسے ایک خوبصورت دوشیزہ سے محبت تھی اور یہ محبت رفتہ رفتہ اتنی پروان چڑھی کہ وہ چند لمحات کی جُدائی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو اُس کی غلط فہمی تھی۔ کملاوتی نے اُس کی محبت کا جواب سچی محبت سے کبھی نہیں دیا۔ وہ صرف اُس کے جذبات سے کھیلتی رہی اور جب آندر کا جذبۂ عشق منتہا کو پہنچا تو اُس نے یکایک سرد مہری اختیار کر لی۔ گویا کملاوتی کو بس اسی کا شوق تھا اور وہ اس طرح اس کا دل توڑ کر بیحد خوش تھی۔ حالانکہ آندر کے یہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مایوس محبت بھی ہو سکتا ہے اور اُس کے حُسن و عشق کی دُنیا اُجڑ کر یوں سراب ثابت ہو سکتی ہے۔ پھر جب کملاوتی کی شادی ہوئی تو اُس کے قلزم عشق میں طوفان بپا ہو گیا اور دُنیا کی ہر شے سے اُس کی طبیعت بیزار ہو گئی ....

چندن گُم سُم بنی سُن رہی تھی اور جب تک وہ اپنا فسانۂ محبت کہتا رہا اُن دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر جمی رہیں۔

آنند بستر پر بیٹھا ہوا ان بے داغ فلک پہ ستاروں کے کھیل دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان ستاروں کی تابانی تو عرصہ ہوا مٹ گئی تھی پھر آج یہ کیوں چمک رہے ہیں؟ ان کی رفتار اور چال میں بھی وہی پہلی سی تیزی اور بانکپن آ گیا ہے گویا انکے نورِ حیات کو کسی نے پھر سے درخشانی بخشی ہے .... اور سوچتے سوچتے اس کا خیال آسمان سے زمین اور زمین سے خود اپنے تئیں پر آ کر رُکا جہاں اُس کے نزدیک تمام کائنات سمٹ آئی تھی۔ وہ حیران رہ گیا، آج چندن کی زبان کیسے کھلی؟ اُسنے اپنا رازِ دلی کیوں ظاہر کر دیا؟ اور ہر چند کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے غلط تاویلیں تراشتا رہا لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ کرۂ ارض پر وہ بھی ایک ستارہ ہے ——— چندن کی مانند ——— اور اُس کی مٹی ہوئی تابانی از سرِ نو عود کر رہی ہے، اور کوئی دوسرا ستارہ اس کے نورِ حیات کو درخشانی بخش رہا ہے۔

چندن کو بھی نیند نہیں آئی، اُسے اس بات کا بڑا ملال تھا کہ آنند کی زندگی اُسی کی صنف کے ایک فرد نے تباہ کی ہے۔ اسی لئے بار بار اُس کو آنند کا خیال آتا رہا۔ اُسے اُس سے بیحد ہمدردی تھی بلکہ وہ یہ تک سوچنے لگی تھی کہ کیا اس کا مداوا نہیں ہو سکتا؟ کیا وہ اس زبردست نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی جو آنند کو ایک عورت کے ہاتھوں پہنچا ہے؟ شاید عورت ہونے کی حیثیت سے اُس کا فرض ہے کہ وہ آنند کو اس تباہ حالی سے بچائے۔ آنند کی کشتیِ حیات ایک ستو چٹان سے ٹکرا کر برباد ہو گئی ہے اُسے چاہیئے کہ وہ اس مصیبت میں اُس کا ساتھ دے، اُسے سہارا دے اور اُسکا ہاتھ تھام کر ساحل تک پہنچا دے۔ پھر خود ہی اُس نے اپنے دل سے سوال کیا "کیا میں اُس کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟ کیا وہ میری مدد قبول کریگا؟"

آخر وہ اُس کی مدد پر آمادہ ہو گئی اور اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اُس کی حالت سنوارنے کی پوری پوری کوشش کریگی۔ اُس کی دُنیا سے بیزاری دُور کریگی اور اُسے زندگی اور متعلقاتِ زندگی میں دلچسپی لینے کی ترغیب دلائے گی۔

۴

لیکن نہیں، دریا میں طغیانی آ گئی اور دھارے کا پانی مصنوعی نہر میں رواں ہونے کی بجائے قدرتی نشیب کی طرف بہہ نکلا۔ چندن کا خیال غلط تھا کہ اُسے آنند سے صرف ہمدردی ہے اور وہ اُسکی حالت بہتر بنانے میں محض انسانی فرض ادا کر رہی ہے، در اصل وہ اُسکی مدد کرتے کرتے خود اس کا سہارا ڈھونڈنے لگی تھی۔

——— ساتھ خوش وقتوں نے مسرت کی گرمی پیدا کر کے ایک ناسازگار اور نامناسب فضا پیدا کر دی۔ وہ بیگانۂ منزل ہو گئے ہیں اور جب نفس کے بے لگام جذبات کا شعور آیا تو وہ بہت گھبرائی۔ دونوں راہ کو خوشی چھوڑ کر ہٹ جانا چاہتے تھے مگر اب یہ ممکن نہیں تھا۔ اُن کا ہر اٹھتا ہوا قدم آگے منزل کی طرف کھینچتا ہوا معلوم ہو رہا تھا اور اُسکا بیقرار دل آنند کا ساتھ چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ گھنٹوں اپنی تمناؤں سے برسرِ پیکار رہتی اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچتی کہ آنند بہ فتح پا کر وہ خود اپنے آپکو ہار گئی ہے۔

آنند کو بستی سے وحشت ہونے لگی ——— وہ جلد از جلد چندن کو ہمراہ لیکر وہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ اور اُس کی طرح اُس کی محبت میں بھی حد درجہ شدت تھی اور وہ اس میں اسقدر خود فراموش ہو گیا تھا کہ اُسے سوشیل کا مطلق خیال نہ رہا۔ اُسکے فردوسِ تخیل میں سوائے اپنے اور چندن کے کسی کے لئے گنجائش نہیں تھی۔ وہ یکسر بھول گیا کہ جیسے کملاوتی کی جُدائی سے اُسکی زندگی تباہ ہو گئی تھی، چندن کے چلے جانے سے سوشیل پر بھی تباہ کن اثر ہو سکتا ہے۔ اور پھر اُس کے لئے یہ کیا کچھ کم باعثِ اذیت ہوگا کہ اُس کی متاعِ حیات خود اُس کے عزیز ترین دوست کی بدولت گئی، جسے اُس نے اپنا، بالکل اپنا سمجھ کر اپنے دامن میں پناہ دی۔

سوشیل چار بجے کے قریب دفتر سے آتا تھا مگر آنند بغیر اس سے ملے چار ہی بجے اسٹیشن چلا گیا۔ چندن اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی "کس قدر وجیہ اور رنگیلا نوجوان ہے" وہ آپ ہی آپ کہتی رہی "اس خوش وضع لباس میں یہ کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے" اور جب وہ سڑک کے موڑ پر نظر سے اوجھل ہو گیا تو اُس کے تمام جسم میں بجلیاں سی دوڑ گئیں اور اسکا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔

اُس نے آنند کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے پرانے ملازم اور خادمہ کو کسی قسم کا شبہ ہو، چنانچہ اُس نے آنند سے طے کیا تھا کہ وہ اُس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد روانہ ہو گی اور اُسے اسٹیشن پر مل جائیگی۔ ٹن کی آواز سنکر اُس نے سامنے دیوار پر دیکھا کہ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھی جا رہی ہیں۔

وہ سوشیل کے نام الوداعی خط لکھنے بیٹھ گئی جس میں اُس نے رُک رُک کر اپنے ارادہ کو بیان کر دیا اور نہایت عجز سے اُس سے التجا کی کہ وہ اُسے معاف کر دے اور اُسے بھول جائے...... اُس نے لفافہ بند کر دیا اور چلنے کی تیاریاں کرنے لگی۔ تیار ہو کر وہ رخصت ہوں نے سامنے گھر پر آخری نگاہ ڈالی اور انجام کار خط رکھنے کیلئے وہ اپنے شوہر کے کمرے میں داخل ہوئی مگر ——— مگر یہ تمام کمرہ پر سوشیل کو بیٹھا ہوا دیکھ کر اُسے سکتہ سا ہو گیا، اُس کے

یہ سڑک

یہ سڑک ــــــــ
سامنے یہ جو ہے پھیلی سی سڑک
جس پہ استادہ ہیں شیشم کے درخت
پا بگِل صف بستہ
پاسبانوں کی طرح
یہ سڑک ــــــــ
یہ سڑک صاف بھی ہے سیدھی بھی۔
نہ کوئی پھیر نہ موڑ
نہ کوئی پیچ نہ خم
اور نہ خاشاک کے انبار کہیں
یہ سڑک ــــــــ
یہ سڑک جس پہ جوانانِ حسیں محوِ خرام
کاجل آنکھوں میں ہو کاجل میں نشے کے ڈورے
تمتمائے ہوئے گال
بال بکھرے ہوئے بہکی ہوئی چال
اور کلّوں میں دبائے ہوئے پان
یہ سڑک ــــــــ
یہ سڑک خام سہی
شارعِ عام سہی
پھر بھی یہ بات بڑی ہے کہ چلی جاتی ہے
اپنی ہی دھن میں چلی جاتی ہے
یونہی کلکتہ سے لاہور تلک
یہ سڑک ــــــــ

کبھی تنہائی سے گھبرا کے نکل آتا ہوں
اس سڑک پر جو ٹہلنے کے لئے
ذہن بن جاتا ہے میرا بھی سڑک کے مانند
ایک ایسی ہی سڑک کے مانند
جو چلی جاتی ہے کلکتہ سے لاہور تلک
جس پہ افکارِ جواں
مثلِ جوانانِ حسیں محوِ خرام
اور اشعار رواں
کار کی طرح رواں اور دواں
گرد میں جس کی چھپی جاتی ہے
شعلۂ رُخ کی لپک
شور میں جس کے دبی جاتی ہے
ایک چوڑی کی کھنک۔
یہ سڑک ــــــــ

(ناتمام)

سندباد جہازیؔ

چشمِ فسردہ (بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۹۰) قدم جہاں سے وہیں جم گئے اور وہ ٹکٹکی باندھکر اپنے شوہر کی نگاہوں کو دیکھنے لگی۔ ... یہ ان آنکھوں کو کیا ہوگیا؟ یہ بربادی کا فسانہ کیوں کہہ رہی ہیں؟ ان کی تازگی اور چمک کب ہٹ گئی؟ اور... معاً اس کے تخیل میں اُن دونوں کی آنکھیں آگئیں ــــــ اندرکی شاداب، متبسم اور تابناک، اور سہیل کی فسردہ خاموش اور غمناک!!

صادق الخیریؔ

دلسوز مکان کی بالائی والی کھڑکی میں گئی، [illegible] رہتی اور پھر یکایک اس کی نگاہیں میز پر پڑے ہوئے [illegible] پڑیں۔ [illegible] بجھ گئے [illegible] منٹ رضیہ کے لب تھرتھرائے اور [illegible] ایک ہلکی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور پھر رضیہ نے کھڑکی کا زور سے بند کر دیا۔

وہ کھڑکی کھلتی رہی اور بند ہوتی رہی وہ لڑکا ہر شام اس گلی سے گزرتا۔ اور رضیہ کی طرف دیکھتا اور چلا جاتا اور ان دو مہینوں میں رضیہ کی حیثیت ہی بدل گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ زمین سے اٹھ کر آسمان پر چلی گئی ہے۔ اب اس کا دل مسرت سے لبریز تھا۔ اور گھر کے کام کاج کرنے میں ایک خاص لطف آتا۔ جب وہ صبح اٹھتی۔ تو آنگن میں چنبیلی کے پھول اس کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے۔ وہ پھولوں کا گچھا توڑ لیتی اور اسے اپنے نرم نرم گالوں سے لگاتی اور پھر ایک دن گلی کے چوکیدار نے رضیہ کے باپ سے کہہ ہی دیا وہی جو انہیں کہنا تھا۔ پھر اس دن کے بعد سے کھڑکی بند ہو گئی اور رضیہ کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ کھڑکی کبھی نہ کھلے گی۔ باپ کی نگاہیں کہہ رہی ہیں۔ بیٹی۔ ہندوستانی لڑکی محبت نہیں کر سکتی۔ وہ صرف شادی کرتی ہے اور اس کی ماں کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ تم نے ہمارے ناموس کو بٹا لگا دیا۔ ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ اپنے ماں باپ کی عزت کا کچھ خیال تو کرتیں اور بھائی کی نگاہیں کہتی تھیں۔ آزادی کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم بھی بزرگوں کے بنائے ہوئے راستے پر چلو۔ یہ راستہ کانٹوں سے لبریز ہے اور پھر میں کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ کہ میری بہن سے کوئی عشق کرے۔ گو میں چاہتا ہوں کہ میں دوسروں کی بہنوں سے عشق کروں۔ ان سے میں کھیلوں .... لیکن جی چاہتا ہے۔ تمہارا گلا گھونٹ دوں۔

اور پھر ایک دن رضیہ کو خیال آیا کہ وہ ان بندشوں کو توڑ دے۔ ان آہنی سلاخوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ جنہوں نے اس کھیل کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے۔ وہ اسے اس وسیع دنیا میں کہیں نہ کہیں ڈھونڈے گی لیکن پھر اسے خیال آتا۔ کہ وہ کہاں ہوگا۔ وہ کیوں چلا گیا۔ اور اب وہ کیوں نہیں آتا۔ وہ آج تک گھر سے باہر کبھی اکیلی نہیں نکلی۔ وہ اکیلی کدھر اور کہاں جائے۔ دنیا اتنی وسیع اور اتنی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اونچے اونچے پہاڑ۔ یہ رات کے بھیانک راؤنے سائے۔ یہ بے معنی اور اونچے اونچے پہاڑ اور درخت اور یہ سانپ کی کینچلی کی طرح بل کھاتا ہوا دریا۔ یہ بندشیں یہ آہنی بندشیں یہ بندشیں۔ یہ کب ٹوٹیں گی۔ وہ کہاں ٹوٹی ہیں۔

اور جب سے گھر والوں کو اس واقعہ کا علم ہوا ہے۔ انہوں نے گھر کی [illegible] شروع کر دی ہے۔ یہ بندشیں [illegible] اور رضیہ سوچتی ہے [illegible] سمجھتی ہے کہ ان بندشوں کا کیا مطلب ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اسے ہندوستانی [illegible] ہندوستانی ناقد

چراغِ طور

اک دلِ مغموم کو آنسو بہانا آ گیا
ناز والے ناز کرنے کا زمانہ آ گیا

انتہائے غم میں بھی مسرور و شاداں ہیں
لو مبارک ہو مجھے بھی مسکرانا آ گیا

اللہ اللہ مری منزل اس سے بھی آگے ہو گیا
جس جگہ جھکتے ہیں سر وہ بھی جھکانا آ گیا

آپ کے جلوے جو بے پردہ نظر آنے لگے
میری نظروں میں سمٹ کر کل زمانہ آ گیا

خام کارِ عشق بھی اب پختہ کارِ عشق ہیں
صدمے سہنا آ گئے ہیں غم اٹھانا آ گیا

آپ کے نقشِ قدم پر رکھ جو دی ہیں جبیں
میرے قدموں میں سارا زمانہ آ گیا

میری جانب لے چلا صیاد جب میرا قفس
میں یہی سمجھا کہ میرا آشیانہ آ گیا

پاؤں میں لغزش ہے میری بند آنکھیں ہیں مری
ہوش میں بہزاد آؤ آستانہ آ گیا

بہزاد لکھنوی

پگڈنڈی

پگڈنڈیاں گاؤں سے ان کھیتوں میں سے گزرتی چلی جاتی ہیں اور بہت دور تک [illegible] آسمان سے جا ملتی ہیں، ایک نیچے اور دوسری آسمان سے اور چلنے والے ان پگڈنڈیوں اور آسمان کے درمیان کہیں کھو جاتے ہیں، اس طرح کھو جاتے ہیں کہ نقش قدم بھی پیچھے نہیں چھوڑتے۔!

کتنی پگڈنڈیاں ہیں، راستے کتنے چلنے والے اور پھر سب کی جدا جدا پگڈنڈی ہے، ایک دوسرے سے کہیں بھی تو نہیں ملتے اور اگر ملتے بھی ہیں تو مختلف سمتوں میں جاتے وقت سب کی جدا جدا پگڈنڈی ہے!

آدمی کا جسم بھی ایک پگڈنڈی ہے جس پر سے زندگی کے مختلف دور گزر جاتے ہیں، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور پھر یوں کی شکل میں اپنا راستہ چہرے پر چھوڑ جاتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے، سب کھو جاتے ہیں، اس زمین اور آسمان کے درمیانی خلا میں، ہوا کے ایک لطیف کرہ میں، پگڈنڈی بھی اور چلنے والے بھی۔ سکھیا پگڈنڈی تھا کہ راہی؟ کچھ خبر نہیں!

بہت کم لوگ جانتے تھے کہ سکھیا افق پر نظریں جمائے گاؤں سے باہر جانے والی پگڈنڈی کو ہر وقت کیوں گھورتا رہتا ہے اور کبھی کبھی اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر ایک خیال میں کیوں غرق ہو جاتا ہے، سوچتا رہ جاتا ہے یہاں تک کہ پگڈنڈی اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتی ہے اور بل کھاتی ہوئی دور کہیں آسمان میں جا کر جذب ہو جاتی ہے۔

سائے مختصر سے طویل اور طویل سے مختصر ہو کر چھپتے رہے، راستہ میں اُگے ہوئے بہت سے پرانے پیڑ سرکش ہواؤں کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑے اور ان کی جگہ نئے درختوں نے لے لی۔ کتنی ہی جگہ پگڈنڈی نے کھسک کھسک کر اپنا راستہ بدل لیا، راستوں کی شکلیں بدل گئیں، مکانوں کی ساخت تبدیل ہو گئی اور دن رات سُک سُک کر ان سے بدلتے رہے مگر سکھیا کی کبھی نہ تھکنے والی آنکھیں اس پگڈنڈی پر سے نہ ہٹیں جس پر سے کبھی وہ اپنی زندگی کی ایک خوشی لے کر آیا تھا۔

سکھیا کی زندگی پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ بدلتی جا رہی تھی مگر فرق صرف اتنا تھا کہ پگڈنڈی کے سائے کے لئے نئے درخت پہاڑوں کی جگہ اُگ آئے تھے مگر سکھیا کی زندگی جس پگڈنڈی پر سے گزر رہی تھی اس پر کوئی سایہ [illegible] کی ایک تپتی ہوئی دوپہر [illegible] اس کا سرمایہ تھا، اس کی نگاہوں [illegible]

[illegible] کھا گئی [illegible]

"وہ اب نہیں آئیگی" مگر سکھیا [illegible] نظریں جما کر انہیں گھورنے لگتا اور انہیں ڈھونڈتا دیکھ کر اس کی نگاہیں ان کا تعاقب کرتیں لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو کر کہیں گہری تاریکی میں کھو جاتے اور وہ سوچنے لگتا، اسی طرح ایک خوبصورت تارا ٹوٹ کر کبھی اس کی گود میں بھی گرا تھا مگر پھر اسی طرح یک بیک ایک اندھیرے میں اوجھل ہو گیا، اس کی حد نگاہ سے دور، اس کے ادراک سے کہیں پرے اور پھر اس کی نگاہیں ان راستوں پر جم جاتیں جن راستوں سے وہ اسے دلہن بنا کر لایا تھا۔ وہ اب سنسان تھے، سنسان اور اداس اور وہ اداس راستوں کو دیکھنے لگتا، اس پگڈنڈی کو، کیا خبر اسے کبھی اس کی یاد آ جائے اور وہ چلی آئے، اپنے سکھیا کی یاد!

سکھیا کو کبھی کسی نے نہاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، وہ پانی سے ڈرتا تھا گویا وہ سلگتی ہوئی راکھ کا ایک ڈھیر تھا جو پانی پڑتے ہی [illegible] سے بجھ کر رہ جائیگا، ایک میلا سا اسی کا ہم عمر حقہ دن رات اس پر [illegible] قہقہے لگاتا رہتا تھا، قریب لیٹے ہوئے اپلے کا دھواں پگڈنڈی کی طرح بل کھاتا ہوا اس کے سر پر منڈلاتا رہتا تھا اور وہ اپلے اور حقے کے درمیان راکھ کے ڈھیر کی طرح پڑا رہتا تھا، ایک سلگتے ہوئے راکھ کے ڈھیر کی طرح!

دن میں کئی بار کوا اس ٹوٹی ہوئی منڈیر پر آن بیٹھتا جس پر ایک لوبیہ سی بیل ایک پرانے چھپر کو تھامے ہوئے تھی۔ اس کی کائیں کائیں پر سکھیا ایک دم چونک پڑتا۔ پگڈنڈی تالاب کے کنارے کنارے مڑتی ہوئی دور کھیتوں میں کھو جاتی، دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اور راستے کی دھول اس کی نگاہوں کا حجاب بن کر انہیں واپس لوٹا دیتی، مایوس، ناکام اور وہ سوچنے لگتا اور سوچتا رہ جاتا، "بہت سی پگڈنڈیاں ہیں، ان گنت، لاتعداد، راستہ بھول جانا کوئی بڑی بات نہیں، وہ بھی راستہ بھول گئی ہے، جانے کب سیدھے راستہ پر پڑے، جانے کب واپس آ جائے!

گاؤں بدل گیا ہے، گاؤں والے بدل رہے ہیں، زندگی آہستہ آہستہ پگھل رہی ہے، اس کے ساتھی بہت آگے نکل گئے، باقی جو ہیں تھکے بیٹھے ہیں، کیا خبر وہاں بھی روحوں کا ملاپ ہوتا ہو، روحوں کا ملاپ اور وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگتا جیسے دبی ہوئی چنگاری پر سے راکھ ہٹ جاتی ہے، اسے یہاں اب کون پہچانے گا، وہ ابھی اس کا انتظار کرے گا، جانے وہ کب واپس آ جائے!

اس کے نزدیک کوٹھے کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا، گر وہ بیلی کی بہت سے کوٹھے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو [illegible] آہستہ آہستہ گرنے والی

منڈیر پہ ٹکا کر کے جھونے والا مچھر کا سپونس، دھیرے دھیرے سلگنے والے اپلے اور خود سکتیا کا رفتہ رفتہ بجھنے والا جسم سب کوڑے کے ایک ڈھیر میں بدلتے جا رہے تھے مگر وہ ان تمام چیزوں سے بیگانہ تھا۔ اس کی زندگی کے صبح شام اس کے سامنے پھیلی ہوئی پگڈنڈی پر تھے، بھٹکتے چلے جا رہے تھے۔

چاندنی راتوں کو تنہا بیٹھا ہوا دیکھ کر سمجھاتا، سکتیا اب وہ کبھی نہیں آئیگی۔ اب وہ کسی اور کی آغوش میں ہے، تیری پہنچ سے بہت دور۔ وہ مگر سمجھاتے سمجھاتے خود سسکیاں لے پڑتا۔ گرم اور ٹھنڈی ہوائیں اس کے بدن میں کچوکے دیتیں، موسم آتے اور چلے جاتے مگر سکتیا۔ رفتہ رفتہ بجھنے والا الاؤ کا ڈھیر اپنی جگہ پڑا رہتا اور ذرا سی آہٹ پا کر اونگھتے اونگھتے چونک پڑتا۔ راتوں کو پچھلے پہر کسان اپنے ہل لئے ہوئے، بیلوں کو ٹکٹکاتے، پگڈنڈی پر حسین نکہت بکھیرتے ہوئے گذر جاتے اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھندلکے میں تکنے لگتا۔

"کیا خبر وہ ان رسیلے گیتوں ہی کی چھاؤں میں چپکے سے چلی آئے اپنے سکتیا کے پاس"!

گاؤں کے لڑکے اسے چاچا کہا کرتے تھے، "سکتیا چاچا"۔ وہ کبھی کبھی اس کے گرد آن کر اکٹھے ہو جاتے، "سکتیا چاچا کوئی کہانی کہو، اچھی سی" اور کوئی بیچ میں بول پڑتا "سکتیا چاچا کیا دن میں کہانی کہنے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں"؟

سکتیا یک لخت چونک پڑتا اور نظریں پگڈنڈی پر جما دیتا جو درختوں کی گھنی چھاؤں میں پڑی ہانپتی رہتی تھی، ویران، خاموش اور وہ پھر پوچھتا، اس کے شانوں کو جھنجھوڑ کر، "بتاؤ نا سکتیا چاچا کیا دن میں کہانی کہنے سے مسافر سچ مچ راستہ بھول جاتے ہیں"؟ اور وہ اپنی تھکی ہوئی بجھی بجھی نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا، "ہاں بیٹا دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں، اپنے راستے سے بھٹک جاتے ہیں، دن میں کہانیاں نہیں کہا کرتے، جاؤ شام کو سنائیں گے"، اور پھر اسی طرح شام ہو جاتی۔

یاد آنے پر غیر مہذب گندے اور میلے بچوں کا ہجوم شور مچاتا ہوا پھر اس کے گرد اکٹھا ہو جاتا۔ ایک چلم اٹھا کر الٹ دیتا اور آگ کرید کر تمباکو جماتے ہوئے کہتا، "سکتیا چاچا ابھی نا شروع کرنا میں تمہارے لئے چلم بھر لوں"

سکتیا نرم نرم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر گردن ہلا دیتا۔ بچے اسکے گرد سکڑ کر بیٹھ جاتے اور وہ [illegible] آواز دیتا،

"کیا سناؤں"؟ اور وہ قہقہہ لگا کر جواب دیتا۔

"آپ بیتی"۔۔۔

اس کی نگاہیں [illegible] آسمان اور دھندلکے میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈی بہت گندی ہوتی ہیں۔ پھول کے چہرے پر چھپا تھا غیر مہذب اور [illegible] چہروں پر جنہوں نے غلامی، خدمت اور شفقت کو [illegible] کے لئے جو تھا ہی تحفہ نسل اور نسل آپ دینے کے لئے جس طرح انہوں نے سب کچھ میں پایا تھا۔ اس کی آنکھیں ان کے گندے چہروں پہ گڑ جاتیں۔ معصوم [illegible] مستقبل کی خوراک!

پھر اسے خاموش دیکھ کر جھنجھوڑتے، "سناؤ نا سکتیا چاچا اب تو اندھیرا ہو گیا" وہ اپنی ٹوٹی ہوئی سانسوں کو جوڑ کر اسی طرح اپنی زندگی کی طویل داستان کا کے انبار میں سے کرید کرید کر نکالتا اور آخری فقرہ پہ آن کر رک جاتا۔

"مگر وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی"!

کوئی بچہ بول اٹھتا، "مر گئی ہوگی سکتیا چاچا بیچاری"؟

"نہیں نہیں" سکتیا ایک کرب کے عالم میں چیختا۔

کوئی دوسرا بچہ بلا سوچے جواب دیتا، "بدصورت ہوگا سکتیا چاچا، وہ تو [illegible]"

اس کا ہاتھ فوراً اس کے چہرے پر جاتا، ایک موٹی سی ناک، بھدے موٹے ہونٹ، اندر کو دھنسی دھنسی آنکھیں، لمبوترا منہ، پھیلا ہوا دہانہ، بھدی داڑھی اور گالوں کی جھریوں میں سے گذرتا ہوا لرز کر [illegible]۔ ان کا منہ پھیلا رہ جاتا اور پتھرائی پتھرائی نگاہیں پگڈنڈی کے آخری نقطہ پر جم کر رہ جاتیں اس کی سانس اس کے سینہ میں الجھنے لگتی اور آنکھیں آنسوؤں کو چھپانے لگتیں۔

اس کی آخری امید پگڈنڈی اس کے سامنے اسی طرح پھیلی ہوئی تھی، خشک، سادہ، بل کھاتی ہوئی اور بچوں کا کہا ہوا فقرہ اس کے لئے بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا، بالکل بے معنی، بے درد و بے جان اور پھر زندگی کی اتنی طویل امید کو وہ نا سمجھ بچوں کے ایک فقرے پر ختم کر بھی کیسے دیتا؟

وہ مبہم آنکھیں بن کر افق کے اسی درمیانی راستہ کو گھورنے لگتا جو [illegible] کی آمد [illegible] زرد زرد پتوں کا ایک ڈھیر پگڈنڈی پر لگا دیتی [illegible] بے کفن پتوں کا ایک ڈھیر! اور راہگیروں کے پاؤں انہیں روندتے ہوئے گذرتے۔ درختوں کی ننگی شاخیں مایوس بانہوں کی طرح پھیلی رہ جاتیں یہاں تک کہ ان میں رفتہ رفتہ شگوفے پھوٹ آتے اور سکتیا بھی کائنات کے اس تسلسل سے اپنی زندگی کو مطابق کرنا چاہتا تھا!

جنگل کی راتیں بہت سی [illegible] اسے پھر ایک روشن ستارہ نظر آنے لگتی جس کی روشنی [illegible] پالی سکتی رہتی تھیں اور ابھی تک دم توڑنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ گاؤں کے لوگ اسے پاگل تصور کرنے لگے تھے [illegible] [illegible]

"... آگ بجھ گئی"؟
... نگاہیں سے سکھیا ان کی طرف دیکھا اور اس کی ... نظریں اسے ... معلوم ہوئیں،
"تم ... ہو، یا ... کیوں"؟
... کے ساتھ ... تھا،
"آگ کہاں بجھی"
"... تو ہے نہیں"؟
"اب آگ ہی آگ رہ گئی ہے [illegible] میں خواہ مخواہ کش لگتا"
"تیرا چھپر بھی کھسک گیا سکھیا [illegible] کا پھونس بکھر گیا"
"ابھی سایہ تو ہے [illegible] بہت ہے"
"تو بھی کیا ہے سکھیا [illegible] ٹوٹ گئی ٹھیک کر لینا"!
"ہاں اسے پھر نئے سرے سے بسانا ہوگا" اور اس کی نگاہیں تالاب کے کنارے کنارے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر جا پڑتیں۔
"سکھیا کتنا کوڑا جمع ہو گیا جھاڑو بھی نہیں دیتا تو"
"جھاڑو تو وہی آن کر دیگی"
"پگلا" وہ ہنس دیتا "وہ نہیں آئیگی"
سکھیا منہ پھیر کر بیٹھ جاتا اور پگڈنڈی کے مد و جزر میں اپنا سکون تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔
وہ دور تک بڑبڑاتا ہوا چلا جاتا، پگلا، حقہ ٹھنڈا پڑا ہے کہتا ہے آگ نہیں بجھی کہتا ہے اب آگ ہی آگ رہ گئی ہے، وہ آئیگی، پگلا!
پگڈنڈی کہیں سے شروع ہوتی ہے اور کہیں ختم ہوتی ہے مگر راستے میں سکھیا کا گھر تو پڑتا ہے جب ندی چڑھتی ہے تو کیا [illegible] کے کھیت [illegible] جاتے ہیں سکھیا [illegible] تسلی دے لیتا تھا مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ جب ندی بہت چڑھ جاتی ہے تو کھیتوں کے ساتھ گاؤں بھی ڈوب جاتے ہیں، ندی آگے بہہ جاتی ہے اور لاشیں مرنے کے [illegible] پیچھے چھوڑ جاتی ہے!۔
سکھیا کی دھندلی آنکھیں افق پر جم کر رہ گئیں۔ دفعتاً سلگنے والا اُپلا ڈھیر ہو گیا [illegible] جلا اُپلا ٹوٹتا ہوا چھپر [illegible] ... سکھیا، سکھیا، سکھیا!!
پگڈنڈی گھومتی [illegible] دروازے کے سامنے آکر ٹھہر جاتی ہے اور آواز دیتی ہے سکھیا [illegible] حیرانی سے منہ پھاڑے [illegible] دیکھتی رہ جاتی ہے [illegible] "کیا وہ آگئی"!
پگڈنڈی [illegible] اور کہیں دور گھنے نیلے آسمان میں جذب ہو جاتی ہے!

اختر اللہ ایمان

غزل

ایفائے وعدہ تم کسی عنوان نہ کر سکے
وہ بات کیوں کہے جسے انساں نہ کر سکے

قاتل کو شاد کام رگِ جاں نہ کر سکے
اس زندگی پہ تف کہ جو قرباں نہ کر سکے

کچھ اس طرح وہ دل کی تباہی پہ ہنس دیے
ہم بھی یقین حال پریشاں نہ کر سکے

اس کی سیاہ بختی کے قربان جائیے
جگنو بھی جس کے گھر میں چراغاں نہ کر سکے

وہ کام کر گئی تری اک جنبش نگاہ
برسوں میں جس کو گردش دوراں نہ کر سکے

اس سے وحشت اچھا کہ آباد ہو سکا
اس گھر کو کیا کریں جسے ویراں نہ کر سکے

ڈر تھا کہ روشنی میں نہ آجائے ظلم حسن
وہ یوں سر مزار چراغاں نہ کر سکے

دل چاہتا ہے درد اور اک زندگی کا درد
یعنی کہ جس کا موت بھی درماں نہ کر سکے

اس ماہتاب حسن کو اظہار کیا کہوں
جو میری کالی راتوں کو تاباں نہ کر سکے

اظہار رامپوری

چراغ کے نیچے

اُس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔

کمرے کی تصویروں میں سے سب سے زیادہ دلکش وہ تصویر تھی جو اس کے سامنے دیوار پر آویزاں تھی اس میں ایک نوجوان ہندو دوشیزہ جس کو مصور کی رنگ آمیزیوں نے قیامت کی خوبصورت بنا دیا تھا، ایک مندر میں دیوتا کے سامنے آرتی کر رہی تھی۔ دیوتا اتنا بدصورت تھا جتنی وہ خوبصورت تھی۔ وہ جواہرات سے اتنا زیادہ گھناؤنا ہو گیا تھا، جتنی رنگوں کی آمیزش سے وہ زیادہ جاذب ہو گئی تھی۔ اجنتائی شعاعوں کی زرد زرد روشنی اور اگر کے نیلے نیلے دھوئیں میں مندر کی سیج کے متبرک دھندلکے کے اندر ڈوبا ہوا تھا۔ اس نیلی نیلی مدھم فضا پر لڑکی کی نیلی نیلی طول آنکھوں نے تقدیس کی شعاعوں سے جادو سا کر دیا تھا۔ پانس پیکی کے روشن دیے اس کے خوبصورت زرد چہرے کی زردی اور خوبصورتی کو زیادہ واضح کر رہے تھے۔

اُس کی حساس نظریں اس تصویر کی لطافتوں میں گم ہو گئی تھیں۔ تھکا ہوا دماغ راحت کا متلاشی تھا!

اُس کی عمر اتنی زیادہ تو نہ تھی۔ اور اس کو خونی دباؤ کا موذی عارضہ بھی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی احتیاطاً اُس نے بڑے بڑے لیڈروں کی عادت کے مطابق بمبئی پہنچنے سے پہلے استقبالیہ کمیٹی کے سیکرٹری کو لکھ دیا تھا کہ اس کی آمد پر کسی غیر معمولی جلوس کا انتظام نہ کیا جائے۔ اور اس کی رہائش کا انتظام کسی ایسے مقام پر ہو جہاں سکون اور راحت نصیب ہو سکے۔

جوہو — بمبئی کے قیامت خیز ہنگاموں سے دُور فطرت کی سکون سے آغوش میں — وہ جوہو کے ایک شاندار بنگلے کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا، اُس کی تھکاوٹیں تصویر کی لطافتوں میں گم ہو رہی تھیں!

تمام دن ملنے والے اُس کو پریشان کرتے رہے تھے۔ اور اگر اس کو خونی دباؤ کے آغاز کا اندیشہ ہوتا تو اب بھی اس کے پاس زائرین بیٹھے ہوتے۔ اُس نے عورتوں کے ایک وفد سے ملاقات کرنے کے بعد ملازم کو کہہ دیا تھا کہ اب وہ کسی سے نہیں مل سکتا۔ وہ عورتوں کے اُس وفد سے بھی ملنے سے انکار کر دیتا اگر وہ عورتوں کا وفد نہ ہوتا — گری ہوئی بہنوں کا وفد۔ انسانی عورتوں کو گری ہوئی بہنیں کہتا تھا۔

ملاقات کرنے والوں میں سے گری ہوئی بہنوں کے وفد نے اُس پر زیادہ اثر کیا تھا۔ [illegible] نے اُس کو سامنے کی

دیوار پر تصویر کی طرف متوجہ کیا تھا۔ لڑکی کے چہرے کی خوبصورتی کا احساس اُن افتادہ بہنوں کے فق رنگ زرد چہروں سے مناسبت رکھتی تھی۔ وہ جیسے [illegible] اور دیکھنا چاہتا تھا۔

کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر اُس کی صدارتی تقریر ہندوستان کے مسائل کے لئے کانگریس کا صدر ہونے کی حیثیت سے موجودہ مسائل پر اس نے مرتب کر لیا تھا۔ افتادہ بہنوں کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد اُس کو تقریر یا پروگرام میں کچھ کمی سی محسوس ہونے لگی۔ معصیت زدہ کمزور صنف کے لئے ہمدردی کا یہ خیال گھڑی کی ٹک ٹک کے وزن کے نیچے نیلاں لطیف ہو گیا۔ سامنے کی دیوار پر تصویر کی فنی نزاکتوں نے اس خیال کو ایک شدید جذبے میں تبدیل کر دیا۔ اور اس کے سامنے ہندوستان کی مظلوم عورتوں کا تخیل اس قدر وسیع ہو گیا کہ اس کو اپنی تقریر یا پروگرام پر دوسری نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی تقریر میں عورتوں کے موضوع کو جگہ دے دی اور کانگریس کے پروگرام میں نسوانی مصیبتوں کے نام سے ایک اور دفعہ شامل کر دی۔ چندے کی فہرست میں چندے کی سب سے زیادہ رقم دس روپے تھی۔ اس نے ... دس روپے کے نیچے سرخ پنسل سے لکیر کھینچ دی۔

کلاک نے دس بجا دیے۔

باہر چاندنی تھی۔ چاندنی میں اونچے اونچے ناریل کے درخت تھے۔ درختوں میں بیضوی شکل کے بڑے بڑے ناریل تھے۔ سمندر تھا۔ سمندر میں موسیقی تھی۔ موسیقی میں راحت تھی۔

وہ دریچے کے پاس کھڑا تھا۔

گویا افتادہ بہنیں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ زرد چہرے، بال بکھرے، لباس ماتمیں، آنکھوں میں آنسو۔ سمندر کی موجیں بہتی ہوئی [illegible] کی سیڑھیوں سے اُن کے پاؤں چومنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اُس کے پیچھے دروازہ کھلا۔ ملازم اندر داخل ہوا۔

"آپ سے ایک عورت ملنا چاہتی ہے۔"

"عورت!"

"جی۔"

"میں نے تجھے کہا تو تھا کہ اب کسی سے نہیں [illegible]"

"میں نے اُس کو بہت سمجھایا [illegible]"

[illegible]

[illegible] ایسا کرنے
[illegible] ہو چکی ہیں لے گیا۔ اگر کوئی سادہ سی عورت ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ اُن عورتوں کی طرح سادہ جو دن کے وقت یہاں آئی تھیں۔ عجیب پاؤڈر، سرخی، سگریٹ اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ وہ مجھ سے ملنا گوارا کریں گے۔ وہ تو بلا وجہ نفرت کرتے ہیں۔ اور پھر بڑے بڑے لیڈروں کی ایک ایک حرکت لوگوں کی نظروں میں رہتی ہے۔ آج کل کے زمانے میں جبکہ ہوا بولنا جانتی ہے، دیواروں نے بھی اخباروں کی نمائندگی اختیار کر لی ہے۔ اگر کل کے اخباروں میں سب سے بڑی خبر یہ ہوئی ——— بمبئی ۲۰ نومبر ——— سیٹھ رؤف کانگریس کے صدر کو کل آدھی رات کے وقت ایک خوبصورت عورت کے ساتھ ——— "

لیڈر کو ملازم کا بہت لمبی تقریر پسند نہ آئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اگر اُس کو روکا نہ گیا تو اس کی تقریر بہت لمبی اور اس کی زبان زیادہ دراز ہو جائیگی۔

"بس تم شرمندہ کرتے ہو۔ اُس عورت سے کہہ دو۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے اُس کو اس وقت ہرگز ——— "

دروازہ کھلا ایک عورت اندر آ کر دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ عمر سے اُدھیڑ اور کسی قدر فربہ بناوٹی آرائشوں سے جوان اور بہت خوبصورت لیڈر کی آنکھیں اُس کے چہرے پر پتھرا گئیں۔ وہ پہاڑ سے لڑک کر نیچے گرنے والے برف کے تودے کی طرح سفید ہو گیا۔ نسی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔

عورت نے تمکنت کے انداز میں کہا۔ "ملازم! تم جاؤ۔"

دروازے پر پہنچتے پہنچتے نسی کی حیرت شکوک میں تبدیل ہو گئی۔ نسی کے چلے جانے کے بعد لیڈر کے پتھرائے ہوئے ہونٹوں میں جنبش آئی۔

"عزیزہ!"

"شکریہ! آپ نے مجھے پہچان لیا۔ [illegible] سال کی لمبی جدائی کے بعد"

"تم کہاں رہیں کیا کرتی رہیں؟"

"آپ کو میری پرائیویٹ زندگی کے متعلق سوالات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"بہت بدل گئی ہو عزیزہ!"

"ہاں میرا نام عزیزہ نہیں۔ اب میں مسز تارکا ہوں۔"

[illegible] کیا ہے جس نے کسی ہندو سے شادی کر لی [illegible]

[illegible] میں نے بھی

شادی کی ہے۔"

"پھر تم مسز تارکا کیوں کر بن گئیں؟"

"مجھے اپنے پرانے نام سے نفرت ہو گئی تھی ——— عزیزہ ——— چھوٹا سا معصوم سا نام جس سے کنوارپن کی بو آتی ہے۔ جس میں رعنائی سموئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رعنائی، کنوارپن، معصومیت اور چھوٹی عمر۔ جو عورت کو مرد کے پیروں میں روندے جانے کے لئے اکساتے ہیں۔ اسی قسم کے سنگدل پیروں کی ٹھوکریں کھا کھا کر جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا کہ شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ عورت کے درمیان سوسائٹی کی بنائی ہوئی کاغذ کی ایک نازک سی دیوار ہے، جس میں میں نے جذبات کی وارفتگی میں جگہ جگہ شگاف کر دئے ہیں۔ دیوانہ وار تلاش کے بعد بھی میرا ہم سفر مجھے نہ مل سکا میں نے غصے کی ایک بے پناہ جنبش سے کاغذ کی اُس دیوار کو مسمار کر دیا۔ دوسری دُنیا میں میں نے اپنے آپ کو زیادہ آزاد، زیادہ تجربہ کار اور زیادہ طاقتور پایا۔ دولت کی گھنگھور گھٹاؤں میں مجھے مذہب اور قانون کھلونے معلوم ہونے لگے میں نے اپنا نام بدل کر مذہب اور قانون کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی ہے۔"

لیڈر کو معلوم ہو گیا کہ وہ اُن عورتوں میں سے نہیں جو اُس کے پاس دن کے وقت وفد کی صورت میں آئی تھیں۔ اُس کے لفظوں میں طاقت تھی۔ اُس کی گفتگو میں انتقام تھا۔ رات کے اِن مضمحل لمحوں میں اُس کا دماغ استدلال کی ضربیں برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

"عزیزہ! ——— "

"عزیزہ نہیں۔ مسز تارکا۔"

"مسز تارکا! مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں تم کو آزاد، تجربہ کار، طاقتور اور دولتمند دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ مجھے افسوس ہے میں تمہاری دلچسپ گفتگو سے محروم رہوں گا۔ رات بہت گذر چکی ہے اور میں ——— "

وہ بے پروا انداز میں آرام کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔

"عزیزی اے مسز تارکا میں مجبور ہوں میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

"زیادہ گذری ہوئی رات میں، تھک کر چُور چُور دماغ پر ہتھوڑے کی چوٹیں زیادہ کارگر ہوتی ہیں۔"

لیڈر سمجھ نہ سکا وہ سمجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی اُس نے دو تین لمحے اُس کو سمجھنے میں صرف کر دئے۔ اور جب وہ پھر بھی نہ سمجھ سکا، تو اُسے افسوس ہوا کہ اُس نے نیند کے بہت قیمتی لمحے ضائع کر دئے۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو مسز تارکا؟"

"سید رؤف! میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا یہ سچ ہے آپ عصمت فروشی کے خلاف ایک مستقل تحریک شروع کرنے والے ہیں اور آپ کے اجلاس میں پبلک کو اپنے ارادے سے مطلع کریں گے؟"

"ایک رہنما کی حیثیت سے یہ میرا اخلاقی فرض ہے مسز نارنگ!"

"رہنما!"

طنز کے زہریلے اثرات کو چھپا لینے کی کوشش میں لیڈر کی نظریں ملال کے ایک احساس کے ساتھ عزیزہ کے چھوٹے پاؤں کی طرف سفر کرتیں اور اُس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے پاس گڑھا کھود کر زمین میں دفن ہو گئیں۔ خاموشی کے اس جانکن وقفے نے حالات کی نزاکت کو کسی قدر ختم کر دیا۔

"تم اس تحریک کو پسند نہیں کرتیں؟ عزیزہ!"

"مجھ کو افتادہ بہنوں سے بہت ہمدردی ہے۔"

"اس لئے اس تحریک میں تم میرے ساتھ ہو؟"

"اس لئے میں اس تحریک کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہوں۔"

"لیکن — لیکن —"

"میں عورتوں کے معاملات میں مرد کے دخل کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟"

"مرد کے نزدیک عورت کی نجات اُس کی غلامی میں ہے۔"

"تم شادی کے رشتے کو غلامی کہتی ہو عزیزہ؟"

"ایسی نظروں سے جو دلوں کے آر پار ہو جایا کرتی ہیں عزیزہ نے لیڈر کی طرف دیکھا۔

"— یہ تم بول رہے ہو؟ تم؟ سید رؤف!"

سید رؤف کا سر جھک گیا۔

پھر جب دوسری دفعہ اُس کو آنکھیں اٹھانے کی جرأت ہوئی تو اس کی نظریں کلاک کی طرف چلی گئیں۔

"بہت رات گذر چکی ہے عزیزہ!"

"عزیزہ! عزیزہ! عزیزہ! اُف مجھے کتنی نفرت ہے اس نام سے۔ میں کس طرح بتاؤں کہ میرا نام عزیزہ نہیں میں مسز نارنگ ہوں۔ جب میں تم کو رؤف کہتی ہوں۔ رؤ علی نہیں کہتی۔ پھر تم مجھے عزیزہ کیوں کہتے ہو۔ مسز نارنگ کیوں نہیں کہتے۔ ۱۰ سال پہلے تم رؤف تھے۔ میں عزیزہ تھی۔ اب تم سید رؤف ہو اور میں مسز نارنگ ہوں۔"

لیڈر نے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے اپنے انگوٹھے کے ناخن کو نوچنا شروع کیا۔ نظریں ایسی جھکی تھیں جیسے وہ ان سے کچھ چھپا رہا ہو اور پھر وہ بہت آہستہ آہستہ مسز نارنگ کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی ایسی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں گویا وہ کسی سوال کا جواب چاہ رہی تھی۔

"تم جا سکتی ہو مسز نارنگ!"

وہ آرام کرسی سے اُٹھ کر چلی گئی۔

"ہاں میں جا رہی ہوں —"

آنے والی راحت کے احساس کو دھکیلنے کے لئے وہ کھڑکی سے دروازے کی طرف چلا گیا۔ اُس نے کمرے کے سب سے بڑے برقی بلب کو بجھا دیا۔ اب کمرے کے اندر ایک کونے میں صرف ایک ٹیبل لیمپ روشنی دے رہا تھا۔ سامنے کی دیوار پر وہ ہندو دوشیزہ کی تصویر پھیکے پھیکے اندھیرے میں ڈوب گئی۔ وہ صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کے پیچھے کھڑکی کے پردے ہوا میں کسی دیوانے آدمی کے قہقہے کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔

"آپ کو اپنی نیند کی فکر دامنگیر ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دنیا میں ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک رات کی نیند جھلکتی بھی نہیں؟"

"میں جانتا ہوں۔"

"کون؟"

"میں"

"اور کوئی نہیں؟"

لیڈر ایک غیر معلوم جذبے کے ساتھ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور جذبات سے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے عزیزہ کی طرف جانے لگا۔ عزیزہ اُس سے دُور رہنے کے لئے پیچھے کی طرف ہٹنے لگی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں پہنچ کر وہ میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ لیڈر کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اس کے اوپر جھک گیا۔

"کیا کہتی ہو؟"

"میں کہتی ہوں نیند سے محروم رہنے والے تم ہی نہیں ہو لیکن میں بھی۔"

"کون؟ — تم؟ — سچ کہتی ہو؟ — تم آج یہاں کیوں آ گئی ہو عزیزہ! — بھرے ہوئے زخموں کو ہرا کرنے سے کیا فائدہ؟ — میں نے تم کو بھلانے کی بے حد کوشش کی — ۱۰ سال تک — اس رات کے اس لمحے تک میں کامیاب تھا — اور کامیاب رہنا چاہتا تھا — عزیزہ! تم آج یہاں کیوں آ گئی ہو — عزیزہ! عزیزہ! —"

عزیزہ کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔

"سید رؤف! پھر اس بند کرو زبان کو تالا ہی لگا دو مجھ سے دور ہٹ جاؤ۔ میں کانپ رہی ہوں۔ میرا دایاں ہاتھ میرے قابو سے باہر ہو چکا ہے۔ لیکن زہریلی بحث ہوں۔"

انہوں نے کرسی کے بازوؤں سے ہاتھ اُٹھا لئے اور اپنے کسیلے نینوں کو موہن کی گھورتی نظروں سے بچا کر ـــ عزیزہ نے اُسی غصّے کے انداز میں کہا۔

"۲۰ سال تک ـــ ۲۰ سال کے طویل عرصے تک ـــ ایک ایک لمحہ، ہر لمحہ ـــ صبح سے شام ـــ شام سے صبح ـــ میں تم سے نفرت کرتی رہی ہوں۔ نفرت کرتی ہوں، اور نفرت کرتی رہوں گی ـــ ۲۰ سال تک ـــ ۲۰ سال کے طویل عرصے تک ـــ ایک ایک لمحہ ہر ہر لحظہ ـــ صبح سے شام ـــ شام سے صبح ـــ تمہاری یاد میرے پہلو میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہی ہے۔ کھٹکتی ہے۔ اور کھٹکتی رہے گی ـــ موہن! تو اس دنیا کی بدترین ہستی ہے ـــ تیرا ہر رونگٹا دوزخ کی آگ کا انگارہ ہے ـــ تیری شہرت ـــ تیری عظمت ـــ تیری ہر دل عزیزی ـــ دُکھے ہوئے دلوں کے بے شمار ناسور ہیں ـــ آج تو نے میری سوئی ہوئی آگ کو پھر جگا دیا ـــ آج تو میرے جذبات کے ساتھ پھر کھیلنا چاہتا ہے۔ اُنہیں الفاظ کے ساتھ، اُنہیں جذبات کے ساتھ، اُسی شدت سے، اُسی انداز سے ـــ"

ـــ وہ آرام کرسی پر آ بیٹھا۔

خاموشی، خاموشی۔ اور پھر ـــ

"میں غلط فہمی کے لئے شرمندہ ہوں مسز تارکا، مجھے تمہاری گالیوں سے راحت ہوتی ہے۔"

وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اس طرح شاید اس کے غصے کی شدت میں کمی واقع ہو گئی۔

"میں نے کہا تھا تمہیں رات کو نیند نہیں آئے گی کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر ہونے کی حیثیت سے تمہارے اوپر تمہاری قوم کی اتنی ذمہ داریاں ہیں کہ ان کا بوجھ تم کو سونے نہیں دیتا۔ اور میں رات کو نیند سے محروم رہوں گی کیونکہ کانگریس کی آئندہ پالیسی جس کی بنا پر تم کل کے اجلاس میں رکھنے والے ہو، میرے مستقبل کے لئے موت کا پیغام ہے۔"

"مسز تارکا! میری کانگریس کے پروگرام میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے کسی جماعت کے کسی فرد کو نقصان پہنچے۔"

"انہوں نے میرے خلاف بغاوت کی ہے۔"

"کس نے؟"

"جن کو تم گری ہوئی سمجھتے ہو۔"

"گری ہوئی نہیں۔"

"وہ [illegible] میری زندگی ہیں۔ اگر تم ان کو مجھ سے چھین لو گے

تو میں تباہ ہو جاؤں گی۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"وہ بازار میں کھڑی ہو کر اپنی عصمت بیچتی ہیں۔ اور میں اُن کے پیچھے کھڑی ہو کر اُن کو بیچتی ہوں۔"

لیڈر کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اُس کی گفتگو سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ ایسی ہی عورتوں میں سے کوئی ہو سکتی ہے۔

"تم عصمت فروشی کی تجارت کرتی ہو؟"

"مسز تارکاز بال روم، مسز تارکاز کیبارے، مسز تارکاز ڈانسنگ ہال، مسز تارکاز بیوٹی ٹریٹمنٹ، مسز تارکاز آرکسٹرا، مسز تارکاز میوزک کلاسز، مسز تارکاز مساج انسٹی ٹیوشن، ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں میرے مرکز کھلے ہوئے ہیں۔ میں نے ہندوستانی حسن فروشی کو مہذب مغربی انداز پر تنظیم دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور اب یہ ذلیل پیشہ ذلیل پستیوں سے نکل کر معزز سطح پر آ گیا ہے۔ میں اپنی ملازموں کو اتنی ہی تنخواہ دیتی ہوں جتنی کوئی یورپین سٹینو ٹائپسٹ کسی آفس سے لیتی ہو گی اور جتنی ہمارے گریجوایٹ کلرکوں کو ریلوے کے دفتروں سے ملتی ہے۔ یعنی ۵۰ روپے سے لے کر ۱۵۰ روپے تک۔"

لیڈر کے لئے یہ باتیں حیرت انگیز تھیں۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر سوئچ کے پاس گیا، اور کمرے کا سب سے بڑا مرکزی بلب روشن کر دیا۔ کمرے کے وہ کونے جن میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اُجالے میں آ گئے۔ عزیزہ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں بیٹھی تھی۔ ٹیبل لیمپ کا شیڈ ٹیبل لیمپ کی روشنی کو یکجا کر کے عزیزہ کے چہرے پر پھینک رہا تھا جس طرح سامنے کی دیوار پر پانس کے مصور اپنی فنو ہندو دوشیزہ کے چہرے پر بکھیر رہے تھے۔ لیڈر نے ایک لمحہ دریچہ میں سے باہر دیکھا۔ ہلکی نیلی چاندنی گہرے نیلے سمندر سے کھیل رہی تھی۔ ہلکی نیلی چاندنی اور گہرا نیلا سمندر! وہ پلٹ کر دریچے کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ ٹیبل لیمپ کے شیڈ نے ٹیبل لیمپ کو سرچ لائٹ بنا دیا۔ سرچ لائٹ عزیزہ کے کے ایک ایک کونے میں پہنچ گئی۔ دماغ کے پہاڑوں میں۔ دل کے غاروں میں۔ جگر کی وادیوں میں۔ اُسے یاد ہے پہلے وہاں ایک سرسبز وسیع میدان تھا

"مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہے مسز تارکا۔"

"کیا میں امید کر سکتی ہوں کہ آپ کانگریس کے ہونے والے اجلاس میں عورتوں کے متعلق کوئی ریزولیوشن پیش نہیں کریں گے؟"

"کانگریس کے ہونے والے اجلاس میں عورتوں کے متعلق ریزولیوشن پاس ہو گا۔"

"آپ کو مجھ سے اتنی ہمدردی ہے کہ آپ مجھ کو تباہ کرنے پر آمادہ

"[illegible]؟"

"ہاں نادار غریبوں کو طاقت اور دولت۔"

"مگر گری ہوئی بہنوں میں سے ایک۔"

"سیٹھ صاحب! تم کو میری شخصیت کے متعلق جاننے کی فکر ہی نہیں تمہارے اور میرے زندگی کے نظریوں میں فرق ہے۔ جس فرق کی بنا پر تم مجھے گری ہوئی سمجھتے ہو اسی فرق کی بنا پر میں تم کو گرا ہوا کہہ سکتی ہوں۔ تمہاری سوسائٹی کے فیصلے عجیب ہیں۔ اگر عورت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو تو وہ اس کو گری ہوئی کہتی ہے۔ اور اگر عورت اپنے آپ کو مردوں کے پیروں کی [illegible] تو وہ اس کو سر بلند کہتی ہے۔ تمہاری سوسائٹی کی یہ کھوکھلی بنیادیں ایک دن تمام عمارت کو منہدم کر دیں گی ۔۔۔"

تاکہ اس کے غصے میں اضافہ ہو جائے وہ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

"اُف! ۔۔۔۔۔ تمہاری بھدی شکل ۔۔۔۔۔۔ مجھ کو تم سے ۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔۔ میں چاہتی ہوں ۔۔۔۔۔۔ اگر میرے پاس تلوار ہوتا تو میں تم کو شوٹ کر دیتی ۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔ اور برسہا برس کی انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھ جاتی ۔۔۔"

وہ کرسی کی پیٹھ کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم جیسی ذلیل ہستی کے پاس زیادہ دیر تک ٹھہرنا میں اپنی ہتک سمجھتی ہوں۔ میں جاتی ہوں۔"

وہ دروازے کے پاس پہنچ کر ٹھہر گئی۔ اور پلٹ کر کہنے لگی۔

"لیکن جانے سے پہلے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھو۔"

لیڈر اپنے آپ کو فارغ سمجھ کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں پوچھنا چاہتی ہوں تم گری ہوئی بہنوں کو اٹھانے کے لئے کیا طریقہ استعمال کرو گے؟"

"میں پبلک میں اس کے خلاف پراپیگنڈہ کر کے اپنی کانگریسی منسٹروں کے نام احکام جاری کروں گا کہ وہ تمام ایسے ادارے بند کر دیں جو ہمارے اخلاق کے لئے مضر ہیں۔"

"میری تحریک لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل کرے گی۔"

"تمہاری تحریک؟"

"میں کل کو تمہاری تحریک کے خلاف ایک تحریک قائم کرنے والی ہوں۔"

"لیکن ۔۔۔"

"اور کامیابی کا سہرا ہم دونوں میں سے کس کے سر ہوگا میں جانتی ہوں۔"

"[illegible] سمجھے؟"

"[illegible]"

"کیوں؟"

"تمہاری تحریک لوگوں [illegible] تحریک کے لئے [illegible]"

"کیا ۔۔۔ وہ ۔۔۔ اس تحریک کے لئے کافی نہیں ہوں گے؟"

"۔۔۔ وہ ۔۔۔ ہے۔"

"چندے کی فہرست میں سب سے زیادہ رقم ۔۔۔ وہ ۔۔۔ ہے جس نے وہ رقم اس تحریک کے لئے وقف کر دی ہے۔"

وہ کمرے میں [illegible] گئی۔ آہستہ آہستہ کمرے کے درمیان میں آ گئی۔

"کیا میں جان سکتی ہوں کانگریس کو ۔۔۔۔ وہ رقم دینے والا کون؟"

"کیا ضرورت ہے؟"

"میرا خیال ہے میں اس کو جانتی ہوں۔ اس نے آج صبح ۔۔۔ سو روپے کے چیک کا ذکر کیا تھا۔"

وہ اٹھا میز کے پاس گیا۔ دراز کھولی۔ فہرست نکالی۔ اور پڑھنے لگا۔

"حکیم جی لقمان جی اینڈ کو۔"

"حکیم جی لقمان جی اینڈ کو کا نوجوان پسر پارٹنر ابراہیم جی!"

"وہ آج دن کو مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

"وہ اب بھی نیچے کار میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ مجھے اپنی کار میں یہاں لایا تھا۔ وہ چھوٹا بیکار اور کمینہ دغاباز!"

"کیوں گالیاں دیتی ہو؟"

"وہ میرے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔ اس نے مجھے اپنی ایک پوری بلڈنگ رہنے کے لئے دے رکھی ہے۔ وہ میری وجہ سے تمام شہر میں بدنام ہے۔ وہ مجھ پر ہزار جان سے نثار ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"نوجوان خون نے اسے اندھا کر دیا ہوگا۔"

"نہیں وہ اسمبلی میں ایک سیٹ کے لئے مرتا ہے۔"

"۔۔۔ لیکن اسمبلی سے تمہارا کیا تعلق؟"

"دراصل وہ میرے رسوخ اور میری دولت سے [illegible] رسوخ اور میری دولت اس کے لئے ووٹ پیدا کر سکتے ہیں [illegible] ذہانت کا بھی [illegible] ہے۔ میں بمبئی کے سب سے زیادہ امیر انسانوں [illegible] میرے پاس بمبئی میں [illegible] بلڈنگیں ہیں [illegible]

[illegible] کی اُمدنی [illegible] ہو گئی ہیں اس سے پہلے [illegible]

لیڈر کے ہونٹوں پر بہت دیر کے بعد معمولی سا تبسم آیا۔
"تم یہ بتانا چاہتی ہو کہ اس نے کانگریس کو ... روپے کی گرانقدر رقم اس لئے نہیں دی کہ وہ قوم کا سچا ہمدرد اور خیرخواہ ہے بلکہ اس لئے کہ ایسا کرنے سے وہ آئندہ الیکشن میں کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلی کے لئے امیدوار کھڑا ہونے کا خواہشمند ہے۔ اور اگر کانگریس نے اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہ کی، تو مت سمجھو کہ اس نے کانگریس کو ... روپے کا چیک دیا ہے سو روپے نہیں دئے۔ میں اس کے پروگرام سے واقف ہوں۔ وہ اس چیک کو منسوخ کر کے یہی رقم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہونے کے لئے مسلم لیگ کو ادا کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے!"

"ہوں!"

"بہرکیف میں خوش ہوں کہ تمہاری تحریک میرے رحم پر ہے تمہارے چندے کا سرچشمہ میرے قبضے میں ہے۔ تمہاری شکست میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ میں آنکھ کے ایک اشارے سے ... روپے کا وہ چیک منسوخ کرا سکتی ہوں!"

"پھر تم ایک کمزور کردار کے آدمی سے اتنی دلچسپی کیوں رکھتی ہو؟"
"کیونکہ میں ایک طاقتور شخصیت کی عورت ہوں۔ اور ہر اُس انسان کو پسند کرتی ہوں جو میرے پاؤں کی ٹھوکر کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے میرے لئے راستہ چھوڑ دے۔"

"اگر حکیم جی نعمان جی اینڈ کو کے نوجوان پروپرائٹر کو معلوم ہو جائے کہ تم اُس کے متعلق اتنی بُری رائے رکھتی ہو تو کیا پھر بھی وہ تمہارے اشاروں پر رقص کیا کرتا رہے گا؟"
باہر سے آواز آئی۔
"یقیناً!"

دروازہ کھلا۔ حکیم جی نعمان جی اینڈ کو کا نوجوان پروپرائٹر اندر آ گیا۔ وہ ایک سیاہ رنگ کے سوٹ میں تھا۔ اُس کی حرکتوں میں ایکٹروں کا سا انداز تھا۔

[illegible] مسز تارکا ٹیبل لیمپ کی روشنی میں میز کے پاس [illegible]

[illegible] کانگریس کو ... روپے کی گرانقدر رقم [illegible] ہے اور جب تک آپ کو [illegible]

آپ کے متعلق ہمارے [illegible] کامیابی حاصل نہ ہو جائے میں کانگریس کو اس سے بڑی بڑی رقمیں دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ مسز تارکا جیسی جھوٹی عورتیں [illegible] باز ہوتی ہیں!"

مسز تارکا کی نظریں نیچی ہو گئیں۔
لیڈر کے منہ سے ایک لمحہ تک ایک لفظ نہ نکلا۔
"معلوم ہوتا ہے کہ آپ دیر سے یہاں ہیں۔" آخر لیڈر نے کہا۔ "آپ اندر کیوں نہ آ گئے مسٹر ابراہیم جی!"
"میں برآمدے میں آپ کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُس مکار عورت کی باتیں۔"
"مسز تارکا نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اُن کو اپنی کار میں یہاں لائے ہیں!" لیڈر نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔
"میرا خیال تھا کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔" وہ بیٹھنے کی بجائے کرسی کی پیٹھ پکڑ کر کھڑا رہا۔
"صرف خیال؟"
"صرف خیال۔ جذبہ نہیں۔ خیال ایک کھلونا ہے جو ہمارے دماغ میں ہمارے ہاتھوں سے بنتا ہے۔ وہ ہماری اپنی آفرینش ہے ہم کو اُس پر پورا اختیار ہوتا ہے۔ ہم جب تک چاہتے ہیں اُس کھلونے کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اور جب اُس سے سیر ہو جاتے ہیں تو اُس کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ اور جذبہ فطرت کا ایک تقاضا ہے۔ وہ کبھی کبھی زلزلے کی طرح آتا ہے اور ہمارے جسمانی قوتوں کی تمام عمارتوں کو بنیادوں سے ہلا کر اُکھاڑ پھینکتا ہے۔ وہ ہماری خودداری کے شیرازے کو اس قدر نقصان پہنچاتا ہے کہ ہم اپنے محبوب کے پاؤں کی ٹھوکر کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے اس کیلئے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔"
لیڈر نے فتح کے ایک مبہم سے احساس کے ساتھ مسز تارکا کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی کو میز پر رکھ کر اپنا سر ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے بے پروائی سے بیٹھی تھی۔ اُس نے لیڈر کی نظروں کا جواب دینے کی پروا نہیں کی۔
"اور اب آپ کا کیا خیال ہے؟ مسٹر ابراہیم۔"
"اب میں سمجھ گیا ہوں کہ مسز تارکا ایک بازاری عورت ہے۔ صرف ایک بازاری عورت!"
"مسز تارکا کے اُن الزامات کے متعلق جو انہوں نے تمہارے خلاف قائم کئے ہیں آپ کیا کہتے ہیں؟"
"مسز تارکا نے میرے متعلق حقیقت بیان کی ہے۔ مجھے دو قسم کی زندگیاں بہت مرغوب ہیں۔ محبت کی زندگی اور سیاست کی زندگی۔ ہمیشہ

محبت کی دنیا [illegible] سیاست کی دنیا [illegible] کی
طرح بھی قربانی کرنی ہے۔ ایک محبت تسکین نہیں دیتی تو دوسری [illegible]
ہے۔ ایک [illegible] پسند نہیں آتا تو دوسرا موجود ہوتا ہے۔ یعنی محبت اور
سیاست ہیں ایک چیز [illegible] ہے۔ محبت اور سیاست میں میرے مخصوص
انفرادی نظریات کو ایک شکست مذہب اور سوسائٹی کی قید سے
مفرور میں پناہ مل سکتی ہے۔ میں شہرت کا دلدادہ ہوں۔ دولت سے اسمبلی
اور اسمبلی سے شہرت۔ بیسویں صدی کی تاریخ میں سب سے زیادہ اُبھرے
ہوئے نقوش ہیں۔ میں قدموں کے انہیں نشانوں پر چلنا چاہتا ہوں میں نے
کانگریس کو . . . . روپے اس لئے دئے ہیں کہ میں اس کے ٹکٹ پر اسمبلی
تک پہنچ سکوں۔ اسمبلی میں پہنچ کر شہرت صرف چند قدم آگے رہ جاتی ہے۔ کسی نامور
پھر شہرت دس تقریریں۔ وہ بھی تقریر کے مطلب سے لکھوا کر اسمبلی کی
میز پر پلیٹ کر دینا کافی ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ اگر کانگریس اس
معاملے میں میری مدد نہ کرتی، تو میں یہی چیک منسوخ کر کے مسلم لیگ کو
دے دیتا۔ لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میری منزل کے راستے میں سب سے
بڑی رکاوٹ مسز تارکا ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ انڈین نیشنل کانگریس کا
پریذیڈنٹ اخلاقی وجوہات کی بنا پر مسز تارکا کو کچل ڈالنے کا ارادہ کر کے
میرے خلاف ہونے والے پراپیگنڈے کے سرچشمے کو نابود کرنے پر آمادہ ہے
میری دولت کے خزانے اُس کے لئے کھلے ہیں۔"

لیڈر کے ہونٹوں پر ابراہیم کی گفتگو کے فصیح اور غیر مبہم انداز سے
تبسم آگیا۔

"میں مسز تارکا کو صرف یہ بتانے آیا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔"
"کیا آپ مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیں گے؟ مسٹر ابراہیم۔"
"کہئے۔"
"روشن پہلو کے علاوہ ہر ایک چیز کا ایک تاریک پہلو بھی ہوتا ہے۔
میری تحریک کا بھی۔"
"کیا؟"
"مسز تارکا تباہ ہو جائیں گی۔"
"بڑا اچھا ہوگا۔"
"نہیں ابراہیم یہ انسانیت سے بعید ہے۔"
"ہونے دو۔"
"میرے پاس ایک [illegible] ہے۔"
"کیا؟"
"شادی۔"

[illegible]
[illegible]
[illegible]

میز پر اپنے بازو میں اپنا چہرہ چھپائے [illegible] مسز تارکا کی طرف
حیران نظروں سے دیکھتے ہے۔ [illegible] مسز تارکا
کمرا ہوگیا۔ ابراہیم کرسی کو مناسب جگہ پر رکھ کے بیٹھ گیا۔ مسز تارکا کی
سسکیاں زیادہ گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ لیڈر نے نرمی کے لہجے میں کہا۔
"ہم کو تمہارے ساتھ ہمدردی ہے، مسز تارکا!"
مسز تارکا نے ضبط کی کوشش چھوڑ دی۔
"میں مجبور ہوں، مسز تارکا۔ ورکنگ کمیٹی فیصلہ کر چکی ہے۔ ہمیں قومی
مفاد کے لئے انفرادی قربانیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ مجھے تمہارے مستقبل
کا پورا خیال ہے، مسز تارکا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ ہمارے اصلاحی اقدام
کے بعد تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

مسز تارکا نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور بھیگی ہوئی سرخ آنکھوں سے
دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"فریب خوردہ انسان! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تیری تحریک کی کامیابی
مجھ کو رلا رہی ہے؟"

"تم کو ناکامی نے پاگل بنا دیا ہے، مسز تارکا!"
"میرے رونے کی وجہ تیری کامیابی نہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تو
ابراہیم کی مدد سے بھی کامیاب نہیں ہو سکتا ——— میری رونے کی وجہ
——— میرے رونے کی وجہ ———"

جذبات نے اس کی زبان بند کر دی۔ اس نے پھر اپنا چہرہ اپنے
بازو میں چھپا لیا۔

"میرے رونے کی وجہ کچھ اور ہے!"
"کیا؟"
"آج ——— زندگی میں ——— دوسری دفعہ ——— مجھے ———
شادی کی خواہش محسوس ہو رہی ہے ——— معلوم نہیں ——— کیوں
معلوم ——— نہیں ——— کیوں"
وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"تمہاری شادی ہو جائے گی، مسز تارکا!"
"مسز تارکا نہیں [illegible] میں عزیزہ ہوں [illegible]
عزیزہ کہو مجھے [illegible] ———"
"میں شادی کرنا چاہتی ہوں ——— ابراہیم کے ساتھ ———"

[illegible] ہو کر اپنا مرض [illegible]
[illegible] ہو جانا اور ڈاکٹر تم سے شادی کرنے کے [illegible]

"ابراہیم [illegible] لیکن ــــــ"

مسز تارکا نے اپنا سر اُٹھا کر کہا "لیکن میں اُس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔"

لیلا نے پوچھا "کیوں؟"

"وہ میرا بیٹا ہے۔"

"عزیزہ!"

"میرا بیٹا اور تمہارا بیٹا!"

ابراہیم کھڑا ہو گیا۔ لیلا کھڑا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ مسز تارکا نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"۲۰ سال ہوئے ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ میں تمہاری شہوانی بھوک کا اور اپنی معصوم غلطیوں کا بوجھ اُٹھائے پھرتی ہوں۔ تمہارے اصرار پر میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ یہاں آگئی۔ بیکاری کے دن تھے۔ عدم تعاون کا زمانہ تھا۔ بیکاری نے تم کو جیل کی سلاخوں کی طرف دھکیل دیا۔ عدم تعاون نے تم کو لیڈر رہنے کا خواہشمند بنا دیا۔ تم دو سال کے لئے قید ہو گئے۔ میں اکیلی رہ گئی۔ اجنبی اور وسیع دنیا میں اکیلی ــــ نہیں۔ اکیلی نہیں ــــ ہم دو ــــ قانون کے مجرم۔ مذہب کے گنہگار ــــ لیکن میں کب تک بھوکی مرتی۔ میں نے بمبئی میں رئیسوں کے سب سے بڑے سوداگر حکیم جی لقمان جی کو اپنی سادی کہانی سنا دی۔ لاوارث سوداگر کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی۔ ہسپتال میں اُس نے میرے تمام اخراجات برداشت کئے۔ میں نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو ۱۰۰۰ روپے میں اُس کے ہاتھ بیچ دیا۔ ... ۱۰۰ روپے سے شروع کی ہوئی بزنس ۳۰۰۰۰ روپے سالانہ کی آمدنی تک پہنچ گئی ــــ ۱۰۰۰ کا معصوم بچہ بڑا ہوتے ہوتے ۲۰ سال کا ہو گیا۔ حکیم جی لقمان جی اُس کو کا نوجوان بیٹا [illegible] ابراہیم۔"

[illegible] سا خاموشی کمرے میں چھا گئی۔

آخر لیلا نے محسوس کیا کہ زیادہ لمبی خاموشی واقعات کو اُس کے اور بھی زیادہ خلاف کر دے گی۔

"[illegible] ــــ"

ابراہیم نے کرسی کی ٹیک پر ایک مضبوط گرفت کے ساتھ اور ایک انتہائی [illegible]

[illegible] تم ایک معصوم ہستی کو گناہوں کے غار میں دھکیلنے کے [illegible] ذمہ دار ہو تم سے انتقام لیا جائیگا۔"

"ابراہیم! تم اتنی جلدی ایک آوارہ عورت کی باتوں پر ــــ"

"سیٹھ سید! اب جھوٹ بول کر اپنے جرم میں اضافہ مت کر۔ مجھے معلوم ہے کہ میں حکیم جی لقمان جی کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں کسی غیر معلوم عورت سے خریدا گیا تھا۔ اور سیٹھ نے خود اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔ تھوڑی دیر ہوئی تو اُس کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر مسز تارکا پر جھکا ہوا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ ــــ عزیزہ! تم کیوں آگئی ہو۔ ۲۰ سال سے میں تم کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے پھر زخم ہرے کر دئے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس جذباتی سین کی فوٹو لے لی ہے۔ کانگریس کو ۵۰۰۰ روپے کا جو چیک دیا گیا تھا منسوخ کیا جاتا ہے۔ اب یہ ۵۰۰۰ روپے تیرے خلاف پراپیگنڈہ کرنے میں صرف ہوں گے۔ ہندوستان کے تمام اخباروں میں اس فوٹو کے ساتھ تیرے مکروہ کردار کے متعلق مضامین شائع کئے جائیں گے۔"

لیلا کا سر صوفے کی ٹیک پر گر پڑا۔

مسز تارکا اپنا سر اُٹھائے ابراہیم کی گفتگو سن رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو خشک ہو گئے تھے۔

ابراہیم نے مسز تارکا کی طرف ملامت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسز تارکا اب تم خوش ہو؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم مجھے مسز تارکا کہتے ہو۔ ماں نہیں کہتے۔"

"میں اپنی ماں کی تلاش میں نہیں تھا۔ تم یہ کہانی نہ سناتیں تو اچھا تھا۔"

"کیا کہتے ہو ابراہیم؟"

"تم نے میری زندگی دشوار کر دی ہے۔ اب مجھے اسمبلی کے لئے ایک ووٹ بھی نہیں مل سکیگا۔"

وہ باہر چلا گیا۔

"ابراہیم! ابراہیم!" وہ چلاتی ہوئی اُس کے پیچھے بھاگی لیکن دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

"سید!"

وہ ابھی تک صوفے کی ٹیک پر سر رکھے ہوئے پڑا ہے۔ اُس کی آنکھیں بند ہیں۔

"سید! تیرا جلایا ہوا تیر اب میرے دل کی گہرائیوں سے بھی آگے چلا گیا ہے۔ اور درد کی تمام شدتوں کو فتح کر لینے کے بعد آج ایک دفعہ پھر مجھے درد کی کسک محسوس ہو رہی ہے ــــ لیکن میں [illegible]

ہوں میرے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک بھڑک کر سرد ہو چکی ہے میرے پاس [illegible]
پیاس بجھائی ہے — سن مسز تارا سن! میری راحت کو چھین لینے والا
میری تسکین کو برباد کرنے والے! میں نے بھی تیری شہرت، تیری عظمت،
اور تیری عزت کو خاک میں ملا دیا ہے —
وہ اسی طرح بے جان بے حرکت بیٹھی ہے
کل افضل کا ایک تار آیا ہے افضل ہوسٹل سے تیری لڑکی
ایک ہندو لڑکے کے ساتھ بھاگ کر میرے پاس آئی آج صبح ان کی میں نے
ان کی سول میرج کروا دی ہے —
— مسز تارا کا [illegible] چلی گئی۔

ایک تاریکی کی رات کے سناٹے [illegible]
[illegible]
تمام چیزیں ٹوٹ پھوٹ کر اس [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ہندو دوشیزہ کا چہرہ — صرف چہرہ — اور کچھ نہیں
انور

آواگون

(۱)

کل جو آدمی رات کو دیکھا ہے میں نے ہم نشیں
دیکھتا کیا ہوں کہ حلقے ظلمتوں میں نور کے
پھر یہ دیکھا چند روحیں جیسے بل کھاتی ہوئی
چاند کی جیسے شعاعیں عالم ظلمات میں
کچھ بگولے روشنی کے کچھ شرارے نور کے

تجھ سے وہ کیوں کر کہوں، کب آئے گا تجھ کو یقیں
کھا رہے ہیں دمبدم ڈھندلی فضا میں پیچ سے
دائروں میں جا رہی ہیں رقص فرماتی ہوئی
اس طرح تھیں چند لہریں اس اندھیری رات میں
پھر رہے تھے کوندتے میری نظر کے سامنے

(۲)

یہ تھیں روحیں قالب انسان سے جو ہو کر جدا
حلقۂ ظلمات میں کھوئی سی گھبرائی ہوئی
لیکن ان کو آسماں پر راستہ ملتا نہ تھا

ڈھونڈتی پھرتی تھیں ایوان سکوں کا راستہ
اڑ رہی تھیں آسماں کی سمت لہرائی ہوئی
روکتی تھیں ظلمتیں ان کو، ڈراتی تھی ہوا

طاقت پرواز تھی ان میں، مگر مجبور تھیں
آسمانوں تک پہنچنے سے یہ سب معذور تھیں

(۳)

تو بھی سمجھا راز کیا تھا؟ آ بتاؤں ہم نشیں!
جسم گو یہ چھوڑ دیتی ہیں فنا ہوتی نہیں
اس فضا میں رات دن چکر لگاتی ہیں یونہیں
ناچتی تھیں رات کو جو صورت برق و شرار

اصل میں روحیں فضاؤں سے کہیں جاتی نہیں
گرد رہتی ہیں یہ ہم سے جدا ہوتی نہیں
اک نئے قالب میں بھی لوٹ کر آتی نہیں
اصل میں یہ آدم روحیں تھیں [illegible]

تو یہ کہتا ہے کہ روحیں لوٹ کر آتی نہیں
میں یہ کہتا ہوں یہ دنیا سے کہیں جاتی نہیں

جلال ملیح آبادی

کاکڑاں کا تیلی

[illegible] سر اٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ [illegible] کی شکنوں کی کثرت سے [illegible] شکل [illegible] نہیں تھی، [illegible] سے [illegible] ہوگا لیکن یوں بہار سا کھل آیا تھا جیسے [illegible] سوکھا ہوا تھا اسے گویا بھی ابھی بتی ملی کہ وہ تم گنہگار تھا گرد کی ہلکی سی تہہ شیرا [illegible] طرح چھائی ہوئی تھی اور اس جسے شعلوں اگر چہ سیدھی نہ پڑتی تھیں، تو بھی چمک کے سارے حصوں میں ہزاروں سی کچھ تبدیلی محسوس ہوتی تھیں۔

مولو نے اپنی پگڑی کو ٹھیک کیا ۔۔۔۔ جسے اس کی بیوی نے رات ریٹھوں کے پانی سے دھویا تھا۔ اور چادروں کی کنی کو پکڑ کر کاٹ دیا تھا۔ اور چند سال اور پہلے اس کی دونوں بیٹیوں نے دونوں طرف سے پکڑ کر آنگن میں چکر لگا کر سکھایا تھا ۔۔۔۔ پھر اس نے اپنی لمبی سفید داڑھی پر جو ہونٹوں کے پاس سے پیلی پڑ گئی تھی، ہاتھ پھیرا، انگشتری کو بائیں کندھے پر رکھ کے اور میں ہاتھ کو ذرا سا جھٹکا دیا اور چل پڑا۔

میاں اس کی بیوی نے سامنے جاتے ہوئے تانگے کے پیچھے اڑتی ہوئی دھول میں آنکھیں جما دیں، اور بولی: "اڑا پکی سڑک ہے اس پہ تو بیسوں دن تک گھر کا گنا دھل سکتا ہے، کچھ نہیں تو جہاں اور لیراں کے مندے آسکتے ہیں یا پھر میرے ننھے چراغ کی لڑکی کرتیاں بن سکتی ہیں۔"

اور اس نے گود میں لئے ہوئے اپنی پالی سوچی سوچی آنکھوں والے اپنے کالے سیاہ لڑکے کو محبت سے چوم لیا۔

جب نے سنگاد کر ریو کے چھپر پڑ جی تھی، رات اس کی بیوی نے اس کے کپڑوں کو دھو کر خوب صاف کیا تھا ۔۔۔۔ جو شاید رات کی تاریکی میں زیادہ دیا گیا تھا، کیونکہ قمیص کا سفید رنگ ہلکی سی نیلاہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی اور جوں جوں گرد پڑتی تھی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔

مولو نے پھر اپنی پگڑی پر ہاتھ رکھ کر کھسکا دیا تھا اور پیشانی کر ہلکی سی نیلی [illegible] ان سالوں کے [illegible] سڑک کا بنتا پاس کر لیا ہے یعنی سڑک بن گئی ہے اور اس نے جو سوچا تھا اس کے پیچھے چل آئے گا اور دونوں بلکیوں اور سات آٹھ سال کے بچے [illegible] سب سڑک پر [illegible] بیٹھ کر [illegible] ہیں۔

[illegible] سڑک [illegible] میل چل کر کھیلو دل سے [illegible] ختم ہو گئی تھی اور بکریوں اور بھیڑوں کا ایک [illegible] بڑے ٹیلے [illegible] اور سات [illegible]

بند ہونے کے بعد جنگل اور شوخ بکریاں، چراہی بائیں بڑی بڑی سینگیں اور جن کے سینگ لئے بھاری نہ تھے کہ ان کے نیچے تیل لگانے کی ضرورت پڑتی اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نا آشنا بیٹے تھا انہیں پھیرنے لگا تو مولو کو اس پیسے کی حقیقت کا احساس ہوا مگر وہ اس طرح اڑی کہ اس کے لئے آنکھ کھولنا اور مڑ کر اپنے بیوی بچوں کو دیکھنا مشکل ہو گیا۔

جب طوفان کچھ تھما اور بکریوں اور بھیڑوں کی آوازوں کو دبا تی ہوئیں چرواہوں کی فحش گالیوں کی کرخت آوازیں ہر ساعت سے پہلے چلی گئیں تو مولو سڑک کو پار کر کے دوسری طرف گیہوں کے کٹے ہوئے کھیت میں جا کھڑا ہوا انگشتری اس نے اتار کر زمین پر رکھ دی، اور تہمد اور قمیص کو اچھی طرح جھٹک کر اس نے سر سے پگڑی اتاری اور اسے اچھی طرح جھاڑا۔ قمیص کے دامن کو الٹا کر کے اس سے منہ پونچھا۔ پھر پگڑی باندھی اور اپنے بیوی بچوں کو آواز دی کہ وہ بھی سڑک کے اس کنارے آجائیں۔

گرد وائیں طرف زمین اور آسمان کے درمیان جا کر معلق ہو گئی تھی۔ جوں جوں ریوڑ آگے جاتا تھا۔ اس کی لکیر بڑھتی جاتی تھی ۔۔۔۔ اس بڑھتی ہوئی لکیر کی طرف دیکھ کر اور دل ہی دل میں چرواہوں کو کئی فحش گالیاں دے کر آخر مولو نے کہا۔ "بد تمیز، نہیں جانتے کہ راستے میں شریف لوگ جا رہے ہیں۔ ذرا خبردار ہی کر دیں کہ سبھی ایک طرف ہو جائے بس اڑتے چلے جاتے ہیں، جیسے کوئی مہم سر کرنے جا رہے ہوں ۔۔۔۔ حرامزادے ۔۔۔۔" اور اس نے اپنی مونچھوں کو دو بار پیار سے ہوئے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

شریف سے مولو کا کیا مطلب تھا، شاید یہ بات اسے خود بھی معلوم نہ تھی۔ وہ کاکڑاں کا تیلی تھا۔ گاؤں کے اس کنارے، جہاں بڑ کا ایک مہیب درخت پھیل کر اوسے جوہڑ کو اپنے سایے میں لے چکا تھا، اس نے ایک چھوٹا سا کولہو لگا رکھا تھا۔ بارش ہوتی، تو جوہڑ کا پانی اس کے کولہو کے قریب تک آجاتا، بارش کی وجہ سے راستہ مسدود ہو جاتا۔ ٹانگیں گھٹنوں تک کیچڑ میں دھنس جاتیں اور جوہڑ کے کنارے لگے ہوئے کوڑی کے ڈھیروں کی عفونت بڑ کے سایے کی نمی سے، جیسے وہیں جم کر رہ جاتی لیکن اپنی زندگی کے پچپن سال مولو نے اسی کاکڑاں میں گزارے تھے اگاؤں سے بیس میل پرے کیا ہوتا ہے، اس کی اسے کوئی خبر نہ تھی۔ زندگی میں شاید دو چار ہی ایسے موقع آئے تھے، جب اسے دھلے ہوئے کپڑے پہننے میسر ہوئے ہوں ۔۔۔۔ عید کے موقع پر وہ ہر سال کپڑے بدلا کرتا تھا۔ لیکن اس کا کپڑے بدلنا یہی ہوتا کہ ننگے بدن رہنے کی بجائے وہ اس پرانی قمیص بھی

پھرتا رہتا تھا، وہاں وہ تیل کے پیچھے تیل انہیں مل جاتی — وہ اس کی طرح تیل [illegible]
کا سے چکٹ کپڑوں میں گندگی تھی۔ جس طرح پاس رہتے ہوئے بھی جونک کے لوتھڑے پانی
اور اس کے کنارے لگے ہوئے کوڑے کے ڈھیروں میں اس کے لئے کوئی نفرت نہ رہی
تھی، اسی طرح تیل اور پسینے سے تر کپڑے، بدبودار، بھدے اور بوسیدہ کپڑوں کے لئے
اس کا احساس بالکل مر گیا تھا اور اگر وہ تیل کے کام سے اس گلی میں [illegible]
کی صورت نہ دیکھ کر اس نے کولہو کے ایک طرف چاک لگا رکھا تھا۔ جہاں وہ
گھڑے، کونڈے، ڈولے، ڈلیاں اور مٹکے بنایا کرتا تھا — ذات سے وہ کمہار
تھا یا تیلی اس بات کا اسے خود بھی علم نہ تھا۔ اپنے دادا اور پھر اپنے باپ کو اس نے
یہی کام کرتے دیکھا تھا۔ اور جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ یہی کئے جا رہا
تھا، جب اس کے ہاتھ تیل میں نہ ہوتے تو مٹی میں ہوتے۔ رہی تعلیم سو قرآن پاک
کی کچھ آیتوں کے علاوہ، جو وہ بڑی کوشش سے غلط تلفظ کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اس
نے وہ سب گالیاں سیکھی تھیں، جو اس کے دادا، پھر باپ اور پھر بڑے بھائی دیا
کرتے تھے — لیکن آج اس ماحول اور اس ماحول کے خلاف، جس میں وہ پیدا ہوا،
پلا اور پروان چڑھا تھا، اس کے دل میں جو ایسا نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور وہ ان
گندگیوں، غلاظتوں میں رہنے والوں کو بدتمیز سمجھنے لگا تو اس کی وجہ تھی۔
وہ اپنے اس چھوٹے بھائی کے لڑکے کی شادی میں شامل ہونے کے لئے جا رہا تھا
جو لاہور میں رہتا تھا اور دیہاتیوں کی نظروں میں شہر والے شریف یعنی باعزت
ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ شریف آدمی کے لڑکے کی شادی میں جا رہا تھا اس لئے
خود بھی شریف تھا۔

دھیرو کے نزدیک ایک کھال پانی سے بھری ہوئی مزے سے رینگ
رہی تھی۔ گورو نے اسے پار کیا، پھر گٹھڑی رکھ کر بچے کو ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔ اور
اس کی بیوی پھلانگ مار کر ادھر آ گئی۔ رحماں پہلے خود آ گئی اور پھر اس نے بچے
کو پار آنے میں مدد دی، لیکن ایراں کے جوتے کی کیل ابھر آئی تھی۔ اور اس کی
دائیں ایڑی میں زخم سا ہو گیا تھا۔ دھرتی گرم لوہے کی طرح تپ رہی تھی۔ اسلئے
وہ ننگے پاؤں چلنے کا حوصلہ نہ کر سکی تھی۔ اور ایڑی اٹھائے، اپنے دوپٹے سے
گردن کے پسینے کو پونچھتی ہوئی چلی آ رہی تھی — اور بہت پیچھے رہ گئی تھی۔
"اری تو پیچھے ہی لٹکتی چلی آ رہی ہے۔ چلا نہیں جاتا تجھ سے؟" اور
لمحہ بھر کے لئے اپنی شرافت کو بھول کر اس نے ایک فحش گالی اپنی اس بالڑی کو
دے ڈالی۔
"مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ میخ نکل آئی ہے۔" اس نے دکھی آواز میں کہا۔
مولو نے گٹھڑی اٹھا کر کنارے کے ایک جامن کے درخت کے نیچے رکھ دی۔
"لے ادھر لا، لا ادھر، میں اس میخ کو ٹھیک کر دوں۔ ابھی [illegible] جاتا ہے"

جہاں اب بچا [illegible] سے اچھے کر [illegible]
گھاس پر بیٹھ گئی اور تھکے کر [illegible] لگی۔
رحماں نے کھال کے پانی سے منہ ہاتھ دھوئے [illegible]
اور ایراں نے وہاں پہنچ کر [illegible]
اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔
گورو نے بچے کو دیکھا۔ اس کی ننھی سی ناک پر [illegible] سے
صاف ہو گیا تھا، کسی پانی کی طرح سر اٹھائے چمک رہی تھی۔ کہیں سے ایک
اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر مولو نے اس کو توڑ دیا۔ اسے کنکر دیا۔ [illegible]
سے اسے بہت زیادہ [illegible] کو چکنا دیا۔ اور پھر گنے پانی کے چھینٹے [illegible]
طرف سے منہ پونچھتا ہوا کچھ سستانے کے لئے اپنی بیوی کے پاس آ بیٹھا۔
"ماشاء اللہ دو بچے،" اس کی بیوی نے کہا، "جیسے ہمارے گھر بچوں کی
بارش ہوتی ہو اور پھر دیکھو، ابھی تو جیسے [illegible] وہاں جائیں گے تو کیا خالی
ہاتھ جائیں گے حسن خاں کے بچوں کیلئے بھلا کچھ نہ لیجائیں گے؟"
یہ حسن خاں، جو اپنی زندگی کے [illegible] برس تک گاؤں میں اچھو کہلاتا
رہا۔ لاہور میں ایشور سنگھ گورنمنٹ کنٹریکٹر کا میٹ تھا — جب [illegible]
تھی اور ٹھیکیدار ایشور سنگھ ادھر آیا تو نہ جانے کس طرح (مولو آج تک اس بات کو
نہیں سمجھ سکا) اچھو جا کر اس کے مزدوروں میں شامل ہو گیا۔ — پھر کچھ عرصہ بعد
پھر ٹھیکیدار ایشور سنگھ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اسے پانچ روپے [illegible]
میٹ بنا لیا۔ اور پھر آٹھ کر دئے۔ اور جب اس کام کو ختم کر کے ٹھیکیدار ایشور
سنگھ لاہور چلا گیا، تو اچھو اس معتبر میٹ کو بھی ساتھ ہی لے گیا۔ گاؤں میں پہلی
جب وہ آیا، تو اس نے چوڑے پائنچوں کی شلوار، بوسکی کی دھاری دار قمیص اور
سر پہ کلے دار صافہ پہن رکھا تھا جس کا طرہ ایک پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔
اسی دن سے اچھو حسن خاں بن گیا تھا۔ اور اسی کے لڑکوں کے لئے مٹھائی لیجانے
کا خیال رحماں کو تھا۔
اس جامن کے سائے میں بیٹھے بیٹھے اپنی تہمد کی گانٹھ سے مولو نے
سب پیسے نکالے۔ اکثر پر تیل اور مٹی کی کالی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اور اگرچہ زمین سے
نکال کر تہمد میں باندھنے سے پہلے انہیں اچھی طرح دھو لیا گیا تھا، تو بھی تہمد کا
وہ حصہ، جس میں اس نے انہیں باندھا تھا، کالا ہو گیا تھا۔
اگرچہ وہ گھر سے انہیں گن کر لایا تھا، پھر بھی [illegible]
بیٹھ کر اس نے انہیں دوبارہ گنا۔ چار روپے [illegible]
نے بڑی مشکل سے [illegible] جمع کر کے [illegible]
آٹھ سال کا [illegible]
[illegible]

[illegible] کی شادی [illegible] رہی تھی
کر [illegible] کے بیاہ کی بات [illegible] رہے تھے۔ پہلے [illegible] سال [illegible] اس نے محنت بھی کم نہ کی تھی۔ جتنی [illegible] وہ حاصل کر سکتا تھا اس نے حاصل کی تھی۔ اور جتنا تیل [illegible] کے پانچ دس گاؤں میں [illegible] تھا اس نے [illegible] کچھ اس [illegible] تھی پھر فصل کے دنوں میں اس نے کٹائی کا کام بھی کیا تھا اور [illegible] کے [illegible] میں [illegible] کی دکان بھی لگائی تھی لیکن اس پر بھی [illegible] کچھ بچا سکا تھا۔ اور [illegible] سال کی سوکھی روٹی سے زیادہ [illegible] ہوا تھا ـــ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شادی کے خیال سے اس نے اپنی بیوی اور بیٹیوں کو گبرون کی ایک ایک قمیص اور ویلیں کی ایک ایک سلوار بھی تھی۔ خود بھی ایک [illegible] بنا لیا تھا۔ اور بچے کو بھی چھوٹا سا تہبند لے دیا تھا لیکن ان سب کے لئے تو وہ بھیلو شاہ کا قرضدار تھا جس سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے سال وہ جتنا تیل نکالے گا، سب اس کی دکان میں ڈال دیگا۔

"وہیں جامن کے نیچے بیٹھے بیٹھے مولو حساب لگانے لگا "اگر وہ آبادی سے جاکر چڑھیں تو چار چار آنے تو موٹر کے لگیں گے۔ اس طرح ساڑھے چار ٹکٹوں کے ....

لیکن جیاں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "ساڑھے چار کیسے؟ بچے کا ٹکٹ کس طرح لگ سکتا ہے، ابھی کل کا تو بچہ ہے ہم اسے گود میں اٹھا لیں گے"

"یہ موٹر والے ایک ہی شیطان ہوتے ہیں، اگر مانگیں گے تو" مولو نے کہنا شروع کیا "مثلاً ہے تین سال سے بڑے کا ٹکٹ لگتا ہے"

"ہاں لگتا ہے" جیاں بولی "وہ مانگیں تو بھی تم نے دینا"

"تو پھر" مولو بولا "ایک روپیہ ہی [illegible] لاہور شہر ہے وہاں جتنو کی شادی ہوگی پیدل [illegible] ہوئے تو اس کے ہاں نہ جایا جاسکیگا۔ پھر وہ نہ کہیں گے کیسے [illegible] تین چار آنے تانگے پر بھی نہیں خرچ کر سکے"

جیاں کو خود بھی اس بات کا یقین تھا۔ اور اپنے بچوں کو بھی اس نے یہی یقین دلایا تھا کہ [illegible] سے انہیں بہت کچھ ملیگا۔ اس لئے اس نے کہا "ایک روپیہ [illegible] مٹھائی [illegible] کے بچوں کے لئے بھی لے جانا۔ جب وہ جانے بچوں کو [illegible] تو ہم کس طرح خالی ہاتھ جائیں گے"

[illegible] حساب لگایا کہ اس طرح سب خرچ نکال کر ان کے [illegible] ایک روپیہ بچ جائیگا۔

[illegible] میرے پاس تین روپے ہو گئے ہیں [illegible] میلہ [illegible] گیا ہے [illegible]"

جیاں بولی "مجھے ایک چنری کی ضرورت ہے جو ہاں لڑکی کے سامنے کیا میں یہ پھٹی ہوئی چنری پہنوں گی"

بچے نے کہا "ابا ہم تو بوٹ لیں گے"

"چلو ہٹو ـــ" جیاں نے ایک جھڑکی دی "بسات آٹھ دن وہاں رہنا ہے۔ تو کیا اپنے پاس ایک کانی کوڑی تک نہ رکھیں گے۔ پھر گھر کی بھلا ہے راستے میں شربت لسی کی ہی ضرورت پڑ جاتی ہے"

. . . . .

لوہکے کے پاس انہیں ایک تانگہ جاتا ہوا ملا لیکن جب اس نے آبادی کے پانچ پانچ آنے فی سواری مانگے۔ تو مولو نے کچھ جواب نہ دیا۔ جھولا کو پھر اوپر سرکا کر پگڑی کے شملے سے گردن اور منہ کا پسینہ پونچھ کر اور گٹھری کے بوجھ سے آہستہ آہستہ دبنے والی گردن کو اٹھا کر وہ چل پڑا۔

لہراں اور بچے نے ایک بار کہا "ابا تانگہ"

کرتاک کر بولو نے اسے چپ کرا دیا۔ جیاں نے بھی بچے کو کندھے سے لگا کر منہ میں انگلی ڈال کر اسے بہلاتے ہوئے ...... او ..... کرنا شروع کر دیا اور جب اس پر بھی بچہ نہ مانا۔ تو قمیص کے بٹن کھول کر اپنی چھاتی نکال کر اس کے منہ میں دیدی

. . . . .

سڑک بالکل کچی تھی ـــ سڑک تو اسے نہ کہا جا سکتا تھا کسی زمانے میں وہاں ضرور سڑک ہوگی۔ لیکن اب تو اس کی وسعت کو دیکھ کر اس پر گرد کے کسی ایسے دریا کا گمان ہوتا تھا۔ جس کے دونوں کنارے وسیع ہوتے ہوتے ارد گرد کی ویران زمین سے جا ملے تھے۔ ہاں دونوں طرف پرانے کے بے سود اونچے اونچے سوکھے اور بدصورت درخت اس سڑک کے وجود کا پتہ دیتے تھے۔ اور کہیں کہیں کوئی ببول کا درخت اپنی کانٹے دار شاخوں کو سڑک پر پھیلائے ہوئے تھا۔ کہ اگر کہیں گرمی کی شدت سے جلتا ہوا کوئی شخص سایے میں آنے کی کوشش کرے۔ تو اس کی پگڑی اتر جائے یا اس کا چہرہ زخمی ہو جائے۔

لہراں کے جوتے کی میخ پھر نکل آئی تھی۔ اور زخمی ایڑی کو وہ اور بھی زخمی کر رہی تھی۔ اس لئے اس نے جوتے ہاتھوں میں اٹھا لئے تھے۔ گرد دہکتی ہوئی راکھ کی طرح جل رہی تھی۔ اور بار بار جب گرد میں ٹخنوں تک پاؤں میں دھنس جاتے تو سارے جسم میں ایک جلن کی لہر سی دوڑ جاتی۔ لیکن میخ کی چبھن سے ٹیس کی جو لہر دوڑتی تھی۔ وہ شاید جلن کی اس لہر سے کم تکلیف دہ تھی لیکن وہ چلی جا رہی تھی۔ پر اس کے باوجود وہ سب سے پیچھے تھی۔

اور مولو اب بھی سب سے آگے تھا۔ اتنی عمر ہو گئی، مولو کبھی اس سڑک پر نہ آیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ سڑک اتنی ویران اور اتنی واہیات ہے، تو وہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرتا۔ خصوصاً اس وقت جب بچے اس کے ساتھ ہوتے۔

[illegible]

[illegible] اس نے کبھی [illegible]
[illegible] ابھی [illegible]
[illegible] بھالی [illegible] ٹھنڈک [illegible] تھی [illegible]
کے حلقے [illegible] اس کا وجود اس کے [illegible]
بوڑ کی طرح کا ہی ہوتا ہے — وہی بڑی بڑی شاخوں والا — سایہ دار۔ تپتے
راہیوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا۔ بے شمار گھونسلوں کو اپنی شاخوں میں چھپائے
ہوئے۔ لیکن یہ تپتی ویران دنیا سہ پہر کا ایک ٹکا تک نہیں۔ اور اس کے درمیان
کسی جلتے ہوئے تیر کی طرح جلتی تپتی، جلاتی اور تپاتی ہوئی یہ سڑک! — اگر
اسے معلوم ہوتا تو کبھی اپنے بچوں کو یوں ساتھ نہ لاتا — کبھی بھی نہ لاتا۔ لیکن
اس خیال کو اس نے فوراً اپنے دل سے نکال دیا۔ اور وہ پھر اکڑ کر چلنے لگا۔ تہبند کو
جھٹکا دے کر قمیص کو جھاڑنے کا خیال وہ کب کا بھول چکا تھا — کوئی سائیکل
سوار یا بیل گاڑی بھی گزرتا تو اس پر گرد کی تہ چھا جاتی۔ تو کبھی ادھر سے
چلتی اور کبھی ادھر سے اور کبھی کبھار کوئی بگولا مٹی اڑاتا ہوا گزر جاتا — تہبند کا
نیلاہٹ لئے ہوئے سفید رنگ اب مٹیالا ہو گیا تھا۔ پگڑی کی وہ رنگت رہ چکی تھی
اور کپڑوں کی اُلٹی طرف سے چہرے یا گردن کا پسینہ پونچھنے کی بجائے اب وہ سینے کی
طرف کو بھی کام میں لانے لگا تھا۔

اس سے کچھ فاصلے پر اس کی بیوی چلی جا رہی تھی۔ اس کی تمام تر کوشش
بچے کو چھپانے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ بچہ پریشان تھی — اپنے خیالات کی دنیا
میں مست [illegible] اپنے [illegible] کا خیال اُسے اس چلچلاتی دھوپ کی
شدت کو محسوس نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کی انگلی تھامے ننھا چلا آ رہا تھا — جسے
کبھی وہ اُٹھا لیتی تھی اور کمر اکڑ جانے یا بازو تھک جانے پر پھر اتار دیتی تھی —
اس کا پھول سا چہرہ کمہلا گیا تھا، ہونٹ سوکھ گئے تھے، گندے میلے ہاتھوں
سے بار بار منہ کا پسینہ پونچھنے کی وجہ سے چہرے پر کئی داغ لگ گئے تھے، اور
اس کی چال بتدریج دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔

نہر کے پل کو پار کر کے مڑتے دیکھا — دائیں طرف ایک گھنا پیڑ
ہے۔ مادہ بڑ کا — جس کا تنا بہت اونچا نہیں اُٹھتا۔ موٹی موٹی لمبی لمبی شاخیں
سر کو جھکی ہوئی چھتری کی طرح پھیلتی جاتی ہیں۔ اس کی شاخوں پہ [illegible]
بیٹھے ہیں، بے فکر اور مست۔ ان کے لمبے لمبے چمکیلے پنکھ [illegible]
[illegible] کسی کنوئیں کی گادی پر بیٹھا ہوا کوئی جاٹ [illegible] —
اس کی سریلی [illegible] اس ویرانے [illegible]
پھیلتی ہوئی اس تک آ رہی تھی۔

[illegible]
[illegible]
کی بات اور اس کے بچوں [illegible]

پھر سے ڈھونڈتا [illegible]
[illegible]
لیکن یہ مان اس کے [illegible] اپنی [illegible]
اور اپنے پیچھے چلے آنے والے بچوں کا اسے خیال آگیا۔ اور اس کے دل سے
ایک لمبی سانس نکل گئی۔

قریب قریب روتے ہوئے سوکھے گلے سے بچے نے کہا "ابا بہت
پیاس لگی ہے ابا مجھے اٹھا لو"

اور تو لوٹنے پیچھے مڑ کر دیکھا — امراں چلتے چلتے تھک کر ہانپتی ہوئی ایک
ٹیڑھی سی جڑ پر بیٹھ گئی تھی۔

"مر گئی وہاں ہی تو" — کہہ کر وہ لوٹ آیا۔

امراں اٹھی اور لنگڑاتی لنگڑاتی چلنے لگی اور پھر اس نے مڑ کر اپنے
بچے کو ڈانٹا کہ تھوڑا سا اور، سامنے [illegible] نظر آ رہا ہے وہیں تمہیں
ٹھنڈا پانی پلائیں گے۔

اور پھر گاؤں تک تو وہ دونوں کسی نہ کسی طرح ہانکتے چلے آئے۔ شاید
پانی سے زیادہ ان کی تسکین کا باعث یہ خیال تھا کہ [illegible]
لیا۔ لیکن جب کچھ سستا لئے اور سوکھی روٹی اور تیل کے [illegible]
[illegible]
کا حکم ہوا تو وہ چل تو پڑے لیکن [illegible]
[illegible] سٹیشن آئے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] مکتبہ کا [illegible]

پیغمبر صحرا [illegible] اردو ترجمہ [illegible] علامہ [illegible]
[illegible] حالات [illegible] عشق رسالت کی [illegible] ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

چاند کا گناہ اور دیگر افسانے [illegible] شگفتہ افسانے شامل ہیں جو ایک اُردو دنیا میں [illegible] ہوئے تھے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ضخامت .. صفحات قیمت مجلد [illegible]

کمپنی کی حکومت (ہندوستان میں) داستان [illegible] اس عہد دور پُر آشوب کی جب ہندوستان کو سیاسی طور پر محکوم اور اقتصادی لحاظ سے غلام بنایا جا رہا تھا تاریخ ادب تنقید۔ مصنف اختر [illegible] بادی۔ قیمت مجلد [illegible]

تین پیسے کی چھوکری اور دیگر افسانے [illegible] کے خلوص [illegible] کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہیں اور یقین واثق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانے اُردو کے حق میں ایک نہایت حسین اضافہ ثابت ہوئے ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔

سوز ناتمام ادیب شہیر عاشق بٹالوی بی اے ایل ایل بی دورِ حاضر کے مشہور انشاپردازوں میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ سوز ناتمام عاشق صاحب کے سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دورِ حاضرہ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی زندگی کے نشیب و فراز اور انکی ذہنی اور روحانی کشمکش کے مدوجزر اور انکی طبیعتوں کے ہیجان و اضطراب کا حیرت انگیز مرقع۔ لکھائی چھپائی کاغذ بہترین [illegible]

زوال غازی یا انقلاب افغانستان یہ ایک نہایت عبرت آموز، بصیرت افروز اور مفید قابل دید تاریخی کتاب ہے جسکو بعض اعتبارات اُردو کی بہترین تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں افغانی بغاوت اور تبدیلی حکومت کے مفصل اسباب و واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ جو شاہ امان اللہ خان سابق بادشاہ کابل کی حکومت کی معزولی بعد افغانستان سے معذوری کا باعث ہوئی نیز اس عظیم الشان افغانی انقلاب کی تمام اصولی اور فروعی جزئیات پر گہرے سیاسی [illegible] مذہبی نقطہ نظر سے نہایت بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا [illegible]

تصویر کشمیر مولانا حفیظ جالندھری [illegible] قیمت [illegible]

[illegible] کی [illegible] کی حد [illegible] قیمت [illegible] محبت اور [illegible] نصیحتیں [illegible] گویا وہ [illegible] ہیں۔ [illegible] شائع ہو گئے ہیں۔ [illegible] یوسف [illegible]

[illegible] ساھکار اور دیگر افسانے [illegible] آپ [illegible] معاشرت کی عریاں تصویر دیکھنا چاہتے ہیں [illegible] اپنے سماج کے [illegible] ملاحظہ کرنا چاہتے ہیں تو [illegible] افسانے [illegible] قیمت [illegible]

وفاق ہند [illegible] وفاق کے موضوع پر لکھی گئی ہے [illegible] حکومت کی گئی ہے اور نئے [illegible] حکومت [illegible] وفاق کا مطلب [illegible] درج ہیں۔ [illegible] حکومت [illegible] جرمن کی [illegible] حیثیت [illegible] کے تعلقات [illegible] کی تکمیل [illegible] اخبارات [illegible] نہایت [illegible]

لاشوں کا شہر اور دیگر افسانے ہندوستان کے مشہور حزنیہ افسانہ نگار مسٹر عبدالقادر کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ منظر نگاری کا کمال کہ پڑھنے والا اپنے آپکو اس ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے مجلد عہ

درانتی اور دیگر مضامین پنجاب کے مشہور مزاح نگار حاجی لق لق کے پُر ظرافت افسانوں اور مضامین کا مجموعہ۔ جن کو پڑھکر آپکے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑجائیں گے۔ طرہ یہ کہ مزاح نہایت سنجیدہ معیاری ہے۔ قیمت ایکروپیہ۔

خطوط شبلی (عورتوں کے نام) علامہ شبلی مرحوم کے وہ نادر خطوط جو موصوف نے بمبئی کی مشہور تعلیمیافتہ خواتین عطیہ بیگم صاحبہ فیضی اور زہرا بیگم صاحبہ فیضی کے نام وقتاً فوقتاً کمال اخلاص و محبت اور انداز خاص کے ساتھ لکھے تھے۔ یہ جواہرپارے اُردو میں کمال انشا پردازی کی یادگار ہیں۔ طرز نگارش اسقدر لطیف و پاکیزہ ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر کتاب چھوڑنا دشوار ہے۔ قیمت ایکروپیہ

محبوب خدا چودھری افضل الحق صاحب نے شہرۂ آفاق کتاب "زندگی" گورکھپور جیل میں تصنیف کیا تھا یہ کتاب "محبوب خدا" آپنے ملتان اور راولپنڈی جیل کی تنہائیوں میں بیٹھکر لکھی ہے۔ کتاب کیا ہے عشق رسول اللہ کا بہتا ہوا دریا ہے جسمیں علم و ادب کی لہریں ہزاروں لطافتوں کو لیکر اٹھتی ہیں جیل خانوں کی سلاخوں کے پیچھے اور مجالس کی دیواروں میں مقید ہوکر ایک مرد مجاہد کیا سوچتا ہے۔ قیمت مجلد عہ۔

دنیا کے تبسم دوسو صفحات، عمدہ لکھائی چھپائی۔ مصنفہ شوکت تھانوی۔ قیمت عہ۔

آخری تحفہ منشی پریم چند کے چودہ بہترین افسانے۔ ۲۲۴ صفحات سرورق رنگین مضبوط جلد عہ

کاروان حیات یہ ایک نہایت ہی دلچسپ کتاب ہے۔ اور اتنی حیرت انگیز ہے کہ آپ پڑھتے پڑھتے حیران ہو ہو جائیں گے۔ ایک ہی شکل ایک ہی لباس، ایک ہی آواز اور ایک ہی نام کے دو آدمی موجود۔ مگر وہ پہچان نہ سکی کہ اس کا خاوند کون ہے یہانتک کہ وہ دھوکہ میں آگئی۔ اور عرصہ تک غیر کو اپنا خاوند سمجھکر اس کے ساتھ رہتی رہی۔ مگر جب اصل خاوند کو حالات معلوم ہوئے تو اس نے کیا غضب کیا یہ پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ ہری بھری دنیا پر کیسی بجلیاں ٹوٹیں شہزادی کا فوٹو اور دونوں خاوندوں کا فوٹو بھی اس کتاب میں موجود ہے قیمت عہ

مسلمانوں کا روشن مستقبل یعنی ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کی تیرہ سو سال کی مذہبی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ۔ قیمت مجلد عہ

سوئٹ روس مصنفہ پنڈت جواہر لال نہرو جس میں پنڈت جی نے روس کے جدید حالات درج کئے ہیں۔ روس یا سوشلسٹ سسٹم آف گورنمنٹ کے دلچسپ حالات۔ قیمت عہ۔

رائے بہادر لالہ کشن چند زیبا ڈرامسٹ کا مشہور و مقبول ڈرامہ ایک خوشامدی کا ٹائیٹل ہو لڈر بنا پھر کس طرح انقلاب اسے محب وطن بنادیتا ہے۔ پلاٹ مذاقیہ۔ قیمت ۸ر۔

افسانۂ غم ہندوستان کی دردناک مصیبتیں، شہزادوں اور بیگمات کا قتل، بہادر شاہ کی ہولناک پریشانیاں، مقبرۂ ہمایوں میں پناہ، گرفتاری کا مقدمہ۔ فرد جرم۔ دہلی سے آخری رخصت۔ رنگون میں نظربندی۔ مؤلفہ سید امیر احمد علوی ڈپٹی کلکٹر۔ قیمت ۱۲ر

سوشلزم سوالات و جوابات کی شکل میں سوشلزم پر بہترین تصنیف۔ قیمت آٹھ آنہ

سولہ سنگار فطرت نگار رشید رشن کے تازہ ترین سولہ افسانوں کا مجموعہ۔ خوبصورت ٹائیٹل مضبوط جلد قیمت عہ،

ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں؟ اعداد و شمار کے ذریعہ ہندوستان کی منہ بولتی تصویر۔ ۱۲ر

دلی کا سنبھالا دلی مرحوم کی داستان الم۔ از خواجہ محمد شفیع دہلوی مرحوم دہلی کے عروج و زوال کی آخری ایام کی عکاسی نگاری دہلی کی اس ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے جو نا بود ہے۔ انداز بیان ایسا موثر ہے کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ قیمت مجلد عہ۔

تاریخ سلاطین آل عثمان معہ حالات جنگ ترکان احرار دیونان جسمیں ۳۷ سلاطین ترکی، غازی مصطفی کمال اور غازی انور پاشا کی نہایت اعلیٰ تصاویر کے علاوہ مسجد (یا صوفیہ) قسطنطنیہ اور شہر انگورا کا نقشہ بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کی ابتدا کیسے ہوئی۔ ترک کون تھے۔ کہاں سے آئے۔ اور کب مسلمان ہوئے۔ سلطان عثمان خاں بانی ترکی کی ابتدائی حالت۔ اس کا حسب نسب۔ اس نے کس طرح بادشاہی حاصل کی۔ قیصر قسطنطنیہ کی امداد کیلئے عیسائیوں کی یورش۔ صلیب و ہلال کا زبردست معرکہ۔ حق و باطل کا مقابلہ۔ اسلام کی فتح۔ غرضیکہ اس طرح ۳۷ سلاطین کی زمانہ حکومت میں جو فتوحات اور مشہور لڑائیاں ہوئیں ان کے حالات۔ سلطنت کے زوال کا باعث۔ شہید قوم انور پاشا کی سوانحعمری۔ اس کے بعد یورپ کی ہولناک جنگ کی تاریخ۔ ترکوں کا نقصان۔ اتحادیوں کی ترکی کو ہضم کرنیکی سازش۔ کمال اتاترک کی بہادری اور انکی مفصل سوانحعمری آخر میں سلطان عبدالمجید خاں آخری خلیفہ کی معزولی کے درد ناک حالات وغیرہ۔ قیمت ایکروپیہ۔

مجموعہ خواب نامہ صدیقی ہر قسم کے خواب اور انکی تعبیر اور علم قیافہ کا مفصل حال۔ قیمت عہ

تاریخ مکہ معظمہ شہر مکہ کے شروع سے لیکر آج تک کے مفصل حالات مع نقشہ جات کے عمارات۔ قیمت [illegible]

تاریخ مدینہ منورہ شہر مدینہ منورہ کی مفصل تاریخ جس میں مسجد نبوی اور شہر مدینہ کا فوٹو بھی شامل ہے۔ بہت نایاب کتاب۔ قیمت ایک روپیہ۔

مقدمات عبدالحق مولوی عبدالحق صاحب بی اے مدیر رسالہ اردو کے ان مقدمات کا مجموعہ جو شروع سے ابتک تحریر فرماتے ہیں۔ قیمت ہر دو حصہ پانچ روپیہ۔

نظر کے دھوکے جناب بدر شکیب بی اے کے باتصویر افسانوں کا مجموعہ۔ اتنی حسین اور باتصویر کتاب آجتک شائع نہیں ہوئی۔ قیمت عہ۔

جدید اردو شاعری عبدالقادر سروری بی اے، ایل ایل بی پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ نے جس عرق ریزی اور جانکاہی کے ساتھ اس کتاب کو مرتب فرمایا ہے وہ صد ہزار تحسین ہر زبان کے ارتقار کی صحیح تاریخ۔ جذبات و خیالات کا آئینہ۔ عروض کی مختصر تفسیر، ردیف و قوافی کا آسان سبق۔ ملک کے نامور شعراء کی زندگی کے حالات معہ نمونہ کلام۔ قیمت تین روپے۔

غنچۂ تبسم مولانا سید تمکین کاظمی کے مزاحیہ رنگ کے دلکش افسانوں کا مجموعہ قیمت دو روپے۔

کردار افسانہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ افسانہ کی نوعیت اور اشخاص افسانہ کے کردار پر بحث۔ ملک کے مشہور افسانہ نویس کی عالمانہ انداز سے تنقید۔ از عبدالقادر سروری ایم اے قیمت عہ۔

دل پھینک مصنفہ شوکت تھانوی۔ بیحد دلچسپ اور چلبلا ناول ہے۔ ایک دل پھینک عاشق نوجوان کی ہمائی دل پھینک تک نظر آئیگی جس میں ایک نوجوان نواب صاحب عالی خاندان اور تعلیمیافتہ لڑکیوں کے ایک گروہ میں اس طرح گھیر دیا گیا ہے کہ ان کی حالت شیش محل میں ایک کتے کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس ایک افسانہ میں دراصل چار ضمنی افسانے بھی گویا ادھیڑ دیئے گئے ہیں تعلیمیافتہ لڑکیوں کی مہذب چہلیں، ظرافت کا سلیقہ ہوا مذاق اور ایک بدحواس عاشق کے کارنامے۔ قیمت ایک روپیہ۔

دنیا جاہ مصنفہ شوکت تھانوی۔ مصنف کا قول ہے کہ میں اپنے اس مسلسل افسانہ کو ان بہنوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جن کے شوہر اپنی دوسری شادی کا ارادہ کر چکے ہیں یا جن کے شوہر علانیہ طور پر دوسرا محل بنا چکے ہوں۔ یا جن کو اپنے شوہروں کے متعلق ثانی کا شبہ ہو۔ مصنف کی دلچسپ ترین تصنیف۔ قیمت عہ۔

تمر خاں یہ بھی مسٹر شوکت تھانوی کا تازہ ترین دلچسپ ناول ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

کتب ... ... کی تحریروں اور تحقیقوں کے پندرہ بیش بہا ... حیات کی اکسیر ... تفسیر۔ اس میں ... بچوں کے جسمانی ... ان کے علاوہ بچپن لئے ان کا ...

کا لقب دیکر انسان نے ہمیشہ کیلئے مسرت سے محروم کر دیا۔ از پروفیسر عابد علی ایم اے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

معاشقۂ نپولین شہنشاہ نپولین بوناپارٹ کی حیات معاشقہ کی دلچسپ تصویر۔ قیمت ۶ر۔

صبح ترکی (مصنفہ مسٹر محمد مارماڈیوک پکتھال سابق اڈیٹر بمبئی کرانیکل) مترجمہ قاضی اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے پروفیسر سنٹ اسٹیفن کالج دہلی۔ یہ ایک نہایت ہی دلچسپ دلکش اور روح پرور افسانہ ہے جس میں ترکی معاشرت، ترکی تمدن اور مجلسی علی کے حیرت انگیز حالات درج ہیں۔ اگر آپ ترکوں کے اخلاق حسنہ اور ان کے مجاہدانہ کارناموں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ کیجئے۔ قیمت عہ۔

عورتوں کی شاعری عورت جذبات کی ملکہ ہے۔ وہ فطرتاً بہ نسبت مرد کے نرم واقع ہوئی ہے اور اسی لئے حسن و سرور، رنج و الم، غضب فرحت اور موت و حیات کے جو واقعات سامنے آتے ہیں ان کا اثر عورت پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ انہی اثرات کا نام جذبات ہے۔ اس مختصر تصنیف میں ۳۰ خواتین کا کلام اور ان کے مختصر حالات بڑی تحقیق اور جانفشانی کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔

غدر کی دکھیا اسلامی سلطنت کے آخری چراغ کی تباہی کا درد ناک منظر۔ لوٹ مار، غارتگری۔ امراء و شرفاء کو پھانسیاں، بیگناہوں کی بربادی۔ باغیوں کے ظلم و ستم اگر آپ غدر کی دکھیا پڑھیں گے تو آنکھ سے آنسو نہیں تھمیں گے۔ یہ وہ دردناک واقعہ ہے اگر پتھر کا کلیجہ ہو تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ قیمت ۸ر۔

بادۂ خیام فلاسفر اعظم خیام کی دو سو آٹھ چیدہ رباعیوں کی پُر کیف شرح جو شاید آجتک آپکی نظر سے نہ گذری ہوگی درج کی گئی ہے۔ خیام جیسے بلند پایہ شاعر کے کلام کی شرح کوئی معمولی بات نہیں۔ ایک ایک مصرعہ ہزار ہزار معنوی پہلو رکھتا ہے۔ اس کتاب میں رباعیات کے مطالب و معارف انوکھے انداز بیان میں تحریر ہیں۔ عہ۔

تہذیب المجالس آجکل کے بچے مغربی تہذیب کی بدولت بزرگوں کا ادب، گفتگو کرنے کا سلیقہ، آداب طعام اور علم مجلس سے قطعی ناآشنا ہیں۔ تہذیب و اخلاق نام کو نہیں اس کتاب میں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے سونے۔ لکھنے اور بولنے کے آداب اور ہر قسم کی مجلس کے آداب کا بیان نہایت عمدہ طریقے سے کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۰ر۔

محمد علی جوہر سب مولانا کے وہ جاں نثار جو ان کی صحیح تصویروں اور پوری زندگی سے واقف ہونا چاہیں تو یہ کتاب ضرور پڑھیں۔ عام فائدہ کیلئے قیمت بہت کم رکھی ہے۔ ابتدائی زندگی سے عہد آخر تک کے مسلسل واقعات مع اہم مقالات ضروری تفصیلات مختلف مضامین نظم و نثر اور مختلف عہد کی ... تصاویر ...

تعلیم مضمون نگاری

[illegible] مولانا [illegible] حسین [illegible] ادیب [illegible] شا وغیرہ کے تجربات ملی، انکی تنقیدی مضامین کے طریقے اور [illegible] قواعد بخوبی درج ہیں۔ اس کتاب کی ہدایتوں پر عمل کرنے سے ہر مبتدی کو مضمون لکھنا آجائیگا اور بہت جلد بہترین انشاء پرداز بن جائیگا۔ قیمت ۱۰/

تعلیم تقریر

تقریر وہ جادو ہے جو دنیا کو مطیع کر لیتا ہے اس کتاب میں پبلک تقریریں۔ انتخابی تقریریں پارلیمنٹری تقریریں۔ اصلاحی تقریریں۔ سوشل تقریریں۔ مولانا ابو الکلام آزاد اور مسٹر جناح مرحوم کی تقریریں، اصول اور قواعد درج ہیں جس پر عمل کرنے سے تھوڑے ہی عرصہ میں نو آموز مبتدی بھی کامیاب خطیب مقرر اور مشہور لیکچرار بن سکتا ہے۔ ۱۰/

شاعری

یہ ایک عجیب و غریب کتاب ہے۔ اس کے مطالعہ اور تھوڑی سی مشق کے بعد آپ ایسے شاعر بن جائیں گے کہ جس محفل میں شعر کہیں گے لوگ واہ واہ کریں گے۔ اس کتاب میں شاعری کے ضروری قواعد و ضوابط تقطیع، وزن، امثال، تشبیہہ۔ اصول شعر تخلص وغیرہ کے متعلق مفید معلومات درج ہیں اور مشاہیر ہند کے خیالات بھی ہیں۔ قیمت ۸/

عربی ٹیچر

اس کتاب سے عربی بولنا۔ عربی لکھنا، عربی پڑھنا۔ عربی الفاظ کا ترجمہ کرنا بخوبی آجاتا ہے۔ ایک مہینے کی مشق میں مبتدی باسانی عربی لکھ پڑھ سکتا ہے۔ نہایت آسان طرز بیان اور قواعد و ضوابط درج ہیں اور مصر، حجاز، بیت المقدس اور علمائے عرب اور مشہور عربی ادیبوں کے اقوال بھی درج ہیں۔ قیمت عہ/

انشائے بخاری

خطوط نویسی، القاب و آداب، نجی خط و کتابت عدالتی تحریریں، رسیدیں، اسٹامپ وغیرہ لکھنے کا طریقہ اور مہر کے متعلق احکام شرعی اور قانون مہر انگریزی مروجہ درج ہے۔ اس کتاب میں مہر کی اہمیت اور اس کے رموز و نکات پہ [illegible] کی [illegible] ہے بلکہ [illegible] کے متعلق مفید کتاب منگائیں۔ قیمت ۱۲/

مقالات نبوی

[illegible] سے زائد آثار نامدار کے اقوال درج ہیں۔ [illegible] بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ سے انتخاب کر کے [illegible] گئے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو پر ایسی نادر و نایاب نصیحتیں ہیں کہ ایک [illegible] حدیث مبارک سونے کے حروف سے لکھنے اور آنکھوں سے لگا کر [illegible] ہیں۔ ہمارے مغربی فلاسفر آپ کے مقالوں کو پڑھنے کے بعد آپ [illegible] فلاسفروں کو بھول جائیں گے۔ قیمت ۱۲/

[illegible] حسین

کربلا کی تپتی ہوئی ریت پر خون شہدا کی گلکاریاں۔ [illegible] کوفیوں کے ہاتھوں [illegible] سال کی [illegible] [illegible] آپ کی [illegible]

[illegible]

تفصیل قیامت

[illegible]

[illegible] کے [illegible] سے [illegible] [illegible] عدالت [illegible] کی سزا [illegible]۔ اس [illegible] حالات [illegible] معلوم [illegible] کتاب [illegible]۔ قیمت ۸/

تسخیر کامل

[illegible] حاکم کو محکوم بنانے کیلئے [illegible] ہوئے شوہر کیلئے [illegible] شوہر کو [illegible] آفات آسمانی سے نجات کے لئے تیر بہدف ہے۔ کلام ربانی کے اوصاف سے کون ہے جو انکار کر سکتا ہے۔ جو لوگ [illegible] اعمال سے مایوس ہو کر بیٹھ گئے ہوں وہ اسے ضرور منگائیں۔ ۸/

عیسائی آشرم

پادریوں کے شرمناک [illegible] حالات زندگی [illegible] زرین [illegible] ایک عیسائی [illegible] نے اپنی آپ بیتی کی صورت میں بے نقاب کیا ہے۔ مقدس عیسائی پادریوں کی ناپاک زندگی۔ رات کی تاریکی میں کلیساؤں میں شرمناک [illegible] نے خود نوشتہ سوانح عمری میں بے نقاب کی ہیں۔ عجیب حیرت انگیز [illegible]

روزنامچہ شیطان

یہ کتاب شیطان کی [illegible] کی مختصر رپورٹ ہے۔ جس میں [illegible] کہ کس طرح شیطان انسان کے بھیس میں آکر لوگوں میں فتنہ و فساد برپا کرتا ہے اور دنیا کو گمراہ کرنے کے لئے کیسے کیسے خطرناک جال پھیلاتا ہے۔ ایک مزاحیہ افسانہ ہے [illegible] عبرت اور سبق آموز۔ ۶/

فرضی صوفی کی ڈائری

یہ اس [illegible] صوفی کی مزاحیہ ڈائری ہے جو صوفیائے کرام کو بدنام کرنے کے لئے اپنے دامن تقدس کی آڑ میں دنیا کو [illegible] [illegible] اور شریف عورتوں کو پھسلا کر عصمت دری کرتا ہے اور ان سب کے انکشافات خود ہی [illegible] پوشیدہ ڈائری میں ایسے مزاحیہ انداز میں کئے ہیں کہ آپ ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ جائیں گے۔ قیمت صرف ۸/

ساغر محبت

یہ محبت میں ڈوبے ہوئے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں لیلی مجنوں، شیریں فرہاد، رانجھا ہیر اور اس کے [illegible] عاشقوں کی داستان عشق کے علاوہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق بہت سے خطوط ہیں۔ زن و شوہر کے خطوط، باپ بیٹے کے خطوط، عاشق و معشوق کے خطوط وغیرہ وغیرہ۔ [illegible] ایک نہایت ہی [illegible] انداز میں [illegible]۔ قیمت صرف ۸/

علم رمل

انگریزی، اردو، ہندی کی [illegible] برس سے بہترین [illegible] کے ساتھ [illegible] حاصل کرنے [illegible]

[illegible]

[illegible] سوال [illegible] علم [illegible] جواب [illegible] ہے [illegible] کون ہے ۔ [illegible] ان کے علاوہ ہر قسم کے سوال کا جواب [illegible] ۔ قیمت [illegible]

علم پامسٹری علم الید کے متعلق ماہرین فن کے تجربات علوم مشرقی و مغربی [illegible] ہاتھوں کے نقوش کی قلمی تصویریں [illegible] کی تصاویر علامات اور کیریکٹر کا مفصل ذکر [illegible] خیالات کا تذکرہ ۔ اور مفید تجربے نہایت عمدہ انداز میں تحریر ہیں ۔ قیمت ایک روپیہ ۔

قصائد عزیز عزیز لکھنوی مرحوم کے قصائد اور قطعات کا مجموعہ ہے ۔ اکثر نظمیں نعتیہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی شان میں ہیں ۔ طباعت اعلیٰ ۔ قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنہ ۔

گلکدہ جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی کا کلام ۔ عزیز کی شاعری دنیا میں تعریف و توصیف سے مستغنی ہے ۔ ان کی ادبیت ۔ زباندانی چاردانگ عالم میں مشہور ہے ۔ قیمت معمولی ایڈیشن عہ مجلد اعلیٰ عا ۔

دردناک افسانے مشہور ادیب جناب نسیم انہونوی کے ۱۰ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ۔ مع مقدمہ حضرت شوکت تھانوی ۔ قیمت مجلد دو روپئے ۔

ابتدائی تعلیم کی رام کہانی از منشی رام پرشاد صاحب بی ۔ اے ۔ دیہاتی مدارس کا سچا نقشہ ۔ گاؤں کی حالت اور مدرس کے کام ۔ ہر مضمون کے پڑھانے کا طریقہ اور مدرسے کی کامل اصلاح کی لاجواب تجاویز ۔ یہ کتاب ماہرین تعلیم نے بے انتہا پسند کی ہے ۔ ہر دیہاتی مدرس کے پاس ہونی چاہئے ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے ۔

عروس کابل شاہ امان اللہ خان اور ملکہ ثریا کا معاشقہ اور شادی ۔ قیمت عہ ۔

امان اللہ خاں کی غمناک داستان شاہ امان اللہ خاں کے بے تاج و تخت ہونے کی داستان ۔ قیمت ایک روپیہ ۔

انقلاب کابل تاریخ کابل از ابتدا تا حادثہ قتل امیر حبیب اللہ خاں ۔ قیمت عہ ۔

محبوبۂ کربلا [illegible] کے تاریخی ناول کا ترجمہ جس میں کربلا کے [illegible] کے گئے ہیں ۔ عہ ۔

انگریزی افسانے [illegible] مصنفین کے منتخب افسانوں کا [illegible] کتاب ہے ۔ قیمت فی پرچہ چھ (۶) آنے

ہوش کے ناخن اس ڈرامہ میں حیدرآباد دکن کی زندگی کو بعض مخصوص پہلوؤں کو نہایت لطیف پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے ۔ قیمت دس آنہ ۔

اردوئے قدیم قدیم شعرا اور مصنفین کے صحیح حالات اور اردو زبان کی عہد بعہد ترقیوں کا تذکرہ ۔ قیمت عہ ۔

دنیائے افسانہ افسانہ کی تاریخ ، اس کی روز بروز ترقی کی وجہ ، افسانہ نگاری کے اصول اور مبادیات پر اس فن کی بہترین کتاب ہے ۔ قیمت ایک روپیہ ۔

کردار افسانہ یہ دنیائے افسانہ کا گویا دوسرا حصہ ہے ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ۔

چینی افسانے مشرق بعید کے پُر اسرار ممالک چین و جاپان کے چیدہ قصوں کا مجموعہ ۔ قیمت نو آنہ ۔ ۹ر

قدیم افسانے مصر ، یونان ، روما ، ہندوستان ، ایران اور عرب کے ۲۵ قدیم افسانوں کا مجموعہ ۔ از مولوی عبد القادر صاحب سروری ۔ قیمت عہ ۔

مئے دو آتشہ حکیم عمر خیام کی رباعیات کے ترجمے ۔ از جناب شوکت صاحب بلگرامی ۔ قیمت عہ ۔

دو ڈرامے روسی زبان کے دو بہترین ڈراموں کا ترجمہ ۔ جس طرح روسی افسانے ایک خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں ۔ اسی طرح ڈرامے بھی معاشرتی مسائل سے لبریز ہوتے ہیں ۔ ان دونوں ڈراموں میں یہ خصوصیت نمایاں ہے ۔ قیمت ۸ر

پیکار گالزوردی کے ڈرامہ کا ترجمہ ۔ مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش ۔ یہ مصنف کی مشہور ترین تصنیف ہے جو ہر طرح قابل مطالعہ ہے ۔ قیمت ایک روپیہ ۔

قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں اس میں قلعہ معلیٰ کی تمام شاہی عمارات کو دیکھیں گے اور اس کی چار دیواری میں بادشاہ ، شہزادے اور شہزادیوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں بسر کرتے پائیں گے ۔ حکومت کے انداز و شجاعت اور دلیری کے کارنامے عدل و انصاف کے نقشے ، شاہی معاشرت اور تمدن اور قلعہ معلیٰ کی جیتی جاگتی تصویریں آپکی نگاہوں میں پھرنے لگیں گی ۔ قیمت ۱۲ر

(۵۳) **تاریخ اسلام** اردو میں اپنی نوعیت کی بے مثل تاریخ جس میں نہایت اختصار کے ساتھ پوری اسلامی تاریخ مسلسل درج ہے ۔ اس میں بڑی بڑی تاریخوں کا خلاصہ پیش ہے ۔

(۵۶) اعتبار سے یہ طلبا اور دیگر اہل علم کیلئے

(۵۷)

(۶۲) **تاریخ خلافہ**

قیمت	نام کتاب
[illegible]	تالار
۴ر	بیگمات کا آنسو
۱۰ر	بلبل بیمار
عہ	سیاحت ہند
۶ر	یادگار تمدن
عہ	گرداب
۴ر	نشیب و فراز
۶ر	بساط حیات
۱۲ر	حور اور انسان
۸ر	دادا لال بجھکڑ

مولانا کی دیگر مشہور کتابیں

قیمت	نام کتاب
عہ	آفتاب دمشق
عہ	سمرنا کا چاند
۴ر	گوہر مقصود
۶ر	لڑکیوں کی انشاء
۳ر	سوکن کا جلاپا
۱۲ر	ماہ عجم
۸ر	سنجوگ
۱۰ر	قطرات اشک
۶ر	شاہین و دراج
۴ر	شہنشاہ کا فیصلہ
۵ر	سودائے نقد
۵ر	منظر طرابلس
۸ر	دُرِ شہوار
عہ	شہید مغرب
عہ	تیغ کمال
۱۲ر	بوہ خداوند
عہ	عروس کربلا
عہ	یاسمین شام
عہ	…من کا دم واپسیں
عہ	…داح ظفر
[illegible]	…ب حزیں
۵ر	…اج خاتون
عہ	…مرا
۴ر	…ستان کی مائیں
۸ر	…بس کی شہزادی
عہ	…یدہ کا لال

قیمت	نام کتاب
عہ	آمنہ کا لال
۴ر	گرفتار قفس
۱۰ر	روداد قفس
۸ر	گلدستہ عید
۸ر	نسوانی زندگی
عہ	طوفان اشک
عہ	سیلاب اشک
عہ	جوہر عصمت
۴ر	چار عالم
۴ر	ویڈیا کی سرگذشت
۴ر	بچہ کا کرتہ
۴ر	منازل ترقی
۲ر	ولایتی شفی
۸ر	فسانہ سعید
۲ر	انگوٹھی کا راز
۸ر	سراب مغرب
۸ر	بنت الوقت
۵ر	تفسیر عصمت
۷ر	مؤودہ
۷ر	ستونتی
۱۲ر	بیلہ میں میلہ
۸ر	سات روحوں کے اعمالنامے
۱۲ر	نغمہ شیطانی
۱۲ر	نوحہ زندگی
عہ	منازل السائرہ
عہ	〃 حصہ دوم
عہ	جوہر قدامت
عہ	طوفان حیات
عہ	شب زندگی اوّل
عہ	شب زندگی دوم
عہ	شام زندگی
عہ	صبح زندگی
عہ	حیات صالحہ

مولانا نذیر احمد

قیمت	نام کتاب
عہ	ایامی
عہ	ابن الوقت
عہ	رویائے صادقہ

قیمت	نام کتاب
[illegible]	منتخبات
عہ	توبۃ النصوح
۱۰ر	مراۃ العروس
۱۲ر	بنات النعش
صہ	لیکچروں کا مجموعہ
۸ر	پند ہند
۸ر	منتخب الحکایات

مولانا بشیر الدین احمد

قیمت	نام کتاب
عہ	اقبال دولہن
عہ	حسن معاشرت
[illegible]	لخت جگر
[illegible]	تاریخ دہلی
عہ	تاریخ بیجاپور
عا	حکایات لطیفہ
عا	لطائف عجیبہ

مولوی عبدالحلیم شرر

قیمت	نام کتاب
۱۰ر	جویائے حق کامل
۱۲ر	فتح اندلس
۸ر	ماہ ملک
۱۲ر	یوسف و نجمہ
۸ر	قیس و لبنیٰ
صہ	فلورا فلورنڈا مجلد
۸ر	طاہرہ
۸ر	ملک العزیز ورجنا قسم اول
۸ر	فردوس بریں
۴ر	حسن انجلینا
۳ر	حسن بن صباح
۳ر	شہید وفا
۲ر	بدرالنساء کی مصیبت

دیگر مصنفوں کی مشہور کتابیں

قیمت	نام کتاب
۱۲ر	دلی کا آخری دیدار

قیمت	نام کتاب
۴ر	تماشہ بہ تماشہ
۴ر	عشق کی گولیاں
۴ر	گمنام عورت کا خط
۴ر	انکشاف حقیقت
عہ	عروس ادب
۸ر	چار انقلابی
۸ر	پُراسرار دوشیزہ
۸ر	عیار فقیر
۶ر	معاشقہ نپولین
عہ	فاؤسٹ
عہ	محبت اور نفرت
عہ	صمدانی
۸ر	سلمیٰ
۱۲ر	تحفہ نوری
۶ر	پیام عمل
عہ	تہذیب عمل
۶ر	دردناک افسانے
عہ	تمدن یورپ
۶ر	یاد رفتگاں

جو اور شادی کی مسرتیں حاصل کرنا ہوں تو مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں

شب عروسی با تصویر

پڑھنے کے بعد شب عروسی کی سب باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ شادی کے وقت عموماً دوستوں کو کچھ نہ کچھ تحفہ دیا جاتا ہے اگر آپ اپنے دوستوں کو ایسے موقع پر کوئی بہترین تحفہ دینا چاہتے ہیں تو صرف یہ کتاب دیجئے۔ شب عروسی اصل کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے یا تکمیل انسانیت کی پہلی سیڑھی ہے اگر اس کتاب کے بعد اس زینہ پر قدم رکھا جائیگا تو وہ ایسا قدم ہوگا کہ انسان کی یہ فطری محبت ہمیشہ برقرار رہیگی۔ قیمت ایک روپیہ محصول ۶ر

عورت نما با تصویر

پھولوں کی سیج پر حسن کی عنایاں دیکھنے کے پہلے معلوم ہونا ہے کہ تمام پوشیدہ اور اق سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب آپ کتاب عورت نما پڑھیں اس کتاب میں عورت کی بہترین تصویر کی کتابوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے عورت کے پوشیدہ اعضا جسم عورت کی فطرت کی زینت غرضکہ عورت کی زندگی کے متعلق کوئی بھی پوشیدہ بات ایسی نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو۔ دو سو کے قریب رنگین فوٹو ہیں۔ قیمت عہ محصول ۶ر

لذت شباب با تصویر

شباب جادواں کی جستجو ہو تو لذت شباب یعنی ہندی کوک شاستر کا مطالعہ کیجئے جس سے آپکو معلوم ہو جائیگا کہ شباب کو عرصہ دراز تک کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔ عورتوں کی اقسام کیا ہیں حسن کی ملکہ کیونکر لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ عورت اگر عورت سے اور مرد اگر مرد کی اپنی خواہش پوری کرے تو کیا خطرناک نتائج ہوتے ہیں۔ لذت شباب کو حیات تازہ بخشنے کیلئے مجرب نسخے۔ متعدد فوٹو بلاک۔ قیمت عہ محصول ڈاک ۶ر

بہار شباب با تصویر

[illegible]

امتیاز رہا ہے وہ جذبات کی چاشنی کے چیز مطالعہ کیلئے خواہ کتنی ہی لذیذ کیوں نہ ہو [illegible] کے ماتحت ہیں انسان جوانی دیوانی کو قابو میں رکھنا چاہتا ہے کہ یہ لذات قائم رہیں۔ [illegible] کیف نیز لگی اور اس کو دوام رکھنے کیلئے بہت سے مجرب نسخے بتائے گئے ہیں۔ متعدد رنگین فوٹو قیمت ایک روپیہ محصول ڈاک ۶ر

شب عروسی کے افسانے

وہ کتاب ہے جو شب عروسی کی تمام لذتوں کو یکجا کر کے نمایاں کیا ہوئی ہے اس کا دوسرا نام عروس نو ہے۔ یہ کتاب حسین لذت اور معطر جذبات کی آئینہ دار ہے شب عروسی کے متعدد افسانے ہیں۔ اپنے ہی طریق پر اس زندگی کی سب سے بہتر راتیں کے مزے لوٹے گئے ہیں فقط باتیں یا حکایتیں ہی نہیں بلکہ ہر حکایت ایک نتیجہ خیز ہے جو بہت سے آنیوالے خطروں سے محفوظ رکھتا ہے۔ عہ محصول ۶ر

دوشیزہ کی ڈائری

ایک دوشیزہ نازنین کے دل میں کس قسم کے پوشیدہ خیالات پیدا ہوتے ہیں شادی سے پہلے کیا معلوم کرنا چاہتی ہے شادی کے بعد اس کیلئے کن باتوں کا علم ضروری ہے حسن و شباب کی حفاظت کس طرح کیجاتی ہے اور دوشیزہ کی پر کیف زندگی سے عیش و عشرت کی بہار کس طرح لوٹی جاتی ہے تمام باتوں کا جواب آپکو دوشیزہ کی ڈائری میں ملیگا۔ بلاک کی ۱۶ درجن حسین دلکش تصویریں۔ قیمت عہ محصول ۶ر

سہاگن کا سہاگ

سات سہیلیوں کا جھرمٹ سات مست شباب لذیذ راتوں کی لذیذ داستانیں انہیں کی زبانی کچھ ہیں جو۔ کی لذت [illegible] سہیلیوں کی پر لطف نوک جھونک۔ حالات کنواری خاص زبان سے شب عروسی کی داستانیں ازدواجی زندگی کے اہم ترین پوشیدہ راز غرضکہ کتاب سہاگن کا سہاگ دنیائے صنفیات میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے جو شادی کو جلسے پر سات دلھنوں نے بیان کیا۔ قیمت عہ محصول ۶ر بہت کم جلدیں ہیں

برتھ کنٹرول

عورت کی شباب آفریں لذت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ تم اسکے حسن و جمال کا خزانہ کو محفوظ رکھنے کا راز سمجھ لو اولاد کی کثرت سے نہ صرف ملکہ حسن کا باغ جمال بہت جلد خزاں چھا جاتی ہے بلکہ عورت والدین پر بچوں کی پرورش وبال جان ہو جاتی ہے اور انسان ازدواجی ذوق و لذت سے محروم ہو جاتا ہے برتھ کنٹرول ایک حیرت انگیز علمی کتاب ہے جس کو پڑھنے کے بعد یقین کیساتھ اولاد کی پیدائش آپکے ہاتھ میں ہو جائیگی عہ محصول ۶ر

دلھنوں کی کانفرنس

سات دلھنوں کی شبہائے خلوت کی دلچسپ داستان ساتوں ایک [illegible] اپنے واقعات [illegible]

دلھن کی ڈائری

ایک شوخ و طرار دلھن کی آپ بیتی، شب زفاف کا پر کیف سماں کچھ شرم، کچھ ہراس، کچھ گدگدی لذت دولھا میاں کی ہیبت، باغبان عشرت کی گل چینی۔ بے صبری کے [illegible] کے مظاہر [illegible]

سہاگ کی ۱۳ راتیں

اس کتاب میں ایک نئی دلھن نے شب زفاف کی ۱۳ راتوں کے پر لطف واقعات بہت دلچسپ پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے عورت اور مرد کی فطرت اور ان کے دلی جذبات سے پوری واقفیت ہو جاتی ہے جن کو ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ [illegible]

آرائش جمال با تصویر

اس کتاب میں عورتوں کے سنگار اور جسمانی آرائش کے تمام مشرقی و مغربی طریقے بیان کئے گئے ہیں دو درجن فوٹو بلاک کی تصاویر کے علاوہ سو مجرب نسخے جو حیرت انگیز [illegible] [illegible]

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے؛
مع محصولڈاک؛ فی پرچہ ۶/
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص
نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل
خریداروں سے انکی قیمت
الگ نہیں لی جاتی؛

جلد ۲۵ | ساقی دہلی۔ بابت مارچ سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۳

قیمت فی پرچہ چھ (۶) آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

مسٹر صادق الخیری ایم۔ اے۔ بمبئی سے لکھتے ہیں۔

"فروری کے ساقی میں "ادب میں دلّی" پڑھا اور طبیعت بیحد خوش ہوئی۔ کاش آپ تنقید (............) کو بھی اپنے لئے مخصوص کرلیں۔ آپ میں وہ تمام صلاحیتیں ہیں جو قاری کو محض پڑھنے والے سے (............) بناتی ہیں۔ آپ اپنے تنقیدی مضامین میں کوئی نہ کوئی نیا پہلو نکال لیتے ہیں۔ اس مضمون میں بھی آپ کو بعض باتیں ایسی سوجھی ہیں جو بعض مصنفین کے تحت الشعور میں ہوں تو ہوں ورنہ ارادتاً ان کو علم نہ ہوگا۔ لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ آپ "قلم چور" بھی ہیں۔ خود ہرگز نہیں لکھیں گے۔ یہ مضمون آپ سے ریڈیو والوں نے لکھوالیا، چند میں نے باصرار آپ سے لکھوائے اور چند انصار ناصری نے...

... "زیبا" قسم کا مضمون کسی "سب سے زیادہ چھپنے والے" ادبی علمی وغیرہ رسالے کے لئے تجویز کر دیا ہوتا۔"

عزیز گرامی کی رائے نہایت وقیع ہے اور مشکور بھی۔ کوتاہ قلمی کا مجھے اعتراف ہے اور افسوس کہ اس میں ترمیم کی گنجائش بھی نہیں رہی۔

کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

زیرِ نظر اشاعت میں پروفیسر فراق نے بڑے کام کی باتیں کہی ہیں۔ آئندہ بھی ہم اُن کی باتوں کے منتظر رہیں گے۔ شیلا سمیر پہلی بار بزمِ ساقی میں شریک ہو رہی ہیں۔ اُن کا افسانہ "برکت" ایک دیہاتی عورت کی اندوہگیں زندگی کا ایک دلچسپ نفسیاتی مرقع ہے۔ شیلا سمیر اُردو، ہندی اور انگریزی، تینوں زبانوں میں مضمون لکھتی ہیں۔ "نئے زاوئے" میں ان کا ڈرامہ "گڑیا" شامل ہے۔ آغا محمد اشرف صاحب بی۔ بی۔ سی۔ لندن کے ہندوستانی شعبے کے سربرآوردہ رُکن ہیں۔ "وزیرِ ہند سے ملاقات" اُن کا تازہ ترین مضمون ہے۔ منٹو صاحب نے اپنے افسانے کے بدلے مضمون لکھا ہے۔ مقالہ نگاری میں بھی ان کا انفرادی رنگ قائم ہے۔ جناب نصیر الدین ہاشمی طویل غیر حاضری کے بعد بزمِ ساقی میں آئے ہیں اور قدیم دکھنی شاعری کا تحفہ اپنے ساتھ لائے ہیں۔ اشک اور احمد ندیم قاسمی کے ڈرامے موثر اور دلدوز ہیں۔ غلام یعقوب انور کا علمی مضمون قابلِ قدر ہے۔ مدھوسودن کا افسانہ "چراغ کی لَو" اور انور کا افسانہ "۱۹۴۲" جدید طرز کے عمدہ افسانے ہیں۔ حصۂ نظم حسبِ دستور چیدہ چیدہ شعرا کے کلام پر مشتمل ہے۔

ساقی اب پھر عمدہ سفید کاغذ پر چھپ رہا ہے۔ وجہ یہ کہ جس کاغذ پر پانچ چھ مہینے چھپا وہ اب صرف اخبار والوں کو دیا جائے گا۔ رسالے والے اگر چاہیں تو چھپنے سے مہنگا سفید کاغذ لائیں ورنہ رسالہ بند کر دیں۔ اور سفید کاغذ کی کیفیت یہ ہے کہ گورنمنٹ نے تو اس کا بھاؤ مقرر کر دیا ہے لیکن بازار میں سرے سے ملتا ہی نہیں۔ بڑی جدوجہد کے بعد کچھ کاغذ کارخانے سے ملا ہے اور آئندہ بھی اُمید ہے کہ اسی طرح الگ سے شوقی ہوتی رہے گی۔ جو کاغذ اِس اشاعت میں لگایا جا رہا ہے اُس کا فقدے دگنی قیمت کا ہے جو پچھلے دنوں ساقی میں لگایا گیا ہے۔ لیکن اگر یہ بھی ملتا رہے تو کسی نہ کسی طرح اس زیرباری کو بھی گوارا کر لیا جائے گا۔

شاہد

ضروری اعلان

جو مسودے ساقی کے لئے موصول ہوتے ہیں انہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم اس بارے میں دفترِ ساقی کوئی ذمہداری نہیں لیتا۔ اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔

جو مضامین قابلِ اشاعت قرار پائیں گے صرف اُنہیں کے بارے میں مزید مراسلت کی جائیگی۔ مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجنے چاہئیں۔

ساقی ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیجا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہنچنے کی شکایت ۱۵ تاریخ تک کرنی چاہیئے۔ اسکے بعد دوبارہ پرچہ نہیں بھیجا جائیگا۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہ ہوگی۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے۔

باتیں

۱

اُردو ادب، خاص کر اُردو شاعری پر ایک مدت سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس میں بدیشی زندگی، بدیشی مناظر، بدیشی روایات، بدیشی طرزِ خیال کی بھرمار ہے اور وطنیت کا فقدان ہے۔ وطن کی زندگی اور وطن کے مناظر کی اُردو ادب میں کمی یا فقدان کو ہم ایک اہم اور بڑی کمی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بدیشی زندگی، بدیشی مناظر، بدیشی روایات، بدیشی چیزوں کا ذکر و بیان، بدیشی طرزِ خیال اور عربی فارسی کے بدیشی الفاظ، فقرے، طرزِ بیان اور اصنافِ سخن کو اگر ہندوستان کی باشندہ مایۂ ناز زبان اُردو نے اپنایا تو یہ ہندوستان کے کلچر اور تہذیب میں [illegible]ںگیاں بہا اضافہ ہے۔ کسی ملک کی کائناتِ خیال کا ملک ہی کی چہار دیواری کے اندر محدود و محبوس ہو جانا اُس کی زندگی میں پامالی اور افسردگی پیدا کر دے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ زندگی "گرمِ تماشا" ہو جائے "کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو"۔ ہندوستان جنت نشان کی گوناگوں جھلکیاں، رنگا رنگ ہم آہنگیاں ایسی چیزیں ہرگز نہیں کہ انہیں نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کر دیا جائے۔ اُردو ادب نے نظیر اکبر آبادی کے ہاتھوں وطن کی زندگی کو اپنایا تھا۔ پھر حالی، اقبال، چکبست، منشی درگا سہائے سرور، جوش ملیح آبادی اور متعدد اُردو شاعروں نے اُردو ادب میں ہندوستانیت کی جھلکیاں دکھائیں۔ ان کی کوشش بار آور ہوئی ہے اور یہ بیل منڈھے چڑھتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ لیکن بدیشی چیزوں کے صحیح اور مناسب اکتساب سے کلچروں اور تہذیبوں میں نئی روح دوڑ جاتی ہے، رنگ اور شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور ان کی وسعتِ نظر بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے [illegible] و جم، میکدہ و ساقی، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، فرشتے، قیامت، دوزخ و جنت، دجلہ، ظلمات، طور و موسیٰ، حسین و کربلا، کعبہ و کلیسا، یزدان و اہرمن، آدم [illegible]، ختن و تاتار، سدِ سکندری، آئینۂ سکندری، [illegible] نوح، [illegible]، خضر اور آبِ حیات، سرو و شمشاد، سنبل و نرگس، [illegible] محراب، قبائے تنگ و دستارِ محبوب، وغیرہ سینکڑوں چیزوں کے [illegible] اور ان کی داخلیت، معنویت اور ہمہ گیری و آفاقیت سے ہمارے شعور [illegible] کر کے ہماری زندگی میں اُردو ادب نے نئی فرزانگی، نئی بصیرت، نئی وسعت، نئی بلندی، نیا زور پیدا کیا۔ شرط صرف یہ ہونی چاہئے کہ بدیشی اپنا [illegible] اکتسابِ حیات اور فطرت اور [illegible] انگریزی ادب و تہذیب کے ایک [illegible] میں حقیقی ہو جانے کی صفت ([illegible]) کا شہرہ

انگریزی شاعر و مفکر میتھو آرنلڈ عمر بھر روتا رہا۔ وہ کہتا تھا کہ انگلستان یورپ کا جزو ہے محض ایک جزیرہ نہیں ہے۔ کاش ہم بھی یہ سمجھتے کہ ہندوستان ایشیا کا ایک جزو ہے کوئی الگ تھلگ ملک نہیں ہے۔ اب تو یہ زمانہ ہے کہ ایشیا اور یورپ بھی الگ الگ رہ کر جی نہیں سکتے۔ اب اس محدود قومیت اور وطنیت کا زمانہ گیا جب رنگ روپ میں ذرا سی بھی تبدیلی آتے ہی ہم اپنے آپ کو بدیشی سمجھنے لگتے تھے۔ ایسی [illegible] وطنیت ہمارے کام نہیں آ سکتی۔ اپنا ایک شعر عرض کرتا ہوں جس میں نئی اور وسیع تر وطنیت کی طرف اشارہ ہے۔ ؎

نئی منزلوں کو سکونِ وطن دے
ٹھہرنا نہیں ہے یہ ہے دورِ [illegible]

۲

حضرت جگر مراد آبادی کا یہ شعر بہت مشہور ہوا ہے۔ ؎

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

لیکن کسی کے اس شعر سے کتنے لوگ واقف ہیں ؎

باغِ عالم میں بڑی چیز ہے یہ اے بلبل
گل تو گل خار سے بھی رابطہ پیدا کرنا

میری ناقص رائے میں تو جگر کا شعر اس شعر کو نہیں پہنچتا۔ [illegible] کے [illegible] نے شعر کو جگر کے شعر سے کہیں زیادہ [illegible] ہو۔ یہ شعر جگر کے شعر سے بارہ تیرہ برس پہلے میں نے کانپور کے ایک مشاعرے میں سنا تھا۔

اسی طرح غالب کا یہ شعر ہزاروں آدمی مزے لے لے کر گنگناتے اور پڑھتے ہیں۔ ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

شوخی اور بذلہ سنجی کی یہ شعر بہترین مثال ہے۔ اصغر مرحوم کا بھی ایک شعر ہے اور خوب ہے، وہ کہتے ہیں ؎

خبر کسی کو نہ ہوئی کنارِ شوق میں آ
جہاں میں چشمِ مہ و مہر باز بستہ رہے

شعر کے تصور و تخیل میں "چشمِ مہ و مہر" نے جو آفاقیت پیدا کر دی

ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ذرا میر کا یہ نرم و سادہ شعر سنئے۔

؎ وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

اب بتایئے غالب اور اصغر کے اشعار میر کے شعر کو پہونچ سکے یا نہیں؟ ایک ایک لفظ تحیر، اور ایک تشنہ و ناکام مانوسیت و قربت کے احساس سے تھرتھرا رہا ہے اور جس زبردست حقیقت کی طرف میر کا دوسرا مصرع اشارہ کر رہا ہے اس کا تو غالب اور اصغر کے ہاں پتہ بھی نہیں۔ میر کی اسی مدرک دور رسی کے باعث تو "مضمون آفریں"، "معنی آفریں" اور طباع شعرا میر سے ناخوش رہتے ہیں۔ ہاں غالب کا ایک دوسرا شعر صرف اس لئے اُن کے مندرجہ بالا شعر سے بڑھ گیا ہے کہ اس میں غالب نے صاف صاف میر کی آواز سے اپنی آواز ملانے کی کوشش کی ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

؎ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

غالب پرستوں کے بارے میں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ باتیں اُنھیں کیسی لگیں گی۔ لیکن اگر غالب زندہ ہوتے تو وہ میری بات سے خوش ہوتے، کیونکہ غالب کا مرتبہ اور غالب کی نظر غالب پرستوں کے مرتبہ و نظر سے بلند تھی۔ مگر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ مدعی سست گواہ چست۔

(۳)

اُردو کی عشقیہ شاعری میں ایک اور نیک شگون کا آغاز کچھ دنوں سے ہوا ہے۔ اُردو شاعری میں یوں تو شروع ہی سے معشوق کے ساتھ شعرا خوب خوب کھُل کھیلے ہیں اور میر کی آہ کے ساتھ سودا کی واہ بھی فضا میں گونجتی ہوئی سُنائی دیتی ہے۔ لیکن میر ہوں یا سودا، مصحفی ہوں یا انشا، غالب، مومن یا ذوق ہوں، جرات، ناسخ یا آتش ہوں، امیر ہوں یا داغ یا ریاض، حسرت، شاد عظیم آبادی، فانی، جگر، کوئی بھی ہو سب کے یہاں معشوق کچھ ایسی فطرت کا ہے کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا، پُٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا۔ بس دیکھئے اور ترسیئے یا اس کے ساتھ زبردستی کھُل کھیلئے، ہاتھاپائی کیجئے، دھول دھپا کیجئے۔ لیکن خود معشوق کے مزاج اور برتاؤ میں کوئی رس اور کوئی نرمی، لچک، خلوص، سپردگی، سوز و گداز، عاشق پرستی، سچائی، وفاداری کا پتہ عموماً نہیں ملتا۔ شاذ و نادر ایسی غزلیں ضرور مل جاتی ہیں جن میں معشوق کی فطرت میں درد اور گھلاوٹ کا پتہ دیا گیا ہے۔ جیسے غالب کی وہ غزل۔ ع۔

"ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے"

یا جگر مراد آبادی کی غزل۔

ع "حسن بھی بیتاب ہے اور کس قدر میرے لئے"

لیکن ایسی چیزیں بہت خال خال ہیں۔ ایک بات میں اور شروع ہی سے محسوس کرتا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ غالب سے پہلے تک کے دہلوی شعرا کے کلام سے عموماً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان شعرا کے دلوں میں نرمی اور گھلاوٹ تھی ان کی فطرت میں ایک خلوص اور سپردگی تھی۔ لیکن یہ بات لکھنؤ کے شعرا کے یہاں مفقود ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں وہ نیکی و نرمی، وہ گھلاوٹ، وہ سپردگی نہیں۔ دہلوی شعرا میں سب سے زیادہ اکڑ مجھے مومن کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں ایک سختی ہے اور ایک نہایت ناخوشگوار اکڑ ہے۔ اسی طرح جگر مراد آبادی کا کلام اپنے چند دیگر محاسن کے باوجود اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ جگر کی فطرت اور جگر کا دل دونوں بہت کڑے ہیں۔ اصغر مرحوم کا کلام بھی بتا رہا ہے کہ وہ انسان کے لئے نہایت کڑا دل رکھتے تھے اور اس عیب پر کبھی خدا یا اُس کے جلوؤں کے سامنے تحیر، فتادگی اور سجدے کے جذبات کا اظہار کر کے پردہ ڈالتے تھے۔ ہاں تو وہ نیک شگون جس کا اُردو کی عشقیہ شاعری میں کچھ دنوں سے آغاز ہوا ہے وہ یہ ہے کہ فراق کی نظموں میں اور بسا اوقات غزلوں میں معشوق کی فطرت میں شرافت، نیکی، نرمی، خلوص، درد محبت، سچائی، وفاداری، عاشق پرستی، سوز و گداز، رس اور جس کا احساس اور اظہار ہمیں ملتا ہے۔ اب معشوق نہ محض ایک کھلونا ہے نہ ایسا پتھر کا بُت ہے جس کے دل نہ ہو، نہ محض محو خود آرائی و خود بینی ہے۔ اب تو محبت اور خلوص اور وفاداری میں وہ عاشق سے کسی طرح کم نہیں بلکہ عاشق سے بڑھکر ہے۔ ؎

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرق ناز و نیاز بھی
کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا وہیں حُسن خاک بسر بھی ہے

اس کے ساتھ وہ اکلوتی، بلند آہنگ خشونت اور ہیکڑی پن بھی جو غزل اور اُردو شاعری کے لہجے سے مفقود ہو چلا ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے یہاں تک کہ خود اقبال کا اتباع جہاں ہو رہا ہے وہاں لہجے کی اس سختی اور کرختگی سے لوگ احتیاط برتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو بسا اوقات اقبال کے یہاں ملتی ہے اور جسے شاید اقبال مجازیت اور فلسفہ خودی دونوں کا ایک اہم عنصر سمجھتے تھے۔ لیکن اقبال کی آواز متعدد موقعوں پر رس، جس، نرمی اور تھرتھراہٹ لئے ہوئے ہوتی ہے۔ کہیں ایک ہی پیکر میں دو اقبال تو نہیں تھے؟ اب لوگ بلند پروازی کے ساتھ انسانیت کی تھرتھراہٹ آواز میں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ بے پایانی اور مانوسیت کا امتزاج شاعری کو عظمت دیتا ہے۔ عالم شاعری عالم جبروت نہیں۔ شاعری ہماہمی اور تیکھے بول کا نام نہیں ہے۔ عشقیہ شاعری سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو بھی ہو رہی عمل،

پیغام عمل، کسی فرد یا ملت یا قوم کو، انسانیت کو جگانے کے لئے گلا پھاڑ کر چلانے، کڑی آواز سے پکارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس قوم کی نیند کڑی اور کرخت آواز سے ٹوٹے گی وہ قوم جاگ کر بھی نیم وحشیانہ حالت ہی میں رہیگی اور سخت عمل و جہالت کرنے کر بیٹھے گی۔ قوموں کو بہت نرم آواز سے جگانا چاہیئے۔ اقبال کی فرزانگی اور حالی کی نرمی، جھنکار اور شرافت نفس کا میل جس آواز میں ہوگا وہی نغمہ پیام بیداری ہوگا۔ غالباً ہندو کلچر اگر دنیا کو احترام، محبت اور حلم کے ساتھ کوئی نذر پیش کرتا ہے تو وہ نذر مزاج کی نرمی ہے۔

۴

کبھی کبھی یہ سوال بھی اُٹھ جاتا ہے کہ بہترین عشقیہ شاعری سے کیا خز انسانیت کی کیا خدمت ہو سکتی ہے۔ جنسی جذبات کے اظہار سے سوائے اسکے کہ دل کی بھڑاس نکل جائے اور کیا ہوتا ہے۔ شاعری کو عشقیہ جذبات نگاری کے بدلے پیغام عمل ہونا چاہیئے۔ اگر ان باتوں کا مقصد یہ ہو کہ شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کو سو فی صدی وقفِ جنسیت نہ ہو جانا چاہیئے۔ اور ہمارے فن کاروں اور شاعروں کے تصور پر بقول اقبال عورت سوار نہ ہے تو یہ نہایت کارآمد مشورہ ہے۔ لیکن داخلی تہذیب اور خارجی عمل ہر خلاقانہ تحریک کے لئے عشق اور جنسیات ایسی ایا بج اور مجہول کن چیزیں نہیں ہیں جیسی بادی النظر میں وہ شاید کسی کو معلوم ہوں۔ اگر آپ مذہب کو، فلسفہ کو، علم کو، سائنس کو، خدمت قوم و وطن کو، سیاسیات اور معاشیات کو، تعلیم اور تربیت کی کوششوں کو، ایجادوں کو، تجارت کو اور سینکڑوں دوسری چیزوں کو ہزاروں آدمی کی زندگی برباد کرتے ہوئے آئے دن دیکھتے ہیں، ان چیزوں کے نام پر اگر انسان حیوان سے بدتر ہو جاتا ہے تو انسان کو برباد کرنے اور نکما کرنے کی ذمہ داری آپ عشق ہی پر کیوں رکھتے ہیں؟۔ تاریخ تو کچھ اور کہتی ہے یعنی قوموں اور تہذیبوں کی زندگی میں جو دور نمایاں طور پر ترقی یافتہ اور جاندار مانے جاتے ہیں انہیں ادوار میں عشقیہ اور جنسی زندگی کی بھی شدت اور فراوانی ملتی ہے۔ نامرد بن کر، حسن و عشق سے بھاگ کر کوئی قوم عمل کا ثبوت نہیں دے سکتی۔ اپنا ایک شعر عرض کرتا ہوں۔ ؎

تاریخ زندگی کے بھی کچھ محرکات
مجبوراتی عشق کی بیچارگی نہیں

میرے ایک دوست جو ہیں تو کافی تعلیم یافتہ و ترقی پسند بھی، لیکن کچھ نیاز مند قسم کے آدمی ہیں، میری ایک غزل سنکر نہایت معصوم خلوص سے پوچھنے لگے کہ اس طرح کی شاعری زندگی کی جدوجہد میں کس طرح معاون ہو سکتی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جو کلچر اس غزل میں

بھی اگر اس کو کسی کا شعور ہضم کر سکے تو وہ شخص روس میں بجائے ایک والنٹیر ہونے کے، بجائے محض ایک مزدور ہونے کے پرولتاریت کا بجائے ایک معمولی گمنام فرد ہونے کے ایک کمیسار ہوگا۔ شیکسپیر اشتراکی نہیں تھا۔ لیکن اگر دو اشتراکی اور ہر لحاظ سے یکساں ہیں لیکن ان میں اگر ایک شیکسپیر کو سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں سمجھتا تو خود اشتراکیت کے لئے شیکسپیر کو سمجھنے والے اشتراکی کا وجود زیادہ کارآمد ہے۔

اس سلسلہ میں جہاں تک اُردو کی کُل عشقیہ شاعری نہیں بلکہ بہترین عشقیہ شاعری کا تعلق ہے یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ شہواتی اور جنسی جذبات کو جو وسعت، جامعیت اور دُور رسی بخشی گئی ہے وہ ہماری بہترین عشقیہ شاعری کو تخصیص اور تنگی سے نکال کر اصولوں کا مرتبہ دے رہی ہے۔ اُردو کی بہترین عشقیہ شاعری مخصوص افراد کی تاک جھانک اور کھتم کھلا یا چوری چھپے کی عیاشیوں سے بہت بلند ہے۔ شہوانیت یا جنسیت کے جذبات، حرکات و سکنات، یعنی معاملہ بندی سے بہت بلند ہے۔ کیونکہ ایسی شاعری میں عشق کرنے کے حالات کی رپورٹ نہیں ہوتی بلکہ حسن سے متاثر ہونے کے نتائج مرتب کئے جاتے ہیں۔ انسانی زندگی میں عشق، شہوانیت، جنسیت کا کیا مقام ہے، ان کا مجموعی انسانی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے، یہ دُنیا اور زندگی کو کس رنگ میں پیش کرتے ہیں، ان سے متاثر ہو کر ہم زندگی کا کیا پیغام سمجھتے ہیں، کائنات و حیات کی کیا شرح حسن و عشق کے تاثرات میں پنہاں ہیں، دشنہ و خنجر، بادہ و ساغر ہمیں کہاں لے جاتے ہیں اُردو کی بہترین عشقیہ شاعری ان چیزوں کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ غزل کے بہترین عشقیہ اشعار کی کلیت، جامعیت، ہمہ گیری اور آفاقیت ہماری عشقیہ شاعری کو تخصیص و تفصیل کی حدود سے نکال کر تنقید حیات کی وسیع حدوں میں لے آتی ہے۔ اسی سے غزل کے عشقیہ اشعار عام انسانی تعلقات، زندگی کے عام واردات پر ایسا عائد ہوتے ہیں گویا انہیں کے لئے کہے گئے تھے۔ یہ بات غالباً دُنیا بھر کی عشقیہ شاعری میں نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حکیمانہ نکات و تنقید حیات شاعری میں بغیر دشنہ و خنجر، بادہ و ساغر یا لوازمات عشق کے بغیر بھی، اصطلاحات عشق کے بغیر بھی دئے جا سکتے ہیں۔ اور ہماری تمام فلسفیانہ شاعری کو حسن و عشق کے رنگ میں رنگا ہوا نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ امر قابلِ تحسین ہے کہ ہمارے چند شعراء حسن و عشق سے بچ کر بہت پتے کی باتیں کر رہے ہیں، اور پہلے بھی کچھ کہا ہے۔ لیکن حسن و عشق کی اصطلاحات نے جتنا مؤقر اور کارآمد اس باب میں اپنے کو ثابت کیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال نے انہیں اصطلاحات کی مدد سے ستاروں تک کو چھو لیا ہے۔ لیکن تنقید حیات و کائنات سے

قطع نظر کر کے عشق برائے عشق اور حسن برائے حسن کا رہا تو احساس و شعور بھی کم کار آمد چیزیں نہیں ہیں۔ شہوانیت اور جنسیت میں بھی بلند مذاق لکھنا "لمسیات اور جنسیات" کا بھی لطیف احساس رکھنا سب کا کام نہیں۔ اس طرح کی بھی شاعری اُردو میں جو ہے وہ قدر داں کی چیز ہے اور بہت زیادہ ہے بھی نہیں۔

(۵)

بات یہاں تک پہونچ چکی تھی کہ دوری کا ساقی آیا اور کرشن چندر صاحب کا معرکہ آرا مضمون "گھونگھٹ میں گوری جلے" نظر آیا۔ عشق یوں ہی کہاں کم بھیانک چیز ہے لیکن کرشن چندر صاحب کا مضمون پڑھ کر تو اور بھی ہمت چھوٹ گئی۔ انہوں نے بڑی دور سے میری بات کاٹ دی۔ ان کا مضمون دیکھکر تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ خدا کرے سارا ہندوستان ہی خواجہ سرا ہو جائے۔ آمین۔ اس طرح ہماری حرم سراؤں کی حفاظت بھی ہو جائے نہ تیغ کی ضرورت پڑے گی نہ چلمن کی تیلیوں کی، نہ اکبر کی رباعیوں کی۔ کیونکہ بقول ظریف۔ ؎

عاشقوں میں جو کوئی خواجہ سرا ہوتا ہے
بے تکلف حرمِ یار میں آسکتا ہے

اگر یہ دعائے نامردی قبول ہو گئی تو حفیظ جونپوری کو اس شکایت کی۔ ؎

ایک میرے لئے درباں ہو نگہباں ہیں حفیظ
اور جو چاہے وہاں شوق سے آئے جائے

اور مضطر خیرآبادی کو یہ شعر کہنے کی۔

دعائے وصل سے کہہ دو پکار دے پردہ
کہ سب گھروں میں بہو بیٹیاں سیانی ہیں

ضرورت نہ پڑے گی۔ بلکہ ہندوستان کے بیس کروڑ مردوں کی زبان پر یہ شعر ہوگا۔ ؎

عشق کیا ہے مری بلا جانے
ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

مگر یہ بے حیا ملک ایک ہی ساتھ عشق اور آزادی اور ترقی کی تمام منزلیں طے کرنا چاہتا ہے۔ پچاسوں برس پہلے حالی نے کہا تھا ؎

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس گھر کو ڈھا کے چھوڑا

لیکن ہندوستان ہے کہ غلام بھی ہے، عاشق بھی ہے، کثیر الاولاد بھی ہے اور دین دھرم کا بھی دنیا بھر میں تنہا ٹھیکیدار ہے۔ غیر کثیر الاولادی کا اور مذہب میں تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جبھی تو اکبر نے کہا تھا ؎

شرع کی رو سے جو شادی پہ نظر کرتا ہوں
جلوۂ کثرتِ اولاد نظر آتا ہے

تو کرشن چندر صاحب چاہتے ہیں کہ ہم سب بجائے مجنوں بننے کے ہرچرن داس بن جائیں۔ لیکن اکبر نے ہرچرن داس کو اُن کے اصلی رُوپ میں دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہرچرن داس عشق کا بکواس میں منہمک رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔

شیوں کو کورس دن کو فارمولا ورک کرتے ہیں
عدیم الفرصتی سے ان کی لعنت ترک کرتے ہیں

حالانکہ مجنوں میں اور ہرچرن داس میں عشق کرنے نہ کرنے کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ فرق ہے کہ ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

میں نے ایک شعر عرض کیا ہے ؎

وہ کام انساں کے کیا آئیں محبت ہی نہیں جن کو
محبت ترک کرنا بھی ہے کام اہلِ محبت کا

لیکن خیر یہ تو صرف باتیں ہی ہیں اور کرشن چندر صاحب نے واقعی کام کی باتیں کہی ہیں۔ مردی نامردی بطرف ہندوستان کے لئے عشق زدہ ہندوستان کے لئے اس وقت تو اسی کی ضرورت ہے کہ حسن و عشق کی آگ سوزِ پنہاں کی حدود سے نکل کر بے پناہ نفرت کی آگ بن جائے اور جس گھونگھٹ میں گوری جلے اس کے متعلق آگ بجھو کا عورت سے یہی کہنے کی ضرورت ہے۔ ع۔

تو اس گھونگھٹ کو اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

جس سڑک سے کرشن چندر صاحب نے گذرنے کا ذکر کیا ہے، اس کے متعلق واقعی ان کا مضمون پڑھکر یہی گمان ہوتا ہے کہ ؎

ہے یہ کوئی سڑک کہ قبرستان
گنگناتے ہوں جس پہ کچھ مردے

اسی درد محبت سے دنیا غافل اسی درد کا گھر گھر چرچا
ایک شب غم کی سو راتیں ایک محبت سو افسانے

لیکن ان گانے والوں کو بھی کس دل اور کس منہ سے بُرا کہا جائے۔ بچارے سڑک ہی پر تو پریم کے گیت بھی گا سکتے ہیں۔ گھروں میں تو بس خدا کا نام ہے۔ شیطان بھی ان بدنصیبوں سے بیٹھنے کے وقت صرف اُجڑی ہوئی سڑکوں ہی پر مل سکتا ہے۔ خدا سے تو گھر پر ملنا ہی ہے، فاقہ اور افلاس کے خدا سے۔ مگر بقول شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی۔

شیطان کی ہے
انسان کی ہے؟

پھر بھی کچھ تو دنیا بدلے۔ ہمارے مصنفوں کی نگاہ میں کچھ تو وہ اثر ہونا چاہیئے جو کرشن چندر صاحب کے مضمون میں بدرجۂ اتم موجود ہو۔ وہ اثر جس کی بدولت ہر کار آمد اور نمک حلال اہلِ قلم یہ کہہ سکے کہ:-

مری نگاہ سے چونک اٹھیں جیتے مُردے بھی
میں چلتے پھرتے مزاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

اب عشق کی مجبوری کو اختیار میں بدل جانا چاہیئے تاکہ بجائے یہ گیت گانے کے کہ:-

گھونگھٹ میں گوری جلے

یہ للکار اس سڑک پر چلنے والوں کی زبان پر ہو ؎

نہ پوچھ ہے مری مجبوریوں میں کیا کس بل
مشیتوں کی کلائی مروڑ سکتا ہوں
مرے ہی سینے میں ہر صبح تھرتھراتی ہے
شبِ سیاہ کی زنجیریں توڑ سکتا ہوں
فراقؔ دیکھ بدلتی ہے منزلِ آفاق
کہ مہر و ماہ کی میں باگ موڑ سکتا ہوں

مگر یہاں تو عالیٔ تیر کیا اپنا حال سننے کو کوئی تیار نہیں ہے۔ ع۔

حال ہی کچھ اور ہے مجلس کا

پھر بھی ؎

جہاں ہیں سینکڑوں ہنگامے اپنی بھی کہہ لے
سنائے جا یہ فسانہ بھی، کون سنتا ہے

اچھا تو اس سڑک سے، بتکدے سے، آپ کی بزم سے جاتے ہیں۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا

فراقؔ گورکھپوری!

داستانِ نشاط

دلِ حزیں کی شرارت سے کھیل سکتی ہوں
تری نگاہِ محبت سے کھیل سکتی ہوں
نگاہِ شوخ کو معصوم و شرمگیں کر لوں
خود آپ اپنی شرارت سے کھیل سکتی ہوں
ہوں بے نیاز مگر دیکھ لے یہ ناز و نیاز
میں حُسن و عشق کی فطرت سے کھیل سکتی ہوں
فسردگی کو تری دوں شگفتگی بہار
تری اُداس طبیعت سے کھیل سکتی ہوں
یہ کچھ اور روکے ہوئے خندہ ہائے زیرِ لبی[1]
دبی دبی سی شرارت سے کھیل سکتی ہوں
خبر نہیں مجھے شعلوں میں ہوں کہ کوثر میں
خیالِ دوزخ و جنت سے کھیل سکتی ہوں
اُداسیاں مری بن جاتیں داستانِ نشاط
خود اپنے غم کی حکایت سے کھیل سکتی ہوں
مرا ہی سینہ تو ہنگامہ زارِ محشر ہے
طلوعِ صبحِ قیامت سے کھیل سکتی ہوں
نگاہِ ساقیٔ دوراں قسم جوانی کی
تری بھری ہوئی نیت سے کھیل سکتی ہوں
نسیمِ صبح مری کمسنی کی خوشبو ہے
کلی کلی کی میں نکہت سے کھیل سکتی ہوں
جو چونکی چونکی ہوئی سی ہے میری بیخبری
میں آپ اپنی ہی غفلت سے کھیل سکتی ہوں
جو تیری زلف چلیپا کہ تیری برقِ نگاہ
میں ہر بلا سے ہر آفت سے کھیل سکتی ہوں
ہنسی ہنسی میں محبت کی سختیاں جھیلوں
میں اپنے ناز و نزاکت سے کھیل سکتی ہوں
بگڑ بھی سکتی ہوں اور بن بھی سکتی ہوں تجمہ
میں آپ اپنی ہی قسمت سے کھیل سکتی ہوں

[1] یہ مصرع فراقؔ گورکھپوری کا ہے۔ تجمہ

(آنسہ) تجمہ تصدق!

نازشِ حسنِ بے نیاز ہے تو

حسن کی دعوتِ جنوں کی قسم — عشق کے اشکِ سرنگوں کی قسم
طور کی شمعِ نور کی سوگند — "چوب[1] برہم زنِ فسوں" کی قسم

نازشِ حسنِ بے نیاز ہے تو
بزمِ ہستی کا سوز و ساز ہے تو

ہے قسم رفعتِ تخیّل کی — باغِ رضواں کے خندۂ گل کی
قمریوں کی صدائے کو کی قسم — مجھکو سوگند سوزِ بلبل کی

نازشِ حسنِ بے نیاز ہے تو
وُہ حقیقت ہے اک مجاز ہے تو

اپنے جوہر سے بےخبر کیوں ہے؟ — دیدہ ور ہو کے بے بصر کیوں ہے؟
اپنی عظمت کو خاک میں نہ مِلا — ہوش کر ہوش خیرہ سر کیوں ہے؟

نازشِ حسنِ بے نیاز ہے تو
دہر کی چشمِ امتیاز ہے تو

نطقِ ہستی زبانِ ہستی تو — رُوحِ ہستی روانِ ہستی تو
ابنِ آدم! ہے تجھ میں وُہ جوہر — جس سے ہے "کُن فکانِ ہستی" تو

نازشِ حسنِ بے نیاز ہے تو
خود نگر ہو خودی کا ساز ہے تو

امینِ حزیںؔ

[1] یعنی عصائے موسیٰ؛

پرکھ

اُس نے پلّو سے منہ لپیٹ لیا جیسے اپنی لمبی سانس کو اوپر اُٹھنے سے روک رہی ہے اور کپکپاتے ہوئے آنسو روک کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

بیٹھے بیٹھے میں نے اپنے تھکے ہوئے پاؤں سمیٹ لئے اور انتظار کرنے لگی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے گھٹنے پر تھا جسے وہ اٹھانا بھول گئی تھی۔ ایک منٹ کے بعد زور سے سانس چھوڑ کر اس نے کہنا شروع کیا: "وہ کبھی کسی کو بھلا نہیں۔ اُن سب کا خیال ہے"

میں نے ایک گنہگار کی طرح نظر نیچی کر لی اور کہا: "تو آپ تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

اُس نے پیر پکڑ کر دبانا شروع کیا اور بولی: "آپ نہ رکھ سکیں گی تو اور نوکری ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔ آپ کے پاس دس دن رہی کچھ کرایہ بنا لیا ہے، نہ ہوا تو دس پانچ دن لاہور ٹھہر کر گھر چلی جاؤں گی۔ بچے اُداس ہو رہے ہیں، آپ کے ساتھ رہنے کا شوق تھا لیکن اب یہ بھی نہ ہو سکیگا"

"لیکن میرا بخار تو ٹوٹ گیا اب میں تمہیں اپنے پاس رکھکر کیا کروں؟" میں نے بناوٹی مسکراہٹ لا کر کہا: "تمہارے اتنے بچے ہیں وہ کام نہیں کرتے کیا؟ تمہارا خاوند بھی تو کچھ چھوڑ گیا ہوگا"

"میرے بچے" اُس نے رُک کر کہا: "میرے آٹھ بچے ہیں، پانچ میرے اور تین میری سوت کے۔ لیکن وہ سب الگ ہیں۔ تین لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے پرائے غریب گھروں میں کہ کھانا بھی مشکل سے ملتا ہے۔ پانچ لڑکے ہیں۔ سب سے بڑا دکان کرتا ہے پان سگرٹ کی۔ باقی چار چھوٹے ابھی کوئی کام نہیں کرتے"

"اور تمہاری سوت کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ وہ تو دو سال پہلے مر گئی تھی۔ اس کے بچے بھی میرے پاس ہیں۔ میری شادی دس بارہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ خاوند مرشد اور خدا کا کلام پڑھ کر لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ لوگ کھانا کپڑا روپے سب دے جاتے۔ گھر میں گائے، بھینس موجود تھی۔ جب کبھی وہ دورے سے لوٹتا میرے لئے زیور اور کئی کئی جوڑے کپڑوں کے لاتا۔ بچوں کے لئے لکھنوی ٹوپی، جوتوں کے جوڑے اور مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے بھر بھر کر لاتا۔ کیا کہوں جب تانگا وں بھر کے لوگ اُسے دیکھنے آتے۔ ایک تو وہ خوبصورت تھا۔ گٹھا ہوا بدن، منہ پر صحت اور جوانی کا رنگ۔ لمبا اونچا، دیکھنے میں انگریز سا لگتا تھا۔ ہفتہ بھر تو ہمارے ہاں جانوروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ میں بھی خوشی میں ڈوبی کبوتروں کی طرح کبھی یہاں کبھی وہاں پھرتی رہتی۔ کسی بات کا ڈر نہ تھا نہ کوئی چاہ رہ گئی تھی۔ گھونگھٹ ہولی رہتی تھی" اب میری طرف دیکھکر "یہ کون مان سکتا ہے" وہ اُس نے اپنی ننگی باہوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہاری سوت کب آئی؟" میں نے لاپروائی سے پوچھا۔

"تو سب سنو گی" اُس نے شرم سے آنکھیں نیچی کر لیں گویا کسی نے اس کی چتر ریکھا کی موہنی میں سیاہی کے کئی دھبّے پھینک دئے ہوں۔ پر اس کا اعتقاد اٹل تھا۔ پھڑکتے ہوئے ہونٹ کو دانت سے دباتے ہوئے اُس نے کہا۔

"یہ بات تب کی ہے جب لال دین میرا بڑا لڑکا دس برس کا تھا۔ میں کسی طرح بچوں کی طرف دیکھکر برہ کے کٹھور دن گزار رہی تھی۔ پر میں سچ کہتی ہوں میرے دل میں ایک عجیب جذبہ تھا۔ میں رات کو کام ختم کر کے چارپائی پر لیٹ جاتی اور سوچتی۔ اُمنگیں میرے دل میں اُٹھ اُٹھ کر آتیں اور مجھے بے ہوش کر دیتیں۔ اسی دھارے میں بہتی ہوئی میں سپنے دیکھتی۔ سورج چڑھتا تو اُٹھتی۔ نئے ارمانوں کے ابال کی طرح گاتے وہ بہتی تو گانے گاتی اور ہمیشہ ایسا محسوس کرتی گویا اُن کی مضبوط باہیں مجھے اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ پھر اُداسی کیسی! اور رونا کیسا! جب چھ مہینے ہو گئے تو انہوں نے ہنسوں سے ہرکارہ بھیجا: "بڑے لڑکے کو بھیج دو۔ دل اُداس ہو رہا ہے۔ میں تین مہینے کے بعد آؤنگا" ساتھ ہی میرے لئے تنک ابیر اور کرن پھول بھیجے۔ لڑکے کا بستر وستر باندھکر تیار کر دیا گیا۔ بار بار اس کا منہ چومتی اور گلے سے لگاتی۔ ایسا معلوم ہوتا گویا میں بھی اُن سے ملنے جا رہی ہوں"

پھر کچھ رُک کر کہنے لگی "آپ شاید نہ مانیں، لیکن اُسے ان دنوں مجھ سے محبت تھی۔ کئی بار مجھے پیار سے اپنے پاس بٹھا کر کہتا تھا: "برکت، تمہیں خدا نے روپ تو نہیں دیا پر میرے دل میں تو تم سما گئی ہو۔ لیکن اگر میں کبھی جوانی میں اندھا ہو کر کسی خوبصورت سی ایک اور عورت کو گھر لے آؤں تو تمہیں کیسا لگے؟" یہ سنکر میرے دل میں کسک سی اُٹھتی اور میں رُوٹھ جاتی۔ پر جب وہ ہنس کر مجھے پکڑ لیتے اور لٹّو کی طرح گھمانے لگتے تو میں سوچتی، مجھے یوں ہی بنا رہے تھے۔ دیکھنے میں تو میں معمولی تھی، اسی شرم کے مارے میں اُن کے ساتھ کبھی باہر نہ جاتی۔ سوچتی کوئی کچھ کہہ نہ دے۔ اور اگر کوئی کبھی ہم دونوں کی طرف حیرانی سے دیکھ لیتا تو میں زمین میں گڑ جاتی۔ پر پھر مجھے احساس ہوتا، انہیں مجھ سے محبت ہے۔ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ یہ بھی جانتی تھی کہ محبت ہونے پر بھی اُنہیں میری شکل پر غرور نہ تھا۔ میرے ساتھ ہونے پر کسی سے بات

کرنے کرتے رُک جاتے۔ انہیں یہ ڈر ہوتا کہ میں کہیں کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھوں جس سے انہیں شرمندہ ہونا پڑے۔

بیٹے لڑکے کے گھر سے نکلتے ہی آنگن سونا ہو گیا۔ وہ تین مہینے دن گن گن کر کسو طرح کاٹے۔ پھر ایک دن چٹھی آئی۔ ہم دونوں کل پہنچ جائیں گے۔ تو دس مہینے کے بعد اس دن میں نے گھر باہر سب دھویا۔ صفائی کی۔ ان کے لئے نیا بستر لگایا، پھول لگائے، زیور اور کپڑے پہنے۔ وہ آئے۔ پہلے ہی کی طرح میں اُن کے بکس کھولتی اور جھومتی تھی۔ وہ میرے پاس کھڑے مسکراتے تھے ــــ!

اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ ایک رات وہ اچانک سنجیدہ ہو کر بولے،

"برکت میں ایک عورت بیاہ لایا ہوں"

میں نے سوچا ہنس رہے ہیں۔ پہ مجھے اُن کی یہ دل لگی اچھی نہ لگی۔ سوچا، ان کی کیسی عادت ہے، خوشی کے وقت بُری بُری باتیں کہہ کر میرا دل ہلا دیتے ہیں۔ میں نے اپنی لرزتی ہوئی شکایت آمیز نگاہیں اُن کی طرف ڈالیں۔ اُن کا مُنہ اترا ہوا تھا۔ میرا کلیجہ سہم گیا۔ پھر بھی یقین نہیں آیا۔ میں اُٹھ کر اُن سے علیحدہ ہو بیٹھی اور کہا، "یہ میں نہیں مان سکتی۔ کبھی نہیں"

انہوں نے اداسی سے کہا: "برکت میں گنہگار ہوں مجھ سے جیسا چاہے سلوک کرو تمہیں اختیار ہے"

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بیٹھی تھی۔ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنا مُنہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اندھیرا، کالا اور بھیانک۔ میں چیخ اٹھی: "تم جھوٹے ہو، مجھے پریشان کرنے سے تمہیں خوشی کیوں ہوتی ہے۔ تم جھوٹے ہو......"

اُنہوں نے اُٹھ کر میرا ہاتھ نہیں پکڑا۔ چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ میں نے ان کی آنکھوں کی طرف تڑپ کر دیکھا۔ میرے دل میں وسوسہ بڑھنے لگا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ زمین کے نیچے سے ایک بادل کا ٹکڑا اُٹھ کر میری طرف ہاتھ پھیلا رہا ہے۔ میں نے اُن سے لپٹنے کی کوشش کی اور دھم سے گر کر بے ہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو رات کے بارہ بج چکے ہونگے۔ میں چارپائی پر پڑی تھی۔ اچانک کسی نے میرے کانوں کے پاس آکر کہا: "پھپھی وہ آ گئی"

میں اُٹھ بیٹھی۔ سہم کر پوچھا: "کون آ گئی"

اُس نے لرزتی ہوئی اور بھیانک آواز میں دُہرایا: "پھپھی پھپھی وہ آ گئی ہے اُٹھو"

میں چونک کر اُٹھی اور اس کا کندھا پکڑ کر بھیانک طور سے بولی۔

"کہاں؟"

اُس نے اُنگلی سے دالان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوپٹہ سنبھالا اور دھیرے دھیرے اس طرف چلی۔ پر میرے پاؤں بھاری ہوتے پر بھی اپنے آپ اُٹھ رہے تھے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میرے گالوں پر سیاہی چھا گئی ہو گی اور ہونٹ تانبے کی طرح ٹھنڈے اور خشک ہو گئے۔ میرا چہرہ دوپٹے کی دُہری تہ میں لپٹا تھا۔ اور لٹ لٹ لٹک رہی تھی۔ دالان میں پہنچی تو دیکھا، ایک خوبصورت عورت ان کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھی تھی۔ اس کا دوپٹہ لال رنگ کا تھا جس پر سفید گوٹا ٹنک رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر رنگ اور آنکھوں میں کاجل تھا۔ میرے وہاں پہنچنے پر اُنہوں نے مجھ سے کہا: "برکت، تھوڑا سا پانی گرم کر دو" میں جا کر برسوں کے مریضوں کی طرح چولہے کے پاس جا بیٹھی اور گرم پانی کی ہانڈی چڑھا دی۔ میرا دم نکل رہا تھا۔ سر اپنے آپ دیوار کے ساتھ لگ گیا اور بے ہوشی کی حالت میں آنکھیں بند کر کے جانے کتنی دیر وہیں پڑی رہی۔

مُنہ ہاتھ دھو کر اور ناشتہ کر کے وہ اُن کے پلنگ پر جا بیٹھی اور میں چُپکے سے اپنی چارپائی پر۔ گاؤں میں تم جانتی ہو کمرے دمرے تو ہوتے نہیں۔ وہیں ایک کونے میں میری چارپائی تھی۔ میں چاہتی تو یہ تھی کہ زمین میں دھنس جاؤں کہیں، دونوں کو میری ہستی کی بو بھی نہ آئے ــــ سکڑ کر بستر میں جا پڑی۔ اُن کی گھُلی ہوئی باتوں کی آواز رہ رہ کر میرے کانوں میں آتی اور میں اپنی قبر میں اپنے کو دفنا کر ایک طرح سے لاپروا ہو کر اپنے اوپر چلنے والوں کے سلوک کا اندازہ لگا رہی تھی۔ جو آواز میرے کانوں تک پہنچی وہ دماغ کے پار نہ جا سکتی تھی۔ میرے دماغ پر بے ہوشی کی گہری نیند چھا رہی تھی۔ رات کے دو بجے ہونگے، آہستہ سے یہ آکر میرے پاس کھڑے ہو گئے اور دھیرے سے پکارا: "برکت!"

میں نے چہرے پر سے لحاف ہٹا لیا اور بولی: "جی"

"برکت" انہوں نے اور پاس آکر کہا: "تمہیں سب کچھ معلوم ہی ہے۔ میری قسمت تمہارے ہاتھ ہے۔ تم ہی اس کا فیصلہ کرو گی۔ بولو کل گاؤں والوں سے کیا کہو گی"

میرا گلا بھر آیا۔ یہ آدمی جو میرے جی جان کا مالک تھا آج مجھ سے کیا مانگ رہا ہے۔ کیا میں اُسے نا اُمید کر سکوں گی۔ میں نے بغیر سوچے کہا: "آپ فکر نہ کریں میں سب کچھ دیکھ لونگی"

دبے مُنہ سے کچھ لفظ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اُن کی دُنیا میں اس وقت میری بیچارگی پر دھیان کرنے کی فرصت نہ تھی۔ یہ سب میں سمجھتی تھی۔

صبح اُٹھ کر میں نے جلدی جلدی چائے چڑھائی اور برتن دھوئے۔ اُن کے اُٹھنے تک سب کچھ تیار تھا۔ عائشہ اُٹھی اور آلے میں سے میری کنگھی اُٹھا کر اپنے بالوں میں کرنے لگی۔ وہیں شیشہ بھی پڑا تھا۔ اُس نے اُٹھا کر اُس میں اپنا عکس دیکھا۔ میں مٹ چکی تھی، اس شیشے میں سے اب مجھے وہی ٹھنک ...

نکمیں نظر آئیں گی، ہمیشہ۔

اس نے نگاہ اوپر اٹھائی اور رک لی۔ میرے ہونٹ کھلے اور پھر بند ہو گئے۔ یہ ہمدردی "نہیں میں نہ کہوں گی۔ اور کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔

چائے پی کر عائشہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی: "مجھے ایک جوڑا کپڑے نکال دو۔ یہ کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔"

میں نے صندوق کھولا اور بوسکی کا سوٹ اور ململ کا پیلا دوپٹہ نکال کر اُسے پہنایا۔ اور ہونٹوں پر اپنے ہاتھ سے سرخی لگائی۔ اُس نے اپنے انگارے کی طرح سرخ چہرے کو شیشے میں دیکھا اور مسکرائی۔ پھر اپنی گداز نرم بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور خوبصورتی اور محبت سے کھلی ہوئی بہار کی نشیلی آواز میں کہا: "تم میری بہن ہو۔"

میں بھول گئی۔ سب کچھ۔ سوائے اس کے آخری لفظوں کے۔ میرے دل میں اس وقت سوائے خوشی کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ میری بہن بنے گی بہن۔ جبکہ میں سب کچھ کھو بیٹھی ہوں۔ شاید اس کے دل میں درد اور محبت کا جذبہ ہے۔ میں کتنی بدقسمت ہوں کہ اپنے درد میں اس کی تکلیف کا اندازہ لگانا بھول گئی۔ اُسے ان سے محبت ہے جن پر میرے ارادے اور ارمان ختم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ بھی عورت ہے میری طرح۔

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا گویا یہ اور عائشہ دو معصوم بچوں کی طرح ہیں جن کی دیکھ بھال کرنا میرے لئے لازمی ہے۔ میں اپنے درد کو دل میں چھپا کر اُنکی غلامی کرنے کو تیار ہو گئی۔

کسی طرح دو مہینے گذرے، اسکے بعد میرا بھتیجا ایک دن بھاگتا ہوا آیا اور بولا: "پولیس۔ پولیس۔"

میرا دم سا نکل گیا۔ بھاگ کر پوچھا: "کیا کہہ رہے ہو، پولیس یہاں کیوں آئے گی۔ ہم نے کیا گناہ کیا ہے؟"

اتنے میں یہ اندر سے لپک کر آئے اور لڑکے کو جھپٹ کر پوچھا۔ "کہاں ہے پولیس؟"

لڑکے نے اِدھر اُدھر گھبرا کر دیکھا، اس کا سانس پھول رہا تھا۔ بڑی مشکل سے بولا: "میں آ رہا تھا تو راستے میں دو پولیس والے ایک آدمی کے ساتھ آتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگے، تمہارے گاؤں میں کوئی عورت اپنے خاوند کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ نکل آئی ہے؟"

"تو تم نے کیا کہا؟" اُن کا چہرہ اُتر گیا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کہا۔ بھاگا چلا آ رہا ہوں۔"

"لیکن یہاں بھاگ کر تو کوئی عورت نہیں آئی؟" میں نے تڑپ کر عائشہ کی طرف دیکھا جو کھڑکی میں کھڑی ہاتھ مل رہی تھی۔

میرے بھتیجے نے چپ چاپ انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ اتنے میں اُنہوں نے عائشہ کو اندر لے جا کر اپنے کپڑے پہنائے۔ سر پر پگڑی اور لٹھے کا پائجامہ۔ ایک ہاتھ میں کچھ کپڑے ساتھ لے اور چلنے لگے۔ جانے سے پہلے انہوں نے آ کر میرے کندھے پر ایک ہاتھ رکھکر کہا: "میں اسے وزیر آباد اسٹیشن سے گاڑی پر سوار کرنے جا رہا ہوں۔"

اس کی آواز لرز رہی تھی لیکن نگاہ قائم تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اُن کو زور سے پکڑ لیا: "تم نہیں جا سکتے۔ وہ تمہیں قید کر لیں گے۔ سمجھ رہے ہو؟" میں جلدی جلدی بولنے لگی: "یہاں سے دس کوس پرے میری بہن کے داماد کا گھر ہے۔ تم عائشہ کو لیکر وہاں چلے جاؤ۔ وہ پولیس میں افسر ہے تمہیں بچا لیگا۔"

پتہ نہیں کس طاقت نے میرے منہ سے یہ سب کچھ نکلوایا۔ آج جبکہ وہ عائشہ کو رخصت کرنے جا رہے ہیں میں اُسے رکھنے کی صلاح دے رہی تھی۔ اُن کے منہ پر رونق آ گئی۔ پر اُنہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ بولے۔ "تم رپورٹ نہ کرو گی؟"

"رپورٹ؟" میں نے دردناک لہجے میں کہا: "تمہارے خلاف رپورٹ کر سکتی ہوں۔ جاؤ میں تمہیں ضرورت کی سب چیزیں بھیجدوں گی۔"

یہ چلے گئے اور عائشہ کو وہاں چھوڑ آئے۔ تین سال انہوں نے نہ میری پرواکی نہ بچوں کی۔ گھر میں چار بچے کھیلتے تھے اور پانچواں میری گود میں تھا۔ گھر میں میرے پاس جو پونجی تھی۔ زیور اور کپڑے تھے انہوں نے دھیرے دھیرے سب عائشہ کے پاس پہونچا دئے۔ دن دیکھتے نہ رات گھوڑے کی لگام کسنے اور عائشہ کے پاس جا پہونچتے۔ تین سال گزر گئے تو اُسے واپس گھر لے آئے۔ میں چپ تھی۔ اُدھر انہوں نے میری قدر کرنی شروع کر دی تھی اور میں انہی کے بھروسے سانس لے رہی تھی۔

عائشہ گھر آئی تو کچھ دن ٹھیک رہی، پھر اس کے تیور بدلنے لگے۔ میری گود میں چھ مہینے کا بچہ تھا۔ وہ اسے دیکھ نہ سکی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے اُن کے کان بھرنے شروع کئے۔ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا کہ وہ اُن سے مجھے گھر سے نکالنے کو کہہ رہی تھی۔ پر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں ان کے بچوں کی ماں تھی، مجھے گھر سے یوں ہی کیوں نکال دینگے۔ میں کچھ نہ سکی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا۔ رات کے دس بجے تھے۔ میں آنگن میں بچوں کو کھانا کھلا کر برتن اکٹھے کر رہی تھی۔ عائشہ پاس ہی بیٹھی اپنے بالوں میں پھول لگا رہی تھی۔ یہ سیدھے آنگن میں آئے اور میرے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا اُن کے ہاتھوں میں ایک لمبا سا کاغذ تھا جس پر ٹکٹ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: "یہ تمہارا طلاق نامہ ہے۔ اب تم میری بیاہتا نہیں رہی ہو۔ یہیں اور جا رہو۔ اب میں عائشہ سے شادی کرونگا۔"

میرے ہوش اُڑ گئے۔ گویا سمندر میں غوطے لگا رہی ہوں۔ میں کہاں جا سکوں گی۔ بیاہتا نہیں رہی! کیسے نہیں رہی! سولہ سال سے تو بیاہتا تھی اور اب یہ مجھ سے چلے جانے کو کہتے ہیں۔ کہاں جانے کو؟ میرے بچے، میں۔ میں کانپ اٹھی۔ جسم لرز رہا تھا۔ سر جھکا لئے لگاتار ملتجی نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھ کر بولی: "میں تمہاری غلام بن کر یہیں رہوں گی۔ مجھے کہیں مت بھیجو۔ میرا تمہارے ساتھ نکاح ہوا تھا۔ آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو مجھے باندھ کر رکھ لیتی۔ خدا کیلئے مجھے اپنے قدموں ہی میں مرنے دو۔"

میں نے لپٹ کر اُن کے قدموں کو اپنے ہاتھوں سے باندھ لیا۔ انہوں نے بے رحمی سے پاؤں کو جھٹک کر کہا: "ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر تم سامان لیکر چلی جانا سمجھیں۔ میں باہر جا رہا ہوں واپس آنے تک تمہارے لئے یہاں ٹھہرنا ممکن نہ ہوگا۔"

میں نے منتیں کیں، عائشہ کے پاؤں پکڑے لیکن وہ چپ چاپ بُت بنی بیٹھی رہی۔ بولی: "ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ میں کیا کروں، تم سے جو بن پڑے کر لو۔"

میں نے گڑگڑانا شروع کیا۔ اپنے بال نوچ ڈالے، سر کئی بار دیوار سے پٹخا: "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔" اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے چھاتی پیٹنے لگی۔۔۔ جب سنبھلی تو دیکھا میں اکیلی زمین پر پڑی ہوں۔ آنکھوں کے آنسو سوکھ چکے تھے۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا، ہاتھ خون میں بھر گیا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ اندر بچے سو رہے تھے۔ اٹھی اور دل پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی آواز نہیں۔ عائشہ اور اُن کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ سچ مچ میں اُن کی بیاہتا نہ تھی۔ وہ تو عائشہ تھی جو اُن کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔ میں تو خزاں کا ایک سوکھا ہوا پتا تھی جو کہ برفیلی ہواؤں کی سردی سے کٹ کر گر پڑا تھا۔ میں جاڑے کی لعنت میں دھل کر ختم ہو جاؤں گی۔ بہار میں میرا کیا کام۔

ایک دوپٹے میں دو کپڑے جو کہ غلیظ ہو گئے تھے، باندھ کر رات کے وقت میں گھر سے چھوٹے لڑکے کو گود میں اُٹھائے نکل پڑی۔ میں تین کوس چل کر ایک سہیلی کے گھر ٹھہر گئی۔ دو دن وہاں ٹھہری تھی کہ گاؤں کے زمیندار نے میرا پیچھا لیا: "تم میرے ساتھ نکاح کر لو۔ تمہیں کیا غرض ہے کہ تم یوں پڑی رہو۔"

تیسری رات میں نے سہیلی سے کہا: "میرے بڑے لڑکے کو کسی طرح یہاں بلوا دو۔ میں اکیلی ہوں اور جہاں جاؤں گی گاؤں کے شُہدے میرے پیچھے ہو لیں گے۔ اُسکے آجانے سے مجھے اطمینان ہو جائیگا۔"

اُس نے رات کے دو بجے اپنے خاوند کو بھیج کر میرے بڑے لڑکے کو بُلوا لیا۔ وہ اپنا بستر اُٹھا لایا تھا۔ رات کو تاریکی میں بھی اُس کی نیند سے بھری آنکھیں میرے دل کو تسکین دے رہی تھیں۔ میں اُسے راستے ہی میں ملی، بنا کچھ کہے اس کو چھاتی سے چمٹا لیا اور پھر آنسو بہاتے ہوئے آہستہ سے کہا: "چلو۔"

یوں تو میں بڑی ڈرپوک واقع ہوئی ہوں، پر غم میں اپنے لئے ڈر کا وقت کہاں تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر کچی پکی سڑک پر چلتے رہے اور صبح ہونے تک ریاست جموں میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک رشتہ دار کے گھر ایک ہفتہ رہے۔ اتنے میں مجھے پتہ لگا کہ گاؤں والوں نے مل کر اُن کے گھر میں ڈاکہ ڈالا اور سب کچھ اُٹھا لے گئے۔ اب وہ اور عائشہ غریب تھے۔ اس میں شک نہیں کہ گاؤں والے میرے ہی دُکھ کے مارے اُنہیں تنگ کرنے پر آمادہ ہوتے تھے، لیکن میں یہ کیونکر سہہ سکتی تھی، جھٹ گاؤں پہونچی، صرف اُن سے یہ کہنے کو کہ میں تمہارے دُکھ میں دُکھی ہوں مجھے یہاں سے نہ نکالو۔ مگر ان دونوں نے طعنے دیے اور کہا: "اب ہمیں تڑپا کر مرتے دیکھنے آئی ہے۔"

مجھے لوٹنا پڑا۔

اسکے بعد ہم دونوں سرگودہ پہنچے، وہاں میرا لڑکا پندرہ روپے پر اور میں بارہ روپے پر ایک فیکٹری میں نوکر ہو گئی۔ دو تین مہینے وہاں رہی۔ اس عرصے میں میرا دماغ پھر گیا۔ گھنٹوں قبرستان میں جا کر پڑی رہتی۔ کبھی قبر کھود کر چھوٹے لڑکے کو اس میں ڈال دیتی اور آپ چھاتی پیٹنے لگتی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں اس لڑکے سے مجھے ذرا بھی محبت نہ تھی۔ یہ بیمار ہوتا تو میں علاج نہ کرتی۔ کہتی کمبخت مرجائے تو میں آزاد ہو جاؤں۔ دن رات جب نماز پڑھتی یہی دعا مانگتی کہ یا اللہ یہ بوجھ مجھ پر سے ہلکا کر، اسے اپنے پاس بُلا لے۔ اور اب یہ مجھے اتنا پیارا لگتا ہے۔" وہ اپنے بچے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔

اِدھر میرے نکلتے ہی گھر میں اناج تک نہ رہا۔ میں نے سُنا گاؤں والے ان سے بگڑ گئے تھے۔ کوئی انہیں کام پر نہ لگاتا تھا۔ ان کی بہن نے پہلے تو ان کو خوب بھلی بُری سُنائی۔ پر بھوکوں کے کھانے کو کچھ روپے اُدھار دے دیئے۔ میں نے جب یہ حال سُنا تو اپنے جمع کئے ہوئے کچھ روپے بھیج دیئے۔

چند سال بیت گئے۔ ایک دن ان کی چٹھی ملی: "ہم دونوں پر مقدمہ ہو گیا ہے۔ عائشہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں چلی گئی ہے۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ گھر اکیلا ہے اور بچے بچیاں بھوکے ہیں۔ تم سے ہو سکے تو اُن کی مدد کرو۔"

میں نے سب کچھ سمیٹا اور گھر پہونچی، گاؤں میں چھوٹے بڑے سب سے ملی اور روئی۔ گھر اُجڑ گیا تھا۔ لڑکیوں کی آنکھوں میں پتلیاں پڑ گئی تھیں۔ جوان تو ہو گئی تھیں، پر مُنہ کملائے ہوئے۔ سچ جاننا میں انہیں پہچان نہ سکتی تھی۔ چھوٹی لڑکی نے مجھے بتایا: "میں رات دن سڑکوں پر بیٹھی روتی

تھی۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

کچھ دن بعد مجھے خبر ملی، عائشہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں میرے ایک چچا کے لڑکے کے گھر ٹھہری تھی، وہ بیمار تھی اور وہ اس بھائی کے زیر علاج۔ اُسنے روائی میں اُسے کچھ دے دیا اور عائشہ کا دل پھٹ گیا۔ بھائی نے مجھے چٹھی بھیجی، مقدمہ خارج ہوگیا۔

اب انکی چٹھی آئی: "عائشہ تین بچے چھوڑ گئی ہے۔ ہوسکے تو انہیں گاؤں میں اپنے پاس بلالو۔ میرے پاس کچھ نہیں تم کہوگی تو گھر آجاؤنگا نہیں تو یہیں کہیں پڑا رہونگا"

میں نے خط لکھوایا اور بچے گھر منگوا لئے۔ یہ بھی تو اس کے ہی بچے تھے۔ ایک ہی خون کے ٹکڑے ـــ پر اُن کے اس اصرار کو کہ مجھے گھر آنے دو، میں نہ مان سکی۔ انہوں نے کہا: "میں بچوں کو دیکھنے دو دن کیلئے آؤنگا"

وہ آئے پر میں اُن کے پاس کھڑی نہ ہوئی۔ انہوں نے بہتیری التجا کی کہ: "برکت تم میرے بچوں کی ماں ہو، مجھے ایک بار پھر موقع دو کہ میں اپنے گناہ کا بار ہلکا کرسکوں" پر میں نہ پگھلی۔ میں نے کہا: "وہ وقت کچھ اور تھا، اب میں وہ نہ رہی"

اس دن انہیں بخار ہوگیا۔ چھوٹی لڑکی نے مجھے آکر بتایا کہ چچا بخار میں پڑے ہیں ـــ تو کھانا دے آؤں؟ ـــ پر اُس دن انہوں نے کچھ نہیں کھایا نہ کمرے سے باہر ہی نکلے۔ میں بھی حال پوچھنے تک نہ گئی۔ آخر تیسرے دن بڑے لڑکے نے آکر کہا: "چچا بستر باندھکر جانے کو تیار ہیں۔ پر جسم بخار سے جل رہا ہے"

میں نے کہا: "اُن کا جو جی چاہے کریں۔ میں کیوں اپنا دل کڑھاؤں"

پر میرا دل دھڑک اُٹھا۔ ان کا کون خیال کرے گا۔ اب تو عائشہ بھی نہیں رہی۔ اور پھر کہاں جائیں گے۔ انہیں کچھ ہوجائے تو۔ سو کھا منہ بنا کر اور آنگن میں دور کھڑی ہوکر میں نے کہا: "بخار اُتر جائے پھر چلے جانا"

انہوں نے اپنی بڑی بڑی لال لال آنکھیں جو پتھر کے کوئلے کی طرح روشن تھیں، اُٹھا کر کہا: "کون کہہ سکتا ہے کہ پھر اُٹھ سکونگا یا نہیں۔ تم سے کافی خدمت کروا چکا اب اجازت دو"

اسکے جانے کے کچھ دن بعد بڑے لڑکے نے ایک دن کہا: "اماں آج حلوا پکاؤ بہت جی چاہتا ہے" میں نے دیگچہ بھر حلوا چڑھایا۔ ابھی حلوہ چولہے پر ہی تھا کہ چھوٹا لالو ہنستا ہوا آیا اور دیگچے سے نکال کر کھانے لگا۔ میں نے ڈانٹا: "پکنے تو جانے دو" ابھی سے بچے کی طرح مُنہ مارنے لگے" تو اُسنے کہا: "لاؤ کسی کی فاتحہ تو دیدوں" میں نے کہا: "اگر فاتحہ دینی ہو تو اپنے باپ کی دو۔ اور کسی کی کیوں دو گے" یہ الفاظ میرے مُنہ پر آگئے لیکن دوسرے ہی لمحے میرا جسم لرز گیا۔ یہ بیماری کی حالت میں گھر سے گئے تھے۔ کون جانے میں ایسے بُرے لفظ کیوں بک گئی۔

پل بھر بھی نہ گذرا ہوگا کہ گاؤں کے بچے دوڑتے ہوتے آئے: "ڈاک والا۔ ڈاک والا"

گاؤں میں ڈاک والے کا آنا ایک عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ میں سمٹ کر تیوری نیچا کرکے دیوار سے چمٹ کر کھڑی ہوگئی۔ خط لال دین کے نام تھا۔ میرے ہونٹ تھر تھرا رہے تھے۔ لال دین نے چیخ ماری: "چاچا جی" میں نے دوڑ کر اُسے سنبھالا اور پوچھا: "کیا ہوا" اُسنے خط پھینک کر کہا: "یہ پڑھ لو" کل شام کو وہ فوت ہوگئے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔

اسکے بعد میں بیمار پڑگئی۔ دو ہفتے کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ اب یہ شاید بچ جائے۔ میرا لڑکا جی توڑ کر میری خدمت کرتا رہا اور اسی خدمت کے صلے میں تین مہینے کے بعد اچھی ہوئی۔ پر اُٹھتے ہی مجھے پتہ لگا کہ ہمارے مکان کی قرقی ہونے کو تیار ہے۔ انہوں نے لوگوں سے قرضہ لیکر ہضم کرلیا تھا اور روپیہ واپس نہ دے سکے تھے۔ قرضخواہوں نے رپورٹ کردی۔ گاؤں والوں نے کہہ سُن کر کسی طرح مہلت لے دی۔ اب چھ مہینے کے اندر مجھے پچاس روپے چکانا ہونگے نہیں تو گھر بار سب بکجائیگا"

اُسنے ایک لمبی سانس لی۔ میں نے دیکھا اُسکی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میں اُسے سمجھ نہ سکی۔ وہ کہتی گئی: "کل رات میں نے انہیں سپنے میں دیکھا۔ میں روتی ہوئی اُن سے چمٹ گئی اور کہا: "مجھے کیوں پھنسا گئے ہو۔ میں تو مر بھی نہیں سکتی" انہوں نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیکر کہا: "تم میرا کام سنبھالنے ہی کیلئے زندہ ہو۔ مجھے دھوکا نہ دینا" میں نے کہا: "تم تو آسانی سے نکل گئے میں اب کس کا در دیکھوں" انہوں نے کہا: "میرے کام کا بیڑا تم نے اُٹھالیا۔ تم میری عورت ہو یہ کبھی نہ بھولنا" میں نے کہا: "تم تو مجھے طلاق دے گئے تھے" انہوں نے اس کا جواب یہی دیا: "تم میری بیاہتا ہو اور میرے بچوں کی رکھوالی۔ کچھ عرصے کے بعد میں تم سے ملونگا اور پھر ہم کبھی جُدا نہ ہونگے۔ اسلئے آج میرے جی میں اُمنگ سی اُٹھ رہی ہے۔ ملنے کی اُمنگ"

میں نے اُس سے پوچھا: "تمہیں اپنے خاوند سے محبت تھی۔ اور اب بھی ہے؟"

"کیوں نہیں" وہ کھلکھلا اُٹھی: "میرے بالوں کی طرف دیکھو اور میری پژمردہ سی آنکھوں کی طرف۔ اب میری محبت کرنے کی عمر ہے کیا؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی: "تمہاری آنکھوں میں محبت کے شرارے ہیں اور تمہارے مُنہ پر ایک نئی دلہن کی سی اُمنگ" اُسنے اپنا مُنہ شرم سے چھپالیا اور آہستہ سے بولی: "یا للعجب کہ ہمارا سنجوگ اتنی دیر کے بعد پھر ہوا ہے کہ میں سنجوگ کی خوشی کو تقریباً بھول ہی گئی تھی"

میرے کلیجے میں ایک ٹیس سی اُٹھی اور اچانک نا اُمیدی کے غبار نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اُس نے حیران ہوکر میرے زرد چہرے کی طرف دیکھا۔ اُسے میرے دل کی حالت کا شاید اب اندازہ ہوا۔ دھیرے دھیرے اُسنے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرنا شروع

وزیر ہند سے ملاقات

کسی نے لندن کو سلطنتِ برطانیہ کا دل کہا ہے۔ اگر لندن سلطنتِ برطانیہ کا دل ہے تو وائٹ ہال کو برطانیہ کا دماغ سمجھنا چاہیے۔ ویسٹ منسٹر کے قدیم گرجا گھر، بگ بن کے فلک نما گھنٹہ گھر، اور پارلیمنٹ کی تاریخی عمارتوں کے سامنے بہت سے سرکاری دفتر ہیں۔ اور ان کے مجموعے کا نام وائٹ ہال ہے۔ اسی علاقے میں پریوی کونسل کی عمارت ہے۔ اس کے دروازے پر انصاف کی دیوی آنکھوں پر پٹی باندھے ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں ترازو لئے کھڑی ہے۔ خدا جانے اس عمارت کے اندر کیسے کیسے عظیم الشان فیصلے سنائے جا چکے ہیں۔ کیسی کیسی قانونی اُلجھنوں کی موشگافی ہو چکی ہے۔ اس کے سامنے وزیر جنگ کا دفتر ہے۔ دُنیا کی قسمت کا فیصلہ اسی دفتر میں ہوتا ہے۔ اسی سڑک پر ایک چھوٹا سا رستہ ہے۔ ہے تو یہ چھوٹا سا رستہ، لیکن برطانیہ کے ناخدا کا مکان اسی سڑک پر ہے۔ اس سڑک کا نام ڈاؤننگ اسٹریٹ ہے۔ اور یہاں دس نمبر کے مکان میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل رہتے ہیں۔ لڑائی سے پہلے ان کے مکان کے سامنے ہر وقت تماشائیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لیکن اب سڑک کے ناکے پر پولیس کا پہرہ بیٹھ گیا ہے۔ اور کوئی شخص بغیر خاص اجازت کے اس بازار میں داخل نہیں ہو سکتا۔ انہی تاریخی عمارتوں میں انڈیا آفس بھی ہے۔ یہاں وزیر ہند رائٹ آنریبل مسٹر ایل۔ ایس۔ ایمرے سے ملنے میں جا رہا ہوں۔

ساڑھے تین بجے ملاقات کا وقت مقرر ہے لیکن میں دس منٹ پہلے ہی پہونچ گیا۔ تاکہ عمارت کی بھی سیر کر لوں۔ لمبے لمبے دالانوں، زینوں، راستوں اور کمروں میں سے گذرتا ہوا میں وزیر ہند کے پرائیویٹ سکریٹری کے کمرے میں پہونچ گیا۔ ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھایا گیا۔ مسٹر ایمرے کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر ہیری سن کمرے میں داخل ہوئے۔ نہایت متین، سنجیدہ، سبک رفتار، تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ میں نے اُن سے کہا: "پہلے میں انڈیا آفس کی عمارت دیکھنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے فوراً ایک ایسے افسر کو بلوا لیا جو مدت سے ریکارڈ آفس کے مہتمم ہیں۔ اور عمارت کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ میں تو انہیں انڈیا آفس کی جیتی جاگتی ڈائرکٹری سمجھتا ہوں۔ یہ میز فلاں سن میں ہندوستان سے آئی تھی۔ یہ تصویر فلاں تاریخی واقعے کی ہے۔ یہ شاہ عالم ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کے دیوانی اختیارات کا پٹہ دے رہے ہیں۔ ان کے سامنے نہایت ادب سے کلائیو جھکے شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ شملے کا جاکھو پہاڑ ہے۔ یہ درۂ خیبر کی تصویر ہے۔ یہ بنارس کے گھاٹ کا منظر ہے۔ غرض انڈیا آفس کی تصویریں کیا ہیں ہندوستان کی تاریخ کا نگار خانہ ہے۔

اسی دفتر میں وزیر ہند کے تینوں ہندوستانی مشیر اور صلاح کار بھی کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رگھوویندر راؤ آج کل میں وائسرائے کے وزیر ہو کر ہندوستان جانے والے ہیں۔ جلدی جلدی ان سے ملاقات کی۔ سر حسان سہروردی سے کون واقف نہیں۔ یہ بھی چند مہینے کی چھٹی پر ہندوستان جا رہے ہیں۔ جب ملتے ہیں بے حد تپاک اور ہمدردی سے ملتے ہیں۔ ان کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ تیسرے مشیر دیوان بہادر رنگا ناتھن مدراس یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اب اقلیتوں کی طرف سے وزیر ہند کو مشورہ دیتے ہیں۔ کھڑے کھڑے ان سے بھی ملاقات ہوئی۔

تیسری منزل پر انڈیا آفس کا کتب خانہ ہے۔ اور یہ دیکھنے دکھانے کے قابل چیز ہے۔ ہندوستان اور مشرقی ملکوں کے متعلق طالب علموں کو جو بیش بہا مسالہ اور قیمتی مواد اس کتب خانے سے مل سکتا ہے وہ غالباً دُنیا میں کہیں ایک جگہ ہاتھ نہیں لگ سکتا۔ لڑائی سے پہلے انڈیا آفس کی لائبریری میں علم کے پیاسوں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا۔ کوئی ہندوستان کے قدیم فلسفے پر چھان بین کر رہا ہے۔ کوئی ہندوستان کی موسیقی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ایک امریکی ماہرِ ہند ہندوستان کی مصوری کے نمونے پرکھ رہا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کے متعلق کسی نے یہ بالکل ٹھیک کہا ہے کہ اس وقت دُنیا بھر میں کوئی ایسا عالم اور مستشرق موجود نہیں کہ جو ہندوستان کے متعلق تحقیق کرے اور اس سلسلے میں انڈیا آفس لائبریری کا دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔ گذشتہ پچاس سال میں ہندوستان کے متعلق جو قدر بھی علم اور تاریخی تحقیق ہوئی ہے اس کا سرچشمہ انڈیا آفس لائبریری ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ اس پر انڈیا آفس کو بجا طور سے ناز ہے۔

سنہ ۳۰ء میں انڈیا آفس لائبریری میں ۲ لاکھ ۳۰ ہزار چھاپے کی کتابیں اور ۲۰ ہزار قلمی مسوّدے تھے۔ ان میں سے اکثر مسودے ایسے نادر نسخے ہیں کہ ان کی نقل دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اس کتاب خانے میں مشرقی زبانوں کی کتابوں کی فہرست سُن کر شاید آپ کو تعجب ہوگا۔ عربی اور فارسی کی دس ہزار کتابیں، سنسکرت پالی اور پراکرت کی ۲۲ ہزار جلدیں۔ ۱۰ سو کتابیں چینی زبان کی، ژند پہلوی کی دو سو کتابیں۔ بنگالی کی ۴۲ ہزار کتابیں۔ ہندی کی ہزار چار سو جلدیں۔ گجراتی ساڑھے نو ہزار۔ پنجابی ۴۹۲۵۔ اور اُردو کی ۱۹ ہزار کتابیں۔ اس فہرست میں میں نے ابھی آسامی مارہی۔ ملیالم۔ مرہٹی۔ نیپالی۔ تبتی۔ پشتو۔ سنتالی۔ سندھی۔ تامل تلنگو اور دوسری زبانوں کا نام تک نہیں لیا۔

لائبریری کے برابر ہی ریکارڈ آفس ہے جسے میں عجائب گھر سمجھتا ہوں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پُرانے ریکارڈ۔ فائل۔ دستاویز۔ فرمان۔ احکام۔ غرض ان کی فہرست بنائی جائے تو گھنٹہ بھر کا کام ہے۔ ایک پرانا اور بوسیدہ رجسٹر یہاں دیکھ کر میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ یہ رجسٹر سینٹ ہیلی نا کے جزیرے سے یہاں آیا ہے۔ اس جزیرے میں نپولین قید تھا۔ اور یہیں نپولین مرا۔ رجسٹر میں ایک جگہ لکھا ہے ”۵ مئی سنہ ۱۸۲۱ء۔ آج نپولین بوناپارٹ مرگیا“ نپولین جیسے فاتح اور جرنیل کی موت کا ذکر ان سادہ لفظوں میں۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے۔ تاریخ اور ریکارڈ آفس سب انسانوں سے برابر کا سلوک کرتے ہیں۔ اور ریکارڈ آفس کی نظر میں نپولین بھی ایک انسان تھا۔

لیجئے ساڑھے تین بج گئے۔ مسٹر ہیری سن دروازے پر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے اندر جاکر مسٹر ایمرے وزیر ہند کو اطلاع کی۔ اور اُلٹے پاؤں آکر بغل والے کمرے میں مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ نہایت آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور میرے نام کا اعلان کردیا۔

ایک بڑے لیکن نہایت سادہ کمرے میں کھڑکی کے برابر ایک بہت بڑی میز ہے۔ اور میز کے سامنے ایک شخص عینک لگائے جھکا ہوا فائل دیکھ رہا ہے۔ پہلی نظر میں اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس شخص کا قد بہت چھوٹا ہے۔ لیکن جسم بہت بنا ہوا ہے۔ چوڑا سینہ، گٹھا ہوا بدن، مضبوط شانے، ساٹھ سال سے اُونچی عمر لیکن چہرے پر رونق۔ اطلاع سنتے ہی انہوں نے گردن اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اور مسکراتے ہوئے کُرسی سے اُٹھے۔ اُن کی مسکراہٹ۔ چہرے کی شگفتگی، آنکھوں کی چمک، اور اس طرح بے تکلفی سے میری طرف ہاتھ بڑھانا اِن سب باتوں کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ جب میں نے ہاتھ ملایا تو ایسا معلوم ہوا کہ میرا ہاتھ شکنجے میں جکڑا گیا۔ ان کا مضبوط ہاتھ اور بھرا ہوا جسم بتا رہا تھا کہ مسٹر ایمرے کو کسرت کا بہت شوق ہے۔ اور اس عمر میں بھی جو یہ رونق اور پھرتی ان کے جسم میں موجود ہے اُسے بنانے میں انہوں نے بہت محنت کی ہوگی۔

مسٹر ایمرے نے مجھ سے سامنے والی آرام کُرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اور خود اپنی کُرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے ”انڈیا آفس تمہارے ہندوستان کی ملکیت ہے، تم نے اُسے دیکھا“

میں نے کہا ”جی ہاں ابھی آپ کے ایک افسر نے مجھے انڈیا آفس کی سیر کرائی ہے۔ اور اب مجھے یہ سُنکر اور بھی خوشی ہوئی کہ میں ایک ایسی عمارت میں بیٹھا ہوں جو میرے وطن ہندوستان کی ملکیت ہے“ میں نے مسٹر ایمرے سے پوچھا ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ضلع گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کو ہندوستان کی کچھ باتیں یاد ہیں؟“

یہ سوال سنتے ہی اُن کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوگئی۔ جیسے کوئی دُور کے دُھندلے نقش اُجاگر کرنے کی کوشش کرے۔ ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے ”مجھے اپنی آیا اب تک یاد ہے۔ اس کا نام ایلائنزا تھا۔ ہندوستان سے آنے کے بہت دن بعد تک ہر سال اُسے میں کرسمس کے موقعے پر تحفے بھیجا کرتا تھا۔ یہ بھی مجھے اکثر اپنا دُکھ درد لکھتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے مجھے خط لکھا کہ میرے گائے بیل میرا ایک ہمسایہ زبردستی کھول کرلے گیا۔ میں نے اُسے تسلی تشفی کا خط بھیجا۔ لیکن بہت دن بعد یہ خط ہندوستان سے واپس آگیا۔ اس کی پُشت پر لکھا تھا۔ ایلائنزا مر گئی۔ یہ سنہ ۸۶ء یا سنہ ۸۷ء کا واقعہ ہے“

میں نے کہا ”ہندوستان کی اور کیا کیا باتیں آپ کو یاد ہیں؟“

بولے ”میرے والد جنگلات کے محکمے میں ملازم تھے۔ اور ان کا اکثر وقت دورے میں کٹتا تھا۔ ہاتھی کی سواری۔ ترائی کے جنگل، شکار، اور چھولداری کی زندگی مجھے اب تک یاد ہے۔ ہندوستان سے ولایت آنے کے بعد ہم دونوں بھائی ایک مدت تک آپس میں ہندوستانی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ اور اس پر ہماری انگریز نرس بہت جھنجلاتی تھی۔ لیکن بعد میں ایکا ایکی ہم یہ زبان بھول گئے“

شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ انگلستان کے مشہور ہیرو اسکول میں مسٹر چرچل اور مسٹر ایمرے ایک ہی وقت میں پڑھتے تھے۔ بلکہ مسٹر ایمرے مسٹر چرچل سے ایک آدھ جماعت آگے تھے۔ مسٹر

ے نے اپنی سوانح عمری میں یہ دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک ن اسکول میں تالاب کے کنارے چرچل نے اڑنگا مار کر مجھے تالاب میں پھینک دیا۔ جب ہی تالاب سے باہر نکلا تو مجھے یہ دیکھ کر بے حد غصہ آیا کہ مجھ سے نچلی جماعت کے ایک لڑکے نے مجھے اس طرح سب کے سامنے تالاب میں دھکیلا ہے۔ چنانچہ پانی سے نکلتے ہی میں نے اپنا بدلا لیا۔ اور اس لڑکے کو پکڑ کر میں نے پانی میں خوب ڈبکیاں کھلائیں۔ مسٹر ایمرے اور مسٹر چرچل کی پہلی ملاقات تھی۔

میں نے مسٹر ایمرے سے پوچھا "سُنا ہے آپ کو بہت سی مشرقی زبانیں بھی آتی ہیں۔ یہ آپ نے کہاں سیکھیں؟"

بولے "جب میں آکسفورڈ میں پڑھتا تھا تو میرا ارادہ سفارت خانے میں ملازمت حاصل کرنے کا تھا۔ ایک سال چھٹیوں میں میری ایک ترک سے ملاقات ہو گئی۔ اُسے میں نے اپنا مہمان بنایا۔ اور اس سے ترکی زبان سیکھ لی۔ اس کے بعد بلقان کی ریاستوں کا دورہ کیا اور وہاں جاکر عرب قوم کی زبان سیکھ لی۔ تھوڑی سی عربی اور فارسی سے بھی شُد بُد ہو گئی۔"

میں نے کہا "کچھ یاد ہو تو سنائیے"

مسٹر ایمرے نے مُسکراتے ہوئے سورۂ فاتحہ پڑھکر سُنادی۔ جب مسٹر ایمرے نے غیر المغضوب علیہم ولاالضالین پڑھا تو میں نے زور سے کہا۔ آمین۔

اس کے بعد مسٹر ایمرے نے مجھے خواجہ حافظ کی مشہور غزل سنائی جس کا مطلع ہے ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندواش بخشم سمرقند و بخارا را

اُنہوں نے مطلع سے لیکر مقطعے تک ایک ایک شعر مزے لے لے کر پڑھا۔ لہجہ انگریزی تھا لیکن الفاظ کی صحت اور تلفظ میں کہیں فرق نہیں تھا۔ میں نے اوروں سے سُنا ضرور تھا کہ وزیر ہند کو مشرقی ادب سے دلچسپی ہے۔ لیکن آج اپنے کانوں سے اور ان کی زبان سے یہ سب باتیں سُنکر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

مسٹر ایمرے کو سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے۔ اور پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق تو جنون کی حد تک پہونچ چکا ہے۔ یورپ کے اونچے اونچے پہاڑ، جنوبی افریقہ کے کوہستان۔ کنیڈا۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کی برفانی چوٹیاں، سب ان کا تختۂ مشق بن چکی ہیں۔ بلکہ جنوبی افریقہ اور کنیڈا میں تو پہاڑیوں کے نام ان کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ غالباً پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق انہیں اس وجہ سے ہے کہ ان کی پیدائش ہمالیہ پہاڑ کی گودی میں ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے والی مہم میں بھی ان کا نام شامل کیا گیا تھا۔ لیکن کسی خاص مجبوری کی وجہ سے یہ جا نہیں سکے۔ اور اس کا انہیں آج تک افسوس ہے۔

مسٹر ایمرے نے زندگی ایک اخبار نویس کی حیثیت شروع کی تھی۔ اور اخبار ٹائمز کے نمائندے بنا کر یہ بوئر وار کا حال دیکھنے کے لئے جنوبی افریقہ بھیجے گئے تھے۔ بوائر وار کے بعد انہوں نے اس لڑائی کے متعلق تاریخ کی کئی کتابیں بھی لکھیں جو اس وقت تمام دُنیا میں سند مانی جاتی ہیں۔ مسٹر ایمرے شاعر بھی ہیں اور انگریزی زبان کے ایک عمدہ خوش بیان ادیب کی حیثیت سے ان کی شہرت مسلّم ہے۔ اخبار نویسی سے یہ سیاست میں پڑے۔ سیاست انہیں ہاؤس آف کامنز میں لائی۔ اور ہاؤس آف کامنز سے یہ وزارت کی کرسی پر بیٹھے۔ اب سے پہلے بھی یہ کئی سال تک برطانیہ کے وزیر رہ چکے ہیں۔ مسٹر چرچل نے جب نئی وزارت بنائی تو وزیر ہند کا عہدہ ان کے سپرد کیا۔ گویا آج سے پچاس برس پہلے جو دوستی ہیرو اسکول میں تالاب کے کنارے شروع ہوئی تھی اُس کی یاد برطانیہ کے وزیر اعظم اور وزیر ہند کے دلوں پر آج بھی باقی ہے۔

اس دلچسپ گفتگو کے بعد میں نے مسٹر ایمرے سے اجازت مانگی۔ یہ مشرقی اخلاق کا زندہ نمونہ ہیں۔ دروازے تک مجھے چھوڑنے آئے۔ خود دروازہ کھولا اور میں رائٹ آنریبل مسٹر ایل۔ ایس۔ ایمرے وزیر ہند سے رخصت ہوا۔

(باجازت بی۔ بی۔ سی۔ لندن)

آغا محمد اشرف؛

عورتوں کو چھیڑنا

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ سو جب تک مردوں کو وصل نصیب نہیں ہوتا تو حسرت ہی سے اپنا دل بہلاتے رہیں گے اور خوباں سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا۔ وہ مرد کون تھا جس نے پہلی بار کسی عورت کو چھیڑا۔ اس کے متعلق تاریخ سے ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ بہت ممکن ہے باغ عدن کی کسی گھنی جھاڑی کے عقب میں یا کسی سایہ دار درخت کے نیچے حضرتِ آدم ہی نے یہ سلسلہ شروع کیا ہو۔ کیونکہ وہ جنت سے یوں ہی تو نکالے نہیں گئے تھے۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت آدم ہی نے اس دلچسپ سلسلے کا آغاز کیا تھا تو پہلی چھیڑ کا تصور ممکن نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چھیڑ بے حد خام ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس چھیڑ میں انتہا درجے کی لطافت اور نزاکت ہو۔ دراصل اس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اُن کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کردار و اطوار سے ہم قطعاً ناآشنا ہیں، اِسی طرح ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اماں حوا نے اس چھیڑ کو کس رنگ میں دیکھا اور اُن کے دل و دماغ میں اِس چھیڑ نے کس قسم کا ردِ عمل پیدا کیا ــــ طرح طرح کے تصور دماغ میں آتے ہیں پر کوئی صحیح تصویر نہیں بنتی۔ دو برہنہ سائے سو ایک خیالی باغ میں ٹہلتے نظر آتے ہیں، اس کے بعد عال کے نقوش کچھ اِس طرح اُبھرتے ہیں کہ تصور امریکہ کے کسی ننگے کلب کی طرف چلا جاتا ہے۔ بابا آدم صاحب بن جاتے ہیں اور اماں حوا اُن کی میم۔

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی ــــ یورپ میں جہاں ترقی پسندی کا دور دورہ ہے اور تہذیب و تمدن کی چولی کے بند کھلے ہوئے ہیں حسرتیں کم ہیں اور وصل زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں چھیڑ چھاڑ عام دیکھنے میں آتی ہے۔ نقاب اُٹھنے پر بھی وہاں کی بے نقاب عورتیں اُسی طرح گھوری جاتی ہیں جس طرح یہاں ہندوستان کی نقاب پوش عورتوں کے نقاب گھورے جاتے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ بھی زوروں کی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ۔ دراصل جنسی بھوک کچھ اس قسم کی بھوک ہے کہ مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ جب تک مرد اور عورت پاس پاس رہیں گے یہ چھیڑ چلی جائے گی یا پھر کوئی ایسا زمانہ آئے کہ عورت کا وجود مرد کے لئے غیر ضروری ہو جائے تو چھیڑ کا یہ سلسلہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس سے پہلے اِس کا خاتمہ ممکن نہیں۔

پچھلے دنوں گاندھی جی نے آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے بارے میں ارشاد کیا تھا: "ایک جولیٹ کے سو سو رومیو موجود ہیں۔" اس پر لاہور میں شور مچا تھا کہ خدا کی پناہ۔ مس ممتاز شاہنواز اور دوسری خواتین نے گاندھی جی کے اس حملے کا بڑی شدت سے جواب دیا۔ بہت دیر تک مستورات کے مضامین ہندوستان کے اس نیم مستور لیڈر کے خلاف چھپتے رہے۔ گاندھی جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہوں نے ایک مضمون اور لکھا اور اس میں تہذیب نو کے گرفتار لڑکوں کو اپنے اہنسائی تیروں کا نشانہ بنایا۔ ان نوجوانوں سے گاندھی جی نے کہا: "تم بازار میں جب چلو تو اپنی نگاہیں نیچی رکھا کرو۔ اگر ہو سکے تو ـــــ ہڈ پہنا کرو تاکہ تمہاری نگاہیں نوجوان لڑکیوں پر نہ پڑ سکیں اور تمہارا ایمان متزلزل ہونے سے بچ سکے۔"

ہندوستان پر گاندھی جی کا اثر مسلّم ہے، پر اُن کا یہ مضمون نوجوانوں کے جذبات پر اثر انداز نہ ہو سکا ـــــ خوباں سے چھیڑ جاری رہی۔ نگاہوں پر سنسر نہ بیٹھ سکا۔ جذبات ویسے کے ویسے بے لگام رہے۔ گاندھی جی کی یہ سعی ویسی ہی ناکام رہی جیسے بمبئی میں امتناعِ شراب کے بارے میں کانگرس گورنمنٹ کی کوشش۔

گاندھی جی کی یہ کوشش اگر بارآور ثابت ہوتی تو ذرا غور کیجئے کہ معاشرتی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب برپا ہو جاتا ـــــ گلی کوچوں اور بازاروں میں آپ کو مرد ماتھے پر ہڈ باندھے اور نگاہیں نیچی کئے چلتے پھرتے نظر آتے۔ ٹریفک میں کئی مشکلات پیدا ہو جاتیں اور ہر روز حادثے وقوع پذیر ہوتے اور اِن حادثوں کا شکار صرف مرد ہوتے۔ ماتھے پہ ہڈ بندھا ہے، نگاہیں فرش پہ، سامنے سے تیز رفتار موٹر آ رہی ہے، اِدھر اُدھر جوان عورتیں جا رہی ہیں، ہارن پہ ہارن بجایا جا رہا ہے، نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن، ایک عجب مشکل میں آدمی پھنس جاتا۔ ہسپتال زخمیوں سے بھر جاتا۔ وہاں بھی بیچارے مردوں کی آنکھوں پر ہڈ چڑھا رہتا کہ کسی نرس کو نہ دیکھ پائیں۔

ہڈ کی بات چھوڑیے، روز مرّہ کی زندگی بالکل بے کیف ہو جاتی۔ جذبات کا دریا بند پانی کی طرح ٹھہر جاتا۔ اُمنگیں، خیال آرائی کی تمام قوتیں، جذباتی ہیجان، غرضیکہ وہ سب کچھ جس سے انسانی زندگی میں حرارت پیدا ہوتی ہے فنا ہو جاتا ـــــ عورت ہوتی، مرد بھی ہوتے، لیکن وہ چنگاری نہ ہوتی جو اِن دونوں کے تصادم سے پھوٹتی ہے۔ جوانیوں کے بھرے ہوئے جام

ؤں کے لمس کو ترستے رہتے۔ شوخیاں اور شرارتیں بالکل مفقود ہوجاتیں۔ ہر طرف متانت اور سنجیدگی نظر آتی۔ چہرے لمبوترے ہوجاتے۔ اُن کی رونق اور اُن کی چمک سب غائب ہوجاتی۔ زندگی کے اُکتا دینے والے یک آہنگ تسلسل میں آدمی بالکل بےجان اور مُردہ ہو کے رہ جاتا۔ ملک کی شاعری اور اُس کے ادب کا ستیاناس ہوجاتا۔ فنونِ لطیفہ سب کے سب ختم ہوجاتے۔۔۔ مگر یہ نہ ہوا اس لئے کہ اس کا ہونا ممکن نہیں تھا۔

ہر بالغ مرد اور ہر بالغ عورت کو معلوم ہے کہ یہ چھیڑ چھاڑ کیوں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی خلافِ عقل چیز نہیں لیکن یہاں وہ چند بیانات دلچسپی سے خالی نہ ہونگے جو میں نے بڑی کاوش سے چند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے اس چھیڑ چھاڑ کے متعلق حاصل کئے ہیں۔

میں نے پہلے ذیل کے سوالات لڑکوں کے لئے تیار کئے۔

(۱) تم لڑکیوں یا عورتوں کو کیوں چھیڑتے ہو۔ کیا اس کی کوئی وجہ تم بیان کر سکتے ہو؟۔

(۲) کس قسم کی لڑکیوں یا عورتوں کو تم زیادہ چھیڑتے ہو؟۔

(۳) تمہارے چھیڑنے کا طریقہ کیا ہے؟۔

(۴) کیا تمہارے خیال میں لڑکیاں یا عورتیں ایسی چھیڑ چھاڑ پسند کرتی ہیں؟۔

(۵) کوئی ایسا واقعہ بیان کرو جو اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کے ساتھ وابستہ ہو اور جس کے نقش تمہارے ذہن پر مرتسم ہوچکے ہوں۔

میں نے یہ پانچ سوال بارہ لڑکوں سے کئے جن کی عمر سولہ سے لے کر چوبیس برس کے درمیان درمیان تھی۔ ان میں سے سات لڑکے جو تعلیم یافتہ تھے مجھے پہلے سوال کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکے۔ باقی پانچ لڑکوں نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے جواب ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ جو کچھ اُنہوں نے اس ضمن میں کہا اُس کا خلاصہ یہ ہے۔

"ہم لڑکیوں اور عورتوں کو اس لئے چھیڑتے ہیں کہ ہمیں اس میں مزا آتا ہے۔ زیادہ مزا ہمیں اُن لڑکیوں کو چھیڑنے میں آتا ہے جو ہماری دراز دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرسکیں۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر خاموش ہوجائیں، گالیاں اُن کی زبان کی نوک پر آ کر رہ جائیں۔ غصے کے اِس خاموش اظہار کا لطف بیان سے باہر ہے۔۔۔ ہم اس لئے اُن کو چھیڑتے ہیں کہ اس چھیڑ کی تحریک ہمارے اندر خود بخود پیدا ہوجاتی ہے۔ بعض اوقات بازار میں چلتے ہوئے کئی خوبصورت اور ترشی ہوئی لڑکیاں ہمارے پاس سے گذر جاتی ہیں مگر ہم اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ دراصل چھیڑنا موڈ کی بات ہے۔ اگر موڈ ایسا ہو تو کوئی لڑکی ہماری چھیڑ سے بچ کر نہیں جاسکتی۔ بعض اوقات ہمیں گالیاں سُننا پڑتی ہیں اور خطرناک حادثوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس سے ہماری یہ سرگرمی کچھ دیر کے لئے ماند پڑ جاتی ہے، مگر پھر وہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ عورت کی بےبسی سے ہم ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر عورت کی بےبسی ہمیں بےبسی نظر نہیں آتی، اس لئے کہ وہ ہماری پہونچ سے بہت دُور رہتی ہے۔ اُس کے خیالات و محسوسات سے چونکہ ہم غافل ہیں اس لئے ہمیں وہ اونچے درخت کی ٹہنیوں سے اُلجھی ہوئی پتنگ دکھائی دیتی ہے جس پر کنکر مارنے کا خیال خواہ مخواہ دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔۔۔ آپ پوچھتے ہیں کہ ہم لڑکیوں کو کیوں چھیڑتے ہیں، ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم لڑکیوں کو کیوں نہ چھیڑیں؟ اگر ہم انہیں نہ چھیڑیں گے تو اور کون چھیڑیگا۔ ہمارے اور اُن کے تعلقات ہمیشہ سے کچھ اس قسم کے چلے آتے ہیں کہ یہ چھیڑ چھاڑ ضروری ہے"۔

ان پانچ نوجوانوں میں سے ایک لڑکا جس کی عمر چوبیس برس کی تھی بہت ہوشیار تھا۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اچھی تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا: "آپ کہتے ہیں کہ ہم عورتوں کو کیوں چھیڑتے ہیں؟۔ اس کا جواب تو آپ کو کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا، لیکن اس کا جواب کیا ہے کہ میں نے پرسوں بازار میں جاتے ہوئے ایک کتے کی طرف دیکھا۔ ایک دم نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اُسے آنکھ ماردی۔ اب اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ میں نے اُس کو آنکھ کیوں ماری تو میں آپ کو خاطر خواہ جواب نہ دے سکونگا۔ اس لئے کہ میں اُس لمحاتی جذبے کا تجزیہ نہیں کرسکتا جو اس عجیب و غریب حرکت کا باعث ہوا"۔

دوسرے سوال کا جواب آٹھ لڑکوں نے یہ دیا کہ ہم اُن لڑکیوں کو چھیڑنا پسند کرتے ہیں یا اُن لڑکیوں کو چھیڑنے کے لئے ہمارے اندر اکساہٹ پیدا ہوتی ہے جو جوان ہوں اور جنہیں اپنی جوانی پر ناز ہو۔ یہ ناز اُن کی چال ڈھال میں صاف نظر آجاتا ہے۔

دو لڑکوں نے اِسی سوال کا جواب یوں دیا: "ہم صرف اُن لڑکیوں کو چھیڑنا پسند کرتے ہیں جو ہمیں عین موقع پر پسند آجائیں۔ بعض اوقات معمولی شکل و صورت اور معمولی جوانی کی لڑکیوں کو چھیڑنے کو دل چاہتا ہے اور بعض اوقات غیر معمولی طور پر حسین اور نکیلی لڑکیوں ہی کو چھیڑا جاتا ہے۔ یہ محض اکساہٹ کی بات ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ اکساہٹ لڑکیاں خود پیدا کرتی ہیں۔ چھیڑنے کا تو مادہ ہمارے اندر موجود ہے مگر اس بارود کو آگ وہی لگاتی ہیں۔۔۔"

باقی دو لڑکوں نے کہا: "ہم صرف موٹی اور گول گپی لڑکیوں کو چھیڑتے رہے ہیں۔ دُبلی پتلی لڑکیوں کو ہم نے کبھی نہیں چھیڑا۔ موٹی اور بھاری جسم کی لڑکی

کو چھیڑنے میں بہت مزا آتا ہے"

اِن میں سے ایک نے کہا: "بازار میں یا گلی میں جہاں کہیں موٹی لڑکی مجھے نظر آ جائے میں آنکھ ضرور مارتا ہوں۔ اس میں ایک خاص لطف آتا ہے مجھے، جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری آنکھ اُس کے نرم نرم جسم میں کھُب گئی ہے۔ موٹی لڑکیاں یوں بھی زیادہ شرمیلی ہوتی ہیں۔ اُنکو آنکھ ماری جائے تو شرم سے اُن کے گدگدے گال جب تھرتھراتے ہیں تو ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے"

تیسرے سوال کا جواب دس لڑکوں نے ایک جیسا دیا۔ اُنہوں نے کہا: "چھیڑنے کے طریقے یوں تو بہت سے ہیں لیکن عام طریقہ یہی ہے کہ راہ چلتی لڑکی کو آنکھ ماری جائے۔ آنکھ سے چھیڑنا خطرناک نہیں، اس لئے کہ اس میں قربت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دُور سے بھی اگر آنکھ ماری جائے تو نشانے پر بیٹھتی ہے۔ اور اپنا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ آنکھ محض شرارت کے طور پر ماری جاتی ہے مگر اس جھپک میں یہ سوال بھی پوشیدہ ہوتا ہے: کیا خیال ہے تمہارا؟ صرف ایک ہلکارے کے ذریعے سے یہ سوال جس میں ہزار ہا سوال منجمد ہوتے ہیں ایک سکنڈ سے کچھ کم عرصے میں کر دیا جاتا ہے۔ اس کا جواب عام طور پر ایک نفرت انگیز اور خشم آلود گھبراہٹ ہوتی ہے جو لڑکی کے سارے جسم پر چشم زدن میں پھیل جاتی ہے۔ آنکھ مارنا اس لئے زیادہ خطرناک نہیں کہ اس شرارت کا ٹھوس ثبوت بہم پہونچانا بہت مشکل ہے۔ ذرا آنکھ جھپکائی، لڑکی کے چہرے پر انگارے سے بکھرے اور چلدئے۔ کبھی کبھی کوئی لڑکی مُسکرا بھی دیتی ہے اور یہ مسکراہٹ دیر تک ہمیں یاد رہتی ہے، اس لئے کہ اس میں ایک ایسی تیتری کے رنگ ہوتے ہیں جو ہاتھ نہیں آ سکتی۔ بس ایک لمحے کے لئے یہ مسکراہٹ ہماری آنکھ کی جھپک سے تیتری کے ہلکے پھلکے پروں کی طرح چھوتی ہے اور پھر پھڑ پھڑا کر اُڑ جاتی ہے ــــ آنکھوں کو چھوڑ دیجئے تو جسم میں زبان کے علاوہ صرف ہاتھ باقی رہ جاتے ہیں جن سے چھیڑا جا سکتا ہے، ہم ان سے مدد لیتے ہیں لیکن بہت کم اس لئے کہ ہاتھ اکثر اختیار سے باہر نکل جاتے ہیں، اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ زیادہ ہو، کوئی میلا ٹھیلا ہو، کھوے سے کھوا اچھل رہا ہو، اس افرا تفری میں کسی لڑکی کو اگر گدگدا دیا جائے تو اتنا زیادہ خطرناک نہیں ہوتا۔ نمائش میں رات کے وقت اُس مقام پر جہاں اُونچی سیڑھی پر سے بازی گر کو نیچے آگ کے کنوئیں میں چھلانگ لگانا ہوتی ہے کافی ہجوم ہوتا ہے۔ یہاں ہم اکثر لڑکیوں کے گدگدیاں کیا کرتے ہیں۔ بعض اوقات اپنا جسم اس کے جسم سے رگڑ کر بہم تیزی سے آگے نکل جایا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کاندھے سے ہلکا سا دھکا بھی دیدیا جاتا ہے۔ بس ہم صرف یہی طریقے استعمال کرتے ہیں"

باقی دو لڑکوں میں سے ایک نے کہا: "میں نے آج تک کسی لڑکی کو آنکھ نہیں ماری۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آنکھ ماری جاتی ہے اور میں نے کئی لڑکوں کو آنکھ مارتے بھی دیکھا ہے مگر میں کوشش کے باوجود یہ چیز سیکھ نہیں سکا۔ میں جب کبھی ایک آنکھ سکیڑنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری دوسری آنکھ بھی بند ہو جاتی ہے، میں اسی وجہ سے کسی کو آنکھ نہیں مارتا۔ میں نے ہاتھ سے بھی آج تک کسی لڑکی کو نہیں چھیڑا۔ میرا چھیڑ چھاڑ کا طریقہ سب سے جُدا اور انوکھا ہے۔ میں راہ چلتی لڑکیوں سے وقت پوچھا کرتا ہوں۔ اس سے مجھے بہت لُطف حاصل ہوتا ہے۔ وقت میں صرف اُنہی سے پوچھتا ہوں جن کی کلائی پر گھڑی بندھی ہو۔ آج تک کسی لڑکی نے مجھے وقت بتانے سے انکار نہیں کیا۔ لیکن بہت کم لڑکیاں مجھے گھڑی دیکھکر صحیح وقت بتا سکی ہیں اس لئے کہ ایک دم جب کسی لڑکی سے وقت پوچھا جائے تو وہ سخت گھبرا جاتی ہے۔ اس گھبراہٹ میں وہ انکار بھی نہیں کر سکتی۔ میں خود اپنے آپ کو گھبرایا ہوا ظاہر کرتا ہوں جیسے مجھے ایک خاص وقت پر کہیں پہونچنا ہے۔ اس قسم کی اضطراری کیفیت اپنے اُوپر طاری کر کے میں ادھر اُدھر پریشانی کے عالم میں دیکھا کرتا ہوں، پھر جیسے اچانک میری نگاہیں اُس کی گھڑی پر جا پڑی ہیں، میں پوچھا کرتا ہوں "معاف فرمایئے گا، آپ کی گھڑی میں وقت کیا ہے؟" بس، وقت پوچھا، جو کچھ اُس نے بتایا سُنا اور تیز قدمی سے چلدئے۔ بعض اوقات شکریہ ادا کر دیا اور بعض اوقات مصنوعی گھبراہٹ میں یہ بھی بھول گئے۔ پانچ برس کے عرصے میں ایک سو ساٹھ لڑکیوں سے میں وقت پوچھ چکا ہوں۔ ایک بار جس سے میں وقت پوچھتا ہوں، اُس کی شکل و صورت اچھی طرح یاد رکھتا ہوں تاکہ پھر اُس سے وقت نہ پوچھوں"

دوسرے نے اس سوال کا جواب یوں دیا: "مجھے صرف زبانی چھیڑ چھاڑ پسند ہے۔ میں نے پانچ چھ بار آنکھ بھی ماری ہوگی مگر زیادہ لطف مجھے زبانی چھیڑ چھاڑ میں آتا ہے۔ بازار میں کسی لڑکی پر ایسا فقرہ کسنا کہ صرف وہی سمجھے، آس پاس کے لوگ نہ سمجھیں یقیناً ایک فن ہے۔ مگر ایسے فقرے ہر روز نہیں کسے جا سکتے۔ دماغ روشن اور حاضر ہو۔ کوئی محرک مل جائے تو فقرہ کسنے میں ایسا لطف آتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا"

چوتھے سوال کا جواب نو لڑکوں نے بالکل ایک جیسا دیا: "ہمارا خیال ہے کہ لڑکیاں ہماری چھیڑ چھاڑ کو پسند نہیں کرتیں، اس لئے کہ عورت اور مرد کے درمیان اُس وقت تک مفاہمت کا کوئی رشتہ پیدا نہیں ہو سکتا جب تک وہ میاں بیوی نہ بن جائیں۔ عورت مرد کی طرف یوں دیکھتی ہے جیسے بکری قصائی کی طرف ــــ مرد کا تصور ہمیشہ عورتوں کو عصمت کے تنے ہوئے رستے پر کھڑا کر دیتا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات ہماری یہ چھیڑ چھاڑ محض ایک معصوم تفریح کے لئے ہو مگر عورت

ے معصوم تفریح کو بھی گناہ اور ثواب کی خطرناک طور پر نازک ترازو میں تولتے
ا ـــــ سچ پوچھئے تو ہمارے پیش نظر صرف عورت ہوتی ہے، جو کچھ اُس کے
قب میں ہے ہم نے اُس پر کبھی غور نہیں کیا ـــــ وہ اگر خوش نہیں ہوتی ہے
نہ ہو، اگر ناراض ہوتی ہے تو ہوا کرے، ہماری یہ چھیڑ جاری رہیگی!"

دو لڑکوں نے اس سوال کا جواب یوں دیا: "عورتیں ہماری چھیڑ
مار پسند کرتی بھی ہیں اور نہیں بھی کرتیں۔ دراصل عورت ہاں اور نہ
ایک نہایت ہی دلچسپ مرکب ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم اُسے پسندیدگی کی
ر سے دیکھتے ہیں۔ اگر اس میں ہاں اور نہ کا یہ اُلجھاؤ نہ ہوتا تو ہم اُسے کبھی
چھیڑتے۔ انکار اور اقرار کچھ اس طرح عورت کے وجود میں خلط ملط ہو گیا ہے
بعض اوقات اقرار انکار معلوم ہوتا ہے اور انکار اقرار ـــــ یہیں تو
ی چیز نے مار رکھا ہے!"

ایک لڑکے نے اس سوال کا جواب بالکل مختلف طور پر دیا: "اجی
صاحب چھوڑیئے۔ لڑکیاں اس چھیڑ چھاڑ کو بہت پسند کرتی ہیں۔ عورت
جوانی اور مرد کی جوانی میں لمبا چوڑا فرق ہی کیا ہے۔ بس یہی نا کہ وہ شلوار
یص یا ساڑھی پہن کر جوان ہوتی ہیں اور ہم پتلون کوٹ کے اندر جوان ہو
لتے ہیں ـــــ میں تو صرف اس لئے لڑکیوں کو چھیڑتا ہوں کہ وہ اسے پسند
رتی ہیں ـــــ جب ہم انہیں چھیڑتے ہیں تو وہ تخلئے میں اپنی سہیلیوں کو اپنے
ثرات ضرور بتاتی ہیں۔ یہ تاثرات ان سہیلیوں پر عجیب و غریب کپکپی طاری
اری کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں اور نہ مجھے معلوم ہے مگر میں محسوس کرتا
وں کہ ہماری پھبتیوں سے لڑکیوں کے کنوارپن کی لو جب لرزتی ہے تو ایک
جیب ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اگر اس کیفیت کا احساس مجھے نہ ہوتا تو میں
رگز ہرگز کسی لڑکی کو نہ چھیڑتا۔"

اب میں آخری سوال کے جوابات کی طرف آتا ہوں۔ ہر لڑکے نے
ب واقعہ بیان کیا جو اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے متعلق تھا۔ مگر ان میں سے صرف
ند اس قابل ہیں کہ میں یہاں درج کروں۔ اکثر واقعات کچھ اس قسم کے
تھے ـــــ ایک لڑکی کو چھیڑا گیا۔ اُس نے شور مچا دیا جس کے باعث چھیڑنے
والے کی بہت بدنامی ہوئی، وغیرہ وغیرہ۔

سب سے دلچسپ داستان اس لڑکے نے مجھے سنائی جس نے
ایک بار کتے کو آنکھ ماری تھی۔ اُس نے کہا: "آج سے چار برس پہلے کا ذکر ہے
امرتسر میں کانگرس تحریک کے باعث دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ جلیانوالہ
باغ میں طلبا اور دوسرے لوگوں کا ایک میلا سا لگا رہتا تھا۔ میں ہر روز شام
کو اسٹڈی کرنے کے بہانے سے جلیانوالہ باغ میں جاتا تھا۔ ایک روز جبکہ
میں اس باغ میں جانے کے لئے بازار طے کر رہا تھا، میری نگاہ بغیر کسی مطلب کے

اُوپر کو اُٹھی۔ ایک سالخوردہ مکان کی بالکونی میں مجھے ایک سفید بگڑی نظر آئی۔
میں نے ایک لمحے کے لئے سمجھا کہ کوئی سکھ ہوگا، پر جب وہ بگڑی اُونچی ہوئی
تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے سانولے رنگ کی ایک تیکھے
نقشوں والی لڑکی کو دیکھا۔ اُس نے سر پر بگڑی باندھ رکھی تھی۔ آہنی جنگلے
میں سے اُس کا چوڑی دار پائجامہ بھی مجھے نظر آیا۔ کمبخت نے اچکن بھی پہن
رکھی تھی جو اُس کے بہت سج کر آئی تھی۔ اُس نے میری طرف جب دیکھا
تو میں نے بلند آواز میں کہا: "تسلیم عرض کرتی ہوں!" یہ سُنکر وہ بوکھلا سی گئی۔
ایک کھسیانی سی شرم آلود ہنسی اُس کے ہونٹوں پر پھیلی اور میری تیز نگاہوں سے
پہلو بچا کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ جلیانوالہ باغ میں اسٹوڈنٹ یونین کیمپ کے
اندر جا کر میں نے اپنے چند دوستوں کو یہ واقعہ سُنایا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ
لڑکی ایک کانگرس ورکر کی بیوی ہے جو تین چار روز سے قید خانے میں ہے۔
لڑکی کی شادی کو مشکل سے چار پانچ مہینے ہوئے تھے، خاوند کی گرفتاری
کے بعد اب وہ اکیلی اُس مکان میں رہتی تھی۔ یہ تمام باتیں جب مجھے
معلوم ہو گئیں تو میں سیدھا اپنے گھر روانہ ہوا جو وہاں سے دُور نہیں تھا۔ گھر
جا کر اپنے کمرے کو بند کر کے میں نے بلاؤز پہنا۔ بلاؤز کے نیچے میں نے ربڑ
کی گیند کے دو ٹکڑے کر کے سینے پر جڑ لئے۔ ہیٹی کوٹ پہنا، پھر ساڑھی پہنی۔
اُس زمانے میں میرے بال بہت لمبے تھے۔ سیدھی مانگ نکال کر میں نے
چند لٹیں اِدھر اور چند اُدھر چھوڑیں۔ اُن دنوں عورتوں میں چپل پہننے کا رواج
عام تھا۔ چنانچہ میں نے اپنا چپل ہی پاؤں میں رہنے دیا۔ یہ سب کچھ کرنے
کے بعد جب میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو مجھے خود پر عورت کا دھوکا
ہونے لگا۔ لباس آدمی کو کتنا تبدیل کرتا ہے ـــــ خیر، بہن کا بُرقعہ اوڑھ کر
میں چلا۔ گلی میں کئی بار مجھے ٹھوکریں لگیں۔ اس لئے کہ بُرقعہ پاؤں میں اُلجھ اُلجھ
جاتا تھا۔ عورتوں کی چال ہی مجھ سے نہیں چلی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی
دامنگیر تھا کہ کوئی راستے میں بھانپ لیگا تو بہت خفیف ہونا پڑیگا۔ بہرحال ان
تمام مشکلات کے ہوتے ہوئے میں نے تین بازار طے کئے اور اُس مکان پر
پہنچ گیا۔ حلوائی کی دُکان کے ساتھ ہی اُس مکان کی سیڑھیاں تھیں۔ میں نے
مُنہ پر سے بُرقعہ ذرا اُونچا کیا اور اوپر چڑھ گیا۔ دل میرا دھک دھک کر رہا تھا۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس کوئی دم میں سینے سے نکل کر سیڑھیوں پر آ پڑے گا۔
لیکن شرارت کا تصور اس کمزوری پر غالب آیا۔ میں نے دستک دی اور دستک
دیتے ہی سوچ لیا، اگر کوئی مرد سامنے آ گیا تو میں کچھ کہے سُنے بغیر نیچے چلا آؤنگا
اور اگر ضرورت پڑی تو آواز میں باریکی پیدا کر کے کہہ دونگا۔ معاف کیجئے، میں
غلطی سے اِدھر چلی آئی ـــــ چنانچہ یہ سوچتے ہی میں نے ایک بار اور دروازہ کھٹکھٹایا
قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا دل پہلو سے نکل کر اندر

کمرے کے فرش پر چل رہا ہو۔ میں نے سوچا کہ بھاگ جاؤں، پہ اندر سے کُنڈی کھل چکی تھی۔ میں نے اُٹھا ہوا بُرقعہ نیچے چھوڑ لیا۔ دروازہ کھلا۔ وہ لڑکی میرے سامنے تھی۔ مجھ سے زیادہ بوکھلائی ہوئی۔ سر کے بال پریشان ہو رہے تھے۔ مردانہ قمیص اُس نے پہن رکھی تھی۔ پائجامہ وہی تھا چوڑی دار۔ کاندھے پر اُس نے دوپٹہ بڑی بے ترتیبی سے ڈال رکھا تھا۔ بُرقعہ پوش عورت کو دیکھکر اُس کے ہوش بجا ہوتے۔ میرے بھی سانس میں سانس آیا۔ اُس نے کہا: "اندر آجائیے"۔ میں بے دھڑک اندر چلا گیا۔ ایک بڑا کمرہ تھا۔ اُس کو طے کر کے ہم دوسرے کمرے میں پہونچے جو بہت ہی چھوٹا تھا۔ اس میں دو کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ اس چارپائی پر مجھے وہ اچکن دکھائی دی جس کو اُس نے پہن رکھا تھا۔ اسکی ایک آستین اُلٹی ہوئی تھی۔ پاس ہی سفید پگڑی دھری تھی۔ اُس نے کئی بار مجھے سرتاپا دیکھا۔ میری آمد اس کے لئے ایک معمّا بنی ہوئی تھی۔ اس چھوٹے کمرے میں پہونچ کر اُس نے مجھ سے کہا: "تشریف رکھئے" اور یہ کہہ کر اُس نے کرسی پر سے چند کتابیں اُٹھا کر چارپائی پر رکھ دیں۔ میں اس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میری پریشانی کسی حد تک دُور ہو گئی تھی مگر میرا دھیان دروازے کی طرف تھا جو وہ کھلا چھوڑ آئی تھی۔ بے شمار خیالات میرے دماغ میں آرہے تھے۔ میں جب کرسی پر بیٹھ گیا تو اُس نے مہمان نوازانہ انداز میں کہا: "بُرقعہ اُتار لیجئے"۔ میں نے اس کے جواب میں اِدھر اُدھر دیکھا تو اُس نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا: "یہاں میرے سوا کوئی نہیں"۔ میں دل ہی دل میں ارادہ کر چکا تھا کہ کوئی بات نہ کرونگا مگر یہ الفاظ غیر ارادی طور پر میرے مُنہ سے نکل گئے: "آپ باہر کا دروازہ بند کر دیجئے"۔ لہجہ میرا اپنا تھا مگر اُسے شک نہ ہوا۔ وہ فوراً اُٹھی اور دروازہ بند کرنے چلی گئی۔ میں نے اس دوران میں حالات پر غور کیا اور چہرے پر سے نقاب ہٹالی۔ سر میرا بُرقعے کی ٹوپی میں تھا۔ دونوں کان بھی اس میں چھپے ہوئے تھے۔ چہرہ بالوں سے بے نیاز تھا اس لئے میں نے سوچا کہ اسکو صدمہ اچانک نہیں پہونچے گا۔ دروازہ بند کر کے وہ آئی۔ میں نے مُنہ دوسری طرف موڑ لیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھی اور بیٹھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے بھڑ نے اُسے کاٹ کھایا ہے۔ میری طرف دیکھکر اسکے مُنہ سے مدھم سی چیخ نکلی۔ انگریزی ضرب المثل کے مطابق بلی بیگ میں سے نکل چکی تھی۔ میں نے بُرقعہ اُتار دیا۔ اُس کی ٹانگیں چوڑی دار پائجامے میں کانپ کانپ گئیں۔ میری جرأت بڑھ گئی۔ مسکرا کر میں نے کہا: "آداب عرض کرتی ہوں"۔ وہ مجھے پہچان گئی تھی، اور خوف نے اس کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ میں نے اس کی خوفزدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "آپ کو مردانہ لباس خوب سجتا ہے، کیا میرے بدن پر آپ کا یہ لباس اچھا نہیں لگتا"۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے، اگر چھت نیچے آرہتی یا آسمان کو ناگہانی طور پر پھیل کر پڑتی تو اُس کو اتنا خوفناک تعجب کبھی نہ ہوتا جتنا کہ میری آمد پر ہوا۔ اُس کی زبان بالکل گنگ ہو گئی تھی۔ اگر وہ چیخنا بھی چاہتی تو ناکام رہتی۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ترس آیا چنانچہ میں نے اپنا بُرقعہ اُٹھا کر کہا: "گھبرائیے نہیں، میں اب چلتا ہوں۔ مذاق ختم ہو گیا"۔ جب میں نے وہاں سے چلنے کا قصد کیا تو اُس نے لرزاں آواز میں کہا: "ذرا ٹھہرئیے"۔

میں ٹھہر گیا: "فرمائیے"۔

اُس نے میرے بلاؤز کی طرف دیکھا جس میں سے گیند کے ٹکڑے نیچے ڈھلک آئے تھے۔ شرم سے اس کے کان کی سانولی لویں سُرخی مائل ہو گئیں۔ لیکن بے اختیار اُس کو ہنسی آگئی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ اِس سے اُس کا خوف کچھ دُور ہوا چنانچہ اُس نے غیر لرزاں آواز میں کہا: "آپ اس لباس میں گھر واپس جا سکیں گے؟"

میں نے جواب دیا: "کیوں نہیں؟ ــــ آیا بھی تو اسی لباس میں تھا"۔

لیکن یہ کہتے ہی ایک دم اندرونی طور پر مجھے محسوس ہوا کہ میں اِس لباس میں ہرگز ہرگز ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکوں گا۔

اُس نے میرا جواب سُنکر کہا: "آپ سوچ لیجئے"۔

اور جب میں نے سوچنا شروع کیا تو یہ احساس اور زیادہ پختہ ہوتا گیا۔ میں نے سوچا کہ ساڑھی اُتار دوں، لیکن بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں تو میں بالکل اسٹیج کا مسخرہ بن جاتا۔ پھر خیال آیا کہ سب کچھ اُتار دوں اور ساڑھی کا تہمد بنا لوں، مگر یوں لوگوں کی نگاہیں اور بھی میری طرف اُٹھتیں۔ پھر سوچا کہ جیسے آیا تھا ویسے ہی چلوں۔ مگر بُرقعے کا تصوّر اب ایک بہت بڑا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ میں نے گھبرا کر اُس سے کہا: "اگر آپ اجازت دیں تو یہاں تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں"۔

اُس نے میری درخواست رد نہ کی: "تشریف رکھئے"۔ لیکن فوراً ہی اُسے کوئی خیال آیا اور وہ مضطرب ہو گئی: "نہیں، آپ اب تشریف لے جائیے۔ میرے فادر ان لا آنے والے ہیں ــــ میں بھول ہی گئی تھی ــــ جائیے، یہاں سے جلدی چلے جائیے"۔

میں اس قدر گھبرا گیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے سارے کپڑے اُتار کر کسی نے مجھے ننگا کر دیا ہے۔ میں بجائے اُٹھنے کے اور جم کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھکر اُس نے مجھ سے زیادہ گھبرا کر کہا: "میرے فادر ان لا آنے والے ہیں ــــ بس اب وہ آتے ہی ہونگے ــــ آپ چلے جائیے"۔

مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا، اسی غصّے میں اُس سے میں نے تیز لہجے میں کہا: "تو میں کیا کروں۔ اس لباس میں مجھ سے ایک قدم نہیں اُٹھایا جائیگا"۔

موقع کی نزاکت کے باوجود اُسے ہنسی آگئی۔ لیکن میری سنجیدگی ویسی کی ویسی قائم رہی۔ اُس نے چند لمحات غور کیا اور پھر کہا: "آپ یہ اچکن پہن لیجئے

میں آپ کو قمیص اور پائجامہ نکال دیتی ہوں، مگر پرماتما کے لئے جلدی کیجئے آپ کچھ سوچتے نہیں۔"

اُس نے میرے جواب کا انتظار نہ کیا۔ چارپائی کے نیچے سے ایک ٹرنک کھینچ نکالا، اُس میں سے جلدی جلدی اُس نے ایک قمیص نکالی۔ پائجامہ وہ دیر تک ڈھونڈتی رہی مگر اُسے نہ ملا۔ میں اس دوران میں بلاؤز اتار کر قمیص پہن چکا تھا۔ جب پائجامہ نہ ملا تو اُس نے کہا: "آپ یہیں ٹھیریے، میں یہ پائجامہ اُتار کر آپ کو دے دیتی ہوں۔" یہ کہکر وہ پھرتی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دو منٹ شدید قسم کے اضطراب میں گذرے، اس کے بعد وہ آئی۔ پائجامہ دے کر وہ باہر چلی گئی: "اب جلدی پہن لیجئے۔"

میں نے افراتفری میں یہ پائجامہ پہنا۔ چونکہ چوڑیاں کافی زیادہ تھیں اس لئے کھینچ تان کر پورا آہی گیا۔ اتنے میں آواز آئی: "پہن لیا؟"

میں نے کہا: "ہاں پہن لیا۔"

یہ سُنکر وہ اندر آئی اور کہنے لگی: "پرماتما کے لئے یہاں سے چلے جائیے ۔۔۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں آنہ جائیں۔"

میں نے اچکن پہنی۔ بُرقعہ ہاتھ میں لیا اور وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ اُس نے کہا: "یہ ساڑھی وغیرہ تو لیتے جائیے۔"

میں نے بلاؤز، ساڑھی، پیٹی کوٹ، اور ربڑ کی گیند کے دونوں ٹکڑوں کی طرف دیکھا اور باہر نکلتے ہوئے کہا: "یہ سب چیزیں یہیں پڑی رہیں۔" اس نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ میں دروازے تک پہونچ گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ آئی۔ جب دروازہ کھول کر میں باہر نکلا تو اُس نے مسکرا کر کہا: "آداب عرض کرتی ہوں۔" ۔۔۔ اسکے بعد میری اس سے ملاقات نہ ہوئی کیونکہ وہ دوسرے روز ہی کہیں چلی گئی، نہ معلوم کہاں۔ میں نے اُس کا بہت کھوج لگایا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ اُس کی اچکن اور پائجامہ ابھی تک میرے پاس محفوظ پڑا ہے۔ شاید میری ساڑھی بلاؤز اور پیٹی کوٹ بھی اُس کے پاس ابھی تک محفوظ ہوں۔ اور گیند کے وہ دو ٹکڑے بھی۔ میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر یہ واقعہ ایسا نہیں کہ ہم بعد توں میں سے کوئی بھول سکے۔"

اُس لڑکے نے جس کو راہ چلتی لڑکیوں سے وقت پوچھنے میں مزا آتا تھا، ذیل کا واقعہ بیان کیا۔۔

"میں جب بمبئی گیا تو وہاں سڑکوں پر اَن گنت لڑکیاں دیکھکر میری طبیعت بہت خوش ہوئی۔ کیونکہ ان میں سے اکثر اپنی کلائیوں پر گھڑی باندھتی تھیں۔ ایک روز کا ذکر ہے، ناگ پاڑہ میں جہاں یہودیوں کی آبادی ہے، فٹ پاتھ پر میں نے ایک پارسی لڑکی دیکھی۔ بڑی تیز قدمی سے وہ سامنے بائیکلہ ہسپتال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس کی گوری گوری کلائی پر کالے تسمے کے ساتھ گھڑی بندھی تھی۔ اُسکے اور میرے درمیان قریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا جو میں نے چٹکیوں میں طے کر لیا۔ اُس سے دو قدم آگے نکل کر میں دفعتہً ٹھرا۔ "تماری گھڑیاں ماکِٹلا واگا؟" میں نے اُس سے گجراتی زبان میں وقت پوچھا۔ اُس نے اپنی کلائی اُونچی کی تو گھڑی ندارد۔ "ماری گھڑیاں کاں چھے؟" اس نے گھبرا کر کہا۔ میری گجراتی ختم ہو گئی۔ میں نے اُسے ہندوستانی میں جواب دیا "آپ کی گھڑی مجھے کیا معلوم کہاں ہے؟" صاحب اُس نے تو چلانا شروع کر دیا۔ ایک تو گجراتی زبان، اُس پر اُس پارسی لڑکی کا چیخ چیخ کر بولنا۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ گھڑی میں نے چند منٹ پہلے اُس کی کلائی پر دیکھی تھی، پر اب ایک دم خدا معلوم کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ برابر کہے جارہی تھی: "تے لَیدی ہشے" یعنی تم نے ہی لی ہے: اور میں اُسے بے سُود یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا: "میں نے آپ کی گھڑی نہیں لی ہے ۔۔۔ اگر میں نے آپکی گھڑی لی ہوتی تو آپ سے وقت ہی کیوں پوچھتا ۔۔۔ اس کو بھی چھوڑیئے۔ میں نے گھڑی آپکی کلائی سے کیسے اُتار لی؟؟"

اُس کا شور سُن کر فٹ پاتھ پر کئی یہودی اور کرسٹان جمع ہو گئے۔ میں اُن میں گھر گیا۔ بھانت بھانت کی بولیاں شروع ہو گئیں۔ کبھی میں انگریزی میں اپنی بے گناہی ثابت کرتا کبھی ہندوستانی میں۔ مگر سب اُسی کے طرفدار تھے۔ میں سخت گھبرا گیا۔ قریب تھا کہ میں اُن سب سے کہدوں: "تم جاؤ جہنم میں، نہیں مانتے تو نہ مانو" کہ میری نگاہ سڑک پر ایک چھوٹے سے بچے پر پڑی۔ اُسکے ہاتھ میں مجھے کالا فیتا نظر آیا۔ کالے فیتے کے ساتھ گھڑی بھی لٹک رہی تھی۔ میں چلایا: "وہ دیکھو، اس بچے کے ہاتھ میں کیا ہے؟"

سب سے پہلے اُس لڑکی نے بچے کی طرف دیکھا اور کہا: "میری گھڑی۔"

بچے کے ہاتھ میں گھڑی اُسی کی تھی۔ ایک بڈھی یہودن نے بڑھکر اُس بچے سے گھڑی لی اور اُس پارسی لڑکی کو دے دی۔ میں نے کوئی بات کرنی مناسب نہ سمجھی اس لئے کہ اس وقت میں اپنے آپ کو ہیرو سمجھ رہا تھا۔"

اُس لڑکے نے جس کا یہ کہنا تھا کہ لڑکیاں چھیڑ چھاڑ پسند کرتی ہیں، یہ واقعہ بیان کیا۔

"جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ لڑکیاں ہماری چھیڑ چھاڑ پسند کرتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہ ہمیں دعوت دیتی ہیں کہ ہم اُنہیں چھیڑیں۔ اس واقعے سے، جو میں اب بیان کرنے والا ہوں، آپ اس کی تصدیق کر سکیں گے۔ آج سے ڈھائی برس پہلے کا ذکر ہے جب میرے خیالات آج سے بالکل مختلف تھے۔ اُن دنوں مجھ پر کسی سے عشق کرنے کی دُھن سوار تھی۔ چنانچہ ہر وقت اُداس اُداس رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے سارے وجود پر ایک ناقابل بیان اضمحلال طاری ہے۔ یہ اُداسی

اور یہ اضمحلال اُس روز بہت ہی زیادہ بڑھ گیا جب مجھے اپنے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ وہ ــ گلی میں ایک لڑکی سے عشق لڑا رہا ہے۔ اُس کے عشق کی داستان سُن کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ اس قدر رشک آیا کہ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اب میں نے ارادہ کر لیا کہ ہر روز اُس گلی سے گذرا کروں گا اور اسی لڑکی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ ارادہ میں نے اس لئے کیا کہ میری نظر میں کوئی ایسی لڑکی تھی ہی نہیں جس سے اِس قسم کا رشتہ پیدا کیا جا سکتا ہو ــ سو جناب، میں پندرہ بیس روز تک متواتر ایک ہی وقت پر اُس گلی میں سے گذرتا رہا۔ وہ لڑکی اس دوران میں مجھے کئی بار نظر آئی۔ ہر مرتبہ اُس نے میری طرف دیکھا مگر بات اس سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

ایک روز دوپہر کو جب کہ گلی بالکل خالی تھی میں اُدھر سے گذرا۔ جب میں موڑ مُڑا تو مسجد کے پاس دفعتاً ایک بُرقعہ پوش عورت مجھے نظر آئی۔ میں جب اُس کے پاس سے گذرا تو اُس نے بُرقعے سے ہاتھ نکال کر میرا بازو پکڑ لیا اور بلند آواز میں کہا "کیوں وے گشتیا، توں ہر روز ایدھر دے پھیرے کیوں کرنا ایں"

اِس کا مطلب یہ تھا کہ آوارہ گرد کہیں کے تو ہر روز یہاں کے پھیرے کیوں کرتا رہتا ہے ــ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بخدا، میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں بشکل یہ کہہ سکا "میں ... میں ... میں تو کبھی اِدھر سے نہیں گذرتا"

وُہ ہنسی۔ بُرقعے کی جالی میں سے اُس کی آنکھیں مجھے نظر آئیں۔ میرا خوف دُور ہو گیا۔ میں نے اپنا بازو چھڑا لیا اور اُس کے کولھے پر اِس زور سے چٹکی بھری کہ وہ بلبلا اُٹھی "اللہ کرکے مر جائیں ــ تیرا ککھ نہ رہے"

اس کا مطلب یہ تھا کہ خدا کرے تو مر جائے، تیرا کچھ باقی نہ رہے ــ میرا سب کچھ باقی رہا، وہ بھی باقی رہی اس لئے کہ میرا خوف دُور ہو گیا اور اُسکی خفگی نہ رہی"

مضمون کا پہلا حصّہ ختم ہوتا ہے۔ اسکے دوسرے حصّے میں لڑکیوں کے تاثرات درج ہونگے۔ اس کا آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔

سعادت حسن منٹو

رُخصت ہوتے ہوئے

آج اپنی نگہِ شوق سے ہو کر مستور
جا رہا ہوں تری رعنائیِ احساس سے دُور
ساتھ ہیں میرے مرے دل کی حکایاتِ لطیف

آپ سے دُور میں ہر چیز سے گھبراؤں گا
کیا کبھی بھول کے بھی آپ کو یاد آؤں گا؟
زندگی موت ہے جب آپ نہوں میرے قریب

ہاں مگر اتنی گذارش ہے بصد عجز و نیاز
نگہِ لطف نہ بنجائے کسی اور کا راز
دوسرا کوئی نہ ہوجائے مرے غم کا شریک

راحت سعید

پروانہ

سلمائے سحر کے حُسن کی ضو ہستی کی فضا پر چھانے لگی — وہ انجم رخشاں ڈوب چلے، وہ شمع کی لَو تھرّانے لگی
جو مطرب و مے سو رنگیں تھی، اُٹھی وہ بساطِ محفلِ شب — موہوم سی اک اُمیدِ سکوں، معدوم سی اک تنویرِ طرب
کلیاں سمٹیں، انگڑائی سی لی موجوں نے، جاگے دشت و جبل — فطرت نے ضمیرِ گیتی میں پھر تازہ کیا آئینِ عمل

وہ آخرِ شب، دُھندلا سا تجلّی بار سماں بھی ختم ہُوا
وہ شمع بجھی، اُٹھا وہ دھُواں، لو اَب وہ دھواں بھی ختم ہُوا

کچھ خاکِ پریشاں ہی، پر ہیں بکھرے ہوئے کچھ پروانوں کے — وہ رات کا عالم اور یہ مآل اُن ہوش رُبا افسانوں کے
ہوتی ہے تلاشِ رقصِ حیات اک بجھتی ہوئی چنگاری میں — وہ خواب ہے دُنیا دیکھ رہے ہیں ہم جسکو بیداری میں

اب بھی ہیں ضمیرِ دانش پر اسرار کے بادل چھائے ہوئے
اب بھی ہیں فضائے ہستی میں ظلمت کے علم لہرائے ہوئے

پروانے کی دُنیا میں کیا کیا عرفاں کے خزانے ملتے ہیں — ہر دَور میں اِسکے، کتنے نامحدود زمانے ملتے ہیں
آساں نہیں، بیدادِ محبت کھیل سمجھ کر سہ جانا — اِس لالہ و گل کی دُنیا میں شعلوں سے لپٹ کر رہ جانا

موتی کی دمک ہے ذرّوں میں، پھولوں کی لطافت خاروں میں
انوارِ حقیقت ملتے ہیں انساں کو انہیں نظّاروں میں

پروانے کی ہستی کیا، پردے نظروں سے اُٹھائے جاتے ہیں — دُنیا کو حیاتِ سرمد کے اسرار بتائے جاتے ہیں
دُنیا ہے مقامِ سوز و تپش، بے سوز و تپش کب آتی ہے — وہ موت نشاطِ عمرِ ابد جس موت سے شرما جاتی ہے
کیا جام جو صرفِ دَور نہیں، کیا مے جو طرازِ جام نہیں — اس راہگذر کی ہل چل میں فطرت کو بھی خود آرام نہیں

یہ موت سمجھتی ہے اس کو کیا عقل بھی دھوکے کھاتی ہے
تھکنے سے تلاشِ منزل میں کچھ دیر جو نیند آجاتی ہے

علی اختر

غزلیات۔

عشق کی شوخیاں

نہیں جو پھول تو خاروں کو چھیڑ سکتا ہوں
خزاں میں رفتہ بہاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

جو تیرے گیسوئے پرخم کو کھیل بھی نہ سکیں
ان انگلیوں سے ستاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

کچھ اور دبے ہوئے خندہ ہائے زیر لبی
دبے دبے سے شراروں کو چھیڑ سکتا ہوں

ہلائی آنکھ بھی کچھ کہہ نہ دے محبت سے
تری نظر کے اشاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

حسینوں ہی پہ ہے گو زندگی کا دار و مدار
تو زندگی کے سہاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

ہزاروں نفس دقم پہلوؤں میں ہیں جن کے
ان اہلِ دل کے غباروں کو چھیڑ سکتا ہوں

نگاہِ شوق سے لرزاں ابھی ہو سازِ جمال
ربابِ حسن کے تاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

زماں مکاں ہیں شگفتہ مری نگاہوں سے
جہان بھر کے نظاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

اداس حسن سے اکثر رہی یہ شرط مری
کہ ایسے درد کے ماروں کو چھیڑ سکتا ہوں

نئے سرے سے پڑے جان جلتے مُردوں میں
میں چلتے پھرتے مزاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

فراقؔ غم بھی کہیں ہو نہ شانِ زندہ دلی
فسردگی میں بھی یاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

فراق گورکھپوری؛

غزل

ہر گھڑی اک عشوۂ لطفِ تمام آیا تو کیا؟
خط پہ خط قاصد پہ قاصد صبح و شام آیا تو کیا؟

اب یہ کہتے ہو جوابِ صد پیام آیا تو کیا
پھر یہ کہہ دینا کوئی "نازک خرام" آیا تو کیا!

چھلک چکی محفل۔ خیالِ اذنِ عام آیا تو کیا
میری جانب قاسمِ کیفِ دوام آیا تو کیا

کیا کریں گلشن پہ جوبن۔ زیرِ دام آیا تو کیا
کیا توقع۔ "انقلاب تو نظام" آیا تو کیا

یہ عقیدہ توڑ تے دیتا ہے زنجیریں کہیں
ہم ہیں وہم کیا ہے۔ جو وقتِ انتقام آیا تو کیا

اب یہ تاثیرِ محبت پر قصیدہ۔ کیا ضرور
جذبۂ بیتابیٔ دل تھا جو کام آیا تو کیا

آنکھ سے دل کی طرف دوڑی وہ مے پیتے ہیں ہم
ہم وہ میکش ہیں کہ ساقی لیکے جام آیا تو کیا

بجھ گیا جب دل تو بے معنیٰ صدائے رنگ و بو
نکہتِ گل کی زبانی اب پیام آیا تو کیا

بجھ ابھی کچھ بھڑک اٹھتی ہے میرے نام سے
ہاتھ مینائے شرابِ لالہ فام آیا تو کیا

میں سمجھتا ہوں اسے آغازِ مستقبل فنا
آپ کہتے ہیں! کوئی بالائے بام آیا تو کیا

اب وہ اظہارِ حقیقت کے لئے ڈرتے نہیں
اب وہ کہتے ہیں خط اس کا، ہے یہ نام آیا تو کیا

کیا کوئی جرم و جسارت ہو خیالِ ننگ و نام
ہم غلاموں کو خیالِ ننگ و نام آیا تو کیا

ہے تو نا احساں شناسی شادؔ لیکن کیا کروں
کام بن سکتا تھا یوں بھی۔ کوئی کام آیا تو کیا

شاد عارفی؛

غزل

تڑپ رہے تھے جو ہم مرگِ ناگہاں کے لئے
سکوں نصیب ہوا عمرِ جاوداں کے لئے

بہار سازِ نظر کی یہ فتنہ سامانی
چمن کو لوٹ لیا تم نے کیوں خزاں کے لئے

تمہاری بے خبری، دو جہاں کی فتنہ گری
یہ اہتمامِ ستم اور ایک جاں کے لئے

جو آشیاں میں قفس کے لئے تڑپتا ہو
قفس میں کیا ہو وہ بیچین آشیاں کے لئے

غرورِ عشق کے قرباں، تری نگاہ کی خیر
جہاں ہے میرے لئے میں نہیں جہاں کے لئے

تمہیں بتاؤ کہ اس دل کا حشر کیا ہوگا
رہی نہ کر کوئی بیداد امتحاں کے لئے

ستم یہ ہے کہ ترے ناز بھی اٹھا نہ سکا
وہ دل جو وقف رہا جورِ دو جہاں کے لئے

نیاز مندِ محبت کو رشک نے مارا
نہیں ہے قیدِ جبیں تیرے آستاں کے لئے

وہ حالِ دل نہ سمجھتے تو کچھ کہا جاتا
سکوتِ راز نہ تھا حسنِ رازداں کے لئے

شکایتِ غمِ دوراں تری نگاہ سے ہے
حکایتِ غمِ دوراں نہیں جہاں کے لئے

رموزِ حسن سے واقف نہیں کوئی حسرت
بیانِ حسن ہے بس زیبِ داستاں کے لئے

حسرت ترمذی؛

سوزِ ناتمام

ترے حسن نے دئے ہیں وہ پیامِ غائبانہ
کہ یقین بن گیا ہے مرا ذوقِ کافرانہ

ابھی دشتِ کربلا میں ہے بلند یہ ترانہ
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ

مری آنکھ ڈھونڈتی ہے نگہِ قلندرانہ
کہ ضمیرِ اہلِ دانش ہے عیارِ تاجرانہ

مجھے کیا خبر کہ تو نے کبھی میکشی بھی کی تھی
تری آنکھ میں نہیں ہے اثرِ مئے شبانہ

وہی زندگی کا حاصل وہی بندگی کے قابل
وہ جبیں کہ جس کا سجدہ ہے غرورِ آستانہ

ترا کام تن کی پوجا، مرا کام من کی سیوا
مجھے جستجو یقیں کی، ہے تجھے فکرِ آب و دانہ

مرے شوقِ مضطرب سے ہے رواں نظامِ ہستی
جو ٹھہر گئی محبت، تو ٹھہر گیا زمانہ

مجھے سایۂ ہما کی نہ تلاش ہے نہ ہوگی
کہ ہما کی زندگی میں ہے نیازِ راہبانہ

وہ فقیہہ کور باطن، ہے عدوئے دین و ملت
کسی خوفِ دنیوی سے جو تراش دے بہانہ

ترا خار و خس پہ تکیہ، مرا عشق پر بھروسا
مجھے برق سے محبت، ہے تجھے خوفِ آشیانہ

مرے جذبِ دل کو ماہر کوئی کیا سمجھ سکے گا
مری شاعری کی حد سے ابھی دور ہے زمانہ

ماہر القادری؛

قدیم دکھنی شاعری کے موضوعات

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ اُردو شاعری کے موضوعات پر حرف گیری کی جائے اور اُس کی تہی مائگی پر حقارت کی نظر ڈالی جائے، یا اس کو صرف عشقیہ شاعری کے باعث قابل اعتراض قرار دیا جائے، لیکن اب بھی ایک بڑے گروہ کی رائے یہ ہے کہ جدید موضوعات پر اُردو شاعری میں جو فکر کی جانے لگی وہ صرف مغربی خیالات کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

یہ خیال اس شاعری کے متعلق دُرست ہو سکتا ہے، جو میرؔ کے زمانہ میں شروع اور حالیؔ کا دور آنے سے قبل ختم ہوئی، مگر یہ تصور کر لینا کہ اُردو شاعری کی ابتدا ہی سے اس میں سوا حُسن و عشق کی داستانوں، گل و بلبل کے افسانوں، شاہد و ساقی کے تذکروں، ہجر و وصال کے قصّوں، معشوق کی بے وفائیوں، رقیب رو سیاہ کے گلہ شکووں اور جھوٹی مبالغہ آمیز مدح و ستایش کے سوا کچھ نہیں تھا تو یہ دعویٰ حق بجانب نہیں ہو سکتا، قدیم اُردو یا دکھنی زبان کی شاعری کے جو شاہکار اب گوشۂ گمنامی سے باہر آ رہے ہیں، ان سے اب اس مفروضہ کی قطعی تردید اور اس خیال کا پورا بطلان ہوتا ہے۔

اس کو ثابت کرنے کے لئے آج سے تین چار سو سال پہلے کی اُردو شاعری کے موضوعات کا ایک مجمل تذکرہ مناسب متصوّر ہوتا ہے۔

حق یہ ہے کہ اُردو شاعری کو اپنے موضوعات کے لحاظ سے کسی دوسری زبان سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اُردو شاعری کی ابتدا۔ برسبیل تذکرہ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ گو چند دکھنی نوجوانوں کی ہمّت و سعی سے دکھنی ادب کا ایک بہت قابل قدر حصّہ اب عام دست رس میں آ گیا ہے۔ بریں ہم یہ امر اب بھی افسوسناک ہے کہ ہنوز اُردو زبان کی قدیم تاریخ پوری طرح روشن نہیں ہوئی۔ اس لئے اب تک تیقن کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُردو شاعری کی ابتدا درحقیقت کب ہوئی، اور پہلا شاعر کون تھا۔ اس وقت تک زبان و ادب کے جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں اُن سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں اُردو شاعری کی نہ صرف ابتدا ہو چکی تھی بلکہ اس میں ادبیاتی خصوصیات بھی پیدا ہو چکے تھے، تصنیف و تالیف عام طور سے رائج ہو چکی تھی، موجودہ معلومات کے لحاظ سے بہمنی عہد کے نظامی شاعر کی مثنوی کو جو ۸۶۳ھ میں مرتب ہوئی ہے، اور خواجہ بندہ نواز متوفی ۸۲۵ھ کی مثنویوں کو اُردو شاعری کے ابتدائی نمونے قرار دینا ناگزیر ہے۔

اُردو شاعری کے اقسام۔ اس بات میں کیا شُبہ ہو سکتا ہے کہ ابتدائی اُردو شعرا نے اپنی فکر کی جولانی کے لئے جو میدان منتخب کیا اسی میں اس سے پہلے فارسی شعرا نے اپنی جودت و ذہانت کے جوہر دکھائے تھے۔ لامحالہ یہ امر ناگزیر تھا کہ اُردو شاعری اسی ڈگر پر چلتی رہی جس پر اس سے پہلے فارسی شاعری چل چکی تھی، اور قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی، قطعات وغیرہ کا وہی قالب تیار ہوا جو اس سے قبل ایران میں بن چکا تھا۔ چنانچہ اُردو شاعری کے ابتدا ہی سے یہ تمام نظم نگاری کے اقسام اُردو نظم نگاری میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعرائے اُردو نے اوّلاً مثنوی میں اپنے قلم کا زور دکھایا، اس کے بعد قصیدہ اور غزل وغیرہ وجود میں آئے ہیں۔ بہر حال یہ بحث خود علیحدہ صراحت طلب ہے۔

اُردو شاعری کے موضوعات۔ اب اصل موضوع اُردو شاعری کے موضوعات کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے۔ قدیم اُردو شاعری کا سرسری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے موضوع متعدد تھے، فکر کا میدان بہت وسیع تھا، تصوّف، فلسفہ، اخلاق، تاریخ، واقعہ نگاری، سوانح، نیچرل امور کی ترجمانی، سب اس دائرے میں شامل تھے۔ اُردو شاعری آج سے چار سو سال پہلے بھی اپنے موضوعات کے لحاظ سے کسی اور زبان کی شاعری سے کسی طرح شرمندہ نہیں تھی۔ اِس کے متعلق اس قدر کثیر ذخیرہ موجود ہے کہ خود ایک مستقل کتاب تصنیف ہو سکتی ہے۔

تصوّف۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ فارسی شاعری میں تصوّف کا خاص درجہ ہے، فارسی کے نامور اور

جلیل القدر شعرا مثلاً ابو سعید ابو الخیر، مولانا روم، عطار، نظامی اور حافظ وغیرہ کا کلام سراپا تصوف ہی تصوف ہے، یا دنیا سے دل برداشتگی کی تحریک ہے۔ اس زمانے میں عام طور سے اسلامی دنیا میں حملہ تاتار کے نتیجے کے طور پر خیالات میں جمود اور ہمتوں میں پستی پیدا ہو گئی تھی، ان اثرات نے ملک پر ملک گھر کر لیا تھا چنانچہ ایران و مشرق وسطیٰ سے یہ خیالات دکن میں بھی آ گئے، اور دکھنی شاعروں کی نظم نگاری میں ان کا اثر صاف طور سے نمایاں ہونے لگا۔ خیالات خواہ کچھ ہی باہر کے دکن آتے ہوں لیکن تاریخ اسلام کے ہر دور کی خصوصیت کے طور پر اسلام کی سادہ تعلیمات اور عوام تک اس کے دل نشیں اور سحر انگیز پیام کو پہونچانے کا کام بوریہ نشیں مشائخ طریقت اور صاحبان حال درویشوں نے پورا کیا ہے، اس لئے ناگزیر تھا کہ عوام کی زبان ہی کو وہ اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بناتے۔

ان وجوہ سے کئی دکھنی شعرا نے تصوف و سلوک کو اپنی نظم نگاری کا موضوع بنایا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، میران جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، شاہ برہان الدین اعلیٰ، قادر وغیرہ وہ پہلی ہستیاں ہیں جنہوں نے اس میدان میں کام کرنے کی بنیاد ڈالی، اور دکھنی زبان میں معرفت اور حقائق الٰہیہ کے نکات بیان کئے۔ ان کے بعد آنے والوں نے پہلی بنیاد پر پوری عمارت کھڑی کر دی۔ بحری، وجدی، امین وغیرہ کی مثنویوں میں تصوف و سلوک کا گویا پورا فن بیان ہو گیا ہے، اور اسکو خود تصوف کے ادبیات کا ایک قیمتی حصہ قرار دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ قدیم شعرا کے غزلوں کے دواوین میں بھی تصوف کا رنگ صاف صاف نظر آتا ہے، سلطان محمد قلی کی اکثر غزلوں میں بادۂ حافظ کی ہی دو آتشہ جھلکتی ہے، ولی اور سراج، باقر آگاہ، شاہ ندیم اللہ وغیرہم کے دواوین میں بھی یہ رو برابر کارفرما ہے۔

رزمیہ شاعری۔ شاہنامہ کے نقش قدم پر، بعد کی رزمیہ مثنویاں خاور نامہ، سکندر نامہ وغیرہ مرتب ہوئیں۔ خاور نامہ کے مصنف ابن حسام کو فردوسی ثانی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے شاہنامے کے جواب میں خاور نامہ مرتب کیا تھا۔

یہ مثنویاں دکھنی شاعروں کے لئے ایک اچھا ماڈل ثابت ہوئیں، انہوں نے اس موضوع پر بھی اپنی ذہانت کی خوب داد دی ہے۔ دکھنی شاعری میں رزمیہ مثنوی کی ابتدا خاور نامہ دکھنی سے ہوتی ہے، بیجاپور میں رستمی نے ۱۰۵۹ھ میں خدیجہ سلطان شہر بانو کے حکم سے خاور نامہ ابن حسام کا ترجمہ دکھنی نظم میں کیا ہے، چوبیس ہزار شعر کی مثنوی ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ اگر یہ مثنوی چھپ کر عام دسترس میں آ جائے تو کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر رستمی کو بھی کم از کم ابن حسام کا اعزاز نصیب ہو جائے۔

رستمی کے بعد نصرتی نے علی عادل شاہ کی جنگی مہمات اور شوقی نے تلی کوٹہ کے معرکہ کی روئداد رزمیہ مثنویوں میں لکھی ہیں اور حقیقت یہ کہ واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے، فوجوں کی روانگی، ان کی ترتیب، واقعات جنگ، صف آرائی کا حال، حملے کے طریقے، لڑائی کا سماں، بہادروں کا مقابلہ، سورماؤں کی جنگ، باجوں کی آواز، توپوں کی گرج، ہتھیاروں کی جھنکار، شب خونی حملے کی صراحت، دشمن کی فراری، لوٹ مار، قلعہ پر چڑھائی، اس کا محاصرہ، سپاہیوں کی گرفتاری وغیرہ امور کی کتنا اس انداز میں لکھی ہے کہ کیا بیان ہو۔

غرض کہ رستمی کا خاور نامہ، نصرتی کا علی نامہ، شوقی کا فتح نامہ نظام شاہ، غضنفر کا جنگ نامہ عالم علی خاں، وغیرہ رزمیہ مثنویوں کے شاہکار ہیں۔ ان کے علاوہ ظفر نامہ لطیف، جنگ نامہ سیوک وغیرہ بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ غواصی اور ابن نشاطی وغیرہ نے بھی اپنی عشقیہ مثنویوں میں برسبیل تذکرہ رزمیہ حالات نظم کئے ہیں۔

اس موقع پر سلطان علی عادل شاہ شاہی کی مثنوی "خیبر نامہ" کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ سلطان نے جنگ خیبر کے صحیح حالات نہایت عمدگی سے نظم کئے ہیں، اس کی یہ مثنوی کلیات میں شامل ہے۔ حضرت علیؓ اور مرحب کی لڑائی کا حال دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ مرحب کا لڑائی کے لئے تیار ہونا، ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر جنگ کے لئے نکلنا، دو زبردست بہادروں کے مقابلہ کرنے کا حال دلکش انداز میں لکھا ہے۔

تاریخی موضوع۔ تاریخ اور سوانح کے لئے نظم سے زیادہ نثر موزوں ثابت ہوتی ہے۔ لیکن موزوں طبع اس کو بھی نظم میں بیان کر کے لذت گیر ہوتی ہے، ہماری دکھنی شاعری میں اس قسم کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔

نصرتی کا علی نامہ اور تاریخ اسکندری، مومن کی اسرار عشق اور شہدا کی اعجاز احمدی، باقر آگاہ کی ہشت بہشت وغیرہ اسی عنوان کی مثنویاں ہیں۔

نصرتی نے علی نامہ میں تاریخ اور ادب کو جس طرح آمیز کیا ہے وہ اُس کی سحر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ تاریخ اسکندری میں سکندر عادل شاہ کی سوانح بیان کی گئی۔ مومن نے اسرار عشق میں سید محمد جون پوری کے حالات نظم کئے ہیں، اور شیدا نے سیرت رسول کریم کو نظم کیا ہے، انہوں نے سوانح نگاری کا جو انداز پیش کیا ہو اس کا معیار کافی بلند ہے۔ اسی طرح باقر آگاہ نے ہشت بہشت میں غزوات سے قطع نظر سیرت پاک کے دوسرے پہلو بھی اس اسلوب میں بیان کئے ہیں کہ ان کی کوشش کو نہ صرف کامیاب بلکہ اردو زبان کا نہ مٹنے والا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

نیچرل شاعری۔ نیچرل شاعری کے موضوع پر شمالی ہند کے اساتذہ نے بہت کم توجہ کی ہے، جو حقیقت میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ قدما کے دور میں نہ تو میر اور مرزا سودا نے اور نہ مصحفی اور انشا نے توجہ کی اور نہ ناسخ اور آتش کو اس کا کوئی ذوق تھا۔ ذوق، مومن، داغ و امیر کی شاعری بھی صرف غزل سرائی کا دوسرا نام ہے۔ اس طور پر عام طور سے یہ خیال قائم ہوگیا کہ جدید اردو شاعری میں نیچرل شاعری کی بنیاد خالص مغربی اثرات اور مغربی کلام کے مدِ نظر عالم وجود میں آئی ہے۔

یہ خیال اس حد تک بالکل درست ہے کہ شمالی ہند کی اردو شاعری میں نیچرل شاعری کا ستر مغربی مضراب کا رہین منت ہو لیکن یہ خیال دکھنی شاعری کی حد تک صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قدیم دکھنی شعرا صرف غزلوں کی پامال زمین اور زلف و گیسو میں اُلجھ کر عشق و عاشقی کے فرسودہ خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے نیچرل شاعری کے میدان میں بھی جولانی کی ہو، انکے کلام سے ایسے بیسیوں نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں، جو بہتر سے بہتر انداز میں نیچر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم صرف سلطان محمد قلی کی کلیات کا تذکرہ کرتے ہیں، جس میں کئی ایسے عنوان ہیں جو نیچرل شاعری کے تحت بیان کئے جاسکتے ہیں۔ اس میں بارش اور موسم سرما پر کئی نظمیں ہیں۔ موسم بہار، نوروز، بسنت پر سلطان نے کئی نظموں میں اپنی بلند خیالی کی داد دی ہے۔ باغوں کی سرسبزی اور شادابی، تالابوں اور حوضوں کے صاف شفاف پانی نے اس کے تخیل کو ایک سے زیادہ مرتبہ متاثر کیا۔ میووں، ترکاریوں کی تر و تازگی نے اس سے شعر کہلوائے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی اس نے غریبوں کی زندگی عوام کے معتقدات، کھیل تماشوں اور بازارات وغیرہ جیسے معاشرتی امور کو بھی شعر کہنے کا موضوع بنایا ہے۔

سلطان محمد قلی کے علاوہ دوسرے شعرا نے بھی اپنے کلام میں نیچر کے موضوع کے کئی عنوانوں پر شعر کہے ہیں، سلطان علی عادل شاہ نے علی دادمحل، اُس کے باغ اور حوض کی تعریف میں ایک زبردست قصیدہ لکھا ہے، جس میں باغ کی سرسبزی اور شادابی، انواع و اقسام کے پھلوں کی تر و تازگی، قسم قسم کے پھلوں کی فراوانی، حوضوں میں پانی کی روانی کی جو دلکش روئداد لکھی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

نصرتی نے "کالی دھوپ" اور موسم سرما پر جو قصیدہ لکھا ہو وہ اپنے زورِ بیان کے لحاظ سے خاص حیثیت رکھتا ہو۔

روزمرہ معاشرت۔ عصر حاضر میں روزمرہ معاشرت پر بھی شعرا کا اظہارِ خیال کرنا ایک متعارف امر ہو۔ اور یہ بھی جدید مغربی خیالات کا اثر تو سمجھا جاتا ہو لیکن حقیقت یہ ہو کہ نیچرل شاعری کی طرح روزمرہ معاشرت پر بھی قدیم دکھنی شاعری میں بھی اچھی نظمیں مل سکتی ہیں۔

اگر ہم صرف سلطان محمد قلی کے کلام ہی کو لیں تو ہم کو روزمرہ معاشرت کے کئی عنوانوں پر نظمیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ہر عنوان پر نئے نئے انداز میں سلطان نے شعر نہیں کہے ہیں گہر افشانی کی ہے مثلاً سالگرہ، عید میلاد نبی، عید بعثت نبی، مجلس شب معراج، عید مولود علی، عید غدیر، محفل شب برات، عید الفطر، عید الضحیٰ، شادی، بیاہ، رسومات شادی، شاہی قصر اور ایوان وغیرہ۔

سلطان محمد قلی کے علاوہ ظل اللہ، عبداللہ قطب شاہ، علی عادل شاہ، نصرتی، ابن نشاطی، شوقی وغیرہ نے کامیابی سے روزمرہ پیش آنے واقعات اور حالات پر اظہارِ خیال کیا ہے، اس کے علاوہ ہمارے شعرا نے جو عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں ان میں بھی شادی بیاہ، ضیافت وغیرہ کے عنوانوں پر اپنی تراوشِ فکر، نزاکت خیال اور لطافت بیان کو پوری طرح نمایاں کیا ہے۔

اخلاقی شاعری۔ اخلاق اور موعظت کا میدان بھی فارسی شاعری میں ایک سیر حاصل موضوع ثابت ہوا ہے، گلستاں، بوستاں، حدیقہ سنائی، وغیرہ جیسے شاہکار دکھنی شعرا کیلئے ایک اچھا نمونہ ثابت ہوئے۔

دکھنی شعرا میں رازی کی مثنوی تحفہ (۱۰۴۰ھ) تاحال معلوم

یہ اخلاقی مثنویوں کا پہلا نمونہ ہے، اسی زمانہ کی دوسری مثنوی پند نامہ شغلی ہے، ان مستقل مثنویوں کے علاوہ اخلاقی عنوانوں پر بیسیوں نظمیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً صبر و شکر، خدا دوست، احسان مندی، ایفائے عہد، نیکی و بدی، وفادار عورت، غرور و تکبر، حب وطن، حسن سلوک، وغیرہ ایسے عنوان ہیں، جن پر ہمارے شعرا قلی، مقیمی، غواصی، طبعی، نصرتی، ولی وغیرہ نے کافی طور سے خیال آفرینی کی ہے۔

اس کے علاوہ دکنی شعرا کے دواوین میں اخلاقی ابواب صبر و شکر، صداقت و راستی، توکل و قناعت، خوش خصلتی، خاکساری و پاکبازی، اطاعت و فرماں برداری وغیرہ عنوانوں پر کافی سے زیادہ مواد مل سکتا ہے۔

مدحیہ شاعری۔ دکنی شاعری جہاں فقیروں اور صاحب حال درویشوں کے حجروں اور خانقاہوں میں پرورش پاتی رہی اور اس کی وجہ سے تصوف اور اخلاق ہماری شاعری کا ایک اہم موضوع بن گیا۔ اسی طرح وہ بادشاہوں اور امیروں کے بلند و بالا قصروں، ذی شوکت و حشمت ایوانوں میں بھی پروان چڑھتی رہی، اس لئے ناگزیر تھا کہ مدحیہ شاعری وجود میں نہ آتی۔ دکنی بادشاہ نہ صرف بلند پایہ اور نازک خیال شاعر ہوئے ہیں، بلکہ انہوں نے اپنی داد و دہش سے شعرا اردو کی سرپرستی بھی فرمائی ہے، اس کو قطع نظر جہاں بادشاہت اپنے پورے لوازم کے ساتھ حکمرانی اور کامرانی کا ڈنکا بجائے وہاں بادشاہ کو خوش کرنے والوں یا یہی بات ہے کہ خوشامد کرنے والوں کا وجود بھی ضروری ہے۔ اس طرح اور جگہ کے مانند دکنی شعرا نے بھی قصیدہ گوئی میں پوری مہارت دکھائی ہے۔

سلطان محمد قلی، سلطان عبداللہ، سلطان علی عادل شاہ، ظاہر ہے کہ اپنی تعریف آپ نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے پیغمبر آخر الزماں علیہ السلام اور امام اعلیٰ مقام کی مدح و منقبت میں اپنے تخیل کی پرواز دکھائی ہے۔ نصرتی نے بادشاہ کی تعریف کا حق ادا کیا ہے۔ یہ قصائد نہ صرف خوبی تمہید، حسن گریز، مدح حسن اور دعا خیر پر ختم ہوتے ہیں، بلکہ ان میں واقعہ نگاری کا بھی اچھا حق ادا کیا گیا ہے۔ خصوصاً نصرتی کے قصیدے واقعہ نگاری کے عمدہ مرقعے ہیں، نصرتی نے اپنے قصیدوں میں بادشاہ کی مدح ہی نہیں کی ہے، بلکہ واقعات جنگ کو بھی حسن و خوبی اور عمدگی سے بیان کیا ہے، اور بلاشبہ حقیقت نگاری کی ہے،

قصیدوں میں تشبیہ کی ندرت، استعاروں کی جدت، خیالات کی بلندی، مضامین کا طمطراق، الفاظ کی شوکت، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو زندگی جاوید کی مستحق ہیں۔

افسوس ہے کہ دوسرے دکنی شعرا کے قصیدے اب تک نہیں ملے ہیں۔ متداول تاریخوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ وجہی، غواصی، رستمی، شوقی وغیرہ سب نے بیسیوں قصیدے لکھے تھے، مگر افسوس اب سب ناپید ہیں، زمانہ مابعد میں جو قصیدے دکن میں لکھے گئے ہیں ان کے متعلق ہم نے تفصیل سے ایک علیحدہ مضمون میں روشنی ڈالی ہے جو مقالات ہاشمی میں شائع ہو چکا ہے۔

مرثیہ دکنی مرثیوں کے سلسلے میں ہمارے کئی مضمون مقالات ہاشمی میں شامل ہیں، جن میں تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں صرف اس قدر بتانا کافی ہے کہ جس طرح شاعروں کے جذبات شکر گزاری نے قصیدوں کی صورت اختیار کی وہاں ان کے جذبات حسرت و غم نے مرثیہ کی صورت اختیار کی۔ قدیم دکنی شعرا میں نہ صرف مرثیہ گو شعرا موجود ہیں، جنہوں نے سوائے مرثیہ کے کسی اور موضوع پر طبع آزمائی نہیں کی، بلکہ دوسرے شعرا نے بھی اس عنوان پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔

اول الذکر گروہ میں مرزا، ہاشم علی، امامی، کاظم وغیرہ کے نام پیش پیش ہیں، اور آخر الذکر میں سلطان قلی، وجہی، غواصی، سلطان عبداللہ، نصرتی، لطیف وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان کے کلام میں بہتر سے بہتر مرثیے ملتے ہیں۔ ان شاعروں نے مختلف عنوانوں پر مرثیے لکھے ہیں۔ مثلاً اصغر کا ماتم، قاسم کی شادی کا شہربانو کا الم، بے کس زینب، مسافر قیدی، ظلم دشت کربلا، اصغر کی ماں، الوداع وغیرہ۔ ہاشم علی، غلامی، مرزا، ذوقی، رضی ندیم، اشرف، روحی، تنکر وغیرہ کے مرثیے اپنے سوز و گداز، رنج و الم کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔

ان مرثیوں کے علاوہ دکنی شاعروں نے شہادت کے موضوع پر مستقل شہادت نامے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ولی ویلوری کی روضۃ الشہدا، عبداللہ کہنہ کی دو مجالس، عطا کی دہ مجلس وغیرہ۔ دہ مجلس کے نام سے تو کئی مثنویاں لکھی گئی ہیں جن میں واقعات کربلا کو نظم کیا گیا ہے۔

عشقیہ شاعری۔ بالآخر مجھے عشقیہ شاعری پر بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔ جس وقت دکن میں اردو

شاعری کا آغاز ہوا اُس وقت فارسی شعرا کے تین طبقے گزر چکے تھے۔ رودکی، اسدطوسی، فردوسی، خاقانی، انوری، نظامی، سعدی اور حافظ کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ان کی مثنویاں اور غزلیں ایران سے چل کر ہندوستان اور دکن تک پہونچ گئی تھیں اور اور خود ہندوستان میں خسرو، حسن، ظہوری اور کلیم کی زمزمہ خوانی فضا میں گونج رہی تھی، ان لوگوں کے کلام نے جو حسن و عشق کی روئداد سے لبریز اور محبت و الفت کی داستان سے مملو تھا، شعرائے دکن کے لئے ایک رہبر اور رہنما کا کام دیا۔ اسی کو پیش نظر رکھکر اُنہوں نے اپنی اچھی مثنویاں لکھیں اور پھر فارسی مثنویوں کو دکھنی قالب میں بدل کر اس عمدگی سے پیش کیا ہے کہ وہ گویا اُنکی اپنی تصنیف ہو گئی۔

اچھی مثنویوں میں بہمنی عہد کے نظامی کی مثنوی کے بعد بیجا پور اور گولکنڈے میں عبدل کی مثنوی ابراہیم نامہ، وجہی کی قطب مشتری، مقیمی کی چندر بدن و مہیار، جنیدی کی ماہ پیکر، خاص طور سے قابل تذکرہ ہیں۔ فارسی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی مثنویوں میں احمد کی لیلیٰ مجنوں، غواصی کی سیف الملک اور طوطی نامہ، ابن نشاطی کی پھول بن، نصرتی کی گلشن عشق، ہاشمی کی یوسف زلیخا، ملک خوشنود کی ہشت بہشت، طبعی کی بہرام و گل اندام، غلام علی کی پدماوت، صنعتی کا قصہ تمیم انصاری وغیرہ نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔

ان مثنویوں کے علاوہ جو حسن و عشق کی پُر کیف و سرور داستانیں ہیں، دکھنی شعرا نے غزلوں کا میدان بھی اچھوتا نہیں چھوڑا تھا، اگرچہ موجودہ ذخیرہ کے لحاظ سے ولی کے پہلے غزلوں کا سرمایہ مثنویوں کے مقابل نہایت قلیل ہے۔ لیکن جو کچھ ذخیرہ ملا ہے اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دکھنی شاعروں نے اظہار تعشق میں بھی کمی نہیں کی۔ اُردو کے شعرا نے جو سرمایہ غزل گوئی کا عام طور سے فراہم کیا ہے اس کے مدنظر یہ خیال درست ہے کہ شعرائے اُردو کا معشوق فرضی ہوتا ہے اور پھر اُسکی مبالغہ آمیز طور سے جو تعریف کی جاتی ہے وہ حقیقت سے دور اور اصلیت کے منافی ہوتی ہے۔

لیکن دکھنی شعرا نے جو غزل سرائی کی ہے اُسکے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے اصلیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ سلاطین کے محل سراؤں اور شاہی قصر و ایوان میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کی کمی نہیں تھی۔ خصوصاً سلطان محمد قلی اور علی عادل شاہ کی رنگین مزاجی اور عاشقانہ طبیعت کے باعث نہ صرف شاہی کوشک اور ایوان بلکہ خود شہر گولکنڈہ اور بیجاپور حسن و رعنائی کے مرکز بن گئے تھے، اس لئے شعرا کو اپنی غزلوں میں حقیقت نگاری کرنے کے لئے فرضی معشوق پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

خاتمہ۔ المختصر دکھنی شعرا نے مختلف نہج پر اظہار خیال کیا ہے، ان کی شاعری کے موضوع ہمہ گیر رہے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کھینچی ہے۔ اگر عشق کی روئداد میں حسن و رعنائی کا اظہار کیا ہے تو وہیں میدان جنگ کی دار و گیر کا صحیح نقشہ اور مرقع بھی پیش کر دیا ہے۔ اگر ان کے کلام میں تصوف اور عرفان جلوہ گر ہے تو وہیں اُنہوں نے فلسفہ کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ گھریلو زندگی کے روزمرہ واقعات کی حکایت بیان کی ہے تو مناظر قدرت کی دل نواز سحر طرازیاں بھی ان کے یہاں ملتی ہیں۔ تاریخ و سوانح پر بھی انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ پھر اخلاق و پند میں بھی اپنے کلام کو یادگار بنا ڈالا ہے۔

دکھنی شعرا نے اپنے دو تین سو سال کی محنت و کاوش کا جو عظیم الشان ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے اُس کی حفاظت اور ان سے کام لینا اب آپ کا کام ہے۔ ان کی شاعری میں ایسے ایسے جواہر پارے موجود ہیں جن کا آج کل کی شاعری میں ملنا دشوار ہے۔ ان کے خیالات کو لینا اور موجودہ زبان میں ان کو تبدیل کر کے اہل ملک کے سامنے پیش کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ نئی دُنیا اور پُرانی دُنیا کو ملا کر ایک ایسی دُنیا پیدا کر سکتے ہیں جس کی اس وقت سب کو ضرورت ہے۔

نصیر الدین ہاشمی

دو آتشہ

مجھے میسّر نہیں وہ مستی جو ہے سوائے شرابِ ساقی
بڑا کرم ہو اگر اُٹھا دے یہ جام وے کے حجاب ساقی

ترے کرم سے ہوئے ہیں رندوں پہ آشکارا ہزار عالم
ترے تصرف سے جامِ مے ہے طلوعِ صد آفتاب ساقی

پڑی تری چشمِ مست جس پر نہ پوچھ اُسکی خراب حالی
سبو تو کیا میکدہ نہیں ہے تری نظر کا جواب ساقی

ہزار مستی فزا ہوں لیکن بیک نفس جانفزا نہیں ہیں
یہ جام و پیمانہ و سبو ہیں کہ موجِ مے کے حباب ساقی

مرا جنونِ طلب ہے شاید ترے مذاقِ کرم کا باعث
فروغ پر میری تشنگی ہے شراب ساقی شراب ساقی

اُٹھا صراحی اُٹھا صراحی! الگ ایک ساغر میں دو مزے ہیں
ہماری کچھ تشنگی بجھے گی تجھے ملیگا ثواب ساقی

شراب سے دل تو ٹھہرا لیکن بپا ابھی حشرِ آرزو ہے
سبو دُ ے جا کہ دل کے ہاتھوں سکوں بھی ہے اضطراب ساقی

ہزار تابشؔ ہے رند مشرب مگر وہ مغرورِ عجز بھی ہے
اُسے گوارا یہ تلخیِ مے مگر ترا اجتناب ساقی!

تابشؔ دہلوی!

تشنہ کامی کا رہے اسکی خیال اے ساقی
ہے ترا بندۂ درگاہ نہالؔ اے ساقی

سرخوشِ کیف ابد ہوں تری آنکھوں کی قسم
مری مستی نہیں پابندِ زوال اے ساقی

وہ پلا بادہ کہ پُر نور ہو کاشانۂ فکر
جگمگا دے مری اقلیمِ خیال اے ساقی

اس جہنم کدۂ دہر میں اک جرعۂ مے
تشنہ لب کو ہے ترے آبِ زلال اے ساقی

اپنی اس مستیِ ہنگامہ طلب کے ہاتھوں
فرصتِ نیم نفس بھی ہے محال اے ساقی

یہ شب ماہ یہ تاروں سے برستا ہوا حُسن
بزمِ امکاں ہے کہ ہے بزمِ جمال اے ساقی

وہ طرب خیز ہوئی مے وہ مٹی یورشِ غم
وہ چلا لشکرِ اندوہ و ملال اے ساقی

جام لا، جام کہ میں جھوم کے چھیڑوں یہ غزل
"ہے ترا بندۂ درگاہ نہالؔ اے ساقی"

نہالؔ سیوہاروی!

ایک دیہاتی تمثیلچہ۔

پھاگن آیا رنگیہ بہریا

افراد

(۱) کندن سنگھ ـــــــ (۲) نینا
(۳) پارو ـــــــ (۴) کاسنی
(۵) لاجو ـــــــ (۶) ہری

(پردہ اُٹھنے سے پہلے دور سے لڑکیوں کے گانے کی آواز آتی ہے جو آہستہ آہستہ نزدیک ہوتی جاتی ہے۔)

پوجن چلو بسنت سکھی ری آج
پھاگن آیا رنگیہ بہریا ہے سکھی
سرسوں پھولی ری سکھی ری آج
گھر گھر منگلاچار دن سنگھ
پھگن آیا رنگیہ بہریا

(گانے کی آواز پاس آکر بالکل بند ہوجاتی ہے۔ اور لڑکیاں آوازیں دیتی ہیں ـــــــ)

ایک آواز۔ نینا۔ اوری نینا۔

دوسری آواز۔ یہاں کھڑکی میں کیا چپ چاپ بیٹھی ہو چلو بسنت پوجنے چلیں۔

تیسری آواز۔ یہ بہرکہلاتی ہو ہم خود تمہیں اوپر آکر گھسیٹ لے چلیں گے۔

(اس کے ساتھ ہی پردہ اُٹھتا ہے۔ نینا دائیں طرف کھڑکی میں بیٹھی باہر کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اُس نے سیدھے سادے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اُس کی بسنتی چنری سامنے کی دیوار میں کھونٹی پر لٹک رہی ہے۔ کمرے میں چرخے، پیڑھے وغیرہ دیہاتی ضرورت کا سامان رکھا ہے۔ پردہ اُٹھنے کے ساتھ ہی بائیں دیوار کے دروازے سے لاجو، پارو اور کاسنی داخل ہوتی ہیں اور اُس کو گھیر لیتی ہیں۔)

پارو۔ (اُسے کندھوں سے ہلاتے ہوئے) نینا چلو نا۔

لاجو۔ چلو بھی نینا۔

کاسنی۔ اب اُٹھو بھی۔ ہمارا تو گلا بھی بیٹھ گیا تمہیں آوازیں دیتے دیتے۔

نینا۔ مجھے یہیں بیٹھا رہنے دو۔

پارو۔ دیکھو سامنے میدان میں سب چرواہے اپنے ڈھور ڈنگر لیکر پہونچ گئے ہیں......

کاسنی۔ ان کے ماتا پتا ہاتھوں میں پانچ پانچ گوٹے لئے وہاں جارہے ہیں ـــ پیلے صافے اور بسنتی چنریاں ـــ معلوم ہوتا ہے جیسے بسنتی ندی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی بہ رہی ہے۔

لاجو۔ کیا تمہاری چنری اس ندی کی لہر نہ بنے گی ـــ ارے تم نے تو بسنتی چنری بھی نہیں پہنی۔

پارو۔ یہ کیا بدشگونی ہے۔ اُٹھو کھڑکی بند کرو۔ بسنتی چنری پہنو اور بسنت پوجا کے لئے چلو۔

نینا۔ میری چنری تو کھونٹی پر لٹک رہی ہے۔ اور میری کھڑکی کھلی ہے۔ (لمبی سانس لیکر) یہ چار سال سے کھلی ہے اور نہ جانے کب تک کھلی رہیگی۔

پارو۔ تم کیسی باتیں کرتی ہو۔

لاجو۔ ہم سب تمہیں لیجاکر رہینگی۔

پارو۔ اُٹھو نینا۔ تمہیں سال کے بعد تو یہ تہوار آتا ہے۔ فکر اور غم تو سال بھر رہتے ہیں۔ یہی ایک دن تو آتا ہے ہنسنے ہنسانے کا۔

نینا۔ میں اسی دن آنسو......

(باہر نیچے سے آواز آتی ہے۔)

نینا، نینا۔ لاجو......

لاجو۔ اُٹھو نینا۔ وہ دیکھو سب شور مچا رہی ہیں۔ اور تم چپ چاپ بیٹھی ہو۔

نینا۔ مجھے نہ چھیڑو۔ مجھے چپ چاپ یہیں بیٹھا رہنے دو۔ جسم کے ساتھ نہ ہوتی تو کیا ان آنکھوں کے ساتھ میں تمہارے ساتھ ہونگی۔

(باہر نیچے سے آواز آتی ہے۔)

لاجو ـــــــ

لاجو۔ میں تو چلی، تم آؤ کاسنی جلدی۔

پارو۔ اُٹھو بھی نینا کیا ہوگیا تمہیں۔

نینا۔ جو پچھلے سال بہا تھا۔

کاسنی۔ (ہنسکر) اور جو اس سے پچھلے سال بہا تھا۔

پارو۔ آخر تم کب تک اس کا انتظار کرتی رہو گی۔ یہ چوتھا سال ہے اور ان چار برسوں سے تم نے اس تہوار میں حصہ نہیں لیا ـــ کیسا دل پتھر ہوگیا ہے تمہارا۔

نینا۔ میرے دل میں اُتر تو جاؤ ـــ وہ پتھر ہے یا پانی۔

(باہر نیچے سے آواز آتی ہے)

کاسنی ـــــــــ

کاسنی۔ وہ سب بے چین ہو رہی ہیں۔ اُٹھو نینا۔

(باہر نیچے سے آواز آتی ہے۔)

تم آتی ہو تو آؤ۔ ہم تو جا رہی ہیں۔

(بیک گراؤنڈ میں گانے کی آواز پھر شروع ہو جاتی ہے جو دھیرے دھیرے دُور ہوتی جاتی ہے۔)

رُت چلو بسنت سکھی ری آج

کاسنی۔ میں تو چلی، تم اسے لیکر آؤ پارو۔

(گانے کی آواز اُونچی ہو جاتی ہے اور لحظہ بہ لحظہ دُور ہوتی جاتی ہے۔)

پھاگن آیا رنگیہ بہریا، ہے سکھی
سرسوں پھولی ری
پیا سنگ کھیلو گلال، مدن سنگ
پھاگن آیا رنگیہ بہریا

پارو۔ نہیں نینا یہ ٹھیک نہیں، اس طرح تو زندگی نہیں بتائی جا سکتی۔

نینا۔ (بیزوری ہیں) کس طرح نہیں بتائی جا سکتی۔

پارو۔ نہ جانے وہ کہاں ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ اور اس بات ہی کا کیا بھروسا ہے کہ وہ ابتک تمہارے ہی نام کی مالا جپتا ہوگا؟

نینا۔ میں بدن سنگھ کو جانتی ہوں۔ وہ بھنورا نہیں، پتنگا ہے ـــ پتنگا چاہے جلا لے......

پارو۔ پتنگے کیا جنت جنت نہیں اُڑتے۔ تم تو پاگل ہو۔ کندن سنگھ .....

نینا۔ (غم سے ہنستی ہے) پتنگے چاہے کسی اور سے لَو لگا لیں پارو۔ پر لَو تو کہیں نہیں جاتی جلتی ہی رہتی ہے

پارو۔ باپو اس کی سگائی بازدنوں میں کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ کان ہی نہیں دیتا۔

(نینا چُپ رہتی ہے۔)

پارو۔ بدن سنگھ کا کیا ٹھکانا ہے نینا۔ اتنے برس ہو گئے اس کی کوئی کھوج خبر نہیں ملی۔ جانے کہاں ہو؟ جانے کیسے ہیں؟ اور کندن سنگھ.....

نینا۔ وہ آئے گا پارو۔ جس دن باپو نے اُسے ڈانٹا تھا اور اُس نے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا اس دن وہ مجھے اس کھڑکی کے نیچے ملا تھا۔ مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے بسنت اُتسو ختم ہو چکا تھا۔ پورب کی طرف نیلے نیلے بادل گھر آئے تھے اور سورج کی ڈوبتی ہوئی کرنوں نے ان کی کوروں کو رنگ دیا تھا۔ تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ اور راستوں میں بکھری ہوئی سرسوں کے پھولوں کی مرجھائی پتیاں ہوا میں اُڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں لیکن اسکے چہرے پر لوہے کے سے ارادے کی سختی تھی۔ اُس نے کہا تھا۔ نینا میں آؤں گا میرا انتظار کرنا میں تمہارے جوگ ہو کر آؤنگا۔

پارو۔ اور کندن کے من میں بھی تو یہی بات سمائی ہے ـــ وہ بھی تو تمہارے لائق ہو جانا چاہتا ہے۔ تمہارے لئے اس نے کیا نہیں کیا؟ تمہارے لئے وہ کیا نہیں کر سکتا؟ کہیں تمہارا نام آتے تو اس کا چہرہ کھل جاتا ہے۔ کوئی تمہاری بُرائی کرے تو اُس پر برس پڑتا ہے۔ تمہارے کام کی، تمہاری قوت کی، تمہاری محنت مشقت کی تعریف کرتے اس کی زبان نہیں تھکتی۔ بھاوجیں سو سو باتیں بناتی ہیں لیکن وہ ہمیشہ تمہاری صفائی کر دیتا ہے۔ "اُس جیسی کوئی بن کر تو آئے" وہ کہا کرتا ہے۔ "آج چار برس بدن بھائی کو باہر گئے ہوگئے ہیں۔ وہ اس کے نام کی مالا جپ رہی ہے۔ اسے کس بات کی کمی ہے۔ اناج سے اس کے کھلیان بھرے ہیں۔ روپے پیسے سے اس کی تجوریاں بھری ہیں ـــ وہ اشارہ کرے تو بیسیوں گبرو اس کے قدموں پر نثار ہو جائیں۔ لیکن وہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔" سچ نینا تمہاری تعریف کرتے کرتے اُس کی آنکھوں میں جیسے چمک آجاتی ہے۔ مجھے تو اُس پر ترس آیا کرتا ہے۔

(نینا خاموش رہتی ہے)

پارو۔ اور باندنوں والوں کی بات پر اُسے آگ لگ جاتی ہے۔ وہ شریف اور بھلے آدمی ہیں۔ دس مربعے زمین ہے اُن کی اور پھر گھر میں سب کو آنندی پسند ہے۔ لیکن وہ تو تمہاری طرف آس لگائے بیٹھا ہے۔ جب تک یہ آسا نہیں ٹوٹتی وہ کسی دوسری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھیگا۔

(نینا چُپ رہتی ہے)

پارو۔ تم اسے کورا جواب بھی تو نہیں دیتیں۔ آخر اُسے کچھ آسا ہوگی ہی ـــ میری بات کا بُرا نہ ماننا نینا۔ یا اُسے اپنا لو یا جواب دیدو۔ کورا جواب دیدو۔ وہ میرا بھائی ہے۔ لیکن میں یہ کورا جواب پسند کر لونگی۔

نینا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ میں اُسے ہمیشہ بھائی کی طرح مانتی آئی ہوں۔ بدن سنگھ کے جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ آیا ہے۔ لیکن میں بدن سنگھ کا خیال نہیں چھوڑ سکی۔ اور تم میری اتنی اچھی سہیلی ہو پارو ـــ تمہارے اور کندن کے مجھ پر اتنے احسان ہیں۔ اور..... اور... میں اسے

مرد ہے۔ ایک عورت۔ دونوں حسین۔

(میوزک بلند ہو کر پھر بیک گراؤنڈ میں چلا جائے۔)

فیروزہ۔ (جذبات بھری آواز میں) آج کی رات کتنی حسین ہے شہباز۔

شہباز۔ تم اس سے کہیں زیادہ حسین ہو فیروزہ۔

فیروزہ۔ جی چاہتا ہے یہ ناؤ عمر بھر چلتی رہے۔ اور میں تمہاری گود میں سر رکھے چاندنی کی ساری ٹھنڈک آنکھوں کے ذریعے اپنے اندر جذب کئے جاؤں۔

شہباز۔ میں چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری فیروزہ کی پیاری آواز یونہی میرے کانوں میں آتی رہے۔ حتیٰ کہ دوسری آوازوں سے بالکل بے خبر ہو جاؤں۔ اس دھندلی روشنی میں تم کتنی حسین معلوم ہوتی ہو فیروزہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا ہی کوئی تخیل محبت کے جادو سے بول پڑا ہے۔ بولتی جاؤ فیروزہ، بولتی جاؤ۔ میری روح ان سرخ ہونٹوں سے ابھرتے ہوئے سُروں میں کھو جانا چاہتی ہے۔ سرود۔ سرود۔ اپنا سرود اٹھاؤ فیروزہ۔ آج میں نغموں کے سمندر میں ڈبکیاں لگانا چاہتا ہوں۔ آواز کی لہروں پر ناچنا چاہتا ہوں۔

(فیروزہ سرود کے ساتھ فارسی کی کوئی غزل گائے)

شہباز۔ لیکن فیروزہ کہاں ہے۔ فیروزہ کہاں ہے۔

نادرہ۔ اسی شہر میں جس کا تم نے محاصرہ کر رکھا ہے۔

شہباز۔ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔

نادرہ۔ اپنے ہم وطنوں کی طرح موت کا انتظار۔ اسے اپنے دشمنوں میں تمہاری موجودگی کا علم ہے۔ اس نے مجھے تمہارے پاس اپنا آخری سلام دے کر بھیجا ہے۔ شہر میں کال پڑا ہے۔ دوسروں کی طرح اب وہ بھی موت کی راہ دیکھ رہی ہے۔ چند دنوں کے بعد وہی فیروزہ جس کی آواز تمہارے لئے فردوس گوش تھی، وہی فیروزہ جس کی پازیب کی جھنکار سے تمہارے سخت دل کے تار بھی لرز اٹھتے تھے۔ وہی فیروزہ جس نے قلندر خان آفریدی کے بیٹے کے سخت دل میں بھی محبت کے کئی نغمے جگائے تھے، اب چند ہی دنوں میں فاقوں سے نڈھال ہو کر موت کی آغوش میں چلی جائیگی۔

شہباز۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ فیروزہ کبھی نہیں مر سکتی۔ فیروزہ کبھی نہیں مرے گی۔ شہباز یہ کبھی نہیں ہونے دیگا۔ کبھی نہیں ہونے دیگا۔

نادرہ۔ آہستہ بولو۔ آہستہ بولو۔ اگر قلندر خان کو اس بات کا علم ہو گیا تو دونوں کی خیر نہیں۔

میں بھی بل ہے ۔۔۔ ٹھہرو، خشک گوشت کا یہ تھیلا تم پکڑ لو۔ دودھ کا مشکیزہ میں اٹھاتا ہوں۔ اور اب چلو مجھے فیروزہ کے پاس لے چلو۔ چلو۔ چلو۔ جلدی کرو۔ ٹھہرو۔ میں پنیر کی یہ گٹھری بھی اٹھا لوں۔

(قدموں کی چاپ)

نادرہ۔ (سرگوشی میں) اس طرف۔ میرا ہاتھ پکڑ لو۔ بس چلے آؤ۔

(وقفہ۔ ہماہمی پیدا کی جائے۔ اور ذیل کی آوازیں آئیں)

شہباز خان مغلوں کے ساتھ مل گیا۔

شہباز خان غداری کر گیا۔

وہ ہمارے سب راز جانتا ہے۔

اب ہمیں محاصرہ اٹھانا پڑیگا۔

ہماری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

(وقفہ)

سنا ہے کہ ایک عورت کے عشق نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ فیروزہ نامی ایک حسین مغنیہ نے شہباز کے پر کلیج کر دئے ہیں۔

وہ فیروزہ کو بہت چاہتا ہے۔

وہ بھی تو ہزار جان سے اس پر فدا ہے۔

اس عورت کے لئے وہ گوشت، پنیر اور نہ جانے کیا کیا کچھ یہاں سے لے گیا ہے۔

(وقفہ)

شیر خان۔ تمہارا بیٹا غدار نہیں تو کیا ہے۔ ایک رقاصہ کی خاطر وطن چھوڑ کر دشمن کے ساتھ جا ملا۔

(وقفہ)

چپ کیوں ہو گئے۔ سر کیوں جھکا لیا۔ اب کیوں نہیں گرجتے۔ شاید اس لئے کہ یہ غدار اتفاق سے تمہارا بیٹا ہے۔ دوست نہیں ہے۔

قلندر۔ شہباز میرا بیٹا ہے۔ میں کب اس سے انکار کرتا ہوں۔ اسکے علاوہ تمہیں کچھ اور بھی کہنا ہے۔

شیر خان۔ غدار بیٹے کے باپ سے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

قلندر۔ اب تم جا سکتے ہو۔

(وقفہ)

(اپنے آپ سے) چپ کیوں ہو گئے۔ سر کیوں جھکا لیا۔ اب کیوں نہیں بولتے۔ شاید اس لئے کہ غدار تمہارا بیٹا ہے، دوست نہیں

کندن۔ تم کتنا گایا کرتی تھیں کتنا ناچا کرتی تھیں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے نینا، اٹھو چنری پہنو۔ یہ کھڑکی بند کرو۔
نینا۔ (لمبی سانس لیتی ہے) شاید میری چنری وہیں ٹنگی رہے گی اور یہ کھڑکی۔
کندن۔ دیکھو گو نٹھوں کا کتنا بڑا ڈھیر لگ گیا ہے۔ سرسوں کے ہاروں سے وہ اتنا ڈھک گیا ہے کہ پیلے پھولوں کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے۔ تمہاری سب سہیلیاں پیلے پیلے پھول بالوں میں گو نتھے، پیلے پیلے گجرے ہاتھوں میں پہنے، پیلی پیلی چنریاں لہراتی بسنت کی دیویاں بنی ناچ گا رہی ہیں۔ تم کس طرح .....
نینا۔ تم مجھے یہ سب نہ سمجھاؤ، مجھے یہ سب نہ سمجھاؤ۔ تم جاؤ کندن۔
کندن۔ میں نہ جاؤں گا اگر تم نہ جاؤ گی۔
نینا۔ میں چار سال سے نہیں جا رہی۔
کندن۔ تو میں بھی کب جاتا ہوں۔ ہر سال جب یہ تہوار آتا ہے میں نئی امید لئے تمہارے دوار پر آتا ہوں۔ پر نراس لوٹ جاتا ہوں۔ چرواہے اپنے اپنے ڈھور ڈنگر لئے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ بڑے بوڑھے ہاتھوں میں گو نٹھو لئے پھول کا ڈھیر لگاتے ہیں۔ عورتیں سرسوں کے ہار چڑھاتی ہیں۔ چرواہے بنسری بجاتے ہیں، سب ناچتے گاتے موج اڑاتے ہیں۔ لیکن میں چپ تنہا اور اداس ویرانوں میں بھٹکتا پھرتا ہوں۔
نینا۔ تا اب تم اور نہ بھٹکو، اب تم اور نہ پھرو، تم اس اتسو میں حصہ لو۔ میری آس چھوڑ دو۔ تمہاری بہن نے ابھی کہا تھا.......
کندن۔ میری بہن نے کیا کہا تھا۔
نینا۔ کہ آسا کے باریک تار کے سہارے میں تمہیں کھینچے لئے آتی ہوں .....
کندن۔ میں خود بخود کھنچا چلا آتا ہوں۔
نینا۔ پاروتی نے کہا ـــــ اگر تمہیں بدن ہی کی باٹ جوہنی ہے تو کندن کو کورا جواب دیدو۔
کندن۔ تم شوق سے بدن کا راستہ دیکھو لیکن تم نے کہا تھا.....
نینا۔ (خلا میں دیکھتے ہوئے) چار سال پہلے باپو نے اسے دھتکار دیا تھا۔ تم اس کے لائق تو بنو۔ انہوں نے اس سے کہا تھا ـــــ باپو محنتی آدمی تھے۔ سب زمین جائداد انہوں نے خود پیدا کی تھی۔ اور بیکار اور نالائق آدمی کو وہ پسند نہ کرتے تھے ـــــ بدن نے کہا تھا: "نینا۔ اگر تیرے پتا اتنا کچھ پیدا کر سکتے ہیں تو کیا میں نہیں کر سکتا!"

(کندن چپ رہتا ہے)

نینا۔ (اسی طرح خلا میں دیکھتے ہوئے) بسنت کی اس شام کو جب وہ اسی اتسو سے اداس لوٹا تھا، اس نے مجھ سے کہا تھا: "نینا میں ابھی چلا جاؤنگا۔ آج ہی یہ گاؤں نگر کو چھوڑ دوں گا اور تب تک اس گاؤں میں پاؤں نہ رکھونگا جب تک تمہارے لائق نہ ہوں گا"

(کندن چپ رہتا ہے)

نینا۔ اس نے کہا تھا: "نینا میں اسی بسنت کے دن آؤنگا۔ اور اتنا کما کر لاؤں گا کہ تمہارے پتا سے مجھے تمہارے لئے کہنے کی ضرورت نہ پڑیگی"
کندن۔ مجھے یہ سب معلوم ہے۔
نینا۔ وہ صوبیدار ہو کر آئے گا۔ (مسرور ہو کر) وہ اتنے تحفے لائے گا کہ مجھ سے سنبھالے نہ سنبھلیں گے .....
کندن۔ تم ویسی ہی بچی ہو۔ ابھی تک اسی خیالی دنیا میں بستی ہو۔ بھول جاتی ہو کہ بدن سنگھ فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا ہے......
نینا۔ وہ ضرور آئے گا۔ جنگ میں فتح حاصل کر کے آئیگا۔ میں اس کا انتظار کرونگی۔
کندن۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اس بسنت وہ نہ آیا تو.....
نینا۔ تم میرے لئے کیا کچھ نہیں کرتے رہے۔ ماتا پتا کی موت کے بعد تم نے میری کتنی مدد نہیں کی۔ تم نہ ہوتے تو میں اس طرح رانی بنی نہ بیٹھی ہوتی۔ کہاں کہاں کے رشتے دار اس زمین، جائداد کو ہڑپ کرنے کے لئے نہیں آئے۔ تم نے ان سے مقدمہ لڑے ہیں، ان کے اتیا چاروں کا مقابلہ کرنے میں میری امداد کی۔ زمین جائداد کے انتظام میں میری سہائتا کی......
کندن۔ تم کیوں بار بار اس کا ذکر کر کے مجھے شرمندہ کرتی ہو۔
نینا۔ اور میں کبھی تمہیں صاف جواب نہ دے سکی۔ اور پارو کہتی ہے ـــــ میں تمہارا حوصلہ بندھاتی رہی ہوں، میں تمہیں اپنے جال میں پھنساتی رہی ہوں۔
کندن۔ تم نے کبھی میرا حوصلہ نہیں بڑھایا۔ تم ہمیشہ نٹھر رہی ہو.....
نینا۔ میں بدن سنگھ کا انتظار کرتی ......
کندن۔ میں نے تمہیں کب روکا۔ بدن سنگھ کیا میرا دوست نہ تھا۔ آج پھر اگر وہ آجائے تو مجھ سے زیادہ خوشی کسی کو نہ ہو۔

(نینا چپ رہتی ہے۔)

کندن۔ اور کون جانتا ہے کہ میں اسی لئے تم سے محبت نہیں کرتا۔ بدن جب یہاں تھا تو ہم لوگ کتنے خوش تھے۔ اس کو تم سے کتنی محبت تھی۔ تم کتنی خوش تھیں ـــــ اس کے جانے کے بعد تم اداس رہنے لگیں۔ تم نہیں جانتیں نینا، تمہیں اس حالت میں دیکھ کر میرے دل پر کیا گذرتی ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ تڑکے تڑکے اٹھ کر تم کام میں جٹ جاتی ہو، اور سارا سارا دن کھانے پینے کی سدھ بدھ بھلا کر کام کرتی رہتی ہو ـــــ اپنے جسم کی، اپنے کپڑوں کی، اپنے بالوں کی تم پروا نہیں کرتیں۔ ناچ گانے، ہنسی مذاق کسی چیز سے تمہیں رغبت نہیں، تو میں دل مسوس کر رہ جاتا ہوں۔

اور چاہتا ہوں کسی طرح بھی تمہیں سکھ پہونچا سکوں۔ کسی طرح بھی تمہیں خوش رکھ سکوں......

(نینا چپ رہتی ہے)

کندن۔ میں نے بدن سنگھ کی کتنی تلاش نہیں کی۔ جب یہ پتا چلا کہ وہ بھرتی ہو کر جنگ پر چلا گیا ہے تو تمہارے غم کے خیال سے میرے دل کو بڑا دھکا لگا تھا۔ لیکن اس بات کو بھی تین سال بیت گئے۔

نینا۔ وہ ضرور آئے گا۔ وہ اتنا کما کر لائیگا......

کندن۔ لیکن نینا وہ فوج میں بھرتی ہو کر گیا ہے۔

نینا۔ ان چار برسوں میں اُسے ہر روز اپنے سپنوں میں دیکھتی رہی ہوں۔ سوتے میں ہی نہیں جاگتے میں بھی، سارا سارا سال اس دن کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ اور بسنت کے دن اس کھڑکی میں بیٹھ کر اس کی راہ دیکھتی رہی ہوں ـــ مجھے اب بھی ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے وہ ابھی آکر کہے گا ـــ نینا میں آگیا۔

کندن۔ (ہنستا ہے) پارو مجھے کہا کرتی ہے ـــ تم ہوا میں بستے ہو۔ ایک مدھم سی اُمید کے سہارے تم اپنی زندگی برباد کر دو گے۔ تم اسی طرح پل پل چھن چھن جلتے رہو گے اور نینا کسی اور سے شادی کر لیگی.....

نینا۔ نینا یا بدن سنگھ سے شادی کریگی یا......

کندن۔ کہو نینا، یا.......

نینا۔ (ہنستی ہے) تم جانتے ہو۔

کندن۔ (طنز سے ہنستا ہے) تو ہم دونوں تمام عمر کنوارے رہیں گے۔ نینا تم میری طرف نہ دیکھو لیکن ذرا اپنی طرف تو دیکھو ـــ تمہارے گیہوں کے پودوں میں بالیاں لگ آئی ہیں۔ تمہاری ایکھ بسنت کی ہوا کے پرس سے سرسرا رہی ہے۔ تمہارے کھیتوں میں سرسوں کے پھول آ گئے ہیں۔ تمہارے باغوں میں بہار آگئی ہے ـــ لیکن تم خود پت جھڑ کے پتے کی طرح مُرجھائی بیٹھی ہو۔ اُٹھو نینا۔ اُٹھو میرے سنگ چلو۔ بسنت اتسو.....

نینا۔ کندن سنگھ تم جاؤ میری قسمت میں بسنت اتسو دیکھنا نہیں۔

کندن۔ تم نے وعدہ کیا تھا۔ تم اس بسنت کو ضرور چنری پہنو گی۔

نینا۔ چُنری پہننا میری قسمت میں نہیں لکھا۔ بدن سنگھ آتا تو.....

کندن۔ بدن اب نہ آئے گا۔

(لاجو ہوا کے جھونکے کی طرح داخل ہوتی ہے)

لاجو۔ بدن سنگھ آ گئے۔

نینا۔ آ گئے.........

(کاسنی بھاگتی آتی ہے۔)

کاسنی۔ نینا۔ بدن بھیا آ گئے۔

لاجو۔ وہ دیکھو۔ وہ بچّوں اور بچیوں کو تحفے بانٹ رہے ہیں۔

نینا۔ کہاں؟ کہاں؟.....

کاسنی۔ وہ.....

نینا۔ خاکی وردی پہنے.......

لاجو۔ وہ صوبیدار میجر بن کر آئے ہیں ـــ اتنے تحفے ساتھ لائے ہیں۔ اتنے.........

کاسنی۔ کئی ٹرنک اُن کے ساتھ بھرے ہوتے ہیں۔ وہ دیکھو۔ وہ سب ادھر ہی آ رہے ہیں۔

نینا۔ کندن میں بسنت اتسو میں چلوں گی۔ وہ میری چنری دو۔ میں جوتا پہن لوں۔ میں اُسے راستے میں جا کر ملوں گی۔ اس بار کا بسنت اتسو.....

کندن۔ (چُنری اُتار کر دیتے ہوئے) یہ لو چُنری اور مجھے اجازت دو۔

نینا۔ تم میرے سنگ نہ چلو گے کندن، اپنے بدن بھیا.....

کندن۔ نہیں نینا۔ بسنت اتسو شاید میری قسمت میں نہیں۔

نینا۔ (کھڑکی بند کرتی ہے) ہم تم پہلے کی طرح رہیں گے کندن ـــ بہن بھائی.......

کندن۔ نہیں نینا۔ میں جاتا ہوں۔ تم نے اپنی کھڑکی بند کر دی۔ میرے کمرے کی کھڑکی کھلی رہے گی۔ لیکن وہاں میری بیقرار رُوح کے علاوہ کوئی میرا انتظار نہ کرے گا۔

شاعر اور بیداری کے سپنے

آپ اکثر سوچتے ہوں گے کہ آخر یہ شاعر لوگ، اتنا تخیلی مواد کہاں سے مہیا کرتے ہیں۔ اور پھر یہ خیالات کے جادوگر کس طرح محض چند ایک لفظوں کے ہیر پھیر سے ہم میں نئے نئے جذبات پیدا کر دکھاتے ہیں جن کا ہم میں پیدا ہونا خود ہمارے نزدیک ناممکن تھا۔ لطف تو یہ ہے کہ خود اہلِ قلم حضرات اِن سوالوں کا تسلی بخش جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ شاعرانہ مواد اکٹھا کرنے والی مشین کے کل پُرزوں کی جان پہچان ہمیں شاعر نہ بنا سکے گی۔ نہ اس مواد کو شعر کے سانچوں میں ڈھالنے کی صفت سے متعارف ہونا ہم میں ایک تخیل گر کی رُوح نہ پھونک سکے گا۔ تاہم چند لمحوں کے لئے ہم آپکو اس بُھول بُھلیاں کی سیر کیلئے لئے چلتے ہیں۔ شاید ہماری چھان بین کو نقوش جو اس ویرانے کو کچھ قدرے روشن کر دیں۔ خیال رہے کہ تحلیل نفسی کے ماہر اور موجد ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ ایم۔ ڈی۔ ایل ایل۔ ڈی۔ اس سیر میں ہمارے ساتھ ساتھ ہیں۔

سب سے پہلے بہتر یہ ہوگا کہ ہم عام افراد میں کوئی ایسا فعل ڈھونڈ نکالیں جو کسی نہ کسی طرح ان تخیل گر باکمالوں کے کارنامے سے مشابہ ہو۔ اس طرح اس مشابہت کے سہارے ہمیں مشاہدہ و مطالعہ کی تقابلی منزلیں طے کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ اس مطلب کے لئے سب سے بہترین چیز ایک بچہ ہے۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ایک بچے کا محبوب ترین شغل کھیل (کھیلکر) ہے اور آپ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے کھیل میں ایک تخیل گر سے کس قدر نزدیک ہو جاتا ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ وہ کس طور اپنی علیحدہ دُنیا آباد کر لیتا ہے اور پھر کس طرح کمال انہماک سے اس پر اپنی جذباتی قوتیں انڈھالتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ کی باریک بین نظریں یہاں یہ بات ضرور ڈھونڈ نکالیں گی کہ ایک بچہ اپنی دُنیا بنانے کے لئے خیال اور مادی اشیا حقیقی دُنیا سے مستعار لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خیالات کا یہ ننھا کوملبس پُرانی دُنیا کی چند فرسودہ اشیا کو اپنی پسند کی ترتیب دیکر خود ہی ایک نئی دُنیا دریافت کر لیتا ہے۔ اور ایسا کرتے وقت وہ اپنی دُنیا کو حقیقی دُنیا سے علیحدہ جانتا ہے۔ حقیقت کے ساتھ اس قسم کا تعلق رکھنا ایک بچے کے کھیل کو بیداری کے سپنے سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ اگرچہ ایک تخیل گر فنکار اپنا علیحدہ گھروندہ بنانے میں ایک بچے کی تقلید کرتا ہے لیکن وہ بازیٔ طفلانہ سے ایک قدم اور آگے بڑھکر اسے حقیقی دُنیا سے قطعی طور پر بے تعلق کر دیتا ہے اور یوں تخیلی اور حقیقی دُنیا کے فرق اُٹھائے جاتے ہیں۔ [1]

بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ لوگ بچپنے کے کھیل چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اب اُن پر ان طفلانہ فرحتوں کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ یہ بات تو کچھ نفسیات کے ماہر ہی جانتے ہیں کہ بنی نوع انسان کے لئے ایک دفعہ کی چکھی ہوئی لذتوں سے ہاتھ اٹھانا کس قدر ناممکن ہے۔ خاقانیٔ ہند اُستاد ذوق مرحوم کا رسوائے عالم مصرع ہے، ہے۔

"چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

۔ اگر آپ یہاں "یہ کافر" کے بھیس میں ہر وہ لذت مضمر سمجھ لیں جو کبھی نہ کبھی انسان تک پہونچ چکی ہے تو یہ کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ ٹھوس حقیقت ہے کہ ہم کوئی چیز چھوڑ نہیں سکتے" یہ اور بات ہے کہ ہم ایک چیز کے بدلے دوسری چیز سے وہی لطف اُٹھانا شروع کر دیں۔ جب بھی آپ کو کوئی شخص کسی چیز کو اس طرح کنارہ کشی کرتا دکھائی پڑے تو آپ یقین کر لیں کہ وہ اس چیز کا نعم البدل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ انسانی فطرت کے اس اٹل قانون کے زیرِ اثر پروان چڑھتے ہوئے ذہن بچپنے کے کھیل چھوڑنے میں صرف اس تعلق سے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں جو بچپن کے کھیل اور حقیقی دُنیا میں قائم ہو چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ کھیل کی بجائے تخیل گری آغاز کرتے ہیں۔ یہ ہوائی قلعے جو جاگتے میں بنائے جاتے بیداری کے سپنے

---

[1] حقیقت اور اسٹیج کے ضمن میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) اکثر اوقات ایسے حادثات جو حقیقی دُنیا میں ہمارے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا نہیں کر سکے اسٹیج پر عجب لُطف دے جاتے ہیں۔ اور اسٹیج پر آ کر بعض ناخوشگوار جذبات بھی کافی خوشگوار بن جاتے ہیں۔

(۲) اگرچہ زندگی کی سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا فرد جلد ہی حقیقت سے دوچار ہو جاتا ہے اور بچپن کے کھیل بُھلا دیتا ہے۔ پھر بھی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک دن کھیل اور حقیقت کا فرق اس کے لئے دفعتاً ناپید ہو جائے اور چند لمحوں کے لئے وہ سنجیدگی اور معقولیت کے تقابل سے بقدرِ ظرف لطف اندوز ہو۔

[redacted]

[illegible] سو سالہ کہلاتے ہیں۔

شاید اگر آپ سمجھیں کہ اگر یہ بیداری کے سپنے بچپنے کے کھیل کا تسلسل قرار پاتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایک طرف بچے (اپنے بچوں میں یا اکیلا کھیلنا پسند کرتے ہوتے ہیں) اپنے کھیل عمر رسیدہ افراد سے پوشیدہ رکھنے کی چنداں کوشش نہیں کرتے۔ اور دوسری طرف جواں سال افراد اپنے بیداری کے سپنے سخت احتیاط سے چھپائے رکھتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ فرق ہر دو افعال کے پس پردہ نہاں وجوہات سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم اطلاعاً صرف ایک وجہ عرض کئے دیتے ہیں۔ بچوں کے کھیل صرف خواہش سے پیدا ہوتے ہیں، یہ خواہش جو انسانی افراد کی نشو و نما کے لئے اشد ضروری ہے "خواہش نمو" کہلاتی ہے اس خواہش کے زیر اثر بچے "بڑا ہونے" کے کھیل کھیلتے ہیں اور اپنے کھیلوں میں اپنے سے زیادہ عمر کے افراد کی نقل اُتارتے ہیں۔ چونکہ بچے اپنی اس خواہش کو چھپانا نہیں چاہتے اس لئے وہ اپنے کھیل پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک جواں سال فرد کا معاملہ کچھ قدرے مختلف ہے، ایک تو وہ یہ جانتا ہے کہ اب اس سے بیداری کے سپنوں میں حصہ لینے کی توقع نہیں کی جاتی، دوسرا اس کے تخیل کو بیدار کرنے والی خواہشیں کچھ ایسی انوکھی واقع ہوتی ہیں کہ ان کا چھپانا ہی مناسب ٹھہرتا ہے اس طرح وہ اپنی ذہنی تخلیق کو بیہودہ، ممنوع اور شرمناک سمجھ کر سینے میں دبائے پھرتا ہے[1]۔

تکلیف معاف، آئیے لگے ہاتھوں اس بیداری کے سپنے کی چند ایک بنیادی خصوصیتوں کی جانچ پڑتال کر لیں۔

اوّل۔ آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ مطمئن اور شادکام افراد اس ذہنی تخلیق سے کچھ دور ہی رہتے ہیں۔ یعنی یہ شے ناکام اور غیر مطمئن افراد ہی کے ذہنوں میں پھولتی پھلتی ہے اس خصوصیت کی تہ میں انسانی ذہن کا مندرجہ ذیل قانون مضمر ہے۔ ایک ادھوری خواہش اپنی تکمیل کے لئے تخیل کے آزاد میدان میں بلا روک تمام گھوڑے دوڑاتی پھرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی ذہن کی ہر تخیلی تصویر اس کے لئے چند غیر تسلی بخش حقیقتوں میں تسلی کے رنگ بھرتی ہے یعنی ایک سیر شدہ فرد کی نسبت ایک بھوکا فرد خیالی پلاؤ پکانے کی طرف جلدی متوجہ ہوگا۔

دوم۔ یہ تخیل گر خواہشیں ہر فرد کے اپنے کردار، ماحول اور صیغہ تانیث و تذکیر کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔ نفسیات کے طالب علم ان جملہ خواہشوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک تو شخصی کامرانی کی وہ خواہشیں جو ایک فرد کو عزت اور بزرگی کے مسند پر بٹھانے کے فرائض سرانجام دیتی ہیں اور دوسرا، جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی خواہش۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جوان عورتیں ایسے ہوائی قلعوں کی بنیادیں زیادہ تر جنسی خواہشات پر رکھتی ہیں اور جوان مرد شخصی کامرانی اور خودی کی خواہشوں کو جنسی خواہشات سے کچھ ہیٹا نہیں سمجھتے پھر بھی ہم آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھ سکتے کہ اس فنی تقسیم پر کچھ زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اکثر اوقات دونوں قسم کی خواہشیں آپس میں کچھ عجب طرح سے گھل مل کر خیالی پلاؤ کو ایک قسم کی کھچڑی بنا دیتی ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ شخصی کامرانی کی مجرد ترین خواہش کی کسی نہ کسی تہ میں ضرور ایک عدد عورت پوشیدہ ہوتی ہے۔ مثلاً یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ تمام کامیابیاں فلاں فلاں عورت کے قدموں پر نچھاور کی جائیں گی۔

سوم۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ ان خواہشوں سے پیدا ہونے والی تخیلی دنیائیں ہمیشہ ایک ہی قسم کے سانچوں میں ڈھل کر نکلتی ہیں۔ معاف کیجئے گا۔ یہ آپ کی زیادتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بیتے دنوں کا سرکتا آنچل "ذہنی تخلیق" کو نت نئے روپ بخشتا رہتا ہے اور آئے دن کے واقعات اس کے ماتھے پر وقت کی مہر ثبت فرماتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں "بیداری کے سپنوں" اور "وقت" کے تعلقات کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سرسری طور پر آپ اتنا سمجھ لیں کہ ایک بیداری کا سپنا ایک ہی وقت میں تین زمانوں کے درمیان چہل قدمی کرتا ہے۔ پہلے تو یہ ذہنی فعل (زمانہ حال) کے کسی واقعہ سے پیدا ہو کر جدید ترین نقوش سے تعلق استوار کرتا ہے پھر اُسکی آوارگی کی حدیں (زمانہ ماضی) کی طرف بڑھتی ہیں اور وہ "پرانی تسکین" یعنی بچپن کے اس دور کی سنہری یادوں کا رُخ کرتا ہے جب اُس کی یہی خواہش پوری ہوئی تھی۔ سب سے آخر میں وہ اپنے لئے (زمانہ مستقبل) میں ایک ایسی جگہ پیدا کر دکھاتا ہے جہاں اُس کی یہی خواہش تکمیل کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوتی ہے۔

یہ ہے وہ "خواب بیداری" جو ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو بیک وقت پنہاں خواہش کے صرف ایک ہی دھاگے میں پرو لیتا ہے۔ مثال: آپ کسی مفلوک الحال نوجوان ادیب کو ایک مشہور ماہنامہ کے منیجر کے نام ایک تعارفی خط دیتے ہیں۔ راستہ چلتے چلتے وہ ایک مناسب حال خواب بیداری سے دوچار ہوتا ہے۔ اس بیداری کے سپنے کے خدوخال بلاشبہ کچھ ایسے ہوں گے، وہ اس ماہنامہ میں نائب مدیر کی جگہ رکھ لیا جاتا ہے، منیجر اسکے کام سے بیحد خوش ہوتا ہے، رفتہ رفتہ اس کے بغیر ماہنامے کا چلنا محال

[1] طرار طبیعتوں کو ابتک یہ سوال سوجھ چکا ہوگا کہ آخر اتنی احتیاط کے باوجود یہ بیداری کے سپنے ہم تک کیسے پہونچ جاتے ہیں۔ اسکے جواب میں آپ نفسی مرضوں کے علاج کی ضرورت کو اس انکشاف کی ایجادی والدہ ماجدہ سمجھکر یہ باور کر لیجئے کہ ذہنی امراض میں مبتلا افراد اپنے علاج کیلئے اپنے پوشیدہ سے پوشیدہ حالات بے نقاب کر دیتے ہیں اور اگرچہ ان معلومات کا بہترین ذریعہ یہی دماغی مریض ہیں تاہم گاہے ماہے صحتمند افراد بھی ہمارے اخذ کردہ نتیجوں پر مہر توثیق ثبت فرماتے رہتے ہیں۔

ہو جاتا ہے۔ وہ مدیر بن نکلتا ہے۔ منیجر اپنی قبول صورت اکلوتی لڑکی اور ماہنامہ اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کی زیر نگرانی یہ ماہنامہ بے حد ترقی کرتا ہے۔

——— یہ ہے وہ طور طریقہ جس سے یہ ناکام ادیب اپنے عہد ماضی کی چند ایک خوشگوار یادوں کو زمانہ حال کے کسی ایک واقعہ کی ترغیب سے عہد مستقبل پر چسپاں کر دیتا ہے اور اس طرح وہ بآسانی اپنے بچپنے کے چھاتے ہوئے گھر، محبت کرنیوالے لواحقین اور شدید جذبات کی بہترین آماجگاہ (محبوب بیوی) کو عہد مستقبل میں حاصل کر لیتا ہے۔

چہارم: خواب اور خواب بیداری ایک دوسرے سے کچھ اتنے قریب ہیں کہ ان کے تعلقات پر کچھ لکھنا ہی پڑتا ہے۔ عرض کیا ہے کہ ہمارے خواب اصل میں ایک قسم کے تخیلی عکس ہیں جن کو صرف تعبیر کے رنگوں سے اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ان کے پس پردہ اکثر ایسی خواہشیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو صرف بھیس بدل کر ہمارے ذہن تک پہونچ سکتی ہیں۔ اس لئے یہ بھیس بدلتے عکس ذرا مشکل ہی سے سمجھ آتے ہیں، اگر یہ فنی مشکلیں راہ میں نہ ہوتیں تو آپ بھی نفسیات کے طالب علموں کے ہم خیال ہو کر یہ کہہ اٹھتے کہ "خواب" اور "خواب بیداری" تکمیل خواہش کے دو توام مجسمے ہیں اور بس۔

یہ تو تھی خواب بیداری کی چھان بین اب روئے سخن تخیل گر فنکاروں کی طرف پلٹتا ہے۔ یہ طبقہ غیر ارادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ اہلِ قلم ہیں جن کو اپنا مواد ایلیڈ، شاہنامہ اور رامائن کی طرح پہلے ہی سے تیار مل جاتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو اپنا مواد خود تعمیر کرتے ہیں۔ ہم پہلے اس دوسرے طبقے کا جائزہ لیں گے۔ آپ دل ہی دل میں چند ایک مشہور مثنویوں، قصّوں اور کہانیوں پر نظر ثانی کریں۔ آپ کو سولسوے ان سب میں ایک نمایاں کردار نظر پڑے گا۔ یہ کردار پڑھنے لکھنے والوں کی جملہ توجہات کا مرکز ہوگا اور اس کے لئے ہر مناسب اور نامناسب طریقے سے آپکی ہمدردی حاصل کی جائے گی۔ یہ ہیرو (Hero) آپ کو خوش قسمتی کی انتہائی بلندیوں پر متمکن نظر آئے گا۔ اگر پہلے باب کے اختتام پر یہ کردار زخموں سے چُور، خون میں شرابور دکھایا جائے گا تو دوسرے باب میں صحت کی شاہراہ پر گامزن ہوگا۔ اگر پہلی جلد میں اس کا جہاز، کشتی، موٹر، یا گھوڑا پرزے پرزے ہوتا دکھائی دے گا تو دوسری جلد اُسے حیرت انگیز طریقوں سے صحیح سلامت بچا لیگی۔ اگرچہ بلاؤں سے محفوظ رہنے کی یہ قوت حقیقی زندگی کے بہادروں میں بھی پائی جاتی ہے لیکن ہمیں شک ہے کہ یہاں یہ قوت اپنے پیچھے "ایغو" کو لئے ہوتے ہے اور یہی حضرتِ "ایغو" جملہ بیداری کے سپنوں اور قصّوں کے بہادر بن نکلتے ہیں۔ ہمارے اس شک کو یقین تک پہونچانے کے لئے چند ایک امور ملاحظہ

ہوں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کہانی کی ہر عورت اس بہادر سے محبت دکھائی جاتی ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے یہ عشق آور قوت حقیقی میں کچھ کم ہی دیکھی جاتی ہے۔ البتہ خواب بیداری میں ایسے حالات دوچار ہونا کچھ تعجب انگیز نہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی خیال ہوگا کہ حقیقی دنیا کے رنگا رنگ اطوار اور عادتوں کے مجموعوں کو ایسی کہانیوں میں صرف دو حصّوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ ایک اچھا حصہ جو "ایغو" کے رجحانات کی مدد کرتا ہے، دوسرا بُرا حصّہ جو اُس کے رقیب اور دشمن پیش کرتا ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ تخیلی تصانیف اکثر اوقات حقیقی خواب بیداری سے بہت پیچھے جا پڑتی ہیں۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تغیر و تبدیل کی یہ مسلسل کیفیت بھی گہری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ آپ میں سے اکثر حضرات جدید نفسیاتی کہانیوں کا اتو کھا اسلوب اور طرز بیان بھی ضرور ملاحظہ فرما چکے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ایسی کہانیوں میں صرف ایک کردار کا باطنی مطالعہ کیا جاتا ہے اور باقی کرداروں کو اس ایک کردار کی آنکھ سے جانچا پرکھا جاتا ہے۔ تشریحاً عرض ہے کہ طرز بیان تخیل گر فنکاروں کی نویلی اپج کا نتیجہ ہے یعنی وہ اپنی ذاتی جانچ پرتال کے لئے اپنے "ایغو" اس کے چند در چند متضاد رجحانات میں تقسیم کر کے ہر ایک حصّہ کو علیحدہ کر دیتے ہیں۔ ایک اور قسم کے افسانوں میں ہیرو ایک طرف بیٹھا دوسرے کرداروں کی مشکلات اور تکالیف کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اسکی وجہ سمجھنے کیلئے آپ ایک ایسے افراد کا پتہ لگائیں جو اس تماشہ گاہِ ہستی میں اپنے لئے ایک تماشائی سے زیادہ جگہ نہیں بنا سکے۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ اتنی چھان بین کے بعد اب آپ "ادھورے خواب" اور "خواب بیداری" کے گہرے تعلقات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اور بیتاب ہیں کہ کسی مصنّف کی زندگی اور اس کی تصنیف کے تقابل سے جلد از جلد لطف اندوز ہوں۔ ہم آپ کو اس "کار ثواب" سے زیادہ دیر روکنا مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ آپ کی اجازت سے مذکورہ بالا بحث سے پیدا ہونے والا اُصول لفظوں کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں تاکہ یاد رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ حقیقی زندگی کا کوئی سخت متاثر کن واقعہ مصنّف کے عہد ماضی (عموماً بچپن) کی کسی یاد کو پھر سے بیدار کر دیتا ہے۔ یہ بچپنے کی یاد ایک ایسی خواہش پیدا کر دکھاتی ہے جس کی تکمیل کے لئے ایک عدد تصنیف کا معرض وجود میں آنا لازم ٹھہرتا ہے۔ چنانچہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر تخیلی تصنیف میں زمانہ حال کا محرک حادثہ اور زمانہ ماضی کی یاد اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہوتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگ بحث کی سرگرمیوں میں ان اہلِ قلم حضرات کو فراموش کر بیٹھے ہیں جو فردوسی، ہومر اور بالمیک کی طرح اپنا تخیلی قصر خود آپ تعمیر نہیں کرتے۔ استعارۃً کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ پرانی شراب نئے ساغروں میں انڈیلتے رہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم ان کی تخیلی آزادیوں کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ایک تو انہیں مضمون کے عنوان اعلیٰ کے انتخاب کی پوری پوری آزادی حاصل ہوتی ہے پھر وہ طرح طرح کی انفرادی اور ضمنی تبدیلیوں کے واحد مالک ہوتے ہیں۔ بھلا آپ کو یہ بات یاد دلانے کی کیا ضرورت ہے کہ ان کے مواد کا بیشتر حصہ نسلی نوشتوں کے ان ابواب سے مستعار لیا جاتا ہے جو جن، پری، دیوتا اور قومی بہادروں کے کارناموں سے پٹا پڑا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ میدان نفسیات کی روشنی سے ابھی پوری طرح اجاگر نہیں ہوا اور ہم ابھی تک اس کے کونے کونے سے متعارف نہیں ہو سکے۔ پھر بھی یہ تو ایک فیصلہ شدہ امر ہے کہ دیومالا پوری کی پوری قوم کی خواب بیداری کا نتیجہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ انہیں نوعمر انسانیت کے کئی ایک صدیوں کی وسعت پر پھیلنے والے سپنے سمجھ لیجئے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر یہ فن کار کون کون سے طریقے بروئے کار لاتے ہیں جو ہم دگم سے جذبات اور جاذبیت کے اتھاہ ساگر میں کود پڑتے ہیں۔ ہمارا محدود علم اور ہماری مختصر معلومات ہمیں تفصیل وار بات کہنے کی اجازت نہیں دیتی لہٰذا ہم چند ایک مختصر اشاروں پر اس مقالہ کو ختم کریں گے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ خواب بیداری کو پوشیدہ رہنے کی عادت ہے اور تمام افراد اپنی اس ذہنی تخلیق کو باہر کی ہوا تک نہیں لگاتے لیکن شاید ہم اوپر یہ نہیں کہہ سکے کہ اگر کوئی باہمت فرد جرأتِ رندانہ سے کام لیکر اپنے خواب بیداری بیان کر بھی دے تو وہ ہم میں کوئی خاص دلچسپی پیدا نہ کر سکے گا بلکہ اس کی شیخ چلی جیسی باتیں ہمیں از حد ناگوار اور بارِ خاطر محسوس ہوں گی۔ ہاں اگر کوئی اہلِ قلم انہی باتوں کو لکھے تو ہم ان سے سو فی صدی دلچسپی اور لطف حاصل کریں گے۔ یہ سحر طرازی ہر ایک تخیل گر فنکار کا ذاتی اور شخصی راز ہے اور ہمیں ہرگز ہرگز حق نہیں پہنچتا کہ کسی کے رازِ خلوت طشت از بام کرتے پھریں۔ ہاں نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں اتنا تو ضرور کہا جا سکے گا کہ یہ ادیب لوگ خواب بیداری کے "انائی" عناصر کو مناسب تبدیلیوں سے کچھ ہلکا کر دیتے ہیں۔ اور پھر ہماری توجہ کو اور بھی زیادہ اپنی طرف کھینچنے کے لئے ہمیں ایک ایسا ادبی سبز باغ دکھاتے ہیں جس میں ہر طرف لطیف جمالیاتی سرور اور دلفریب فنی انبساط کی کیاریاں ہی کیاریاں نظر پڑتی ہیں۔ وہ اپنا جادو جگانے کے لئے ہمیں ایک انبساطی پیمانہ پیش کرتے ہیں جن کی موجودگی انبساطِ فراواں سے دریچوں کے از خود کھل جانے کی ضامن ہوتی ہے۔ یہ انبساط پیشیں کے ہتھکنڈے ہیں اور اس طرح ہم لوگ ادب کے سہارے اپنے سر سے نفسی کشمکشوں کے بوجھ اتار کر لطف و سرور کی وادیوں اتر جاتے ہیں۔ اس انبساطِ فراواں کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ فن کار ہمیں ایک ماحول میں لے جاتے ہیں جہاں ہم اپنے خواب بیداری کو بلاخوف و خطر منصۂ شہود پر جلوہ گر دیکھ سکتے ہیں اور بغیر کسی شرم یا ممانعت کے اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ——— شاید!

غلام یعقوب انور

فریاد

یہ وسعتِ بے کنار جس میں
ہر لحظہ بدل رہا ہے پہلو۔
ہنگامۂ خاک و آتش و آب
اک بار سمٹ کے پیس ڈالے
مجھکو مرے جسمِ ناتواں کو۔

* * *

صدیوں کے یہ گردباد، شعلے
پگھلی ہوئی دھات، ریت، پتھر
امڈے ہوئے بے پناہ سیلاب
اور سر بفلک مہیب تودے
ٹکرائیں ——— مرا نشاں مٹا دیں!

* * *

اے گردشِ روزگار لیکن ———
یہ ذہن کا اضطراب کیا ہے؟
اک کھوئے ہوئے ندیم کی یاد
اٹھے مرے دل میں کرب بن کر
اور آنکھ سے بہہ سکے نہ آنسو!

مسعود پرویز
(لے۔ آئی آر۔ لاہور)

من دی کرچیاں

افراد

جانوں۔ ایک الھڑ دوشیزہ جس کے خوابوں کے غنچے ابھی پوری طرح نہیں چٹکے۔
گلابو۔ ایک لڑکی جو دوشیزگی کے فردوس سے کچھ دور نکل چکی ہے۔
زماں۔ ایک نوجوان۔ (جانوں کے سپنوں کا راجہ فیض کا ہم نوالہ دوست)

منظر۔ گاؤں سے کچھ دور ایک وسیع چراگاہ۔ جس پر لہراتی ہوئی پگڈنڈیوں کا جال سا بچھا ہوا ہے۔ کہیں کہیں اکا دکا جھاڑیاں پڑی سو رہی ہیں۔ ایک پگڈنڈی پر جانوں اور گلابو ہولے ہولے چلی آ رہی ہیں۔ ان کے ٹخنوں سے جھانجنیں لپٹی ہوئی ہیں اور بھری بھری باہوں میں نیلی پیلی کانچ کی چوڑیاں ہیں۔

گلابو۔ بہت سستی ہو؟ دیکھو، کہیں سمٹتے سمٹتے غائب نہ ہو جاؤ ہوا میں!

جانوں۔ بھئی مجھ سے تمہاری طرح اینڈ اینڈ کر نہ چلا جائے۔ میں کوئی پہلوانی تھوڑی ہوں، مسکین سی لڑکی ہوں۔ اللہ نے حیا کی دولت دے رکھی ہے۔ تمہاری تو غصیلی بلی کی سی پھٹی پھٹی لال لال آنکھیں ہیں اور تم تو سر راہ چلتے کو یوں گھور گھور کر دیکھتی ہو جیسے بس چلے تو اٹھا کر من میں بٹھا لو!

گلابو۔ دیکھو جانوں۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، حیا اور شرم کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ ایسی چال میں بھلا کون سی حیا ہے کہ تم چودہ برس کے سن میں کبڑی ہوتی جا رہی ہو۔ اری یوں گردن کھینچ کر رکھو۔ یوں سینہ تان کے چلو، یوں باہیں ہلاؤ۔ اور آنچل کو باہوں سے یوں لہراؤ، جیسے کوئی اکیلی دکیلی بدلی ہوا پر سوار تیرتی جا رہی ہو! تم عورت ہو گئی۔ اور عورت کو اپنے عورت پن ڈبیا میں بند کر کے نہیں رکھنا چاہیئے۔

جانوں۔ بلکہ ساری دنیا کے سامنے کھول کر ڈال دینا چاہیئے، ہے نا؟ چل ہٹ دور رہو۔ تم تو ان پچھلے دنوں سے کچھ ایسی چنچل نظر آ رہی ہو کہ جیسے چر چر بولتی ہوائیں اڑ جاؤ گی، لنڈوری چڑیا کی طرح!

گلابو۔ اری مجھے لنڈوری چڑیا کہہ دیا؟ اور جو مجھ سے پوچھو تو تم دم سنبھالتی ہی ہو! تم بوڑھی چڑیا ہو۔ تم مسسی بلی ہو، سمجھیں؟ تم — تم — (ہلکی آواز ہے) اری تمہاری پتلیاں کیوں چمک اٹھیں؟ روٹھ گئیں؟ میری جانوں تو اک بھیگی سی ڈالی ہے جو لنڈوری چڑیا کے اڑ جانے سے ہوائیں دھیرے دھیرے ہلکورے کھا رہی ہو۔ (کچھ وقفے کے بعد) کدھر دیکھ رہی ہو تم؟

جانوں۔ زماں آ رہا ہے۔

گلابو۔ تمہارے منگیتر کا ہجولی ہے نا، سنا ہے اسکے پاس چٹھیاں آتی ہیں فیض بھیا کی، کچھ پوچھ لیا کرو نا، اس سے!

جانوں۔ میں کیسے پوچھوں۔ اسے دیکھ کر تو میری زبان سن ہو کر رہ جاتی ہے بکھت!

گلابو۔ میں پوچھوں گی۔ پشاور پار رہتا ہے تمہارا منگیتر، اور تمہیں اس کی اتنی بھی فکر نہیں کہ وہ چھٹی کاٹ کر جانے کے بعد کیسا ہے، کس چھاؤنی میں ہے، کب آئے گا، تم تو عورت ہو مٹی کی، تم تو پتھر ہو اللہ قسم — اللہ قسم تم تو کاٹ کی گڑیا ہو!

جانوں۔ اری تم کیا جانو، تمہیں کیا معلوم کہ میرے من میں کیسی کیسی آندھیاں اٹھتی ہیں۔

گلابو۔ لے ذرا پرے ہٹ، مجھے بھی نہ اڑا لے جائیں یہ آندھیاں!

جانوں۔ تم مذاق کرتی ہو۔

گلابو۔ تم سے؟ (ہنستی ہے) تم سے مذاق؟ (سنجیدہ ہو کر) تم سے مذاق کرنے کا بھلا مجھے کیا حق حاصل ہے، میں تو ایک لنڈوری چڑیا ہوں جو تمہارے پاس دانہ دنکا چگنے آ جاتی ہے!

جانوں۔ روٹھ گئیں؟

گلابو۔ تو کیا تمہیں گلے لگا لوں؟ ادھر منہ سے بات نکلی ہے ادھر ہونٹ لٹک جاتے ہیں تمہارے۔ چھوئی موئی ہو تم تو — تم تو بس جھاگ کا بلبلا ہو!

جانوں۔ (نہایت غمگین لہجے میں) بہن، مجھے بہت نہ چھیڑا کرو، تم نہیں جانتیں کہ چند روز ہوئے میرے من کے آئینے میں بال آ گیا ہے! بس اب تھوڑی سی گھڑیاں باقی ہیں، کرچی کرچی ہو جائے گا یہ کھلونا! (دکھ میں سنک

بھر کر بیچ گرا دی ہے) اس دھول میں مل کر دھول بن جائے گا کمبخت! ـــ تم تو بات بات پر مذاق کرتی ہو مجھ سے، اری پگلی، کیا میری مسکراہٹوں پر تمہیں ناامیدیوں کا غبار پھیلا ہوا دکھائی نہیں دیتا! کیا تمہیں میری آنکھوں کی گہرائیوں میں مسرتوں کی بجھی ہوئی شمعیں دھواں چھوڑتی نظر نہیں آتیں؟ ـ نادان! ـــ شریر! (اس کی آواز بھرا جاتی ہے اور وہ ایک گنجان جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ جاتی ہے۔)

(گلابو حیرت زدہ ہو کر آنکھیں جھپکاتی ہے، اور اسکے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہتی ہے۔)

گلابو۔ مجھے بھوت بتا جائیں تمہارے من کا حال؟ تم تو ہمیشہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے ٹال دیتی ہو مجھے۔ میں تو تمہارے ہاں آنکھوں تو شکنیں پڑ جاتی ہیں تمہارے اس چاند سے ماتھے پر، اور سائے چھا جاتے ہیں، تمہاری شفاف کٹوری جیسی آنکھوں پر ـــ میں تو خواہ مخواہ تم سے چھیڑ چھاڑ رہی ہوں، مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم یہ خاک جھاڑنے کے لئے دامن جھٹکنا چاہتی ہو، تمہاری اور بہت سی سہیلیاں ہیں، جنہیں تم اپنے دل کی دھڑکنوں کی کہانیاں سناتی ہو گی۔ میں نگوڑی کس شمار میں ہوں! میں تو چمارن ہوں چمارن ـــ میں تو اللہ قسم، بھنگن ہوں تمہاری نظروں میں! ـــ کھل کھیلو اپنی نئی سہیلیوں سے!

جانوں۔ کون ہیں ری میری سہیلیاں؟

گلابو۔ (انگلیوں پر گنتی ہے) چھاتو، راتی، جنت، اور وہ امامی ـــ اور ہاں وہ آشی! اس سے تو آجکل بڑے شوق سے پیار کی پینگیں بڑھا رہی ہو۔

جانوں۔ کس سے؟

گلابو۔ آشی سے!

جانوں۔ آشی سے؟ اری تمہارا دماغ تو نہیں چکرا گیا۔ آشی سے پینگیں بڑھا رہی ہوں میں؟ ـــ اری وہی تو میری نیندوں کی سوتن ہے۔

گلابو۔ سوتن ہے؟

جانوں۔ مان لو، اس کٹنی کے دم سے تو میری آس کی کومل کلیاں کملا رہی ہیں ـــ!

گلابو۔ اللہ قسم، مجھے کچھ معلوم نہیں، میں کچھ نہیں جانتی۔

(جانوں سر اٹھا کر کہیں دیکھتی ہے اور پھر سرگوشی کرتی ہے۔)

جانوں۔ کوئی آ تو نہیں رہا؟

گلابو۔ (ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) وہ تو وہیں جھاڑی کے پاس کسی سے باتیں کر رہا ہے۔

جانوں۔ تو لو سنو، ذرا دل تھام لو اپنا، کلیجہ نہ کٹ جائے تمہارا!

گلابو۔ ہائے ہائے، میری تو رگیں اینٹھ رہی ہیں، اللہ قسم کیسی یہ پہیلی ہے کرتی ہو تم، کیا قیامت ٹوٹ پڑی تم پر؟

جانوں۔ (ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے) وہ جو ہے نا ـــ وہ ـــ!

گلابو۔ تمہارے گال گلاب کے پھول کیوں بنے جا رہے ہیں، جانوں؟ وہ کون ـــ؟

جانوں۔ وہ ـــ اری جانتی تو ہو اسے!

گلابو۔ فیض بھیا؟

جانوں۔ ہاں ـــ وہ جو فیض ہے نا! اس کا باپ بڑا خناس ہے، بڑا بدذات ہے! اول اول مجھے گلیوں میں ملتا تھا نا تو یوں پچکارتا تھا مجھے، یوں سر پر ہاتھ پھیرتا تھا، جیسے بس میں ہی اس کے جینے کا سہارا ہوں۔

گلابو۔ ہاں، وہ تو بڑا لاڈ پیار کرتا ہے تم سے، اور بیچارا کیوں نہ کرے، تم اگر بیٹے کی من کی رانی جو بننے والی ہو!

جانوں۔ (جل کر) رانی بننے والی ہوں! ـــ بات سنتی نہیں، اور اپنی ہی ہانکے جا رہی ہے۔

گلابو۔ تم کچھ کہو بھی، تو سنوں، منہ بسورے منمنائے جا رہی ہو تم!

جانوں۔ وہ بوڑھا پچھلے دنوں سے سٹھیا گیا ہے، چند روز ہوئے میرے ابا سے الجھ پڑا چوپال پر۔

گلابو۔ تمہارے ابا سے الجھ پڑا؟ لیکن میں نے تو اسے ایک دن تمہارے ابا کے جوتے سیدھے کرتے دیکھا تھا۔ ایک بار پیلے پیلے پھلوں کا ٹوکرا لے آیا تھا شہر سے، اور کسی کمین سے اٹھوانے کی بجائے خود لے آیا تھا، تمہارے گھر ـــ تمہارے بھیا کی شادی پر میراسیوں کو مالا مال کر دیا تھا اس نے۔

جانوں۔ لیکن ان دنوں آشی جو پردیس میں تھی۔

گلابو۔ وہ دیس میں آئی تو کیا غضب ہو گیا؟

جانوں۔ میرے ابا ایک روز چوپال میں بیٹھے تھے، فیض کا باپ بھی وہیں موجود تھا۔ بھیا کے بیاہ پر ابا نے جس ساہوکار سے تین سو روپے قرض لئے تھے وہ کمبخت وہاں آ دھمکا، اور بھرے چوپال میں ابا کے آگے جھولی پھیلا دی۔

گلابو۔ جھولی پھیلا دی؟

جانوں۔ ہاں، بولا مجھے میرا روپیہ واپس دو، کیونکہ آجکل جنگ کی وجہ سے بیوپار میں گھاٹا ہو رہا ہے۔

گلابو۔ پھر؟

جانوں۔ پھر کیا، ابا کی آنکھیں جھک گئیں، ہونٹ کاٹ کر رہ گئے وہاں سے اٹھے اور ادھر قصبے میں ایک اور ساہوکار سے قرضہ لیکر اس کی جھولی بھر دی، ـــــــــ اور جب جھولی بھر چکے تو دانت پیس کر ساہوکار کے وہ گھونسہ لگایا کہ وہ لڑھکتا ہوا گلی کی پرلی طرف جا گرا اور بچے

اُکی جھولی سے نکل کر گھروں میں جا گئے

گلابو۔ (حیران آواز میں) پھر؟

جانوں۔ پھر کیا، اُدھر سے فیض کا باپ آ رہا تھا، اُسے پتا ہے۔ کہنے لگا، تم نے گاؤں کے ساہوکار کی پگڑی اچھالی ہے اور ـــــ

گلابو۔ (بات کاٹ کر) ساہوکار پگڑی تو پہنتا نہیں!

جانوں۔ اری یہ ایک کہاوت ہے، وہ کہنے لگا کہ تو نے گاؤں کے ساہوکار کی عزت پر ہاتھ مارا ہے، اور اس طرح گاؤں کے سب سفید پوشوں کی ناک کاٹ ڈالی ہے، اور پھر غضب دیکھو، گلابو بہن، کہ کمبخت نے دھمکی بھی دی میرے ابا کو! بولا، میں گاؤں کے سب بدمعاش ساتھ لیکر تجھے غلیظ گھوروں میں گھسیٹتا پھروں گا، اور تیرا بھیجا نکال کر گدھوں کے آگے پھینک دوں گا ـــــ اللہ کرے منہ جل جائے اُس کا!

گلابو۔ لیکن فیض کے باپ کا ساہوکار سے کیا رشتہ ہے؟

جانوں۔ اری اُس نے بھی پانچ سو روپیہ قرضہ لے رکھا ہے نا۔ فیض کے بیاہ کے لئے، اس کی خاطرداری منظور تھی، ڈرتا تھا نا، کہ کہیں بھرے چوپال میں وہ اس سے بھی رقم مانگ بیٹھا تو ساری عزت وزت چوپٹ ہو جائیگی۔

گلابو۔ لیکن اُس نے یہ نہ سوچا کہ جس بیاہ کے لئے وہ تمہارے ابا سے اُلجھ رہا ہے وہ صرف تمہارے ابا کی مرضی پر موقوف ہے، فیض سے تو تمہاری پکی منگنی ہو چکی ہے۔

جانوں۔ اری سنو تو سہی ـــــ گھر آ کر میرے ابا نے اُسے کہلوا بھیجا، کہ چونکہ خاندانی عزت کا پاس ہے، اس لئے میں منگنی تو فی الحال نہیں توڑتا، البتہ میرے گھر آ کر مجھ سے معافی مانگ جا، ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا!

گلابو۔ اُس نے کیا جواب دیا؟

جانوں۔ اُس نے کہا، کہ معاملہ بگڑتا ہے تو بگڑ جائے، میری بلا سے میں اس سے پہلے ہی تیری گھناونی صورت والی بیٹی کے بجائے آشی کے باپ سے بات چیت طے کر چکا ہوں، اور یہ بھی کہا، گلابو، کہ آشی اس گاؤں کی حور ہے!

گلابو۔ اری وہ آشی! حور بنا ڈالا اُسے! اُس کی گردن دیکھی ہے کبھی؟ ـــــ بالکل بطخ کی طرح اور میری مٹھی سے بڑی ناک ہے اس کی ـــــ اس مٹھی سے بڑی! اللہ قسم کرتارو کی دکان جتنی ناک ہے ـــــ اور پھر جب بلاق پہن کر نکلتی ہے تو بچے اُس کے پیچھے ناچ ناچ کر تالیاں بجاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قبرستان سے ڈائن نکل آئی ہے!

جانوں۔ تمہاری نظروں میں وہ بھدی ہے، صرف اس لئے کہ تم میری پیاری سہیلی ہو، ورنہ اس بوڑھے کھوسٹ سے پوچھو، کہتا ہے اُس کے لئے جاپانی ریشم کے ایسے ایسے کپڑے خریدا ہوں کہ دیکھے سے تعلق ہو۔ منہ روتی ہیں بھی پیاسے کی طرح تڑپتے رہتے ہیں!

گلابو۔ لیکن وہ سب کچھ تمہارے لئے ہو رہا ہے، سب کچھ تمہارا ہے، وہ اور بازو بند اور پازیب اور وہ چھلے، جھمکے، بالیاں اور ـــــ

جانوں۔ رہنے بھی دو، کیوں میرے کلیجے پر سنپولیاں لوٹاتی ہو۔ آگے بھی میرے ابا غصے سے دیوانے ہو گئے، لپک کر لٹھ اٹھایا اور نکل بھاگے فیض کی طرف، وہ تو خیر ہوئی کہ بھیا انہیں پکڑ لائے، ورنہ وہ خون خرابہ ہوتا کہ فیض کے ابا کو اپنی دوزخی نانی یاد آ جاتی۔

گلابو۔ پھر؟

جانوں۔ پھر کیا، دوسرے دن فیض آ گیا۔ جس دن کی چھٹی پر میں ایک روز پنگھٹ پر جا رہی تھی تو وہ رستے میں مجھے مدرسے کے سائے میں طاہر لے نکل کیا اُس سے، تو میرا شانہ تھپک کر بولا پگلی، اری اُس آشی کو دیکھ تو جی متلانے لگتا ہے میرا، میں صرف تمہارا ہوں، دنیا بھر میں صرف تمہارا مجھے تو نہ ملی، تو کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں گا۔ سر پھوڑ لونگا دیواروں سے چھرا بھونک لونگا اپنے پیٹ میں ـــــ یہ کہتا تھا وہ!

گلابو۔ اچھا ـــــ پھر؟

جانوں۔ پھر کیا ـــــ بولا میں معاملے کو سدھارنے کی کوشش میں مصروف ہوں، ابا بھولے بھولے سیدھی راہ پر آ رہے ہیں، اور ـــــ کہتا تھا ـــــ!

گلابو۔ کیا کہتا تھا؟

جانوں۔ کہتا تھا، کہ وہ علاقے کے سب سے اچھے شہنائی بجانے والے بلائے گا، اگلے ساون میں اور مجھے ڈولی کے بجائے من میں بٹھا کر اپنے گھر لے جائے گا۔

گلابو۔ یہ بات ہے تو تم اتنی گھبرا کیوں رہی ہو؟

جانوں۔ اری مجھے تو غصہ آ رہا ہے اُس آشی پر ـــــ میری سہیلی بنی پھرتی رہی نوراں دھوبن نے مجھے بتایا ہے کہ وہ تو مدت سے فیض پر مرتی ہے، اُدھر قصبے میں ایک سنیاسی سے ٹونا لے آئی ہے ـــــ پورے سات دن اُدھر قبرستان میں ایک دھنسی ہوئی قبر میں بیٹھی کچھ پڑھتی رہی، اور ساتویں روز ـــــ وہ جس روز بڑی زبردست آندھی اور بارش آئی تھی، جب بجلی گری تھی ہمارے کھلیان کے پاس ـــــ بس اس روز فیض کی ڈیوڑھی میں جا کر پھونکیں مار آئی ـــــ اس کے دوسرے روز یہ جھڑپ ہو گئی۔ میں تو ڈرتی ہوں کہیں میرے فیض پر اس ٹونے کا سایہ نہ پڑ جائے! ـــــ سنتی ہوں بڑا کالا جادو ہے اس سنیاسی کے پاس، اللہ کرے غارت ہو جائے وہ، سانپ ڈس لے اُسے!

گلابو۔ تمہارا فیض ایسا بھولا نہیں، کہ تو نے ٹونکوں کے بس میں آ جائے، وہ تمہارے بغیر ساری دنیا کو اندھیر سمجھتا ہے، مجھ سے یہی بات کہی تھی اس نے ـــــ وہ جن دنوں تمہاری منگنی نہیں ہوئی تھی، اور تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے پنگھٹ کے کنارے کڑکتی دھوپ میں دن دن بھر کھڑا جلتا رہتا تھا!

جالوں۔ ہاں، مجھے تو اس کی محبت میں اتنا یقین ہے کہ اگر یہ سورج پورب کے بجائے پچھم سے کود نکلے، اگر ہمارے گاؤں والی ندی نیچے جانے کے بجائے اوپر کو بہنے لگے، تو پھر بھی مجھ سے وہ آنکھیں پھیرنے کا نہیں! ـــــ اری سن، کوئی آ رہا ہے۔

(گلابو اُٹھ کر دیکھتی ہے)

گلابو۔ (ہولے سے) تم یہیں دبکی بیٹھی رہو، زماں آ رہا ہے، میں اس سے یہ ساری باتیں پوچھتی ہوں۔

(گلابو جھاڑی کے عقب میں جا کر پکارتی ہے)

گلابو۔ زماں بھیا!

زماں۔ (دور سے) اری کہاں پھر رہی ہے تو اس وقت؟

گلابو۔ ادھر بکریاں ڈھونڈنے آئی تھی بھیا۔ ذری بات تو سن میری۔

(زماں، گلابو کے قریب آ جاتا ہے)

گلابو۔ کدھر جا رہا ہے تو؟

زماں۔ قصبے سے شکر اور تیل خریدنے۔

گلابو۔ کس کے؟

زماں۔ فیض کے ابا کے،

گلابو۔ کس لئے؟

زماں۔ تجھے معلوم نہیں؟

گلابو۔ نہیں، مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔

زماں۔ بھولی بنتی ہے، بچہ بچہ جانتا ہے اور تجھے معلوم نہیں۔

گلابو۔ اللہ قسم، مجھے نہیں معلوم!

زماں۔ آج فیض اور آشی کی منگنی ہونے والی ہے نا، شکر اور تیل بانٹے جائیں گے۔

گلابو۔ (سہمی ہوئی آواز میں) منگنی ہونے والی ہے؟ فیض اور آشی کی منگنی ہونے والی ہے؟ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو آسمان ابھی تک کیوں نہیں ٹوٹا ـــــ!

زماں۔ آسمان ابھی ذرا ذرا سی باتوں پر ٹوٹنے سے رہا!

گلابو۔ سارے بھولے یہ ذرا سی بات ہے؟ فیض اور آشی کی منگنی ہوتی تو جالوں کدھر جائے گی!

زماں۔ اُس کے اور فیض کے باپ میں چل گئی ہے۔ سُنا ہوگا تو نے۔ فیض کا باپ کہتا ہے کہ وہ اب جالوں کے منہ پر تھوکنا بھی اپنی ہتک سمجھتا ہے ـــــ!

گلابو۔ لیکن سچ کہوں، فیض نہ مانے گا یہ بات، صاف انکار کر دے گا ـــــ!

زماں۔ انکار؟ اری اس کی تو چٹھی بھی آ گئی ہے آج، اس نے تو لکھا ہے کہ آشی سے منگنی اُسے دل و جان سے قبول ہے۔

گلابو۔ یہ بات فیض نے لکھی ہے؟

زماں۔ ہاں ہاں خود فیض نے۔

گلابو۔ تمہارے دوست فیض نے۔

زماں۔ ہاں ہاں میرے دوست فیض نے۔ جس کی تیری سہیلی سے منگنی ہوئی تھی ـــــ اور جو اب ٹوٹ گئی ہے!

گلابو۔ (پریشانی میں زماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہے) تو کیا سچ کہہ رہا ہے تو ـــــ؟

زماں۔ (ہاتھ جھٹک کر) اری تو تو دیوانی ہو گئی ہے! انکھیاں چڑھا دیں میری لال دیدے پھاڑے مجھے گھور کیوں رہی ہے؟

(زماں تیزی سے دور نکل جاتا ہے، گلابو کچھ دیر تک خلا میں کسی موہوم نقطے پر نظریں جمائے رکھتی ہے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی جھاڑی کے اس طرف آتی ہے۔ جالوں باہوں اور گھٹنوں میں سر دیئے سسک رہی ہے)

گلابو۔ (روتی آواز میں) کیا کر رہی ہے بہن!

(جالوں آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھاتی ہے۔ اس کا دامن آنسوؤں سے تر ہو گیا ہے ـــــ گھٹی، بھرائی اور جھلسی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔)

جالوں۔ میں اپنے من کی کرچیاں چن رہی ہوں گلابو بہن!

(مٹھی میں خاک لیکر اُسے گراتی ہے، اور خوابناک آواز میں کہتی ہے۔)

ـــــ من کی کرچیاں چن رہی ہوں!

(دونوں ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگتی ہیں)

احمد ندیم قاسمی!

چراغ کی لَو

پھر ہوا کا ایک جھونکا آیا، پھر چراغ کی لَو جھلملائی اور اُسکے خیالات نے ایک دوسری پگڈنڈی اختیار کی۔

"آخر یہ زندگی اور اس کا یہ بوجھ ہے کیوں، مکمل نا اُمیدی کے بعد بھی انسان کو موت کیوں نہیں آتی؟" جمنا نے سوچا، لیکن شدید کھانسی نے اُسکے خیالات کو درہم برہم کر دیا۔ اُس نے اپنے ہاتھوں سے سینے کو دباکر کھانسی کو روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اُسکے کمزور پھیپھڑے، اُس کھانسی کو جو اُسے راتوں کو سونے نہیں دیتی، روک نہ سکے۔ اب تو اُس کے جسم میں جان تک باقی نہیں ہے۔ اُس کا وہ پھول سا جسم صرف ایک ڈھانچہ بچا ہے اور نہ جانے کس طاقت نے اُسے ایک ہلکی سی زردی میں لپیٹ دیا ہے، وہ شگفتگی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی، اس کے چہرے پر کھیلتا ہوا وہ نشہ نہ جانے کہاں اُڑ گیا۔ پہلے تو اس کی آنکھوں کو دیکھکر زمیندار کا بیٹا بھی مبہوت ہو گیا تھا، وحشی ہرن کی سی بے پرواہ سیاہ آنکھیں۔ اب تو اُن میں حسرت بھر گئی ہے، اب کھانسی کے ساتھ اُسے خون کے قطرے بھی آتے ہیں۔ یونہی چوبیس گھنٹے وہ کچھ سوچتی رہتی ہے۔ گزرے ہوئے دنوں کی غمگین یاد اس کے چراغ زندگی کی لَو کو سرکا جاتی ہے، تیل ختم ہو چکا ہے، چراغ تیزی سے جل رہا ہے......

محبت انسان کے دل اور جسم دونوں کو کمزور کر دیتی ہے، اور محبت کی ماری ہوئی عورتیں، خوبصورت عورتیں...... پہلے جب وہ چلتی تھی تو محسوس ہوتا تھا کہ وہ چل نہیں رہی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قدیم زمانے کے حسین مندروں میں دیو داسیوں کے گھونگھٹ پہنے ناچ رہی ہے اور اس کا ہر قدم رقص کا ایک حصہ ہے ___ وہ مغرور تھی، ایک عجیب سا نسوانی غرور، نوجوانوں کی نظروں کی تاب نہ لا کر وہ لاجونتی کے پودے کی طرح شرما کر جھک نہ جاتی بلکہ وہ اپنی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے نوجوانوں کے سامنے سے انکی طرف بغیر نظر ڈالے بغیر استقلال سے گزر جاتی۔ اُس کی چال میں تمکنت آ جاتی، اس کے ہونٹ بھنچ جاتے اور جتنی دیر وہ اُن کے سامنے چلتی رہتی اُسے صرف یہ احساس رہتا کہ یہ مجھے دیکھ رہے ہیں، اور یہ احساس اس کے دل میں احساس پیدا کرتا کہ میں خوبصورت ہوں اور وہ ان نوجوانوں کی طرف جنہیں وہ کمتر سمجھنے لگتی دیکھنا اپنی کسرِ شان سمجھتی۔ اور لوگ سمجھتے کہ وہ مغرور ہے۔

اُسے اپنے متعلق ایک عجیب قسم کا غرور تھا۔ کبھی بہار کے دنوں میں شام کے جھٹپٹے میں اُسے سرسوں کے زرد زرد اُداس پھولوں کے درمیان کھیتوں سے گنگناتے ہوئے لوٹتا ہوا کوئی نوجوان ملتا اور اگر اُسے دیکھکر اسکے ہونٹوں پر وہ گیت رُک جاتا اور وہ پگڈنڈی کے ایک طرف ہو کر پوچھتا ___ ار... ر... تمہیں آگے جاتی ہوئی کوئی گائے تو نہیں ملی جمنا، اور اب اندھیرے میں تم کہاں جا رہی ہو؟... تو وہ سمجھتی کہ یہ صرف مجھ سے بات کرنے کا ایک بہانہ ہے، لیکن یہ جان کر بھی اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آتی۔ وہ بے پروائی سے جواب دے کر آگے بڑھ جاتی جیسے وہ کسی کو قابلِ اعتنا نہ سمجھتی ہو۔

ہاں وہ مغرور تھی۔

اور اُسکے اس غرور نے ہی اس کی جیون نیا کا رُخ بدل دیا تھا۔ اسکی زندگی کو غمزدہ اور بیمار کر دیا تھا۔

کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی، چراغ کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کا ایک بڑا سا سایہ دیوار پر کانپ رہا تھا۔ چھت کی کڑیوں میں کوئی جاگی ہوئی چڑیا کبھی کبھی بول اٹھتی تھی، چُپ چُپ، چُپ چُپ۔ باہر چاند ابھی نکلا نہ تھا اور درختوں، میدانوں اور کھیتوں پر دُور دُور تک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ دُور کہیں کہیں کسی جھونپڑی میں جگنو کی طرح کوئی دیا ٹمٹما رہا تھا۔ جیسے وہ تاریکی سے چپکے چپکے کچھ کہہ رہا ہو۔ ایک عجیب حالتِ سکون میں چراغ جل رہا تھا اور جمنا کی آنکھیں چراغ کے شعلے میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے چراغ کی لَو میں ماضی کی یادیں اُجاگر ہو رہی ہیں۔

اُسے وہ دن یاد آیا جب ایک شام کو اُس نے وہ منحوس کھیل شروع کیا تھا جس نے اُسے زندگی سے مایوس کر دیا تھا، اس کی خوشی کو ہمیشہ کے لئے مسل دیا تھا۔ وہ اسٹیشن کے قریب سے واپس آ رہی تھی، شام ہو رہی تھی اور ریل گاڑی کی آواز جو ابھی ابھی اس چھوٹے سے اسٹیشن کو چھوڑ کر گئی تھی دور چلی گئی تھی۔ دُور سے آتی ہوئی، مدھم ہوتی ہوئی، ریل کی آواز میں وہ محسوس کر رہی تھی کہ جیسے یہ شور شام کے سناٹے میں گھلتا جا رہا ہے۔ ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ برقی تاروں کے اُوپر سیاہ رنگ کے پرندے شور مچاتے ہوئے اُڑے جا رہے تھے۔ اُسی وقت کسی نے پوچھا کہ یہ پگڈنڈی کدھر کو جاتی ہے؟ جمنا نے گھوم کر دیکھا، ایک چھریرے بدن کا دراز قد نوجوان کھڑا تھا

رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا اور اُس کے جسم پر سفید کپڑے۔ جمنا چند سکنڈ تک دیکھتی رہی۔ اُسے یاد نہیں رہا کہ اجنبی نے کیا پوچھا۔ اس کی غیر معمولی شباہت نے جمنا کو چونکا دیا تھا۔ عام حالت میں جمنا اجنبی کی بات کو کوئی اہمیت نہ دیتی لیکن وہ اُن نوجوانوں سے بالکل مختلف تھا جنہیں اب تک دیکھتی آئی تھی اور اسی بات نے اُسے چند سکنڈ تک نوجوان کو دیکھتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ نوجوان نے پھر پوچھا: "کیا میں اِس راستے پر چلتا چلتا گاؤں پہنچ جاؤں گا!؟"

جمنا اپنے آپ میں آگئی، اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اُس نے سر ہلا دیا اور اجنبی تیز تیز قدم اٹھا کر آگے نکل گیا۔ ایک لمحہ تک وہ وہیں کھڑی رہی جیسے شام کے دھندلکے میں اپنے آشیانوں کو لوٹتے ہوئے پرندوں کے سرمدی نغمے کو سُن رہی ہو۔ پھر جب اُس نے اگلا قدم اُٹھایا تو اُسے یاد آیا کہ اجنبی کو جواب دینے سے پہلے اُس کے پاؤں میں کانٹا چُبھ گیا تھا۔

کانٹا نکل جانے کے بعد جب اُس نے سر اُٹھایا تو اجنبی دُور چلا گیا تھا۔ مغرب کی طرف لہلہاتے ہوئے کھیت تھے، اُن کے پار ندی، ندی کے پار پھر ریت اور اُن کے پار پھر آسمان، خون آلود آسمان۔ سورج ڈوب گیا تھا اور شام کی دیوی کے رُخسار کسی نامعلوم حیا سے تمتمائے ہوئے تھے۔ شفق کا سُرخ عکس سبز کھیتوں پر ایک عجیب انداز سے پڑ رہا تھا۔ ساری فضا میں ایک سُرخ سا نور تیر رہا تھا جیسے سینکڑوں، لاکھوں، کروڑوں چراغ بجھنے سے پہلے بھڑک رہے ہوں، جمنا دُور جاتے ہوئے اجنبی کو دیکھنے لگی جو شفق کے سنہری پس منظر میں ایک کھوئے ہوئے محبوب کی طرح جا رہا تھا اور اُس نے محسوس کیا کہ یہ شفق کو پردے کو چیر کر اُفق کے پار چلا جائے گا۔ اور اس احساس سے اُس نے ایک عجیب سی خوشی اور ایک عجیب سی اُداسی محسوس کی اور ایک غیر مانوس سا خطرہ جس سے اُس کی رُوح کا ذرہ ذرہ کانپ گیا۔ اجنبی موڑ پر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ جمنا کے ہونٹ کھل گئے۔ وہ اجنبی کو پکارنے لگی تھی تاکہ اُسے بتا دے کہ وہ غلط راستے پر مڑ گیا ہے، لیکن وہ پکار نہ سکی، کسی غیر محسوس جھجک نے اس کی زبان پکڑ لی۔

جب وہ خود موڑ پر پہونچی تو دیکھا اجنبی ایک بڑے سے شیشم کے درخت سے لگا کھڑا تھا۔ اس کا سوٹ کیس اس کے قدموں میں پڑا تھا اور وہ خود سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے غلط راستہ تو اختیار نہیں کر لیا۔ پھر وہ ساتھ ساتھ گاؤں کے سنسان راستے پر چلنے لگے۔ اجنبی نے بتایا کہ اس کا نام ہرنند ہے اور وہ یہاں اس گاؤں کے لوگوں کو جگانے آیا ہے جو صدیوں سے غلامی کی گود میں سو رہے ہیں۔ اُس نے کھدر کے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور اُس کے سر پر گھنے بڑے بڑے بال تھے جو اُس کے شانوں پر پڑے رہتے تھے اور جنہیں وہ

تھوڑی تھوڑی دیر بعد پیچھے کو جھٹک دیتا تھا۔ جمنا کو اس کے بال عجیب معلوم ہوئے عجیب اور اچھے۔ اور ہرنند کی باتوں میں ایک عجیب قسم کی نرمی تھی، شیرینی اور خلوص۔ اور اُس سے بات کرتے ہوئے جمنا نے محسوس کیا جیسے وہ اجنبی کو صدیوں سے جانتی ہے، جیسے وہ بچپن سے اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا چلا آیا ہے۔

باتیں کرتے کرتے وہ گاؤں کے قریب پہونچ گئے۔ اُفق میں شفق کی سُرخی دھندلی ہوتی ہوتی غائب ہو گئی تھی اور مشرقی سمت سے اُٹھتا ہوا اندھیرا پھر فضا میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اچانک مغرب کی طرف جاتے ہوئے پرندوں کا شور تھم گیا اور ایک سناٹا چھا گیا۔ دھندلکے میں گاؤں کے جھونپڑوں سے اٹھتا ہوا دھواں اُداسی اور سناٹے کو گہرا کر رہا تھا۔

"تو تم کتنے دن یہاں ٹھہرو گے؟" جمنا نے پوچھا، اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں اجنبی کے چہرے پر رُک گئیں۔

"معلوم نہیں، شاید بہت دنوں تک، جب تک مجھے کہیں اور جانے کو نہ کہا جائے۔"

اُس رات جمنا کو بہت دیر تک نیند نہ آئی، وہ دیر تک ہرنند کے متعلق سوچتی رہی، کئی بار اُس نے غیر شعوری طور پر اپنے بالوں کو پیچھے جھٹک دیا۔ اس کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے آگے سے ہٹتا نہ تھا اور اُس کے الفاظ جمنا کے کانوں میں اس طرح گونج رہے تھے، جیسے کسی مبہم سے شیریں نغمے کی صدائے بازگشت مسلسل ہوا میں گردش کر رہی ہو جیسے اُسے تحلیل ہونے کا راستہ نہ ملتا ہو۔ اور جمنا سوچتی رہی ایسی باتیں جو کنوارے جذبات کو جگا دیتی ہیں اور کنواریوں کی نس نس میں عشق کی چنگاریاں بھر دیتی ہیں۔

دن گذرتے گئے۔ ہرنند اب اس گاؤں میں رہنے لگا تھا۔ وہ اجنبی تو تھا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں وہ اس گاؤں میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ ہر دلعزیز سہی لیکن پھر بھی ایسے بہت سے آدمی تھے جنہیں وہ عزیز نہ تھا۔ کیونکہ جیسا کہ آسکر وائلڈ نے کہا ہے کہ جس کا کوئی بھی دشمن نہیں وہ نہایت کمینہ آدمی ہے، اور ہرنند کمینہ نہ تھا، وہ بیچارا اس گاؤں کے لوگوں کو جھنجھوڑ کر انہیں صدیوں کی غلامی کا احساس کرانا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ غلام اُن زنگ آلود زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیں جن سے اُن کے پاؤں بوجھل ہیں۔ اور اس گاؤں میں بھی جیسا کہ ہر ایک گاؤں اور شہر میں ہوتے ہیں ایسے بہت سے آدمی تھے جو اس غلامی میں خوش تھے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی زندگی میں جو ایک جوہڑ کی طرح ساکن ہے انقلاب پیدا کریں۔ انہیں ہرنند پسند نہ تھا۔

لیکن جمنا کو تو اُس سے محبت ہو گئی تھی۔ پہلے ہی دن جب اُس نے ہرنند کو ڈوبتی ہوئی شام کے وقت اسٹیشن سے آتے دیکھا تھا، تب ہی وہ اُس کے دل کی گہرائیوں میں سما گیا تھا۔ ہرنند سے الگ ہو کے ایک لمحہ بھی اُسے محسوس ہوتا تھا

کہ کسی غیبی ہاتھ نے اُس کے دل کی شانتی کو نوچ لیا ہے، جیسے اُس کے دل میں خلا ہی خلا ہے جیسے زندگی ایک لق ودق صحرا ہے جس میں وہ کسی نامعلوم شے کے پیچھے بھاگی جا رہی ہے۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ محسوس کرتی کہ دل پر سینکڑوں لاکھوں، کروڑوں من بوجھ ہے، وہ ایک بے پناہ بوجھ کے نیچے دبی جا رہی ہے۔ اور اس کا دل گھبراتا۔ جیسے آسمان کی نیلی بلندیوں پر اُڑتے ہوئے ننھے پرندے کو قفس میں بند کر دیا ہو۔

ہرتندر کی اُن باتوں نے جو جمنا کے لئے نئی تھیں، اس کے دل کو موہ لیا تھا۔ اُس کی گفتگو کا مہذب ڈھنگ، بات کرتے کرتے اچانک سنجیدہ ہو جانا اور پھر مسکرا دینا ــــ اس کی ہر بات جمنا کو اچھی لگتی کیونکہ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی، لیکن وہ اپنی محبت کو اپنے دل میں چھپائے رہی۔ وہ ہرتندر سے اپنی محبت کے بارے میں کچھ کہہ نہ سکتی تھی، یوں تو ہندوستانی عورت ویسے ہی کبھی اپنے منہ سے محبت کا اظہار نہیں کرتی، کیونکہ اُسے دب کر رہنا سکھایا جاتا ہے، اُسے بتایا جاتا ہے کہ نظریں نیچی رکھ کر چلو، مردوں کی طرف مت دیکھو۔ شادی سے پہلے محبت کرنا پاپ ہے۔ اور اس میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے پاپ کا اظہار کر سکے۔ اور جمنا بھی اپنی محبت کو اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپائے رہی، وہ ایک ہندوستانی عورت تو تھی ہی، لیکن اس میں وہ غرور بھی تو تھا جو سب عورتوں میں نہیں ہوتا۔ وہ غرور جو اُسے غیر شعوری طور پر نوجوانوں کے سامنے سے بے اعتنائی سے گزرنے پر مجبور کرتا تھا۔ اُس پاپ کے اظہار سے اُسکے وقار کو ٹھیس سی لگتی تھی، کیونکہ محبت کا اظہار ایک التجا ہی تو ہے، جنس مخالف سے محبت کی بھیک ہی تو مانگنا ہے، اور جب سے اُسے اپنے عورت ہونے کا احساس ہوا تھا اُس نے کسی سے التجا نہ کی تھی اور وہ محبت کو اپنے دل میں دبائے رہی جیسے وہ ایک حاملہ عورت ہو اور اپنے ناجائز بچے کو اپنے پیٹ میں لئے پھرتی ہو، کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی، کچھ بتا نہیں سکتی۔ وہ یہ چاہتی ضرور تھی کہ ہرتندر کو اُس کی محبت کے بارے میں معلوم ہو جائے لیکن وہ یہ نہ کر سکتی تھی کہ خود یہ بات کہے۔ ہرتندر جب سامنے ہوتا تو اس کے ہونٹ بھنچ جاتے، مسکراہٹ اُس کے چہرے سے کافور ہو جاتی۔ وہ کبھی اس کی آنکھوں سے آنکھیں نہ ملاتی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا جیسے وہ پریشان ہے اور کسی شدت کو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور جب ہرتندر اس کے سامنے سے ہٹ جاتا تو وہ دور تک اُسے جاتا دیکھتی رہتی، اس کا چہرہ اُداس ہو جاتا اور جسم بے حس و حرکت، جیسے کسی نے اُسکی روح سلب کر لی ہو۔

لیکن وہ اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکتی تھی!

اور ہرتندر گاؤں والوں کے اتنا قریب آ گیا تھا جیسے ہندوستانی زبان میں گھل مل جانا کہتے ہیں۔ شاید وہ گاؤں والوں کو جگانے کے لئے اُنکی زندگی سے گھل مل جانا چاہتا تھا۔ وہ کٹتی ہوئی فصلوں میں جا کر کسانوں کے ساتھ کام کرتا اور جب کھیتوں میں وہ اُتھی چلاتی ہوئی عورتیں دیہات کے سہانے گیت گاتیں تو وہ مسکراتا رہتا۔ اور اکثر وہ جاڑوں کی رات کے سنسان اندھیرے میں چمکتے الاؤ کے گرد بیٹھ کر انہیں روس کے کسانوں کو کہانیاں سُناتا جنہوں نے اپنے ملک سے سرمایہ داری کو اکھاڑ پھینکا تھا اور گاؤں کے نوجوان غور اور دلچسپی سے اس کی باتیں سنتے اور حقہ گڑگڑاتے ہوئے بوڑھے سر ہلا ہلا کر کہتے کہ اس کلجگ میں جانے کیا ہو گا....

دن گزرتے جا رہے تھے، جیسے ہمیشہ گزرتے ہیں۔ نہیں ہمیشہ کی طرح نہیں گزر رہے تھے، کم از کم جمنا کے لئے ایسا نہ تھا، اُسکے دل کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، وہ اضطراب جس نے ایک منحوس شام کو اس کے دل میں جنم لیا تھا، پھیلتا جا رہا تھا۔ وہ پانی لینے کے لئے ندی پر جاتی اور گھنٹوں محویت کے عالم میں ندی کی سطح پر بہتے ہوئے بلبلوں کو دیکھتی رہتی۔ شام کی خاموشی میں اُسکے دل کی افسردگی گہری ہو جاتی اور مغرب میں شفق کو پھولتے دیکھکر اسکے دل میں ایک کسک سی ہوتی اور اس کی آنکھوں میں وہ شام پھر جاتی اور ایک لمحہ کے لئے اُسے واہمہ سا ہوتا کہ ہرتندر اب بھی شفق کو چھونے جا رہا ہے اور اس وہم سے اُسے محسوس ہوتا کہ اُس نے ہرتندر کو بھی کھو دیا ہے اور وہ اُداس ہو جاتی۔ اُداسی، اداسی، اداسی ــــ یہ اُداسی اُس کی رُوح سے لپٹ گئی تھی، اِس اُداسی نے اس کی زندگی کو غمگین اور محزون کر دیا تھا۔ اس کی ہر خواہش کو مٹا دیا تھا۔ کئی بار ستاروں کی حسین چھاؤں میں گیہوں کی بالیں الگ کرتے ہوئے اُس نے ننھے ننھے کپکپاتے ہوئے ستاروں سے آنکھ بچا کر اپنے آنسو پونچھ دئے۔ شہر کے ایک لاابالی نوجوان نے آکر اُس مغرور حسینہ کی دل کی بستی کو اُجاڑ دیا تھا۔ اُس کے دل میں عشق کا دُھواں بھر دیا تھا اور خزاں کی شام کی سی اُداسی۔

وہ اُداس تھی، اُداس اور غمگین اور مضطرب۔

اور جب یکایک وہ دھان کوٹتے کوٹتے رُک جاتی، اس کے ہاتھ میں وہ موسل ساکن ہو جاتا اور وہ ایک ٹک خلا میں تکنے لگتی تو اُس کی بھولی ماں سوچتی کہ نہ جانے میری لاڈلی کو کیا ہوا جا رہا ہے اور جوان لڑکیوں کی آنکھیں مسکرا مسکرا کر کہتیں کہ ہم جانتے ہیں کہ تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے، تو نے ہمیں نہیں بتایا لیکن ہمیں معلوم ہے کہ تو کیوں غمگین ہے، کیوں اُداس ہے۔

لیکن یہ اُداسی اُس غرور کو جو پیدائش سے جمنا کی فطرت میں رچ گیا تھا مٹا نہ سکی۔ وہ سوچتی کہ میں اس کے آگے اپنا دل کھول دوں گی کہ مجھے کہیں دُور، اس آسمان، ان ستاروں سے دُور لے جاؤ ــــ پاگل لڑکی، کوئی آسمان اور ستاروں سے بچ کر بھی جا سکتا ہے ــــ لیکن یہ خیال آتے ہی اُسکو

دل میں اس کا وہ احساس شکست سے انگڑائی لیکر آنکھیں کھول دیتا۔ چند لمحوں کے لئے اسکے دل سے وہ اُداسی غائب ہوجاتی اور وہ اپنی محبت کو بھول جاتی۔ صرف چند لمحوں کے لئے اس کا وہ غرور اسکی محبت پر غالب آجاتا۔ لیکن پھر وہی اُداسی وہی اضطراب، وہی بے چینی۔

اور وہ رات!

جمنا جا رہی تھی۔ جنوری کی ایک سرد رات تھی، سرد اور اداس۔ جاڑوں کا کپکپاتا ہوا چاند ایک بھورے سے بادل کے پیچھے سے نکل رہا تھا اور اسکی پھیکی اور افسردہ روشنی کچی پگڈنڈی اور اس کے دونوں طرف، دور دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے کھیتوں پر پڑ رہی تھی۔ دور اُفق کے قریب ایک نیلا سا روشن ستارہ سب ستاروں سے الگ جگمگا رہا تھا۔ ساری فضا میں ایک خواب کی سی خاموشی تھی، ایک موت کا سا سکون۔ اور جب خاموشی ہو اور سناٹا اور موت کا سا سکون تو خود احساس شدید ہوجاتا ہے۔ اور چاند کی اس پھیکی اور افسردہ روشنی میں، فضا کے اس بے آواز سکون میں جمنا نے اپنے دل کی اُداسی بڑی شدت سے محسوس کی۔ اُسے ساری کائنات اپنے دل سے ہم آہنگ معلوم ہوئی، دھندلا چاند، کپکپاتے ہوئے ستارے، اور دور دور تک پھیلے ہوئے تاریک کھیت، سب اُسے اُداسی میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوئے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

قدرت کا یہ کیسا ظلم ہے کہ اُس نے محبت کا لازمی تعلق اُداسی، بے چینی، غم اور اذیت سے رکھ دیا۔ ایسا کیوں ہے، محبت میں خوشی حاصل ہونے کی بجائے رنج ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ محبت کی فطری آگ نے ایک نازک سینہ کی خوشی کو پھونک کر رکھ دیا۔

وہ جا رہی تھی، جہاں ہرنندر الاؤ کے گرد بیٹھا ہوا کسانوں کو کہانیاں سنا رہا ہوگا یا انہیں انقلاب پر اکسا رہا ہوگا، جہاں وہ دور سے اس کی شکل دیکھ سکتی اور شاید اس کی آواز سن سکتی، جسے سنکر اُسے محسوس ہوتا تھا، جیسے جھیل کی ساکن سطح پر کوئی ننھا سا سنگریزہ پھینک دیا گیا ہو اور ننھی لہریں بیدار ہو گئی ہیں اور ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔

اور آج وہ پہلی بار اس طرح نہ جا رہی تھی۔ کئی بار جب رات بالکل اندھیری ہوتی تھی، اندھیری اور بھیانک اور تاریک، تب بھی وہ گئی تھی، اور کئی بار جب آکاش پہ بے شمار ستارے بکھرے ہوتے تھے اور ان کے درمیان کہکشاں کسی نامعلوم منزل کی طرف بہائی جا رہی ہوتی تھی، تب بھی وہ گئی تھی۔ اور آج بھی وہ ان برفیلی ہواؤں کی پروا نہ کرتے ہوئے جا رہی تھی اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی سہیلیوں کو اُس کا راتوں کو یہاں آنا معلوم تھا۔

رات خاموش تھی اور سرد اور غمگین، جنوری کی ہواؤں کے منچلے جھونکے کبھی کبھی کیکر اور شیشم کے خوابیدہ پتوں میں ازلی حرکت واضطراب کے راگ گاتے ہوئے گذر جاتے تھے۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ شیشم کے ننھے ننھے پتے حسرت سے ہاتھ ملتے اور چاند بار بار سردی سے ٹھٹھر کر بھورے بادلوں میں گھس جانے کی کوشش کرتا۔ اُس نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ یہ لوگ رات کو کہانیاں سننے کے لئے گاؤں سے باہر کیوں جمع ہوتے ہیں۔ اور جب وہ وہاں پہونچی تو چاند بادل کے ایک بڑے سے سیاہ ٹکڑے کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ اندھیرے میں الاؤ کی لکڑیاں تیزی سے جل رہی تھیں۔ الاؤ کی سُرخ روشنی کے ہالے میں بیٹھے ہوئے وہ لوگ ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے کسی مُردے کو پھونک کر چتا کے گرد بیٹھے ہوں۔ سُرخ روشنی میں اُن کے چہرے دمک اُٹھے تھے۔ اور جمنا نے محسوس کیا کہ تاریکی کے پس منظر میں خونیں روشنی کا وہ حلقہ کائنات سے بالکل علیحدہ ہے، اندھیری کائنات سے۔ اس روشنی میں نظر آتا ہوا ہرنندر، جمنا کے دل کی شاعرہ کو عجیب معلوم ہوا۔ ہرنندر کے متعلق عجیب عجیب سے احساسات ہوتے تھے۔ اس محبت میں اُس کے احساس کا دائرہ سمٹتے سمٹتے صرف ایک ہرنندر کے گرد رہ گیا تھا۔ محبت انسان کے دل کے شاعر کو جگا دیتی ہے، وہ بہت کچھ محسوس کرتا ہے لیکن وہ سب کچھ صرف ایک اُسی محبوب کے متعلق ہوتا ہے جس کے بارے میں اُسے ہمیشہ عجیب عجیب سے احساس ہوتے ہیں۔ دہکتے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے بیسیوں آدمیوں میں سے وہ صرف ایک ہرنندر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا اور اُس کی آواز سُرخ روشنی ہی میں تحلیل ہو رہی تھی، جمنا اُسے سُن نہ سکتی تھی لیکن وہ ہرنندر کے چہرے پر اتنی شدت سے متوجہ تھی کہ اُسے وہ آواز سنائی دیتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اور اس بے آواز آواز کو سنتے سنتے وہ خود کو بھول سی گئی۔ قدرتی طور پر اُس نے اپنے گرد و پیش کے احساس کو فراموش سا کر دیا۔

پھر اچانک وہ چونک پڑی، بہت سی لڑکیاں اس کے قریب آ کر ہنسنے لگی تھیں۔ وہ ہنستے ہنستے دُہری ہوگئیں ــــ ایک نے کہا بے شرم، ہا ہا ہا، ہی ہی ہی! بے شرم کہیں کی، ہا ہا ہا، ہا ہا ہا، اوہ اوہ....

یہ لڑکیاں نہ جانے کہاں سے نکل آئی تھیں، انہوں نے جمنا کے گرد گھیرا ڈال لیا اور ہنس ہنس کر کہنے لگیں :-

"آج تو چور پکڑ لیا!"

"کیوں ــــ یہ چھپ چھپ کے!"

"کسی کو بتایا بھی نہیں!"

"میں تو پہلے ہی جانتی تھی!"

اور یکایک غیر متوقع گھبراہٹ کے بعد جب جمنا سوچنے کے قابل ہوئی

تو اُس کے دل میں ان لڑکیوں کے لئے ایک عجیب سی نفرت بیدار ہو گئی، وہ ایک ایسی حالت میں دیکھی گئی تھی جسے وہ چھپانا چاہتی تھی، اور نہ صرف عورت ہی بلکہ مرد بھی جب ایسی حالت میں دیکھ لیا جائے تو وہ اپنے اُس فعل سے، اس کی شہادت سے اور بعض اوقات خود سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اور جمنا تو ایک مغرور لڑکی تھی، اس کے کانوں میں لڑکیوں کے قہقہے سوئیوں کی طرح چبھنے لگے اور ایک ناقابلِ برداشت غصہ اور نفرت اُسکے دماغ کی رگ رگ میں پھیل گئی۔

"ہم تو پہلے ہی جانتے تھے" ایک لڑکی نے مسکرا کر آنکھیں مٹکاتے ہوئے رُک رُک کر کہا "کہ تم اُس پردیسی سے ... کہہ دوں ... کہ تم ... بس سمجھ جاؤ۔ ہم تو اُڑتی چڑیا کو پہچان لیتے ہیں"

جمنا کو محسوس ہوا کہ اس کے غرور کو ایک زبردست جھٹکا لگا ہے، اور اپنی نفرت کی شدتِ احساس میں اس کا جی چاہا کہ وہ اس لڑکی کو سخت الفاظ کہے، کوئی ایسے لفظ جو اُس کی اُمیدوں کے خلاف اس کے دل کو چھید ڈالیں اور اُس کے منہ سے نکلا "میں اُس سے نفرت کرتی ہوں، میں تم سے بھی نفرت کرتی ہوں اور تمہارے بھائی سے بھی جو ہر وقت میرے پیچھے پیچھے پھرتا ہے، تم خود ہی کیوں نہیں کہتیں کہ تم ہی اس پر ریجھ گئی ہو۔ مجھے اس سے نفرت ہے، مجھے تم سے بھی نفرت ہے"

دُور اُفق کے قریب نیلا سا روشن ستارہ ٹوٹا اور دُور تک ایک نورانی کرن چھوڑتا ہوا خلا میں تحلیل ہو گیا۔ اور اُس کے ٹوٹنے سے جو روشنی پھیل گئی تھی اس کے غائب ہونے کے بعد جمنا نے محسوس کیا کہ چاندنی پھیکی پڑ گئی ہے اور چاند دُھندلا ہو گیا ہے۔ اُسے احساس ہوا کہ یہ بات میں نے کیوں کہہ دی اور آہستہ آہستہ اس کا غصہ خود بخود کسی دُھند لکے کی طرح اُسکے احساس سے غائب ہونے لگا۔

اور پھر اس دن کے بعد سے سوشلسٹ نوجوان کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں۔ اُس نے الاؤ کے گرد بیٹھ کر رات گئے تک کہانیاں سُنانا چھوڑ دیا اور گاؤں کے لوگوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنا ترک کر دیا اور اس کے چہرے سے وہ بشاشت کافور ہو گئی۔ وہ سب سے الگ الگ رہتا۔ اس دن کے بعد وہ ایک بار بھی جمنا کے سامنے نہ آیا۔ جیسے وہ جمنا کے سامنے آنے سے پرہیز کرتا ہو، جیسے جمنا کو وہ کچھ اور سمجھتا ہو اور وہ کچھ اور ثابت ہوئی ہو اور وہ اپنی غلطی پر پشیمان اور دُکھی ہو اور جمنا کے سامنے آنا اُسے اپنی غلطی کا احساس کرا دیتا ہو۔

اور جمنا!

اُس کی اُداسی پر اب ایک بے رحم سی پشیمانی غالب آ گئی تھی۔ پشیمانی کی ایک ایسی تیز آگ جو اس کے دل کو کھائے جاتی تھی اور اضطراب، اضطراب۔ وہ ایک ایسی مدھم آگ میں جل رہی تھی جو اس کے دل کے ہر گوشے کو آہستہ آہستہ جلا کر خاکستر کئے ڈالتی تھی۔ اس کا جی گھبراتا، اُسے خیال آتا کہ کیوں میں نے اُس رات کو وہ چند الفاظ کہہ دیئے، وہ سوچتی کہ شاید کسی نے ہر تندر کو اُس رات کی بات بتا دی ہے جس نے اُسے تبدیل کر دیا ہے، جس کی وجہ سے وہ الگ الگ رہتا ہے اور اُس کے سامنے آنے سے بھی کتراتا ہے۔ اور وہ سوچتی کہ میں اُس سے معافی مانگ لوں۔ ایک بار اس کے گھٹنوں میں سر رکھ کے کہہ دوں کہ وہ الفاظ میں غصّے میں کہہ گئی تھی، مجھے معاف کر دو کہ یہ دُکھ مجھے کھائے جاتا ہے۔ لیکن جب اس کا تخیل اُسے گھٹنوں میں سر رکھے دیکھتا تو اُس کا غرور پھر اس کے جذبات پر غالب آ جاتا۔ وہ یہ بھول جاتی کہ یہ گھٹنے کس کے ہیں۔ اُسے صرف یاد رہتا کہ اُس کا سر گھٹنوں میں رکھا ہوا ہے۔ اور اپنے گھٹنوں میں رکھے ہوئے سر کے لئے اُس کے دل میں حقارت پیدا ہو جاتی، اور پھر جب وہ ہوش میں آتی تو وہی پشیمانی، بے چینی، اداسی، پھر اس کا جی گھبراتا اور اس بے چینی کی شدت سے وہ بار ہا پاگل سی ہو جاتی۔ لیکن وہ اپنے غرور کے آگے بے دست و پا تھی۔ وہ غرور اُسے سوچنے تک نہ دیتا تھا۔ شاید اگر ہر تندر آ کر خود اس سے بات کرتا، اُس سے پوچھتا، ان تمام باتوں کا جو اُس نے اُس رات کو کہہ دی تھیں جواب طلب کرتا تو وہ کہہ دیتی کہ میں نے غصّے میں کہہ دی تھیں، شاید وہ معافی بھی مانگ لیتی۔ لیکن جمنا کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ خود جا کر اس کو کہتی، اُسے اس واقعہ کی یاد دلاتی اور پھر اُس سے معافی مانگتی۔

اور جوں جوں دن گذرتے جا رہے تھے، اُس کی یہ جھجک بڑھتی جا رہی تھی۔

اور آخر وہ دن آ گیا جب گاؤں کے ہر شخص کی زبان پر یہی چرچا تھا کہ اجنبی نوجوان جا رہا ہے۔

اور جب جمنا نے یہ سُنا تو اُس کے دل کی بے چینی ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک زبردست طوفان اُسکے دل کے اندر بے چین ہے، جسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا اور جو سینہ کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتا۔

لیکن جانے سے پہلے بھی ہر تندر اُس کے پاس نہ آیا، اُس نے اُس سے بات تک نہ کی۔

وہ بیل گاڑی پر سوار ہو گیا اور گاڑی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ جا رہا تھا! جمنا اپنے دروازے میں کھڑی ہوئی کچی سڑک پر بیل گاڑی کو دُور جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ مغرب میں سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ گاڑی بھی آہستہ آہستہ دُور جا رہی تھی۔ اور جب گاڑی موڑ پر گرد کا ایک

سنہری غبار چھوڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو اُس نے اپنا چہرہ اپنے آنچل میں چھپالیا اور پھوٹ پھوٹ کر

سورج ڈوب گیا!

اور پھر اُس دن کے بعد جمنا کی آنکھوں میں سینکڑوں بار آنسو آئے اُس اُداسی نے ایک گہرے اندھیرے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سسک سسک کر روئے لیکن وہ اپنے آنسوؤں کو پی جاتی اور اس کا دل ہمیشہ بھرا رہتا۔ وہ شام کے دھندلکے میں اسٹیشن سے آتی ہوئی پگڈنڈی کی طرف دیکھتی رہتی اور سوچتی کہ شاید وہ ایک بار پھر اس گاؤں میں آئے۔ اور کبھی کبھی جب سناٹے میں ریل گاڑی اسٹیشن کو سنسان چھوڑ جاتی اور اس کی آواز دھیمی ہوتی ہوتی تحلیل ہونے لگتی تو اُمید و یاس کے سنگم پر رُک کر وہ سوچتی کہ وہ ایک بار پھر آئیگا۔

لیکن وہ پھر نہیں آیا اور اُس کی موٹی موٹی حسین آنکھوں میں حسرت بھر گئی اور چہرے پر زردی چھانے لگی۔ پھر وہ بیمار ہوگئی۔ پہلے کھانسی، پھر ہلکا بخار——!

اور اب تو کھانسی کے ساتھ اسے کبھی کبھی خون بھی آتا ہے۔ اب تو اُس سے بستر سے اُٹھا بھی نہیں جاتا یونہی چوبیس گھنٹے وہ کچھ سوچتی رہتی ہے گزرے ہوئے دنوں کی غمگین یاد اُسکے چراغ زندگی کی لَو کو سرکا جاتی ہے، تیل ختم ہوچکا ہے، چراغ تیزی سے جل رہا ہے.....

پھر ہوا کا ایک جھونکا آیا، پھر چراغ کی لَو جھلملائی اور بجھ گئی کمرے میں تاریکی چھاگئی۔ چاند کی ایک کرن دراز میں سے آکر اُسکے چہرے پر پڑ رہی تھی اور وہ سوگئی تھی۔ آنسوؤں کے دو قطرے اُس کے رخساروں پر کانپ رہے تھے——!

مدھوسودن!

غزل

مجھ پہ جو لطف نرگسِ مستانہ ہوگیا
چکر فلک کا گردشِ پیمانہ ہوگیا

مسجد سے واسطہ نہ تجھے بتکدے سے کام
آنکھ اُٹھ گئی جدھر تری ویرانہ ہوگیا

دل کیا مٹا کہ مٹ گئے نقشِ نیاز و ناز
یہ جبر و اختیار بھی افسانہ ہوگیا

اللہ رے شمع عمر تری گلفشانیاں
کیا کیا ہجومِ بلبل و پروانہ ہوگیا

اک تم کہ دل میں رہ کے نظر کو خبر نہیں
اک میں کہ میرا راز بھی افسانہ ہوگیا

جب سے تری نظر میں سمایا ہوں مست ہوں
ہر پردہ آنکھ کا مجھے میخانہ ہوگیا

مجھکو نظر میں رکھتا ہے اُن کا نگاہباں
میں بے نوا بھی صاحبِ کاشانہ ہوگیا

ساقی نہ چھیڑ اب تو کہ بھر آیا دل مرا
لبریز دیکھ لے مرا پیمانہ ہوگیا

شاید نگاہ پھر گئی ساقیِ عشق کی
خالی اثر سے نالۂ مستانہ ہوگیا

سُن سُن کو وہ بھی رو دئیے قصّہ گو کیساتھ
اب تو تپش کا حال بھی افسانہ ہوگیا

عبداللطیف تپش،

غزلیات۔

نغمۂ نور

میرے صبر و شکر پر ظلم و ستم ڈھاتا ہے کون   تم یہ خود ہی دیکھ لو حد سے بڑھا جاتا ہے کون
یاد مجھکو آ گئی روز ازل کی داستاں   کس کے ہیں سارے کرشمے ٹھوکریں کھاتا ہے کون
تم نقابِ رُخ اُٹھا دو تم کو اس سے کیا غرض   کس کی قسمت میں ہے جلنا ہوش سے جاتا ہے کون
تیری محفل میں تو جو آیا وہ ساغر لے گیا   تجھکو ساقی کیا خبر ہے مست ہو جاتا ہے کون
کہہ نہ دینا اپنی محفل میں ہماری داستاں   صرف اتنا دیکھ لینا اشک بھر لاتا ہے کون
سخت حیرت ہے کہ کیوں اسکی نگاہیں پھر گئیں   مجھ کو سمجھاتی ہے دُنیا اس کو سمجھاتا ہے کون

راز دارانہ ادا سے دیکھتے ہیں جو مجھے
اُن سے اے بہزاد دل کا راز کہہ جاتا ہے کون

چراغِ طور

بے نیازی غمِ دل یاد کرتی ہے تمہیں   یاد رکھنا میری محفل یاد کرتی ہے تمہیں
ہر قدم اک عافیت ہے ہر قدم محشر بپا   زندگی منزل بہ منزل یاد کرتی ہے تمہیں
یہ مری چشمِ تصور کا نیا انداز ہے   تم کو ہی رکھکر مقابل یاد کرتی ہے تمہیں
میری کشتی بحرِ غم میں تم کو باور ہو نہ ہو   دیکھکر دُوریِ ساحل یاد کرتی ہے تمہیں
تم بڑھا دو پھر اسی انداز سے دستِ کرم   بے کسیٔ دستِ سائل یاد کرتی ہے تمہیں
مجھ سے تم آسانیوں کو چھینتے تو ہو مگر   یہ بڑی مشکل ہے مشکل یاد کرتی ہے تمہیں
ساغر و تے جام و مینا و صراحی و سبو   یعنی کُل ساقی کی محفل یاد کرتی ہے تمہیں

ناتوانی بڑھ گئی ہے اس قدر بہزاد کی
اب زباں اسکی بمشکل یاد کرتی ہے تمہیں

بہزاد لکھنوی۔

چراغ شام

ایک ایسے نوجوان کا مطالعہ جو پرچھائیوں سے محبت کرتا تھا۔ نوجوان اکیلا ہے۔ ملازمہ چراغ روشن کر کے لاتی ہے۔

ملازمہ: نمستے چھوٹے سرکار۔

نوجوان: نمستے۔ مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ تم چراغ لئے ہوئے ہو۔ کیونکہ اس سے تمہاری پرچھائیں دکھائی دیتی ہے۔

ملازمہ: آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس کمرے میں روشنی پھیلتی ہے اور آپ کو چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔

نوجوان: دُنیا کی کوئی روشنی بھی کسی کو کوئی چیز نہیں دکھا سکتی۔ ایسے تو تم روشنی نہیں کہہ سکتیں، کیوں؟ تاہم میں اس کا شکر گزار ہوں، کیونکہ اس کی مدد کو پرچھائیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ملازمہ: چھوٹے سرکار، آپ کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں۔

نوجوان: آؤ، میں تمہارے ہاتھ پکڑ کر تمہیں سکھاؤں کہ پرچھائیں کے پودے اور پرچھائیوں کے جانور اور پرچھائیوں کی پہاڑیاں کیسے بنتے ہیں۔

(ملازمہ کے ہاتھ اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کا سایہ دیوار پر پڑتا ہے)

ملازمہ: مجھے ڈر لگ رہا ہے، آہ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ چھوٹے سرکار، سرکار، بس کانپ ....

نوجوان: جب بھی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو سب ہی کانپا کرتے ہیں، دیکھو ہماری پرچھائیاں کیسی گھل مل گئی ہیں۔ ان کی شادی ہو گئی ہے، بغیر پنڈت یا کسی فضول رسم کے۔ پرچھائیوں کو جھوٹی رشتہ داریوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ جب میری ماتا جی کی پرچھائیں میری پرچھائیں سے ملتی ہے تو ان دونوں کی بھی شادی ہو جاتی ہے۔ پرچھائیاں پوتر ہوتی ہیں، جھوٹے بندھنوں سے آزاد۔

ملازمہ: چھوٹے سرکار، آپ مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھیں گے۔

نوجوان: میں تمہیں تباہی و بربادی کی دُنیا سے الگ لیجانا چاہتا ہوں۔ غیر فانی ہوجاؤ۔ پرچھائیوں سے محبت کرنے لگو، اور امر ہو جاؤ۔

ملازمہ: آپ ہمیشہ اس قدر رنجیدہ نظر آتے ہیں۔

نوجوان: میں اس لئے رنجیدہ رہتا ہوں کہ اس گھر میں میرے سوا اور کوئی سائیوں کو نہ تو سمجھتا ہے اور نہ ان سے محبت کرتا ہے۔ ہا ہا! تمہاری پرچھائیں تو دیکھو۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے اس سے عشق ہے!

(ملازمہ کی پرچھائیں پر جھپٹتا ہے)

ملازمہ: سرکار، آپ کیا کر رہے ہیں؟ آہ! آہ!! آہ!!!

نوجوان: (بے پروائی سے دھکا دے کر) ہٹ جاؤ، راستہ میں سے۔ اے جوان حسین مخلوق! کیا تو وجود کے بغیر اپنا سایہ نہیں ڈال سکتی؟ بغیر راہ میں حائل ہوئے۔ بغیر بیہودہ گوشت اور خون اور ہڈیوں کے؟ میں سمجھتا ہوں کہ میں تجھے مار مار کے ایک ابدی، شریف، بے آواز پرچھائیں میں بدل سکتا ہوں ....

ملازمہ: (زور سے چیختی ہے) دیوانے ہو گئے۔ چھوٹے سرکار دیوانے ہو گئے۔

(نوجوان کی ماں داخل ہوتی ہے)

ماں: کیا بات ہے؟

ملازمہ: ان پر آسیب کا اثر ہو گیا ہے، مالکن۔ اس کمرے میں آسیب ہے اور مجھ پر آسیب کا اثر ہو رہا ہے، اور میں اس گھر سے جا رہی ہوں .....

(روتی چیختی باہر بھاگ جاتی ہے)

نوجوان: نمستے ماتا جی۔

ماں: نمستے بیٹا۔ تم جانتے ہو کہ تمہارے امتحان میں صرف بارہ دن رہ گئے ہیں، اور پچھلے چند مہینوں سے بس تمہارا صرف یہی کام رہ گیا ہے کہ پرچھائیوں کو دیکھتے رہو اور اُن سے باتیں کرتے رہو .....

نوجوان: ماتا جی، سنئے.... پتا جی کہاں ہیں؟

ماں: اُن کی خاک دھرتی میں گاڑدی تھی بیٹا۔

نوجوان: وہ اب ایک پرچھائیں ہیں۔ اسی لئے میں اُن سے محبت کرتا ہوں۔

ماں: بھگوان کی اُس اندھیری رات سے اب تک بیٹا تم ایسی عجیب عجیب باتیں کر رہے ہو۔

نوجوان: ماتا جی کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ سے زیادہ آپ کی پرچھائیں سے محبت کرتا ہوں؟ حقیقت میں مجھے پرچھائیں اُس چیز سے زیادہ محبوب ہے جسے کم عقل لوگ ٹھوس مادہ کہتے ہیں: درخت جو پھولوں کی آگ میں دہک رہا ہو یا مور اپنے ہفت رنگ پروں کے باوجود اتنا حسین نہیں ہوتا جتنا کہ اس کا سایہ۔ آہ! اور پہاڑ پر بادل کا سایہ اور ٹیلے پر پرندے کی پرچھائیں۔ اور کھیت پر ریل کا سایہ، اور پانی پر جہاز کا سایہ۔ یہ سب پرچھائیاں مجھے دیدو۔ اور میں اُن کے آگے ماتھا ٹیک دوں گا۔ اور اُن کی پوجا کروں گا۔

اور اُن سے اپنی آشنا کو تسکین دوں گا۔ کیونکہ پرچھائیں پوتر اور نیک اور معصوم ہوتی ہے۔ عظیم، خاموش اور کبھی خراب نہ ہونے والی۔ سانپ کی پرچھائیں زہر سے خالی ہوتی ہے اور شیر کی پرچھائیں میں چیر پھاڑ ڈالنے والی بھوک نہیں ہوتی۔ اور ہاں، پنڈت کی پرچھائیں اس گندگی سے پاک ہوتی ہو جو اس کے وجود میں بسی ہوتی ہے، اور مندر کی پرچھائیں کو اُس ریاکاری اور مکاری سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا جو اُس کے اندر آباد ہوتی ہے۔ سرکاری افسر کی پرچھائیں اُس کوڑھ سے آلودہ نہیں ہوتی جو اُس کے دل میں بھری ہوتی ہے، اور قشقہ لگائے ہوئے پجاری کا سایہ اُس فریب سے آزاد ہوتا ہے جو اُس کے تلک میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اجی ماتا جی! کتنی شاندار چیز ہوتی ہے پرچھائیں!

ماں: بیٹا تم پرچھائیوں کا پیچھا کر رہے ہو۔

نوجوان: میں پرچھائیوں کا پیچھا کرتا رہوں گا۔ تاآنکہ روشنی کے دروازے پر پہنچ جاؤں ـــــ روشنی جو آخری اگنی پرچھائیں ہے۔ ساری پرچھائیوں کا سنگم جس میں روشنی ذرا بھی جگہ نہیں پا سکتی۔ ارے ماتا جی، دیکھو... دیکھو....

ماں: تم نے مہینوں سے اپنی سائنس کی کتابوں کو چھوا تک نہیں ہے۔

نوجوان: میری انگلیوں میں جو سائنس ہے اُسے دیکھو۔ پرچھائیوں کا علم الحیوانات دیکھو۔ لو دیکھو اب ماتا جی، یہ جنگلی گھوڑا ہے، اور یہ بندر ہے، اور یہ دیکھو یہ ایک بے مثل دریائی بچھڑا ہے۔ اور اب، ذرا غور سے دیکھو...... گھوڑا۔ ایسا کہ بڑے بڑے بادشاہ بھی اس کی سواری کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ ..... کتنی پھرتیلی اور جاندار اور مخمور پرچھائیاں ہیں....

ماں: تمہارے ماسٹر نے شکایت کی ہے کہ تم دل لگا کر حساب نہیں پڑھتے اور تمہیں معلوم ہے کہ تم حساب میں کتنے کمزور ہو۔

نوجوان: ماتا جی مجھے حساب سے نفرت ہے۔ زندگی اس کی اُلجھنوں سے بہت بالاتر ہے۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا شاہکار ہے۔ جس میں پرچھائیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ حقیقت میں ماتا جی پرچھائیوں کی دُنیا میں حساب کتاب ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی تفصیل نہیں ـــــ کیونکہ ہر پرچھائیں اسی نوعیت کی ہوتی ہے جیسی اور پرچھائیاں۔ جب سب مل جاتی ہیں تو ایک بڑی اور محترم پرچھائیں بن جاتی ہے۔ تفصیلات تو صرف تکرار اور تباہی اور تکلیف اور بیکار خوابوں کی دُنیا ہی میں ہوتی ہیں۔

ماں: تم بہک رہے ہو.....

نوجوان: میں تمہیں بھی پرچھائیوں سے محبت کرنا سکھا دوں گا... ایک نہ ایک دن دیکھ لینا، شاید کل۔ شاید آج ہی ـــــ شاید ـــــ ابھی! تم میں پرچھائیوں سے محبت کرنے والوں کی سی صلاحیت ہے۔ جب تم میرے مرے ہوئے پتا کی سمادھ پر پھول چڑھانے جاتی ہو تو حقیقت میں تم غیر شعوری طور پر پرچھائیوں کی تعظیم کرتی ہو ـــــ لیکن تمہیں یہ شعوری طور پر سیکھنا چاہیے۔ آؤ ماتا جی میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ اب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے جاؤ۔

ماں: تم نے اتنے زور سے مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے۔ لے رے بھاگنا!

نوجوان: یہ ماتا پہلا نام ہے جو انسان نے پرچھائیں کو دیا ہے.... ہاں چلو... نظر جما کر دیکھو میری آنکھوں میں.... دیکھو!.....

ماں: تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ مجھے مسحور کرو گے کیا؟

نوجوان: بس، ایک دفعہ، ماتا جی..... دیکھو!

ماں: میں نہیں دیکھتی۔ تمہاری آنکھیں ایسی ہیں جیسے آسیب زدہ پرچھائیاں۔

نوجوان: یہ اُن پرچھائیوں کے کنویں ہیں جو دُنیا میں سب سے زیادہ تنہا ہیں۔

ماں: دیکھو، دیکھو.....

نوجوان: کیسے ماتا جی؟

ماں: اپنے آپ کو تمہیں بحران ہو رہا ہے۔

نوجوان: عشق کا بحران ـــــ مجھے عشق ہے، عشق ـــــ میں چاہتا ہوں ـــــ میں چاہتا ہوں ـــــ

ماں: کسے؟

نوجوان: اُسے!

(پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے اور ایک تکیہ میں مُنہ چھپا لیتا ہے۔ پھر سر اُٹھاتا ہے۔ آنکھیں خشک کرتا ہے اور حقارت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتا ہے جو داخل ہو رہا ہے۔)

ماں: نمستے ڈاکٹر صاحب!.....

ڈاکٹر: گھر اور گھر والوں کا کیا حال ہے؟

نوجوان: نمستے ڈاکٹر صاحب۔ میں آپ کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تم سب ڈاکٹروں کو کچل دینا چاہتا ہوں، اور تمہارے ساتھ تمہارے دواخانوں کی ساری شیشیاں۔ اور تمہارا خون اور چمکتی ہوئی دوائیں بہا دینا چاہتا ہوں۔ محض اس وجہ سے باز رہتا ہوں کہ دواخانوں کی شیشیوں اور ڈاکٹروں کی پرچھائیاں ہوتی ہیں۔

(قدم جما کر آہستہ آہستہ باہر چلا جاتا ہے۔)

ڈاکٹر: نہیں، یقیناً دیوانہ نہیں ہے۔

ماں: محبت میں مبتلا ہے۔

ڈاکٹر: ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

ماں: اس نے ابھی اقرار کیا ہے۔

ڈاکٹر۔ کس سے محبت کرتا ہے؟

ماں۔ یہ میں نہیں سمجھ سکی۔ اور اُس نے مجھے بتایا بھی نہیں۔ مگر وہ تو پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا ہے۔ ایسی ہی حرکتیں عاشق بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ کل رات کو اُسے اچھی طرح نیند آگئی تھی؟

ماں۔ ہمیشہ کی طرح خراب۔ رات کو بہت بے چین رہتا ہے۔ رہ رہ کر نیند سے چونک پڑتا ہے۔ پلنگ پر سے اچھل پڑتا ہے اور لالٹین کی بتی بڑھا کر ہاتھ نچایا کرتا ہے اور دیوار، میز، کرسیوں پر پرچھائیوں کو حکم دیتا رہتا ہے۔ عجیب و غریب پُراسرار اشارے کرتا ہے گویا کوئی بہت پُرانی بھولی ہوئی رسم ادا کر رہا ہو اور پھر آخر میں جھک کر اپنی پرچھائیں کو پکڑنا چاہتا ہو۔

ڈاکٹر۔ اس بیان ہی کو سنکر تعجب ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ اس نے کالا جادو سیکھنا چاہا ہو؟ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر کوئی جادوگر ہے جو منھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ لیکن اس میں یہ قوت ہے کہ خاموشی ہی میں اپنے خیالات دوسروں کے دلوں میں پہونچا دیتا ہے اور اُن سے دریافت کر لیتا ہے کہ کالا عرق کس برتن میں ڈالنا ٹھیک ہوگا۔ کالا زہر۔ جادو کا۔ یا شاید......

ماں۔ میں اُسے سارے وقت اس قدر غور سے دیکھتی رہتی ہوں ــــ لیکن میں نے تو اُسے اپنے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا نہیں۔ ہمیشہ اندر ہی رہتا ہے۔ اگر کبھی باہر جاتا بھی ہے تو بس اُن کی سمادھ تک جن سے اُسے بیحد محبت ہے۔ (آنسو بہاتی ہے) لیکن میرا بچہ تو بالکل سادھو ہے۔ نیک، شریف۔ بڑی اچھی طبیعت کا لڑکا ہے۔ میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے۔

ڈاکٹر۔ کیا آپ نے اُسے کسی عورت کی تصویر کے قریب دیکھا ہے؟

ماں۔ نہیں، کبھی نہیں......

(ملازمہ چیختی چلاتی کمرے میں بھاگتی ہوئی آتی ہے۔)

ملازمہ۔ مالکن، مالکن.... چھوٹے سرکار ابھی ابھی چمن کی پگڈنڈی پر سے ہو کر سمادھ کی طرف گئے ہیں۔ جاتے میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہنے لگے: "مجھے عشق ہے" ــــ ایک ایک لفظ اس طرح کہا جیسے کوئی منتر کے واسطے گنے ــــ انہوں نے کہا کہ وہ عاشق ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا کہ مجھ پر ــــ میں دھرم سے کہتی ہوں مالکن ــــ اور پھر ماتما جانتا ہے۔ اور پھر بھی مجھے وہم سوار ہے۔ مجھ پر آسیب ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ہونے والا ہے۔ میں اب اس چار دیواری میں نہیں رہ سکتی، ان کرسیوں، اس میز، اور اس چراغ کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ ــــ کئی کئی دنوں سے مجھ پر جادو کا اثر ہو رہا ہے ــــ اور اب مجھے پرچھائیوں سے ڈر لگتا ہے ــــ

جی ہاں خود اپنی پرچھائیں سے بھی ــــ

ماں۔ ارے ارے تو ڈر کیوں رہی ہے؟

ڈاکٹر۔ (بیگ میں سے سفوف نکالتا ہے) کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے، لو، اب ذرا اپنی طبیعت سنبھالو اور پانی کے ایک گھونٹ کے ساتھ اِسے پی لو۔ اعصاب کی کمزوری ہے، بس اور کچھ نہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ (ماں کو ایک طرف لے جا کر) میں تو سمجھتا ہوں کہ ساری مصیبت کی جڑ یہی ہے، اور اسے گھر میں اب نہیں رہنا چاہیئے۔ ورنہ لڑکا کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھے گا۔ یہی ہے وہ کالا جادو.... اور اب میں چلتا ہوں۔ کل پھر آؤں گا۔ نمستے۔

(ڈاکٹر جاتا ہے)

ماں۔ اچھا شانتی مجھے سچ سچ بتا۔ کیا اس نے کبھی تجھ سے کچھ کہا ہے؟

ملازمہ۔ جی ہاں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ "مجھے چراغ پسند ہے کیونکہ اس سے میری پرچھائیں پیدا ہوتی ہے"......

ماں۔ اور کیا کہا ــــ کیا اُس نے کبھی تیرا ہاتھ چھوا؟

ملازمہ۔ ہاں مالکن۔ وہ اکثر میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہیں۔

ماں۔ اور اُنہیں چومتا ہے؟

ملازمہ۔ نہیں ــــ میرے ہاتھوں سے پرچھائیاں بنانا سکھاتے ہیں۔ اور میں اتنی سی مشق ہی میں اپنی اُنگلیوں سے ڈھانچ کی پسلیاں بنا سکتی ہوں۔ ــ آہ ــ اور اب میں پاگل ہو رہی ہوں۔

ماں۔ جب وہ تمہارے ہاتھوں کو چھوتا ہے تو تمہیں کیا معلوم ہوتا ہے؟

ملازمہ۔ یہ کہ میرے ہاتھ پرچھائیاں بن جائیں گے۔

ماں۔ کیا اُس نے کبھی تم سے کہا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے؟

ملازمہ۔ انہوں نے صرف ایک دفعہ کہا تھا کہ انہیں عشق ہے......

ماں۔ تم سے؟

ملازمہ۔ نہیں مالکن ــــ میری پرچھائیں سے ــــ افسوس! میں اب دیوانی ہو جاؤں گی۔ بالکل دیوانی ــــ

(نوجوان ہاتھوں میں پھول لئے داخل ہوتا ہے)

نوجوان۔ چلا گیا وہ؟ اچھا ــ شانتی اب سنو.....

ملازمہ۔ اچھی مالکن، دیکھئے دیکھئے ــــ ان کے سایہ کو دیکھئے۔ کس قدر حسین اور مہربان ہے ــــ ذرا اس کے خطوط اور خموں کو دیکھئے.. کس قدر شاہانہ.....

نوجوان۔ ماتا جی۔

ماں۔ تم کیا لائے ہو؟

نوجوان:۔ پھول۔
ماں:۔ کس کے لئے؟
نوجوان:۔ اُس کے لئے جس سے مجھے عشق ہے۔
ماں:۔ تو پھر اُسے دے دو۔
نوجوان:۔ لو تم لے لو ـــــ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسے یہ پھول دئے جائیں۔ کیونکہ مجھے صرف ایک سے محبت ہے، اور وہ ہے ہر ایک، اِن پھولوں کو روشنی کے سامنے بالکل سیدھا رکھو۔ دیکھو۔ اپنے ہاتھوں کی پرچھائیں اور پھولوں کی جیسے وہ پکڑے ہوئے ہے۔ کیا اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا!
ماں:۔ شانتی، چراغ لے جا اس کمرے میں سے۔ مجھے پرچھائیوں سے ڈر لگتا ہے۔

(سامنے کی دیوار پر ایک لمبا سا سایہ پڑتا ہے)

اری پرچھائیں .... اری پرچھائیں .... تو کون ہے؟

نوجوان:۔ یہ پتا جی ہیں، ہماری محبت کی پرچھائیں۔
ماں:۔ یہ کیا ہے؟ میں کہاں ہوں؟ اور یہ پھول تم کہاں سے لائے ہو؟
نوجوان:۔ پتا جی کی سمادھ سے۔ اس میں ایک نئے ادراک کی خوشبو بھری ہوئی ہے۔ جب وہ زندہ تھے تو ایک دفعہ پرچھائیوں کا پیچھا کرنے پر میرا گلا بس گھونٹ ہی دیا تھا ـــــ لیکن اب انہوں نے یہ پھول بھیجے ہیں۔ ادراکِ کامل کی نشانی بطور۔ لو دیکھ لو، وہ خود یہ دیکھنے آتے ہیں کہ میں تمہیں اپنے ساتھ سچ کی دُنیا میں لے جاؤں .... میں پرچھائیں کا عاشق۔
ماں:۔ اے پرچھائیں، میں تجھ سے محبت کرتی ہوں .....

(سایہ غائب ہو جاتا ہے)

ملازمہ:۔ (نوجوان کے سایہ کو مخاطب کرکے) اے پرچھائیں، میں تجھ سے محبت کرتی ہوں .....
نوجوان:۔ بالآخر ہم، پرچھائیں کے عشاق، خود بھی پرچھائیاں، اپنے نئے گھر کا راستہ لے رہے ہیں۔ اُس گھر کا جس میں زندگی کی دُلہن ہمارا انتظار کر رہی ہے ..... آؤ میں تمہیں اس نئے گھر میں لے چلوں۔

(اندھیرے دروازے میں سے روشنی کا طوفان سا داخل ہوتا ہے، جو علامت ہے ابدی رحمت کی۔)

(پردہ)

(ہر تمدنا تھ چٹو پادھیا)

مترجمہ:۔ شاہد

اِعتراف

کھیل کھیلے تھے، مگر جیت کی بازی ہاری!

میری بھرپور جوانی کی شرارت سمجھو!
ایک بے داغ جوانی کو مٹایا میں نے
اپنے غمزوں کو جو خونریز بنایا تھا مجھے
ان کے مُنہ خونِ جگر اس کا لگایا میں نے
اس لئے کہ مری آنکھوں میں ستارے جھکیں
اُس کی آنکھوں کے چراغوں کو بجھایا میں نے
میرا مطلب تھا سناں بار ہوں میری پلکیں
اُس کی آہوں سے انہیں درس دلایا میں نے
ناز کہتا تھا کہ بن بن کے ہنسنا سیکھو
آپ بن بن کے اُسے خوب بنایا میں نے
عربدہ جوئی مُصر تھی کہ رُلا کر دیکھوں
اپنے اشکوں پہ اُسے خُون رُلایا میں نے

اک ادا عین لگاوٹ میں ٹھٹھک جاتا تھا
کھیل تھا، دل کو اسی کھیل سے بہلاتا تھا!

دل لگی آپ سمجھ لیں اسے جہلِ حسن کی
دل لگی میں نہ یہ دھیان آیا کہ کل کیا ہوگا
سازِ تفریح بنا تو لیا بیتابی کو
یہ نہ سوچا کہ مجھے خود بھی تڑپنا ہوگا
اس کے اشکوں میں خوشی میری نہا کر نکلی
نیر میں نینوں کے اب ڈوب مجھے مرنا ہوگا
میری آنکھوں کا نہ بھیگے وہ ساون بھادوں
گریہ یونہی کبھی تھمے گا کبھی جمنا ہوگا!
اب ندامت سے کیا سنگدلی نے پیماں
اس بھرے گھر میں تباہی کا بسیرا ہوگا

ہم نے خود اپنے ہی پاؤں پہ کلہاڑی ماری
کھیل کھیلے تھے مگر جیت کی بازی ہاری!

ممتاز صدیقی

۱۹۸۲

"وہ آ رہے ہیں۔"

"کون؟"

"ارشد بھیا اور بہن صغریٰ۔"

"کیوں؟"

"سنا ہے اُن کے لڑکے واحد کو کمیشن مل گئی ہے اور وہ ریزرو فورز میں سیکنڈ لفٹیننٹ بن کر لاہور جا رہا ہے۔"

"پھر؟"

"وہ جانے سے پہلے اُسکی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔"

پروفیسر خیال پر اس خبر نے کچھ اثر نہیں کیا۔ وہ بدستور میز پر جُھکا ہوا لکھتا رہا۔ اپنی بیوی کی باتیں اُسے دخل در معقولات معلوم ہوتی تھیں۔ اُس کے ایک ایک خفقہے کے لفظ بتاتے تھے کہ وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اور اپنی بیوی کے عتاب میں آنے سے بھی ڈرتا ہے۔ اس کے سامنے میز پر کتابوں کا بے ترتیب انبار تھا۔ ان کو ترتیب دینے کے لئے اُس کے پاس وقت نہیں۔

سامنے دیوار میں تینوں دریچوں میں سے باغ کا کچھ حصہ نظر آتا ہے۔ دریچوں کے اُوپر کا حصہ ایک درخت کی شاخوں کے سامنے ہے۔ شاخوں پر پتے سُوکھے ہوئے ہیں۔ سُوکھے ہوئے پتے شام کے چار بجے کی شفق کو نظر آنے نہیں دیتے۔ سرد ہوا کے جھونکے کبھی کبھی کمرے کی خنکی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

پروفیسر خیال کی بیوی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا جواب دو گے؟"

"جواب دے دونگا۔"

"جواب دے دو گے! آٹھ سال کی منگنی کو توڑ ڈالو گے۔ شرم نہیں آئے گی تمہیں، لوگ کیا کہیں گے؟"

"تم میری طرف سے انکار پسند نہیں کرتیں؟"

"نہیں۔"

"تو فاخرہ انکار کر دے گی۔"

"فاخرہ انکار کرتی ہے تو کیا کرے۔ فاخرہ کو پوچھتا کون ہے! وہ کالج جانے لگی باتوں کو تم نے تو شرم اُتار کر پھینک دی ہے۔ کوئی لڑکی کو بھی پوچھتا ہے اُس کی شادی کہاں کی جائے۔ سر پر چڑھا رکھا ہے تم نے اُس کو۔ لوگ اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ آخر اس کا سشن جج کے لڑکے سرور یا یک کیساتھ گھومنے کا کیا مطلب ہے ـــــ"

"فاخرہ بی۔ اے۔ کی سٹوڈنٹ ہے۔"

"ـــــ اچھے ہیں بیچارے ارشد بھائی جو یہ سب کچھ دیکھ کر بھی چُپ ہیں۔ کوئی غصّے والا ہوتا تو منگنی توڑ پھوڑ کر ایک طرف ہوتا۔ کہتے تھے واحد سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔ وہ فاخرہ سے محبت کرتا ہے۔ اور اُس سے شادی کر کے اُسکی یہ آزادیاں ختم کر دینا چاہتا ہے ـــــ"

ملازم نے اندر آ کر کہا: "وہ آ گئے ہیں۔"

پروفیسر کی بیوی اُٹھ کھڑی ہوئی: "وہ آ گئے! اور تم نے چائے تیار کر لی ہے؟"

"تھوڑی دیر اور لگے گی۔"

"جلدی کرو۔ اور دیکھو اُن کو جب تک یہیں لے آؤ۔"

"ارے بھئی انہیں نہیں!" پروفیسر نے بے قراری سے کہا: "اُن کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔"

ارشد اور اُس کی بیوی صغریٰ اندر آ گئے۔

"اوہ! تم آ گئے!" پروفیسر کھڑا ہو گیا: "کیسے ہو ارشد؟ اور تم بہن؟"

"شکریہ!"

وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کیا لکھ رہے ہیں آج کل آپ؟" ارشد نے پوچھا۔

"ایک ڈرامہ ہے۔"

"کیا موضوع ہے؟"

"ہندو مسلم اتحاد!"

"پلاٹ کیا ہے؟"

"جدید ادب میں پلاٹ نہیں ہوتا۔ آنے والے اور جانے والے زمانے کی کشمکش ہے۔ جانے والی دُنیا کے نظریئے آنے والی دُنیا کے پہیوں کے نیچے زندہ رہنے کی بے سُود کوشش کرتے ہیں۔ ایک لڑکا منصور اور ایک لڑکی سنتوش ایک دوسرے کی محبت میں وارفتہ ہیں۔ منصور نے اپنا نام منصور اس لئے نہیں رکھا کہ وہ ایک مسلمان لڑکا ہے۔ سنتوش نے بھی اپنا نام سنتوش

لئے نہیں رکھا کہ وہ ایک ہندو کی لڑکی ہے۔ انہوں نے ایسے نام محض اپنی
ذاتی پسندیدگی کی بنا پر انتخاب کئے ہیں۔ سوسائٹی کی مخالفت کے باوجود
ان کی شادی ہو گئی۔ مذہب کی مخالفت کے باوجود لڑکی اپنے آپ کو مسز سقیہ
کہلاتی ہے۔ اور ـــــ

"وہی قانون شکن خیالات!"

"بہت شکن خیالات!"

"کب اسٹیج ہوگا یہ ڈرامہ؟"

"کونووکیشن کے موقع پر۔ اور ہمارے پاس اس دفعہ قابل ایکٹروں کی ایسی شاندار ٹیم ہے کہ یہ ڈرامہ ہمارے کالج میں ایک غیر فانی کارنامہ بن جائے گا۔"

"کون ہیں ایکٹر؟"

"ہماری لڑکی فاخرہ اور سیشن جج کا لڑکا سرودیاپک!"

سرد ہوا کے ایک جھونکے نے دریچوں میں سے اندر آکر فضا کو بکھیر دیا۔

آخر ارشد نے کہا: "میں آپ سے فاخرہ اور سرودیاپک کے متعلق کچھ پوچھنے آیا تھا۔"

"پوچھئے!"

ملازم نے اندر آکر کہا: "چائے تیار ہے۔"

پروفیسر کی بیوی نے شور مچا دیا: "ہاں ارشد بھیا پہلے چائے۔ چھوڑو ان فضول باتوں کو، چلو بھی۔"

وہ جانے کیلئے کھڑے ہو گئے۔

ارشد نے جاتے ہوئے کہا: "خیال صاحب! آپ بھی آئیے۔"

"نہیں نہیں، بھیا!" پروفیسر کی بیوی نے فوراً کہا: "رہنے دو انکو۔ آج اتوار ہے۔ اتوار کے دن نہانا، شیو کرنا اور اس کرسی سے اٹھنا انکو حرام ہے۔ ان کی چائے یہیں آجائے گی۔"

سب اندر چلے گئے۔

پروفیسر خیال بڑے انہماک سے لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ ملازم آہستہ سے چائے کی ٹرے لاکر تپائی پر رکھ دی۔ اور چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد پروفیسر کی نظر ٹرے پر گئی۔ اس نے ایک پیالی میں چائے بنا کر پینا شروع ہی کی تھی ـــــ

یکایک دروازہ کھلا اور پروفیسر کی بیوی گھبرائی ہوئی اندر آئی۔

"سنا بھی کیا ہو گیا؟"

"کیا ہوا؟"

"میں پہلے ہی جانتی تھی کہ تمہیں فاخرہ کو اتنی آزادی دینے کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔ دیکھا وہی ہوا نا جو میں کہتی تھی۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"وہ چھنال پکنک پر نہیں گئی۔ اسی دن سے سرودیاپک کیساتھ کہیں غائب ہے۔"

"یعنی سرودیاپک، فاخرہ کو کہیں اغوا کر کے لے گیا ہے؟"

"نہیں فاخرہ، سرودیاپک کو کہیں اغوا کر کے لے گئی ہے۔"

"سچ کہتی ہو؟"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اُف! مجھے تمہاری خوشخبری سے کتنی خوشی ہوئی ہے۔"

"خوشی!"

"کچھ معلوم ہے وہ کہاں گئے ہیں؟"

"کیوں؟"

"ممکن ہے ان کے پاس شادی کیلئے کوئی پیسہ نہ ہو۔ میں انکو پانچ سو روپے ٹیلیگرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بکتے ہو؟"

"وہ بیچاری جانتی تھی کہ تم سرودیاپک کے ساتھ اس کی شادی کو پسند نہ کرو گی۔ کتنی دبی زبان سے اس نے سرودیاپک سے کہا ہوگا ـــــ چلو کہیں ایسی جگہ چلیں جہاں ہمارے درمیان کوئی دیوار حائل نہ ہو۔ جہاں ہم آزادی سے ایک دوسرے سے محبت کر سکیں۔ جہاں مذہب اور سوسائٹی کے قوانین ہم کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھیں۔ جہاں نام نہاد رشتہ دار ہمارے معاملات میں دخل انداز نہ ہوں ـــــ اس آزاد فضا میں زندگی شاداب ہوتی ہے، روح کو راحت ہوتی ہے، دل کو تسکین ہوتی ہے، دماغ میں پرواز ہوتی ہے۔ انسانی قوتیں آزادی میں پرورش پاکر اپنی تکمیل کرتی ہیں اور آئندہ نسلوں میں آزادی اور علوم کے لئے ایک بے پناہ تڑپ پیدا کر دیتی ہیں۔ اے لڑکی! میں تیری جرات کی داد دیتا ہوں، تو نے اپنے باپ کی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ تیرا نام انسانیت کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائیگا ـــــ"

"بڑی نیکی کی ہے نا اس نے!"

"لڑکے کا لڑکی کو اغوا کر کے لیجانا معمولی بات ہے لیکن لڑکی کا لڑکے کو اغوا کر کے لے جانا معمولی بات نہیں۔"

"تم بڑے بے غیرت ہو۔"

"تم اپنے ہاتھوں سے اپنی لڑکی کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا چاہتی ...

میں [illegible] بڑی بے عزتی بھی جاتی تھی کہ وہاں اس بے عزتی سے بچنے کو لئے پیدائش کے وقت ہی مار ڈالتے تھے میں بھی کچھ اسی قسم کی جہالت کا آدمی ہوں، اُس وقت کے تصور سے جبکہ مجھے اپنی فاخرہ کو کسی غیر شخص کو سپرد کرنا پڑتا، میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا تھا۔ میری بیٹی نے مجھ کو اس بے عزتی سے بچا لیا"

باہر پیروں کی آہٹ سنائی دی۔

"خدا کے لئے اِن بے ہودہ باتوں کو چھوڑو۔ کسی طرح سے اُس ناہراد کو واپس لانے کا انتظام کرو اور جتنی جلدی ہو سکے واحد سے اس کا کالا منہ کر دو"

پیروں کی آہٹ زیادہ نزدیک آ گئی۔

"وہ آ رہے ہیں، اُن کے آگے ذکر نہ کرنا"

ارشد اور صغریٰ اندر آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"تم کدھر بھاگ گئی تھیں بہن" صغریٰ نے پروفیسر کی بیوی سے کہا "ہم جانے پر اکیلے رہ گئے"

"مجھے ان سے ذرا کام تھا"

"ارشد صاحب!" پروفیسر [illegible] کا رُخ اُن کی طرف کر کے بیٹھ گیا۔ "واحد کو کمیشن ملنا مبارک ہو۔ خوشخبری سے بڑی خوشی ہوئی"

"شکریہ!"

"اب تو ہم اس سے بڑی خوشی دیکھنا چاہتے ہیں، بھیا!" صغریٰ نے ہنستے پروفیسر سے کہا۔

"کیا!"

"واحد کی شادی"

پروفیسر کی بیوی فوراً بولی "ضرور بہن، ضرور، کیوں نہیں، خدا [illegible] سب کو دکھائے، جب چاہو کرو"

"بس خیال بھیا کی ہاں چاہیئے"

"اِنکی بات بھی وہی ہے جو میری ہے۔ ہم تھوک کر نہیں چاٹیں گے اگر ایک دفعہ زبان دیدی تو پیچھے نہیں ہٹیں گے"

"تم پر تو [illegible] بھروسہ ہے، بہن، لیکن خیال بھیا کچھ اُکھڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں"

سب پروفیسر خیال کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اپنے فاؤنٹین پن کو ساتھ کھیل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کو بیچ میں نہ گھسیٹا جائے۔ چاروں طرف سے گھورنے والی نظروں نے اُسے بے چین سا کر دیا۔ اس کو محسوس ہوا [illegible]

"مجھے بھی وہ بہ اب" پروفیسر کی بیوی نے بھولے پن سے کہا۔ وہ تو شکر ہوا کہ ملازم چائے کی ٹرے لینے کے لئے اندر آ گیا اور سب کی توجہ اُس پر چلی گئی۔

ملازم کے جانے کے بعد بالآخر ارشد نے کہا "مسٹر خیال! ہم واحد کے جانے سے پہلے اُسکی شادی ضرور کر دینا چاہتے ہیں"

"ضرور، کر دو۔ میرج الاونس کیوں ضائع جائے"

"تو آپ رضامند ہیں"

"میں! بابا میری شادی تو ہو چکی ہے"

"مذاق چھوڑیئے! میرا مطلب ہے کہ کیا آپ واحد اور فاخرہ کی شادی پر رضامند ہیں"

"یہ سوال تو فاخرہ سے ہو سکتا ہے"

"اُن کی منگنی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں"

"منگنی شادی کا ارادہ ہے۔ ارادے ٹوٹ بھی تو جاتے ہیں"

"گویا آپ اس شادی کے حق میں نہیں"

"میرا خیال ہے فاخرہ واحد کو پسند نہیں کرتی"

"کیوں؟"

"میں نہیں جانتا فاخرہ کو اِس رشتے کے خلاف کیا اعتراض ہوگا۔ ممکن ہے اُس کو اُس کی بدصورتی کا بھی خیال ہو۔ لیکن میرا خیال ہے سب سے بڑی وجہ اُن کے ذہنی تفاوت میں ہے۔ اُن کی طبیعتیں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ واحد مولویانہ رجحان کا لڑکا ہے اور فاخرہ باغیانہ خیالات رکھتی ہے۔ واحد کو گالزوردی پسند ہے، فاخرہ برنارڈ شاہ کو زیادہ پڑھتی ہے۔ واحد مذہب اور سوسائٹی کے قوانین کو مقدس چیزیں سمجھ کر اُن کی پابندی کا قائل ہے۔ فاخرہ کے نزدیک وہ وقت کے ساتھ بدل جانے والی چیزیں ہیں اور اُن کی پابندی لازمی نہیں۔ واحد، فاخرہ سے تین سال کے قریب بڑا ہے، اور اتنا ہی عرصہ پہلے اُس نے تعلیم شروع کی تھی۔ اب وہ دونوں بی۔ اے میں اکٹھے ہیں۔ واحد کو اس وقت تک آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد انگلستان سے کورس لیکر واپس آ جانا چاہئے تھا۔ فاخرہ کلاس میں صرف ایک لڑکے کو چھوڑ کر سب سے بہتر سٹوڈنٹ سمجھی جاتی ہے۔ واحد ایک جماعت میں فرسٹ اور فاخرہ ہمیشہ سیکنڈ رہتی ہے، واحد [illegible] میں اکثر فیل ہوتے دیکھتا ہوں"

"کچھ بھی ہو، رینڈ و فورس میں سیکنڈ لفٹیننٹ کوئی معمولی [illegible]"

"یقیناً معمولی بات نہیں۔ وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ واحد دماغی قوتوں سے سراسر عاری ہے۔ اور اُس کا جسم کسی [illegible]

آپ کا کام پڑھنے کے سوا اور کسی کام میں نہیں آ سکتا۔ جس کی مثال یہ ہے کہ جنگ کے بعد جب فوجیں توڑ دی جاتی ہیں تو معمولی سپاہی تو بیچارے کسی تحصیل میں چپراسی کی ملازمت اختیار کر لیتے ہیں اور افسروں کو میس الاؤنس بند ہو جانے کی وجہ سے اپنی بیویوں سے جنگ کا اعلان کر کے ایک نئے محاذ پر لڑنا پڑتا ہے۔"

"لے بھیا ارشد" پروفیسر کی بیوی آخر چلا اٹھی۔ "ان کی کیا سنتے ہو۔ یہ تو یونہی بڑبڑایا کریں گے۔ تم جا کے تیاری کرو۔ میں لڑکی تم کو دونگی۔"

"فاخرہ مجھے اسقدر پیاری ہے کہ میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہونے دوں گا۔"

"ارشد بھیا! صغریٰ بہن! تم جاؤ، بات طے ہو گئی۔ کوئی مناسب تاریخ مقرر کر کے پتہ دونگی۔ اس دن برات لیکر آ جاؤ۔"

ارشد اور صغریٰ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

پروفیسر نے کہا: "مسٹر ارشد آپ کو ناکامی ہو گی۔"

ارشد نے پوچھا: "کیوں؟"

"فاخرہ تین دن سے سرو ویاپک کے ساتھ غائب ہے۔ ان کی شادی ہو چکی ہو گی۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

سرد ہوا کا ایک جھونکا خشک پتوں میں سے کھڑکھڑاتا ہوا نکل گیا۔

پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سب پروفیسر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ پروفیسر کی بیوی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ارشد اور صغریٰ حیرت کی بے جان تصویریں بنے کھڑے ہیں۔ پروفیسر انتہائی بے پروائی کے انداز میں بیٹھا ہے۔

پروفیسر کی بیوی نے سوچا زبان ہلائے بغیر حالات اور بھی خراب ہو جائیں گے۔ "جھوٹ! ارشد بھیا! سفید جھوٹ! بکتے ہیں یہ۔ صغریٰ بہن! ان کی ایک نہ سنو۔"

"اغوا کی شادی بہترین شادی ہے۔ اغوا لڑکا اور لڑکی کی رضامندی کا ثبوت ہے۔ اغوا شادی کے معاملات میں ماں باپ کے غیر متعلق افراد ہونے کی دلیل ہے۔ اغوا ایک کامیاب ازدواجی زندگی کا امید افزا آغاز ہے۔ بہت سے کامیاب زندگیاں اپنی مسرتوں کے لئے اغوا کے احسان سے زیر بار ہیں۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔"

"تم!" ارشد کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"میں ایک نازک مزاج خوبصورت لڑکی کو انگریزی پڑھاتا تھا جو ایک سکول میں پڑھتی تھی۔ ان دنوں میں نیا نیا پروفیسر مقرر ہو کر اس شہر میں پہنچا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب اس کو لیکر کشمیر بھاگ گیا اور ایک ہفتہ کے اندر ایک ہاؤس بوٹ میں اس کے ساتھ شادی کر لی۔ مگر چونکہ اس شادی سے میری بہت سی آزادیاں مجھ سے چھین لیں اس لئے پہلے مجھے کافی سے زیادہ پشیمانی محسوس ہوتی رہی، لیکن وہ تردیدی عمل شادی کے خلاف تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ شادی کے خلاف نہیں تھا۔ میری پبلک زندگی میں کامیابی کا انحصار محض اس لڑکی پر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کی شادی اس نارمل پاس سکول ماسٹر سے ہو جاتی جس کے ساتھ بچپن میں اس کی منگنی ہو گئی تھی تو وہ کبھی خوش نہ ہوتی۔ اس طرح ایک معصوم زندگی خاک میں مل جاتی۔ اور میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس صورت میں میں بھی تباہ ہو جاتا۔ کیونکہ ممکن ہے مجھے کسی اور لڑکی کو اغوا کرنے کا موقع ملتا۔"

"کون تھی وہ بے حیا لڑکی؟" صغریٰ نے غصے میں ڈوبے ہوئے لفظوں سے پوچھا۔

"فاخرہ کی ماں۔"

"فاخرہ کی ماں!"

"ہاں فاخرہ کی ماں جو فاخرہ کے اغوا پر شرم سے پانی پانی ہوتی جاتی ہے۔"

حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھیں فاخرہ کی ماں پر مرکوز ہو گئیں۔

ملازم نے اندر آ کر کہا: "فاخرہ خاتون آ گئی ہیں۔"

"فاخرہ!"

"فاخرہ!"

"فاخرہ!"

ملازم نے حیران ہو کر سب کی طرف دیکھا اور کہا: "...اندر سشن جج کا لڑکا۔"

دو سہرے لے فاخرہ اور سشن جج کا لڑکا اندر آ گئے۔

"گڈ آفٹر نون پاپا — آفٹر نون، ممّا — کیسے ہیں آپ مسٹر ارشد!—"

"لڑکی!" فاخرہ کی ماں نے مہمانوں کے سامنے فاخرہ کی زبان درازی کو روکنے کے لئے کہا۔

"ممی! پہلے چائے منگوائیے — چنو! جاؤ! ہمارے لئے چائے لاؤ —"

ملازم اندر چلا گیا۔

"فاخرہ بیٹی! پکنک پارٹی آ گئی؟"

"مجھے معلوم نہیں پاپا، سرو ویاپک اور میں پکنک پر نہیں گئے

"پھر؟"

"اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ٹیگور اپنی پارٹی کے ساتھ لاہور میں آیا ہوا ہے۔ پکنک کی دلچسپیاں پھیکی پڑ گئیں۔ سرود یاپک رضامند ہو گیا، ہم انچارج کو خبر کئے بغیر دوسرے پلیٹ فارم سے لاہور روانہ ہو گئے"

"ٹیگور کی پارٹی لاہور سے چلی گئی؟"

"نہیں"

"پھر تم کیوں آ گئیں؟"

"بڑا دلچسپ واقعہ ہے ۔۔۔"

ملازم نے چائے کی ٹرے کو تپائی پر رکھ دیا۔ فاخرہ اور سرود یاپک دو کرسیوں پر آمنے سامنے چائے پینے کیلئے بیٹھ گئے۔

"۔۔۔ بڑا دلچسپ واقعہ ہے، پاپا۔ ہم سٹینڈرڈ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ایک دن ایک [illegible] خیریت سے گزر گئے۔ دوسری رات معلوم نہیں ان حضرت کو کیا ہو گیا۔ بڑبڑانے لگے ۔۔۔ فاخرہ! میں تم سے محبت کرتا ہوں، تم چودھویں رات کا چاند ہو۔ تم رعنائی کے چمن زار کا شگفتہ پھول ہو، تم ساحری کا بولتا جادو ہو۔ تم [illegible] تم پر جان دیتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں [illegible] بستر پر لیٹی ہوئی تھی [illegible] کے پاس ایک کرسی [illegible] اپنے دونوں [illegible] کے ساتھ اس [illegible] قدر بے رحمی سے [illegible] ساتھ گر کر قلا بازی کھاتے ہوئے کمرے [illegible] جا گرے۔ ہوٹل کے نے گھنٹی بجا کر اس کو ٹیکسی کا انتظام [illegible] دیا۔ اور انتہائی غصے میں اکیلی واپس آنے کے [illegible] لگا ۔۔۔ فاخرہ! مجھے معاف کر دو۔ میں [illegible] ہوں۔ مجھے غلط فہمی تھی۔ میں آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ [illegible] میں اس کے ساتھ واپس آنے پر رضامند ہو گئی۔ لیکن رضامندی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں نے اس کو معاف کر دیا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ میرے پاس واپس آنے کیلئے ریلوے کا کرایہ نہیں تھا۔ راستے میں میں نے [illegible] بالکل بات نہیں کی۔ صرف ایک مرتبہ اس نے کہا تھا کہ یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے"

ارشد اور صغریٰ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ پروفیسر کی بیوی غرق ہونے کے لئے جگہ ڈھونڈ رہی تھی۔ پروفیسر تذبذب کے عالم میں پین کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔

چائے کی دو پیالیاں تیار کر کے، فاخرہ نے ایک سرود یاپک [illegible] کچھ عرصہ تک کمرے میں چائے کی چسکیوں کی آہٹ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

آخر ۔۔۔

"تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو، سرود یاپک؟"

"آپ نے وہ ڈرامہ مکمل کر لیا؟"

"ابھی تھوڑا سا باقی ہے"

"آپ شعور اور سمتیہ کی شادی کو جائز سمجھتے ہیں؟"

"بیشک!"

"آپ زندگی کے حقیقی اسٹیج پر ایک حقیقی ڈرامے کو پسند کریں گے؟"

"ہاں"

"تو پھر اپنی رضامندی دے دیجئے"

"یعنی"

"پروفیسر! آپ خدا ہیں"

"کیا کہتے ہو، سرود یاپک؟"

"آپ کا شعور ایک حقیقی شعور ہے۔ آپ کی سمتیہ ایک حقیقی سمتیہ ہے۔ دونوں حقیقی ایکٹر پردہ اٹھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اشارہ کر دیجئے پروفیسر ۔۔۔"

"سرود یاپک! تمہارا کیا مطلب ہے!"

"پروفیسر! میرا دل کہتا ہے مجھے غلط فہمی نہیں۔ فاخرہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ میرے ساتھ شادی کے لئے رضامند ہو جائے گی۔ وہ صرف آپ کی رضامندی کی منتظر ہے"

پروفیسر نے سائلانہ انداز میں اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

"فاخرہ؟"

"میں فیصلہ کر چکی ہوں، پاپا"

"کیا؟"

"کہ میرا ہونے والا خاوند کون ہوگا"

"کون ہوگا؟"

"واحد ۔۔۔!"

نفرت سے گدلائی ہوئی آنکھوں میں حیرت کی چمک پیدا ہو گئی۔

"۔۔۔ واحد کی بدصورتی میرے لئے اس کی سب سے بڑی [illegible] میں چاہتی ہوں میرے خاوند کو میرے سوا اور کوئی پسند نہ کرے۔ [illegible] کند ذہن اور بیوقوف ہے اس لئے مجھے اس پر حکومت کرنا [illegible] زندگی کے جادے میں میری رہنمائی کا دست نگر رہنا پڑے گا [illegible]

آگ کے پیڑ کی کلیاں

بھوری بھووں کی شکنیں، اور ہینٹوں کا پُر وقار انداز سے ہوا [illegible] بیا، کریپ و ساٹن میں ملبوس کندھوں کے جھٹکے، سلاجیوں کا سینڈیا [illegible]ست کیا جانا، نچلے ہونٹوں کا بھاری ہو کر لٹکنے لگنا، عفیف اور نیک [illegible] کی کھڑ کھڑ، یہاں تک کہ قابلِ احترام وِگ کی پوجیل فیصلہ کن [illegible]

"شریف لڑکیوں کے پڑھنے کے لئے نامناسب"

"ادب ایک عورت کی زندگی کا مشغلہ نہیں ہو سکتا"

معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک چہ بچے کے کنارے کھڑے ہیں۔

ہمیشہ، ہر زمانے میں، اور میں یہ کہنے کو تیار رہوں، بالکل درست [illegible] محترم! بجا ارشاد، معزز خاتون!

مگر، میرے عزیزو،

جب کوتے دل پر ٹھونگیں مار رہے ہوں تو چیخ نہیں روکی جا سکتی۔ [illegible] خدا کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں اسی کسک اور [illegible] اور چبھن میں مزا آتا ہے۔ کبھی تو وہ اپنا دل آستین پر لٹکا لیتے ہیں [illegible] کی قسم اپنے آپ انتخاب کی جا سکتی ہے۔ لیکن چاہے وہ [illegible] بھی ہوں، ہوتے ہیں بڑے جان لیوا، اور ان کی چونچوں کو [illegible] گوشت میں گڑتے ہوئے محسوس کرنا ہر کسی نرم و نازک کھال والے [illegible] کا نہیں ہے۔ ان خونخواروں کو دعوتِ مبارزت دینے والے سب [illegible] کی طرف سے عصمت کی ایک بڑی بہن جس نے بیورتھ کے [illegible] پر چلنے والی خشم ناک ہواؤں کو اپنی رُوح کی شکل میں تبدیل کر لیا [illegible] ہے۔ "جو کچھ میری رُوح نے برداشت کیا ہے اُسے میری رُوح [illegible] ہی اندر بیان کر سکتی ہیں"۔۔۔۔ عصمت بھی

جہنم کی غضب آلود روشنی میں کھڑی ہے۔

اس کے کان بھی عفریتوں کی کراہیں سن رہے ہیں۔

آہ، وہ منظر جسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں، [illegible] کرتی ہیں، سماج کا گھٹتا ہوا، پستا ہوا نیم مُردہ، بیجان [illegible] سے لپٹی ہوئی سکیوبائیں (Succubae)؛ [illegible] ہوئے، اپنے شکار کو چوس پھینکنے کے ارادے سے، [illegible] دست و گریباں، مگر اپنے مقصد میں مُتحد،

ان میں سے ایک کے (جو سب سے زیادہ ہولناک اور موذی ہے)

نہ آنکھیں

نہ کان

نہ مُنہ،

اِن سب کی جگہ ایک چکنا گول گنبد جس میں کوئی رخنہ نہیں۔ پلپلا جسم، متورم ہاتھ پیر، سوجی ہوئی چھاتیاں، پکی ہوئی جنسی کی سی سوزش اور سرسراہٹیں اور بدبو، [illegible] سے زیادہ سماجی جسم پر اپنا سر رگڑ رہی ہے، اُس کی نااطاقی کا [illegible] نہیں کرتی، اور اپنے گونگے تقاضے جاری رکھے ہوئے، اُس کی گھناؤنی اور دہشت انگیز ہیولن بڑھتی جا رہی ہے، کیا وہ پھوٹ پڑے گی؟ کاش کہ ایسا ہو! مگر اس کے اندر سے اُبلنے والے زہر سے [illegible] سکتا ہے۔ اور جو دوسری ہیں وہ بھی ایک [illegible] میں ابدی نیندیں، سینوں [illegible]

عصمت [illegible] منظر [illegible] پتھر بن گئیں۔ لیکن جب [illegible] اور چیزیں بھی دکھائی دے رہی تھیں، کراہیت، نفرت، کرب، [illegible]

اور

ایک سیاہ بغاوت، جوش [illegible] سماجی جسم کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کر دینے کا ارادہ، اور [illegible] دینے کیلئے سازو سامان،

بجلی کی طرح چمکتی ہوئی تیز تلوار، [illegible] والی کمند، کاٹ کی صفائی، چالاک چھلانگیں، حرکت کی پھرتی اور کچھ گویا آنکھ مچولی۔

اور اب

تاریکی کا دل ہے۔

عصمت کا ایک ایک شعر، ایک کتابچہ [illegible] روایات — کسی ناول کی شکل میں جس کی [illegible] ہے۔ [illegible] میں [illegible]

۱۹۸۲

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۶)

واحد ایک مذہبی ذہنیت کا لڑکا ہے اس لئے میں اُس کو [illegible] رکھنے کے لئے دوزخ اور جنت کے تازیانوں سے بھی کام [illegible] واحد کو میں نے واقعہ اب تک اپنی گرفت سے [illegible] میرا رعب اور وقار قائم رہے اور اب جب کہ [illegible] جہنم کا واحد ہوا ہے بہت خوشی ہوئی کہ [illegible] شادی سے اکثر دور ہی رہا کرے گا۔ واحد اپنے ماں باپ کا [illegible] لئے مشترکہ کی بیشمار جائداد اس کو ملے گی اور [illegible] خاتمہ ہو گیا جس کی اس تباہ کن جنگ میں توقع [illegible] دوسری شادی کیلئے کافی روپیہ ہوگا۔"

سرد ہوا کے ایک طاقتور جھونکے سے [illegible] ہاتھ سے چائے کی ٹرے کو فرش پر گرا کر چینی کے [illegible] خشک پتوں کا ایک دیوانہ گروہ قہقہے مارتا ہوا [illegible] ٹکڑوں سے کھیلنے لگا۔

انور [illegible]

[illegible]

کی ہے جسے تیز تر، تیز تر ... کیا ہم یہیں تک لاکر چھوڑ دیے جائیں گے؟ بس تھوڑی سی ہمت اور! ... خداوند سا قاتن کے نزدیک لشکر آ دیا ... خداوندی پرستی کیوں؟ ... قاتن اپنے لئے کیوں الگ بستی بسانے پر مجبور کیا جاتا ہے؟ ہاں، کیوں؟ ... کیا وہ ابھی اپنا [illegible] ہو سکے گا؟

ایک قدم اور بھی باقی ہے۔

جب مثلث کے تیسرے کونے کی اہمیت بالکل ختم ہو جائے اور دونوں نظاموں میں ایک دوڑ، ایک جنگ شروع ہو جائے، جب وہ ایک دوسرے کے لئے وبال ترین جائیں، جب ایک نظام کی رگیں دوسرے [illegible] ... مگر اس کے لئے بڑی ریاضت [illegible] سے بچا کر دیکھنا ہوتا ہے، اسے [illegible] ہوتا ہے، اس پل صراط میں سرنگ بنائی ہوتی [illegible] اپنے آپ کو تیزاب میں ڈالتا ہے۔ [illegible] اور ایسے آدمی کے [illegible]

[illegible] تیار رہتے [illegible] جن لوگوں کو ہم اس [illegible] سے ایک [illegible]

[illegible] فرشتے کی ہنسی" نہیں سُن [illegible] "فرشتے کی ہنسی اور عفریت [illegible]

[illegible] مکمل نہیں ہوتی۔

[illegible]

محمد حسن عسکری!

کتب خانہ علم و ادب میں بہترین کتابوں کا ذخیرہ

ناول

ابن الوقت (مولوی نذیر احمد)
ایامیٰ
رویائے صادقہ
توبۃ النصوح
مرآۃ العروس
بنات النعش
محصنات
سلامبو (مولوی عنایت اللہ)
…
لٹو دان (پریم چند)
میدان عمل
…
بردۂ مجاز
…
حسن سوز (رمز علی…)
…
…
…
…
راہ جان آوا (مرزا رسوا)
اختری بیگم
خونی …
خونی …
خونی بھید
خونی بھید
جویائے حق (شرر)
ایام عرب
مقدس نازنین
فتح اندلس
…
…

ایک خواب (شرر)
حسن کا ڈاکو
روضۃ الکبریٰ
قیس و لبنیٰ
ملک العزیز ورجنا
غیب دان دلہن
طاہرہ بیگم
ننکی کا کھیل
فلورا فلورنڈا
حسن انجلینا
منصور موہنا
…
دربار حرام پور
فردوس بریں
حسن بن صباح
…
افسانۂ قیس
…
…
…
… کی شادی
…
…
…
… (راشد الخیری)
… زندگی
… زندگی
… زندگی
… زندگی
طوفان حیات
نسوانی زندگی
ماہ عجم
…
عروس کربلا
… شام

جوہر … (راشد الخیری)
لالہ رخ (ل۔ احمد)
کھلا (رشید…)
دھرتی ماتا (ریو…)
بچھڑے
داستان (عابد علی)
قلوپطرہ (سلمیٰ تصدق)
قسیم (رائے آرا خاتون)
سراب ہستی (ایم اسلم)
نرگس
شب غم
طوفان (ٹیگور)
جیون پربھات
ترکش
تلاش کبیر (ترجمہ …)
ستم ہوش ربا
قسمت کا شکار
الفا
لکھنوی نواب
بحر فنا
نازک کنار
لعل مقدس
کری کا سپل
مصری جادوگر
مقدس جوتا
آتشی کتا
شاہی خزانہ
ڈاکٹر نکولا
انمول ہیرا
انصاف
چڑیا کی …
پہلا ہیرا
آزادی
قفس زریں

زہری … (… اسلم)
مرد میدان (مسعود علی)
جھانسی کی رانی
ضرب محمود (احسان الٰہی …)
اسرار دوشیزہ (ظہور احمد)
قتل … (حسرت)
ماہ ور خشاں (بیگم …)
انقلاب فرانس (عبد الرزاق)
ابو الاسرار کا چاند (حسرت)
مہدی (ایم اسلم)
ہلال و صلیب
عروس غربت
پیغام سروش
پس پار (ترجمہ …)
جعلی کرو… — …کی شہزادی
ہلاک جستجو — پیراہن آتشین
ابلیس و جمیلہ — راز قتل
کشتۂ ستم — ملوک دلشین
سلطان صلاح الدین
سراب … — قاتلہ
سعید و فلپانا — فتح روم
فیروز ڈاکو — فاتح یورپ
قاتل کی گرفتاری — آدمی …
قتل بہرام — رخصیہ پولیس
خون … — خونی آقا
خونی طوق — افسانۂ بابل
اختر و لیلیٰ — افسانۂ ثریا
ایڈیٹر کا حشر — آفتاب …
ایران کا چاند — اسلامی …
شہزادی خلود — محبوبۂ …
بصرہ کا ظالم گورنر
انوکھا عیار — بحری ڈاکو
بیوہ کی شرارت — پاسکو …
زیتوں کا درخت

ترکی … — پیاری …
… — …
… کی … — معرکۂ …
معرکہ … — معشوق …
مجاہد — …
شاہی … — …
… (وحید الرحمن)
… — …
… — …
… — …
… — …
… — …
زرتشت … — …
… …

افسانے

سات تارے (ساتا جیب)
پھریری (عظیم بیگ چغتائی)
تازہ (اختر انصاری)
اندھی دنیا
طلسم خیال (کرشن چندر)
ہوائی قلعے
نظارے
تفسیر حیات (ایم اسلم)
کارزار حیات
گل نو
آشوب زمانہ
ثمرۂ گناہ
رقاصہ
شرم گناہ
خار و گل
انوکھے افسانے
مویاں کے افسانے (… بیسالی)
دھواں (منٹو)

[illegible] اور کلیاں (...)
[illegible] ۔۔
[illegible] ۔۔
[illegible] افسانے ۔۔
[illegible] (جاوید)
[illegible] (پریم چند)
[illegible] ۔۔
[illegible] ۔۔
دیہاتی افسانے ۔۔
[illegible] (سدرشن)
[illegible] ۔۔
[illegible] ۔۔
[illegible] ۔۔
[illegible] عافیت ۔۔
[illegible] کی دنیا ۔۔
[illegible] انجام ۔۔
[illegible] بہار ۔۔
[illegible] کے افسانے (گوپال مِتل)
[illegible] ۔۔
آپ بیتیاں (رتیرتھ رام)
[illegible] ۔۔
[illegible] (نا ستانی)
[illegible] کی کہانیاں ۔۔
[illegible] کے افسانے ۔۔
الہامی افسانے (مرتضیٰ)
[illegible] (آتش)
[illegible] (مہدی)
[illegible] افسانے (کوثر)
[illegible] افسانے (تسنیم)
[illegible] (رضی)
[illegible] (عیسیٰ)
[illegible] (راجندر سنگھ)
[illegible] (علی عباس)
[illegible] (احمد علی)
[illegible] (ریاض محمود)
[illegible] کی قیمت (احمد عطا)
[illegible] (ملک ...)
[illegible] (عزیز ہندی)

[illegible] (عبدالقوی)
تمنیوں کی ... ۔۔
سیب کا درخت ۔۔
تین پیسے کی چھوکری ۔۔
عورت (رشید جہاں)
شب کی پکار (راحت آرا)
سوز ناتمام (عاشق بٹالوی)
سحر فرانس (طاہر قریشی)
پریم کا جادو (سراج الدین)
طلسمات (عابد علی)
مہر و ماہ (احسان علی)
معیار محبت (سیاح سنامی)
برف کا دیوتا ۔۔
عورتوں کے افسانے (کوثر چاند پوری)
دنیا کی حور ۔۔
عروسِ ادب (عباس حسین)
تازیانے (الطاف مشہدی)
بھوک (حمید الدین)
ریزۂ مینا (رکھاس شہود ادیب)
اخوان الشیاطین (مضحک)
چار چاند (ناصر نذیر فراق)
دکن کی پری ۔۔
دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ ۔۔
سات ملاقاتوں کی کہانیاں ۔۔
بیگموں کی چھیڑ چھاڑ ۔۔
خواب پریشاں ۔۔
عشق کی گولیاں (فرحت اللہ بیگ)
پھول والوں کی سیر ۔۔
گمنام عورت کا خط (ظفر قریشی)
انکشاف حقیقت (صادق الخیری)
تماشہ پر تماشہ (ناکارہ)
نگارستان (نیاز فتحپوری)
جمالستان ۔۔
شباب کی سرگزشت ۔۔
محبت کا فسانہ (ل۔ احمد)
انشائے لطیف ۔۔
شمع انجمن (صادق الخیری)
سیاہ کار (باقر نسیم)

[illegible]
[illegible]
محبت کے افسانے ۔۔
آتش پارے (سعادت حسن منٹو)
روسی افسانے ۔۔
کیمیاگر (مجیب)
نقش اول (رسالہ ... عابد حسین)
دہلی کے افسانے (خواجہ حسن نظامی)
چندا موہنی (انصار ناصری)
سحر بنگال (طاہرہ دیوی)
صحرا نورد کے خطوط (رشید اختر ندوی)
قیمت مسرت ۔۔
دنیائے آرزو ۔۔
ستارۂ صبح (احسان علی شاہ)
محبت اور نفرت (اختر حسین)
شکستہ دل ۔۔
شمع حرم ۔۔
منٹو کے افسانے ۔۔
ٹوٹے ہوئے گملے ۔۔
تاریخی افسانے ۔۔
دکھی دنیا ۔۔
جواتی کی سیاہ کاریاں ۔۔
گل و بلبل ۔۔
آغاز و انجام ۔۔
غلاموں کی بغاوت ۔۔

ڈرامے

پیرو کی فریاد (شاہد احمد)
نرگس جمال ۔۔
نجمہ نوری (انصار ناصری)
تعلیم زدہ بیوی (فضل حق قریشی)
دیوا (سعادت حسین)
جہل مرکب (منیر احمد)
حشرات الارض (فضل الرحمٰن)
ظاہر و باطن ۔۔
نئی روشنی ۔۔
آئندہ زمانہ ۔۔
محبت کا انتقام (سدرشن)

[illegible]
[illegible] (فضل الٰہی)
[illegible] (فضل حق)
تسلیم (مظہر)
معلم اسد (اشتیاق حسین)
شہید وفا (شرر)
میوۂ تلخ ۔۔
پردۂ غفلت (عابد حسین)
نیم شب (اشتیاق حسین)
لیڈر (فضل حق)
خوددار خاتون (محمد مرزا)
مختار دلہن ۔۔
شکنتلا (اختر حسین)

سیاست تاریخ

مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی
مصنفہ (محمد مرزا)
دوسری جنگ عظیم ۔۔
تاریخ مسلم لیگ (اختر حسین)
انقلاب بشکنہ (حسام الدین)
ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی (...)
وفاق ہند (مظہر انصاری)
یورپ کی حکومتیں ۔۔
قول فیصل (ابوالکلام)
خطبہ صدارت ۔۔
۔۔ تقریری ۔۔
تازہ مضامین ۔۔
سی پی میں کانگریس راج (اسرار احمد)
شہنشاہیت (مظہر شاہ)
سیاسی معلومات (اسرار احمد)
کارل مارکس (دہرویال)
ہٹلر کیا چاہتا ہے
لینن (وہرم دیو)
لینن (ڈاکٹر اشرف)
سوشلزم (جمیل احمد)
محمد علی جناح (عبدالعزیز)

[illegible]
[illegible] (...)
[illegible] (...)
غلامی کا فلسفہ ۔۔
ہمارے زمانہ کی غلامی ۔۔
سیاست ملیہ (محمد امین)
ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش (خالدہ ادیب خانم)
نازیت (شاہد حسین)
قومیت بین الاقوامیت (...حسین)
ممالک اسلامیہ کی سیاست (...)
بحر الکاہل کی سیاست (امین اللہ)
دنیا کی کہانی (مجیب)
الپیرونی (ہاشمی)
تاریخ ... ۔۔
مہاتما کی سیاسیات (...)
نازی ازم (عبدالرحیم)
[illegible] (...)
ریاست (افلاطون)
خلافت و سلطنت (امیر...)
سوشلزم کی ... (مصنفہ ... ایم اے)
مسلمان کیا کریں
حکومت ... (...)
[illegible]
ہندوستان کی اقتصادی تاریخ (عبدالمجید)
انقلابی شرارے (جمیل احمد)
تمدن عرب (سید علی)
اخبار الاندلس (خلیل الرحمٰن)
[illegible] ۔۔
خلافت موحدین (...)
تاریخ مغرب (ابن عذاری)
تاریخ اسلام (اکبر شاہ خاں)
تاریخ اسلام
تاریخ صقلیہ کامل
یورپ کی موجودہ حکومتیں
سلاطین متاخرین اسلام
تاریخ سلطان (...)

تاریخ

- خلافت ... (... الفہیم)
- مختصر تاریخ اسلام ...
- ترکان احرار
- ترکی جدید (ضمیر ...)
- تاریخ الامت (اسلم جیراجپوری)
- دربار اکبری (محمد حسین)
- تاریخ سلطنت خداداد
- مختصر تاریخ ہند
- داستان غدر (ظہیر دہلوی)
- ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ۱۲ر
- مسلمانان اندلس
- [illegible]

سیر و سوانح

- سیرۃ النبی (شبلی)
- ایضاً دوم
- ایضاً سوم
- ایضاً چہارم
- [illegible]
- رحمت عالم (سلیمان ندوی)
- سیرۃ رسول (اسلم جیراجپوری)
- رسول کریم (رحمۃ العالمین)
- رؤف الرحیم (ناہر)
- نبی عربی
- خطبات مدراس (سلیمان ندوی)
- میلاد نامہ جدید
- میلاد شریف (خواجہ شفیع)
- آئینہ کمال (...)

سیر صحابہ و تابعین

- خلفائے راشدین (معین الدین)
- الفاروق (شبلی)
- الصدیق (حبیب الرحمن) ۱۲ر
- سیر الصحابہ ششم (معین الدین)
- " " ہفتم
- اسوۂ صحابہ (عبدالسلام ندوی)
- سیر الصحابیات (حبیب الرحمن)
- اسوۂ صحابیات ۱۰ر
- صحابیات
- سیر الانصار
- تابعین
- سیرۃ عائشہ (شرر) ۱۰ر
- ذی النورین " ۸ر
- ثانی اثنین " ۱۰ر
- ابو الحسنین " ۸ر
- مہاجرین (معین الدین)

ائمہ و سلاطین

- سیرۃ عمر بن عبدالعزیز
- عمر بن عبدالعزیز
- سیرۃ معاویہ (مراد)
- سیرۃ حسین "
- ... کے بعد (عزیز حسن)
- النعمان (شبلی)
- حیات امام مالک
- الغزالی (شبلی)
- المامون
- سوانح مولانا روم

علماء و فقراء

- فقرائے اسلام (عبدالسلام ندوی)
- غلامان اسلام (سعید احمد)
- تذکرہ علماء (محمد حسین آزاد) ۵ر
- سیر علماء (شرر)
- مخدرات مشاہیر اسلام (شرر)

- حکایات صحابہ

مشاہیر عالم

- انور پاشا (ملیح آبادی)
- اتاترک (محمد مرزا)
- عہد ... کے بڑے لوگ
- زوال فارس (عزیز ...)
- حیات کامل (مظہر الدین)
- شہید سکوتی ۱۲ر
- ہٹلر اعظم
- مسولینی کی خود نوشت سرگزشت
- روز ولٹ (...) ۱۲ر
- چیمبرلین ۱۲ر
- اسٹالن ۱۲ر
- ڈی ویرا
- سوانح حیات سلطان ابن سعود
- نامور ان سائنس ۱۰ر
- نگارستان فارس
- حیات آزاد (محمد ابراہیم ...)
- ولی اللہ (شاہ ولی اللہ کی سوانح) ۸ر
- تیمور (مولوی عنایت اللہ)
- چنگیز خاں
- چنگیز خاں کے سوانح حیات ۱۲ر
- حکیم اجمل خاں
- خیام (سلیمان ندوی)
- حیات سعدی (شبلی) ۶ر
- حیات حافظ ۶ر
- حیات خسرو ۶ر
- حیات سعدی (حالی)
- ذکر غالب ۸ر
- آپ بیتی (خواجہ حسن نظامی)
- کالی داس (...)
- بزم اکبر (اکبر الہ آبادی کی سوانح)
- روسی ادب کامل (اختر حسین)
- مشاہیر عالم کی داستان مصیبت
- قیمت صرف

تاریخ تنقید ادب اور تذکرے

- شعر العجم کامل (شبلی)
- آب حیات (محمد حسین آزاد)
- شعر الہند کامل
- گل رعنا (عبدالحی)
- تاریخ ادب اردو (سکسینہ)
- تاریخ ادبیات ایران حصہ اول
- " " حصہ دوم
- ارباب نثر اردو
- دکن میں اردو (خیال)
- مغل اور اردو (خیال)
- داستان ... "
- غالب (غلام رسول)
- جدید اردو شاعری (عبدالقادر)
- تنقیدات عبدالحق (عبدالحق)
- اردو شاعری پر ایک نظر (کلیم الدین)
- اقبال کی شاعری ۱۰ر
- اردو کا پہلا ناول (محمد ادریس)
- دنیائے افسانہ
- کردار افسانہ
- نقوش سلیمانی (سلیمان ندوی)
- مقالات حالی کامل
- سب رس (وجہی)
- خطبات عبدالحق (عبدالحق) ۱۰ر
- نصرتی
- فاؤسٹ (شاہد احمد)
- محاسن کلام غالب (عبدالرحمن)
- وضع اصطلاحات (وحید الدین سلیم)
- سلیم
- ... ہند (خالد ...)
- دریائے لطافت (انشاء) ۱۰ر
- اخوان الصفا
- ترکوں کی اسلامی خدمات
- سودا (شیخ چاند)
- نکات الشعراء (میر تقی)

- گلدستہ ...
- مخزن شعراء (...)
- تذکرہ ہندی (مصحفی)
- ریاض الفصحا
- عقد ثریا
- گلزار ابراہیم (نواب علی)
- چمنستان شعراء
- مخزن نکات (قائم)
- ذکر میر
- گل عجائب (اسد علی تمنا)
- رہنمایان ہند (نارائن ...)
- ادب اور زندگی (...)
- افسانہ

اردو لغت

- سیدی ڈکشنری
- مبادی اللغات
- جدید لغات اردو
- نور اللغات
- بازاری زبان ۱۰ر
- لغات سیدی فارسی

مقالات و انشاء

- افادات مہدی (مہدی حسن)
- مقالات شبلی حصہ اول (شبلی)
- " جلد دوم
- " جلد سوم
- " جلد چہارم
- " جلد پنجم
- " جلد ششم
- " جلد ہفتم
- " جلد ہشتم
- مضامین چکبست (چکبست)
- مضامین حالی (حالی)
- مضامین ... (...)
- افادات سلیم (وحید الدین سلیم)
- باقیات بجنوری (...)
- محشر خیال (...)

- حصہ اول
- حصہ دوم
- حصہ سوم
- ... ڈول (خواجہ چغتائی)
- ... بلی
- ... (خواجہ محمد شفیع) ۱۲ر
- ... کہار (قاضی عبدالغفار)
- ... (اقبال)

مکاتیب

- مکاتیب غالب (امتیاز علی)
- ... معلی (غالب)
- عود ہندی ۱۲ر
- ... سرسید
- مکاتیب شبلی جلد اول
- جلد دوم
- خطوط شبلی
- مکتوبات آزاد (محمد حسین آزاد)
- مکاتیب مہدی (مہدی حسن)
- ... اکبر (اکبر الٰہ آبادی)
- مکاتیب اکبر
- ... (مولوی نذیر احمد)
- ... کے نام ۳ر

ظریفات و مضحکات

- ... (رشید احمد صدیقی)
- ... رشید
- ... مضامین (پطرس بخاری)
- (عظیم بیگ چغتائی)
- ... افسانے
- ... نامہ
- ...
- ... ات
- ...

- ... (عظیم بیگ چغتائی)
- ...
- دیکھا جائے گا
- خطوط کی ستم ظریفی
- چینی کی انگوٹھی ۸ر
- مضامین چغتائی ۱۲ر
- لفنٹنٹ ۶ر
- تعویذ ۵ر
- مرزا جنگی ۱۲ر
- قدردان ۵ر
- مقراض محبت ۵ر
- سسر بیوی
- فل بوٹ
- جنت کا بھوت ۸ر
- ملفوظات نامی ۱۲ر
- شہزوری ۸ر
- پھریری
- گہوارۂ تبسم (عباس حسین)
- طوفان ظرافت (سراج الدین)
- گلکش (ابوطاہر داؤد)
- پرواز لق لق (لق لق)
- مضامین لق لق
- حاجی لق لق کے افسانے ۱۲ر
- دو وانتی
- مہیج تبسم (شوکت تھانوی)
- بحر تبسم
- سیلاب تبسم
- منفی جی
- سودیشی ریل
- مرزا جی حصہ اول (ا ہ لم)
- دوم
- نہتے ملکیم
- اکیلے کا چھلکا (سندباد جہازی)
- مطائبات
- دو ڈاکٹر
- جدید جغرافیہ پنجاب
- صحرائی (ناکارہ حیدرآبادی)
- تماشہ پر تماشہ ۳ر

- ... مضامین ...
- ... عجیم
- عورت ذات (ملا رموزی)
- شفاخانہ
- لاٹھی اور بھینس
- مضامین رموزی
- گلابی اردو
- شادی
- صبح لطافت
- خطوط رموزی
- حکایات لطیفہ (بشیر الدین احمد)
- لطائف عجیبہ
- شیخ جی

اقوال

- اقوال زریں ۳ر
- موتی (یوسف بخاری) ۱۲ر
- لعل و گوہر (رضیہ) ۸ر
- عقل کی باتیں

کھانا پکانے کی کتابیں

- عصمتی دسترخوان
- مشرقی مغربی کھانے
- اسلامی دسترخوان
- دلی دسترخوان ۸ر
- مکمل باورچی خانہ ۱۲ر
- ناشتہ ۱۰ر
- بیماروں کے کھانے ۱۰ر
- مذاقیہ کھانے ۱۰ر

نظم

- نغمۂ نور (بہزاد لکھنوی)
- کیف و سرور
- موج طہور
- چراغ طور
- کیف بہزاد ۱۲ر
- نغمات بہزاد ۱۲ر

- ... کلیات
- نقش و نگار
- فکر و نشاط
- شاعری کی مائیں ۸ر
- پیغمبر اسلام ۸ر
- آیات و نغمات
- درشہوار تجوید (دحیلیین تجوید)
- گفتار تجوید
- نشاط روح (اصغر گونڈوی)
- سرور زندگی
- باقیات فانی (فانی بدایونی)
- عرفانیات فانی
- مختصر دیوان جگر (جگر مرادآبادی)
- جگر کے سو شعر
- بانگ درا (اقبال)
- ضرب کلیم
- مثنوی اسرار و رموز
- بال جبریل
- کلیات (اکبر الٰہ آبادی)
- نغمۂ روح (اختر انصاری)
- آبگینے
- تصویر احساس (الطاف مشہدی)
- پریت سنگیت
- لعلفہ (حاجی لق لق)
- گیانگ گ زادی (نہال سیوہاروی)
- حسن کے دو روپ (آنند انصاری)
- معارف جمیل
- کلیات ولی (ولی دکنی)
- انتخاب کلام میر (انجمن ترقی اردو)
- انتخاب میر (مکتبہ جامعہ)
- دیوان میر (مطبوعہ بدایوں)
- (دہلی)
- قصائد مومن (مومن)
- کلیات آتش (آتش)
- دیوان ذوق (مرتبہ آزاد)
- قصائد ذوق (ذوق)

- ... قسم دوم
- قسم سوم
- ... ظاہر ... قسم اول
- قسم دوم
- مرقع چغتائی
- نقش چغتائی
- شرح (نظامی)
- (تجوید دہلوی)
- (آسی لکھنوی)
- (آغا باقر)
- (شبلی)
- ...
- ... آنش
- جلد نو
- شاہنامۂ اسلام جلد اول (حفیظ جالندھری)
- دوم
- سوم

[illegible]

[illegible]
- کلام جوہر (محمد علی جوہر)
- آئینہ جذبات (اکبر حیدری)
- زمان حماقت (احمق)
- جوش و عمل (فضلت)
- ظہور رحمت (شاد عظیم آبادی)
- جیب کی بلو (رحالی)
- بیہودگی مناجات 〃
- نغمۂ حرم (اختر شیرانی)
- خیابان (مجموعہ اسواتی)
- بہار بیتاب دل (رضا علی)
- قطعات خواجہ [illegible]
- انتخاب [illegible]
- دیوان [illegible]
- دیوان [illegible]
- [illegible]
- حقیقت [illegible]
- سلطان ابو سعید [illegible]
- جواہر منظوم ترجمہ [illegible]
- مطلع سعد (رقا قیب)
- حرف ناتمام (ربیق)
- نقش فریادی (رشیق)
- فرعون کی دنیا [illegible]
- افکار سلیم

- [illegible] ۴ر
- حیات محمد علی ۸ر
- ظرافت رابعہ ۸ر
- چار یار ۸ر
- الاسلام ۳ر
- الرسالت ۶ر
- الایمان ۳ر
- التوحید ۵ر
- الآخرت ۶ر
- الاعمال ۵ر
- حیات النبی ۵ر
- [illegible] صدیق رض ۴ر
- [illegible] ۳ر
- [illegible] ۲ر
- سیرت علی رض ۲ر
- [illegible] بک ۶ر
- اسلام کیسے شروع ہوا ۱۲ر
- عقائد اسلام ۲ر
- ہمارا دین ۲ر
- چالیس حدیثیں ۳ر
- محاسن اسلام ۸ر
- [illegible] ۳ر
- [illegible] قصے ۵ر
- [illegible] ۸ر
- [illegible] ۵ر
- [illegible] بیبیاں ۵ر
- [illegible] اسلام ۱۲ر
- [illegible] ۲ر
- [illegible] ۳ر
- سرکار کا دربار ۸ر
- سرکار دو عالم ۸ر
- سیرت رسول
- رحمت العالمین
- چار یار ۸ر
- خلافت راشدہ
- نبی عربی

- ششی مرغابی ۴ر
- بچوں کی کہانیاں ۴ر
- لال مرغی
- مرغی اجیر علی ۴ر
- تانبل خاں
- پوری کر دھائی سے حق بیگی ۲ر
- چھوٹا چھو ۲ر
- شریر موتی ۱ر
- ترقر ۲ر
- چھوتو ۲ر
- چنبیلی ۲ر
- نیست کا پھل ۳ر
- شیلا ۳ر
- چھدو ۳ر
- انعامی مقابلہ ۳ر
- بیکاری ۳ر
- شہزادی گلنار ۳ر
- عقاب ۳ر
- دو بھائی ۳ر
- جادو کا جہاز ۲ر
- شہزادی ڈیلیاں ۳ر
- بادشاہ نیوں گا ۳ر
- ہار سنگار ۳ر
- استاد ۳ر
- اللہ جسے رکھے اسے کون چکھے ۳ر
- شہزادہ نے نواز ۲ر
- شوری تارا ماتھے چاند ۲ر
- صبر بادشاہ زادہ ۲ر
- لعل شہزادہ ۲ر
- دکھیارہ شہزادہ ۲ر
- طلالبس کی شہزادی ۲ر
- اتاترک ۲ر
- ازطغرل ۲ر
- فتح قسطنطنیہ ۲ر
- عثمان کا خواب ۲ر
- لنگڑا ماموں ۲ر

- [illegible]
- شہزادہ عبد [illegible] ۴ر
- جادو کا بیج ۲ر
- خلیفہ عبد الرحمن ۲ر
- گوڑیا سپہ سالار ۲ر
- مزیدار کہانیاں ۵ر
- شہزادی نیلوفر ۸ر
- شیخ چلی کا پکوان ۱ر
- [illegible] کی بوا ۴ر
- بالشتیوں کی دنیا ۲ر
- جاپانی کہانیاں ۲ر
- ریچھوں کا بادشاہ ۲ر
- خزانہ ۲ر
- اورنگزیب عالمگیر ۴ر
- مور ۲ر
- موروں کی شہزادی ۲ر
- ملک نم نم ۴ر
- محبت کا پھول ۴ر
- نصیحت کا کرن پھول ۸ر
- آسمانی دولہا ۱۲ر
- ملا دو پیازہ ۴ر
- قیدی کشمیر ۴ر
- ہندوستانی پہیلیاں ۲ر
- تاریخ ہند کی کہانیاں ۸ر
- تاریخ اسلام کی کہانیاں ۱۰ر
- دہلی ۴ر
- سمندر کا عجائب خانہ ۸ر
- ہندوستان ۴ر
- ایورسٹ کی داستان ۳ر
- ننگا پربت ۵ر
- دھوئیں کی پھانسی ۸ر
- کائنات ۴ر
- دنیا کے بسنے والے ۵ر
- دنیا کے بچے ۵ر
- مزیدار پہیلیاں ۴ر
- ہندوستانی کھیل ۱۲ر
- تعلیمی کھیل ۳ر

ڈرامے

- دیانت
- شریر لڑکا ۳ر
- قوم پرست طالب علم ۳ر
- بچوں کا انصاف ۳ر
- اسکول کی زندگی
- کایا پلٹ ۲ر
- چھوٹے سچے دوست ۲ر
- پریم کی جیت ۲ر

نظمیں

- قومی نظمیں
- بچوں کی نظمیں
- بچوں کے اسٹیل
- بچوں کی رباعیاں
- بچوں کے گیت
- بچوں کا تحفہ حصہ اول
- پہیلی نامہ
- لوری نامہ ۲ر

عورتوں کی کتابیں

- الزہرا (راشد الخیری)
- نوبت پنج روزہ 〃
- وداع خاتون 〃
- امین کا دم واپسیں 〃
- دلی کی آخری بہار 〃
- بزم رفتگاں 〃
- داستان پارینہ 〃
- حیات صالحہ 〃
- منازل السائرہ 〃
- جوہر قدامت 〃
- بنت الوقت 〃
- سراب مغرب 〃
- سنجوگ 〃
- سوکن کا جلاپا 〃
- فسانہ سعید 〃
- سودائے نقد 〃

[illegible] ۱۲؍	سلسلہ عورتوں کے حقوق [illegible]	[illegible]	[illegible]	مفرق کتابیں
[illegible] ۱۰؍	گلدستہ [illegible] ۱۴؍	[illegible]	[illegible]	
[illegible] " ۳؍	بلبل [illegible] " ۱۰؍	آفتاب زندگی "	[illegible] "	تہذیب نسل (حکیم)
[illegible] " ۷؍	ساجن موہنی " ۳؍	شباب زندگی "	[illegible] (اختر جہاں)	مثنوی حسن فطرت (عبرت)
[illegible] " ۷؍	شادی کا انتخاب " ۸؍	انشائے سلمیٰ (رولی امام) ۶؍	ہماری ڈاکٹر [illegible] ۱۲؍	ناکام (خواجہ محمد شفیع) ۶؍
عصمت " ۵؍	زیب ہستی " ۶؍	خواتین کی دستکاریاں " ۸؍	نظارہ مغرب " ۶؍	گناہ " ۳؍
[illegible] کا راز " ۶؍	بیگم کا آخری دن " ۳؍	شمع خاموش (منجو بیگم) ۶؍	رفیق مرزا " ۳؍	
منازل ترقی " ۳؍	چمنستان مغرب "	آئینہ جمال " ۱۲؍	عقیلہ بیگم " ۳؍	یادرفتگاں (زوجہ عبد المجید) ۳؍
[illegible] کا گریہ " ۳؍	بکھری ہوئی پتیاں "	زچہ خانہ (ڈاکٹر [illegible])	غریب [illegible] " ۳؍	ہماری زبان (مولوی عبد الحق) ۳؍
[illegible] کی سرگزشت " ۳؍	خیابان نسواں (نصیر احمد) ۱۲؍	سنگسار خانہ "	[illegible] خطوط " ۳؍	زندہ بین (ستاری) ۳؍
[illegible] عالم " ۳؍	پردہ و تعلیم (سعید احمد) ۱۲؍	انوری بیگم (خدیجہ جنگ)	کفایت شعاری " ۳؍	انوکھے افسانے (فضلی) ۳؍
جوہر عصمت "	پتھر سے ہیرا " ۱۴؍	جانباز (نذر سجاد) ۱۲؍	تقدیر و تدبیر (عبد الرؤف) ۳؍	مصری افسانے (سجاد) ۳؍
[illegible] اشک "	اسلام اور عبادت " ۸؍	غیرت کی پتلی (فاطمہ بیگم) ۶؍	شوہر کی نصیحتیں "	[illegible] افسانے (کوپال متل)
طوفان اشک "	اسلام عورت " ۱۰؍	شہید وفا (امت الوحی)	آداب نسواں " ۶؍	[illegible] (فضل حق) ۶؍
قطرات اشک "	اسلام اور مدنیت "	چار رنج (انیس فاطمہ) ۳؍	بنت رسول [illegible]	[illegible]
[illegible] "	خواتین اندلس " ۶؍	فیروزہ (حمیدہ بیگم) ۸؍	ناموس ملت (خادم علی)	[illegible]
گوہر مقصود " ۶؍	افسانہ حرم " ۷؍	صنعت و حرفت (امت الحفیظ)	گھر گرہستی (رشوق [illegible]) ۳؍	[illegible] ۳؍
[illegible] حیات "	جمال ہمنشیں (خاتون اکرم)	تندرستی ہزار نعمت (زہرا) ۳؍	صبر کی دیوی (سلطان حیدر جوش)	[illegible]
[illegible] حیات " ۶؍	گلستان خاتون "	کپڑے کی چھپائی " ۸؍	نیا باورچی خانہ (آمنہ بیگم)	[illegible]
[illegible] " ۱۲؍	پیکر وفا " ۸؍	عصمتی کشیدہ (آمنہ نازلی)	ترکی کھانے (محمد اسمعیل) ۳؍	[illegible] ۳؍
نشیب و فراز " ۳؍	بچھڑی بیٹی " ۶؍	گلدستہ کشیدہ (عزیز فاطمہ)	مناجات بیوہ (حالی) ۳؍	[illegible] ۳؍
[illegible] " ۱۰؍	مطیر نسواں (صغریٰ ہمایوں مرزا)	گلزار درخشاں (آر کے)	اولاد کی شادی (خواجہ حسن نظامی)	[illegible]
[illegible] " ۶؍	سرگزشت ہاجرہ " ۱۰؍	گلشن زہرا (زہرا [illegible])	اولاد کو [illegible] کی باتیں	[illegible]
[illegible] " ۸؍	تحریر النساء " ۱۲؍	عصمتی کروشیاں (فاطمہ انور علی)	اتالیق خطوط نویسی	[illegible]
[illegible] نسواں "	موہنی " ۱۰؍	چمنستان خیاطی (فاطمہ بیگم)	بیوی کی تربیت	[illegible]
[illegible] " ۶؍	خانہ داری کے تجربات (ملقیس بیگم) ۱۲؍	گلستان خیاطی (عزیز فاطمہ)	بیوی کی تعلیم	[illegible]
[illegible] " ۸؍	مفید نسواں " ۸؍	موتیوں کا کام (آمنہ نازلی)	بیگمات کے آنسو	واقعات [illegible]
[illegible] اسلام "	دولت پہ قربانیاں (آمنہ نازلی) ۸؍	سلمہ ستارے کا کام (خدیجہ [illegible])	چٹکیاں گدگدیاں	[illegible]
[illegible] " ۸؍	تاریخی لطیفے " ۸؍	ادنیٰ کام سلائیوں سے (احمدی بیگم)	مشرقی کشیدہ کاری	[illegible]
[illegible] کی افتاد "	ہنسی کی باتیں " ۸؍	کروس اسٹیچ ورک	یوسف و نجمہ	[illegible]
[illegible] ہوئی پتیاں " ۶؍	عقل کی باتیں " ۸؍	تعلیم موزہ کاری (سعیدہ)	عجب دان دلہن	ایوان تصور (ظفر قریشی)
[illegible] مغرب "	پھول پھلواری (سرور جہاں) ۸؍	تار کشی کا کام	ثریا بیگم	جزیرہ سخنوراں (عباس) ۳؍
[illegible] " ۶؍	شہزادی نیلوفر " ۸؍	گلدستہ تارکشی (سیدہ اشرف)	عورتوں کے افسانے	[illegible]
[illegible] نسواں " ۸؍	رنگیلی شادی (پریم چند) ۶؍	گوٹہ کناری کا کام "	دنیا کی حور	آب حیات کے لطیفے [illegible]
[illegible] "	دودھ کی قیمت "	جالی کا کام	رضیہ کے خطوط	کربلا (پریم چند)
[illegible] " ۸؍	بچوں کی تربیت (عبد الغفار) ۱۰؍	اصلاح معیشت (بشیر الدین احمد)	عائشہ صدیقہ رضی	روشنی جوانی "
[illegible] مشرق " ۱۰؍	حلیمہ " ۳؍	شمع ہدایت "	تعلیم خانہ داری	شاہزادہ [illegible]
[illegible] "	دلی کی دستکاری (سیدہ [illegible])	اقبال دلہن "	[illegible] کی [illegible]	[illegible]

مطبوعات کتب خانہ علم و ادب دہلی

تاریخ [illegible]
اول ۔ احمد
قیمت ڈھائی روپے ۲/۸

[illegible]
از محمد مرزا
قیمت ایکروپیہ بارہ آنہ ۱/۱۲

بنات النعش
مولوی نذیر احمد
قیمت ایکروپیہ ۱/

خواب پریشان
مولوی عنایت اللہ
قیمت چار آنہ ۴/

تاتار کا [illegible]
محمد مرزا
قیمت دو روپے ۲/

پھول والوں کی سیر
مرزا فرحت اللہ بیگ
قیمت چھ آنہ ۶/

چند پند
مولوی نذیر احمد
قیمت آٹھ آنہ ۸/

عشق کی گولیاں
مرزا فرحت اللہ بیگ
قیمت چار آنہ ۴/

سات تارے
سات مشہور ادیب
قیمت ڈیڑھ روپیہ ۱/۸

ایک کہانی
چڑیوں کی زبانی
قیمت چھ آنہ ۶/

منتخب الحکایات
مولوی نذیر احمد
قیمت آٹھ آنہ ۸/

گہوارۂ تبسم
ظریف دہلوی
قیمت چار آنہ ۴/

دوشیزۂ صحرا
صادق الخیری ایم اے
قیمت سوا روپیہ ۱/۴

عروس ادب
از قاضی عباس حسین
قیمت ایکروپیہ ۱/

خطوط کی [illegible]
عظیم بیگ چغتائی
قیمت آٹھ آنہ ۸/

[illegible]
[illegible]
قیمت [illegible]

بغداد کا جوہری
اشرف صبوحی دہلوی
قیمت ایکروپیہ ۱/

حیات مومن
از عرش گیاوی
قیمت ایکروپیہ ۱/

دلی کا آخری [illegible]
ناصر نذیر فراق
قیمت چار آنہ ۴/

[illegible]
اشرف صبوحی
[illegible]

برقاصہ
ایم اسلم
قیمت ایکروپیہ ۱/

ملک العزیز ورجنا
عبد الحلیم شرر
قیمت ایکروپیہ ۱/

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ
ناصر نذیر فراق
قیمت چار آنہ ۴/

[illegible]
اشرف صبوحی
قیمت دو آنہ [illegible]

لاوسٹ
شاہد احمد بی اے
قیمت [illegible]

مسدس حالی
حالی (مرحوم)
قیمت چھ آنہ ۶/

سات طلاقوں کی کہانی
ناصر نذیر فراق
قیمت چار آنہ ۴/

[illegible]
[illegible]
قیمت [illegible]

سلطانان ہند کی
حیات سیاسی
از محمد مرزا قیمت [illegible]

معاشقہ نپولین
از آزاد
قیمت چھ آنہ ۶/

دکھن [illegible]
ناصر نذیر فراق
قیمت چار آنہ ۴/

[illegible]
اشرف صبوحی
قیمت دو آنہ [illegible]

افسانۂ پدمنی
از مولوی [illegible] ایم اے
قیمت ایکروپیہ ۱/

شمع انجمن
صادق الخیری ایم اے
قیمت ... [illegible]

گمنام عورت کا خط
ظفر قریشی بی اے
قیمت چار آنہ ۴/

[illegible]
اشرف صبوحی
قیمت [illegible]

[illegible] بہادر
عظیم بیگ چغتائی
قیمت ایکروپیہ ۱/

[illegible]
مولوی نذیر احمد صاحب
قیمت ایک روپیہ ۱/

تماشہ پر تماشہ
ناکام
قیمت چار آنہ ۴/

پیام فطرت
جاذب
قیمت دو آنہ ۲/

مضامین فراق
ناصر نذیر فراق
قیمت ایکروپیہ ۱/

[illegible]
مولوی نذیر احمد
قیمت ایکروپیہ ۱/

[illegible]
صادق الخیری ایم اے
قیمت چار آنہ ۴/

بلیاں
از ایم اسلم
قیمت [illegible]

ملنے کا پتہ: کتب خانہ علم و ادب اردو بازار جامع مسجد دہلی

چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی
تین روپے مع محصول ڈاک
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ۔ فی پرچہ ۸ر

۲ جُرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر شائع
ہوتے ہیں۔ مستقل خریداروں سے
اُن کی قیمت الگ نہیں لی جاتی

جلد ۲۵ | ساقی دھلی۔ بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۴

قمت ۸ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

جنگ کی گرانی اور کاغذ کی نایابی سے جہاں لٹریچر کو بیحد نقصان پہونچا وہاں ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ناقص اور گھٹیا ادب کی اشاعت بڑی حد تک معدوم ہو گئی۔ اب صرف وہ ادب شائع ہو سکتا ہے جس کا مطالعہ ناگزیر ہے، یا جس کو زندہ رکھنا کسی قیمت پر بھی مہنگا نہیں۔ اس پائیدار ادب کی مقدار ہر زمانے میں کم ہوتی ہے اور اس کے لئے ہمیشہ کاغذ مہیا ہو سکتا ہے۔ انگریزی زبان کے رسائل جو بڑے بڑے سرمایوں سے نکلتے ہیں کاغذ کی نایابی کی وجہ سے آدھے اور پاؤ رہ گئے ہیں۔ اردو رسائل جس ہمت و استقامت سے شائع ہو رہے ہیں اس کا اعتراف نہ کرنا بڑی حق ناشناسی ہے۔ اوّل تو یہ رسالے بہت مختصر اور محدود سرمائے سے چل رہے ہیں، دوسرے انہیں آمدنی کے وہ وسائل میسّر نہیں جو جنگ کے زمانے میں انگریزی رسائل کو زندہ رہنے میں شہ رگ کا کام دیتے ہیں۔ اردو رسائل کی صرف ظاہری شکل میں فرق آیا ہے۔ کسی کا کاغذ بدل گیا ہے اور کسی کے دس بارہ صفحے کم ہو گئے ہیں لیکن مضامین کی نوعیت نے نہ صرف اس کمی کو پورا کر دیا ہے بلکہ ان رسائل کی قدر و قیمت کو بہت بڑھا دیا ہے۔

ہمارے رسائل کے لئے جو مضامین موصول ہوتے ہیں اُن میں ہر قسم اور ہر معیار کے مضامین ہوتے ہیں۔ معمولی مضامین کے لئے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جگہ نہیں نکل سکتی۔ اچھے مضامین سب کے سب کسی ایک رسالے میں جگہ نہیں پا سکتے۔ مجبوراً چند اچھے مضامین بھی واپس کرنے پڑتے ہیں۔ مضمون نگار حضرات اِن دشواریوں اور مجبوریوں کو سمجھتے نہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے مضمون کی واپسی پر یا تو ناراض ہو جاتے ہیں یا اڈیٹر سے بحث و مباحثہ شروع کر دیتے ہیں۔ اِن حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون کی واپسی کو وجہِ عناد نہ بنائیں، کیونکہ مضمون کی واپسی کسی نہ کسی مجبوری کی بنا پر ہوتی ہے۔ مضمون نگار کو یہ فیصلہ نہیں کر لینا چاہیئے کہ اڈیٹر نے دشمنی سے ایسا کیا ہے۔ ادارۂ ساقی کے متعلق میں مضمون نگار حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ مضامین کی واپسی کی وجہ بغض و عناد یا تعصب یا شخصیت پرستی یا کوئی اور پست جذبہ نہیں ہوتا۔ بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ساقی کی محدود ضخامت ہے اور اِس ضخامت کو پورا کرنے کیلئے انتخاب میں زیادہ سے زیادہ احتیاط کی جاتی ہے۔ اہلِ قلم اور ناظرینِ ساقی کے مشورے قابلِ قدر ہوتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مضامین کے انتخاب میں اڈیٹر ساقی کا فیصلہ آپ کے اعتماد کا مستحق ہے۔

مسٹر فضل احمد کریم فضلی کا اسمِ گرامی اُردو کے لئے نیا نہیں ہے، البتہ افسانہ نگار کی حیثیت سے پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ "کنکی" ایک واقعاتی کہانی ہے لیکن صرف کہانی بھی نہیں ہے..... سنتوش کیشیپ بزمِ ساقی میں پہلی بار شریک ہو رہی ہیں۔ زیرِ نظر اشاعت میں ان کا افسانہ "سارنگی والا" شامل ہے۔ سنتوش کیشیپ ایک انوکھے اندازِ تفکر کی مالک ہیں جو اس افسانے کی رومانی فضا کے ساتھ حقیقت کی جھلکیاں بھی پیش کرتا ہے۔ وشوامتر عادل بھی پہلی دفعہ آئے ہیں لیکن ایک دلکش نظمِ جدید کے ساتھ۔ محمد یونس احمر نے قاضی نذر الاسلام کی جدید نظموں کے تراجم کا ایک سلسلہ ساقی کیلئے شروع کیا ہے۔ اُمید ہے کہ ان کی قدر کی جائے گی۔

شاھد

ضروری اعلان

جو مسودے ساقی کے لئے موصول ہوتے ہیں انہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاہم اس بارے میں دفترِ ساقی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔

جو مضامین قابلِ اشاعت قرار پائیں گے صرف انہیں کے بارے میں مزید مراسلت کی جائیگی؛ مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجنے چاہئیں۔

ساقی ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیجدیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت ۱۵ تاریخ تک کرنی چاہیئے۔ اسکے بعد دوبارہ پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہ ہوگی؛ جواب طلب امور کے لئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔

باتیں

کارواں، قافلہ، سفر اور منزل، شامِ غریباں اور صبحِ وطن وغیرہ سے متعلق ہماری شاعری بہت اچھے اشعار پیش کر سکتی ہے۔ کچھ اشعار میں بات براہِ راست کہی گئی ہے کچھ میں بالواسطہ اور کچھ میں تشبیہوں، استعاروں یا تعبیروں کے پردے میں بات کہی گئی ہے۔ چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا — مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو — کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے — اقبال

خراب پھرتا ہے دیوانہ کیوں بگولا سا — زمیں میں صورتِ آبِ رواں سما نہ گیا
وطن کو کیا ہے ہوائے وطن سے ہیں بیزار — لپٹ رہے جو بگولوں سے دشتِ غربت کے
یہ کس نے گرمِ رفتارِ فنا کی راہ کھوٹی کی — پڑے ہیں پردۂ فانوس پر بے بال و پر ہو کر
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زورِ پستی کا — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
ٹھٹھک گئے حرم و دیر کے دوراہے پر — خلاف جا نہ سکے شاہراہِ فطرت کے
امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلو — جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا
ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر — ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا — یگانہ

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
کوئی تو دوش سے بارِ سفر اتارے گا — ہزار رہزنِ امیدوار راہ میں ہے
نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں — لگا کے آگ مجھے قافلہ روانہ ہوا — آتش
بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے — حفیظ جونپوری
طولِ رہِ حیات سے گھبرا رہا ہوں میں — گھبرا رہا ہوں اور چلا جا رہا ہوں میں — سیماب
یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے — حالی
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں — غالب
اڑا تو عرش پہ جا کر لیا ہے دم میں نے — زمیں کو توڑ گیا ہوں جو رہ گیا ہوں میں
شمیمِ گلشن، نسیمِ صحرا، شعاعِ خورشید و موجِ دریا — ہر ایک گرمِ سفر ہے ان میں کوئی مرا ہمسفر نہیں ہے
یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری — جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے — اصغر

ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی — کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا
پاؤں کی تھرتھری کو دیکھ، دیکھ یہ نالۂ جرس — راہگذارِ عشق میں چھوٹتی ہمتیں نہ دیکھ
قید کیا رہائی کیا ہے ہمیں میں ہر عالم — رک گئے تو زنداں ہے چل پڑے بیاباں ہے
منزلیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں — وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

ہر اک عدم کا مسافر ہر ایک خانہ بدوش
مسر دیارِ محبت کوئی مکاں نہ مکیں

ہر آوازِ جرس پر اک صدائے بازگشت آئی
بہت ہے اس قدر بھی خیر یادِ رفتگاں ہونا

دیر و حرم ہیں اگر درِ راہ نقشِ قدم میں مہر و ماہ
ان میں کوئی بھی عشق کی منزلِ کارواں نہیں

راہ کھوٹی کر رہی ہے منزلِ دیریں کی یاد
کارواں سے قلب و پاکی رجعتوں کو چھین لو

یہ راہ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیتی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہگذر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہونچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

نئی منزلوں کو سکونِ وطن دے
ٹھہرنا نہیں ہے یہ ہے دُور جانا

نہ رہزنوں سے رُکے راستے محبت کے
وہ قافلے نظر آئے لُٹے لٹاتے ہوئے

فراق تو ہی مسافر ہے تو ہی منزل بھی
کدھر چلا ہے محبت کی چوٹ کھاتے ہوئے
راقم الحروف

سہ شمع سا کٹا ہے پر دم نہ ماریئے
منزل ہزار دُور ہو ہمت نہ ہاریئے
ذوق

حسرت پر اس مسافرِ بےکس کے روئیے
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے

چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا
مصحفی

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے، تو بھی جو چلا چاہے
میر

ان تیس چالیس اشعار میں جو کچھ بھی محاسن ہوں لیکن کوئی محسوس کرے تو میر کا آخری شعر "رنگِ گل و بوئے گل" دوسرے تمام اشعار سے بہت زیادہ بلند ہے۔ میر نے جو بات کہنا چاہی ہے وہ "کیا قافلہ جاتا ہے" کے بعد ختم ہو گئی۔ لیکن "تو بھی جو چلا چاہے" کا ٹکڑا اتنے اچانک طور پر اتنی نرمی سے اور اتنے غیر متوقع طور پر جوڑ دیا ہے جو اس ٹکڑے کو بیک وقت سامنے کی بات بھی اور دُور کی بات بھی بنا دیتا ہے۔ یوں تو میر کے اس شعر سے مصحفی کا آخری شعر "چلے بھی جا" قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میر کے اس شعر میں جو بات ہے وہ مصحفی کے وہاں یا مندرجہ بالا کسی شعر میں بھی کہاں۔ "تو بھی جو چلا چاہے" کے ٹکڑے کا اچانک پن اسے تیز طبعی اور نکتہ سنجی کی نایاب مثال بنا دیتا ہے۔ "دنیا بھر کی شاعری میں کسی ایک مصرعے میں دو باتیں یا دو بیانات غیر متوقع، اچانک اور فطری طور پر داخل کر دینا شاعری کا فنی کارنامہ ہے کہ شعورِ انسانی کی اُس رسا کاری کا ثبوت ہے جس کی شاعری میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ اجازت ہو تو اپنا ایک مصرع پیش کروں۔

"بات وہ کہئے عشق کہ سن کر سب قائل ہوں، کوئی نہ مانے"

"سب قائل ہوں" کہنے کے بعد بات بظاہر ختم ہو گئی تھی لیکن "کوئی نہ مانے" کا اضافہ اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر ہوا ہے کبھی کبھی پورے شعر کے پہلے مصرع میں جو بات کہی جاتی ہو دوسرے مصرع میں بالکل اچانک طور پر ایک غیر متوقع بات کہی جاتی ہو جیسے میرا ہی یہ شعر:۔

آج تو درد ہجر بھی کم ہے
آج تو کوئی آیا ہوتا

لیکن ایک ہی مصرع میں ایسا کر سکنا بہت مشکل ہے۔ میر کے جس شعر کا ذکر میں کر رہا تھا اس کے آخری ٹکڑے کو سنتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے گویا شاعر جب اپنی بات ختم کر چکا تو اسے اچانک ایک نہایت اہم بات یاد آئی اور اُسے بھی اپنے بیان میں شامل کر کے بات کو معجزہ بنا دیا۔ پورے شعر کا طرزِ عمل [illegible] اس ٹکڑے سے بدل گیا۔ میر کے اس شعر کے دوسرے مصرعے کا آخری ٹکڑا اتنے بے لاگ طریقے پر آیا ہے کہ کم از کم مجھے اس کی مثال اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔ خود میر کا کوئی دوسرا شعر اس تیور کا یاد نہیں آتا۔ میں نے اپنا جو مصرع نقل کیا ہو اس میں بھی وہ شعریت نہیں پیدا کر سکا جو میر کے مصرعے میں ہے۔ غزل کی شاعری پر یہ اعتراض بارہا کیا گیا ہے کہ پہلے قافیے اور ردیف لکھ لئے جاتے ہیں پھر قافیہ اور ردیف کے مطابق کوئی فرسودہ اور رسمی خیال جوڑ دیا جاتا ہے۔ میر نے بھی ہوا چاہے، مٹا چاہے، وغیرہ لکھتے لکھتے یہ ٹکڑا لکھا ہوگا۔ چلا چاہے، "چلا چاہے" کا قافیہ جب دل و دماغ میں گونجا ہوگا تو فطری مگر اچانک اور بے لاگ طور پر یہ فقرہ ذہن میں آیا ہوگا "تو بھی جو چلا چاہے"۔

اس کے بعد اس شعر کی بحر میں ایک لہر اور اٹھی ہوگی "کیا قافلہ جاتا ہے"۔ ان تین منزلوں سے گذرتا ہوا دوسرا مصرع پایۂ تکمیل کو پہونچا ہوگا۔ "کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے"۔ اس کے بعد تخیل کے غیبی عمل نے اپنا خلاقانہ کام کیا ہوگا اور پہلا مصرع موزوں ہوا ہوگا۔ "رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں" گویا یہ شعر آگے سے پیچھے کی طرف لکھا گیا ہوگا۔ انتہا سے ابتدا کی طرف شاعر کا تخیل مڑا ہوگا۔ یہ ضروری نہیں کہ غزل میں ہمیشہ ایسا ہو۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے۔ یہ الٹا سلسلۂ عمل (process) اپنے اندر خلاقانہ صلاحیت رکھتا ہے۔ شعر کی ایسی پیدائش بچے کے جنم لینے کی طرح ہے جب سر پہلے نمودار ہو، پھر دھڑ پھر پاؤں۔ اس میں کوئی خلاف فطرت بات نہیں ہے۔ اب یہ شاعر پر ہے، اس کی خلاقانہ صلاحیتوں پر ہے اس کے تخیل کے خلوص پر ہے کہ وہ قافیہ، ردیف اور مصرعۂ ثانی سوچ کر محض ایک رسمی یا فرسودہ بات پہلے مصرع میں کہتا ہے یا پہلے مصرع میں بھی انفرادی احساس بیان کرتا ہے وہ انفرادی احساس جس سے دوسرے مصرعے کا ایک ربط باطنی ہو۔ رنگِ گل اور بوئے گل کا ہوا ہونا یا اڑجانا ایسا تجربہ ہے جس کا اظہار میرؔ سے پہلے اردو شاعری میں ہوا ہوگا اور فارسی شاعری میں تو یقیناً ہوچکا ہوگا لیکن جس موقع اور سلسلے میں میرؔ نے پہلے مصرعے میں اس تجربے کو دُہرایا وہ فرسودہ اور رسمی بات کہنے کے مرادف نہیں ہے۔

جب سے زمین اور آسمان ہیں کسی زمانے میں ایسی عالمگیر جنگ نہیں ہوئی تھی جیسی خیر سے آج ہو رہی ہے۔ اس جنگ کے ختم ہوتے ہوتے دُنیا کی آبادی کا بہت بڑے حصّے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ قتل ہو جانے والوں اور عمر بھر کے لئے بیکار ہو جانے والوں کی تعداد کا اندازہ اس طرح کیجئے کہ پنجاب یا یو۔پی۔ یا بنگال یا چار پانچ کروڑ کی آبادی کا کوئی صوبہ یا کوئی ملک یوں برباد ہو کہ اس کی پوری آبادی قتل ہو جائے یا فی صدی ایک یا دو یا تین آدمی بچ رہیں۔ اس جنگ کو انگلستان، امریکہ، روس، چین اور جرمنی، اٹلی، جاپان کی جنگ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ حالانکہ ان ملکوں کی حکومتیں ایسا ہی کہہ رہی ہیں۔ لیکن ان ملکوں اور دُنیا بھر کے ملکوں کی فوجوں کی صف آرائی کے پیچھے دو عالمگیر سماجی طاقتوں کی فیصلہ کن جنگ ہو رہی ہے۔ ایک طاقت کے نمائندے دُنیا بھر کے وہ سرمایہ دار ہیں جن کی تعداد چھوٹوں بڑوں کو ملاکر پانچ لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی اور ان کے ساتھ بیس پچیس لاکھ الیسوں کی تعداد ہے جو سرمایہ دار نہیں لیکن خوشحال ہیں۔ دوسری طاقت کے نمائندے دُنیا بھر کے تین ارب آدمی ہیں جو اپنی روٹیوں کے لئے اور زندگی بسر کرنے کے تمام ذرائع کے لئے ان پچیس تیس لاکھ آدمیوں کے پنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے لڑائی میں اس کا فیصلہ نہیں ہونا ہے کہ ہماری سرکار جیتے گی یا جرمنی اور جاپان کی جیت ہوگی بلکہ اس کا فیصلہ ہونا ہے کہ اس جنگ میں سرمایہ داری کی فتح ہوگی یا انسانیت کی فتح ہوگی۔ حبشیوں، ریڈ انڈینس اور دوسری قوموں کے کروڑوں افراد پر جس بیدردی سے امریکہ، انگلستان، ہالینڈ، بلجیم، فرانس حکومت کرتے رہے ہیں، جس طرح کروڑوں آدمیوں کی زندگی کو ان ممالک کے اہل حکومت اور اہل سرمایہ آج تک جہنم بناتے رہے ہیں جس طرح خود اپنے اہل وطن اور ہم قوم و ہم نسل کروڑوں آدمیوں کو برائے نام آزادی دے کر انہیں مفلس اور نادار ان حکومتوں نے رکھا اس سے کچھ بہت مختلف سلوک جرمنی، اٹلی یا جاپان کا نہ ہوگا۔

اس لئے اگر جنگ کے بعد چرچل، روزویلٹ اور یورپ و ایشیا کے ممالک سے بھاگے ہوئے اہل حکومت جو اس وقت انگلستان میں براج رہے ہیں پھر انہیں کا راج پاٹ قائم ہوگیا یا دُنیا بھر پر ہٹلر، مسولینی اور جاپان کے اہل حکومت و سرمایہ دار کا راج قائم ہوگیا تو سرمایہ داری کی جیت ہوئی اور انسانیت کی ہار ہوئی دونوں حالتوں میں۔ اس جنگ میں جرمنی، اٹلی، جاپان کی ہار ہمیں نہیں منانا ہے نہ انگلستان اور امریکہ کی جیت منانا ہے۔ ہم تو یہ مناتے ہیں کہ انگریزی، جرمنی، امریکی، جاپانی، اطالوی، فرانسیسی، اور دنیا بھر کے ممالک کی (ایک روس کو چھوڑ کر) طرزِ حکومت اور اقتصادی اور سماجی نظام مٹ جائیں اور ایسا سماجی نظام قائم ہو کہ دُنیا بھر کے انسان منظم طور پر خوشحال ہو جائیں اور سماج اور حکومت کی مدد سے ترقی کی راہ میں گامزن ہوں۔ اگر مذہب، ملت، ملک، قومیت، نسل، مشرق، مغرب، ہر طرح کا امتیاز مٹا کر اور سرمایہ دارانہ نظام کو مٹانے کا فیصلہ کرکے اور جلد سے جلد دورانِ جنگ میں ہی مساوات اور اخوت کو عمل میں لاکر انگلستان امریکہ اور ان کے ساتھ ہو کر لڑنے والی حکومتیں جنگ اور صلح کے مقاصد اعلان کر دیں تو جرمنی اور اٹلی اور جاپان کی پرجا خود اپنی حکومتوں سے بغاوت کر جائے گی۔ ہٹلر، مسولینی اور جنرل توجو کا خاتمہ جرمنی، اٹلی اور جاپان کی رعایا کے ہاتھوں ہو جائے گا۔ لیکن اگر اشتراکیت، اخوت، مساوات کا مفصل اور دیانت دارانہ اعلان نہ ہوا تو بھی اگر موجودہ نظام کو قائم رکھتے ہوئے انگلستان اور امریکہ کی حکومتیں ہٹلر کے خلاف

کوئی دوسرا ایسا زبردست محاذ ([illegible]) قائم کردیں کہ روس سے لڑتے ہوئے بھی ہٹلر کو پچاس ساٹھ لاکھ کی فوج سے انگلستان اور امریکہ کا مقابلہ کرنا پڑے اور اگر یہ کام چند مہینوں نہیں چند ہفتوں میں شروع کر دیا گیا تو اب سے پانچ چھ مہینوں کے اندر ہٹلر کی طاقت کا خاتمہ ہوجائے گا اور یورپ آزاد ہوجائے گا۔ پھر جاپان ایک آزاد یورپ کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے گا خواہ اس درمیان میں جاپان کتنا ہی بڑھ جائے۔ لیکن اگر چند ہفتوں کے اندر امریکہ اور انگلستان نے ہٹلر کے خلاف دھاوا نہیں بول دیا تو ایشیا میں چین اور ہندوستان پر جاپان کا زبردست قبضہ ہوجائے گا اور اُدھر روس کا خاتمہ ہٹلر کے ہاتھوں بھی بہت ڈر ہے کہ ہوجائے۔ پھر مسٹر روزویلٹ کا پروگرام اور انگلستان میں سامانِ جنگ کے پہاڑ کوئی کام نہ آئیں گے۔ ہاں تو اگر بغیر موجودہ سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام بدلے ہوئے بھی انگلستان اور امریکہ جلد از جلد ہٹلر کے لئے دوسرا محاذ کھول دیں تو جرمنی اور جاپان اور اُن کے تمام ساتھی ہار جائیں گے۔ لیکن یاد رہے کہ جرمنی اور جاپان کی ہار چرچل اور روزویلٹ اور دُنیا بھر میں اُن کے ساتھیوں یعنی سرمایہ داری کے طرفداروں کی ہار ہوگی۔ ہٹلر تو چرچل اور روزویلٹ کی زہریلی چھٹی اُنگلی ہو رہا ہے جسے کاٹو تو بھی موت اور نہ کاٹو تو بھی موت ؎

ڈر رہے ہیں شکستِ دُشمن سے لڑنے والوں کی وضعداری ہے

لیکن ہمیں چرچل اور روزویلٹ اور اُن کے ساتھیوں اور مشیرکاروں سے ابھی بالکل نااُمید نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ جنگ نے جو انقلابی فضا پیدا کر دی ہے اس سے متاثر ہوکر دُنیا کے غلام ملکوں اور نادار طبقوں کی آزادی اور بہبودی کا زیادہ دیانتدارانہ اعلان بھی چرچل اور روزویلٹ کر دیں اور نئے نظام کو سو فی صدی اشتراکی بنائے بغیر بھی بہت بڑی حد تک اُسے اشتراکی بنانے پر تیار ہوجائیں اور ہٹلر کے خلاف زبردست محاذ بھی کھول دیں۔ یہ ذہنی اور اخلاقی اور عملی انقلاب انگلستان اور امریکہ کے اہلِ حکومت میں جنگ کے دباؤ سے پیدا ہوسکتا ہے لیکن ہٹلر اور اس کے ساتھیوں میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ نازیت اور فاشیت ہٹلر اور مسولینی اور جاپانی حکمران تو جہنمی قوتوں کے سرمایہ داری کی قوت کے اوتار ہیں، وہ تو مجسم شر اور فساد ہیں۔ لیکن چرچل، روزویلٹ اور اُن کے شریک کار محض ایک قدیم اور فرسودہ روایت کے زیر اثر ہیں۔ اس کا بہت کچھ امکان ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے اہلِ حکومت سرمایہ داری کی زنجیر کو اگر توڑ نہ دیں تو بھی اُسے ڈھیلا اور کمزور بنا دیں اور اس طرح دُنیا بھر میں آزادی کی کھلی فضا قائم کرکے دُنیا بھر کے ساتھ انصاف و محبت اور باہمی امداد و موالات کی بنا پر رہنا اپنا نصب العین بنالیں۔ شاید اس ذہنی، اخلاقی اور عملی عالمگیر انقلاب کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ غریب قوموں اور مالدار قوموں، معمولی حکومتوں اور سامراجی حکومتوں پر، یعنی آقا اور غلام سب پر ہٹلر کی مار پڑے۔ شر کے دھوئیں اور اس کی چنگاریوں میں خیر کے پھول اور گلزار چھپے ہوتے ہیں۔ انسان کی جے کے لئے شیطان کا جنگ آزما ہونا ضروری ہے۔

میں یہ بات کسی سیاسی مصلحت سے نہیں کہتا کہ اگر اب سے لگ بھگ ایک ہزار برس پہلے مسلمان ہندستان نہ آتے، اور ہندستان کی زندگی اور آبادی کے ایک اہم جزو نہ بن جاتے تو ہندستان زندگی کی سینکڑوں اہم قوتوں اور لطافتوں سے محروم رہتا۔ مسلمانوں نے ہندستان کو بگاڑا نہیں بلکہ بنایا۔ اسلام کی قوت ہندستان میں ایک تعمیری اور خلاقانہ قوت رہی ہے۔ ہندستان کی زمین دُنیا بھر کی جنم بھوم ہے ــــ میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے ــــ اگر مسلمانوں کی طرف سے اقبال نے یہ کہا ہے۔

"مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

تو ہندستان کے مُسلم اور غیر مسلم تمام باشندوں کی طرف سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہندستان سارے جہان کا وطن ہے۔ ہندستان صرف ایک جغرافیائی اکائی نہیں ہے اور نہ اس کے باشندے ایسے ہیں کہ انہیں ہندستان سے اُجاڑ کر جہاں چاہے بسا دیا جائے۔ ہندستان ایک روحانی اکائی ([illegible]) ہے۔ ہندستان کا اپنا ایک مزاج ہے جو ہندو مسلمان عیسائی اور ہر مذہب و ملت اور لامذہبوں میں یکساں موجود اور کارگر ہے۔ ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کے کوئی معنی نہیں۔ مگر ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی کلچر کے معنی نہایت اہم ہیں۔ ایک خود غرض بدیشی حکومت کچھ دنوں سے اس مشترکہ کلچر کو پنپنے سے روکنے کی کوشش کرتی رہی ہے اور بظاہر کچھ کچھ کامیاب بھی ہوتی رہی ہے۔ اور یہ بھی مسلّم ہے کہ غلامی اور افلاس کی فضا میں یہ مشترکہ تہذیب نشوونما حاصل نہیں کرسکتی تھی۔

پھر بھی عارضی طور پر ہندو مسلمان ایک دوسرے کے حریف ہوتے ہوئے چند روزہ انگریزی حکومت میں بگڑ بگڑ کر بھی یوں بنتے اور سنورتے رہے کہ اب اُن کا اتحاد اور میل اور بھی بار آور ہوگا۔ بھارت شکتی، تفرقہ پردازیوں کے پردے میں اپنا کام کرتی رہی۔

ے کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن یہ آسماں ہمارا

ہندو اور مسلمان دونوں قدیم یونان، قدیم روم، قدیم مصر کی تہذیبوں سے زیادہ جاندار اور حیات اور تہذیب کے حامل اور وارث تھے۔ ہندو اور مسلمان تہذیبوں میں تصادم ہونا بھی لازمی تھا اور میل ہونا بھی یقینی تھا، اور تاریخی جدلیت (Dialectics of History) نے اس سلسلے کو قائم رکھا۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ تصادم سرے سے مٹ جائے اور سو فی صدی اتحاد ہو جائے۔ اس اتحاد میں ہندو رسوم اور سینکڑوں خارجی اور ضمنی چیزیں ہندوؤں کی زندگی سے، اور مسلم رسوم اور سینکڑوں خارجی اور ضمنی چیزیں مسلمانوں کی زندگی سے مٹ جائیں گی۔ معاشرت دونوں کی بالکل یکساں ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ عبادت اور مذہب بھی دونوں کے ممکن ہے مٹ جائیں۔ دونوں کی زندگی کے میل سے ایسی روحانیت رونما ہو جس کی مثال گذشتہ صدیوں کی زندگی میں رشیوں اور ولیوں کی زندگی میں بھی نہ ملے۔ یہ روحانیت شعور اور زندگی کے ایک مخصوص داخلی ارتقا کے ذریعے رونما ہوگی اور نشو و نما پائے گی۔ کاش ہندو سبھا اور مسلم لیگ کے اربابِ حل و عقد و قضا و قدر اس نئی زندگی کے جنم کے آثار دیکھ سکتے۔

مجھے جہاں اور سینکڑوں ضمن اس نئی زندگی کے نظر آرہے ہیں وہاں دورِ حاضر کے ہندستانی ادب میں خصوصیت سے اس نئی زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اس باب میں ہندستان کی تمام زبانوں کے مقابلے میں جو انقلاب اُردو ادب میں گذشتہ پانچ سات برس کے اندر رونما ہوا ہے وہ غالباً اُردو ادب کو اس نئی زندگی کا میرِ کارواں کا مرتبہ دے رہا ہے۔ ہندستان کی اور زبانوں کے ادب خالص ہندو چیز رہے ہیں اور وہ بہت آہستہ آہستہ سست رفتاری کے ساتھ متحدہ نئی زندگی کی فضا میں آنکھیں کھول رہے ہیں۔ لیکن اُردو ادب ہرگز خالص اسلامی چیز نہیں رہا ہے نہ اُردو زبان خالص اسلامی زبان رہی ہے۔ اُردو خالص اسلامی چیز ہوتی تو اس میں یہ دلکشی نہیں ہوتی۔ بہرحال اُردو ادب میں نمایاں طور پر ایک نئی جانکاری اور فرزانگی آرہی ہے۔ اب اُردو شاعری اور اردو ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں رہے۔ وہ نئی زندگی کے آئینہ دار ہو رہے ہیں۔ اُردو ادب میں انقلاب انگڑائیاں لے رہا ہے۔ وہ انقلاب جو دنیا بھر میں ہوتا ہوا ہندستان میں بھی آئے گا اور کیا عجب کہ یہیں آکر دم لے۔ وہ انقلاب جو ہم ہندو مسلمانوں اور دوسرے اہلِ ہند کی صدیوں کی زندگی کو ایک اہم مقام پر پہونچا دے گا اور ایک طولانی سلسلے کی تکمیل کریگا ے

آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں لب پہ آسکتا نہیں — دیکھنا ہندوستاں اب کیا سے کیا ہو جائیگا

یا بقول یگانہ (سابق یاس) ے

نگاہِ یاس ہے آئینۂ غمِ فردا — نظر کے سامنے سامان ہیں قیامت کے

فراق گورکھپوری

واپسی

میرے ایوانِ تخیل میں اندھیرا کیوں ہے؟
آج تاریک ہے کچھ روزنِ دیوار، نہیں
گل ہوئی جاتی ہے کیوں شمع شبستانِ وجود
میری آمد پہ وہ پُرآب نگاہیں بھی نہیں
آج خاموش ہیں دیوار و در و بام تمام
آج سنسان ہے کچھ مہر و محبت کی زمیں
جس پہ قدموں نے بنائے ہیں ہزاروں نقشے
وہم بننے لگی آنکھوں میں وہی راہ گذار
میرے دامن پہ کئی اشک ہیں ابتک تازہ
میرے شانوں پہ وہی جنبشِ سر ہے اب بھی
میرے ہاتھوں کو ہے احساس انہی ہاتھوں کا
میری نظروں میں وہی دیدۂ تر ہے اب بھی
اب بھی وہ ہونٹ لرزتے ہیں نگاہوں میں مری
اس تصور میں وہی شام و سحر ہیں اب بھی
آج آہٹ بھی نہیں کوئی اشارا بھی نہیں
کوئی ڈھلکے ہوئے آنچل کا سہارا بھی نہیں

آچلی سرد ہواؤں کے تنفس میں جھجک
ہر طرف پھیلتی جاتی ہے سیاہی شب کی
اور تاریک ہُوا جاتا ہے ہر لمحہ خیال
ایک آواز سی پُرہول خلا میں گونجی
کس قدر تنگ ہے امید کا میدانِ وسیع
شوق تازہ کی ہر اک سانس ہے سہمی سہمی
کیا پلٹ جائیں گے ناکام مرے پاؤں یونہی!
آج کیا ٹوٹ ہی جائے گا مرا سازِ حیات!
کچھ بھیانک سے اشارے ہیں درونِ خانہ
مُنہ چڑاتی ہے دریچے سے کوئی چیز مرا
ایک آواز سی پُرہول خلا میں گونجی
سر پٹکتا ہے کوئی سرد ہوا کا جھونکا
چیخ اُٹھتے ہیں گذرتے ہوئے واقعات کے بھوت
یہ سرِ شام یہاں کون پلٹ کر آیا!
پھر کسی تازہ و وارفتہ محبت کا خمار!
لے گیا اس کو یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں

اخترؔ الایمان

ارجن اور کملا

دُور دُور تک پہاڑ اور پہاڑوں کے دامن پھیلے پڑے ہیں۔ ان پر سال کے جنگل اور دیودار کے بن کھڑے ہوا میں سائیں سائیں کرتے ہیں۔ ایک طرف جہاں بہت سی سرسبز پہاڑیاں پاس پاس گھری کھڑی ہیں، وہاں تاریکی ہے۔ اور وہیں ایک چراغ کی سی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ ندیا کے کنارے ایک غریب سادھو لکڑیاں بین رہا ہے، کہ اتنے میں ایک نوعمر خوشرو پردیسی جاتری کے بھیس میں اُدھر سے گذرا۔ صورت سے بہت ہی تھکا اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ سادھو کو دیکھتے ہی پکار اٹھا۔

"سادھو مہاراج، ہم غریبوں پر بھی دَیا کرو۔ میں ان پہاڑیوں میں کبھی کا رستہ بھولا بھٹکتا پھرتا ہوں۔ تھکن کے مارے اب چلا نہیں جاتا۔ قدم اٹھتا نہیں۔ چکر آ رہے ہیں۔ رستہ بڑا کٹھن ہے، کسی طرح نبڑتا نہیں۔ جتنا چلتا ہوں راہ اتنی ہی بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔ اتنی کرپا کرو کہ دور جو چراغ جلتا نظر آتا ہے وہاں تک پہونچنے کا رستہ بتا دو۔"

سادھو سنتے ہی بولا "پردیسی، خبردار۔ اُدھر نہ جائیو۔ وہ چراغ کا اُجالا نہیں ہے۔ وہاں تو اگیا بیتال چمک رہی ہے کہ دھوکا دیکر تجھے جان سے کھو دے۔ اگر آرام چاہتا ہے تو یہاں سے کچھ دُور میری منڈھیا ہے۔ پونجی میری تھوڑی ہے۔ پر جتنی ہے خوش ہو کر اُسے محتاجوں پردیسیوں کو دیتا ہوں۔ بابا۔ اب رات ہونے کو ہے۔ بس وہیں چل اور میری جھونپڑی میں جو کچھ ہے وہ تیرے لئے موجود ہے۔ پھونس کا بستر ہے، سیدھا سادا کھانا ہے۔ اور ایشور کے گیان میں سا جھا کر۔

پہاڑوں میں جو اُجلے اُجلے ریوڑ بھیڑوں کے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ان غریب جانوں کو مار کر کھانا میں بُرا سمجھتا ہوں، جو مالک مجھ پر رحم کرتا ہے اُس سے میں نے اِن پر رحم کرنا سیکھا ہے۔ پر سامنے جہاں گھاٹی میں ہریاول زیادہ ہے وہاں سے کچھ ساگ پات، پھل پھلیاں چن کر پانی پہاڑ کے صاف اور ستھرے چشمے سے بھر لاتا ہوں۔ دیکھ اندھیرا بڑھتا جاتا ہے، پردیسی۔ بس دُنیا کی فکروں کو دُور کر اور میرے ساتھ منڈھیا میں چلکر کچھ دیر آرام کر لے۔ بابا، اپنا غم دُور کر۔ اس سنسار کی جتنی بپتا اور جتنے دُکھ ہیں سب ہیچ ہیں۔ دُنیا میں انسان کی ضرورتیں کم ہیں اور جتنی ہیں وہ بھی تھوڑے دن کی ہیں۔"

سادھو کی اس تواضع کا جواب جاتری نے ایسی شیریں اور لطیف آواز میں دیا جیسے آسمان سے پھولوں پر اوس گرتی ہو۔ جھک کر سادھو کو تعظیم دی اور منڈھیا تک جانے کو سادھو کے پیچھے ہو لیا۔

کچھ دُور ایک ویران سے مقام پر سادھو کی جھونپڑی تھی۔ جو بھولے بھٹکے مسافروں کیلئے بڑی پناہ کی جگہ تھی۔

اس جھونپڑی میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کی رکھوالی کی اُسکے مالک کو ضرورت ہو۔ دروازے میں کنڈی تک نہ تھی۔ پٹ یونہی بھڑے تھے۔ اب سادھو اور جاتری دونوں جھونپڑی کے اندر گئے۔

جب وہ وقت آیا کہ لوگ دن بھر کی محنت مشقت کے بعد آرام کرتے ہیں تو سادھو نے اپنی منڈھیا میں آگ جلائی اور مہمان کو خوش کرنا چاہا۔

جو کچھ ساگ پات موجود تھا اُس کے سامنے رکھا۔ ہنس ہنس کر باتیں کیں، اور اس خیال سے کہ وقت ہنسی خوشی کٹ جائے مہمان کو کہانیاں سنانی شروع کیں۔

آگ جلتے ہی منڈھیا میں اندر تو پتنگوں کے اُڑنے کی بہار تھی اور باہر جھینگر بول رہے تھے۔ سادھو نے مہمان کا غم غلط کرنا چاہا مگر اس کا دل کسی طرح ہلکا نہ ہوا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سادھو جاتری کی یہ حالت دیکھکر گھبرایا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا پوچھے کیا نہ پوچھے۔ جب نہ رہا گیا تو کہنے لگا: "مصیبت کے مارے مسافر تیرا دل کیوں اتنا غم میں ڈوبا ہے؟ کیا گھر بار چھٹنے کا رنج ہے، یا کسی دوست کی بیوفائی کا۔ یا کسی سے عشق کیا اور نامراد رہا اس کا صدمہ ہے۔ افسوس، مال و دولت سے جو راحتیں ملتی ہیں وہ چند روزہ ہوتی ہیں، وہ ادنیٰ ہوتی ہیں اور جلد غارت ہو جاتی ہیں۔ اور جو اِن ادنیٰ چیزوں کی قدر کرتے ہیں وہ ان چیزوں سے بھی ادنیٰ تر ہوتے ہیں۔ اور دوستی کیا چیز ہے، بس اِسے تو نام ہی نام سمجھو۔ وہ تو نیند لانے کی ایک لوری ہے کہ سنتے ہی آدمی سو جائے۔ دولت اور نام ایک سایہ ہے جو ڈھل جائے گا۔ اور پھر رونے اور حسرت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اور عشق۔ یہ تو دوستی سے بھی بدتر ایک چیز ہے۔ آج کل کے حسینوں کا ایک مشغلہ ہنسی مذاق کا سمجھو۔ عشق کا پتا دُنیا میں نہیں۔ پپیہے کی آواز یا قمری کے آشیانے میں ہو تو ہو۔ بس پردیسی، عقل کے دشمن اِن باتوں کو جانے دے۔ اور اپنا غم دُور کر اور

کسی عورت کی وجہ سے اپنی زندگی غارت نہ کرے۔"

سادھو جب یہ باتیں کر رہا تھا تو جاتری کا چہرہ سُرخ ہونے لگا۔

اب جو سادھو دیکھتا ہے تو جاتری پر حسن و جمال کا ایک رنگ آتا اور دوسرا جاتا ہے۔ اور یہ نئے نئے رنگ اس طرح پیدا ہو رہے ہیں جیسے نور کے تڑکے برف کے پہاڑوں پر سورج کی کرن نئے نئے جلوے دکھاتی ہے۔

مرمریں شانے اور اُبھرتا سینہ دیکھکر سادھو ڈرا کہ اتنے میں وہ تھکا ہارا جاتری ایک نہایت حسین لڑکی کی صورت میں نمودار ہوا۔

اور اب یہ لڑکی شرما کر بولی "سادھو مہاراج مجھ غریب دکھی کی خطا معاف ہو۔ میں نے آپ کی اس پاک اور پوتر جھونپڑی کو جہاں آپ بھگوان کو یاد کرتے ہیں اپنی موجودگی سے ناپاک کیا۔ لیکن اجازت ہو کہ ایک دکھیا لڑکی آپ سے رحم کی درخواست کرے جسے عشق نے گھر سے بے گھر کیا۔ آرام چاہتی ہوں مگر سوائے مایوسی اور غم کے کوئی ساتھ دینے والا نہیں ملتا۔

سادھو جی کے برا جی سنو۔ میرا باپ گنگا کے کنارے رہتا تھا۔ مال اُس کے پاس بہت تھا اور میں اس کی اکلوتی اس کی دولت کی وارث تھی۔ جب جوان ہوئی تو بڑے بڑے بھیلے جوان مجھ سے شادی کی آرزو میں میرے باپ کے گھر آنے جانے لگے۔ اب روز بروز ان جوانوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ یہ سب بڑے بڑے وعدے مال و دولت کے مجھ سے کرتے تھے۔ ان ہی جوانوں میں ایک ارجن تھا اُسے مجھ سے عشق تھا، مگر کبھی عشق کا نام زبان پر نہ تھا۔ کپڑے بہت سیدھے سادے غریبوں کے سے پہنتا تھا۔ دھن دولت کچھ پاس نہ تھا۔ صدق و صفا، لیاقت اور ذہانت بہت تھی۔ مجھے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے تھا۔ جب میرے پاس بیٹھ کر وہ عشق و اُلفت کے راگ الاپتا تو اُس کی شیریں آواز فضا میں خوشبو بن کر مہکنے لگتی۔ اور باغوں میں درخت جھومنے لگتے۔ صبح سویرے جو کلیاں اوس میں نہائی دھوئی پاکیزہ پھول بن کر کھلتی ہیں وہ پھول اتنے پاکیزہ اور حسین نہیں تھے جتنا کہ اس کا دل تھا۔ درختوں پر پھول اور پتّوں پر شبنم اپنا حسن و جمال دکھاتی ہے پھول حسین تو ہوتے ہیں مگر ان کے رنگ و بو کو ثبات نہیں ہوتا۔ یہ حسن و جمال تو ارجن کا تھا اور بے ثباتی میری۔ کوئی بے اعتنائی ایسی نہ تھی جو میں نے اس کے ساتھ نہ کی ہو۔ اس کی محبت کا اثر میرے دل پر تھا مگر اُسے دُکھ دینے میں میں خوش ہوتی تھی۔ جب وہ میری بے اعتنائیوں سے بیزار اور مایوس ہوا تو وہ مجھے میرے غرور اور نخوت پر چھوڑ کر تنہائی کی تلاش میں کہیں نکل گیا اور اسی حال میں وہاں مر کھپ گیا۔ لیکن قصور اور قصوروں سے جتنے رنج اور صدمے پہونچے وہ سب میرے تھے۔ اور اب جس تنہائی میں وہ جا کر مرا ہے اُسی تنہائی کو تلاش کر کے میں اپنی جان دے کر اُس کی جان کا صدقہ کروں گی۔ اور میں بھی وہیں کہیں پڑ کر مر رہوں گی۔"

سادھو چلّایا "نہیں، ہرگز نہیں۔ ایسا نہ کیجیو" اور اتنا کہہ کر اس نے حسین جاتری کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ لڑکی چونکی اور سادھو پر بگڑنے کو تھی کہ فوراً معلوم ہوا کہ یہ تو ارجن ہے جس نے اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا؟

سادھو بولا "پیاری کملا۔ مجھ پر جادو چلانے والی میری جان کملا، میں تو تیرا وہی کھویا ہوا ارجن ہوں جو اب پھر تجھ پر جان نثار کرنے کو زندہ ہوا ہے۔ بس اب مجھے اپنے سینے سے لگا لے تاکہ سب دُکھ دور ہوں۔ اور دونوں عشق و اُلفت کے متوالے پھر کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔"

عنایت اللہ دہلوی؛

بھونرا اور پتنگا

بھونرے سے پتنگے نے کہا طعن کی لَے میں ۔۔۔ فرسودہ ہیں کس درجہ محبت کے ترے ڈھنگ
وحشت ہے ترے ذوقِ جگر سوز سے مجھ کو ۔۔۔ رکھتی نہیں تہذیب روا رنگ میں یہ بھنگ
یوں شمع پہ جلنا ترا اندازِ جنوں ہے ۔۔۔ دیوانے! بجا تا ہے تو کیا موت کا مردنگ!
ہوتا ہی نہیں حسن کے شعلے میں کوئی سوز ۔۔۔ آ، باغ میں کر سیر ذرا آج مرے سنگ
دیوانے! مسرت ہی مسرت ہے محبت ۔۔۔ یعنی یہ محبت نہیں بے بادہ و بے چنگ
کلیوں کے تبسم میں نہاں دعوتِ صد کیف ۔۔۔ ساقی سے ہے میخوار ہم آغوش و ہم آہنگ

اُلفت تو ہے اک کھیل یہاں جذب و کشش کا
عالم ہی نرالا ہے مگر تیری روش کا!"

پروانے کی غیرت کی زباں ہو کے شرربار ۔۔۔ گویا ہوئی بھونرے سے کہ "اے مردکِ طنّاز!
معلوم حقیقت ہے ترے جذب و کشش کی ۔۔۔ مضرابِ ہوس سے ہے ترے ساز کی آواز
خالی نہیں مطلب سے اُدھر مشقِ تبسم ۔۔۔ دھوکا ہے اِدھر "رقص نما" تیری یہ پرواز
کلیوں کی صلا اور تری اُس پہ یہ لبیک ۔۔۔ دونوں نہیں ایسے کہ کرے اُن پہ کوئی ناز
معلوم نہیں کس کو ترے جو بھی ہیں کرتوت؟ ۔۔۔ تو وہ ہے کہ خود بادِ صبا جس کی ہے غماز
شعلے ترے بے سوز مبارک ہوں تجھی کو ۔۔۔ بھاتے نہیں اک آنکھ مجھے تیرے یہ انداز

لیلائے طرحدار ہے دیوانے کو شعلہ
گلزارِ براہیم ہے پروانے کو شعلہ!

تنقیدِ شاعر

ہے آتشِ نمرود امیں "حسنِ سرِ راہ" ۔۔۔ کہتی ہے مجھے میری براہیم نگاہی
وہ "مہرِ جہاں تاب" نہ جب تک ہو جگر سوز ۔۔۔ ہوتی ہے کہاں دُور شبِ دل کی سیاہی؟!
ممکن نہیں منزل پہ کبھی اس کا پہونچنا ۔۔۔ ہر سائے میں سستانے اگر بیٹھ کے راہی
اُترے ہوئے چہرے ہیں جو کلیوں کے چمن میں ۔۔۔ بھونروں ہی کے یہ "سیلِ ہوس" کی ہے تباہی
مدہوش ہے بدمست ہے ہر ذرّۂ گلشن ۔۔۔ سنتا نہیں بلبل کی کوئی آہِ پگاہی
جو اِس خس و خاشاک کو شعلے میں بدل دے ۔۔۔ بجلی کوئی ایسی ہی گرا اَب تو الٰہی!

کلیوں کی نگاہیں ہوئیں بے باک غضب ہے!
معصوم تھے جو دل ہوئے ناپاک غضب ہے!

امین حزیں سیالکوٹی

شرابی

امجد سے میرے ایک مدت سے دوستانہ تعلقات تھے۔ میرا دوست ایک شریف طبع انسان تھا۔ غیور بھی اور دوست نواز بھی۔ شہر میں بھی اس کی جائداد تھی اور مضافات میں بھی اس کی اراضیات تھیں۔ ٹھاٹھ بھی امیرانہ، وضع قطع بھی امیرانہ۔ اُسے تو ملازمت وغیرہ کی ضرورت ہی نہ تھی لیکن میں ملٹری آفس میں ملازم تھا۔ وقت مزے سے گذر رہا تھا۔ اچانک میری تبدیلی ہندوستان سے باہر ہوگئی۔ اسٹیشن پر جو لوگ مجھے رخصت کرنے آئے ان میں امجد بھی تھا۔ خیال تھا کہ سال دو سال بعد پھر وطن واپس آجاؤں گا۔ لیکن وطن کی صورت سات سال بعد دیکھنی نصیب ہوئی۔ اس سات سال کے عرصے میں میں نے بہت ملکوں کی سیر کی۔ حج بیت اللہ شریف سے بھی مشرف ہوا اور حکومت سے خطاب بھی ملا۔ — ۱

سال بھر تو امجد سے خوب خط و کتابت رہی۔ پھر دونوں طرف سے یہ سلسلہ کم ہونے لگا۔ کچھ میری طرف سے تساہل کچھ اُدھر سے تاخیر۔ آخر نوبت یہاں تک پہونچی کہ سال چھ مہینے میں ایک آدھ خط میں لکھتا اور ایک آدھ امجد۔

میں نے امجد کو واپس آنے کی اطلاع دیدی تھی۔ میرے احباب کے علاوہ امجد بھی اسٹیشن پر پیشوائی کے لئے موجود تھا۔ لیکن وہ پہلا امجد نہیں۔ ایک دُبلا پتلا امجد۔ پیٹ کسی قدر بڑھا ہوا، آنکھوں میں سرخ حلقے۔ کمر کچھ جھکی جھکی سی۔ آواز میں کچھ کرختگی تھی۔

وطن واپس آنے پر مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہی امجد جو دوستوں میں پاکباز اور مرد صالح کہلاتا تھا، اب دختِ رز کا شیدائی بنا ہوا ہے۔ عام لوگوں کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ جہاں دولت کی فراوانی ہو، جوانی ہو، بے فکری ہو وہاں اس قسم کے شوق ہوا ہی کرتے ہیں۔ امجد کی شادی میری عدم موجودگی میں ہوئی تھی اور کوئی سال بھر کی رفاقت کے بعد وہ نیک بخت اللہ کو پیاری ہوئی۔ اس کے مرنے کے بعد امجد نے دوسری شادی نہیں کی تھی اور میرے خیال میں یہی اُس کی غلطی تھی، بہرکیف یہ سب قیاسات ہی تھے۔ چونکہ میرے احباب کی رسمی دعوتیں اور بلاوے ابھی ختم نہیں ہوئے تھے اس لئے امجد سے اطمینان سے بیٹھکر باتیں کرنے کا موقع مجھے ابھی تک نہیں ملا تھا۔ کوئی آٹھ دس روز تک یہ مصروفیتیں رہیں۔ پھر کہیں جاکر اطمینان نصیب ہوا اور وہی رسم کہن پھر تازہ ہونے لگی یعنی ادھر شام ہوئی اُدھر میں امجد کے ہاں پہونچا یا وہ میرے یہاں آگیا اور ایک دنیا کی باتیں ہوا کرتیں۔ لیکن امجد نے ابھی تک میرے سامنے نہیں پی تھی۔ لیکن ایک روز اُس کے نوکر کی غلطی سے اس موضوع پر بات چیت کرنے کا موقع نکل ہی آیا۔

ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ امجد صوفے پر لیٹا تھا اور میں ایک آرام کرسی پر ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ نوکر چائے لیکر آیا اور ایک چھوٹی میز پر چائے کا سامان لگا دیا۔ میں جب چائے بنانے لگا تو امجد بولا "بھئی میرے لئے نہ بنانا"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تو کچھ پیاس لگ رہی ہے" امجد نے جواب دیا۔

"پیاس کے لئے تو چائے اچھی چیز ہے" میں نے کہا۔

"نہیں!" امجد بولا "لیکن میں تو چائے نہیں پیونگا"

نوکر جو پاس کھڑا تھا، جھٹ بولا "تو شربت لاؤں جناب"

"ہاں لے آؤ" امجد نے جواب دیا۔

نوکر سوڈا اور شراب لے آیا۔

"ارے کمبخت!" امجد بولا "یہ کیا اٹھا لائے"

"جناب ہی نے تو حکم دیا تھا" نوکر نے جواب دیا۔

امجد ہنس کر بولا "چلو یونہی سہی۔ جب خدا سے پردہ نہیں تو دوست سے کیا پردہ!"

یہ کہکر وہ ایک پیگ مزے مزے سے پی گیا۔ پھر ہنس کر کہنے لگا "بھئی معاف کرنا، خیال تو تھا کہ جب تک چھپ سکے گا تم سے چھپاؤنگا۔ لیکن اس احمق نے بھانڈا ہی پھوڑ دیا"

"یہ کب سے مُنہ لگی؟" میں نے پوچھا۔

"میری مجبوری اور لاچاری سمجھو" امجد نے دوسرا پیگ تیار کرتے ہوتے کہا۔

"کیا کہنے ہیں ایسی مجبوری اور لاچاری کے" میں نے زیرلب مُسکرا کر کہا۔

اور امجد جام مے کی طرف دیکھکر بولا "خدا کی قسم سچ کہتا ہوں

؎ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے "

"سب یونہی کہا کرتے ہیں" میں نے کہا "تم یہ کہو کہ ؎
ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدام ما! "

"واللہ ہرگز نہیں!" امجد نے ہنسکر کہا "تم سے بھی جھوٹ کہونگا کیا؟ جب یار ہی نہیں تو "رخِ یار" کہاں؟"

"چھوڑ مرے یار!" میں نے کہا "ہاتھ میں شراب اور زبان پر اللہ اللہ!"

"پہلے میری تو سن لو!" امجد نے جام میز پر رکھتے ہوتے کہا۔ "پھر جو کہنا ہو کہہ لینا!"

"یہ کہہ تو تم چکے ہو" میں نے کہا "کہ اس کی وجہ مجبوری اور لاچاری ہے۔ یہی نا یا کچھ اور بھی؟"

"بیشک!" امجد نے جوابدیا "مجبوری اور لاچاری! لیکن جانتے بھی ہو کیسی مجبوری اور لاچاری؟"

"کسی کوٹھے والی نے پلادی ہوگی" میں نے مسکرا کر کہا۔

"استغفراللہ!" امجد بولا "تم مجھے اتنا گیا گذرا سمجھ رہے ہو کیا؟"

"تم کچھ سمجھو" میں نے کہا "کہ تمہاری بیوی کو مرے پانچ چھ برس ہو گئے۔ دوسری شادی تم نے کی نہیں۔ جوان آدمی ہو۔ روپیہ پیسہ پاس ہو۔ مواصلت کی لذّت سے آشنا ہو۔ دختِ رز سے بھی آنکھ لڑا چکے ہو تو اگر بازارِ حسن کا تماشائی نہ ہوگا تو کیا ہوگا!"

"سبحان اللہ!" امجد نے ہنسکر کہا "کیا انوکھا استدلال ہے۔ تم کیا جانو کہ ؎
ختم ہو چکی ہوں رونے سے جسکی جوانیاں
اب وہ جوانیوں کو جگائے تو کس طرح "

"یہ شغل شراب بھی تو جوانیوں کے جگانے ہی کو ہے" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں! نہیں! ہرگز نہیں!" امجد نے ایک آہ بھر کر کہا "مجھے افسوس ہے کہ ایک دنیا جو مجھے سمجھ رہی ہے تمہارا بھی میرے متعلق وہی خیال ہے۔ قسمت بھائی!"

میں نے کہا "دنیا جو کہتی ہے وہی کہتی ہے!"

"لیکن!" امجد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرا تو یہ خیال تھا کہ کم از کم تم اس دنیا والوں کے ہم نوا نہ ہوگے۔ میں پیتا ہوں۔ پہلے چھپ کر پیتا تھا۔ پینے سے پیشتر ہچکچاتا تھا، کچھ شرم سی کچھ نفرت سی محسوس کرتا تھا لیکن اب کھلے بندوں پیتا ہوں۔ مانگ کر پیتا ہوں۔ ایک دنیا کے سامنے پیتا ہوں۔ گناہگار تو ضرور ہوں۔ لیکن حقیقت میں نہ میرے عیب جو کو یہ معلوم ہے کہ میں کیوں پیتا ہوں نہ میرا کوئی غمگسار ہی یہ جانتا ہے کہ میں نے یہ شغل کیوں اختیار کر رکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ نہ اوّل الذکر نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں اس گناہ کا مرتکب کیوں ہو رہا ہوں اور نہ آخر الذکر کو کبھی یہ جرات ہوئی کہ وہ مجھ سے شغل کے متعلق کچھ بات چیت کرے۔ ہاں! مجھے بُرا کہنے اور بُرا سمجھنے میں دونوں برابر ہیں اور دونوں میں سے یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ ؎
کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

لیکن مجھے موردِ الزام سمجھنے سے پیشتر اتنا تو ہونا چاہیئے تھا کہ واقعات پر بھی کچھ غور کر لیا جاتا۔ مشکل یہ ہے اس زمانے میں، باطن کو کوئی نہیں دیکھتا ظاہر دیکھ کر ہی نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے۔

تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے جانے کے کچھ روز بعد میں نے احباب کے اصرار پر شادی کرلی۔ بیوی بھی وہ تھی کہ چندے آفتاب چندے ماہتاب لیکن اس چاند ایسی صورت والی کو دل اور مزاج وہ ملا کہ خدا کسی کو نصیب نہ کرے۔ وہ نیک بخت سیدھے منہ بات کرنا تو جانتی ہی نہ تھی۔ تلون مزاجی نے یہاں تک فروغ پایا تھا کہ نوکر چاکر دو ہی دن میں نالاں نظر آنے لگے۔

خدا کے فضل سے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ خیال تھا کہ گھر والی کے قدم سے گھر میرے لئے راحت کا گہوارہ بن جائے گا۔ لیکن یہ امید بر آنے کی بجائے زندگی ایسی تلخ ہوئی کہ کچھ نہ پوچھو نہیں۔ اس نیک بخت کی تو یہ بات تھی کہ ؎
میں جو سیدھی بھی بات کرتا ہوں
ٹیڑھیاں وہ مجھے سناتا ہے

جو جتن ہو سکے کئے۔ لیکن اس کی بد دماغی کا مداوا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ایک سال کی ازدواجی زندگی کے بعد ایک بچہ ہوا۔ لیکن بچے کی پیدائش ماں کے لئے پیغامِ موت ہوئی۔ صبح اس نے آنکھیں بند کیں شام ہوتے ہوتے ننھا بھی ماں سے جا ملا۔ محرمِ راز سے یوں چھوٹ جانے کا افسوس تو مجھے ہوا۔ لیکن سچ پوچھو تو تھوڑے ہی روز بعد میری وہ حالت ہوئی جو ایک طائر کی قفس سے چھوٹنے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ میں آزادی محسوس کرنے لگا۔ مجھے ایک نئی زندگی نظر آنے لگی۔ وہی گھر جہاں قدم

رکھتے ہی دل کو بیزار کرنے والے ایک چھوڑ بیسیوں واقعات موجود ہوتے اب حقیقی معنوں میں راحت کا گہوارہ نظر آنے لگا۔ دل ایک اطمینان سا محسوس کرنے لگا۔ طبیعت کو کچھ سکون سا حاصل ہونے لگا۔ اور جناب! میں نے سچے دل سے یہ عہد کر لیا کہ اب شادی کا نام بھی میری زبان پر نہ آئے گا۔

بہت روز بیت گئے۔ اور زندگی بے کیف مسرّتوں کے ساتھ بسر ہونے لگی۔ انقلاب صرف اتنا ہوا کہ پہلے گھر سے ماہ بماہ سینما دیکھنے جایا کرتا تھا اب ہر دوسرے روز جانے لگا۔ عموماً دوسرے شو میں جاتا۔ اور واپس آتے ہی چادر اوڑھ کر لیٹ جاتا۔ ایک روز جو میں سینما دیکھ کر واپس آیا تو کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی عورت آرام کرسی پر بیٹھی ہے۔ میں نے غور سے دیکھا تو آرام کرسی بالکل خالی تھی۔ لیکن نہ جانے کیا وجہ تھی کہ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں کچھ دیر پلنگ کے پاس خاموش کھڑا رہا۔ پھر شب خوابی کے کپڑے پہن کر پلنگ پر لیٹ گیا اور کمبل اوڑھ لیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں اندھیرے میں سونے سے گھبراتا ہوں۔ ایک بہت کم روشنی والا سبز رنگ کا بجلی کا لیمپ جل رہا تھا۔ کرسی کی طرف دیکھا۔ یقین مانو تم! مجھے پھر ایسا معلوم ہوا کہ کوئی عورت کرسی پر سر جھکائے بیٹھی ہے۔ تم اسے چاہو تو میرا وہم کہہ لو۔ لیکن اس عورت کو دیکھتے ہی میرے بدن میں ایک کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ شکل و شباہت سے میری ہی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس خیال سے میرے دل میں کچھ گھبراہٹ سی کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ میں نے اٹھ کر ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ کرسی بالکل خالی تھی۔ لیکن میرا دل دھڑک رہا تھا۔ پلنگ کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر کچھ اخبارات رکھے تھے۔ میں ایک اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اخبار تو ہاتھ میں تھا لیکن خیال کسی اور ہی طرف پرواز کر رہا تھا۔ میں نے حیات روح پر کئی مضامین پڑھے تھے۔ اور میں خود بھی اس نظریہ کا قائل تھا کہ مرنے کے بعد ارواح اس گھر میں جہاں وہ کبھی جسم اور پوست کی قیود میں رہتے تھے، پھیرا کرتے ہیں۔ اس خیال نے مجھے دیر تک سونے نہ دیا اور خاص کر اس کمرے میں مجھے کچھ وحشت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کمبل اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر کے صوفے پر لیٹ رہا۔ اور آخر نیند نے مجھے اس وہم یا خیال یا خوف سے نجات دلا دی۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو اپنی اس کمزوری یا وہم پر مجھے کچھ ندامت سی محسوس ہونے لگی۔ دن تو گذرا سو گذرا لیکن رات پھر وہی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میں جب کرسی کی طرف دیکھتا مجھے اپنی بیوی بیٹھی ہوئی نظر آتی۔ بالکل خاموش اور سر جھکائے ہوئے۔ ایک روز گذرا دوسرا بھی گذرا تیسرا بھی پھر چوتھا بھی۔ لیکن وہ جو ایک وہم سا یا خیال سا دل میں بیٹھا ہوا تھا نہ وہ نہ جانے ویسا ہی رہا۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ ایسی حالت میں نیند کیسے آسکتی تھی۔ ایک خوف تھا جو ہر وقت دامنگیر رہتا۔ تنگ آکر میں نے اپنے نوکر کو حکم دیا کہ رات وہ میرے ہی کمرے میں سویا کرے۔ نوکر تو مزے سے خراٹے بھرتا اور میں اپنے اسی وہم یا تخیل کا شکار بنا رہتا۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر دن کے وقت بھی میں اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا تو وہی صورت پھر پیدا ہو جاتی لیکن اگر کوئی میرے پاس ہوتا تو یہ کیفیت پیدا نہ ہوتی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ میرے دن کس مصیبت سے گذرتے ہوں گے۔ اور میری زندگی کس قدر تلخ ہو گی۔ دن تو خیر کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتا۔ لیکن رات تو ایک پہاڑ بن کر آتی۔ مصیبت یہ تھی کہ نوکر کے خراٹے کسی ہوائی جہاز کی آمد کا پتہ دیتے تھے اور میری یہ عادت کہ گھڑی کی ٹک ٹک بھی نیند اُچاٹ کر دے۔ گھر میں رہنا ایک مصیبت نظر آنے لگا تو میں نے کچھ روز سیر و سیاحت میں گذارنے کا ارادہ کیا اور ایک روز رخت سفر باندھ کر گھر سے چل دیا۔ کئی ایک مشہور مقامات کی سیر کی۔ کئی ایک خوبصورت شہر دیکھے۔ لیکن جب کبھی اکیلا ہوتا تو وہی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ اس اثنا میں میں نے ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا اور دو ایک خدا رسیدہ لوگوں سے بھی دُعا کی خواہش کی۔ لیکن نہ تو ڈاکٹروں کی ادویات سے کچھ حاصل ہوا نہ اِن بزرگوں کی دُعاؤں سے کچھ بنا۔ اور حالت یہ ہوئی کہ اب میں زندگی ہی سے بیزار ہو گیا۔

سفر کے دوران میں میرا قیام ہوٹل ہی میں ہوتا۔ ایک روز رات کے وقت میں ایک ہوٹل میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ پانچ دس اور مسافر بھی اِدھر اُدھر کرسیوں پر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ ایک حضرت سامنے شراب کی بوتل رکھے اور ٹانگیں میز پر پسارے اونگھ رہے تھے کہ اچانک آگ آگ کا شور بلند ہوا۔ آگ باورچی خانے میں لگی تھی۔ ہم سب باورچی خانے کی طرف بھاگے۔ آگ پر تو جلدی ہی قابو پا لیا گیا۔ لیکن جب میں واپس آیا تو وہ شراب کی بوتل والا اسی طرح کرسی پر مگن بیٹھا تھا۔ گویا اُسے کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ کچھ ہوا بھی ہے یا نہیں۔

ہوٹل میں نوکر کو پاس سُلانا چونکہ مناسب نہ تھا اس لئے مجھے اکیلے ہی سونا پڑتا۔ لیکن نیند کسے آتی۔ بہت رات گئے تک وہی صورت کبھی اِدھر کبھی اُدھر کھڑی ہوئی نظر آتی۔ اور جب پو پھٹنے کا وقت ہوتا تب کہیں میری آنکھ نیند سے آشنا ہوتی۔

توجناب! تم خود ہی اندازہ لگالو کہ کس ضیق میں میری جان تھی۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن! میں کسی شہر میں دو چار روز سے زیادہ نہیں ٹھہرا کرتا تھا لیکن جہاں کہیں بھی جاتا یہ بلا بھی وہیں آموجود ہوتی۔ اس وقت مجھے اس شخص کا جو شراب کی بوتل سامنے رکھے مزے سے اپنی دُنیا بسائے پڑا تھا، اکثر خیال آتا۔ چنانچہ ایک روز میں نے بھی یہ نسخہ آزمانے کا ارادہ کر ہی لیا۔ اور شراب کی ایک بوتل اور سوڈا میں نے اپنے کمرے میں منگوایا۔ مشکل یہ تھی کہ نہ کبھی پی تھی اور نہ پینے کا ڈھنگ ہی معلوم تھا۔ ہاں یہ جانتا تھا کہ سوڈے یا پانی میں ملا کر پی جاتی ہے۔ اس رات میں بارہ بجے کے قریب سینما دیکھکر ہوٹل میں واپس آیا۔ ہوٹل کے دربان نے میرا کمرہ کھولا اور حسب دستور وہی صورت ایک کونے میں کھڑی نظر آئی۔ اب مشکل یہ آپڑی کہ جہاں وہ مجھے کھڑی نظر آرہی تھی وہیں وہ الماری بھی تھی جس میں میں نے شراب کی بوتل رکھی تھی۔ بہرکیف میں ہمت کرکے الماری کی طرف بڑھا اور وہ دُھندلی سی شکل وہاں سے غائب ہوگئی۔ میں نے شراب اور سوڈے کی بوتل نکالی اور اسی طرح گھونٹ گھونٹ پیتے گلاس ختم کر ڈالا۔ کچھ دیر بعد طبیعت میں کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ پھر قے ہوئی۔ میں نے اُٹھ کر مُنہ صاف کیا۔ کچھ دیر بعد پھر قے ہوئی۔ اس کے بعد مجھے نیند آگئی۔ اُس رات میں خُوب مزے سے سویا۔ صبح میں جب خواب سے بیدار ہُوا تو سر بھاری سا تھا طبیعت بھی کچھ بے مزہ سی تھی۔ لیکن اس پر بھی دل ایک سکون سا محسوس کر رہا تھا۔ اب اس داستان کو کہاں تک طول دوں۔ اسی ایک نسخہ کی بدولت مجھے نئی زندگی ملی۔ پہلے ضرورتاً پیتا تھا پھر عادت سی ہوگئی۔ اب دُنیا جو چاہے کہے، اپنا تو یہ عقیدہ ہے کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر!

ایم۔ اسلم!

آہِ ناتمام

حشر تک باعثِ ہنگامۂ عالم ٹھہرا
وہ بیک جلوہ ترا جلوہ نما ہوجانا

اے بے خبر وہ تیرے تغافل سے مٹ گئیں
اب لذتیں کہاں ہیں غمِ جانگداز میں؟

موسمِ گُل کی ابتدا، میرے جُنوں کی انتہا!!
لاؤں کہاں سے پیرہن دن ہیں ابھی بہار کے؟

جوشِ جُنوں بروئے کار آنہ سکا بہار میں
ہاتھ اُلجھ کے رہ گئے دامنِ تار تار میں

دیدۂ قیس بند ہے شاید!
پردے اُٹھے ہوئے ہیں محمل کے

غرق ہو کر اُٹھا دئے میں نے
امتیاز آج بحرِ و ساحل کے!

جاتے جاتے نگاہ ڈال گئے
گِر رہا تھا مجھے سنبھال گئے

دامنِ تنگ، ننگِ بخشش تھا
ہم ترے در سے بے سوال گئے

تابش دہلوی!

بسنت

ہوا میں تازگی فضا میں دلکشی سما گئی
وہ گُدگُدی جو ہر کلی کے لب پہ مُسکرا گئی
بسنت کی خبر کلی کلی کو گُدگُدا گئی
بہار بادلوں کی طرح بوستاں پہ چھا گئی

وداعِ شب سے جاگ اُٹھے طیورِ نغمہ باختہ
اُڑی پھننگ سے بلندیوں کی سمت فاختہ[1]
"دو صد اُصول ساختہ ترانہ ہا نواختہ" (قاآنی)
اُسی پھننگ پر "کسیکو" ساتھ لیکے آ گئی

دلوں میں سیر کی امنگ لے رہی ہے چٹکیاں
رُخ و جبیں جواں نظر نظر مزاج داں
شکیل فطرتیں ہیں سبزہ زار پر جہاں تہاں
جدھر اُٹھی۔ جدھر پڑی۔ دلوں کو بھید پا گئی

"ترنج زر" کو مات کر رہے ہیں زرد سنترے
پکارتی ہے "لائی" کھیت میں یہاں وہاں درے
یہ مرغزار ہیں کہ فرشِ مخملیں "ہرے بھرے"
ادھر نظر اٹھی کہ زعفران میں نہا گئی

"شریکِ زندگی" وہ کشت کار اُٹھ اُٹھا چکے
جو آ گھسیں تھیں کھیت میں وہ بکریاں بھگا چکے
بچی کھچی۔ مٹھے کیسا تو کھا کے کھیت جا چکے
یہ جتنی بکریاں تھیں "انکو" جو بھی منہ پہ آ گئی

یہ گاؤں کی جوانیاں سحر کو بے سپتے ہوئے
سیاہ "ناگنیں" بغل میں گاگریں لئے ہوئے
قدم کو لغزشیں۔ نظر کو مستیاں دئے ہوئے
"جگت"[2]، پہ عورتوں میں جیسے رات ڈھل ڈھلا گئی

طراوتوں سے پھٹ پڑا شباب سوسن و سمن
گدازیِ بدن۔ ہوا کے رُخ پہ "تنگ پیرہن"
چمن میں حسنِ سیمتن۔ روش روش پہ گامزن
نسیمِ صبح آنچلوں میں سلوٹیں بنا گئی

وہ پیلوؤں[3] کی تتلیوں میں دلفریبیاں کہ بس
یہ سار یوں کے رنگ روپ "جسپہ کسکو" دسترس
وہ چمپئی لباس ہر طرف کہ دیکھ اور ترس
یہ "دسترس کی بات" صرف قافیہ سجا گئی

نہیں یہ قافیہ نہیں "برائے بیت" بے اثر
یہ کہہ تو دوں کہ میں بھی انکا ہمخیال ہوں۔ مگر
سُنیں! جو نوحہ خواں رہے ہیں اعتبارِ حسن پر
وہ پھول توڑتی ہوئی مرے قریب آ گئی

شاد عارفی

[1] نئی مادہ کو لبھانے کیلئے "نر فاختہ" کا یہ کرتب عموماً کامیاب رہتا اور کبھی نہیں بھی؛ [2] کنوئیں کی من۔
[3] پیبل پر پیدا ہونے والی تتلیاں حسین ترین مانی جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ پیلوؤں کے ذکرے میں سے کوئی لطیف تر معنی لئے ہوں۔ شاد

کُنکی

خواجہ حافظ رح نے فرمایا تھا ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

ہم بھی اس دلخوش کن اُمید میں "قند اردو" بن کر یہاں آئے لیکن طوطیان بنگالہ کا "شکر شکن" ہونا تو درکنار کسی نے یہ بھی نہ جانا کہ یہ مصری کی ڈلی ہے یا نمک کا ڈھیلا اور ہم اُلٹے "ہر چہ درکان نمک رفت نمک شد" کے مصداق خود بنگالی بابو بن کے رہ گئے، دل کی بھڑاس کبھی کبھی شعروں میں نکال لی مثلاً ؎

قیدِ زاغ و زغن میں ہے بلبل
حال فضلی کا پوچھتے کیا ہو

یا ؎

حیرت ہے کہ دل زندہ ہے اب بھی ترا فضلی
اس جال میں جنجال میں بنگال میں پھنسکے

لیکن یہ سب شاعرانہ شکایتیں تھیں، سچ تو یہ ہے کہ "بنگالی بابو" بننا بڑا دلچسپ ثابت ہوا، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا تو مجھ پر بڑا گہرا اثر پڑا، شاید پڑھنے والوں پر بھی کچھ نہ کچھ ہو۔

واقعہ یہ ہوا کہ ایک ضلع میں جہاں کے ہم "بڑے بابو" تھے یا سرکاری پُرشکوہ اصطلاح میں کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر، وہاں ایک بڑے زمیندار صاحب رہتے تھے، بنگال میں زمیندار ؎

آوارہ و منتشر ہیں مانند غبار
معلوم ہوا مجھ کو زمیندار ہیں آپ
(اکبر)

کے مصداق نہیں ہوتے بلکہ ہمارے ہاں کے بڑے تعلقہ دار یا راجہ کی طرح، تو وہ راجہ صاحب اکثر سلام کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے، تن و توش ایسا کہ ہزاروں لاکھوں کے مجمع میں بھی نمایاں رہے، فٹن سے اترنے چڑھنے میں دو مضبوط آدمی سہارا دیتے تھے اور سہارا دینے کے بعد ان لوگوں کے چہروں پر بھی اتنا ہی پسینہ آجاتا تھا جتنا کہ راجہ صاحب کے چہرے پر، راجہ صاحب کی آن بان شان کچھ فٹن ہی پر زیادہ کھلتی اسلئے انہیں موٹر کی سواری پسند نہ تھی، ایک تو ماشاء اللہ خود ہاتھی دوسرے ہاتھیوں کا شوق، ایک دو نہیں بلکہ کئی کئی ہاتھی روز ٹن ٹن کرتے سلام کو حاضر ہوتے، ہاتھیوں کے سلام سے انہیں اتنی خوشی ہوتی کہ اُن کا جسم صاف پھیلتا نظر آتا، آنکھیں قریب قریب غائب ہوجاتیں اور چہرے پر آلو کے کھیت کی طرح بلغمی گوشت کی اُٹھی اُٹھی قطاریں نظر آتیں۔ اپنے ہاتھ سے ہاتھیوں کو طرح طرح کی چیزیں کھلاتے، ان سے دلار کے لہجہ میں باتیں کرتے اور اس کے بعد کھلی فٹن پر بیٹھ کے جنگل کی تفریح کے لئے جاتے، جیسے سارا جنگل انہیں کا ہے۔ عوام انہیں ہاتھی بابو کہتے تھے، یہ خطاب اتنا موزوں ثابت ہوا کہ سارے سرکاری خطابات لوگ بھول گئے۔ حد یہ ہے کہ جب وہ پہلے پہل مجھ سے ملنے تشریف لائے تو خود ہی بہت شرما لجا کر اپنا یہ لقب بتایا۔ پھر اپنے ہاتھیوں کے شوق کا ذکر کیا اور درخواست کی کہ میں اُن کے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرماکے اُن کے ہاتھیوں کا معائنہ کروں، اُن کا ہمیشہ یہ دستور تھا، ہر حاکم ضلع سے سب سے پہلے ملتے اور سب سے پہلے دعوت دیتے، اگر کبھی اتفاق سے کوئی افسر کسی دوسرے کی دعوت اُنکی دعوت سے پہلے قبول کرلیتا تو انہیں اتنا ملال ہوتا کہ کئی دن تک اپنے ہاتھیوں کو نہ دیکھتے۔

ہاتھی بابو مجھے بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوئے اور میں نے اُن کی درخواست خوشی سے قبول کرلی، دعوت دیتے وقت انہوں نے صرف ہاتھیوں کا ذکر کیا تھا لیکن جب میں وہاں پہونچا تو نہایت پرتکلف چاء نوشی کا سامان بھی موجود تھا۔ چاء کے بعد ہاتھیوں کا معائنہ شروع ہوا۔ سب سجے سجائے صف باندھے کھڑے تھے، پہلے تو سب ہاتھیوں نے ایک ساتھ چنگھاڑ مار کے سلامی دی۔ ہاتھی بابو میرا چہرہ دیکھتے جاتے تھے کہ میں خوش ہو رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے یہ دیکھ کے اپنی خوشی کو نمایاں طور پر ظاہر کرنا شروع کیا۔ اس وقت ہاتھی بابو کی خوشی نہ محض دیکھنے کے قابل تھی بلکہ سننے کے بھی۔ یعنی ایک طرف تو چہرہ لال غبارہ بنا ہوا پھول رہا تھا دوسری طرف آواز میں ایک دبی ہوئی چیخ پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے سب ہاتھیوں کا نام بنام تعارف کرایا، تعارف کراتے وقت ہر ہاتھی گھٹنا ٹیک کر سلام کرتا۔ اس کے بعد ہاتھی بابو اُسے ایک کیک دیتے، وہ کھڑے ہو کر پھر سلام کرتا اور کیک مُنہ میں رکھ لیتا۔ آخر میں ایک سب سے بڑا ہاتھی کھڑا تھا، ہاتھی بابو جب اُس کے پاس پہونچے تو انہوں نے بڑے فخر سے فرمایا کہ "یہ ہمارا کُنکی ہے۔ ویسے تو سب ہاتھی ہی چھوٹے بڑے کُنکی ہیں لیکن یہ اتنا بڑا کنکی ہے کہ ہم نے اس کا نام

ہی کنکی رکھ دیا ہے"

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کنکی اس ہاتھی کو کہتے ہیں جس کی مدد سے جنگل کے ہاتھیوں کو پکڑ کے رام کیا جاتا ہے۔ کنکی نے برخلاف دوسرے ہاتھیوں کے سونڈ اُٹھا کے ایک زوردار چنگھاڑ ماری، جس سے ہمارے پاؤں دہل کے خود بخود دو قدم پیچھے ہٹ گئے، پھر اُس نے گھٹنا ٹیک کے سلام کیا۔ ہاتھی بابو نے کنکی سے کہا: "صاحب، ہمارے ضلع کے نئے حاکم ہیں، صاحب کو سلام کر"

اُس نے مجھے ترچھی نظر سے دیکھ کے خاص انداز سے سلام کیا' کنکی کو بہت سے کیک ملے، راجہ صاحب نے کھلائے اور اُن کے کہنے سے میں نے بھی، کھانے کے بعد کنکی نے پھر چنگھاڑ مار کے سلام کیا جو اس بات کا پُرشکوہ اعلان تھا کہ اور ہاتھی تو خیر جو ہیں وہ ہیں مگر کنکی اعظم میں ہی ہوں، راجہ صاحب نے کنکی کے فیلبان کا بھی تعارف کرایا۔ اس کا نام قربان علی تھا مگر سب قربانی قربانی کہتے تھے، نہایت مستعد اور نڈر آدمی تھا۔ جس طرح کنکی سارے ہاتھیوں کا سردار تھا اسی طرح قربانی سارے فیلبانوں کا، جس وقت وہ کنکی پر بیٹھ کے انداز کجکلاہی میں اپنی گردن ذرا سی کج کر کے دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ ساری دنیا کو زیر قدم سمجھتا ہے۔

اس تعارف کے بعد میں نے کہا: "راجہ صاحب تو آپ کے ہاں ہاتھی پکڑے بھی جاتے ہیں"

انہوں نے فرمایا: "حضور یہ جتنے ہاتھی دیکھ رہے ہیں ان میں سب کے سب پکڑے ہوئے ہیں، ہمارے ہاں باپ دادا سے یہ بات چلی آرہی ہے کہ ہاتھی کبھی خریدتے نہیں بلکہ پکڑ کے لاتے ہیں"

میں نے کہا: "تو یہ کنکی بھی پکڑا ہوا ہے"

فرمایا: "جی ہاں، اس کو جس نے پکڑا تھا وہ اس سے بھی بڑا کنکی تھا، بیچارہ دو سال ہوئے مر گیا۔ وہ اس کی قبر ہے"

میں نے دیکھا تو ایک خوبصورت سیاہ ستون نظر آیا۔ اُن سپاہیوں کی یادگار کی طرح جو گذشتہ جنگ میں کام آئے تھے۔ ہاتھی بابو نے ستون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "کنکی سلام کر" کنکی نے بغیر کسی چنگھاڑ کے بڑے ادب سے اس ستون کو سلام کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کنکی مرحوم کی خاموش سلامی اُتار رہا ہے۔

"[illegible] یہ لوگ ہاتھی کس طرح پکڑتے ہیں"

کہنے لگے: "ہاتھیوں کے پکڑنے کے بہت سے طریقے ہیں، کبھی کنکی ہتھنیوں کو جنگل میں بھیج دیتے ہیں، وہ اپنے ساتھ دو ایک ہاتھی ورغلا کے لے آتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی جنگل کے ہاتھی بھی اُنہیں ورغلا لیتے ہیں، تو غائب ہو جاتی ہیں، اس طرح نقصان بھی ہوتا ہے اور پھر شکار کا کوئی لطف بھی نہیں آتا، کبھی جنگلوں میں ہاتھیوں کے راستوں پر گہرے گڑھے کھود کے اور انہیں دھوکے سے اس میں گرا کے پکڑ لیتے ہیں لیکن اس میں ہاتھیوں کو بعض وقت زیادہ چوٹ آجاتی ہے اس لئے اب ہم لوگ یہ طریقہ اختیار نہیں کرتے اب تو ہاتھیوں کو گھیرے میں لا کے پکڑتے ہیں، اسی میں شکار کا اصل لطف ہے، حضور کہیں تو......"

میں نے بات کاٹ کر کہا: "چیز تو بڑی دلچسپ ہوتی ہوگی"

ہاتھی بابو نے فرمایا: "جی ہاں حضور، صاحب لوگ بہت پسند کرتے ہیں، کئی صاحب شکار دیکھنے جا چکے ہیں، جس دفعہ یہ کنکی پکڑا گیا اس دفعہ تھامسن صاحب گئے تھے۔ ہاتھیوں کے پھنسے ہوئے غول میں دو بڑے ہاتھی تھے، ایک تو یہی ہمارا کنکی اور دوسرا ایک اور اس کا ساتھی بھائی بھائی معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس سے تھوڑا ہلکا تھا۔ ان دونوں نے دیوار کے لٹھوں کو مار مار کے ٹیڑھا کر دیا تھا اور اس کنکی کی مدد سے اس کا بھائی نکل بھاگا۔ گولی ماری گئی، اس کے پاؤں میں لگی لیکن بھاگ گیا۔ یہ ہمارا کنکی جب سے کئی سو ہاتھیوں کو پکڑ چکا ہے، حضور کہیں تو پھر ایک شکار کا بندوبست کیا جائے"

جی تو میرا اس شکار کو بہت چاہتا تھا مگر میں نے کہا: "شکریہ، آپکو فضول تکلیف ہوگی"

ہاتھی بابو کھل گئے: "نہیں حضور، تکلیف کیا، میں تو ویسے بھی شکار کا بندوبست کرنے والا تھا، بہت دن سے ہاتھی نہیں پکڑے گئے، بڑا نقصان کرنے لگے ہیں، تمام گنّے کا کھیت کھا جاتے ہیں۔ ابھی اُس دن ایک ہاتھی نے ہمارے ایک پرجا کی ٹانگ چیر ڈالی، کیوں خانصاحب؟"

خانصاحب ان کے مصاحب خاص تھے، جھٹ بول اُٹھے، "جی سرکار، ایک آدمی کیا، تمام گاؤں کا گاؤں ویران ہو گیا ہے، سب لوگ "راجہ صاحب کی دہائی، کلکٹر صاحب کی دہائی" چلا رہے ہیں..."

خانصاحب ہاتھیوں کے ظلم و ستم اور لوگوں کی تباہی کے حالات کچھ اور تفصیل سے بیان کرتے لیکن میں نے شکار پر جانے کی رضامندی دیکر اُن کی تقریر کے سلسلے کو وہیں ختم کر دیا اور وہ فاتحانہ انداز میں ہاتھ باندھ کر خاموش کھڑے ہو گئے۔

شکار کا بڑی دھوم دھام سے انتظام ہوا۔ ہاتھیوں کی فوج قطار در قطار جھومتی جھامتی روانہ ہوئی۔ ڈیرے، خیمے، چھولداریوں کے ساتھ ساتھ

خلاصی اور دیگر ملازمین ہاتھیوں اور بیل گاڑیوں پر لدے جا رہے تھے، ہاتھیوں کی ٹن ٹن، بیلوں کی چھن من، خلاصیوں کی تانیں، برق اندازوں کی للکاریں ان سماں پیدا کر رہی تھیں کہ ہم کلکی پر بیٹھے ہوئے اپنے آپ کو خدا جانے کیا کیا سمجھنے لگے۔ سفر ختم ہوا، جنگل میں منگل ہو گیا، خیموں کا ایک چھوٹا سا سفید قصبہ کھڑا ہو گیا۔ خبر پہلے ہی سے پھیل چکی تھی کہ ہاتھی بابو بڑے صاحب کو ہاتھی کا شکار کھلانے جا رہے ہیں۔ دُور دُور سے گاؤں کے لوگ ڈھول، طبل، کنستر، ٹین، لاٹھی، بانس وغیرہ لیکے اکٹھا ہونے لگے، کچھ انعام اکرام کی اُمید میں کچھ شکار کی ہما ہمی میں شرکت کا لطف اُٹھانے کے لئے، اچھا خاصہ میلہ لگ گیا۔ جنگل کی قسمت جاگ گئی۔ جنگلی جانوروں کی آوازیں اُن کے خوف و دہشت کو ظاہر کرتی تھیں، ہر طرف جنگل میں کھڑ کھڑ ہو رہا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ خوف کھائے ہوئے جانور گھبرا گھبرا کے بھاگ رہے ہیں۔ ایک سوکھے ہوئے درخت پر گِدھوں نے معلوم نہیں کس اُمید میں آ کے ہجوم کر لیا اور اس طرح کی آوازیں نکالنی شروع کیں کہ ہاتھی بھی اپنے بھاری بھاری کان کھڑے کر دیتے تھے، ہاتھی بابو کو اِن گِدھوں سے دلی نفرت تھی، فرمایا: "ارے کوئی ہے جو اِن گِدھوں کو مار کے بھگائے" ملازموں نے "ہا ہا" کر کے درخت پر ڈھیلے پھینکنے شروع کئے، ہم لوگ ادھر "معاینۂ موقع" کے لئے نکلے۔

دیکھا تو جنگل کے پاس ایک کف دست میدان کے ٹکڑے کو کہیں لٹھوں، کہیں خندقوں اور کہیں بے ڈال پات کے درختوں سے گھیر کے ایک "جیل خانہ" سا تیار کیا گیا تھا، جنگل کی طرف سے اس جیلخانہ میں جانے کا صرف ایک دروازہ نما راستہ تھا جو بند کیا جا سکتا تھا۔ اُس دروازے کے دونوں طرف سے جنگل میں دو دیواریں شروع ہوتی تھیں جو درختوں اور لٹھوں کی مدد سے بنائی گئی تھیں، ان دیواروں کو درمیان کا فاصلہ رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا، گویا جیل خانے کے دروازے سے لیکے ان دیواروں کے ختم تک جو صورت بنتی تھی وہ بہت کچھ ہماری اس غلیل سے ملتی جلتی تھی جسے ہم بچپن میں چھوٹی چھوٹی چڑیاں مارنے کیلئے ایک دو شاخہ ڈال کو کاٹ کے اور اس میں گیٹس کا لال لال ربر باندھ کے تیار کرتے تھے، اب ہاتھیوں کو نشانہ بنانے کیلئے ہم نے میلوں لمبی چوڑی غلیل زمین پر ڈال دی تھی، بس۔

ہاتھی بابو نے جملہ انتظامات دکھلانے کے بعد بتایا کہ ہاتھیوں کو ہکوا کر کے اسی "غلیل" کی زد میں لایا جائے گا اور اس کے بعد انہیں جیل خانے میں دھکیل دینا آسان ہو گا، میں نے دریافت کیا کہ آیا ہم بھی اس ہکوے میں شریک ہوں گے یا نہیں۔ اس پر ہاتھی بابو نے فرمایا کہ:-

"ہکوے میں شرکت کرنا نہ محض تکلیف دہ ہے بلکہ خطرناک بھی، اور جس طرح فوج کا سردار اپنے کو خطرے میں نہیں ڈالتا اسی طرح ہمیں بھی دُور اندیشی سے کام لینا چاہئے"

ہاتھی بابو کے "نیک مشورے" کو ہم نے مان لیا اور کلکی پر بیٹھ کر اس فرشی غلیل کے باہر سے تماشہ دیکھنے لگے، ہکوا شروع ہوا، دُور جنگل میں سے بندوقوں کی آوازیں آنے لگیں، رفتہ رفتہ یہ آوازیں قریب ہونے لگیں، اب آدمیوں کے بھی چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کے گلے ڈھول و طبل کا مقابلہ کر رہے ہیں، ساتھ ہی ساتھ جنگل میں جیسے کئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گئے، شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے، فضا دھوئیں اور راکھ سے اَٹ گئی، ہاتھی بابو نے بتایا کہ جنگل میں کئی طرف سے آگ لگا دی گئی ہے تاکہ ہاتھی ادھر سے بھاگیں، جلد ہی ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی آوازیں بھی آنے لگیں، ہمارے کنکی ہاتھیوں نے بھی فوراً چنگھاڑنا شروع کیا۔ مادائیں خاص طور سے ایک مخصوص انداز میں چیخنے لگیں، ہاتھی بابو نے بتایا کہ اس چنگھاڑ کے معنی ہیں: "ادھر آؤ، ادھر آؤ" مادہ کی پکار کا خاص اثر ہوتا ہے، یعنی دوسرے الفاظ میں جنگلی ہاتھیوں کو کنکی ہاتھی دھوکا دے کے جال میں بلا رہے ہیں۔ اور اس دھوکے کو مضبوط بنانے کیلئے نسوانی جال سے کام لیا جا رہا ہے۔ اِن سب آوازوں نے مل کر وہ طوفان بے تمیزی اُٹھایا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی اور ہاتھی بابو تھے کہ چیخ چیخ کے سمجھانے کی کوشش کئے جاتے تھے۔ میں نے تو اپنے کانوں میں اُنگلی دے لی۔ جس قدر ہاتھی بابو کے گردن کی رگ پھولتی جاتی، جتنا زیادہ اُنکا مُنہ کھلتا جاتا، جس قدر اُن کا چہرہ زیادہ سُرخ ہوتا جاتا اور جتنی زیادہ میری انگلیاں میرے کانوں میں خود بخود دھنستی جاتیں میں سمجھتا کہ ہاتھیوں کا غول اتنا ہی قریب ہوتا جا رہا ہے۔ دفعتاً جنگل کا سینہ پھٹتا نظر آیا اور اس میں سے ہاتھیوں کا ایک بڑا غول جھاڑیوں کو روندتا، درختوں کو گراتا، اور سونڈیں لہراتا ہوا نکلا، ہاتھی کیا تھے خوف و دہشت کے بھاگتے ہوئے پہاڑ تھے جو ایک دوسرے کو پیچھے ڈالتے تھے، غول کے بیچ میں دو تین چھوٹے بچے تھے ان پر بھی بڑے ہاتھیوں نے پاؤں رکھ دئے، ایک بہت ہی چھوٹا بچہ ایک ہتھنی کے پیٹ کے نیچے نیچے بھاگا جا رہا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی کا بچہ ہے۔ جب بھاگڑ بہت زیادہ بڑھی تو اسی ہتھنی کے پیر کے نیچے وہ آ پڑا۔ ایک چیں کی دلدوز آواز ہوئی، ہتھنی نے پلٹ کے دیکھنا چاہا لیکن پیچھے کے ہاتھیوں نے اُسے آگے دھکیل دیا۔ ہتھنی قدم قدم پر مڑ مڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن ایک دفعہ

بھی نہ دیکھ سکی۔ بچّے کے جسم کا چھوٹا سا سیاہ ڈھیر وہیں پڑا رہا۔ ہاتھیوں کے تھوڑا پیچھے آدمیوں کا غول چیختا، چلاتا، ڈھول بجاتا، کنستر پیٹتا، ٹین کھڑکھڑاتا، بندوق چھوڑتا، آگ کے بھبکوں سے اونچی اونچی گھاسوں میں آگ لگاتا اور اس طرح ہاتھیوں پر زمین و آسمان کو تنگ بناتا چلا آرہا تھا، آگ کی روشنی میں اُن کے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے دیکھنے کے قابل تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس آگ نے تہذیب و تمدن کی نقاب جلا دی ہے اور انسان کا چہرہ اپنے اصلی خدوخال میں نظر آرہا ہے، میں ان چہرے کو غور سے دیکھتا لیکن ہاتھی بابو کے ہاتھ پھینک کے کھڑے ہوجانے نے اصل تماشہ کی طرف مجھے متوجہ کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ہاتھی بابو کے اس طرح ہاتھ پھینکنے کی وجہ یہ تھی کہ ہاتھیوں کے غول نے اپنے "جیل خانہ" میں پناہ لینا شروع کر دیا تھا۔ جلد ہی سارا غول پناہ گزیں ہوگیا۔ ہاتھیوں نے شاید فوراً ہی بھانپ لیا کہ یہ "پناہ" درحقیقت اُن کی آزادی کی موت ہے۔ کیونکہ انہوں نے ایک دفعہ اپنے چاروں طرف دیکھ کر اس زور سے چنگھاڑ ماری کہ دل لرز گیا۔ ہم نے بے اختیار اپنے کان اور زور سے بند کر لئے لیکن سینہ ایک پرانے مقبرے کے گنبد کی طرح معلوم ہوتا تھا جس میں یا تو چنگھاڑ کی صدائے بازگشت تھی یا ابابیل کے پروں کی آواز کی سی دل کی دھڑکن یا پھر اللہ کا نام۔

میں نے ہاتھی بابو سے پوچھا: اب تو ہاتھی پھنس گئے، اب کیا ہوگا؟"

ہاتھی بابو بولے "صاحب، اصل کھیل تو اب شروع ہوگا۔ اِن ہاتھیوں کو ایک ایک کر کے گرفتار کرنا ہے، لیکن یہ ابھی نہیں ہوسکتا ایک ہفتے تک یہ بے دانہ پانی یہیں پھنسے رہیں گے، تب کہیں جا کے ان کا غرور ٹوٹے گا۔ اس کے بعد ایک ایک ہاتھی کو دو دو کنکیوں کی مدد سے گرفتار کیا جائے گا۔"

مجھے اس شکار سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، اس لئے میں نے وہیں باضابطہ کیمپ لگا دیا۔ تمام فائل آنے جانے لگے، مال گزاری سبھی قسم کے، کسی کی زمینداری بکنے کا حکم، کسی کی گرفتاری کی منظوری، پروانۂ خوشنودی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب پر خیمے میں بیٹھے بیٹھے دستخط ہوتے رہے اور اس طرح بادشاہ کی حکومت چلتی رہی۔

ایک ہفتے کے بعد ہاتھیوں کی حالت زار ہوگئی، وہ سارا زور و شور اور جوش و خروش رفتہ رفتہ غائب ہوگیا۔ پہلے تو چاروں طرف بھاگنے کی کوشش کرتے، دیواروں کو توڑنا چاہتے، جہاں سے مشعلیں یا بندوقیں دکھائی دیتیں یا لوگوں کی چیخ پکار انہیں بھگا دیتیں مگر اب سب کے سب اکٹھے احاطے کے بیچ میں خاموش کھڑے رہتے، آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے، کبھی کبھی دو ایک ادھ مری چنگھاڑ کی آواز نکل جاتی۔ مگر وہ چنگھاڑ کیا ہوتی چنگھاڑ کی نقل ہوتی۔

جب ہاتھیوں کی یہ حالت زار نظر آئی تو اس احاطے سے متصل ایک اور چھوٹا سا احاطہ بنایا گیا۔ اس میں دو کنکی داخل ہوئے۔ کنکیوں کے ساتھ ساتھ اُن کے فیلبان ہاتھوں میں موٹی موٹی لوہے کی زنجیریں لئے دبک دبک کے جا رہے تھے، ان دونوں احاطوں کے بیچ میں ایک چھوٹا دروازہ تھا، اتنا کہ اس میں سے صرف ایک ہاتھی ایک وقت میں نکل سکے، کنکیوں نے ایک خاص انداز سے آواز دی جس سے قیدی ہاتھیوں کے کان کھڑے ہوگئے اور ان میں سے دو ایک دریافت حال کے لئے اس طرف آئے۔ دروازہ کھلا پا کے ایک ہاتھی جھٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کے نکلتے ہی دروازہ فوراً بند کر دیا گیا۔ ہاتھی اپنے کو آزاد سمجھ کے اتنا خوش ہوا کہ اپنے بھاری مگر زار و نزار جسم کو اُچھالنے لگا۔ اتنے میں وہ دونوں کنکی اس کی طرف بڑھے، اور اُسے اپنے بیچ میں لے لیا، وہ ہم جنس سمجھ کر انہیں اپنی آزادی کی سونڈ ہلا کے مبارکباد دینے لگا، دونوں کنکی اس سے اور قریب تر ہوگئے اور رفتہ رفتہ اس کے دونوں پہلو دبا بیٹھے۔ ان کی آڑ میں دونوں طرف سے فیلبان دبک دبک کر آئے اور کنکیوں کی ٹانگوں کے بیچ سے اس قیدی کے پیروں میں پھرتی کے ساتھ موٹی موٹی زنجیریں پہنا دیں، قیدی اس حرکت پر خوف و ہراس کے عالم میں بے اختیار اچھلنے لگا، کنکی اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھے۔ دونوں طرف سے اس زور سے دھکّا مارا کہ اس کی پسلیاں کڑک گئیں۔ اس کے بعد قیدی کی گردن کنکیوں کی گردن سے باندھ دی گئی اور کنکی اُسے گھسیٹتے ہوئے باہر کے دروازے کی طرف لے گئے۔ کنکیوں کو احاطے سے باہر نکلتے وقت ایک ایک گنّا انعام ملا اور وہ خوش خوش اُسے کھاتے چلے گئے۔

اسی طرح ایک ایک کر کے کئی ہاتھی پکڑے گئے، ہوتے ہوتے اُس بڑے ہاتھی کی باری آئی جو غول کا سردار تھا، وہ تھوڑا تھوڑا لچک کر چلتا تھا۔ ہاتھی بابو اُسے دیکھ کر چیخے "ارے یہ تو وہی ہمارے کنکی کا بھائی ہے" اس کے پکڑنے کے لئے کنکی بہ نفس نفیس اور ایک اور بڑا ہاتھی مقرر کئے گئے۔ کنکی اس نو گرفتار کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکا اور وہ اِسے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کو پہچان رہے ہیں۔ ایک لمحے کے بعد نو گرفتار خوشی میں کنکی کی طرف بڑھا اور اس محبت کے انداز میں سونڈ بڑھائی گویا کہہ رہا ہے "بھائی اتنے دن کہاں رہے۔ میں پھر گرفتار

ہوگیا تھا اور تمہیں یاد کر رہا تھا کہ تم ہوتے تو مجھے دوبارہ آزاد کراتے۔ خیر میں ابھی ابھی کسی طرح قید سے نکل بھاگا ہوں، میری آزادی تمہیں مبارک ہو اور کھوئے ہوئے یار کا ملنا مجھے؛ یہ کہتے کہتے اُس نے اپنی سونڈ کی نوک کنکی کی سونڈ سے ملانی چاہی لیکن کنکی نے اُس کی سونڈ کو پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ وہ دفعتاً چونک پڑا اور مُنہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ پھر حسب دستور کنکی اور اس کے ساتھی نے اس نئے قیدی کو اپنے گھیرے میں لینا شروع کیا، یہاں تک کہ اس سے پہلو بہ پہلو ہوگئے۔ اسکی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس معمے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی، آخر کار اس نے ایک دفعہ پھر اپنی سونڈ صلح و محبت کے انداز میں کنکی کی طرف بڑھائی۔ کنکی اور اس کے ساتھی نے دونوں طرف سے اس بڑھے ہوئے صلح کے ہاتھ یعنی سونڈ کو اپنی اپنی سونڈوں میں جکڑ لیا۔ تاکہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ اتنے میں فیلبانوں نے اس کے پیروں میں پھرتی سے زنجیر پہنا دی، زنجیر پہنانا تھی کہ وہ چنگھاڑ مار کر اس زور سے اُچھلا کہ دل دہل گیا، ادھر کنکیوں نے اُس کی سونڈ کو شدید جھٹکا دیا۔ دو طرفہ جھٹکے کی وجہ سے سونڈ سے خون ٹپکنے لگا۔ پھر کنکیوں نے دونوں طرف سے نوگرفتار کی پسلیاں توڑنی شروع کیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تین کالے پہاڑ زلزلے میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں، اتنے میں قربانی جھٹ سے کنکی پر بیٹھ گیا اور دوسرا فیلبان اپنے ہاتھی پر، دونوں فیلبان نوگرفتار کے سر میں تیز چمکتے ہوئے بھالے مارنے لگے گویا اس طرح اس کے مغرور سر سے آزادی کا خیال مار مار کے نکال رہے تھے۔ ان سب کا جواب وہ چیخوں اور اپنے بدن کی پُرجوش جنبشوں سے دیتا مگر بے سود۔ بالآخر اکو بھی مثل دوسرے ہاتھیوں کے کشاں کشاں باہر لے گئے۔ باہر نکلتے وقت کنکی اور اُسکے ساتھی کو بجائے ایک ایک کے دو دو گنے ملے۔

اپنے نئے قیدیوں کو لیکے ہم لوگ شہر واپس ہوئے۔ راستے بھر یہ قیدی مجنونانہ حرکتیں کر کر کے اور چنگھاڑیں مار مار کے اپنے دل کا بخار نکالتے اور اپنی آزادی کے کھونے کا ماتم کرتے رہے جس پر انکو معقول سزائیں ملتی رہیں۔

میں نے ہاتھی بابو سے پوچھا: راجہ صاحب، اب کیا ہوگا؟"

ہاتھی بابو مسکرا کر بولے: صاحب، چھوٹے چھوٹے ہاتھی تو خالی اسی مار سے سیدھے ہو جائیں گے، جو اس طرح نہ ہوں گے وہ پیٹ کی مار سے ہوں گے، جو مار سے نہ ہوں گے وہ پیاسے ہوں گے: ہاتھی بابو نے تھوڑا رُک کر پھر سلسلہ گفتگو شروع کیا: صاحب کے قدموں کی برکت سے اس دفعہ کا شکار جیسا اچھا ہوا ویسا کبھی نہ ہوا تھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ایک اور بڑا کنکی مل گیا"

میں نے کہا: راجہ صاحب، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا ہاتھی جسے ہم نے پکڑا ہے کنکی بن جائیگا؟"

ہاتھی بابو بولے: صاحب، یہ تو ایسا کنکی ہوگا کہ بڑے بڑے کنکی اسکے آگے کان پکڑینگے؛"

مجھے اس نئے ہاتھی کی گرفتاری سے اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی کہ میں اس کا حال دریافت کرنے ہاتھی بابو کے ہاں برابر جاتا۔ دوسرے ہاتھی تو بہت جلد سدھر گئے لیکن یہ بڑا قیدی کسی طرح نہ پسیجتا تھا، یا تو چنگھاڑیں مارا کرتا یا روتا۔ کبھی کبھی اُسے زبردستی کنکی کے ساتھ باندھ کے سیر کیلئے لے جاتے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ ایک دفعہ یہ نوگرفتار کنکی کے ساتھ بندھا جا رہا تھا کہ قربانی نے کنکی کو اشارہ کیا، کنکی نے جھٹ سے اسکی سونڈ پکڑ لی اور قربانی کنکی کی گردن سے کُود کر اس کی گردن پر جا بیٹھا اس کا بیٹھنا تھا کہ قیدی اس زور سے چلایا کہ جیسے اس کی جان ہی نکل گئی۔ اور پھر مجنونانہ انداز میں کنکی کو لئے دئے زمین پر گر پڑا۔ قربانی لڑھک کے بھاگنے ہی والا تھا کہ اُس کا پاؤں قیدی کے جسم کے نیچے آ دبا۔ شاید قیدی کو بھی اس کی آہٹ مل گئی کیونکہ وہ آناً فاناً اسی طرف لوٹ گیا۔ قربانی کے مُنہ سے صرف ایک چیخ نکلی اور بس۔ چیخ کی آواز سنتے ہی قیدی زور زور سے اپنی پیٹھ مسلنے لگا جیسے کوئی بٹے سے قیمہ پیسے۔ تمام لوگ دوڑ پڑے۔ کئی ہاتھیوں نے مل کر کنکی اور اس قیدی کو اٹھایا — قربانی کی لاش نکلی لیکن ایسی کہ اس کی ماں جو خبر سُن کے دوڑتی ہوئی آئی تھی اسے پہچان نہ سکی اور کھوئے ہوئے انداز میں یہ چیختی ہوئی بھاگی: جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ، نہیں یہ میرا قربانی نہیں ہے" لیکن کنکی نے پہچان لیا۔ اسکی لاش کے لوتھڑے کو سونڈ سے کئی بار سہلایا اور پھر اُسے اُٹھا کے اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ اس واقعے کے بعد سے اس قیدی کا نام "خونی" پڑ گیا۔

"خونی" کو اس خون کی اچھی طرح سزا ملی، کئی ہاتھیوں نے مل کر اسے چاروں طرف سے خوب نرم کیا، فیلبانوں نے تمام بدن چھید کر رکھدیا لیکن "خونی" کی آنکھوں سے خون ہی ٹپکتا رہا، اب وہ کچھ کچھ ہمارے الفاظ بھی سمجھنے لگا تھا۔ مثلاً کنکی کے نام پر وہ وحشت زدہ ہو جاتا اور خونی پر وہ فاتحانہ انداز سے جھومنے لگتا۔

ایک ہفتہ ہو گیا لیکن خونی کی یہ حالت تھی کہ اس کے سامنے گنّا رکھا جاتا تو وہ پیروں سے روند ڈالتا اور روٹی دیا جاتا تو اُٹھا کے پھینک دیتا، کسی فیلبان کی ہمت نہ پڑتی جو اُسے چمکارے۔ ہاتھی بابو بھی پریشان نظر آنے لگے۔ فرمایا: یہ عجیب ہاتھی ہے، دوسرے ہاتھی تین چار روز تک

سوگ مناکر کھانے پینے گئے تھے لیکن اس نے تو حد کر دی۔"

میں نے پوچھا: "پھر کیا کیجیے گا؟"

کہنے لگے: "والد صاحب کے زمانے میں ایک اسی طرح کا ہاتھی پکڑا گیا تھا، کسی طرح رام نہ ہوا، آخرکار اُسے گولی ماردینی پڑی۔ اگر اسے بھی مارنی پڑی تو بڑا افسوس ہوگا۔ کیسا اچھا کنکی بنتا۔"

میں نے پوچھا: "کنکی کا کیا حال ہے؟"

فرمایا: "صاحب، وہ بھی بڑے غم و غصے کی حالت میں رہتا ہے۔ جیسے کسی سوچ میں ہو۔ ڈر ہے کہیں پاگل نہ ہو جائے۔ خونی کا نام سُنکر گھبراتا ہے۔"

اتنے میں شور ہوا کہ "کنکی چھوٹ گیا، کنکی چھوٹ گیا۔" دیکھا تو وہ جھپٹتا ہوا "خونی" کی طرف جا رہا ہے۔ پہونچتے ہی چنگھاڑ مار کر اُس پر بڑے زور سے حملہ کیا۔ ایک تو خونی کے پیروں میں موٹے موٹے دُہرے زنجیر پڑے ہوئے تھے، دوسرے مار اور فاقہ کی مصیبت، بہت کمزور ہو گیا تھا۔ پہلی ٹکر تو کسی طرح برداشت کی لیکن دوسری اور تیسری کے بعد بیٹھ گیا۔ کنکی اتنے زور سے حملہ کرتا تھا کہ ٹکر کی آواز دُور دُور تک سنائی دیتی تھی۔ کنکی کے حملے کا ہر انداز یہ کہتا معلوم ہوتا کہ "جب میں نہیں تو بچو تم کیسے رہ سکتے ہو، اپنی آزادی کی شان دکھا کر ہمیں ذلیل کرتے ہو، رہو تو ہماری طرح، نہیں تو مرو۔"

ہاتھی بابو نے فرمایا: "ہاتھیوں کی ایسی لڑائی تو اکبر بادشاہ نے بھی نہ دیکھی ہوگی۔"

خانصاحب بولے: "کیوں نہ ہو ہمارے صاحب کس بادشاہ سے کم ہیں۔"

جو خونی ڈرامہ میرے سامنے ہو رہا تھا وہ اتنا دل ہلا دینے والا تھا کہ میں اکبر اعظم سے اپنے مقابلے کی دل خوش کن بات پر بھی زیادہ کان نہ دے سکا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ خونی جو اتنی دیر خاموش بیٹھا مار کھا رہا تھا یکایک جھپٹ کے اُٹھ بیٹھا۔ اس بے سان گمان حرکت نے کنکی کو لڑکھڑا دیا، اس کا لڑکھڑانا تھا کہ "خونی" نے جھٹ اُس کی گردن اپنی سونڈ میں جکڑ لی اور پھر جھٹکے کے ساتھ گرتے ہوئے "ہم تو ڈوبے ہیں مگر یار کو لے ڈوبیں گے" کے مصداق کنکی کو بھی اپنے ساتھ لے گرا۔ کنکی کے مُنہ سے لٹتی ہوئی چیخ کی آواز نکلنے لگی۔ جیسے اس کا گلا گھٹ رہا ہو، اس آواز کو سُن کے ہاتھی بابو گھبراتے اور چیخنے لگے: "ارے کہیں یہ خونی میرے کنکی کو خراب نہ کر دے، ارے خانصاحب دیکھتے کیا ہو، جلدی اس پر رائفل چلائیے۔"

اتنے میں ایک زور کی چنگھاڑ ہوئی اور "ارے مار ڈالا، مار ڈالا" کا شور بلند ہوا۔ دیکھا تو کنکی نے اپنے دانت "خونی" کے سینے میں پیوست کر دیے تھے۔ اُدھر خانصاحب نے دُور ہی سے رائفل چلا دی۔ معلوم نہیں گھبراہٹ میں یا غلطی سے یا جان بوجھ کر اُنہوں نے بجائے "خونی" کے کنکی کے سر کو نشانہ بنایا۔ ایک چیخ نکلی اور بس۔ ہاتھی بابو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ دونوں ہاتھیوں کی لاشیں پڑی سسک رہی تھیں، میری طبیعت کچھ ایسی خراب ہوئی کہ میں زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا، کرسی پر بیٹھ گیا اور بیٹھکر ٹھنڈا پانی پیا۔ ہاتھی بابو کی تو یہ حالت تھی کہ اگر میرا خیال نہ ہوتا تو شاید رو دیتے۔ صرف اتنا ہی کہا: "خانصاحب آپنے تو ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ ہائے کیسا وفادار کنکی تھا، "خونی" سے بدلہ لینے میں آپ گیا۔ کنکی ہو تو ایسا ہو۔ آہ!"

خانصاحب، ہاتھی بابو کی رائفل سمیت ایسے غائب ہوئے کہ پھر نظر نہ آئے۔ میں نے بھی معلوم نہیں کیوں اُنہیں گرفتار کرانے کی زیادہ کوشش نہ کی۔

خیر ہاتھی بابو اپنا غم و غصہ ضبط کرتے ہوئے اُٹھے اور فرمانے لگے: "اس حرامزادے کنکی کی لاش کتوں سے نچوا ڈالو اور خونی کیلئے ایسی یادگار بناؤ کہ ہمیشہ رہے۔"

میں نے کہا: "آپ کا مطلب شاید یہ ہے کہ کنکی کی یادگار بنائی جائے اور خونی کی لاش کتوں سے نچوائی جائے۔"

کہنے لگے: "جی ہاں، جی ہاں، اور میں نے کیا کہا تھا۔ کیا میں نے اُلٹی بات کہی تھی؟"

میں نے اُن کے اس ٹیڑھے سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا۔

کچھ دنوں بعد کنکی کی ہڈیوں پر بڑی شاندار یادگار بنائی گئی۔ اس کی رسم افتتاح کے دن ہاتھی بابو نے پھر مجھے بلایا۔ میں اخلاقاً گیا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل وہاں جانے سے گھبراتا ہے۔ سنگ موسیٰ کا نہایت خوشنما اور بلند ستون تعمیر کیا گیا تھا۔ کنکی اوّل کے ستون سے دوگنا اُونچا۔ اس پر پھولوں کے ہار کا انبار تھا اور موٹے موٹے حرفوں میں "کنکی اعظم" کندہ تھا۔ خونی کے مرنے کی جگہ پر غلیظ اور کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا جو ہاتھی بابو کے حکم سے لگایا گیا تھا۔ اس گھورے میں خود بخود کچھ جنگلی پھول نکل آئے تھے جو ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ہاتھیوں کی قطار اس گھورے کی طرف دُم کیے کھڑی تھی اور کنکی اعظم کی خاموش

سلامی اُتار رہی تھی۔

اس وقت ایک عجیب اتفاق ہوا۔ ڈاک آئی اور اس کے ساتھ نئے اخبار۔ موٹے موٹے حرفوں میں یہ خبر چھپی تھی کہ ناروے کو وہاں کے ایک افسر کوئز لنگ (Quisling) نامی نے جرمنوں کے حوالے کردیا۔ اور وہ اس ملک کے باشندوں کو مار مار کے یا عہدوں کی لالچ دے دیکر جرمنوں کا مطیع بنا رہا ہے۔ جو راضی نہیں ہوتے انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔"

میں نے کہا: "ہاتھی بابو، دیکھئے ایک اور بڑا کنگی پیدا ہوا۔"

وہ خوشی سے اس طرح چونکے جیسے میں اُنہیں سچ مچ کوئی بڑا ہاتھی تحفتاً دے رہا ہوں۔ میں نے اخبار اُن کے ہاتھ میں دیدیا اور اُٹھکر خاموش چلا آیا۔ چلتے وقت سب کنگیوں نے مجھے بہت جھک کر سلام کیا۔ میں یوں تو سلام سے بہت خوش ہوتا ہوں مگر خدا جانے کیوں اس وقت یہ سلام مطلق نہ بھایا۔ معلوم نہیں ہاتھی بابو اخبار پڑھکر کچھ سمجھے بھی یا نہیں لیکن اس دن سے یہ لفظ کنگی میرے دل میں برابر کھٹکتا رہتا ہے۔

فضل احمد کریم فضلی؎

ربابِ شکستہ

تجھ سے ہیں تخئیل کی رعنائیاں
بادۂ گلگوں سے رنگیں جام ہے

عشق سے ہوتا ہے آغازِ حیات
اس سے پہلے زندگی الزام ہے

بھر گئے دل میں سکون و اضطراب
چاندنی محبوب کا پیغام ہے

حُسن جبتک خود محبت بن نہ جائے
عشق اک دیوانگی کا نام ہے

مل بھی جاتے تھے کبھی بچھڑے ہوئے
اب کہاں وہ گردشِ ایام ہے

سرخوشی ہے جس میں دردِ سر نہیں
تیرے ہونٹوں میں وہ رُوحِ جام ہے

زندگی کیا جب نہ ہو دل میں خلش
موت بھی اک بے حسی کا نام ہے

اک تبسم یاس میں ڈوبا ہوا
بس یہی مجبور کا پیغام ہے

شہاب شیرانی

تانگے والا

شاہ محمد کے تکیئے کا ایک حصّہ کاٹ کر اصطبل بنالیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ جبرًا ہوا۔ آخر رمضان کی چھاتی سوا فٹ تھی۔ اور اس دیو ہیکل جوان کو دیکھکر سب کے حوصلے جواب دے جاتے تھے۔ پھر جبر کا یہ قصہ اور بھی طویل ہوگیا۔ کبوتروں کے دڑبے سے لیکر مزار تک لید بکھری رہتی تھی۔ لید بکھیرے رمضان کا گھوڑا اور اُٹھائے معلّی۔ جس کی ناک میں بدبو آتی وہ لید اُٹھا دیتا۔ رمضان کو تو گھوڑے سے سروکار تھا۔ البتہ گھوڑے کے تھان کو وہ شیشے کی طرح چمکا کر رکھتا تھا۔

کمیٹی میں شاید کسی کی شنوائی نہ ہوسکتی تھی۔ رمضان اپنے تانگے پر داروغہ کو مُفت دریا کی سیر کرالاتا تھا۔ داروغہ کہتا: "ہمارے راج میں رمضان کو سب چھٹی ہے"۔ رمضان سمجھتا، داروغہ کا راج اٹل ہے۔ اسکی آنکھوں میں اصطبل پھر جاتا۔ تصوّر میں گھوڑے کا تھان اور بھی چمک اُٹھتا۔ محبت کے ایک نئے انداز سے وہ گھوڑے کی طرف دیکھتا اور سوچتا کہ داروغہ کو شاید یہ حرکت اچھی نہ لگتی ہو ورنہ وہ تانگے سے اُتر کر گھوڑے کی آنکھوں میں جھانکتا اور اس کا سر اپنے سینے سے بھینچ لیتا۔

گھوڑے کا نام تھا عیدو۔ آدمی کے کھلنڈرے بچّے ہی کی طرح اُسے کلیلیں کرتے دیکھکر رمضان کو یقین ہوگیا تھا کہ بڑا ہوکر یہ ابلق بچھیرا ایک خوبصورت اور ہوشیار گھوڑا نکلے گا۔ اور جب وہ عید کے دن اُسے خرید لایا تھا تو دیر تک وہ اُس کے دانتوں کا ملاحظہ کرتا رہا تھا۔ آخر وہ چار پُشت کا کوچوان تھا اور گھوڑوں کے متعلق اس کی واقفیت بہت بڑھی چڑھی تھی۔ عیدو کو نہلاتے وقت رمضان کے ہاتھ اس کی کالی مخملی پُشت پر پھسلتے چلے جاتے۔ اُس کے سفید ہاتھ پیر وہ مَل مَل کر دھوتا اور پھر اُس کا مُنہ کھول کر دیکھتا کہ دودھ کے دانت ابھی کتنے باقی ہیں۔ اور عیدو اپنی تھوتھنی رمضان کے سینے پر تھپ تھپانے لگتا۔ جیسے کہہ رہا ہو: "ابھی سے مجھے تانگے میں جوتنے کی بات مت سوچو، رمضان میاں۔ ابھی تو کھیلنے مچلنے کے دن ہیں میرے۔ پانچ سال کی عمر سے پہلے مجھے اپنے تانگے میں نہ جوتنا۔ پھر دیکھنا، میرے پھیپھڑے کتنے مضبوط ہو جاتے ہیں اور میں کتنا بھاگتا ہوں!" رمضان کہتا: "اب نہاؤ گے بھی آرام سے یا یوں ہی مفت کی شرارت کئے جاؤ گے عیدو بیٹا؟" مگر عیدو نہ مانتا اور رمضان اپنی مشکی دُلہن کو پکار کر کہتا: "اری اب ادھر آ دیکھ، سمجھا دے اِسے ذرا۔ پر تو نے ہی تو اِسے سر چڑھا رکھا ہے۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر پھیر کر!"

مشکی دُلہن قریب آکر کہتی: "تم ہٹ جاؤ، میں خود نہلاؤں گی اپنے بیٹے کو۔ تمہیں تو مزا آتا ہے اس بیچارے کی شکایتیں کرنے میں!"

اور رمضان کہتا: "لے سنبھال لے اپنے بیٹے کو!"

اپنے مختلف بے ڈھنگے طریقوں سے عیدو اپنی محبت کا اظہار کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ پچھاڑی کو وہ عجیب انداز سے اُچھالتا تھا اور رمضان کو دیکھکر ہنہنانے لگتا تھا۔ اور رمضان کہتا: "بس ٹھہر جا بیٹا ابھی آیا۔ تیرے لئے بہت اچھا مصالحہ منگوایا ہے۔ کھائے گا تو خوش ہو جائیگا!" لیکن عیدو اتنی آسانی سے ماننے والا نہ تھا۔ لگاتار ہنہنائے جاتا۔ جیسے کہہ رہا ہو: "دُور مت جاؤ، رمضان میاں۔ مصالحہ تو پھر بھی آسکتا ہے۔ بس میں تمہیں دیکھتا رہوں، تمہاری باتیں سنتا رہوں!" رمضان کہتا: "ارے بیٹا، بے صبر نہیں ہوا کرتے۔ ذرا سی دیر میں لَوٹ آؤں گا بس!" عیدو ہنہنانا چھوڑ دیتا مگر بہت آزردہ سا ہو جاتا۔ اور پھر یوں معلوم ہوتا کہ وہ ابھی چیخ کر کہہ دیگا: "اچھا ہو آؤ باہر، دیر مت لگانا!" اور عیدو کی خوبصورت تھوتھنی زمین کی طرف جُھک جاتی۔

گذشتہ سال سے رمضان رنڈوے کی زندگی گذار رہا تھا۔ بیوی بیچاری گوٹے کے دوپٹے تک کیلئے ترستی رہی تھی۔ زمانے کے گرم و سرد نے رمضان کو بہت ستایا تھا۔ سائیں جی کا اُدھار الگ بڑھ گیا تھا۔ کہاں سے لے دیتا گوٹے کا دوپٹہ اپنی مشکی دُلہن کو؟ لے دیکر اب وہ عیدو ہی سے جی پرچالیتا تھا۔ اس سمجھدار، ہمدرد عیدو کی بجائے اُس کے پاس وہی پہلا مریل سا گھوڑا ہوتا تو اس کی زندگی ایک خاموش گرم دوپہر بنی رہتی۔

اصطبل میں بیٹھے بیٹھے اکثر رمضان کی آنکھیں مِچ جاتیں جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اُس وقت اُسے محسوس ہوتا کہ عیدو کی آنکھیں بھی مِچ گئی ہیں اور وہ دونوں بیک وقت مشکی دُلہن کو دیکھ رہے ہیں۔ عیدو کے گلے میں باہیں ڈال کر وہ پوچھتا: "سچ سچ بتاؤ عیدو بیٹا، تمہیں مشکی دُلہن تو یاد آتی ہوگی، جو ہر روز صبح تمہیں نہاری کھلایا کرتی تھی!"

سات سال کے لمبے عرصے میں مشکی دُلہن کے کوئی بچہ نہ ہوا۔

بانجھ ہی وہ زمین کے نیچے قبر میں جا سوئی۔ کسی کسی رات رمضان کو یوں محسوس ہوتا کہ اس کی گردن پر کسی بچے کی غیر مرئی انگلیاں رینگ رہی ہیں، جیسے قبر میں مشی دُلہن کی کوکھ ہری ہو گئی ہو اور اللہ کی رحمت سے اس کا بچہ اپنے باپ کے اصطبل میں آن پہونچا ہو۔ اور وہ سوچتا کہ یہ سب عیدو کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ آگے بڑھکر اس کے خواب میں اور بھی دلچسپ منظر پیش نظر ہوتا۔ وہ دیکھتا کہ اس کا بچہ اکیلا نہیں ہے۔ شہر بھر کے بچے کِل بِل کرتے اسکی طرف دیکھکر مسکرا رہے ہیں۔ اور عیدو ہنہنا رہا ہے، جیسے کہہ رہا ہو: "رمضان میاں دیکھو تو یہ نظارہ اور بتاؤ کہ اِن سب میں خوبصورت بچھیرا کونسا ہے؟"

یہ سب خواب اس کے سوتے ہوئے ساگر کی لہروں کو جگا دیتے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ رمضان پہلوان ہے اور یہ کوئی جھوٹ بھی نہ تھا۔ مگر یہ بھی تو سچ تھا کہ بیوی کی موت کے بعد اس کی روح نے ایک تھرتھر کپتی کا روپ دھار لیا تھا۔ جیسے یہ پرندہ جنگل میں بیٹھا یونہی کانپتا رہتا ہے اس کی رُوح بھی مشی دُلہن کی یاد میں لرزتی رہتی تھی۔

"آٹھ سیر کا تو گیہوں کا آٹا ہے، عیدو بیٹا!" رمضان اپنی تنگدستی کی کہانی چھیڑ دیتا، جیسے حیوان کا بیٹا انسان کے غم کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ "ایک دن تو ساڑھے پانچ سیر تک ہو گیا تھا آٹا، عیدو بیٹا، یہ تو سرکار کو رحم آ گیا کہ آٹھ سیر روپے کا بھاؤ ٹھہرا دیا۔" اور عیدو اپنی خوبصورت تھوتھنی اوپر اُٹھاکر رمضان کی طرف دیکھتا، جیسے کہہ رہا ہو: "گھبراؤ مت، رمضان میاں، آٹا پھر آ جائے گا اپنے پہلے بھاؤ پر — روپے کا پندرہ سیر۔" لیکن رمضان سر جھکاکر بیٹھ جاتا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا کہ کوئی مکڑی اس کے دماغ میں اپنا جالا تن رہی ہے۔ عیدو ہنہناتا، جیسے کہہ رہا ہو: "واہ، رمضان میاں، خوب پہلوان ہو تم بھی۔ ارے میاں حوصلہ رکھو، یہ تکلیفیں ہمیشہ تو نہیں رہتیں۔" رمضان کا سر اوپر اٹھ جاتا۔ عیدو اپنی پچھاڑی چھپاتا اور رمضان کی طرف دیکھنے لگتا۔ جیسے کہہ رہا ہو: "مجھے نہاری بھی تو نہیں ملتی رہی، رمضان میاں۔ لیکن کچھ پروا نہیں۔ میں تمہارے لئے سو میل بھاگوں گا، خون پسینہ ایک کر دونگا۔"

اور عیدو بہت بھاگتا اور خون پسینہ ایک کر دیتا۔ لیکن اس کی آمدنی جسے وہ ہوائی رزق سمجھتا آیا تھا، ان دنوں بہت گر گئی تھی۔ تانگے کا ساز بہت پُرانا تھا۔ نئے ربر ٹائروں کی اب کوئی امید نہ تھی۔ ان کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔ زمانہ بدل گیا تھا، جیسے رات ہی رات میں موسم بدل جائے اور سائیں جی کی فصلوں کی فکر اُسکے دماغ کو چھلنی کئے دیتی تھی۔

عیدو کا کملایا ہوا چہرہ دیکھکر رمضان اپنے کو مجرم گردانے لگتا۔ کہاں وہ اُسے روزانہ ڈیڑھ من ہرا چارا اور چار سیر دانہ کھلایا کرتا تھا۔ لیکن اب تو ان کی قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ پندرہ آنے کا ہرا چارا آتا تھا اور آٹھ آنے کا دانہ۔ اور رمضان اُسے پوری خوراک تو دور رہی آدھی خوراک بھی نہ دے پاتا تھا۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی اور اب اُسے یوں محسوس ہوتا کہ اس کے دماغ میں عیدو کی آخری لید داخل ہو رہی ہے اور اس کے پیشاب کی دھار بھی ضرور اُسی کے دماغ پر گرے گی۔ بے غیرت آدمی۔ بھوکے گھوڑے سے کام لئے جاتا ہے، جیسے وہ اپنا زر خرید غلام سمجھتا ہو۔

بھوک بہت ستاتی تو رمضان کو اپنے پیٹ میں ایک آتش گیر لاوا پیدا ہوتا محسوس ہوتا اور وہ سوچتا کہ عیدو کے پیٹ میں بھی لاوا بھڑک اٹھیگا۔ وہ تانگے کو روک لیتا، لیکن یہ کوئی علاج تھوڑی ہی تھا۔ اور غضب خدا کا، فاقہ زدہ لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اُسے یہ محسوس ہوتا کہ یہ لوگ اُسے گھور رہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں: "کمبخت، خود تو مرے گا ہی بھوک سے، پر غریب گھوڑے کو بھی کیوں مارتا ہے اپنے ساتھ۔ اِسے بیچ کیوں نہیں دیتا؟"

لیکن عیدو کو بیچنے کا خیال رمضان کو سرے سے نامنظور تھا۔ وہ بہت اُداس رہتا۔ غسل تو غسل، کئی کئی دن وہ منہ تک نہ دھوتا۔ حتیٰ کہ اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کے میلے جسم کی نچلی تہوں میں بھی دُنیا بھر کی غلاظت بھرتی جاتی ہے۔ اس کی خاکی قمیص اور صافے پر کیچڑ کا رنگ چڑھ گیا تھا — شاید اُسکی رُوح پر بھی۔

بھوک اور غلاظت میں کھوئے ہوئے سے رمضان نے محسوس کیا کہ جنگ کی خبریں ایک مقناطیسی قوت رکھتی ہیں، جس کے پیش نظر اس کے رگ و ریشے لوہ چُون کے ذرّوں کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں —

"جانتے ہو جرمن والا کیا کہتا ہے عیدو؟" اُس نے پوچھا۔

عیدو خاموش رہا۔ اور رمضان بولا: "جرمن والا کہتا ہے کہ روس والا اس کا سکّہ مانے۔"

تھوڑی دیر بعد عیدو نے سر ہلایا اور تھوتھنی گھماکر رمضان کی آنکھوں میں تکنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو: "یہ کوئی نئی خبر نہیں ہے رمضان میاں، شہر کے چوتھے دروازے کے باہر ریڈیو کے حلق سے میں بھی جنگ کی گرما گرم خبریں سُن لیتا ہوں۔"

جنگ کی تباہ کاریوں کی خبریں سنتے ہوئے رمضان کو اپنی تکلیفیں بے حقیقت اور ہیچ نظر آنے لگتیں۔ اصطبل میں بیٹھ کر حقّے کا کش لگاتے ہوئے وہ سوچتا کہ جرمنی ایک بہت بڑا تانگہ ہے جس پر سوار ہو کر ہٹلر روس

میں سے گذرنا چاہتا ہے۔ لیکن جب ایک دن کسی سواری کی زبانی اُسے پتہ چلا کہ روسی کسان، مزدور دو ہزار میل لمبی دیوار بنا کر ہٹلر کا راستہ روکے کھڑے ہیں اور ہٹلر کا باپ بھی اب اِس انسانی دیوار کو توڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتا تو اُسے بہت خوشی ہوئی۔ اور اصطبل میں پہونچکر وہ بڑبڑا تھا "روس کی سڑک پر ہٹلر کے تانگے کے نئے ربڑ ٹائر بھی کام نہ دیں گے۔"

اور عیدو ہنہنایا، جیسے کہہ رہا ہو "میرے لئے تمہاری کوئی بھی خبر نئی نہیں ہوسکتی، رمضان میاں"

رمضان سوچتا کہ ہٹلر کی ہار ہو جائے تو یہ جنگ ختم ہو جائے۔ یہ رائے اُس نے سواریوں کی باتیں سن سُن کر بنائی تھی۔ جنگ نے ہر چیز کے دام چڑھا دئے تھے۔ سینکڑوں ہزاروں میل دُور ہونے والی جنگ کے بھیانک پنجے ابھی سے غریبوں کے مُنہ سے روٹی چھین رہے تھے۔ اُسے عیدو کی دُھندلی دُھندلی آنکھوں میں غم اور خوف گھلے ملے دکھائی دیتے، جیسے وہ جنگ میں مرنے والوں کی چیخ پکار سُن رہا ہو۔۔۔ ایک لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی پکار، جیسے ایک عجیب لیکن شدید ڈر اُس کی رُوح کو اپنی آہنی مٹھی میں دبا رہا ہو۔

سیہہ کے کانٹوں کی طرح لٹکتے ہوئے سر کے لمبے بالوں میں شاید رمضان نے کبھی انگلیوں سے بھی کنگھی نہ کی تھی۔ اُس کی چھاتی کا ماپ بھی اب گھٹ چلا تھا۔ لیکن مصلی کو یہ حسب معمول، انچ بہ انچ، پوری نظر آتی تھی ۔۔۔ پوری سوا فٹ۔ رمضان اب اُسے کبھی کبھار دریا کی طرف مفت لیجا لاتا اور کبوتروں کے ڈربے کے قریب سے پیر اُٹھاتے وقت مصلی کے انداز میں رقص کی سی کیفیت دکھائی دے جاتی۔ اور کبھی مصلی، عیدو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر دیتا تو وہ اُس کی طرف تھوتھنی گھما کر ہنہناتا۔ جیسے کہہ رہا ہو "میں تمہیں جانتا ہوں، مصلی"

ایک دن رمضان رات کو گیارہ بجے اصطبل میں واپس آیا۔ مصلی نے بتایا کہ عیدو کے لئے وہ ہری گھاس کا گٹھا لینے کی کوشش کرتا رہا، پر کوئی گھسیارن اُدھار پر رضامند نہ ہوئی۔ عیدو نے دو چار مرتبہ اپنے مالک کے دائیں بازو پر تھوتھنی تھپ تھپائی، جیسے کہہ رہا ہو "کچھ پروا نہیں رمضان میاں، میں بغیر کچھ کھائے ہی رات کاٹ لونگا"

رمضان پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ تکیے کے قریب ہی وہ ایک دکان کے سامنے تانگہ روک کر تین تنوری روٹیاں خرید کر تانگے پر بیٹھا بیٹھا نگل گیا تھا۔ لیکن عیدو جو بھوکے پیٹ نئی آبادی تک سالم سواری لیکر گیا تھا اور بھوکے پیٹ ہی وہاں سے لوٹا تھا۔ اب رات بھر بھوکا رہیگا۔ سرات بہت جا چکی تھی۔ اس وقت تو دانہ بھی نہ مل سکتا تھا۔

رمضان سوچنے لگا کہ جب آدھی رات کے بعد فرشتہ آئیگا اور پوچھےگا "تمہیں کوئی شکایت تو نہیں ہے، زمین پر چلنے والو، اپنے مالک سے؟" اور عیدو کہدیگا "آسمان پر رہنے والو، ہمیں شکایت کیوں ہوتی؟"

فرشتہ عیدو کے قریب آکر کہےگا "تمہارے مالک کیلئے اب میں دُعا کرتا ہوں۔ تم بھی دُعا میں شامل ہو جاؤ میرے ساتھ"

اور عیدو میرے لئے دُعا میں شامل ہو جائےگا۔ کیونکہ صرف فرشتوں کی دُعا خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوتی۔ ہر رات کو فرشتہ آتا ہے اور ہر گھوڑے سے یہی سوال کرتا ہے۔ مالک کی معمولی بدسلوکیوں کی تو کوئی بھی گھوڑا شکایت نہیں کرتا۔ لیکن عیدو کتنا نیک گھوڑا ہے کہ بھوکے پیٹ چودہ میل کا سفر کرنے کے بعد بھی اُسے کھانے کو کچھ نہیں ملا اور فرشتے کے سامنے میرے خلاف ایک بھی لفظ منہ پر نہ لائےگا۔ حالانکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ بھوکا کھڑا ہے اور اس کے مالک نے اُس کے دیکھتے دیکھتے تین تنوری روٹیاں کھالیں۔

رمضان کو نیند نہ آتی تھی۔ دن بھر کے مشاہدے اور تجربے الگ الگ شکلیں دھار کر اُس کے سامنے پھرنے لگے۔ اندھیارے میں عیدو کا مُنہ صاف صاف نظر نہ آسکتا تھا۔ کھاٹ سے اُٹھکر وہ اس کے قریب گیا۔ وہ بدستور کھڑا تھا۔ اُس کی تھوتھنی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولا "اب سو بھی جاؤ عیدو بیٹا! فرشتہ آئے تو یہ مت کہدینا کہ تم بھوکے ہو"

عیدو نے تھوتھنی نہ ہلائی، نہ وہ ہنہنایا ہی۔ عیدو اُونگھ رہا ہے، یہ سوچ کر رمضان پھر اپنی کھاٹ پر آگیا۔ وہ خوش پوش نوجوان، جو دس آنے سے شروع کر کے بڑی مشکل سے بارہ آنے میں سالم تانگہ لے کر نئی آبادی گیا تھا، رمضان کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ وہ اس سے بہت جلد مانوس ہو گیا تھا۔ رمضان نے اُسے بتایا تھا کہ وہ ایک رنڈوا ہے۔ پھر اُس نے مشکی دُلہن کیلئے گوٹے کا دوپٹہ نہ لے سکنے، عیدو کو عید کے دن خریدنے اور داروغہ کی بیگار کاٹنے کا سب حال اُسے تفصیل سے کہہ سنایا تھا۔ اور خوش پوش نوجوان نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا تھا "کاش تم روس میں پیدا ہوئے ہوتے، کوچوان" یہ سُنکر کہ روس میں سب تانگے سوویٹ سرکار کے ہیں، تانگے ہی کیوں، ریلیں اور موٹریں بھی، اُسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ نوجوان نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا "سب چیزیں روس میں لوگوں کے لئے ہیں۔ سب مل کر اپنے اپنے حصے کا کام، کھیت میں ہو یا کارخانے میں سر انجام دیتے ہیں۔ سب کو بھوک لگتی ہے۔ کوئی بھوکا نہیں رہتا۔ سب کو سوویٹ کے ہوٹلوں سے کھانے کو مل جاتا ہے" اور رمضان نے سوچا، روس میں سچ مچ بہت مزہ ہوتا ہوگا۔

اُس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں، دماغ کی بتّیاں ٹمٹمانے لگیں۔ وہ نیند کے لاطم میں بہہ گیا، بہتا گیا.....

اُس نے دیکھا کہ آسمان سے روٹیاں برس رہی ہیں۔ وہ بہت ش ہوا۔ صدیاں گذریں کہ من وسلویٰ اُترا کرتا تھا آسمان سے۔ اب یہ ٹیاں برس رہی ہیں۔ یہ نئے زمانے کا من وسلویٰ ہے۔ سب غریبوں ے لئے۔ اچھی خیرات ہے خدا کی۔ اب کوئی بھوکا نہیں رہے گا۔ وہ روٹیوں ی طرف لپکا۔

پتہ چلا کہ یہ روٹیاں نہیں ہیں بلکہ گول گول چوڑی چوڑی پاتھیاں یں ۔۔۔ روٹیوں کی شکل کے اُپلے! توبہ توبہ، اللہ میاں بھی خوب مذاق کرتے لے ہیں زمین والوں کے ساتھ......

اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اللہ کی لعنت اِن روٹی نما پاتھیوں پر۔ وہ ڈراُٹھ کر بیٹھ گیا۔ عیدو اُس کا منہ غور سے تک رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو: "مجھے ات بھر نیند نہیں آئی رمضان میاں۔ تم نے بھی رت جگا کیا ہوتا تو ایک ب تماشہ دیکھا ہوتا۔ میں تو حیران رہ گیا۔ آسمان سے روٹیاں برسنے لگیں۔ ہاں وہاں روٹیاں ہی روٹیاں نظر آتی تھیں۔ مگر پیشتر اس کے کہ تم جاگ ٹھتے اور مجھے کھول دینے پر رضامند ہو جاتے، روٹیاں جانے کدھر م ہو گئیں۔" رمضان نے سوچا کہ شاید انسان کی طرح حیوان کو بھی خواب تے ہیں۔

مصلّی کچھ ہری گھاس اور دانہ لے آیا تو عیدو ہنہنانے لگا ۔۔۔ سورج کی کرنیں چھن چھن کر اُس کے سیاہ مخملی بُت پر پڑ رہی تھیں۔ مصلّی نے ریب آکر دانے والا بٹھل عیدو کی کھولی میں رکھ دیا۔ عیدو پھر ہنہنایا جیسے ہہ رہا ہو: "جب بھی کوئی خمیری گلگلا کہہ کر تمہارا مذاق کرتا ہے میں چاہتا ہوں اُسے کاٹ کھاؤں، مصلّی، اور وہ شخص رمضان ہی کیوں نہ ہو۔ ۔ سوا گز چھاتی والا، چھ فٹ اونچا دیوہیکل رمضان۔" مصلّی بولا: "جیتا رہ عیدو، اللہ رسول کی امان۔"

اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے رمضان نے مصلّی کو اپنے پاس بلایا۔ رمضان بہت مطمئن نظر آتا تھا.....

ایک دن، دو دن، پانچ دن، بڑی مشکل سے رمضان نے آٹھ روپے بارہ آنے جوڑے تھے کہ دس روپے کی قسط کی ادائیگی کا وقت آن ہونچا۔ سائیں جی آدھمکے اور اِدھر اُدھر کی گفتگو کی منزلیں طے کرنے کے بعد اصلی تان دس روپے پر ٹوٹی۔ پہلے تو رمضان کے جی میں آئی کہ سائیں جی سے کہہ دے کہ میرے پاس صرف پانچ روپے ہیں جو وہ بخوشی لے سکتا ہے۔ باقی کے پانچ روپے چند روز ٹھہر کر ادا کر دے گا۔ اور حتی الوسع کوشش کرنے پر بھی ادا نہ کر سکا تو اگلی قسط دس کی بجائے پندرہ کی ہو جائے گی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ ایسی کوئی بات شروع کرتا سائیں جی کہہ اُٹھے: "تمہاری قسطوں کا تو کچھ دھڑکا نہیں ہے، رمضان میاں، لیکن تم تو سیانے ہو۔ وقت پر ہر قسط ادا کر دی جائے تو زیادہ آسانی دینے والے ہی کو رہتی ہے۔"

رمضان نے عیدو کی طرف دیکھا، جیسے اُس کی رائے مانگ رہا ہو۔ بے زبان عیدو کی آنکھوں میں رمضان نے اُس کے جذبات پڑھ لینے کی وِدّیا سیکھ لی تھی۔ اُس کی سفارش یہی معلوم ہوتی تھی کہ جیب کی سب نقدی، پیسہ پیسہ، سائیں جی کے سامنے ڈھیری کر دی جائے۔ اور رمضان نے یہی کیا۔

سائیں جی نے رقم گن ڈالی۔ اُن کے چہرے پر ایک وحشیانہ ہنسی پھوٹ نکلی۔

"بات کیسے بنے گی رمضان میاں۔ دس روپے کی ضرورت ہے۔ اور سوا روپے کی کمی رہ گئی ہے۔"

رمضان کا دماغ سوچنے سے رُک گیا تھا۔ وہ چونک پڑا: "سوا روپے کی کمی رہ گئی ہے۔ پیسہ پیسہ تو ڈھیری کر دیا سائیں جی۔ اب کیا کہتے ہو؟"

"یہی کہ سوا روپے کی کمی رہ گئی ہے۔"

رمضان کو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے دماغ میں داخل ہو کر اُس کی سب سے اہم بال کمانی نوچ رہا ہو، جیسے اُس کے دل میں سوراخ کیا جا رہا ہو تاکہ اس کا سب خون نکال لیا جائے۔ اُس نے عیدو کی طرف دیکھا۔ اس کی سفارش یہی معلوم ہوتی تھی کہ کل شام کا وعدہ کر لیا جائے۔ اور اُس نے یہی وعدہ کر لیا۔

سائیں جی کے چہرے پر زندگی کی لہر دوڑ گئی اور وہ کبوتروں کو دڑبے کے قریب پڑی ہوئی لید کی طرف دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔

عیدو ہنہنا رہا تھا۔ اُس کی ہنہناہٹ میں اس کی ساری خودداری کی چمک موجود تھی۔ وہ رمضان کی تنگ دستی سے واقف تھا لیکن شاید وہ ہمیشہ ایک خوددار کوچوان کے تانگے میں جُتنے کی خواہش رکھتا تھا۔ رمضان کا سر جھک گیا تھا، جیسے صدیوں کی گھنی ڈھیر قسطوں نے اپنا سارا بوجھ اس کی گردن پر ڈال دیا ہو۔

نمناک آنکھوں سے رمضان نے عیدو کی طرف دیکھا۔ عیدو نے اپنی تھوتھنی رمضان کے کندھے پر رکھ دی اور پھر دھیرے دھیرے اُسے سہلانے لگا، جیسے کہہ رہا ہو: "سوا روپیہ بھی کچھ چیز ہوتی ہے، رمضان میاں؟ کیوں گھبراتے ہو؟" اور رمضان نے سر اُٹھا کر عیدو کی کھوں

میں اس کے جذبات پڑھ لئے "اچھا یہ سوا روپیہ اب تمہارے ذمے رہا، عیدو بیٹا"

اگلے روز رمضان شام کو اصطبل میں پہونچا تو اُس کی جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ اُس کی حالت کم و بیش ایک ہارے ہوئے جواری کی سی تھی جس کی تقدیر کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

تانگے سے کھول کر عیدو کو اس کے تھان پر باندھا گیا تو وہ پچھاڑی اُچھال اچھال کر تھان کی زمین سونگھنے لگا۔ جیسے وہ مٹی کھانے پر تیار ہو گیا ہو۔ ایک پٹے ہوئے گدھے کی طرح اس کے جسم کا بند بند دُکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ رمضان اس کے جسم پر مالش کرکے اس کی تکان دُور کر دے۔ لیکن رمضان کی اپنی تکان بھی تو آج کچھ کم نہ تھی۔ وہ نمناک آنکھوں سے رمضان کو تکنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو "تیار ہو جاؤ، رمضان میاں، سائیں جی آتے ہی ہونگے"

رمضان نے فیصلہ کیا کہ سائیں جی کو کچھ نہ دے۔ یوں ہی ٹال مٹول کر دے۔ وہ کھاٹ ڈال کر بیٹھ گیا اور مصفیٰ حقہ تازہ کرکے چھوڑ گیا تھا۔

عیدو بہت اُداس تھا۔ اُس کی بیکار رہنے والی، زنگ آلود انتڑیاں باہر آیا چاہتی تھیں۔ ابلق کے بیٹے کو انسان سے کئی گُنا زیادہ بھوک لگتی ہے۔ بیچارہ عیدو۔ اُس کی تھوتھنی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئیں۔ دھیرے دھیرے اُس نے اپنے پیٹ کو اندر پچکانا شروع کیا۔ بھوک تو بڑھ رہی تھی، بڑھتی آ رہی تھی اور اُس کی آنت آنت میں برما گھما کر چھید پر چھید کر رہی تھی۔

رمضان بھی اُداس تھا۔ سائیں جی لاکھ بلایا کریں، وہ اُن سے بولے گا ہی نہیں آج۔ گھٹنی سا دم لینا کچھ مشکل تھوڑی ہے۔ مت ماری گئی ہو سائیں جی کی۔ بہت دق کرتے ہیں۔ کوئی کسی کے روپے رکھ تو نہیں لیتا۔ کچھ بھی تو صبر نہیں ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں دُھندلی سپیدیاں پیدا ہو رہی تھیں ––– گھنے ڈھیر زہر کی سپیدیاں۔ آج سائیں جی بچ کر نہ جائیں گے۔ ذرا سی بس اُن کی زبان درازی کی دیر ہوگی اور یہ پہلوانوں کا سردار کوچوان اُنہیں ٹھیک کر دے گا۔ آج وہ عیدو کے سامنے اپنی جوانمردی کا ثبوت دیگا۔

اور سائیں جی آ گئے، وہ چپ چپ سے نظر آتے تھے۔ وہ رمضان کی کھاٹ پر بیٹھ گئے۔ رمضان کے ذہن کی زہریلی سپیدیاں جانے کدھر دبی رہیں۔ اس نے سوچا کہ کوئی نرم سی بات کہہ کر ٹال مٹول کر دے۔ لیکن اُس کے ہونٹ نہ ہلے، جیسے گول کنڈلی مارے یوں خاموش بیٹھا رہے گا ہمیشہ، ہمیشہ۔

"قسطوں کا مطلب یہی ہوتا ہے، رمضان!" سائیں جی بولے "کہ رقم آسانی سے اُتر جائے"

رمضان نے بیدلی سے سر ہلا کر کہا "ہاں، سائیں جی"

"یعنی ایک قسط کا تھوڑا سا بقایا بھی دوسری قسط میں شامل نہ ہونا چاہیئے۔ اور صاف بات تو یہ ہے کہ اس میں زیادہ فائدہ مقروض ہی کا منظور ہوتا ہے"

"ہاں سائیں جی!" رمضان نے عیدو کی طرف آنکھیں گھماتے ہوئے جواب دیا۔ اور عیدو ہنہنایا، جیسے وہ اپنے مالک کے ساتھ کسی طرح کی ناانصافی پسند نہ کرتا ہو اور اس بات سے جل رہا ہو کہ رمضان نے آخر شرافت کا پلّو کیوں پکڑ رکھا ہے اتنی مضبوطی سے؟ کیوں نہیں دھتا بتا دیتا اس کمبخت سائیں جی کو؟۔

"تمہاری ایمانداری، تمہاری دانائی اور سب سے بڑی بات ہے تمہاری شرافت" سائیں جی نے پینترہ بدل کر کہا "ان میں تو مجھے کبھی کوئی شک نہیں گزرا"

"آپ مالک جو ہوتے" رمضان نے نرم ہو کر کہا۔

"لیکن قسط کی ادائیگی تو ضروری ہے وقت پر، رمضان میاں!" سائیں جی نے رمضان کے کندھوں پر ہاتھ ٹیک کر کہا "اور یہ بات میں اپنی ہی غرض سے تھوڑی کہتا ہوں۔ جلدی اس بوجھ سے چھٹکارا پانے کا بس یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے"

"آج تک تو کسی نے مجھ پر ٹھیکرا نہیں پھوڑا، سائیں جی!"

"یہی تو میرا بھی خیال ہے" سائیں جی نے اُس کی آنکھوں میں تکتے ہوئے کہا اور اسکی کھاٹ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جیب سے روپیہ نکال کر رمضان نے سائیں جی کے سامنے پھینک دیا۔

"اور چونی" سائیں جی نے روپیہ اُٹھا کر کہا۔

رمضان نے عیدو کی طرف دیکھا۔ وہ تھوتھنی ہلا رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو "روپیہ تو تم دے ہی بیٹھے رمضان میاں، اب کل چونی بھی مارنا سائیں جی کے ماتھے سے" اور رمضان نے کل کا وعدہ کر لیا۔

سائیں جی جا چکے تھے۔ رمضان نے محسوس کیا کہ اُسے چاروں طرف سے نااُمیدی نے گھیر رکھا ہے۔ صدیوں کی گھنی ڈھیر قسطوں میں آخر ایک روپے کی ادائیگی سے کتنا فرق پڑ سکتا ہے؟ وہ بہت اُداس تھا، جیسے اس کا دل بجھ جانے کو ٹمٹما کر ––––– اصطبل کے چراغ کی طرح۔

عیدو اپنے تھان پر بھو کا بندھا تھا۔ رمضان اس کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ بغیر بستر بچھائے ہی وہ کھاٹ پر گر پڑا۔ اس نے کروٹ بھی نہ بدلی۔ پیٹھ تو تختہ ہو گئی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ عیدو ہی کی طرح ہنہنانے لگتا۔ وہ تھکا ہارا نڈھال پڑا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ سو جائے۔ تنے ہوئے پیٹ پر تو نیند دوڑی چلی آتی ہے۔ جانے آج وہ کدھر غائب ہو گئی تھی۔

پھر مصلّی آن پہونچا۔ کہیں سے وہ دو روٹیاں اور اچار کی پھانک لے آیا تھا۔

"رمضان، او میاں رمضان!" دل میں گدگدی سی محسوس کرتے ہوئے وہ بولا "دیکھ تیرے لئے روٹیاں لایا ہوں۔ تو بھوکا کیوں رہے آخر۔ تیرے قریب ہی میں سو جاؤں ایک پیٹ سے زیادہ کھا کر۔ نہ بابا، یہ تو نہ ہوگا مجھ سے، آخر میں اس قطب اعظم کے مزار کا مجاور ہوں۔ ور میں اللہ اور اُسکے قطب سے ڈرتا ہوں"

رمضان کا خیال فوراً من و سلویٰ کی طرف دوڑ گیا۔ مصلّی روٹیاں رکھ کر چلا گیا تھا۔ رمضان نے سوچا، آخر بھیج ہی دیا نا میرے اللہ نے۔ اور مجھے کسی کا دروازہ کھٹکھٹانے کی نوبت نہیں آئی: اُس وقت عیدو کے ہنہنانے کی آواز رمضان کے کانوں میں آئی۔ آج عیدو کسی طرح رمضان کی آخری چوٹی کے لئے دریا تک چلا گیا تھا۔ اِس وقت تک رمضان نے من و سلویٰ کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیا تھا۔ لیکن جھٹ سے اُس نے لقمے کو ہتھیلی پر اگال کر دور کنوئیں کی منڈیر پر پھینک دیا اور بولا "جب تک تیرے لئے دانہ، تیرے لئے من و سلویٰ نازل نہیں ہوتا، میں کھاتا نہیں کھاؤں گا، عیدو بیٹا!" اور رمضان نے کاغذ کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور زبردستی اپنی پلکوں کے کواڑ بند کرنے لگا۔

دیوندر ستیارتھی!

شرحِ تمنّا

اِسی آئینے میں امروز و فردا دیکھ لیتی ہوں
نگاہِ ناز میں تیری میں کیا کیا دیکھ لیتی ہوں
کبھی دُنیا کے اندر کچھ نظر آتا نہیں مجھکو
کبھی اپنے ہی اندر ایک دُنیا دیکھ لیتی ہوں
کبھی تو کھینچتی ہوں اپنی ہی اُلفت کا خمیازہ
کبھی انگڑائی لیکر حُسن تیرا دیکھ لیتی ہوں
چمن اندر چمن دیکھا ہے اکثر دشتِ ویراں میں
کبھی نظارۂ گلشن میں صحرا دیکھ لیتی ہوں
کبھی سی رہتی ہوں لیکن ہوائے کوئے جاناں سے
چراغِ زندگانی جھلملاتا دیکھ لیتی ہوں
مری دوشیزگی کھِل اُٹھتی ہے گُل کی طرح جس دم
گناہِ عشق کا دامن پہ دھبّا دیکھ لیتی ہوں
ترا ہی جلوہ ہے جن میں ترا ہی حُسن ہے جن میں
انہیں آنکھوں سے دُنیا کا تماشہ دیکھ لیتی ہوں
میں بن جاتی ہوں اک تصویرِ حیرت سامنے اُسکے
وہ جلوہ دیکھ لیتی ہوں وہ پردا دیکھ لیتی ہوں
مری آوارہ گردی ہے حریفِ منزلِ جاناں
کسی کو کُو بہ کُو صحرا بہ صحرا دیکھ لیتی ہوں
فنا بھی ہے بقا بھی ہے نگاہِ شوق ساماں میں
عدم اندر عدم دُنیا میں دُنیا دیکھ لیتی ہوں
سمجھتی ہوں کہ یہ بھی اک فریبِ حُسن ہے لیکن
نگاہِ ناز میں شرحِ تمنّا دیکھ لیتی ہوں
سُنا ہے فیصلہ ہے عشق کا میری نگاہوں پر
اگر ہے بات اتنی سی تو اچھا دیکھ لیتی ہوں
وہ آنکھیں دیکھ کر میں ایک شانِ بے نیازی سے
سرِ میخانہ سمت جام و مینا دیکھ لیتی ہوں
کبھی بیتابیاں کم ہو سکی ہیں قربِ جاناں سے
نگاہیں مست ہو جائیں بس اتنا دیکھ لیتی ہوں
کسی کے ڈبڈبائے آنسوؤں میں پچھلی راتوں کو
میں حجبہ اپنی قسمت کا ستارہ دیکھ لیتی ہوں

مِس فریا

شادی کے ایک مہینے بعد سہیل پریشان ہوگیا۔ اُس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہوگیا۔

اُس کا خیال تھا کہ بچہ کم از کم تین سال کے بعد پیدا ہوگا مگر اب ایک دم یہ معلوم کرکے اُس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ جس بچے کا اُس کو وہم و گمان بھی نہیں تھا اُس کی بُنیاد رکھی جا چکی ہے۔ اُس کی بیوی کو بھی اتنی جلدی ماں بننے کا شوق نہیں تھا اور سچ پوچھئے تو وہ ابھی خود بچہ تھی۔ یوں وہ پندرہ برس کی عمر کیا ہوتی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے عائشہ گڑیاں کھیلتی تھی اور صرف پانچ مہینے کی بات ہے کہ سہیل نے اُسے گلی میں جنگلی بلی کی طرح نکتے چنوں پر خوانچہ والے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ منہ لال کئے وہ اس سے کہہ رہی تھی: "تم نے مجھے کل بھی کھیلیں اسی طرح کم دی تھیں۔ تم بے ایمان ہو ——— میرے پیسے کیا مفت کے آتے ہیں جو میں تول میں ہر بار کم چیز لے لوں!" اور اُس نے زبردستی جھپٹا مار کر مٹھی بھر نمکین چنے اُس کے خوانچے سے اُٹھا لیے تھے۔

اب سہیل یہ منظر یاد کرتا اور سوچتا کہ عائشہ کی گود میں بچہ ہوگا جب وہ گھر جاتے ہوئے ٹرین کا سفر کریگی تو اپنے اس ننھے کو اُسی طرح دودھ پلائیگی جس طرح ریل کے ڈبوں میں دوسری عورتیں پلایا کرتی ہیں ——— اس کی لڑکی یا لڑکا اسی طرح چپڑ چپڑ کرے گا، اسی طرح ہونٹ سکیڑ کر روئے گا، تو وہ عائشہ سے کہے گا: "بچہ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا ہے اور تم کھڑکی میں سے باہر کا تماشہ دیکھ رہی ہو ———" اس کا تصور کرتے ہی سہیل کا حلق سُوکھ جاتا تھا۔

"اِس عمر میں بچہ؟ ——— بھئی میرا تو ستیاناس ہو جائے گا ——— ساری شاعری تباہ ہو جائے گی۔ وہ ماں بن جائے گی، میں باپ بن جاؤنگا۔ شادی کا باقی رہے گا کیا؟ ——— صرف ایک مہینہ جس میں ہم دونوں میاں بیوی بن کے رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اولاد کا سلسلہ کیوں میاں بیوی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اولاد بُری چیز ہے۔ بچے پیدا ہوں پر اس وقت جب اُن کی خواہش کی جائے۔ یہ نہیں کہ بن بلائے مہمانوں کی طرح آن ٹپکیں۔ میں خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ کیسے کیسے حسین خیال میرے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ شروع شروع کے دن تو ایک عجیب قسم کی افراتفری میں گذر گئے تھے، اب ایک مہینے کے بعد سب چیزوں کی نوک پلک درست ہوئی تھی۔ اب شادی کا اصلی لُطف آنے لگا تھا کہ بیٹھے بٹھلائے یہ آفت آگئی ——— ابھی جانے کتنے اور ہوں؟"

سہیل پریشان ہوگیا۔ اگر دفعتہً آسمان سے کوئی جہاز بم برسانا شروع کر دیتا تو وہ اس قدر پریشان نہ ہوتا مگر اس حادثے نے اس کا دماغی توازن درہم برہم کر دیا تھا۔ وہ اتنی جلدی باپ نہیں بننا چاہتا تھا۔

"میں اگر باپ بن جاؤں تو کوئی ہرج نہیں مگر مصیبت یہ کہ عائشہ ماں بن جائیگی ——— اس کو اتنی جلدی ہرگز ہرگز ماں نہیں بننا چاہیئے۔ وہ جوانی کہاں رہے گی اُس کی جس کو میں اب بھی یعنی شادی ہونے کے بعد بھی کنکھیوں سے دیکھتا ہوں اور ایک لرزش سی اپنے خیالات میں محسوس کرتا ہوں۔ اس کی تیزی و طراری کہاں رہے گی ——— وہ بھولاپن جو آب مجھے عائشہ میں نظر آتا ہے ماں بن کر بالکل غائب ہو جائے گا۔ وہ کھلنڈرا اپن جو اس کی رگوں میں پھڑکتا ہے فسردہ ہو جائے گا ——— وہ ماں بن جائیگی، اور صابن کے جھاگ کی طرح اُس کی تمام چلبلاہٹیں بیٹھ جائیں گی ——— گود میں ایک چھوٹے سے روتے پِلّے کو لئے کبھی وہ میری میز پر پیپر ویٹ اُٹھا کر بجائیگی، کبھی کنڈی ہلائے گی اور کبھی کن سُری تانوں میں اوٹ پٹانگ لوریاں سنائیگی ——— واللہ میں تو پاگل ہو جاؤنگا۔"

سہیل کو دیوانگی کی حد تک اِس حادثے نے پریشان کر رکھا تھا۔ تین چار دن تک اُسکی پریشانی کا کسی کو علم نہ ہوا۔ مگر اس کے بعد جب اُس کا چہرہ فکر و تردد کے باعث مرجھا سا گیا تو ایک دن اس کی ماں نے کہا: "سہیل کیا بات ہے، آج کل تم بہت اُداس اُداس رہتے ہو؟"

سہیل نے جواب دیا: "کوئی بات نہیں امی جان ——— موسم ہی کچھ ایسا ہے۔"

موسم بیحد اچھا تھا۔ ہوا میں لطافت تھی۔ وکٹوریہ گارڈن میں جب وہ سیر کے لئے گیا تھا تو اُسے بے شمار پھول کھلے ہوئے نظر آئے تھے۔ ہر رنگ کے۔ ہریاول بھی عام تھی۔ درختوں کے پتے اب مٹیالے نہیں تھے۔ ہر شے دُھلی ہوئی نظر آتی تھی۔ مگر سہیل نے اپنی اُداسی کا باعث موسم کی خرابی بتایا۔

ماں نے جب یہ بات سُنی تو کہا: "سہیل تو مجھ سے چھپاتا ہے ——— دیکھ، سچ سچ بتا، کیا بات ہے ——— عائشہ نے تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی؟"

سہیل کے جی میں آئی کہ اپنی ماں سے کہہ دے: "ایسی ویسی بات؟ — امی جان اُس نے ایسی بات کی ہے کہ میری زندگی تباہ ہوگئی ہے — مجھ سے پوچھے بغیر اس نے ماں بننے کا ارادہ کر لیا ہے" مگر اس نے یہ بات نہ کہی اس لئے کہ یہ سُنکر اُسکی ماں یقینی طور پر خوش ہوتی۔

"نہیں امّی جان۔ عائشہ نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ وہ تو بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ آپ سے تو اُسے بے پناہ محبت ہے — در اصل میری اداسی کا باعث — لیکن امی جان میں تو بہت خوش ہوں"

یہ سُنکر اس کی ماں نے دعائیہ لہجے میں کہا: "اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے — عائشہ واقعی بہت اچھی لڑکی ہے — میں تو اُسے بالکل اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں — اچھا، پر سہیل یہ تو بتا اب میرے دل کی مراد کب پوری ہوگی"

سہیل نے مصنوعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا: "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"تو سب سمجھتا ہے — میں پوچھتی ہوں کب تیرا لڑکا میری گود میں کھیلے گا۔ سہیل دل کی ایک آرزو تھی کہ تجھے دولھا بنتا دیکھوں۔ سو یہ آرزو خدا نے پوری کر دی۔ اب اس بات کی تمنا ہے کہ تجھے پھلتا پھولتا بھی دیکھوں"

سہیل نے اپنی ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا: "امّی جان، آپ تو ہر وقت ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ دو برس تک میں بالکل اولاد نہیں چاہتا"

"دو برس تک تو بالکل اولاد نہیں چاہتا، کیسے؟ — یعنی تو اگر نہیں چاہے گا تو کبھی بچہ نہ ہوگا؟ — واہ، ایسا بھلا کبھی ہو سکتا ہے — اولاد دینا نہ دینا تو اُس کے ہاتھ میں ہے اور ضرور دیگا — اللہ کے حکم سے کل ہی میری گود میں پوتا کھیل رہا ہوگا"

سہیل نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ کہتا بھی کیا۔ اگر وہ اپنی ماں کو بتا دیتا کہ عائشہ حاملہ ہو چکی ہے تو ظاہر ہے کہ سارا راز فاش ہو جاتا اور وہ بچے کی پیدائش روکنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ شروع شروع میں اس نے سوچا تھا کہ شاید کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ اُس نے اپنے شادی شدہ دوستوں سے سُنا تھا کہ عورتوں کے حساب کتاب میں کبھی کبھی ایسا ہیر پھیر ہو جایا کرتا ہے۔ ابھی تک یہ خیال اُس کے دماغ میں جما ہوا تھا۔ اس کے موہوم ہونے پر بھی اس کو اُمید تھی کہ چند ہی دنوں میں مطلع صاف ہو جائیگا۔

پندرہ بیس دن گذر گئے مگر مطلع صاف نہ ہوا، اب اسکی پریشانی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ وہ جب بھولی بھالی عائشہ کی طرف دیکھتا تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کسی مداری کے تھیلے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ "آج عائشہ میرے سامنے کھڑی ہے۔ کتنی اچھی لگتی ہے۔ لیکن مہینوں میں اس کا پیٹ پھول کر تھلیا بن جائے گا۔ ہاتھ پیر سوج جائیں گے — ہوا میں عجیب عجیب خوشبوئیں اور بدبوئیں سونگھتی پھرے گی۔ قے کرے گی اور خدا معلوم کیا سے کیا بن جائے گی — !"

سہیل نے اپنی پریشانی ماں سے چھپائے رکھی، بہن کو بھی پتہ نہ چلنے دیا۔ مگر بیوی کو معلوم ہو ہی گیا۔ ایک روز سونے سے پہلے عائشہ نے بڑے تشویشناک لہجے میں اُس سے کہا: "کچھ دنوں سے آپ مجھے بیحد مضطرب نظر آتے ہیں — کیا وجہ ہے؟"

لطف یہ ہے کہ عائشہ کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک دو بار اُس نے سہیل سے کہا تھا کہ یہ ابکی دفعہ کیا ہو گیا ہے تو سہیل نے بات گول مول کر دی تھی اور کہا تھا کہ شادی کے بعد بہت سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں، ممکن ہے کوئی ایسی ہی تبدیلی ہوگئی ہو" مگر اب اُسے سچی بات بتانا ہی پڑی: "عائشہ، میں اس لئے پریشان ہوں کہ تم ....تم اب ماں بننے والی ہو"

عائشہ شرما گئی: "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں"

"کیسی باتیں کرتا ہوں۔ اب جو حقیقت ہے میں نے تم سے کہدی ہے — تمہارے لئے تو یہ خوشخبری ہوگی مگر خدا کی قسم اس نے مجھے کئی دنوں سے پاگل بنا رکھا ہے"

عائشہ نے جب سہیل کو سنجیدہ دیکھا تو کہا: "تو....تو.....کیا سچ مچ؟..."

"ہاں، ہاں — سچ مچ — تم ماں بننے والی ہو — خدا کی قسم جب میں سوچتا ہوں کہ چند مہینوں ہی میں تم کچھ اور ہی بن جاؤ گی تو میرے دماغ میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے — میں نہیں چاہتا کہ اتنی جلدی بچہ پیدا ہو۔ اب خدا کیلئے تم کچھ کرو"

عائشہ یہ بات سُنکر صرف محجوب سی ہوگئی تھی۔ حجاب کے علاوہ اُس نے ہونے والے بچے کے متعلق کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ در اصل یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکی تھی کہ اُسے خوش ہونا چاہیئے یا گھبراہٹ کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اس کو معلوم تھا کہ جب شادی ہوئی ہے تو بچہ ضرور پیدا ہوگا مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سہیل اتنا پریشان ہو جائے گا۔

سہیل نے اسکو خاموش دیکھ کر کہا: "اب سوچتی کیا ہو۔ کچھ کرو تاکہ اس بچے کی مُصیبت ٹلے"

عائشہ دل ہی دل میں ہونے والے بچے کے ننھے ننھے کپڑوں کے متعلق سوچ رہی تھی، سہیل کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"کیا کہا؟"

"میں کہتا ہوں کچھ بندوبست کرو کہ یہ بچہ پیدا نہ ہو۔"

"بتایئے میں کیا کروں؟"

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تم سے کیوں کہتا۔ تم عورت ہو، عورتوں سے ملتی رہی ہو۔ شادی پر تمہاری بیاہی ہوئی سہیلیوں نے تمہیں کئی مشورے دئیے ہوں گے۔ یاد کرو، کسی سے پوچھو۔ کوئی نہ کوئی ترکیب تو ضرور ہوگی۔"

عائشہ نے اپنے حافظے پر زور دیا۔ مگر اُسے ایسی کوئی ترکیب یاد نہ آئی۔

"مجھے تو آج تک کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔۔۔ پر میں پوچھتی ہوں کہ اتنے دن آپ نے مجھ سے کیوں نہ کہا۔ جب بھی میں نے آپ سے اس بارے میں بات چیت کی آپ نے ٹال دیا۔"

"میں نے تمہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ یہ بھی سوچتا رہا کہ شاید یہ میرا وہمہ ہو، پر اب کہ بات بالکل پکی ہو گئی ہے تمہیں بتانا ہی پڑا۔ عائشہ اگر اس کا کوئی علاج نہ ہوا تو خدا کی قسم بہت بڑی آفت آ جائے گی۔ آدمی شادی کرتا ہے کہ چند برس ہنسی خوشی میں گذارے یہ نہیں کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں۔۔۔ جھٹ سے ایک بچہ پیدا ہو جائے۔۔۔ کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیتا ہوں۔"

عائشہ نے جواب دماغی طور پر سہیل کی پریشانی میں شریک ہو چکی تھی، کہا: "ہاں، کسی ڈاکٹر سے ضرور مشورہ لینا چاہیئے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ بچہ اتنی جلدی نہ ہو۔"

سہیل نے سوچنا شروع کیا۔ پولینڈ کا ایک ڈاکٹر اُس کا واقف تھا۔ پچھلے دنوں جب شراب کی بندش ہوئی تھی تو وہ اِس ڈاکٹر کے ذریعہ ہی سے وسکی حاصل کیا کرتا تھا پر اب وہ دیولالی میں نظر بند تھا، کیونکہ حکومت کو اُسکی حرکات و سکنات پر شبہ ہو گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر اگر نظر بند نہ ہوتا تو یقیناً سہیل کا کام کر دیتا۔ اِس پولستانی ڈاکٹر کے علاوہ ایک یہودی ڈاکٹر کو بھی وہ جانتا تھا۔ جس سے اُس نے اپنی چھاتی کے درد کا علاج کرایا تھا۔ سہیل اُس کے پاس چلا جاتا مگر اس کا چہرہ اتنا رعب دار تھا کہ وہ اُس سے ایسی بات کے متعلق ارادے کے باوجود مشورہ نہ لے سکتا۔

یوں تو بمبئی میں ہزاروں ڈاکٹر موجود تھے مگر بغیر واقفیت اِس معاملے کے متعلق بات چیت ناممکن تھی۔۔۔ بہت دیر تک غور و فکر کرنے کے بعد معاً اُسکو مس فریا کا خیال آیا جو ناگپاڑے میں پریکٹس کرتی تھی اور اُس کا خیال آتے ہی مس فریا اُسکی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

موٹے اور بھاری جسم کی یہ کرسچین عورت عجیب و غریب کپڑے پہنتی تھی۔ ناگپاڑے میں کئی یہودی، کرسچین اور پارسی لڑکیاں رہتی ہیں۔ سہیل نے اِن کو ہمیشہ چست اور شوخ رنگ لباسوں میں دیکھا تھا۔ سکرٹ گھٹنوں سے ذرا نیچے، ننگی پنڈلیاں، اونچی ایڑی کی سینڈل، سر کے بال کٹے ہوئے، ان میں لہریں پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے۔ ہونٹوں پر گاڑھی سُرخی، گالوں پر اُڑتے اُڑتے سے رنگ کا غازہ، بھویں مونڈ کر پنسل سے بنائی ہوئی۔ ۔

اِن لڑکیوں کا بناؤ سنگھار کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ نگاہیں ان چیزوں کو پہلے دیکھتی تھیں جن سے عورت بنتی ہے مگر مس فریا ٹخنوں تک لمبا ڈھیلا ڈھالا فراک پہنتی تھی۔ پنڈلیاں ہمیشہ موٹی جرابوں سے ڈھکی رہتی تھیں۔ شو پہنتی تھی بہت ہی پرانے فیشن کا۔ بال کٹے ہوئے تھے مگر اُن میں لہریں پیدا کرنے کی طرف وہ کبھی توجہ ہی نہیں دیتی تھی۔ اسی بے توجہی کے باعث اُسکے بالوں میں ایک عجیب قسم کی بے جانی اور خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ رنگ کالا تھا جو کبھی کبھی سنولاہٹ بھی اختیار کر لیتا تھا۔

عائشہ نے تھوڑی دیر تک بچے کی پیدائش کے متعلق غور کیا اور سہیل کے پہلو میں سو گئی۔ غور و فکر ہمیشہ اُسے سُلا دیا کرتے تھے۔

عائشہ سو گئی مگر سہیل جاگتا رہا اور مس فریا کے متعلق سوچتا رہا۔

ٹھیک ایک برس پہلے انہی دنوں جب اُس کے کمرے میں نہ یہ نیا پلنگ تھا جو عائشہ جہیز میں لائی تھی اور نہ خود عائشہ تھی تو سہیل نے ایک بار مس فریا کو خاص زاویے سے دیکھا تھا۔ سہیل کی بہن کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بچہ کب پیدا ہوگا مس فریا کو بلایا گیا تھا۔ سہیل تازہ تازہ بمبئی آیا تھا۔ ناگپاڑے کی شوخ تیتریاں دیکھ دیکھ کر جو بالکل اس کے پاس سے پھڑپھڑاتی ہوئی گذر جاتی تھیں اسکے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ان سب کو پکڑ کر اپنی جیب میں رکھ لے مگر جب یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ ناامیدی کی حد تک پہونچ گیا تو اُسکو مس فریا دکھائی دی۔

پہلی نظر میں سہیل کے جمالیاتی ذوق کو صدمہ سا پہونچا۔ "کیسی بے ڈول عورت ہے۔۔۔ لباس کیسا بے ہودہ ہے اور قد۔۔۔ تھوڑے ہی دنوں میں بھینس بن جائیگی۔"

مس فریا نے اس روز کالے رنگ کی جالی دار ٹوپی پہن رکھی تھی جس میں تین چار شوخ رنگ کے پھندنے لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کیچڑ میں آلوچے گر پڑے ہیں۔ فراک جو ٹخنوں تک بڑے اُداس انداز میں لٹک رہا تھا چھپی ہوئی جارجٹ کا تھا۔ پھول خوشنما تھے، کپڑا بھی اچھا تھا مگر بہت ہی بھونڈے طریقے پر سیا گیا تھا۔

مس فریا جب دوسرے کمرے سے فارغ ہو کر آئی تو اس نے سہیل کو انگریزی میں کہا: "غسل خانہ کدھر ہے۔ مجھے ہاتھ دھونے ہیں۔"

غسل خانے میں سہیل نے مس فریا کو بہت قریب سے دیکھا تو اُسے

نسوانیت کے کئی ذرّے اُس کے ساتھ چپٹے نظر آئے۔ سہیل نے اب اُسے پسند کرنے کی نیت سے دیکھنا شروع کیا۔ "بُری نہیں ـــ آنکھیں خوبصورت ہیں۔ میک اَپ نہیں کرتی تو کیا ہوا۔ ٹھیک ہے۔ ہاتھ کیسے اچھے ہیں!"

مس قریا کے بالائی ہونٹ پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ کام کرنے کے باعث پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ سہیل نے جب ان کی طرف دیکھا تو مس قریا اُسے پسند آ گئی۔ پسینے کی یہ پھوارسی جو اُس کی مونچھوں کے روئیں پر کپکپا رہی تھی اُسے بہت ہی بھلی معلوم ہوئی۔ سہیل کے جی میں آئی کہ وہ کچھ کرنا شروع کر دے جس سے اس کا سارا جسم عرق آلود ہو جائے۔

مس قریا جب ہاتھ پونچھ کر فارغ ہو گئی تو اُس نے سہیل کی ماں سے کہا: "آپ اِن کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔ میں دوا تیار کر کے دیدوں گی اور استعمال کرنے کی ترکیب بھی سمجھا دونگی۔"

تانگہ اڈے تک جہاں وہ پریکٹس کرتی تھی، وکٹوریا میں سہیل نے اُس سے کوئی خاص بات نہ کی۔ کونین کے متعلق اُس نے چند باتیں دریافت کیں کہ ملیریا میں کتنی مقدار اس کی کھانی چاہیئے۔ پھر اُس نے دانتوں کی صفائی کے بارے میں اس سے کچھ معلومات حاصل کیں کہ اتنے میں وہ جگہ آ گئی جہاں مس قریا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا بورڈ لٹکا رہتا تھا۔

پہلی منزل کے ایک کمرے میں مس قریا کا مطب تھا۔ اس کمرے کے دو حصے کئے گئے تھے۔ ایک حصے میں مس قریا کی میز تھی جہاں وہ عام طور پر بیٹھتی تھی۔ دوسرے حصے میں اُس کی ڈسپنسری تھی۔ ڈسپنسری کی دو الماریوں کے علاوہ وہاں ایک چھوٹا سا تخت بھی تھا جس پر غالباً وہ مریض لٹا کر دیکھا کرتی تھی۔

مس قریا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی ٹوپی اُتاری اور ایک کیل پر لٹکا دی۔ سہیل اُس بنچ پر بیٹھ گیا جو میز کے پاس بچھی تھی۔ ٹوپی اُتار کر مس قریا نے نیم انگریزی اور نیم ہندوستانی لہجے میں آواز دی: "چھوکرا۔" کمرے کے دوسرے حصے سے ایک مریل سا آدمی نکل کر آیا اور کہنے لگا۔

"ہاں، میم صاحب!"

میم صاحب کچھ نہ بولیں اور دوا بنانے کے لئے اندر چلی گئیں۔

سہیل اس دوران میں سوچتا رہا کہ مس قریا سے کس طرح دوستی پیدا کرنا چاہئے۔ وہ تھوڑا سا وقت جو اُسے ملا اِسی سوچ بچار میں خرچ ہو گیا اور مس قریا دوا بنا کر لے آئی۔ کرسی پر بیٹھ کر اُس نے شیشی پر گوند سے لیبل چپکایا اور پُڑیوں پر نمبر لگانے کے بعد کہا: "یہ دو دوائیں ہیں۔ پُڑیا ابھی جا کر پانی کے ساتھ دے دیجئے اور اس میں سے ایک خوراک آدھے گھنٹے کے بعد پلا دیجئے گا۔ پھر پھر تیسرے گھنٹے کے بعد اسی طرح!"

سہیل نے پُڑیاں اٹھا کر جیب میں رکھ لیں، شیشی ہاتھ میں لے لی اور مس قریا کی طرف کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

وہ گھبرا گئی: "آپ بھُول تو نہیں گئے؟"

سہیل نے اُسی انداز سے دیکھتے ہوئے کہا: "میں بھُولا نہیں ـــ مجھے سب کچھ یاد ہے!"

مس قریا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے: "تو... تو... ٹھیک ہے...!"

سہیل دراصل اپنے ارادے کو مکمل کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

مس قریا نے چند کاغذات اُٹھا کر میز کے ایک طرف رکھ دئے۔

"اس کے.... اسکے دام؟"

سہیل نے خاموشی سے بٹوہ نکالا: "کتنے ہوئے؟" یہ کہہ کر اُس نے پانچ کا نوٹ بڑھا دیا۔

مس قریا نے نوٹ لیا۔ میز کی دراز کھول کر اُس میں رکھا۔ جلدی جلدی ریزگاری نکالی اور حساب کر کے باقی پیسے سہیل کی طرف بڑھا دئے۔

سہیل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور جلدی سے کہا: "تمہارا ہاتھ کتنا خوبصورت ہے!"

مس قریا تھوڑی دیر تک فیصلہ نہ کر سکی کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے: "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

سہیل نے بڑے ہی خام انداز میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا جیسے وہ اسٹیج پر عشقیہ پارٹ ادا کر رہا ہے: "میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

سہیل کو جب مس قریا کے لہجے میں کھردرا پن محسوس ہوا تو وہ چونکا۔ اُس نے لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ اینگلو انڈین اور کرسچین لڑکیاں فوراً ہی پھنس جایا کرتی ہیں۔ چنانچہ اسی سُنی سنائی بات کے زیر اثر اُس نے اتنی جرأت کی تھی مگر یہاں جب اُسے معاملہ بالکل برعکس نظر آیا تو اُس نے جلدی سے دوا کی شیشی اُٹھائی اور کہا: "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے آپ سے ایسی فضول باتیں نہیں کرنا چاہیئے تھیں... میں... میں نہ جانے کیا بک گیا۔ مجھے معاف کر دیجئے گا!"

مس قریا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا غصّہ کچھ کم ہو گیا: "تم نے جو کچھ کیا ہے اس پر مجھے بے حد غصّہ آیا تھا مگر اب میں تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو مجھے تم بہت ہی معصوم نظر آتے ہو ـــ بیوقوفی کی حد تک معصوم۔ جاؤ، پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا!"

سہیل سہم سا گیا۔ مس فریا کو وہ اسکول کی اُستانی سمجھنے لگا: "آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟"

مس فریا کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ پیدا نہ ہوئی جو سہیل چاہتا تھا کہ پیدا ہو: "جاؤ، میں نے کہہ جو دیا کہ پھر ایسی حرکت نہ کرنا ـــ دوا کسی ور جگہ سے نہ لینا۔ کل یہیں چلے آنا ـــ اور دیکھو تم نے میرے آنے جانے کے پیسے نہیں دئے۔"

سہیل نے پوچھا: "کتنے ہوتے ہیں؟"

"بارہ آنے۔"

سہیل نے بارہ آنے میز پر رکھ دئے۔ اور جب وہ بازار میں پہونچا تو اُسے خیال آیا کہ وکٹوریہ والے کو تو وہ بارہ آنے ادا کر چکا تھا لیکن اس نے سوچا کہ چلو، بلا ٹل گئی ہے، کیا ہوا اگر بارہ آنے زیادہ چلے گئے۔

سہیل کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ امرتسر میں وہ کئی لڑکیوں سے ایسی ور اس سے بھی سخت جھڑکیاں کھا چکا تھا۔ چند گھنٹوں تک اس واقعہ کا سہیل پر بہت ہی زیادہ اثر رہا لیکن جب وہ دوسرے دن مس فریا کے ہاں دوا لینے کے لئے گیا اور اُس نے دوسرے گاہکوں کی طرح اُس سے بات چیت کی تو وہ شرمندگی جس کا تھوڑا سا احساس باقی رہ گیا تھا دور ہو گئی۔

دس بارہ روز تک وہ متواتر دوا لینے کے لئے مس فریا کے ہاں جاتا رہا۔ اِس دوران میں کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے سہیل کے دماغ میں اس خفت انگیز واقعہ کی یاد تازہ ہوتی۔ اس کے بعد اس کی بہن تندرست ہو گئی اور مس فریا ایک عرصے کے لئے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

اب ایک دم بارہ تیرہ مہینے کے بعد سہیل کو اُس کا خیال آیا اور اُس نے اس سے مشورہ لینے کا ارادہ کیا: "عورت کو روپے پیسے کا بہت لالچ ہے، میرا خیال ہے کہ وہ ضرور اس معاملے میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہو جائیگی۔ اور پھر اُس واقعے کو اس بات سے کیا تعلق ہے۔ اگر وہ میرا کام کر دیگی تو میں اُسے مُنہ مانگے دام ادا کر دونگا۔"

دوسرے روز شام کو وہ مس فریا کے پاس گیا۔ سہیل کو دیکھکر اُس نے بڑے کاروباری انداز میں کہا: "بہت مدّت کے بعد تشریف لائے۔"

سہیل شادی کے بعد اب کافی تبدیل ہو چکا تھا۔ آرام سے بنچ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا: "اس دوران میں کوئی بیمار نہیں ہوا اس لئے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔"

مس فریا مسکرائی: "اب کیسے آنا ہوا؟"

سہیل نے جواب دیا: "میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا ہوں ـــ"

مس فریا نے اور زیادہ متوجہ ہو کر پوچھا: "آپ کی شادی ہو گئی؟"

"جی ہاں ـــ ہو گئی۔"

"کب ہوئی؟"

"ایک مہینہ پہلے۔"

"صرف ایک مہینہ......"

مس فریا نے کرسی پر اپنا پہلو بدلا: "کیسی ہے آپکی بیوی؟"

سہیل نے بالکل رسمی انداز میں جواب دیا: "بہت اچھی ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ...کہ...خوبصورت ہے؟ ـــ ضرور خوبصورت ہوگی۔ پنجاب کی لڑکیاں عام طور پر خوبصورت ہوتی ہیں۔"

سہیل نے مس فریا کی طرف دیکھا۔ چہرے پر اُس نے پوڈر لگا رکھا تھا جس سے رنگ بہت ہی بدنما ہو گیا تھا۔ بال خشک اور بے جان تھے۔ فراک بھی نہایت ہی بھونڈا تھا۔ جب اُس نے عائشہ کا خیال کیا تو فریا اُسے بھنگن معلوم ہوئی۔ دل ہی دل میں وہ ہنسا اور پرانا بدلہ لینے کی خاطر اُس نے کہا: "میری بیوی بہت خوبصورت ہے ـــ تم اُسے دیکھوگی تو پتہ چلے گا۔"

مس فریا نے شاید یہ بات نہ سُنی کیونکہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ "تو ایک مہینے سے تم عیش کر رہے ہو؟"

سہیل نے پھر اُسے جلانے کیلئے کہا: "انسان کو زندگی میں ایک بار ہی ایسا موقع ملتا ہے۔ کیوں نہ اس سے فائدہ اُٹھایا جائے؟"

"ہاں ہاں، ضرور فائدہ اُٹھانا چاہئے... مگر... مگر زیادہ نہیں. ... تم ضرور زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوگے" مس فریا کے لہجے میں ایک عجیب قسم کی للچاہٹ تھی۔

سہیل کو اس گفتگو میں مزہ آنے لگا۔ مسکرا کر اس نے کہا: "زیادہ سے زیادہ فائدہ کیوں نہ اُٹھایا جائے ـــ یہی وقت تو ہے کہ جی بھر کے لُطف اُٹھایا جائے۔ بیوی اچھی ہو، طبیعتیں آپس میں مل جائیں ـــ جوانی ہو، حالات سازگار ہوں۔ موسم خوشگوار ہو تو......"

مس فریا مضطرب ہو گئی۔ یہ اضطراب چھپانے کی خاطر اُس نے کہا "آپ... آپ کس قسم کا مشورہ لینے کیلئے آئے ہیں؟"

"میں اپنی بیوی کے متعلق کچھ پوچھنے آیا تھا۔"

مس فریا پھر اُسی رَو میں بہہ گئی: "میں... میں اُس کو ضرور دیکھونگی. مجھے... مجھے خوشی ہوگی...... کسے معلوم تھا کہ تم اتنی جلدی شادی کر لوگے... تمہاری زندگی میں... میرا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی میں ضرور ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی ہوگی۔"

سہیل نے جواب دیا: "تبدیلی؟ — کوئی خاص تبدیلی پیدا تو نہیں ہوئی۔ میں پہلے بھی ایسا ہی تھا — خاص فرق پڑ بھی کیا سکتا ہے — بہرحال میں خوش ہوں، بہت ہی خوش ہوں — شادی بہت اچھی چیز ہے"۔

مس ثریا نے تھوک نگل کر کہا: "کیا شادی واقعی بہت اچھی چیز ہے؟"

"بہت ہی اچھی چیز ہے — میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی شادی کر لو"۔

مس ثریا نے میز پر سے رنگین تیلیوں کا بنا ہوا جاپانی پنکھا اٹھایا اور جھلنا شروع کر دیا: "مجھے اپنی بیوی کے متعلق کچھ اور بتاؤ — یعنی تمہاری ازدواجی زندگی کیسے گذر رہی ہے... اسکے خیالات کیا ہیں؟"

ثریا کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اُسکے ہونٹ کچھ اس انداز سے باتیں کرتے وقت کھل رہے تھے کہ سہیل کو محسوس ہوا ثریا کے چہرے پر مُنہ کے بجائے ایک زخم ہے جسکے ٹانکے اُدھڑ رہے ہیں —

سہیل نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور یوں دیکھتے ہوئے وہ ایک برس پیچھے چلا گیا۔ جب اُس نے بڑی نیک نیتی سے اس عورت میں چند خوبصورتیاں تلاش کی تھیں اور اِن کا سہارا لیکر اُس سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی ایک نہایت ہی بھونڈی کوشش کی تھی۔ اب ہی عورت اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھی پنکھا جھل کر اپنا اندرونی اضطراب ہلکا کر رہی تھی۔ ایک برس اُس کے کالے چہرے اور خشک بالوں پر سے مزید سیاہی اور خشکی پیدا کئے بغیر گذر گیا تھا۔ مگر سہیل اب بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مس ثریا نے اس سے کہا: "تم کتنے تبدیل ہو گئے ہو — اب تم پورے مرد بن چکے ہو"۔

سہیل نے ثریا کی طرف دیکھا۔ اُسکی مونچھوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ اِن کو دیکھ کر اب اُس کے دل میں وہ پہلی سی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

مس ثریا نے پنکھا میز پر رکھ دیا اور کہنیاں ٹیک کر سہیل کی طرف اُن بلیوں کی طرح دیکھنے لگی جو موسمِ بہار میں مٹی میں لوٹ لگا کر اداس اداس آوازیں نکالا کرتی ہیں۔

سہیل نے پنکھے کی ایک اُکھڑی ہوئی تیلی نوچنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مس ثریا نے اُسے آہستہ سے پکڑ کر کہا: "یاد ہے تمہیں ایک دفعہ اسی طرح تم نے میرا ہاتھ دبایا تھا"۔

مس ثریا کی آواز لرزاں تھی۔

سہیل نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بڑے خشک لہجے میں کہا: "مس ثریا، تمہاری یہ حرکت بہت ہی نازیبا ہے.... دیکھو، پھر کبھی ایسا نہ کرنا"۔ یہ کہکر اُس نے اپنا بٹوہ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا اور بارہ آنے نکالکر میز پر رکھ دئے: "یہ رہا تمہارے آنے جانے کا کرایہ"۔

سہیل جب نیچے اُترا تو بازار میں چلتے ہوئے اُس نے سوچا: "جب بچّہ پیدا ہوگا تو میں اُسے اپنی گود میں اُٹھا کر مس ثریا کے پاس ضرور آؤں گا اور فخر کے ساتھ کہونگا، اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

سہیل بہت خوش تھا۔ جب اُس نے مزا لینے کی خاطر یہ سارا واقعہ دُہرایا تو آخر میں بارہ آنے آئے، جو اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نکال کر مس ثریا کی میز پر رکھے تھے: "ارے — یہ میں نے اُسے بارہ آنے کیوں دئے — یہ کرایہ کس بات کا تھا؟"

سہیل جب اس کا جواب تلاش نہ کر سکا تو بے اختیار ہنس پڑا۔

سعادت حسن منٹو

.....کہ تو عورت نہیں

عشرتوں کے مسکراتے نُور میں
تیرا انسانی وجود
جلوہ ساماں ہو رہا ہے اور ہوتا جائے گا
آئینے کے روبرو گوندھے ہوئے آوارہ بال
سُرخیوں میں پا بجولاں نرم گال
ہونٹ — سیراب تبسم شوخ آنکھیں — سرمہ پوش
اور تیرے جسم کا خاموش پُر معنی گداز
تیرا انسانی فراز
کھوکھلی روحانیت کی دُھند میں لپٹا ہُوا
معبدِ ہستی میں ہوگا جلوہ ریز
اور اس کے سامنے
سرد، سُوکھے ہونٹ پوجا کیلئے تھرّائیں گے۔
شہوت آلودہ نگاہوں کے تھکے ماندے چراغ
جھلملائیں گے — بجھیں گے — جھلملاتے جائیں گے۔

اے خداوندِ حسین
تُو ہے خوش۔ تیری خداوندی ہے خوش
اور تیرے چاہنے والے ہیں خوش
میں بھی ایک ایسا پُجاری ہوں مگر
تجھ کو چھو سکتا ہے جو
اور تیری رس بھری آواز کے آغوش میں
جذب ہو سکتا ہے جو
پھر بھی لیکن یہ سمجھتا ہے کہ تو عورت نہیں
بلکہ آوازِ پرِ پرواز ہے

دُکھ بھری۔ سنسان۔ برفانی۔ اُجاڑ
جو کسی جنگل میں سونی جھیل پر
طائرِ آبی کے اُڑ جانے کے بعد
کانپتی رہتی ہے سپنوں کی طرح —

دفتروں کے کاغذوں میں گم ہوا جاتا ہوں میں
قہوہ خانوں کے پیالوں میں گھلا جاتا ہوں میں۔
یا اندھیری رات میں
سُونے سُونے راستوں کے آس پاس
سُوکھے سُوکھے شیشموں کے اور کھمبوں کے ہجوم
دیکھتا جاتا ہوں — یونہی سوچتا جاتا ہوں میں
یا بڑھا جاتا ہوں میں
ٹوٹے پھوٹے بھورے بھورے آشیانوں کی طرف
جن کی پھیکی کپکپاتی روشنی
میرے احساسات کو دیتی ہے ترغیبِ گناہ

زندگی یونہی لٹی جاتی ہے اور
جانتا ہوں تیرا انسانی وجود
یہ نہیں میرے لئے
لیکن آوازِ پرِ پرواز سی
دُکھ بھری۔ سنسان۔ برفانی۔ اُجاڑ
میرے پیچھے آ رہی ہے...... آ رہی ہے.... آ رہی
....

وشوامتر عادلؔ

سارنگی والا

کشمیر کو جانے والی لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی سڑک پر جا رہی تھی۔ وینا کا دماغ ایم۔ اے کا امتحان دے چکنے کے بعد تھک کر سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُسے سب چیزیں پھیکی، بے رس اور بے جان سی معلوم ہوتی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں اُسے گھر جانے کی ذرا بھی خوشی نہ تھی۔ بلکہ وہ یہ چاہتی تھی، کہ ابھی کچھ دن اور لاہور ٹھہرے۔ اور میلے کچیلے کپڑے پہن کر دن بھر اُس کی گندی گلیوں میں چکر لگاتی رہے۔ لیکن وہ کشمیر میں دُور بیٹھے ہوئے اپنے ماتا پتا کی مرضی کے خلاف یہ کام نہ کر سکتی تھی۔ وہ لوگ کیا کہیں گے۔ امتحان ختم ہو چکا، لاہور میں گرمی زوروں پر ہے۔ اب بھی اگر وہ گھر آنا نہیں چاہتی، تو آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ برسوں کی ناکام اور گھٹی گھٹی جدوجہد کے بعد وینا میں اب اتنی بھی ہمت باقی نہیں رہی کہ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام کر سکے۔ کوئی نئی بات شروع کر سکے۔ اب بھلا اُسے اپنے گھر اس جسمانی غلامی کے سوا اور کونسی چیز کھینچے لئے جا رہی تھی۔ یہ سماج کی اندھی نکیل۔ ایک وقت تھا جب اس کا دل کہتا تھا کہ وہ دنیا میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے کام کر سکتی ہے۔ اور ان کے کرنے میں اُسے کسی دوسرے کی مدد درکار نہ ہوگی۔ لیکن اس کے عزیز، قریبی رشتہ داروں نے بھی اُسے کبھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ اور ہمیشہ اُسکی خودداری کے جذبے کو دباتے رہے۔ اب نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنی نگاہوں میں بھی گر گئی ہے۔ سماج کی ڈراؤنی آنکھوں نے جیسے اُس کے دل میں ایک بھاری دہشت سی پیدا کر دی ہے۔ اور اب وہ یہ سوچنے سے بھی ڈرتی ہے کہ وہ کبھی کسی کام کو سرانجام دے بھی سکتی ہے۔ اور بظاہر وہ ہمیشہ یہ دکھانا چاہتی ہے کہ اُسے سماج کے بنائے ہوئے اُصولوں کا کتنا خیال ہے۔ ایم۔ اے کا امتحان دے چکنے کے بعد بھی اُسے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو، آخر وہ ایک لڑکی ہی تو ہے۔ اُس کے ماں باپ جب چاہیں، جس سے چاہیں اس کا بیاہ کر سکتے ہیں۔ لیکن — لیکن کیا وہ ایک دفعہ بھی اپنا ماتھا اُونچا کر کے یہ نہ کہہ سکے گی کہ اُس نے اپنی ایک آدھ بات کو پورا کر کے دکھا دیا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے وینا کے جسم میں ایک جھُرجھُری سی آئی۔ اور اُس نے سوچا کہ وہ بھی باغی بن جائے۔ اور لاری کی طرح اس سیدھی سڑک پر چلنے سے انکار کر دے۔ یکایک اُسے ایک دھچکا سا لگا، اور وہ اپنی رشتے دار عورت پر جا پڑی، جو اُسکے ساتھ نشست پر بیٹھی تھی۔

لاری کی دُنیا بھی ایک عجیب دُنیا ہے۔ یعنی بالکل ہماری دُنیا کی طرح۔ لاری کی اگلی دو سیٹیں قدامت پسند لوگوں سے رُکی پڑی ہیں۔ گندے اور باتونی لوگ۔ جو ہر دو فقروں کے بعد ایک موٹی گالی جڑ دیتے ہیں۔ عورتوں میں جگہ کے لئے لڑائی بلکہ ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔ دو مرد ہیں، جو خربوزے کھاتے کھاتے چھلکے سیٹوں کے نیچے پھینکتے جا رہے ہیں۔ وینا کا اُٹارچی کیس انہی چھلکوں سے گندا ہو رہا ہے۔ اتنی گرمی میں وینا اپنی رشتے کی بہن اور اس کے بچّے کے ساتھ جُڑی ہوئی بیٹھی ہے۔ لاری کے ایک حصّے میں اناج اور کھانڈ کی بوریاں لدی پڑی ہیں۔ اور ڈرائیور نے اِن بوریوں کے اوپر بھی آنوں پیسوں کی چلتی ہوئی سواریاں جمع کر رکھی ہیں۔ جو راستے میں ایک گاؤں سے سوار ہو کر دوسرے گاؤں اُتر جاتی ہیں۔

اور ڈرائیور راستے بھر کے لئے سگرٹ، ایک ادھا اور بھُنی ہوئی مُرغی کے لئے پیسے بنا لیتا ہے۔ پھر ڈرائیور گاڑی کو اِن راہ چلتے ہوئے مسافروں کو سوار کرنے، پٹرول ڈلوانے، چُنگی دینے، اور مال لدوانے کے لئے بار بار روک لیتا ہے۔ وینا کے لئے کبھی تو سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی لاری تو ہماری دُنیا ہے۔ اور اس میں رہنے کے لئے بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ اسی لئے تو وینا چُپ چاپ بیٹھی ہے۔ اور جب اس طرح بھی کام نہیں چلتا تو اپنی رشتے دار بہن کی اَن سُنی باتوں پر زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتی ہے....

آہستہ آہستہ سلسلہ ہائے کوہ نمودار ہو رہے ہیں۔ آسمان کی نیلاہٹ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ دو ایک بادلوں کے سفید ٹکڑے بھی سڑک کے آس پاس دیہاتی بچے کھیل رہے ہیں۔ جوہڑوں میں بھینسیں کیچڑ میں لوٹ رہی ہیں۔ تپتی ہوئی دوپہر کے تیز شرارے دل چھید دیتے ہیں۔ وینا چاہتی ہے کہ یہ منظر اس کے دل کو چھو لیں۔ لیکن نہ جانے اس پر ان چیزوں کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔ راکھ میں لپٹے ہوئے ایک دو بجھتے انگارے پھر شعلہ ساماں ہونے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ ناکام کوشش......

وہی پُرانا برسوں کا جانا پہچانا راستہ ہے۔ اب تو مری کی چڑھائی

بھی شروع ہوگئی۔ لیکن گھر ابھی ایک سو ستر میل دُور ہے۔ دوسرے دن شام کو کہیں وینا وہاں پہونچے گی .... وینا کو یاد آیا کہ پچھلے سال گھر جاتے ہوئے اُس نے یہ سفر کتنی خوشی سے طے کیا تھا۔ کشمیر میں بسنت کا موسم دیکھنے کیلئے وہ راولپنڈی سے ایک کار میں چلے تھے۔ راستے میں جہاں جی چاہتا ٹھہر جاتے، جہاں جی چاہتا آگے بڑھ جاتے۔ ہنسی، مسرّت، شادمانی۔ زندگی کے اچھے دن بھی کتنے مختصر ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ سارنگی والا بھی تو یہیں کہیں ہوتا تھا۔ جس کی دہکتی تڑپتی ہوئی تانوں سے دل کے زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ ہاں شاید وہ اگلے دو پڑاؤ کے بعد آئیگا۔ پتہ نہیں وہ سارنگی والا اب وہاں ہوگا بھی یا نہیں۔ یکایک راہ کے کنارے کچھ دیکھنے کی چاہ وینا کے دل میں پیدا ہوئی اور اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن دیکھنے کے لئے جگہ کہاں تھی۔ وہ چاروں طرف سے گھری پڑی تھی۔ یکایک رشتے کی بہن کے بچے نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اور وینا نے مایوس ہو کر اپنی آنکھیں بند کرلیں اور تھوڑی ہی دیر میں اُس کا سر کبھی اپنے دائیں طرف اور کبھی اپنے بائیں طرف بیٹھی ہوئی عورتوں کے کندھوں سے ٹکرانے لگا۔ وہ کبھی کبھی جھنجلا کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اُونگھ جاتی۔

یکایک ایک جھٹکے کے ساتھ وینا کی آنکھ کھُل گئی۔ اور اُس نے دیکھا کہ لاری ایک پڑاؤ پر کھڑی ہے۔ ڈرائیور کسی مزدور سے لبس کے پہیے دھلوا رہا ہے۔ بہت سے مسافر لاری میں بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ یکایک وینا کو محسوس ہوا جیسے فضا میں کچھ تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ دوپہر کی جلن جیسے بجھ گئی ہے اور اس کی جگہ ٹھنڈک اور نمی نے لے لی ہے۔ وینا مڑکر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ ہاں وہی پانی کا پڑاؤ تھا۔ آس پاس کے دیودار کے درختوں کی گھنی چھاؤں۔ ٹھنڈے اور شفاف پانی کے دو بڑے بڑے چشمے۔ اور چائے اور قہوے والوں کی دکانیں۔ اِدھر اُدھر ہو کر وینا نے سڑک کے آر پار نظر دوڑائی۔ اس کی متلاشی نگاہیں دکانوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کے چہروں کو ٹٹولنے لگیں۔ آپ نے کچھ نہ دیکھا نہ سُنا ہی۔ وہ پانی کے پڑاؤ کے ساتھ سارنگی والے کا ایک نہ ٹوٹنے والا ناطہ ہے۔ وینا کی متلاشی نگاہیں چاروں طرف سارنگی والے کو کھوجنے لگیں۔ پھر یکایک وینا نے ایک نوجوان کو پھٹے پُرانے کپڑے پہنے سارنگی ہات میں لئے چائے کی ایک پُرانی بوسیدہ سی دُکان کے اندر بیٹھے دیکھا۔ سارنگی والا کھڑکی کی راہ سے دُور کے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لاری میں وینا کی نگاہیں شک اور یقین کے ملے جُلے جذبات سے معمور ہوگئیں۔ ہے تو وہی۔ اس بے جان خشک لکڑی کی بنی ہوئی سارنگی سے زندگی کا راگ سننے کی خواہش وینا کی آنکھوں میں چمکنے لگی۔ لیکن اتنے مسافروں کے بیچ میں اِن دو جھانکتی ہوئی آنکھوں کی خواہش کو کون سمجھے گا۔ اِسی پہاڑی راگ کو سننے کے لئے وینا کی رُوح بے چین ہو اُٹھی۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ لاری سے نیچے اُتر کر سب مرد و عورتوں کے ساتھ ایک غریب نوجوان سارنگی والے کو یہ یقین دلا سکے کہ وہ اس کی رُوح کی راگ کی زبان سمجھتی ہے۔ وہ اس کی سارنگی کو پہچانتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس کی ٹیڑھی بیڑھی میلی کچیلی اُنگلیوں کے چھونے سے ہی پُرانی سارنگی کے دل میں زندگی کا ایک نیا چشمہ اُبلنے لگتا ہے۔

اور اب تو وینا اس سارنگی کی تان سننے کے لئے اور بھی بیقرار ہوگئی۔ شاید اس سارنگی کا ایک جانسوز نغمہ اُسے بھولے بِسرے مسرّت بھرے لمحوں کی یاد دلا دے۔ وہ سوتی سوتی جاگ جائے۔ اور اس کے دل میں خوشی کا منبع پھر سے پھُوٹ پڑے۔ مگر سارنگی والے کو وہ یہ کیسے بتائے۔ سارنگی والا ایک میلی کچیلی دُکان میں بیٹھا ہوا ہے۔ لاریوں کے کلینر، قلی اور مزدور اس دُکان میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے ہیں۔ اور وینا اشراف کے طبقے کی ایک شریف گھر کی لڑکی ہے۔

سارنگی والا یکایک پہاڑ کی طرف سے اپنا منہ موڑ کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ سے اُس نے سڑک پر کھڑی ہوئی لاریوں کی طرف دیکھا۔ اچانک اُس کی اُداس آنکھوں میں ایک چمک عود کر آئی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دُکان کے برآمدے میں آکر اپنی برسوں کی پُرانی سارنگی میں سوتے ہوئے نغموں کو جگانے لگا۔ نہ جانے کس اَن بوجھی کوشش سے سارنگی سے رسیلے اور شیریں سُر دلوں میں بجنے لگے۔ وینا کی لاری چلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ غور سے دیکھنے پر بھی وینا کو کوئی ایسا آدمی نظر نہ آیا جو اس نغمے میں دلچسپی لے رہا ہو۔ یا اس غریب سارنگی والے کو دو چار پیسے دینے کا خیال رکھتا ہو۔ تب بھی سارنگی والا کسی غیر معمولی سحر کے زیر اثر ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر سارنگی بجائے چلا جا رہا تھا۔

لمحہ بھر کیلئے اس کی اُنگلیاں رُک گئیں۔ اور اُس نے جھک کر وینا کی لاری کی طرف غور سے دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس لمحے بھر میں اُس نے بہت کچھ دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب و غریب چمک پیدا ہوئی۔ اور ایک ہلکی سی حزیں مسکراہٹ اُسکے چہرے پر چھا گئی۔ اور اس وقت اس کے سدھے ہوئے ہاتھ سارنگی میں سے ایک البیلا مدھر راگ نکالنے لگے۔ جو اِس پہاڑی پردیس کی فضاؤں میں چھا سا گیا۔ وینا نے اس ایک لمحے میں بہت کچھ پالیا۔ سویا ہوا سانپ جس طرح بین کی

چغتائی کی مزاح نگاری

اُردو ادب میں نثر کی طرف عام رجحان غدر سے شروع ہوتا ہے جب زمانے کے سرد و گرم سے عام بیزاری سر سیّد کے جہادِ علمی کی دوست رہ گریاں تھی۔ مفید مطلب کتابیں لکھتے لکھتے اِن صاحبِ ہمت بزرگوں نے تحقیقی اور تنقیدی موضوعات کی طرف رجوع کیا۔ حتٰی کہ تحقیق اور سنجیدہ ریسرچ کو شبلی نعمانی رحمۃ اللہ نے اپنی بے مثل ذہانت کی بدولت خاص وقعت دی۔ رفتہ رفتہ دوسرے موضوعات توجہ بھی لوگوں کے سامنے آتے گئے۔ مولانا آزاد کے شگفتہ طرزِ تحریر کے زیرِ اثر مہدی حسن کی شوخ فطانت نثر کی رنگین مرقع کشی اور خلیقی مرحوم کی البیلی سنجیدگی کا رواج ہوا۔ بیسویں صدی نے افسانے، ڈرامے، ناول اور دوسرے سائنٹفک موضوعات کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اِسی طرح اُردو کے ایک انوکھے لکھنے والے کی بدولت پہلی بار اُردو میں مزاح نگاری نے دخل پایا۔ یہ فرحت اللہ بیگ تھے۔ جن کی بچپن کی شرارتیں، ہائی اسکول کی شوخیاں اور عام سماجی رواجوں پر طنزیں، دہلی کی ٹکسالی زبان میں ڈھل کر لوگوں کے لئے ایک زاویۂ ادب کا پیغام ثابت ہوئیں۔ ان کی دیکھا دیکھی مزاح نگاری کی رَو اُردو میں چل نکلی، اور ملّا رموزی کی بات میں بات، شوکت تھانوی کا غیر متعلق ہنسوڑ پنا، ماتھپوری کی سادہ طنزیں، سالک و حسرت کی فکاہات اور رشید کی شدید علمی مزاح نگاری نے رواج پایا۔ مرحوم عظیم بیگ بھی انہی میں سے تھے۔ مگر ان کا انداز شدید انفرادی اور موضوعات اس سے بھی داخلی تھے۔

ان کی زندگی کے متعلق کچھ کہنا زیادہ ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ وہ بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ اور علی گڑھ کی افسانوی زندگی کے ایک نمایاں کردار — جس کی عام بود و باش کے ٹکڑے ان بیشمار کتابوں میں بھی ہیں۔ مگر اس افسانوی زندگی کا ہیرو تعلیمی طور پر نہایت نیاز مند معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ مرحوم عظیم بیگ حقیقت میں بڑے ذہین طالب علم تھے۔ جنہوں نے وہاں انعامات کی لمبی چوڑی فہرستیں قبضہ میں کر رکھی تھیں۔ ایل ایل۔ بی ہونے کی بدولت انہوں نے جودھ پور میں تھا وکالت شروع کی۔ مگر جیسا کہ "شریر بیوی" اور "کولتار" سے معلوم ہوتا ہے ان کی وکالت چل نہ سکی۔ اس کی وجہ اُن کے لکھنے لکھانے کا جنون بھی ہو سکتی ہے۔ بعد کو راجپوتانہ کی ایک چھوٹی سی ریاست یعنی جاورہ کے وہ چیف جج ہو گئے۔ مگر جیسا کہ برادرم شاہد احمد کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے ان کی پرائیویٹ زندگی بڑی عُسرت سے کٹی۔ اور عام طور پر کتابوں کی آمدنی یا آخری سالوں میں ہندی کی افسانہ نگاری کے معاوضے ہی انکی ضروریات کے کفیل رہے۔ ادھر کئی سالوں سے انہیں شاید سِل کا خطرناک عارضہ تھا۔ ان کی صحت کے جو اشارے ان کی کتابوں سے اکٹھے ہو سکتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دبلے پتلے دائم المریض آدمی تھے۔ جس کو ادب کے سہارے پیٹ پالنا پڑتا تھا۔ شاہد احمد کہتے ہیں کہ اس دردِ اذیت کے گھلاؤ نے انہیں ہڈیوں کا ڈھانچ بنا دیا تھا۔ دورے پڑتے تو وہ کھانس کھانس کر نڈھال ہو جاتے تھے۔ اِن دنوں وہ ڈھیروں خون تھوکتے، اور جب طبیعت ذرا سنبھل ہوتی تو پھر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ یہی زود نویسی اُن کی ادیبانہ عمر کے مختصر ہونے کے باوجود ان سے بے شمار کتابیں، کہانیاں اور ناول لکھوا گئی!

اُن کی مزاح نویسی کے ترکیبی عناصر تو شاید بہت زیادہ ہوں کیونکہ اُن کی تصنیفات کافی ہیں۔ اور پھر یہ تصنیفات جب اس فینک سے دیکھی جائیں کہ ان کا باعث وہ تحریکات ہیں جن کی حیثیت تحلیلی طور پر لاشعوری اور واقعاتی طور پر ذہن اور ادیبانہ فن کاری ہیں تو یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے، موروثی تاثرات، والدین سے تعلقات، طفلی کی ادھوری عمل اور دبی ہوئی خواہشات، جوانی کے عشقیہ رومان، روز مرّہ کی زندگی طاقت اور کمزوری کے لحاظ سے جسمانی اور جنسی امکانات — اور ان کے علاوہ غیر شعوری نسلی یادیں یعنی قدیم تصوّرات اور احساسات ایسے بے شمار اثرات ایک ادبی تخلیق کی تربیت اور تشکیل کرتے ہیں۔ اور چغتائی کی ادبی تخلیقات تو بیحد داخلی ہیں۔ اس لئے اگر ان انداز اور قرائن سے ان کو پرکھا جائے تو اُن کی احساساتی اور ذہنی زندگی کا ایک ڈھانچ ضرور کھڑا ہو سکتا ہے۔ جس کے اجزا شوخ ذہانت، دُکھ بھری زندگی اور کمزور صحت ہیں۔ مگر یہ دُکھ بھری زندگی اور کمزور صحت اس شوخ ذہانت کی بدولت ملوثیت، پاتی تھیں۔ اور اسی لئے اُنکی تصنیفات میں المیہ کہانیاں بھی اپنے اندر مزاح کا عنصر بڑی حد تک قائم رکھتی ہیں — اس مطالعے میں ایک چیز اور بھی مشکل پیدا کر دیتی ہے کہ ان کی کتابیں اگرچہ ایک سی بنیادی اُفتاد کی حامل ہیں مگر کہیں کہیں ایک سیا

اجنبی پلٹا ([illegible]) بھی آپڑتا ہے کہ ان پر ایک عمومی تنقید لکھنے والا مشکل سے کوئی فیصلہ کن بات کہہ سکتا ہے۔ اس اشکال کی ایک صورت اور بھی ہے جو ہمیں بے لاگ تحلیل مطالعہ سے باز رکھتی ہے اور وہ یہ کہ عمر کے ایک خاص حصہ میں ہم لوگ چغتائی پر جان دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شگفتہ کتابوں کے چلتے پھرتے ہیرو اور اُن کے الفاظ میں بھٹا سی ہیروئن یا کوئی ضمنی کردار ہمیں اپنے اندر یا اپنے ماحول والوں میں سوتے جاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ انکی لچکدار زبان اور نفیس اسلوب ہمارے لئے ایک نوزائیدہ ادب کا کامیاب ہما بن نکلتا ہے۔ ان کا خاص عبارت سے گتھا ہوا پلاٹ ہمارے ذہنی تعطل کو ہمیشہ اپنی ہی مرضی سے سولی پر چڑھاتا یا آسمانوں پر لے جاتا ہے ـــــ مگر اس کے بعد جب ہمیں بھی زندگی کی مضحک رومان آفرینی سے واسطہ پڑتا ہے تو ہمیں چغتائی "[illegible]" نظر آنے لگتا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ چغتائی میں گہرائی نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں وہ چیز نہ ہو جس سے ہماری پختہ کار یا نیم پختہ کار ہمدردی مطابقت نہ کر سکنے پر مجبور ہو۔ یہی پختہ کار ہمدردی جب زیادہ علمی ادبی ہو جاتی ہے تو پھر شاید فرحت اللہ بیگ ایسے ہوشیار فن کار بھی ہیچ نظر آنے لگیں۔ یہاں ہمیں صرف ایک فن کار ٹھیک جچا دکھائی دیتا ہے اور وہ رشید ہے جس کی ذہنی اٹھانیں اتنی پیچیدہ ہیں اور لامحدود مطالعہ یا اُسکی طرّار ذہانت ہو یا اس کے برعکس ہماری برخود غلط "گہرائی" چاہنے والی تنقیدی کھجلی ـــ مگر ہوتا یہی ہے ـــ چغتائی کا سا حال انگریزی میں کم و بیش اسٹیونسن کا ہے۔ کم سے کم ایک بات میں تو دونوں ملتے جلتے ہیں۔ یعنی دلیر تخیل اور مضحک فن کاری کا ملاپ سنجیدہ پلاٹ سے ـــ مگر اسٹیونسن کو اپنی طرز ترکیب قائم کرنے میں بہت دیر لگی اور اس کا یہ طرّار انداز ایک دو کتابوں کے سوا کہیں قائم نہ رہ سکا۔ مگر چغتائی کے پلاٹ، انداز اور بانکے فقرے شروع سے لیکر آخیر تک ایک ہی سانچے میں ڈھلے نظر آتے ہیں۔ پختہ کار ہمدردی یا سنجیدہ اُفتاد کا تارا نہ بن سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چغتائی کی ذہانت میں اُپج ضرور تھی مگر اعلیٰ درجے کی فطنت نہ تھی۔ کہ وہ ٹھکا ٹھکا کر اپنی سوانی منوا سکتا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ چغتائی مضمون نگار کی بجائے پہلے افسانہ نویس تھے۔ اور بعد میں کچھ اور ـــ کیونکہ صرف مزاح تو شوکت یا نکارہ کی "حدیثِ دراز" سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ مزاح [illegible] "غلط اُفتادگی" سے ہو یا [illegible] ردّو بدل سے اور کئی دفعہ خواہ نامعقول مزاح [illegible] nonsense wit کے زمرے میں آئے ـــ مگر چغتائی نے واقعات کو نازک بنا دینے پر ہی مضحک تشکیل کی بنیاد رکھی اور مزاح کے سستے ذریعوں کو ہی بات بنانے کا واسطہ نہ بنایا۔ جہاں کہیں بھی دیکھیں پلاٹ اتنا مضبوط اور گتھا ہوا ہے اور واقعات قدرتی طور پر ہی اتنے نازک بن نکلتے ہیں کہ زبان کی چاشنی کے بغیر ہی صورت حال پر ہنسی آئے بغیر چارہ نہیں۔ یہی چیز ان کے ہاں مابہ الامتیاز ہے۔ باقی مزاح نگار، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پھبتی، مضحک تقابل یا نشست الفاظ یا ردّو بدل وغیرہ سے مزاح کی ہتھواں کو آسان کرتے ہیں۔ پلاٹ اوّل تو غیر معیّن ہوتا ہے یا سرے سے ہی مفقود ـــ اگر پلاٹ ہو بھی تو یہ مسئلہ اتنا ٹیڑھا ہوتا ہے کہ کم اُپج رکھنے والے ذہن یا محدود تخیل یا اوسط درجے کے تخلیقی تصورات سے اس کا نبھاؤ مشکل امر ہے۔ چغتائی اس معاملے میں ضرور اعلیٰ درجے کے فن کار تھے کہ پلاٹ کا نبھاؤ، کہانی کا اُتار چڑھاؤ اور نفسِ مضمون کے عروج و زوال کو بڑی چابک دستی سے تیار کرتے تھے۔ بیچ بیچ کی پھبتی، کہانی کی مضحک ارتقائی نشست، نپے تلے فقرات اور دلآویز بیان مضبوط پلاٹ کے ساتھ مل کر اُن کے ہر کارنامے کو ایک کامیاب ناول اور ایک کامیاب تفریح بنا دیتے تھے۔ اور یہی اُن کی فن کاری کی بنیادی چیز تھی۔

اب رہا پلاٹ ـــ تو انکے پلاٹ کے متعلق مندرجہ ذیل اشارے ایک تحلیلی ڈھانچ ضرور کھڑا کر سکتے ہیں۔

علیگڑھ کی یاد یا طالب علمانہ زندگی کی یاد اُن کے دل سے نہ نکلتی تھی۔ وہاں کی بے فکر کھلنڈری طبیعتیں جو زمانہ کے سرد گرم سے ابھی ناآشنا ہوتی ہیں اور جنہیں اپنی عملی شرارتوں کو کامیاب بنانے کے لئے بعض اوقات بڑی دردسری سے بھی کام لینا پڑتا ہے، انکے لئے محبوب ہیرو تھیں۔ علیگڑھ والوں کا ریل کے ملازمین کو بے مثل ستا بے ٹکٹ سفر، لاابالی افتاد سے سامان گنوا بیٹھنا، لمبی سیریں۔ ڈنر، پکنک اور پھر غل ہو جانا ـــ یہ سب مدارج انہوں نے بڑی خوبی سے نبھائے ہیں۔ اسکے ساتھ ہی وہ علیگڑھ والوں کی مخصوص نفسیاتی اُفتاد سے بھی خوب واقف تھے۔ اس لئے مقامی رنگ لئے اور گہرے داخلی مطالعے نے ان چیزوں کو اور بھی دلکش روپ بخش دیا ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی طالب علم ان کی کہانی کا مرکزی کردار ہے وہیں ہمیں شبہ پڑتا ہے کہ اس پردے کے پیچھے وہی چغتائی ہیں جو علیگڑھ میں خوش فکر کچّی یا پکّی بارک کی صحبتوں کی جان تھے۔ اسکی وجہ ہی گہری داخلیت ہے جو ہمیشہ اُنکے ایسے کرداروں کی خصوصیت ہے۔

عام دُنیا کے کردار اُن کے ہاں کم ہیں۔ طالب علم کرداروں کے ادہ اُن کے کردار کہیں تو اُن کے اپنے گھر کے آدمی معلوم ہوتے ہیں اور یں یو۔پی کے تعلقدار جو اپنے یہاں کے "طرّہ باز" ہیں۔ پھر جہاں کہیں لوگ محلِ نظر ہیں وہاں کہانی کا اُتار چڑھاؤ اور پلاٹ کی رفتار ان ہی پراسرار سازشوں کا حامل ہے جو ہر اسّے اعلیٰ طبقے کی پرائیویٹ زندگی خاصہ ہیں۔ یہاں نفسیاتی اُفتاد ہی بہت کچھ بدل جاتی ہے اور چغتائی ہاں خود بھی اپنا اصلی بانا اُتار کر عجیب "مشرقی" پردوں میں نظر آتے یں۔ ان کتابوں میں مزاح کا عنصر کم اور کہانی کا عنصر زیادہ ہے اور انہی لے زمرے میں ان کی معدودے چند المیہ کہانیاں ہیں۔ تاہم بول چال پر نثر اور واقعات میں کتربہ رنگ چھلک ہی پڑتا ہے۔ یہ تعلقدار کہیں تو سلمان ہیں اور کہیں راجپوت۔ اور دونوں کی قومیت کے فرق کے ساتھ ساتھ نفسی امتیاز اور منظر بھی علیحدہ ہوتے جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے کرداروں والی کہانیوں میں تو منظر علیگڈھ، دہلی، آگرہ وغیرہ ہیں! اور دوسری قسم کے کرداروں کے بل پر ناچتے واقعات راجستان کی شعلہ آشام طبائع اور عجیب وغریب سرزمین سے متعلق ہیں۔ ایسی کہانیوں کے واقعات کی سنجیدگی ہی ان کو چغتائی کے ناول شمار کراتی ہے اور ہلکی شق کی کتابوں کو ہلکا پھلکا ادب ـــــ حالانکہ دونوں میں ہی پلاٹ کی مضبوطی کو وہ کہیں معیار سے گرنے نہیں دیتے۔

روزمرّہ زندگی کی تلخیوں کو خوش آئند پیرائے میں ڈھالنا ن کے سوا بہت کم لکھنے والوں کا حصّہ ہے۔ ہماری ہندستانی معاشرت خواہ کتنی ہی مغرب زدہ ہوتی چلی جائے تاہم اس کے خانگی مناقشات اور پرائیویٹ تلخیاں نئے تمدّن کے غازہ میں بھی اپنا پُرانا رُوپ قائم رکھتی ہیں۔ وہی ساس بہو کا نہ مٹنے والا اختلاف، شادی بیاہ میں وہی بدمذاقی کینے۔ گھرانوں میں وہی آئے دن کی بم چخ ـــــ وغیرہ۔ مگر چغتائی نے گھریلو زندگی کو بھی اس خوش فکری اور خوش وضعی سے پیش کیا کہ گھریلو تلخیاں اور چھوٹے بڑے واقعات اکثر عظیم خاندانی مناقشات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں ہر پڑھنے والے کے لئے سماجی زندگی کا آدرش بن نکلے۔ اور خوش وضعی، تفریح، ہنسنا بولنا اور معصوم شرارتیں ہی گھریلو زندگی کے اجزائے ترکیبی نظر آنے لگے۔ گھناؤنی حقیقتیں جو محض اپنی ندواقعاتی حیثیت سے ہماری معاشرت کو بے نقاب کرنے اور اُن کا مداوا ڈھونڈنے کا دعویٰ کرتی ہیں انہیں مرغوب نہ تھیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے کردار ہمیشہ بے فکرے اور کھلنڈرے ہیں جن میں سنجیدہ طبعی کی گہرائی نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے ایسے کردار ہی اپنے بے فکرے اور کھلنڈرے پن میں ہی ان گہرائی پیش کرتے ہیں اور اچھی سنجیدہ طبائع اپنی جملہ عاقبت اندیشی کے باوجود اُن کے سامنے ماند ہوتی نظر آتی ہیں۔ اور بڑے سے بڑے خاندانی تنازعے اور پیچیدگیاں اسی بے فکری اور کھلنڈرے پن میں بڑی خوبی سے طے ہوتی معلوم ہوتی ہیں ـــــ

المناکی اور خوش فکری کے امتزاج میں مرحوم عظیم بیگ خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اس کے آئینہ دار کئی افسانے ہیں اور کئی کتابیں مگر یہ مشکل کام وہ بہت سوچ سمجھ کر سرانجام دیتے تھے۔ اس المناکی پر اُن کی داخلی تلخی کا کوئی حصّہ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ داخلی تلخی کے تشاکم نے یہ کروٹ لی ہو کہ خارجیت کا رُوپ دھار کر اپنے ہی بیان کو دوسری طبائع سے منطبق کر دیا ہو۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُن کی تلخ زندگی تو قلم سے ٹپک کر اپنی مزاح سے جیسے پڑھنے والے کو خوش کر دیتی تھی ویسے ہی ان کے دل کا غبار بھی نکال دیتی تھی۔ آلام سے بھرپور زندگی کی اُفتاد بڑی قنوطی ہو جاتی ہے خصوصاً اس نامعقول علالت کا بے رحم چنگل تو بڑے بڑے جیالوں کا حوصلہ چھڑا دیتا ہے۔ مگر چغتائی نے اس گہرے گھاؤ کی جھلکیں اپنی تحریروں میں کہیں آنے نہیں دیں۔ لوگ اِسے خلوص کا فقدان کہیں گے۔ مگر شاید ناسور کُرید کر دکھانے کی اُنہیں ہمّت نہ تھی یا اس خیال ہی سے نفرت، کہ اپنی اذیّت کے اظہار سے سننے والوں کو بھی زندگی سے بیزار کیا جائے۔ نفسیاتی طور پر ایسا آدمی خود کو بھولنا چاہتا ہے اور خوش آئند خیالوں اور آسودہ تصورات کے گھٹتے بڑھتے سایوں میں ہی جیون بتا دینا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذہین اذیّت کوش اُفتادیں بیزار کرنے کی بجائے ہنستی ہنساتی رہتی ہیں۔ یہی حال ان کا بھی ہے۔ اسی لئے اُنہوں نے اعلیٰ درجے کے رومانی ناول نویس کی بجائے نامور مزاح نگار کی حیثیت سے فروغ پایا۔

ـــــ سچ ہے؛ ع۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے!

انور مختار صدیقی؛

سہارا

آج اس کے من کے شانت ساگر میں پھر ہلچل مچ گئی تھی۔ وہ اُس سے ملنے آ رہا تھا ــــ وہ ــــ ناصر، جو اس کی اُمیدوں کا سہارا رہ چکا تھا۔ یہ آٹھ دس برس کی بات تھی ــــ اُمید حسرت بنی اور حسرتیں مٹ گئیں۔ اچانک ذکیہ کو ایک خط ملا ــــ ناصر اُس سے ملنے آ رہا تھا۔ اس کی خزاں دیدہ آرزوئیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔ ان میں اُمید کی کرن دکھائی دی۔ تاریک رات میں چاند ــــ مہ کامل نکل آیا۔ اُسے اپنا سارا گھر خوشیوں سے لبریز نظر آنے لگا۔ وہ سارے گھر کو قرینے سے سجا رہی تھی۔ خوشی پھوٹ پھوٹ کر بہی جا رہی تھی۔ چار بجے ناصر چائے پر آ رہا تھا۔ ناصر ــــ اُس کا ناصر ــــ!

ڈرائینگ روم کے وسط میں پیتل کے گملے میں اُگا ہوا پام کا پودا اسٹینڈ پر رکھا تھا۔ ذکیہ کی طرح گرمی سردی سے بے نیاز ــــ وہ اس کی طرف بڑھی۔ اُس نے پتوں کو رُخسار کے ساتھ لگا لیا۔ گرم گرم رُخسار سے اور سرد سرد پتے ــــ اُسے ٹھنڈک محسوس ہونے لگی ــــ ناصر کے کندھے پر کبھی وہ اسی طرح سر رکھ کر راحت محسوس کیا کرتی تھی۔ مگر اب تو ایک زمانہ گزر چکا تھا ــــ

نسرین اور وہ آج چار بجے ہی "مجلس علمیہ" میں جانے والی تھیں، وہ اس مجلس کی صرف سرگرم رُکن ہی نہ تھی بلکہ اس کے بانیوں میں سے تھی۔ آج اس مجلس کا ایک غیر معمولی جلسہ ہو رہا تھا جس میں ذکیہ کو بھی بولنا تھا۔ اس کی غیر معمولی ذہانت، ادبی ذوق، سلجھا ہوا مذاق، اور فن کارانہ سنجیدگی تمام مجلس میں ایک امتیاز رکھتی تھی۔ وہ تیس سال کی عمر کو پہونچ چکی تھی۔ مگر ابھی تک کنواری تھی۔ اس کی ساری توجہ علمی مشاغل کی طرف مرکوز تھی ــــ یہ مجلس اس نے خود شروع کی اور اس کی ترقی کا سارا انحصار اُس کی محنت پر تھا۔ مگر آج وہ پہلی بار اس مجلس سے غیر حاضر ہو رہی تھی۔ زندگی میں اُس نے دو بار محبت کی ــــ ایک ناصر سے جہاں وہ ناکام ہوئی، دوسری مجلس علمیہ سے۔ اب جبکہ ناصر اس کی زندگی کے تاریک اُفق پر پھر نمودار ہوا تو مجلس کی محبت جو اُس کے ٹوٹے ہوئے دل کا ایک سہارا تھا، اب اُسکی اُسے ضرورت نہ رہی تھی۔

نسرین حیران تھی کہ ذکیہ کیوں اُسے ٹال رہی ہے۔ نسرین اُسکی رازدار سہیلی تھی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ نسرین کے سہارے وہ زندگی گزار رہی تھی ــــ وہ اکیلی تھی، نسرین کا سارا خاندان نسرین کی طرح اس کی عزت کرتا تھا۔ مگر اس طویل عرصے میں اس نے پہلی بار نسرین کو ٹالنا چاہا ــــ نسرین، ذکیہ کی بیتابی، کمرے کے سامان کی تبدیلی، ذکیہ کے سُرخ کان، اور چہرے کی رنگت دیکھکر اندازہ لگا رہی تھی ــــ نسرین بھلا ٹلنے والی تھی ــــ!

"کیوں جی! کیا چھپایا جا رہا ہے؟" نسرین نے اُسے گدگداتے ہوئے پوچھا۔

"میں آج موڈ میں نہیں ہوں؟" ذکیہ نے اپنے آپ کو اس سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "نسی! آج تم مجلس میں اکیلی ہی سارا انتظام کر لینا ــــ میں ــــ میں ــــ میں، ہاں مجھے ایک کام ہے ــــ ایک مہمان آ رہا ہے، چار بجے۔"

"مہمان" نسرین نے مسکراتے ہوئے کہا "کہیں حضرت ناصر تو نہیں آ رہے جو اتنا اہتمام ہو رہا ہے اور پھر ہم سے چوری؟" نہ جانے نسرین کے مُنہ سے یہ الفاظ کیسے نکل گئے۔ حالانکہ کئی سالوں سے ذکیہ کے مُنہ پر یہ لفظ کبھی نہ آیا تھا۔ نسرین خوب جانتی تھی کہ اس ناصر کے ساتھ ذکیہ کی ہزاروں بربادیاں وابستہ تھیں۔ ذکیہ کی تباہ حالی ــــ ایک دیبہ کی ذہنی تلخیوں کا نام تھا ناصر ــــ وہ ہمیشہ اس ذکر سے بچتی رہتی مگر آج نہ جانے کیسے اُسکی زبان سے یہ نام نکل گیا۔

"ناصر ــــ ہاں" ذکیہ کی بلوریں آنکھیں نمناک ہو گئیں ــــ اس کے گال اور بھی سُرخ ہو گئے۔ کان انگاروں سے بھی زیادہ لال نظر آنے لگے۔ ذکیہ نے نسرین کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں "ہاں وہ آ رہا ہے۔ اُس نے مجھے خط لکھا ہے کہ وہ آ رہا ہے ــــ چار بجے۔"

عورت کی آنکھ زبان سے زیادہ دل کا اظہار کر سکتی ہے۔ اُن کی نگاہوں نے ایک دوسرے کو بہت سی باتیں سمجھا دیں، خاموشی کی زبان میں دل کی تمناؤں کا اظہار کر دیا گیا ــــ حیا کے پردے میں آرزوئیں اُبھر رہی تھیں ــــ نسرین کی نگاہیں اپنی کلائی کی گھڑی پر تھیں ــــ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ کم ہوتا گیا۔ پونے چار بجے وہ جا چکی تھی ــــ اچھی نسرین۔

پندرہ منٹ ــــ ان پندرہ منٹوں میں اُسے کیا کچھ کرنا تھا۔ اپنا معمولی سا سنگار، چائے کی میز کا آخری جائزہ، اپنی کتابوں کی میز کی

دیکھ بھال ـــ اور پھر آخری بار آئینہ ـــ مگر قدموں کی چاپ، تو وہ آگیا۔

ناصر کمرے میں داخل ہوا، اُس نے سرسری نظر سے سارے کمرے کا جائزہ لیا۔

"خوب! یہ آپ کی لائبریری ہے؟"

"ہاں! اور ڈرائنگ روم بھی۔"

وہ بے تکلفی سے کمرے میں گھومنے لگا۔ دیوار پر مختلف قسم کے آرٹ کی تصاویر تھیں، دستی اور کیمرہ کی تصویریں ـــ وہ اچانک رُک گیا ـــ اُس نے ایک سرد آہ بھری ـــ "مرحوم حامد! آج تم اگر زندہ ہوتے تو ـــ" وہ آگے بڑھ گیا ـــ حامد ذکیہ کا بڑا بھائی تھا اور ناصر کا کلاس فیلو، ناصر کا تعارف حامد کے ذریعہ ہوا تھا۔ حامد اور ناصر بڑے گہرے دوست تھے ـــ ذکیہ کو اسی لئے ناصر پر پورا اعتماد تھا۔ حامد کی اچانک عالم شباب میں موت نے ناصر اور ذکیہ کے تعلقات کو بڑھا دیا۔ ذکیہ آرٹ اور ادب کی دلدادہ، شعر و شاعری اور فنون لطیفہ کی شیدائی ـــ مگر ناصر دولت کا خواہش مند، تجارت کی طرف مائل ـــ یہ بعد المشرقین، اس کے باوجود ذکیہ کو ناصر سے محبت تھی، وہ مرد تھا اور مجسم مرد ـــ والہانہ محبت ـــ مگر اس کی محبت، اُس نے ایک آہ بھری۔ آج دس سال کے بعد وہ پھر مرحوم حامد کا نام لیکر پُرانی باتوں کی یاد دلا رہا تھا۔

"ذکیہ دس سال یونہی گزر گئے ـــ" گویا یہ عرصہ اُس کے لئے دس دن تھے۔

"دس سال ـــ ہاں! یونہی گزر گئے" ذکیہ نے سوچا "اسکے دس سال یونہی گزر گئے۔ مگر میرے دس سال! وہ کیسے جان سکتا تھا"

"ہاں یونہی گزر گئے" وہ بولی۔

"وہ کتنے اچھے دن تھے جب ہم تینوں ـــ حامد، تم اور میں ـــ وہ ہماری بحثیں، دلچسپ مناظرے اور گرما گرمی، مگر اب ـــ اُن دنوں کی یاد ـــ حامد کی تصویر، تم اور میں، وہی تمہاری کتابوں سے لدی ہوئی میز۔"

ذکیہ لفظ "تم" پر چونکی۔ دس سال کے بعد پھر کوئی اُسے "تم" کہکر پکار رہا تھا ـــ کوئی کون؟ ـــ ناصر ـــ وہی جس نے اُسے برباد کیا۔ وہ تاجر خاندان کا فرد تھا، وہ آرٹ، محبت اور زندگی کو لین دین کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شادی اُس کے نزدیک ایک سودا تھا۔ اُس نے ذکیہ سے شادی کرنا شاید خسارے کا سودا جانا۔ اُس نے ذکیہ کی زندگی کی پروا نہ کرتے ہوتے اپنا فائدہ مقدم خیال کیا، ـــ وہ آج پھر ذکیہ سے ملنے آیا تھا ـــ ذکیہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ اب بھی اُس کے لئے ناصر وہی پُرانا ناصر تھا۔ عورت کتنی جلدی بھول جاتی ہے۔ اُس نے اپنے برباد کرنے والے کو بھی معاف کر دیا۔

چائے کی میز پر دونوں بیٹھے کسی اور دنیا میں تھے۔ وہ پھر بے تکلف ہو گئے۔ ادب ذکیہ کا کمزور پہلو تھا۔ ناصر اس کی ادبی سرگرمیوں سے واقف تھا ـــ

"ذکو! وہ تمہارے افسانوں کا مجموعہ خوب تھا!"

"آپ نے پڑھا تھا اُن افسانوں کو؟"

"ہاں! میں نے کئی بار پڑھا اُن افسانوں کو ـــ تم تو اب خوب لکھتی ہو۔"

"خوب لکھتی ہوں" ذکیہ نے دل میں دُہرایا "تمہارے لگائے ہوئے چرکے ہی تو افسانوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں مگر تمہیں کیا معلوم!"

"مگر مجھے چنداں اس سے فائدہ نہیں ہوا" اُس نے ادب کے اقتصادی پہلو کی طرف رُخ بدلتے ہوئے کہا "ناشر کی اطلاع کے مطابق میرا یہ مجموعہ زیادہ بکا نہیں ـــ ہاں ریویو اچھے اچھے رسالوں نے کر دیا۔ ناشر کہتا ہو کہ یہ محض اس کے ذاتی رسوخ کا نتیجہ تھا!"

"تم خود چھپوا لیتیں اور پھر ـــ" وہ کسی خیال سے رُک گیا۔

"آپ کے ذریعے فروخت کا انتظام کرا لیتی۔"

ناصر اس مذاق پر خوب کھلکھلا کر ہنسا۔

چند لمحات وہ خاموش رہے ـــ ناصر، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر خاموش تھا، ذکیہ، وہ کچھ سننا چاہتی تھی اور بے تاب تھی ـــ آخر ناصر ہی بولا۔

"ذکو! تم بالکل ویسی ہی ہو جیسی آج سے ـــ" وہ مسکرایا بسکٹ کا ٹکڑا اس کے منہ میں تھا اور ذکیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"تم بالکل ویسی ہو جیسے" وہ بالکل ویسی ہی تھی ـــ وہ پھر دس برس پہلے کے زمانے میں جا چکی تھی جب وہ اور ناصر محبت کے رومان پرور ماحول میں پروان چڑھ رہے، ذکیہ ڈرائنگ روم میں سائیکی اور کیوپڈ ڈرامہ کیا کرتے۔ علمی بحثوں کے پردے میں دل کی تمناؤں کا اظہار ہوتا ـــ آرٹ کے نمونے پیش کرتے، ذکیہ، ناصر کو بتایا کرتی تھی کہ وہ بھی قدرت کے آرٹ کا بہترین نمونہ ہے ـــ ایک رات باہر بادل گرج رہے تھے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، دونوں کمرے میں آگ کے پاس بیٹھے شاعری پر گفتگو کر رہے تھے ـــ ذکیہ مجسم شعر بنی بیٹھی ناصر کو اپنے نغمات سے مسحور کر رہی تھی۔ یہ رات اُسے بھی بار بار یاد آتی تھی، پھر ناصر اُٹھا، اُس نے

ذکیہ کے سنہری بالوں کی لٹوں کو لیکر ذکیہ کی سفید گردن کے گرد حلقہ ڈال دیا۔ وہ گرہ لگا رہا تھا ــــ سفید گردن میں نیلی رگیں نمایاں ہو گئیں ــــ مگر اُسے ذرا بھی تکلیف یا دکھ محسوس نہ ہوا ــــ دکھ، ناصر کے ہاتھوں سے؟ وہ مسرور تھی، اس نے سر اُٹھا کر ناصر کی طرف دیکھا۔ وہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ ــــ آرٹ کا ایک مجسم نمونہ ــــ ذکیہ شعر اور ناصر آرٹ ــــ آرٹ اور شعر مل گئے ــــ ذکیہ کے لب خود بخود مل گئے ــــ اس نے لبوں کو دبایا ــــ

"ذکو! میں تم سے ایک مدد لینے آیا ہوں ــــ تم جانتی ہو میری بیوی مر گئی ہے ــــ پچھلے سال ہم کشمیر میں ہی تھے کہ ــــ ہاں! تو میں دوبارہ شادی ــــ"

"دوسری شادی ــــ کیا ہوا؟" اس نے سوچا۔ آخر دس سال کے بعد بھی اگر وہ کامیاب ہو جائے تو بھی خیر ــــ اس نے شادی نہ کی۔ اچھا ہوا۔ اُس کا ناصر آخر اسی کا تھا۔ سماج، والدین، کاروبار ان سب کے دباؤ میں وہ ذکیہ کو اپنا نہ سکا۔ مگر اب وہ خود مختار ہے، کاروبار کا واحد مالک، اب وہ اس کا ہے۔ اس عرصے میں اُسے کئی نوجوانوں کی طرف سے پیغامات آئے اس کی علمی قابلیت کا چرچا تھا۔ وہ سوسائٹی میں ممتاز تھی، ادبی حلقوں میں اس کا نام تھا۔ کئی نوجوان اس کے لئے اپنے آپ کو موزوں سمجھتے تھے۔ مگر ذکیہ کا آرٹ اس کے آڑے آیا اور جب بھی اس نے انہیں آرٹ کی کسوٹی پر پرکھا تو اس کے معیار پر وہ پورے نہ اُتر سکے ــــ آرٹ کی بدولت وہ دس سال سے ایک کمرے میں مقید تھی ــــ بھائی، والدین سب اُسے آرٹ کے حوالے کر کے رخصت ہوتے گئے۔ اس کا گذارہ اب صرف معمولی سی جائداد کی آمدنی پر تھا جو وہ چھوڑ گئے تھے۔ نسرین کے خاندان کی سرپرستی اور آرٹ کے لئے زندگی وقف کر کے وہ دن گذار رہی تھی۔ ــــ اُسے کئی بار خیال آیا، وہ اپنا ساتھی منتخب کر ہی لے۔ مگر آرٹ ــــ آج وہ اپنے فیصلوں پر خوش تھی۔ ناصر اور وہ ــــ اداس کمرہ خوشی سے ناچنے لگا تھا ــــ تصاویر مسکرا رہی تھیں ــــ حامد کی آنکھیں شرارت سے مسکرانے لگیں۔

"آپ! دوسری شادی ــــ" ناصر سے وہ تصدیق کر رہی تھی۔

"ہاں ذکو! بات یہ ہے کہ میرے دو بچے ہیں ــــ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔

"بچے"، وہ ان بچوں میں جائے گی۔ وہ اُسے کیسے پکاریں گے۔ "ماؤسی"۔ وہ انہیں پیار کرے گی۔ بچوں سے اُسے کتنا پیار تھا۔ نسرین کا بھتیجا وہ کتنا پیارا بچہ تھا ــــ گھر میں رونق رہے گی۔ وہ دن بھر اُن میں مصروف رہیگی ــــ یہ علمی مشاغل ــــ یہ تو محض بیکاری کا مشغلہ ہیں۔ اگر اس کی بھی شادی ہو گئی ہوتی تو آج اس کے بھی بچے ہوتے ــــ وہ ماں ہوتی ماں!"

"ــــ بچے! ان کی نگہداشت مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ کام سنبھالوں یا اُن کو لئے بیٹھا رہوں۔"

ناصر کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اُن کو لئے بیٹھا رہے، اب وہ خود اُن کی دیکھ بھال کرے گی ــــ ذکیہ ــــ ناصر کے بچے، اس کے اپنے بچے ہونگے۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر شاید میں کامیاب نہ ہو سکوں گا!"

"کامیاب نہ ہو سکوں گا!" ناصر کو ابھی تک اس پر اعتبار نہ تھا۔ ذکیہ کبھی "نہ" کہہ سکتی تھی۔ اس نے ناصر کے لئے عمر برباد کر دی تھی۔ وہ اتنے عرصے سے کنواری بیٹھی تھی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ مگر وہ ابتک بن بیاہی تھی ــــ ناصر بھی کونسا نوعمر بچہ تھا۔ وہ تو پینتیس کا ہوگا، کنوارا ــــ وہ شاید ذکیہ سے مدعا کہتے ہوئے جھجکتا تھا۔ اُسے اپنے پہلے رویئے کی وجہ سے شاید حجاب تھا ــــ کیا ہوا، انجام اچھا ہے ــــ ناصر آخر اُس کا تھا اور اس کا ہو گیا ــــ

جواب کی بجائے اُس نے صرف "اوں" کر دی۔ وہ ہمہ تن شوق بنے کچھ سُننا چاہتی تھی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا، زرد چہرہ دمکنے لگا۔ جوانی کا لہو پھر رگوں میں دوڑنے لگا۔ دبے ہوئے جذبات اُبھر آئے، آرزوئیں آباد ہو گئیں ــــ وہ مجسم خوشی بن کر تخیل کی دنیا میں حسین تتلی کی طرح اُڑنے لگی۔ کبھی خیالات کی ایک ٹہنی پر کبھی دوسری پر ــــ

"حمیدہ کو تم جانتی ہو ــــ وہ رشتے میں تمہاری بھتیجی ہے شاید ــــ اس کا باپ آج کل ہمارے شہر میں تبدیل ہو کر آیا ہے۔ ایک دعوت میں میری اس سے ملاقات ہوئی ــــ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ تمہاری رشتہ دار ہے ــــ اب ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے ــــ اب شادی ــــ ہم دونوں راضی ہیں مگر اس کے والدین نے بچوں کی اُپچ نکالی ہے ــــ"

ذکیہ کی عجیب حالت تھی۔ اُس نے ایک گھروندا تیار کیا تھا۔ دل میں کئی آرزوئیں پیدا ہوئیں کہ آندھی کے ایک طوفان نے دھڑام سے گھر کو گرا دیا۔ اس کی حالت اس مسافر کی طرح تھی جو پیاس سے بے حال ہو رہا ہو۔ اُسے پانی ملنے کی اُمید ہی باقی نہ رہے۔ اچانک دُور سے پانی دکھائی دے وہ دیوانہ وار اس کی طرف بھاگے۔ اس خیال سے کہ آخر اُسے پانی مل گیا ــــ پیاس اور تیز ہو جاتی ہے۔ وہ گرتا پڑتا پانی تک پہنچتا ہے مگر جسے وہ پانی سمجھا تھا وہ تو چمکتی ہوئی ریت تھی ــــ گرم اور خشک ــــ

زندگی کی آخری اُمید بھی ختم ہوگئی۔

ذکیہ کیا سمجھ رہی تھی اور ہوا کیا۔ گلاب سے گال مُرجھا گئے۔ اس پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔ وہ ــــ نہ جانے اُسے کیا ہوگیا۔ وہ مردہ ہوکر کرسی پر گر گئی۔

ناصر کچھ نہ سمجھا۔ اُس نے پانی کے چھینٹے دئے۔ وہ گھبرا گیا تھا۔ ذکیہ اتنے اچھے موڈ میں تھی۔ اُسے اچانک کیا ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ذکیہ نے آنکھیں کھولیں ــــ بے جان لاش کی طرح ــــ وہ اُسے گھور رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہوگیا تھا ذکو!"

"مجھے اکثر ایسا ہو جاتا ہے نہ جانے کیوں؟"

"بات تو ادھوری رہ گئی تھی ــــ" وہ رُکا۔ "تم اکیلی ہو، جمیلہ کا خیال ہے کہ اگر تم بچوں کو سنبھال لو تو میں ممنون ہونگا ــــ خیر اب تم اس قصّے کو جانے دو۔ آج تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں، میں کل بھی یہیں ہوں، کل کسی وقت آؤنگا ــــ پوری بات چیت تب ہوگی ــــ اس طرح شاید تمہاری بھی مدد کرسکوں ــــ حامد میرا بھائی ہے اور تم اُس کی بہن ہو ــــ"

ناصر جاچکا تھا اور وہ ابھی تک میز پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اکیلی، وہ خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہی تھی، چائے کا گھونٹ اس کے حلق میں کانٹے پیدا کر رہا تھا۔ چائے کی پیالی جامِ جم بن گئی۔ حامد، ناصر، جمیلہ، ان کے چہرے نمودار ہوئے، ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے ــــ پھر دو سپولے سامنے آئے ــــ دونوں ہوا میں اُڑنے لگے۔ پھر اُس کے گلے کے گرد لپٹ گئے ــــ اُسے درد محسوس ہونے لگا ــــ اس نے ایک اور گھونٹ بھرا ــــ چائے حلق میں اٹک گئی۔

شیر محمد اختر؛

غزل

کاش تیری سمجھ میں آئے یہ راز — خامشی بھی کسی کی ہے آواز
حُسن اور عشق راز اندر راز — اس سے واقف نہ غزنوی نہ ایاز
منزلیں اٹھ رہی ہیں بنکے غبار — آج دُنیا ہے مائلِ تگ و تاز
رکھ عمل سے بلند ذوقِ عمل — کارِ دنیا نہ مختصر نہ دراز
اب نہ وہ دل نہ وہ نگاہ تری — اب نہ آئینہ ہے نہ آئنہ ساز
اب مساوات حسن و عشق میں ہو — کوئی بندہ نہ کوئی بندہ نواز
کون جانے کہ اہلِ دوزخ پر — درِ جنّت ہوئے ہیں اکثر باز
رات ہے یار سے جدائی کی — موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز
اے دلِ بیقرار و جانِ سکوں — کیا ہیں تیرے دھڑکنے کے انداز
اور عالم تھا آستاں کا ترے — یوں تو جھکتی نہیں جبینِ نیاز
عشق بھی پاچلا ہے ذوقِ نظر — حسن بھی ہو چلا ہے جلوہ طراز
سبزہ بیگانہ اور لالہ دو رنگ — تو ہی اے بوئے دوست ہے دمساز
تجھکو اے حسنِ دوست، یہ تو بتا — رازِ عالم کہیں کہ عالمِ راز
اب ستارے بھی ہو چلے او جھل — ایک جنبش سی لے پرِ پرواز
موت ہے گردِ کارواں اُن کی — آرہے ہیں وہ عشق کے جانباز
ذرّہ ذرّہ کھلی حقیقت ہے — نہ کوئی راز ہے نہ پردۂ راز
چونک اٹھتا ہوں اپنے نغموں پر — میں ہوں پہچانتا تری آواز
موت بھی کھو گئی اندھیرے میں — اے شبِ ہجر تیری عمر دراز

شاید اے دوست یہ فراق کی ہو
آنسوؤں میں ڈھلی ہوئی آواز

فراق گورکھپوری؛

عورت اور حُسن

ہمارے کالج میں مسٹر آئی۔ ڈی۔ تھچر، انگریزی ادب کا معلم تھا جب کبھی شعر و نظم پڑھاتے وقت حُسن و محبت کا حوالہ آجاتا تو وہ ناک منہ چڑھا کر بڑے حقارت آمیز انداز میں اس کا ذکر کرنے لگتا۔ کبھی کہتا کہ یہ حسن ہماری بدعیب کا پلیگ ہے۔ کبھی کہتا کہ یہ خوبصورتی ایک سزا ہے جو خدا نے حوّا کی بیٹیوں کو آدم کو گندم کھانے کا مشورہ دینے کے عوض میں دی ہے۔ یہ ایک معیوب دھوکا ہے، زہر ہلاہل ہے۔ اور یہ خوبصورت عورتیں ایک قسم کی کھونٹیاں ہیں جن پر یہ چمکیلے زرق برق کپڑے لٹکائے جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہتا رہتا تھا کہ اس حُسن کا خدا کی تخلیق میں اتنا ہی کم وجود ہے جتنا نیکی کا انسان کی زندگی میں۔ یہ قدرت تو ہر قسم کی اعجوبیت، بدنمائی اور وحشت انگیزی کا بے ترتیب مرکب ہے۔ اس میں حُسن اور محبت کہاں۔ یہ گلاب، یہ کلیاں، یہ حسین چہرے سب ہماری اپنی ایجادات ہیں۔ یہ حُسن عورت نے ایجاد کیا ہے تاکہ اس ہتھیار سے وہ مرد کو غلام بنا سکے۔ یہ حُسن دماغ کی غیر موجودگی کی نشانی ہے، جتنا خوبصورت پرندہ اتنا ہی دماغ سے خالی، اور جتنی یہ عورتیں خوبصورت بننے کی کوشش کرتی جارہی ہیں اتنی ہی وہ عقل سے محروم ہوتی جائیں گی۔ کبھی وہ اس بات پر زور دینے لگتا کہ حُسن کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ عورتوں کو اسی طرح بچے پیدا کرنے ہیں جیسے چوہیا کو۔

میرے بہت سے ہم جماعتوں کا خیال تھا کہ غالباً پروفیسر صاحب کی بیوی بہت بدصورت ہے اور یہی حسرت نفرت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ کوئی انگور کھٹے ہیں کی مثال دے دیتا، کوئی اُس نکٹے کی کہانی سنانے لگتا جو اپنی ناک کٹ جانے پر اوروں کو یہ کہہ کر ناک کٹوانے کی دعوت دینے لگا تھا کہ ناک کٹوانے سے خدا نظر آجاتا ہے۔ لیکن مجھے اس لفظی گورکھ دھندے کے پس منظر میں کوئی بہت ہی سنجیدہ پُر معنی واقعہ کھٹکتا ہوا محسوس ہوا کرتا تھا جس نے حُسن سے پروفیسر صاحب کا دل کھٹا کر دیا تھا۔ مجھے یقین سا ہوگیا تھا کہ یہ باتیں سطحی نہیں بلکہ ایک جلے ہوئے پھپھولوں سے بھرے ہوئے دل کی آہیں ہیں۔

جب کبھی گفتگو کے دوران میں مَیں پروفیسر تھچر کا دل ٹٹولنے کی کوشش کرتا تو وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا۔ معنی خیز سنجیدگی سے اُٹھی ہوئی ہنسی۔ اور پھر وہ وہی اپنے پسندیدہ نوکدار فقرے اُگلنے لگتا۔ یہ حُسن سزا نہیں تو اور کیا ہے۔ ہمیشہ آئینے سے چمٹے رہنے کی سزا۔ یہ حُسن دھوکا نہیں تو کیا ہے۔ اس سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ یہ ہمیں ہر چیز سے غافل کر دیتا ہے۔“ جب وہ بنے سنورے فقرات یا مسکراہٹ کے آنچل میں اپنے احساس کو چھپانے کی کوشش کرتا تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو جاتا۔ جوں جوں وہ اُس راز کو چھپاتا جاتا میرے دل میں اُسے معلوم کرنے کا اشتیاق اُتنا ہی بڑھتا جاتا۔ کئی دفعہ میں گھوم گھام کر باتیں اُسی طرف لانے کی کوشش کرتا لیکن وہ صاف ہی کسی اور موضوع کی طرف نکل جاتا لیکن ایک دن میں نے اُسے راہ پر ڈال ہی لیا اور وہ اپنی کہانی سنانے پر تیار ہو ہی گیا۔ پہلے تو اُس نے سر نیچے لٹکا کر اپنے آپ کو ماضی کی یاد میں لپیٹ لیا پھر اُس نے آنکھوں کو میری طرف پھیر کر ہچکچاتے ہوئے مضمحل لہجے میں اپنی کہانی سُنانی شروع کی ——

”جن دنوں کا مَیں اب ذکر کر رہا ہوں اُن دنوں بھی مجھے اس نسوانی حُسن، اس رنگ و روپ میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس کی وجہ اور تھی۔ اُن دنوں مَیں عجیب سی تصوری اور مثالیت پسند حالت میں تھا۔ میرے خیال میں حُسن کا پرستار تو ہر شخص ہو سکتا ہے لیکن حُسن کی تخلیق کرنے والا امرِ خدا کبھی کبھی پیدا ہوا کرتا ہے۔ میرے سر پر اُن دنوں حُسن کا خالق بننے کا بھوت سوار تھا۔ اُن دنوں مجھے فنون لطیفہ کا بےحد شوق تھا۔ میں خود حُسن کو خلق کرنا چاہتا تھا۔ خدا کے بنائے ہوئے نسوانی حُسن سے زیادہ پائیدار حُسن۔

میں اسی کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے میں داخل ہوگیا تھا۔ اُن دنوں اُس کالج کی فورتھ ایر کلاس میں ایک انتہائی خوبصورت لڑکی پڑھا کرتی تھی۔ سیالکوٹ کی ایک بیوا کی دختر۔ وہ لاہور کے ایک گرلز ہوسٹل میں رہا کرتی تھی۔ سنیچر کی شام کو وہ سیالکوٹ چلی جایا کرتی تھی اور سوموار کی صبح لوٹ آیا کرتی تھی۔

کالج کے لڑکوں کو پڑھنا پڑھانا تو کیا تھا سب اس لڑکی سے دل لگی چھیڑ چھاڑ، عشق بازی کرتے رہتے تھے۔ اس کا حُسن بھی کچھ ایسا جاذب تھا کہ کوئی بھی اس کے طلسمی اثر سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اُس کا غیر معمولی پرکشش چہرہ تھا، آج بھی وہ صورت میری آنکھوں

کے سامنے اتنی ہی وضاحت سے گھوم رہی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ ہوا میں کسی چیز کو گھورنے اور بڑبڑانے لگا۔ بس سمجھ لو کہ رُخساروں کی جگہ دو شگفتہ پھول ہیں اور ان میں بند کلی سی لمبی تیکھی ناک۔ لمبی لمبی پلکوں میں چھپی ہوئی تیتری کے پروں کی مانند ہلکی پھلکی آنکھیں، اور گھنی گھنگریالی زلفوں میں دو دھیا مانگ ـــــ کلاس روم میں یا باہر سب کی آنکھیں اس کی طرف ہی جمی رہتی تھیں جب وہ سائیکل پر سوار ہو کر اپنے ہوسٹل کی طرف جاتی تو اس کے پیچھے پیچھے سائیکلوں کی قطاریں ہوتیں۔ لڑکے اس کے انتظار میں سائیکل اسٹینڈ پر اپنی سائیکلوں میں سے ہوا نکالتے بھرتے رہتے۔ وہ صرف گردن اوپر ابھار کر بغیر کسی کی طرف توجہ کئے ایک لطیف لاپروا مسکراہٹ کو اپنے لبوں کے خطوط پر پھیلا دیتی۔ جیسے کہنا چاہتی ہے کہ وہ جانتی ہے یہ سب کچھ کیا ہے اور کس لئے ہے۔ جب وہ سنیچر کے روز سیالکوٹ جانے لگتی تو کئی منچلے نوجوان بھی اس گاڑی میں جا سوار ہوتے۔ کوئی ایک دو اسٹیشن پہلے کوئی ایک دو اسٹیشن بعد سے لوٹ آتا۔ ہر روز اس کے پاس درجنوں خطوط آتے۔ کوئی اپنی محبت اور عقیدت کا ثبوت دیتا، کوئی خودکشی کی دھمکی دیتا، کوئی اس کی محبت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی قسمیں کھاتا۔ کوئی لکھ بھیجتا کہ وہ صرف اس کی پرستش کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔ کوئی سینما کے پاس بھیج دیتا، کوئی اپنا فوٹو۔

ایک دن اس کی ایک کاپی جماعت کے کمرے میں ہی رہ گئی جب اسے وہ واپس ملی تو چالیس سے زائد لڑکوں نے اس میں دل کے نقشے کھینچ کر اپنے اپنے نام لکھ دیئے تھے۔ سینکڑوں شعر اور بڑی بڑی فحش گالیاں لکھی ہوئی تھیں۔ اس میں ایک اِنچ جگہ بھی خالی نہیں تھی۔ اس لڑکی کا نام وینا تھا۔ ہر جگہ اس کے نام کے پہلے لفظ "وی" کا نشان ہی نظر آتا تھا۔ بلیک بورڈوں پر، دروازوں پر، ڈیسکوں پر، رومالوں پر، فاؤنٹین قلموں پر۔ نئے عاشق مزاجوں نے اپنے نام سے پہلے یہ 'وی' لگالی تھی: 'وی محمد حسن'، 'وی گوربچن سنگھ'، 'وی رام چندر'۔

اِن بیسواؤں کی لڑکیوں کے کانوں میں عموماً چھوٹی چھوٹی مرکیاں پڑی ہوئی ہوتی ہیں جو اُن کے کنوارے پنے کی نشانی ہوتی ہے۔ ایک دن ہماری جماعت کا ایک طالب علم یہ خبر لایا کہ وینا کی بہن کی اِن مرکیوں کو اُتارنے کیلئے ریاست جموں کے ایک جاگیردار نے دس ہزار روپیہ خرچ کیا ہے یہ خبر چند گھنٹوں میں ہی تمام کالج میں پھیل گئی اور لڑکے وینا پر طرح طرح کے آوازے کسنے لگے۔ اس سے چھیڑ خانی کرنے کے لئے لڑکے ویسے بھی کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیا کرتے تھے۔ ایک لڑکا کالج سے نکال بھی دیا گیا لیکن ان باتوں سے بھلا کون مانتا تھا چند لڑکے ...ٹے ہوسٹل کی دیواریں پھاندنے کی کوشش میں پکڑے گئے تھے۔ کچھ اور لڑکوں نے اُسے اغوا کرنے کی کوشش کی اور انہیں چھ چھ مہینے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ ایک دن ایک لڑکا جو وینا کا ہم جماعت تھا اور خود بھی کافی خوبصورت تھا، اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اپنا سر اس کے پاؤں پر رکھ کر گڑگڑا کر محبت کی بھیک مانگنے لگا۔ اس لڑکے کو گھسیٹ کر علیحدہ کیا گیا۔ وہ زور زور سے رونے چیخنے لگا۔ چند دن وہ بہکا بہکا پھرتا رہا۔ پھر دو دن وہ بالکل غائب رہا۔ تیسرے دن راوی کے کنارے اس کے کپڑوں میں یہ لکھا ہوا ملا کہ "سب موتوں سے ڈوب مرنا بہتر ہے، اپنے جسم سے پتھر باندھ تاکہ لاش بھی نہ ملے"۔

میرے دل میں، وینا محبت کی بجائے ایک مبہم سی نفرت پیدا کر سکی تھی۔ ایک دن بازار میں مَیں پیدل جا رہا تھا، وہ سائیکل پر میرے پاس سے گزری اور اُس کا رومال نیچے گر پڑا۔ میں نے جلدی سے لپک کر وہ رومال اُٹھا کر اُسے پکڑا دیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ میں جانتی تھی کہ تم اُسے اُٹھا کر میرے پاس بھاگے بھاگے آؤ گے میں جانتی تھی ـــــ میں از حد شرمسار ہو گیا۔ میں اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیا کرتا تھا۔ ایک دن وینا آکر مجھ سے ایک کتاب مانگنے لگی میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ کتاب نکال کر اُسے دیدی اور وہ پھر اپنے اسی مخصوص انداز میں مسکرانے لگی، جیسے کہہ رہی ہو کہ میں جانتی تھی کہ تم انکار نہیں کر سکتے ـــــ شرم سے میں پانی پانی ہو گیا۔ غصہ سے میری آنکھیں بھیگ گئیں اور ایک اضطراری کیکپی مجھ پر طاری ہو گئی۔

وینا کی خوبصورتی میرے لئے کشش کا باعث نہیں ثابت ہو سکی تھی۔ حسن سے محبت کرنے کی بجائے میں صرف اس پر اپنا فلسفہ چھانٹ سکتا تھا۔ میرے دل میں وہ اُن حسیات کو بیدار نہیں کر سکی تھی جو عموماً ایک عورت مرد کے دل میں کرتی ہے۔ میرے لئے یہ چیزیں اُن دنوں اتنی ہی غیر ضروری تھیں جتنی تیسری ٹانگ۔ بلکہ میں اس بات پر غور کیا کرتا تھا کہ اتنی خوبصورتی کے ساتھ جینا کسی کے لئے کتنا مشکل ہو گا۔ اور یہ حسن عورتوں کو کہیں سزا ہی تو نہیں ملی۔ ہر وقت یہ انہیں آئینے کی طرف ہی کھینچے رکھتا ہے اور انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر ایک آدمی کی آنکھوں میں بھی ایک آئینے کی طرح ہی دیکھتی رہیں اور ان میں اپنے حسین ہونے کا ثبوت تلاش کرتی پھریں۔ میرے دل میں یہ خیال رہ رہ کر کھٹکا کرتا تھا کہ خدا نے اس حسن کو مرد عورت دونوں کی زندگی کو اجیرن بنانے کے لئے ایجاد کیا ہو ورنہ اس کی ضرورت ہی کیا تھی جب کہ آدمی عورت کے پاس صرف اُن

جذبات کے زیر اثر جاتا ہے جو ایک حیوان کو دوسرے حیوان کی طرف کھینچتے ہیں۔"

یہ کہکر پروفیسر تھیچر، ذرا رک گیا۔ اس کا سر کندھوں میں ڈوب گیا تھا۔ وہ اپنی ناک پر سے آہستہ سے عینک اتار کر اُسکے شیشوں کو رومال سے صاف کرنے لگا۔ اس کے جذباتی حسرت انگیز چہرے پر موٹی مدھم سرخ ڈوروں بھری آنکھیں سوجے ہوئے پپوٹوں کے نیلے تکیوں پر ابھری ہوئی تھیں اور لمبے لمبے کھچڑی بھروٹوں سے چھپی ہوئی تھیں۔ وہ ایک لمبے قد کا انسان تھا اور سوکھ کر کسی خزاں دیدہ درخت کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی لمبی لمبی خمیدہ انگلیاں بڑے بے بس اور غیر ارادی طور پر کانپ رہی تھیں۔ وہ میری طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اُسے نیند سے ابھی ابھی جگایا گیا ہے۔ اُس نے اپنی انگلی سے ماتھے پر سے پسینے کی بوندوں کو نچوڑا اور سوچنے کی کوشش میں بھروٹوں کو سکیڑتے ہوئے اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"وہ دن سول نافرمانی کے دن تھے۔ ہر روز لاہور میں پکٹنگ، ہڑتالیں، گرفتاریاں ہوتیں سب کالج بند ہوجاتے لیکن ہمارا کالج کھلا رہتا کیونکہ اس میں سب لوڈیوں کے لڑکے ہی پڑھتے تھے۔ ایک دن لاہور میں عورتوں کے جلوس پر لاٹھیوں کی خوب بارش ہوئی اور بعد میں پولیس نے گولی بھی چلائی۔ اگلے دن سارے شہر میں بطور احتجاج ہڑتال تھی۔ تمام کالج بند تھے لیکن ہمارا بدستور کھلا تھا۔ یکایک وینا میں ایک تبدیلی رونما ہوگئی۔ وہ اُس ہڑتال کے روز کالج پر پکٹنگ کر رہی تھی۔ ہمارے کالج میں بھی مکمل ہڑتال رہی۔ اُس کے بعد وہ کھدر پہن کر آنے لگی۔ کالج کے بیشتر لڑکوں نے اُس کی تقلید کی۔ وہ اب تمام جلسوں اور جلوسوں میں حصّہ لینے لگی۔ اُس نے اپنی ماں کے پاس سیالکوٹ جانا بند کر دیا تھا اور وہ کالج چھوڑ کر موری دروازے کے باہر والے والنٹیر عورتوں کے کیمپ میں جا شامل ہوئی تھی اور سول نافرمانی میں پورا پورا حصّہ لینے لگی تھی۔

اُن دنوں دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی تھیں وہ جلد ہی گرفتار ہوگئی اور ڈیڑھ سال کے لئے جیل بھیجدی گئی۔ میرے دل میں اُسکے لئے جو جذبۂ نفرت تھا وہ اب احترام میں تبدیل ہوچکا تھا۔ میں اُس کی زندگی میں اس معرکہ خیز تغیر پر حیران ہوا کرتا تھا۔

ہمارے کالج میں لالہ بھاگی مل بلیکر کا لڑکا رام سہائے پڑھا کرتا تھا۔ وہ میرا ہم جماعت تھا اور وہ زنانہ جیل میں اپنی ماں سے گاہے گاہے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہاں اُس کی وینا سے بھی ملاقات ہوجایا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کی جان پہچان ایک اچھی خاصی گہری دوستی کی شکل اختیار کرنے لگی۔ وینا اب بالکل ہی تبدیل ہوچکی تھی۔ اُس نے اپنے آپکو اپنے ماضی کے زمرے سے قطعاً توڑ لیا تھا۔

گاندھی ارون معاہدہ پر جب سب رہا ہوئے تو وینا کو ایک نئی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اب اپنی ماں کی دست نگر نہیں ہونا چاہتی تھی۔ لاہور میں ایک یتیم لڑکیوں کا آشرم تھا۔ مل ملاکر لالہ بھاگی مل نے وینا کو اُس کا انچارج بنوادیا۔ وینا کالج میں پھر داخل ہوگئی۔ اور یتیم لڑکیوں کی خدمت کا کام بھی بڑی دلجوئی اور عقیدت سے کرنے لگی۔ اس وقت تک وینا اور رام سہائے کی محبت بہت گہری اور پختہ ہوچکی تھی۔ آپس میں شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ پہلے تو لالہ بھاگی مل نے اعتراض کیا لیکن اصلاح پسند ہونے کی وجہ سے جلد ہی مان گئے۔ برادری کے ٹھیکیداروں نے بھی شور مچانے کی کوشش کی لیکن کیونکہ ٹھکر امیر آدمی سے تھی اس لئے جلد ہی خاموش ہوگئے۔ لالہ بھاگی مل کو اس سے زیادہ سوشل اور سندر بہو اور کہاں مل سکتی تھی۔

یتیم لڑکیوں کا آشرم گوالمنڈی کی ایک حویلی میں تھا۔ یک منزلہ حویلی جس میں بہت بڑا دالان تھا۔ اوپر لڑکیاں رہا کرتی تھیں اور نیچے اُستانیاں اور دوسری عورتیں۔ ایک رات اس حویلی کے ایک حصّہ میں آگ لگ گئی۔ جب نیچے وینا اور دوسری عورتوں کی اوپر والی لڑکیوں اور بچوں کی چیخوں سے آنکھ کھلی تو ساری بالائی منزل آگ کے بےقابو شعلوں میں دہک رہی تھی۔ بہت سی اُستانیوں نے باہر بھاگ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ وینا نے ایک عورت کو بیرونی مدد لانے کے لئے کہا، اور خود ایک رسّا لیکر آگ سے سلگتی ہوئی سیڑھیوں سے اُوپر چڑھ گئی اور اُوپر والی لڑکیوں کو نیچے لٹکانے اور اُتارنے لگی۔ ابھی وہ تمام لڑکیوں کو نیچے اُتار نہیں سکی تھی کہ آگ اُس تک پہونچ گئی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی باقی لڑکیوں کو نیچے لٹکایا۔ اتنے میں وہ بالاخانہ جس پر وہ کھڑی تھی نیچے گر گیا۔ اور وینا آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی دھڑام سے نیچے آگری۔ اور آگ سے جھلسے جانے کے علاوہ بُری طرح زخمی بھی ہوگئی۔ اُسے جلدی جلدی ہسپتال پہونچایا گیا۔

اگلے دن سارے شہر میں وینا کی بہادری اور قربانی کا چرچا ہو رہا تھا۔ اخباروں میں اس کے حسین چہرے کی تصویریں شائع ہوئیں مرد عورتیں جوق در جوق اُسے دیکھنے آئے۔ اس کا چہرہ اور بدن پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ میں بھی ایک دفعہ اُسے دیکھنے گیا۔ رام سہائے تو دن رات وہاں بیٹھا رہتا اور اپنی محبت کے راگ الاپتا رہتا۔ باپ بیٹے دونوں

کی فخر سے گردنیں اُٹھ گئی تھیں۔ پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

اٹھارھویں دن جب وینا کے چہرے پر سے پٹیاں کھولی گئیں، تو ہم نے وہاں کسی اور ہی عورت کا چہرہ دیکھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ سب کی گردنیں نیچے لٹک گئیں۔ وینا کا چہرہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ زخموں کے داغوں، آگ سے جھلسے جانے کے نشانوں، داغوں اور جھائیوں نے اُس کے چہرے کو از حد بدشکل اور گھناؤنا بنا دیا تھا۔ دائیں گال پر کھپری سے اُبھر آئے تھے جو نیچے گردن تک پھیلے ہوئے تھے۔ بایاں گال ایسا ہو گیا تھا جیسے مٹی پر کسی بچے نے انگلیوں سے لکیریں کھینچ دی ہوں۔ ناک بالکل جھلس چکی تھی۔ دائیں آنکھ بیٹھ گئی تھی۔ ہم سب پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا ——!

وینا کے ہسپتال سے خارج ہونے میں ایک مہینہ اور باقی تھا۔ اس عرصے میں رام سہائے وہاں دو تین دفعہ اور آیا۔ پھر اُس نے آنا بالکل بند کر دیا۔ یہ سب اتنا ناگہانی تھا کہ وینا کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ اُسے تمام دُنیا ہی میں تغیر سا محسوس ہو رہا تھا۔ جس دن وینا ہسپتال سے باہر نکلی اُسی دن اُس نے رام سہائے کی کسی اور لڑکی سے شادی کی خبر اخبار میں پڑھ لی۔

یتیم خانے کی لڑکیاں جو پہلے وینا سے بے حد محبت کرتی تھیں اب اس سے بہت ڈرتی تھیں اور اس کے قریب نہیں پھٹکتی تھیں۔ وینا نے اُن سے بہت پیار کیا لیکن اُنہیں تو کسی اور ہی عورت سے محبت تھی۔ وہ اسے پہچانتی تک نہیں تھیں۔ جلد ہی وینا کو اُس نوکری سے بھی سبکدوش ہونا پڑا۔

وینا اب بالکل بیکس تھی۔ وہ اپنی ماں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اب وہاں جانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اگرچہ اس کے کانوں میں ابھی تک مرکیاں لٹک رہی تھیں ——! اس کے پاس اب ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی تمام آمدنی کو یتیم خانہ کی لڑکیوں پر ہی خرچ کر دیا کرتی تھی۔ اس کی تمام پونجی اس حویلی کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ایک دو گہنے فروخت کر کے گذارہ کرنے لگی۔ اُسنے چند اور جگہ ملازمت کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہی رہی۔

مَیں اُن دنوں اسی کالج میں لیکچرار ہو گیا تھا۔ میں نے گمنام طور پر وینا کو مالی امداد پہونچانے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بعد میں جب مجھے اس کی بیماری کی خبر ملی تو میں خود اُس سے ملنے گیا۔ میرے دل میں اس کے لئے احترام کا جذبہ دن بدن بڑھتا گیا تھا۔

جب میں اُسکے پاس پہونچا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔ اُس پر پڑی ہوئی چادر بالکل ہموار معلوم ہو رہی تھی اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ایک سوکھے ہوئے مریل سر کو تکیے پر اٹکا دیا گیا ہو۔ اُسکے بخار سے دہکتے ہوتے چہرے کے سُرخ دھبتے بڑے بھیانک طریقے سے چمک رہے تھے۔ آنکھیں بڑے دلگیر سایوں میں گھری ہوئی تھیں، جن سے اُسکے مرجھائے ہوئے چہرے کی ہڈیاں اور بھی اُبھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اُسکی آنکھیں مجھے ایک مشکوک نفرت سے دیکھنے لگیں، ایک مرجھائی ہوئی دُکھی مسکراہٹ اُسکے دانتوں میں اٹک گئی۔ اسکی آنکھوں، ماتھے اور کنپٹیوں سے پانی کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ بڑے ملال انگیز طریقے سے اس کا چہرہ غم کی وجہ سے اور بھی چپٹا اور لمبا معلوم ہونے لگا تھا اور انتہائی سنجیدہ اور مغموم عاجزی کی آئینہ داری کر رہا تھا۔

میں وینا کو اپنے ساتھ لے آیا اور وہ اُس دن سے میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ اُس کے دل پر ماضی کی ان باتوں کا کچھ اتنا زیادہ اثر پڑ چکا ہے کہ وہ بہت مجبور کرنے پر بھی گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ ابھی تک وہ اس صدمے سے اچھی طرح بحال نہیں ہوئی۔"

یہ سب کچھ پروفیسر بھیجر نے بے رُکے سُنا دیا تھا اور میں نے اسے انتہائی انہماک سے سنا تھا۔ چند ثانیوں کی اذیت خیز خاموشی کے بعد اس نے پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "ہم سب اس چہرے کی سفیدی اور بناوٹ کے مقابلے میں جسمانی و ذہنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ایسا کیوں؟ —" یہ کیوں کا لفظ پروفیسر صاحب کے حلق سے چیخ کی طرح نکلا تھا۔ شدتِ احساس سے مجبور ہو کر اُس نے اپنی گردن کو پیچھے کی طرف کرسی پر لٹکا دیا۔ میری آنکھوں کے کونے بھی آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔

شمشیر سنگھ نرولا!

کالپی

کچھ عجیب سے نام کا شہر ہے، مگر اس کو تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ شہر دریا جمنا کے کنارے کانپور سے کوئی پچاس میل دکھن کی طرف واقع ہے اور جی۔ آئی۔ پی کا ایک چھوٹا سا سنسان ریلوے اسٹیشن اسکو دنیا کے دیگر حصّوں سے ملاتا ہے۔ میں اکثر اس راستے سے گذرا اور ہر بار آتے جاتے شہر سے باہر گنبدوں کی کثرت دیکھی جو غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی سنہری روشنی میں سیاہ اور اداس دھبوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ میں سمجھ نہ سکا کہ آخر یہ گنبد کیا ہیں اور اس عجیب سے نام کے ویران شہر کو اتنی کیوں اہمیت حاصل ہے۔ یہ خیال آیا اور چلا گیا، شہر نظروں سے اوجھل ہوا اور اس کی یاد بھی دل سے محو ہو گئی۔ آج اتفاق سے کالپی میں اُترجانا پڑا۔ کوئی دو گھنٹے دن کے ملے جن میں ایک ستھرا سا ایکہ کرایہ پر لیکر اس شہر کو دیکھنے نکل پڑا۔ کالپی میں کوئی آٹھ یکے ہیں جن کے ٹٹو مریل قسم کے سُست رفتار جانور ہیں اور اُن کے چلانیوالے بھی علیٰ ہذالقیاس ایسے ہی ہیں۔ سڑکیں تنگ، ناہموار، متعفن اور اکثر جگہ ٹوٹی ہوئی ہیں۔ کہنے کو یہاں میونسپلٹی بھی ہے اور سڑک کی لالٹینیں بھی، مگر جب میں کوئی سات بجے لوٹا تو سارے شہر میں چند ٹمٹماتے ہوئے دیئے دیکھے اور کچھ بھی نہ تھا۔ بازار کا ایک حصّہ گنیش گنج میں ہے دوسرا ٹنڈن گنج میں۔ ٹنڈن گنج شہر کے آخری پچھمی حصّے میں ہے۔ یہ کوئی آدھی فرلانگ مربع زمین ہے جو بلند احاطے کی دیوار سے گھیر لی گئی ہے۔ اس احاطے کے چار بلند دروازے ہیں جو آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ بازار چھوٹا، غلیظ، خاک آلود اور گندہ ہے۔ جس میں کچھ اِدھر اُدھر کی پھٹی پُرانی چیزوں کو سمیٹ کر دُکانیں لگالی گئی ہیں اور کچھ دُکانیں تو سڑک پر چلی آئی ہیں جن کے مالک فرشِ خاک پر گوٹ مار کر بڑی بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ شہر کی منڈی ہے جس میں آس پاس کے دیہات سے غلہ کی بیل گاڑیاں لدی پھندی آتی ہیں اور شاید ہفتوں انتظار کے بعد سامان فروخت کرکے واپس لوٹتی ہیں۔

شہر کے چھوٹے بڑے متعدد محلے ہیں اور عمارتیں ایک پر ایک اس کثرت سے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ ان عمارتوں کا بیشتر حصّہ پُرانا، فرسودہ اور کھنڈر ہے۔ یہ غلط نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ کالپی ہندوستان کے اُن چند اُجڑے ہوئے شہروں میں سے ہے جن کی رونق آج سو دو سو سال پہلے ختم ہو چکی اور اس گذشتہ عظمت کی یادگاریں ابتک کھڑی نوحہ کناں ہیں۔ ہر قدم پر، جدھر دیکھئے، کھنڈر ہیں، مزارات ہیں، پُرانی حویلیوں و بارہ دری کے ٹوٹے ہوئے دروازے اور محراب ہیں، شہر پناہ کی فصیل ہے، دروازے ہیں جو کہیں جھک گئے ہیں اور کہیں زمین کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اکثر جگہوں میں پُرانی قبروں کے انبار ہیں جن کے تودے برق و باراں کے صدمے سے منتشر ہو کر دور تک پھیل گئے ہیں، مسجدیں ہیں جن کے گنبد شق، محرابیں متزلزل اور مینار ہیچ ہو گئے ہیں، مندروں کی بلند چوٹیاں ہیں جو نہ جانے کب گر کر پیوندِ زمین ہو گئی ہیں۔ الغرض شہر کیا ہے ایک وسیع قبرستان ہے جس میں چند مفلوک الحال قلاش حلوائی بنئے، جلاہے، چمار اور مہتر رہتے ہیں جن کی صورتیں قبرستان کے ان کیڑوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں جو گڑی ہوئی ہڈیوں کو کریدتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں ——،

میں کوئی تاریخ داں نہیں اور نہ مجھے اتنا وقت ہے کہ اس شہر پر کسی تاریخی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالوں۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہندوستان کی کوئی تاریخ کالپی کے ذکر سے خالی نہیں۔ یہ شہر بہت پُرانا ہے، اتنا پُرانا کہ رِشی بالمیک کی جنم بھومی بتایا جاتا ہے۔ رشی بالمیک کا زمانہ ویدکا زمانہ ہے جس کے متعلق کوئی یقین نہیں کہ یہ دو ہزار یا چار ہزار برس پُرانا ہے۔ دریا جمنا کے کنارے، کالپی سے کوئی دو میل پچھم اب تک ایک چھوٹا سا مندر ہے جہاں کا پجاری لاہی کہتا ہے کہ یہ رشی بالمیک کا جنم استھان ہے۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ یہ شہر پانچویں صدی عیسوی میں راجہ واسودیو نے آباد کیا جو کنبل کا راجہ تھا۔

یہ کنبل کہاں تھا اور اب کہاں ہے، مجھے پتہ نہیں۔ ساتویں صدی عیسوی کا مشہور چینی سیاح ہیون سانگ جس نے اپنی زندگی کے سولہ سال ہندوستان میں گذارے اور اس براعظم کے چپہ چپہ کو چھان مارا وہ کالپی کا ذکر نہیں کرتا۔ ممکن ہے وہ کالپی سے گذرا ہو مگر چونکہ یہاں بدھ دھرم کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی اس لئے ذکر نہ کیا۔ ہندوؤں کے بعد مسلمان آئے اور دلی میں پٹھانوں کی سلطنت رہی۔ ان کے زمانہ میں کالپی کو بڑی اہمیت تھی اور ملک کے اس حصّہ کا یہی خاص شہر تھا۔ شہر کے باہر جو مقبرے ہیں اُن میں سے زیادہ تعداد پٹھان بادشاہوں کے زمانہ

کی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ اُن کی اینٹ، طرزِ عمارت، گنبد کی ساخت، پتھروں پر نقش و نگار اور عمارتوں کا بھدا مگر ٹھوس ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ عمارتیں بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی ہیں۔

شہر سے کوئی دو میل باہر پچھم کی طرف، پختہ سڑک کے کنارے ایک مقبرہ ہے، جس کو یہاں کے لوگ چوراسی گنبد کہتے ہیں۔ اس کو اس نام سے کیوں پکارتے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں یہ مشہور ہے کہ یہ سکندر لودھی[1] بادشاہ اور اس کی بیگم کا مقبرہ ہے جس میں کبھی ۸۴ گنبد تھے۔ مگر تھے تو کہاں تھے؟ یہ عمارت ... اگز مربع زمین پر واقع ہے جس کے گرد احاطہ کی دیوار ہے، اس میں داخل ہونے کے چار دروازے ہیں جن پر کبھی گنبد ہونگے۔ چار گنبد اس احاطے کی دیوار کے چاروں کونے پر ہونگے۔ اس طرح آٹھ گنبد ہوئے۔ اس کے اندر مقبرے کی عمارت ہے۔ یہ عمارت ..۴ فٹ مربع زمین پر واقع ہے جس کے اندر جانے کے لئے ہر طرف سے سات محراب ہیں۔ محرابوں کے بیچ میں مرکزی بلند و بالا گنبد ہے جو گر چکا ہے۔ عمارت کے اندر دو مزار ہیں، ایک بڑا اور ایک اس کے پہلو میں چھوٹا۔ بڑا مزار غالباً بادشاہ کا ہے جس پر پتھر کی تختی ہے۔ تختی غالباً گنبد کے گرنے سے ٹوٹ گئی ہے۔ اس پر خطِ عربی میں " لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ .... نصر من اللہ و فتح ..... " لکھا ہے۔ تختی کا پتھر معمولی سنگ سُرخ ہے اور طرزِ تحریر بھی وہی ہے جو قطب مینار میں ہے۔ اس مزار کی عمارت میں بھی زیادہ سے زیادہ ۹ گنبد ہو سکتے ہیں اس طرح سے پوری عمارت میں سترہ گنبد ہوتے۔ یہ چوراسی گنبد کہاں تھے اور اب کہاں گئے؟۔

۸۴ گنبد چونے اور پتھر کی عمارت ہے جو بہت مستحکم ہے، اس کے اندر اور بھی قبریں ہیں جو نہ معلوم کن کی ہیں۔ یہ عمارت غالباً شاہی افراد کی تدفین کے لئے بنوائی گئی ہو جس طرح سکندرہ میں اکبر اعظم نے بنوائی تھی۔ عمارت کا بیرونی حصہ چونے اور مصالحہ سے پلاسٹر کیا ہوا ہے۔ مگر محراب، دروازے اور دیگر حصوں میں جو پتھر لگائے گئے ہیں وہ بہت صاف ترشے ہوئے ہیں اور اُن کے نقش و نگار زیادہ تر اقلیدسی شکل کے ہیں جن میں اکثر دائرے کے اندر پتیاں ہیں، جن کی مجموعی شکل آفتاب جیسی ہو جاتی ہے بہت نمایاں ہیں۔ یہ نقش پٹھانوں کے وقت کی عمارتوں میں بہت مقبول تھا۔ چنانچہ چندیری کی محفوظ عمارتوں میں یہ نقش بہت نمایاں ہے۔

۸۴ گنبد کے بعد سڑک سے ہٹ کر مقبروں کی ایک قطار چلی گئی ہے جن میں چھوٹے بڑے بارہ مقبرے ہیں۔ ان تک پہونچنے کیلئے پیدل چلنا پڑتا ہے۔ ان مقبروں کے چاروں طرف جنگلی بیر، ببول اور ڈھاک کی جھاڑیاں ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ مویشی اور اُن کے چرواہے اسی میدان میں رہتے ہیں یا دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے مقبروں کے اندر چلے آتے ہیں۔ ان مقبروں میں سب سے بڑا، بیربل کی بارہ دری کہلاتا ہے جس کے مرکزی بڑے گنبد کے چاروں طرف نو چھوٹے گنبد ہیں۔ میں شوق سے اس عمارت کو دیکھنے کے لئے گیا کہ دربار اکبری کے سب سے بڑے مسخرے نے اپنی بارہ دری بھی بنوائی تو مقبروں کے بیچ۔ یہ بھی اس شاہ مسخر کی ایک ستم ظریفی کا نمونہ ہے مگر میں نے اس عمارت کو جب قریب سے دیکھا تو یہ پٹھانوں کے وقت کی عمارت تھی جو بارہ دری نہیں ہے بلکہ مقبرہ ہے۔ مقبرہ کے اندر کی قبر کا کہیں نشان نہیں، فرش کے پتھر تک غائب ہو چکے ہیں۔ اور خام زمین رہ گئی ہے جہاں دھول اڑتی ہے اور کوئی گڈریا اپنی چلم گرم رکھنے کے لئے جنگلی لکڑیوں کو لاکر یہاں جلاتا ہے۔ اس مقبرے کے قریب ہی دو اور مقبرے ہیں جن کی ساخت مغلوں کے وقت کی ہے۔ عمارتیں مقابلتاً نئی ہیں اور ان کے گنبد کے نچلے حصوں میں کبھی نیلے رنگ کے خوشنما ٹائل لگے تھے۔ مقبرے کی قبریں غائب ہو چکی ہیں مگر اُن کے نشان اب تک باقی ہیں۔ کالپی کے لوگ مقبروں اور پرانی عمارتوں کے پتھر اور اینٹ چرانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ وہاں کی نئی عمارتیں بھی اس مردے کی طرح ہیں جس کو قبر سے نکال کر اور نئے کپڑے پہنا کر بازاروں میں ٹہلایا جائے۔

ان مقبروں کے قریب شہر کی عیدگاہ ہے۔ عیدگاہ کے پاس ٹوٹے مزاروں کی کثرت ہے، انہیں مزاروں کے ٹوٹے ہوئے دروازوں کے ایک پتھر کو شہر کے لوگ دودھن پیر کا مزار بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس عورت کے دودھ نہ ہو وہ اس مزار کے پتھر کو دھو کر پی لے تو فوراً دودھ اُتر آتا ہے۔ اس سے کچھ آگے سڑک ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کے اندر سے گذرتی ہے جس کے ایک طرف ایک مٹی کا تودہ ہے جس کو سید کا سر کہتے ہیں۔ اسی کے قریب ماموں بھانجے کا مزار ہے۔ الغرض اسی طرح مزاروں، قبرستانوں، اور کھنڈروں سے گذرتے ہوئے سری دروازے تک آجایئے۔ اس دروازے کے نیچے کسی مقتول راجہ کا سر دفن ہے۔ یہ دروازہ بلند، مستحکم اور بہت کشادہ ہے جس میں وقتاً فوقتاً مختلف زمانوں میں تبدیلیاں اور مرمت ہوتی رہی ہے۔ اس دروازے سے ملحق شہر کی جامع مسجد ہے جو پٹھان طرزِ عمارت کا عمدہ نمونہ ہے۔ مسجد پست اور

---

[1] سکندر لودھی اٹھائیس سال کی حکومت کے بعد ۱۵۱۷ء میں مرا اور سکندرہ میں دفن ہوا۔

تین گنبد کی کوئی سو فٹ لمبی ہے جس میں کوئی نقش و نگار نہیں۔ گنبد کی چوٹی پر پتھر کی چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہیں۔ یہ یہاں کس مصرف کے لئے بنائی گئی ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مسجد کے دونوں سِروں پر دو بلند اور نازک مینار ہیں۔ مسجد کا احاطہ بھی چھوٹا سا ہے جس کے اندر کوئی آٹھ فٹ قطر کا نہایت گہرا کنواں ہے۔ کالپی کے مسلمان بہت غریب ہیں اور جاہل بھی۔ مسجد کے کھنڈرات کو کبھی صاف کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس کے اندر سے پتھر کی تختی نکلی تھی۔ اس تختی کو مسجد کے باہر ایک دکان کے ستون پر لگا دیا ہے اور اس پر میلی مٹی کی اتنی موٹی تہ جمع ہو گئی ہے کہ کچھ پڑھا نہیں جاتا۔ میں یہاں شام کو پہونچا تھا اور میرے پاس کوئی روشنی نہ تھی اس لئے تختی کو پڑھ نہ سکا۔ مسجد کے مؤذن نے جو کوئی ستر سالہ بوڑھا تھا، کہا، حکیم صاحب کو معلوم ہے کہ اس تختی میں کیا لکھا ہے، میں حکیم صاحب کے مکان پر بھاگتا ہوا گیا کہ ان سے کچھ اور معلوم ہو مگر وہ اب تک اپنی تمباکو کی دکان سے لوٹے نہ تھے۔ اس مسجد کے قریب عظیم الشان حویلیوں کے کھنڈرات ہیں جو اس محلہ کے رہنے والے جوہریوں اور سناروں کی تھیں۔

پٹھانوں کے بعد مغلوں کا زمانہ آیا۔ اکبر اعظم کا زمانہ کالپی کیلئے سنہری زمانہ تھا۔ جب اس کی خاک سے راجہ بیربل پیدا ہوئے۔ ان کو اکبر کے مزاج میں جو دخل تھا وہ معلوم ہے، چنانچہ انہوں نے کالپی میں اپنی بیگمات کے لئے ایک محل تیار کرایا جو ابتک رنگ محل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت مرزا منڈی محلہ میں واقع ہے۔ اور اس کے کھنڈرات اب تک اس کی گذشتہ عظمتوں کی یاد دلا رہے ہیں۔ کبھی اس میں بیربل کی بیگمات رہتی تھیں مگر ان پر کنجروں کا قبضہ ہے جو دن کو بکریاں چراتے ہیں اور رات کو اس میں آکر کھانا پکاتے ہیں اور سو رہتے ہیں۔ اس عمارت کی نزاکت، صاف ستھری ترا شِر اور نقش و نگار کے جو حصے بچ رہے ہیں وہ دیکھنے کی چیز ہیں۔ اکبر اعظم کے وقت میں کالپی میں تانبے کے سکوں کا ٹکسال تھا اور یہاں مصری اور کاغذ نہایت اعلیٰ قسم کے تیار ہوتے تھے۔ یہاں کی مٹھائیوں میں گجیا بھی ایک مٹھائی ہے جو کبھی بہت مشہور تھی اور اب بھی بنتی ہے۔ مجھے تو یہ کھوئے کی ایک نہایت گندہ قسم کی مٹھائی معلوم ہوئی جس کو میں نے سوغات کے طور پر بھی خریدنا منظور نہ کیا۔ کاغذ یہاں اب بھی بنتے ہیں مگر برائے نام مصری بنانے والوں کی اولاد موجود ہے اور ان کے مال کا کوئی گاہک نہیں۔

مغلوں کے بعد مرہٹوں اور طوائف الملوکی کا دور آیا۔ جب ہر چیز لٹ گئی، ہر شخص بچھڑ گیا اور زمانہ روشنی سے تاریکی میں آ گیا۔ دریا جمنا کے کنارے شہر سے ملحق قلعہ ہے جس میں اب ڈاک بنگلہ ہے اور محکمہ جنگلات کا دفتر۔ محکمہ جنگلات کا دفتر جس عمارت میں ہے وہ مغلیہ دور کی معلوم ہوتی ہے جس کی دیواریں کم از کم دس فٹ موٹی ہیں۔ یہ عمارت نہایت بلند مقام پر واقع ہے جس کے کوئی دو سو فٹ نیچے دریا جمنا بہتا ہے۔ دریا جمنا کے چوڑے چکلے سینے پر ریلوے کا عظیم الشان پل ہے جو دس دیو پیکر ستونوں پر قائم ہے اور انسانی دست قدرت کا نہایت اچھا نمونہ ہے۔ اس قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ رہا اور ۱۸۵۷ء کے غدر میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی، تانتیا توپی، راؤ صاحب اور نواب باندہ نے مل کر دس ہزار کی جمعیت سے انگریزوں کا مقابلہ کیا مگر یہ مقابلہ برائے نام تھا۔ اس فوج کا ہر شخص خود سر انسان تھا چشم زدن میں اس فوج کا تختہ اُلٹ گیا۔ اور اس بہادر رانی کو بھاگ کر گوالیار جانا پڑا جہاں اُس نے اپنے ملک اور حقوق کی حفاظت میں جان دیدی۔ یہ جنگ پہلے اسی قلعہ سے لڑی گئی پھر قلعہ سے باہر اور آخر میں جمنا کے دونوں کناروں پر۔ ۲۳ مئی ۱۸۵۸ء کو سر ہیو روز نے، جو بعد میں اسی کارنامے کے عوض میں لارڈ اسٹارٹ بیرن بنائے گئے، کالپی کے قرب و جوار میں ہندوستانیوں کی آخری جدوجہد کا خاتمہ کیا۔

اس وقت سے لیکر آج تک کالپی انگریزی حکومت میں ہے اور ضلع جالون (اوری) کی ایک تحصیل ہے۔ یہاں کی فارغ البالی، صنعت و حرفت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا اور یہاں کے فارغ البال اور خوش حال لوگ ہمیشہ کے لئے زیر زمین چلے گئے۔ کالپی کا تذکرہ نامکمل رہیگا اگر یہاں کے ایک مینار کا ذکر نہ کر دوں جس کو یہاں کے لوگ لنکا کہتے ہیں۔ یہ مینار کوئی سو فٹ بلند ہے جس کے اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہیں اور چونکہ یہ شہر کے بلند مقام پر واقع ہے اس لئے اس کی بلندی سے سارے شہر کا نہایت خوبصورت نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کو بابو متھرا پرشاد نگم ایک مقامی وکیل نے آج سے ۷۰ سال پہلے تعمیر کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بابو صاحب کو اپنے مکان کی تعمیر کے وقت ایک دفینہ ملا اور چونکہ آپ سری رامچندر جی کے بھگت تھے اس لئے اس رقم کو اس مینار اور اس سے ملحق مندر کے بنوانے میں صرف کر دیا۔ سارے مینار پر مختلف قسم کی مورتیاں بنی ہیں۔ جو اُن تمام اصحاب کو دکھاتی ہیں جو لنکا کی فتح کے وقت رامچندر جی کے ساتھ تھے۔ مورتیوں کے بیچ میں کوئی ۴۰ فٹ بلند مورتی راون کی ہے جس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر ہنومان جی نے اس کی ٹانگوں کو اپنی مضبوط گرفت میں کر لیا ہے۔ راون کے قریب اس کا لڑکا پرہاست ہے اور اسی کے قریب انگد کی مورتی

ہیں. مینار میں چھوٹے چھوٹے بندروں کی بھی مورتیاں ہیں۔ اس مینار سے ملحق ایک چھوٹا سا مندر ہے جس میں بچے کی مورتی ہے۔ مندر کے احاطے پر سیاہ سانپوں کی لمبی مورتی ہے جو بجائے خود ریلنگ کا کام دیتی ہے۔ اس سانپ کو شیش جی کا اوتار بتاتے ہیں۔ احاطہ اور مندر کی دیوار پر سینکڑوں چھوٹی چھوٹی سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کی مورتیاں ہیں جن کو ہندو دھرم سے تعلق ہے۔ (گمگشتہ اور ریگ کی مورتیاں.)

الغرض کالپی کچھ عجیب درد بھری داستان سناتا ہے جسکو سننے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ میں شہر میں کوئی تین گھنٹے یکہ پر گھومتا رہا، دل بڑا غمگین ہوا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور زبان نے کہا: اللہ اللہ ہم کیا تھے اور آج کیا ہو گئے۔ پہلے اسی دیس میں دودھ کی ندیاں بہتی تھیں اور آج پینے کو ٹھنڈا پانی بھی نہیں ملتا۔

محمد نصیر الدین

سارنگی والا

(بسلسلۂ صفحہ ۳۸)

دھن سنکر اپنا پھن اٹھا کر جھومنے لگتا ہے۔ اسی طرح وینا کا مچلتا ہوا دل نغمے کی لہروں میں ہلکورے لینے لگا۔ اس کے سوئے ہوئے سپنے اس ایک لمحے کے لئے گویا پھر جاگ اٹھے۔ وینا سوچنے لگی کہ اس سارنگی کے سُروں میں کیسی آگ بھری ہوئی ہے۔ لیکن پڑاؤ کے سبھی کام پہلے کی طرح جاری تھے۔ گویا مسافروں کے لئے سارنگی کے نغمے کا وجود ہی نہ تھا۔ ڈرائیور گاڑی دھلا چکا تھا۔ قلی لوگ پتھروں پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ کلینر انہیں آوازیں دینے لگا۔ سب مسافر پہلے کی طرح گھبراتے ہوئے لاری میں بیٹھے تھے۔ ڈرائیور نے ہارن دیا۔ انجن سے بڑے زور سے آواز نکلی اور لاری چل پڑی۔

سارنگی والے کو جیسے ایک دم ہوش آیا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں ایک بار اوپر کو اٹھیں اور وینا کی آنکھوں تک پہونچکر پھر نیچی ہو گئیں۔ اسی لمحے اس کا دایاں ہاتھ سارنگی کا گز چھوڑ کر ماتھے پر گیا۔ اور پھر ماتھا بھی جھک گیا......

چلتی ہوئی لاری سے وینا نے مڑکر دیکھا کہ سارنگی والا غور سے اُن پہاڑوں کی طرف دیکھ رہا ہے؛ جو دور مغربی افق تک پھیلے ہوئے ہیں...

سنتوش کیشیپ

محسوساتِ ماہر

اب سے کچھ دن پہلے "غزل" کے خلاف ہنگامہ بپا ہوا، اُسکے بعد قافیہ و ردیف کی قید سے آزاد نظمیں کہی گئیں اور اب تو "ترقی یافتہ نظموں" کیلئے "بحر و وزن" کی بھی ضرورت نہیں رہی، اگر اس "انقلاب و ترقی" کی رفتار کا یہی عالم رہا، اور اربابِ ذوق اس "ترقی" (دُنیا میں شاید ہی کوئی لفظ اس قدر متضاد معنویت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہو — فریاد) کو گوارا کرتے رہے تو اس انقلابی کوشش کا انجام اُردو زبان کیلئے جسقدر تباہ کُن ثابت ہوگا اسکے تصوّر سے میرے وجدان کو پسینہ آجاتا ہے۔ کاش! لوگ "جدت و تنوع" اور "بد مذاقی" میں امتیاز کر سکتے!

"غزل" اُردو ادب کا نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے، جس سے ہم زندگی کی کسی منزل میں بھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ یہ کہنا اصولِ نفسیات سے بیخبری کا ثبوت ہے کہ "وصل و ہجر" کی باتیں پُرانی ہو گئی ہیں۔ "وصل و ہجر" کبھی پُرانے نہیں ہو سکتے، ہر انسان "وصل نو" اور "ہجر جدید" کا حامل ہے اور یہ لذتیں بلکہ حقیقتیں کبھی پُرانی نہیں ہوتیں

اگر فطرت کا ہر انداز بیباکانہ ہو جائے
ہجومِ رنگ و بُو سے آدمی دیوانہ ہو جائے

کرم کیسا، ستم سے بھی نہ وہ بیگانہ ہو جائے
میں ڈرتا ہوں محبت میں کہیں ایسا نہ ہو جائے

مجھے اُس انجمن میں بار پاکر اب یہ خدشہ ہے
مرا اندازِ بے تابی نہ گستاخانہ ہو جائے

نگاہِ مستِ ساقی اک طلسمِ رنگ و مستی ہے
کہیں پیمانہ بن جائے، کہیں میخانہ ہو جائے

یہاں بھی کچھ نگاہیں تشنۂ دیدار ہیں ساقی!
ادھر بھی ایک دورِ نرگسِ مستانہ ہو جائے

میں کہتا ہوں نہ تم پیغام بھیجو اپنے آنے کا
اسی دھوکے میں بیمارِ الم اچھا نہ ہو جائے

میں اُس محفل کی تہمت کس طرح آخر اُٹھاؤنگا
خموشی بھی جہاں افسانہ در افسانہ ہو جائے

نقاب اُلٹے ہوئے اک روز گر وہ خود چلے آئیں
سیہ خانہ مرا ماہرؔ، تجلی خانہ ہو جائے

ماہر

لبِ جوئبارے

ایک ہی پل کے لئے بیٹھ کے پھر اُٹھ بیٹھی
آنکھ نے صرف یہ دیکھا کہ نشستہ بُت ہے
یہ بصارت کو نہ تھی تاب کہ وہ دیکھ سکے
کیسے تلوار چلی، کیسے زمیں کا سینہ
ایک لمحے کے لئے چشمے کی مانند بنا۔

پیچ کھاتے ہوئے یہ لہر اُٹھی دل میں مرے
کاش یہ جھاڑیاں اِک سلسلۂ کوہ بنیں۔
دامنِ کوہ میں مَیں جا کے ستادہ ہو جاؤں۔
ایسی اَن ہونی جو ہو جائے تو کیوں یہ بھی نہ ہو:
خشک پتّوں کا زمیں پر جو بچھا ہے بستر
وہ بھی اک ساز بنے — ساز تو ہے، ساز تو ہے'
نغمۂ بیدار ہوا تھا جو ابھی، کان ترے
کیوں اسے سُن نہ سکے؟ سننے سے مجبور رہے'
پردۂ چشم نے صرف ایک نشستہ بُت کو
ذہن کے دائرۂ خاص میں مرکوز لیا۔

یاد آتا ہے مجھے — کان ہوئے تھے بیدار
خشک پتّوں سے جب آئی تھی تڑپنے کی صدا
اور دامن کی ہر اک لہر چمک اٹھی تھی،
پڑ رہا تھا اُسی تلوار کا سایہ شاید
جو نکل آئی تھی اک پل میں نہاں خانے سے
جیسے بے ساختہ انداز میں بجلی چمکے۔

لیکن اُس دامنِ آلودہ کی ہر لہر مٹی
جل پری دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہوئی
میں ستادہ ہی رہا، میں نے نہ دیکھا (افسوس)
کیسے تلوار چلی، کیسے زمیں کا سینہ
ایک لمحے کے لئے چشمے کی مانند بنا۔

دامنِ کوہ میں استادہ نہیں ہوں اس وقت
جھاڑیاں سلسلۂ کوہ نہیں، یہ وہ ہیں
جس کے اُس پار جھلکتا نظر آتا ہے مجھے
منظرِ انجان، اچھوتی سی دلہن کی صورت۔

ہاں، تصوّر کو میں اب اپنے بنا کر دولھا
اسی پردے کے نہاں خانے میں لے جاؤں گا
کیسے تلوار چلی، کیسے زمیں کا سینہ،
دلِ بے تاب کی مانند تڑپ اُٹھا تھا؟
ایک بے ساختہ انداز میں، بجلی کی طرح
جل پری گوشۂ خلوت سے نکل آئی تھی!
زندگی گرم تھی ہر بوند میں، آبی پاؤں
خشک پتّوں پہ پھسلتے ہوئے جا پہنچے تھے
میں بھی موجود تھا — اک کرمکِ بے نام و نشاں
میں نے دیکھا کہ گھٹا شق ہوئی، دھارا نکلی
برق رفتاری سے اک تیر کماں نے چھوڑا،
اور وہ خم کھا کے لچکتا ہوا، تھرّا کے گرا
قلۂ کوہ سے گرتے ہوئے پتھر کی طرح
کوئی بھی روک نہ تھی اس کیلئے۔ اس کیلئے
خشک پتّوں کا زمیں پر ہی بچھا تھا بستر
اُسی بستر پہ وہ انجان پری لیٹ گئی!
اور میں، کرمکِ بے نام، گھٹا کی صورت
اِسی امید میں تکتا رہا، تکتا ہی رہا
اب، اسی وقت، کوئی جل کی پری آ جائے
سنہری ہاتھ میں لیکر میں گھٹا بن جاؤں

جل پری آئے کہاں سے؟ وہ اُسی بستر پر
میں نے دیکھا ابھی آسودہ ہوئی، لیٹ گئی
لیکن افسوس کہ میں اب بھی کھڑا ہوں تنہا
ہاتھ آلودہ ہے، نمدار ہے، دھندلی ہے نظر
ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو تو نہیں پونچھے تھے!

(میراجی)

بے رنگ و بو

میری زندگی ایک لق و دق صحرا کی مانند ہے جو تمام عمر صرف تشنۂ لب ہی نہیں، بلکہ واقعات اُسے اُسی طرح جلاتے اور تڑپاتے رہے جس طرح آفتاب کی حرارت خیز و تپش انگیز شعاعیں صحرا کے سینے پر آگ برساتی ہیں۔ میری پیاسی اُمنگیں، صحرا کے بگولوں کی طرح اُٹھیں، آوارہ ابر کے ٹکڑوں کا تعاقب کیا، مگر ناکام رہیں۔ میری آرزوئیں ایک پیاسے مسافر کی طرح سراب کی طرف آندھی بنکر دوڑیں، مگر نامراد رہیں۔

جب کبھی میں اپنے رہ گذرِ ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو وہ مجھے ایک ریگستانی راستہ نظر آتا ہے، جہاں بگولے پیچ و خم کھاتے ہیں۔ جہاں آندھیاں قہقہہ مارتی ہیں، جو دُور تک ایک صحرائے عظیم میں بل کھاتا ہوا، لہراتا ہوا ماضی کے گرد و غبار میں پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرا سفر بے منزل رہا ——— اور معلوم نہیں مسافر کی منزل کہاں ہو گی ؟ —

میرے والد شہر کے کھاتے پیتے لوگوں میں سے تھے۔ مجھے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی کمی نہ تھی۔ مجھے اپنی والدہ کا خیال بھی نہیں ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمیشہ سوتیلی والدہ کی جھڑکیاں سنتا رہا ہوں۔ والد کو اپنے کاروبار سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ میری طرف توجہ کرتے۔ آج تک کسی نے میری پیشانی کا بوسہ نہیں لیا۔ سوائے اس لڑکی کے جس نے آج سے دو ماہ قبل ہسپتال میں، اپنی اس حرکت سے کچھ مدت کیلئے مجھے موت کے مُنہ سے بچا لیا تھا۔

رُوح کی غذا محبت ہے، رُوح ایک پودا ہے، جس کو محبت کے پانی سے سینچا جاتا ہے۔ اگر بچپن میں پودے کی اچھی طرح پرورش نہ کی گئی تو یہ کمی اس کی زندگی کا جُزو بن جاتی ہے۔ بچپن میں انسان کو محبت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میرا بچپن محبت سے خالی تھا، میری رُوح کو اُس کی غذا نہیں ملی۔ یہ تشنگی میری ہستی کا جُزو ہو کر رہ گئی۔ مجھے ہمیشہ محبت کی تلاش رہی۔ جہاں بھی مجھے محبت کا گمان ہوتا میں اُس طرف اس طرح کھنچتا جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ — میری حالت اُس گم گشتۂ راہ مسافر کی سی تھی جو برسات کو راستہ بھول کر تاریک جنگلات میں گھوم رہا ہو اور ایک جگنو کو یہ سمجھ کر تلاش کر رہا ہو کہ شاید اس نے کسی جھونپڑی کا دیا دیکھا ہے۔

میری تاریک زندگی میں بھی بہت سے جگنو چمکے اور میں فریب کھاتا رہا۔ کسی آستان پر پہونچنے کی بجائے ہمیشہ تاریکی میں اُلجھتا چلا گیا۔

میں بھوکا تھا محبت کا ——— محبت کے اُن ملکوتی نغموں کا جو انسان کی رُوح پر ایسی کیفیت طاری کر دیتے ہیں کہ وہ ستاروں کی بستی میں جا پہونچتا ہے ——— میں پیاسا تھا اُس کیف انگیز، خمار آلود شراب کا جو آنکھ پلاتی ہے اور دل پیتا ہے ——— میں مضطرب تھا اُن سرمدی راگوں کے سننے کا جو دل کے ساز پر نظروں کی مضراب سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

میں محبت چاہتا تھا۔ میں محبت کا جویا تھا۔ مگر مجھے دُنیا میں محبت کہیں بھی نہیں ملی۔ نہ والدین کے نہ بھائی بہنوں کے پاس۔ نہ عزیز و اقارب کے نہ دوست و احباب کے پاس۔ میری زندگی ایک تشنہ زندگی تھی۔ ایک ندی جو ہمیشہ خشک رہی۔ ایک چشمہ جس کی سوتیں کبھی نہ کھلیں۔ ایک درخت، جو جڑ کو پانی نہ ملنے کی وجہ سے سوکھ گیا۔

میری حیاتِ ماضی کا مرقع میرے سینے میں دفن ہے۔ کبھی کبھی میں اُس کے شیرازے کو بکھیر دیتا ہوں۔ ورق ورق پریشان ہو جاتا ہے۔ میرے تصوّر کے سامنے بہت سی تصاویر کانپتی ہوئی، ناچتی ہوئی آتی ہیں۔ میں اُنہیں پہچاننے لگتا ہوں ——— یہ ریحانہ ہے ——— یہ میرے اسکول کے ماسٹر ——— یہ ناہید ——— یہ میرے دوست عشرت ——— یہ برجیس ——— اور یہ وہ، سفید پوش حور شمائل نرس، جس نے میری پیشانی کا بوسہ لیا تھا۔

ریحانہ ——— میرے پڑوس میں رہتی تھی۔ مجھ سے تین سال بڑی تھی۔ بچپن میں میرا زیادہ وقت اُسکے ساتھ گذرتا تھا۔ اکثر ہم لڑ لیتے، مگر پھر ملاپ ہو جاتا۔ وہ مجھے تنگ کرتی، چھیڑتی، ستاتی، مگر میں پھر بھی اُسکے ساتھ کھیلنا پسند کرتا تھا۔ ایک نامعلوم کشش مجھے اس کی طرف کشاں کشاں کھینچے لئے جاتی تھی۔ اسکول کے زمانے میں وہ مجھے پڑھاتی، میرے سوالات حل کر دیتی ——— میرا دل چاہتا تھا کہ ہمیشہ اُس کے پاس رہوں۔ اور وہ مجھ سے کبھی جدا نہ ہو۔ مگر ایسا کیونکر ہو سکتا تھا؟ ——— اُسے ایک دن مجھ سے جدا ہونا تھا۔ آخر وہ گھڑی آن پہونچی۔ مجھے بہت دُکھ ہوا۔ مجھے ایسا

محسوس ہوا کہ جیسے کوئی میرے جسم سے میری روح کھینچ رہا ہو ـــ مگر سب بیکار تھا۔ میں گھر میں پڑا روتا رہا۔ اور پڑوس میں شادیانے بج رہے تھے۔

یہ میرے اسکول ماسٹر ہیں۔ انہیں صرف اُن لڑکوں سے اُلفت تھی جو انہیں روپیہ دیکر نجی طور پر ان سے پڑھا کرتے تھے۔ جو بیچارے غریب روپیہ نہیں دے سکتے تھے، وہ ہمیشہ اُن کی نظرِ التفات کے محتاج رہے۔

میرے والد کو میری تعلیم و تربیت سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ مجھے ہر سال کامیاب ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں یہی آرزو رہتی تھی کہ ہر سال اُن کا لڑکا امتحان پاس کیا کرے کہ انہیں اپنے دوست اور احباب میں اپنے برخوردار کی اس کامیابی پر فخر و ناز کرنے کا موقع ملے۔

دوستوں کے معاملے میں بھی میں بہت بدنصیب رہا ہوں۔ اِس زمانے میں دوست اُس شخص کو بہت میسر آتے ہیں جو اُن کی خاطر و تواضع کا بار آسانی سے اٹھا سکتا ہے۔

ناہید ـــ ناہید میری ویران زندگی میں کچھ اس طرح آکر حائل ہوگئی جیسے ــ کوئی تو دل کی آگ پر پنکھا سا جھل گیا ـ خشک کھیتوں پر ایک جھلا برس گیا۔ سوکھی ندی میں سیلاب آگیا ـ ناہید کالج میں میرے ساتھ داخل ہوئی۔ سہ ماہی امتحان کے بعد ایک مضمون کی کاپی اُس نے دیکھنے کے لئے مانگی، جس میں مجھے سب سے زیادہ نمبر ملے تھے۔ ہمارے تعلقات بڑھنے لگے۔ میری فطری کمزوریوں نے رنگ پکڑا۔ میں اس کی پرستش کرنے لگا۔ محبت کی ایک بھٹکی ہوئی شعاع جو میری تاریک زندگی میں اتفاقاً در آئی تھی، میں اُسے کیونکر ضائع ہونے دیتا۔ وہ مجھ سے کھیلتی رہی۔ وہ مجھے ایک عرصے تک فریب دیتی رہی ـــ اور میں اُس کی پرستش کرتا رہا۔ اُسے پوجتا رہا۔ میں اُسے تحفۂ محبت میں ایک دُکھا ہوا دل۔ محبت سے بھرا ہوا دل پیش کر سکتا تھا۔ مگر وہ کچھ اور چاہتی تھی ـــ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُسے خرید لے۔ وہ محبت کی تجارت کرنا چاہتی تھی۔ ایک خوبصورت برق رفتار موٹر کے بدلے میں ـــ ایک عالیشان کوٹھی کے عوض۔ شملہ اور کشمیر کی سیر کے معاوضہ میں ـــ میرا ریگ آسا شیش محل بکھر کر چور چور ہوگیا۔ میرے تخیلات پانی کی سطح پر رقص کرتے ہوئے رنگین بلبلے ثابت ہوئے۔

اس فریب خوردگی کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ مجھے اپنی کمی کا شدت سے احساس ہوا۔ میری رُوح کی تشنگی نے مجھ میں جنونی کیفیت پیدا کر دی اور میں اسی عالم میں گھر چھوڑ کر نکل گیا۔ بہت دنوں تک آوارہ گردی کرتا رہا۔ میں، خود کو فراموش کرنے کی خاطر، عیش و نشاط، رقص و سرود کی محفلوں میں ڈوب گیا۔ مگر تسکین نہ ہوئی ـــ آخر میرے ایک رشتے کے ماموں کی محبت نے زور مارا۔ انہوں نے مجھے ایک آفس میں نوکر رکھ دیا۔ اور اپنی ایک عزیزہ سے شادی کر دی۔

والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ سوتیلے بھائی بہنوں کو نہ مجھ سے کوئی لگاؤ تھا نہ میری ضرورت۔ میں یہاں ماموں کے پاس رہ گیا۔ اس لئے کہ جو چیز مجھے دیس میں میسر نہ آئی تھی وہ پردیس میں ملتی نظر آئی۔

ابتدا میں، مجھے میری بیوی برجیس سے قطعی محبت نہیں تھی وہ زخم جو ناہید نے لگائے تھے اب تک ہرے تھے۔ لیکن برجیس نے اپنی خدمت سے مجھے اپنا لیا۔

آہ عورت! ـــ مظلوم عورت!! ـــ تُو تو محض مردوں کا آلۂ تفریح ہے ـــ تُو صرف مردوں کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی۔ بچپن سے جوانی تک، ماں باپ کی خدمت کرتی ہے اور پھر شوہر اور اولاد کی ـــ مرد کی خواہش تیری خواہش ـــ مرد کی آرزو تیری آرزو ـــ تُو تو ان کی لونڈی ہے۔ وہ تیرے مالک ہیں۔ وہ جیسا چاہیں تجھے رکھیں جیسا چاہیں تجھ سے کام لیں ـــ آہ مظلوم عورت!

برجیس بھی میری خدمت کرتی تھی۔ یہ اس کا ایمان تھا۔ اُس کی اس بے بسی، بے کسی پر اتنا رحم آیا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا۔

یہ میری زندگی کے تین سال نہایت اطمینان و سکون سے گذرے۔ رُوح کو اس کی غذا مل گئی۔ سوکھے درخت کی جڑ کو پانی مل گیا۔ خشک و ویران چشمے کی سوتیں پھوٹ نکلیں ـــ مگر میرا یہ آرام و چین، اطمینان و سکون قدرت کو گوارہ نہ ہوا ـــ زچگی کے مصائب اس کی جان لیوا ثابت ہوئے۔ وہ مجھے اس بے رنگ و بو دُنیا میں تنہا چھوڑ کر رخصت ہوگئی۔

لوگوں نے مجھے دوسری شادی کی رائے دی۔ مگر میں شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر میں شادی کیوں کرتا؟ مجھے جنسی تسکین کی خواہش نہیں تھی۔ دُنیا اس کے لئے بہت فراخ تھی ـــ مجھے نفرت اس نظام سے۔ اس کی ہر ہر چیز سے۔ یہاں عورت اور محبت بازاری جنس کی طرح فروخت کی جاتی ہیں۔ سماج عورت کو محبت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ یا تو تجارت کر سکتی ہے یا خود لونڈی بن کر رہ سکتی ہے۔ ہمارا موجودہ نظام تجارت پر قائم ہے۔ ہر چیز کا مول تول

ہوتا ہے۔ ہر چیز روپیہ آنہ پائی کے معیار پر تولی جاتی ہے۔ باپ بیٹے کو سماج میں فخر حاصل کرنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ بھائی بہن دولت کے لئے لڑا مرتے ہیں۔ تعلیم، سونے کے ناپ بکتی ہے۔ محبت، دولت و سرمایہ سے کی جاتی ہے۔ ہر طرف تجارت ہے — بنیائی — مہاجنی — مروت اور شرافت، خدا اور مذہب، بازاری جنس کی طرح فروخت ہوتے ہیں۔

اِن خیالات کا یہ اثر ہوا کہ میں سخت بیمار پڑ گیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ مجھے ہسپتال پہونچا دیا گیا۔

کئی دن تک میں بالکل بے ہوش پڑا رہا — جب مجھے ہوش آتا۔ تو میں دیکھتا کہ وہ حور شمائل نرس خاص طور پر میری نگہداشت کرتی ہے۔ میری کراہ سُنکر وہ بے چین ہو جاتی۔ میرے قریب آکر بیٹھ جاتی۔ میری نبض دیکھتی۔ اکثر راتوں کو میں نے اُسے اپنے سرہانے بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ اکثر میرے پاس آتی۔ میری حالت دریافت کرتی۔ مجھے تسلی دیتی۔ ایک رات میری حالت بہت خراب تھی۔ آدھی رات کو مجھے ہوش آیا۔ میں نے دیکھا وہ میرے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میری کلائی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کچھ پریشان سی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اُس نے اپنے تھرتھراتے ہوئے لب میری تپتی ہوئی پیشانی پر رکھدئے۔ صرف ایک بوسہ — محبت سے بھرا ہوا بوسہ، تجدید حیات کے لئے کافی تھا۔ زندگی کی خواہش میرے مریض جسم میں انگڑائی لیکر بیدار ہوئی — اور میں اُسی روز سے بتدریج اچھا ہونے لگا۔

مگر یہ افاقہ محض ایک وقفہ تھا۔ درحالیکہ میری ہستی کو چند ایسے جراثیم اندر ہی اندر گھن کی طرح کتر رہے تھے، جن کا انسداد دُنیا کی زہریلی کڑوی دوائیں نہ کر سکتی تھیں۔

کبھی کبھی مجھے خیال ہوتا ہے کہ دنیا میں محبت کا وجود نہیں ہے۔ لیکن فوراً ہی مجھے ایک محبت سے بھرا ہوا بوسہ یاد آتا ہے — اور مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہ کائنات کس وجہ سے قائم ہے؟ — نظام شمسی کا دارومدار کس شے پر ہے؟۔ اگر تمام ستاروں کے درمیان ایک نازک سا رشتہ محبت کا نہ ہوتا تو یہ عالم کا شیرازہ کب کا بکھر گیا ہوتا۔ تمام سیارے ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے اور ایک ایسی آگ لگتی کہ ہستی ناپید ہو جاتی۔

لیکن ہمارا معاشی و سماجی نظام اپنی تباہی کی منزلوں کی طرف تیزی سے گامزن ہے — محبت دُنیا میں عنقا ہو چکی ہے — ہر شے کی تجارت ہوتی ہے وہ ادارے جن کی بنیادیں محبت پر استوار تھیں، انہیں تجارت کا کیڑا لگ چکا ہے۔ کیا یہ نظام کے خاتمہ کے آثار نہیں؟ محبت نہ ہوگی تو کیا تمام ستارے ایک دوسرے سے نہ ٹکرا جائیں گے؟ —

ڈاکٹر نے کل خوشخبری دی ہے کہ میرا مرض اب انتہا کو پہونچ چکا ہے — اور میں خوش ہوں — چند روز سے یہ خیال مجھے بار بار ستا رہا تھا کہ جس طرح محبت نے تمام عمر مجھ سے دشمنی مول لے رکھی تھی اُسی طرح موت بھی کہیں مجھے نہ بھول بیٹھی ہو؟ —

"ریاض رؤفی"

زیبا!

میری پھولوں کی ڈالی! کتنی نکہتیں، کتنی رنگینیاں تم نے اپنے پیارے خط میں سمو کر بھیجی ہیں۔ یہ بہار کی ہوائیں ہی کیا کم جنوں انگیز ہوتی ہے، اس پر یہ چاندنی راتیں اور تمہارا خط۔ ماضی پر، گذرے ہوئے دنوں کے جتنے پردے پڑے تھے ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے اور آج میں پھر اسی جگہ کھڑا ہوں جہاں آج سے چھ سال قبل، پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ یاد ہے وہ بہار کی رت؟ وہ سہانی شام؟ وہ پہلی ملاقات؟۔

زیبا! تم مجھ سے ہزاروں کوس دور ہو اور وہ ساعتیں بھی ہم سے برسوں پیچھے رہ گئیں مگر اس وقت بھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہو جیسے تمہاری گرم سانس میرے رخسار کو چھو رہی ہو۔ وہ حباب جیسے ریشم کا گہرا کاسنی دوپٹہ، تمہارے سینے پر مچلتا ہوا۔ چاند پر بدلی آ گئی تھی۔ بالوں میں وہ سچے موتیوں کے گچھے، گھٹا میں ستارے چمک رہے تھے۔ وہ سفید حریر کی شلوار، چاندنی اکٹھی ہو گئی تھی۔ پیارے ہاتھ میں وہ گلاب کا پھول، شاخ گل جھوم رہی تھی۔

آہ زیبا! میری ننھی کلی! کس خوشبو میں بسایا ہے یہ خط؟ عطر کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ تمہارے معطر پیرہن کی سی مہک ہے۔ میرے حواس پر ایک بے خودی سی چھا رہی ہے۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں مگر منظر روشن تر ہوتا جا رہا ہے۔

دیکھنا وہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ میں تمہارے پلنگ سے اٹھ کر آرام کرسی پر جا بیٹھا۔ دروازہ کھلا۔ کون ہے یہ الڑھ، متوالی؟ گوری رنگت، کالی آنکھیں، بھری جوانی۔ لو میں تو اس کا نام بھی بھول گیا۔ یہ تمہاری سہیلی ہے۔ پنجابن سہیلی، جس کا فاونٹن پن تم نے مستعار لیا تھا اور شاید گھڑی بھی۔ تم نے ایک بنگالی سے اس کا تعارف کرایا۔ کتنا شوخ تھا وہ بنگالی۔ دو ہی منٹ میں استادی اور شاگردی کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ پنجابن کو کئی لفظ بنگلا زبان کے سکھائے اور خود کئی باتیں پنجابی زبان کی اس سے سیکھیں۔ پنجابن شرماتی جا رہی ہو، جھینپی جا رہی ہے، اور تم اس چھیڑ چھاڑ سے پھول کی طرح کھلی جا رہی ہو۔

پنجابن چلی گئی۔ اب ہم تنہا ہیں۔ میں نے کہا: "زیبا! کتنی خوبصورت ہے تمہاری یہ شلوار! کس نے سی ہے؟"

تم نے کہا: "میں نے"

میں نے کہا: "سچ؟"

تم نے کہا: "یا اللہ آپ کا خیال ہے مجھے اتنا بھی سلیقہ نہیں! اچھا میں تمہارے لئے بھی ایک شلوار سیوں گی۔ پہنو گے تم؟"

میں نے کہا: "ہاں"

پھر میں نے پوچھا: "زیبا! اگر کسی کو میرے یہاں آنے کا علم ہو جائے تو تمہارے اوپر کوئی برا اثر تو نہیں پڑے گا؟"

تمہاری آنکھوں میں برہمی، یاس اور اندوہ کے ملے جلے آثار نمودار ہو گئے۔ پھر تم نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "برا اثر؟ برا اثر کیا پڑتا۔ پہلے ہی مجھے بتا دیا گیا ہے کہ اس جرم کی سزا میں مجھے گولی سے مار دیا جائے گا"

میں لرز گیا۔ میں نے کہا۔

"اور جو اسی وقت کوئی یہاں آ جائے تو؟"

"تو کچھ بھی نہیں۔ پجارن اپنے دیوتا پر قربان ہو جائیگی"

یہ کہہ کر تم نے بے اختیار مجھے کھینچ لیا۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ پھولوں کی اور شبنم کی بارش ہو رہی تھی۔ رگوں میں خون نہیں بجلی کی رو دوڑ رہی تھی۔ اف، کتنی تیز تھی دل کی دھڑکن! اور کتنی طاقت آ گئی تھی ایک نازک لڑکی کے بازوؤں میں! آہ وہ قرب! ہوا بھی تو ہمارے درمیان حائل نہ تھی۔

تم نے میرے بال میری پیشانی پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ! کیونکر جیوں گی میں تمہارے بغیر؟ ہائے مر جاؤں گی میں تو۔ تم چلے جاؤ گے مجھے چھوڑ کر؟"

تمہارے کنول کے پھولوں میں شبنم کی بوندیں چمک رہی تھیں جی چاہتا تھا تمہیں اپنے میں جذب کر لوں۔ اپنے سینے میں رکھ لوں۔ آہ زیبا! کتنے بے بس تھے ہم اس دن۔ کتنے بے بس ہیں ہم آج بھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم سے چھوٹ کر کیسی قیامت کا سامنا ہوگا۔ ملنے کی آرزو میں، جب کہ ملنے کی امید بھی تھی، ہر سال برس کن اذیتوں کے ساتھ گذرا تھا۔ اور اب جبکہ ملاقات کی امید سورج کی آخری کرن کی طرح دھندلی ہو کر ناپید ہو چکی ہے، یہ ساری عمر یہ ویران زندگی

چونکر کٹے گی؟

مگر کس قدر سنگین ہے یہ دل کا نازک شیشہ۔ یا تو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتا ہے یا پہاڑ کی ٹکر بھی جھیل لیتا ہے۔ برس گذر گئے۔ تم سے جدا ہوں اور زندہ ہوں۔ کھانا پینا، سونا جاگنا، ہنسنا بولنا، زندگی کے تمام معمولات اُسی طرح جاری ہیں۔ مگر نہیں زیبا! اب ہم کہاں اور زندگی کہاں؟ یہ سراب کی جھلک ہے پانی نہیں۔ تبسّم کا پردہ ہٹا کے دیکھو تو معلوم ہو کہ اس کے پیچھے آنسوؤں کا دریا اُمنڈ رہا ہے۔ ٹھنڈی راکھ کی تہ میں چنگاریاں پڑی دہک رہی ہیں۔

تمہارے ساتھ اُمیدوں کا آسرا بھی گیا
اجل ہی اب تو سہارا ہے زندگانی کا
دلِ شکستہ کی فریاد بن گئے نغمے
رباب توڑ دیا غم نے شادمانی کا

توبہ! میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ کتنا ظالم ہے یہ نامرادی کا احساس۔ میں ایک رُوح پرور خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کمبخت نے مجھے چونکا دیا۔

زیبا! یہ دلوں کا نظر نہ آنے والا رابطہ بھی کتنا عجیب ہے؟ مجھے تمہارا تصور بندھا اور تم بیچین ہو گئیں۔ تم نے مجھے یاد کیا اور میں تڑپ اُٹھا۔ تم نے اپنا خط اس شعر سے شروع کیا ہے ؎

ستا رہی ہے انہیں شاید آج میری یاد
یہ اضطراب تو پہلے کبھی نہ تھا دل کو

اس دن صبح ہی سے خدا جانے میرا دل کیوں گھبرا رہا تھا۔ بہت ہی گھبرا رہا تھا۔ بڑی ہی بے کلی تھی۔ تمہیں حیرت ہوگی یہ سن کر کہ اس دن میں گھنٹوں کسی کا یہ شعر گنگناتا رہا ؎

خلش تھی دل میں مگر اتنی بیکلی تو نہ تھی
ضرور آج انہیں یاد آ رہا ہوں میں

اب تمہارے خط سے اپنے احساس کی تصدیق ہو گئی۔ محبت کا الہام جھوٹا نہیں ہوتا۔

اُسی دن شام کو میں نے تمہارے کئی پُرانے خط نکال کر پڑھے۔ پڑھتے پڑھتے رات ہو گئی۔ عالمِ خیال میں تم سے باتیں کرتے کرتے آنکھ لگ گئی۔ تم پھر بھی سامنے تھیں۔ جانتی ہو کس طرح؟

"آغازِ بہار کی قدرے خنک اور چاندنی رات۔ خوبصورت باغیچہ کے درمیان ماڈرن سٹائل کا خوشنما بنگلہ۔ صحن کے وسط میں گول چبوترے پر صرف "ایک" پلنگ بچھا ہوا ہے۔ دوسری سنگ مرمر کی ایک بنچ پڑی ہے۔ رات کے دو بج چکے ہیں۔ لیکن چاندی جیسے سفید براق بستر پر اب تک ایک شکن بھی نہیں پڑی۔ رنگا رنگ کے پھولوں کے گملوں سے چبوترہ دلہن کی طرح آراستہ ہے۔ فضا خاموش ہے۔ خاموش اور معطر۔ سارا سنسار میٹھی نیند سو رہا ہے سوائے ایک حرماں نصیب کے جسے اتنی رات گذر جانے پر بھی نیند کی مطلق پروا نہیں۔ ابھی تک شب خوابی کا لباس بھی نہیں پہنا۔ اس شاعرانہ رات میں ایسے رُوح پرور وقت میں وہ حزن و افسردگی کا مجسمہ بنی بنچ پر بیٹھی ہے۔ سفیدی مائل موتیا رنگ کے نفیس ریشم کی شلوار اور قمیص پہنے ہے۔ آسمانی رنگ کا باریک وائل کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانوں پر آ گیا ہے۔ جسم ہر قسم کی آرائش سے آزاد ہے۔ البتہ بال خاص توجہ سے بنائے گئے ہیں۔ داہنی طرف بالوں میں چنبیلی کے پھولوں کا گچھا پن سے اٹکا رکھا ہے۔ عریاں بازوؤں اور کلائیوں میں بھی چنبیلی کے گجرے لپٹے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں سُرخ گلاب کا بڑا سا پھول ہے۔ یونہی پتھر کی مورت بنی بنچ پر ساکت بیٹھی ہے۔ کبھی ایک دبی دبی آہ منہ سے نکل جاتی ہے اور کبھی ایک دردناک لَے اور دھیمی آواز میں یہ شعر گنگنانے لگتی ہے۔ ؎

"وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ آپ نے مجھ کو بھلا دیا"

تڑپ کر میری آنکھ کھل گئی۔ چونکا ہوں تو یہ دو شعر زبان پر تھے۔

تمہاری یاد سے وابستہ تلخیاں؟ توبہ! ؎
تمہاری یاد سے شیریں تو کوئی یاد نہیں
وفا پرست ہیں، قادر نہیں وفا پہ مگر
جہاں میں کوئی ہم ایسا بھی نامراد نہیں

اگر کوئی دوسرا شخص مجھ سے کہتا کہ میں سوتے میں شعر کہتا ہوں تو شاید مجھے یقین نہ آتا مگر اب تو انکار ممکن نہیں۔ البتہ ایک بات ہے۔ اب اگر کبھی کوئی مجھ سے کہے گا کہ میں نے سوتے میں شعر کہا ہے تو میں ایک معنی خیز تبسّم کے ساتھ اُسے جواب دونگا کہ ہاں تم نے کسی کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ حیران ہو کر میری صورت دیکھنے لگے گا۔

زیبا! پے در پے تمہارے دو خط پا کر دل کو بڑا سکون ملا۔ یاس کی تاریکی میں آس کی کرنیں چمکنے لگیں۔ مگر زیبا! کیا چاند سچ مچ کبھی زمین کے اتنے قریب آ جائے گا کہ زمین اُسے چھو لے؟ آسمان پر ایک ستارے کو تو میں نے دیکھا ہے کہ وہ ایک زمانے تک چاند سے بہت دور ہوتا ہے۔ وہ چلتا رہتا ہے، چلتا رہتا ہے اور شاید

چاند بھی اُسے اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ ہر شب وہ چاند سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی دُور اُفتادہ بیتابانہ اپنے محبوب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ چاند کے ہالے میں داخل ہوجاتا ہے، جیسے کوئی سراپا آرزو کسی کے پُرشوق آغوش میں پہونچ جائے پھر اور بھی قریب ہوجاتا ہے۔ اتنے قریب جتنے قریب ایک بار چاند نے زیبا اور اس کے محبوب کو دیکھا تھا۔ چاند اور ستارے کا یہ اتصال میں نے بارہا دیکھا ہے اور سوچا ہے کہ کیا ہم کبھی اس طرح یکجا نہیں ہوسکتے؟ کیا گردشِ ایام دو چاہنے والوں کو صرف جدا کرسکتی ہے ملا نہیں سکتی؟ زیبا! کب آئیں گی وہ ساعتیں؟ ہائے کیسی موہوم امیدوں پر ہم جیتے ہیں۔

زیبا! ایک بات کہوں۔ مانوگی؟ تمہیں دیکھنے کو بہت ہی جی چاہتا ہے۔ پھر دکھادو نا اپنی صورت۔ خواب میں نہیں، اس طرح تو بارہا دیکھا ہے، عالمِ خیال میں نہیں، اس طرح تو ہر وقت دیکھتا ہوں اور دیکھ سکتا ہوں۔ عالمِ واقعات میں نہیں، یہ تمہارے اختیار ہی میں کب ہے۔ ان صورتوں کے علاوہ ایک اور صورت بھی تو ہے۔ اسی طرح جس طرح ایک بار پہلے آنکھیں روشن کی تھیں۔ کیا اب کے بھی اتنی ہی منتوں کی ضرورت ہوگی۔ کیا پھر مجھے روٹھنا پڑیگا، صرف اس لئے کہ کوئی منائے اور اپنا "جلوہ" دکھائے؟ تو پھر کب؟ میری اچھی زیبا!۔

اچھا کیا تم نے اُس پتے پر خط بھیجا۔ احتیاط بہرحال فرض ہے۔ اچھا خدا حافظ میری پھولوں کی ڈالی! بامیدِ دیدار و تمنائے لب بوسی

تمہارا۔ ہمیشہ تمہارا.....

ہاں ایک ضروری بات تو میں کہنا بھول ہی گیا۔ آئندہ تمہاری دلچسپی کا سامان رسالہ بیسویں صدی لاہور میں ملیگا۔

ابنِ داؤد

آزمائش

اسیرانِ قفس میں بال و پر کی آزمائش ہے
ہوائے دامنِ شاخ و شجر کی آزمائش ہے

مرا رازِ خموشی اور بزمِ غیر کیا معنی
اُنہیں منظور شاید چشمِ تر کی آزمائش ہے

نسیمِ صبح غنچوں کو کھلاتے تو سہی۔ دیکھیں
ہمیں بھی خندۂ زخمِ جگر کی آزمائش ہے

کلیجے میں تو کیا رخنے مرے ایمان میں ڈالو
اگر مدِ نظر تیرِ نظر کی آزمائش ہے

اُڑا جاتا ہے میرے خرمنِ ہستی کا ہر دانہ
نصیبِ دُشمناں برق و شرر کی آزمائش ہے

اُبھر آتا ہے نقشِ پا جہاں میں سجدہ کرتا ہوں
یہی اک اُن کی خاکِ رہگزر کی آزمائش ہے

یہ جوشِ حُسن اور میرا دلِ افسردہ جانے دو
شبِ مہتاب میں شمعِ سحر کی آزمائش ہے

نظر ہے برق کی پھر آشیاں کے چار تنکوں پر
چمن میں آج پھر اک مشتِ پر کی آزمائش ہے

زمینِ میرزا میں پھر غزل مضطرؔ نے لکھوائی
تپشؔ کیا پھر مرے عیب و ہنر کی آزمائش ہے

عبداللطیف تپشؔ

لہ مضطر نظامی میرے ایک دوست ہیں۔

دائمی اُستواری

دوستو! آؤ کشتیٔ حیات کو مستحکم کرلیں۔

کوئی پروا نہیں آسمان کی چھاتی ابر آلود ہوجائے۔ روئی کے سفید گالے سیاہی میں تبدیل ہوجائیں لیکن تم اپنے ارادے میں اٹل رہو! جوں جوں شکست کا خوف آنکھوں میں ممکن بن جائے، اتنا ہی زیادہ جنگ کی آگ میں سر کے بل کود جاؤ۔ لیکن موت کی بھیانک شکل دیکھکر لاپروا مت بن جاؤ کیونکہ اس کی ضرب، ضربِ شمشیر ہوتی ہے—

آؤ صداقت کے پیغامبر کے ساتھ رشتۂ محبت اُستوار کرلیں اور جنگ کے میدان میں جان کی بازی لگاکر حیاتِ جاوید حاصل کرلیں۔ —یہی اللہ کا حکم ہے—یہی دائمی اُستواری ہے۔ اسی دائمی اُستواری نے دُنیا کے ناممکن کو ممکن میں مبدّل کردیا ہے۔ کمزور اپنی قوم کے لئے بارِ گراں ہے۔ خدا کو منکروں اور کمزوروں سے محبت نہیں۔ شیرِ خدا بنو۔ "شیرِ خدا" وہی ہے جو اپنے ارادے اور عزم میں اُستوار ہو۔

قوم کے باغی اور منکر کو ہمیشہ شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں۔ اُس کو خدا کا خوف نہیں۔ دیکھو! آج بزدلوں کی زبانیں "اللہ زندہ باد" کے نعرے لگا رہی ہیں۔ خوف اور ڈر، ہمّت اور شجاعت سے بدل گیا ہے—اَن داتا ہی دائمی حقیقت ہے۔ پھر ہمیں ڈرنے کی ضرورت کیا۔ غداری اور کمزوری ہمارے دلوں میں خوفناک چنگاریاں پیدا کردیتی ہو—!

کیا تمہارے دلوں سے عربوں کی غیر فانی شجاعت کی داستان مٹ گئی ہے جنہوں نے رومنوں اور فارسیوں کی شہنشاہیت کی بساط اُلٹ ڈالی تھی؟ ان کی فوج کی تعداد کتنی تھی؟ ہاتھوں میں کتنے تیر کمان تھے؟ انہیں صرف خدا پر بھروسہ تھا۔ اُسی پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اسی اعتقاد اور ایمان کی بدولت انہیں عظیم الشان فتوحات کی کنجیاں ملیں۔ ان کے جاہ وجلال اور رعب وحشمت سے روئے زمین کا چپہ چپہ کانپ اٹھا تھا۔ بہادر بن کر ساری دنیا میں حکومت کی۔ دلوں میں کبھی شکست اور ہار کے وسوسے نہیں آئے۔ وہ صحیح معنوں میں اسلام کے شیدائی تھے۔ اسلام کے مطالب سمجھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اللہ کے سپاہی ہیں اور اسی خیال سے آزادی د[ے] ہمکنار ہوئے۔ خون کی ندیاں بہاکر آزادی حاصل کی۔ خوشامدیں نہیں کیں۔ بھیک نہیں مانگی!

اگر فاتح بن کر زندہ رہنا ہے تو پہلے موت کا فاتح بننا پڑیگا۔ یہی سپاہیوں کے اُصول ہیں۔ وہ سپاہی کہلانے کے مستحق نہیں جو دشمن کی فوج کو دیکھکر کانپ اُٹھیں اور اُن آنکھوں میں شکست کی پرچھائیں سمٹ آئے۔ سپاہی وہ ہے جس کی پیاس دُشمن کو دیکھکر بڑھ جائے۔ جو سر کو ہتھیلی میں لیکر پامردی سے مقابلہ کے لئے کھڑا ہوجائے۔ اور شکست دینے کی قوت اس کی نبض کو جھنجوڑ ڈالے! تلوار میں جس قدر ضرب پڑتی ہے—دھار اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح دشمن کی رسد اگر کم ہوجائے تو خون کی ندیاں بہادیتے ہیں، بے شمار جانیں ہلاک ہوجاتی ہیں—دیکھو کبھی ناامید نہ ہونا—کیونکہ ناامیدی اور تقدیر پرستی جنگ میں بہتوں کو زخمی کردیتی ہے اور متعدد پیاری جانوں کو چھین لیتی ہے—

سنو! ہمدم، گوشِ دل سے سُنو! جس پیشانی کو تم نے وحدۂ لاشریک کے آگے خم کیا ہے—خبردار! اُسے کسی دوسرے کے آگے ڈراور خوف سے نہ جھکانا، کیونکہ یہ گناہِ عظیم ہے۔ بہت بڑا گناہ! اگر تمہارا سر وطن کی آزادی کی جنگ میں کٹ جائے تو اس سر کو خدا اپنی آغوش میں لے لیگا۔

جو اپنی قوت بازو سے دُنیا کو فتح کرنا چاہتا ہے—وہی میرا امام ہے۔ اسی کو میں اپنا رہنما کہتا ہوں اور اُسی کے ساتھ میری محبت کی ڈوریاں بندھی ہیں۔ جو اپنی زبان سے، اپنی شعلہ انگیز تقریر سے خفتہ رگوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ اس کے سر پر میں فتح کا تاج رکھتا ہوں—اُسی بہادر سپاہی کے ساتھ رشتہ جوڑتا ہوں۔ جو روح یہ کہکر روزہ رکھتی ہے کہ غریبوں کی عید آئے گی میں اُسی کو خدا کا بندہ کہہ کر پکارتا ہوں۔ وہی خدا کا بندہ ہے—لیکن جو آلام و مصائب کا پیامبر ہے، جو انسانوں کا دشمن ہے—میں اس کے ساتھ خوفناک جنگ کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں۔ ایسی جنگ جو تباہی وبربادی کی بند راہ کھول دیگی—مجھے خدا کی طرف سے پیغام ملا ہے کہ ہندستان کے بکھرے ہوئے سپوتوں کو متحد کروں۔ میں آواز دوں،

...ا رہوں، اسی آواز کا نتیجہ ہے کہ آج بے حس و حرکت اور خواب آلود جسموں میں حرکت آگئی ہے اور تھپیڑوں کے تیز رفتار بہاؤ کی طرح مقدس راہ میں جمع ہو رہے ہیں۔ میں ہمیشہ کے سوتے ہوئے بند کانوں میں تکبیر کی آواز پہونچانے کے لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ راہِ حقیقت میں کٹ مرنے والے جو سپاہی ہیں انہیں میدان میں جمع کروں ـــ!

دیکھو! دیکھو!! مستقبل کا سُرخ آفتاب آزادی کی موسیقی بکھیرتا ہوا دامنِ مشرق سے طلوع ہو رہا ہے۔ مجھے موت کی بھیانک شکل سے ڈر نہیں، میں قید خانہ کی آہنی سلاخوں سے خوف نہیں کھاتا! یہ عہد مستقبل کا جوان آفتاب، آسمان کی بلند و بالا چوٹی پر کھڑا ہو کر سبھوں کو آواز دے رہا ہے۔ اس آواز کو سُنکر فاختہ کے قدم نہ اُٹھیں تو پروا نہیں، آزادی کے طیور پرواز کرتے آئیں گے ـــ اگرچہ اسی راہ میں باز کا قافلہ موجود ہے اور خوفناک بادلوں کا سیلاب آیا ہوا ہے ـــ تاہم روشنی کا پیاسا طائر میٹھی تان اُڑاتا بڑھا جا رہا ہے ـــ!

آج ہندوستانی مردوں اور عورتوں کو موت اور خوف کے خوفناک پنجے سے چھڑانے کے لئے میں نیام سے تلوار نکال چکا ہوں۔ ـــ میں نے رُوح کی دردناک فریاد سُنی ہے۔ وہ درد اور دُکھ سے چیخ رہی ہے۔ اُس کی حفاظت کے لئے میں نے قدم اُٹھایا ہے۔ مجھے خدا کا پیغام ملا ہے، اُس نے مجھے آواز دی ہے ـــ وہ مجھے پکار رہا ہے۔

طبلِ جنگ پر چوب پڑنی شروع ہو گئی۔ آزادی کا پرچم بادل کو چیر کر روشنی کی طرف شُنہ کئے لہرا رہا ہے ـــ محبت کی بارش اور برق کی گرج سے رُوح جاگ اُٹھی ہے! حکومت نے یہاں سے کوچ کرنے کی تیاری کر لی ہے ـــ اب ہم اسی راہ سے فتح کے رتھ میں سوار ہو کر آئیں گے جن کے بازو مستحکم ہیں، جن کی رُوح میں خدا کی عظمت نقش ہے ـــ اسی کے دروازے سے میں آواز دیتا ہوں، اُسی کو بُلاتا ہوں۔ اب ہندوستان کے سپوت متحد ہو گئے ہیں، فساد کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں ـــ بغض و عناد مٹ چکے ہیں ـــ دیکھو! اسی اتحاد کے آسمان سے نیا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ آؤ اِسے ہم خوش آمدید کہیں ـــ!!

مترجمہ محمد یونس احمر؛ — قاضی نذر الاسلام۔

چراغِ طور

اُس نے نقاب رُخ سے ہٹایا نہیں ہنوز
گلشن کو بجلیوں نے جلایا نہیں ہنوز

دل ہے کہ پاش پاش جگر ہے کہ پاش پاش
گو اُس نظر نے تیر چلایا نہیں ہنوز

جو ذرّہ جس جگہ پہ ہو سرمست ہو چکا
ساقی نے پھر بھی جام بڑھایا نہیں ہنوز

لاکھوں جواب دل میں ہیں اک اک سوال پر
حالانکہ اس کا خط کوئی آیا نہیں ہنوز

جلوے ہزار ملتے ہیں ایک ایک گام پر
میری نظر میں کوئی سمایا نہیں ہنوز

اُس آستاں کو کیوں ہو مری بندگی کی لاج
میں نے سرِ نیاز جُھکایا نہیں ہنوز

تُو ہو رہا ہے گو مری رگ رگ میں جلوہ گر
پھر بھی تری قسم تجھے پایا نہیں ہنوز

دامن نہیں ہے چاک گریباں نہیں ہے چاک
لطفِ جنونِ عشق اُٹھایا نہیں ہنوز

اے قوتِ خیال ذرا اور کام دے
جس کو بُلا رہا ہوں وہ آیا نہیں ہنوز

تُو نے بُھلا دیا اُسے یہ تیرا کام تھا
بہزاد نے تو تجھکو بُھلایا نہیں ہنوز

جرعات

جلد [illegible] ساقی دہلی۔ بابت مئی ۱۹۴۱ء نمبر [illegible]

[illegible] نہیں دیتا۔ دنیا کا ہر مذہب اس کی اجازت دیتا ہے کہ لاکھوں سے لیکر کروڑوں، اربوں، کھربوں روپے سالانہ منافع دینے والے [illegible] ذاتی ملکیت ہو سکیں۔ کوئی مذہب حکومت کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ یہ کارخانے ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ ہر مذہب میں تاجر یا [illegible] کا نفع کمانا جائز ہے۔ قدیم زمانوں میں چونکہ تجارت سائنس کے ذریعے چلنے والے کارخانوں، ریلوں اور جہازوں کی مدد نہیں لے سکتی [illegible] سے دنیا کی آبادی کو تاجر اس طرح خاردار آہنی زنجیروں میں جکڑ نہیں سکتے تھے جس طرح دورِ سائنس کے تاجروں نے انسانیت کو جکڑ رکھا ہے اور یہی اس عالمگیر جنگ کی وجہ ہے ـــ یہاں تک کہ جہاں میں یہ جنگ عالمگیر ہے ـــ سرمایہ دارانہ نام نہادی یا محض سیاسی جمہوریت اور مذہب دونوں دنیا کو آزاد اور خوشحال بنانے سے قاصر ہیں۔ رہی ان لوگوں کی بات جو کہتے ہیں کہ سائنس اور مشینوں اور مشینوں سے چلنے والے کارخانوں ہی کو مٹا دیا جائے تو دنیا پھر سکھ چین سے رہنے لگے۔ گویا انسانیت ہزار ہا برس تک چرخے نہیں چلا چکی تھی۔ ہزار ہا برس تک دولت کی پیداوار صنعت و حرفت، زراعت و تجارت محض جسمانی مشقت پر منحصر نہیں رہ چکی ہیں۔ تو کیا ہلاکو، چنگیز، سکندر، [illegible] فاقہ، افلاس، ظلم اور ہزاروں عذاب، دورِ سائنس کے قبل انسانیت کا گلا ہزاروں برس سے نہیں گھونٹ رہے تھے۔ اس [illegible] کے مقابلے میں تو سرمایہ داری کا زمانہ زیادہ ترقی یافتہ رہا ہے اور انسانوں کی زیادہ آبادی زیادہ تربیت یافتہ اور خوشحال رہی ہے۔ [illegible] چرخے سے بھی کام نہیں چلے گا۔ کہاں دنیا کی تین ارب آبادی اور کہاں اس کو آزاد، مہذب اور خوشحال بنانے کی ذمہ داری [illegible] کارخانوں پر، ادباؤں یا بدوؤں، نوابوں پر، زکوٰۃ اور خیرات پر، چرخے پر، قدیم آلات پر، مذہب پر اور اس سرمایہ دارانہ نظام پر رکھنا جو [illegible] کے کارخانوں اور بچے مالوں کو دو چار ہزار خاندانوں کی ملکیت بنا دے۔ دنیا کا پاپ ان ذریعوں سے نہیں کٹے گا۔ ہندو مسلم تہذیب [illegible] بیت چکا۔ اب اشتراکی تہذیب کا جگ ہے۔

سچ ہے دنیا نہیں دکاں، لیکن — صحنِ مسجد بھی تو نہیں ہے جناب

سنتا آپ نے!

(۱۰)

میر کا یہ شعر مجھے گزشتہ چوتھائی صدی کے اندر بارہا یاد آیا۔ ے

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے — سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

جس بات یا اصول کا اظہار میر نے اوپر والے شعر میں کیا ہے اسے فلسفے کی مغربی اصطلاح میں nescience (لاعلمی یا [illegible]) کہتے ہیں۔ اس اصول کا تعلق جس مبحث سے ہے اسے فلسفے کی مغربی اصطلاح میں Epistemology (علمیات) کہتے ہیں۔ جرمن فلسفی کانٹ کا بیان ہے کہ ہم کسی چیز کے صرف ان پہلوؤں یا اجزا یا اثرات کا احساس کرتے ہیں جن کا تعلق ان سانچوں یا [illegible] سے ہے جن کے ذریعے ہمارا دماغ چیزوں کا احساس کرتا ہے۔ ان ابواب یا سانچوں کا نام کانٹ نے Categories of [illegible] رکھا ہے اور بتایا ہے کہ کسی چیز کی اصل یا ماہیت ـــ the thing-in-itself ـــ کا براہِ راست یا بے نقاب [illegible] ممکن ہے۔ افلاطون کا بھی قول ہے کہ ہم چیزوں کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے، بلکہ چیزوں کی یا حقیقت کی پرچھائیاں دیکھتے ہیں۔ [illegible] فلسفہ میں برگساں کا قول ہے کہ عقل ہمیں درک یا عرفان نہیں دے سکتی ہے عقل کا ارتقا عمل کے لئے ہے اور علم، درک یا عرفان [illegible] وجدان (intuition) یا ادراک بلاواسطہ ہمیں عطا ہوتا ہے۔ میر کے شعر میں جو جادو ہے وہ اوّل تو پہلے مصرعے کے بیان کی جدلیت ہے۔ بیان میں یہ اجتماعِ ضدین بیک وقت، نرمی، زور، اچانک پن اور تاثیر پیدا کر رہا ہے۔ پہلا لفظ "یہی" بہت [illegible] ہوتے ہوئے بھی کتنا نرم اور فیصلہ کن لفظ ہے۔ ذرا اردو شاعری میں لفظ "یہی" کا اتنا پرمغز، اتنا اہم، اتنا سہما اور اتنا [illegible] استعمال کہیں اور سے ڈھونڈئے تو اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یوں تو یہ لفظ سیکڑوں بحروں اور زمینوں میں ردیف رہ چکا ہے۔ [illegible] فقرہ پہلے ہمیں متوجہ اور امیدوار کرتا ہے ہم یہ سننے کے مشتاق ہو جاتے ہیں کہ کیا جانا اور جواب پاتے ہیں کہ کچھ نہ جانا [illegible] لیکن اس اعتراف لاعلمی میں وہ حیرت چھپی ہوئی ہے کہ بجائے مایوسی کے ایک عرفان کی حالت [illegible] [illegible] پیدا ہو جاتی ہے اور یہ کیفیت نشاط آفریں ہے۔ دوم یہ کہ دوسرا مصرعہ ـــ سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم [illegible]

ہیئت کو بہت قدر مکمل ہوتا دیتا ہے۔ عمر بھر کا حاصل "علم لاعلمی" ٹھہرا۔ دوسرے مصرعے میں حیرت اس قدر شدید نرم اور گہری [illegible]
شکل ہونے سے یہ بات بجا لگتی ہے۔ اس شعر کا یہ اثر نہیں ہونے پانا چاہیئے کوئی کہے کہ عمر بھر جان کھپا کے کچھ نہ پایا۔ میر کے پہلے مصرعے [illegible]
جانا" لغوی بیان سے گذر کر اثباتی بیان بن جاتا ہے۔ گویا "کچھ نہ جانا" برابر ہے بہت کچھ پانے کے۔ اوروں نے بھی لاعلمی یا گیان [illegible]
کی ترجمانی کی ہے۔ اصغر مرحوم کا یہ شعر سنیئے :-

گوشہ گوشہ علم و حکمت کا یہاں دیکھا ہوا یہ غنیمت ہے در میخانہ اب تک باز ہے

شاید یہ بھی اصغر ہی کا شعر ہے :-

مقامِ جہل کو پایا نہ عقل و عرفاں نے میں بے خبر ہوں بہ اندازۂ فریبِ شہود

اپنا ایک شعر عرض کرتا ہوں :-

نگاہِ ہوش رُبا تک تو ہوش قائم تھے میں کھو گیا ہوں ان آنکھوں کا جب پتہ پایا

"نگاہ" "آنکھوں" "کھو گیا ہوں" "پتہ پایا" یہ ٹکڑے بیک وقت جمالیاتی پہلو بھی رکھتے ہیں یعنی ایک لطیف رومانی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور "مشاہدۂ حق" کی گفتگو بھی کرتے ہیں۔

غالب کے کچھ شعر اس باب میں سنیئے :-

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

لیکن ہم ہوں، یا تم ہو یا کہ غالب ہوں، کسی کو بھی "نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب" میر کے شعر کا دوسرا مصرع اتنا سہل ہے کہ اس کی بلاغت کی طرف پہلے توجہ نہیں جاتی۔ میر کے شعر میں جو معصومیت اور خلوص ہے وہ سب کو حاصل نہیں۔ لاعلمی یا "مقامِ جہل" کو میر نے "نحن اقرب" کا مرتبہ دے دیا ہے۔ لاعلمی کو میر نے اپنی سانس بنا لیا ہے۔ میر کے علاوہ دوسرے شاعروں کے جو اشعار میں نے اوپر نقل کئے ہیں اُن میں بہ ظاہر طمطراق زیادہ ہے۔ میر نے دو ٹوک بات کہی ہے۔ دوسروں نے بہ ظاہر بہت حسین طریقے سے بات کو گھما پھرا کر کہا ہے۔ خوش آہنگ الفاظ بھی استعمال کئے ہیں اور فن کارانہ قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن میر کے شعر کو دیکھتے ہوئے یہ رنگین بیانیاں حشو و زوائد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ میر کے شعر میں جو تحیر اور انفعال ہے وہ اس لئے ٹھیٹھ احساس کو جوں کا توں بغیر ایک زائد حرف بغیر ایک زائد نقطہ، بغیر ایک زائد زیر، زبر، پیش لائے ہوئے بیان کر دیا ہے۔ میر کے اشعار کی نشتریت اور ان میں چونکا دینے کی صفت جو پائی جاتی ہے اس کا راز یہی ہے کہ مانوس احساس کو بغیر کسی دلیل کی وساطت کے بغیر گھٹائے بڑھائے براہ راست بیان کر دیتے ہیں۔ شعر میں حیرت اس احساس یا تجربے کی مانوسیت سے پیدا ہوتی ہے جس احساس یا تجربے کا شعر حامل ہوتا ہے یا جس کی وہ ترجمانی کرتا ہے۔ جو چیز جتنی ہی جانی بوجھی ہوتی ہے اتنی ہی وہ حیرت انگیز ہوتی ہے "یہ سوجھی" "اک عمر میں" "ہوا معلوم" یہ ٹکڑے کتنا مانوس لہجہ رکھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ احساس تحیر (sense of wonder) سے کس طرح تھرتھرا رہے ہیں۔ زندگی جب ٹھیٹ زبان پاتی ہے تو اس کا لہجہ بیک وقت مانوس اور حیرت انگیز ہوتا ہے۔ اس وقت جس چیز کا بھی ذکر ہوگا وہ مانوس ترین معلوم ہوگی اور بے پایاں بھی۔ بیک وقت مانوسیت اور رمزیت اُس چیز میں اور اُس شعر میں پیدا ہو جائے گی۔ شیلے نے اسی حقیقت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ شاعری ہر علم کا مرکز اور محیط ہے :-

Poetry is the centre and circumference of all knowledge.

ورڈزورتھ نے کہا تھا کہ شاعری ہر قسم کی سائنس اور رُوحِ لطیف ہے :-

Poetry is the breath and finer spirit of all knowledge.

لاعلمی کے علم کو حاصل کرنے کے لئے شاعرانہ یا جمالیاتی وجدان کی ضرورت ہے۔ میر نے اتنی بڑی بات جس طرح [illegible] [illegible] اقبال بھی نہیں کہتے۔ دوسرے مشہور شعرا کا "زورِ بیان" کمزوریاں کا درجہ رکھتا ہے اور میر کی [illegible]

[illegible] بیان کا مرتبہ رکھتی ہے۔ میر کے نرم، ایک رو اور ہلکے اشعار دوسرے شعرا کی بلند آوازوں پر فوقیت رکھتے ہیں:۔

یاد رکھ شورشِ زمانہ پر
عشق کی ایک بات بھاری ہے

اور اس "شورشِ زمانہ" میں مشہور تریں بلند آہنگ اور خوش آئند شاعری بھی شامل ہے۔ میر کو وہ خلوص نصیب تھا جو اوروں کو [illegible] نصیب نہیں تھا اور خلوص ایک ایسی چیز ہے جو ہلکی سے ہلکی اور بھاری سے بھاری ہوتی ہے۔

گذشتہ فروری میں میں پٹنہ بزمِ ادب میں شریک ہونے کے لئے پٹنہ گیا تھا۔ پٹنہ کالج اور سائنس کالج کے پرنسپل، پروفیسروں اور وہاں کے ادیبوں اور اہلِ ذوق سے اور طلبا سے ملنا میرے لئے صرف خوشگوار وقفہ نہیں تھا بلکہ ایک مفید اور قیمتی تجربہ تھا۔ پروفیسر اختر اورینوی کی تحریریں رسالوں میں دیکھ کر خاص متاثر ہو چکا تھا۔ محض ان تحریروں کے ادبی محاسن سے نہیں بلکہ اس شرافت نفس سے اس کلچر اور انسانیت سے جس کی حامل ان کی زندگی اور ان کی تحریریں ہیں۔ ان کے بے تکلف تپاک اور خلوص کا مجھ پر بہت اثر تھا۔ وہاں کے لوگوں سے مل کر مجھ پر یہ اثر ہوا کہ اردو کو ترقی دینے والے اگر ایسے نیک، روشن خیال، مستعد اور غیر متعصب افراد ہیں تو اردو ہرگز نہیں مٹ سکتی۔ وہیں شام کی صحبت میں ایک ہونہار نوجوان طالب علم جناب آزر تمنائی نے مجھے نیا سنسار، کتاب گھر، [illegible] پٹنہ کی طرف سے تین کتابیں نذر کیں۔ پہلی کتاب کا نام ہے "ہماری زبان" مصنفہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ یہ ایک مقالہ ہے جو چھوٹی تقطیع پر شائع ہوا ہے۔ کتابت اور طباعت میں نہایت خوش سلیقگی سے کام لیا گیا ہے۔ قابل مقالہ نگار نے اس اسّی صفحوں کے مقالہ میں دلیلوں اور مثالوں سے یہ سمجھایا اور بتایا ہے کہ اردو ہندستان کے ہندو مسلمانوں دونوں کی مشترکہ زبان ہے۔ اس دعوے کو انہوں نے تاریخی واقعات کے حوالے دیکر ثابت کیا ہے۔ اردو اور ہندی کے مسئلہ کو طے کرنے میں مصیبت یہ پیش آتی ہے کہ زیادہ تر لوگ بغیر کسی دلیل کے یا تو اردو کی موافقت میں فیصلہ کر لیتے ہیں یا ہندی کی موافقت میں کچھ معقول کچھ نیم معقول اور کچھ نامعقول دلائل بہم پہنچاتے ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی باتیں انہیں لوگوں کو موثر اور دلنشیں معلوم ہوں گی جو ٹھنڈے دل سے تنگ خیالی اور تعصب کو دور کر کے اس مسئلہ پر ذمہ دارانہ اور مدبرانہ طور پر خلوص کے ساتھ غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میری [illegible] مستقل رائے یہ ہے کہ جس زبان میں ہندی نثر و نظم گذشتہ چالیس برسوں کے اندر عام طور پر لکھی گئی ہے اور جس ہندی کا پرچار کیا جا رہا ہے (اس زبان میں اور جو بھی خوبیاں ہوں وہ) ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی زبان مشترکہ زبان ہو سکتی ہے تو وہ اردو زبان ہے، بشرطیکہ اس کی رائج لغت میں اور اسلوبِ بیان میں خوبصورت اور خوش آہنگ فارسی عربی الفاظ اور فقروں کے ساتھ ساتھ ہزارہا سنسکرت کے خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ اور ٹکڑے بھی جوڑ دئے جائیں اور اردو کتابیں فارسی رسم الخط اور ناگری رسم الخط دونوں میں شائع ہوں۔ پہلی شرط کی تکمیل ہو چکی ہے اور اردو لغت سنسکرت الفاظ کے اضافہ سے اور بھی زیادہ جاندار اور وسیع ہوتی جائے گی۔ دوسری شرط کی تکمیل کی طرف، یعنی اردو کتابوں کو ناگری حروف میں شائع کرنے کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے۔ اسی طرح اگر آج کل کی ہندی بھی ان سنسکرت الفاظ کو جو خوبصورتی سے ہندی میں نہیں کھپ سکتے خارج کر کے صرف خوبصورت اور نرم سنسکرت الفاظ رائج کرے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہزاروں ایسے فارسی، عربی الفاظ و فقرے ہندی اسلوبِ بیان میں داخل کرلے جو ہندو مسلمان دونوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں تو ہندی اور اردو دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آجائیں گی۔ وہ ہندی یا اردو جس میں زیادہ تر ٹھیٹ الفاظ ہوں اور جس میں سنسکرت کی چاشنی کے ساتھ فارسی اور عربی کی بھی چاشنی ہو حقیقی معنوں میں ہماری مشترکہ زبان بن جائے گی۔ اردو تو اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ اس کا دل بڑا ہے لیکن ہندی ابھی اس بات کا ثبوت نہیں دے رہی ہے۔

دوسری کتاب جو جناب آزر تمنائی نے مجھے نذر کی اس کا نام ہے "افادی ادب" مصنفہ جناب اختر انصاری۔ یہ بھی اسی سریز اور اسی صورت شکل اور تقطیع پر ہے جس پر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا مقالہ ہے۔ ان کتابوں پر قیمت درج نہیں ہے لیکن غالباً آٹھ آنے فی کتاب سے زیادہ قیمت نہیں ہے۔ یہ بھی ایک مقالہ ہے جس میں ادب اور شاعری کے ان فرسودہ پامال اور ضرر رساں نظریوں پر بحث کی گئی ہے جو ایک زمانے سے [illegible] کے مصنفوں، شاعروں اور ادبی حلقوں کے دل و دماغ پر مسلط تھے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے تھے کہ

خبر کے کہ سفینے ڈبو چکی کتنے   فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی (اقبال)

یہ مقالہ بہت سنبھل کر لکھا گیا ہے اور بہت غور و فکر اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ روشن خیال مقالہ نگار نے نہایت مُوقر اور مدلل انداز میں بتایا ہے کہ ادب ایک سماجی پیداوار ہے اور سماجی زندگی کے رجحانات اور محرکات جو بظاہر حسین یا معصوم ہیں یا جنہیں ادب حسین و معصوم بنا دیتا ہے مگر جو ہیں حقیقتاً مضرت رساں بلکہ مہلک ان رجحانات اور محرکات کی ایسی ترجمانی ادیب کو نہیں کرنا چاہیئے کہ ان رجحانات و محرکات کو تقویت ملے۔ نمک حلال مصنف کو محض ادب برائے ادب کا پیرو نہیں ہونا چاہیئے، اسے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مفکر اور مدبر ہونے کی ضرورت ہے۔ اسے اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ اس کی باتوں میں کتنا وزن ہے اور اس کی باتیں سماجی زندگی کو بدلنے میں اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں کہاں تک مدد دے سکتی ہیں۔ ادیب کا بھی وہی کام ہے جو اصلاح اور انقلاب کے پیشواؤں کا کام ہے یا فلسفی اور مفکر کا کام ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ادیب کا آلۂ کار سماجی اور سیاسی لیڈر یا فلسفی سے مختلف ہے کیونکہ ادب ایسی ہنسی چیز نہیں جیسا اسے وہ لوگ خیال کرتے ہیں جو ادب کی غرض و غایت دل و دماغ کے لیے وہ نشاط فراہم کرنا سمجھتے ہیں جو ایک حسین اور نشہ آور مہملیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ پاکیزہ تریں لذتیت بھی کافی نہیں اگر ادب میں فرزانگی اور عمل کی چنگاریاں نہ بھری ہوں۔ میں نے تو اس کتاب کے موضوع کو مجمل طور پر بیان کر دیا ہے لیکن جس کاوش اور عرق ریزی سے اصل کتاب میں اس اصول کی وضاحت کی گئی ہے۔ جزئیات اور کلیات جس طرح مع مثالوں کے بحث کی گئی ہے جس طرح اس مسئلہ کی گتھیاں سلجھائی گئی ہیں جس طرح قدم قدم پر ہمیں دعوتِ غور و فکر دی گئی ہے اس کا اندازہ اس مختصر کتاب کو پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اگر ہمارے وہ نوجوان جو مصنف ہونا چاہتے ہیں اس کتاب کا بغور مطالعہ کریں اور اس کی باتیں ہضم کریں اور پھر تصنیف و تالیف کے لئے یا صحافت نگاری کے لئے قلم اٹھائیں تو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہمارے ادب میں کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔

تیسری کتاب کا نام ہے "زندہ چین"۔ اور یہ بھی نیا سنسار کتاب گھر بانکی پور سے شائع ہوئی ہے۔ یہ مجلد کتاب ہے اور اس میں پونے تین سو صفحات ہیں۔ اس کی قیمت بہت کم رکھی گئی ہے یعنی صرف عہ۔ یہ کتاب چین کے جدید افسانہ نگاروں کے کچھ افسانوں کا اردو ترجمہ ہے اور اس کے مرتب و مترجم جناب تمنائی ہیں۔ کتاب زیر نظر میں سات چینی مرد اور عورت افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے ہیں جن افسانوں کی تعداد گیارہ ہے۔ ان میں سے کچھ چینی مصنفوں کے حالات زندگی بھی دئے گئے ہیں جو دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں کیونکہ ان میں سے کچھ مصنف محض قلم کے سورما نہیں تھے بلکہ انقلاب چین اور تاریخ چین کی روح فرسا کش مکش میں عملی حصہ لیا ہے اور ان کی زندگی بجائے خود ایک مسلسل جوکھم (adventure) کی حیثیت رکھتی ہے۔ کچھ مصنفوں کے حالات نہیں مل سکے۔ افسانوں کے انتخاب میں خوش سلیقگی سے کام لیا گیا ہے۔ غالباً یہ ترجمے انگریزی ترجموں کے ترجمے ہیں مگر اردو ترجمہ نہایت کامیاب ہے۔ جہاں تک افسانوں کا تعلق ہے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگرچہ روسی ادب انقلاب روس سے پہلے ہی دنیا کے بلند تریں لٹریچر کے دوش بدوش کھڑا ہو چکا تھا بلکہ کئی امور میں دنیا کے ادب کی پیشوائی کر رہا تھا چین کے ادب پر نگاہیں حال ہی میں پڑنے لگی ہیں۔ چین کے پچاس کے افسانوں نے جس نئے جنم کا ثبوت دیا ہے اور دے رہے ہیں وہاں زندگی جس طرح کروٹیں لے رہی ہے اس انقلاب کی اس ہولی دوزخ اور جنت کی کچھ جھلکیاں ان افسانوں میں ہمیں ملتی ہیں۔ ہر افسانہ ہمیں چین کی روح سے چین کی زندگی اور اس کی شخصیت سے، سامنے سے اور مختلف زاویوں سے روشناس کراتا ہے۔ واقعیت ان افسانوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ان مصنفوں کی نگاہیں چین کی تاریخی زندگی اور جدید زندگی کے دل کو چیر جاتی ہیں۔ زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان اہم گہرے اور بسا اوقات نہایت ناخوشگوار حقائق سے بھی ہمیں یہ کہانیاں دوچار کرتی ہیں ——— اور ہمیں بتاتی ہیں کہ ان چینی مصنفوں کی زندگی پر گرفت کتنی صحیح اور زبردست ہے۔ ان کی نگاہیں کتنی اچوک ہیں اور چین کا نشاۃ ثانیہ کن ڈراما‌ئی کیفیتوں کا حامل ہے۔

فراق گورکھپوری

پیامِ پیرِ ہندؒ

جنوں اگر ہے جنونِ کامل ترا جنوں کامیاب ہوگا
تو شمع پروانہ سے بنے گا تو ذرّہ سے آفتاب ہوگا

تمام غنچہ دریدہ ہو کر ہی رنگ و بو کی بہار دے گی
وفورِ سوزِ درونِ دل سے ظہورِ حسنِ شباب ہوگا

یہ تیری اپنی ہی کم نگاہی "حجابِ اکبر" بنی ہوئی ہے
کھُلے گی جب خواب کی حقیقت تو آپ تعبیرِ خواب ہوگا

یہی ہے وہ جاں نواز نکتہ چھپا ہوا ہے جو "من عرف" میں
فلاح پائے گا۔ بارگاہِ خودی میں جو باریاب ہوگا

سحر کی آنکھوں سے اشکِ شبنم ٹپک ٹپک کر یہ کہہ رہی ہیں
سفینۂ "نیل نور" ہوگا وہ دل جو چشمِ پُر آب ہوگا

یہی سمجھانے کو روزِ اوّل ملائکہ نے کیا تھا سجدہ
نہیں کہیں بھی جواب تیرا تو آپ اپنا جواب ہوگا

ٹپک نہ جائے یہ اشک بنکر سنبھالکر اسکو دل میں بھر لے
اسی تمنا کا خون اس خم میں رہ کے "لعلِ مذاب" ہوگا

تشنۂ شراب

سرائے کے باہر

ڈرامے کے افراد

اندھا بھکاری
منی۔ اندھے بھکاری کی ایک نوجوان لڑکی
بھکارن۔ اندھے بھکاری کی بیوی۔
جانی لنگڑا۔ ایک چالاک پُرفن بھک منگا

ایک آوارہ شاعر
سرائے کا مالک
بی بی۔ سرائے کی ایک نوکرانی۔
چند شکاری اور اُن کی بیویاں۔

منظر۔ ایک پہاڑی قصبے کی سرائے کے دروازے پر، دروازے سے چند گز کے فاصلے پر اندھا بھکاری اور اُس کی بیوی الاؤ پر بیٹھے آگ تاپ رہے ہیں۔ منی سرائے کے بڑے دروازے پر کھڑی سرائے کی نوکرانی سے باتیں کر رہی ہے۔

منی۔ بی بی۔ کچھ کھانے کو دو گی، صبح سے بھوکی ہوں۔

بی بی۔ پرے ہٹ مُردار، کیوں اندر گھسی چلی آتی ہے، جا کسی مشٹنڈے کی بغل میں بیٹھ اور چین سے رہ، تیری جوانی کو آگ لگے۔

منی۔ بی بی۔ کیوں ناحق گالی دیتی ہو۔

بی بی۔ گالی، اری دو ٹکے کی بھکارن تجھے بھی گالی لگتی ہے۔ اے ہے میری شرم کی ماری لاجونتی۔ دن بھر دیدے مٹکاتی پھرتی ہے اور سرائے کے مسافروں کو تاکتی پھرتی ہے۔ اور اب رات گئے وقت، بڑی معصوم، بڑی شریف، بڑی وہ، اونہہ، چڑیل!

منی۔ بی بی۔

بی بی۔ بی بی کی بچی۔ اری اگر میں تجھے گالی دیتی ہوں تو اس کے بدلے تجھے کھانا بھی تو دیتی ہوں، تجھے اور تیرے بوڑھے بھکاری باپ کو اور تیری ماں چڑیل کٹنی کو۔ دو گالیوں میں کیا یہ سودا مہنگا ہے۔ مجھے دیکھ اس سرائے میں صبح سے لیکر شام تک جھوٹے برتن مانجھتی ہوں، کنویں سے پانی نکالتی ہوں، مالکن اور مالک کی سو سو خوشامدیں کرتی ہوں۔ اور — اچھا دیکھ اس وقت مجھے نہ ستا، مسافرخانے میں اندر آر وقت بہت لوگ جمع ہیں۔ مجھے کتوں کی دیکھ بھال کرنی ہے۔ جب یہ لوگ کھانا کھا چکیں گے، اس کھڑکی کی طرف آ جائیو۔ اور جو کچھ تیری قسمت میں ہو گا لے جائیو۔ اری دیکھ اب ان موٹے موٹے دیدوں میں آنسو نہ چھلکا۔ اللہ اللہ ان تقیوں نے تو تنگ میں دم کر رکھا ہے۔ میں مالکن سے کہتی ہوں [illegible] کر اندر کم سرائے کے باہر مین دروازے

پر توجہ ہونے نہ دیا کرے۔

(سرائے کا دروازہ بند کر دیتی ہے)

بھکارن۔ منی!

منی۔ آئی اماں۔

بھکارن۔ کیا ہوا منی۔

(وقفہ)

اندھا بھکاری۔ منی، بٹیا، بڑی بھوک لگی ہے۔

منی۔ تو مجھے کھا لو ابا۔ بھوک لگی ہے، بھوک لگی ہے۔ جب سنو بھوک لگی ہے۔ جانے یہ پیٹ ہے کیا بلا ہے۔ کبھی بھرتا ہی نہیں، اُدھر بی بی الگ گالیاں دیتی ہیں۔ اور اِدھر یہ میری جان کو کھائے جاتے ہیں۔ بھوک لگی ہے تو میں روٹی کہاں سے لاؤں، بی بی کہہ گئی ہے کہ جب کھڑکی کھلے گی جب روٹی ملے گی۔

اندھا بھکاری۔ کھڑکی کب کھلے گی۔

منی۔ جب مسافر کھانا کھا چکیں گے۔

اندھا بھکاری۔ مسافر کب کھانا ختم کریں گے۔

منی۔ جب کھڑکی کھلے گی۔

اندھا بھکاری۔ جب کھڑکی کھلے گی... کب کھڑکی کھلے گی! میں کچھ نہیں جانتا، میں کچھ نہیں جانتا، منی تو کیا کہہ رہی ہے... میری آنکھوں میں روشنی نہیں رہی، مجھے وقت پر بھیک کی روٹی کوئی نہیں لا دیتا۔ منی کی اماں کیا تمہارے پاس تھوڑی سی [illegible]

ہاں نہیں ہو گی ——— میں اندھا ہوں ———

بھکارن ——— اپنی گستاخ بیٹی کا محتاج ہوں۔

منی۔ صبر کرو، اب تھوڑی دیر میں بی بی کھانا کی کھڑکی کھولے گی، پھر پیٹ بھر کر کھانا ملے گا۔ آج سرائے میں بہت سے مسافر آئے ہیں تو میں روز دعا مانگتی رہتی ہوں کہ سرائے مسافروں سے بھری رہے۔ تاکہ ان کی پلیٹوں سے بہت سا جھوٹا کھانا ہمارے لئے بچ جایا کرے۔

منی۔ لیکن اماں۔ بعض مسافر تو اتنے پیٹو ہوتے ہیں کہ پلیٹیں بالکل صاف کر دیتے ہیں۔ اور کھانا تو ذرا بھی نہیں بچتا۔ ایسے موقع پر اگر بی بی بچ نہ بچا دیں تو ———

بھکارن۔ بُری باتیں نہ مُنہ سے نکال ، وہ سب کا والی ہے ......

منی۔ اُف آج کیسی سردی ہے۔ یہ تیز برفیلی ہوا جسم کو چیرے جاتی ہے۔ آگ ذرا تیز کر دے۔

(الاؤ کی لکڑیاں اِدھر اُدھر کرتی ہے)

منی۔ یہ چیڑ کی لکڑیاں دھواں زیادہ دیتی ہیں۔ آگ کم۔

بھکارن۔ تو جنگل سے کاؤ کی لکڑیاں چن لایا کر۔ میں نے تجھے کئی بار کہا ہے۔

منی۔ ماں، کاؤ کا جنگل بہت گھنا ہے۔ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

بھکارن۔ پاگل ہوئی ہے، ڈر کا ہے کا۔

اندھا بھکاری۔ منی دیکھ، ابھی کھڑکی کھلی کہ نہیں۔ یہ کون آرہے ہیں۔

منی۔ مسافر ہیں سرائے کے اندر جا رہے ہیں۔ اچھا میں جا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوتی ہوں۔ آج امید ہے کہ اچھے کچھ نہ کچھ ضرور ہی ہو گا۔

(چلی جاتی ہے)

بھکارن۔ تم نے سنا منی کو کاؤ کے جنگل میں لکڑیاں چننے سے ڈر لگتا ہے۔

اندھا بھکاری۔ ہاں، منی جوان ہو گئی ہے۔

بھکارن۔ تم اس کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتے۔

اندھا بھکاری۔ اس قصبے میں تو کوئی ایسا بھک منگا ہے نہیں۔ سنا ہے شہروں کے بھک منگے بڑے امیر ہوتے ہیں۔ مجھے ایک دفعہ سرائے کا ایک مسافر بتا رہا تھا کہ اس نے ایک دفعہ اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک شہر ——— مجھے اس شہر کا نام یاد نہیں رہا۔ بھلا سا نام تھا۔ ایک بھک منگا رہتا تھا جب وہ مرا، تو منی کی اماں ساٹھ ستر ہزار روپیہ چھوڑ کر مرا۔ ساٹھ ستر ہزار روپیہ کتنا ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے۔

بھکارن۔ نہیں۔ پر میں سوچتی ہوں کہ میری منی کو بھی کوئی ایسا ہی بھک منگا مل جائے۔

اندھا بھکاری۔ تم نے تو میری بات نہیں مانی، وہ بنیا پانسو مجھے دیتا تھا۔ اسی کے پلے باندھ دیتے۔ منی کی زندگی بھی سدھر جاتی اور ہم بھی۔

بھکارن۔ تم کیا کرتے اُن پانسو روپے سے۔

اندھا بھکاری۔ اُن پانسو روپے سے ...... میں پھر ایک زمین کا قطعہ خرید لیتا۔ گائیں رکھتا۔ بھیڑ بکریاں۔ میرا ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر ہوتا۔ کچی مٹی کا بنا ہوا۔ گھر یا مٹی سے لپا ہوا۔ منی کی اماں۔ تجھے کیا معلوم ہے، کہ بھکاریوں کی ٹولی میں داخل ہونے سے پہلے میں ایک کسان تھا۔

بھکارن۔ مجھے معلوم ہے۔ تم ایسی باتیں مجھے کئی بار سنا چکے ہو۔

اندھا بھکاری۔ تم ایک بوڑھے اندھے کی باتوں پر کب اعتبار کرو گی۔ لیکن منی کی اماں میں نے بھی اچھے دن دیکھے ہیں۔ جہاں میں رہتا تھا۔ وہاں چاروں طرف خوبصورت کھیت تھے۔ کھیتوں سے پرے پہاڑ، ایک اُجلی اُجلی ندی دھان کے کھیتوں میں میٹھے میٹھے گیت گاتی ہوئی بہتی تھی۔ اس ندی کے ساتھ چلتے چلتے میں اپنی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو ریکھ میں لے جایا کرتا تھا۔ جہاں لمبی لمبی دوب تھی اور بنفشے کے پھول اور کھٹے اناروں کے جنگل اور ———

بھکارن۔ اور پھر تمہارا باپ مر گیا۔ اور تمہارے باپ کو گاؤں کے بنئے کا بہت سا روپیہ قرض دینا تھا۔ اور بنئے نے تمہاری زمین قرق کرالی۔ اور تم ہوتے ہوتے ایک بھک منگے بن گئے۔ اور پھر تم ہمارے ٹولے میں آملے۔ میں یہ سب باتیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ انہیں بار بار سنانے سے تمہیں کیا حاصل ہوتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ کہ تم ہمیشہ سے اک بھک منگے تھے ہمیشہ رہو گے۔ اور ایک بھک منگے کی موت ہی مرو گے۔ صرف یہ بات سچ ہے۔ باقی سب جھوٹ ہے۔ نہ تمہارا باپ کسان تھا۔ نہ میری ماں امیر زادی تھی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں میری ماں کون تھی۔ ایک کُٹنی سی چڑیل کی یاد ہے جو میرے سارے پیسے جو میں بازار سے لوگوں کے پیچھے بھاگ کر اکٹھے کیا کرتی تھی، سب چھین لیا کرتی تھی۔ اور اکثر راتوں کو بھی بھوکا رکھا کرتی تھی۔ تاکہ میں کہیں موٹی نہ ہو جاؤں۔

(قدموں کی آواز)

بھکارن۔ کون ہے؟

اندھا بھکاری۔ کون ہے؟

شاعر اور جانی لنگڑا۔ مسافر ہیں۔ بابا، ذرا آگ تاپ لیں۔
اندھا بھکاری۔ مسافر ہو۔ تو سرائے میں جاؤ۔ ہم فقیروں کے پاس کیا کام ہے۔
جانی لنگڑا۔ سرائے کے اندر جانے کی توفیق ہوتی، تو تم سے بات ہی کیوں کرتے۔
اندھا بھکاری۔ تم کون ہو؟
جانی لنگڑا۔ میرا نام جانی لنگڑا ہے۔ پہلے میں نور پور میں بھیک مانگتا تھا پر وہاں پولیس والوں نے بڑا تنگ کر رکھا ہے۔ بیچارے بھکاریوں کی ہر روز پیشی، ہر روز بلاوا۔ یہ میری ٹانگ لنگڑی تھی۔ کچھ اس پر ہیں اپنے دو چار گلے سڑے ناسور بھی ہیں۔ مزے سے بیٹھے بٹھائے روٹی مل جاتی تھی۔ لیکن برا ہو ان پولیس والوں کا۔
اندھا بھکاری۔ اور تمہارے ساتھ یہ دوسرا ساتھی کون ہے۔
جانی لنگڑا۔ یہ اسی سے پوچھ لو۔
شاعر۔ میں ــ میں۔ میں شاعر ہوں۔
اندھا بھکاری۔ شاعر کیا ہوتا ہے، بھئی بڑے بڑے بھک منگے دیکھے۔ قسم قسم کے بھکاری، لیکن یہ قسم آج ہی سننے میں آئی۔
جانی لنگڑا۔ ارے بابا یہ شاعر کبت بناتا ہے۔ کبت، اور گاؤں گاؤں سنا کر اپنا پیٹ پالتا ہے۔
اندھا بھکاری۔ آں ہاں، تو بھاٹ کہو نا، کہو کہ میں بھاٹ ہوں۔ شاعر! عجب نام ڈھونڈا ہے اس نے بھی۔
جانی لنگڑا۔ یہ راستے میں مجھے مل گیا تھا۔ میں نے کہا سفر میں دو ہوں تو راستہ آسانی سے کٹ جاتا ہے۔ اسی لئے اسے ساتھ لیتا آیا۔ بابا تم تو میاں بڑے مزے میں ہو۔ یہ بڑھیا کون ہے؟
اندھا بھکاری۔ یہ میری بیوی ہے۔
(قدموں کی آواز)
اور یہ میری منّی آ رہی ہے۔ میری لڑکی، منّی، یہ جانی لنگڑا ہے۔ یہ شاعر ہے۔ کبت بناتا ہے، کبت۔ بی بی نے کھڑکی کھولی! ہاں۔ تو جلدی سے کھانا دے مجھے۔
منّی۔ لیکن بی بی کہتی ہے کہ ابھی کھانے کے بعد ملے گا۔ آج سرائے میں مسافروں کی بہت بھیڑ ہے۔
اندھا بھکاری۔ تو کچھ تھوڑا سا ہی اس نے دیدیا ہوتا۔ میں تو بھوک سے مرا جا رہا تھا۔
[illegible] بھاگی اسے بھون کر کھا لو۔

اندھا بھکاری۔ کدھر ہے، کدھر ہے۔ کہاں ہے۔ منّی بیٹی [illegible] آگ پر بھون ڈال۔ رات کتنی سردی ہو رہی ہے۔ آہ! اس [illegible] میں بھی جان نکل جا رہی ہے ...... کون ہے؟ کسی کے آنے کی [illegible] آ کر رکی ہے۔ منّی جاؤ ذرا بھاگ کر۔
جانی لنگڑا۔ میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ شاید ایک دو [illegible] بھی مل جائیں۔ منّی ذرا مجھے سہارا دینا۔ آہ!
(قدموں کی آواز۔ گھوڑا گاڑی رکنے کی آواز)
پہلا شکاری۔ اُف، آج تو یار تھک کر چور ہو گئے۔
پہلے شکاری کی بیوی۔ یہ تو کوئی بڑی ذلیل سی سرائے [illegible] ذرا مجھے سہارا دینا۔ Thank you
دوسرے شکاری کی بیوی۔ اور بھئی، ہمیں تو بہت بھوک لگی [illegible] جان نکلی جا رہی ہے، اور پھر یہ بلا کی سردی، شکر ہے [illegible] پہونچیں گے۔
دوسرا شکاری۔ شکار پر مردوں کے ساتھ آنا بھی تو کوئی [illegible] نہیں۔
دوسرے شکاری کی بیوی۔ شکار پر مردوں کے ساتھ آنا بھی [illegible] کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ دیکھ لی آج ہم نے بھی تمہاری [illegible]
Oh, how brave you are — my courageous knight!
منّی۔ صاحب ایک پیسہ، میم صاحب کی جوڑی بنی رہے [illegible] مل جائے۔
جانی لنگڑا۔ غریب محتاج لنگڑے پر ترس کر جاؤ رے بابا!
تیسرا شکاری۔ اوڈیم۔ یہ کمبخت ہر جگہ موجود ہیں۔ اب [illegible] کہ اس on the way to the [illegible] سرائے میں بھی یہ [illegible] کیلئے موجود ہوگی۔
منّی۔ میم صاحبوں کی جوڑی سلامت، صاحب کا اقبال بلند [illegible] جی آپ کے گھر ایک خوبصورت پیارا بچہ .....
پہلے اور دوسرے شکاری کی بیویاں۔ آؤ ڈارلنگ [illegible] [illegible] next! [illegible] چلو جلدی اندر چلیں، ورنہ یہ [illegible] تو ہماری جان کھا جائیں گے۔
(قدموں کی آواز)
پہلا شکاری۔ ہاں آپ چلئے۔ ہم ذرا سامان اتروا لیں [illegible] وسکی کدھر ہے۔

[illegible] میں فکر نہ کرو۔ ایسا میں کچھ قبول سکتا ہوں۔

[illegible] جائے حضور۔

[illegible] ۔ بہرہ۔ انہیں کچھ دینا۔

(برتن میں سکہ پھینکنے کی آواز)

[illegible] کا مالک۔ آئیے۔ آئیے، حضور، اندر تشریف لائیے۔

[illegible] ۔ اوہ۔ تم اس سرائے کا مالک ہے۔

[illegible] لنگڑا۔ حضور کا اقبال بلند ہو، اس غریب محتاج لنگڑے کو بھی [illegible] جائے۔

[illegible] ۔ اوہ — بہرہ۔ جلدی سے اس بلڈی ([illegible]) [illegible] کر نالو — اور تم اس سرائے کا مالک ہے اور دروازے پر [illegible] کو بٹھائے رکھتا ہے۔

[illegible] ۔ مسافروں کو دونوں طرح سے لوٹتا ہے، اندر بھی اور [illegible]

[illegible] کا مالک۔ حضور اندر تشریف لائیے۔ سرائے کے باہر کی زمین کا میں [illegible] ہوں۔ اندر تشریف لائیے حضور۔

[illegible] صاحب جی۔ آپ بھی —

[illegible] ۔ [illegible] ، یہ بھکارن لڑکی تو مجھے خاصی [illegible] معلوم ہوتی ہے، اہی۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں.....

دوسرا بھکاری۔ ہش، بڑے بیہودہ ہو تم۔ بہرہ سب سامان ٹھیک ہے؟

[illegible] ۔ جی حضور۔

[illegible] ۔ چلو بھئی اندر چلیں۔ یہاں کھڑے کھڑے تو لہو بھی جم جائیگا۔

[illegible] کا مالک۔ اندر تشریف لے چلئے حضور۔

[illegible] صاحب جی۔ آپ بھی ایک دوتی —

(صاحب لوگ سرائے کے دروازے کے اندر چلے جاتے ہیں)

[illegible] بھاگو یہاں سے کس وقت سے کھڑی چلا رہی ہے خنڈی [illegible]

([illegible])

[illegible] بھکاری۔ کچھ ملا۔

[illegible] لنگڑا۔ ایک اکنی۔

[illegible] ایک دوتی مجھے بھی۔

[illegible] ۔ جوان عورتوں کو لوگ یہاں بھی زیادہ خیرات دیدیتے ہیں۔

[illegible] لڑکی تو —

[illegible] ۔ ہاں مالک نے اس کے ہاتھ دیا تھا لیکن مٹی کی

ماں نے —

جانی لنگڑا۔ مٹی کی ماں نے عقلمندی سے کام لیا۔ اگر تم بھی عقلمندی سے کام لو تو یہ لڑکی تمہاری ساری عمر کے لئے روٹیاں مہیا کر سکتی ہے۔ کیوں شاعر میاں تمہارا کیا خیال ہے۔

(وقفہ)

جانی لنگڑا۔ شاعر بھائی۔

شاعر۔ ایں۔ کیا کہا۔ معاف کرنا، میں نے سنا نہیں۔

جانی لنگڑا۔ ہی ہی ہی، اچھا ہوا تم نے نہیں سنا۔ اب یہ بتاؤ تم کیا کوئی نیا گیت بنا رہے تھے۔

شاعر۔ ہاں، ایک نیا گیت ہی تھا۔

جانی لنگڑا۔ ذرا سناؤ۔ اور اس سارنگی کو کاندھے پر سے تو اتارو۔

(گانا)

میں ہوں ایک بھکاری میرا جیون ہے کشکول
پھیلی پھیلی دھرتی پر میں پھرتا ہوں آوارہ
نہ میں کسی کا پریمی ہوں نہ کوئی میرا پیارا
دیکھتا ہوں جب زخمی آہیں یا نینوں کی دھارا
سونے گاتے گاتا ہے من ہو کر ڈانوا ڈول
میں ہوں ایک بھکاری میرا جیون ہے کشکول
میری طرح یہ گیت ہیں میرے ننگے بھوکے مارے
میری طرح یہ گیت ہیں میرے آوارہ بیچارے
دن کو پھرتے ہیں یہ در در رات کو گنتے تارے
دنیا والے ان کی خاطر بیت کا مندر کھول
(دشوامترعاول) میں ہوں ایک بھکاری میرا جیون ہے کشکول

شاعر۔ تم کیوں رو رہے ہو بابا۔

اندھا بھکاری۔ مجھے اپنے سکھ کے دن یاد آگئے۔ وہ دھان کے پیارے پیارے کھیت، وہ بہتی ندی کا نرمل شفاف پانی، وہ رکھ جہاں میں اپنا ریوڑ چرایا کرتا تھا۔ میری ماں جو مجھے لوریاں دیا کرتی تھی۔ میرا باپ جو مجھے کاندھے پر بٹھا کر قصبے کے بازار میں سیر کرانے کے لئے لایا کرتا تھا —

بھکارن۔ جھوٹ ہے، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے اسے قصبے کے بازار میں اسے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔ کسان کا بیٹا، اونہہ، رہتا سرائے کے باہر اور خواب دیکھے محلوں کے۔

شاعر۔ ہاں، ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم سرائے کے [illegible]

ں۔ کتے اور بھکاری، جو مسافروں کا بچا کھچا کھانا کھا کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اور اکثر اوقات تو پیٹ بھی نہیں بھر سکتے۔ انہیں ایسے سنہرے اب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ کبھی نہیں دیکھنے چاہئیں۔

انی لنگڑا۔ میاں ان باتوں کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اپنے نے بس یہ سمجھ رکھا ہے کہ جیتو بھکاری اور مرو بھکاری۔ اور ایمان کی بات ہے کہ یہ پیشہ کوئی اتنا برا نہیں۔ بیٹھے بٹھائے روٹی مل جاتی ہے، لوگ چار گالیاں ہی دے دیتے ہیں۔ لیکن ایمان کی بات ہے کہ گالیاں س پیشے میں نہیں۔ ہم نے بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا ہے کہ گالیاں کھاتے ہیں اور چوں نہیں کرتے۔ یار اپنے لئے تو بس یہی پیشہ پسند ہا ہے۔

(وقفہ)

منی۔ شاعر، کیا تمہارے گیت سبھی ایسے ہوتے ہیں۔

شاعر۔ کیا مطلب ہے تمہارا منی۔

منی۔ تمہارا گیت بڑا برا تھا۔ اس نے بابا کو رلا دیا۔ اور مجھے بھی۔

شاعر۔ تم بھی۔

منی۔ ہاں میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

شاعر۔ منی، میرے پاس آنسوؤں کا ایک خزانہ ہے، جسے میں نے دھرتی کے مختلف کونوں سے چن چن کر اکٹھا کیا ہے، ان آنسوؤں میں انسان کی کہانی ہے۔ کیا تم نے کبھی ان گول گول مدور آنسوؤں کے اندر جھانک کر دیکھا ہے، ان میں میلوں تک سرخ سرخ انگاروں کے میدان ہیں۔ اور لاکھوں شعلے اپنی خوفناک زبانیں پھیلائے ہوئے آسمان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان میں زخمیوں کی چیخ و پکار ہے، کمسن بچوں اور بیوہ عورتوں کے شیون، ان آنسوؤں کے افق پر ہمیشہ کالی گھٹا چھائی رہتی ہے، جس میں کبھی کبھی ایک ایسی خوفناک بجلی کا کوندا لہراتا ہے۔ کہ بڑے بڑے جیالوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

منی۔ ہائے، تم نے تو مجھے ڈرا دیا ہے۔

شاعر۔ لیکن ان آنسوؤں کے پیچھے کبھی کبھی سات رنگوں والی دھنک کا نرم و نازک جھولا بھی نظر آ جایا کرتا ہے، بس ایک ہی لمحے کے لئے، پھر وہ اسی کالی گھٹا میں غائب ہو جاتا ہے۔ اور لاکھوں شعلوں کی سرخ پتلی زبانیں آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔

منی۔ میں آج تک کبھی کسی جھولے پر نہیں بیٹھی۔ شاعر، کیا میں اس سات رنگوں والی دھنک پر بیٹھ سکتی ہوں۔ بس صرف ایک لمحے کے لئے۔

شاعر۔ [illegible] کسی انسان نے اس دھنک کو نہیں چھوا ہے۔ چھونا تو کیا بہت سوں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں [illegible] میں نے بھی تو کبھی کبھی اسے دیکھا ہے۔ یہ دھنک ہر ایک آنکھ کے آنسوؤں میں نہیں جھلملاتی، ہاں جب میں گیت گاتا ہوں [illegible] گیت سن کر کسی معصوم بچے کی آنکھوں میں آنسو جھلنے لگتے ہیں [illegible] میں اس دھنک کو ایک لمحے کے لئے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر یہ دھنک [illegible] ایک آنسو میں دکھائی دے، تو یہ آگ کے جہنمی شعلے ہمیشہ کے لئے بجھ جائیں۔

منی۔ تو پھر کیا ہو۔ شاعر تم بڑے ہی عجیب آدمی ہو۔

شاعر۔ پھر کیا ہوگا۔ منی، پھر وہ ہوگا جو تمہاری آنکھوں نے کبھی نہیں [illegible] جس کھڑکی کے کھلنے کی تمنا تم ہر دم کرتی رہتی ہو، وہ کھڑکی ہمیشہ کے لئے کھل جائے گی۔

منی۔ تو کیا تم اسی واسطے دھرتی کے مختلف کونوں سے آنسو جمع کرتے رہتے ہو۔

شاعر۔ ہاں۔

منی۔ ابا۔ ابا، یہ مسافر کہتا ہے کہ میں دھرتی کے مختلف کونوں سے آنسو جمع کرتا رہتا ہوں۔ تاکہ ہماری یہ سرائے والی کھڑکی ہمیشہ کے لئے کھلی رہے۔

(لنگڑا جانی، منی کی اماں اور ابا اور منی خوب ہنستے ہیں۔)

جانی لنگڑا۔ یہ گیت بنانے والے سبھی پاگل ہوتے ہیں۔

(ہوا کا تیز جھونکا۔ دور جنگل میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز)

اُف یہ ہوا کتنی سرد اور برفیلی ہے۔ بیچارے انسانوں پر تو آفت ہی ہے جنگل میں گیدڑ تک سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے چلا رہے ہیں۔

اندھا۔ کیا تم نے وہ کہانی نہیں سنی؟ ایک تھا راجہ، اس نے جب سردی کے دنوں میں گیدڑوں کو یوں چلاتے ہوئے سنا، تو [illegible] سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ وزیر نے بتایا کہ مہاراج ان گیدڑوں کو سردی لگتی ہے۔ مہاراج نے حکم دیا کہ اسی وقت ان گیدڑوں میں کمبل اور لحاف مفت تقسیم کئے جائیں۔

(شاعر ہنستا ہے)

اندھا۔ (خفا ہو کر) کیوں ہنستے ہو شاعر؟

شاعر۔ میں پوچھتا ہوں کیا اس راجہ کے شہر میں کوئی بھکاری نہ تھا

(ہنستا ہے)

اندھا۔ بھکاری کیوں نہ ہونگے، یہ شاعر کیسی باتیں کرتا ہے [illegible] جہاں راجہ ہوگا وہاں بھکاری بھی ہونگے، لیکن اس بات [illegible]

[illegible] کیا فلسفی! میں کہانی سنا رہا تھا اور بیچ میں تو ٹوک دیتا ہے؟

[illegible] کیسا آدمی ہے۔ تمہارا دوست جاتی!

جاتی لنگڑا۔ معاف کر دو بھئی اسے، تم جانتے ہی ہو یہ کبت بنانے والے [illegible] بے سرو پا باتیں کیا کرتے ہیں۔

[illegible] ہاں، گیدڑوں والی کہانی سے مجھے بھی ایک بات یاد آ گئی۔ [illegible] دفعہ میں سڑک پہ بیٹھی بھیک مانگ رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔ کوئی [illegible] کوئی پیسہ، بھکارن بھوکی ہے۔ کوئی روٹی، کوئی پیسہ، بھکارن [illegible] ہے۔ اتنے میں میرے قریب سے ایک خوبصورت عورت گذری [illegible] ریشم کا تھا، اور سر سے پاؤں تک زیور میں لدی پھندی [illegible] اس کے ساتھ ایک نہایت پیاری ننھی لڑکی تھی۔ میں نے انہیں [illegible] اور بھی مسکین آواز میں کہا۔ کوئی روٹی، کوئی پیسہ، بھکارن بھوکی [illegible] اس پہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنے بٹوے سے [illegible] نکال کر میری ہتھیلی پہ رکھا۔ ننھی لڑکی بول اٹھی۔ کہنے لگی، ماں [illegible] ہے۔ ماں نے کہا۔ ہاں بیٹا۔ یہ بھکارن ہے، غریب ہے، [illegible] ہے۔ ننھی لڑکی بولی۔ ماں یہ بھوکی ہے تو بسکٹ کیوں نہیں [illegible] بسکٹ؟ سنا تم نے منی کے ابا۔ بسکٹ (کھو کھلے انداز میں [illegible] ہے) اس کی ماں نے اسے ایک زور کا طمانچہ لگایا۔ اور پھر اپنی [illegible] لڑکی کو لیکر آگے نکل گئی۔

(کھوکھلے انداز میں ہنستی ہے)

اندھا۔ ابھی میری کہانی تو پوری ہوئی نہیں کہ تم لوگوں نے بیچ [illegible]

[illegible] (دور سے آواز دیتی ہے) منی، منی، منی بیٹا۔

[illegible] کھڑکی کھل گئی ہے۔ منی کھڑکی کھل گئی ہے۔ بی بی تجھے بلا [illegible] ہے بھاگ کر جا۔

[illegible] منی، منی۔

جاتی لنگڑا۔ بی بی کھڑکی پر نہیں ہے۔ وہ تو سرائے کے دروازے [illegible] کی آوازیں لگا رہی ہے۔

بھکارن۔ منی، جا بھاگ کر۔

[illegible] آئی، بی بی جی۔

(دوڑتی ہوئی جاتی ہے۔)

[illegible] بی بی جی، اب کھانا دو گی۔

[illegible] ہاں، چڑیل، تجھے کھانا بھی دو گی اور بہت سی اچھی اچھی [illegible] دوں گی۔ چل سرائے کے اندر چل، سرائے کے مالک تجھے [illegible]

[illegible] بیٹھے ہیں۔

منی۔ اہا! تنگل بھاگ کر کہاں ہیں سرائے کے مالک۔

(سرائے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے)

بھکارن۔ منی سرائے کے اندر چلی گئی؟

جاتی لنگڑا۔ بی بی، منی کو لیکر سرائے کے اندر چلی گئی، سرائے کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔

اندھا بھکاری۔ سرائے کے اندر چلی گئی؛ کیا کہہ رہے ہو جاتی، میری منی تو آج تک کبھی سرائے کے اندر نہ گئی تھی..... منی کیسے سرائے کے اندر چلی گئی۔ سرائے کے اندر..... منی ـــــ منی ـــــ منی۔

شاعر۔ آخر ایک نہ ایک دن اسے سرائے کے اندر جانا ہی تھا۔

اندھا بھکاری۔ نہیں۔ میری بیٹیا.....

شاعر۔ اور آج سرائے کی دہلیز نے اس کی زندگی کے دو ٹکڑے کر دئے سرائے کے اندر اور سرائے کے باہر۔ اور اب منی کی لاج اسی سرائے کی دہلیز کے محور پر آوارہ ہو کر بھٹکا کرے گی۔ ذرا آگ تیز کر دو جاتی، میرے گیت اس برفیلی رات میں سردی سے ٹھٹھرے جا رہے ہیں۔ وہ ان آوارہ گیدڑوں کی طرح ہیں جنہیں سردیوں میں کوئی کمبل نہیں دیتا۔ وہ ان اندھے بھکاریوں کی طرح ہیں، جن کی بوسیدہ اور پرانی گدڑی میں ہوا برف کے کانٹے بن کر چبھتی ہے۔ میرے گیت بھوکے، ننگے اور پیاسے ہیں، انہیں کوئی بسکٹ نہیں دیتا، میرے گیت کانٹوں کے گلے سڑے ناسور ہیں۔ ان رستے زخموں پر آج تک کسی نے پھاہا نہیں رکھا۔

(سارنگی بجانے لگتا ہے۔)

جاتی لنگڑا۔ ہی ہی ہی، دماغ چل گیا ہے سردی سے بیچارے کا۔

گیت

میری طرح یہ گیت ہیں میرے ننگے بھوک کے مارے
میری طرح یہ گیت ہیں میرے آوارہ بیچارے
دن کو پھرتے ہیں یہ در در رات کو گنتے تارے
دنیا والے ان کی خاطر ہیت کا مندر کھول
میں ہوں ایک بھکاری میرا جیون [illegible] کشکول

ان کی خاطر ہیت کا مندر کھول او دنیا والے
اس میں پھر اک سندر سی آشا کی جوت جگا لے
[illegible]

من کی دولت ڈھونڈنے والے من سے تیرے بول
میں ہوں ایک بھکاری میرا جیون ہے کشکول
(اندھا بھکاری اپنی گٹھڑی سمیٹنے لگتا ہے)

بھکارن۔ کہاں جا رہے ہو، منّی کے ابا۔

اندھا۔ میں اپنی منّی کو واپس بلانے جا رہا ہوں۔ میں سرائے کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا، شور و غل مچاؤں گا، چیخوں گا، چلاؤں گا، گالیاں دوں گا، سمجھا کیا ہے انہوں نے، میں بھی کبھی کسان تھا، میرا بھی گھر تھا، بیلوں کی جوڑی تھی، خوبصورت کھیت تھے.... میری منّی۔

جانی لنگڑا۔ چلو، چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں، آؤ شاعر میاں۔

(آہستہ آہستہ جاتے ہیں۔)

جانی لنگڑا۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ۔

(کھٹ کھٹ)

جانی لنگڑا۔ کوئی نہیں بولتا۔

(کھٹ کھٹ)

جانی لنگڑا۔ سرائے میں خاموشی ہے۔

(کھٹ کھٹ)

جانی لنگڑا۔ سب سو رہے ہیں۔

(کھٹ کھٹ)

شاعر۔ (طنز سے) منّی بھی سو رہی ہوگی۔

اندھا۔ دروازہ کھول دو، دروازہ کھول دو۔ سرائے کے بدمعاشو، دروازہ کھول دو۔ میری منّی کو میرے حوالے کر دو۔ میری بیٹی کو میرے حوالے کر دو، میں منّی کا باپ ہوں، دروازہ کھول دو، دروازہ کھول دو۔ (کھٹ کھٹ کھٹ) آہ، ظالمو، شیطان کے جہنمی بیٹو، میری معصوم منّی کو مجھے واپس دیدو۔ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، تم نے مجھ سے میرا گھر چھینا، میرے سنہرے کھیت چھینے، میرے خوبصورت بیلوں کی جوڑی، میری آنکھیں بھی تم نے مجھ سے چھین لیں۔ اب میں اندھا ہوں، تمہارے دروازے کا بھکاری ہوں، یہ دروازہ کھول دو۔ (کھٹ کھٹ) کھول دو، ظالمو ایک اندھے بھکاری پر رحم کرو، اس کے بڑھاپے کا سہارا، اس کی اندھی زندگی کا جھنڈا مجھ سے واپس دیدو۔ ہاں مجھے میری منّی واپس کر دو۔ میں پھر تم سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گا۔ چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا جنگل کی پگڈنڈیوں میں جا کر بسیرا کر لوں گا۔ چپ چاپ چلا جاؤں گا۔

(کھٹ کھٹ کے بیچ)

(سسکیاں لیتا ہے)

شاعر۔ میں جانتا ہوں یہ سرائے کبھی نہ بولے گی، سرائے گونگی ہے، جامد ہوتی ہے، اس کا سینہ پتھر کا ہوتا ہے، یہ پتھر جو ہر روز تھکے ہوئے پاؤں سے ٹکراتے ہیں اور ان میں زخم پیدا کر دیتے ہیں، یہ پتھر اس سرائے کی دیواریں بنی ہیں۔ صرف دیواریں ہی نہیں اس کا سینہ بھی پتھر ہی کا ہے۔ اس سینے میں دھڑکن پیدا نہیں ہوتی اور جہاں دھڑکن نہ ہو وہاں آواز بھی نہیں ہوتی۔ اسی لئے تو سرائے خاموش ہے۔ لیکن گھبراؤ نہیں، اس بے آواز سرائے میں جس طاقت نے منّی کو نگل لیا ہے، وہ وقت آنے پر خود بخود اسے اُگل کر باہر پھینک دے گی۔ آؤ اپنے الاؤ پر چلیں۔

جانی لنگڑا۔ ہاں، ہاں، آؤ۔ الاؤ کی طرف چلیں۔ بڑھیا بیچاری اکیلی رو رہی ہوگی۔

(آہستہ آہستہ الاؤ کی طرف مڑ جاتے ہیں۔)

(قصبے کا کلاک ایک بجاتا ہے)

شاعر۔ ایک! (وقفہ)

(قصبے کا کلاک دو بجاتا ہے)

شاعر۔ دو! (وقفہ)

(کلاک تین بجاتا ہے)

شاعر۔ تین!

(خراٹوں کی مدھم آوازیں)

شاعر۔ سو گئے، سب سو گئے، اندھا، لنگڑا، بھکارن، سب سو گئے۔ الاؤ کے تپتے ہوئے سرخ شعلے بھی جاگ جاگ کر سو گئے۔ اب کالی اندھیری رات ہے اور ہواؤں کے تیز فراٹے، لیکن یہ تیز فراٹے سرائے کے سخت سینے کو نہیں چیر سکتے، جس طوفان کا تو منتظر ہے، وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ اس لنگڑے کو اپنے ناسوروں سے محبت ہے، اس بھکاری کو اپنی منّی سے، اور تو ۔۔۔ تو اپنی اس بے مصرف سارنگی کے بوجھ کو کاندھے پر اُٹھائے اس بجھتے ہوئے الاؤ کے کنارے کیوں بیٹھا ہے۔ اُٹھ جنگل کی پگڈنڈی کی پرانی دھول تجھے بلا رہی ہے۔ تو راہی ہے، عاشق نہیں، تو مسافر ہے، محبت کرنے والا نہیں۔

(قدموں کی آہٹ)

شاعر۔ کون ہے؟

منّی۔ میں ہوں منّی.... من.... نی.... من نی سرائے کے ... اس نے کہا تھا۔

...نے کہا تھا! یہ تیرے قدم کیوں لڑکھڑا رہے ہیں؟ یہ تیرے ... سے کیسی بو آ رہی ہے۔

... بو کیا ہے .... ہی ہی ہی بو کہ خوشبو، تم شاعر ہو کر بو اور خوشبو میں تمیز نہیں کر سکتے، ہا ہا ہا۔

... (چونک کر) کون!

اندھا۔ یہ منی کی آواز تھی۔

... منی میری بیٹیا، تو اتنا عرصہ کہاں رہی۔

منی۔ میں .... اس سرائے کے اندر، اور اب سرائے کے باہر ہوں، آج بہت خوش ہوں، آج میں نے انگوروں کا رس پیا ہے، ریشم کے کپڑے پہنے ہیں، لذیذ اور میٹھے کھانے کھائے ہیں۔ تمہارے لئے بھی لائی ہوں۔ لو۔ اس رومال میں سب کچھ بندھا ہے۔ اور یہ ــ یہ بھی لو۔

بھکارن۔ یہ کیا؟

جانی۔ نوٹ! دس، بیس، تیس، چالیس، واہ میرے یار، یہ لونڈیا تو بڑی ... ہے۔

بھکارن۔ چالیس؟ وہ بنیا تو پانسو دیتا تھا۔

اندھا۔ (چلا کر) منی .... منی .... ذرا میرے قریب آ، میری بیٹی۔

منی۔ کیا بات ہے ابا۔

اندھا۔ اور قریب آ، میرے قریب آ جا۔ میری بیٹی۔

(اندھا منی کا گلا دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ منی چیختی ہے۔ شاعر اور جانی ان دونوں کو الگ الگ کر دیتے ہیں)

منی۔ کیا بات ہے ابا .... کیا بات ہے .... تم تو مجھے (لمبی لمبی سانسیں) جان سے مارے ڈالتے تھے۔ میں نے کیا کوئی بُری بات کی ہے؟ تمہارے لئے کھانا لائی ہوں۔ اپنے لئے یہ خوبصورت کپڑے ــ دیکھو یہ میرے بدن پر کیسے سجتے ہیں۔ اچھے لگتے ہیں نا۔ وہ بہت ... ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے، کہتا تھا، جب میں نے ... سرائے کے باہر دستک دی تھی اُسی لمحے سے میں تم سے محبت کرنے ... اُس کی باتیں بہت ہی رسیلی تھیں۔ اس نے مجھے بہت بہت پیار ... وہ کہتا ہے، وہ کہتا ہے۔ میں تم سے شادی کر لوں گا، وہ کل ... گا۔ پھر وہاں سے وہ سرائے کے مالک کو خط لکھے گا، اور پھر ... ایک خوبصورت چار گھوڑوں والی گاڑی آئے گی۔ اور میں ... اپنے خاوند کے گھر جاؤں گی۔ اماں تمہیں یاد ہے نا ایک بار ایک ... نے تم سے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا کہ یہ لڑکی بڑی ہو کر شہزادی بنے گی، بھکارن سے شہزادی، اماں وہ بہت ہی امیر ہے۔ میلوں تک اُس کے کھیت پھیلے ہوتے ہیں، اُس کے پاس بیلوں کی جوڑیاں ان گنت ہیں۔ اُس کا گھر سُرخ اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ اور اس کے چاروں طرف ایک وسیع باغ ہے۔ ماں وہ بڑا ہی اچھا آدمی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے ابا اور اماں کو بھی ساتھ لے چلوں گی، وہ کہنے لگا۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے، میں ان دونوں کیلئے ایک الگ مکان بنوا دوں گا۔ اور تمہارے ابا کے لئے کھیت اور بیلوں کی جوڑی بھی خرید دونگا۔ تم میرے ساتھ چلو گے نا ابا ــ اماں تم بھی، اب ہم بھکاری نہیں رہیں گے، در بدر بھیک نہیں مانگیں گے، بی بی کی گالیاں نہیں سہیں گے۔ سرائے کے باہر سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے الاؤ کی مدھم آگ نہیں تاپیں گے۔ ہاں، جانی کو بھی ساتھ لیتے چلیں گے، میں اس سے کہہ دوں گی، وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ شاعر تم بھی ہمارے ساتھ چلنا، تمہارے میٹھے گیت سُن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے، کیوں ٹھیک ہے نا۔ ٹھیک ہے نا ابا ــ (وقفہ) اماں (وقفہ) جانی (وقفہ) تم سب چُپ کیوں ہو، شاعر، کیا بات ہے؟ تم بھی نہیں بولتے؟ تم بھی نہیں بولتے ... (مدھم آواز میں سسکیاں لیتے ہوئے) تم بھی نہیں بولتے! ....

(سسکیاں لیتی ہے)

شاعر۔ رومت، منی، آج تم واقعی اس کالی اندھیاری رات کی شہزادی ہو، اس سرائے کی ملکہ ہو، تمہارا لباس ریشم کا ہے۔ تمہارے بالوں میں گلاب کے پھول ٹنکے ہوتے ہیں۔ تمہارے لبوں پر تمہارے محبوب کے بوسے چمک رہے ہیں۔ آج کی رات تم نے سات رنگوں والی قوس و قزح دیکھی ہے، آج کی رات وہ تمہارا خاوند ہے، آج کی رات وہ تمہیں اپنے چار گھوڑوں والی گاڑی میں بٹھا کر اپنی بیاہتا بنا کر اپنے گھر لے گیا ہے۔ آج کی رات اُس نے تمہیں اپنے سونے اور جواہرات کے بنے ہوئے محل کی سیر کرائی ہے۔ تمہاری کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے وسیع باغات میں پھرایا ہے۔ رومت منی۔ ان خوشی کے آنسوؤں کو سنبھال کر رکھ، ان آنسوؤں کو تو دوبارہ نہ حاصل کر سکے گی، آج کی رات تو نے کیا کھویا ہے، اور کیا پایا ہے؟ یہ شاید تو اس وقت نہیں جان سکتی۔ کل صبح جب وہ مسافر اپنی چار گھوڑوں والی گاڑی میں سوار ہو کر اپنے سونے کے محل میں واپس چلا جائیگا۔ اُس وقت تجھے معلوم ہوگا کہ تو اس ... سرائے کی پتھریلی دہلیز سے بیاہی گئی ہے، کہ جس کے آستانے کی جبہ سائی کرتے کرتے تیرا باپ اندھا ہو چکا ہے۔ رومت، منی، ... ساری عمر پڑی ہے، کل تجھے معلوم ہوگا کہ ...

ہے وہ سب کے سب افق تک [illegible] بھی گیا ہے۔ وہ [illegible] باغات اور محبت
بجز اسد ویران ہو گئے ہیں، جن میں تپتی ہوئی ریت کے بگولے اڑتے ہیں
اور غول بیابانی جنہیں پالتے ہیں۔ اور تو اپنے [illegible] میں اپنی ہوئی
ہاتھ پھیلائے بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ کوئی روٹی، کوئی پیسہ، بھکارن
بھیک۔۔۔!

منی۔ نہیں، نہیں، شاعر، یہ کیسے خوفناک الفاظ ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟

شاعر۔ تیری بدنصیبی یہی ہے، کہ تو نے ابدی مسرت، حسن کے چند لازوال لمحے اپنی پاک و صاف روح کی پہنائیوں سے نکال کر ایک ایسے آدمی کو بخش دیے، جو اُن کی قدر و قیمت نہیں جانتا۔ اس کائنات کے بے پیانہ طلسم میں کوئی انسان ان کی قدر و قیمت نہیں جانتا، وہ لمحات جن کا جواب چاند اور سورج کی دُنیاؤں کے پاس بھی نہیں ـــ لیکن انسان ابھی انسان نہیں ہے، وہ ہر اس چیز کو گزند پہونچاتا ہے جو خوبصورت ہے، مقدس ہے اور معصوم ہے، اور ہر اُس چیز کا پجاری ہے، جو اُس پر ظلم کرتی ہے، اُس کی رُوح کو کچل کر اُسکے نازک احساسات کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے۔

جانی لنگڑا۔ سچ سچ، بہک گیا ہے بے چارہ، دماغ چل نکلا ہے اِس کا۔ چاند اور سورج، اور شعلے اور قوس و قزح۔ بھلا اِن باتوں کا چالیس روپوں سے کیا تعلق؟ جا بھائی جا، بہت مغز چاٹ لیا تو نے، اب اگر یوں سیدھی طرح نہ جائے گا تو جانی لنگڑا تجھے اپنی لنگڑی ٹانگ کے کرتب دکھائے گا۔ یہ میری لنگڑی ٹانگ ایسے موقعوں پر خوب چلتی ہے، بڑا آیا ہے منی کو بہکانے والا۔۔۔ چلا جا، یہاں سے۔

(شاعر آہستہ آہستہ پگڈنڈی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔)

منی۔ شاعر، ٹھہرو۔ (وقفہ)

مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔

شاعر۔ نہیں میں اب ٹھہر نہیں سکتا، میں تمہارے آنسو اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں منی۔ محبت کرنا یا زخمی زندگیوں پر پھاہا رکھنا میرا کام نہیں، میں تو صرف دھرتی کے آنسو جمع کرتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے۔)

(خاموشی، پھر جنگل میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز)

کرشن چندر

چراغِ طور

ہونا ہی کیا ضرور تھے یہ دو جہاں ہیں کیوں
اللہ اک فریب میں کون و مکاں ہیں کیوں

بیچارگانِ عشق کہ آوارگانِ شوق
رکھتے تو ہیں زبان مگر بے زباں ہیں کیوں

دُنیا تو شاد شاد ہے عالم تو مست مست
یہ خواب عاشقی کے ہمیں کو گراں ہیں کیوں

سنتے ہیں ایک درد تو اٹھتا ہے بار بار
اس کی خبر نہیں ہے کہ آنسو رواں ہیں کیوں

اِن بے نیازیوں میں بھی شانِ نیاز ہے
سجدے نہیں پسند تو پھر آستاں ہیں کیوں

جس گلستاں میں روز تڑپتی ہیں بجلیاں
یارب اسی چمن میں یہ پھر آشیاں ہیں کیوں

اس کا ہمیں ملال ہے ہم کیوں بدل گئے
اس کا نہیں ملال کہ وہ بدگماں ہیں کیوں

جب دل نہیں رہا تو تمنا کا کام کیا
جب کارواں نہیں تو پسِ کارواں ہیں کیوں

بہزاد ان کے ہجر میں گھبرا رہا ہے دل
اب کیا کہیں کسی سے کہ بے خانماں ہیں کیوں

بہزاد لکھنوی

چھچھو کی آنکھیں

۱

ہوسٹل کے ایک کمرے میں کچھ سہیلیاں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرنے میں مشغول تھیں۔ کھلی دھوپ کا دن تھا لیکن کبھی کبھی ایک آدھ بادل کی پرچھائیں باہر کی ہری ہری دوب پر سے گزر جاتی۔ کھڑکی سے باہر نیم کے پیڑ کی جھکی ہوئی ڈال کے جھومروں کو تھرکاتی ہوئی ہوا گنگناتی بہہ رہی تھی۔

یکایک اسی نیم کی ڈالی سے ڈھکی ہوئی کھڑکی کے چوکھٹے میں موسم اور بھوک سے جھلسی ہوئی ایک عورت نظر آئی۔ ایک ڈھیلی کالی میلی پھٹی سی ساڑھی میں وہ عورت اپنے نحیف جسم کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ اعضا نحیف، نگاہیں پژمردہ۔ اسے دیکھنے سے خیال ہوتا تھا کہ یہ عورت نہیں ہے، بلکہ کوئی پالتو بوڑھا جانور ہے۔ پھیکے نیلے رنگ کے ہونٹوں کے اندر دانت غائب تھے۔ ایک عجیب سی وا[illegible]۔ پھیلے ہوئے ہاتھ پسارے کسی بے یار و مددگار بھوکے حیوان کی طرح رک رک کر اپنے مطلب کی بات کے اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گویا وہ کوئی ایسی داستان کہہ رہی تھی جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ کچھ مانگا اس نے۔

اس کی عجیب مخوف سی آواز نے ان نوجوان دوشیزاؤں کو چونکا دیا۔ جیسے کھلی دھوپ کے دن میں کسی سیاہ بادل کی پرچھائیں چہرے پر سے گزر جائے۔ یہ آواز لگاتار آ رہی تھی۔ کبھی نہ ٹوٹنے والی، کبھی نہ ختم ہونے والی۔ گردنیں موڑ کر انہوں نے کھڑکی کی طرف تاکا۔ اور چند ایک لمحے مبہوت ہو کر اس عورت کی طرف دیکھتی رہیں۔ اسی بوڑھے جنگلی حیوان کے جسم کی طرف۔ جو اس حالت میں اپنی مخوف کسی کی سمجھ میں نہ آنے والی آواز میں، رندھے ہوئے گلے سے رک رک کر ڈھیلے انداز میں نچلے ہونٹ کو اوپر کے ہونٹ سے ملا کر کچھ سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس جسم میں حسن نہ تھا۔ بدصورتی بھی نہ تھی۔ وہ تو بس گرمی سردی پالے اور بھوک سے مارا ہوا ایک بے روح جسم تھا۔ نہ خوبصورت نہ بدصورت۔

ایک گھبرائی ہوئی لڑکی ترحمانہ انداز سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی: "اسے کچھ دیدو۔" جواب میں ایک زود رس سمجھدار لڑکی نے کہا۔ "بھک منگوں کو بھیک دینے کا برا نتیجہ تم جانتی ہو کیا ہے۔ آج تم نے اس پر ترس کھا کر اسے کچھ دیدیا تو کل کلاں کو وہ اور بھک منگوں کو بھی اپنے ساتھ لائے گی۔ پھر یہ المنظر ڈرسا تو روز یہاں آتی ہے۔"

اس کے بعد اسی عاقل لڑکی نے بھک منگوں کے متعلق ایک دو اسی قسم کی کہانیاں سنائیں۔ اور پھر بھکارن کو اونچی آواز میں ایک جھڑکی دے کر اسے کھڑکی کے کواڑ سے دھکا دیکر پیچھے دھکیل دیا۔ اور کھڑکی بند کر دی۔ کمرے میں کچھ عرصے تک ایک عجیب پھیکی اور اداسی سی چھائی لیکن صرف چند لمحوں تک ہی۔ اس کے بعد پھر ہوسٹل کا وہی کمرہ نوجوان لڑکیوں کے قہقہوں سے معمور ہو گیا۔

۲

اُف، ان تین لڑکیوں کی آنکھیں۔ گرسنہ نگاہیں۔ دل کو چھیدتی ہوئیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا یہ آنکھیں میرے سامنے پڑے ہوئے کھانے کے گلاس سمیت مجھے بھی ہڑپ کر جائیں گی۔ ایک دن نہیں دو دن نہیں، ہر روز۔ چاروں وقت جب میں ہوسٹل کے کھانے کے کمرے میں داخل ہوتی ہوں، وہ بھوکی آنکھیں کھڑکی کی آڑ میں سے ہمارا تعاقب کرتی ہیں۔ اس طرح ٹکٹکی لگا کر دیکھتی ہیں کہ کھانے کا نوالہ اکثر اوقات ہاتھ ہی میں رہ جاتا ہے اور انگلیاں جیسے شل ہونے لگتی ہیں۔ ان کی اس بُری نظر سے بچنے کے لئے کئی بار لڑکیاں اپنا کھانا میز پر چھوڑ کر بھوکی ہی اٹھ جاتی ہیں۔ اکثر ایسے منہ موڑ کر جلدی جلدی سے کھانا ختم کر کے کمرے سے باہر نکل آتی ہیں۔ جب سب لوگ کھانا ختم کر چکتے ہیں۔ تو بہت سا بچا کچھا کھانا بعد میں ان لوگوں کو مل جاتا ہے۔ یہ کھانا کافی ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ لڑکیاں بھوکی نہیں رہتی ہوں گی۔ پھر نہ جانے ان کی آنکھوں کی گرسنگی اور تشنہ کامی کیوں نہیں جاتی۔

یہ آنکھیں ہوسٹل کے معصوم ترین فرد کو بھی ایک دم گھبراہٹ میں ڈال دیتی ہیں۔ وہ آنکھیں کچھ اس طرح اُن کی طرف دیکھتی ہیں گویا کہیں ان سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ وہ آنکھیں اس کے خوشبودار تیل سے چپڑے ہوئے بالوں کی طرف دیکھتی ہیں۔ دھلے ہوئے پاک و صاف براق کپڑوں کی طرف۔ پالش کئے ہوئے جوتوں کی طرف۔ ان مہذب اطوار کی طرف جو کھانا کھانے میں برتے جاتے ہیں کچھ اس طرح ٹکٹکی لگا کر دیکھتی ہیں کہ لڑکی سٹ پٹا جاتی ہے۔ بار بار اُس کی گھبرائی ہوئی نگاہیں اپنے بالوں کپڑوں اپنے جوتوں اپنے کھانے کے ڈھنگ کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ کیا کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جی میلا میلا سا ہونے لگتا ہے۔ جتنی جلد بھی ہو سکے کھانا ختم کر کے اس کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی جاتی ہے اُف وہ بھوکی آنکھیں۔

لیکن سبھی طالب علموں کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ اکثر لڑکیاں تو ہنستی کھیلتی ہوئی ایک دوسرے سے مذاق کرتی ہوئیں کھانے کے کمرے میں آتی ہیں۔ اور اسی لاابالیانہ انداز سے ہنستی کھیلتی ہوئی واپس چلی جاتی ہیں۔ صرف وہی رُوح بے چین ہو اُٹھتی ہے، جس کی نگاہیں ان تین بالوں والی میلے کچیلے پھٹے پُرانے کپڑوں والی لڑکیوں کی وحشی آنکھوں سے ٹکرا جاتی ہیں۔ اُسی بے چاری بدقسمت لڑکی کا دل بے چین ہو اٹھتا ہے وہ تڑپ کر اپنے دل میں سوچتی ہے، میں نے ایسا کونسا گناہ کیا ہے؟ مجھ پر اتنا ظلم کیوں؟ ان آنکھوں کی تیز چمک اک برق بن کر میرے نشیمن پر کیوں گرتی ہے؟ سبھی لڑکیوں کو بھوک لگتی ہے۔ میں بھی تو صرف اپنے ہی حصّے کا کھانا کھا رہی ہوں۔ کسی سے نوالہ چھین کر تو نہیں کھا رہی ہوں۔ کوئی ہیرے جواہرات قیمتی گہنے بھی تو نہیں پہن رکھے۔ پیسے دیتی ہوں کھانا کھاتی ہوں۔ مفت کا تو کھانا نہیں کھاتی۔ آخر ان آنکھوں کی تلخ نگاہیں میرے لئے ہی کیوں وقف کر دی گئی ہے۔

لیکن ان خاموش سوالوں کے جواب میں کھڑکی کی اوٹ میں سے مجھے وہی تین آنکھیں تاکتی ہیں۔ ان آنکھوں میں لالچ بھوک اور حیرانی کے جذبات ہر وقت اُبلتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ دن میں چاروں بار......

(۳)

جس بارش کی مدت سے خواہش تھی، وہ آج زمین پر اُتر آئی ہے۔ رم جھم کا سندر سنگیت اور تھوڑے سے کھلے ہوئے پانی کے نل سے پانی کے فرش پر گرنے کی خوش آئند لَے اور پھر اس لَے کا بارش کے نغمے میں گھل جانا۔ میرے کان، میرا دل، میری جبیں، جسم کا ایک ایک تار ان دونوں نغموں کے امتزاج سے مرتعش ہو اُٹھا ہے۔ اس خوش آئند نغمے سے معمور ہو گیا ہے۔ اور اس نغمے کے ساتھ یادیں بھی تو دبے پاؤں چلی آ رہی ہیں۔ جھرنوں کی طرح حسین، اور سنیما کی تصویروں کی طرح آنکھوں کے سامنے آ کر پھر اوجھل ہوتی جا رہی ہیں۔

بہت بھرے چنار ... شمشاد کے دورویہ درخت .... برف سے لدے ہوئے بجلی کے تار .... اور وہ چبھتی ہوئی ٹھنڈی سنسناتی ہوا .... رم جھم رم جھم بوندیں۔ بارش۔ دھوپ کی ایک ہلکی گرم گلابی لکیر، سبھی میری آج کی دُنیا میں نہیں ہے۔ لیکن بارش کا یہ البیلا نغمہ میری کائنات کے ذرّے ذرّے میں گونج رہا ہے!

اوہ.... کھڑکی کے باہر وہ ننھی چھوٹی موتی کی طرح نازک لڑکی کھڑی ہے۔ اس کا باپ کوٹھی کے اندر جھاڑو لیکر صفائی کر رہا ہے۔ غریب کی ٹھٹھر رہی ہے۔ گندہ پھٹا ہوا فراک پہنے۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو سینے سے لگائے ہوئے بارش کی بوندوں میں وہ آسمان کی طرف تکتی جاتی ہے۔ اور کبھی اس کھڑکی کے اندر۔ ان آنکھوں نے جیسے کہ ساری کائنات کو ننگا کر دیا ہے۔ ہر چیز عریاں اور اُداس سی نظر آ رہی ہے۔ پتّے سوکھے ہوئے ٹنڈ منڈ درخت، کالے بادلوں سے گھرا ہوا آسمان۔ اور وہ لڑکی.... میرا نغمہ.... کدھر گیا....؟

سنتوش کیشپ

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یعنی تعلق بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ عداوت بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ عجیب و غریب مضمون ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد اور عورت کا باہمی رشتہ کیا ہے۔ عورت کی طرف مرد کا میلان سمجھ میں آجاتا ہے لیکن مرد کی طرف عورت کا میلان جو ہے بھی اور نہیں بھی ہے سمجھ سے کچھ اونچا ہی رہتا ہے۔ یعنی عورت محبت، نفرت بھی کرتی ہے اور انجام کار اس سے محبت بھی کرتی ہے۔ اس کی بدعنوانیوں کی مذمت کرتی ہے مگر اس کے باوجود ان بدعنوانیوں پر شاد ہو جاتی ہے۔

شادی ہی کو لیجیے جو کہ بہت عام چیز ہے۔ چاہیے تو یہ کہ لڑکی اپنی شادی پر خوش ہو۔ لیکن ہونے والی دلہنوں کو کس نے گھڑی بھر ہنستے نہیں دیکھا۔ دن اور رات میں اُن کے منہ سے ایسی باتیں کس نے نہیں سنیں۔ "میری جوتی کو کیا غرض پڑی تھی جو میں بیچ میں سے اُن کو جھانک کر دیکھتی ——— میں تو ہاتھ بھی کسی کو لگانے دوں ——— منتوں میں ہاتھ لگ گئی ہوں جبھی تو اپنے دوستوں میں میری یوں ہتک کی گئی ہے ——— آگ لگے میری جان کو ——— نہیں نہیں میں تو عمر بھر کنواری رہوں گی۔ امی جان نے تو اپنے سر کی بلا ٹالی ہے۔ جانے کون ہیں کون نہیں ہیں۔ گھر لے جاتے ہی مجھے قتل کر دیں۔ اتنا پڑھایا لکھایا تھا، کیا اسی دن کے لئے کہ مجھے ایک نامحرم آدمی کے حوالے کر دیا جائے ——— میں زہر کھا لوں گی ——— لڑکیاں پرایا دھن ہوتا ہے، بس یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے ——— چار دن کا سودا ہے، ابھی منہ میں ایک کھیل تک نہیں گئی۔ کسی کو ترس بھی نہیں آتا۔ نہیں میں مایوں نہیں بیٹھوں گی ——— مجھ سے یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ جاؤ، سجو، بنو ——— یہ سجا بنا کر مجھے کس کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ میری کچی کھائیے، مجھے ہائے ہائے کر کے پیٹیے اگر میری شادی کیجیے۔۔۔۔"

آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں، کئی کئی دن واقعی کھانا نہیں کھایا جاتا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہاتھوں پر مہندی لگوائی جاتی ہے، ڈھولک بجانے والی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھا جاتا ہے، گیتیں اُڑائی جاتی ہیں، اور تخلیے میں اپنی سب سے عزیز سہیلی کے ساتھ گدگدی پیدا کرنے والی باتیں کی جاتی ہیں، تازہ تازہ نوٹ کیے جاتے ہیں۔ آنے والے حادثے کی تفصیلات اِدھر اُدھر سے اکٹھی کی جاتی ہیں اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔

مہندی لگے ہاتھ، معقیش بال، لس لس کرتے بھاری جوڑے، چمکیلے زیور، چہرے کی اُڑی اُڑی رنگت، ریشمیں گھونگھٹ، دل میں دھڑکنیں ——— شہنائیاں ——— باجے گاجے، ہجوم دھڑکے۔۔۔۔ اس کے بعد حجلۂ عروسی۔۔۔۔ خاموشیوں کے قفل جو کبھی کھلتے ہی نہیں۔ اِدھر یکسر انکار، اُدھر کبھی التجائیں منتیں، خوشامدیں اور کبھی دھمکیاں: "لو اب خدا کے لئے مان بھی جاؤ ——— دیکھو ہم تم سے کبھی نہ بولیں گے ——— کچھ منہ سے تو بولو۔۔۔۔ قسم لے لو جو تمہیں پھر کچھ کہوں، ایک نقاب ہٹا دو ——— خدا کی قسم میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔۔۔۔ لو میں ایک طرف ہٹ جاتا ہوں۔۔۔۔ تم اب بھی نہیں مانتیں، آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ بھئی میں تو تنگ آ گیا ہوں، نہ نہیں تھوڑی دیر آرام بھی تو کرنا ہے۔۔۔۔"

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔۔ خاموشی تکلم میں تبدیل ہوئی: "نہیں آپ اپنے دوستوں کو ضرور ساری باتیں بتا دیں گے۔۔۔۔ مجھے کہیں کا نہ رکھیے۔ آپ کو خدا کی قسم جو آپ نے کچھ کہا۔۔۔۔ ہائے میں کیسی بے حیا ہوں۔۔۔۔ آپ دل میں کیا کہتے ہوں گے، چٹاخ پٹاخ باتیں کر رہی ہے ——— خدا کرے مجھے موت آ جائے۔۔۔۔ ضرور دروازے کے باہر کوئی کھڑا ہے ——— اب میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔۔ زبردستی نہ کیجیے۔۔۔۔ میری کلائی ٹوٹ جائے گی۔ آپ کتنے بے رحم ہیں۔ دیکھیے میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دیجیے۔۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔۔۔۔ مجھے بخش دیجیے۔ صرف آج کے روز بخش دیجیے پھر آپ جو کہیں گے میں مان لوں گی۔۔۔۔"

ایسی باتیں کون مانتا ہے، آخر وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے ——— ہر جوان لڑکی کو جلد یا بدیر یہی سانحہ پیش آتا ہے۔ مردوں کی بدعنوانیوں کے متعلق سارے گلے شکوے دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور ایک ہی رات میں وہ تمام منزلیں طے کر لی جاتی ہیں جن کے متعلق سوچنا بھی کبھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔

شادی کے دوسرے روز ہی وہ مرد جس کو بُرا بھلا کہا جاتا تھا، عزیز ترین رفیق بن جاتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ تمہیں سے ۔۔۔

صبح سے کہیں باہر گئے ہیں، ابھی تک لوٹے نہیں، اللہ خیر کرے ــــ یہ سلیپنگ شرٹ انہوں نے مجھے دیا ہے۔ کہتے تھے رات کو سوتے وقت دوسرے کپڑوں کے بجائے اب اسے ہی پہنا کرو ــــ نہیں بھئی میں پان نہیں کھاؤں گی، انہوں نے منع کیا تھا ــ ان کو آج تک کبھی وقت پر چائے نہیں ملی تھی۔ جب میں نے یہ سنا تو خدا کی قسم میرے دل کو بہت دکھ ہوا ــ صبح اٹھ کر میں نے پہلا کام یہی کیا کہ اُن کے لئے چائے بنوائی۔۔۔۔۔"

میں سمجھتا ہوں کہ مرد اور عورت کے درمیان صرف ایک رات حائل ہے۔ اگر یہ کالی چیز حائل نہ ہوتی تو خواہ مخواہ یہاں سے چھیڑ چھاڑ کبھی بیہودگی [illegible] نہ آتی۔ بہت ممکن ہے کہ مرد چھیڑتے وقت اس رات کو بھول جاتا ہو مگر عورت جب [illegible] ق ہے یا جب کسی عورت کو چھیڑا جاتا ہے تو یہ رات [illegible] اُس کی نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

سارا فساد اسی رات کا ہے جس نے انسانی زندگی کو کئی خوبصور [illegible] سے متعارف کرایا ہے۔ چھیڑ چھاڑ ابھی روشنیوں میں سے ایک [illegible] ہے جسے پھلجھڑی کہنا بجا ہوگا۔ میں اس کے متعلق پچھلے مضمون میں نوجوا [illegible] ت بیان کر چکا ہوں۔ اس مضمون میں نوجوان لڑکیوں کا ردِ عمل بیان کیا جائے گا۔

یہ ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے میں نے ذیل کا سوالیہ تیار کیا۔

(۱) مردوں کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ اسے پسند کرتی ہیں یا ناپسند؟ ــ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی وجہ بیان کیجئے۔

(۲) جب آپ کو چھیڑا جاتا ہے تو آپ کیا کرتی ہیں؟

(۳) آپ کو کیوں چھیڑا جاتا ہے؟

(۴) کیا آپ مردوں کو نہیں چھیڑتیں؟

(۵) کوئی ایسا واقعہ بیان کیجئے جو اس چھیڑ چھاڑ سے متعلق ہو اور جس کا اثر ابھی تک آپ کے حافظے پر قائم ہو۔

ظاہر ہے کہ عورتوں اور لڑکیوں سے براہِ راست یہ سوال کرنے اور اُن کا جواب حاصل کرنے میں مجھے بہت دقت پیش آئی ہوگی خصوصاً کنواری لڑکیوں سے تو میں نے ڈر ڈر کے یہ سوال کئے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اِن دقتوں اور مشکلوں کے باوجود یہ مضمون تیار ہو ہی گیا۔

عورتوں اور لڑکیوں کے تاثرات اور ان کا ردِ عمل بیان کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک جگہ تمام لڑکیوں اور عورتوں کو اکٹھا کر کے میں نے یہ معلومات حاصل نہیں کیں۔ مجھے تین بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لاہور، بمبئی اور دہلی۔ ان تین شہروں میں مختلف اوقات پر میں ایک ایک، دو دو عورتوں سے ملا۔ اُن سے دوستانہ بات چیت کی اور اپنے مطلب کی باتیں معلوم کرلیں۔

کل بارہ عورتوں سے میرا اس قسم کا انٹرویو ہوا۔ جن میں سے دو بیاہی ہوئی تھیں باقی سب کنواری تھیں۔ ان کی عمر کا اوسط سولہ سال سے زیادہ نہیں تھا۔

نو لڑکیوں نے جن میں دو بیاہی ہوئی بھی شامل تھیں، پہلے سوال کا بالکل ایک جیسا جواب دیا: "مردوں کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ ایسی فضول اور نازیبا حرکت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ پرائی بہو بیٹیوں کو چھیڑنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ صریحاً شہدہ پن ہے۔ اِس قسم کی حرکت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اخلاقِ حمیدہ سے عاری ہوتے ہیں جن کی آنکھوں میں شرم کا پانی ہی نہیں ہوتا ــ ہم اس چھیڑ چھاڑ کو صرف ناپسندیدہ نہیں کرتیں بلکہ اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اس لئے کہ ہماری آزادی میں یہ بے شمار رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب بنی ہوئی ہے۔ غضب خدا کا، ہم ڈر کے مارے باہر سیر کو بھی تو نہیں جا سکتیں۔ کہیں باغ میں گھومنے کے لئے جائیے تو ہمیشہ اس بات کا کھٹکا رہتا ہے کہ کوئی مرد ہمارے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیگا اور ایسی عجوبی نظروں سے دیکھے گا کہ سیر کا سارا لطف، سارا مزا کرکرا ہو جائے گا ــ کسی پھول کی طرف دیکھئے تو جھاڑی کے عقب سے کوئی [illegible] آئے گی ــ انہیں منظر اپنے زخمیوں کو دیکھا، تھا۔ چلیں ہے سیر گل کو دیکھنا شوقی بہانے کی ــــ سیر گل گئی بھاڑ میں اور زخمی گئے چولہے میں۔ کہاں کی سیر گل، کہاں کی شوخی۔ یہ تھوڑے کچھ کرتے ہی دیں۔ یہ موئی چھیڑ چھاڑ ہے یا گنہگاری موری کے چھینٹے ــــ کوئی کچھ دیکھنے جاؤ تو سب کی گردنیں ہماری طرف مڑ جاتی ہیں۔ گھورے جا رہے ہیں، بس گھورے جا رہے ہیں۔ بات تک کرنے کی اجازت نہیں۔ اندھیرا ہوتا ہے تو اس بات کا دھڑکا رہتا ہے کہ کوئی [illegible] ٹنگ کھولنے کے بہانے سے ساتھ والے لالچی ہماری ٹانگ کھجلانا شروع کر دیں گے۔ کچھ ختم ہونے پر باہر نکلتے وقت یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ [illegible] [illegible] اور انگریزی میں افسوس کا اظہار کر دیں گے ــ کوٹھے پر بال سکھانے کے لئے جاؤ تو کوئی ہمسایہ اپنے چھجے [illegible]

...کی ڈور ڈھیل کر کے بالوں میں اُلجھا دے گا۔ غضب میں آ کر ڈور پکڑ لو تو آواز آئے گی :۔ "لے لیجئے جتنی ڈور درکار ہے" جتنا کر ڈور کھینچتا جاتا ہے [illegible]
...سے جوڑی ہاتھ میں لے لی۔ کھینچتے جائیے جب تک آپ تھک نہ جائیں :۔ کیا کریں کیا نہ کریں ہم تو بہت عاجز آ گئے ہیں ... ایک ٹکہ ہو تو بتائیں۔
...درس شاپنگ کے لئے جائیں تو اور مصیبتیں سر پر کھڑی ہوتی ہیں۔ دکاندار بھی آنکھیں سینک رہے ہیں اور اپنی حرص پوری کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی
...کو بھی بحث کر دیتا ہے۔ کشمیر کے سیب ادھر بھی دیکھتے جائیے ـــــ انڈر وئیرز کے نئے نئے ڈیزائن آئے ہیں، ملاحظہ فرماتے جائیے ـــــ ایک
...بالکل نیا مال ہے ..... تو اب ان مردودوں سے کوئی کیا کہے۔ جی تو اکثر یہی چاہتا ہے کہ اپنی چھتری ان ملعونوں کے حلق میں ٹھونس دیں
...منہ پر دے ماریں، مگر بیکار کے فضیحتے سے ڈر لگتا ہے اس لئے مجبوراً خاموش رہنا پڑتا ہے ـــ کوئی موٹر پاس سے گذرتی ہے تو اُس کے
...بیٹھے ہوئے تمام صاحبان گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی اُن سے پوچھے کہ حضرت یہ آپ کو کیا خبط سمایا۔ آپ کی موٹر جا رہی ہے، ہم بھی جا رہے
ہیں۔ اس نظر بازی کا فائدہ ؟ ـــــ موٹر والوں کو چھوڑئیے، یہ کمبخت ڈلیا والے مزدور (جنہیں دہلی میں جھلی والے اور بمبئی میں پاٹیا والے کہتے ہیں) کب
...پیچھا نہیں چھوڑتے۔ "میم صاحب، لائیے یہ پارسل میں اُٹھا لوں ـــ یہ مرتبان مجھے دیدیجئے، میں اٹھا لیتا ہوں" اُن سے کہا جاتا ہے: "نہیں بھائی،
اتنی چھوٹی چیز کے لئے مزدور نہیں چاہئے۔" جواب ملتا ہے: "میم صاحبہ میں آپ سے پیسے تھوڑے ہی مانگتا ہوں۔" اب بتائیے ان اُلو کے پٹھوں کو کیا جواب دیں۔
...سو سو آفتوں میں ہر وقت جان پڑی رہتی ہے ـــ کوئی ٹھکانا ہے اس عذاب کا۔ خدا کرے نہ رہیں ایسے لوگ اس دُنیا کے تختے پر۔ ناک میں دم
کر رکھا ہے نابکاروں نے ـــــ چھیڑ چھاڑ کو ناپسند کرنے کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ ایک نہایت ہی لغو اور بے ہودہ حرکت ہے کہ جس
...آخر کیا سمجھ لیا گیا ہے۔"

ان تو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا "مجھے اس چھیڑ چھاڑ سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی چوہوں سے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ـــ"

ایک اور نے کہا "میں اس لئے یہ چھیڑ چھاڑ ناپسند کرتی ہوں کہ عورت اس کا جواب تھپڑ مارنے یا گالی دینے کے سوا کسی اور طریقے سے دے
ہی نہیں سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں ہم سے نہیں ہو سکتیں، اسی واسطے ہم اس سے نفرت کرتی ہیں۔ راہ چلتے چھیڑا جائے تو اور بھی مصیبت ہے۔ اب
کیا بیچ بازار کے تُو تُو میں میں شروع کر دی جائے۔ اصل میں عورت شروع سے دبی ہوئی ہے اس لئے بیچاری کچھ بھی نہیں کر سکتی ورنہ ایسے بدنیت
مردوں کا علاج ہو سکتا ہے۔"

باقی تین لڑکیوں میں سے دو نے اسی سوال کے جواب میں کہا "ہمیں یہ چھیڑ چھاڑ ناپسند نہیں مگر وہ چھیڑ چھاڑ یقیناً ناپسند ہے جو بالکل تہذیب سے
گری ہوئی ہو یعنی جس میں انتہا درجے کا بھونڈا پن ہو۔ آنکھیں مارنا، کندھے رگڑنا، سلام کرنا، دُور سے اشارہ بازی کرنا، فحش مذاق کرنا، یہ سب ہمیں ناپسند ہے۔
ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک آنکھ میچ لینے سے کیا ہوتا ہے۔ چھیڑنے کا یہ طریقہ بہت ہی بازاری اور عامیانہ ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو
سکتا ہے کہ کیوں تمہاری کیا صلاح ہے؟ یہ مذاق نہیں بلکہ ایک نہایت ہی ادنیٰ کاروباری سوال ہے۔ ایسا بھدا اشارہ ہے جو خوش ذوق آدمیوں کو ہرگز استعمال
نہیں کرنا چاہیئے۔ اس میں بنیا پن ہے۔ اور کندھے رگڑنا یا دھکا دینا اکھاڑوں میں ہونا چاہیئے۔ چھیڑ چھاڑ کشتی گیری نہیں اور پھر کیا پتہ ہے دھکے سے کوئی
...گر پڑے، کوئی جوڑ نکل جائے، کوئی ہڈی ٹوٹ جائے۔ ہنسی میں کھنسی ہو جائے۔ اور جناب سلام کا تو کوئی مطلب ہی نہیں۔ یہ کیا ہے کہ بار بار ہاتھ
...جا رہے ہیں۔ ماتھے کی طرف ہاتھ لے جایا جا رہا ہے۔ اس فعل میں قابلِ رحم بھونڈا پن ہے۔ فحش مذاق کے متعلق کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ مذاق شستہ
ہونا چاہیئے۔ کوئی اس میں بات ہو نہ کہ صرف چھیڑنے کی خاطر چھیڑ دیا جائے۔ کوئی پتھر اُٹھا کر سر پر مار دیا جائے۔ پسلیوں میں ٹہوکا دے دیا جائے ـــــ
کوئی پُرلطف اور بات ہونا چاہیئے جس سے دل و دماغ کو فرحت حاصل ہو۔ شگفتگی سی پیدا ہو۔ آدمی ایک دو گھڑی کے لئے خوش ہو جائے۔ ایسی چھیڑ چھاڑ ...
...اور خدا کرے کہ یہ ہمیشہ جاری رہے۔ اس سے بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ جوانی کی داستان میں اس قسم کے چٹکلے ضرور ہونے چاہئیں۔ ورنہ پہلی
...کہانی بالکل خشک اور بے مزہ ہوگی۔"

...لڑکیوں میں سے ایک نے یہ کہا "بدصورت اور کریہہ المنظر مردوں کو تو چھیڑنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ اگر وہ چھیڑنا ہی چاہتے ہیں تو ایسی
[illegible] یا بدصورتی میں کچھ اُن سے زیادہ ہی ہوں [illegible] بدصورت مردوں کا [illegible] کو چھیڑنا میرے نزدیک
[illegible]

[illegible] کی خوبصورت تھی۔

پانچویں یعنی آخری لڑکی نے اس سوال کے جواب میں کہا: مردوں کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق میرا خیال بہت اچھا ہے۔ مجھے یہ چیز پسند ہے [illegible] وجہ صرف یہ ہے کہ میں بہت شریر ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ مرد مجھے چھیڑیں تاکہ جواب میں اُن کو میں بھی چھیڑ سکوں۔ وہ عورتیں جو سمجھتی ہیں کہ ہم مردوں کا [illegible] نہیں سکتے، بیوقوف ہیں، وہ سوچتی ہی نہیں کہ مردوں کو اتنی سہولتیں میسر نہیں جتنی کہ ہمیں ہیں۔ ہمارا جوابی حملہ انہیں بوکھلا سکتا ہے، اُن کی ہنسی [illegible] انہیں لاجواب کر سکتا ہے اس لئے کہ ہم عورتیں ہیں۔ اُن کو اس کا ہر حالت میں لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ مرد عورت کو کمزور، کم زبان اور کم عقل سمجھتا ہے۔ [illegible] اس نظریئے سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ عورت کمزور سہی لیکن وہ کم زبان اور کم عقل تو نہیں۔ اپنی عقل اور اپنی زبان سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا جائے میں سمجھتی ہوں کہ مردوں کے مقابلے میں ہم عورتیں کہیں زیادہ ذہین اور طباع ہیں، ہم اگر چاہیں تو مردوں کی زبان بند کر سکتی ہیں؛ اُن کی سٹی [illegible] گم کر سکتی ہیں ـــــ عورت کے سامنے مرد حیثیت ہی کیا رکھتا ہے، عورت سے دور مرد سب کچھ ہے پر جب وہ عورت کے سامنے آتا ہے تو کشکول [illegible] والا بھکاری بن جاتا ہے، کیونکہ عورت سے وہ سوائے خیرات کے اور مانگتا ہی کیا ہے۔ مرد کے لئے عورت بہت دلچسپ چیز ہے، عورت [illegible] کم دلچسپ چیز نہیں اور میرا تو یہ خیال ہے کہ ایسی دلچسپ چیز خدا نے پیدا ہی نہیں کی۔ اکثر عورتیں مرد کو اُن آنکھوں سے دیکھتی ہیں جن سے وہ [illegible] اور بھائیوں کو دیکھنے کی عادی ہیں۔ یہ غلطی ہے۔ سب مرد باپ اور بھائی تو نہیں ہوتے۔"

دوسرے سوال کا جواب پہلی نو میں سے پانچ لڑکیوں نے اس طور پر دیا: "ہم نفرت سے مُنہ پھیر لیتے ہیں، یا دل ہی دل میں ان کو کوس کر خاموش ہو جاتے ہیں۔"

نو میں سے باقی چار لڑکیوں نے کہا: "اگر اکیلی ہوں یعنی ساتھ کوئی مرد نہ ہو تو مجبوراً خاموش ہو جانا پڑتا ہے لیکن اگر ساتھ کوئی مرد ہو تو اس کی [illegible] لی جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ساتھ والے مرد اکثر یہی کہا کرتے ہیں: "تمہیں شرم نہیں آتی، کیا تمہاری ماں بہن نہیں؟" یوں شرم دلانے پر ہماری تسلی [illegible] ہو کر خاک بھی نہیں ہوتی مگر کیا کیا جائے، سرِ بازار جھگڑا کرنے سے تو ہم رہے۔"

ان چار لڑکیوں میں سے ایک نے کہا: "نہیں بابا میں تو خاموش نہیں رہ سکتی۔ اگر کوئی مرد میرے ساتھ ایسی حرکت کرے تو میں لڑنے مرنے پہ تُل جاتی ہوں۔ مجھ میں ذرہ بھر برداشت کا مادہ نہیں۔ میں تو گالیوں کا تانتا باندھ دیا کرتی ہوں اور کیا مجال ہے کہ چھیڑنے والا چُوں بھی کر جائے۔ شریف عورتوں سے دل لگی کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ اور کبھی اپنے دل کی بھڑاس تو ضرور نکال لینی چاہیئے چاہے اس میں اپنی بدنامی ہی کیوں نہ ہو۔"

اسی سوال کا جواب باقی تین لڑکیوں نے ترتیب وار یوں دیا۔

(۱) اگر چھیڑ چھاڑ شستہ اور تہذیب کے دائرے کے اندر ہو تو میں مسکرا دیا کرتی ہوں۔ بس ذرا سی مسکراہٹ جس سے صرف داد کا اظہار ہو، ہونٹوں اور آنکھوں میں پیدا کی اور چل دی ـــــ مردوں کو زیادہ مُنہ نہیں لگانا چاہیئے، کیونکہ زیادہ مُنہ لگانے سے یہ اکثر بگڑ جاتے ہیں۔ اگر کسی نے تہذیب سے گرا ہوا مذاق کیا تو حقارت کے آثار چہرے پر خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ کرنے والا یقینی طور پر عورت کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے، جب اُسے اپنی حماقت کا جواب مل جاتا ہے تو دل ہی دل میں خجل ہو کر ایک طرف سمٹ جاتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مرد خواہ کتنا ہی ذلیل ہو اس کے اندر شرم و حیا کا مادہ ضرور ہوتا ہے، خاص طور پر جب کوئی عورت اس کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرے تو وہ ضرور شرمندہ ہو جاتا ہے۔

(۲) اگر چھیڑ چھاڑ نہایت ہی عامیانہ اور بازاری قسم کی ہو تو میں نہ چھیڑنے والے کی طرف غور کرتی ہوں نہ اس کے فعل کی طرف۔ ایسے بد ذوق [illegible] کو اہمیت دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ البتہ خوش ذوق مردوں کی چھیڑ چھاڑ کی رسید ضرور دینی چاہیئے۔ صرف رسید۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بد ذوق مردوں کی چھیڑ چھاڑ کا جواب میں اپنی زبان نکال کر یا ٹھینگا دکھا کر دیا کرتی ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ نفرت اور حقارت کا کوئی اور اچھا ذریعہ اظہار مل جائے مگر ٹھینگا دکھلانے سے زیادہ آسان، باثر اور قریب ذریعۂ اظہار مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ دراصل کہنا یہ ہوتا ہے: "یہ مُنہ اور مسور کی دال۔" ذرا آئینے میں رخِ مبارک تو دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے [illegible] نہایت بھونڈے پن سے جلانے کی کوشش کی ہے۔" بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ خود بخود ٹھینگا اُن کی جانب اُٹھ جاتا ہے اور دل کو تھوڑی سی تسکین حاصل ہو جاتی ہے ـــــ یہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ [illegible] کا ان جذبات سے کیا تعلق ہے۔

(۳) میں [illegible] کی قائل ہوں خواہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر عورت اسے اپنا اصول بنا لے۔

[illegible] کے جواب میں پہلی نو لڑکیوں اور عورتوں نے کہا: "جانے ہماری بلا ـــــ [illegible]

[illegible] لڑکوں کے اخلاق بگڑ جائیں۔ ایسی حرکتیں ہی تو کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اگر ان کا دماغ جوتوں سے چپلا کر دیا جائے تو آئندہ کبھی ان کو جرأت نہ ہو۔"

باقی تین لڑکیوں نے ترتیب وار اس سوال کے جواب میں یہ کہا:

(۱) "ہم عورتوں اور مردوں کے درمیان ایک نہایت ہی لطیف پردہ حائل ہے۔ اس شفاف پردے میں سے مرد اکثر ہماری طرف تعجب آمیز دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ شیشے کی الماری میں رکھی ہوئی چیزیں خواہ مخواہ دلچسپ ہو جاتی ہیں۔ ہم شیشے کی الماریوں میں رکھی ہوئی نمائشی چیزیں ہیں مگر یاد رکھیے کہ ہمیں ان الماریوں میں خود مردوں ہی نے بند کر رکھا ہے۔"

(۲) "جس بنچ پر یہ لکھا ہو "روغن گیلا ہے" اس کو انگلی سے چھو کر ضرور دیکھا جائے گا۔ جس دیوار پر یہ حکم امتناعی لکھا ہو "یہاں اشتہار لگانا منع ہے" اس پر اشتہار ضرور چسپاں کئے جائیں گے۔ جس راستے پر "شارع عام نہیں" کا بورڈ لگا ہو اس راستے سے لوگ ضرور گزریں گے۔ عورت بھی ایک قسم کا بند راستہ ہے۔ وہ دیوار ہے جس پر اشتہار لگانا منع ہے یا وہ سڑک ہے جس پر "یہ شارع عام نہیں" کا بورڈ لگا ہو۔"

(۳) "ہمیں اس لئے چھیڑا جاتا ہے کہ ہم چھیڑنے کی چیز ہیں۔ اگر مرد ہمیں نہ چھیڑیں تو کسے چھیڑیں۔۔۔ گھوڑیوں کو؟"

چوتھا سوال یہ تھا: "کیا آپ مردوں کو چھیڑتی ہیں؟" اس کا جواب میں نے پہلی دو لڑکیوں سے پوچھنا مناسب خیال نہ کیا۔

باقی تین لڑکیوں میں سے پہلی دو نے کہا: "ہم نے آج تک اس معاملے میں کبھی پہل نہیں کی۔ دراصل ہم ڈرپوک ہیں۔ کئی دفعہ جی چاہا کہ چھیڑخانی کی جائے مگر ہمت نہیں پڑی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ پہل مردوں ہی کی طرف سے ہونی چاہیئے۔"

آخری لڑکی نے کہا: "کیوں نہیں، میں ضرور چھیڑتی ہوں۔ جب موقعہ ملے چھیڑتی ہوں۔ اگر موقعہ نہ ملے تو موقعہ پیدا کر لیتی ہوں۔ موقعے پیدا کرنے عورت کے لئے کیا مشکل ہیں۔ مرد کو تو موقعے کی تلاش میں گھنٹوں ضائع کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے اندر جرأت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ ساری اونچ نیچ پر غور کرنا پڑتا ہے مگر عورت یہ ابتدائی مرحلے طے کئے بغیر اپنا کام کر سکتی ہے۔ مرد کے چہرے پر ان ابتدائی تیاریوں کے آثار نظر آ جاتے ہیں۔ یعنی وہ مضطرب سا، کچھ بے وقوف سا دکھائی دیتا ہے۔ جونہی یہ آثار نظر آئیں عورت کو فوراً اپنا پستول چلا دینا چاہیئے۔۔۔ اس کی ساری تیاریاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ میں تو اکثر یہی کیا کرتی ہوں۔ یوں میں نے کئی شکاری شکار کرنے سے پہلے شکار کئے ہیں۔"

آخری سوال کے جواب میں پہلی دو لڑکیوں اور عورتوں میں سے صرف چار مندرجہ ذیل واقعات بیان کر سکیں۔

ایک نے کہا: "میں۔۔۔ اسکول میں پڑھتی تھی اور ہر روز تانگے پر جاتی تھی۔ ایک دن میں نے تانگہ اسٹیشنری کی دکان پر ٹھہرایا کیونکہ مجھے کوہ نور پنسل لینا تھی۔ مجھے معلوم نہیں سائیکل پر ایک لڑکا میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ جب میں نے پنسل نکالنے کے لئے دکاندار سے کہا تو وہ جھٹ سے آگے بڑھا اور دکاندار سے کہنے لگا: "ایک پنسل کوہ نور میرے لئے بھی۔" دکاندار دو پنسلیں نکال کر لے آیا۔ "کتنے پیسے؟" اس لڑکے نے پوچھا۔ دکاندار نے جواب دیا۔ "ساڑھے تین آنے۔" لڑکے نے پنسل پھینک دی اور کہا: "تم نے تو یہ لوٹ مچا رکھی ہے۔ دوسری دکان پر یہ پنسل تین آنے میں ملتی ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "آئیے میں آپ کو وہ دکان دکھا دوں۔" میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے سائیکل کے پیڈل پر پیر رکھا اور کوچوان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے چل پڑا۔ میں نے دل میں سوچا: یہ دکاندار واقعی بہت مہنگا۔۔۔ ہوا ہے، ضرور اس پنسل میں یہ دو پیسے زیادہ منافع لے رہا ہے۔ چنانچہ تانگہ اس لڑکے کی سائیکل کے پیچھے پیچھے چلا۔ تھوڑی ہی دور چل کر وہ سائیکل پر سے اترا اور مجھ سے کہنے لگا: "یہ دکان ہے۔" پھر اس دکاندار سے بڑی بے تکلفی سے کہا: "مولوی صاحب، کوہ نور کی دو پنسلیں نکالئے گا۔" دکاندار فوراً دو پنسلیں نکال کر لے آیا۔ اس پر لڑکے نے مجھ سے کہا: "اس کو تین آنے دیجئے۔" میں نے تین آنے ادا کر دئے۔ لڑکا سامنے اسکول میں داخل ہو گیا اور میں آگے چل دی۔ اسکول جا کر میں نے ایک سہیلی سے بات کی۔ اس نے کہا: "کوہ نور پنسل تو ہر جگہ ساڑھے تین آنے میں ملتی ہے، اس دکاندار نے تین آنے میں کیسے دی؟" میں نے کہا: "تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں اس سے دلوا دوں گی۔" اسکول کا ٹائم ختم ہونے سے پہلے پہلے چار لڑکیاں میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ ہم سب اس دکان پر گئیں۔ میں نے چار پنسلیں ان کو اسی دام پر لے دیں۔ دوسرے روز چھ میں نے اپنے بھائی جان کے لئے خریدیں۔ شام کو جب میں اپنی استانی کے لئے بارہ پنسلیں خریدنے کے لئے اس دکان پر پہنچی تو دکاندار نے کہا: "وہ صاحب جو اس روز آپ کے ساتھ آئے تھے چھ آنے جمع کرا گئے تھے۔ ایک پنسل انہوں نے لی تھی۔ اگر [illegible] انہوں نے روپے دے گئے تھے۔ گیارہ پنسلیں آپ نے لیں تین آنے کے حساب سے۔ چھ آنے [illegible] باقی بچتے ہیں [illegible] ایک پنسل لے جا سکتی ہیں۔" [illegible]

یہ شرارت کیوں کی۔ یہ واقعہ اسی وجہ سے مجھے اب تک یاد ہے۔"

دوسری نے کہا۔ ــــــ میرے پیٹ میں تھا ہم لوگ پہلی مرتبہ قطب دیکھنے گئے تھے۔ وُہ آگے آگے تھے اور میں آہستہ آہستہ اُن کے پیچھے سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔ ایک تو اندھیرا تھا دوسرے میری طبیعت خراب تھی، قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا۔ دم پھول رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا لیکن تمام مصیبتوں کے باوجود میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ آخری منزل تک ضرور پہونچوں گی خواہ راستے ہی میں دم نکل جائے۔ لیکن دوسری منزل تک پہونچتے پہونچتے میری طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ مجھے دیوار کا سہارا لیکر رکنا پڑا۔ دو نوجوان لڑکے میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہا: "اگر قطب الدین ایبک کو اس بات کی خبر ہوتی تو لاٹ کے بجائے اُس نے یقیناً میٹرنٹی ہوم تعمیر کرایا ہوتا۔" واقعی میں کرہی تو رہی تھی ان اللہ ماروں کو مذاق بھی کب سوجھتا ہے۔"

تیسری نے کہا: "پتاجی کی تبدیلی لاہور ہوئی تو ہم نے ــــــ میں ایک مکان کرائے پر لیکر رہنا شروع کیا۔ سردیوں کا موسم آیا تو میں پہلی مرتبہ دھوپ سینکنے کے لئے کوٹھے پر چڑھی۔ سامنے ہی ایک اور کوٹھا تھا۔ وہاں ایک لڑکا کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ چنانچہ میں نے فوراً آواز دی "ماتاجی!" لڑکے نے جب یہ آواز سُنی تو جوڑے ہوئے ہاتھ کھول دیئے اور بازو پھیلا کر ورزش شروع کر دی۔ باہوں کے بعد اُس نے ٹانگوں کی ورزش کی اور دس منٹ کے بعد مجھے دیکھتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ اس کی اس دلچسپ حرکت پر مجھے بےحد ہنسی آئی۔ اس واقعے کو چار برس گذر گئے ہیں مگر جب کبھی میں اس لڑکے کے جڑے ہوئے ہاتھوں کا تصور کرتی ہوں جو میرے "ماتاجی" کہنے پر ورزشی انداز میں کھل گئے تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔"

چوتھی نے کہا: "ہم ہر روز اسکول سے فارغ ہو کر ایک قطار میں واپس آیا کرتی تھیں۔ اسکول پرائیویٹ قسم کا تھا۔ ہمارے ساتھ ہیڈ ماسٹر بھی ہوا کرتا تھا۔ ایک روز اسی طرح ہم واپس آ رہی تھیں کہ ہال بازار میں ہماری چار لڑکوں سے مڈبھیڑ ہوئی جو غالباً ہاکی کھیلنے جا رہے تھے۔ کیونکہ ہر ایک کے ہاتھ میں اسٹک تھی۔ ان لڑکوں میں سے ایک نے ہم سب کو گھور گھور کے دیکھا۔ ہم میں کچھ بہت چھوٹی بھی تھیں۔ ان کی طرف اُس نے غور نہ کیا۔ جو جوان تھیں ان کو اُس نے بلند آواز میں گننا شروع کر دیا: "ایک ــ دو، تین ــ چار۔۔۔" ہیڈ ماسٹر صاحب یہ دیکھ کر فوراً آگے بڑھے: "تمہیں شرم آنی چاہیئے!" لڑکے نے جیسے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات سُنی ہی نہیں، کہنے لگا: "پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو۔۔۔ دس۔۔۔ دس گول۔۔۔ ہاف ٹائم میں دس گول۔ کون شکست کرے گا" ہیڈ ماسٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ انہوں نے دل میں سوچا ہو گا کہ چلو اچھا ہوا جو اس نے میری بات نہ سُنی ورنہ خواہ مخواہ جھگڑا ہو جاتا۔ ــــ مجھے اس لڑکے کی یہ چالاکی کبھی نہیں بھولے گی۔ بات کا کانٹا بدلتے وقت اسکے چہرے پر مجال ہے جو ذرہ بھر گھبراہٹ نظر آئی ہو۔"

باقی تین لڑکیوں نے آخری سوال کے جواب میں ترتیب وار ذیل کے واقعات بیان کئے:۔

(۱) یہ بمبئی کی بات ہے۔ میں اور میری سہیلی دونوں بس میں ماہم کا میلہ دیکھنے جا رہی تھیں۔ موسم بہت اچھا تھا۔ شام کا وقت تھا ہم بالائی منزل پر تھے اس لئے ہوا کے جھونکے خوب مزا دے رہے تھے۔ جب بس دادر کے پُل پر چڑھی تو اِدھر اُدھر ریلوے لائنوں کا ایک جال سا بچھا نظر آیا۔ میرے اس طرف دوسری رو میں ایک خوش شکل لڑکا بیٹھا تھا۔ سگرٹ کے دھوئیں کے چھلے بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اُس نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا اور اپنے ساتھی سے کہا: "ہاتھی ــــ سفید ہاتھی!" میں نے اپنی سیٹ پر سے اُٹھکر اس طرف دیکھا مگر مجھے ہاتھی نظر نہ آیا۔ اس پر اُس لڑکے نے مجھ سے مخاطب ہو کر بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا: "اسے تخیل کی فسوں کاری کہتے ہیں!" بات بڑی معمولی ہے مگر یہ واقعہ میرے دل و دماغ میں ہمیشہ کے لئے مرتسم ہو چکا ہے۔ "اسے تخیل کی فسوں کاری کہتے ہیں!" اُس گورے چٹے لڑکے نے یہ فقرہ ایسے دلکش انداز میں کہا کہ میں بےحد متاثر ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں مصنوعی شوخ پن تھا، چہرے پر ایک عجیب قسم کی قلندرانہ متانت تھی۔ پھر مجھے مسکراتا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر جو تبسم پیدا ہوا، اس میں ابھی بنی ہوئی چائے کی سی گھلاوٹ تھی۔

(۲) سردیوں کا موسم تھا۔ رگوں میں خون منجمد ہوا جاتا تھا۔ انہی دنوں میں ہمارا ایک دُور کا رشتہ دار ملازمت کی تلاش میں ــــ آیا اور کچھ دیر ہمارے پاس ٹھہرا۔ یہ لڑکا جس کی عمر پچیس برس کے قریب ہو گی اچھے ڈیل ڈول کا تھا۔ بھرا بھرا جسم جو کسی حد تک موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ گال سُرخ، رنگ سفید جیسا کہ عام طور پر کشمیریوں کا ہوتا ہے۔ وہ سینے کا بہت قائل تھا۔ آتے ہی اُس نے امی جان سے کہا: "آپ کو تکلیف تو ضرور ہو گی مگر میں ناشتے پر ایک [illegible] خود پیاک سے ہوں کہ [illegible] خوب کھاتا ہوں۔"

اس کو ورزش کا بھی شوق تھا، چنانچہ صبح اُٹھ کر ڈمبلوں سے اکسرسائز کرتا تھا اور اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے نہانا فرض سمجھتا تھا۔ ایک روز میں نے اُس سے پوچھا: "اتنی سردی میں ٹھنڈے برف پانی سے نہانا کیا ضروری ہے۔۔۔ اور پھر ہر روز؟" اس کے جواب میں اُس نے اپنی چھاتی چوڑی کرتے ہوئے کہا: "مجھے تو بالکل سردی محسوس نہیں ہوتی۔ خدا جانے آپ لوگوں کے دانت کیوں بجتے رہتے ہیں۔ ادھر میری طرف دیکھئے صرف ایک قمیص پہنا ہوا ہے بنیان بھی نہیں۔ بہت زیادہ سردی ہو تو چند دنوں کیلئے یہ تکلف کرنا پڑتا ہے ورنہ کبھی نہیں۔"

تین چار روز تک اُس نے ہم سب پر اس طرح رعب گانٹھا۔ جب ملازمت نہ ملی تو مایوس ہو کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کچھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ مجھے چونکہ ہر روز نہانے سے اور دودھ پینے سے سخت نفرت ہے اس لئے میں نے اُس سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ اُس کے اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں میں بیان کرنا نہیں چاہتی۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ہم نے ایک رات کوٹھی کے باہر اصطبل میں ملنا طے کر لیا۔ اب کچھ اصطبل کے متعلق۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جسے ابا جی اصطبل کہا کرتے ہیں۔ اس میں ایک عدد گائے بندھی رہتی ہے۔ رات کے بارہ بجے یعنی مقررہ وقت پر وہ اپنے کمرے سے کھسک کر اصطبل کے پاس آ گیا۔ میں بھی کسی نہ کسی طریقے سے وہاں پہنچ چکی تھی۔ جونہی وہ آیا میں نے اُسے اصطبل کے اندر داخل کر دیا: "آپ کچھ دیر یہاں کھڑے رہیں، میں کوٹھی کے اندر جا کر اپنا اطمینان کر آؤں۔ ممکن ہے کوئی جاگتا ہو۔"

اُس نے جب گائے کو دیکھا تو ٹھٹکا۔ میں نے مسکرا کر کہا: "آپ کو تو اس کے دودھ سے بہت پیار ہے۔۔۔ ڈرتے کیوں ہیں۔ میں ابھی آئی۔" میں نے اس کو اندر داخل کیا اور باہر سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

صبح چھ بجے کے قریب اتفاقاً جب میری آنکھ کھلی تو مجھے اس کا دھیان آیا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دوڑی دوڑی گئی۔ کواڑ کے ایک سوراخ میں سے میں نے اندر جھانکا۔ وہ گائے کا کالا اور کھُردرا کمبل اوڑھے گائے پر بیٹھا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اس سے کہا: "معاف کیجئے گا۔ میں نے واپس آنے کی بہت کوشش کی مگر امی جان نے مجھے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ انہیں بہت سردی لگ رہی تھی۔۔۔ میں کیسے آپ سے معافی مانگوں۔ آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔" اُس نے میری کسی بات کا جواب نہ دیا۔ شکر ہے کہ گھر میں کسی کو اس واقعے کی خبر نہ ہوئی۔ آٹھ بجے کے قریب اس نے نوکر کو بلایا اور کہا: "آج میں گرم پانی سے نہاؤں گا۔" پھر نو بجے جب ناشتہ چنا گیا تو اُس نے دودھ پینے سے انکار کر دیا: "میں آج چائے پیوں گا۔"

مجھے اس قدر مسرت حاصل ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اب اُس سے میری باقاعدہ خط و کتابت جاری ہے۔

(۳) "دو برس پہلے کی بات ہے جس کا میری شرارت پسندیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یوں تو میری زندگی میں ایسے بہت سے واقعے ہیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں لیکن یہ واقعہ جو میں اب بیان کروں گی ایسا ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں بہت شریر ہوں، حاضر جواب ہوں، بلا کی ہوں۔ میں کبھی پریشان نہیں ہوتی تھی لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ جب مجھے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو عجیب و غریب لطف کا احساس ہوا۔ جیسا کہ آپ کو واقعے کے بیان سے معلوم ہوگا میری پریشانی کا باعث کسی مرد کی چالاکی یا ہوشیاری نہیں تھی بلکہ محض ایک حادثہ کی وجہ سے مجھے بیحد خفیف ہونا پڑا۔

میں نے ٹریم میں کبھی سفر نہیں کیا تھا لیکن مجبوراً ایک روز مجھے اس میں سوار ہونا پڑا۔ مجھے جلدی دادر پہنچنا تھا۔ بس آنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ ٹریم سامنے کھڑی تھی۔ چنانچہ میں اس میں بیٹھ گئی۔ میرے سامنے ایک بہت ہی موٹا پارسی بیٹھا تھا۔ اُس کی توند اس قدر بڑی تھی اور اس کی گردن چربی کی وجہ سے اس قدر موٹی تھی کہ اگر وہ نیچے فرش کی طرف دیکھنا چاہتا تو اُسے لیٹنا پڑتا۔

مجھے سخت زکام ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ریشمی رومال تھا جس سے میں بار بار اپنی ناک صاف کر رہی تھی۔ جب ٹریم چلی تو لال باغ کے قریب ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا۔ رومال میرے ہاتھ سے اُڑا اور اُس موٹے پارسی کی ران پر جا گرا۔ کچھ دیر تک میں نے دل ہی دل میں کئی طریقے یہ رومال حاصل کرنے کے لئے سوچے۔ یہ بھی خیال آیا کہ اُسے مخاطب کر کے کہوں: "میرا رومال گر گیا ہے، براہ مہربانی مجھے دیدیجئے" لیکن وہ بیچارہ گردن جھکا کر کیسے دیکھ سکے گا۔ میں خود اُس کو بتا کر وہاں سے رومال اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ چپ چاپ انگلیوں کی مدد سے بالکل آہستگی کے ساتھ اُسے اٹھا لوں گی۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن ہر بار اس ڈر کے مارے کہ ٹریم میں بیٹھا ہوا کوئی اور آدمی دیکھ لے گا مجھے اپنا ہاتھ کھینچنا پڑا۔

مجھے غیر معمولی طور پر مضطرب دیکھ کر پارسی کو ایسا محسوس ہوا کہ فضا میں کچھ گڑبڑ ہے۔ جب کھڑکی میں سے باہر جھانکتے دیکھ کر کئی مرتبہ اس نے اپنی گردن موڑ کر باہر جھانکا۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ میں اس رومال کو وہیں چھوڑ دیتی اور بازار سے ایک اور خرید لیتی۔ مگر وہ ایک دوست کا تحفہ تھا اس لئے مجھے بیحد عزیز تھا۔ میں نے آخری بار ارادہ کر کے جب ہاتھ اُس طرف بڑھایا تو پارسی بے چین ہو گیا۔ میں اُس کی طرف خدا معلوم کن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کو اب پکا یقین ہو گیا کہ میرے اضطراب کا باعث اُس کا کوئی ایسا نقص ہے جس سے وہ ابھی تک غافل ہے۔ اُس نے بڑی دقت سے اپنی گردن جھکائی موٹے موٹے گدگدے ہاتھ رانوں پر ادھر اُدھر پھیرے۔ ایک ہاتھ کے نیچے میرا رومال آیا۔ ایک دم اُس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ جلدی سے بڑی پھرتی کے ساتھ اُس نے اپنی انگلیوں کی مدد سے میرے اس ننھے سے رومال کو اپنی پتلون کے اندر داخل کر لیا۔ کمبخت نے یہ خیال کیا کہ اُس کی قمیص کا دامن نکلا ہوا ہے۔ ادھر اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا ادھر میرا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر شرم محسوس کرتے رہے۔ میں تو اس حادثہ کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ جونہی ٹرام ٹھہری میں اُس پارسی کی طرف دیکھے بغیر اُتر گئی۔

میں اس واقعے کو قریب قریب بھول چکی تھی کہ چھ یا سات مہینے کے بعد کرافورڈ مارکیٹ کے پاس جبکہ میں ایک دُکان سے ننھا ہوا پستہ خرید رہی تھی ایک خوش پوش نوجوان میرے قریب آیا۔ اُس نے اپنی جیب میں سے باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک چیز نکالی اور مجھ سے کہا۔ معاف فرمائیے گا آپ کی ایک چیز گم ہو گئی تھی جو مجھے مل گئی۔ آج حاضر کر رہا ہوں۔"

میں نے باریک کاغذ کھول کر دیکھا تو میرا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا ــــ وہی رومال تھا جو اُس موٹے پارسی نے اپنی پتلون میں داخل کر لیا تھا ــــ مجھے بیحد شرم محسوس ہوئی۔ غصہ بھی بہت آیا۔ تھوڑی سی ہنسی بھی آئی۔ اور میں حیران ہوں کہ ایک دم میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے...... شاید اس لئے کہ میں نے اُس نوجوان کو پہچان لیا تھا۔ ٹرام میں یہ اُس روز دُور ایک کونے میں بیٹھا تھا...... مجھے کوئی بات نہ سوجھی ٹھیک طور پر میں اپنے کھسیانے پن کا بھی اظہار نہ کر سکی۔

سعادت حسن منٹو،

شوہر

اعتبار اور اعتماد کے لئے ہم ہر مقدس اور محبوب چیز کی قسم کھاتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ دیہات والوں کی سادگی کی قسم کیوں نہیں کھاتے۔

شہروں میں تعلیم اور تہذیب کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔ لیکن دیہات والوں پر اس کا اثر بہت کم ہوتا ہے۔ ان کی زندگی تکلف اور تصنع سے ہمیشہ پاک رہتی ہے۔ ان کے رسم و رواج شہریوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ عیاریاں، فریب کاریاں، عشق و الفت، کھیل تماشے دیہات میں بھی سبھی کچھ ہوتا ہے۔ لیکن شہر والوں سے جداگانہ طریق پر۔ ان کی عیاریوں اور فریب کاریوں میں جہالت کی جھلک، ان کے کھیل تماشوں میں جوانمردی اور بہادری نمایاں اور ان کا عشق و الفت سچے رومان سے لبریز جس کی پُر لطف کیفیتوں سے یہ سادہ لوح شاید خود بھی واقف نہ ہوں۔

درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں گاؤں تھا۔ کوئی تین چار سو نفوس کی آبادی تھی۔ کھیتی باڑی پر زندگی کا مدار تھا۔ اور کھیتی باڑی کا بارش پر۔ اگر وقت پہ پانی پڑ گیا تو سبھی خوش حال اور جو امساکِ باراں ہوا تو امیر بھی پریشان اور غریب بھی نالاں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جیسے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ تھے، ان کی گذران کچھ اچھی ہو رہی تھی۔ گاؤں سے پانچ سات کوس کے فاصلے پر ایک منڈی تھی۔ یہاں بھیڑ بکری کا دودھ بھی فروخت ہو جاتا اور گوشت بھی۔

راجو جاٹنی اسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ تھی تو مفلس لیکن اس کے دل میں کھبنے والے خد و خال کا گاؤں کے نظر بازوں میں اکثر چرچا رہتا۔ راجو کے باپ کے پاس پانچ سات بیگھے اراضی تھی۔ اور ایک مریل سا بیل۔ راجو کی ماں بوڑھی تھی اور باپ آنکھوں سے معذور۔ اور راجو جوان اور گاؤں کے اکثر مفلس اور قلاش نوجوان راجو سے شادی کرنے کے آرزومند۔ لیکن راجو کا باپ بیٹی ایسے شخص کو دینا چاہتا تھا جو زمین بھی پاسے اور بوڑھے ساس سسر کے اخراجات کا بھی کفیل ہو۔

لیکن یہ شرط ایسی کڑی تھی کہ کوئی حامی بھرنے کو تیار نہ تھا۔ صرف ایک دآدو تھا جو یہ بوجھ اٹھانے کے لئے آمادہ تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ دآدو جاٹ نہیں تھا۔ اور راجو کا باپ جاٹ کے سوا کسی اور سے بیٹی کی شادی کو ہتک سمجھتا تھا۔

دآدو کی کل جائداد تین گدھے تھے۔ ان گدھوں پر وہ گاؤں والوں کا غلہ لاد کر منڈی لے جایا کرتا۔ اور جب غلہ کا موسم نہ ہوتا تو ادھر ادھر سے سوکھے ہوئے اُپلے اکٹھے کر کے منڈی لے جا کر بیچتا۔ اور تو نہیں لیکن دونوں وقت روٹی مل جاتی تھی۔

دآدو کی بھی ایک مدت سے راجو پر نظر تھی۔ اور راجو بھی کچھ دلچسپی سے دآدو کی طرف دیکھا کرتی تھی۔ اور جو کبھی کہیں سے آتے جاتے دونوں کا سامنا ہو جاتا تو راجو ذرا آنکھیں مٹکا کر ذرا لچک لچک کر اس سے باتیں کیا کرتی۔ اور کبھی بلاوجہ ایک آدھ انگڑائی بھی لے لیتی۔ دآدو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتا تو راجو بھی مسکرا کر پوچھتی: "میں کوئی تماشہ تو نہیں، جو مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہو؟"

دآدو جواب دیتا: "راجو! تم سر سے پاؤں تک تماشہ ہو!"

"کیسے؟" راجو ذرا تیوری چڑھا کر پوچھتی۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" دآدو جواب دیتا۔

"معلوم نہیں تو پوچھتی بھی ہوں" راجو جواب دیتی: "تم ہی بتلا دو"

دآدو کہتا: "راجو! یہ تمہاری مرگ ایسی آنکھیں۔ یہ کالی رات ایسے سیاہ بال۔ یہ گنبد کی طرح ابھرا ابھرا سینہ اور ارہر کے بوٹے کی طرح یہ جھومتی ہوئی جوانی اور کوئل ایسی پیاری آواز! اب تم ہی کہو تماشہ ہو یا نہیں——؟"

راجو بظاہر بگڑ کر کہتی: "بہت سر چڑھ چلے تم! اپنی اوقات تو دیکھو! دو گدھوں پر چوہدری بنے پھرتے ہو!"

"او ہو!" دآدو کہتا: "تم تو بگڑنے لگیں راجو! تم نے پوچھا میں نے بتا دیا۔ اس میں میرا کیا قصور! جس منہ سے تمہارا نام لیتا ہوں اس منہ سے جھوٹ کیسے کہتا!"

راجو گھر کو لوٹتے ہوئے پلٹ کر کہتی: "تھوڑے سوکھے اُپلے تو دے جائیو۔"

دآدو اُپلے دے آتا۔

ایک روز جو دآدو گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک بیری کے نیچے بیٹھا

اپنے میلے کچیلے کُرتے میں پیوند لگا رہی تھی۔ راجو بیل کے لئے چارہ سر پر اُٹھائے اس سے گذر رہی تھی۔ دادو کو دیکھ کر چارے کا گٹھا سر سے پھینک دیا۔ اور سُرخ سُرخ بیر جو نیچے گرے ہوئے تھے اُٹھا اُٹھا کر کھانے لگی۔ پھر دادو سے بولی: "لاؤ! میں تمہارے کُرتے میں پیوند لگا دیتی ہوں۔ تم مجھے تھوڑے بیر توڑ دو!"

دادو بیری پر چڑھ گیا۔ اور راجو اس کے کُرتے میں پیوند لگانے لگی۔ دادو نے اُوپر جا کر جو ٹہنیاں ہلائیں تو بہت سے پکے پکے بیر نیچے گرے۔ راجو کُرتا چھوڑ کر بیر اُٹھا اُٹھا کر جھولی میں ڈالنے لگی۔ دادو نے اُوپر سے کہا: "آج تو تمہارے جھانسے میں آ گیا۔ لیکن پھر کبھی سہی!"

"کیا؟" راجو نے نیچے سے پوچھا: "کیا جھانسہ دیا میں نے؟"

دادو نے اُوپر سے ہنس کر کہا: "تمہاری تو وہی مثال ہے، پہاڑی پار کس کے، بھات کھایا اور کھسکے! میرا کُرتا تو رہا!"

"میں کہیں بھاگ تو نہیں گئی۔" راجو نے جواب دیا۔

"تم بھاگ بھی جاؤ تو میں کیا کر لوں گا۔" دادو نے اُوپر سے کہا۔

راجو اُوپر کی طرف دیکھ کر بولی: "یہ ذرا داہنے ہاتھ والی ٹہنی تو لاؤ۔ بڑے لال لال بیر ہیں اس پر۔"

دادو نے جو ذرا زور سے ٹہنی ہلائی تو کچے بیروں کے ساتھ کچے بھی گرے۔

راجو بولی: "واہ! یہ کچے کیوں گرا دئے!"

"میں نے جان بوجھ کر تو نہیں گرائے۔" اُوپر سے دادو جواب دیا۔ "تم کچے مت اُٹھاؤ۔ لو اب اُتر آؤں؟ جھولی بھر گئی؟"

"آ جاؤ!" راجو نے کہا۔

دادو بھی نیچے آ کر بیر اُٹھا اُٹھا کر کھانے لگا۔ جو اچھا ہوتا وہ راجو کو دیتا۔ جب بیر چُنے گئے تو راجو دادو کا کُرتا سینے لگی۔ دادو بھی پاس آ بیٹھا۔

راجو بولی: "میرے پاس کیوں آ بیٹھے؟ بیر کھاؤ۔"

"کچے بھی کھا جاؤں۔" دادو نے کہا: "تم تھوڑے سے پکے پکے دیدو۔"

راجو نے ہنستے ہنستے انگوٹھا دکھا دیا۔

دادو بولا: "دیکھو تو کتنے کانٹے لگے میرے۔ ترس بھی نہیں آتا تمہیں۔"

دونوں ہنسنے لگے۔

راجو بولی: "دادو! اب تم بیاہ کر لو!"

"کس سے؟" دادو نے پوچھا: "غریب سے کون بیاہ کرے گی؟"

"کوشش کرو گے تو کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گی۔" راجو نے جواب دیا۔

"تم سفارش کرنے کی حامی بھرو تو شاید کام بن جائے۔" دادو نے کہا۔

"ہے کون؟" راجو نے پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا؟" دادو نے کہا: "سفارش کرو گی پھر؟"

"پہلے بتلاؤ!" راجو نے ہنس کر کہا: "ہے کون؟"

"بیروں والی۔" دادو نے ہنس کر کہا۔

"ہوں؟" راجو نے یہ ہوں ذرا لانبی کر کے کہا: "یہ مُنہ اور مسور کی دال!"

"میں غریب جو ہوا؟" دادو نے پوچھا: "ٹھیک ہے نا؟"

"تمہارے مُنہ میں زبان نہیں کیا؟" راجو نے کہا: "یا بات کرتے شرم آتی ہے؟"

"زبان تو ہے۔" دادو نے جواب دیا: "لیکن میری سننے گا کون؟"

"جسے کہنے کی ہمت ہی نہ ہو۔" راجو نے کہا: "اس کی سُنے گا کون؟"

"تمہاری ماں مان جائے تو ایک گدھا بیچ ڈالوں۔" دادو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" راجو نے پوچھا۔

"تمہارے لئے لال جوڑا بناؤں گا۔" دادو نے جواب دیا۔

"بس!" راجو نے ہنس کر کہا۔

"اور چاندی کے کنگن بھی۔" دادو نے کہا۔

"بس!" راجو نے ہنس کر کہا۔

"ایک ہیکل بھی!" دادو نے کہا۔

"بس!" راجو نے ہنس کر کہا۔

"تلے والا جوتا بھی!" دادو نے کہا۔

"بس!" راجو نے کہا۔

اور دادو نے ہنس کر کہا: "نہ جانے اور کیا کیا ہونا ہے۔"

راجو بھی ہنسنے لگی۔

قدرت جو مہربان ہو تو غریبوں کے ارمان پورے کرنے کے خود ہی سامان کر دیتی ہے۔ راجو کا باپ ایک تو آنکھوں سے معذور تھا، اس پر دمہ کی نامراد بیماری نے کھوکھلا کر دیا تھا۔ بڑھاپا میں اب اتنی سکت نہ تھی کہ

...سارا دن جو محنت مشقت کرتی تب کہیں جا کر کچھ کمانے کو ملتا۔ داؤد کے گدھوں میں ہمدرد رہتا تھا کبھی آڑے وقت کام آ ہی جاتا۔ بوڑھے کو دمہ ہوا تو اُسے گدھے پر سوار کروا کر منڈی کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ خیراتی شفاخانے سے مفت کو دوا مل گئی۔ ڈاکٹر نے کہا جب دوا ختم ہو جائے تو اور آ کر لے جانا۔ چنانچہ دوا جب ختم ہوتی داؤد منڈی سے دوا دارو بھی لے آتا۔ داؤد کی اس ہمدردی سے بوڑھے جاٹ کا بھی دل پسیجا اور وہ داؤد سے بیٹی کا بیاہ کرنے پر رضامند ہو گیا۔ داؤد نے تین گدھوں میں سے ایک بیچ ڈالا اور راجو کے لئے چاندی کے پتلے پتلے کنگن، جھمکے، گوٹے والا سرخ جوڑا، چاندی کی ایک ہیکل اور کامدار جوتا خرید لایا۔

راجو کی ماں نے گڑ کے چاول پکا کر بیٹی کا داؤد سے نکاح کر دیا۔

ایک دو سال خوب گذرے۔ گھر میں کمانے کو اناج بھی آ گیا اور گدھوں کی مزدوری سے داؤد نے کچھ ٹکے بھی کما لئے۔ لیکن اسکے بعد پے در پے دو ایک سال سوکھے ہی گذر گئے۔ راجو کے والدین بھی یکے بعد دیگرے دنیا سے چل بسے۔ افلاس اور تنگ دستی نے اتنا پریشان کیا کہ آخر داؤد بیوی سے صلاح مشورہ کر کے کسی شہر میں جا کر محنت مزدوری کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ آخر شادی کے تیسرے برس داؤد دو بچیاں جن میں ایک دو سال کی اور دوسری سال بھر کی تھی چھوڑ کر تلاش معاش میں چل نکلا۔ لیکن نحوست کب پیچھا چھوڑتی تھی۔ شہر میں آتے ہی ایسی افتاد پڑی کہ محض اپنی جہالت اور سادگی کے باعث بارہ سال کیلئے جیل بھیج دیا گیا۔

ادھر راجو یہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اس کا شوہر شہر میں جا کر کہیں ملازم ہو جائے گا یا محنت مزدوری کرے گا۔ ملازم بھی ہو گیا تو سات روپے ماہوار کے علاوہ روٹی بھی دونوں وقت ملے گی۔ پانچ سات روپیوں میں اس کا اور اس کی بچیوں کا گاؤں میں بخوبی گذارہ ہو جائیگا اور جو محنت مزدوری ہی کرنی پڑی تو بھی داؤد اتنے روپے ضرور پس انداز کر لیا کریگا جو ان کی ضروریات زندگی کے لئے کافی ہونگے۔

اسی تمنا میں پہلے ہفتے پھر مہینے اور مہینوں کے بعد سال گذر گئے۔ لیکن نہ تو داؤد نے کوئی خط ہی بھیجا اور نہ روپے۔ راجو کے پاس صرف ایک گدھا تھا۔ وہ غریب دن بھر سوکھے اُپلے اکٹھے کرتی اور تیسرے چوتھے روز منڈی میں لے جا کر فروخت کر آتی۔ چار پانچ آنے یوں مل جاتے۔ رات پہروں بیٹھی چکی پیستی اور اس طرح اپنا اور اپنی بچیوں کا پیٹ پالتی۔

کئی سال یوں ہی گذر گئے لیکن راجو نے نہ ہمت ہی ہاری اور نہ اُس کی آس ہی ٹوٹی۔ وہ داؤد کو یاد کر کے آہیں بھی بھرتی کبھی رو بھی لیتی۔ اُپلے بھی اکٹھے کرتی، چکی بھی پیستی۔ جاٹنیوں کا کام کاج بھی کر آتی۔ اسی طرح اس نصیبوں کی ہاری نے دس سال! پہاڑ ایسے دس سال گذار دیے لیکن اس کی آس پوری نہ ہوئی اور پچیس تیس سال کی عمر میں نہ تو بدن میں سکت رہا نہ چہرے پر شگفتگی۔

راجو کا پڑوسی شرفو پندرہ بیس بھیڑوں کا واحد مالک تھا۔ اسکی بیوی عموماً بیمار ہی رہتی۔ لیکن یہ نیک بخت راجو کی بچیوں کا ہمیشہ خیال رکھتی۔ راجو بھی اُس کی کچھ نہ کچھ خدمت کرتی ہی رہتی۔ قضا الٰہی شرفو کی بیوی مر گئی۔ گھر والی کے مرنے کے بعد راجو ہی شرفو کی روٹی پکا دیتی۔ آخر دس سال شوہر کا انتظار کرنے کے بعد مسجد کے مُلّا نے راجو کو عقد ثانی کی اجازت دیدی۔ اور راجو نے شرفو ہی سے نکاح پڑھوا لیا۔ پانچ بھیڑیں مہر قرار پایا۔ یوں ایک مدت کے بعد راجو اور اس کی بچیوں کو پیٹ بھر کر روٹی کھانی نصیب ہوئی۔ اب نہ تو وہ اُپلے اکٹھے کرنے جاتی نہ جاٹنیوں کے گھر جا کر اُن کا کام کاج کرتی۔ اور نہ ہی اُس کی بچیاں روٹی کپڑے کو ترستیں۔ اب جو اُسے اپنے گھر کے کام دھندے سے فرصت ہوتی تو وہ اُون کاتتی۔ اُس کی بچیاں بھی کبھی اس کا ہاتھ بٹاتیں۔

یہ سب کچھ تو ہوا تاہم داؤد کی یاد کبھی کبھی اُسے بے چین سا کرتی۔ وہ سوچا کرتی کہ آخر اُسے ہوا کیا جو اُس نے بھول کر بھی نہ خبر بھیجی نہ گھر والوں کی خبر لی۔

اس دوسرے نکاح کو دو سال گذر گئے اور داؤد غریب کو وطن سے نکلے بارہ برس۔ گاؤں والے داؤد کو بھول چکے تھے۔ غریب کو یاد بھی کون رکھتا ہے۔ ایک روز شرفو گھر کے صحن میں بیٹھا بھیڑوں کی اُون اُتار رہا تھا۔ اتنے میں ایک فقیر دروازے پر آیا۔ نہ سر پر پگڑی نہ پاؤں میں جوتا۔ پھٹا ہوا تہبند، پھٹا ہوا کرتا۔ ہاتھ میں لاٹھی تھی مفلسی اور غربت کی مجسم تصویر——!

"جاؤ بابا!" ایک لڑکی بولی "معاف کرو اس وقت"
لیکن فقیر پھر بھی کھڑا رہا۔
لڑکی نے پھر کہا "جاتے کیوں نہیں۔ کچھ قرض تو نہیں دینا تمہارا——!"
شرفو نے لڑکی سے کہا "جاؤ! کوئی ٹکڑا ہو تو لا دو"

لڑکی بولی۔ "آدمی باسی تھی جو ہم نے مرغیوں کو ڈالدی؟"

شرفو نے مسکرا کر کہا۔ "تمہاری مرغیاں انڈے تو دیتی نہیں۔ کھلا کھلا کر انہیں موٹا کر دیا ہے تم نے؟"

راجو تندور پر سے واپس آرہی تھی۔ سر پر روٹیوں کی چنگیری تھی۔ راجو نے فقیر کی طرف دیکھا اور فقیر نے راجو کی طرف۔ آنکھیں چار ہوتے ہی دونوں کی عجب حالت ہوئی۔ راجو کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور فقیر صورت تصویر خاموش کھڑا تھا۔

شرفو نے لڑکی سے کہا۔ "ماں سے کہو ایک ٹکڑا اسے بھی دیدے!"

لڑکی نے جو ماں کو روتے دیکھا تو تعجب سے بولی۔ "اماں! رو رہی ہو کیا ہوا؟"

راجو نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔"

شرفو نے بھی تعجب سے بیوی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "کسی سے لڑ تو نہیں آئیں؟"

راجو نے کچھ جواب نہ دیا۔ چنگیری سر سے اتار کر پیڑھی پر رکھدی اور صحن میں کھاٹ ڈال کر دادو سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ!"

دادو کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ شرفو نے تعجب سے فقیر کی طرف دیکھا۔ لڑکیاں پاس آکر کچھ حیرت سے فقیر کی طرف دیکھنے لگیں۔ راجو لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"یہ دونوں تمہاری ہی بچیاں ہیں۔ تم کہاں رہے اتنے روز؟"

دادو کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ شرفو بھیڑوں کو چھوڑ کر پاس آیا اور دادو کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تم دادو ہو؟"

"ہاں!" دادو نے جواب دیا۔

"کہاں رہے اتنے روز؟" شرفو نے پوچھا۔

"جیل میں!" دادو نے جواب دیا۔

"جیل میں؟" شرفو نے پوچھا۔ "چوری کی تھی کیا؟"

"نہیں!" دادو نے جواب دیا۔ "شہر کے بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ نا سمجھی میری!"

دادو کے واپس آنے کی خبر گاؤں میں پھیلتے ہی ادھر ادھر سے پانچ سات جاٹ بھی آگئے۔ کچھ صلاح مشورہ کے بعد مسجد کے مُلا کو بلوایا گیا۔ مُلا نے دادو کی سرگذشت سنکر یہ فتویٰ دیا کہ شرفو، راجو کو اسی وقت طلاق دیدے اور مہر ادا کردے۔ شرفو نے راجو کو طلاق دیدی اور مہر کی پانچ بھیڑیں بھی دیدیں۔ مُلا نے راجو کا دادو سے نکاح پڑھ دیا۔ شرفو اسی روز اپنا بوریا بستر اٹھا کر گاؤں سے چلا گیا پھر کبھی کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔

ایم۔ اسلم

بھینٹ

ندی کے پار یہ پیپل کا بوڑھا دیوتا اب بھی
کسی غمناک افسانے کا مجرم ہو ہی جاتا ہے

عقیدت سے یہاں نازک قدم تھرا کے اُٹھے تھے
یہاں آتے ہوئے پازیب کی جھنکار بھی کم تھی
وہ آنچل مورتی کے سامنے لہرا کے اُٹھے تھے
یہاں دوشیزگیِ حُسن پردہ دار بھی کم تھی

کوئی الھڑ جوانی صبح کے پھولوں کی تھالی پر
لڑکپن کے حسیں خوابوں کی دُنیا لے کے آئی تھی
اُمیدوں کی سنواری ایک تصویرِ خیالی میں
نسائیت یہاں خود جذب ہو کر مسکرائی تھی

تقدس کے حسیں شیطان کے قدموں کی آہٹ میں
یہاں دوشیزگی کی چیخ بھی گم ہو گئی آخر
گھنے پتوں کے نیچے مورتی کی مسکراہٹ میں
ہمیشہ کیلئے بھولی پجارن کھو گئی آخر

کئی صدیوں سے جو سویا ہوا تھا وہ خدا اب بھی
یہاں کی شام کی تنہائیوں میں سو ہی جاتا ہے!!

سلام مچھلی شہری

ساز اندر ساز

(۱)

نرم فضا کی کروٹیں دل کو دکھا کے رہ گئیں
ٹھنڈی ہوائیں بھی تری یاد دلا کے رہ گئیں

سازِ نشاطِ زندگی شعلہ ساتھر تھرا اٹھا
کس کی نگاہیں عشق کا درد سنا کے رہ گئیں

سچ ہے کہ اہلِ درد کو اور تو کون پوچھتا
ہاں تری شادمانیاں اکھڑ لا کے رہ گئیں

حسنِ نظر فریب میں کس کو کلام تھا، مگر
آج تو تیری سب ادائیں دل میں سما کے رہ گئیں

تیرے خرامِ ناز سے آج وہاں چمن کھلے
عشق کی بستیاں جہاں خاک اڑا کے رہ گئیں

تاروں کی آنکھ بھی بھر آئی میری صدا لئے درد پر
ان کی نگاہیں بھی ترا نام بتا کے رہ گئیں

تیرا جمال ہے کہ اک عہدِ نہاں کی داستاں
آنکھیں تری قسم سی پھر چپکے سے کھا کے رہ گئیں

یاد کچھ آئیں اس طرح بھولی ہوئی کہانیاں
ہر دلِ بیقرار میں درد اٹھا کے رہ گئیں

تب کہیں کچھ پتہ چلا صدق و خلوصِ حسن کا
جب وہ نگاہیں عشق سے بات بنا کے رہ گئیں

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

غم زدگانِ عشق کو کون سکون دے سکا
بھیگتی راتیں بھی فراقؔ آگ لگا کے رہ گئیں

(۲)

خوابِ گراں سے عشق کو جیسے جگا کے رہ گئیں
اٹھتی ہوئی جوانیاں درد اٹھا کے رہ گئیں

مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تری
مجھ سے حیات و موت بھی آنکھ چرا کے رہ گئیں

تو نہیں آیا اور رات رہ گئی راہ دیکھتی
تاروں کی محفلیں بھی آج آنکھیں بچھا کے رہ گئیں

دشت و چمن کی کچھ ہوائیں دور و قریب کی صدا پر
بھولی ہوئی کہانیاں یاد دلا کے رہ گئیں

چھیڑ دیا کچھ اس طرح آج تری نگاہ نے
غفلتیں اک جہان کی ہوش میں آ کے رہ گئیں

نرگسِ مست ہوشیار چونک اٹھے اہلِ انتظار
ان کی نگاہیں کچھ ترے راز سے پا کے رہ گئیں

پوچھ نہ ان نگاہوں کی طرفہ کرشمہ سازیاں
فتنے سلا کے رہ گئیں فتنے جگا کے رہ گئیں

تھیں یہی آنکھیں آئنہ اور یہی آنکھیں پردہ تھیں
تجھ کو دکھا کے رہ گئیں تجھ کو چھپا کے رہ گئیں

تیری نگاہوں میں کبھی تھا جہانِ تو بھی تھا
اس کو بنا کے رہ گئیں مجھ کو مٹا کے رہ گئیں

پردۂ دل پہ لکھ گئیں خوں شدہ حسرتیں کچھ آج
نقش و نگارِ بزمِ دوست جیسے بنا کے رہ گئیں

پھر وہی سوز کائنات پھر ہیں وہی اداسیاں
زندہ دلوں کی محفلیں رنگ جما کے رہ گئیں

جاگتا خواب تھا کوئی دید بھی اہلِ حسن کی
اپنی ہی صورتیں فراقؔ خواب میں آ کے رہ گئیں

فراقؔ گورکھپوری

دریچے کے نیچے

(مرد ایک ابدی احمق ہے اور عورت ایک مسلسل ضد)

آپ مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ تمام عمر کنواری رہنے کا راز بتاؤں۔ آپ کو میرے نجی معاملات سے کیوں دلچسپی ہوگئی ہے۔ خیر جانے دیجئے بعض آدمیوں میں تجسس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ آپ کی جرأت ہے۔ اب تک جس قدر مرد مجھ سے یہ سوال کرتے رہے وہ یا تو ناموزوں تھے یا خاموشی کے ساتھ میرے کنوارے پن کی دل ہی دل میں ہنسی اڑا تے تھے۔ آپ ہی ایک دلیر و دانا مرد مجھے ملے ہیں۔ اگر ایک جوان عمر دولتمند حسین لڑکی شادی نہ کرے تو لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ یا تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ "خشک" ہے، یا "سرد" ہے۔ یا پھر یہ کہ اسے کوئی "مایوسی" اور ناکامی عشق ہوئی ہے جس کی وجہ سے اس کا دل مردوں کی طرف سے پھر گیا۔

لیکن کوئی شخص بھی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں نے اب تک کیوں شادی نہیں کی۔ اس کی وجہ میں بتاتی ہوں۔ میں نے شادی یوں نہیں کی کہ میں مردوں سے متنفر ہوں اور میں مردوں سے ڈرتی بھی ہوں۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں نے سب ہی مردوں کو ظالم و جابر پایا ہے۔ نہیں، مرد محبت و شیفتگی کے مجسمے بن کر بھی میرے سامنے آئے۔ اور قہر و غضب کے آتشیں گولے بھی بن کر میرے سامنے سے گذر گئے مگر کوئی چیز مجھے متاثر نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں مردوں کی اصل حقیقت سے آگاہ ہو چکی ہوں۔ میں مردوں کو خوب جان گئی ہوں۔ مجھے کسی محبت کی ناکامی اور نامرادی سے واسطہ نہیں پڑا کیونکہ میں نے آج تک کسی سے عشق کیا ہی نہیں۔ مجھے عشق سے نفرت ہوگئی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مردوں سے نفرت کرنے کا عشق ہوگیا ہے! ...... میں بہت جلد بوڑھی ہوگئی، گو بیشک میری عمر کم ہے مگر دل بوڑھا ہوگیا۔ اور اس قدر جلد کہ آپ کو سن کر حیرت ہوگی۔ بس ایک رات ——— جبکہ میں صرف سترہ سال کی تھی ——— ایک رات ایسی آئی کہ جس نے مجھے برسوں کا بوڑھا بنا دیا ——— کیا بات تھی وہ!

[illegible] بہت دلسوزی کے ساتھ سن رہے ہیں۔ سن لیجئے

آپ سنیں گے اور اسے حرف بحرف تسلیم کریں گے مگر پھر بھی سننے کے بعد یہی فیصلہ کریں گے کہ میں غلطی پر تھی۔ میں نے غلط اندازہ لگایا۔ کیوں نہ ہو آپ بھی تو مرد ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ ایک اچھے مرد ہوں مگر بہر کیف مرد تو ہیں! اس لئے مردوں کی حمایت پر کمربستہ۔ آپ کے لئے یہ کہنا بالکل آسان ہے کہ:۔

"جو واقعہ آپ نے سنایا ہے وہ ٹھیک ہے اپنی جگہ، مگر وہ استثنیٰ ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے اور سماج کی ایک اعلیٰ حیثیت عورت کے ساتھ بھلا ایسا ہونا اور تواتر کے ساتھ ہونا کیسے مانا جا سکتا ہے تم بہت حساس بلکہ نازک مزاج لڑکی ہو اس لئے ایک معمولی سے واقعہ نے تمہارے دل پر گہرا اثر کیا ہے!"

لیکن میں ان دلیلوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کیونکہ آپ نے وہ دیکھا ہوتا جو میں نے دیکھا ہے تو ایسی رائے پاس نہ کرتے۔.. .... مجھے توقع نہیں ہے کہ آپ میرا نقطۂ نظر پوری طرح سمجھ سکیں گے۔ لیکن پھر بھی میرا فرض ہے کہ آپ کی ہمدردی اور دلجوئی کے شکریہ کے طور پر چند باتیں اس واقعے سے متعلق آپ کے گوش گذار کروں خواہ آپ مانیں یا نہ مانیں۔

آج سے چند سال قبل کا ذکر ہے کہ میں اور میری والدہ "قدم شریف" میں رہا کرتے تھے۔ ہم نے ایک مکان لے رکھا تھا جس کی دو منزلیں تھیں۔ یہ مکان ایک سنسان اور کم آباد گلی میں واقع تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر چلمنیں چڑھی رہتی تھیں اور ہم دونوں ماں بیٹیاں کبھی کبھار ہی کسی کام کو باہر نکلتے تھے ورنہ بالعموم گھر میں رہتے تھے۔

ایک رات بڑی حبس تھی اور مجھے گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی۔ سخت پریشان رہی، کسی طرح نیند نہ آتی تھی۔ سوچا کہ کھڑکیاں کھول دوں تو ہوا آسکے گی۔ مگر خیال ہوا کہ کھڑکیاں کھلنے کی آواز سے کہیں اماں جی کی آنکھ نہ کھل جائے اس لئے

میں نے یہ عذاب بھگت کے طاقاتی کرنے میں چل کر لیٹوں اور پنکھا چلتا رہا، اسی حالت میں تھی، اسی حالت میں مجھے آنکھ لگ گئی۔ مجھے کچھ سکون محسوس ہوا اور میں نے طاقاتی کمرے کی کھڑکیوں کی طرف نظر کی۔ تقریباً سب کھڑکیاں بند تھیں بس ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس کی جھلملیاں چڑھی ہوئی تھیں..... تازی ٹھنڈی ہوا گلی کی طرف سے آ رہی تھی میں نے اس کھڑکی کی جھلملیاں ہٹا دیں اور باہر کی طرف دیکھنا شروع کیا۔

میرے لئے پاکیزگی خیال و تصور اور دوشیزگی مسرت کی یہ آخری رات تھی!۔

میں دریچے میں مشکل سے ایک منٹ کھڑی رہی تھی کہ سامنے سے ایک مرد اور ایک لڑکی کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتے دیکھا۔ مرد یہ چاہتا تھا کہ لڑکی کو سڑک کے محاذ سے ہٹا کر گلی کے اندر سایہ میں لے آئے جہاں اندھیرا تھا کیونکہ اندھیرا بہترین امینِ عشق ہوتا ہے۔ دیکھنے سے یہ آدمی ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا ہے جو مہینہ بھر کام کرنے کے بعد اپنی تھوڑی کمائی کا روپیہ کبھی اس لڑکی کے پیچھے کبھی اس لڑکی کے پیچھے لٹانے کے سوا اور کوئی کام نہیں جانتے۔ وہ شکیل تھا۔ سانولا رنگ اور گورا تھا۔ اگر غیر متحرک حالت میں ہو تو کسی رومی دیوتا کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا ــــــ رہ گئی لڑکی، تو اُسے میں نے فوراً پہچان لیا۔ کیونکہ وہ ماہی کے پاس اکثر آیا کرتی تھی۔ غریب لڑکی جو پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے اچھی تعلیم نہ حاصل کر سکی تھی اور اچھی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے روپیہ سے محروم رہ گئی تھی اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کی عمر کوئی پندرہ سال کی ہوگی۔ اس وقت وہ ایک سیاہ ساری پہنے ہوئے تھی جس کا جلاؤ زعفرانی رنگ کا تھا۔ اس کے خوبصورت بال جوڑے کی صورت میں تاج کی طرح سر پر رکھے ہوتے تھے۔

اسکے ساتھ جو سانولا سا آدمی تھا اُس نے اس کا کندھا پکڑ رکھا تھا۔ یکایک وہ بولا: "بس یہاں ٹھیک ہے.... یہاں آجاؤ۔ یہ جگہ......"

لڑکی زرد پڑ گئی اور اُس نے تقریباً چیخنے کی آواز میں کہا: "چھوڑ دو مجھے ــــ مجھے جانے دو!"

اُس کی آواز سے تھکن اور پریشانی ظاہر ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ فقرہ بار بار دہرا کر تھک چکی تھی مگر اس بے حس اور سنگدل مرد پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

مرد برابر کہے گیا: "کیوں نہیں۔ اب تمہیں جانے نہیں دونگا۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ......"

"اس جگہ نہیں ــــ یہاں کو نہیں کہا تھا... خدا کیلئے مجھے چھوڑ دیجئے، مہربانی کیجئے ــــ!"

"تو پھر کہاں؟ کمرہ کرایہ پر لینا میری جیب کی دسترس سے باہر ہے۔ اچھا چلو لال قلعہ کے نیچے چلیں آدھ گھنٹے میں وہاں پہونچ جائیں گے وہاں سنسان ہے۔"

لڑکی نے جھنجلا کر سر ہلایا جس پر مرد بہت برافروختہ ہوا اور بولا: "دیکھو! تم میرے ساتھ دھوکہ کر رہی ہو۔ طرح طرح کے وعدے کئے اور اب انکار کرتی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اگر تم مجھ کو دھوکہ دے رہی ہو تو اپنا رستہ لو۔ ابھی چلی جاؤ۔ مجھے تم جیسی لڑکیوں کی ضرورت نہیں ہے تم جیسی چھتیس پھرتی ہیں۔"

لڑکی سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ روتے روتے وہ بولی: "اوہ! تمہیں کیا معلوم ہے کہ میں کس قدر محبت کرتی ہوں تم سے!.... مگر یہ نہیں ہو سکتا جو تم چاہتے ہو.... اسے محبت کہتے ہیں!.... ہرگز نہیں ــــ میں چاہتی ہوں کہ تم کو برابر دیکھے جاؤں اور کبھی کبھی تم کو چوم بھی لوں۔ بس یہ کافی ہے۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں کیونکہ تم شیریں گفتار ہو، میری مدد کرتے رہتے ہو۔ بہادر اور قوی ہو، مگر جب تم اس قسم کی باتوں کا ذکر چھیڑ دیتے ہو تو میرا دل دُکھنے لگتا ہے۔ مجھے ان باتوں سے نفرت ہے! یہ گناہ ہے! اور پھر تم سے!.... تم مجھ سے شادی کرو، میں تمہاری ہی ہوں لیکن یہ مذاق کیوں؟ آخر شائستگی بھی تو ہماری زندگی میں کوئی جگہ پاتی ہے۔ تم اس رومان کا کیوں ستیاناس کرنا چاہتے ہو؟"

اس پر مرد نے لڑکی کو گالیاں دیں اور غلیظ باتیں سنانی شروع کیں جنہیں یہاں میں نہیں دُہرا سکتی۔ اور یکایک اُس نے کوٹ کی جیب میں سے ایک چاقو نکالا ــــ ایک طویل فولادی شے ــــ اور بھاری آواز میں بہت آہستہ آہستہ کہنے لگا: "اب چھوڑو اس مذاق کو! ــــ چلو سیدھی طرح میرے ساتھ آؤ ورنہ یہ محسوس کرنا پڑے گا!"

لڑکی نے اپنا جسم سخت اکڑا لیا اور دونوں میں ایک بھیانک لڑائی سی شروع ہو گئی۔ اس منظر کا صحیح نقشہ کھینچنا محال ہے....

گلی بالکل سنسان تھی اور خاموشی بُری طرح دل و دماغ میں پیوست ہوئی جا رہی تھی!

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ تمام بستی سو رہی تھی سوائے ان دو ہستیوں کے اور ایک خوفزدہ نظارہ بیں کے ۔ ۔ ۔ ۔

وہ دونوں اب میری کھڑکی کے عین قریب آ گئے تھے اور اس طرح کھڑے تھے کہ اگر میں چاہتی تو ان کو چھو سکتی تھی۔ وہ دوہری ہو چکی تھی۔ اس کا سر ٹانگوں میں جا لگا تھا۔ مرد نے اُسے بالکل بے قابو کر دیا تھا۔ جونہی کہ اس بزدل کا ہاتھ اس کی ساری تک پہونچا لڑکی نے ایک زور کی لات دی اور ناخنوں سے اُس کا چہرہ زخمی کر دیا۔

اوہ! آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ منظر کتنی دیر تک قائم رہا۔ آپ کو شاید توقع نہ ہوگی کہ اس قدر دیر تک رہا ہوگا مگر وہ رہا اور میری حالت غیر ہوئی۔ مگر خیر، لڑکی بالکل بے بس ہو گئی اور مرد نے اُس پر پورا قابو پا لیا۔ وہ ایک ناتواں پر اپنی جرأت اور مردانگی کا وار کر کے کس قدر نازاں تھا۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ لڑکی کے مُنہ سے کف جاری تھے اور غیظ کی انتہائی کیفیت اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ فضا میں ہل رہے تھے گویا وہ کسی غیبی مدد کے لئے بلبلا رہے تھے ـــــــ یکایک لڑکی کا ہاتھ مرد کی پیٹی سے ٹکرایا جس میں چاقو لٹک رہا تھا۔ اُس نے بلا تامل چاقو پر ہاتھ ڈال دیا اور کچھ سوچے سمجھے بغیر قدرت کے اس غیبی ہاتھ سے موذی کی گردن کو مجروح کر دیا۔

مارنے کے انداز سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کہاں مارے اور کہاں نہ مارے، بس جہاں اور جیسے بھی ہاتھ پڑ گیا اس نے مارنا شروع کیا۔ یکایک چاقو گردن میں سے وار پار نکل آیا۔

خون کا ایک فوارہ۔

گردن کے دونوں طرف جو پھولی ہوئی رگیں تھیں وہ کٹ گئیں اور خون کا فوارہ چاروں طرف گرنے لگا۔ یکایک خون کا لوتھڑا عین میری جھلملیوں پر آ کر گرا بلکہ اس کی چھینٹیں میرے سفید شب خوابی کے لباس پر آ کر رکیں۔

اب مرد بالکل بے حس و حرکت پڑا تھا خاموش اور بے حقیقت اس کا چہرہ بھیانک تھا، آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں، ۔ ۔ ۔ ۔ جذبۂ شہوت سے اندھا ہو کر وہ ایک ناتواں لڑکی پر جس بھیانک درندگی کے ساتھ جھپٹا تھا اور دہشت لہجے میں بول رہا تھا، یہ بے بسی اور ناطاقتی اس کے مقابلے پر، اور وہ بھی اس قدر جلد، عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔ ایک آن واحد میں کیا سے کیا ہو گیا۔

مگر لڑکی کو کچھ فکر نہ تھا، وہ خوشی میں دیوانی سی ہو رہی تھی، اُس نے فرطِ انبساط میں دو تین چیخیں زور کی لگائیں جس سے گلی گونج اٹھی گویا دیوار قہقہہ پھوٹ پڑی۔ اور لڑکی بھاگ گئی ـــــــ اوہ، وہ چیخیں، میں نے آج تک ایسی آواز نہیں سُنی۔ نہ اسے خوف کی چیخ کہا جا سکتا ہے نہ جانے وہ کیا جذبات تھے جن کی وجہ سے یہ تین چیخیں اس فاتح لڑکی کے مُنہ سے نکلیں، ان کی توجیہہ اور تعریف کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

میں نے ان چند لمحوں میں کیا نہیں دیکھا تھا۔ زندگی دیکھ لی۔ محبت کا نظارہ۔ ہوس کا کھیل ـــــــ خون، موت، فولاد ـــ ـــ!

مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد پھر کیا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ البتہ یہ ہے کہ اوپر سے میری امّی نے مجھے پکارا کہ اس وقت نیچے کیوں گئی میں سہم گئی، مجھ سے دو قدم چلنا دوبھر ہو گیا ـــــــ وہ مجھے ڈھونڈتی اور مجھے دیکھا کہ لرز رہی ہوں اور دریچے سے ایک انچ آگے سرکی اور پھر لرز کر ان جھلملیوں کو تھام لیتی تھی۔ غرض عجب کیفیت مجھ پر سے گذر رہی تھی۔ اُنہوں نے میرا شب خوابی کا لباس خون سے تر دیکھا تو لرز گئیں کہ کیا ہوا میری جان اور آبرو کی خیر تو ہے؟"

خیر، میں یہ بتانا نہیں چاہتی کہ پھر کیا کیا باتیں ہوئیں اور کس طرح میں اس کشمکش میں سے نکلی۔ تم میرا راز معلوم کرنا چاہتے تھے میرے پیارے دوست ـــــــ میرے نفسی دوست ـــــــ یہ ہے میری زندگی کا راز اب تم سمجھ گئے ہو گے۔

پھر میں نے کسی لڑکے سے محبت نہیں کی۔ میں کسی مرد سے اب محبت کر بھی نہیں سکتی تھی ـــ میں ہر چند کہ دوشیزہ ہوں لیکن مردوں کی ہر خواہش کو دیکھ چکی ہوں، ہر چند کہ میں ایک مجہول سی لڑکی ہوں مگر یہ جانتی ہوں کہ زندگی کس چیز کا نام ہے ـــ محبت! ابھی تک آپ دھوکے میں ہیں۔ اس لئے میں پھر ایک بار یاد دلاتی ہوں کہ آپ میرا خیال دل سے نکال دیں میں اب کسی سے محبت نہیں کر سکتی ہوں، یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی اب میں مرد کو کس نظر سے دیکھ سکتی ہوں اس کا اندازہ آپ لگا لیں گے۔ اس لئے آپ نے ان دیکھے محبوب کی شان میں جو قصیدے لکھے ہیں وہ خطوط آپ کو واپس کئے دیتی ہوں۔ میں انہیں پڑھتی تھی اور مسکراتی تھی، ممکن ہے آپ ایک اچھے مرد ہوں ـــ لیکن پھر بھی مرد تو ہیں، ایک ایسی جنس سے تعلق رکھنے والے جس نے میری ہم جنس پر اُسے سے ... عین میری آنکھوں کے سامنے حملہ کیا تھا ـــ میں تمام عمر ...

...ہے ہر مرد ایک چمکتا ہوا فولاد معلوم ہوتا ہے ——— اور میں نہیں چاہتی کہ یہ فولاد میرے جسم میں پیوست ہو۔ میرا بس چلے گا تو ہر مرد کو تشنگی اور ساحل سے نامراد واپس کر دوں گی۔ اس کے بغیر میرے جذبۂ انتقام کی تسکین نہیں ہوگی، میری جلن تو سرد ہوگئی۔ علاوہ یہ قربانی کی ہے محض اس لئے کہ مردوں سے انتقام لیتی رہوں ——— تم اس کے پہلے شکار رہے ہو۔ اور ابھی کئی احمق از خود عشق سے مجبور ہو کر میری ہوسِ انتقام کے آگے جھکے ہیں، میں ان تمام مظالم کا بدلہ لونگی جو توانا مرد بے بس عورتوں پر اب تک کرتا رہا ہے۔ کوئی مرد محبت نہیں کر سکتا۔ عورت مستک ہے اور کمزور، اس نے مرد کی شیریں گفتاری کو محبت سمجھ لیا ہے۔ مرد احمق ہے اور عورت کی خاموشی کو رضا سمجھتا ہے اور امیدوں کے قلعے تعمیر کرنے لگتا ہے لیکن ایک فولاد کا ٹکڑا اسے تھوڑی ہی دیر میں ختم کر دیتا ہے۔ اگر تم میرا دریچہ دیکھنا چاہتے ہو جہاں یہ واقعہ ہوا تھا تو کبھی آ سکتے ہو مگر اپنے ساتھ کوئی آلۂ ضرب نہ لانا ورنہ عورت جب اس پر قابو پالیتی ہے تو مرد کی شاہ رگ کی خیر نہیں ہوتی۔ اگر اس دھمکی پر یقین نہیں کرتے ہو تو اس افسانے کو دوبارہ پڑھو۔ اور پھر بھی اگر ہمت ہو تو مجھ سے ملنے آ سکتے ہو مگر ذرا سنبھل کر، یاد رہے میں ایک عورت ہوں اور عورت محبت بھی ایسی ہی طوفانی کرتی ہے اور نفرت بھی ——— عورت کی محبت اور نفرت دونوں سے بچو" کہ کسی دانا نے کیسی دانائی کی بات اپنے قول میں سمجھائی ہے ———!

ظفر قریشی دہلوی!

فیصلہ

آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کر دوں؟
اپنے شوریدہ ارادوں کو اپاہج کر لوں
اپنی مجروح تمنا کا مداوا نہ کروں
اپنی خوابیدہ محبت کا المناک مآل
اپنی بے خواب جوانی کو سنایا نہ کروں
اپنے بے کیف تصور کے سہارے کے لئے
ایک بھی شمع سرِ راہ جلایا نہ کروں
اپنے بے سود تخیل کو بھٹک جانے دوں
زندگی جیسے گذرتی ہے گذر جانے دوں

چند لمحوں میں گذرنے کو ہے ہنگامۂ شب
سو گئے جام صراحی کا سہارا لے کر
سرد پڑنے لگا اجڑی ہوئی محفل کا گداز
تھک گئی گردشِ یک رنگ سے ساقی کی نظر
چند بیدار فسانوں کا اثر لوٹ گیا
دب گیا تلخ حقیقت میں نشہ تا بکمر
سوچ میں ڈوب گئے راہ گذر کے خم و پیچ
کون آئے گا اب امید کے ویرانے میں!

میں ابھی آخری مے نوش ہوں میخانے میں
دیکھتا کیا ہے مری سمت بڑھا جام بڑھا
لا صراحی کو مرے پاس شکستہ ہی سہی
چھیڑ ٹوٹے ہوئے تاروں کو کراہیں تو ذرا
سوچتا کیا ہے انڈیل اور انڈیل اور انڈیل
سرد پڑتی ہوئی محفل کے تکدر پہ نہ جا
اپنے بیدار تفکر کی ہلاکت پہ ہنسوں
آج سوچا ہے کہ احساس کو زائل کر دوں!

اختر الایمان

کالا پانی

جب سے ہندوستان کے قیدیوں کو کالے پانی بھیجنا بند ہوا اس کا تذکرہ بہت کم سنا جاتا ہے، مگر اب سماترا، سنگاپور، ملایا اور جنوبی ایشیا کے کچھ حصے پر جاپانیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد اس کا نام پھر اخباروں میں آنے لگا ہے، ایسی صورت میں اس کے حالات تحریر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

کالا پانی یا جزائر انڈمان ۲۰۴ چھوٹے بڑے جزیروں کا مجموعہ ہے، جو ہگلی کے دہانے سے ۵۹۰ میل، برما کی راس نیگرس سے ۱۲۰ میل اور سماترا کے شمالی سرے سے ۳۴۰ میل کے فاصلے پر خلیج بنگال میں ۱۴ درجہ شمالی طول البلد اور ۹۲ سے ۹۴ درجہ مشرقی عرض البلد کے درمیان واقع ہیں، ان کی مجموعی لمبائی ۲۱۹ میل اور چوڑائی ۳۲ میل ہے، ان کا کل رقبہ ۲۵۰۰ مربع میل ہے۔ ماہرین طبقات الارض کا خیال ہے کہ یہ دراصل ان پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں ہیں جن کا سلسلہ برما سے ہوتا ہوا سماترا تک پہونچ گیا ہے، یہاں کی زمین پتھریلی ہے اور بہت تنگ اونچی اونچی وادیاں ہیں، جزیروں میں پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے اور سب سے اونچی چوٹی سطح سمندر سے ۱۴۷۸ فٹ بلند ہے، جزیروں کا بڑا حصہ منطقہ بارہ کے جنگلات سے پٹا پڑا ہے، یہاں جنگل دو قسم کا ہے ایک سدابہار، اور دوسرا موسمی، جو برسات گذرنے کے بعد سوکھ جاتا ہے، یہاں کے خاص درخت پدوک، دھوپ، پیپیتا، کوکو اور بادام ہیں۔ چونکہ گورنمنٹ نے ابتدا ہی سے یہاں کے جنگلوں کی طرف توجہ کی تھی اس لئے یہاں لکڑی چیرنے والے کئی کارخانے قائم ہو گئے ہیں جہاں سالانہ بیس ہزار ٹن لکڑی چیر کر باہر بھیجی جاتی ہے۔ لٹھوں کے ڈھونے کا کام پہلے ہاتھیوں سے لیا جاتا تھا مگر اب بھینسے بھی استعمال کئے جانے لگے ہیں۔

تاریخ: ہندوستان، برما اور مشرق بعید کے تجارتی راستوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے ان جزیروں کے نام بڑے قدیم زمانے سے تاریخ میں پایا جاتا ہے، اور ان کے قدرتی اچھے بندرگاہ موسمی طوفانوں سے پناہ لینے اور پانی کا ذخیرہ حاصل کرنے کے لئے عرصہ دراز سے استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس نے ان کا ذکر کیا تھا، [illegible] عرب تاجر ان کو انگمینان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چینیوں کے بدھی راہب تسنگ اور مشہور سیاح مارکوپولو نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ اس سے بہت پہلے رامائن میں ان کا تذکرہ موجود ہے، اور یہاں کے باشندوں کو ہنومان کہا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے ملایا کے رہنے والے ان کو ہندومان کہتے تھے، جو ہنومان ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے جو افسانوں اور روایات کی صورت میں ان تک پہونچی تھی، اور بعد میں یہاں کے باشندوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے اور صدیوں تک ان کو سیام، کمبوڈیا اور ہند چینی کے درباروں میں بطور غلاموں کے فروخت کیا کرتے تھے۔

جب انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جم رہے تھے اس وقت یہ جزیرے ملایا کے بحری قزاقوں اور تباہ شدہ جہازوں کے لٹیروں کا مسکن تھے۔ چنانچہ تجارتی جہازوں کی حفاظت اور ایک تعزیری نوآبادی بنانے کے خیال سے لارڈ کارنوالس نے اس طرف توجہ کی اور ۱۷۸۹ء میں لفٹننٹ کولبروک اور لفٹننٹ بلیر کو ان جزیروں کا جائزہ لینے اور مفصل تحقیقات کرنے کے لئے روانہ کیا، اور دوسرے سال یہاں ایک چھوٹی سی نوآبادی کی بنیاد پڑ گئی جو اس جگہ واقع تھی جہاں اب پورٹ بلیر ہے اور جس کا نام اس وقت بندرگاہ کارنوالس تھا۔ ۱۷۹۲ء میں یہ آبادی شمال مشرقی حصہ میں اس جگہ تبدیل کی گئی جو اب بندرگاہ کارنوالس کہلاتا ہے۔ مگر یہ نئی جگہ بڑی خراب ثابت ہوئی، اور اعلیٰ شرح اموات کی بدولت یہ ساری نوآبادی تقریباً ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ساٹھ سال تک ان جزیروں کا کوئی خاص ذکر سرکاری کاغذات میں موجود نہیں، سوائے اس کے کہ کبھی کوئی جہاز یہاں ٹھہرا یا طوفان سے پناہ لی تو اس کے مسافروں اور یہاں کے باشندوں سے مڈبھیڑ ہوئی اور قتل و خون کی نوبت آئی۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء آگیا جب ہندوستانیوں نے غیر منظم طریقے پر آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی، اس وقت حکومت کو پھر ایک تعزیری نوآبادی کا خیال ہوا۔ چنانچہ اسی سال ایک منتخب جماعت کو یہاں روانہ کیا گیا اور اس نے پورٹ بلیر کو اس کام کے واسطے موزوں قرار دیا اور ۱۸۵۸ء میں قیدیوں کا پہلا دستہ پچاس سپاہیوں کی حفاظت میں یہاں پہونچا۔ تین مہینے کے اندر قیدیوں کی تعداد ۷۷۳ ہو گئی، مگر ان میں سے

صرف ۱۸۴ باقی رہے۔ بقیہ لوگ یا تو مر گئے یا اِدھر اُدھر بھاگ گئے، یا ان کو پھانسی دیدی گئی۔ کیونکہ ان کے نگران جے۔ پی واکر ایک سخت مزاج آدمی تھے، ان کے خیال میں قیدیوں کو بھاگنے کی کوشش سے محفوظ رکھنے کے لئے سخت ترین سزائیں دینا ہی مناسب تھا، نوآبادی کے قیام کے بعد اکثر یہاں کے مقامی باشندوں سے جھڑپیں ہوا کرتی تھیں حتیٰ کہ جنگ ابرڈین نے ان کا بڑی حد تک سدباب کر دیا۔ یہ معرکہ لڑائی ۱۴ مئی ۱۸۵۹ء کو ہوئی۔ انڈمانیوں نے اس کے لئے بڑی تیاریاں کی تھیں اور وہ بیخبری میں حملہ کرنا چاہتے تھے، لیکن نوآبادی کے ایک مفرور قیدی کی بروقت اطلاع سے مدافعت کا انتظام کر لیا گیا، ورنہ سخت نقصان کا اندیشہ تھا اس صلے میں مفرور قیدی کی تیواری کی سزا معاف کر دی گئی۔

۱۸۶۴ء میں ان کا نظم ونسق حکومت ہند نے برما کے چیف کمشنر کے سپرد کر دیا۔ مگر آٹھ سال بعد پھر یہ حکومت ہند کے ماتحت آ گئے، اور ۱۸۷۲ء میں ان کو خود چیف کمشنری کا درجہ مل گیا۔ ۱۸۷۱ء میں قیدیوں کے قانون میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں اور اب عمر قیدیوں کو بیس پچیس سال کی سزا کے بعد اگر ان کا چال چلن اچھا رہے تو رہائی ملنے لگی، لارڈ میو وائسرائے ہند کو اس نوآبادی سے بڑی دلچسپی تھی اور انہوں نے ۱۸۷۲ء میں یہاں کا سفر کیا اور یہیں ایک قیدی نے ان کو قتل کر دیا۔ ۱۸۹۰ء میں یہاں کے حالات معلوم کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوا جس نے سفارش کی کہ کم مدت والے قیدیوں کے لئے ایک الگ جیل بنائی جائے، اسی سفارش پر سیلولر جیل تیار ہوئی۔ ۱۹۲۰ء کے زمانے میں جیل کمیٹی نے انڈمان کی تعزیری نوآبادی کو منسوخ کرنے کی سفارش کی۔ اور ۱۹۲۱ء تک اس قسم کے احکامات نافذ ہوئے اور یہ نوآبادی مجرمانہ لحاظ سے ختم ہو گئی۔ اس طرح ہندوستانی تاریخ کے ایک تکلیف دہ باب کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا، اس کے بعد سے یہاں سوائے ۱۴۰۰ موپلا قیدیوں اور چند پنجابیوں کے اور کوئی قیدی نہیں بھیجے گئے۔ یہاں قیدیوں کی سب سے بڑی تعداد جو کسی ایک وقت میں رہی ہو ۱۱،۵۳۲ تھی۔ ۱۹۳۱ء میں یہاں ۶،۱۲۵ مجرم تھے۔

چند اعداد۔ ۱۹۳۱ء کی رپورٹ مردم شماری کے چند اہم اور ضروری اعداد حسب ذیل ہیں۔

کل دیہات	۹۰
آبادی	۱۹،۲۲۳
مرد	۱۴،۲۵۸
عورتیں	۴،۹۶۵

جزیروں میں کوئی گاؤں قصبے کی تعریف میں نہیں آتا کیونکہ بڑے سے بڑے گاؤں یعنی پورٹ بلیر کی آبادی چار ہزار سے کم ہے ۱۹۴۱ء میں ان جزیروں کی آبادی ۲۱ ہزار کے قریب پہونچ گئی مگر آج کل کچھ لوگ اس کو خالی کر رہے ہیں۔

	مرد	عورت	کل
خواندہ اشخاص۔	۳۶۴۲	۳۲۴	۳۹۶۶
انگریزی داں۔	۸۶۰	۸۴	۹۴۴

واضح رہنا چاہیئے کہ ۸۴ انگریزی داں عورتوں میں ۳۰ انگریز عورتیں شامل ہیں۔

مذہبی اعتبار سے یہ آبادی یوں منقسم ہے۔

ہندو برہمن	۷۵۱۳
مسلمان	۶۴۳۴
بدھ	۲۹۰۲
عیسائی	۱۱۲۳
سکھ	۶۴۹
جنگلی	۴۷۴

(اس میں ۴۶۰ اصلی باشندے بھی شامل ہیں۔)

آریا	۹۰
شنٹو	۳۷
یہودی	۱

یہاں کی خاص خاص زبانیں مندرجہ ذیل ہیں۔

زبان	بولنے والوں کی تعداد	کل آبادی کا فیصد
ہندوستانی	۴،۶۱۸	۲۴.۰۲
برمی	۲،۷۴۵	۱۴.۲۷
اردو	۲،۳۱۱	۱۲.۰۲
پنجابی	۲،۲۲۸	۱۱.۵۸
ملیالم	۲،۰۷۳	۱۰.۷۸
بنگالی	۱،۱۷۱	۶.۰۹
متفرق	۴،۰۷۷	۲۱.۲۰

جس سے کہ عام زبان ہندوستانی ہے جو بولی کا اندازہ [illegible]

تھوڑا سا فرق رکھتی ہے جو جزیرے کے تھوڑے دنوں کے قیام سے کوئی ہر شخص آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔

پیشوں کے اعتبار سے کام کرنے والوں کی تقسیم یہ ہے:۔

زراعت و پرورش مویشی وغیرہ:۔	۲۹۵۲
صنعت:۔	۱۴۳۵
نقل و حمل:۔	۹۷۷
تجارت:۔	۴۷۰
سرکاری ملازمت:۔	۱۶۹۹
متفرق:۔	۱۲،۴۸۸

یہاں کی خاص فصل دھان اور ناریل ہے، اسکے علاوہ چائے، کافی، گنا، مکا، دالیں، ترکاریاں اور تربوز کی کاشت بھی ہوتی ہے، پہلے یہاں ربر کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں جزیرے کی مالگذاری کی آمدنی ۴۸ ہزار کے قریب تھی۔

تعزیری نوآبادی

سنہ ۱۸۵۷ء میں بہت سے لوگ گرفتار ہوئے، ان میں کچھ کو تو پھانسی دے دی گئی اور باقی لوگوں کو طویل سزائیں دی گئیں اور ان کو ہندوستان سے دور رکھنے کے لئے انڈمان میں مجرموں کے لئے ایک قیدخانہ بنایا گیا، جہاں بعد میں اور قسم کے قیدی بھی بھیجے جانے لگے۔ اس قیدخانہ کے چار درجے تھے، اور قیدیوں کی ایک درجے سے دوسرے درجے میں ترقی و تنزل ہوتا رہتا تھا، قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی نیا قیدی یہاں آتا تو اس کو چھ مہینے تک حوالات میں رکھا جاتا تھا۔ اور رات کو ایک علیحدہ کوٹھری میں سونا پڑتا تھا۔ دن بھر مختلف قسم کے کام مثلاً ناریل کے ریشوں کو کوٹ کر رسی بنانا یا ناریل کا تیل نکالنا یا کوئی اور کام ان سے لیا جاتا تھا، جب وہ یہ چھ مہینے قابل اطمینان طریقہ پر گذار لیتا تو اس کو کھلے طور پر کام کرنے والے مزدوروں میں شامل کر دیا جاتا تھا، مگر رات اس کو جیل کی چار دیواری میں گذارنا پڑتی تھی، یہاں چوتھے درجے کے مقابلے میں قانون میں ذرا کم سختی برتی جاتی تھی۔ اس طرح ۴ سال گذارنے کے بعد وہ دوسرے درجے میں منتقل کر دیا جاتا تھا، جہاں یا تو وہ قیدیوں کا نگراں اور سردار بنا دیا جاتا ہے یا اس کو گھریلو ملازمت کی اجازت دے دی جاتی ہے، سردار بنانے کی صورت میں اس کو کچھ اختیارات دیدئے جاتے تھے، مگر اس کو اب بھی قیدیوں کا عام کھانا ملتا تھا۔ بعض وقت اسکو خشک غذا اور [illegible] کے نام سے ایک رقم بھی ملتی تھی، اس

درجے میں اس کو ۵ سال تک رہنا پڑتا تھا، گویا اس طرح دس سال گذارنے کے بعد اس کو پہلے درجے میں ترقی دی جاتی تھی، اب اسکو خود کفالت کا ٹکٹ مل جاتا تھا اور وہ اپنی روزی کما لے، قیدی عورتوں سے شادی کر لے، یا اپنے بیوی بچوں کو گھر سے بلا لے، زمین اور مویشی خریدنے یا مکان بنانے کا مجاز سمجھا جاتا تھا، اس درجے میں داخل ہونے سے پہلے یعنی دس سال تک اس کو قیدیوں کے کپڑے پہننے پڑتے تھے، اور اس کے گلے میں لوہے کا ایک کڑا پڑا رہتا تھا جس میں لکڑی کی ایک تختی لٹکی رہتی تھی جس پر اس کا نمبر، جرم کی نوعیت اور قیدی کی تاریخ لکھی رہتی تھی۔ مجنون اور عادی مجرم کو الگ جیلخانے میں رکھا جاتا تھا، عورتوں کے لئے جیل الگ تھی، عورتیں پانچ سال کے بعد گھریلو ملازمت کے قابل سمجھی جاتی تھیں، اور جو شادی کے لائق ہوتیں ان کو مقررہ دنوں میں امیدوں کے اندر مرد قیدیوں سے ملنے کی اجازت ہوتی تھی، تاکہ وہ اپنے شادی کے معاملات طے کر سکیں، شادی کے بعد عورت کی قید کی مدت میں پانچ سال تک کمی کر دی جاتی تھی تاکہ وہ اس کا خاوند ایک ساتھ چھوٹ سکیں، مگر ایسی شادیوں سے اولاد بہت کم ہوتی تھی۔

جب جیل کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ اس تعزیری نوآبادی کو ختم کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ انڈمان خالی کر دئے جائیں، مگر مقامی سرکاری عہدے دار اس کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے دلائل یہ تھے کہ پہلے یہاں تین ہزار کے قریب قیدیوں کی آزاد اولاد ہے جو ہندوستان کے کسی صوبے سے تعلق نہیں رکھتی لہذا اسکو کہاں منتقل کیا جائے گا، دوسرے جنگلات کی پیداوار اور اس کی تجارتی اہمیت، تیسرے اس کی اہم جائے وقوع کی وجہ سے اس کو خالی کرنا مناسب نہ ہوگا، چوتھے وہ کثیر رقم جو یہاں صرف ہو چکی ہے اس کو خالی کر دینے سے بیکار جائے گی۔ چنانچہ بڑی رد و قدح کے بعد یہ طے پایا کہ آئندہ قیدیوں کو یہاں نہ بھیجا جائے، اور یہاں صرف ان قیدیوں کو رکھا جائے جو اپنی خوشی سے اس پر تیار ہوں کہ بقیہ قید ہندوستانی جیل خانوں میں کاٹنے کے بجائے یہیں گذاریں گے۔ نیز جرائم پیشہ لوگوں کو یہاں نہ رکھا جائے تاکہ خطرات کا امکان کم ہو جائے، مگر ہندوستانی جیل خانے اتنی بڑی تعداد کو لینے کے لئے تیار نہ تھے، پھر بہت سے موپلا قیدی یہاں آ چکے تھے، اس لئے قیدی مزدوروں کی بھی ضرورت تھی، تاکہ جزیرے کی عام معاشی زندگی متاثر نہ ہو، اس لئے رفتہ رفتہ تھوڑے تھوڑے

کو ہندوستان واپس کر دیا گیا۔

تعزیری نو آبادی کی حیثیت ختم ہو جانے کے بعد یہ کوشش کی گئی کہ یہاں آزاد لوگوں کو بسایا جائے، مگر کالے پانی کے ہیبتناک قصے اور سوہان روح تصورات نے اس کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ حتیٰ کہ وہ ہندوستانی قیدی بھی اپنی خوشی سے یہاں آنے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو ہندوستانی جیل خانوں میں طویل سزائیں بھگت رہے تھے۔ بہرحال ان مشکلات کا خاتمہ ۱۹۲۳ء کے بعد ہوا جب قیدیوں کو بعض مراعات دی جانے لگیں، مثلاً ان کو خود کفالت کے ٹکٹ آسانی سے اور کم وقفے میں ملنے لگے، ان کی اجرتوں میں اضافہ کیا گیا، ان کے بیوی بچوں کو وہاں منتقل کرنے کے اخراجات حکومت نے برداشت کرنا شروع کئے، بلکہ بعض لوگوں کو تو ہندوستان سے اپنے بال بچوں کو لے جانے کی اجازت دی گئی، ان کے لئے مکانات بنائے گئے جن کا کرایہ بہت معمولی رکھا گیا۔ یہاں اسپتال اور مدرسے قائم کئے گئے، ان کو اپنی اپنی عبادت گاہیں بنانے کی اجازت دی گئی۔ کاشت کرنے والے قیدیوں کو تقاوی دئے جانے لگے، پانچ سال مسلسل کاشت کے بعد زمین پر ان کے مالکانہ حقوق تسلیم کئے جانے لگے، اس طرح ان میں بڑی تبدیلی ہوگئی، اور پہلے جو لوگ مجرم، قیدی، حقیر اور اچھوت سمجھے جاتے تھے اب آزاد ہوگئے۔ وہ کاروبار، تجارت، زراعت یا محنت مزدوری کرنے لگے۔ زمین، مویشی اور مکان کے مالک بننے لگے، اپنے بیوی بچوں کو ساتھ رکھنے لگے، اور اس طرح وہ معمولی زندگی گذارنے کے قابل ہوگئے۔ ان کا اخلاقی معیار بھی بلند ہونے لگا، اور ان کی آپس میں برادریاں بننے لگیں۔ اس وقت انڈمان میں چار بڑی برادریاں ہیں۔ پہلی بھانتو لوگوں کی ہے، یہ صوبجات متحدہ، متوسط اور وسط ہند کے خانہ بدوش لوگ ہیں، ہندوستان میں یہ جرائم پیشہ اقوام میں شامل ہیں، یہ سب لوگ سزا یافتہ قیدی ہیں، ۱۹۲۶ء میں ان کی تعداد ۲۰۵ تھی۔

دوسری برادری موپلاؤں کی ہے، یہ مالابار کے ہنگامے کے بعد یہاں بھیجے گئے، بعد میں بہت سے لوگوں نے اپنے بال بچوں کو یہاں بلا لیا اور یہیں آباد ہوگئے۔ ان میں سے بعض چھوٹے چھوٹے دکان دار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب سب موپلاؤں کی سزا ختم ہو جائیگی تو یہ لوگ واپس چلے آئیں گے، ان کی تعداد ۱۰۰۰ تھی۔ ان کے گاؤں ہندوؤں سے الگ ہیں۔

تیسری برادری "کارن" لوگوں کی ہے۔ یہ ۱۹۲۵ء میں برما کے علاقے ٹنیسرم سے آکر یہاں اس شرط پر آباد ہوئے کہ ان کو زمین مفت دی جائے، اور جنگلات میں ان کے لئے کام مہیا کیا جا سکے۔ ان کی تعداد ۲۶۲ تھی۔

چوتھی برادری برمی قیدیوں کی ہے، جن میں بہت سے لوگوں کے بال بچے یہاں آگئے ہیں۔ ان کے اسکول الگ ہیں اور انہوں نے اپنے لئے ایک پگوڈا بھی بنا لیا ہے۔

انڈمان کے اصلی باشندے کچھ مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے مگر اب وہاں صرف تین قبیلوں یعنی جروا، اونگی اور سنٹنلی کے کچھ لوگ رہ گئے ہیں، مقامی باشندوں کی تعداد میں برابر کمی ہو رہی ہے، اندازہ لگایا گیا تھا کہ ۱۸۵۸ء میں پہلے دو قبیلوں کی تعداد آٹھ ہزار کے قریب تھی۔ مگر اب کل انڈمانی باشندوں کی تعداد ۴۰۰ رہ گئی ہے۔ اس کے مختلف وجوہ ہیں، پہلی چیز دو متضاد تمدنوں کا اتصال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب دو متضاد قسم کے تمدن ملتے ہیں تو کمزور تمدن ختم ہونے لگتا ہے، لیکن اگر وہ اتنے عرصے سنبھالا لے لے کہ وہ نئے تمدن کو اپنا سکے تو یہ خاتمے سے محفوظ رہتا ہے، چنانچہ آسٹریلیا میں تسمانیہ کے اصلی باشندے بالکل مفقود ہو گئے لیکن آسٹریلیا کے اصلی باشندے موروی اب پھر پنپنے لگے ہیں۔ دراصل اس میں جنسی اختلاط بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور دو متضاد تمدنوں کا جنسی اختلاط مختلف قسم کی بیماریاں پیدا کر دیتا ہے۔ مگر طاقتور تمدن اپنے مؤثر اور کامیاب ذرائع کی بنا پر ان کی حفاظت کر لیتا ہے، مگر وحشی تمدن کے پاس چونکہ ایسے مؤثر ذرائع نہیں ہوتے، اور ان کی معلومات بہت محدود ہوتی ہیں اس لئے ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں کہیں دو متضاد تمدنوں کا اتصال ہوا اور ان کے درمیان جنسی اتحاد قائم ہوا تو امراض خبیثہ میں کثرت ہوگئی، اور اس کی وجہ سے اتلاف جان کے علاوہ قوت تولید میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انڈمان کے اصلی باشندوں میں ہمیشہ آتشک کی کثرت رہی اور ان کی قوت تولید بھی برابر گھٹتی رہی۔ اس وقت اصلی باشندوں میں اونگیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے یعنی یہ ڈھائی سو کے قریب ہیں۔ اور ان کی یہ تعداد محض اس وجہ سے باقی ہے کہ یہ ابھی تک زیادہ تر علیحدہ جنگلوں میں رہتے ہیں اور تمدن سے بہت کم آشنا ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ جزیرے کسی خشکی سے ملے ہوئے نہیں ہیں اس لئے یہاں [illegible] کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مقامی باشندے

(بقیہ بر صفحہ ۴۳)

لڑکی یا چھاگل

کھیت کے کنارے ادھیڑ عمر شریف ایک ننھے سے پتھر کو ایک بڑی چٹان سے بجا رہا تھا۔ اور کھیت کے قریب اُبھری ہوئی ڈھیری کی گول چوٹی پر بھیڑیں چر رہی تھیں۔ آسمان پر دو بادل آونٹوں کی شکل اختیار کرکے اُفق کی طرف بھاگے جا رہے تھے، اور دُور، نیم کے ایک گھنیرے درخت کے نیچے کوئی چرواہا بیٹھا مُرلی بجا رہا تھا۔ مُرلی کے تیز سُر فضا کے لامحدود خلاؤں میں تیز پر بھونروں کی طرح تیرتے پھر رہے تھے اور شریف کے پتھر کی ٹھک ٹھک جیسے اس ابدی نغمے کے لئے طبلے کا کام دے رہی تھی!

اچانک پتھروں میں سے دو چنگاریاں نکل کر بجھ گئیں اور شریف کا ہاتھ رُک گیا۔ مُرلی کے تیز سُر اُس کے کانوں کے قریب پھڑپھڑانے لگے اور اُس نے پلٹ کر مُرلی بجانے والے کی طرف دیکھا۔ ڈھیلے ہونٹوں میں تناؤ پیدا ہُوا، بے رنگ جبڑے نمایاں ہوئے۔ جھولتے ہوئے پیلے دانت دکھائی دیئے۔ اُس کی ننھی ننھی دُھندلی آنکھوں میں ایک مبہم سی چمک آئی، وہ مُسکرانے لگا! اُس کے سینے میں مہین دھوں کی تہوں کے نیچے سے ایک خیال نے سر نکالا۔ اور اُچھل کر اُس کے دماغ میں آبیٹھا۔ شریف سوچنے لگا: "مُرلی بجانے والے تو مُرلی میں اپنے من کی آگ پھونک رہا ہے اور میں اُس آگ کی لپٹیں محسوس کر رہا ہوں، لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تو جوان ہے، جوانی آگ ہے، اور آگ کا کام شعلے بھڑکانا ہے! میں بوڑھا ہوں، بڑھاپا پتھر ہے۔ لیکن آج مجھے پہلی بار معلوم ہُوا ہے، کہ پتھر چنگاریاں بھی اُگل سکتے ہیں! کیا میرے سینے کی راکھ میں ابھی تک کوئی انگارہ دبا پڑا ہے!؟" اور اُس نے اپنے سینے کو ٹٹولا۔ اُبھری ہوئی ہڈیوں نے جیسے اُس کی اُنگلیوں کو ڈس لیا! اُس نے ایک بار پھر ننھے سے پتھر کو چٹان سے ٹکرایا۔ اور چند چنگاریاں چمک کر بجھ گئیں۔ اُس نے پتھر کو ہوا میں اُچھال دیا جو نیچے گر کر لُڑھکا اور ایک لودمیدہ پودے کی جڑ کے پاس رُک گیا۔ پودے کا سارا وجود کپکپا کر قدرے سیدھا ہو گیا ــــ شریف اُٹھا، انگڑائی لے کر اُس نے اپنی پتلی اُنگلیاں چٹخائیں اور اوپر نیلے آسمان پر اُن دو بادلوں کو دیکھنے لگا جو پردہ نشیں دوشیزاؤں کی شکل اختیار کرکے جیسے پُر سکون سمندر میں تیرتی جا رہی تھیں! ــــ سب جھوٹ! سب غلط، سب بکواس!" ــــ اور سینے کی [illegible] سے ملا رہے جیسے اُس نے اُس کے اندر دبے ہوئے تمام [illegible]

ہوتے ہوئے وہ ڈھیری پر چڑھنے لگا۔ ایک جھاڑی [illegible] میں سے چھاگل اُٹھائی کہ پانی پی لے، مگر اچانک اُسے [illegible] پانی!" وہ بولا۔ خالی چھاگل ہاتھ میں لٹکا کر وہ ڈھیری کے گرد [illegible] ہوئی پگڈنڈی پر سے ہوتا ایک طرف نکل گیا۔ اور آسمان پر بادل [illegible] ہو گئے، مُرلی رُک گئی اور ایک لمحہ بندوق کی گولی سی آواز پیدا [illegible] ایک کبوتر کے تعاقب میں ڈھیریوں سے دُور غائب ہو گیا۔

شریف چھاگل بھر کر واپس آیا، تو اس کا دماغ بالکل [illegible] جھاڑی کے قریب ایک بڑے پتھر کو لُڑھکا لایا۔ اُس پر چادر رکھی اور ایک [illegible] بھیڑوں کی طرف دیکھ کر، پتھر پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

دُھوپ کی وجہ سے اُسے اپنے پتلے پتلے پپوٹوں سے پرے پیلا پیلا اندھیرا نظر آیا۔ اور پھر اس اندھیرے میں لہریں سی اُٹھنے لگیں [illegible] اندھیرا رنگ بدلنے لگا۔ سبزی مائل پس منظر پر اچانک بہت سے ہیولے اُبھرے، جن کے خطوط گو واضح نہ تھے۔ لیکن شریف کا جی چاہا کہ یہ ہیولے اُن بل کھاتی ہوئی لہروں سے نکل کر اس کے قریب آجائیں اور اس آرزو کے پیدا ہوتے ہی اُن بے شمار ہیولوں میں سے ایک [illegible] سی آگے بڑھی اور اس کے بہت قریب آگئی۔ "فاطمہ!" وہ پکارا۔ اور اس کی آنکھ کھل گئی، پاس ہی چرتی ہوئی بھیڑیں ڈھیری کی چوٹی کی طرف دوڑ گئیں اور ارد گرد پہاڑیوں نے بیک وقت۔ "فاطمہ! فاطمہ!" کی گونج پیدا کر دی۔ شریف کا چہرہ برسوں کے سوکھے ہوئے چمڑے کی طرح بے نور ہو گیا۔ ڈھیلے ہونٹ کانپنے لگے، اور آنکھوں کے سامنے [illegible] سبز تارے ناچنے لگے۔ چند لمحے وہ دُھوپ سے تپے ہوئے خلا میں [illegible] رہا اور پھر سر کو چادر پر اچھی طرح جما کر آنکھیں بند کر لیں مگر فوراً کھول [illegible] پتھر کے نیچے سے پتھر نکال کر پرے پھینک دیا! ہاتھوں کو سینے پر [illegible] اُس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ لیکن اب اس پیلے اندھیرے کی [illegible] وسعتوں میں نہ لہریں اُٹھیں نہ بے شمار ہیولے اُبھرے۔ [illegible] بھری پلکوں کو جھپکاتی اُس کے اس قدر قریب آگئی کہ قریب [illegible] گرم گرم سانسیں اپنے ماتھے سے مس کرتی محسوس کیں، شریف [illegible] کے ہر ذرّے سے بے ربط سی دھڑکنیں بلند ہونے لگیں، [illegible] کے نیلے ہونٹ وا ہوئے اور وہ بولی: "تو نے میری [illegible]

… کو جلا دیا! تو نے میرے حسن کے نوخیز پھول مسلے! تو نے مجھ سے
… باتیں کیں! مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے میری زرد سی … کی
… شہد کی بوندیں ٹپکا رہا ہے! لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ
… کے ان قطروں میں میری جوانی کا زہر چھپا ہوا تھا. تو نے میرا نام
… کر کے گلی گلی اپنی فانی محبت کے گیت گائے. تو نے مجھے گھر گھر بدنام
کیا اور مجھے ان دنوں اس بدنامی پر ناز تھا! لیکن تو مجھے چھوڑ کر
… میں پھرتی ہوئی. اور یہی بدنامی میری روح کا کفن بن گئی! تو
… ہے، تو فریبی ہے، تو کمینہ ہے. تجھے انسان سمجھنے والے حیوان
ہیں! مجھے زندہ سمجھنے والے مردہ دماغ ہیں. تو حیوان ہے، تو مر چکا
… اس دن سے مر چکا ہے، جب تو سر پر لمبا طرہ رکھ کر اور کھڑکھڑاتے
… کی چادر باندھ کر لاہور چلا گیا تھا. اور … قلاش، جب تو
… واپس آیا اور تجھے معلوم ہوا کہ میں نے اپنے باپ کی افیون چرا کر
کھا لی تھی اور تیرے جانے کے ہفتہ بھر بعد قبر میں جا سوئی تھی تو تیری
آنکھوں سے ایک آنسو تک نہ ٹپکا. تو میری قبر پر بھی نہ آیا. تو نے … ف
ایک دوست سے میرا ذکر کیا. اور اس سے بھی صرف اتنا کہا: "اس گاؤں
کی لڑکیوں کے پاس نہ فاطمہ جیسی چکنی پنڈلیاں ہیں نہ ریشمیں گال!"
… لعنت ہے تجھ پر. لعنت ہے! لعنت ہے!" اور شریف نے محسوس
کیا جیسے فاطمہ نے اس کے منہ پر تھوک دیا ہے. غصے سے بیتاب ہو کر
وہ فاطمہ پر جھپٹا اور اس کی آنکھ کھل گئی، ایک بھیڑ اس کے منہ سے
… کھڑی تھی، اور جب شریف نے اس کے پیٹ پر ایک
… مارنا چاہا تو وہ اس زور سے چھینکی کہ شریف دیر تک اپنا
… بھرا چہرہ پونچھتا رہا.

اس کا دماغ انگارہ بن گیا. اور اس انگارے کی حدت سے اس کی
… ناچنے کے باریک تاروں کی طرح تڑپ رہی تھی. ہر پہاڑی کی چوٹی پر
… ہاتھ پھیلا پھیلا کر چنگاریاں پھینکتی نظر آئی. اس تکلیف دہ خیال
کو دل سے نکالنے کے لئے وہ زور زور سے ہنسنے لگا. قہقہوں سے تنگ
… گونج اٹھیں اور ساری کائنات کو اس خوشی میں شامل دیکھ کر
… آس پاس ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے دہکتے ہوئے انگاروں
پر پانی چھڑکا جا رہا ہو. "آؤ نہر؟" اس کے سینے کی راکھ سے ایک وہ خیال
… محبت اٹھائے پھرتی ہے. لطف تو تب تھا، کہ تو میرے پیچھے پیچھے
… آتی، یہاں افیون کھا کر مر گئی تو کون سا تیر مارا ... اور یہ خیال
… راکھ میں دبک گیا. … پتھر کی ٹھک ٹھک سنائی دی
… اور اس نے جھٹ اپنے دونوں خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا …

وہ خود ہی اپنا کھیل کھیل رہا ہو! آخر اس نے ڈھیری کی طرف …
پھر دور کھجور نیم کی طرف اور اس کی نظریں نیم کے پاس ابھری …
پہاڑیوں کے دامن میں ہوتیں اسی جگہ آکر رک گئیں، جہاں وہ
بجاتا رہا تھا. ایک لڑکی سر جھکائے اسی چٹان پر پتھر بجا رہی تھی
وہ جان بوجھ کر زور سے کھانسا. لڑکی کا ہاتھ رک گیا اور اس نے
پلٹ کر شریف کی طرف دیکھا. دو نشوں بھری آنکھیں اوپر فضا میں
شریف کے سامنے آگئیں اور ان کی صاف پتلیوں میں اسے اپنا
نظر آنے لگا. وہ ایک بار جھپکیں اور کھلیں اور شریف کا دل سمٹ
پھیل گیا. پھیلتا گیا. پھیلتا گیا. حتیٰ کہ وہ لڑکی اس کے دل کی زد میں
شریف نے ایک بار کھنکار کر ان پرچھائیوں کو پرے پھینک دیا اور چٹان کی
طرف دیکھا تو ٹھک ٹھک اسی طرح جاری تھی.

نہایت آہستہ آہستہ وہ ڈھیری سے اتر کر چٹان کے
پہونچ گیا اور جب لڑکی نے ایک بار پھر اس جھاڑی کی طرف دیکھا
شریف لیٹا ہوا تھا تو شریف کو وہاں نہ پا کر اس نے نظریں ادھر
دوڑائیں. شریف مسکرایا. بے رنگ جبڑوں میں لٹکے ہوئے پیلے پیلے
دانتوں پر دھوپ نے ایک آسیبی سی چمک پیدا کر دی!

"تم کس کی لڑکی ہو؟" وہ اپنی بھاری آواز میں نرمی
کرتا ہوا بولا.

لڑکی نے پتھر کو ہاتھ میں گھمایا اور بولی: "تم میرے باپ کو
جانتے. میں یہاں کی رہنے والی نہیں، میرا وطن میدانوں میں ہے
یہاں بیل چرانے آئے ہیں کیونکہ ہمارے وطن میں آجکل قحط پڑا ہے

"بیل کہاں ہیں تمہارے؟" شریف نے اسکے خمیدہ لبوں
گوشوں کی پھڑکن دیکھنے کیلئے یہ سوال پوچھا.

اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی: "بیل تو ان ڈھیریوں
پرے چر رہے ہیں. میں پانی کی تلاش میں ادھر آئی تھی مگر مجھے …
کوئی چشمہ، کوئی جھرنا نظر نہیں آیا. یہاں سامنے درے سے ٹھنڈی …
آرہی ہے، اس لئے میں نے کہا چلو ٹھنڈا پانی نہیں، ٹھنڈی ہوا …
ہمیں پیاس بجھانے سے کام ہے!"

"ٹھیک ہے" شریف بولا "لیکن ہوا سے پیاس بجھ سکتی
خدا پانی پیدا ہی کیوں کرتا!"

"تم بھلا کیا سمجھو!" وہ مسکرائی اور اسکے موتیوں ایسے …
پر دھوپ نے ایک آسمانی چمک پیدا کر دی.

شریف کے سینے کی راکھ میں سے …

خانہ بدوش بولوں کی طرح ناچنے لگے اور وہ اپنے اختیاری ہاتھ کو سینے پر رکھ کر بولا: "لیکن اگر تمہیں پانی مل جائے؟"

"تو خدا کا شکر ادا کروں گی!"

"اور میرا؟" شریف کے دماغ میں ایک خیال اُچھل کر چلایا۔ بہت مشکل سے اُس نے اپنے دماغ کی باغی سپاہ کی روک تھام کی اور بولا: "تو چلو میرے ساتھ، وہ سامنے جھاڑی تلے چھاگل دھری ہے، ابھی ابھی بھر کر لایا ہوں!"

وہ آہستہ آہستہ ڈھیری کی طرف چلنے لگا۔ پلٹ کر پیچھے دیکھا تو لڑکی سر جھکائے آ رہی تھی اور ہوا کی وجہ سے اس کے بال اس کے چہرے پر بکھر بکھر جاتے تھے۔ شریف نے سوچا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں ڈھیری کی طرف جانے میں اس قدر تیزی نہ کرتا۔ وہ آگے چلتی، میں اُس کے پیچھے پیچھے ہوتا اور دیکھتا کہ اُس کے پاؤں کیسے اُٹھتے ہیں، اس کا آنچل کیسے پھڑ پھڑا کر اس کے سر سے اُڑ جاتا ہے اور اس کے بال کس طرح ہوا میں ایک جالا سا تن کر اُس کے شانوں پر بکھر جاتے ہیں —— اس کے ہاتھ، اس کی پیٹھ، اور شاید اُس کی پنڈلیاں بھی!" —— پنڈلیوں کا خیال آتے ہی اُسے فاطمہ یاد آ گئی اور وہ اس قدر پریشان ہو گیا کہ سر کو جھٹک جھٹک کر بڑی مشکل سے یہ پرچھائیں باہر نکالی۔

اُسے سر جھٹکتا دیکھ کر لڑکی بولی: "تمہارے سر میں درد ہے شاید؟"

اور شریف کے جسم کا ذرہ ذرہ مسکرانے لگا: "ہاں ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے درد ہو رہا ہے!"

"ہوا سے بچ کر دھوپ سینکو، ٹھیک ہو جاؤ گے!" وہ بولی۔

اور شریف کے دماغ میں کسی نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"لیکن کیا تم میرے سر کو نہیں دباؤ گی؟ میری عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہے اور تم پندرہ سولہ سال کی معصوم لڑکی ہو۔ تمہیں کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہیئے۔ تمہیں ——" لیکن اب شریف جھاڑی کے قریب پہنچ گیا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ لڑکی کو بہت دیر تک یہاں روکے رکھے، لیکن اس وقت چھاگل اُٹھانے کے سوا اسے اور کوئی بات نہ سوجھی۔

چھاگل اُٹھا کر اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا اور ایک ہی نظر میں اُس کے سب خد و خال کا جائزہ لے لیا، اس مختصر وقفے میں اُس نے سوچا "اس کے بال یوں تو عام لڑکیوں کی طرح ہیں لیکن انہیں ہوا نے اُس کے چہرے پر بکھیر کر غضب ڈھایا ہے۔ آنکھیں بہت غیر معمولی طور پر خوبصورت نہیں ... دیکھنے کی خوشی ہیں ان میں جو چمک سی آ رہی ہے،

یہ سب یہ —— بس اب میں کیا کہوں، جیسے ... رہی ہے اور یہ خمیدہ لبوں کے گوشوں کی پھڑکن اور یہ ... کا سرخی مائل بالشت اور یہ —— یہ ——!" وہ اور نہ سوچ سکا ... ہوا کہ وہ لڑکی کو گھور رہا ہے اور وہ اِسے اچھا نہیں سمجھ رہی ... پتھروں کی طرح گر گئیں۔ اور وہ دو قدم آگے بڑھا کر بولا: "چھاگل ... سے لگا لو!"

"نہیں میں اوک سے پی لوں گی!" لڑکی اوک بنا کر تھوڑی ...

"یہ ٹھیک ہے!" شریف نے سوچا۔ چھاگل کا منہ کھول کر ... آگے بڑھا اور ایک پتلی سی دھار گلابی اوک میں اُبھرتے اور ... کا ایک ننھا سا طوفان اُٹھانے لگی۔ تیزی سے شریف نے لڑکی کے روشن ماتھے کی اُس لکیر کو دیکھا جہاں سے اس کے بال شروع ... تھے اور ماتھے کے اُبھار سے اُس کی نگاہیں پھسلتی اس کے ابروؤں پر آ کر رکیں اور پھر لانبی پلکوں کے جال سے چھنتی پتلی ناک پر آ کر ... گئیں یہاں اس نے دائیں بائیں اس کے ریشمیں گالوں پر ... ہوئے پانی کے قطروں کو دیکھنے میں بہت دیر لگا دی۔ لال گالوں پر ... پانی کے قطرے بھی لال ہو رہے تھے۔ اور پھر اچانک شریف نے ... کے خمیدہ ہونٹوں کو پانی میں ڈوبے ہوئے دیکھا تو اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ان ہونٹوں پر —— ان نیم وا ہونٹوں پر ایک بار —— بس ایک بار —— صرف ایک پل کے لئے —— آنکھ کی ... سے مختصر جھپکی کے وقفے کے لئے —— بس ایک بار!"

اور لڑکی چیخ اٹھی: "تم نے تو میرے سارے کپڑے بھگو ڈالے، اوک کے بجائے سب پانی میرے چہرے پر ڈال رہے ہو! تم کس سوچ میں ہو؟"

اور جب تک لڑکی بولتی رہی، چھاگل میں سے نکلتی ہوئی پانی کی دھار اسی طرح اس کی نامکمل اوک کے کنارے پر پڑتی رہی ... جب اچانک اُس نے چھاگل کا منہ بند کر لیا، تو ننھے ننھے قطروں کی پھوار سی لڑکی پر برس پڑی اور وہ آنکھ مل کر بولی: "تمہیں کیا ... میں تو ٹھنڈ سے اکڑ جاؤں گی۔ ہوا بھی ٹھنڈی ہے، پانی بھی ... کپڑے بھی بھیگ گئے ہیں!" اور شریف یہ الفاظ سننے کے بجائے اُس کے ہونٹوں کی حرکت دیکھتا رہا —— "ایک بار —— صرف ... پل کیلئے ان ہونٹوں پر میرے —— !"

اُس نے اپنے ڈھیلے ٹھنڈے ہونٹوں کو ملا۔ ... بے شمار خیالات ہر طرف غبار اُڑاتے اُبھرے اور اس کے دماغ ...

...سے محو حیرت ہو گئے تھے، اُس نے شریف کو ان کی طرف ...
... اور اس نے ایک قدم اُٹھایا بھی! ــــ لیکن وہ رک گیا
... کی طرف دیکھ رہی تھی!

"کیا بات ہے؟" لڑکی نے اُسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔
شریف کی زبان پتھر بن گئی۔ اور جب بڑی کوشش سے وہ اُس ... میں کامیاب ہوا تو بولا: "یہ چھاگل تم لیتی جاؤ، تم پردیسی ہو، پانی ... ہوگی تمہیں، اب یہ آدھی بھری ہوئی ہے، کل گاؤں سے ... لاؤں... دن بھر کام آتے گی۔ میں اور لے لونگا۔ میرے پاس اور بہت ... چھاگلیں ہیں۔ لے لو ــــ کوئی بات نہیں ــــ لو ــــ لے بھی لو!"

اور ہنستی ہوئی لڑکی کو چھاگل تھماتے وقت اُس نے کوشش کی کہ اس کی انگلی کو اپنی انگلی سے چھولے، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ... مسکراتی ہوئی پلٹی۔ ڈھیری سے اُتر کر کھیتوں میں سے گذرتی ... جھاڑیوں میں ایک پگڈنڈی پر سے ہوتی ایک موڑ مُڑ کر غائب ... گئی!

شریف ہولے ہولے ڈھیری سے اُترتا اسی چٹان کے پاس ... ایک بہت لمبی اور گہری سانس لیکر اُس نے آنکھیں ملیں اور ہونٹوں ... زبان پھیری، اس کا جسم جذبات کی شدت سے تپ کر کانپ رہا ... اُسے پیاس محسوس ہوئی۔ پیاس محسوس ہوتے ہی وہ آنکھیں ... لگا۔ تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھا، دور پگڈنڈی کے موڑ کو ... اور پھر چٹان پر بیٹھ گیا اور تیز تیز سانسیں لینے لگا۔ اُس کے دماغ میں ایک خیال اچھل اچھل کر پکار رہا تھا۔ "تو اُسے چھو تک بھی نہ سکا۔ ... چھاگل بھی دے بیٹھا۔ شاید پانی کے لالچ سے وہ روز یہاں آتی لیکن ... سے چھاگل مل گئی ہے۔ وہ پہاڑوں کے بڑے ہی رہیگی اور تو یہاں ... پیاس سے مر جائیگا۔ ارے یہی تو وہ چھاگل تھی جس میں فاطمہ تیرے لئے ... شربت بھر لائی تھی! ــــ پگلا ــــ بوڑھا کھوسٹ!"

شریف دماغ میں گونجتے ہوئے اِن طوفانوں کی تاب نہ لا کر ... اور ایک پتھر اُٹھا کر چٹان سے بجانے لگا۔ ایک بار چند چنگاریاں نکلیں ... چمکیں ــــ فوراً!

اور شریف کے دماغ میں جیسے کوئی ادھ بھری چھاگل چھلکانے ... ــــ چھاگل! ــــ چھاگل ــــ چھاگل!

شریف کے دماغ پر اب لڑکی کے بجائے چھاگل سوار تھی!

احمد ندیم قاسمی

سُکھ میں دُکھ

(کرشن کنہیا کے نام)

سر پہ رات آئی تو اک چندر کرن لہرائی
چار چاند آپ لگا تا تھا اندھیرے کا لباس
رات کی رانی بھی افشاں میں بسی بیٹھی تھی!
سُرخ ڈوروں کو چھپاتی ہوئی کاجل کی لکیر
اَن گنت فتنوں کے پردے جو کسی بیٹھی تھی
موہنی چھب پہ تبسم کی سحر اترائی
چاندنی بجھی، تو سورج مُکھی بنکر بھائی!

میں بھی تاریکی کا پروا تھا، اسی سے شائد
میری سُورج مُکھی بنتی گئی غم کی صورت
میری تاریکی میں وہ لائی جھڑی ساون کی
نیر میں ڈوب کے رِم جھم سی جو برسیں آنکھیں
سُرمئی بدلی کوئی جھوم پڑی ساون کی
پھیلا کاجل، تو اری پھیکی مسی سے شاید
سسکیاں نکلیں ــــ کوئی بجرا کسی سے شاید

دیکھا جب پروا چراغ تہِ داماں کا ہٹا
دم بدم ہوتی ہیں لبریز کنول سی آنکھیں
آنسو آتے ہیں چھلکتے ہیں کٹورے دونوں
اور بے نام سی برکھا سے ہیں تر رُخسارے
میں بھی اور رات بھی ہیں کوسے کٹورے دونوں
آنسو کہتے تھے کہ آلام کا بادل نہ چھٹا
بہنا بے سُود ہے، کیا درد مٹا، رنج گٹا؟

دُکھ کے سپنوں کا بنی رُوپ جو سکھ کی لذت
میرے پہلو میں کوئی چیخ اُٹھا ــــ یا قسمت!

مختار صدیقی

رنگون سے واپسی

ہم تیئس نومبر ۱۹۴۱ء کو رنگون پہونچے۔ رنگون کی رنگینیوں میں اضافہ ہوچکا تھا۔ دلچسپیوں کے نئے نئے سامان موجود تھے۔ جاپان کے اعلانِ جنگ کے بعد کسی قسم کا فرق رونما نہیں ہوا۔ جاپانی طیاروں کی بمباری کا خیال ہمارے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپانی طیاروں نے رنگون پر فضائی حملہ کیا۔ اس فضائی حملے کے بعد ہم شہر سے سات میل کے فاصلے پر چلے گئے۔ ۲۵ دسمبر کو پھر فضائی حملہ ہوا۔ جس باغیچہ میں ہم لوگ مقیم تھے اس میں بہت سے دوسرے لوگ بھی تھے۔ ان میں بچے، عورتیں، اور مرد سب شامل تھے۔ شہر چھوڑ کر اس مقام پر جمع ہونے والے زندگی اور اس کے فلسفہ پر مختلف اور نئے نئے نظریوں کے ماتحت باتیں ہورہی تھیں۔ ایک معزز خاتون جن کا کافی سامان آچکا تھا، بھاموکی ہنڈیوں کے گھر پر رہ جانے کا غم کررہی تھیں۔ ۲۵ دسمبر کو ہم ایک پناہ گاہ میں تھے۔ ہمارے لب اگرچہ خاموش تھے تاہم ہمارے دلوں سے دُعائیں نکل رہی تھیں۔

موت اور زندگی کی کشمکش میں انسانی ذہن کے سامنے اس کی گذشتہ زندگی کے واقعات فلم بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ میں نے بھی اس فلم کو دیکھا۔ اس فلم میں گناہ کے داغ تو تھے لیکن وہ جرائم سے پاک تھی۔ جب نیکیاں سامنے آئیں تو دل کو تسلی ہوتی، رُوح مطمئن تھی۔ وہ دوسرے سفر کے لئے تیار تھی لیکن اُسے رُخصتِ سفر نہ ملی۔

اسی دن ہم لاریوں پر سوار ہوکر رنگون سے وناچاؤں پہونچے۔ رات ہوچکی تھی، کھانا کھایا اور سو گئے۔ اگلے دن بستی میں کئی ایک صورت آشنا ملے۔ سب کو منزل کی خبر تھی لیکن راہ سے ناآشنا تھے۔ ہم بھی منزل کو جانتے تھے اور راستہ سے ناواقف! اسٹیشن ماسٹر سے ملاقات کرتے ہی ہمیں مال گاڑی کا ایک ڈبہ مل گیا۔ ہم نے اُسے غنیمت جانا۔ رات اس ڈبے میں بسر کی۔ گاڑیوں کی آمدورفت بڑے زوروں پر ہوچکی تھی۔ ریلوے حکام نے مسافروں کو مفت لے جانے کا حکم دیدیا تھا۔ ہم وناچاؤں سے لپڈان پہونچے۔ ایک پنجابی ٹھیکیدار نے انتہائی درجہ خاطر و مدارات کی۔ لپڈان سے رات کو گاڑی پر سوار ہوئے اور اگلی صبح پروم پہونچے۔

پروم تک پہونچتے ہوتے ہمارے قافلے میں دوسرے لوگ بھی شامل ہوگئے تھے۔ وناچاؤں سے پروم تک ہر اسٹیشن پر برمیوں کی طرف سے مونگ پھلی، سگار، گڑ اور چاول ملتے رہے۔ ریلوے کے ملازمین کا سلوک بہت اچھا تھا۔ رنگون سے آنے والوں کی تواضع کے لئے برمیوں کو آمادہ پایا۔

پروم کا ایک ہی بڑا بازار ہے جو بہت طویل ہے۔ اس شہر میں چند خوشنما مسجدوں کے علاوہ کئی ایک قدیم پگوڈے ہیں۔ رنگون کی طرح یہاں بھی بازار کی زبان اُردو ہے۔ ہندوستان والے تو ابھی تک ہندی فرینکا کے تنازعوں میں پڑے ہوتے ہیں لیکن برما میں اردو نے ... زبان کی صورت اختیار کرلی ہے۔ بنگالی اور برمی آپس میں اردو بولتے ہیں چینی اور پشاوری اسی زبان سے اظہارِ مطلب کرتے ہیں۔ رنگون کی اُردو لکھنؤ یا دہلی کی زبان تو نہیں بن سکتی تاہم وہاں اردو بولی ... ہے۔ وہاں جو زبان بولی جاتی ہے ہم آسے انگریزی کا اُردو ترجمہ کہہ سکتے ہیں:—

کیسا ہے؟
اچھا ہے!
کدھر کو جاتا ہے؟
بازار کو جانے گا!
آپ کون گلی میں رہتا ہے؟
ممبیا دو (۲۲)
ہمارا تھوڑا کام کرو۔
سختے سے کریگا۔
معمولی بات ہے تم سے گا۔

رنگون کے علاوہ برما کے ہر بڑے شہر میں اُردو سے کام چلایا جاسکتا ہے۔ پروم میں بھی رنگون اُردو کو رائج پایا۔ سادگی اور مناظر کے لحاظ سے پروم میں بہت دلکشی ہے۔ یہ دریا کے کنارے واقع ہے اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ریلوے لائن کا ختم تھا۔ دریا عبور کرنے کے بعد ہم پڑاؤن میں تھے۔

ہم سے پہلے پڑاؤن میں کئی ایک مسافر پہونچ چکے تھے ... سب کے سب داروواله کے کارخانے میں مقیم تھے۔ ...

[illegible] کیمپ دکھائی دیتا ہے۔ ایک بین الاقوامی کیمپ جس میں [illegible] بنگالی، سندھی اور پنجابی سب ہی شامل تھے۔ بانس اور پتوں [illegible] سے قطار اندر قطار دکھائی دیتے تھے۔ سورج غروب ہونے [illegible] منظر پیش کرتے تھے۔ کافی رات گذرنے کے بعد ہم [illegible] نیند سے لطف اندوز ہوئے جو صرف مسافروں کے حصہ میں [illegible] ہے۔ اگلی صبح میں نے حجامت بنائی اور چائے تیار کی۔ چائے پی [illegible] کسی نے کہا آج عید ہے۔ عید کا لفظ سنتے ہی ذہن اس مصرع [illegible] دوڑا۔ ع

یوں بیابانوں میں گذری ترے دیوانوں کی عید

[illegible] نماز پڑھی۔ نماز عید کا خطبہ اُردو میں تھا۔ اور یہ وہی خطبہ [illegible] جسے کئی بار عید کی نمازوں میں میں سن چکا تھا۔ مسجد سے باہر نکلا تو [illegible] بچوں نے عیدی طلب کی۔ احساسِ غربت نے وطن کی یاد دلا دی [illegible] سے بچوں کو خوش کر دیا تھا اور وہ ہنستی کودتی بازار کی طرف [illegible]

[illegible] بھی اپنے اندر دلکشی رکھتا ہے، یہ پرُدم کی ایک تحصیل ہے۔ [illegible] میں اسے ٹاؤن شپ کہا جاتا ہے، ساری بستی دریا کے کنارے [illegible] پھیل گئی ہے۔ یہاں بھی پگوڈے اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ [illegible] کی تقریباً ساری بستیوں میں کاکے دکاندار ہیں۔ یہ جنوبی ہند کے [illegible] ہیں اور سب کے سب برما کے طول و عرض میں تجارت کرتے [illegible] تامل ان کی مادری زبان ہے لیکن وہ اُردو اور برمی پوری وضاحت [illegible] سکتے ہیں۔ پڑاؤں میں کاکوں کے ہوٹلوں میں رنگون کی چہل پہل [illegible] پیمانے پر پایا۔ کاکوں کے علاوہ برما کے طول و عرض میں چاٹگامی [illegible] عام پائے جاتے ہیں۔ چاٹگامی سب کے سب مسلمان ہیں۔ [illegible] نچلی ذات کے ہندو ہیں۔ برما کی ہندو سوسائٹی میں انہیں اچھوت [illegible] حاصل ہے۔ شام کے وقت پڑاؤن کی سیر نے برما کی دیہاتی [illegible] کے دلکش مناظر پیش کئے۔ رنگون کی طرح پڑاؤن میں بھی صبح کے [illegible] عورتوں کو بازار میں سبزی اور پھل بیچتے ہوئے پایا۔ چونکہ [illegible] ہماری منزل میں تھی اس لئے وہاں کے مناظر اور وہاں کی دلکشیوں [illegible] دیکھنا ہوشمندی سے بعید تھا۔ چنانچہ تانگپ روڈ سے گزرنے کی [illegible] حاصل کرنا سب سے اہم کام تھا۔ اس سلسلہ میں مختلف قوموں [illegible] کے وفد نے پڑاؤن کے ٹاؤن شپ آفیسر سے ملاقات [illegible] بھی اس وفد میں شریک تھا۔ یہ آفیسر ایک مہذب و شائستہ [illegible] تھا اور نہایت عمدہ انگریزی بولتا تھا۔ چنانچہ گفت و شنید کے دوران [illegible] میں نے بھی انگریزی لغت کی ہر اس اصطلاح کو استعمال کیا جو مجھے یاد رہ گئی تھی۔ ہماری گفتگو کا بڑی آفیسر پر بہت اچھا اثر پڑا چنانچہ [illegible] ہمیں حکام بالا سے تانگپ روڈ عبور کرنے کی اجازت لے دی۔ اور ہمارا قافلہ جس میں سو ایک کے قریب لوگ شامل تھے یکم جنوری [illegible] ہم لوگ روانہ ہوئے۔

ہمارے دائیں طرف پہاڑ تھے اور بائیں طرف چاند اپنی پوری تابناکی سے دریا کی لہروں کو فرش سیمیں بنا رہا تھا۔ ہم لوگوں نے ضروری سامان اور کھانے پینے کی چیزوں کے لئے بیل گاڑیاں کرایہ پر لے رکھی تھیں، قافلہ روانہ ہوتے ہی بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو بیل گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا تھا باقی لوگ پیدل چل رہے تھے۔ اگلے دن صبح سات بجے پولس کی چوکی پر ہمارے اجازت نامے کو دیکھا گیا۔ سڑک کے دونوں طرف چائے کی دکانیں دیکھ کر میں آنکھ بچا کر ایک دکان میں گھس گیا اور جلدی جلدی چائے کے ایک گرم پیالے سے اپنے اندر نئی قوت پیدا کی۔ نو بجے ہم اونٹیبو کی بستی سے گذر کر ڈاک بنگلے اور اسکے اردگرد ٹھہرے۔ چونکہ یار لوگوں کو صبح سے چائے بھی نصیب نہیں ہوئی تھی اس لئے آناً فاناً چولہوں میں آگ جلا دی گئی۔ چائے تیار ہوئی۔ ایک بجے تک کھانے سے فارغ ہو کر ہم پھر روانہ ہوئے۔ پہاڑ بلند ہو رہے تھے، بانس آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ سورج غائب ہوتا گیا یہاں تک کہ ہم اس کی شعاعوں کو ترسنے لگے۔ ایک طرف اراکان برما کا سلسلہ تھا اور دوسری طرف گہرے کھڈ۔ اٹھارہ فٹ چوڑی سڑک پر قافلہ روانہ تھا۔ کبھی کبھی ہاتھی دکھائی دیتے۔ ہم لوگ خالی پیپے بجاتے اور ہاتھی بھاگ جاتے۔ ہاتھی کے کان مائیکروفون سے بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں اس لئے ذرا سے شور کو وہ بہت زیادہ محسوس کرتا ہے۔ رات کو ہم اپنے اردگرد ایک الاؤ روشن کر لیتے اور گھنٹوں آگ کے شعلوں کی روشنی میں اپنی گذشتہ اور آنے والی زندگی کے متعلق باتیں کرتے۔ ہمارے سفر میں یکسانیت تھی، وہی پہاڑ، وہی کھڈ وہی جنگل اور وہی دال بھات!

دوسرے دن ہم کوہ سیلون کی چوٹی پر تھے یہاں سے ایراودی سورج کی ایک کرن کی مانند دکھائی دیتا تھا۔ پڑاؤن بھی صاف نظر آتا تھا۔ اب ہم پہاڑ کی بلندیوں پر جا رہے تھے، یہاں تک کہ [illegible] پہاڑی گاؤں میں پہونچ گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد گاڑیبان رک گئے۔ ہر گاڑی بان نے ایک ایک موم بتی کو پہاڑ کے [illegible] کھوہ میں جلایا۔ ہم سے ایک ترجمان نے کہا [illegible]

دریافت کیا کہ موم بتیاں روشن کرنے کا کیا مقصد ہے؟ ترجمان نے گماشتوں سے باتیں کرنے کے بعد کہا۔

"یہاں ایک جن رہتا ہے اور اگر اس کی نوجانہ کی جائے تو بیل مر جاتے ہیں، اور اگر مسافر یہاں کوئی منت نہ مانے تو سفر میں اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے صدیوں پہلے اراکان کے ایک راجہ نے اسی راہ سے برما پر حملہ کرنا چاہا لیکن جب اس کی فوج اس مقام پر پہونچی تو اس نے نہ یہاں چراغاں کیا اور نہ کوئی منت مانگی۔ چنانچہ اسکی فوج میں وبا پھوٹ نکلی جس سے اس کی ساری فوج تباہ ہوگئی۔"

شاید یہی وجہ تھی کہ گاڑی بان ہمیں نہیں بتاتے تھے کہ کتنے دنوں میں ہمیں تانگپ پہونچائیں گے؟ وہ کہتے ہیں کہ روانہ ہونا انکا فرض ہے منزل مقصود پر پہونچانا خدا کا کام ہے۔ چار جنوری کو صبح پانچ بجے روانہ ہونے کے بعد راستہ کو بہتر پایا۔ دس بجے بی بانے (زیادہ پانی) پہونچے، پہاڑی چشمے پر غسل کیا اور دھوپ میں بیٹھکر گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ اس مقام سے اراکانی اثرات دکھائی دینے شروع ہوئے۔ برمی زبان میں بھی تبدیلی ہو چکی تھی۔ اب ہم محسوس کر رہے تھے کہ منزل مقصود قریب ہے۔ شام کو ہمارا قافلہ رکا۔ اگلے دن سفر بہت دلچسپ رہا۔ راستہ اچھا اور صاف تھا اس لئے زیادہ سفر طے ہو گیا۔ پانچ بجے شام کو پھر رکے۔ میں دو تین میل تک اکیلا تانگپ کی طرف نکل گیا۔ سیر اور سکون نے دل اور دماغ پر خوشگوار اثر کیا۔

اگلی صبح روانہ ہو کر نو بجے تانگپ پہونچے۔ راستہ زیادہ صاف تھا۔ پہاڑوں کی بلندی کم ہو چکی تھی۔ برمی عورتوں کو دیکھکر بستی کے قریب کا اندازہ ہوا۔ چند قدم مزید چلے تھے کہ پگوڈا نظر پڑا۔ ہم اب ایک نئے شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ جونہی ہم شہر میں داخل ہوئے مرد اور عورتوں کا ہجوم سڑک کے دونوں طرف تھا۔ وہ سب ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ہم پر ترس کھا رہے تھے اور بعض نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہماری طرف شرارت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

تانگپ میں اراکانی اثر زیادہ ہے۔ یہ اثر زبان اور شکل وصورت سے صاف نمایاں ہوتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کا لباس برمی ہے لیکن تانگپ میں مرد مونچھوں سمیت دکھائی دیتے ہیں۔ ارکان کے لوگ برمیوں کی طرح مونچھیں بھی منڈواتے۔ تانگپ اسی نام کے دریا کے کنارے کنارے [illegible] میں تھم پھیلا ہوا ہے۔ شام کو سیر کرتے کے بعد ایک [illegible] بازار میں گھوم رہے تھے کہ

ایک نقارچی کی آواز نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا [illegible] چالے گا! ہوا! ہوا! وہ حکومت کی طرف سے تانگپ [illegible] کو مطلع کر رہا تھا کہ آج دن کے بارہ بجے تانگپ سے اکیاب [illegible] روانہ ہوگا۔ ہم میں سے کئی ایک اسی جہاز کے ذریعے [illegible] کچھ لوگ دوسرے دن تانگپ چھوڑ گئے۔ میں اپنی بیوی [illegible] سعیدہ کو لیکر ۱۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو پانچ بجے اسٹیم لانچ [illegible] خیال تھا کہ مسافروں کا رش ہوگا۔ اس لئے وہاں جلدی [illegible] اس رات جہاز مسافروں کی قلت کے باعث روانہ نہ ہو سکا۔ [illegible] نئے قافلے تانگپ پہونچ چکے تھے۔ چنانچہ اب مسافروں کی کمی نہیں [illegible] چنانچہ شام کو پانچ بجے کیانگ اکیاب کی طرف روانہ ہوا۔

ایس۔ ایل۔ کیانگ کا انسپکٹر ایک نوجوان تھا۔ اس [illegible] راہ ورسم پیدا ہوگئی چنانچہ اس نے مجھ سے اپنا رومان کہا۔ اس [illegible] کا تعلق پنجاب کی ایک لڑکی سے تھا جس کے والدین اکیاب میں [illegible] رہنے کے بعد پنجاب روانہ ہو چکے تھے۔ اراکان فلوٹیلا کمپنی کے [illegible] نوجوان کا نام ابوالقاسم تھا۔ دوران سفر میں اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ اکیاب تک ہمارے کھانے پینے کا وہی کفیل تھا۔ وہ اکثر [illegible] کو اپنے کیبن میں لے جاتا اور اسے دودھ اور بسکٹ کھلاتا۔

اگلی صبح ہمارا لانچ چوکفیو کی بستی پر رکا۔ اس بستی میں [illegible] گزینوں کے لئے جا بجا لنگر کھلے ہوئے تھے۔ ہمیں پلاؤ اور زمین [illegible] چائے پلائی گئی۔ چوکفیو برما کی نسبت مشرقی بنگال کا ایک چھوٹا سا شہر دکھائی دیتا ہے۔ اس شہر میں بنگالیوں کی آبادی برمیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ چائے پینے کے بعد لانچ پر سوار ہوئے اور اگلی صبح [illegible] بجے اکیاب پہونچ گئے۔

اکیاب، برما کے اراکان ڈویژن کا صدر مرکز ہے۔ دھان کی بہت بڑی منڈی ہے۔ لائل پور کی منڈیوں میں اتنی گندم [illegible] نہیں دیتی جتنا اکیاب میں دھان۔ اکیاب میں بنگالی عنصر [illegible] ہے۔ سارے شہر کی تجارت بنگالیوں کے ہاتھ میں ہے۔ دریا میں کشتیاں بادبان اڑاتی ہوئی دکھائی دیں۔ اکیاب بہت [illegible] شہر ہے۔ یہاں برمیوں کو مگ کہا جاتا ہے۔ شہر کی سول آبادی [illegible] اچھے مناظر پیش کرتی ہے۔ اکیاب میں ہم ایک نوجوان بنگالی [illegible] لے۔ صغیر چوہدری کی مہمان نوازیوں کے بہت ممنون ہیں۔ چوہدری صاحب ایک بنک کے ڈائرکٹر ہیں۔ صنعتی اور مالیاتی امور کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ چودہ جنوری کی صبح کو ہم ایک لانچ پر سوار [illegible]

رات کے آٹھ بجے بوچی ٹاؤن پہنچے۔ اس بستی میں ہمیں ایک ہی ہوٹل دکھائی دیا۔ ساری آبادی چاٹگامی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اگلی صبح ناشتہ دن چڑھنے کے لئے اُٹھے۔ دھند نے ساری بستی کو ردائے دود میں لپیٹ رکھا تھا۔ سردی بھی کافی تھی۔ ہماری منزل اس مقام سے چودہ میل تھی۔ ہم سے کہا گیا کہ راستہ پہاڑی ہے اس لئے کرایہ زیادہ ہوگا۔ ہم نے موٹر گاڑیوں کا انتظام کیا۔ راستہ بہت پر لطف تھا۔ اس سڑک کے پہاڑ ہمالیہ کے مقابلے پر اراکان یومی دکھائی دیتے تھے۔ ایک گھنٹہ بعد ہم بنگال اور برما کی اس سرحدی بستی میں تھے۔ اگلی منزل چاٹگام (چاٹگانگ) تھی۔ سعیدہ اچانک بیمار ہو گئی اس لئے ہم پرانے ہمسفروں کا ساتھ نہ دے سکے، اور نہ میں اپنے ہمسفروں کو اپنا ساتھ دینے کے لئے مجبور کر سکا۔ ہم بانس اور پتوں کے بنے ہوئے ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ ہمارے سامنے جو کھانا رکھا گیا تھا اُسے دیکھتے ہی ہم سیر ہو گئے۔ کچھ کھائے، چائے پی اور سو گئے۔ لیکن دل نے پہلی مرتبہ خوف محسوس کیا۔ نہ معلوم کیوں؟ ہم زر و مال سے بے نیاز تھے، نہ رہزن کا کھٹکا تھا اور نہ چور کا ڈر، تاہم دل میں نامعلوم سبب کی بنا پر خوف پیدا ہو چکا تھا۔ میں مشکل سے اپنے آپ کو نیند کے لئے آمادہ کر رہا تھا کہ ایک نوجوان نے جگا دیا۔

"کون ہے؟!"

"آپ رنگون سے آتا ہے صاحب؟"

"ہاں بھائی کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے میں نے موم بتی جلائی اور نووارد کو اپنے پاس بیٹھ جانے کو کہا۔

اُس نے بیٹھتے ہی کہا: "آپ رنگون سے آتا ہے صاحب آپکے ہمراہ آپ کا بال بچہ بھی ہے۔ آپ بہت دُکھ میں ہے۔ ہمارا دل بہت جلتا ہے۔ ہم کیا کرے؟"

"صاحب! آپ کی بہت مہربانی! ہم لوگ بڑے آرام میں ہیں۔ صبح ہوتے دیکھا جائیگا۔" ان الفاظ کے بعد میں نے اُسے سگریٹ پیش کیا جس کے جواب میں اُس نے چائے منگوائی۔ چائے پینے کے بعد وہ میری نیند میں مخل انداز ہونے کی معافی مانگتا ہوا چلا گیا۔ میں ابھی سگریٹ کے دھوئیں میں نیند تلاش کر رہا تھا کہ ایک اور صاحب تشریف لے آئے۔

"آپ رنگون سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔

"آپ سے کچھ کہنا ہے"

"تشریف رکھئے، فرمائیے!"

"میں آج جہاز پر گیا تھا آپ کے ہم سفروں سے مجھے اطلاع [illegible] آپ یہاں اکیلے رہ گئے ہیں۔ معاف کیجئے، مجھے آپ تک پہنچنے میں اس لئے دیر ہوئی کہ جہاز رات کے نو بجے چھوٹا تھا۔ اگر یہاں تکلیف ہو تو غریب خانہ حاضر ہے۔" اس نے کہا۔

"ہم آرام میں ہیں! آپ کی تکلیف کا شکریہ، صبح دیکھا جائے گا۔ آپ کی تعریف؟"

"مجھے نور احمد کہتے ہیں۔"

اگلے دن ہم اس "ہوٹل" سے نکل کر نور احمد کے ہاں چلے [illegible] سعیدہ بدستور بیمار تھی۔ نور احمد یہاں کی ریلیف کمیٹی کا ممبر اور بستی کا مشہور تاجر تھا۔ ہماری آسائش کے لئے اُس نے اپنے گھر میں الگ جگہ دی۔ شام کو مجھ سے کہا گیا کہ چند برمی عورتیں اندر آنا چاہتی ہیں [illegible] میں نے کہا۔ ان برمی عورتوں نے آتے ہی میری بیوی کے لباس کو غور سے دیکھا اور اسکے بعد انہوں نے برمی زبان میں باتیں شروع کر [illegible] میری بیوی کو سوائے "دنا بے بو" (نہیں سمجھتی) کے برمی زبان کا اور کوئی [illegible] نہیں آتا تھا چنانچہ عورتوں کی یہ محفل بے زبان ہو کر رہ گئی۔ اسکے بعد [illegible] نے میری بیوی اور سعیدہ کے کپڑوں کو دونوں ہاتھوں سے چھو کر اپنے [illegible] ملے۔ جاتی دفعہ ان برمی خواتین میں سے ایک بڑی مشکل سے یہ ال[illegible] کہہ سکی "ہمارا گھر آئے"۔

ماندر سے ہم جہاز پر سوار ہو کر اگلے دن ۱۲ بجے دوپہر چاٹگام پہنچ گئے۔ ہم یہاں رفیع الدین احمد ایم۔ اے۔ ایل (مرکزی) کے مہ[illegible] تھے۔ آپکے صاحبزادے سیف الدین احمد صدیقی کے حسن سلوک کو [illegible] نہیں بھول سکتے۔ سعیدہ کی علالت کے سبب ہمیں پانچ دن چاٹگام میں رُکنا پڑا۔

چاٹگانگ دریائی بندرگاہ کے علاوہ آسام بنگال ریلوے کا بہت بڑا اسٹیشن ہے۔ یہ شہر پہاڑی ہے اور دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس شہر کے مناظر بہت دلکش ہیں۔ چاٹگانگ میں جو زبان بولی جاتی ہے اس میں چالیس فی صدی سے زیادہ عربی فارسی کے الفاظ ہیں۔ شہر اور مضافات میں مسلمانوں کی اکثر[illegible] اُردو زبان شہر میں اچھی طرح سمجھی جاتی ہے۔ یہ شہر چٹائی بُنائی کی صنعت کے لئے بہت مشہور ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چاٹگام کی درخواست پر میں نے ۲۱ جنوری کو مسلم ہال میں لیکچر دینے کی کوشش کیا۔ اسی شام [illegible]

دو بیل

رات آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ اور دُور مشرق میں افق لکیر پر روشنی جاگ رہی تھی۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا کرۂ ارض پر سورج کی ہلکی سفید روشنی چھاتی جاتی تھی۔ بوڑھے احمد نے کھڑکی کھولی اور جھانک کر سامنے نگاہ دوڑائی۔ پورے بیس دن کے بعد اُس نے اس کھلے میدان کو دیکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار بوڑھے احمد کو اتنی خطرناک بیماری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت کم بیمار ہوا تھا۔ غریبی میں بیماری آجائے تو سمجھو کہ غریب موت کی نذر ہوا۔ بھلا جو آدمی دن بھر کام کرے، صبح سے لیکر شام تک سڑک پر پتھر کوٹتا رہے، یا دن بھر کسی فیکٹری میں گذارے، یا گندی نالیوں کو صاف کرے، بھلا وہ بیمار ہو جائے تو اس کی تیمار داری کون کرے۔ اور تیمار داری کے لئے روپیہ چاہیئے۔ اور روپے کے لئے محنت۔ بیماری میں محنت کب ہو سکتی ہے۔

بوڑھے احمد نے اُٹھنا چاہا، لیکن ٹانگیں لڑکھڑا گئیں۔ بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی اور کانوں میں سائیں سائیں کی سی آوازیں آنے لگیں۔ کھانسی زکام اور تیز بخار نے اس کا تمام خون چوس لیا تھا۔ اور اب وہ اس گنے کی طرح سوکھا اور سکڑا ہوا معلوم ہوتا تھا جس کا رس نچوڑ لیا گیا ہو، بدن ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ اور چہرے پر سیاہی مائل رنگت چھا گئی تھی۔ گو آج بخار اور زکام کو آرام تھا لیکن کھانسی بدستور تھی۔ یہ سالی کھانسی نہیں چھوڑتی۔ کسی دن جان لیکر رہیگی۔ اور کھانسی کھانستے اس کی چھاتی دُکھنے لگتی۔ آنکھیں انگارے کی طرح لال ہو جاتیں۔ اور چہرہ پر زردی چھا جاتی۔ لیکن آج بوڑھے احمد کو کچھ افاقہ تھا۔ کھڑکی سے مڑکر اس نے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ کمرے کی حالت دیکھکر اسے بہت کوفت ہوئی۔ ہر طرف پھٹے پُرانے کپڑے، ٹوٹے ہوئے برتن، پھٹی ہوئی دریاں گندے لحاف اور ہر طرف اس کے بلغم کے نشان۔ کمرے کی دیوار پر زمین پر، کپڑوں پر برتنوں پر۔ وہ کیا کرتا رہا ہے۔ سوائے تھوکنے کے اُسے کوئی کام نہ تھا۔ اس نے باہر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ آسمان کتنا صاف اور نیلا تھا۔ دُور مشرق کی طرف سفید براق بادل ہوا میں تیر رہے تھے۔ ہوا کتنی خوشگوار اور بھلی معلوم ہوتی تھی۔ گو وہ اس ہوا سے بچنا چاہتا تھا کیونکہ ہوا ٹھنڈی تھی۔ اس لئے اُسے اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں بیماری کا دوبارہ حملہ نہ ہو جائے۔ یہ موذی تو چھوڑ کر رہے۔ کمرے کی اس غلاظت اور گھٹتے ہوئے ماحول کو دیکھکر بڑھیگا۔ احمد کو اپنے افلاس کا تلخ احساس ہوا۔ اُسے معلوم ہوا آج اس کا دیوالہ نکل گیا ہے اور شاید یہ ٹھیک بات تھی۔ اس بیماری میں اس کا تمام اثاثہ لگ گیا۔ پہلے اس کا اثاثہ کتنا تھا۔ وہ کتنا بچا سکتا تھا۔ یہی کچھ روپیہ۔ صرف روپیہ یا بانو کے چاندی کے گہنے۔ بانو نے اس دفعہ اپنی چاندی کے گھونگھرو کو بھی بیچ دیا تھا۔ بچاری بانو۔ اگر بانو نہ ہوتی تو وہ کب کا قبر میں ہوتا۔ بانو نے کتنی تن دہی سے اس کی تیمار داری کی تھی۔ رات رات بھر جاگ کر کئی راتیں جاگ کر کاٹیں۔ دوا دارو خود لاتی رہی۔ اس رات کو وہ کب بھول سکتا ہے، جب اس کے سینے میں زبردست درد اٹھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پھیپھڑوں میں ایک خنجر چبھو دیا گیا ہے۔ رات کو اندھیرے میں اُس نے آپ کو قابو میں لانا چاہا۔ لیکن درد بڑھتا گیا۔ آخر وہ چلانے لگا۔ اور بچاری بانو خدا اس کی عمر دراز کرے، اُس نے رات کے دو بجے جاکر دوائی لائی اور اُسے پلائی، تب جاکر کہیں آرام ہوا۔ کتنا ایثار ہے۔ کتنی بے لوث محبت ہے۔ بچاری بانو اس افلاس نے اُسے کتنا نحیف کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غربت کے بے رحم خدا نے اسکے جسم کی تمام خوبیوں کو فنا کر دیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پچیس سال پہلے کی تصویر کھنچ گئی۔ جب بانو پہلی بار اس کے گھر دُلہن بن کر آئی تھی، وہ لال رنگ کا لہنگا پہنے ہوئے تھی اور پیازی رنگ کی انگیا۔ اور یہ لمبا گھونگھٹ، جس میں اس کی شوخ نگاہیں اسے جھانک رہی تھیں۔ اس کے آنے سے گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ بھلا گھر میں لکشمی آئے اور دولت منہ نہ چومے۔ اتنا کام گھر کو ملتا تھا کہ اسے کام سے انکار کرنا پڑتا تھا۔ اور بانو کا بھرا بھرا جسم باہوں کا گداز پن، اور چہرے کے متناسب خدوخال، گو اس کا رنگ کالا تھا۔ لیکن وہ کون گورا چٹا تھا اور پھر اس کی آواز میں اتنی مٹھاس تھی جو اُس نے چاوڑی بازار کی طوائفوں میں کبھی نہ پائی تھی اور آج بانو کیا رہ گئی ہے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا۔ آنکھوں کی چمک غائب باہوں کا گداز معدوم۔ آواز میں کرختگی۔ اور چال میں نقاہت۔ بوڑھا احمد کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ سامنے دیکھا

[illegible] تھی۔ ایثار اور محبت کا مجسمہ۔ حسین اور خوبصورت۔ جوان اور [illegible] بوڑھے احمد نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ اور آنکھوں کو اپنے [illegible] سے ملا اور پھر بانو کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

"جانتے ہو۔ آج کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ بچہ صبح سے [illegible] ہے۔ اور تم بستر پر ہے......"

"بانو میرے قریب آؤ!"

"کیوں کیا کہتے ہو؟"

"یہی کہ میں چھکڑا لیکر بازار میں جاؤں گا۔ میں سسک سسک کر [illegible] نہیں رہ سکتا۔"

بانو نے گردن ایک طرف جھکا لی اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اور پھر سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

"میرے پاس جو کچھ تھا تمہاری بیماری پر لگا دیا۔ حتیٰ کہ اپنے [illegible] بیچ ڈالے۔ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ بازار میں گئی تھی کہ کوئی کام مل جائے۔ لیکن بڑھیا کو دیکھکر کون کام دیتا ہے۔ چھکڑا چلانا تو آتا نہیں ورنہ خود چلی جاتی......" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔

"بانو گھبراؤ مت، جب تک زندہ ہوں تم بھوکی نہ ہو گی۔ اللہ کی قسم جب تم روتی ہو تو میرا کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ اور اگر تم زیادہ روئیں تو میں اسی وقت چھکڑا لیکر باہر چلا جاؤنگا!"

"لیکن تم جاؤ گے کس طرح۔ کیا چھکڑا چلا لوگے کیا اتنی طاقت ہے!......"

"آخر کیا کیا جائے۔ بھوک سے مرا تو نہیں جاتا!"

اتنا کہکر بوڑھا احمد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بوڑھی رگوں میں ایک [illegible] سی آگئی۔ گھر میں بھوک سے سسک سسک کر مرنے سے یہ بہتر ہے کہ ان بوڑھے ہاتھوں سے کچھ کام کیا جائے۔ جب وہ گھر سے باہر نکلا اس کی نگاہ اپنے بیل پر رکی۔ جو میدان میں ٹنگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ وہ اس درخت کی طرح تھا کہ جس کے سائے تلے ہزاروں ستاتے تھے لیکن اسے کوئی فائدہ نہ پہنچاتے ہوں۔ بیل دو دن کا بھوکا تھا۔ مالک کو دیکھکر اس نے کان کھڑے کئے۔ بیل کے نتھنے پھول کر سانسیں چلنے لگیں اور دم کو اپنے کمر درست جسم پر پھیرتے ہوئے اس نے امید بھری نظروں سے بوڑھے احمد کی طرف دیکھا۔ جیسا کہ وہ کہہ رہا ہو۔ کچھ تو دو۔ دو دن کا بھوکا ہوں۔ لاؤ کیا لائے ہو۔

بوڑھا احمد بیل کے پاس جاکر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ اس بے زبان جانور سے کس طرح اپنے دل کا حال کہے۔ احمد نے بیل کی آنکھوں میں بھوک کی جھلک دیکھی۔ اس کا دل کانپنے لگا۔ وہ کیا کرے۔ اس بیل نے زندگی بھر مزدوری کی ہے۔ یہ بیل کبھی بیمار نہیں ہوا۔ اور ہمیشہ کام کرتا رہا ہے۔ لیکن یہ بھی دو دن سے بھوکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ شاید اس کے ایمان کی دیواریں بھی شکستہ ہو گئی ہیں۔

بوڑھے احمد کو اس بیل سے بہت محبت تھی۔ یہ بیل اس کا روزی رساں تھا۔ یہ ابھی چھوٹا بچہ ہی تھا کہ احمد نے اسے خرید لیا تھا۔ بوڑھے احمد نے اپنے ہاتھوں سے اسے کھلایا، پلایا، پالا پوسا، اور بڑا کیا۔ جب تک احمد کی زندگی میں بانو وارد نہ ہوئی تھی۔ احمد بیل کو منو منو کہکر پکارتا تھا۔ اسے اس بیل سے فریفتگی سی ہو گئی تھی۔ ایک مجنونانہ محبت۔ جس دن احمد پیسے زیادہ کماتا، تو وہ منو کو خوب کھلاتا۔ اس کے جسم پر مالش کرتا اور اس سے ہنس کر باتیں کرتا۔ اور جب کبھی رات کی تاریکی میں وہ اکیلا ہوتا تو وہ منو کے پاس چلا جاتا اور گھنٹوں اسکے پاس بیٹھتا۔ کبھی کبھی منو اس کے سر کو چاٹنے لگتا تھا۔ جیسے کوئی نرم نرم انگلیوں والی لڑکی اس کے سر کو سہلا رہی ہو۔ لیکن بانو کے آنے سے اس کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس جانور اور احمد کے درمیان جو محبت کا رشتہ پیدا ہو گیا تھا وہ ٹوٹنے کا نہ تھا۔ گو وہ منو کو اب اس شدت سے پیار نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ بانو کی رسیلی باتیں منو کی ابدی خاموشی سے کئی درجے بہتر تھیں۔ وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ بیل نے پیر مارنے شروع کئے۔ شاید وہ کہہ رہا تھا: "بوڑھے میاں! ماضی کے اوراق کیوں پلٹتے ہو۔ جانے بھی دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ تم کس سوچ میں ہو؟"

احمد نے بیل کو چھکڑے میں لگایا۔ اور بیل چھکڑے کو آہستہ آہستہ کھینچنے لگا۔ نہ بوڑھے احمد میں اتنی ہمت تھی کہ بیل کو تیز کر دیتا اور نہ بیل میں اتنی سکت تھی کہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا۔ سورج نصف النہار پر آچکا تھا۔ گو سردیوں کے دن تھے لیکن کافی گرمی ہو گئی تھی۔ بوڑھے کے کھوکھلے جسم میں یہ دوپہر کی کڑکتی ہوئی دھوپ بجلی کی مانند سرایت کرنے لگی۔ اس کے تمام جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ شاید یہ دھوپ کا اثر تھا۔ وہ منٹو روڈ سے ہوتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھا۔ پاس سے ایک جوان خوبصورت گھسیارن سرخ لہنگا پہنے ہوئے گذری۔ چال میں بلا کی شوخی، آنکھوں میں بے پناہ کشش۔ وہ دیر تک گھسیارن کی طرف دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے سوچا کبھی میری بانو بھی ایسی ہی تھی۔

بوڑھے احمد نے دور سے آنے والے ایک چھکڑے کی طرف نگاہ ڈالی۔ چھکڑا سبزی سے بھرا ہوا تھا۔ سبزی کو دیکھتے ہی بیل کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

بوڑھے احمد نے بیل کو پچکارتے ہوئے کہا: "یہ سبزی تمہارے لئے نہیں۔ یہ سبزی انسانوں کیلئے ہے۔"

متواتر چار گھنٹے تک بڈھا بیل کو ہانکتا ہوا ادھر اُدھر کام کے لئے گھومتا رہا۔ دھوپ میں چلنے پھرنے سے اس کا بوڑھا دماغ چکرا گیا تھا۔ اس بیماری نے پھیپھڑوں کو کیا دماغ تک کو کمزور کر دیا تھا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بیماری کی کمزوری اور نقاہت کیا کم تھی کہ بھوک اور فاقے نے اُسے نڈھال کر دیا۔ اب شام ہونے کو تھی۔ ہوا میں کچھ خنکی سی آ گئی تھی۔ کبھی کبھی جب ٹھنڈی ہوا اس کے سینے سے ٹکراتی تو کھانسی کا دورہ پڑ جاتا اور وہ چھکڑے پر ہی کھانسنے لگتا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آتیں۔ منہ انگارے کی طرح گرم ہو جاتا اور کنپٹیاں جلنے لگتیں۔

اور بیچارا بیل حیران ہو جاتا کہ آج میرے مالک کو کیا ہو گیا ہے۔

جوں جوں شام کی تاریکی بڑھتی جاتی، اُسکے دل کی اداسی بڑھتی جاتی۔ بوڑھے احمد کو روشنی اچھی لگتی تھی۔ یہ اندھیرا یہ ابدی اندھیرا زندگی کو تاریک کر دیتا ہے۔ پھیپھڑوں کو جلا دیتا ہے۔ ہوا کو غلیظ کر دیتا ہے۔ محبت کو بے زبان اور جوانوں کو جوانی میں بوڑھا کر دیتا ہے۔ یہ اندھیرا نہیں، موت کی نشانی ہے۔ اسے روشنی اچھی لگتی ہے۔ اور وہ روشنی میں کام کر سکتا ہے۔ لیکن آج کام نہیں ملتا۔ لوگ کہتے ہیں جنگ زوروں پر ہے، روزگار عام ہے۔ یہاں سے مال باہر جاتا ہے۔ باہر سے مال یہاں آتا ہے۔ لیکن پھر بھی کام نہیں ملتا۔ اور ابھی کل تو کہتے تھے کہ آجکل چھکڑے والوں کی ریل پیل ہے۔ آدمی کام کرنے والا ہو، دن میں بیسیوں روپے کما سکتا ہے۔

شام کی تاریکی رات کی سیاہی میں مبدل ہو گئی۔ آسمان پر ستارے چمکنے لگے۔ سڑکوں پر بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ اور اب بوڑھے احمد نے سوچا کہ اُسے واپس گھر چلنا چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کاروان آکر میں رہ جائے۔ اور اس میں طاقت نہ رہے کہ وہ اپنے آخری لمحے اپنے گھر پر گذار سکے۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ بانو سے کیا کہے گا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اتنی بڑی زمین پر اسے کام نہیں ملتا۔ لوگ بے تحاشہ اِدھر اُدھر بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ ٹرامیں بسیں یہ لاریاں کدھر جا رہی ہیں۔ یہ لوگوں کا ہجوم یہ رنگ رلیاں، یہ سبز ساڑھیاں یہ موٹریں یہ تانگے، یہ گھوڑے، پالکیاں، یہ پھل پھولوں کی دکانیں، یہ سبزیوں کے چھکڑے، یہ آٹے کی بوریاں، گندم کے گودام کس کے پیچھے کہاں جاتے ہیں۔ یہ کہاں صرف ہوتے ہیں۔ وہ کیوں بھوکا ہے اس کی بانو کیوں بھوکی ہے، اس کا بچہ کیوں بھوکا ہے۔ اس کا بیل کیوں بھوکا ہے۔ اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے جھلملا رہے تھے۔ اسے نہایت غصہ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اُس کے پاس وہی لمبی مشعل ہو کہ وہ ان مسکراتے ہوئے تاروں کا منہ جھلس دے۔ مصیبت سے غریب کی غربت پر مسکرائے جا رہے ہیں۔ بے شرم، ڈھیٹ، بے حیا۔

یکایک فضا کو چیرتی ہوئی ایک آواز آئی: "او چھکڑے والے"

بوڑھے احمد نے مڑ کر ایک موٹی توند والے انسان کو دیکھا۔

"کام کرو گے؟"

"کیوں نہیں حضور"

"دس من سامان ہے۔ کیا لو گے؟"

"دس آنے حضور"

"پانچ آنے ملیں گے" اور موٹی توند والا آگے بڑھ گیا۔

"ٹھہریئے بابو صاحب، مجھے پانچ آنے منظور ہیں"

"اچھا تو اسٹیشن پر جاؤ۔ گودام میں دس بوریاں ہونگی۔ یہ لو فارم اسے سنبھالو۔ یہ کاغذ دیکر بوریاں لے آنا۔ سیدھے چاندنی چوک رام رکھا مل کی دکان پر پہونچنا"

بوڑھا احمد یہ کام پاکر خوش ہوا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔ بجھتے ہوئے دیئے میں ایک بوند تیل کی بھی دیئے کی زندگی کو بڑھا دیتی ہے۔ اور بوڑھا احمد اپنی زندگی کو بڑھانا چاہتا تھا۔ یہ پانچ آنے نہیں پانچ روپے ہیں۔ آج خدا نے اس کی دعا سن لی ہے۔ وہ پیسے کی بیل کے لئے گھاس خریدے گا۔ دو پیسے بچے کے لئے دودھ۔ دو آنے کے چنے اور ایک آنے کا گڑ۔ لو اب کھانا تیار ہو گیا۔ لیکن لوگ یہ کھانا بھی چھیننا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ غریب ہوا میں رہے، ہوا کھائے اور ہوا پہنے۔ بوڑھے احمد نے بیل کی رسی کھینچی اور بیل دوڑنے لگا۔ شاید بیل سمجھ گیا تھا کہ یہ اسکی آخری دوڑ ہے۔ اگر آج اس میں رہ گیا تو وہ کہیں کا نہ رہیگا۔ وہ موڑ گذر کر داہنے ہاتھ کی طرف جانے لگا۔ یہاں سڑک پر روشنی کم تھی اور درختوں کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں نے سڑک کو اور بھی تاریک کر دیا تھا۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ یا کبھی کبھی دور سے لاری کے ہارن کی آواز آتی تھی۔ ہوا سرد اور بھاری ہو چلی تھی۔ سامنے کی طرف دھند میں

غبار تھا جو آنکھوں کو چندھیائے دیتا تھا۔ بوڑھا احمد سردی کی وجہ سے سکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹانگوں کو اکٹھا کر کے وہ سر کو ٹانگوں سے ملائے ہوئے ایک عجیب انداز میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی کی آواز آئی "ٹھہر او چھکڑے والے۔"

آواز بھاری تھی اور ہوا میں گونجتی ہوئی گئی۔ آواز میں ایک قسم کا رعب تھا۔ جو یک لخت بڈھے کے جسم پر طاری ہو گیا۔ ہاتھ رک گئے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی غیبی طاقت نے اس کے ہاتھ شل کر دئے ہیں۔ اس نے بائیں طرف دیکھا تو ایک لحیم شحیم سپاہی کھڑا تھا۔ سپاہی کھڑا تھا۔ سپاہی نے عقابی نظروں سے بوڑھے کو تاکا۔ اور پھر بیل پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ یکایک سپاہی کی نظریں بیل کی ٹانگوں پر جم گئیں۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں معنی خیز شرارت ٹپکی۔ اب وہ اس جرنیل کی طرح تھا جس نے ایک عظیم الشان مہم سر کی ہو۔ اس نے اپنے بوٹوں کی ایڑیوں پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا "کیوں رے بڈھے، تجھے شرم نہیں آتی، کہ اس غریب جانور پر اتنا ظلم ڈھاتا ہے۔"

"حجور کیا بات ہے"

"حجور کا بچہ" سپاہی نے کڑک کر کہا۔ اس کی کڑک میں حکومت کی تمام طاقت پنہاں تھی "خود کھا کھا کر موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ اور دیکھتا نہیں بیل کی طرف۔ کتنا دبلا پتلا ہے۔ بے زبان جانور پر تشدد کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ دیکھ اس کے پاؤں کی طرف۔ خون بہے جا رہا ہے۔ کیا آنکھوں سے اندھا ہے۔ بینائی ختم ہو چکی ہے۔"

"حجور آپ مائی باپ ہیں۔ بھلا دیکھوں تو کہاں سے خون بہہ رہا ہے۔ صبح تو بھلا چنگا تھا۔"

"دیکھو اس پاؤں کی طرف۔"

سپاہی نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اور کسی کو نہ پا کر بوڑھے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ یہ نگاہیں کچھ مانگ رہی تھیں۔ غریبوں کا لہو۔

بوڑھا اس بے زبان انسان کی بات سمجھ گیا۔ لیکن بیچارہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اور اگر ہوتی تو آج اس نقاہت اور کمزوری میں گھر سے باہر کیوں نکلتا۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "حجور آج کچھ نہیں ہے۔ کل آپ کی نذر کروں گا۔"

سپاہی کی آنکھوں میں سے شرارے نکلنے لگے۔ اس کا منہ غصے سے لال ہو گیا۔ اس نے بوڑھے کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور زمین پر تھوکتے ہوئے کہا "بے زبان جانوروں پر ظلم کرتے ہو۔ جی چاہتا ہے تمہارا بھیجا نکال دوں۔ حرامی۔ بوڑھا کھوسٹ، میں ابھی بتاتا ہوں کہ جانوروں پر ظلم کرنے سے کیا سزا ملتی ہے۔" سپاہی نے بوڑھے کو چھکڑے سے نیچے اتر آنے کو کہا اور بیل کو چھکڑے سے علیحدہ کر کے آگے ہانکنے لگا۔ "رہنے دو چھکڑے کو یہیں رکھو۔ تم لوگ جانوروں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آؤ گے۔ جب تک تمہیں پوری سزا نہ ملے۔"

دوسرے دن جب بوڑھا احمد انسدادِ بے رحمی کے محکمے میں گیا تو اسے معلوم ہوا کہ بیل ہسپتال میں معائنے کے لئے بھیج دیا گیا ہے۔ اس لئے اسے بے رحمی کے ہسپتال میں جانا چاہیئے۔ وہ خود حیران تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر اس کا بیل اس سے چھن گیا تو وہ کیا کریگا۔ زندگی کی آخری کرن ہمیشہ کے لئے مفقود ہو جائیگی۔

جب وہ بے رحمی کے ہسپتال میں پہنچا تو اس نے اپنے سامنے ایک گورے چٹے انسان کو دیکھا۔ جو ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسکی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی۔

"کیا یہ تمہارا بیل ہے؟"

"جی حجور" بوڑھے نے بیل کی طرف نگاہ ڈالی۔

"ہم نے اس کا معائنہ کیا ہے۔ اس کے خون میں تپ دق کے جراثیم ہیں۔ تم لوگ بہت بدمعاش ہے۔ بہت بے رحم ہے۔ کتنا ظلم کرتا ہے جانوروں پر۔ یہ جانور تمہیں روٹی دیتا ہے۔ لیکن تم اسے مارتا ہے اور دن رات بھوکا رکھتا ہے۔ اسے پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے یہ بیماری ہو گئی ہے۔"

"حجور ایسی بات تو نہیں ہے۔ میرا بیل بھلا چنگا ہے۔ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ کل تک یہ راجی خوشی تھا۔ سرکار بیمار تو میں ہوں۔ بیس دن سے بیمار ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میری بیوی بھوکی ہے۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔"

ڈاکٹر نے غضبناک ہو کر کہا "کیا ہم جھوٹ بولتا ہے۔ بے شرم کہیں کا۔ چپڑاسی اس بوڑھے آدمی کو دھکے دیکر باہر نکال دو۔ اس بیل کو ہسپتال میں پہونچا دو۔ اور وارڈ میں داخل کرو۔ اس کا علاج ہم کرینگے۔"

"حجور ہم بھوکے مر جائیں گے۔ میری بیوی میرے بچے۔"

"سرکار تمہارے بال بچوں کی ذمہ دار نہیں۔ ہم کیا کریں۔ نکل جاؤ۔ چپڑاسی نکال اس بوڑھے کو۔"

اور جب بوڑھا احمد دروازے سے نکلا تو اس نے سوچا کہ

کیا اس دنیا میں کوئی ایسا ہسپتال نہیں ہے جہاں ان انسانوں کو داخل کیا جائے جن پر بے رحمی کی جاتی ہے۔ وہ اب اکیلا تھا۔ بالکل تنہا۔ اس درخت کی طرح۔ جو صحرا میں اکیلا ہو۔ اس نے جانا کہ وہ اس پرندے کی طرح ہے جس کے پر ہمیشہ کے لئے کاٹ دیئے گئے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے کانوں میں ٹراموں، کاروں اور رکشاؤں کی شور آوازیں تھیں۔ لیکن یہ شور لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا گیا۔ وہ اب اس زمین کے قریب جا رہا تھا، جہاں ابدی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اور روشنی کی کرن ہمیشہ کیلئے معدوم ہو جاتی ہے۔

مہندر ناتھ؛

رنگون سے واپسی

(بسلسلۂ صفحہ ۴۸)

انجنیر، مسٹر صدیقی اور مجھے چائے کی دعوت دی۔ یہ دعوت چائے اور پیسٹری کی لذتوں کے علاوہ اس لحاظ سے پُرلطف تھی کہ اس صحبت میں مختلف مسائل پر بحث ہوتی رہی۔ اسی شہر میں میری ایک پرانے دوست ظہور الحق سے ملاقات ہوئی۔

۲۳ جنوری کی صبح کو ہم چٹاگانگ سے روانہ ہوئے۔ اس سفر کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ راستے میں کسی اسٹیشن پر کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ جگن ناتھ گنج سے سراج گنج گھاٹ تک سٹیمر پر گئے۔ ۲۴ جنوری کو ہم اسٹیشن (کلکتہ) پر پہونچے۔ سعیدہ کو بخار نے گھیر لیا۔ کلکتہ کے قیام میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے خوب باتیں ہوتی رہیں۔ آخر ۲۹ جنوری کو ہوڑہ سے گاڑی پر سوار ہوکر ۳۰ جنوری کو دہلی پہونچے!

دہلی میں سعادت حسن منٹو کے ہاں ایک ہفتہ قیام کیا مولانا شاہد احمد دہلوی اور مولانا محمد مرزا سے گھنٹوں اردو ادب کے حال اور مستقبل پر گفتگو ہوتی۔ دہلی سے روانہ ہوکر لائل پور پہونچا۔ جہاں اب تک مقیم ہوں۔

"باری"

کالا پانی

(بسلسلۂ صفحہ ۴۴)

اجنبیوں کے خوف سے اِدھر اُدھر بھاگ گئے، کچھ بیماریوں کا شکار ہو گئے اور کچھ اجنبیوں کے حملوں میں مارے گئے، بیماریوں کی وجہ سے ان کی قوت تولید گھٹ گئی اور عام شرح پیدائش میں کمی آگئی پھر ان کی عورتوں نے بیرونی آدمیوں سے شادیاں کرلیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان کی نسل مٹنے لگی، اور اگر خاص طور پر ان کے تحفظ کی کوشش نہ کی گئی تو ۲۰، ۲۵ سال بعد ان کی نسل بالکل ختم ہو جائے گی۔

یہاں دلدلوں کی بڑی کثرت ہے جن میں مچھر بکثرت پیدا ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے ملیریا کی بھی کثرت ہے۔ اب ان دلدلوں کو خشک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہاں ایک بجلی گھر بھی ہے، جس سے بعض دیہات میں روشنی پہونچائی جاتی ہے۔ سنا ہے کہ اب پورٹ بلیر میں ایک چھوٹی سی طیارگاہ بھی بن گئی ہے۔ پندرہ روز میں یہاں ایک مرتبہ اسٹیمر آتا ہے جو ڈاک اور مسافر لاتا ہے۔ البتہ اب ریڈیو کی وجہ سے اس کا سلسلہ بیرونی دنیا سے قائم ہو گیا ہے۔

محمد احمد سبزواری؛

انسان

حقیقت کے تصور میں ضیا تابی تھی مبہم سی
کبھی مجسم ہو کر بن گئی تنویر عالم کی
مگر اس نور کو فانوسِ جسم ناتواں بخشا
مقدرِ ظلمت نے طوفاں خیزیوں کا اِذن بھی پایا
بگولے اُٹھ رہے ہیں، ہر طرف کالی گھٹائیں ہیں
چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے

فرشتوں اور شیطانوں کی رزم آرائیاں توبہ!
تصادم نیک و بد کا روحِ انساں میں معاذ اللہ
کشاکش جینے مرنے کی، ہنگامے ترقی بھی
عجب تقدیرِ انساں ہے! عجب تعمیرِ انسانی
اندھیری شب، فضا پُرہول، منزل دور، رستہ گم
چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے

کبھی اہرمن بجلی گراتی ہے کبھی اس پر
کبھی یزداں ہے خوش اس کو گناہوں کی سزا دے کر
کبھی اس کی نگاہیں دید کو ترسائی جاتی ہیں
کبھی اس کی دعائیں عرش سے ٹکرائی جاتی ہیں
مسافر زندگی کا کھا کے ٹھوکر چل رہا ہے
چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے

کبھی یہ دورِ وحشت میں ہے ننگِ زندگی یکسر
کبھی تہذیب کی گمراہیوں سے اسفل و ابتر
کبھی اپنی خودی بھولا تو ذرّوں پہ جھکایا سر
خدائی کی لی طاقت، کبھی اپنوں کا خوں پی کر
کبھی یہ نورِ خاکستر، کبھی شعلہ، کبھی اخگر
چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے

یہی تقدیس کا حامل، یہی ہے رندِ میخانہ
یہی معمارِ کعبہ ہے، یہی بانیِ بت خانہ
کبھی اوہام کے ناوک کا یہ نخچیر ہوتا ہے
کبھی پرواز سے افکار کے یہ تیر ہوتا ہے
یہی مجبورِ دوراں ہے، یہی خالق زمانے کا۔
چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے

حجازی خاک میں بولہبیوں کا کبر و نخوت بھی
اسی ظلمت کدے میں نورِ خورشیدِ رسالت بھی
یہیں ابن اُبی کا مکر، شامی کی شقاوت بھی
جگر بندِ رسالت کا یہیں خونِ شہادت بھی
وفا کے پھول ارضِ کربلا کے شمعِ ایمانی
چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے

ہزاروں آندھیاں اُٹھیں مگر یہ نورِ یزدانی
بڑھاتا ہی گیا حسبِ ضرورت اپنی تابانی
حرا کا سوز و ساز اور بدر و خندق کی وہ قربانی
نشانِ راہِ منزل! خالقِ تقدیرِ انسانی!
ہے طوفانوں پہ خندہ زن اگرچہ
چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے

کشاکش ہے، تصادم ہے، خرد ہے، جذبۂ دل ہے
صداقت کی کرن تیرے لئے اور فوجِ باطل ہے
شہیدِ نازِ آزادی، جفاکاریِ قاتل ہے
خبر ہے آج بھی انسان اسی مقتل میں بسمل ہے
بڑھی آتی ہے ظلمت پر لگائے، زہر برساتی
چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے

مرقعِ خونِ دل کا ہے نیا "ارژنگِ چیں" دیکھو
شہادت سرخرو ہے۔ لال تارے کی جبیں دیکھو
مگر ہیں کتنے خود بیں میری قسمت کے امیں دیکھو
مہابھارت نہ بن جائے یہ بھارت کی زمیں دیکھو
نیا فتنہ بہ سازِ دلبری خونریز ہے ہمدم
چراغ آندھی کی زد میں جل رہا ہے

ہے طرفہ محفلِ ہستی، عجب ساقیِ گردوں ہے
ہزاروں اُٹھ گئے پی کر مگر وہ چشم نگوں ہے
اسی طناز کی عشوہ گری ہے چین کی دشمن
اسی کا غمزہ ہے قاتل اُسی کی چال [illegible]

نصیبِ انساں کا رحم آفاتیوں میں پل رہا ہے
چراغِ آندھی کی زد میں جل رہا ہے
"شبِ تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل"
مگر ہستی کے دھارے ہیں ترقی کی طرف مائل

نہ اب تک ہو سکا گو بربریت کا اثر زائل
ہوئی ہے ساری دنیا جنگ آتش بار میں گھائل
یہ سب کچھ ہے مگر انسان آگے بڑھ رہا ہے
شفق کا خون مل مل کر یہ سورج چڑھ رہا ہے

نوٹ:۔ اس نظم کی تنظیم قافیہ (rhyme scheme) اور تعدادِ ارکان میں روانیِ خیال اور اس کے اتار چڑھاؤ کا پاس کیا گیا ہے۔ صورتِ نظم کا روحِ نظم کے ساتھ ربط و ہم آہنگی ضروری ہے۔

سیّد اختر اوریتوی

اپریل پھول

مناظر پہ نظریں جمانے کی رت ہے
تفکر میں کلیاں کھلانے کی رت ہے
بہاریں مصوّر بنانے کی رت ہے
تاثر کو کاغذ پہ لانے کی رت ہے

یہ غمگیں نظارے، یہ پت جھڑ کا عالم
طراوت کے ملبے یہ پت جھڑ کا عالم
یہ برگد، بجائے" یہ پت جھڑ کا عالم
خزاں کو سواری بڑھانے کی رت ہے

حجابوں میں ہل چل مچانے کا موسم
شبابوں کو رستہ پہ لانے کا موسم
نقابوں کے جھگڑے چکانے کا موسم
حسینوں کے دل گدگدانے کی رت ہے

یہ ٹھہرا ہوا "روپ" وہ برق راہی
نہ کلیوں کی آنکھوں میں "لالی" نہ لاہی؟
یہ بیباک نظریں وہ عشوہ نگاہی
کوئی گیت ہو۔ گنگنانے کی رت ہے

یہاں سے وہاں تک یہ پھولوں کی دنیا
جہاں سے جہاں تک یہ پھولوں کی دنیا
کہاں سے کہاں تک یہ پھولوں کی دنیا
ٹہلتے ہوئے۔ مسکرانے کی رت ہے

جدھر جائیے حسن تنہا۔ مہیا
طلب ہو نہ ہو کیفِ صہبا مہیا
شغف ہو نہ ہو جام و مینا مہیا
سبب ہو نہ ہو "لا پلانے" کی رت ہے

وہ دن ہیں کہ اونچا ہے الفت کا پارا
بہت دیر تک دل میں سوچے گی "تارا"
یقیں ہے کہ میں نے اگر ہاتھ مارا
نہیں ہے کہ دامن چھڑانے کی رت ہے

نگاہوں کی زد میں سیکے بعد دیگر
یہ تتلی وہ بجلی وہ ہرنی کی ہمسر

یہ سادگی، وہ سایہ، وہ شعلہ چہرہ
تخیل کا الہام ہو جانے کی رُت ہے

مگر شاد ایسی گھڑی "آ پڑا جی"
مناسب نہیں آج شاعر مزاجی

سنا تا ہے بھارت کو آکاش باجی
وطن دشمنوں سے بچانے کی رُت ہے

وہ رُت ہے کہ آپس کے جھگڑے چکا لیں
وہ اُلفت جو ان بن میں کھو دی ہے پالیں

گلے ملکے روٹھے ہوؤں کو منا لیں
گیا دَور کھونے کا، پانے کی رُت ہے

شاد عارفی!

گرفتاران مے سے

مے چھلکا دو، جام لنڈھا دو
میخانے کا رنگ جما دو
پینے والو، جھوم کے اٹھو
ساقی کا مُنہ چوم کے اُٹھو
رقص کرو، مینا کو اچھالو
ذرّے ذرّے کو دھو ڈالو
گاؤ اور گا کر لہراؤ
سوچتے کیا ہو، آؤ، آؤ،
آؤ، یہ دُنیا ہے فانی
خواب ہے یہ بدمست جوانی
جیسے اک بادل کا سایا
آنکھ کی جھپکی میں گم پایا
جیسے ایک کلی البیلی
بھونرے کی نادان سہیلی
مُسکاتے ہی مُرجھا جائے
جی بھر کر ہنسنے بھی نہ پائے
جیسے ساون کی گھٹائیں
گرجیں، برسیں اور چھٹ جائیں

مے خانے سے باہر آؤ
دیکھو دُنیا کے اُلجھاؤ

سُورج کی تابانی دیکھو،
ذرّوں کی حیرانی دیکھو
اُونچے پربت، نیلی جھیلیں
شہروں پر منڈلاتی چیلیں
پُر رونق اشجار کا منظر
اور کونجوں کی ڈار کا منظر
دھیمے جھکڑے، اُڑتی کاریں
سوئی یت جھڑ، مست بہاریں
سلطاں کی بلّور کی ڈھالیں
دہقاں کی مضبوط کدالیں
منعم کا سنجابی بستر
اور مفلس کا غار نما گھر
ایواں میں سازوں کی جھن جھن
کُٹیا میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
دوشیزاؤں کی رعنائی
دل میں جو کہہ، قدموں میں خدائی

بانکی چتون، تیکھے ابرو
سلجھی پلکیں، اُلجھے گیـ
مُسکائیں تو تیر سے چھوٹیں
کوندے لپکیں، تارے ٹوٗ
بگڑیں تو دل کٹ کٹ جائے
سورج کا سینہ پھٹ جاـ
چرخ دُھواں بنکر چھٹ جائے
دُنیا مرکز سے ہٹ جاـ
یہ گبرو ــــ نوخیز شکاری
چہروں پر مستی سی طارـ
گلیوں میں بے مطلب گاتے
چوراہوں پر شور مچاـ
آہن کی سختی باہوں میں،
دوزخ کی حدّت آہوں ـ
اس سے جھپٹیں اس کو کھیلیں
ناز اُٹھائیں سختی جھیلیں
گھر میں لاڈ اور پیار کی باتیں
رَن میں بپھرے شیر کی گھاـ
یہ نازک گالوں پر غازہ
وہ ڈھیلے کاندھوں پہ جـ

چاند پہ بادل چھائے، دیکھو
کرنیں دیکھو، سائے دیکھو

جام پہ جام چڑھانے والو
ناچنے، ہنسنے، گانے والـ
تم سچ سے گھبراتے کیوں ہو
دنیا سے کتراتے کیوں
میخانے سے باہر آؤ
میدانوں میں شور مچا
سینے چیرو کہساروں کے
رنگ اُڑاؤ گلزاروں ـ
اس سے بھڑو، اس سے ٹکراؤ
مے چھلکاؤ، جام بجـ

زیست ابھی بے رنگ نہیں ہے!
یہ دُنیا دل تنگ نہیں ہے!

ناجائز تعلقات

رات!

اب تو ایک بج چکا ہوگا۔ دُور کہیں کسی ریلوے انجن نے سیٹی دی، ایک مختصر سی تیز چیخ۔ سیٹی کی آواز تھوڑی دیر ٹھہر ٹھہرا کر تحلیل ہو گئی لیکن اُس کی توجہ جو سیٹی کی اچانک آواز سے اِدھر منتقل ہو گئی تھی دیر تک اس مُردہ گونج کو محسوس کرتی رہی، اُس نے محسوس کیا کہ سیٹی کی گونج ایک غیر مرئی تار ہے کہ جو کھنچتا جا رہا ہے، کھنچتا جا رہا ہے اور پتلا ہو رہا ہے، اور —— کھڑ کھڑ کھڑ کھڑ.... اسٹیشن کی لائنوں پر کوئی گاڑی گزر رہی تھی۔ ایک عجیب سی رومانی یکسانیت کے ساتھ اس کی آواز کمرے کے دروازوں میں سے گھُسی چلی آ رہی تھی، کھڑ کھڑ، کھڑ کھڑ.... سارا ماحول سویا پڑا تھا، صرف ریل گاڑیاں جاگ رہی تھیں۔ ایک بج چکا تھا مگر وہ ابھی تک سوئی نہ تھی، ذہن میں نیند کا نشان بھی نہ تھا۔ خیالات ایک پروانے کی طرح اسکے دماغ کے گرد چکر لگا رہے تھے، ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں، ایک ہی نغمے کی مختلف لَے۔

اُس نے کروٹ لے لی۔ ہولی جاڑوں کا آخری سانس.... نہیں ہے! اُس نے لحاف کو اپنے اوپر کھینچ لیا۔ کل ہولی ختم ہو جائیگی، اس نے سوچا اگر آج گرہن نہ ہوتا تو آج ہی ختم ہو جاتی، لیکن یہ جاڑے —— لحاف اب بھی بُرا معلوم نہیں ہوتا تھا، اُس کی گرمائی ابھی تک ناگوار نہ تھی، ہلکی ہلکی گرمائی میں اُس نے اپنا جسم ڈھیلا کر دیا —— حرارت سے چیزیں پھیلتی ہیں اور ٹھنڈی ہو کر سکڑ جاتی ہیں۔ خیالات پھر پھیل گئے تھے، لیکن ایک محدود دائرہ تھا جس سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ یہ دائرہ اسکے احساس کے گرد آج ہی بنا تھا۔

دوپہر کو ساتھ والے مکان میں رہنے والے نوجوان نے اچانک اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہا تھا —— میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا!

اور وہ گھبرا گئی تھی! جیسے ایک متحرک موٹر اچانک اس کے سامنے آ گئی ہو، شوک سے بغیر کسی اشارے کے، بغیر کسی سگنل کے، اچانک اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا۔ اس اچانک پن سے وہ گھبرا گئی تھی۔ ایک دم جو کچھ ہو گیا تھا اُس کے لئے وہ تیار نہ تھی۔ درمیان کی چھت پر سے گذر کر وہ اگلے مکان میں جا رہی تھی۔ اس محلے میں تمام مکان ایسے تھے کہ اوپر ہی اوپر ایک مکان میں سے دوسرے مکان میں جایا جا سکتا تھا۔ [illegible] میں بہت شور و غل تھا۔ عورتیں ہولی کھیل رہی تھیں، اُن کے [illegible] قہقہے، چھوٹی چھوٹی چیخیں، پانی گرنے اور برتنوں کے کھڑکنے کی [illegible] اُس کے دل میں ایک گدگدی سی کر رہے تھے۔ درمیان کی چھت [illegible] گذر کر وہ اگلے مکان میں جا رہی تھی۔ سائبان کے قریب وہ ہاتھ [illegible] گلاس لئے کھڑا تھا۔ مایا کو دیکھ کر اس کا گلاس ہونٹوں تک جاتے جاتے رُک گیا۔

اور جب وہ قریب سے گزری تو اُس نے گلاس بڑھاتے ہوئے کہا: "پانی ڈالدوں؟"

اُس کی آواز اسکی اپنی تو نہ تھی!

سو فی صدی زنانے ڈھنگ سے مایا نے جواب دیا [illegible] "اوپر ڈالے جبھی تو ڈالو!"

ایک سیکنڈ خاموشی رہی جیسے مایا اُس کا راستے سے ہٹ جانے کا انتظار کر رہی ہو، پھر اچانک اُس نے اُس کے دونوں بازو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا، اُس کی آواز ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے اس کا دم گھُٹ رہا ہے۔ جیسے وہ کسی میلوں لمبے صحرا سے پیاسا چل کر آیا ہے [illegible] آواز میں وہ بولا: "میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا!"

یہ سب کچھ اتنی جلدی، اتنا غیر متوقع اور اتنا اچانک ہوا کہ مایا سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ سمجھ اور ناسمجھی کے درمیان گھِر کر گھبرا گئی۔ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے ذہن میں خیالات آئے، اُوپر کھُلا آسمان تھا، عورتوں کا شور و غل کتنا قریب تھا، اور پھر اچانک اُسے اس طرح اپنی گرفت میں لے کر وہ کیا کرنا چاہتا تھا! —— اُس نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے گھبراہٹ میں سہمی ہوئی آواز میں کہا —— "مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو!"

اور وہ تیزی سے آگے نکل گئی۔

دھک دھک، دھک دھک، دھک دھک....

دل تیزی سے دھڑک رہا تھا!

اُس نے پھر کروٹ لے لی، دن میں یہ چند لفظ بار بار اُس کے ذہن میں گونجتے رہے تھے۔ اپنی اٹھارہ سالہ زندگی میں پہلی بار اُس نے [illegible]

۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا! محبت!... اس نے ایک اُس نے مجھے کیسے پکڑ لیا تھا، اگر کوئی آ جاتا تو؟

کسی کے آ جانے کا یہ احساسِ خوف پھر اُس کے تحت الشعور سے اس جذبے سے ساتھ خوف کا تعلق ہمارے غریب ہندوستان میں ایسے ہی ہے جیسے مذہب کے ساتھ غلامی کا۔ یہاں کے مرد، بھی محبت کو ایسے لیتے ہیں جیسے بجلی کے تار کو جس سے جھٹکا لگنے کا ڈر ہو۔ خوف جذبوں میں شدید ہوتا ہے۔ مایا بھی ایک ہندوستانی عورت ہی تو تھی۔ وہ شرمیلی تو نہ تھی ۔۔۔ شرمیلی لڑکیوں کی جنسی حس تیز ہوتی ہے ۔۔۔ لیکن وہ بارہا اس جذبے کی شدت کو محسوس کرتی۔ اس شدت میں ایک عجیب قسم کی نرمی و ملائمت تھی، ایک عجیب عشق کی شاعرانہ خواہش، رومانی محبت کی ایک حسین سی آرزو، اور تسکین وہ ۔۔۔ میٹھی اور بے چین۔ اکثر اس کا یہ جذبہ استعاروں کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اُس نے خود کبھی سمجھنے کی کوشش نہ کی تھی، ہر شخص اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ موضوع پھر اُس کے بات کرنے کا ڈھنگ بھی نرالا تھا، ایک خوف تھا جو اُسے کھل کر بات کرنے نہ دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی باتیں کرتی تھی جو اُسے پسند ہوتیں۔ اپنی سہیلیوں میں بھی کبھی کھل کر اپنے دل کی بات نہ کہی تھی۔ لیکن وہ یہ چاہتی ضرور تھی کہ عشق اور محبت کے متعلق باتیں کرے۔ یہ باتیں کئے بغیر وہ رہ بھی نہ سکتی۔ دل میں ایک خلا سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اکثر ان کے متعلق گفتگو کرتی۔ محبت کو وہ ہمیشہ ایک بیکار چیز کہا کرتی تھی۔ محبت، محبت، محبت، مجھے تو سمجھ نہیں آتا تمہارے دلوں میں کیا سمایا ہوا ہے، بُری بُری کہانیاں پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ خود بھی بُری کہانیاں پڑھنے کی شوقین تھی، اور وہ پوچھتی ”کیوں شیلا تمہارے ”بل ٹیرین“ مہاشہ چھت پر چڑھ کر بچوں کے ساتھ پتنگ نہیں اڑاتے؟“

”بل ٹیرین کی شکل تم سے تو اچھی ہی ہے“

”میری شکل کا کیا؟“ وہ کہتی ”ہماری چھت پر تو ان کی پتنگ گرتی ہی نہیں۔ سچ کہتی ہوں شیلا، بالکل چڑی مار معلوم ہوتا ہے“

مایا جانتی تھی کہ وہ چڑی مار بالکل معلوم نہیں ہوتا، نہ ہی بل ٹیریئر ہے وہ اور کیا کہتی۔ وہ یہ تو کہہ نہ سکتی تھی کہ اس کی صحت بہت اچھی ہے، اس کا نقشہ بھی بُرا نہیں اور ٹائی باندھ کر تو ۔۔۔ ٹائی سے نام آئے پھر یاد آیا وہ کہتی ”اور چھت پر جب آتے ہیں جناب ٹائی باندھ کر، ایک ہی تو ٹائی ہے بیچارے کے پاس، اُسے ہی شیلا کو دکھانے کو باندھ لیتا ہے، ہے ہے بیچاری شیلا ہے ہے!“

اُسکے باتیں کرنے کا ڈھنگ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ دو مہینے پہلے جب اشوک اس مکان میں مع اپنے ”گھر والوں“ کے آباد ہوا تھا، تب بھی وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ کہنے لگی ”تم تو شیلا اسے اپنا رشتہ دار سمجھو، بالکل تمہارے بل ٹیرین کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔ شریمان کا نام تو اشوک ہے مگر چہرے سے یہ حسرت برستی ہے۔ مجھے تو محبت کا مارا معلوم ہوتا ہے بیچارہ“

چند دن بعد کہنے لگی ”میری طرف تو ایسے دیکھتا ہے جیسے کھا جائیگا“ بڑا خونخوار معلوم ہوتا ہے!“

اور آج ۔۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا!

یہ الفاظ پھر اس کے ذہن میں کوند گئے۔ ابکے اُسے ”کسی کے آ جانے“ کا خیال نہیں آیا۔ اس مرتبہ ان الفاظ میں وہ اجنبیت نہ تھی۔ اب وہ اُن کے معنوں اور اہمیت کو سمجھ رہی تھی، محسوس کرنے لگی تھی۔ اُن لفظوں میں اُسے ایک مبہم سی ملائمت کا احساس ہوا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، اُس نے سوچا محبت، وہ محبت کس طرح کرتا ہے۔ اُسکے دل میں ایک تجسس کا سا جذبہ پیدا ہو گیا، یہ جاننے کی خواہش کہ اُس کی محبت میں مبتلا ہو کر وہ کیا محسوس کرتا ہے!

دو مہینے سے وہ اس سامنے والے مکان میں رہتا تھا۔ شروع شروع میں دو تین دن تک تو وہ چھت پر سر جھکا کر چلتا تھا، لیکن اُس کے بعد اُس نے سر اٹھا لیا تھا۔ اب آتے جاتے اُس کی نظریں مایا کی چھت پر رینگنے لگتی تھیں۔ چھت پر اب وہ بہت آہستہ آہستہ گزرا کرتا تھا۔ اب تو وہ چھت پر ٹہلنے بھی لگا تھا۔ کتنی کتنی دیر تک وہ چھت پر ٹہلتا رہتا تھا۔ اکثر وہ ٹہلتا ٹہلتا رک جاتا اور چھت کی منڈیر پر کہنیاں ٹکا کر سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھنے لگتا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں کو دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھیں فوراً ہی تھک جاتی تھیں اور وہ سورج کی طرف سے نظریں ہٹا کر مایا کی چھت پر دیکھنے لگتا تھا۔ اس میں مایا کا تو کوئی قصور نہ تھا کہ وہ وہاں چھت پر کیوں ہوتی تھی۔ جاڑوں کے دن تھے اور وہ چھت پر دھوپ سینکا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ کنواری لڑکیوں کو سردی کم لگتی ہے۔ لیکن مایا کو تو سردی لگتی تھی۔ پچھلے دنوں سے تو سردی کچھ بڑھ ہی گئی تھی؛ اور دھوپ زیادہ خوشگوار ہو گئی تھی! اکثر وہ چھت پر دھوپ سینکا کرتی تھی۔ اُس بیکار نوجوان کی طرف تو شاید ہی اُس نے کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو۔ وہ اب ترقی کر رہا تھا۔ اب کئی کئی منٹ تک وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ مایا اب بھی اس کی طرف نہ دیکھتی تھی۔ عورتوں کو دیکھنے سے

زیادہ دیکھے جانے کی خواہش ہوتی ہے! اشوک کا اس طرح اپنی طرف گھورتے رہنے کا مایا نے کبھی اپنے دل میں بُرا نہ مانا تھا۔ بلکہ اُسے تو اُس کے اس فعل سے غیر شعوری طور پر کچھ خوشی ہوتی تھی۔ ایک ایسی خوشی جو کسی آرزو کو پورا ہوتے دیکھ کر انسان کو ہوتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ کبھی اپنے دل میں اس بات کا فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ یہ لڑکا اُس سے محبت کرتا ہے۔ یہ خیال اُسے بار بار آتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن وہ سوچتی کہ دیکھنے کی عادت تو سبھی لڑکوں میں ہوتی ہے، اور پھر دیکھنے کا مطلب محبت ہی تو نہیں ہے — "گونگے عاشقوں کو تو ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی پسند نہیں کرتیں" اس کی یہ عادت ہی ہے۔ وہ سوچتی۔ اس کی اس عادت کے متعلق وہ اکثر سوچا کرتی تھی، اور اس 'عادت' کے متعلق سوچتے سوچتے اُسے ایک مبہم سا غیر یقینی یقین ہو چکا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اب وہ شیلا اور دوسری سہیلیوں سے اشوک کی زیادہ بُرائی کرتی تھی! وہ کہتی: "مجھے ایسے آدمیوں سے نفرت ہے جو چھتوں پہ چڑھ چڑھ کر عورتوں کو گھورتے ہیں:" پھر فوراً ہی شیلا کا دل رکھنے کو جوڑ دیتی — "اگر تمہارے بِل ٹیرین کی طرح پیار سے دیکھے تب تو خیر کوئی بات نہیں، کوئی برداشت بھی کر لے۔ لیکن اب ذرا ان مہاشہ کی طرف دیکھو۔ ہر وقت جیسے تاک لگا رہتا ہے۔ اس کی کوئی بہن بھی تو نہیں جس سے شکایت ہی کر دیں۔"

اگر کوئی لڑکا "بغیر بہن" ہو تو اس محلے کی لڑکیوں کو وہ یتیم سا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے موجودہ ماحول میں لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلقات میں بہنیں اکثر ایک لازمی اور لاشعوری رشتہ ہوتی ہیں۔ برابر برابر کے مکانوں میں رہتے ہوئے یہ لڑکے اور لڑکیاں آپس میں اجنبی سے تھے۔ اجنبیوں کو تو پھر بھی آپس میں بات کرنے کا ادھیکار ہوتا ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے آپ کو اس حق سے بھی محروم سمجھتے تھے۔ دو مہینے سے بھی زیادہ اشوک کو اس مکان میں رہتے ہو گئے تھے، لیکن مایا اور اس کے درمیان کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا تھا۔ شیلا نے بھی کبھی اپنے بل ٹیرین سے گفتگو نہ کی تھی۔ ان کی بات بھی یہیں تک محدود تھی کہ اکثر اس کی پتنگ شیلا کی چھت پر اٹک جاتی تھی۔ پتنگ چھڑانے کو وہ بیچارہ خود کبھی نہیں کہتا تھا بلکہ بچوں سے کہلواتا تھا۔ بچوں کے شور مچانے پر کبھی کبھی شیلا کہتی، مسکرا کر: "میں نہیں چھڑاتی۔ کیوں اٹکتی ہے یہاں آ کر بار بار؟" اس وقت بل ٹیرین کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ جاتی، جیسے کہہ رہا ہو "اب کیا کروں، اٹک جاتی ہے۔"

دن یونہی گذرتے جا رہے تھے۔ اشوک، جیسا تھا [illegible] تھا، اکثر چھت پر نظر آیا کرتا تھا۔ منڈیر پر اس جگہ سے جہاں [illegible] سورج، کو چھپتے دیکھا کرتا تھا، سفیدی چھوٹ گئی تھی، [illegible] کیا کہتی ہوگی، مگر اُسے شاید اس بات کا کوئی احساس [illegible] تندہی سے اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ مایا یونہی کبھی کبھی اُدھر [illegible] دیکھ لیتی تھی اور یونہی 'نادانستہ' ہی اُس کی نظر اشوک پر [illegible] کبھی تو اُسے اس طرح اپنی طرف دیکھتا دیکھ کر گھبرا جاتی [illegible] بات سے ڈرتی تھی کہ اسے اس طرح ہر وقت ادھر [illegible] لیکن اُسے شاید اس بات کا بھی کوئی احساس نہ تھا [illegible] تھی کہ ابھی تک محلے کی کسی بڑی بوڑھی نے اس [illegible] مہینے تو ہو گئے تھے، اور دن یونہی گذرتے جا رہے تھے — [illegible] میں جتنے عشق چھتوں پر کئے جاتے ہیں اتنے شاید پیرس [illegible] روم میں بھی نہیں ہوتے۔ شاید اسی لئے اسی لئے اردو شاعری [illegible] بام بہت نظر آتا ہے — اب مایا کو یقین ہونے لگا تھا کہ [illegible] "دیکھنا" نہیں ہے اور اب تو — "میں تم سے محبت کرتا ہوں" [illegible]

اچانک مایا کو دل میں ایک برتری کا سا احساس [illegible] نے لحاف اپنے اوپر سے پھینک دیا، بہت گرم ہو گیا تھا [illegible] جاڑوں کا آخری سانس ہے۔ مایا کے اپنے جسم کی حرارت بھی [illegible] لاشعوری طور پر اُس اظہارِ محبت کی یاد نے اس کے دل میں ایک [illegible] سا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی آنکھوں کے سامنے [illegible] پھر گئے۔ شیلا، سروجنی، للیتا..... اس کے ہونٹوں پر ایک [illegible] آ گئی۔ ان میں سے کسی سے بھی اس طرح محبت کا اظہار نہیں کیا [illegible] اُس کے دل میں شیلا کی چھت پر بل ٹیرین کی پتنگ اٹکنے [illegible] میں ایک حقارت سی پیدا ہو گئی۔ لاشعوری طور پر وہ خود کو [illegible] مقابلے میں تولنے لگی۔ "اونہہ۔ بیوقوف ہے شیلا! اس میں [illegible] کوئی بات ہے کہ ہمیشہ پتنگ ہی اٹکتی رہتی ہے۔" اب وہ [illegible] متعلق سوچ رہی تھی۔ لیکن اس کے شعور کے پس منظر میں [illegible] وہ سوچ تو رہی تھی بل ٹیرین کی اس بیوقوفی کے بارے [illegible] مہینوں گذر گئے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ پتنگ [illegible] لیکن تحت الشعور میں وہ اشوک کا اُس کی ان باتوں سے مقابلہ [illegible] تھی! اس وقت وہ اشوک کو کسی بھی بل ٹیرین سے اچھا سمجھ [illegible] بیچارہ تو اس سے محبت کرتا ہے! اشوک کی وہ باتیں جنہیں [illegible] کبھی کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی، اب اُسے تو معلوم [illegible]

نے اشوک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی، لیکن اس وقت اس نے یہ نہ سوچا تھا کہ اس کا نتیجہ 'میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا' ہوگا۔ ہولی ہو رہی تھی۔ ہولی کے دنوں میں جذبات بھڑکے ہوئے ہوتے ہیں۔ صدیوں کے رُکے ہوئے جنسی جذبات ہولی کے دنوں میں بڑی شدت اختیار کر جاتے ہیں۔ جیسے انہیں تشفی کا ایک راستہ نظر آنے لگتا ہو۔ لڑکیاں لڑکیوں پر رنگ ڈالتے ہوئے بھی ایک قسم کی جنسی تسکین محسوس کرتی ہیں۔ مایا بھی کل بھیگ چکنے کے بعد اس وقت چھت پر دھوپ میں کپڑے سکھا رہی تھی۔ گیلے کپڑے اس کے جسم سے لپٹ گئے تھے، جیسے لپٹ جاتے ہیں۔ اس کی مانگ میں سُرخی بھری ہوئی تھی۔ ہولی کھیلتے ہوئے لڑکیوں نے 'مذاق' میں ایک دوسرے کی مانگیں بھر دی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس سُرخی کو پونچھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اپنی مانگوں کو سُرخ دیکھ کر انہیں ایک قسم کی مسرت سی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ چھت پر ویسے ہی کھڑی تھی، گیلے کپڑے ابھی سوکھے نہ تھے۔ اسی طرح اس کے جسم سے لپٹے ہوئے تھے۔ بچارے، بال پریشان سے تھے، مانگ میں سُرخی تھی۔ نیچے عورتیں اب ہولیاں گا رہی تھیں ——— برندابن کی کنج گلن میں کیسی ہولی کھیلی ——— مایا سوچنے لگی کہ برندابن کی گلیوں میں کرشن نے کیسے ہولی کھیلی ہوگی، اور ایک تصویر سی اس کی آنکھوں کے آگے پھر گئی ——— ایک دو تیز سینکڑوں کرشن گوپیوں سے ہولی کھیل رہے تھے، گوپیوں کے کپڑے جسم سے لپٹ گئے تھے، برندابن کی گلیوں میں چاروں طرف گلال اُڑ رہا تھا، سبز، گلابی۔ کرشن .... اچانک کرشن سامنے کی منڈیر پر نمودار ہو گئے۔ ہاں یہ اشوک ہی تھا۔

نہ مارو پچکاری موہن، بھیگ گئی موری چولی

نیچے عورتیں گا رہی تھیں، نہ مارو پچکاری موہن ——— مایا کی نظر اوپر اٹھ گئی، وہ کیسے غور سے دیکھ رہا تھا ——— بھیگ گئی موری چولی، عورتیں گا رہی تھیں۔ مایا نے آنچل کو سینے پر لپیٹ لیا۔ سُرخی کے دو دھبے اس کے رخساروں پر نمودار ہوئے اور پھیلتے ہوئے کانوں تک چلے گئے۔

بھیگ گئی یہ ساری ساری بھیگ گئی موری چولی

عورتیں گائے جا رہی تھیں۔ مایا کی چھاتیاں دھڑکنے لگیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے ہٹ جانا چاہیئے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے منڈیر پر سے کرشن جی اسے بے حجاب دیکھ رہے ہیں ———

نُدو ٹھ گئی میں تم سے جاؤ، کرو نہ جوڑا جوری

شاید کرشن نے اس کے دل کی بات سمجھ لی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ منہ پھیرنے سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ آج پہلی بار وہ مسکرایا تھا!

میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا!

محبت، محبت، محبت، اس نے پھر کروٹ لے لی لیکن الفاظ آواز بن کر اس کے سامنے ناچنے لگے، محبت، محبت، محبت، خیالات کی وہ گردش جو اس کے ذہن کے گرد جاری تھی تیز تر ہو گئی، دل کی حرکت میں ایک اضطراب سا آگیا۔ جیسے حرارت کی تیزی سے پانی کھولنے لگے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا! محبت کرتا ہوں، محبت کرتا ہوں، محبت کرتا ہوں ———

ٹن!

وہ چونک پڑی، کلاک نے ڈھائی بجایا تھا۔

کلاک کی آواز نے کھولتے ہوئے پانی کو شانت کر دیا۔ دیر تک وہ تھکی سی پڑی رہی۔ ذہن میں ایک کشمکش سی شروع ہو گئی تھی۔ یہ محبت اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ دیر تک یہی سوچتی رہی، عورت محبت کرنے سے پہلے اس کے انجام پر غور کرتی ہے، اور وہ دیر تک، بہت دیر تک اسی کشمکش میں مبتلا رہی۔ ایک طرف یہ ہونے والی محبت تھی، ایک طرف اس کا انجام تھا۔ یہ انجام اس کے ذہن میں صاف نہ تھا، لیکن ایک فطری خوف نے اسے شریک بنا دیا تھا۔ اسے اپنے سامنے دو پگڈنڈیاں نظر آ رہی تھیں، اور وہ یہ فیصلہ نہ کر پا رہی تھی کہ کہیں راستے پر مڑ جائے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، ان الفاظ میں وہ غیر شعوری طور پر یہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس سے بھی محبت چاہتا ہے۔ وہ اسی کشمکش میں تھی کہ کیا وہ خود کو بھی اس محبت کی رَو میں بہ جانے دے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، وہ سوچتی، لیکن یہ محبت کہاں لے جائے گی، اسے خیال آتا اور ایک مبہم سا خوف ——— نہیں نہیں، وہ محسوس کرتی کہ وہ اس سے محبت نہ کر سکے گی۔ لیکن یہ احساس اس کے دل میں الفاظ کی شکل اختیار کرنے نہ پاتا تھا۔ نہیں نہیں، لیکن ——— میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا! یہ الفاظ نہیں، کہ اس احساس خوف کو جو فطری نہیں بلکہ عادتی تھا دبا دیتے تھے۔ یہ الفاظ اپنے سستے پن کے باوجود میٹھے تھے، میٹھے اور حیات بخش، وہ ان کے اثر سے جدا ہونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس سب پر سگریٹ کی بھرائی ہوئی آواز نے ان کی رومانیت کو بڑھا دیا تھا۔ ان الفاظ میں، جو اس سے کہے گئے تھے، وہ ایک لذت سی محسوس کر رہی تھی

انسان کے لئے کسی کا محبوب بننا ایک بہشتی خوشی ہے ہم سب محبت پانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ عورتوں کی یہ خواہش اور بھی شدید ہوتی ہے، میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا! انسان کو اکثر اس آدمی سے محبت ہو جاتی ہے جو اس سے محبت کرتا ہو۔ مایا کے دل میں بے اثری ـــــــ کے اس جذبے کو یہ احساس کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے، آہستہ آہستہ بے جان کرتا جا رہا تھا۔ ان لفظوں کو سوچتے سوچتے اُس کے تحت الشعور میں کہنے والے کے لئے پسندیدگی کا ایک ایسا جذبہ پیدا ہو چکا تھا جو محبت سے بہت قریب تھا! لیکن یہ کشمکش ختم نہ ہوتی تھی ـــ ممکن ہو آخر میں بدنامی ہو، کیا جانے، کسی کو معلوم ہی ہو جائے! وہ محبت کے "رسوا" ہونے سے ڈرتی تھی۔ لیکن محبت ایک میٹھا سا دکھ ہے، ایک شدید جذباتی رَو ہے جس کی جاں بخش اذیت میں کچھ فراموش ہو جاتا ہے، ایک نغمہ ہے جس کی غمگین اور مضطرب لہروں میں بہتا ہوا انسان آپ ہی آپ، خود بخود، حسن اور لذت اور عیش ایک عجیب سی دنیا میں پہونچ جاتا ہے.... محبت کے بارے میں اُس نے بہت کچھ پڑھا تھا، لیکن ـــ تھک کر اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں.... ہولی کھیلنے والی عورتوں کی آوازیں آ رہی تھیں، شیریں قہقہے، چھوٹی چھوٹی چیخیں، پانی گرنے کی آوازیں، میں تم سے محبت کرتا ہوں مایا! اس نے دیکھا کہ اشوک نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا ہے۔ وہ گرفت پھر اُسے اپنے بازوؤں کے گرد محسوس ہونے لگی، سخت، مضبوط، ـــــــ پر جوش۔ اپنے تخیل میں اُس نے اس گرفت سے نکلنے کی کوشش نہ کی، اپنے جسم کو اس نے اُن بازوؤں میں چھوڑ دیا۔ اُس گرفت میں وہ خود کو ایک کھلونا سا محسوس کر رہی تھی۔ یہ کھلونا سا بن جانے کا احساس اُسے اچھا لگ رہا تھا، وہ اس سے محظوظ ہو رہی تھی! یہ گرفت سخت ہوتی گئی، وہ یہ چاہ رہی تھی ـــــــ

کھڑڑڑ کھڑڑڑ

کون؟ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک دم سے اُسے احساس ہوا جیسے وہ ہم آغوشی کی حالت میں دیکھ لی گئی ہو! کوئی نہیں تھا، ہوا کواڑوں کو کھڑکھڑا رہی تھی۔

پھر نیند آنے سے پہلے بہت دیر تک وہ یونہی آنکھیں بند کئے ہوئے سوچتی رہی۔

صبح!

صبح ہولی ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ لڑکیوں نے اپنی مانگوں کی سُرخی ابھی تک پونچھی نہ تھی۔ وہ سہاگ کی اس نشانی کو مٹانا نہ چاہتی ہوں!

مایا کے دل میں آج ایک اُمنگ سی تھی، ایک عجیب سی خوشی، جیسے وہ صدیوں سے کچھ چاہ رہی ہو اور آج اُسے سب کچھ مل گیا ہو، وہ خود کو بڑا سا سمجھ رہی تھی۔ اور اس احساس سے لاشعوری طور پر خوش تھی۔ اس خوشی میں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ گائے ـــ پھر آئے ساجن گھر میرے، پھر آئی ری ہولی ـــ صبح سے وہ بار بار گنگنا رہی تھی، پھر آئے ساجن گھر میرے، پھر آئی ری ہولی۔ گنگنانا جذبات جنسی کا ایک مبہم سا اظہار ہے، پھر آئی ری ہولی۔ ہولی پھر آ گئی تھی۔ دوپہر کو ہولی پھر شروع ہو گئی۔ عورتوں کے گروہ کے گروہ بھیگے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے لگے۔ ایک رونق سی ہو گئی۔ رنگ، گلال، ابیر۔ ہولی کے دن معلوم ہوا کہ اس محلے میں کتنی عورتیں ہیں، مائیں، بہنیں، بیویاں، سب ایک ساتھ گھروں سے باہر آ گئی تھیں، پھر آئی ری ہولی۔ ہر گھر سے نکل کر اُن کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، جس گھر میں وہ جاتی تھیں، وہاں کی عورتیں اُن کے ساتھ مل جاتی تھیں، ہولی، ہولی، ہولی۔

ہولی کھیلنے والیاں مایا کے گھر آ گئیں، بھیگی ہوئی عورتیں پھر بھیگنے لگیں۔ رنگ، رنگ، رنگ، نیلا، پیلا، سرخ۔ عورتیں پھر بھیگ رہی تھیں، ایک دوسری کے گلال مل رہی تھیں، ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں ـــــ نوعمر لڑکیاں ایک دوسری سے گلے کیوں لگ ملتیں؟ وہ سب مل کر باری باری کسی ایک لڑکی کو پکڑ لیتی تھیں، اس کا منہ لال کرتیں، تھپک تھپک کر اس کے جسم پر پانی ڈالتیں، ہنس ہنس کر، مل مل کر اُسے نہلاتی تھیں۔ سرو جنی کے بعد انہوں نے مایا کو پکڑنا چاہا، ہولی کھیلنے والوں کو بھیگنے سے زیادہ بھیگنے سے بچنے میں مزہ آتا ہے اور مایا کا دل اس وقت مسرور تھا۔ دل میں ایک تحریک سی تھی، جی چاہ رہا تھا کہ حرکت کرے! وہ بھاگی، لڑکیاں پکڑنے کو، وہ کمرے میں گھس گئی، جیسے وہ ہولی نہیں کھیلے گی، بھیگے گی بھی نہیں ـــ نہ چھیڑو مجھ کو سکھیوں ری، نہ کھیلوں میں ہولی ـــ لیکن لڑکیاں اُسے پکڑ کر باہر نکال لائیں اور ـــــ

رنگ لاؤ رنگ... پانی... گلال... ارے میری آنکھیں جل گئیں... چلا گیا... خوب نہلاؤ اسے... رنگ ختم!... پانی... جلدی جلدی... کون گری؟... شیلا... بیچاری شیلا....

رنگ!

پانی!

رنگ!

پانی!

ہولی کا شور و غل ختم ہو رہا تھا۔ عورتیں اگلے گھر میں جا رہی تھیں۔ عورتیں اگلے گھر میں چلی گئیں۔ مایا کے کپڑے بالکل بھیگ گئے تھے، چھت کر دھوپ تو ہوگی!

لیکن وہ ابھی کپڑے نہ سکھائے گی! اُس نے سوچا۔ وہ درمیان کی چھت پر سے گزر کر اگلے مکان میں جائے گی۔ وہ ابھی اور بھیگنا چاہتی تھی۔ بھیگنے سے جسم کی حرارت بڑھ گئی تھی! درمیان کی چھت پر سے ......

درمیان کی چھت پر سے گزر کر وہ اگلے مکان میں جا رہی تھی، ایک قدم اور ـــ اور وہ چھت عبور کر لیتی ـــ

"مایا!"

اُس نے گھوم کر دیکھا، اشوک! دل حلق میں آگیا۔ دوسرے لمحے اس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی!

پہلے تو وہ کبھی اس طرح سرخ نہ ہوئی تھی!

"مایا!" اس نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے کہ کل میں نے تمہیں ناراض کر دیا" اس کی آواز بھرّا ہوئی تھی "میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ تمہیں نقصان پہونچاؤں، میں ... میں ..."

مایا کی نظریں زمین پر جھک گئیں!

اُسکے رخساروں پر جھکی ہوئی اُس کی پلکیں کتنی حسین تھیں!

مدھوسودن

دوست سے خطاب

اللہ آنکھ سے نظر آتا نہیں ہے دوست
دل کو جگا کہ دیدۂ دل وا نہیں ہے دوست

مستی میں ہو چکا ہے جو شیطان کا غلام
اللہ اس دماغ کے بس کا نہیں ہے دوست

اللہ کا نہیں ہے تو شیطان کا تو ہے
تیرا دل و دماغ بھی تیرا نہیں ہے دوست

ہوتے ہیں اختیار سے باہر زبان و دل
انساں جب اپنے ہوش میں رہتا نہیں ہے دوست

جب تک نہ ہو دماغ و دلِ آدمی میں جنگ
اس طرح پیچ و تاب وہ کھاتا نہیں ہے دوست

اتنا خراب بادۂ "امروز" ہے کہ آج
تجھکو خیالِ "خطرۂ فردا" نہیں ہے دوست

ناداں ہنسی اڑا نہ "شہیدوں کے خون" کی
حشرِ یزید پیشِ نظر کیا نہیں ہے دوست

بڑھ بڑھ کے کر نہ "رعبِ نبوت" پہ اعتراض
یہ شیطنت خدا کو گوارا نہیں ہے دوست

تو اور ذکرِ "نطقِ رسالت" بہ طنز و طعن
یہ سفلہ پن تو غیر بھی کرتا نہیں ہے دوست

جز اتفاقِ باطل و جز اختلافِ حق
کیا اور کچھ دماغ میں آتا نہیں ہے دوست؟

فرعونِ بے دیار ابوجہلِ بے قریش
تیرے لئے یہ فخر بھی اچھا نہیں ہے دوست

شیطان کی ہے جسے کبھی ابلیس کی ثنا
کیا ہے اگر یہ نفس کا دھوکا نہیں ہے دوست

قدرت کے انتقام کو اپنے وجود میں
تو دیکھتا ہے اور سمجھتا نہیں ہے دوست

ناموسِ حق سے کر نہ تقاضائے انتقام
تیری نظر میں جنگ کا نقشہ نہیں ہے دوست؟

کیا آج نخوتیں متصادم نہیں بہم
کیا آج خونِ دوست کا پیاسا نہیں ہے دوست؟

جب جانتا ہے نخوتِ نمرود کا مآل
پھر کیوں خدا کے قہر سے ڈرتا نہیں ہے دوست

تو ہے خدا کے قہر سے بے فکر و مطمئن
تو نے خدا کا قہر ہی دیکھا نہیں ہے دوست

ہوتا ہے اس کے قہر کا طوفان بے پناہ
آتا ہے جب تو نوح سے رکتا نہیں ہے دوست

مت بھول ناخدا پہ، سفینہ خدا پہ چھوڑ
اس بحر میں ہوا کا بھروسا نہیں ہے دوست

عمرے گزشتہ است کہ عمر از چہل گذشت
پیری میں طفلگی تجھے زیبا نہیں ہے دوست

یوں ہی مٹائی جاتی ہے آوارگی کی شرم
"ناموس و ننگ کی مجھے پروا نہیں ہے" دوست

ہر جرم پیشہ کی یہی ہوتی ہے ذہنیت
"مجھ پر کسی کا زور ہی چلتا نہیں ہے" دوست

لیکن، "اسیر طوق بگردن، رسن بدست"
جز انفعال، غیظ میں آتا نہیں ہے دوست

بے سود ہے فرار کی کوشش کہ آج تک
کوئی گرفتِ جبر سے چھوٹا نہیں ہے دوست

خواہانِ انقلاب یہ اعلانِ انقلاب　　نعرے فلک شگاف لگاتا نہیں ہے دوست
تو اور انقلابِ خطرناک کی مہم　　یہ بزم دورِ ساغر و مینا نہیں ہے دوست
تو اور رزم گاہِ بغاوت میں کشمکش　　خوش فکر شاعروں کا یہ جلسہ نہیں ہے دوست
تو اور کشت و خوں سپے آزادیِ وطن　　میدانِ جنگ کھیل تماشا نہیں ہے دوست
سالارِ قوم، قائدِ ملت، زعیمِ ملک　　بدمستیوں میں وقت گنواتا نہیں ہے دوست
تو جوشِ مے سے ہوش اڑاتا ہے بزم کے　　"اقبال" بن کے ہوش میں لاتا نہیں ہے دوست
ہوجائے ختم مدتِ مہلت نہ جانے کب　　ہنگامِ بد پکار کے آتا نہیں ہے دوست
ممکن ہے اندمال مگر شرط ہے علاج　　تعجیل کر کہ زخم ابھی گہرا نہیں ہے دوست
پرچھائیاں ہیں پردۂ سیمیں پہ مرتعش　　جلوہ نہیں ہے دوست یہ جلوہ نہیں ہے دوست
وادی کے ریگ سے کہیں بجھتی ہے تشنگی　　آگے نہ جا سراب ہے دریا نہیں ہے دوست
جس راستے پہ تجھکو لئے جا رہا ہے نفس　　تیری قسم یہ راستہ سیدھا نہیں ہے دوست

حیرت دکھا رہا ہے تجھے راہِ مستقیم
تو ہے کہ راہِ راست پہ آتا نہیں ہے دوست

حیرت بدایونی؛

چندہ سالانہ چھ روپے
ششماہی تین روپے آٹھ آنے
مع محصول ڈاک۔ فی پرچہ ۱۰ر
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جُرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر
شائع ہوتے ہیں۔ مستقل
خریداروں سے اُن کی
قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

جلد ۲۵ | ساقی دہلی۔ بابت جون سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

کاغذ کی گرانی کا شکوہ سنتے سنتے آپ کے کان پک گئے ہونگے لیکن ؎

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں   مدعائے ضروری الاظہار

اب ایک اور نئی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ یہ کہ ہفتوں مہینوں کاغذ ہی نہیں ملتا۔ کاغذیوں نے اپنی دکانیں محبی کے دل کی طرح صاف کر دی ہیں تاکہ کسی کو کوئی شکایت ہی نہ رہے۔ لیکن اگر اب بھی کوئی چوگنی قیمت پر کاغذ خریدنا چاہے تو اہلِ دل کاغذی ضرورت کو پورا کر دیتے ہیں۔ اس دستِ غیب کی روک تھام اب تک حکومت نہیں کر سکی۔ اب پھر حکومت اور کاغذیوں کی گفت و شنید ہو رہی ہے۔ لیکن یہ کام صرف باتوں سے نہیں طے ہو سکتا۔ اس کے لئے حکومتِ ہند کو سختی سے کام لینا پڑے گا۔ ورنہ ملک کا قیمتی لٹریچر اس نفع بازی کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ اور اس نقصانِ عظیم کی تلافی کبھی بھی نہ ہو سکے گی۔ ساقی کے لئے ہم وقتاً فوقتاً کاغذ خریدتے رہے ہیں اور اس بات کا بالکل لحاظ نہیں کیا کہ کس قیمت پر خرید رہے ہیں۔ جس قیمت پر بھی ملا لے لیا۔ ورنہ نہ کاغذ ملتا اور نہ رسالہ شائع ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ساقی اب تک پابندیٔ وقت کے ساتھ ماہ بماہ شائع ہوتا رہا ہے اور اُمید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح شائع ہوتا رہے گا لیکن جو مالی نقصان اس وقت ادارے کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے اس کی تلافی شاید آئندہ کئی سال میں بھی نہیں ہو سکے گی۔ موجودہ زیر باری کو کچھ کم کرنے کے لئے ہمیں مجبوراً تھوڑا سا اضافہ سالانہ چندے میں کرنا پڑ رہا ہے۔ یعنی بجائے پانچ روپے سالانہ کے یکم جون سے ساقی کا چندہ چھ روپے سالانہ ہوگا۔ اُمید ہے کہ ناظرین و قدردانِ ساقی اس قلیل اضافے کو گوارا فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

ساقی کا آئندہ پرچہ افسانہ نمبر ہوگا۔ ایم۔ اسلم، اوپیندر ناتھ اشک اور جناب امتیاز علی کے افسانے پڑھ کر آپ بے اختیار کہہ اُٹھیں گے کہ ایسے افسانے جس زبان میں لکھے جاتے ہوں وہ زبان دُنیا کی کسی زبان سے پیچھے نہیں رہ سکتی۔ افسوس ہے کہ ہمارے بعض عمدہ افسانہ نگار اب تک اپنے افسانے نہیں بھیج سکے ہیں لیکن اُمید ہے کہ انکے افسانے ساقی کے افسانہ نمبر میں آپ ضرور ملاحظہ فرمائیں گے۔ اسی پرچے میں کسی اور جگہ افسانہ نگاروں کے نام درج کر دئے گئے ہیں۔

تصحیح۔ مئی کے ساقی میں "باتیں" کے گیارھویں پارہ میں اُزیر احمد صاحب کے نام کے بعد بجائے تمنائی کے ارکوئی ہونا چاہئیے۔ ان کا نام جناب اُزیر احمد ارکوئی ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

شاھد

ضروری اطلاع۔

ساقی کا چندہ یکم جون سے بجائے پانچ روپے کے چھ روپے سالانہ اور ۳ روپے ششماہی ہوگا۔

جو مسودے ساقی کے لئے موصول ہوتے ہیں اُنہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاہم اس بارے میں دفترِ ساقی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔

جو مضامین قابلِ اشاعت قرار پائیں گے صرف اُنہیں کے بارے میں مزید مراسلت کی جائے گی۔

مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجنے چاہئیں۔

ساقی ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیجدیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت ۱۵ تاریخ تک کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد دوبارہ پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہ ہوگی۔

جواب طلب امور کے لئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔

باتیں

جو لوگ پاکستان کے خلاف ہیں اور جو لوگ پاکستان کے موافق اور اکھنڈ ہندستان کے خلاف ہیں دونوں کے دلوں میں ایک ہی چور ہے۔ وہ چور یہ ہے کہ یہ معاملہ انگلستان طے کرے۔ فریقین اپنے بل بوتے پر اپنے مطالبے نہیں کر رہے ہیں۔ اگر اپنے بل بوتے پر دونوں فریق بھروسا کرتے تو وہ محسوس کرتے کہ ابھی تو پاکستان یا اکھنڈ ہندستان دھوکا دینے والے الفاظ یا فقرے ہیں۔ پہلے آزادی، مکمل آزادی، پہلے انگلستان کے اس ہلاک کن چنگل سے چھوٹنا ہے جس کی بدولت نو کروڑ مسلمان، تیس کروڑ ہندو اور ایک کروڑ کے قریب اوروں کی زندگی جہنم کی زندگی بن گئی ہے۔ اس کے بعد چاہے اکھنڈ ہندستان بنا چاہے دو، تین یا چار سودیشی جمہوری حکومتیں ہندستان میں قائم ہوئیں ہر حالت موجودہ حالت سے بدرجہا بہتر ہوگی۔ میری رائے میں شری راجگوپال چاری نے جو شگوفہ چھوڑا ہے اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ لوگ چونک پڑے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے اگر یہ ضروری ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں سے کوئی ایسا راضی نامہ یا معاہدہ کر لیا جائے کہ ہم لوگ مل کر آزادی کے لئے لڑیں اور انگریزوں اور جاپانیوں کے حملوں سے آزاد کر کے اس ملک میں جو صوبہ دوسرے صوبوں سے الگ رہ کر حکومت قائم کرنا چاہے تو اس کے لئے دونوں راضی ہوں تو خلوص، محبت اور دیانت داری کے ساتھ ایک معاہدہ کر لینا چاہیئے۔ لیکن یہ پاکستان اُس پاکستان سے زیادہ پاکیزہ اور بابرکت ہوگا جسے جناب جناح انگریزوں کی مدد سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ پاکستان اُس پانی سے سینچ کر قائم کریں گے جس میں ہندو مسلمان دونوں بھائیوں کا خون ملا ہوگا۔ اب مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی پچھلی چوتھائی صدی کی زندگی کا ایک دور ختم ہو رہا ہے۔ ہمیں اب اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ جب انگریزی حکومت کہے کہ یہ تمہارا وطن ہے اس کے لئے کٹ مرو تب ہم اسے اپنا وطن مانیں اور اس کے لئے کٹیں مریں۔ ہم چالیس کروڑ ہندستانیوں کو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اسے اپنا وطن مانیں۔ ہمیں آپس میں سمجھوتہ کر کے وائسرائے کی کونسل میں گھس پڑنا چاہیئے۔ اور جو کچھ بھی اختیارات ملیں انہیں لیکر لاکھوں کی تعداد میں گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ میں پھیل جانا چاہیئے۔ اور اہل وطن کو آزادی کے لئے اور جاپانیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ جب مقابلے کی اسپرٹ پیدا ہوگی اس وقت انگریزی حکومت بھی دھوئیں کی طرح اُڑ جائے گی۔ ہندو مسلمانوں کو اب نئی رہبری کی ضرورت ہے۔ اگر کانگریس اور لیگ کے موجودہ لیڈر یہ نئی رہبری نہ کریں گے تو یہ کام ہندستان کے کمیونسٹ کر دیں گے۔ انہیں کے ہاتھوں ہندو مسلم اتحاد ہوگا۔ اور ہندستان آزاد ہوگا ؎

اُنہیں دھکیا کے بڑھیں قافلے والے آگے		قدم اُٹھتے ہیں غلط قافلہ سرداروں کے		(فراقؔ)

(۲)

کبھی آپ نے اس بات کو بھی سوچا کہ اگر میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، آتشؔ، داغؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ اور ہمارے دوسرے عشقیہ شاعر ڈھائی تین سو برس کی عمریں پاتے اور ان کی صحت، شاعرانہ صلاحیتیں قائم رہتیں تو ان کی وہ شاعری کیسی ہوتی جو وہ لگ بھگ ڈیڑھ سو برس کی عمر میں شروع کرتے۔ اور جو پختہ تر ہوتی جاتی۔ اور اگر ان کے کلام کے مشتاق حضرات بھی ڈیڑھ ڈیڑھ سو برس سے تین تین سو برس کی عمریں پاتے تو وہ کیسی شاعری کا مطالبہ کرتے۔ آج ان شعرا کی سینکڑوں غزلیں اور ہزارہا اشعار جنہیں ہم نشتر سمجھتے ہیں کیا ہمیں اس وقت بدمزہ نہ کر دیتے۔ اگر آپ بھی ایسا محسوس کرتے ہیں تو کیا آپ کو یہ ماننے میں تامل ہے کہ یہ تیر و نشتر کچے لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ شعرا باوجود اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کے کچھ کچے تھے اور چونکہ ہم بھی کچے ہیں اس لئے ان کا عشقیہ کلام ہمیں گھائل کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں اور آپ کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر اہلِ مشاعرہ کے بجائے مہاتما کرشن، مہاتما بدھ، مہاتما زرتشت، مہاتما عیسیٰ، حضرت محمدؐ، اور سنسار بھر کے رشی، منی، مہاتما، فلاسفر، سائنسداں، عالم فاضل، بیر سورما، اور تمام پختہ کار ہستیاں یہ عشقیہ اشعار سنتیں تو ان بے شمار اشعار میں سے جنہیں ہم تیر و نشتر سمجھتے ہیں کے شعر ... ... پر سر سے کیا داد دیتے! جو معنویت یا زندگی کی جن قدروں کی ترجمانی انہیں وجد میں لاتی کیا وہ حقیقت

ترجمانی ان تیروں اور نشتروں میں موجود ہے ! یہ سمجھنا بڑی بھاری خود فریبی ہے کہ جن برگزیدہ ہستیوں کا جس مرتبہ کی ہستیوں کا اوپر ذکر آیا ہے وہ شاعری کی قدر کیا سمجھیں۔ شاعرانہ حقیقت بھی اس کے برعکس ہے۔ وہی شعر بڑا شعر ہے وہی شاعری پُرعظمت شاعری ہے جو ایسی ہستیوں کی پسندیدگی حاصل کر سکے جو ایسی ہستیوں کے ذوق اور وجدان سے ہم آہنگ ہو۔ مثلاً اگر اس عشقیہ شعر ؎

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے　　تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے　　(فانی)

یا اس شعر ؎　جب پرسشِ غم وہ کرتے ہیں کیا جانیئے کیا ہو جاتا ہے　　کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے　　(")

سے یہ عشقیہ شعر ؎

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے　　پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے　　(غالب)

یا یہ شعر ؎　ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں　　(اقبال)

ہمیں نسبتاً زیادہ بلند معلوم ہوتے ہیں تو کیوں؟ اس لئے کہ زندگی، عشقیہ زندگی کے جن مقامات کی طرف غالب کا شعر اور اقبال کا شعر ہمیں لے جاتے ہیں وہ اُن مقامات سے قریب ہیں جہاں مہاتماؤں کی زندگی، دُنیا کے بڑے لوگوں کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ ہم اور آپ ڈیڑھ سو برس تک اگر ترقی کرتے جائیں اور داخلی طور پر پختہ ہوتے جائیں تو غالب اور اقبال کے شعر پر وجد کریں گے لیکن فانی کے مندرجہ بالا دونوں اشعار کے دائرہ اثر سے گذر چکے ہوں گے۔ ورنہ اس میں شک نہیں کہ اپنے حدود میں فانی کے اشعار تغزل کی جان ہیں۔ مگر اسے کیا کیا جائے کہ زندگی میں جس بات، جس حالت، جس کیفیت و تجربہ کو جتنی عظمت حاصل ہے اتنی ہی عظمت اُسے شعر میں بھی حاصل ہو گی نسبتاً ایک کم بڑی بات ایک زیادہ بڑی بات سے شاعری کی دُنیا میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ میں اکثر اپنے طلبا سے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ جو چیز زندگی میں بڑی نہیں اُسے شاعری بڑی نہیں بنا سکتی۔ انگریزی مصنف جارج مور نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بڑا ادب ادبی نہیں ہوتا (Great literature is seldom literary ——) ہم جب عشقیہ یا غیر عشقیہ اشعار سنیں یا پڑھیں تو ہمیں چاہیئے کہ اس کا اندازہ لگائیں کہ اس شعر میں داخلی پختگی کتنی ہے۔ ڈیڑھ سو برس کی عمر کو جانے دیجئے صرف اتنا سوچئے کہ جس شعر کو ہم اتنا چٹپٹا اور رچا ہوا سمجھتے ہیں وہ تیس چالیس برس کے آدمی کے احساسات کا حامل ہے یا ستر پچھتر برس کے پختہ کار دل و دماغ والے انسان کے احساسات کا آئینہ دار ہے۔ رہے ہمارے شعرا سو زیادہ تر وہ اپنے ارتقا کی منزلیں چالیس برس کے ادھر ہی طے کر لیتے ہیں اور بعد کو ماضی کا بوجھ اپنی پیٹھ سے ہلکا نہیں کر سکتے۔ اسی لئے بوڑھے ہو کر یعنی پختہ ہو کر بھی وہ جوان شعر یعنی کچے یا نیم پختہ شعر کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے مشاقی یا کہنہ مشقی بڑی چیز ہوتے ہوتے بھی ایک خطرناک چیز ہے جو شاعر کی ترقی یافتہ زندگی کو اس کی داخلی نشو و نما کو شاعر ہی کے ماضی کے جنگل میں پھنسا دیتی ہے۔ میں نے بیس بائیس برس کی عمر میں یہ شعر کہا تھا ؎

اپنے ہوئے، پرائے ہوئے، پُر جفا ہوئے　　تم دیکھتے ہی دیکھتے اُف کیا سے کیا ہوئے

تقریباً پندرہ برس بعد جب میں اشاعت کے لئے اپنے کلام کی ترتیب دینے لگا تو اس شعر کو دیکھ کر میں کچھ شرمایا۔ اگرچہ میرے اس شعر پر غیر تو کم لیکن سینکڑوں دوسرے لوگ جو اچھے خاصے انسان تھے، بہت کافی سر دھن چکے تھے —— میں نے اب اس شعر کو یوں کر دیا ؎

باقی نہیں ہے اب تمہیں برقِ نگاہِ عشق　　تم دیکھتے ہی دیکھتے اُف کیا سے کیا ہوئے

میرا دوسرا شعر بھی کوئی آیت نہیں ہے لیکن پہلے شعر میں اور دوسرے شعر میں جو فرق ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ دوسرے شعر سے ملتے جلتے میں نے یہ شعر بھی اس واقعے کے کچھ بعد ہی کہے ؎

اپنے جلووں سے بھی برقِ حُسن کو ہے احتراز　　اب نگاہِ شوق کو بھی دُور جانا چاہیئے

نگاہِ اہلِ شوق برقِ حُسن سے بھی بڑھ چلی　　ترے جمال و دید پر بھی اب ترا گماں نہیں

میں تو یہی کہوں گا کہ عمر بھر بہ کمالِ روانی و سلاست و ترنم و حسنِ بیان ایسی شاعری کرتے رہنا جس کے بارے میں اس سے زیادہ ہم نہ محسوس کر سکیں کہ "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا" اپنے بالوں میں نہیں بلکہ اپنے دل و دماغ اور اپنی رُوح میں خضاب لگانے کے برابر ہے۔

کیا عشقیہ شاعری کا کوئی ایسا اہم پہلو ہے جس کی ترجمانی خدائے سخن میر نے نہیں کی۔ اگر ہے تو بتائیے وہ کون پہلو ہے آپ شاید یہ کہیں کہ وہ طربیہ نشاطیہ پہلو ہے۔ بجا، لیکن طربیہ ونشاطیہ اشعار میر کے یہاں بھی کہیں کہیں ملتے ہیں اور وہ اشعار جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مثلاً ؎

بُرقعے کو اٹھائے ہوئے وہ بُت اگر آئے اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے

یا ؎

کیونکہ نقاشِ ازل نے نقش ابرو کے کئے کام تھا اک مُنہ پہ تیرے کھینچنا شمشیر کا

میں جو چیز میر کے یہاں نہیں پاتا یا جہاں تک مجھے یاد آتا ہے جو چیز میر کے یہاں نہیں ہے وہ ہے عشقیہ جذبات کو براہِ راست اور بےکم وکاست ...ُوں طریقے پر بیان کر دینے کے بجائے اُن جذبات کا یا جنسی نفسیات وکیفیات کا تجزیہ وتحلیل۔ میر کی عشقیہ بنیادی اور اساسی (elemental) ...رہے۔ شدتِ احساس، بنیادی ردِعمل، عشقیہ زندگی کے احساسات ومعیار بیان کرنے میں میر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ لیکن داخلی معاملہ بندی، نفسیات ...طریقِ عمل (process) ان کی روِش، تلازمِ خیالات (association of ideas) جذبات کی پیچیدگی، جذبات کا تضاد اور ٹکراؤ ...نفسیاتِ حسن وعشق کی تہیں، ان کے نیم واضح نیم فراموش پہلو، جذبات کے دروبست، حسن وعشق کے کردار کی نیرنگیاں، نفسیاتِ حسن وعشق کے ...ن موقعے اور نازک مقامات! یہ ایک پوری کائنات تھی جس کی خلقت میر کے بعد ہوئی۔ کچھ شعر میر کے مجھے ضرور ایسے یاد آتے ہیں جن میں چند نیم واضح ...باتیں اُجاگر کی گئی ہیں۔ مثلاً ؎

جفائیں دیکھ لیاں کج ادائیاں دیکھیں بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر اُس بیوفا کو راہ پہ لانا ضرور تھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

اُچٹتی ملاقات کب تک رہیگی کبھو دل سے بھی تو مرا یار ہوگا

کیا ہے دیکھو ہو جو ادھر ہر دم اور چتون میں پیار سا ہے کچھ

وجہِ بیگانگی نہیں معلوم تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

اِن اشعار میں نازک باتیں کہی گئی ہیں۔ تحت الشعور، احساسات ماورائی جذبات وتجربے پیش کئے گئے ہیں۔ فطرتِ حسن پر بھی کچھ اشعار ...روشنی پڑتی ہے۔ لیکن میر کا سب سے نمایاں رنگ ایسے اشعار میں ہے جن میں سامنے کی باتیں دو ٹوک انداز میں کہی گئی ہیں۔ مثلاً ؎

جو یوں رات بھر میر روتا رہیگا تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہیگا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہا یہ دل تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

تڑپے ہے جبکہ سینے میں اُچھلے ہے دو دو ہاتھ گر دل یہی ہے میر تو آرام ہوچکا

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر ہے پیارے ہنوز دلی دور

میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے جان ہے تو جہان ہے پیارے

ہاں تو حسن وعشق کی وہ بے شمار نیم واضح کیفیتیں وہ نیم محسوس بلکہ قریب قریب نامحسوس نفسیاتی حقیقتیں میر کے بعد اُردو شاعری میں ظاہر کی ...ب۔ مومن پہلا غزل گو ہے جس نے تغزل کے اس پہلو کو چمکایا۔ دورِ حاضر کی غزل گوئی بھی جذبات نگاری کی بہ نسبت غالباً وقوفِ جذبات، فلسفۂ ...بات، تحلیل وتجزیۂ جذبات کی طرف خاص طور پر مائل رہی ہے۔ ایسے اشعار ؎

پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سُنا نہ گیا اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا (یگانہ)

دکھانا پڑیگا اُسے زخمِ دل اگر تیر اُس کا خطا ہوگیا (حالی)

اُدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری کہ میں نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی (جگر)

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں محبت کا زمانہ آرہا ہے (〃)

مدتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں (راقم الحروف)

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں (〃)

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے ۔۔۔ آج تو کوئی آیا ہوتا (راقم الحروف)

اہلِ دل کو تیرا پیمانِ وفا ۔۔۔ یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں (")

اب چلا ہے مجھ کو سکونِ نامحسوس ۔۔۔ حجابِ دردِ محبت اٹھائے جاتے ہیں (")

یا ایسے اشعار جن میں صرف حسن کی ادائیں حسن کے حرکات و سکنات یا محض شکر و شکایت نہیں ہیں بلکہ حسن کی فطرت و کردار کے نازک رموز بیان کئے گئے ہیں یا ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

حسب منشادلِ پُرشوق کی باتوں کا جواب ۔۔۔ دے دیا شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی نے (سراج لکھنوی)

لبِ جاناں ہیں پھر صرف تبسم ۔۔۔ پناہ اس التفاتِ شادماں سے (حسرت موہانی)

کھلیں نہ حسن کی فطرت کے راز عاشق پر ۔۔۔ برت خلوص بھی، جھوٹی قسم بھی کھائے جا (راقم الحروف)

نگاہِ یار بزمِ ناز میں سشہ دیتی ہے کیا کیا ۔۔۔ تغافل ہائے پیدا سے نوازش ہائے پنہاں کو (")

میرؔ اور میرؔ کے زمانہ کے بعد کہے گئے۔ یہ اشعار ایک نئی آگاہی و فرزانگی کا پتہ دیتے ہیں۔ ایسے اشعار نے اردو تغزل میں رمزیت پیدا کی، حسن و عشق کی کردار نگاری کو خارجی حرکات و سکنات کے بیان سے آگے بڑھا کر اس میں داخلیت و معنویت پیدا کر دی اور اسباب و علل کا ایک داخلی سلسلہ قائم کیا۔ اس طرح ہماری نئی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی۔ لیکن اس قسم کی شاعری میں اغلاق و اہمال پیدا ہو جانے کا بہت ڈر رہتا ہے۔ بہت سے شاعر ایسی باتیں کہنے میں بسا اوقات بہک جاتے ہیں۔ لفظوں اور ترکیبوں کا شاہکار ہونے سے بچنے کے لئے یہاں بھی واقعیت کا دامن مضبوطی سے تھامنا چاہیئے۔

۱۵

میں نے سماجی مسائل پر اپنے طلبا سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بارہا کہا ہے کہ دنیا میں جنگ کا عذاب اُن حکومتوں کی وجہ سے ہے جن میں اہلِ دولت، اہلِ ثروت اور اہلِ حکومت خود اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں کے ساتھ ظلم و بے انصافی برتتے ہیں۔ پہلے ایک حکومت خواہ وہ بظاہر جمہوری ہو ایسا نظام قائم کرتی ہے جو اہلِ حکومت کے ہم نسل و ہم قوم افراد کو مستقل طور پر غریب اور غلام اور دنیا کی برکتوں سے محروم رکھے۔ اس کے بعد دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کو غلام بنانے اور لوٹنے کے لئے جنگ کرتی ہے۔ انگلستان کو لے لیجئے۔ وہاں کی آبادی لگ بھگ چھ کروڑ ہے۔ ہندوستان سے انگلستان کو ہر سال ڈھائی ارب روپوں کا فائدہ ہے۔ لیکن اگر یہ رقم انصاف کے ساتھ تمام انگریزوں میں ہر سال بانٹ دی جائے تو فی کس ہر سال چالیس روپے کے قریب پڑینگے یعنی ساڑھے تین روپے مہینہ ہر انگریز کو ہندوستان سے ملے گا۔ ظاہر ہے کہ ساڑھے تین روپے مہینہ پانے کے لئے کسی قوم کے افراد کسی دوسری قوم کو غلام ہرگز نہیں بنائیں گے اور انگلستان میں تو ساڑھے تین روپے مہینہ کچھ ہوتا ہی نہیں۔ مارکس نے اسی لئے تو کہا تھا کہ دنیا کے مزدوروں کے مفاد میں کوئی تصادم نہیں اور ایک ملک کے مزدور دوسرے ملک کے مزدوروں سے کبھی جنگ کرنا نہیں چاہیں گے۔ ہم پر انگریزوں کا راج نہیں ہے بلکہ کچھ ہزار انگریزوں کا راج اور ظالمانہ راج چھ کروڑ انگریزوں اور چالیس کروڑ ہندستانیوں پر ہے۔ البتہ چھ کروڑ انگریزوں پر جو ظلم ہے وہ اس ظلم سے کم ہے جو ہندوستانیوں پر ہے۔ اس لئے جنگ کے عذاب کا تنہا سبب سرمایہ دارانہ نظام ہے اور یہی نظام ملوکیت یا دوسرے ملکوں کو غلام بنائے رکھنے کا بھی سبب ہے۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان میں بھی نازیت یا فاشیت کا جو نظام ہے وہ اسی نظام اسی طرز حکومت کی بگھری ہوئی تصویر ہے جو انگلستان، امریکہ، فرانس، ہالینڈ اور دنیا بھر میں قائم ہے، سوا روس کے۔ اگر انگلستان کے چھ کروڑ آدمی ایسا نظام قائم کریں جس میں سو فی صدی انگریز مساوی طور پر خوشحال ہوں تو ہندستان کو وہ فوراً آزاد کر دیں گے۔ کیونکہ دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا ملک دنیا کے بڑے سے بڑے ملک کو غلام بنا کر اسے لوٹ کر اکبارگی یا سال بہ سال اتنی دولت نہیں پا سکتا کہ اس چھوٹے سے چھوٹے ملک کا ہر باشندہ یا اس کے آدھے باشندے بھی کوئی خاص فائدہ حاصل کر سکیں۔ یاد رہے کہ جب تک دنیا بھر میں اشتراکی حکومت قائم نہ ہوگی جنگ کے بادل دنیا پر منڈلاتے رہیں گے۔

۱۶

پاکستان اور اکھنڈ ہندستان کے متعلق ایک معرکہ آرا تجویز ہمارے ملک کے فاضل اور جہاں دیدہ بزرگ ڈاکٹر بھگوان داس صاحب نے کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ مسلم لیگ کچھ لوگ کانگرس کچھ لوگ ہندو مہاسبھا اور کچھ لوگ دوسری سیاسی جماعتوں کے کیمپ الگ اور ایک

ایسی مفصّل اسکیم بنائیں جس کو عمل میں لاکر اس مُلک کے سو فی صدی آدمیوں کو زیادہ سے زیادہ خوش حال، تندرست، تعلیم و تربیت یافتہ اور خوش اخلاق بنایا جاسکتا ہو، اور ہندستان کی مختلف قومیتیں اور ملتیں اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کو جائز طور پر فروغ دے سکیں۔ جب ایک ایسی اسکیم یا نظام پر اتفاق ہوجائے گا تو سیاسی پھوڑا بھی پھوٹ جائے گا اور ہماری سیاسی زندگی سے سب فاسد مادّہ نکل جائے گا۔ پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم کیسا پاکستان چاہتے ہیں کیسا اکھنڈ ہندستان چاہتے ہیں، کیسا سوراج چاہتے ہیں۔ سقراط کے وقت سے آج تک دُنیا بربادی اور مصیبتوں کا شکار اس وجہ سے رہی کہ الفاظ کے ٹھوس مفہوم متعین نہیں کئے جاتے تھے۔ اُن کے نتائج نہیں سوچے جاتے تھے ان کے مطالب و مقاصد کی تفصیل و تشریح صاف صاف نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً پاکستان میں بینک یا افراد کے لئے قرض لینے اور دینے کے متعلق، زمینداری کا نظام، جاگیرداری کا نظام رکھنے، مٹانے یا بدلنے کے متعلق، بے روزگاری کے متعلق، امیر اور غریب، مزدور اور سرمایہ دار کے متعلق کیا قانون بنانے جائیں گے۔ کیا محض اسلامی شریعت سے یا محض زکوٰۃ کے قانون سے پاکستان میں رہنے والوں کا دلدر دور ہوسکیگا، کیا خلفاء اور اماموں کے بس کی یہ بات تھی۔ پیغمبروں کی بھی حکومت ہوتی تو کیا اُن کے بس کی بھی یہ بات تھی کہ مشینوں کے ذریعے سے چلنے والے کارخانوں، مشین کے ذریعہ سے ہونے والی زراعت اور سرمایہ داری کی اس جدید خوفناک شکل کو جسے جوائنٹ اسٹاک کمپنی کہا جاتا ہے قائم یا رائج رکھتے ہوئے پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کو (ہندوؤں کو جانے دیجئے) ذلّت، مصیبت اور افلاس کے دلدل سے نکالا جاسکتا ہے۔ اپنی قوم کے ساتھ بے ایمانی اچھی چیز نہیں ہے۔ پاکستان والے اور اکھنڈ ہندستان والے پہلے صاف صاف اس کا اعلان کریں کہ وہ اپنی قوم کے راجاؤں، نوابوں، مہاجنوں، تعلقہ داروں، کارخانوں اور بینکوں کے حصّہ داروں سے کون کون حقوق چھینیں گے اور انہیں چھین کر اپنے ہم مذہبوں کی (غیر مذہب والوں کو جانے دیجئے) جو ٹھوس اور مستقل مدد کریں گے اس کی تفصیل بیان کریں۔ جہاں یہ مطالبہ قوم کی طرف سے کیا گیا سب بھید بھرم کھل جائے گا اور معلوم ہوجائے گا کہ پاکستان کے طرفدار موٹے موٹے راجے مہاراجے بیرسٹر اور نوابوں کے غریب مسلمانوں کے متعلق نہایت ناپاک ارادے ہیں اور اسی طرح ہندو سبھا کے لیڈروں اور بہت سے کانگریس کے لیڈروں کے متعلق یہ بھید کھل جائے گا کہ اکھنڈ ہندستان کے پردے میں غریبوں کے لئے وہ نہایت ناپاک ارادے رکھتے ہیں۔ مجھے تو برناڈ شا کا وہ قول یاد آتا ہے کہ جو شخص اشتراکی نہیں ہے وہ شریف انسان نہیں۔ غریب ہندوؤ اور غریب مسلمانو اپنے لیڈروں سے ہوشیار ——— پہلے اپنے لیڈروں سے نو کروڑ مسلمانوں، تیس کروڑ ہندوؤں اور ایک کروڑ دوسرے مذہب والیوں کی روٹیوں، بے روزگاری، افلاس، تعلیم اور عملی مساوات کے سوالات طے کراؤ۔ پہلے ان معاملات کو حل کرنے کی مفصل اور ٹھوس اسکیم بناؤ، پہلے ایک آئین مرتب کراؤ تب پاکستان اور اکھنڈ ہندستان کا نام لینے دو۔ اس کے پہلے ہرگز نہیں۔

فراق گورکھپوری

شعر و شاعر

شعر و شاعر ایک خاص واقعہ کی یادگار ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ آرٹ اگر پیٹ پوجا کا ذریعہ وحیلہ ہوجاتا تو آرٹ آرٹ نہیں رہتا۔ یہ شعلہ سینا ہے اس شعلے سے روٹی نہیں پکائی جاتی۔ بلکہ اس سے چوب کلیمی اور یدِبیضا پیدا کئے جاتے ہیں۔

(۱)

اندیشۂ تاریک کا انجام ہلاکت ❊ ہے خوب بھی ناخوب بھی اندازِ نظر سے
جس بادِ سحر میں نہیں پیغامِ بہاراں ❊ غنچے کبھی کِھلتے نہیں اس بادِ سحر سے

(۲)

بلبل کا اگر سوزِ جگر ہو نہ چمن میں ❊ محروم رہے صحنِ چمن آتشِ گل سے
ممکن نہیں ہنگامہ بپا بزم میں ہو جائے ❊ رندوں کے اگر جام بھرے جائیں نہ مل سے

(۳)

رنگینیٔ مینا میں نہیں کیف کا جوہر ❊ نشے سے الگ چیز ہے یہ کسوتِ مینا
خلاقِ عصا و یدِبیضا ہے یہ تجلی ❊ چولھے کی امیں آنچ نہیں شعلۂ سینا

(۴)

بے سوز اگر شمع ہو افسردہ ہے محفل ❊ جگنو سے شبستانوں کو روشن نہیں کرتے
سینے سے لگے رہتے ہیں الماس کے ٹکڑے ❊ گھنگرو کی طرح پاؤں میں چھن چھن نہیں کرتے

امین حزیں سیالکوٹی

بے روزگار بوڑھا

آج کل ایک بہت دلچسپ خدمت میرے سپرد ہے یعنی پڑھے لکھے بے روزگاروں کو مشورہ دینا کہ وہ کہاں اور کس طرح روزگار حاصل کریں۔ بنگال میں جتنی اس طرح کے بے روزگاروں کی کثرت ہے اتنی شاید کہیں اور نہ ہو، روز اُمیدواروں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ہر شخص اپنے دُکھ درد کی داستان سُنا کے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ملازمت کا سب سے زیادہ مستحق وہی ہے، اُمیدوار یہ سمجھتا ہے کہ ملازمت کی تقسیم صاحب ہی کے ہاتھ میں ہے، حالانکہ یہاں سوائے "نیک مشورے" کے اللہ کا نام ہے اور بس، باوجودیکہ ہر امیدوار کو مجھے یہ تلخ حقیقت بتانی پڑتی ہے لیکن اُمیدوار ہیں کہ مانتے ہی نہیں، بدستور چلے آتے ہیں ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کی جیتی جاگتی تصویریں بنے ہوئے۔

ایک دن ایک صاحب ملنے آئے، عمر قریب پچاس کے، وضع قطع اور چہرے بشرے سے گذشتہ خوشحالی اور موجودہ افلاس کے آثار نمایاں، کوٹ میلا اور پھٹا ہوا لیکن اچھے کپڑے کا، قمیص بھی کالر کے نیچے رفو کی ہوئی، پھچڑے دار کالر میں ایک ازار بند نما ٹائی بندھی ہوئی، رنگ جھلسا ہوا مگر کسی زمانے میں گورا رہا ہوگا، بال بڑھے ہوئے، ڈاڑھی بھی چار پانچ روز سے استرے کی محتاج، آنکھیں جلتے میں، ان سے ضعف و نقاہت نمایاں جیسے ابھی طویل بیماری اٹھائی ہو، قدم لغزیدہ لغزیدہ نظریں لرزیدہ لرزیدہ۔ میز کے پاس آکے کھڑے ہوگئے، اشارہ پاکے کرسی پر بیٹھ گئے، کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن سانس پھول رہی تھی، ان کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ اپنی جانب خاص توجہ کا مطالبہ کرتی تھی، میں نے ان کی دلجمعی کے لئے بنگلہ زبان[1] میں گفتگو شروع کی، اور کہا: "آپ کی طبیعت شاید اس طرف کچھ خراب تھی؟"

جواب سے پہلے انہیں کھانسی آئی، اس کے بعد کہنے لگے، "جی نہیں، کچھ یوں ہی بخار آگیا تھا، میری بیوی کی طبیعت البتہ خراب ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیماری کو چھپانا چاہتے ہیں اس ڈر سے کہ کہیں اس کی وجہ سے انہیں ملازمت نہ ملے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے کیوں ایسا سوال کیا، لہٰذا میں نے ہمدردانہ طور پر ان کی بیوی کی علالت کے متعلق دریافت کرنا زیادہ مناسب خیال کیا کیونکہ اس میں انہیں دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔

کہنے لگے: "وہ دو برس سے بیمار ہیں، اب اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ علاج کے لئے روپیہ پیسہ نہیں، نوکری کی تلاش میں آیا ہوا ہوں کہ اگر مل جائے تو علاج کروں۔"

میں نے کہا: "مگر آپ کی عمر زیادہ ہے۔ اس عمر میں ملازمت ملنا آسان نہیں۔"

جواب ملا: "ابھی میری عمر پچاس برس کی بھی تو نہیں ہے، ابھی میں اچھی طرح کام کرسکتا ہوں، دس بارہ میل پیدل چل سکتا ہوں، بیس بائیس میل سائکل چلا سکتا ہوں، پلیٹ فارم بھر ریل کے ساتھ ساتھ دوڑ سکتا ہوں، سات آٹھ گھنٹے بیٹھ کے آفس میں کام کرسکتا ہوں۔"

ہر جملے پر کھانسی آآکے یہ کہے جاتی تھی کہ جو یہ کہہ رہے ہیں وہ بات پہلے سچ ہو تو ہو مگر اب نہیں ہے، اگر ان کے لہجہ میں زہرخند کی کیفیت نہ ہوتی تو مجھے ضرور ہنسی آگئی ہوتی، پھر بھی میرے منہ سے نکل گیا: "ہزاروں نوجوان آپ سے زیادہ طاقتور بیٹھے ہیں، انہیں تو ملازمت ملتی نہیں آپ کو کیسے مل جائیگی؟"

میرے اس کہنے نے نشتر کا کام کیا اور پھوڑا پھوٹ نکلا۔ کہنے لگے: "کیا جوانوں ہی کی ضرورتیں ہیں، بڈھوں کی نہیں، اور پھر میں ایسا بڈھا بھی نہیں، میں سچ کہتا ہوں میری ضرورتیں جوانوں سے زیادہ ہیں۔ اس وقت مجھے ملازمت کی ضرورت ان سے کہیں زیادہ ہے، میری بیوی بیمار پڑی ہے، بے دوا درمن، میرے پانچ بچے ہیں، بھوکے پیاسے ننگے، مجھے گھر جاتے ڈر معلوم ہوتا ہے، جب میں ان کی بھوکی آنکھوں کو دیکھتا ہوں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں، وہ منہ سے کچھ نہیں کہتے، میری بیمار بیوی بھی مجھے دیکھ کے اپنے سوکھے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتی ہے مگر ان کا یہ

[1] مجھ انگریزی بولنا کچھ زیادہ مرغوب نہیں مگر ان امیدواروں سے عموماً انگریزی ہی میں بات کرنی پڑتی ہے تاکہ انکی انگریزی کی قابلیت کا اندازہ ہوسکے۔

محسوس کرنا میرے دل پر اور چھریاں چلاتا ہے، اگر وہ مجھ سے تقاضہ کرتے مجھے خالی ہاتھ جاتے پر برا بھلا کہتے تو مجھے اس سے بہت کم تکلیف ہوتی جتنی اب ہوتی ہے۔"

میں خاموش سنتا جا رہا تھا، ادھر مواد تھا کہ اُبلا چلا آتا تھا، کھانسی برابر آ رہی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جھٹکے مواد کو دل کی گہرائیوں سے نکالے لا رہے ہیں۔ میں نے روکنا مناسب نہ سمجھا اور سنتا گیا، کہہ رہے تھے:۔

"میں کسی سے بھیک نہیں مانگ سکتا۔ ایسا کرتے مجھے شرم آتی ہے۔ میں شریف خاندان کا آدمی ہوں، ہم لوگ پہلے بہت خوشحال تھے۔ آج کل کے فلاں وزیر ہمارے گھر پر آ کے گھنٹوں دل بہلایا کرتے تھے، فلاں صاحب میری ماں کو چچی اور میری بیوی کو بھابی پکارتے تھے، اب جب سے تیرے دن آئے ہیں کوئی جھانکتا نہیں، میں سچ کہتا ہوں اب کوئی نہیں آتا۔ اب میرے گھر پر کوئی نہیں آتا، کہیں ملاقات ہو جاتی ہے تو کترانا چاہتا ہے، فلاں وزیر صاحب نے اس دن مجھے ایک تعارفی خط دیا، لکھا تھا میں انہیں پہلے سے جانتا ہوں، یہاں اُنہوں نے دانت پیس کر کہا: دیکھا آپ نے میں جانتا ہوں، ہوں، جانتا ہوں، میں نے مکان سے نکلتے ہی خط پھاڑ کے نالی میں پھینکدیا۔

پہلے میری تندرستی بڑی اچھی تھی، لوگ پہلوان کہا کرتے تھے اور اب آپ بیمار کہتے ہیں، فاقے اور پریشانیوں نے کمزور کر دیا ہے تو بیماری کیسے نہ آئے۔ بعض وقت مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ خالی بیماری ہی آ کے کیوں رہ جاتی ہے موت کیوں نہیں آتی۔"

اب انہیں کھانسی بڑے زور سے آنے لگی، وہ رک رک کے کھانسنے لگے، کھانسنے کے بعد کہا: "آپ کو یہ میری بکواس بری معلوم ہوتی ہوگی مگر کیا کروں کسی سے کہنا چاہتا تھا، آپ ہی سے کہدیا، آپ خود انصاف سے کہیے جوانوں کو یہ سب پریشانیاں کہاں ہوتی ہیں؟ اور اگر ہر چیز جوانوں ہی کے لئے ہے تو پھر بڈھوں کو زہر دلوا دیجئے۔ ہر وقت گھٹ گھٹ کے مرنے سے ایک دفعے مر جانا اچھا ہے۔"

میں نے دل کڑا کر کے کہا: "برا نہ مانئے مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر جوانوں کے نقطہ نظر سے بھی تو دیکھئے۔ اگر وہ چند ملازمتیں جو خالی ہوتی ہیں زیادہ عمر کے لوگوں کو ملا کریں تو جوان کہاں جائیں؟" میں نے ایک دفعہ بڈھے کی جگہ "زیادہ عمر" کا فقرہ استعمال کیا کیونکہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ان کے دل کو بڈھے سے تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے زمانہ گفتگو میں ایک رکھتے ہوئے کہا: "ان میں بہتوں کے ماں باپ بڈھے اپاہج ہونگے جن کا سہارا بیٹے کی کمائی پر ہوگا۔"

کہنے لگے: "تو پھر گورنمنٹ سب کی ضرورتوں کے لحاظ سے نوکری دے۔"

میں نے کہا: "آپ کہتے تو ٹھیک ہیں مگر یہ میرے بس میں نہیں، اور آپ کچھ اُن کا بھی تو خیال کریں جو ملازم رکھنا چاہتے ہیں پہلے اپنی ضرورت کا خیال کرینگے یا دوسروں کی۔ وہ تو یہی چاہیں گے کہ انہیں اپنے روپے کا بہتر سے بہتر معاوضہ ملے یعنی ایسے شخص رکھیں جو سب سے زیادہ اچھا کام کر سکے، ظاہر ہے کہ زیادہ عمر والے جوانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چند خاص خاص جگہوں کے لئے زیادہ عمر کا ہونا مناسب ہو سکتا ہے لیکن عام طور سے نہیں۔"

وہ سن کے تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر کہنے لگے: "لیکن خیال سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا، کہتے شرم آتی ہے، لیکن میں کل سے خالی تین چار دفعہ پانی پیا ہے، ایک دانا نہیں کھایا۔ الا کپڑا لتا، زیور، اسباب بیچ کے کسی نہ کسی طرح اپنا اور گھر والوں کا پیٹ پالتا رہا۔ ایک نقلی سونے کی زنجیر رہ گئی تھی، کل اُسے روپیہ چودہ آنے میں بیچ ڈالا، ایک روپیہ ڈاکٹر کو دیا۔"

میں نے کہا: "ایک روپیہ؟"

کہنے لگے: "جی ہاں، وہ کمپونڈر ڈاکٹر، اب ہماری اوقات بڑے ڈاکٹر کو تو بلانے کی ہے نہیں، کمپونڈر بھی اب دو روپے لینے لگا ہے لیکن مجھ سے ایک ہی لیتا ہے، دس آنے دوا بھی لے، چار آنے بچے تھے۔ تین آنے میں تینوں بچوں کیلئے اور روٹی لادی۔ ایک آنہ وقت بے وقت کے لئے رکھ چھوڑا۔"

یہ کہہ کے اُنہوں نے جیب سے اکنی نکال کے میز پر رکھدی۔ اس اکنی میں اس وقت کچھ ایسی بات معلوم ہوتی تھی کہ ہم دونوں کی نگاہیں اس پر جم گئیں اور دیر تک جمی رہیں۔

میں اس کے بعد تھوڑی دیر سوچتا رہا کہ ان سے کیا کہوں اور کس طرح، بالآخر دل مضبوط کر کے میں نے کہا: "میں آپ کی ایک ایک بات کو سچ سمجھتا ہوں لیکن آپ یقین جانیئے میں بھی مجبور ہوں، کوئی ایسی ملازمت فی الحال نظر نہیں آتی جو میں آپ کو دلا سکوں۔"

کہنے لگے: "تو پھر میرا نام رجسٹر ہی کر لیجئے۔"

میں نے کہا: "بڑی خوشی سے، لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کب تک آپ کو ملازمت مل سکے گی، رجسٹر میں کئی ہزار نام موجود ہیں۔

ابھی تک ملازمت نہیں مل سکی۔"

میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ یہ سن کے خاموش ہوجائیں گے مگر مجھے حیرت سی ہوئی جب انہوں نے کہا "اچھا صبر کر لیجئے۔"

ان کے جانے کے بعد دیر تک "اچھا صبر کر لیجئے" میرے دماغ میں گونجتا رہا۔ اس ایک جملے میں جو امید موہوم کی دنیا جھلک رہی تھی اس کی دلدوزی کو میں بیان نہیں کر سکتا حالانکہ مجھے اپنی قدرتِ بیان پر کچھ کم ناز نہیں، خود بخود یہ شعر زبان پر آگیا ؎

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہے بہت
دوستو، آواز دیتے جاؤ ساحل سے مجھے

اس شعر کا جیسا اس وقت لطف آیا ویسا کبھی نہ آیا تھا۔ میں یہ شعر پڑھتا جاتا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے انسانوں کے سروں کا ایک سیاہ سمندر نظر آتا تھا جس میں کچھ سفید سروں کے بلبلے ڈوبتے نظر آتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اتنا اثر لینے کے بعد میں نے کیا کچھ کوشش نہ کی ہوگی کہ انہیں کہیں کوئی ملازمت مل سکے۔ کلکتہ کی تمام بڑی بڑی کمپنیوں کو لکھا مگر ہر جگہ سے یہی جواب آیا کہ ہم کو اتنی عمر کے آدمی کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم نہیں ان کا کیا حشر ہوا۔ پھر وہ نہ آئے، شاید انکا سفید سر بھی سیاہ سروں کے سمندر میں ڈوب گیا۔

فضل احمد کریم فضلی

نذرِ شاہد

اشاروں سے وعدے کئے جا رہے ہیں
فریبِ محبت دئے جا رہے ہیں

تری خیر ساقی ترے میکدے میں
نگاہوں سے ساغر پئے جا رہے ہیں

طبیعت تو جینے سے گھبرا چکی ہے
مگر وائے قسمت جئے جا رہے ہیں

ترے در کو کعبہ سمجھتی ہے دنیا
ترے در پہ سجدے کئے جا رہے ہیں

کہاں ہم اُٹھے ہیں ترے در سے خالی
تجھے اپنے دل میں لئے جا رہے ہیں

نگاہِ تنفر، نگاہِ عنایت
دئے جا رہے ہیں۔ جئے جا رہے ہیں

یہ ہم ہیں کہ کرتے ہیں کفرانِ نعمت
یہ وہ ہیں کہ سب کچھ دئے جا رہے ہیں

مری منزلِ شوق تو دو قدم ہے
کہاں مجھکو رہبر لئے جا رہے ہیں

کبھی چاک کرتے ہیں بجستہ دامن
کبھی اپنا دامن سئے جا رہے ہیں

بہزاد لکھنوی

چرائی ہوئی ڈائری

آج کی صحبت میں میں آپ کو ایک مشہور اور ترقی پسند افسانہ نگار کی ڈائری کے چند مختلف اوراق سناتا ہوں جس کے افسانے عوام و خواص دونوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ اس روزنامچہ میں بھی اس کے تخیلات اور اس کے اسلوب بیان کی جھلک دیکھ لیں۔

"وہ میرا عزیز ترین دوست ہے۔ میں نے اس کو ہر ہر پہلو سے دیکھا ہے اور میں جانتا ہوں کہ صداقت اس کا اصولِ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں تصنع اور ریاکاری نہیں ہوتی۔ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ اُسے ظاہر کر دینے میں بالکل نہیں جھجکتا چاہے یہ بیان دوسروں کے لئے ہو چاہے خود اپنے لئے! ایک دفعہ اتفاق سے مجھے اُس کی ڈائری نظر پڑی اور میں نے اُسے پڑھنا شروع کر دیا لیکن میں ابھی تھوڑا ہی سا پڑھنے پایا تھا کہ اُس نے یہ کہکر ڈائری میرے ہاتھ سے چھین لی کہ یہ بہت پرائیویٹ ہے"۔ مگر جتنا حصہ میں پڑھ چکا تھا اس سے مجھے بڑی حیرت اور لذت محسوس ہوئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہوگا میں یہ ڈائری ضرور پڑھونگا۔ چنانچہ میں نے پڑھ لیا، اور اب اسے کہیں کہیں سے آپ کو بھی سناتا ہوں۔

ان صفحات میں گوناگوں کیفیات درج ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اس ڈائری میں ایک طرح کا ربط اور تسلسل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جیتی جاگتی ہوئی زندگی کا ایک سادہ و دلکش فلم ہے جس کے مناظر میں تنوع ہونے کے باوجود لچک اور ایک دوسرے میں ضم ہونے کی صلاحیت ہے۔ مزید برآں اس روزنامچے کو پڑھکر ذہن میں اس کے افسانوں کا پس منظر مرتب ہو جاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بعض واردات اُس کے افسانوی کرداروں کو پیش آتی ہیں بسا اوقات وہ خود بھی اُن میں مبتلا ہے۔

تنویر

آج کافی رات گئے روزنامچہ لکھنے بیٹھا ہوں، اور یہ اس لئے کہ بہت دیر تک اپنی بالکنی میں کھڑا ایک رُوح پرور تماشہ دیکھتا رہا۔ میں نشیمن کا رُخ میرے مکان کی پچھلی جانب ہے جہاں تاڑ کے لانبے لانبے دیو آسا درخت آسمان کی آوارہ ہواؤں سے سرگوشیاں کیا کرتے ہیں۔ ان کے قدموں میں سبزۂ خوابیدہ بچھا ہوا ہے، اور اس مختصر سے پُر سحر مرغزار کو دیکھ کر مجھ پر ہمیشہ ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہو جاتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب اس کے شمالی گوشے میں سمندر کی سرکش لہریں اپنے جذبات کے جوش میں اس ننھے سے چمن زار کو آغوش میں لے لینے کے لئے قریب سے قریب تر آجانا چاہتی ہیں۔ اور قریب اور قریب، لیکن نہیں آسکتیں۔ بلکہ صرف ایک تموّج کی شکل بنا کر چند گز کے فاصلے پر مچلتی رہ جاتی ہیں۔ میں حسبِ معمول اس نظارے سے، جو اب میری تنہائیوں کا رفیق اور میری دلبستگی کا اکیلا سامان رہ گیا ہے، سرور حاصل کر رہا تھا کہ میں نے اسٹیج کے (Transfer scene) ٹرانسفر سین کی طرح اس چمن میں ایک اور روپ دیکھا۔ میرے یہودی پڑوسی عزاکیل کی لڑکی نامِ خدا، پندرہ سولہ کا سِن، اپنے ہم جلیسوں کے ساتھ چاندنی رات کا لطف اُٹھانے آئی، اور وہ سب مل کر کوئی ایسا کھیل کھیلنے لگے جو کسی طویل اور قدیم داستان کا ایک محیّر کن ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے وہ کھیل یاد نہیں اور نہ اُن لڑکوں کے چہرے یاد ہیں جن کے ساتھ وہ اپنے حُسن و شباب سے بے خبر، معصوم اور الھڑ، قدم قدم پر فتنے جگاتی بڑی آزادی اور بیباکی سے کھل مل رہی تھی؛ میں صرف اسے دیکھتا رہا اور دیکھتا گیا، گویا تمام کائنات اس ایک نقطے میں سمٹ آئی تھی ـــ

کسی نے اُسے پکارا "ہیلی!" اور میں نے آپ ہی آپ کہا واقعی یہ پھول ہے۔ اس میں سوسن کی مانند نزاکت اور رعنائی ہے۔ لیکن یہ ابھی کھلا ہوا پھول نہیں، بلکہ غنچۂ نو شگفتہ ہے، گُلِ نو بہار! اور جوں جوں میری نظریں اس پر جمتی گئیں، طائر خیال ماضی کے کسی بھولے بسرے آشیانے کی طرف پرواز کرتا گیا اور مجھے اس دوشیزۂ سرمست کے خدوخال میں ایک اور چہرہ نظر آنے لگا جس نے میری حیاتِ گذشتہ کو رنگین بنا دیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ وہ بھولی ہوئی صورت میرے دل و دماغ پر اسقدر مسلّط ہوئی کہ میں مجسّم تمنّا بن گیا "کاش اس تمام عمر، تمام علم اور تمام اثاثے کے بدلے، مجھے پھر کوئی وہی بچپن کے دن دیدے!" مگر نہیں۔ اب یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ بچپن کی

حدود سے نکل کر تو ہم سوسائٹی کے وضع کئے ہوئے قوانین میں جکڑ جاتے ہیں اور ہم کو الگ الگ مضبوط قلعوں میں مقید کر دیا جاتا ہے۔
اس لڑکی نے ناحق دس بارہ سال پہلے کی بات یاد دلادی۔ اب میں کہاں اور وہ بچپن کی شہزادی کہاں؟ وہ تو گویا زندگی کی ندی پر ایک شاداب درخت کا سایہ تھی۔ زندگی بہا کی۔ سایہ جھکولے لیتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ درخت وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ ندی اب بھی بہتی ہے۔ اس کی سطح خالی ہو گئی مگر اس کے سینے میں ایک عکس، ہلکا سا نقش سہی، اب بھی باقی ہے، اسے کون مٹا سکتا ہے؟ میرے دل میں بے اختیار آیا کہ میں اُسے جا کر بتادوں کہ میں وہی ہوں! تم کو تو یاد ہوگا؟ وہ گذری ہوئی دلچسپیاں؟ وہ بیتی ہوئی باتیں؟ لیکن میں اب یہ سب کچھ کیسے کہہ سکتا ہوں؟ اس کی تو شادی ہو گئی ہے۔ انجان اور اجنبی۔ وہ کیوں سنے گی۔ اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ محبوب کو اپنی محبت ضرور ہی جتائی جائے؟ دل کے صنم کدے میں اسکی یاد ہی کیوں نہ محبت کی شمع روشن رکھے!

اور یہ سطور لکھتے لکھتے میرے ذہن میں ایک افسانے کا پلاٹ تیار ہو گیا ہے جس میں مَیں ایک ایسا کردار پیش کرونگا جو اپنی شدید اور انتہائی محبت کا علم اپنی محبوبہ کو نہیں ہونے دیتا، مبادا کہ اس سے اس کو کسی قسم کا نقصان پہونچ جائے۔ وہ اپنے درد کو اپنے ہی دل میں محفوظ رکھتا ہے۔ گویا وہ اپنی محبوبہ کو ایک بیش بہا شے دیدیتا ہے مگر اس کا معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ یہ محبت کا ایک مثالی کردار ہوگا——'

——— ۲ ———

یکم جنوری ———

آج کتاب زندگی کا ایک اور ورق اُلٹ گیا۔ زمانے کی اس کروٹ نے سالِ گذشتہ کو ہمیشہ کے لئے ماضی کی آغوش میں سلادیا اور اب وہ صرف اس لائق رہ گیا ہے کہ ہم اس کا جائزہ لے لیں۔ جو جو کچھ اس دوران میں بیتا ہے اس پر تبصرہ کرلیں۔ اس کے روشن اور اُجلے پہلو پر ذرا خوش ہوں اور تاریک و مغموم رُخ پر اداس۔ لیکن میرے نزدیک پچھلا سال بہت اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی سال میں نے اپنی افسانہ نگاری کا عروج پایا۔ میں نے اس سال دو درجن سے زائد افسانے لکھے اور یہ سمجھنے میں مجھے مطلق غلط فہمی نہیں ہے کہ ان میں سے بعض اس سال کے بہترین افسانے ہیں۔ مجھے ان کے پلاٹ یاد ہیں اور میں ایک نقاد کی طرح جب ان پر تبصرہ کرتا ہوں تو اُن میں جدت، تازگی اور زندگی کی لہر پاتا ہوں۔ میں نے ان افسانوں سے اپنے لئے ایک دنیا بنائی ہے اور میری کتنا ہے کہ میں اسی میں گم رہوں۔ میرا ذہن کردار تخلیق کئے جاتے اور میں انکو کرداروں میں بکھرا رہوں۔

مجھے اپنی افسانوی کامیابیوں اور مبصروں کی داد و تحسین سے جہاں خوشی ہوتی ہے، وہاں لوگوں کے اعتراضات بھی مجھے ایک فکر دیتے ہیں۔ میری تحریروں میں جو جو نقائص نکالے جاتے ہیں میں ان پر سرسری نگاہ ڈالتا ہوا انہیں گذر جاتا بلکہ ان پر غور کرتا ہوں اور ان لوگوں کو اپنا کرمفرما سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

ان دنوں سب سے زیادہ اعتراض یہ ہے کہ میں شوخ چشم ہوں۔ میرے افسانوں میں عریانی بہت ہے اور میں نازک سے نازک موضوعات پر اس قدر آزادی اور بے باکی سے اظہار خیال کرتا ہوں کہ بعض اوقات، اخلاقیات کو مجروح ہونے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ میں نے اس اعتراض پر بہت کافی سوچا، اس لئے نہیں کہ میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں، بلکہ محض اس لئے کہ اگر ادبیات میں سوائے اخلاقیات کے کسی اور چیز کی گنجائش نہیں ہے تو میں لکھنا لکھانا بالکل چھوڑ دوں یا کم از کم لکھنے سے پہلے اپنے خیالات والفاظ پر اخلاقیات کا سنسر بٹھادوں، جس کے معنی یہ ہونگے کہ میری تحریروں میں سے بے ساختگی اور صداقت بالکل مٹ جائے۔ لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ میرے ذہن میں اس اعتراض یا عیب کا (اسے آپ جو جی چاہے کہیں) ایک ہی جواب پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی بصورت استفسار، یعنی "کیا آرٹ کے لئے معلم اخلاق ہونا ضرور ہے؟ کیا آرٹ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اخلاقیات کی قیود سے بالکل آزاد ہوجائے اور پھر بھی آرٹ رہے؟"

——— ۳ ———

۱۸ مارچ ———

کل میں نے اس سلسلے میں کہ "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں" ایک افسانہ نگار کا مضمون پڑھا، جس میں انہوں نے اس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے کہ ان کے افسانے طبع زاد ہوتے ہیں میری طبیعت میں فوراً شرارت ناچنے لگی اور میں نے سوچا، یہ عنوان تو پرانا ہو چکا اس کی بجائے یہ کیسا رہے گا۔

"میں افسانہ کیونکر چُراتا ہوں؟"

اس عنوان پر کتنے ادیب لکھنے کی جرأت کرسکیں گے؟ کتنے لوگ ہیں جو سچ سچ بتادیں کہ انہوں نے اپنے فلاں افسانے کا پلاٹ

[illegible] نے یا اُن معنف سے چرایا ہے چرانے کو جانے دیجئے، ذرا [illegible] تحت ہو جائے گا۔ وہ یہی اقبال کر لیں کہ ان کے زیادہ تر افسانے [illegible] دوسروں کے رہین منت ہیں۔ اور دوسروں کے متعلق سوچتے سوچتے [illegible] اپنے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے اپنے تئیں سے کہا: پہلے تم [illegible] بتا دو! تمہارے کتنے افسانے خود تمہاری اپنی پیداوار ہیں؟ کیا تم کو اقرار [illegible] کہ تمہارے افسانے "بہار و خزاں" کا پلاٹ، جس نے تمہاری شہرت [illegible] چاند لگائے، ایک ایسی کہانی سے ماخوذ ہے جو ایک معمولی رسالے [illegible] ایک معمولی ادیب کے قلم سے شائع ہوئی؟ اور پھر "قفس کی تیلیاں" کے متعلق کیا رائے ہے؟ کیا اس کا بنیادی خیال تم نے ٹیگور کے افسانے سے نہیں لیا؟ ... "غرض اس قسم کے بہت سے خیالات میرے دماغ میں گردش کرنے لگے اور میں اپنے بعض اُن افسانوں کے متعلق جن پر مجھے ناز ہے، تذبذب کے عالم میں رہ گیا کہ کہیں یہ سچ تو نہیں؟

تب میں نے یکایک محسوس کیا کہ یہ سوال محض مذاق اور شرارت کی حد سے نکل کر خاصی سنجیدگی اختیار کر گیا ہے۔ اور اسی روشنی میں جب میں نے اپنے چند افسانوں پر نظر کی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے اپنے تازہ ترین افسانے "وہ فسردہ نگاہیں" کے متعلق سوچتا رہا کہ اس نے میرے ذہن میں جنم کیونکر لیا؟ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کے پلاٹ نے کس طرح نشوونما پائی؟ اور میں بہت کچھ سوچ بچار اور بہت دیر تک غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہونچا کہ انسانی ذہن یقینی ایک خالی تختی ([illegible]) کی مانند ہے جس پر مختلف النوع نقوش، ذاتی تجربے اور مشاہدات کے ساتھ ساتھ اُجاگر ہوتے رہتے ہیں اور ان اثرات کو پروان چڑھانے کے لئے خود انسانی ذہن کو ایک مستور قوت ودیعت کی گئی ہے۔ اسی کے بل پر ہمارے تاثرات ڈھلتے ہیں اور ہم ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔ مستقبل حال میں اور حال ماضی کی گود میں پرورش پاتا ہے! بس اسی طرح افسانہ نگار کسی خاص چیز سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ پچھلے اثرات کی روشنی میں ایک نامکمل سی تصویر کا دھندلا سا خاکہ دیکھنے لگتی ہے۔ اس کا حساس ذہن اس خاکے میں نقوش بھرنے لگتا ہے اور جب افسانہ نگار الفاظ کے ذریعے اپنے مافی الضمیر پوری قدرت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے تو وہ ایک مکمل سراپا، ایک مکمل جسم، ایک منہ سے بولتی تصویر بن جاتی ہے۔ میرا افسانہ "وہ فسردہ نگاہیں" اسی خیال آفرینی اور اثر خیزی کی ایک مثال ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے ایک انگریزی فلم (Queen Christina) دیکھا [illegible] کی آنکھوں پر کیا گیا تھا۔ اور کیمرے نے انہیں اس قدر نمایاں کر دیا تھا کہ وہ میرے نفس تحت الشعور میں محفوظ ہو گئیں۔ اور اب جو سالہا سال گذرنے کے بعد میں نے یہ کہانی لکھی تو ان آنکھوں کو غیر ارادی طور پر اس قدر نمایاں جگہ دی کہ اس کا (climax) ہی ان سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر میرے افسانے کا اس فلم سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا پلاٹ اس سے کہیں اثر پذیر نہیں ہوا۔ اس لئے کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے یہ افسانہ اس فلم سے چرایا ہے۔ ہاں، جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں ایک دیئے سے دوسرا دیا جلتا ہے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا ہے۔

۔۔۔۔۔۔ ۴ ۔۔۔۔۔۔

۱۲ر مئی

دن بھر رحمان علوی کے افسانوں کا نیا مجموعہ پڑھتا رہا۔ ان افسانوں کی خصوصیت جنسی تعلقات کا پُرجوش و رنگین بیان ہے۔ کہیں کہیں مزاح اور طنز بھی نظر آتی ہے۔ مگر یہ کوئی ایسی زبردست خوبیاں نہیں ہیں جن کی وجہ سے ان افسانوں کو اس قدر اچھالا جائے۔ پھر بھی ان اخبارات و رسائل میں ان افسانوں کا چرچا ہے اور علوی کی افسانہ نگاری پر مقالے شائع کئے جا رہے ہیں، لیکن ایسا کیوں ہے؟ کیا ہمارے نقاد ہمیشہ پروپیگنڈے کے زیر اثر رہیں گے؟

مجھے علوی پر رشک آتا ہے کہ اُسے افسانہ نگاری میں وہ جگہ بہت جلد مل گئی جو میں نے اب جا کر حاصل کی ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض افسانہ نگاروں کو عظمت نصیب ہوتی ہے، بعض کو شہرت۔ بعض کو دونوں، اور بعض کو کچھ بھی نہیں۔ گویا یہ بھی اس کی دین ہی ہے جسے چاہے نوازے۔ یا اس کی دین نہیں تو رسائل کے ایڈیٹروں کا کرم ہے جسے چاہیں بڑھائیں۔ علوی کی شہرت اسی لئے روز بروز ترقی پا رہی ہے کہ ایڈیٹروں سے اس کے تعلقات ہیں، جب ہی تو اسکے ہر افسانے کو خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو بڑی شان سے چھاپا جاتا ہے، اور میں حیران ہوں کہ ہمارے دیس میں عظمت اور شہرت بھی دوستی کے سہارے ملتی ہیں۔ لیکن صرف ہندوستان پر یہ الزام شاید زیادتی ہوگی۔ دنیا کے بڑے بڑے تعلیمیافتہ ملکوں میں بھی یہ پروپگنڈا، یہ دوست نوازی، یہ وطن پروری بڑی زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ علوی خوش قسمت ہے کہ وہ اس خطے کا رہنے والا ہے جہاں کے ذرے کو بھی آفتاب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مجھے علوی سے کوئی پرخاش نہیں، بلکہ میں نے اسکے بعض افسانوں کی فراخدلی سے داد دی ہے۔ مگر میں نقاد سے [illegible] کی

افسانہ نگاری کا اشتہار دیا جاتا ہے اس سے خواہ مخواہ چڑ پیدا ہوتی ہے اور سمجھدار قارئین کی نظروں میں ایسے ادیبوں کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ پھر بھی پروپگنڈا کام کرتا ہے۔ زیادہ تر لوگ تو دوسروں کی آرا اور اشتہارات کے مبالغوں ہی سے مرعوب ہوتے ہیں۔ اسی لئے علوی کے افسانوں کو مقبولیت حاصل ہے۔ یا پھر ان افسانوں کی پسندیدگی کی وجہ ان کا موضوع اور طرزِ بیان ہے یعنی جسمانی بھوک اور اس کا ہیجان بپا کرنے والا بیان۔ جب ہی تو ایک سال میں اُنکے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہو گئے۔ اس کے برخلاف اچھے افسانہ نگاروں کے مجموعے بہت کم کتابی صورت میں چھپتے ہیں۔ لیکن ایک زمانہ آئے گا جب پروپگنڈا کا اثر زائل اور تعمیری ادب کی تحقیق اور چھان بین ہوگی۔ کس افسانہ نگار کا نام زندہ رہیگا اور کون کونسے افسانے ہمیشہ تابندہ رہیں گے، یہ فیصلہ مستقبل کے بطن میں محفوظ ہے۔ جب صحیح تنقید نگاری کا رواج ہوگا، جب درحقیقت عمدہ افسانے کی قدر ہوگی تو تاریخ اُن ناموں کا ذکر کرنے سے ہرگز نہیں جھجکے گی جنہیں واقعی آسمانِ ادب پر روشن ستاروں کی طرح جگمگانے کا حق ہے۔

(۵)

۷ ر جولائی

میں نے افسانہ نگاری میں جو نئی راہ اختیار کی ہے، لوگ اس پر متعجب ہیں۔ فانوس کے افسانہ نمبر میں میرا تازہ افسانہ شائع ہوا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب نے چند باتیں بڑی دلچسپ لکھی ہیں:۔ "... ادھر کچھ عرصے سے ہم ان کے افسانوں میں تبدیلی دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاں اب وہ پہلی سی حسن وعشق کی حکایتیں نہیں ہوتیں، بلکہ اب زندگی کی دوسری کیفیات ان کا مرکزِ نگاہ بن گئی ہیں۔ رومان نگاری اب یہ قریب قریب ترک کر چکے ہیں، اسکی بجائے حیات اور اسکی تلخیاں ان کا موضوع بنتی جا رہی ہیں۔"

اسے پڑھکر میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی، کیونکہ جس تبدیلی کی طرف ان سطور میں اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف افسانہ نویسی ہی میں نہیں بلکہ میری زندگی میں بھی واقع ہوئی ہے۔ مجھے بھی احساس ہے کہ میرے تخیلات میں وہ شاعرانہ رنگینیاں نہیں رہیں۔ میرے تصورات میں وہ غزلیاتی ولولے نہیں رہے۔ میری جولانگاہ اب یہاں تو یہی ہے کہ زندگی اور یہی اس کا غیر متناسب نظام ہے۔ لیکن کیوں [illegible]؟

یہ اس لئے کہ وہ میری طالب علمی کے دن تھے۔ کالج کا [illegible] بھی خوش باش اور ہر قسم کی فکروں سے آزاد ہوتا ہے۔ زندگی اور [illegible] تلخیوں کو اُن کے اصل رنگ روپ میں دیکھنے کا مجھے کبھی موقع ہی نہ ملا۔ پھر میرے افسانے ادب برائے ادب کا نمونہ کیوں نہ ہوتے [illegible] میں ادب برائے زندگی کی صلاحیت کیسے پیدا ہوتی؟ اور اب جو آسمان سے زمین پر اُتر آیا، خیالی بستی کی بجائے اسی حقیقی [illegible] سے واسطہ پڑا، جہاں خوشیاں کم اور دُکھ زیادہ ہیں، جہاں آرام کم اور آزار بہت ہیں تو میرے احساسات بھی بدل گئے۔ میرا ذہن نئی تصویریں بنانے لگا اور گذشتہ خاکے، حسن و رومان کے [illegible] نقوش، خود بخود دھندلے ہوتے گئے۔ ممکن ہے ان لوگوں کے لئے جو میرے جذباتی افسانوں کو پڑھکر میرے متعلق کوئی خاص رائے قائم کر چکے ہیں، جو مجھے صرف حسن و محبت کا داستان گو سمجھتے ہیں، میرے افسانوں کے موضوع کی تبدیلی باعثِ تعجب ہو، لیکن میں مجبور ہوں، میرے تخیل کو اب اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ پھر ایک دفعہ ماضی کی طرف لوٹ جائے۔ ایک دفعہ پھر انہی رومانی داستانوں کو دُہرانے لگے۔ اب رُوح سے زیادہ جسم کشمکش میں ہے۔ اسی کے آرام سے رُوح کو بھی سکون ملتا ہے۔ جب تک جسم ابتلا میں رہیگا رُوح کی خلش برقرار رہے گی۔ رُوح سے میرا مطلب وہی احساسات ہیں جو جسم اور جان کے ساتھ ساتھ ہیں، وہ نہیں جو جسم سے غیر متعلق ہے۔

(۶)

۱۳ ر نومبر

آج مجھے ملازم ہوئے پورا ایک سال ہو گیا۔ اس عرصے میں میں گنتی کے چند افسانے لکھ سکا۔ مجھے لکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی، لیکن اس دوران میں میں نے وہ وہ تجربے حاصل کئے ہیں جو تمام عمر یاد رہیں گے کہ ان میں مٹھاس کم اور کڑواہٹ زیادہ ہے۔ ملازمت بھی کیسی بیہودہ چیز ہے؟ انسان تھوڑی سی دولت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ اس کی آزادی، اس کی بےفکری، اس کی حمیت، غرض اس کی ہر وہ شریفانہ خصوصیت جو انسانیت کا تقاضہ ہے، اس سے چھین لی جاتی ہے۔ افسر اور ماتحت کے تعلقات خود اپنی جگہ ایک مستقل باب ہے۔ افسر ہنسے تو ماتحت کو ہنسنا ضروری۔ افسر کسی پہ ناراض ہو تو ماتحت کو اس کی ہاں میں ہاں ملانا لازمی، چاہے وہ جانتا ہو کہ افسر غلطی پر ہے۔ لیکن اس کو ٹوک دینے کی اس میں ہمت [illegible]

کی ۔ اس کی کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ جس قیمت پر بھی ممکن ہو افسروں کی خوشنودی حاصل کرے اور موقع پڑنے پر وہ اپنی حدود سے بھی تجاوز کرجاتا ہے۔ اسکی غیرت اور عزت دھری رہ جاتی ہے۔

چند سال ہوئے میں نے ایک افسانہ لکھا تھا "کلرک" یہ میرے طالب علمی کی یادگار ہے۔ اس افسانے کو آج میں نے خاص طور پر پڑھا، لیکن اس حصے میں جہاں میں نے اس کلرک کی دفتری زندگی بیان کی ہے، مجھے رنگ کچھ پھیکا نظر آیا۔ اسے اور زیادہ گہرا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس پھیکے پن کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت میں روزگار اور نوکری کی پابندیوں سے ناآشنا تھا۔ وہ تمام تاثرات جن پر اس افسانے کا دارومدار ہے میرے ذاتی نہیں تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ملازمت اختیار کرنے کے بعد انسان کس قدر مجبور اور غیر انسان ہو جاتا ہے۔ اور اب سوچتا ہوں کہ یہ افسانہ میں پھر سے لکھوں۔ کسی پابند ملازمت کی زندگی نئے سرے سے بیان کروں اور اسکے پلاٹ کیلئے مجھے دور نہیں جانا پڑیگا۔

۲۴ر دسمبر

آجکل جدید رجحانات اور نئے نئے قسم کے افسانے ہمارے ادبیات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ زبان اور لٹریچر کے حق میں نیک فال ہے۔ لیکن "ترقی پسند" افسانوں کے نام سے جس نوع کا ادب پیش کیا جا رہا ہے اُسے مدِ نظر رکھتے ہوئے کم از کم میں تو "ترقی پسند افسانہ نگار" کہلانا ہرگز گوارا نہیں کروں گا۔ ان افسانوں کا بنیادی خیال محض جنسی تعلقات اور نفسانیت ہے، اور یہ ترقی پسند افسانہ نگار اسی ایک خیال کو پھیر پھیر کر اور طرح طرح کے پلاٹ بنا کر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے ہاں محض نویسی کی حد تک بڑھی ہوئی عریانی کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ عریاں افسانے ہمارے عوام میں قدرتی طور پر مقبول ہوتے ہیں اس لئے یہ سیلاب بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ مگر اس قسم کی چیزوں کو "ترقی پسند ادب" کہہ کر ادب کو کیوں بدنام اور مجروح کیا جائے؟ آخر لٹریچر اور کوکشاستر میں کوئی تو امتیاز ہونا چاہئیے۔ ادب ایک نازک فن ہے اس کی حدود سے ذرا تجاوز کیا اور اس کی پاکیزگی جاتی رہی! لیکن ہمارے نوجوان افسانہ نگار ان نزاکتوں اور التزامات کو نہیں سمجھتے یا سمجھنا نہیں چاہتے۔

مجھے اپنے گذشتہ خیالات یاد آئے تو ہنسی آگئی۔ ایک زمانے میں میں بھی آرٹ برائے آرٹ اور ادب برائے ادب کا حامی تھا، مگر اب یہ رائے بدل چکی ہے۔ بیشک، آرٹ اگر معلمِ اخلاق نہ ہو تو بھی آرٹ رہتا ہے لیکن اگر مخربِ اخلاق ہو تو اس کی قدر یقیناً کم ہو جاتی ہے۔ کم از کم وہ پاکیزہ آرٹ نہیں رہتا جو اس آرٹ سے یقینی بہتر ہوتا ہے جو خیال کو بلندی کے بجائے پستی کی طرف لے جائے۔ ادب کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ہم اس میں عریانی اور جنسی تعلقات کو نازیبا طور پر نمایاں جگہ دیدیں تو یہ ادب کہاں رہے گا؟ اور پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جنسی لٹریچر کی ہمارے ہاں کمی تو نہیں!

"ادبِ جمیل" کے سالنامہ میں ایک افسانہ "رضائی" پڑھا۔ یہ ایک مشہور افسانہ نگار خاتون کے ذہن کی پیداوار ہے اور اس میں جنسیت ایک نئے زاویے سے جلوہ گر ہوئی ہے۔ افسانے کے کیا کہنے! تحریر کا زور لائقِ تحسین، مگر موضوع وہ کہ جسے ادب کے لطیف تصورات برداشت نہیں کر سکتے۔ اور میں حیران ہوں کہ یہ افسانہ ایک عورت کے قلم سے ہے جو ہندوستانی بلکہ خالص مشرقی ہے لیکن محض آرٹ کے دھارے پر وہ کس قدر تیزی سے بہی جا رہی ہے؟ مگر یہ سب کچھ شاید ردِ عمل ہے۔ ہندوستان میں عورت اور اسکے جذبات و احساسات کو ہمیشہ دبا کر رکھا گیا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا اس کو ذرا بھی موقع نہیں ملا۔ عورت اسی کا بدلہ لے رہی ہے اور لیتی رہے گی۔ یہاں تک کہ مرد چیخ اٹھیں گے اور وہ ہنستی رہے گی۔ آخر ایک وقت آئے گا جب عورت کی ہنسی قہقہے میں اور مرد کی چیخ سسکی میں تبدیل ہو جائیگی — اور پھر کچھ نہ ہوگی، بس شاید سناٹا۔

(اس مضمون کا کچھ حصہ بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہو چکا ہے)

صادق الخیری

دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی۔ اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی، بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گڑبڑایا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں۔ اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آئیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں۔ گھر کی مرغی دال برابر والا مضمون، گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں۔ مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا۔ یہ ادب نہیں پھکڑ مذاق، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہونگی۔ یعنی بے پڑھے رائے قائم۔ مجھے خود یقین نہیں آتا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں۔ شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خود ستائی بھی، یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں اور ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون۔یکہ۔ نظر آیا میں اور عصیم پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آ گئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منہ بنانے لگے۔ وہ ایک ہوشیار تھے۔ بولے "لاؤ میں تمہیں سناؤں"

اور یہ کہکر وہ ایک مضمون جو ہمیں سنانے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہو گئی۔ ایک تو ان کے مضمون اور پھر ان کی اپنی ہی زبانی معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔

جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے "تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمون میں کچھ نہیں" اور انہوں نے چھیڑا۔ ہمارے منہ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہو گئی۔

مجھے تو ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی۔ حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے۔ مگر یہاں تو ان کی بہت سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور جب وہ شخص کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا کہ بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز کیسی مسکراہٹ اور کٹتے ہوئے جملے۔ میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی —!

کبھی کہتے: "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو" اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے اس لئے جی جلتا تھا کہ یہ مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہو گئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ اُفوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے ان رلنے والی کتابوں میں۔ ایک ایک لفظ پر انکی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں، وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال، وہ پیلی نیلاہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت ٹوٹے ہوئے ناہموار دانت اور وہ لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ۔ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آ گیا تھا۔ پتلی پتلی کھپچی جیسی ٹانگیں، جن کے سرے پر ورم سے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے کی طرف ہی جایا کرتے تھے۔ اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کپڑوں بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر جنداتی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے۔ نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ خدا قہار و جبار چڑ چڑ کر دمہ اور کھانسی کے عذاب نازل کر رہا ہے اور یہ دل

نہیں چھوڑتا۔ کونسا دُنیا اور دین کا دُکھ تھا جو قدرت نے بچارے کو نہ دیا مگر پھر بھی نہ مٹا سکا۔ اسی دُکھ میں، جلن میں ہنستے ہی نہیں ہنساتے رہنا کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے "زندہ لاش" خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر پُرغبار، بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دُنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر جب ان کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اُٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل! اس میں کتنی جان تھی! مُنہ پر گوشت نام کو نہ تھا مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آجانے سے چہرہ خوبصورت ہوگیا تھا کنپٹیاں بھری بھری تھیں، پچکے ہوئے گال دبیز ہوگئے تھے۔ موت کی سی جلا چہرے پر چھائی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آگئی تھی جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں، جو ذرا ذرا سی بات پر ناچ اُٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر پھٹ اٹھتیں۔ ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہوجاتی اور پلکیں، ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آجاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ خانم پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں، ان میں اتنی جان ہی کب تھی مگر وہ ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے۔ جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا کودتا دوڑتا دیکھتا ہے ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی خانم اس ہیرو کو دیکھ لیتی!

شاید اوروں کے لئے خانم کچھ بھی نہیں لیکن سوائے لکھنے والے کے باقی کے سارے کیرکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھابی جان، نانی اماں، سیٹھانی، والد صاحب، بھتیجے، بھتیجی، بہشتی، یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی، اور اب بھی گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک تفصیل گھر کی سچی تصویر ہے جب خانم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لئے ایکٹنگ کیا کرتے تھے، ہم ہنستے بولتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے ہو بہو اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ خانم کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے جیسے حالات کا گھر روپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں کیا کر رہے ہیں اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش

تصویر کشی میں مشغول ہے۔

کمزور، بیمار روح جس کا پیلا گدڑا روح لطافت میں چھپا ہو۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دُنیا جہان کی شرارتیں کروا لیتا ہے۔ وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا لیکن ہمزاد چھلانگیں مار کر شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک اُنگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا مگر ہمزاد جل کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کا ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کر جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دُنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیے نا جینے کے لئے۔

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے، روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور کہہ کر معاف کر دیتے ہر ایک دلجوئی میں لگا رہتا مگر بیمار کو بیمار کہو تو اُسے خوشی کب ہوگی ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی غصہ بڑھتا۔ مگر بے بس سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انہیں بھی انسان سمجھے انہیں بھی کوئی ڈانٹے انہیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان۔ لیٹے لیٹے کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہوگئی۔ اچھا خاصہ گھر میدان جنگ بن گیا۔ اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہوگئے۔ اور کمزور لاچار ہر دم کا روگی تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا۔ اور کیا چاہیے تھا۔ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہوگئی۔ دُنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا جو صورت سے جی ستانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہوگیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دُنیا انہیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا اُن سے کھنچنا شروع کیا اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو حد ہوگئی معاف کرے اُن کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ [illegible] تم

ے بھائی بہنیں اور بھائی آواز سنکر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں
ن؛ سانپ جنا تھا میں نے !"

مرنے سے پہلے قابل رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان
ہو کہتی ہوں، جی چاہتا تھا جلدی سے مر چکیں۔ آنکھوں میں دم ہے
دل دکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذاب دوزخ بن گئے ہیں۔ ہزاروں
یوں اور افسانوں کا ہیرو ایک ولین بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ
بتا تھا اب بھی کوئی اُسے پیار کرے، بیوی پوجا کرے، بچے محبت
میں بہن واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگائے۔

ماں نے تو واقعی پھر کلیجہ سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر
لگا۔ آخر کو ماں تھی۔ مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک
پھیپھڑے ختم ہو گئے، ورم بڑھ گیا، آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح
لنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا۔ اسکے
لے نفرت، حقارت، کراہت ملی۔ انسان کس قدر پُر ہوس ہوتا ہے۔
شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔
ح چار بجے آج سے ۴۴ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا زندگی
ہنگ کھیل چکا تھا۔ ۲۰ اگست کو صبح چھ بجے شمیم نے آکر کہا: "منّے
ئی ختم ہو رہے ہیں اٹھو"

"وہ کبھی بھی ختم نہ ہونگے ـــــ بیکار مجھے جگا رہے ہو ـــــ"
ےنے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔
"ارے کمبخت تجھے یاد کر رہے ہیں"۔ شمیم نے کچھ پریشان
ڑ بڑایا۔

"اُن سے کہدو آپ حشر کے دن ملیں گے ـــ ارے شمیم وہ
نہیں مر سکتے" میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی، کمرہ سامان
ے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ کتابیں ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا
بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں، دو ننھے بچے پریشان
ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابی اُنہیں زبردستی چائے
رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں۔ سوکھی سوکھی آہیں ایک
ے سے نکل رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

"منّے بھائی!" میں نے اُن پر جھک کر کہا۔ ایک لحظہ کو آنکھیں
ے مجھ پر جم گئیں، ہونٹ سکڑے اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی
سب باہر چلے گئے مجھ ... تھے بے جان ہاتھوں کی جنگ
مجھے ... ہیں پست ہو رہے ہیں، جنگ

تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منّے بھائی" نہ جانے کس نے کہا۔

"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے" مجھے خیال آیا۔

اور آج میں اُن کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں "ناممکن، وہ کبھی نہیں
مر سکتے۔ ناممکن" وہ جئیں گے جب تک ان کا ایک لفظ بھی جی سکتا ہے وہ
نہیں مر سکتے۔ اُن کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرتے سے کہا ہوتا ہے
میرے لئے تو "نہ مر کر جئے!" اور نہ جانے کتنوں کے لئے وہ مر کر پیدا
ہونگے۔ اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان کا پیغام "دکھ سے لڑو
سے لڑو، نفرت سے لڑو ـــ اور مر کر بھی لڑتے رہو" یہ کبھی نہ مر سکے گا۔ انکی پیاسی
روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے، پارسا نہ ہوتے اگر انکی صحت
اچھی ہوتی۔ وہ جھوٹے تھے، اُن کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ
تھی ان کا رونا جھوٹا، ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں، ماں باپ کو دکھ دیا،
بیوی کو دکھ دیا، بچوں کو دکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت
تھے جو عذاب دُنیا بنکر نازل ہوئے تھے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں
ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار تو
ضرور اس دوزخ میں جانا پڑیگا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دُنیا
کی دوزخ میں یوں ہنس ہنسکر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑوے
تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا
چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ لبوں میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں
جسے دیکھکر دوزخ کا داروغہ بھی جل اُٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا، کیڑے اُس کی کھال
کو کھا رہے ہونگے، ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہونگی۔ ملاؤں کے فتووں سے
اُس کی گردن دب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم چیرا جا رہا ہوگا مگر وہ
ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہونگی، نیلے مُردہ ہونٹ کھلی سو
ہل رہے ہونگے مگر کوئی اُسے رُلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی
ہوئی، باہیں انجکشنوں سے گدی ہوئی، کولے میں امرود برابر پھوڑا
آخری دم۔ اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہو گئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے
"یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت اپنا حصہ لینے
آن پہونچیں" یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا۔ دل چاہیئے، پتھر کا کلیجہ
مرتے وقت چٹکلے کہنے کیلئے!

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک لفظ ہو جو یاد رکھا جائے ان
کی پوری کتابیں ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ ...

[illegible] پانی کے سہر وقت چلتا رہتا تھا اور زبان تھی کہ قینچی۔ اسقدر پیے تلے [illegible] تھی کہ جھکر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے اُن کی گاڑی نہیں چلی۔ دُنیا بدل گئی ہے خیالات بدل گئے ہیں۔ ہم لوگ بدزبان ہیں اور مُنہ پھٹ۔ ہم دل دُکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری سوشل ازم اور بیکاری سے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ یہ اپنے پوشیدہ دُکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اُگلتے ہیں۔ وہ بھی دُکھی تھے۔ نادار، بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا مُنہ چڑا دیتے تھے۔ دُکھ میں ٹھٹھے لگا [illegible] تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے۔ زندگی کے ہر معاملہ پر ہنس کر دُکھ کو نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اسقدر شوقین کہ دُنیا کا کوئی انسان ہو اُس سے دوستی۔ "کھرپا بہادر" میں جو شاہِ لنگر آن کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوتے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں باتیں ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں مگر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ اُسی میراثن نے بتایا ہو۔

اور تو اور بھنگن، بہشتی، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں رہے وہاں جب رات کو خاموشی ہو جاتی آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اُڑایا کرتے۔ ہزاروں قصے سنتے اور سناتے، وہی قصے "سوانہ کی روحیں" "ہماری [illegible] خواب" "چمکی" بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے۔ اور زندگی میں سکتے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں بہت سی باتیں بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات پر یقین کرتا تھا۔

اُن کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی۔ خصوصاً [illegible] تو بالکل ردّی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی صورت میں [illegible] کرکے لکھ دیا ہے۔ شریر بیوی تو بالکل فضول ہی مگر اپنے زمانے کی بڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

"چمکی" ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس قدر [illegible] مارا انسان، جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ اُفوہ وہ چمکی کی [illegible] نگاہوں کے پیغام، وہ ہیرو کا اُس کی حرکتوں سے مسحور [illegible] پھر خود مصنف کی زندگی ــــــ کس قدر مکمل جھوٹ۔

یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد ہوتا تھا جو اُن کے جسم سے نکل کر حسن و عشق عیاشیاں کر آتا تھا۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں اپنی بالکل ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پُرانی "گل بکاولی، زہرِ عشق" وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انہیں پُرانی کہہ دیا گیا تھا۔ لیکن اب پھر یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پُرانا سینہ کا اتار چڑھا پنڈلیوں کی گاؤ دمی، رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عر[یانی] سمجھتے تھے۔ اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی اُن کے یہاں عام اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات عریاں دیکھتے تھے مگر خود اُسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے۔

وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ "نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھ[و]ے ہیں اور اوپر سے اُن پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں" اماں کھاتا معلوم ہوتا ہے۔" وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہندوستانی ادب میں ہر زمانے میں جنس بہت نمایاں رہتی ہے۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری مصوری قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبولِ عام نہیں رہ سکتے یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں اُن کا رنگ غائب ہو کر وہی "الف لیلہ" کا رنگ غالب آگیا۔

انہیں حجابِ امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے "یہ عورت بہت پیارا جھوٹ بولتی ہے۔" انہیں شکایت تھی کہ میں بہت ہی اُلٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں۔ میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں اور اُن کے جھوٹ بھوک کی مسکراہٹیں! اللہ جانے اُن کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم اُن کے افسانوں کو عموماً "جھوٹے" کہا کرتے تھے۔ جہاں انہوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسنے "پھر قصر صحرا لگے؟" وہ اُن کی گپوں کو "قصر صحرا" کہتے تھے۔ عظیم بھائی کہتے "سرکار دُنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں؛ بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔"

[illegible] یہ بھی کہتے تھے "جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو قصر صحرا ہے"

اس پر ماموں کہتے "ارے اس زندہ لاش کو منع کرو کہ یہ کفر ہے؟
اس پر وہ ماموں کے تو ہم پرست سسرال والوں کا تمسخر
تے تھے۔

انہیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا لیکن کہتے تھے۔
با کا ہر ڈھونگ ایک مزیدار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزیدار ہے؟
تھے "میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر پجوا دیتا۔
ں دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔ مزے سے آمدنی ہوتی"
انہیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی
کہتے تھے "دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں، عقل چاہیئے ان چیزوں
لئے ــــ"

انہیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا۔ مگر کس ناچ سے؟ یہ جو
نچے آتے ہیں اُن کا۔ عموماً پیسے دیکر دھول میں ناچتے ہوئے فقیروں
شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھکر رشک آتا تھا۔
نے انہیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔
میں نے کبھی انہیں نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر
تھے اور بے ادبی سے اسکے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے
کی تو اس پر کا فقرہ چڑھا کر کہدیا کرتے تھے کچھ نہیں قانونی کتاب ہے۔
تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لئے
عجیب حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔
حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں
لے ٹھکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر
بیتے تھے۔

یزید کے بڑے مداح تھے اور امام حسینؑ کی شان میں ہجو اس
تے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے "میں
اب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؑ کھڑے ہیں، اُدھر سے یزید
آیا، آپ کے پیر پکڑ لئے، گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش
لگا اور اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اس دن سے
عزت شروع کر دی۔ جنت میں تو اُن کا ملاپ بھی ہو گیا پھر ہم
لڑیں ــــ"

سیاست سے کم دلچسپی تھی کہتے تھے "بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے
کہیں، لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کمبخت کھانسی
... سال ہوئے کچھ مضامین ریاست میں
سیاسیات اور اکنومکس پر لکھے تھے وہ نہ جانے کیا ہوئے۔
مذہب کا جنون سا تھا، مگر آخر میں آکر بحث کم کر دی تھی اور
کہتے تھے "بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے ہو، میں مرنے والا ہوں اور مجھ
مجھیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا کرونگا ـــ لہٰذا چپ ہی رہو۔
پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے "یہ پرانی
بات ہوگئی۔ اب پردہ روکے سے نہیں رک سکتا۔ اس معاملے میں ہم
کر چکے ــــ اب تو نئی پریشانیاں ہیں"
لوگ کہتے تھے، دوزخ میں جاؤ گے تو فرماتے تھے "یہاں
کونسی اللہ میاں نے جنت دیدی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔
کچھ پرواہ نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے
تو اُن کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی
ہیں"

کبھی کہتے کہ "اگر دوزخ میں ہے تو ہمارے جراثیم تو مر
جائیں گے، جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لینگے"
یہی وجہ ہے کہ سب انہیں باغی اور دوزخی کہتے ہیں۔
وہ کہیں بھی جائیں میں دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی اُن کی وہی
قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا
رہے ہیں یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں سے
اُلجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں اُن کی کھانسی گونج رہی
ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتہ اُن کے انجکشن گھونپ
رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ہے ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔
دوزخی کا کیا ٹھکانا؟

عصمت چغتائی؛

آم کے ٹوکرے

خزانے کے تمام کلرک جانتے تھے کہ منشی کریم بخش کی رسائی بڑے صاحب تک بھی ہے چنانچہ وہ سب اُس کی عزّت کرتے تھے۔ ہر مہینے اپنی پنشن کے کاغذ بھرنے اور روپیہ لینے کے لئے جب وہ خزانے میں آتا تو اُس کا کام اسی وجہ سے جلد جلد کر دیا جاتا تھا۔ پچاس روپے اس کو اپنی تیس سالہ خدمات کے عوض ہر مہینے سرکار کی طرف سے ملتے تھے۔ ہر مہینے دس دس کے پانچ نوٹ وہ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوتے ہاتھوں سے پکڑتا اور اپنے پرانے وضع کے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیتا۔ چشمے میں سے خزانچی کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھتا اور یہ کہہ کر "اگر زندگی ہوئی تو اگلے مہینے پھر سلام کرنے کے لئے حاضر ہوں گا" بڑے صاحب کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔

آٹھ برس سے اس کا یہی دستور تھا۔ خزانے کے قریب قریب ہر کلرک کو معلوم تھا کہ منشی کریم بخش جو مطالبات خفیفہ کی کچہری میں کبھی سرشتہ دار ہوا کرتا تھا بے حد وضعدار، شریف الطبع اور حلیم آدمی ہے۔ منشی کریم بخش واقعی ان صفات کا مالک تھا۔ کچہری میں اپنی طویل ملازمت کے دوران میں افسران بالا نے ہمیشہ اس کی تعریف کی۔ بعض منصفوں کو تو منشی کریم بخش سے محبت ہو گئی تھی۔ اُنکے خلوص کا ہر شخص قائل تھا۔

اس وقت منشی کریم بخش کی عمر پینسٹھ سے کچھ اُوپر تھی۔ بڑھاپے میں عموماً کم گو اور حلیم ہو جاتا ہے مگر وہ جوانی میں بھی ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ دوسروں کی خدمت کرنے کا شوق اس عمر میں بھی ویسے کا ویسا ہی قائم تھا۔

خزانے کا بڑا افسر منشی کریم بخش کے ایک مربّی اور مہربان جج کا لڑکا تھا۔ جج صاحب کی وفات پر اُسے بہت صدمہ ہوا تھا۔ اب وہ ہر مہینے اُن کے لڑکے کو سلام کرنے کی غرض سے ضرور ملتا تھا۔ اس سے اُسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ منشی کریم بخش اُنہیں چھوٹے جج صاحب کہا کرتا تھا۔

پنشن کے پچاس روپے جیب میں ڈال کر وہ برآمدہ طے کرتا ہوا چق لگے کمرے کے پاس جا کر اپنی آمد کی اطلاع کراتا۔ چھوٹے جج صاحب اس کو زیادہ دیر تک باہر کھڑا نہ رکھتے، فوراً اندر بلا لیتے اور کام چھوڑ کر اُس سے باتیں شروع کر دیتے۔

"تشریف رکھئے منشی جی صاحب ۔۔۔ فرمائیے مزاج کیسا ہے؟"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ۔۔۔ آپ کی دعا سے بڑے مزے میں گذر رہی ہے"

"میرے لائق کوئی خدمت؟"

"آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے۔ خدمت گذاری تو بندے کا کام ہے"

"آپ کی بڑی نوازش ہے"

اس قسم کی رسمی گفتگو کے بعد منشی کریم بخش جج صاحب کی ہم... کا ذکر چھیڑ دیتا۔ ان کے بلند کردار کی وضاحت بڑے فدویانہ انداز میں کرتا اور بار بار کہتا: "اللہ بخشے مرحوم فرشتہ خصلت انسان تھے۔ خدا اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے"

منشی کریم بخش کے لہجے میں خوشامد وغیرہ کی ذرہ بھر ملاوٹ نہ ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا محسوس کر کے کہتا تھا۔ اس کے متعلق جج صاحب کے لڑکے کو جو اب خزانے کے بڑے افسر تھے اچھی طرح معلوم تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اسکو عزّت کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتے تھے اور دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

ہر مہینے، دوسری باتوں کے علاوہ منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا ذکر بھی آتا تھا۔ موسم آنے پر جج صاحب کے لڑکے کی کوٹھی پر آموں کا ایک ٹوکرہ پہونچ جاتا تھا۔ منشی کریم بخش کو خوش کرنے کے لئے وہ ہر مہینے اس کو یاد دہانی کرا دیتے تھے: "منشی صاحب، دیکھئے اس موسم پر آموں کا ٹوکرہ بھیجنا نہ بھولئے گا ۔۔۔ پچھلی بار آپ نے جو آم بھیجے تھے اُس میں سے تو صرف دو میرے حصّے میں آئے۔ کبھی یہ تین ہو جاتے تھے کبھی چار اور کبھی صرف ایک ہی رہ جاتا تھا۔"

منشی کریم بخش یہ سُنکر بہت خوش ہوتا تھا: "حضور ایسا ہو سکتا ہے ۔۔۔ جونہی فصل تیار ہوئی میں فوراً ہی آپ کی خدمت میں ٹوکرہ لے کر حاضر ہو جاؤں گا ۔۔۔ وہ کچھ ...

...ہاں کھی سکتے ہیں؟ ـــ آپ ہی کے تو ہیں۔"

کبھی کبھی چھوٹے جج صاحب پوچھ لیا کرتے تھے: "منشی جی آپکے باغ کہاں ہیں؟"

"دینا نگر میں حضور ـــ زیادہ نہیں ہیں۔ صرف دو ہیں۔ اس میں سے ایک تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو دے رکھا ہے جو ان دونوں کا انتظام وغیرہ کرتا ہے۔"

مئی کی پنشن لینے کے لئے منشی کریم بخش جون کی دوسری تاریخ کو خزانے گیا، دس دس کے پانچ نوٹ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر اس نے چھوٹے جج صاحب کے کمرے کا رخ کیا۔ حسب معمول ان دونوں میں وہی رسمی باتیں ہوئیں۔ آخر میں آموں کا ذکر بھی آیا جس پر منشی کریم بخش نے کہا: "دینا نگر سے چٹھی آئی ہے کہ ابھی آموں کے منہ پر چیپ نہیں آیا جونہی چیپ آگیا اور فصل پک کر تیار ہوگئی میں فوراً پہلا ٹوکرہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا ـــ چھوٹے جج صاحب اس دفعہ ایسے عمدہ آم ہونگے کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ طلائی اور شہد کے گھونٹ نہ ہوئے تو میرا ذمہ۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ چھوٹے جج صاحب کے لئے ایک ٹوکرہ خاص طور پر بھروا دیا جائے اور سواری گاڑی سے بھیجا جائے تاکہ جلدی اور احتیاط سے پہونچے۔ دس پندرہ روز آپ کو اور انتظار کرنا پڑیگا۔"

چھوٹے جج صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ منشی کریم بخش نے اپنی چھتری اٹھائی اور خوش خوش گھر واپس آگیا۔

گھر میں اس کی بیوی اور بڑی لڑکی تھی۔ بیاہ کے دوسرے سال ہی جس کا خاوند مر گیا تھا۔ منشی کریم بخش کی اور کوئی اولاد نہیں تھی اس مختصر سے کنبے کے باوجود پچاس روپوؤں میں اس کا گذر بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ اسی تنگی کے باعث اس کی بیوی کے تمام زیورات دو برسوں میں آہستہ آہستہ بک گئے تھے۔

منشی کریم بخش فضول خرچ نہیں تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی دونوں بڑے کفایت شعار تھے مگر اس کفایت شعاری کے باوصف ماہانہ خرچ سے ایک پیسہ بھی ان کے پاس نہیں بچتا تھا۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ منشی کریم بخش چند آدمیوں کی خدمت کرنے میں بے حد مسرت محسوس کرتا تھا۔ ان چند خاص الخاص آدمیوں کی خدمت گذاری سے اسے [illegible] عقیدت تھی۔

[illegible] میں سے ایک تو جج صاحب کے لڑکے تھے، دوسرے ایک اور افسر تھے جو ریٹائر ہو کر اپنی زندگی کا بقایا حصہ ایک بہت بڑی کوٹھی میں گذار رہے تھے۔ ان سے منشی کریم بخش کی ملاقات ہر روز صبح سویرے کمپنی باغ میں ہوتی تھی۔

باغ کی سیر کے دوران میں منشی کریم بخش ان سے پہلے [illegible] دن کی خبریں سنتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ چلتے ہوئے دلوں کے تار چھیڑ دیتا تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنی بہادری کے قصے سنانے شروع کر دیتے تھے کہ کس طرح انہوں نے لائل پور کے جنگل علاقے میں ایک خونخوار قاتل کو پستول، خنجر دکھائے بغیر گرفتار کیا اور کس طرح ان کے رعب سے ایک ڈاکو سارا مال چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کبھی کبھی منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا بھی ذکر آجاتا تھا۔ "منشی صاحب کہیئے ابکی دفعہ فصل کیسی رہے گی؟"

"ڈپٹی صاحب پچھلی دفعہ چونکہ آم بہت ہوتے ہیں اس لئے یہ فصل کچھ کمزور ہی رہے گی۔"

"پچھلے سال آپ نے جو آم بھجوائے تھے بہت ہی اچھے تھے ـــ بے حد لذیذ تھے۔"

"انشاءاللہ، خدا کے حکم سے ابکی دفعہ بھی ایسے ہی آم حاضر کروں گا ـــ ایک ہی بوٹے کے ہونگے۔ ویسے ہی لذیذ، بلکہ پہلے سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہونگے۔"

اس آدمی کو بھی منشی کریم بخش ہر سال موسم پر ایک ٹوکرہ بھیجتا تھا۔ کوٹھی میں ٹوکرہ نوکروں کے حوالے کر کے جب وہ ڈپٹی صاحب سے ملتا اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تو منشی کریم بخش نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے کہتا: "ڈپٹی صاحب آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں ـــ اپنے باغ ہیں۔ اگر ایک ٹوکرہ یہاں لے آیا تو کیا ہوگیا۔ بازار سے آپ ایک چھوڑ کئی ٹوکرے منگوا سکتے ہیں ـــ یہ آم چونکہ اپنے باغ کے ہیں اور باغ میں صرف ایک بوٹا ہے جس کے سب دانے [illegible] خوشبو اور مٹھاس میں ایک جیسے ہیں اس لئے یہ چند تحفے کے طور پر لے آیا۔"

آم دینے کے بعد جب وہ کوٹھی سے باہر نکلتا تو اس کے چہرے پر تمتماہٹ ہوتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی روحانی تسکین اسے محسوس ہوتی تھی جو کئی دنوں تک اسکو مسرور رکھتی تھی۔

منشی کریم بخش اکہرے جسم کا آدمی تھا۔ بڑھاپے نے اس کے [illegible] کو ڈھیلا کر دیا تھا مگر یہ ڈھیلا پن بصورت [illegible] کے پتلے ہاتھوں کی ہتھیلی ہوئی رگیں [illegible]

چہرے کی گہری لکیریں اُس کی متانت و سنجیدگی میں اضافہ کرتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے اس کو نکھار دیا ہے۔ کپڑے بھی وہ صاف ستھرے پہنتا تھا جن سے یہ نکھار اُبھر آتا تھا۔

اُس کے چہرے کا رنگ سفیدی مائل زرد تھا۔ پتلے پتلے ہونٹ دانت نکل جانے کے باعث اندر کی طرف سمٹے رہتے تھے ہلکے سرخ تھے خون کی اس کمی کے باعث اس کے چہرے پر ایسی صفائی پیدا ہو گئی تھی جو اچھی طرح منہ دھونے کے بعد تھوڑی دیر تک قائم رہا کرتی ہے۔

وہ کمزور ضرور تھا۔ پینسٹھ برس کی عمر میں کون کمزور نہیں ہو جاتا مگر اس کمزوری کے باوجود اس میں کئی کئی میل پیدل چلنے کی ہمت تھی۔ خاص طور پر جب آموں کا موسم آتا تو وہ ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو آموں کے ٹوکرے بھیجنے کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ بیس پچیس برس کے جوان آدمی بھی کیا کریں گے۔ بڑے اہتمام سے ٹوکرے کھولے جاتے تھے۔ اُن کا گھاس پھوس الگ کیا جاتا تھا۔ داغی یا گلے سڑے والے الگ کئے جاتے تھے اور صاف ستھرے آم نئے ٹوکروں میں گن گن کر ڈالے جاتے تھے۔ منشی کریم بخش ایک بار پھر اپنا اطمینان کرنے کی خاطر ان کو گن لیتا تھا تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔

آم نکالتے اور ٹوکروں میں ڈالتے وقت منشی کریم بخش کی بہن اور اس کی بیوی کے منہ میں پانی بھر آتا مگر وہ دونوں خاموش رہتیں۔ بڑے بڑے رس بھرے خوبصورت آموں کا ڈھیر دیکھ کر جب ان میں سے کوئی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتی: "کیا ہرج ہے اگر اس ٹوکرے میں دو دو آم نکال لئے جائیں" تو منشی کریم بخش سے یہ جواب ملتا "اور آ جائیں گے۔ اتنا بیتاب ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

یہ سنکر وہ دونوں چپ ہو جاتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔

جب منشی کریم بخش کے گھر میں آموں کے ٹوکرے آتے تھے تو گلی کے سارے آدمیوں کو اس کی خبر لگ جاتی تھی۔ عبداللہ بیچے بند کا لڑکا جو کبوتر پالنے کا شوقین تھا دوسرے روز ہی آ دھمکتا تھا اور منشی کریم بخش کی بیوی سے کہتا تھا: "خالہ، میں گھاس لینے کے لئے آیا ہوں کل خالو جان آموں کے دو ٹوکرے لائے تھے۔ آن میں جتنی گھاس نکلی ہو مجھے دیدیجئے۔"

ہمسائی گوراں جس نے کئی مرغیاں پال رکھی تھیں، اسی وز ... آجاتی تھی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا کرتی

تھی: "پچھلے برس جو تم نے مجھے ایک ٹوکرہ دیا تھا بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ اگر ابکے بھی ایک ٹوکرا دیدو تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

دونوں ٹوکرے اور ان کی گھاس یوں چلی جاتی تھی۔

حسب معمول اس دفعہ بھی آموں کے دو ٹوکرے ... سڑے والے الگ کئے گئے۔ جو اچھے تھے اُن کو منشی کریم بخش نے اپنی نگرانی میں گنوا کر نئے ٹوکروں میں رکھوایا۔ بارہ بجے سے پہلے یہ کام ختم ہو گیا۔ چنانچہ دونوں ٹوکرے غسل خانے میں ... جگہ رکھدیے گئے تاکہ آم خراب نہ ہو جائیں۔

ادھر سے مطمئن ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ... بخش کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔

جون کے آخری دن تھے۔ اس قدر گرمی تھی کہ دیوار ... کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہ گرمیوں کے موسم میں عام طور ... کے اندر ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹا کرتا تھا۔ یہاں ... رستے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آ جاتی تھی لیکن اب کہ اس ... بڑے بڑے ٹوکرے پڑے تھے، اس کو گرم کمرے ہی میں جو تنور بنا ہوا تھا چھ بجے تک وقت گذارنا تھا۔

ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب آموں کے یہ ٹوکرے آتے اُسے ایک دن آگ کے بستر پر گذارنا پڑتا تھا مگر وہ تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ قریباً پانچ ... تک چھوٹا سا پنکھا بار بار پانی میں تر کر کے جھلتا رہتا۔ انتہا ... کرتا کہ نیند آ جائے مگر ایک پل کے لئے بھی اُسے آرام نصیب ... جون کی گرمی اور ضدی قسم کی مکھیاں کسے سونے دیتی ہیں۔

آموں کے ٹوکرے غسلخانے میں رکھوا کر جب وہ کمرے میں لیٹا تو پنکھا جھلتے جھلتے ایک دم اس کا سر چکرایا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سانس اکھڑ رہا ہے اور وہ سارے کا سارا گہرائیوں میں ... اس قسم کے دورے اُسے کئی بار پڑ چکے تھے اس لئے کہ اس کا دل ... تھا، مگر ایسا زبردست دورہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ سانس لینا اس کو بڑی دقت محسوس ہونے لگی، سر بہت زور سے چکرا... گھبرا کر اُس نے آواز دی اور اپنی بیوی کو بلایا۔

یہ آواز سُنکر اس کی بیوی اور بہن دونوں دوڑی دوڑی آئیں۔ دونوں جانتی تھیں کہ اُسے اس قسم کے دورے پہلے بھی ... فوراً ہی اس کی بہن نے عبداللہ بیچے بند کے لڑکے کو بلایا ...

اک ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہے ڈاکٹر کی حالت کی تشویش لگا رہے۔ لیکن چند لمحوں
میں منشی کریم بخش کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا دل ڈوبنے
لگا بیقراری کا اس قدر بڑھ گئی کہ وہ چارپائی پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔
اس کی بیوی اور بہن نے یہ دیکھ کر شور برپا کر دیا جس کے باعث
آس پاس کے کئی آدمی جمع ہو گئے۔

بہت کوشش کی گئی کہ اس کی حالت ٹھیک ہو جائے لیکن
کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے تین چار آدمی دوڑائے
گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی واپس آئے منشی
کریم بخش اپنی زندگی کے آخری سانس لینے لگا۔ بڑی مشکل سے کروٹ
بدل کر اس نے عبداللہ نیچہ بند کو جو اس کے پاس ہی بیٹھا تھا اپنی
طرف متوجہ کیا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "تم سب لوگ باہر چلے
جاؤ میں اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

سب لوگ باہر چلے گئے۔ اس کی بیوی اور لڑکی دونوں اندر
داخل ہوئیں، رو رو کر ان کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ منشی کریم بخش نے اشارے
سے اپنی بیوی کو پاس بلایا اور کہا: "دونوں ٹوکرے آج شام ہی کو ڈپٹی
صاحب اور چھوٹے جج صاحب کی کوٹھی پر ضرور پہنچ جانے چاہئیں۔
پڑے پڑے خراب ہو جائیں گے۔" ادھر ادھر دیکھ کر پھر اس نے
دھیمے دھیمے لہجے میں کہا: "دیکھو تمہیں میری قسم ہے۔ میری موت کے
بعد بھی کسی کو آموں کا راز معلوم نہ ہو۔ کسی سے نہ کہنا کہ یہ آم ہم بازار
سے خرید کر لوگوں کو بھیجتے تھے۔ کوئی پوچھے تو یہی کہنا کہ دیناپور میں
ہمارے باغ ہیں..... بس..... اور دیکھو جب میں مر جاؤں
چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی صاحب کو ضرور اطلاع بھیج دینا۔"

چند لمحات کے بعد منشی کریم بخش مر گیا۔ اس کی موت سے
ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو لوگوں نے مطلع کر دیا۔ مگر
وہ دونوں چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل
نہ ہو سکے۔

سعادت حسن منٹو!

ایتلافات خیال

غمکدے میں آج مہماں آ گئی
وہ بھی کیا دن تھے کہ جب زندگی
ہر نفس ہو موت ہر دم ہو حیات
ماہ لیکن زندگی کا تاج ہے!
چاند کی اس مسکراہٹ کی قسم
بات کہنے کی نہیں پر کیا کریں!
بزم ہائے تہنیت کے واسطے
تاکہ محفل میں ہنسیں خوددار ہنسائیں
میری مدہوشی پہ کوئی ہنس پڑا؟
نغمۂ جانسوز کا یہ زیر و بم!
نقرئی خوابوں کی اک کاں ہو یہ
بس گئیں نغموں سے دل کی بستیاں

نغمۂ شاہد کے وصف [illegible]
رکھتی تھی ہم سے بھی عہد [illegible]
چاند سے ہو چاندنی کی [illegible]
زندگی پر چاندنی کا راج ہے
خود بخود آنکھیں ہوئی جاتی ہیں نم
کچھ تراشے قہقہوں کے جمع ہیں!
ان تراشوں ہی کو جس [illegible]
اور اس غمگین دنیا کو بھلائیں!
ہمنشیں! نغموں کا اک طوفاں اٹھا!
نیش زن ہو مثل مژگاں ستم
نغمہ ہے یا آتش خنداں ہے یہ!
اللہ ہی وارہ فضا میں مستیاں

نغمۂ شاہد ہے یا برق تپاں
اٹھ رہا ہے دل کی دنیا سے دھواں
اٹھ رہا ہے دل کی دنیا سے دھواں

زندگی اک دود کش بن جائے گی
اکثر انساں گوشت کے ہیں لوتھڑے
مصر کے اہرام ان کے شاہکار!
آہ! تاریکوں کو نیند آتی نہیں!

قبر پر انساں کی لگ جائے آگ!
مخمل و کمخواب میں لپٹے ہوئے!
سو رہے ہیں جن میں اگلے تاجدار
موت دروازے پہ چلاتی نہیں!!

ہو رہا ہے بند دروازہ کہیں!
ہو رہا ہے بند دروازہ کہیں!!
ہو رہا ہے بند دروازہ کہیں!!
تم میں کوئی کھولنے والا نہیں؟

عرش تیموری

جب تہذیب جنم لے رہی تھی

انگریزی میں ایک کہاوت ہے جس کا ترجمہ ہے: جب آدم پھاوڑا چلاتے اور حوا چرخہ چلاتی تھیں اس وقت شریف کون تھا؟ یہاں ہمیں اس سے تو بحث کرنی نہیں کہ شرافت کا لفظ کب شرمندہ معنی ہوا یا کبھی ہوا بھی کہ نہیں اور نہ اس امر کی تصدیق آسان ہے کہ ابوالبشر نے پھاوڑا چلایا یا کاتنا اور بُننا اُمّ البشر کا مشغلہ تھا۔ البتہ پتا ہے دُنیا کی پہلی عورت کو یہ فن معلوم رہا ہو یا نہیں اس کی پوتیوں پڑپوتیوں کی تحقیق و تجسس نے ضرور اس فن کی تخلیق کی کیونکہ بُننا ایک ایسی پرانی ایجاد ہے جس کی ابتدا نہ کسی کو معلوم ہے اور نہ کوئی اس کے جاننے کی فکر ہی کرتا ہے۔

اتر میں رہنے والوں کا جانوروں کے بال اور سمور سے پوشاک تیار کرنا تو بہت بعد کی چیز ہے۔ اس سے کہیں پہلے دکھن میں بسنے والی عورتیں خس وخاشاک اور پتوں کو بُن کر ایسی ٹوکریاں بنانا جانتی تھیں جن میں دونوں ہاتھوں سے زائد چیزیں سما سکتی تھیں۔ انہیں اپنے غاروں اور جھونپڑوں کی سخت اور نرم زمین پر بچھانے کے لئے چٹائیاں بنانا بھی آتا تھا اور غالباً اپنا تن ڈھانکنے کے لئے خس وخاشاک کو بُن کر پوشاک بنا لیا کرتی تھیں۔ دُنیا ابھی بچی تھی جب عدن کے پورب (غالباً ہندوستان یا چین) میں ایک شخص جبل ([illegible]) نامی گلہ بانوں کا سردار تھا۔ اس کی ماں اڈہ ([illegible]) اور بیوی اور بیٹی پتے اور چھال کی چٹائیاں اور خیمے بنانے میں بہت مشاق تھیں۔ انہوں نے ڈوریاں بٹنا ایجاد کیا اور ان سے چٹائیوں کو ٹانکنا اور خیمے کے سروں کو باندھنا رائج کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جس میں تہذیب انسانی کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی اور تب ہی سے عورت نے لباس و غذا کی طرف توجہ کی اور اپنے ناقص عقل سے ایسے فنون کی تخلیق کی جو بعد میں اس کا طرۂ امتیاز بن گئے۔ کاتنا بُننا اور رنگنا جیسے حسین فن اسی کے ذوق لطیف اور دست نازک کے رہین منت ہیں۔ وہ ایک عورت ہی تھی جس نے سَن کے پیڑ سے پہلے پہل ریشہ نکال کر دھاگا بٹا۔ سردی کے زمانہ میں اونچی اونچی پہاڑیوں پر بھیڑیں [illegible] اون نوچ کر اپنے شیرخوار بچے کے لئے لباس تیار کرنے کی ابتدا ایک عورت ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ سَن اور اون کے لمبے دھاگے بٹنے کی کوشش میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ایک لکڑی پر رکھ کر اُسے گول پھرانا شروع کیا اور پھر ایک سرا پکڑ کر کھینچا تو مضبوط بٹا ہوا دھاگا نکلنے لگا۔ اس طرح تکلے کی ایجاد بھی ایک عورت ہی کے جذبۂ تجسس کی مرہون منت ہے۔ یہ تکلا پہلے ہاتھ سے پھر چرخے سے گھمایا جانے لگا۔ صنف نازک میں خوبصورتی اور سنگار سے فطری ذوق ہی اس کا ذمہ دار تھا کہ سَن اور اون کے سادہ رنگوں سے اکتا کر اُسے زیادہ جاذب نظر رنگوں کی تلاش ہوئی۔ چھالوں پھولوں اور پتوں کے عرق میں دھاگوں کو ڈبو ڈبو کر رنگ برنگی پوشاکیں تیار ہونے لگیں اور لباس پر طرح طرح کے بیل بوٹے بننے لگے۔

یہ عورتیں جن کا ہم نے اب تک ذکر کیا اس زمانے میں تھیں جب لوگ تلاش معاش میں جگہ جگہ مارے پھرتے تھے۔ زراعت کی ایجاد اور تعمیر کے فن سے آگاہی ہو جانے پر عورت کو کسی قدر اطمینان نصیب ہوا اور اسے اپنا دستور العمل بنانے کا موقع ملا۔ اب جنگل کی محدود اور تھوڑی پیداوار اس کے لطیف احساسات کے لئے ناگزیر تھی۔ سَن اور روئی کی کاشت عمل میں آئی اور کپڑوں کی بناوٹ میں نزاکت پیدا کی جانے لگی۔ اون کے لئے بھیڑیں زیادہ تعداد میں پالی جانے لگیں۔ کیونکہ اب ان کے لئے چراگاہیں کاشت کی جا سکتی تھیں۔ گلہ بانی اور بھی فائدہ مند پیشہ ہو گیا کیونکہ گوشت کے علاوہ اون بھی مصرف میں آنے لگا تھا۔ اس طرح عورتوں نے بُننے کے ہنر کو ترقی دیکر اون کو ایک قیمتی تجارتی شئے بنا دیا۔

جبکہ باقی دُنیا میں بہیمیت اور وحشت کا دور دورہ تھا چین کے لوگ کئی لحاظ سے متمدن کہے جا سکتے تھے۔ خصوصاً شہنشاہ ہوانگ تی کی حکومت میں رعایا بہت خوش حال تھی اور بادشاہ رعیت کی بہبودی کیلئے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے تاجروں کیلئے وزن اور ناپ کے پیمانے مقرر کر رکھے تھے تاکہ خریدار دھوکا نہ کھا سکیں۔ اس نے کشتیاں ایجاد کیں اور اس طرح دریاؤں کے ذریعے چین کے مختلف مقامات میں مراسلت اور تجارت شروع ہو گئی۔ اسی کے دوران حکومت میں دھاتوں کی تحقیق ہوئی اور مٹی کے برتن بننے لگے۔ گو ہوانگ تی حکومت کے معاملات میں بہت منہمک رہتا پھر بھی وہ اپنے ملک کی آئندہ بہبودی اور ترقی کے لئے [illegible]

بتاتا کہ اس کی حسین ملکہ سیلنگ شیہ نے اپنے پاتیں باغ میں بیٹھے بیٹھے ایک مکروہ کیڑے کا مطالعہ کر کے کر دیا۔ اس باغ میں شہتوت کے درخت بکثرت تھے اور چونکہ ان کی پتی ریشم کے کیڑوں کو بہت مرغوب ہے اس لئے یہ کیڑے وہاں بڑی تعداد میں تھے۔ ملکہ گھر کے کسی کام میں ہاتھ نہ لگاتی اور دوپہر کے وقت گرمی سے بچنے کے لئے گنجان درختوں کے نیچے آ بیٹھتی تھی۔ ایک دن حسب معمول جب وہ باغ میں آئی تو درختوں کی سی آواز اس کے کانوں میں آنے لگی جیسے کہ پانی برس رہا ہو لیکن آسمان پر ابر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ سنتی رہی اور تجسس کی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی۔ یکایک اس نے دیکھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے کریہہ المنظر کیڑے جو خوبصورت شہتوت کے درختوں پر چڑھا کرتے تھے اور جن سے وہ نفرت کیا کرتی تھی کہ وہ اسکے خوشنما درختوں کو خراب کرتے رہتے تھے، پتیاں کھانا بند کر کے اپنے لئے خول (cocoons) تیار کر رہے ہیں۔ ملکہ کی کنیزوں نے اسے بتایا کہ یہ کیڑے اسی طرح تین دن اور تین رات تک خول کاتتے رہیں گے۔ پھر جبکہ اپنے کو پوری طرح بند کر کے ہوا اور دھوپ سے محفوظ کر لیں گے تو ماہ کامل تک اسی کے اندر سوتے رہیں گے اور پورا چاند ہونے پر خول کے ایک سرے پر سوراخ کر کے خوبصورت تتلیاں بن کر اڑ جائیں گے۔

سیلنگ شیہ نے خول میں سے تتلیوں کا نکلنا کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ بے چینی سے اس وقت کا انتظار کرنے لگی تین دن کے بعد آواز بند ہو گئی اور باغ میں پہلے جیسی خاموشی پھر ہو گئی۔ ملکہ دن گنتی رہی اور آخر جب چودھویں رات کا چاند نکلا تو سینکڑوں کی تعداد میں تتلیاں اڑتی نظر آئیں۔ لیکن ملکہ کو ان پتنگوں پر کوئی اچنبھا نہیں ہوا بلکہ ان کے خول کی ساخت پر حیرت ہونے لگی۔ درجنوں خالی سنہرے خول زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں چن لیا، ان کا بغور مطالعہ کیا، ان میں سے نرم ریشمی دھاگے نکالے اور اس کو یہ احساس ہونے لگا کہ یہ دھاگے تو ان سے بھی زیادہ ملائم اور باریک ہیں جن سے خود اس کا لباس بنا ہوا تھا۔ اسی فکر میں غرق سیلنگ شیہ بے اعتنائی سے ان خولوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔ کبھی دھاگے کھینچ کر ان کی مضبوطی کا اندازہ لگاتی تو کبھی ہاتھوں سے مل کر ان کی ملائمت کو دیکھتی۔ یکایک یہ خیال اس کے ذہن میں آیا کہ ایسے دھاگے بٹنے کی کوشش ہی کیوں کی جائے، کیوں نہ اس کیڑے کے کاتے ہوئے دھاگے ہی سے اپنے لئے پوشاک بنی جائے!

جب ریشم کے کیڑوں کے خول بنانے کی دوسری فصل آئی تو ملکہ اپنی کنیزوں کو لیکر باغ میں پہنچی اور جونہی کہ خول بن کر تیار ہوئے اس نے سب جمع کرا لئے اور دھاگا کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے تو اس کوشش میں دھاگے ٹوٹ ٹوٹ گئے لیکن اس مشکل کو ملکہ نے بآسانی حل کر لیا۔ اس نے خولوں کو گرم پانی میں ڈلوا دیا تاکہ اندر کے کیڑے مر جائیں، ریشم ملائم پڑ جائے اور آسانی سے کھولا جا سکے۔ اس طرح ریشم کھلتا گیا اور لکڑیوں پر لپٹتا گیا۔ اس سنہرے چمکدار دھاگے سے سیلنگ شیہ نے خود ایک چھوٹا سا ٹکڑا بنا اور اسے زیب تن کر کے اپنی دلفریب ایجاد کو دیکھتی اور خوش ہوتی تھی۔ اس کے بعد سے اس کا معمول تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے خول جمع کرتی، ریشم کے دھاگے کھولتی اور اپنے لئے لباس تیار کیا کرتی۔ درباری عورتوں پر ملکہ کا تتبع فرض تھا۔ محل میں ہر عورت کا یہی شغل بن گیا۔ شہتوت کے باغ لگنے اور ریشم کے کپڑے پہننے لگے۔ لازم تھا کہ عوام بھی محل والوں کی تقلید کریں۔ تھوڑی ہی مدت میں چین کے تمام رؤسا ریشم میں ملبوس نظر آنے لگے۔ تاہم جب شہتوت کے درختوں میں نئی پتیاں نکلتی ہیں تو اب بھی ملک کے تمام مرد عورتیں اور بچے ہر سال مندروں میں جا کر ملکہ سیلنگ شیہ کی پوجا کرتے ہیں۔ اسے ریشم کی دیوی کہتے ہیں کیونکہ اس نے اپنی عقل اور اپنے ہی ہاتھوں سے ریشم کا کاتنا اور بننا معلوم کر کے اپنی رعیت کو مالا مال کر دیا۔

تین ہزار سال تک اس قیمتی بھید کو ساری چینی قوم اپنے سینوں میں محفوظ کئے رہی۔ دوسرے ملکوں سے سیاح اور تاجر آتے تھے بازاروں اور شہروں میں پھرتے پھراتے، ریشم کی صنعت کا راز معلوم کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے لیکن ان کیڑوں کی کاریگری انہیں معلوم نہ ہو سکی۔ شروع میں تو چینیوں کو اپنی اس غیر معمولی صنعت پر اس قدر فخر تھا کہ حکام نے ریشم کا ملک سے باہر بھیجنا جرم قرار دے رکھا تھا۔ تاجر چینی برتن، چائے اور چاول خرید سکتے تھے۔ ہل، دھات کی بنی ہوئی اشیاء اور دیگر سامان دستکاری ملک سے باہر لے جا سکتے تھے۔ سنہرے ریشمی کپڑوں پر ان کی للچائی نظریں پڑتیں لیکن ان تک ان کی دسترس نہ تھی۔ رفتہ رفتہ چینی تاجروں کو زیادہ داموں کی طمع نے بیوپاریوں کے ہاتھ یہ چیز چوری چھپے فروخت کرنے پر آمادہ کر دیا اور خفیہ طور پر ریشمی کپڑے چین سے باہر جانے لگے۔ جوں جوں دوسری قوموں نے

سے بڑی رقم کی کپڑا زیادہ مقدار میں دوسرے ممالک کو بھیجنے لگے۔

جاپانیوں کو کاشت ایران سے چین کو ایک بہت پرانی سڑک جاتی ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ دنیا کی قدیم ترین سڑک ہے۔ شروع میں یہ چھوٹی تھی مگر بڑھتے ہوئے پرانی دنیا کے تجارتی قافلوں کا سب سے بڑا شاہراہ عام بن گیا۔ یہ سڑک مشرق قریب کو مشرق بعید سے ملاتی تھی۔ مغرب میں بسنے والے چین اور ہندوستان کی دستکاریوں اور صنعتوں کے اشتیاق میں اسی راستے سے آتے جاتے تھے۔ ایرانی تاجر ریشم ہر طریقوں سے چین سے لے کر آتے تھے لیکن انہیں ریشم کے کیڑوں کا راز نہ معلوم ہو سکا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر زمین کرنے کے شوق میں جب ہندوستان تک پہونچا تو یہاں پہلے پہل اس نے روئی کا درخت دیکھا۔ اسکے بعد سے اس کی کاشت ہونے لگی۔ جب وہ ریشم کی صنعت گاہوں تک پہونچا تو ریشم کے گٹھے ہی خرید کر نہیں لایا بلکہ بہت سا کچا ریشم بھی فراہم کیا لیکن یہ نہ جان سکا کہ کچا ریشم پیدا کیسے ہوتا ہے۔ یہ چین کا وہ قدیم راز تھا جسے دنیا کا فاتح عالم بھی نہ جان سکا۔

ابتدائی عیسوی صدیوں میں روما کے محلوں میں لوگ ایرانی تاجروں سے خریدی ہوئی ریشمی پوشاکوں میں ملبوس پھرتے تھے۔ روم کے دستکاروں کو کھول کر از سر نو اپنے مذاق کی وضع کے کپڑے بھی بن لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ کپڑے انہیں بہت مہنگے پڑتے۔ حکومت روما کے زمانہ کا استعمال صرف امرا تک محدود تھا۔ تیسری صدی عیسوی کے ایک رومن بادشاہ آرلین (Aurelian) نے اس کی گرانی کے سبب اسے پہننا گوارہ نہ کیا اور نہ اپنی ملکہ کو اس کے استعمال کی اجازت دی۔ رومنوں کے بھاری لباس کے مقابلہ میں چونکہ ریشم بہت ہی ہلکا تھا اس لئے وہ اسے "بنی ہوئی ہوا" کہا کرتے تھے۔

آخر کار اس بھید کا طلسم چین ہی کی ایک شہزادی نے توڑا۔ ۴۰۰ء کے لگ بھگ اس شہزادی کی شادی ایک ہندوستانی حکمراں سے ہونے والی تھی، بادشاہ جانتا تھا کہ چین کی شہزادی ریشمی لباس زیب تن کرنے کی عادی ہوگی۔ لہذا اس نے شہزادی کے پاس پیغام بھیجا کہ ہندوستان میں روئی کے کپڑے بنتے ہیں اسے یہاں ریشم نہ مل سکے گا۔ شہزادی نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کچھ شہتوت کے بیج اور ریشم کے کیڑوں کے انڈے اپنے عروسی لباس میں چھپا لئے اور اپنا نیا گھر بسانے ختن کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس زمانے میں اس جرم کی سزا موت تھی، لیکن شہزادی کی یہ قانون شکنی لوگوں پر ظاہر نہ ہوسکی اور وہ بلا کسی مزاحمت کے چین کی سرحد پار کر گئی۔ ختن کی ملکہ بننے کے بعد اس نے ریشم کے کیڑے پالنے شروع کئے لیکن اس کے شوہر کے دربار میں جو چین کے ایلچی تھے ملکہ کی اس حرکت سے بہت برہم ہوئے۔ ملکہ کے خلاف سرتابی کرنے کی مجال تو نہ تھی پھر بھی ملک کے اس راز کو محفوظ رکھنے کا انہوں نے تہیہ کر لیا۔ اور ایک دن انہوں نے بادشاہ کو یہ پٹی پڑھائی کہ ملکہ اپنے باغ میں ایک خاص قسم کے کیڑے پال کر زہریلے سانپوں کو نوید دے رہی ہے۔ بادشاہ نے پورے باغ کو نذر آتش کرا دیا اور اس طرح ریشم کے کیڑے جل کر خاکستر ہو گئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد یہ راز ہندوستانیوں کو بھی معلوم ہو گیا۔ جب اس دستکاری کا بھید کھل گیا تو ۳۰۰ء میں چار چینی لڑکیوں کو جاپان بھیجا گیا تاکہ وہاں کے باشندوں کو بھی وہ ریشم کے کپڑے بننے کے طریقے بتائیں۔ لیکن ۶۰۰ء تک مغربی دنیا کے سب سے بڑے شہر قسطنطنیہ میں بھی ریشم بنانے کا ہنر راز سربستہ ہی رہا۔ شہنشاہ جسٹینین بڑا ہی بیدار مغز بادشاہ تھا اور اسے اپنے ملک کی تجارت کو فروغ دینے کی ہر وقت فکر رہتی تھی۔ سکندر اعظم کی طرح اسے بھی دوسرے ملکوں کی نئی چیزوں کی جستجو رہتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایران میں بسنے والے دو عیسائی درویش سلطنت چین میں مدت دراز تک رہنے کے بعد قسطنطنیہ آئے۔ ظاہر ہے کہ کسی ملک میں عرصہ تک رہنے سہنے سے وہاں کی بہتیری باتوں سے واقفیت ہو ہی جاتی ہے۔ ان درویشوں نے بادشاہ سے ریشم کے کیڑوں اور ریشم کی پیداوار کے متعلق سب حالات بیان کئے۔ جسٹینین نے ان سے وعدہ لیا کہ جب دوبارہ قسطنطنیہ آئیں تو ریشم کے کیڑوں کے انڈے اپنے ساتھ ضرور لائیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۵۵۰ء میں یہ درویش اپنے عصا کے خول میں چھپا کر انڈے لائے اور انہیں کی نگرانی میں انڈوں سے کیڑے پیدا ہوئے، کیڑوں نے خول کاتے۔ اور حسب دستور اس میں سوراخ کر کے تتلیاں اڑ گئیں۔ الغرض بادشاہ نے اپنے محل کے باغ میں ریشم کی کاشت، اور اس سے کپڑے بننے کا کام شروع کیا۔ جسٹینین نے بہت چاہا کہ ملک میں اسکے سوا دوسرا ریشم کی صنعت کا اجارہ دار نہ بنے۔ کسی کو اس کی کاشت کی اجازت نہ دی لیکن قسطنطنیہ چین تو نہ تھا۔ وہاں تو محل کے اندر بھی کسی راز کا چھپا رہنا [illegible] بہت جلد مغربی دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ریشم کی صنعت شروع ہو گئی۔ [illegible]

[illegible]

لعنت

ایکا ایکی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پیٹ میں کوئی پھڑپھڑا رہا ہے۔
ماکی طبیعت بے چین ہو گئی ـــــ اُسکی مصیبت کو زیادہ کرنے کے لئے ایک ور
ن بے قرار تھا ـــ وہ، وہ گھبرا سی گئی۔

وہ بیٹھی ننھے ننھے کپڑے سی رہی تھی، آنے والے مہمان کے لئے ـــــ
ن جن کے لئے گھر میں ان ننھے ننھے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا ـــ جس کی آمد
ں کے لئے سوہانِ روح بن رہی تھی، ماں ہو کر بھی اُسے ہونے والے بچے سے
ت تھی ـــ اس کی غربت میں اضافہ کرنے والا بچہ ـــ ہندستان کے بدحالوں
ں ایک اور کا اضافہ ـــــ

"ہر ایک بچہ اپنی قسمت ساتھ لیکر آتا ہے" یہ الفاظ اُسے کانوں میں
بجتے سنائی دئے، مگر ایسا ہوتا بھی ہے؟ اُسے یقین نہ آتا تھا ـــ وہ تو
ہ کی پیدائش کو والدین کے لئے ایک لعنت سمجھتی تھی ـــ لعنت، ماں
خون چوسنے والا، باپ کے منہ سے نوالہ چھیننے والا ــــ بچہ ـــ لعنت۔

وہ ان دنوں بہت زیادہ یاسیت کی طرف مائل تھی ـــ اس کی
یہ تھی کہ کئی دنوں سے اس کا پیٹ ایکا ایکی پھڑپھڑانے لگتا ـــ گویا کوئی
پ رہا ہو ـــ اس کا زرد رنگ اور بھی زرد ہو جاتا ــــ وہ پہروں پیٹ
ماے بیٹھی رہتی ـــ گذر اوقات کے لئے وہ سلائی کا کام کیا کرتی تھی۔
ں نئی تکلیف کے باعث وہ کام بھی نہ کر سکی ـــ دایہ کی فیس، زچگی کی اور
روریات کے لئے بھی روپے کی ضرورت تھی۔ مگر اس نے کام نہ کیا تو ـــــ
ں کا پیٹ اور پھڑپھڑانے لگا ــــ وہ ہلدی سے بھی زیادہ زرد ہو گئی۔

"نا جو! تمہیں آج کیا ہو رہا ہے؟" ناظم پاس بیٹھا ایک مثل پڑھ
رہا تھا۔ اس نے نجمہ بیوی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو کئی بار دیکھا تھا مگر
ے دفتر کے کئی کیس مکمل کرنے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ نجمہ سے اچھی
رح باتیں نہ کر سکا۔ لیکن نجمہ کی حالت زیادہ دگرگوں ہوتے دیکھکر
وہ چونکا۔ اُسے نجمہ کا پیٹ پھڑپھڑاتا دکھائی دے رہا تھا ـــ وہ اپنی حماقت
پر شرمندہ ہو گیا۔

جانے کب بیٹی بچے جن کر اس لعنت کو پورا کر رہی ہے۔ جو نجمہ منوہ کے
ل کملنے کی وجہ سے اس پر پڑی تھی ـــ نجمہ بھی جو اکی بیٹی تھی ـــ وہ اس
[illegible] اس کی کئی

سہیلیاں بچے جننے کی بڑی خواہشمند تھیں ـــ انہوں نے جب بھی کسی کا [illegible]
جمیل، موٹا تازہ بچہ دیکھا، اُسے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور [illegible]
کرنے ـــ کھیتی میں بیج اگر اچھا پڑے تو خوشے بھی اچھے لگتے ہیں ـــ [illegible]
اچھا خوشہ دیکھکر وہ بھی ایسے ہی بیج کی خواہشمند ہو جاتی تھیں ـــ [illegible]
بھی تو ایک کھیتی ہے ـــ مگر اُسے بچے پیدا کرنے سے نفرت تھی، وہ جانتی تھی
کہ کثرت اولاد ہی تباہی کا موجب بنتی ہے۔

اس کے ہاں جب پہلی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ بالکل خوش نہ تھی [illegible]
اس کی سہیلیاں اُسے مبارکباد دینے آئی تھیں: "بالکل تمہاری شکل ہے"
ایک نے کہا۔

"تم سے بڑھ کر ہوگی" دوسری بولی۔

مگر وہ خاموش رہی تھی ـــ وہ خاموش تھی، اُسے کوئی خوشی
نہ تھی، ایک ماں اور پیدا ہو گئی تھی، بچے جننے کے لئے، غلاموں کی تعداد
بڑھانے کیلئے ـــ مگر اسکی خاموشی کے معنی غلط لئے گئے۔

"لڑکی یا لڑکا ـــــ یہ خدا کی دین ہے بیٹا" نجمہ کی ماں نے
اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ لڑکی یا لڑکا نجمہ کے نزدیک بے معنی الفاظ
تھے ـــ بات ایک ہی تھی، خدا کی لعنت کا اظہار لڑکی یا لڑکا ـــ انجیل
کے الفاظ ـــ خدا نے کہا میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا تو درد
کے ساتھ بچے جنے گی ـــ زور زور سے اسکے کانوں میں گونجنے لگے۔

کمرے میں خاموشی تھی ـــ دیوار پر کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا ـــ ٹک ٹک
ـــ مسلسل ٹک ٹک، بعض اوقات جب وہ اکیلی ہوتی تو پہروں اُسے دیکھتی
رہتی ـــ ایک مسلسل ٹک ٹک، یہ ٹک ٹک کبھی بند نہ ہو گی ـــ وہ اکثر سوچتی
عورت اور کلاک ـــ مسلسل بچے جننا اور مسلسل ٹک ٹک ٹک ـــ بچہ ـــ
لعنت بن کر ماں باپ کی زندگی کو ختم کرتا ہے ـــ کلاک کی ٹک ٹک
وقت کو کھا رہی ہے ـــ ٹک ٹک ـــ اس وقت اُسے یہ ٹک ٹک بہت بری
معلوم ہو رہی تھی ـــــ بہت بری معلوم ہو رہی تھی ـــــ بہت بری کلاک
اُس نے چاہا کہ وہ قینچی پھینک کر اُسے توڑ ڈالے ـــ مگر یہ کلاک اُسے
جہیز میں ملا تھا ـــ ٹک، نجمہ، تیری عمر کا ایک اور لمحہ کم ہو گیا۔ اسکے پیٹ
میں پھر کوئی حرکت کر رہا تھا۔

اس خاموش فضا میں کلاک کی ٹک ٹک کے ساتھ ناظم [illegible]

قلم کاغذ پر دوڑ رہا تھا ــــ وہ میز پر بیٹھا سامنے مثلوں کا انبار لگائے
ہوئے یہ کام اُسے مکمل کر کے صبح دفتر لے جانا تھا ــــ اس انبار کو اُٹھا کر
ــــ بدقسمت کلرک ــــ نجمہ اپنا دکھ بھول کر ناظم کی طرف دیکھنے لگی ــــ
ناظم ــــ نجمہ،

نجمہ کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ناظم کی قسمت میں کلرک ہونا لکھا تھا۔ شادی سے پہلے وہ سنتی تھی کہ ناظم آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے کا امتحان دے رہا ہے۔ شادی کے بعد اس کے فائینس کے مقابلہ کا امتحان دیا۔ پھر پی سی ایس اور پھر ــــ چالیس روپے کی کلرکی۔ وہ ایم۔ اے تھا۔ خوش رو، وجیہہ۔ ذہین، مگر یہ کچھ اس کے کام نہ آیا۔ وہ، وہ کچھ بھی نہ بن سکا نجمہ شادی سے پہلے میکے میں خواب دیکھا کرتی تھی ــــ بنگلے، موٹر کاریں، دعوتیں، سیریں، ــــ اعلیٰ طبقے کے سارے لوازمات یکے بعد دیگرے ہر وقت اس کے سامنے رہتے ــــ وہ خیال ہی خیال میں تصور کے حسین پروں پر اڑا کرتی ــــ اس کی زندگی کس قدر مصروف ہوگی، آئی، سی، ایس، کی بیوی ــــ پارٹیاں، کلب، سنیما۔ ملاقاتیں، سوشل کاموں میں حصہ۔ وہ کتنی مصروف ہوجائے گی۔ مگر اس کے یہ حسین خواب مدھم پڑتے گئے ــــ آخر اُسے گھر ملا لیکن کرایہ کا ــــ اوسط درجے کا گھر کرایہ زیادہ ــــ باقی رقم میں دونوں کا گذارہ مشکل تھا، نجمہ کی کفایت شعاری کے باوجود مالی مشکلات دُور نہ ہو سکتی تھیں۔ ناظم نے ملازمت کے علاوہ دو ایک طلبا کی ٹیوشن لے رکھی تھی۔ دفتر کا کام اس قدر زیادہ کہ بے چارہ دن بھر کرتے کرتے تھک جاتا۔ پھر گھر بھی لے آتا تھا ــــ وہ صبح سویرے چلا جاتا اور کہیں رات گئے واپس لوٹتا۔ نجمہ گھر کا سارا کام کاج کرتی، اس سے جو وقت بچ جاتا وہ ہمسایہ کے لوگوں کے کپڑے سی لیتی، اس طرح چار پانچ روپے کی اور آمد ہو جاتی۔

ناظم کا قلم برابر چل رہا تھا ــــ نجمہ قمیص سی رہی تھی اور ننھی منی بچی قدسیہ مٹی میں لت پت فرش پر سو رہی تھی۔ وہ تھک کر وہیں سو گئی تھی ــــ ماں میں اتنی سکت نہ تھی کہ اُسے اُٹھا کر چارپائی پر ڈال دیتی۔ باپ کام میں مصروف تھا ــــ قدسیہ کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل بھر آیا ــــ بدقسمت بچی ــــ اپنی ماں سے زیادہ بدنصیب، ماں کا بچپن تو خوشحالی میں گذرا تھا۔ مگر بچی پیدا ہی ہوئی غربت میں ــــ ایک لاش، بے جان اور سرد ــــ پچھلی گرمیوں میں ایک دن ایک تانگے والا گھوڑا تیزی سے دوڑاتے سڑک پر جا رہا تھا کہ اچانک گھوڑا گرا، تڑپا اور دم توڑ دیا۔ تانگے والے نے تانگہ کھول کر ایک طرف کر دیا اور گھوڑے کی لاش وہیں پڑی رہی۔ اتنے میں چند بچے کھیلتے ہوئے آئے۔ انہوں نے بے جان گھوڑے پر پتھر مارنے۔ وہ چلمن سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ ابھی بھاگا بھاگا جا رہا تھا۔ اس میں زندگی تھی۔ اس کی زندگی کے سہارے چند تانگے پر سوار چلے جا رہے تھے۔ وہ بے جان ہو کر گرا ــــ اس کی زند ہوئی ــــ ان چار آدمیوں کا کام رکا نہیں ــــ ایک اور تانگہ آیا اور ہو گئے ــــ بچے آئے، ننھے اور خوبصورت بچے، بے جان لاش اُ لئے تماشہ تھی۔ وہ پتھر مارنے لگے۔ وہی چار ٹانگیں جنہیں برق ر کہا جاتا تھا اکڑ گئیں ــــ حسین بچے اور بدصورت لاش ــــ سارا منظر ڈراؤنا معلوم ہونے لگا تھا، بالکل ڈراؤنا ــــ بچوں کے اُس کی کھوپڑی پر لگے ــــ ایک آواز پیدا ہوئی ــــ بھدی آوا پتھر زمین پر گر گیا ــــ ایک، دو، تین، چار ــــ پتھر چل رہے تھے۔ گھوڑا خاموش تھا ــــ ان پتھروں سے بے پروا ــــ وہ مر چکا تھا۔ نے سوچا وہ بھی تو مُردہ ہے، جذبات کی موت، اس کی موت تھی۔ اس پر بھی برستے تھے مگر وہ بے حس تھی ــــ پتھر خود بخود گر جاتے، بے بے حس ــــ اس کی قدسیہ بھی تو اس وقت بے جان، بے حس تھی۔

ٹک ٹک بدستور جاری تھی۔ ناظم کا قلم کاغذ پر چل رہا تھا۔ کا سانس برابر جاری تھا اور نجمہ کے پیٹ میں بچہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ سب زندہ تھے، وہ بھی زندہ تھی۔ اُسے زندہ رہنا تھا۔ کلاک بھی تو ٹک ٹک کئے جا رہا تھا ــــ یہ لعنت کب تک جاری رہے گی۔ حوا کی بیٹیاں کیوں یوں گرفتار ہیں۔ ہر عورت کا پیٹ پھڑپھڑاتا ہے۔ مگر عورت پر بھی خوش ہے۔ اس کی قدسیہ، کمسن اور معصوم بیٹی بھی اس بلا سے نہیں بچ سکتی ــــ آج شام کو ماں بیٹی بیٹھی تھیں کہ ان کے ہم کا لڑکا اعظم آیا۔ وہ قدسیہ سے ایک آدھ برس بڑا ہوگا۔ وہ قدسیہ کھیلا کرتا تھا۔ وہ خوش خوش تھا۔ اسکے پاس ایک کھلونا تھا۔ وہ س قدسیہ کی طرف آیا۔

"سیہ!" اُس نے توتلی زبان میں کہا "یہ لو!" اور قدسیہ ما چھوڑ کر اسکے ساتھ کھیلنے لگی ــــ بھولی قدسیہ۔

کلاک کی آواز بار بار اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیتی ــــ وہ ابھی بچہ ہی تھی کہ وہ اس آواز سے مانوس ہوگئی ــــ اُسے ا گھر کا ڈرائنگ روم یاد آگیا ــــ ایک کمرہ۔ دروازے اور کھڑکیوں رنگین پردے۔ فرش پر خوبصورت سبز رنگ کی دری، ایک صوفہ س ایک کونے میں انگیٹھی، اس پر گلدستے اور چند تصاویر ــــ دیوار کلاک ــــ وہ اکثر اسی کمرے میں کھیلا کرتی، اپنے چچا زاد بھائی

ہ ۔۔۔ اُسے اس سے کتنی محبت تھی، وہ بچپن میں اکٹھے رہے، اکٹھے
پلے، وہ بھی اسکے لئے کھلونے لایا کرتا تھا۔ مگر ۔۔۔

کلاک کی ٹک ٹک دنوں، مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہوتی
)، وہ بڑھتی گئی اور ظہیر سے بے تکلفی کم ہوتی گئی اور آخر ۔ اُسے کمرہ
دمتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ زندگی گزر جاتی ہے اس کے مدھم نقوش
نجاتے ہیں وہ انہیں نقوش میں سے قدسیہ کو دیکھ رہی تھی۔ مگر فرق
نتا تھا ۔۔۔ وہ ہمیشہ تتلی کی طرح سجی سجائی رہا کرتی تھی۔ بال سنوارے
ئے۔ ان میں سُرخ ربن، جارجٹ کا فراک۔ جانگیہ، دن میں کئی
) بار مُنہ دُھلاتا۔ مگر قدسیہ، وہ تو مٹی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ ننگے
ں، پریشان بال اور معمولی پاپلین کا فراک۔

ہمسایہ کا لڑکا بڑی دیر تک کھیلتا رہا۔ نجمہ کام میں مصروف تھی۔
وڑی دیر بعد اس کی ماں بھی آگئی۔

"بہن قدسیہ اور اعظم ایک دوسرے سے کتنا پیار کرتے ہیں" اس
آتے ہی کہا اور وہ دونوں کو دیکھنے لگی۔

"جی ہاں! بڑا پیارا بچہ ہے اعظم"

"دیکھو نا! آج بازار گیا تو ضد کرنے لگا کہ کھلونے لے دو! اسکے
نے اسے کھلونے دے دیے۔ گھر آیا تو ان میں سے ایک کھلونا کار لیکر کہنے لگا۔
ا! قدسیہ اور میں اس پر سیر کرینگے"

وہ بڑے مزے سے یہ کہانی بیان کر رہی تھی۔ اعظم کی ماں
"اس کے ابا نے مجھے بھیجا ہے، میں دونوں کو دیکھنے آئی ہوں"

"ہاں بہن! دونوں ایک دوسرے سے بڑا پیار کرتے ہیں"
اعظم کی ماں پہر بھر بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر
نے اعظم کے لباس کیلئے کپڑے کا حساب پوچھا۔ آکے ماہ وہ بازار سے
منگوائے گی۔ وہ بڑی ہمدرد عورت تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ جا چکی تھی اور نجمہ پھر کھانا پکانے میں مصروف
ی تھی۔

وہ انہیں خیالات میں محو تھی کہ ناظم نے ذرا ستانے کے لئے
رکھدیا اور بلند آواز سے "اوہ!" کہا۔

نجمہ چونکی۔

"میری نجمہ! کیا سوچ رہی ہے" وہ ننھی سی قمیص کی طرف دیکھکر مسکرایا۔
"قدسیہ کو ذرا چارپائی پر لٹا دیجئے۔ کھیلتے کھیلتے سوگئی ہے"

ناظم اُٹھا۔ اس نے بچی کو ہاتھوں پر اُٹھا لیا ۔۔۔ بے جان لاش
رح، قدسیہ [illegible] تھی ۔۔۔ اس نے بچی کی پیشانی پر
بوسہ دیا۔

بوسہ، نجمہ کو اپنے ماتھے پر وہی بوسہ محسوس ہوا ۔۔۔ ایک دن ناظم
نے اُسے بھی اسی طرح اُٹھایا تھا ۔۔۔ ۔۔۔ ایک شعلہ کی طرح اس کا
بدن دہک رہا تھا۔ گرم اور سُرخ، اور پھر اس نے گرم گرم ہونٹوں پر ناظم کے
گرم ہونٹ تھے۔

اس کا پیٹ ۔۔۔ ایک اور لعنت، غلاموں کی تعداد میں اضافہ،
دُنیا کی مصیبتوں میں ایک اور مصیبت ۔۔۔ یہی اس کی بچی کی تقدیر میں لکھا
تھا، اعظم نے آج کھیلتے ہوئے قدسیہ کا کرتہ اُٹھاکر اُسے دیکھا تھا ۔۔۔ بچہ
حوا کی بیٹی، لعنت ۔۔۔ ٹک ٹک ۔۔۔ سارا کمرہ گھوم رہا تھا، اس کے پیٹ
میں بچہ پھر تڑپ اُٹھا ۔۔۔

شمیم محمد اختر

خندۂ مسرّت

انگریز مصنف Max Eastman کی کتاب "ذوقِ ظرافت" (Sense of Humour) ایک مستند اور مشہور کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے مزاح کا نفسیاتی نقطہ نظر سے گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس مضمون کو پہلی دفعہ سائنٹفک طریقہ پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ باذوق حلقوں میں اس کتاب کو قدر و عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

میں ہر مہینے اس کتاب کے ایک ایک باب کا ترجمہ پیش کرتا رہوں گا۔

فلسفہ کے تقریباً ہر نئے نظام نے ہنسی کی ساحرانہ تشریح کرتے وقت اسے ضمنی حیثیت دی ہے۔ تنقیدی مواد کا ایک جزو کل سے ہٹا لیا جاتا ہے ذہانت کی ہلکی سی کمی کو گوارا کر لیا جاتا ہے اور چند پھسپھسے مذاق ٹھونس دیے جاتے ہیں جو بالکل بے لطف اور بے جان ہوتے ہیں اور پیش کرنے پر سرے سے مذاق معلوم بھی نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزاح میں ایک غیر فطری ترحم اور الجھن کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا صحیح ادراک سے بہت کم تعلق ہے۔ میرے نزدیک اس نظریہ میں نقص یہ ہے کہ ہم ہنسی کو تشریح انسانی کا ایک ضروری حصہ خیال کرنے کی بجائے اسے فردی حیثیت دے دیتے ہیں۔

اس چھوٹی سی دماغی بستی میں جسے فلسفی کائنات کہتے ہیں شاید مذاق اور دوستانہ دل لگی کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس لئے ہنسی ان فلسفیوں کو ایک مادی اور خارجی مسئلہ معلوم ہوتا ہے اور ان کی وسیع قیاس آرائیاں آسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتیں مگر ایک معمولی آدمی کو جو اپنی کھڑکی میں سے روز مرہ زندگی کے بہاؤ کی طرف جھانکتا ہے اور اس کا رخ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں رہتا ہے جو اس کے لئے ایک مسکراہٹ کا سامان پیدا کر سکے۔

وہ تشریحات جو ہنسی کو دوسرے کارناموں کی محض ایک ضمنی پیداوار قرار دیتی ہیں اور اسے ایک مکان کی واردات، ایک طغیانی یا افلاس کی حالت بتاتی ہیں۔ انسان کے اس امتیازی جوہر سے جو اسے دوسرے حیوانوں سے ذرا زیادہ دلآویز بنا دیتا ہے۔ بہت بے انصافی برتتی ہیں۔

تقریر کے بعد ہنسی سب سے بڑی طاقت ہے جو سماج کو شلک رکھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی غول پسند جبلت کا لاینفک حصہ ہے۔ تنہائی میں وہ محض بے چین ہی نہیں ہوتا بلکہ ہم جنسوں سے میل جول کی خواہش جو اس کے دل میں موجود ہے یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی فطرت کا صحیح استعمال کرنا چاہتا ہے۔ مسکراہٹ ایک خوش آمدید ہے۔ حالانکہ اور ہمہ رس، اور ہنسی ایک خیر مقدم ہے کسی آنے والے دوست کا! یہ ہماری مہمان نوازی اور خوشی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ گویا یہ کہتا ہے: "صاحب! میں آپ کا ہمنوا ہوں۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی!" مسکراہٹ ایک پگڈنڈی ہے جس پر دو وجود ملتے ہیں اور نہ مسکرانا گویا ملاقات کی تلخی کا دانستہ اعلان کرنا ہے۔

شاید کوئی مکانکی واردات یہ بیان کر سکے کہ یہ جبلت صرف چہرے کی ان خوبصورت شکنوں، اور دلنواز لہکوں میں کیوں بہتی ہے اور کسی دوسرے طرزِ عمل سے کیوں ظاہر نہیں ہوتی۔ کتے اس جبلت کا اظہار اپنی دُم سے کرتے ہیں اور یہ صحیح ہے کہ ہم بھی اسے اپنے کانوں کی مدد سے زیادہ خاموش طریقے پر ادا کر سکتے ہیں۔ کتے اپنی عقبی گرمجوشی اور تپاک ظاہر کرنے کے لئے بُری طرح دُہرے ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم ان کی بے زبانی پیشِ نظر رکھیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ انسان کی ہنسی میں بھی ایک سماجی فائدہ مضمر ہے۔

ہنسی کے ارتقا میں ایک فیصلہ کن اثر شاید یہ بھی تھا کہ ایک ایسے روشن اسلوبِ بیان کی ضرورت محسوس ہوئی جو آسانی سے لحن و بصارت میں گھل مل سکے۔ مسکراہٹ شخصیت کی بڑی بڑی خوبیوں کا متحرک نچوڑ ہے۔ یہ چہرے کے خطوط کی اتنی مکمل اور نازک تصویر ہے کہ چہرے کے فالج کے ہلکے سے ہلکے حملہ کا سراغ لگانے کے لئے جب ڈاکٹر ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں تو مسکراہٹ ہی سے تشخیص میں مدد لیتے ہیں۔

معمولی مسکراہٹ میں اگر سانس، آواز اور اشارے کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ قہقہہ بن جاتا ہے۔ دراصل یہ دونوں چیزیں بنیادی اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ وہ حضرات جنہوں نے ان دونوں میں تمیز کرنے کی کوشش کی ہے [illegible]

یہ مسرت جس طرح لطیف اور پیچیدہ ہے اسی طرح واحد اور مسلسل بھی ہے۔ یہ مسکراہٹ سماجی مسرت کا اظہار ہے اور ایک ایسی خدا داد نعمت ہے جس کے بغیر ہماری زندگی اپنی موجودہ حالت کا ایک ڈھانچہ بن کے رہ جاتی۔

چارلس فوریر میں یہ مسرت اس قدر غالب تھی کہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ "سماجی انجذاب" کا قانون علم سیاسیات میں وہی منصب ادا کر سکتا ہے جو علم طبیعات میں کشش ثقل کا قانون۔ اس کے احساس کی اس فراوانی کا شاید یہ ردِ عمل تھا کہ چارلس فوریر خود کبھی نہیں ہنسا۔ اپنے افعال پر اس قسم کا غیر ضروری دباؤ ڈالنے ہی سے اکثر جذبات تیز ہو جاتے ہیں اور میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو آنکھوں کے ذریعے سے ہلکے طور پر مسکراتے ہیں ان کی دوستی پر ہمیں پورا اعتماد ہو جاتا ہے اور وہ لوگ جو غیر مخلص قہقہہ لگاتے ہیں انہیں ہم عیش کا ساتھی سمجھتے ہیں، غم کا رفیق نہیں جانتے۔

یونان اور روم کے سب مشہور معلم اخلاق اور ہندی عالموں کی یہ رائے ہے کہ فرمائشی قہقہہ عقل و ہمت کی دلیل نہیں۔ لیکن میرے خیال میں صحت مند روح کی پکی نشانی یہ ہے کہ آدمی کے تمام چہرے کو دوستانہ بشاشت اس کے گلے میں اتر جائے اور بے روک ٹوک اس کے جسم کے ہر رگ اور پٹھے میں دوڑ جائے۔

مجھے وہ مسکراہٹ دلکش معلوم ہوتی ہے جو دفعتاً پیدا ہو۔ پہلے پہلے اوپر کا ہونٹ شدت سے جنبش کرتا ہے اور کچھ اس طرح کھل جاتا ہے کہ تمام دانت چمکنے لگتے ہیں اور منہ پہلے سے ذرا زیادہ گلابی ہو جاتا ہے۔ گالوں میں خم پیدا ہوتا ہے۔ آنکھیں چمک اٹھتی ہیں اور بھووں اور پلکوں کو نہایت ہی خفیف طور پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ نیک فطرت اور طیب خاطر کے لوچدار تابندہ خطوط اُن کی چمک دمک کو اور بھی چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ایسی زندہ جنبشیں شراب، پھول یا بادل کے رنگوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ یہ اسی روشنی کا منبع ہیں جس میں انسان اپنی تاریک منزل تک پہونچنے کیلئے بیتاب اور بے باک کوشش کر رہا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر واضح بات فلسفیوں کے صرفِ نظر کیوں ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہنسی اور حقارت کی ہنسی میں صحیح تمیز نہیں کی، حالانکہ ان دونوں کا مزاج متضاد ہے اور ان کی اعصابی بناوٹ بھی مختلف ہے۔ یہ بات اس سے ظاہر ہے کہ ہم ہنستے وقت چہرے کے دونوں طرف استعمال کرتے ہیں مگر حقارت سے مسکرانے کے لئے ہم اکثر ایک ہی طرف استعمال کر سکتے ہیں۔ کلکر دنیا ([illegible]) کو ظاہر کر کے چھوٹے چھوٹے سانس لینا یا ہاہا کی آواز [illegible] ہے حتیٰ کہ ایک کتے کے دانت

اس کی دُم سے دُور ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم معتبر حیاتیاتی اور نفسیاتی وجوہ کی بنا پر آغاز ہی سے ہنسی کے موضوع سے حقارت کی بحث خارج کرتے ہیں۔

صرف حقارت آمیز ہنسی ہی نہیں بلکہ اس کی کچھ خلق اولاد مثلاً تمسخر، آوازہ کسنا، تضحیک، لولو ہو ہو۔ ظامت۔ تعریض کلبی اور معنوی چھان بین بھی اس بحث سے خارج ہیں۔

لفظ sarcasm کا اصل مطلب کتوں کی طرح گوشت چیرنا پھاڑنا ہے۔ اور یہ ہونٹوں کا نہیں بلکہ دانتوں کا فعل ہے۔ مزاح کے کلبی نظریہ کا نام بھی کتے سے نکلا ہے۔ حتیٰ کہ لفظ sarcasm کا مادہ یونانی لفظ sarkazein ہے جو ابتدا میں جانوروں کے متعلق استعمال کیا جاتا تھا اور ہماری زبان میں اس کا مطلب اپنے دانت دکھانا ہے۔ بیشک یہ ممکن ہے کہ ان الفاظ میں جن احساسات کا اظہار ہے آدمی کی مختلف حالتوں کی طرح ہنسی میں مل کر جذبات کی نئی نئی لذتیں پیدا کرتے ہوں مگر ان میں سے کوئی بھی ہنسی کی روح اور تخلیق میں شامل نہیں ہے کیونکہ ہنسی کا عمل پیدا و نہیں قبول ہے، یہ زحمت نہیں مسرت ہے۔ تضحیک نہیں فرحت ہے۔ چالیس روزہ بچے کو ہی دیکھئے! حقیقت میں یہی اس کا جنم دن ہے کہ اس دن اس کا ایک ساتھی پیدا ہوتا ہے۔

ابتدائی خوشس آمدید کی پہلی کارگر مسکراہٹ جو سماجی رابطے کے لئے ناگزیر ہے۔ ہر نوع کی ہنسی اور مسکراہٹ کی تخلیق اسی سے ہوتی ہے۔ اگر ہمیں اس بات کا صحیح احساس ہو کہ سماجی جذبہ اور جبلت ہمارے شعوری وجود میں کس طرح داخل ہو کر اس پر چھا جاتے ہیں تو ہم اندازہ لگا سکیں گے کہ اس پہلی مسکراہٹ سے بعد میں کیا کیا فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ انسانی فطرت متذکرہ صدر جذبات کا مرکب ہے۔ ہمارے معجزاتی وجود کی تخلیق صرف اسی حالت میں ہو سکتی تھی اگر اس کا واسطہ دوسروں سے بھی پڑتا۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر یہ وجود خلوت میں بھی اپنا سماجی پہلو قائم رکھے۔ مثال کے طور پر کوئی خیال آنے پر آپ ہی آپ ہنس دے۔ یونہی کھسیانہ ہو کر مسکرا دے یا بادِ نسیم کی آمد اور کلی کی چٹک پر باغ باغ ہو جائے۔

وہ لوگ جو آداب مجلس کے کسی دقیانوسی معیار کے خواب پریشاں میں مبتلا ہیں ان تمام رس پھلوں کو ہنسی خوشی سے قبول نہیں کریں گے جو شدید انتظار کے دوران میں یا نہایت غیر متوقع طور پر ہماری جھولی میں آگریں۔ لیکن تمام ایجابی خوشی کے وقت سرچشمہ [illegible] مسکراہٹ پیدا کرتا ہے۔ غمگین آدمی کے رونے کی [illegible]

آدمی زیادہ ہنستا ہے اور نسبتاً کم التہاب پر۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہنسی جماعتی وسائل دولت کے نظم و نسق میں قدرتی ارتقا کی وجہ سے "سماجی خوشی" کا ذریعہ ترسیل ہونے کی بجائے خوشی کی "سماجی ترسیل" کا ذریعہ بن گیا ہے اور ہمارے نظام عصبی میں عام طور پر خوشی اور تسکین کا مترادف بن گیا ہے۔

ہنسی کامیابی اور زندگی کی دلیل ہے۔ صرف شاعروں کے گیتوں ہی میں نہیں ـــــ بلکہ مذہبی رسوم میں بھی اسے ایسا ہی مانا گیا ہے۔ ہنسی کو معبدوں سے صرف ہمارے مذہب زدہ زمانے میں ہی دیس نکالا ملا ہے اور صرف آنسوؤں ہی کو دیوتاؤں تک پہونچنے کے لئے مناسب ذریعہ قرار دیا گیا۔

رومن تہوار ـ [illegible] کے دوران میں دو نوجوان قربانگاہ پر خون آلودہ خنجر سے چھوئے جاتے تھے اور جب دودھ میں بھیگی ہوئی مٹی بھر اون سے ان کی پیشانی کا خون صاف کیا جاتا تو رواج کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ ہنسیں۔ یہ ہنسی دنیا میں ان کی نجات کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

تمام پرانے اور سیدھے سادے مذہبوں میں جو ہمارے مذہب کی طرح موت اور نفی سے زیادہ وابستہ ہیں اور جن کے پیروکار اپنے دیوتاؤں کی حقیقت میں واقعی یقین رکھتے تھے۔ ان تمام مذاہب میں ہنسی نے اپنا منصب ادا کیا ہے۔

نہ صرف انسان ہی دنیا کی برکتوں کیلئے دعا مانگتے وقت دیوتا کے سامنے ہنستے تھے بلکہ خود کروڑوں دیوتا جو غیر فانی زندگی کے مظہر ہیں ہم ملکر لازوال قہقہے لگاتے تھے۔

ان باتوں کے بعد یہ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفیوں نے آنسوؤں، آہوں اور ماتھے کی ملال انگیز غمگین شکنوں کو تو پر معنی مان لیا ہے مگر ہنسی کو اس طرح ٹال دیا ہے جیسے کہ وہ قدرت کی کوئی غلطی یا قابل مواخذہ جرم ہے۔

میں ہنسی کے مسئلہ کو ٹالنے کی کوشش نہیں کرونگا بلکہ اس کو انسانی جوہر کا سب سے ضروری حصہ سمجھتے ہوئے اور اگر دنیا میں کوئی بھی خندہ آور چیز نہ ہوتی تو بھی اس کا وجود مانتے ہوئے یہ بیان کروں گا کہ یہ اپنے اصلی حلقۂ اثر سے باہر جاکر کس طرح مذاق کی تنقید اور قدر شناسی میں کام آئے گی۔

فضل اقبال

زرد چراغ

گل کرو، پھینک دو پہلے ہی سے یہ زرد چراغ
آج بھی عیش کے لمحات فسردہ کیوں ہوں

ملگجی شمع کے پرتو میں جوانی کا خمار
خود بخود اک نئے احساس سے تھرا جائے
مجھکو منظور نہیں، میری مسرت کی بہار
ایک مغموم تصور ہی سے گھبرا جائے

جگمگاتے ہوئے ریشم کا پرانا ملبوس
جسم افسردہ کی زردی کو چھپا ہی لے گا
رات کے وقت بہرحال یہ نیلا فانوس
تم سمجھتی ہو کہ خلوت کو سجا ہی لے گا

کل یہی ساز یہی گیت۔ یہی جام شراب
جھلملاتی ہوئی دیوار پہ تھراتے تھے
رات یہ شمع۔ یہ تارے۔ یہ سنہرا مہتاب
خلوت عیش میں کچھ سرد ہوئے جاتے تھے

دھندلے دھندلے سے انہی ریشمیں پردوں کے ادھر
حسن و محبت کے نظارے بھی یہاں کیوں دیکھوں
جنکے چہروں سے مجھے اپنے گناہ آئیں نظر
ایسے وہ چاند ستارے بھی یہاں کیوں دیکھوں

ہاں ہٹادو مری نظروں سے یہ پژمردہ چراغ
میرے گاتے ہوئے جذبات فسردہ کیوں ہوں

چند نظمیں

ایک چیخ

میں نے کل رات ایک چیخ سنی — درد سے کروٹیں بدلتی ہوئی
اِک گلی سے بگولا بن کے اُڑی — شہر کی وسعتوں پہ پھیل گئی
خامشی کا طلسم ٹوٹ گیا — اور فضاؤں کو رعشہ چھوٹ گیا
میں جونہی پھینک کر قلم لپکا — چٹخنی کھولنے ہی والا تھا
کہ مری اُنگلیاں اکڑ سی گئیں — اور کہیں میری آنکھیں گڑ سی گئیں
دفعتاً اس گلی کے کونے سے — میں نے دو چار قہقہے سُنے
قہقہوں کی ردا میں لپٹی ہوئی
چند سکّوں کی کھنکھناہٹ تھی

التماس

ہے میرے دل میں بھی شوقِ منزل مگر کوئی راہ بھی دکھائے — یہ کیا کہ دل میں دھڑکتا جائے مگر کبھی سامنے نہ آئے
اگر میں اب پاؤں توڑ بیٹھا ہوں، اسمیں میرا قصور کیا ہوا — اگر وہ مجھکو سہارا دیدے تو اُسکی رحمت سے دُور کیا ہے
بجا کہ مایوس ہو چکا ہوں، بجا کہ نومید ہو چکا ہوں — مگر یہ کس نے کہا کہ میں داغِ عشق سینے سے دھو چکا ہوں
تو اپنے اک بندۂ حزیں کو سہارا دینا گوارا کر لے — وگرنہ تو اذن دے کہ یہ دامنِ طلب پارا پارا کر لے
بس اتنا کہہ دے: "ندیم! وہ سامنے کھڑا ہے حریم میرا!"
تو تیری مَن میں، قسم تیری، مر مٹے گا قلبِ دونیم میرا!

عمل کی باتیں

ختم کر دوست، ابد اور ازل کی باتیں — آج تو بھول کے کیوں کرتا ہے کل کی باتیں
داستاں کوئی اس اُجڑی ہوئی دنیا کی سُنا — اور پھر شوق سے کر شمس و زحل کی باتیں
شاید اب سدرہ و طوبیٰ سے ہے یارانہ ترا — بھول بیٹھا ہے گلاب اور سمن کی باتیں
کیا زمانے کے نئے بُت نہیں دیکھے تو نے — کہ سناتا ہے مجھے لات و ہبل کی باتیں
چلّہ کش رہنے میں اک کیف سا ملتا ہے ضرور — کام آئیں گی مگر اب تو عمل کی باتیں
ڈھالتا رہتا ہوں میں شعلوں میں اشعار اپنے
تجھکو کس طرح سناؤں میں غزل کی باتیں

احمد ندیم قاسمیؔ

چھیلا میاں

انسانی کاریگری یہ سمجھی گئی ہے کہ اس کا ہاتھ سدھا ہوا ہو۔ ایسا سدھا ہوا کہ اگر لوہار ہے تو جہاں ہتوڑے کی پہلی چوٹ پڑی وہیں اور چوٹیں بھی پڑیں۔ بڑھئی ہے اور پلنگ کے پلنے بناتا ہے تو چاروں ایک ڈھال کے ہوں۔ یعنی جتنے پرزے وہ بناتے ان میں دیکھنے والے کو فرق نظر نہ آئے۔ لیکن اللہ میاں کا کمال اس میں ہے کہ انسان ہوں یا حیوان سب اپنی شان میں الگ۔ مجال ہے کہ ایک کی صورت دوسرے سے مل جائے۔ انگوٹھے کے نشان ہی دیکھ لو ہر آدمی کے جدا ہیں۔ صورت تو صورت سیرت میں بھی سب کی اختلاف ہے۔ جیسی وضع وضع کی شکلیں ویسی ہی طرح طرح کے خیالات اور سب اپنی اپنی دھن میں پکے۔ اپنے اپنے حال میں مگن۔

چھیلا میاں کو تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ ان کے انتقال کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ یہ تو شاید جس سے پوچھو گے وہ بتا نہیں سکے گا کہ ان کا اصل نام کیا تھا۔ کہاں پیدا ہوئے؟ لڑکپن کیسا گزرا؟ جوانی میں کیا کرتے رہے اور دلّی میں کب آئے؟ لیکن آدمی تھے عجب مزے دار، مرنجان مرنج۔ بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان۔ ہمیشہ سدا سہاگن بنے رہتے۔ رنڈیوں میں ان کی بڑی آؤ بھگت تھی۔ سنا ہے شہر کی اکثر گانے والیاں مرید بھی ہوگئی تھیں۔ کیا تعجب ہے؟ یہ عقیدے کی بڑی پکی ہوتی ہیں۔ پھر چھیلا میاں کسی کو دکھ دیوا نہیں۔ کیا مقدور کسی کے ہاں پان تک کھا لیں۔ تعلق بس اتنا ہی رکھتے کہ گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے ہر ایک کے ہاں الگ تھلگ بیٹھے باتیں سنا کرتے۔ کوئی صلاح کی بات ہوتی تو آہستہ سے کہہ دیتے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

ہاں ایک چیز تھی جس پر مدتوں لوگوں کی چہ میگوئیاں رہیں اور کسی پر یہ بھید نہیں کھلا کہ آیا یہ رنڈیوں کے خفیہ ایجنٹ ہیں یا کوئی بیماری ہے کہ جہاں گانے بجانے کا جلسہ ہوتا حضرت سب سے پہلے موجود۔ اور اس طرح جیسے انہی کے ہاں جلسہ ہے۔ نک سے ٹک تک سارا انتظام، کوئی کہے نہ کہے اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ سلیقے کے بھاری، بھکم، درویش وضع آدمی تھے۔ لوگوں کو کیا بُرا تھا، مفت کا انتظام کرنے والا ملتا۔ ہر ایک کو قرینے سے بٹھاتے۔ گانے والیوں کی الگ خاطر، شوقینوں کا جدا خیال۔ وقت کی چیزیں گواتے۔ کسی کو بے کیف ہونے کا موقع نہ ملتا۔ پھر کفایت شعار ایسے کہ جس تقریب کا سو کا تخمینہ ہوتا پچھتر میں جلسہ کی رونق دوبالا کر دیتے۔ طوائفوں کی چون وچرا کرنا حرام تھا۔ جسے جو کچھ مٹھی بند کرکے دے دیا سوس کرکے لے گئی۔ نہ سازندوں کے نخرے اٹھانے پڑتے نہ نائکا بھویں چڑھاتیں۔

رفتہ رفتہ چھیلا میاں کی یہ شہرت عام ہوگئی اور اب لوگ انہیں دے کر بلانے لگے۔ جو لوگ جلسوں سے بھاگتے تھے کہ کون رنڈیوں کے میں پڑے۔ نقصانِ مایہ کے ساتھ اگر محفل میں بدمزگی پیدا ہو جائے تو میں شماتتِ ہمسایہ بھی اٹھائے۔ وہ بھی مجروں کے لئے تیار ہوگئے۔ کو بلایا اور کہہ دیا کہ اتنی رقم میں جلسہ ہونا چاہیئے۔ میاں کی مراد بر آئی کمر باندھی اور مستعد۔ آپ ہی طائفے انتخاب کرتے، محفل جماتے اور اس رقم میں سے بھی کچھ نہ کچھ بچا دیتے۔ بعض بعض موقعوں پر تو بعد میں معلوم ہوا کہ صاحب خانہ کی رقم جوں کی توں رہی اور جلسہ ہوگیا۔ لوگوں کو حیرت تھی کہ آخر ان کو اس قدر ناچ گانے سے دلچسپی کیوں ہے؟ درد سر مول لیں اور نفع بظاہر کوئی نہیں۔

ہماری ٹولی کی چھیلا میاں سے بہت پرانی یاد اللہ تھی جس جلسے میں ہم جاتے خوب آؤ بھگت کرتے۔ کبھی ویسے بھی کسی کوٹھے پر نکل گئے اور وہاں یہ حضرت ہوتے تو ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا رہا۔ ہم میں ایک دو ایسے بھی تھے جو ہر وقت اس ٹوہ میں رہتے کہ چھیلا میاں کو یہ آپ کو سوختت غیر کو لذت کی کیا بیماری ہے؟ مفت خدا دوسروں کے لئے اپنی جان کو عذاب میں مبتلا کرنا کہاں کی خیر خواہی ہے؟ اور پھر خدا اور رسول کے خلاف۔ قومی و ملکی مفاد کی صریحاً مخالفت۔ دنیا تو ان عیش پرستیوں اور فضولیات سے بھاگنا چاہتی ہے۔ لیڈروں کی کوششیں ہیں کہ سماج ایسی لعنتوں سے پاک ہو۔ برعکس اس کے چھیلا میاں گانے مجرے اور حسن پرستیوں پر فدا ہیں۔ اور جتنا ان سے ہو سکتا ہے قدمے، سخنے، درمے برابر ترغیب دئے جا رہے ہیں۔ اور لطف یہ کہ قوم کے نوجوانوں میں ان کا اثر زیادہ ہے۔ حالانکہ ان اٹھتی ہوئی کونپلوں کو بچانا چاہیئے۔

واقعہ بھی یہ تھا کہ ہر جلسے میں بوڑھے اور میاں شیدا کے ٹہلنے

متوالوں کی نسبت نوجوانوں اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں کی مدارات زیادہ کرتے اور طرح طرح سے ان کے دل لبھانے کی کوشش کرتے۔ میری ان سے اکثر ملاقات ہوتی اور جب وہ ملتے میں ضرور ٹٹولتا، لیکن وہ بڑے گہرے تھے۔ ملنگانہ انداز میں ہنس کر ٹال جاتے۔ درویش صورت آدمی سے زیادہ اصرار بھی مناسب نہیں۔ ممکن ہے کوئی اہلِ خدمت ہوں۔ اللہ کی طرف سے ان کی یہی ڈیوٹی ہو۔ دوسرے انہیں کسی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ کبھی کسی کے پان کے ٹکڑے کا شرمندۂ احسان ہوتے نہیں دیکھا۔ جب کہیں مل گئے اپنا ہی کچھ کھلا پلا دیا۔ پانوں کی ڈبیا ہر وقت عمدہ مہاراج پوری پانوں سے بھری ہوئی رومال میں بندھی رہتی۔ جلسوں میں بھی ناممکن تھا کہ صاحبِ خانہ کی کسی چیز کو ہاتھ تو لگالیں۔ ساری ساری رات بھوکے پیاسے بیٹھے رہتے اور کیا مجال کہ وہاں کا پانی تو پئیں۔

چند روز ہوئے ہمارے دوستوں میں ایک صاحب ولایت سے بیرسٹر ہو کر آئے۔ یاروں نے جلسہ مانگا۔ دولت مند ماں باپ کے بیٹے تھے۔ جلسہ دینے میں کیا عذر تھا۔ جلسہ ہوا مگر کیسا جلسہ؟ نئی قسم کا۔ رنڈیوں کے بدلے انگریزی بھان متی بلائے گئے۔ مسمریزم کے کھیل ہوئے اور آخر میں دوستوں کے اصرار سے قوالوں کی ایک چوکی نے تھوڑی دیر دھیڑ دھپڑ کرلی۔ کسی کو مزہ آیا یا نہیں آیا۔ جلسہ ہوگیا۔ ہماری پارٹی بھی شریک تھی اور ہمارا خیال تھا کہ چھیلا میاں بھی ضرور آئیں گے۔ اسلئے کہ شہر کا کوئی تفریحی جلسہ ایسا نہ ہوتا جہاں وہ نہ جاتے۔ بلانے نہ بلانے سے انہیں بحث نہ تھی۔ یہ دیکھکر ہمیں تعجب ہوا کہ چھیلا میاں ندارد ہیں۔ کم از کم وہ اس جدید قسم کے جلسہ کا رنگ تو دیکھنے آتے۔ انتظام میں انکا دخل نہ سہی۔ کوئی انجانے تو نہ تھے کہ کوئی انہیں ٹوکتا۔

دوسرے دن صبح کو میں خدا جانے کس کام کو جا رہا تھا کہ سامنے سے چھیلا میاں دکھائی دئے۔ میں نے لپک کر ان کا راستہ روکا اور چھوٹتے ہی پوچھا "حضرت رات کو رفیق صاحب کے ہاں آپ کو نہیں دیکھا"۔

روکھی پھیکی صورت بنا کر کہنے لگے۔ "بس میاں اب ہمارے ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ بچ چکی جتنی بچنی تھی۔ جس قوم کے ہونہار اپنی زندگی کی شیرینیوں کو اپنے ہاتھ سے کھاری سمندر میں دھکیلنے لگیں وہ ترقی کر چکی"۔

میں حیران کہ یہ کہتے کیا ہیں۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان۔ قومی ترقی و تنزل کا کیا ذکر۔ ان کی شکل دیکھنے لگا۔

بولے "میری طرف کیا دیکھتے ہو۔ جھوٹ نہیں کہتا۔ کہتا ہوں جیتا رہا تو دکھا دوں گا کہ یہ ساری نئی تانتی دھوبی کے کتے بن کر رہیں گے گھر کے نہ گھاٹ کے"۔

میں:- میں پوچھتا ہوں کھیت کی آپ کہتے ہیں کھلیان کی۔

چھیلا:- کھیت کے کھلیان ہونے میں کچھ دیر نہیں رہی۔ پیتے پڑگئی ہیں۔

میں:- اجی میں یہ پوچھتا ہوں کہ رات کے جلسے میں آپ نہیں گئے۔

چھیلا:- میں بہرا نہیں۔ اسی کا جواب دے رہا ہوں۔

میں:- میاں! آپ تو آج کچھ اکھڑی اکھڑی سی باتیں کر رہے ہیں۔

چھیلا:- (ٹھنڈا سانس لیکر) برخوردار تم کیا جانو کل سے میرے دل پر کیا گذر رہی ہے؟

میں:- (چھیلا میاں کا منہ دیکھکر) کیا ہوا؟ کوئی خلاف مرضی سانحہ پیش آیا؟

چھیلا:- ارے میاں میں کیا اور میری مرضی کیا۔

میں:- پھر؟

چھیلا:- میاں رات کو جو تمہارے دوست کے ہاں جلسہ ہوا ہے! اس نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہماری قوم کسی طرح روحانی یا مادی ترقی نہیں کرسکے گی۔ تم ہی ایمان سے کہو حواسوں کے بغیر انسان کی زندگی، زندگی ہوتی ہے؟

میں:- ہرگز نہیں! مگر.....

چھیلا:- اگر مگر سے مجھے نفرت ہے۔ میری سنو!

میں:- فرمائیے؟

چھیلا:- اور حواس کا چاق چوبند ہونا زندہ رہنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

میں:- بیشک۔ اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے!

چھیلا:- پھر حواس کے چاق چوبند رہنے کا ذریعہ؟ بولو۔ چپ کیوں ہوگئے

میں:- آپ ہی بتائیے؟

چھیلا:- ان کی غذا پہونچانا۔

میں:- ان کی غذا کیا ہے؟

چھیلا:- جانو بھی! حواس کی غذا نہیں جانتے؟ اچھا حواس کے ہیں؟

میں:- پانچ!

چھیلا:- کیا کیا؟

میں:- باصرہ، سامعہ، شامّہ، ذائقہ، لامسہ!

چھیلا۔ باصرہ کی غذا کیا ہے؟ اچھی صورتوں کو دیکھنا! سامعہ کو قوت پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اچھے نغمے سُنے جائیں۔ شامّہ محبت، کے پھولوں کی بوسونگھ کر بنتی ہے۔ ذائقہ عمدہ عمدہ مزیدار غذاؤں سے برقرار رہتا ہے اور جب تک ایسی چیزیں نہ چھوئی جائیں جن سے دل میں گدگدی ہو، لامسہ کو مُردہ سمجھو۔

میں۔ (بات کاٹ کر) اچھا آپ رات والے جلسے کے شاکی ہیں۔

چھیلا۔ لاحول ولاقوۃ۔ مجھے شکایت سے کیا واسطہ؟ مگر یاد رکھو کہ اب ہندوستان کوئی ترقی نہیں کرسکتا۔ حواس کی غذاؤں سے جسم اپنی گرسنگی حواسوں میں رہتا، یعنی چہ؟ اور جب آدمی بدحواس ہوگیا تو محض معطّل رہا۔ صاحبزادے یہ لوگ اپنی غلامی سے نکل کر دوسروں کے غلام بن رہے ہیں۔ ہندوستانی قسم کے جلسوں میں ایک ایک حس کی الگ الگ غذا پہونچنے کے علاوہ اپنی دولت بھی کہیں باہر نہیں جاتی۔ رنڈیاں کماتی ہیں رنڈوے کھاتے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے خدا جانے چھیلا میاں کو کیا بات یاد آئی کہ یکایک بغیر صاحب سلامت کئے روانہ باشد۔ میں دو چار منٹ تک تو اُن کو جاتے دیکھتا رہا۔ پھر دل میں سوچنے لگا کہ چھیلا میاں کو ہم تو یونہی اوٹ پٹانگ ایک رنڈیوں کا پیر سمجھتے تھے۔ لیکن یہ حضرت تو بہت دور نکلے۔ ان کا دماغ بھی انقلاب پسند ہے۔ سچ ہے انقلابی ہونے کے لئے کسی خاص چولے اور رنگ کی ضرورت نہیں۔ کوئی چولا کوئی رنگ ہو اور کوئی نظریہ، صرف دھن کا پکا اور ہاتھ کا سچا ہونا چاہیئے۔

اشرف صبوحی؛

پہلی رات کا چاند

دُور تک سطحِ زمیں پر ہے فلک چھایا ہوا
جیسے محکوموں کے دل میں اپنے حاکم کا خیال
ننھے بادل آسماں کے مُنہ پہ ہیں پھوڑوں کے داغ
جن کی کثرت میں لرزتی ہو درخشندہ لکیر
جیسے کانپے عیش کراں کے حلقۂ آغوش میں
بھوکی پیاسی پتلی دُبلی ایک دوشیزہ کا جسم

رات کی دُھندلاہٹوں میں جگمگاتی ہو لکیر
آڑی ترچھی ٹیڑھی بینگی اور خم کھائی ہوئی
یعنی میرے خستہ و مجروح سینے کی خراش
کھود کر گہرا جسے کرتا ہے رنجِ روزگار
جس سے اکثر رستا رہتا ہے درخشندہ لہو

مسکراتی ہے لکیر اور پھیلتا جاتا ہے نُور
میں اک انساں اپنی ہی جیسے اک انساں کا غلام
دہر کی آلائشِ مکروہ میں لتھڑا ہوا
ڈھونڈتا ہوں روشنی، رخشندگی تابندگی

یہ لکیر۔ اک تنگ در چھوٹی گلی اک، رہگذر
گال پر ٹپکے ہوئے آنسو کی اک باریک رَو
جا رہی ہے نور میں لپٹی ہوئی، بھیگی ہوئی
ایک نامعلوم، پُر اسرار منزل کی طرف
اور ادھر سایوں میں لپٹا۔ کر رہا ہوں میں تلاش
اس میں وہ محبوبہ جسکو آج تک دیکھا نہیں

مخمور جالندھری؛

ولی کے پہلے کی دکھنی شاعری

دکھنی شاعری کی ابتدا [illegible] میں ہوئی ہے۔ ابتدائی نظم کے نمونے اسی زمانے کے ملتے ہیں۔ اور [illegible] سے لیکر [illegible] تک دکھنی شاعری معراج کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد دکن کے بہت بڑے حصے میں دکھنی کے بجائے شمالی ہند کی زبان یا بالفاظِ دیگر اُردو مروّج ہوتی گئی۔ ولی کا زمانہ [illegible] ہے۔ بقول بعض ۱۱۱۹ھ اور بعض کے خیال کے مطابق ۱۱۴۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس موقع پر ہم صرف ولی کے زمانہ تک کی غزلوں کی صراحت [illegible] جائے گی۔

دکھنی شاعری کا بڑا ذخیرہ مثنوی کی صورت ہی میں ملتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنی ایک کتاب میں جو دکھنی مثنویوں کے عنوان سے مرتب کی گئی تقریباً دو سو طویل مثنویوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسی مختصر مثنویاں جو پچیس تیس شعر یا اس سے کم و زیادہ کی ہیں جن کو ہم نے متروک کر دیا ہے ان کو شامل کر لیا جائے تو پھر ان کی تعداد تین چار سو تک پہونچ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف غزلوں کی جانب دکھنی شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے۔ [illegible] جو اب تک دستیاب ہوا ہے اس میں سلطان محمد قلی، عبداللہ قطب شاہ، اور سلطان علی عادل شاہ کے سوا دوسرے ایسے خوش نصیب یا [illegible] شعرا ہی ہیں جن کا نام غزل نگاری کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہو۔ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم کو اپنے لئے زیادہ مفید اور سودمند تصور کیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ غزل معشوق کے راز و نیاز اور اس کے کرشمہ اور [illegible] کا بیان اور معشوق سے گفتگو کا نام ہے۔ اس لئے دکنی شعرا میں انہوں نے ہی ایسی خیال آفرینی کی ہو جن کو یہ باتیں میسر تھیں۔ جن کی نظر پر [illegible] شاہد و ساقی رہا کرتے تھے۔ جن کا ماحول ہی بتانِ طناز کی جلوہ گری تھا۔ جن کے آٹھوں پہر ہوشان سیمیں تن کی صحبت میں رنگ رلیوں کے ساتھ بسر ہوتا تھا۔ چنانچہ جن شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور۔ ان کی زندگی جس طرح معشوقوں اور محبوبوں میں بسر ہوتی تھی وہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے سوا اگرچہ غواصی، شوقی، نصرتی، ہاشمی وغیرہ کی غزلیں ملتی ہیں لیکن انکی تعداد کم ہے۔

غزلوں کے متعلق مزید صراحت کے پہلے اس وقت کے تمدن اور معاشرت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ اس وقت کی [illegible] کا ایک خاکہ پیش نظر ہو جائے۔

سلطان محمد قلی اپنے بچپن سے ایک عاشق مزاج اور رند مشرب شاہزادہ تھا جس کی ابتدائی زندگی سے لیکر مرنے تک معشوقوں میں بسر [illegible] سلطانی محل میں ہر ایک ملک اور ہر مذہب کی عورتیں جمع تھیں۔ اگر ان میں دکن اور گجرات کی نازک بدن اور گل اندام رانیوں کی فراوانی تھی تو [illegible] ایران اور ترکستان کی گل رخسار اور گل رخ حرموں کا بھی جمگھٹا تھا۔ ہر وقت عیش و نشاط کی محفل گرم رہا کرتی، موسیقی کی دلکش نغمہ نوازی [illegible] سرور کرتی قلب کو سرور پہونچاتی۔ مئے ناب کے دور مدہوش کرتے تھے، بقول ڈاکٹر زور "اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں خوبی، حسن [illegible] وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں اور کئی مذہبوں اور ہر وضع قطع کی نازنین آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ [illegible] حسن و جمال کی آرائش و زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و رعنائی کے بے پناہ جذبات کا [illegible] کرتی رہتی تھیں۔"

اسی طرح اس کے نواسہ سلطان عبداللہ کا دورِ حکومت بھی اس کی یاد تازہ کرتا تھا۔ جب بادشاہ اس قسم کے شاہد و ساقی پسند ہوں [illegible] ہے کہ ملک کی کیا حالت ہوگی۔ چنانچہ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں گولکنڈہ میں بیس ہزار سے زیادہ طوائفیں آباد تھیں۔ اور یہ [illegible] ہندوستان کے مختلف شہروں سے جن میں گجرات، بنگال، دہلی، آگرہ، لاہور حتیٰ کہ کابل بھی شامل تھا۔ طوائفیں گولکنڈہ میں آتی اور [illegible] تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی کوئی تقریب خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی بغیر طوائف کے انجام نہیں پاتی تھی۔ عیش [illegible] رقص و سرود کی محفلیں عام طور سے ہوتی تھیں۔ ہر شخص نغمہ و طرب کا دلدادہ تھا۔ گولکنڈہ کی فضا ہی نغمہ نواز ہو گئی تھی۔

[illegible] میں بھی ابراہیم اور علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں یہی حالت تھی۔ بزم عیش و طرب گرم رہا کرتی [illegible]

رنگ ریلے ہوتے ساقیان مہ وش و نازنینان گلبدن اور زاہد فریب دانیاں زینت محفل ہو کر صحبت کو گرماتی۔ ان ماہ جبینوں کی جلوہ آرائی۔ انکے مختلف لباسوں اور نیم برہنہ جسموں اور قیمتی جواہرات کی ضیا پاشی سے محفل کا سماں دوبالا ہو جاتا۔ اور ساغر کے دور سے گلگوں کے سرود سے طبیعتیں سرشار و مدہوش ہوا کرتی تھیں۔

اس وقت کی عام معاشرت میں سادگی، بلند مشربی، عالی دماغی کا وجود نابود ہونے لگا تھا۔ تمدن اور رسمی شائستگی میں پیچیدگی اور تکلف نے جگہ لے لی تھی۔ عالیشان عمارات کی زیبائش اور آراستگی میں سونے کو پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ جنت نظیر باغوں، فردوس منظر گلزاروں اور رشک ارم خیابانوں کی چمن بندی اور گلشن آرائی میں بے دریغ روپیہ صرف ہو رہا تھا۔ یہ تھی وہ فضا، یہ تھا وہ ماحول، جبکہ گولکنڈہ اور بیجاپور میں دکھنی شاعری کا بول بالا تھا۔

اس کے ساتھ دکھنی شعرا کے لئے جو نمونہ پیش نظر تھا وہ حافظ و سعدی۔ کلیم و خسرو اور حسن کی غزلیں تھیں۔ اسی کو ماڈل قرار دیکر دکنی شعرا نے اپنی غزلیں لکھیں۔

فارسی شاعری یا فارسی غزل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا اس میں یا تو عشقیہ مضامین ہیں یا پھر ان کو تصوف کی جانب منسوب کر کے عشق حقیقی کا رنگ دیا جا سکتا ہے۔ فلسفہ یا اخلاق یا اور کوئی موضوع غزلوں کی پامال زمین میں نہیں مل سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس نمونہ کو آگے رکھکر جو غزل سرائی ہوئی ہوگی تو اس میں بھی سوا ان ہی موضوع کے اور کوئی موضوع تلاش کرنا عبث اور بے سود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری کے علمبردار اور ناخدا قدیم شاعری اور اس کے موضوع پر حرف زنی کرتے اور اردو شاعری کو موضوع کے لحاظ سے تہی مایہ قرار دیتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں ولی اور میر سے لیکر حالی تک جو غزل نگاری ہوتی رہی ہے وہ حقیقت سے دور اور اصلیت سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ لیکن اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ دکنی غزلیں حقیقت پرداز تھیں اور دکنی شعرا غزلوں میں بھی حقیقت نگاری کرتے تھے تو بیجا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس امر کی صراحت کردی گئی ہے کہ زیادہ تر سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور نے غزل سرائی کی ہے اور ان کے تصرف اور قبضہ میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کی کمی نہیں تھی۔ رخساروں کی گلگونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آنکھوں پہر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیا تھا۔ اس لئے اگر انہوں نے معشوق کی تعریف اور توصیف کی ہے تو گویا انہوں نے اصلیت کو پیش نظر رکھ کر واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جن دوسرے شعرا نے غزلیں لکھی ہیں ان کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے لئے معشوقوں کی کمی نہیں تھی۔ فرضی معشوق تلاش کرنے اور اس کے عشق میں سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ گولکنڈہ اور بیجاپور حسینان جہاں کے مرکز بن گئے تھے۔ ان لوگوں کی غزلوں میں زمانہ مابعد کی غزلوں کی طرح مبالغہ آمیزی کی بہتات نہیں ہے۔

اب ہم سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کے غزلوں کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں تین سو سے کچھ زیادہ غزلیں ہیں۔ اس کی بہت ساری غزلوں میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے اور اس نے جگہ جگہ اس امر کا اقرار کیا ہے کہ وہ اپنے عشق حقیقی کو چھپا نہیں سکتا، جب منصور جیسا عاشق بھی اس کو چھپا نہ سکا تو اس کی کیا مجال جو اس کو چھپا سکے، اور اقرار کرتا ہے کہ مجھے دنیا میں بجز آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن دیکھنے والوں کے لئے دنیا تیرے ہی حسن کا ایک عکس ہے۔ اس دنیا کو حکما اور فیلسوف اپنے علم و فضل و حکمت و دانش کے زور سے نہیں سمجھ سکتے۔ اسلئے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنیکے بجائے پیا کے نام کا ترانہ عیش گانا بہتر ہے۔

سلطان نے اپنی کئی غزلوں میں خواجہ حافظ کے غزلوں کی ترجمانی کر دی ہے۔ حافظ کی پوری کی پوری غزل سلطان نے اپنی زبان میں کامیابی سے منتقل کر دی ہے۔

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ سلطان کی زندگی عیش و عشرت سے معمور تھی اور اسی کی بدولت اس کی شاعری پروان چڑھی۔ سلطان کی غزلیں حسن و عشق کی اصلی اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اس نے اپنی غزلوں میں اپنی محبوبوں اور پیاریوں کے حسن رنگین، انداز معشوقی، ناز و نیاز محبوبی اور ان کی دل نوازی، غمزہ بازی و کرشمہ سازی کے ایسے ایسے نوٹو کھینچے ہیں کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ اس کی تشبیہیں اور استعارے لاجواب ہیں۔ اس کی غزلیں حسن و عشق کی شیریں اور پُر لطف داستان ہی نہیں ہیں بلکہ اس نے وصال کے کیف و سرور کو بھی بے تکلف الفاظ

سکتے ہیں کہ کسی مصور کو بھی ایسی عریاں فوٹو پیش کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ راز و نیاز کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو سلطان کے قلم سے چھوٹ گیا ہو۔ حسن اور شباب کی رنگا رنگ رنگینیوں اور جذبات کی جولانیوں کے اظہار میں اس سے بڑھ کر شاید ہی کسی شاعر نے خیال کیا ہو۔

اس کے ساتھ ہی ایک عمدہ غزل کے جو لوازم قرار دئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سادگی شیرینی اور حلاوت، رنگینی وغیرہ، یہ سب کچھ اس کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

سلطان محمد قلی کے بعد عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ کا نام آتا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا کا پورا جانشین تھا۔ اسی طرح عیش و عشرت میں اپنی زندگی بسر کی۔ لیکن اس کے کلام میں وہ خوبی اور رنگینی اور حلاوت اور شیرینی نہیں پائی جاتی جو اس کے نانا قلی کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ سلطان عبداللہ کا ایک مختصر دیوان موجود ہے۔ اس میں بجز غزلوں کے کوئی اور صنف سخن نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شاعری کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اسکے کلام میں جیسا کہ لکھا گیا ہے، اگرچہ وہ خوبی اور نزاکت نہیں جو محمد قلی کے کلام میں پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس نے بھی اپنے ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ اور اپنا حال سنایا ہے۔ اور آپ بیتی واقعہ کو شعر کی صورت دی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے ساتھ سلطان علی عادل شاہ کا تذکرہ بحیثیت غزل نگاری کے ضروری ہے۔ اگرچہ اس کے دیوان میں صرف دو موجود ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ شاہی کی غزلیں بھی حقیقت نگاری کا مرقع ہیں۔ رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی میں شاہی نے کامیابی سے اپنے تخیل کو کام میں لایا ہے۔

معشوق کی وہی زلفِ سیاہ، رخسار گلگوں اور چشم فتاں کی تعریف ہے۔ اس کی ترچھی نگاہ سے عاشق کا دل گھائل ہوتا اور تیر نظر سے دل و جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا۔ معشوق کی جدائی کا صدمہ اس سے سہا نہیں جاتا۔ زمانہ فراق میں رات کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو چین ہوتا ہے۔ کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہوتا۔ اس کے آنسو نکلتے ہیں۔ جدائی میں ایک ایک پل ایک ایک سال معلوم ہوتا ہے۔ وہ شمع کی طرح پگھل جاتا ہے یہ اور اسی قسم کے خیالات ہیں لیکن ان کو نئی نئی تشبیہوں اور تمثیلوں سے پیش کیا گیا ہے۔

سلاطین گولکنڈہ کے بعد اس دور کے دوسرے شعرا جن کی غزلیں ہمدست ہوئی ہیں دو چار ہی ہیں۔ اگرچہ اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ دوسرے شعرا نے بھی صنف غزل میں خیال آفرینی کی ہے لیکن وہ سب اب ناپید ہیں۔ جن دو چار شعرا کی غزلیں ملتی ہیں ان کی تعداد کم ہے۔ ان کے غزلوں میں بھی وہی سب کچھ ہے جو ایک اچھی غزل میں ہونا چاہتے۔ زمانہ مابعد کے شاعروں اور ان میں جو ایک فرق ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ مابعد میں فرضی معشوق کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف ہونے لگی۔ اس کی کمر بال سے باریک بننے لگی اور منہ نقطہ سے کمتر بننے لگا ایک ایسا معشوق پیدا ہو۔ لگا جس کا وجود نابود تھا۔ لیکن دکنی شعرا کا معشوق فرضی نہیں ہوتا تھا اور وہ اس قسم کی مبالغہ آمیز تعریفیں نہیں کرتے تھے۔

اگر ولی کے پہلے کی ضخیم مثنویوں کی تعداد بیان کی جائے تو بلامبالغہ سینکڑوں تک پہونچ سکتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر جملہ شاعروں کی غزلوں کو جمع کیا جائے تو ان کا مجموعہ زیادہ ضخیم نہیں ہو سکتا۔ ان میں بڑا حصہ سلاطین کی غزلوں کا بھی ہوگا۔

یہ موقع تھا کہ بعض غزلیں بھی پیش کی جاتیں مگر ایک تو طوالت مضمون اور دوسرے دکنی زبان ہونے کے لحاظ سے اس وقت ان سے کچھ لطف بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ولی کے پہلے کی دکنی غزلیں حقیقت بردار ہوتی تھیں۔ جو کچھ اس میں بیان کیا جاتا تھا وہ سب کچھ اصلیت ہوتی تھی یہ اور بات ہے اس سے کوئی فائدہ تھا یا نہیں! اس میں شک نہیں کہ وہ بھی اردو ادب کی خدمت تھی اور دکنی شعرا نے اس فرض کو ایک حد تک اچھی طرح انجام دیا ہے۔ ان کا کلام موجودہ اور آنے والی نسل کے لئے شرمندہ کرنے والا نہیں بلکہ فخر کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی

بنگالی نظمیں

ازلی بیباک

ہمدم! سنو میں خدا کا سہارا حاصل کر کے ہمیشہ کے لئے منڈر انسان بن گیا ہوں!

اور جسے بھی اس کے بحرِ کرم کا قطرہ مل گیا گویا اُسے کونین کی دولت مل گئی۔ وہ نڈر بن گیا۔ خوف کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ ہمدم! اس کے راہِ مستقیم میں کوئی بندھن نہیں، کوئی رکاوٹ نہیں۔ اور جتنے بندھن ہیں انہیں پاش پاش کرنے کے لئے خود وحدہٗ لاشریک انسانوں کے سینوں میں بے پناہ بیکل موجوں کی طرح بہتا رہتا ہے۔ اس کی بھیانک تباہ کن شمشیر ہمیشہ بلند ہو کر ناچتی رہتی ہے۔

آؤ، آج میں انہیں اپنی یوم پیدائش کی کہانی سُناتا ہوں جنہیں مجھ پر اعتماد نہیں، جو مجھے کافر و ملعون جیسے القاب سے مخاطب کرتے ہیں۔

ہمدم! ہمدم!! آہ! سنو! جب میں نے پہلی مرتبہ دنیا میں آنکھیں کھولیں ——— زبردست آندھی نے اپنی تمام تر چیرہ دستیوں کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا! گھر کی چھت طوفان کا لقمہ بن گئی اور در و دیوار تھپیڑے کا مقابلہ نہ کرنے کے بعد چور چور ہو گئے۔ گویا میری آمد کے ساتھ صورِ اسرافیل نے اپنی بند زبان کا تسمہ کھول دیا تھا اور ہر طرف تباہی و بربادی کے مناظر نمایاں ہو گئے تھے ——— مگر! میرے کانوں میں فوراً "اللہ اکبر" کی میٹھی آواز لہراتی چلی آئی اور پہلی بار آنسوؤں کے ساتھ میرے حلق سے چیخ نکلنے لگی ——— اس مقدس آواز کا پیچ و تاب، اس کی برق آسا کڑک میری نبض میں سمٹ گئی اور ذی روح و غیر ذی روح مخلوق میرے ارد گرد جمع ہو گئی!

یوم پیدائش کا وہی خوفناک طوفان مجھے کتنی معلوم اور غیر معلوم راہوں میں پھینکتا رہتا ہے، اس کا کوئی شمار نہیں۔ پہاڑوں، جنگلوں، سمندروں اور ریگستانوں کی آغوش میں کھیلتا رہا۔ بھیانک پہاڑیاں اور گھاٹیاں میری آرامگاہ بنیں۔ اُف! نہ جانے کتنی دفعہ میں نے یوم پیدائش کی وہ اذان سنی ہے ——— اور اس اذان نے مجھے کہاں کہاں نہیں پہنچایا! میں نے ان راہوں میں تکالیف و مصائب کی برچھیوں کو دل میں پیوست کیا ہے، خون کے آنسو رویا ہوں، بھوک کی شدت برداشت کی ہے ——— لیکن ان تمام ستم رانیوں کے باوجود بھی میں نے "رحمت" حاصل کر لی۔ اس کی بارشِ کرم میرے ساتھ ہے!

میں نے نڈر اور باغی انسان بن کر تمام بندھنوں کے ساتھ جنگ کی ہے کیونکہ یوم پیدائش ہی سے میں سپاہی بن کر آیا ہوں۔ یہی میری حقیقت ہے۔ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ دُنیا کی کوئی رکاوٹ، کوئی بندھن مجھے اپنی "راہِ پیش قدمی" سے منحرف نہ کر سکے ——— لیکن نہیں معلوم میرے اس خواب کو کس کی آواز نے چور چور کر ڈالا۔ عقب سے کس نے مجھے آواز دی۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ جو مجھے عقب سے پکارتا ہے میں کان بند کر لیتا ہوں۔ کبھی گھوم کر نہیں دیکھتا۔ میرا اصول کمزور نہیں ہے ——— یہ کس کی آواز محبت ہے جو مجھے کھینچے لئے جا رہی ہے! یہ کون ہے جس نے میرے قدموں میں بجلی کی سی سرعت پیدا کر دی ہے؟ یہ کون ہے جو مجھ سے بار بار کہتا ہے "اے نادان! یہ وہ راہ نہیں ہے چل ابھی اور آگے چل!"

میرے دماغ میں بغاوت کی جتنی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں ——— ہمدم "اس کا" سہارا پا کر سرد ہو گئیں۔ میرے دل کے اندر ایک عجیب سی ویرانی سی برس رہی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کسی محبوب ترین چیز نے جدائی اختیار کر لی ہے۔ نہ جانے جدائی کا یہ دکھ کیوں دل و دماغ کے گوشہ میں جاگ اٹھتا ہے ———!

وہ کون ہے؟ اللہ! خالقِ ارض و سما! میرا ان داتا!

وہ کون ہے؟ میری تلاش کا حاصل! مسرتوں کا خزانہ!

کیا میں وہی ہوں؟ کیا میں وہی ہوں؟

میں نے اس کے ساتھ پیمانِ محبت استوار کیا ہے ——— آہ! وہ کتنا اچھا ہے ——— کبھی تو مجھے گہری اور بھیانک تاریک گھاٹیوں میں پھینک دیتا ہے اور کبھی اپنی مقدس نور کی لہروں میں بہا دیتا ہے!

میں شہابِ ثاقب اور کرۂ نور کی طرح آزاد ہو کر بھاگا جا رہا تھا ——— جاتے جاتے میں نے کتنی پھول کی بہار دار شاخوں میں پھول

پھوٹتے ہوئے دیکھا لیکن گھناؤنی خطائیں کر گذرا۔ آج یہ سب نمایاں تاریک گناہ میرے حافظے سے ہمیشہ کے لئے خاک آلود ہو گئے ہیں!

گذشتہ باتوں کو کیوں یاد کروں؟ کیونکہ میرے ان ناپاک گناہوں نے مقدس راہ میں گندگی نہیں پھیلائی — میری تشنگی کا رشتہ حسب سابق مضبوط اور نئی راہوں میں بڑھا چلا جا رہا ہے! ہمدم! جانتے ہو جس ندی کی بے کل موجیں سمندر کی پیاس سے نہیں مر سکتی ہیں — ایسے صاف و شفاف پانی کو کوئی غلاظت ناپاک کیسے کر سکتی ہے —!

میرا لخت جگر موت کی جیرہ دستیوں کا شکار ہو گیا، آنکھیں اشک غم سے بھیگ گئیں — آہ! اُس اکلوتے بچے کا سوگ! وہ چند فانی لمحوں کے لئے سنہرے آسمان سے حنا کی خوشبو لیکر آیا تھا! میں اپنے اس بچے کا غم بھلا نہ سکا اور میرا غیر مطمئن دل دکھ کی بانسری کی لہروں میں ڈوب گیا۔ دوستوں نے میری اس بیکلی کو دیکھکر کہا "شفقت پدری ہے یا ہیجان بشر؟"

آہ! یہ کیسا راز ہے کہ جو تصویریں میری آنکھوں سے گذرتی ہیں وہ تادم زیست واپس نہیں آتیں — کیا وہی میری تمناؤں کا ساتھی ہے جو مجھ سے بچھڑ جاتا ہے؟ — میری رُوح روز ازل سے چیخ چیخ کر کہتی ہے "بہت دیر ہو گئی پیارے! کیونکہ کامیابی کے ساتھ تلاش کرم کا رشتہ بھی ختم ہو گیا!"

پھر میں نے محبت کی راہ میں گامزن ہو کر پیش قدمی شروع کی — مگر یہ کون ہے جو مجھے پیچھے گھسیٹنے لگا —؟ کون؟ — ملعون شیطان! جہالت کی تاریکی!

میں نہیں جانتا کون ہے؟ اور کون جان سکتا ہے!

ظلم و ستم کی یہ بھیانک شمشیریں، آلام و مصائب کے گھنگھور بادل اور شر و فساد کی سیاہی آلود شکلیں — اس طرح رقص کرتے زمین پر چھا رہی ہیں جیسے دیوالی کی روشن مشعلوں کو دیکھ کر پتنگے ایک جگہ سمٹ آتے ہیں! میں ان خونناک مناظر سے خوف نہیں کھاتا کیونکہ میں اللہ کا سپاہی ہوں۔ میں دُنیا کے کسی بندھن کو نہیں مانتا۔ میں صرف اُسی کی پوجا کرتا ہوں وہی جو تمام قوتوں سے برتر و اعلیٰ ہے۔ کیا پھر جہنم کا قیدی شیطان! مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ سکتا ہے —؟

یکایک میں نے اپنی نگاہوں کے سامنے آسمان کی پہنائیوں میں لامحدود سیاہ نیلے لباس میں ملبوس عظیم الشان خوبصورت قوس قزح کو دیکھا — میں نے اس کی طرف تیر کا نشانہ کیا — لیکن شیطان قوس قزح کا دامن پکڑ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے اندھیری گھاٹیوں میں لے گیا۔

میں نے دیکھا خالق ارض و سما کی تیز شمشیریں فضا میں ناچنے لگیں اور تباہی و بربادی کا بھیانک طوفان پھر نمودار ہوا ہے۔ میں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگا کر قوس قزح کے سینے میں تیروں کی بارش کر دی اور شیطان کے ناپاک سر میں ٹھوکریں ماریں۔ میں نے دیکھا جیسے وہ اللہ کے عرش کو چھو آیا ہے!

آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا — یہ کیا! یہ تو میرا پروردگار ہے۔ میری خوشی و مسرت ہے! شیطان کہاں؟ یہ تو خوشی کے رس کا گھنگھور شہد ہے! وہی غیر معمولی شہد کا شیریں چشمہ شانتی کی راگنیاں بکھیرتے ہوئے بہتا رہتا ہے — وہ امرت، وہ شیریں اور مدھر شہد اس کے لئے مخصوص ہے جو اُس کی حقیقت کا شناسا ہو!

میں اللہ کا سپاہی ہوں، مجھے کسی بندھن کا خوف نہیں۔ اُس کی تیز برق آسا تلوار تمام بندھنوں کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے!

طوفان میرے روز پیدائش کا ساتھی ہے۔ میں دنیا میں مجروح آیا ہوں — "جہاد، جہاد" — بغاوت میرا نغمہ ہے۔ میری بانسری کی تھالے ہے! دُنیا کی خستہ اور مرجھائی ہوئی کلیوں اور خس و خاشاک کے سر پر بلندی کا تاج رکھکر بڑھا جا رہا ہوں!

دُنیا کا کوئی آسمان، کوئی شہاب ثاقب، کوئی پردہ، کوئی زنجیر اور کوئی قیدخانہ مجھے اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ میں آزاد ہوں، بیباک ہوں، سربلند ہوں!!!

شب و روز مجھے ان داتا اپنی رحمت میں کھینچ کر نے بلاتا ہے — میں اسی فاتح سے ڈرتا ہوں۔ اسی کے سامنے سرِ عبودیت خم کرتا ہوں — — —!!"

—— (۴) ——

صدائے غیب

اے خدائے لایزال! کب تک تیرا فردوسِ بریں گندے انسانوں سے کثیف رہے گا؟

اس سرزمین پر گناہ و معصیت کا دیو مقید ہے!

کب تک پُرہیبت ہیکلوں اور بھوت پریت کا بول بالا رہے گا؟

ظالم کی دل شکن ضربیں کمزور انسانوں کی زندگیاں مٹا رہی ہیں ـــــ ان کی حریص زبانیں خون چوس چوس کر بڑھتی جا رہی ہیں اے پالن ہار! تیری راہ حقیقت! انسانوں کے خوف سے کانپ رہی ہے ـــــ اور رُوحِ شکست کی کمزوری سے خودکشی کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے ـــ آج "انسانیت" خواب نوشیں میں کروٹیں لے رہی ہے اور "بزدلی" آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہے ـــ دیکھ رہی ہے۔ ہماری پُرپیچ زندگی میں سوراخ کر رہی ہے۔ مفلسی اور تنگدستی کے پر نکل آئے ہیں۔ اور ہمارے کمزور منصوبوں نے چمگادڑ کے شکستہ مکان میں قیامت کے ڈیرے باندھے ہیں۔ اُمید کی قندیل دل کے اندھیرے گوشے میں مردہ ہے ـــ اے ہماری حیات و موت کے مالک! ٹمٹماتی ہوئی شمع کو زندگی عطا کر، اُسے حقیقی روشنی سے ہمکنار کر!!

ہاں! ہمیں روشنی دکھا! تاکہ ہماری ناامیدی کے سیاہ اور خوفناک بادل چھٹ جائیں۔ خوف کی آنکھیں اندھی ہو جائیں اور ہر جگہ چراغِ اُمید جگمگا اُٹھے!

مولا! کب تک سچائی کا دامن خالی رہے گا؟ کب تک خواہش مندوں میں "صبر" کی زنجیر لٹکی رہے گی ـــ اے کنگالوں کے ہمدم! اے مفلسوں کے ساتھی! وہ کب تک ظلم کی سنگین ضربیں برداشت کرتے رہیں ـــ ان کی زبان سے تو آہ بھی نہیں نکلتی۔ وہ تیرے ہی نام کا ہر وقت ورد کرتے ہیں۔ اے داتا! ان کی آنکھیں تیری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ وہ تجھ سے مدد طلب کر رہے ہیں۔ مدد ہاں مدد!! وہ نہیں چاہتے کہ تو انکی عبادت اور دُعا کی قیمت دے۔ پالن ہار! انہیں صرف تیرا سہارا چاہیئے۔ صرف تیرا اے خالقِ ارض و سما!!

میں نے سُنا ہے تو ظالم کا ساتھی نہیں۔ ستم پرور کا دوست نہیں۔ تو مظلوم کا مددگار ہے۔ جا اور اس کے دروازے پر بیٹھ جا! بیٹھ جا۔ دیکھ اس نے اپنے ہاتھوں سے گھر کا دروازہ کھول دیا ہے۔

تاریکی کی عمیق گھاٹیوں میں مظلوم کی رُوحیں سسک کر رہ گئی ہیں۔ وہ جو چند بچے نکلے ہیں اُن پر اے یار الہا! رحم کے پھول نچھاور کر۔ اے رحیم! ان کے قصور سے آنکھیں پھیر لے۔

دیکھ! دیکھ!! اے رحیم! کمزوروں کے جسم کانپ رہے ہیں، انہیں سہارا دے! ظالم کی آنکھیں قہقہہ لگا رہی ہیں۔ ان کی کشتیٔ حیات کو نہ غرق کر دے۔ اور اندھے اور گونگے جو راستہ بھول گئے ہیں انہیں اپنا راستہ دکھا۔ نہیں نہیں بلکہ تو اپنا مستحکم رحم بھیج تاکہ ہم اس کے سوار ہو کر جائیں اور اپنے جگر کے گھاؤ دکھائیں جو رس چکے ہیں، کچھ رس رہے ہیں۔

مغرب میں تیرا قہر، تیرا عذاب اور تیری بلائیں ہوائیں مل کر سانس لے رہی ہیں ـــ لیکن مشرق میں تیری سزائیں کیوں خاموش ہیں؟ تو یہاں کے بحرِ حیات میں بھی طوفان کی ہولناکیاں کیوں نہیں بھیج دیتا ہے ـــ اے دانائے راز! کیا ہم تیری مخلوق نہیں؟ کیا ہمیں تو نے نہیں بنایا؟ جو بلائیں اور طوفان قیامت تو نے مغرب کے گوشہ گوشہ میں بھیجا ہے ـــ کیا وہی موت کی خوفناک آندھی مشرق میں بھیجتے تجھے خوف معلوم ہوتا ہے؟ ہم تو تیرے ہی سہارے اور تیرے ہی آسرے پر جی رہے ہیں۔ سانس کی ہر رفتار میں ایک اُمید نظر آتی ہے تیری مدد کی اُمید! اے داتا! ظالم کی سفاکیاں اب بھیانک تاریکیوں میں لپٹ کر بھیانک بن گئی ہیں ـــ تو ہمیں یقین دلا دے کہ اب ظلم و ستم کی آندھیاں بند ہو جائیں گی ـــ اس "یقین" کے اندر ہمیں دائمی سکون، ابدی مسرت اور لازوال محبت نظر آئے گی۔ پھر چاہے ہمارے جسم گل سڑ جائیں مگر تیرے در کے بھکاری کبھی تجھ سے برگشتہ نہیں ہو سکتے۔

اے خدائے محبت! ہم دیکھ رہے ہیں کہ محبت، خوشی اور سکون اس دنیا میں ہم سے بغلگیر ہونگے لیکن تیری جدائی میں ہم ہزاروں راتیں رو رو کر بسر کر دیں گے۔ آ، اور ایک بار ہمیں آسرا تو دیدے!

کہدے اے مولا! بول اے خالقِ ارض و سما!

کہ اندھے بھکاری کی یہ دعا کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔

تو ہمیں قوت دے، ہماری اندھی آنکھوں کو اُمید کا چراغ دکھا ـــ اے قہر ذوالجلال!

ہم نے بہتیری اذیتیں سہیں، ذلت کے اندھیرے غاروں میں ہاتھ پاؤں مارا کئے ـــ اب ہمیں دائمی آزادی کی خوشخبری سنادے!

اے اُمید! ماں کے ہم سب بیٹوں کی سختیاں دُور کر دے ـــ دیکھ اے معبود! تیرے رحم و کرم کا بدر کامل صاف و شفاف آسمان کی چھاتی پر جلوہ فگن ہے۔ اب ہماری آس بندھ گئی ہے کہ ہمارا کشکول گدائی تو کرم سے بھر جائے گا!

ہم کنگال ہیں، غریب ہیں، بھکاری ہیں، مسکین ہیں! آ، ایک مرتبہ ہماری چوکھٹ ہی تک آ اور دیکھ کہ ہماری آہیں اور سسکیاں کتنی درد انگیز ہوتی ہیں۔ ہماری کراہ میں کتنا اضطراب ہے سرمایہ داروں کے محلات میں تو آخر کب تک بیٹھا رہیگا؟

ـــ تو، قوت ہے، محبت ہے، عیش و طرب ہے، تو رحیم ہے۔ ہماری اس دعا کو قبول کرلے اور گھوم کر ایک نظر اپنے اس بھکاری اور ٹھکرائے ہوئے بندے کو دیکھ!

سنو! سنو!! بھکاریو، کنگالو، گوش دل سے سنو ـــ طول طویل بلندی سے کس کی آواز آرہی ہے؟ آمین!! یہ کس کی آنکھیں رو رہی ہیں ور آنسوؤں کے قطرے سے زمین میں سیلاب آگیا ہے۔ جسم میں سنسنی دوڑ گئی ہے۔

آؤ، جشنِ شادمانی منائیں۔ ناچیں۔ ہماری دعائیں بارگاہ ایزدی میں قبول ہوگئیں ـــ وہ دیکھو بالآخر رب عظیم! عرش بریں سے اتر کر ہمارا جھونپڑیوں میں اُتر آیا ہے ـــ!

قاضی نذرالاسلام؛ مترجمہ۔ محمد یونس احمر؛

غزلیات

نوائے سرمدی

کوئی کیفیت ہی نہیں وہ اُلٹا اثر جو اپنا دکھا نہ دے
کوئی غم بھی کیا جو ہنسا نہ دے وہ خوشی بھی کیا جو رُلا نہ دے

تیرے ہجر کا یہ اثر ہوا تجھے پا رہا ہوں قریب سا
ترے وصل سے یہی خوف ہے کہ وہ درد ہجر اُٹھا نہ دے

یہ طلسم غیب و شہود کیا یہ فریب ہجر و وصال کیا
کہ چھپے تو بیش نظر رہے جو ملے تو اپنا پتا نہ دے

کرے سب نیاز نصیب جو ہے وہ چیز چشم کرم تری
یہی کہہ رہی ہیں مشیتیں اُسے دے تو جیکو خدا نہ دے

تری داستاں ہے دلِ غمیں کہ چراغ بزم حیات ہے
ابھی جگمگائیں حقیقتیں جو نہیں ہیں رنگ فسانہ دے

مرے جرم عشق کے وسوسے کبھی تحمل کے ساتھ زندگی سے
یہی ڈر ہے تیری نگاہ سے کہ معاملے کو دبا نہ دے

ابھی اور لاگ لگی رہے مرے دل کی آگ دبی رہے
کوئی اور غم دے زمانے کو مرے غم کو وہ زمانہ دے

میں ہوں تجھ سے تیرے قریب تر تو ہے مجھ کو سب سے قریب تر
یہ تکلفات بھی کیوں رہیں یہ حجاب زیست اُٹھا نہ دے

مرے عشق کا بھی تو ٹھیک کیا ترے حسن کا بھی ٹھکانا کیا
یہ مٹا کے بھی نہ ابھار دے وہ ابھار کر بھی مٹا نہ دے

دل ناصبور کی تیرگی تھی انقلاب کی شام ہے
کہ یہ زندگی تو ہے زندگی اسے موت ہی کا بہانہ دے

میں جسے سُنا کے ہوں مطمئن میں جسے بتا کے خموش ہوں
یہ سکوت ناز سے خوف ہے کہ کہیں وہ بات بڑھا نہ دے

وہ ہو بے اثر کہ ہو با اثر مری التجا ہے یہ چارہ گر
کہ تو کر علاج مرض مگر مجھے زندگی کی دعا نہ دے

یہ عجیب جلوۂ حسن ہے یہ عجیب قرب و وصال ہے
ملے تحمل کے اور پتہ نہ دے رہے دل میں اور ہوا نہ دے

تری یاد شمع حیات ہے تو میں کیسے ہجر میں سانس لوں
کہ یہ نرم نرم ہوائے غم کہیں یہ کنول بھی بجھا نہ دے

یہ عجیب اُلٹی سی بات ہے یہ عجیب راز حیات ہے
کوئی غم بھی کیا جو نہ کم پڑے وہ خوشی بھی کیا جو ٹھکانہ دے

دلِ بیقرار ترے ہی دم سے قصۂ غم کی ہے تازگی
کوئی پیچ و تاب نہیں ہے وہ کہ جو کیف موج صبا نہ دے

کھلے گیسوؤں کی بھی نکہتیں رُخِ یار میں ہیں بسی ہوئی
وہ فراقؔ شاعر صبح ہے کہ جو پوتے جام شبانہ دے

فراق گورکھپوری

غزل

شاد و افتادہ دہر نفس مت پوچھ
حضرت قاضی و عسس مت پوچھ

ہائے مت پوچھ ہمنفس مت پوچھ
ہم ہیں شائستہ قفس مت پوچھ

تمام کاری بوالہوس مت پوچھ
وصل و حسرت نفس مت پوچھ

(ق)

حاصل اکتساب سرمایہ
اعتبار نفس نفس مت پوچھ

خون بھی ہے رگ حمیت میں
کیوں نہیں لوگ کس و ناکس مت پوچھ

پھول کانٹوں میں تو نے دیکھا ہے
مجھ سے حالات پیش و پس مت پوچھ

کیا مری آرزو سے واقف ہے
وہ نگاہ وقیقہ رس مت پوچھ

آشیاں دِچمن کے دلدادہ — تو کبھی وسعت قفس۔ مت پوچھ
جیستاں ہے۔ فریب آزادی — شرح اِجمال کو ترس۔ مت پوچھ
قتل کا حکم ہی سہی۔ لیکن — ہی جو اسکے گلے میں رس۔ مت پوچھ
شاؔد کب تک مری حسد داتی
ہندو" فرعونِ مصر" بس مت پوچھ

شاؔد عارفی؛

غزل

عشق، ہوس انجام نہیں ہے — راہِ محبت عام نہیں ہے
ہجر نصیبوں کی دُنیا میں — صبح نہیں ہو شام نہیں ہے
تیری تجلّی عام ہے، لیکن — تابِ تجلّی عام نہیں ہے
عہدِ جوانی، عہدِ محبّت — ہوش و خرد کا نام نہیں ہے
تیرا قفس پھر تیرا قفس ہے — قید میں کیا آرام نہیں ہے
بادہ کشِ میخانۂ اُلفت — دُرد کشِ انجام نہیں ہے
پہلے نہ تھی بدنامِ محبّت — آج ہوس بدنام نہیں ہے
قیس نہیں ہے ہر دیوانہ — عشقِ جنونِ خام نہیں ہے
رند تیرے بدنام ہیں کیا کیا — تیری نظر بدنام نہیں ہے
تلخیِ غم کچھ اور بڑھاؤ — بادہ بقدرِ جام نہیں ہے
عشق ہے حسرؔت دولتِ سرمد
اور یہ دولت عام نہیں ہے

حسرؔت ترمذی؛

غزل

رازِ ناکامی کو عالم آشکارا کیجئے — اشکِ حسرت جو گرے آنکھوں کا تارا کیجئے
رشتۂ امید کبھی ہو دستِ وحشت تابکے — دامنِ زخمِ جگر کو پارا پارا کیجئے
قطرۂ ناچیز کی اللہ رے بربادیاں — جی میں آتا ہے کہ دریا سے کنارا کیجئے
کھُل گیا رنگِ محبت پردہ داری ہو چکی — جو چھپایا تھا کبھی اب آشکارا کیجئے
وہ قیامت کا ہی دن کچھ اور ورنہ آج بھی — حشر ہوتا ہے جہاں چرچا تمہارا کیجئے
زندگی کروٹ بدلنے کو ہے کیا جانے کدھر — آپ کیوں خاموش ہیں کچھ تو اشارا کیجئے
دیر کی صورت نگاری کا وہ نقشہ ہی نہیں — ہم ہیں اور شیخِ حرم۔ کیونکر گزارا کیجئے
بیربط ہستی میں چھیڑیئے کو ہے خامشی کا راگ — بے صدائے تارِ شکستہ۔ گوارا کیجئے
نوجوانی کی تپش۔ پیری میں کیسی جستجو — عمرِ رفتہ کیا پلٹتی ہے۔ پکارا کیجئے

عبداللطیف تپش

مرثیۂ جدید

شہادت حقیقت کا عرفان ہے

کہیں ہے ترا جام ہی بزم میں یہ حالت سرِ بام ہی بزم میں!
فتیلہ نہیں ہے کہ روغن نہیں ترا ہی دیا ہے کہ روشن نہیں
تجھے اور جتنے ہیں بالیدہ ہیں تری ڈالیاں ہی خزاں دیدہ ہیں
اُدھر نور تا ذرہ مہ و مہر ہے ادھر مہر بے ضو، یہ کیا سحر ہے
اُدھر ندی نالے ہیں طوفاں بدوش اِدھر بحر تیرا حریفِ خروش
کہیں تری کثرت ہے گلزار میں تو ہی دب گیا جھاڑ جھنکار میں
تھی زندگی غیر کو مل گئی بنا تیری ہی زیست کی ہل گئی

تو ہی محو ہے خوابِ خرگوش میں!
یہ کیڑے پڑے کیوں ترے ہوش میں؟

۲

تو ہے وارثِ ذوالفقارِ علیؑ امینِ رموزِ خفی و جلی
ہلالِ فلک کس کے پرچم پہ تھا؟ قدم کس کا تختِ کَے و جَم پہ تھا؟
رگوں میں کیا خون باقی نہیں ترے سر میں کیوں آج سودا نہیں؟
حسینؑ و حسنؑ کس کے اجداد تھے؟ وہ نخچیر تھے یا کہ صیاد تھے؟
صداقت و سطوت نہ فقر و غنا یہ ترکہ جو آبا کا تھا کیا ہوا؟
نمایاں ہیں آنکھوں کی نمناکیاں نہ جرأت ہی باقی نہ بیباکیاں

تری سینہ کوبی یہ گریہ ترا!
کہاں تک روا ہے خدا را بتا!

۳

شہیدانِ حق کی حیات و ممات ہے وہ مہرِ تابندۂ کائنات
جو مشعل ہو دنیائے تاریک کی سمجھ تجھ کو کیا رمز باریک کی
صداقت کا دل میں اگر درد ہو نہ کر شین و شیون کہ تو مرد ہو
صداقت پہ مٹنے پر آمادہ ہو جو مسلم تو اک مردِ آزادہ ہو
حسینؑ و حسنؑ ہیں انہیں کے امام نہیں جن کی گردن میں باطل کا دام
یزیدوں سے جو خوف کھاتے نہیں کبھی ان کے بہکے میں آتے نہیں
جنہیں لو لگی ہو اسی ذات کی جو مالک ہے ارض و سموات کی
وہی اہل ہیں حبِ شبیرؑ کے ثنا خواں ہیں جو انکی تقدیر کے

شہادت سے شبیرؑ کی شان ہے
شہادت حقیقت کا عرفان ہے

امین حزیں سیالکوٹی

زندگی میری نظر میں

جس زمانے میں میری شاعری کی ابتدا ہوئی، اُس زمانے میں ترقی پسندی کے لفظ یا تخیل کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس وقت علامہ اقبال مرحوم زندہ تھے۔ لیکن ان کی شاعری کے خلاف بھی ایک ردِ عمل ضرور شروع ہو چکا تھا۔ ادبی طبقہ اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی کوئی حرف دلآویز" سننے کے لئے بیتاب تھا۔ میرے نزدیک یہی وجہ ہے کہ میری نظمیں "اے عشق کہیں لے چل" "اعترافِ محبت" اور "دیس سے آنے والے بتا" وغیرہ بےحد مقبول ہوئیں۔ اور لوگوں نے میری توقع سے زیادہ ان کی پذیرائی کی۔

میں اقبال کو اپنے زمانے کا ایک بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ ہم نے صدیوں کے بعد ایک ایسا شخص پیدا کیا جس کا ہاتھ زمانے کی نبض پر تھا اور جو زمانے کے دل کی دھڑکن کو پہچانتا تھا۔ اقبال کی ذہنی توانائی، اس کی فراست، اس کے ادراک اور اس کی صناعی کی داد نہیں دی جا سکتی۔ البتہ اس کے کلام میں ایک چیز جس کی خطرناک حد تک کمی نظر آتی ہے، یہ ہے کہ انسان اور فطرت پر اس کی نظر ایک فن کار کی نظر بن کر نہیں پڑتی جس نظر سے وہ انسان اور فطرت اور اُن کے باہمی تعلق کو دیکھتا ہے، اس کی تہ میں یہ احساس نہیں پایا جاتا کہ تخلیق کا مقصد ایک لازوالِ حسن، ایک جاودانی مسرت اور ایک ابدی لذت کی پیدائش ہے۔ اقبال فطرت اور انسان کے باہمی آہنگ کو نہیں دیکھتا۔ اسکے مشترکہ سرچشمے کا اُسے احساس نہیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرت اور انسان کے درمیان ایک ازلی کشمکش اور ایک دائمی آویزش کا قائل ہے، وہ فطرت کو انسان کے لئے ایک آلہ کار سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔ وہ فطرت پر انسان کی برتری کا قائل ہے اور فطرت پر غلبہ پانے کا اُسے حقدار سمجھتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اقبال دُنیا کی کسی دو چیزوں میں آہنگ کا قائل نہ تھا۔ اس کے جس مفروضے پر بھی آپ نظر ڈالیں اس سے یہی پایا جاتا ہے کہ اسکے نزدیک ہر چیز دوسری چیز پر غالب آنے اور اسے گرا کر آگے بڑھنے کیلئے بیتاب ہے۔ اس کی شاعری میں عقل پر عشق کے غلبے، فطرت پر انسان کی حکومت، حسن پر افادیت کی فوقیت اور فرد پر قوم کی [illegible] کے تصورات بار بار آتے ہیں۔ اس کے ہاں خودی اور عمل کے نظریے بھی اسی کشمکش کے احساس کا قدرتی نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ صرف فطرت ہی پر غلبہ پانے کے لئے انسانوں کو نہیں ابھارتا بلکہ خود انسانوں کے اندر ایک جماعت کو دوسری جماعتوں پر یا ایک جماعتوں کو دوسری جماعتوں پر حکومت کرنے کی بھی تبلیغ کرتا ہے۔ تمام تخیل میں جو بنیادی اعتراض مجھے ہے، یہ ہے کہ شاعر کی نگاہ فطرت اور انسان یا انسانوں کے باہمی ربط اور آہنگ کو دیکھ سکتی ہے اُنکے باہمی تعاون کی ضرورت ہی کو سمجھتی ہے۔ اقبال کے فلسفے یہ ہے کہ انسانوں کے کسی نہ کسی گروہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی خودی کی تربیت اس طریقے سے کرے کہ دوسرے گروہوں کی خودی پر غلبہ پانے کی راہیں آسان ہو جائیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ ہر انسانی ضمیر کی خلوت گاہ بقول راشد "خودی کی جوتی سی قندیل" روشن ہے۔ اسے بھی چمکنے کا وہی حق حاصل ہے جو کسی بھی سے برتر چراغ کو ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک دُنیا کے اس نگار خانے کی زینت و آرائش کا بڑا راز یہی ہے کہ اس کی ہر قندیل اپنی جگہ روشن رہے۔ اور دوسری قندیلوں سے مل کر اور ان کے ہم آہنگ ہو کر اس نگار خانہ میں رنگ اور نور کا ایک سیلاب برپا کرتی رہے۔ کوئی ایک قندیل دوسری قندیلوں کو اپنے ساتھ جنگ آزمائی کی دعوت نہ دے نہ اسے چیلنج کرے۔ نہ اسے بجھا کر خود شعلہ جوالہ بننے کی خواہش رکھے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی محسوس کیا کہ دُنیا کو پیدا کرنے والی ہستی کا مقصد حسن اور مسرت کو عالمگیر اور دائمی بنانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہمارے چاروں طرف حسن و رنگینی اور [illegible] ایک سیلاب ہے۔ جو ہر چیز پر چھا رہا ہے۔ خدا نے جہان فطرت کے اندر ایک سادہ اور دلکش حسن پیدا کیا ہے۔ وہیں انسان کے میں بھی ایسی حسین صلاحیتیں رکھدی ہیں کہ وہ فطرت کی زینت میں اضافے کا باعث ہوں، اور اس کے لئے غازہ و گلگونہ کی [illegible] بہم پہونچاتے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان نے فطرت کے حسن کی اہمیت کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اکثر فطرت کو اپنی ہوس [illegible] اور زیاں کاری کا شکار بنایا ہے۔ وہ فطرت کا دوست بننے [illegible]

ہوس کا رہزن بن گیا ہے۔ یا اس کی رہنمائی کے بہانے میں اس کی صورت کو مسخ کرنے میں مصروف رہا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان دنیا بھر کے جذبات سے زیادہ لطیف جذبے کو جس کا نام عشق ہے، اپنی شیطنت اور ہوس کا آلۂ کار بنا کر رہ گیا ہے۔ انسان نے فطرت کی اس نعمت کو فطرت کے حضور میں عبودیت کے اظہار کا وسیلہ بنانے کی بجائے اکثر اس پر غالب آنے کا بہانہ بنایا ہے۔

انسان کی اس مکاری یا غلط فہمی کی وجہ سے فطرت کے ساتھ اور اپنے آپ کے ساتھ بارہا اس کی ٹکر ہوئی ہے۔ یہ ٹکر کہیں جرائم کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے کہیں جنگ کی شکل میں اور کہیں معاشی مقابلہ بن کر۔ یہ سب مصیبتیں اس عقیدے کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ چونکہ انسان کی خودی پر دوسرے انسانوں کی خودی کو غالب دیکھنے کا قائل ہے۔ ہم رنگی اور اتحاد کا نہیں۔

جن لوگوں نے میرے کلام کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی اپنی شاعری میں فلسفہ، سیاست یا اس قسم کے دوسرے ثقیل اور دور از کار عناصر کو داخل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ مجھے احساس ہے کہ میری شاعری اس آرزو کی پیداوار ہے کہ میں زندگی کے حسن کو زیادہ سے زیادہ روشن کر سکوں۔ مجھے کبھی تو مرجھائی ہوئی کلیوں کا حسن لبھاتا ہے، کبھی نغمے کی دلآویزی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کبھی رنگ اور خوشبو کی فراوانی دیکھ کر دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اور کبھی دنیا کے تمام رنگ اور نور و نغمہ کی تمثیل یعنی عورت کے جسم کی دلکشی پر مرمٹا ہوں۔ میری زندگی میں غم انگیز واقعات کی کمی نہیں۔ لیکن ان واقعات نے آج تک مجھے کبھی زندگی سے بیزار نہیں کیا۔ زندگی سے نفرت نہیں دلائی۔ بلکہ شاید زندگی کی ان ہی شوخیوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی لازوال حقیقتوں سے قریب تر ہوتا چلا گیا ہوں۔

میں نے جب شعر کہنا شروع کیا تھا تو شاعری کے افادی مقصد کا وہ تصور کہیں موجود نہ تھا جسے آج ترقی پسندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس تخیل نے کافی فروغ پایا لیکن میں اسے مغربی فیشن کی تقلید سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ ترقی پسندی یورپ والوں کی نقالی کا ایک کرشمہ بن کر رہ گئی ہے۔ اسے بھی مغربی عقل و فراست کے خزانوں سے اسی طرح چرایا گیا ہے جس طرح اور عقیدے، رسمیں اور رواج ان کے ہاں سے ہم نے چرائے ہیں۔ یورپ کی افادی شاعری میں فطرت، انسان کی ایک کنیز سہی۔ لیکن حقیقت اور عمل قریب تر ہے۔ مگر ہمارے ترقی پسندوں کی شاعری

گئے ہاں تو اس کا چہرہ اتنا گھناؤنا اور مکروہ نظر آتا ہے کہ ایک شاعر اسے دور سے دیکھنے کی بھی تاب نہیں لا سکتا۔ میں عرض کروں کہ شاعر کا کام زندگی کے حسن کو خود دیکھنا اور دوسروں کو دکھانا ہے۔ زندگی کے ناسوروں کے علاج کی کوشش کرنا اس کا کام نہیں۔ "ہر کارے و ہر مردے" کا اصول ہر جگہ کارفرما ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی ہی سے اس کی مثال مل سکتی ہے۔ مثلاً درزی کا کام جسم کو چھپانا اور ایسے لباس سے چھپانا ہے جو آپ کے جسم پر خوبصورت معلوم ہو۔ لیکن اگر آپ کے پاؤں پر کوئی زخم ہو تو آپ درزی سے اس بات کی توقع نہیں رکھتے کہ وہ آپ کے جسم پر پوشاک پہنانے کے ساتھ آپ کے زخم کا علاج بھی خود کرلے۔ کون نہیں جانتا کہ زخموں کو اچھا کرنا جراح یا طبیب کا کام ہے۔ اسی طرح شاعر کا کام زندگی سے حسن حاصل کر کے انسانوں کی روح کو زیبائش دینا ہے۔ اس کا کام انسانی روحوں کے چھپے ہوئے زخموں کو نمایاں کرنا یا ان کے علاج کی فکر کرنا ہرگز نہیں۔ اسی لئے میں آج تک اس نام نہاد ترقی پسندی کا قائل نہیں ہو سکا۔ جو ہمارے ملک میں بدقسمتی سے رواج پا رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے نے بعض ایسے نازک مسئلے ہمارے سامنے لا رکھے ہیں جن سے گریز ممکن ہے، نہ مصالحہ۔ سیاست میں عوام کی آواز اور خیالات کا اثر بڑھ گیا ہے۔ اقتصادی کشمکش ہمہ گیر ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری دنیا کے نیم وحشی اور پسماندہ ملک بھی اس کے تاثرات سے نہ بچ سکے۔ بلکہ شاید مہذب ملکوں سے کہیں زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ تجارتی لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری نے سماج کے ہر ایک طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور بے شمار گروہ اور ملک ہماری دنیا کے خوبصورت جسم پر بڑے بڑے ناسور بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم شاعر بھی انسان ہونے کی حیثیت سے ان اثرات کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔ لیکن ہمارا ان ناسوروں کی جراحی کر کے انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا ایک اناڑی کی کوشش سے کم نہ ہوگا۔ ان کا علاج تو سیاسی اور اقتصادی ماہروں کے ہاتھ میں ہے۔ اور انہیں پر علاج کا فرض عائد ہوتا ہے۔

شاعری افراد اور اقوام کے لئے ایک لطیف اور لذیذ غذا ہو سکتی ہے۔ جو ان کے ذوقِ نفاست کی تسکین کرے اور ان کی عمدگی کو برقرار رکھے۔ لیکن اس سے بیمار اور بوڑھی قوموں کے حق میں معجون شباب کا کام لینا میرے نزدیک بہت بڑی زیادتی ہے۔ ترقی پسندی کو جس قدر بھی فروغ اب تک حاصل ہوتا ہے اس کا باعث

ذر کی دلکشی نہیں بلکہ اس کے لیبل کی دلکشی ہے۔ اس کے لیبل کو
یہ کر ذہن سب سے پہلے ترقی کے لفظ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور
ر لوگ اسی وجہ سے ترقی پسندوں کے پھیلائے ہوئے جال میں
نس جاتے ہیں۔ اس تخیل نے مزدور، کسان اور فقیر کی اہمیت کو
نمایاں کیا ہے لیکن اس نے حکمت اور صناعی کے اس مفہوم کا
تمہ کر دیا ہے۔ جس نے شکسپیئر، کالیداس، حافظ، سعدی اور غالب
یہ نام کو زندہ کیا تھا۔

مجھے اور میرے ہم خیال شعرا کو جن کے فن کا مقصد زندگی کو
ن کی پرستش اور پرورش کرنا ہے۔ عام طور پر رجعت پسند کہا جاتا
ہے۔ ہمیں عام طور پر فراری کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اور ان
تی پسند شاعروں کو فراری نہیں کہا جاتا جو زندگی کے بعض مکروہ اور
دار پہلوؤں کو نمایاں کر کے زندگی سے نفرت اور بیزاری پیدا
تے ہیں میرے خیال میں اگر کوئی چیز ہمیں زندگی کے قریب لا سکتی ہے
وہ صرف زندگی کے حسن کا احساس ہے۔

میرے نزدیک شاعر کے لئے اپنے آپ کو کسی سیاسی یا
تصادی نظام سے وابستہ کرنا ضروری نہیں۔ وہ نظامِ سرمایہ داری
یا اشتراکیت، جمہوریت ہو یا فاشیت، شاعر کے لئے ان میں سے ایک
قابلِ توجہ نہیں شاعر کی قدریں یعنی (حسن، نیکی اور سچ) ان سب سے
اور آزاد ہیں شاعر کی مثال شہد کی مکھی کی سی ہے جو زندگی کے باغ
حسن کی شادابیوں اور رنگینیوں کا رس لیکر دوسرے انسانوں کی
سرت اور تسکین کا سامان تیار کرتی ہے۔ اس کا کام باغ کو صیاد یا
بان کے نقطۂ نظر سے دیکھنا نہیں۔ نہ ان کے کام میں دخل دینا اسکے
کی بات ہے۔

شاعری پر میں نے اس لئے آپ سے مفصل گفتگو کی کہ میں
شاعری کو اپنی زندگی سے علیٰحدہ نہیں جانتا۔ یہی میری زندگی کا تارِ
و اور یہی میری زندگی کی روحِ رواں ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کو کسی
مافی چیز کے بغیر سمجھنا اور سمجھانا ویسے بھی ناممکن ہے۔ ایک عرصہ ہوا
میں نے ایک سانٹ لکھا تھا جس میں میں نے اس احساس کو واضح
نے کی کوشش کی تھی کہ زندگی اپنی تمام ہمہ گیری کے باوجود ایک
ی چیز ہے جسے سمجھنا ہمارے لئے بیحد دشوار ہے۔ یہ سانٹ میں آپکو
سناتا ہوں اس میں میں نے زندگی کو ایک پرندے سے تشبیہ دی
ہے جو راستہ بھول گیا ہو۔ کہیں پہونچنا چاہتا ہو۔ لیکن افق کی پہنائیاں
سے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں، اور وہ آخرکار انہیں پہنائیوں

کے قفس میں قید ہو کر رہ گیا ہو ؎

زندگی مست ہے اُس طائرِ ناداں کی طرح
جو ہو تنہا نگراں دور فضاؤں کی طرف
مہ و خورشید کی زرکار ضیاؤں کی طرف
محوِ نظارہ کبھی نرگسِ حیراں کی طرح
اور کبھی بال فشاں بوئے خیاباں کی طرح
مسکراتی ہوئی شاداب گھٹاؤں کی طرف
وادیِ کوہ کی مستانہ ہواؤں کی طرف
نکہت گل کدۂ دسیل بیاباں کی طرح
آرزو اڑنے کی کرتی رہے بیتاب سدا
پر نظر آئے نہ تسکین کا انداز اس کو
یونہی ترساتی رہے حسرتِ پرواز اس کو
نارسائی کی خلش سے رہے بیخواب سدا
کبھی آرام نہ دے حسرتِ پرواز جسے
اپنا انجام نظر آئے نہ آغاز جسے

(مرسلہ اے آئی آر دہلی)

اختر شیرانی؎

سحر سامری

جب فطرت محبت جھلکے گی آدمی میں — کچھ شان موت کی بھی نکلے گی زندگی میں
صبحیں جھلک رہی ہیں چہرے کی تازگی میں — آنکھیں ہوئی ہیں راتیں زلفوں کی برہمی میں
شان ربوبیت بھی ہے اسکی کافری میں — جب تک ہے حسن باقی سب کچھ ہے آدمی میں
کیا لن ترانیاں ہیں آنکھوں کی خامشی میں — موسیٰ کے معجزے ہیں اس سحر سامری میں
جوش بہار دیکھو ایک ایک پنکھڑی میں — گلشن مہک رہا ہو جیسے کلی کلی میں
ہے اس کی اک نظر میں امروز اور فردا — دنیا بھی ہے اسی میں عقبیٰ بھی ہے اسی میں
خلوت میں اس کی دور چرخ و زمیں نہیں ہے — ہے وقت دید اس کا دن میں نہ رات ہی میں
مانوس ہیں جو آنکھیں وہ میں امید خو بھی — کچھ شان عشق بھی ہے انداز دل کشی میں
کچھ گھٹ چلا تجاہل کم ہو چلا تغافل — یارب زیادتی ہو کچھ اور اس کمی میں
ہو ان کے رنگ و بو میں کچھ خون دل بھی شامل — میری بھی کچھ جھلک ہو کلیوں کی تازگی میں
اس مست ناز میں کیا کافرادائیاں ہیں — مستی ہے بانکپن میں شوخی ہے سادگی میں
چونکا دے مجھکو ساقی غفلت کی زندگی سے — احساس بھر کے دیدے پیمانہ خودی میں

نغمے ہیں شعر و نغمہ سب جاں نواز لیکن
کچھ رس ہو راگنی میں اور حس ہو شاعری میں

[illegible]

دختر ہند

ایک لڑکی بیکس و مجبور و زار — خاک پر بیٹھی ہوئی ہے دلفگار
چیتھڑوں سے جسم لاغر ہے ڈھکا — کائنات دل میں ہے محشر بپا
آنکھ میں ہے نیند کا ہلکا خمار — گیسوئے خمدار پر گرد و غبار
قلب میں الجھن پریشان و حزیں — ایک کرتا زیب تن نیم آستیں
ایک بھینہ اوڑھنی اوڑھے ہوئے — جس کے آنچل جا بجا ادھڑے ہوئے
اندرونی دکھ کی سچی داستاں — کہہ رہی ہے اس کی چشم خوں فشاں
بیکسی، بیچارگی کا سرفراز — دست نازک بھیک کی خاطر دراز

آہ یہ آفات یہ بربادیاں
ہند کی اور آہ یہ شہزادیاں

آہ اے ہندوستان خستہ حال — بھوک سے بیتاب ہو تیرے لال
آہ اے جنت نشان ہندوستاں — تو کہاں اور یہ تری حالت کہاں

کاش پلٹا کھائیں روز و ماہ و سال
تو ہو اور تیرا وہی جاہ و جلال

[illegible]

ریڈیائی ڈرامہ

قلندر خاں

(دتائی ناچ کی آواز آتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد بیک گراؤنڈ میں چلی جائے۔ بھاگتے ہوئے گھوڑوں کے سموں کی آواز آئے ــــ)

پہریدار۔ کون ہے۔

سوار۔ قلندر خاں کی بے پناہ تلوار سلامت رہے

پہریدار۔ گذر جاؤ۔

(رقص کی آواز فوراً گراؤنڈ میں آجائے اور پھر یکا ایک خاموش ہوجائے۔)

سوار۔ سردار قلندر خاں کو مژدہ ہو کہ خان زادہ شہباز خاں اپنے دوست ...خاں کے ساتھ کل شام آفریدی آباد پہونچ جائیگا۔ دونوں نوجوان اپ... رنگوں اور قبیلے کے لوگوں کو سلام بھیجتے ہیں۔

قلندر خاں۔ ہم نے ان کا سلام قبول کیا۔ پرسوں روز ہم نے ان خودسر ...مندوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اس دن ہمیں پیغام پہونچا تھا کہ وہ ...نوں آج پہونچ جائیں گے۔

سوار۔ سفر کی تھکان دور کرنے کیلئے آج رات وہ پشاور میں قیام ...یں گے۔

قلندر خاں۔ تھکان، آفریدی بچے اور تھکان۔ افسوس مصنوعی تہذیب ...افیون سے قلندر خاں کا بیٹا بھی نہ بچ سکا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ...کی تعلیم کے لئے آگرے کی بجائے سمرقند یا ایران میں ہوتی بگ... رہے گی۔ لیکن تم نے خواہ مخواہ اصرار کیا کہ انہیں آگرے بھیجو۔ ...ب خاں اب میں تم سے کیا کہوں۔ اب دیکھنا ہے تمہارا لونڈا کیا ...سکے آتا ہے۔

گلاب خاں۔ خان انہیں آنے تو دو۔ ہم خود انہیں دیکھ تو لیں

قلندر خاں۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب ہمیں ان کے مستقبل کی فکر ...نی چاہیئے۔ لیکن تم نے یہ رقص کیوں بند کر دیا۔ مشعلوں کی روشنی ...چمکتی ہوئی تلواریں ہم پسند کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہماری رگ... ...میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ناچتے جاؤ۔ ناچتے جاؤ۔

(رقص پھر شروع ہو اور آہستہ آہستہ فیڈ ہو جائے۔)

(وقفہ)

شہباز خاں اور شیر خاں۔ (ایک ساتھ) خان اعظم ہم قدم بوسی کی اجازت چاہتے ہیں۔

قلندر خاں۔ آفریدی بچے آبائی تلوار چوما کرتے ہیں۔ قدم بوسی مغلئی رسم ہے۔ لیکن۔ لیکن تم نے یہ لباس کیسا پہن رکھا ہے۔ بخدا تم تو اچھے خاصے خواجہ سرا معلوم ہوتے ہو۔

شہباز۔ (حیرانی سے) خواجہ سرا۔

قلندر خاں۔ خاموش رہو کیوں گلاب خاں تمہارا اس لباس کے متعلق کیا خیال ہے

گلاب خاں۔ مغل روسا اس طرح کا لباس پہنتے ہیں خان۔

قلندر۔ یہ مغل ہیں یا آفریدی۔

شہباز۔ آپ نے میری توہین کی ہے خان۔ آپ میرے باپ ہیں لیکن ایسے الفاظ میں برداشت نہیں کر سکتا۔

قلندر خاں۔ (طنزیہ) اوہو تم ایسے الفاظ برداشت نہیں کر سکتے میں بھی ایسی گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔ نکالو اپنی تلوار۔

شہباز۔ میری تلوار خودبخود میان سے باہر نکل آئے گی۔ آپ کی تلوار پہلے باہر نکلنی چاہیئے۔

قلندر۔ تو دیکھتے کیا ہو میدان میں کیوں نہیں آتے۔

(میانوں سے تلواریں نکالنے کی آواز)

قلندر خاں۔ چلو پہلا وار تم کرو۔

(تلواریں ٹکراتی ہیں یہ آوازیں ذیل کے ٹکڑے میں متواتر آتی رہیں)

گل بانو۔ خان خان تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ ارے کوئی انہیں سمجھائے کسی نے آج تک باپ بیٹے کو بھی لڑتے دیکھا ہے۔ میں کیا کروں میرا بچہ میرا بچہ دس سال کے بعد وطن واپس آیا ہے۔ میں نے اس کی پیشانی بھی تو ابھی تک نہیں چومی۔ گلاب خان تم ہی انہیں سمجھاؤ۔

قلندر خاں۔ خاموش رہو۔ مردوں کی باتوں میں دخل دینے کیلئے تمہیں کس نے کہا ہے۔

گل بانو۔ تم ہی جانے دو بیٹا۔ تم ہی جانے دو۔ تمہارے باپ کو تو

ہند جانے کیا ہو گیا ہے۔ مان جاؤ بیٹا۔ دیکھو میں تم سے التجا کرتی ہوں۔

قلندر خاں۔ میرا وار روکو شہباز۔ ایسا نہ ہو کہ ماں کی باتیں سنتے ہوئے تم اپنے باپ کے ہاتھوں گھائل ہو جاؤ۔

(تلواروں کی جھنکار زیادہ تیز ہو جائے۔)

شہباز۔ وار روکئے ابا۔ ایسا نہ ہو کہ بیٹے کو سمجھاتے ہوئے آپ خود زخمی ہو جائیں۔ شہباز کی تلوار آگرے کی سانوں سے بہت تیز کی گئی ہے۔

قلندر خاں۔ میں جی بھی خوش ہو گیا۔ اگر تمہاری تلوار تمہاری گفتگو ہی کی طرح تیز ہے تو مجھے آگرے کی سانوں کا قائل ہونا پڑے گا۔ لو وار سنبھالو، ایسے وار تم نے مغلیہ تلواروں میں نہیں دیکھے ہوں گے۔

شہباز۔ ابا۔ تلوار مغل کی ہو یا آفریدی کی۔ ہوتی تو لوہے کی ہے۔ اور لوہے کا استعمال وہی کر سکتا ہے جس کے اندر گرم گرم لہو ہو۔

قلندر۔ تمہارا لہو اتنا گرم نہیں ہو سکتا جتنا تمہارے باپ کا ہے۔ وہ لوہے کو تمہاری گردن کی طرح مروڑ سکتا ہے۔ تلوار چھوڑ دو۔

شہباز۔ یہ لیجئے۔

(تلوار کی آواز بند ہو جائے۔)

قلندر۔ اب آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم واقعی سچے آفریدی ہو جو تمہارے آفریدی ہونے پر شک کرے وہ خود آفریدی نہیں ہے۔ (ہنستا ہے) گلاب خان دیکھا، میں نے کیسا شاندار بیٹا پیدا کیا ہے۔

(ہنستا ہے۔ شہباز خاں بھی ہنستا ہے)

قلندر۔ تم بیوقوفوں کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو شیر خان۔ اٹھاؤ تلوار۔ تم بھی تو مجھے شہباز کی طرح عزیز ہو کیا میں تمہارے بازوؤں کا بل نہیں دیکھنا چاہتا۔ (ہنستا ہے)

گلاب خاں۔ (ہنستے ہوئے) اسکے ساتھ میں لڑوں گا۔

(قلندر، گلاب، شیر، شہباز سب ہنستے ہیں۔)

قلندر۔ ہم آج کی خوشی میں ایک جشن منانا چاہتے ہیں جس میں آفرید آباد کے تمام بہادر شریک ہوں گے اور اس کے لئے دنبے وغیرہ ہمارے دونوں بیٹے مہیا کریں گے۔

شیر اور شہباز۔ جیسے آپ ارشاد فرمائیں۔

قلندر خاں۔ شاباش۔ شاباش ــــ گلاب خاں کیا خیال ہے تمہارا۔ پاس کا علاقہ مناسب رہے گا۔ سنا ہے ان لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ مویشی ہیں۔

گلاب خاں۔ سننے میں تو یہی آیا ہے۔

قلندر۔ تو کل صبح تم چند جوان جو راستوں سے اچھی طرح واقف ہوں انکے ساتھ کر دینا۔ اس طرح ان کی تفریح بھی ہو جائے گی اور جشن کیلئے دنبے بھی مہیا ہو جائیں گے۔ اور اب بھی تم کچھ کھا پی کر سو جاؤ۔ صبح تمہیں باہر جانا ہوگا۔

وقفہ (فیڈ ان قبائلی ناچ فیڈ آؤٹ)

گل بانو۔ شہباز کے ابا، شہباز کے ابا۔

قلندر۔ (جیسے کچھ سوچتے ہوئے) کیا کہتی ہو۔

گل بانو۔ میں پوچھتی ہوں یہ آجکل تم کیا سوچتے رہتے ہو۔

قلندر۔ میں سوچ رہا ہوں شہباز کو یہ ایکا ایکی کیا ہو گیا ہے۔ نہ شکار، نہ تلوار بندوق کی مشق۔ جب دیکھو چپ چاپ بیٹھا ہے۔ بات پوچھو تو ہوں، ہاں، اسکے بعد پھر وہی چپ۔

گل بانو۔ اب وہ خیر سے جوان ہو گیا ہے نا۔

قلندر۔ تو کیا ہوا۔

گل بانو۔ میرا خیال ہے ــــ میرا خیال ہے ــــ

قلندر۔ مجھ سے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ صاف صاف کہو۔ تمہیں کیا کہنا ہے۔

گل بانو۔ میں کہتی ہوں اب شہباز جوان ہو گیا ہے۔ اس کی شادی ہو جانی چاہئے۔ شاید تنہائی محسوس کر رہا ہے۔

قلندر۔ تنہائی ــــ کیسی تنہائی ــــ شادی ــــ کیسی شادی ــــ

گل بانو۔ ویسی ہی جیسی کہ تمہاری اور میری ہوئی۔ آج کہتے ہو کیا ہے۔ کل کہو گے اولاد کیا ہوتی ہے۔ بس حد ہو گئی۔

قلندر۔ شادی کا بوجھ اٹھانے سے پہلے اسے محنت و مشقت سے پختہ ہونا ہوگا۔ مغلیہ فیون کا جو اثر اس کے دماغ پر ہوا ہے اسے دور کرنا چاہتا ہوں اور باقی رہی تنہائی جس کا ذکر تم نے کیا سو وہ میرے لئے ایک بے معنی چیز ہے۔ جب تک مرد کی ران تلے اصیل گھوڑا، ہاتھ میں اچھی بندوق اور تلوار ہو، وہ کبھی تنہا نہیں ہو سکتا۔ تنہائی کیسی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تنہائی کیا بلا ہے۔ کیا دنیا میں ایک عورت ہی تنہائی دور کرنے کے لئے رہ گئی ہے۔ ان بہادروں کی تمام دلچسپیاں کیا بالکل فنا ہو گئی ہیں۔ کیا بندوقوں کی نالیاں سرد ہو گئی ہیں۔ کیا آفرید آباد کی ساری بارود گیلی ہو گئی ہے۔

گل بانو۔ لیکن۔

قلندر۔ لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں اس کی بہتری تم سے کہیں زیادہ سوچ سکتا ہوں۔ میں گلاب خاں سے مشورہ لوں گا۔ اس سے پوچھ

سن لو بڈھے کی تنہائی کیسے دور ہو سکتی ہے۔

(وقفہ)

قلندر۔ گلاب خاں آفریدی تلواریں زنگ آلود ہو گئی ہیں۔ اب انہیں کسی سان کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے چھاپہ مارنے کیلئے پشاور کا علاقہ موزوں رہیگا۔

گلاب۔ لیکن خان مغلوں سے تو ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے۔

قلندر۔ معاہدہ۔ (ہنستا ہے) معاہدے ہمیشہ توڑنے کیلئے کئے جاتے ہیں۔ خود مغل ہی کئی بار اپنے وعدے توڑ چکے ہیں۔

گلاب۔ پر اس وقت تو وہ ہماری دوستی کا دم بھرتے ہیں۔

قلندر۔ دوستی۔ (طنزیہ ہنسی ہنستا ہے) اس لئے کہ وہ آج کل دکن میں لڑ رہے ہیں۔ اور ہم سے نبٹنے کی ان میں طاقت نہیں ہے۔ انکی دوستی کی بس یہی وجہ ہے۔

گلاب۔ میرا خیال ہے کہ پہل ہماری طرف سے نہیں ہونی چاہیئے۔ اگلی طرف سے ہو تو وہ اور بات ہے۔

قلندر۔ غلط بات ہے گلاب خان۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں جسکی پہل اسی کی جیت۔ اس کے علاوہ اس وقت تو ہمارے پیش نظر ایک ایسی چیز ہے جس پر ہمارے قبیلے کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ایک عرصے سے آفریدی تلواریں اپنے میانوں میں سو رہی ہیں۔ مجھے ڈر ہے اگر کچھ عرصہ یہی حال رہا تو وہ کبھی بیدار نہ ہوں گی۔ اور تو اور ذرا اپنے شیر اور میرے شہباز ہی کو دیکھو، ہر وقت افسردہ اور پژمردہ بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ رانوں کے نیچے گھوڑا ہے، نہ ہاتھ میں بندوق ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہے ہیں۔ بے عمل اور بے حرکت۔ تم ہی کہو اگر ہمارے ہی فرزند ایسی مثال پیش کرینگے تو باقی نوجوانوں کا کیا بنے گا۔

گلاب۔ کچھ بھی ہو ہمیں مغلوں سے نہیں الجھنا چاہیئے۔

قلندر۔ بھائی یہاں قبیلے کی زندگی کا سوال ہے۔ اور تم بے عملی کی تعلیم دے رہے ہو۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہتے ہو۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ کبھی نہیں ہونے دونگا۔ میں مغلوں سے لڑونگا اور ضرور لڑونگا۔ غضب خدا کا پورے تین مہینے ہو گئے۔ میں نے ایک دن بھی کارتوس ہی نہیں چلائے۔ یوں کام نہیں چلے گا۔

گلاب۔ تو اس جنگ میں تم گلاب خاں کو اپنے ساتھ نہ پاؤ گے۔

قلندر۔ کیا کہا! ٹھہرو جانے کہاں ہو۔ تو یہ سچ نکلا کہ تم مغلوں کے ہاتھ بک چکے ہو۔ آج تک تو میں اس افواہ کو جھوٹ سمجھتا رہا۔ پر آج۔ آج مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ تم غدار ہو۔

گلاب۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) گلاب خاں کو اتنے سستے داموں کوئی نہیں خرید سکتا۔ تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ میں غدار ہوں۔

قلندر۔ خاموش رہو۔ میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ تمہارا مقدمہ جرگے کے سامنے پیش ہوگا۔ وہی فیصلہ کریگا کہ کون غدار ہے۔

(وقفہ۔ ہماہمی پیدا کی جاتی ہے۔)

قلندر۔ بھائیو اب تم ہی فیصلہ کرو۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دو۔ خوب غور کر لو۔ تاکہ بعد میں کسی کو شکایت کا موقع نہ مل سکے۔

(ذیل کا ٹکڑا سرگوشیوں میں سنائی دے)

آواز ۱۔ قلندر خان ٹھیک کہتا ہے۔
آواز ۲۔ گلاب خان واقعی غدار ہے۔
آواز ۳۔ اس کا ثبوت مل چکا ہے۔
آواز ۴۔ مغل کے ہاتھ بک چکا ہے۔
آواز ۵۔ گردن زدنی ہے۔
آواز ۶۔ اسے گولی سے اڑا دینا چاہیئے۔

***

قلندر۔ صاحبو تم کس نتیجے پر پہونچے ہو۔
ایک آدمی۔ ہم اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ گلاب خان غدار ہے۔
دوسرا۔ ہاں، گلاب خان غدار ہے۔
تیسرا۔ یہ مغلوں کا پٹھو ہے۔
چوتھا۔ ہمیں تباہ کرنا چاہتا ہے۔
ہجوم۔ غدار! غدار! غدار!
قلندر۔ تو کہو تم اس کے لئے کیا سزا تجویز کرتے ہو۔
ہجوم۔ سزائے موت۔
ایک آدمی۔ اب ہم اپنے سردار کی بھی رائے پوچھنا چاہتے ہیں۔
قلندر۔ سزائے موت۔ مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے۔ کیوں شیر خاں تم کیا چاہتے ہو۔
شیر خاں۔ خان میں اپنے باپ کیلئے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔ آپ مجھے اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں۔ آپ سے میری پہلی اور آخری درخواست ہے کہ میرے باپ کی جان بخشی کی جائے۔
قلندر۔ جرگے کا فیصلہ میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ گلاب خان ایک

[illegible] نہیں کر سکتا۔

شیر خان۔ لیکن ـــــ لیکن۔

قلندر۔ میں تمہارے جذبات خوب سمجھتا ہوں بیٹا۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میں غدار کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تم سے بھی زیادہ ہمدردی کا مستحق ہوں اس لئے کہ گلاب خان میرا دوست ہے۔ لیکن لیکن اس کے باوجود آپ سے یہ فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔

شیر خان۔ مرتا ہوگا۔

قلندر۔ ہاں۔ کل صبح جس وقت حقاب اپنے شکار کے لئے نکلتا ہو، گلاب خان کو گولی سے اڑا دیا جائیگا۔

(وقفہ۔ وائلن پر چند لمحوں کے لئے کوئی دردناک چیز بجائی جائے فائر کی آواز۔ میوزک فیڈ آؤٹ۔ ڈھولکے پر چوٹ پڑے۔ پھر ہما ہمی ہو جائے۔)

قلندر خان۔ (خطیبانہ لہجے میں) بہادرو۔ تم جانتے ہو کہ یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ آج تمہیں پشاور کی طرف کوچ کرنا ہے۔ پشاور جہاں مغل رئیسوں کے گھروں میں دولت کے انبار لگ رہے ہیں۔ جہاں منڈیوں میں غلہ ہے کہ اونچے اونچے پہاڑ بن گئے ہیں۔ جہاں زر دوز جھولوں والے خوبصورت گھوڑے ہنہناتے ہیں۔ جہاں بندوقوں کے کندھوں پر سونے اور چاندی کے پترے چڑھے ہیں۔ جہاں تلواروں کے دستوں میں جواہرات جگمگاتے ہیں۔ ہاں جہاں فراوانی ہی فراوانی ہے۔ آج تم ایسی جگہ جا رہے ہو جس میں اگر تم کامیاب ہو گئے تو بے شمار دولت تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔ کہو تم تیار ہو۔

سب۔ ہم تیار ہیں، خان ہم تیار ہیں۔

(وقفہ۔ گھوڑوں کے سموں، فائروں، تلواروں کے ٹکرانے دبی دبی چیخیں اور قلندر خان کے گونجتے ہوئے قہقہوں کی آوازیں۔ ذیل کا ٹکڑا ان آوازوں پر سپر امپوز کیا جائے ـــــ)

آفریدی آ گئے۔

آفریدی آ گئے۔

قلندر خان آ گیا۔

آفریدی آ گئے۔

قلندر خان۔ شاباش۔ شاباش۔ بڑھے چلو۔ ہماری منزل قریب ہے۔

(فیڈ ان قہقہوں کی آواز۔ موسیقی کی لہریں جو کبھی سنائی دیں اور کبھی ڈوب جائیں۔)

قلندر۔ شاباش بڑھے چلو، بڑھے چلو۔

(بہت سی آوازیں)

پشاور آ گیا۔ پشاور آ گیا۔

قلندر خان۔ بھائیو، بزدل مغلوں نے شہر کے دروازے [illegible] اب ہمیں محاصرہ کرنا پڑے گا۔ اس وقت تک جب وہ تنگ آ کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔ شہر کے گرد گھیرا ڈال لو۔ مدد دشمن تک نہ پہونچنے دو۔ شمالی دروازے کے باہر شیر خان مقیم ہوگا۔ مغربی دروازے کی نگرانی شہباز خان کے ذمے۔ [illegible] سنبھال لونگا۔ یاد رہے شب خون سے بچنے کے لئے عشا کے بعد ڈیرے کی تمام شمعیں گل کر دی جائیں۔ صرف سردار کے [illegible] میں روشنی رہ سکتی ہے۔

(وقفہ۔ اذان کی آواز۔ پھر خراٹوں کی آوازیں آئیں اور کبھی کبھی پہریدار کے قدموں کی چاپ سنائی دے)

شہباز خان (اپنے آپ سے) شہر کا محاصرہ کئے ہمیں کتنے دن ہو گئے لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مغلوں کے بندوقچی آہستہ آہستہ ہماری صفوں کو خالی کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس، شہر پناہ کے وزنی پتھروں سے اپنا سر پیٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکے۔ نہ جانے ہمارے بوڑھے سردار کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ محاصرہ اٹھانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اگر یہی حال کچھ اور دن جاری رہا تو فوجوں کا بالکل صفایا ہو جائے گا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں جنگ و جدل کی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ شروع شروع میں واقعی بڑی دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب تو میں اس سے اکتا گیا ہوں۔ چاروں طرف گلی سڑی لاشیں۔ زخمیوں کی چیخ پکار (آہ بھرتے ہوئے) کاش وہ آگرے کے دن کبھی ختم نہ ہوتے۔ (چونکتے ہوئے) کون۔

نادرہ۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے لئے ایک پیغام لائی ہوں۔ ایک ہستی کا پیغام جو تمہیں بہت عزیز ہے۔

شہباز۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ صاف صاف کہو تمہیں کیا کہنا ہے۔

نادرہ۔ آگرے کے دن یاد کرو۔

(اس مقام پر سازوں پر کوئی دھیمے سُروں والا نغمہ چھیڑا جائے)

رات کا سماں ہے چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ اور [illegible] سینے پر ایک نازنین جا رہی ہے۔ آپ [illegible]

سرود ہے۔ ایک عورت۔ دونوں حسین۔

(میوزک بلند ہو کر پھر بیک گراؤنڈ میں چلا جائے ۔)

فیروزہ۔ (جذبات بھری آواز میں) آج کی رات کتنی حسین ہو شہباز۔

شہباز۔ تم اس سے کہیں زیادہ حسین ہو فیروزہ۔

فیروزہ۔ جی چاہتا ہے یہ ناؤ عمر بھر چلتی رہے۔ اور میں تمہاری گود میں سر رکھے چاندنی کی ساری ٹھنڈک آنکھوں کے ذریعے اپنے اندر جذب کئے جاؤں۔

شہباز۔ میں چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری فیروزہ کی پیاری آواز یونہی میرے کانوں میں آتی رہے۔ حتیٰ کہ دوسری آوازوں سے بالکل بے خبر ہو جاؤں۔ اس دھندلی روشنی میں تم کتنی حسین معلوم ہوتی ہو فیروزہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا ہی کوئی تخیل محبت کے جادو سے ڈھل پڑا ہے۔ بولتی جاؤ فیروزہ، بولتی جاؤ۔ میری روح ان سرخ ہونٹوں سے ابھرتے ہوئے سُروں میں کھو جانا چاہتی ہے۔ سرود۔ سرود۔ اپنا سرود اٹھاؤ فیروزہ۔ آج میں نغموں کے سمندر میں ڈبکیاں لگانا چاہتا ہوں۔ آواز کی لہروں پر ناچنا چاہتا ہوں۔

(فیروزہ سرود کے ساتھ فارسی کی کوئی غزل گائے)

شہباز۔ لیکن فیروزہ کہاں ہے۔ فیروزہ کہاں ہے۔

نادرہ۔ اسی شہر میں جس کا تم نے محاصرہ کر رکھا ہے۔

شہباز۔ وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔

نادرہ۔ اپنے ہم وطنوں کی طرح موت کا انتظار۔ اسے اپنے دشمنوں میں تمہاری موجودگی کا علم ہے۔ اس نے مجھے تمہارے پاس اپنا آخری سلام دے کر بھیجا ہے۔ شہر میں کال پڑا ہے۔ دوسروں کی طرح اب وہ بھی موت کی راہ دیکھ رہی ہے۔ چند دنوں کے بعد وہی فیروزہ جس کی آواز تمہارے لئے فردوس گوش تھی، وہی فیروزہ جس کی پازیب کی جھنکار سے تمہارے سخت دل کے تار بھی لرز اٹھتے تھے۔ وہی فیروزہ جس نے قلندر خان آفریدی کے بیٹے کے سخت دل میں بھی محبت کے کئی نگینے جڑ دیے تھے، اب چند ہی دنوں میں فاقوں سے نڈھال ہو کر موت کی آغوش میں چلی جائیگی۔

شہباز۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ فیروزہ کبھی نہیں مر سکتی۔ فیروزہ کبھی نہیں مرے گی۔ شہباز یہ کبھی نہیں ہونے دیگا۔ کبھی نہیں ہونے دیگا۔

اور۔ آہستہ آہستہ بولو۔ آہستہ بولو۔ اگر قلندر خان کو اس بات کا علم ہو گیا تو ہم دونوں کی خیر نہیں۔

نادرہ۔ [illegible] شہباز بھی قلندر خان ہی کا بیٹا ہے۔ اسکے بازوؤں میں بھی بل ہے ــــــ ٹھہرو، خشک گوشت کا یہ تھیلا تم پکڑ لو۔ پانی کا مشکیزہ میں اٹھاتا ہوں۔ اور اب چلو مجھے فیروزہ کے پاس لے چلو۔ چلو۔ چلو۔ جلدی کرو۔ ٹھہرو۔ میں پنیر کی یہ گٹھری بھی اٹھا لوں۔

(قدموں کی چاپ)

نادرہ۔ (سرگوشی میں) اس طرف۔ میرا ہاتھ پکڑ لو۔ بس چلے آؤ۔

(وقفہ۔ ہماہمی پیدا کی جائے۔ اور ذیل کی آوازیں آئیں۔)

شہباز خان مغلوں کے ساتھ مل گیا۔

شہباز خان غداری کر گیا۔

وہ ہمارے سب راز جانتا ہے۔

اب ہمیں محاصرہ اٹھانا پڑیگا۔

ہماری امیدیں خاک میں مل گئیں۔

(وقفہ)

سنا ہے کہ ایک عورت کے عشق نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ فیروزہ نامی ایک حسین مغنیّہ نے شہباز کے پر کاٹ کر رکھ دیئے ہیں ــــ،

وہ فیروزہ کو بہت چاہتا ہے۔

وہ بھی تو ہزار جان سے اس پر فدا ہے۔

اس عورت کے لئے وہ گوشت، پنیر اور نہ جانے کیا کیا کچھ یہاں سے لے گیا ہے۔

(وقفہ)

شیر خان۔ تمہارا بیٹا غدار نہیں تو کیا ہے۔ ایک رقاصہ کی خاطر وطن کو چھوڑ کر دشمن کے ساتھ جا ملا۔

(وقفہ)

چُپ کیوں ہو گئے۔ سر کیوں جھکا لیا۔ اب کیوں نہیں گرجتے۔ شاید اس لئے کہ یہ غدار اتفاق سے تمہارا بیٹا ہے۔ دوست نہیں ہو۔

قلندر۔ شہباز میرا بیٹا ہے۔ میں کب اس سے انکار کرتا ہوں۔ اسکے علاوہ تمہیں کچھ اور بھی کہنا ہے۔

شیر خان۔ غدار بیٹے کے باپ سے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

قلندر۔ اب تم جا سکتے ہو۔

(وقفہ)

(اپنے آپ سے) چُپ کیوں ہو گئے۔ سر کیوں جھکا لیا۔ اب کیوں نہیں بولتے۔ شاید اس لئے کہ غدار تمہارا بیٹا ہے، دوست نہیں ہے۔ میں کیا کروں۔ اے خدا میں کیا کروں۔ شہباز تو میرا بیٹا ہے

شہباز میرا بیٹا ہے۔

(وقفہ)

(سرگوشیوں میں ذیل کی گفتگو سنائی دے۔)

ایک آدمی۔ نہیں خان نہیں۔ تمہیں اپنی جان اس طرح خطرے میں نہیں ڈالنی چاہیئے۔

دوسرا۔ دیوار بہت اُونچی ہے خان۔ بہت اُونچی ہے۔

قلندر۔ باتوں میں وقت نہ ضائع کرو۔ صبح ہوا چاہتی ہے۔ اور دُشمن کے بیدار ہونے سے پہلے ہمیں فصیل کے اس طرف پہونچ جانا چاہیئے۔

پہلا آدمی۔ لیکن ہمیں ایک بار پھر سوچ لینا چاہیئے۔

قلندر۔ خاموش رہو۔ اگر تم نہیں جانا چاہتے تو صاف صاف کہدو میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔

آوازیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم مرتے دم تک تمہارا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

قلندر۔ شاباش۔ تو ساری باتیں تم نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اندر پہونچ کر ہمیں دروازے کے محافظوں پر اس تیزی سے دھاوا بولنا ہے کہ ایک بار بوکھلا اُٹھیں۔ ان کی گھبراہٹ سے فائدہ اُٹھا کر ہم اپنے لشکر کے لئے دروازہ کھول دیں گے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ کام بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہو۔ تو لو سب سے پہلے میں دیوار پر چڑھتا ہوں۔

ایک آدمی۔ کمند ٹھیک ہے نا خان۔

قلندر۔ گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہے۔

(وقفہ)

(دفعتاً فائروں کی آوازیں۔ تلواروں کی جھنکار۔ دبی دبی چیخیں سُنائی دیں۔ ذیل کا ٹکڑا ان آوازوں پر سپرامپوز کی جائیں۔)

شبخون۔ شبخون۔

آفریدی آگئے۔ آفریدی آگئے۔

بھاگو۔ بھاگو۔

قلندر۔ شاباش۔ شاباش۔ بچنے نہ پائے —— دروازہ کھول دو۔ دروازہ کھول دو۔

(وزنی دروازہ کھلنے کی آواز۔ اور اس کے ساتھ ہی جنگ کا شور بلند ہو۔ چند لمحوں کے بعد یہ آوازیں بیک گراؤنڈ میں چلی جائیں۔)

ایک آدمی۔ قلندر خان قلندر خان!

قلندر۔ کیا ہے۔

آدمی۔ تمہارا بیٹا!

قلندر۔ کہاں؟

آدمی۔ وہ۔ وہ۔ دیکھو چند مغلوں کے ساتھ ہمارے سپاہیوں سے لڑ رہا ہے۔

قلندر۔ دیکھو۔ تم لوگ اس کے گِرد گھیرا ڈال لو۔ اور جس طرح ہو سکے اُسے گرفتار کر کے شہر کے باہر جنگل میں لے چلو۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ (بلند آواز میں) شیر خان۔ شیر خان میرے ساتھ آؤ۔

(جنگ کا شور بلند ہو کر عقب میں چلا جائے۔)

(وقفہ)

شہباز۔ (ڈرتے ہوئے لہجے میں) کون؟

قلندر۔ قلندر خان آفریدی۔ تمہارا باپ۔

شہباز۔ میں میں.....

قلندر۔ خاموش۔ شیر خان اس کی مشکیں کھول دو۔ مُنہ کیا تک رہے ہو مشکیں کھول دو۔ تمہارا طمنچہ کہاں ہے شیر خاں۔ وہی جو تم نے اپنے مرے ہوئے باپ کی نشانی کے طور پر رکھا ہے —— شکریہ! شہباز اس درخت کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔

شیر خان۔ کیا کر رہے ہو خان؟

قلندر خان۔ شہباز میرا بیٹا ہے دوست نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو آفریدی باپ اپنے بیٹوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

(فائر کی آواز۔ چیخ۔ اور جیسے کوئی دھڑام سے گرے)

آوازیں۔ یہ تم نے کیا کیا خان۔

قلندر خان۔ یہ میرا بیٹا تھا۔ اور غدّار بیٹوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ شیر خان تم نے دیکھ لیا۔ غدّار بیٹوں کو خود اُن کے باپ سزا دیا کرتے ہیں ——

(فیڈ آؤٹ)

ابوسعید قریشی

دو غزلیں

مسرور بھی ہوں خوش بھی ہوں لیکن خوشی نہیں
تیرے بغیر زیست تو ہے زندگی نہیں

کس آستاں پہ ہے جو مرا سر جھکا ہوا
رنگِ نیاز ہے یہ کوئی بندگی نہیں

بے نور ہو چکا ہے زمانہ مرے لئے
نکلا ہوا ہے چاند مگر چاندنی نہیں

بس دردِ عاشقی کو سمجھتا ہوں جان و روح
کمبخت وہ بھی دل میں کبھی ہے کبھی نہیں

غم ہی ڈال دے مرے دستِ سوال پر
میں کیا کروں خوشی کو جو تیری خوشی نہیں

کچھ دیر اور رہنے دے خودداریٔ جنوں
دامن تو چاک ہونا ہے لیکن ابھی نہیں

ساقی نگاہِ ناز سے لِللّٰہ کام لے
سو جام پی چکا ہوں مگر بے خودی نہیں

لینا پڑے گی تم کو تہی دامنی کی لاج
مجھ کو کمی ضرور ہے تم کو کمی نہیں

بہزاد صاف صاف میں کہتا ہوں حالِ دل
شرمندۂ کمال مری شاعری نہیں

بہزاد لکھنوی

جاتا تھا نامراد دل کیا آسی بے وفا کے پاس
کاوشِ آرزو مجھے لے نہ گئی قضا کے پاس

ہر کوکس اُمید پہ داغِ جگر دکھائیں ہم
ایک نگاہِ لطف بھی جب نہیں آشنا کے پاس

آ گیا میری روح پر بن کے سرورِ بے خودی
خواب نہیں طلسم تھا دیدۂ نیم وا کے پاس

شیفتہ دل، فگار دل، ایک نحیف و زار دل
نذر کیا حضورِ دوست تھا یہی بے نوا کے پاس

رونقِ محفلِ طرب آ میری بزمِ وجد میں
نغمۂ بے صدا کہاں مطربِ خوشنوا کے پاس

لے کے ہم واپس پھر آتے ہیں شرمسار وہ
کچھ کوئی عذر تو اب نہ رہا قضا کے پاس

[illegible]

ساقی کا افسانہ نمبر

افسانہ نمبر حسبِ دستور جولائی کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا۔ کاغذ کی نایابی کی وجہ سے یہ خاص نمبر بہت ضخیم نہیں ہوگا۔ لیکن چیدہ چیدہ افسانوں کا ایسا مجموعہ آپ کی نظر سے کم گزرا ہوگا۔ مندرجہ ذیل حضرات کے افسانے شریک ہونے کی اُمید ہے:۔

قاضی نذر الاسلام؛ ایم اسلم؛ حجاب امتیاز علی؛ کرشن چندر؛ سعادت حسن منٹو؛ اوپیندر ناتھ اشک؛ قیسی رامپوری؛ بھارت چند کھنہ؛ ظفر قریشی؛ شیلا سمیر؛ فضل احمد کریم فضلی؛ سنتوش کیشپ؛ صادق الخیری؛ عصمت چغتائی؛ انصار ناصری؛ مدھو سودن؛ جاں نثار اختر؛ نریندر ناتھ سیٹھ؛ محمد حسن عسکری؛ مہندر ناتھ؛ عرش تیموری؛ ریاض روفی؛ انور؛ پرتھوی ناتھ شرما۔

ان کے علاوہ مشہور شعرا کی افسانوی نظمیں بھی شریک ہوں گی۔
قیمت ۱۲؍ مستقل خریداروں سے قیمت الگ نہیں لی جائے گی۔

عظیم بیگ چغتائی

...لم	قیمت للعہ
...لستاد	، ۶ؔ
...ی	، ۶ؔ
...نجوفت	، ۶ؔ
...قدر	، ۶ؔ
...بیری	، ۶ؔ
...ٹی کے افسانے	، ۳ؔ
...ہائیڈ	، عہ
...ہاجاستگا	، عہ
...نکڑے	، عہ
...ح لطافت	، ۶ؔ
...یدی	، عہ
...یروری	، ۸ر
...ٹ	، عہ
...بیوی	، ۶ؔ
...تی کی رد میں	، ۸ر
...ابجی	، ۱۲ر
...ن اور کیسے	، ۱۲ر
...تمک	، ۲ر
...ا پہاڑ	، عہ
...ں کی انگوٹھی	، ۸ر
...مرض	، ۵ر
...ند سرحد	، ۵ر
...ہروں	، ۵ر
...خیمہ	، ۵ر
...نا اور پردہ	، ۶ؔ
...شا اور پردہ	، عہ
...ا وسرود	، ۴ر
...ین چغتائی	، ۱۲ر
...ناظمی	، ۱۲ر
...نا نمبر	عہ

ایم اسلم

نرگس	قیمت ۶ؔ
گنہگار	، عہ
رقاصہ	، عہ
طلسم سامری	، ۶ؔ

بہزاد لکھنوی

نغمۂ نور	قیمت عہ
کیف وسرور	، عہ
موج طہور	، عہ
چراغ طور	، عہ

مولانا عنایت اللہ

نجم السحر	قیمت ۶ؔ
سلامبو	، ۳ؔ
ہیملٹ	، عہ
مہر ودیاس	، ۱۲ر
اندلس کا لٹیرا	، عہ
دانتے کا جہنم	، ۱۲ر
خواب پریشاں	، ۴ر

مشہور مصنفین

دھواں	قیمت ۶ؔ
جنازے	، عہ
کلیاں	، ۶ؔ
ضدی	، عہ
کہکشاں	، ۶ؔ
دنیا کے بڑے لوگ	، ۶ؔ
اتاترک	، ۶ؔ
دوسری جنگ عظیم	، ۶ؔ

سوز وگداز (؟)	قیمت ۶ؔ
نرگس جمال	، عہ
سرگذشت عروس	، ۶ؔ
پروین وثریا	، عہ
فاؤسٹ	، ۶ؔ
چندرا مکھی	، عہ
نجمہ نوری	، ۱۲ر
سلے	، ۸ر
ریڈیو ڈرامے	، عہ
تعلیم زدہ بیوی	، ۸ر
محبت ونفرت	، ۶ؔ
لال قلعہ کی ایک جھلک	، عہ
دلی کا آخری دیدار	، ۱۲ر
اخوان الشیاطین	، ۶ؔ
ید قدرت	، ۵ر
چار چاند	، ۸ر
نغمات موت	، ۶ر
ترکی میں مغرب مشرق کی کشمکش	، ۶ؔ
لالہ رخ	، ۶ؔ
ریزۂ مینا	، ۳ؔ
سات تارے	، ۶ؔ
سودیشی ریل	، عہ
روح سیاست	، ۸ر
انقلاب شاہنشہ کا دوسرا رخ	، ۶ؔ
فرانسیسی افسانے	، ۴ر
مسلمانوں کی حیات سیاسی	، عہ
شعلے	، عہ
ادب زریں	، ۸ر
لیڈر	، ۳ر

ملنے کا پتہ: ساقی بکڈپو، دہلی

رسیلے، مہکتے، جگمگاتے اور دہکتے ہوئے افکار کا

خیال افروز مجموعہ

جلوہ گاہ

مخمور جالندھری

زندگی کی عریاں تصویر اور سماج کے دامن کی دھجیاں اڑتی ہوئی دیکھنی ہوں تو مخمور کا کلام ملاحظہ فرمایئے۔ مخمور پنجاب کے مشہور، نوجوان اور ترقی پسند شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ جلوہ گاہ کے دلفریب مناظر دل ونگاہ پر بجلیوں کا کام کرتے ہیں۔ فردوس نظر گردپوش، مضبوط جلد، ضخامت ۲۱۵ صفحات۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ: مخمور جالندھری۔ لال کرتی جالندھر چھاؤنی

نرگس یہ ایک ناول ہے جس میں ایک طوائف کی دردناک عبرت انگیز زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ نہایت غمناک کہانی ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گناہ آلود زندگی گزارنے والی کے پہلو میں ایک حساس اور محبت کرنے والا دل دھڑکتا رہتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو اس کی تباہی و بربادی کس طرح ہوتی ہے؟ یہ آپ کو نرگس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ کتاب مجلد اور رنگین گردپوش سے آراستہ۔ قیمت ۶ؔ علاوہ محصولڈاک۔

رقاصہ اس کتاب میں سات بھیانک کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں انسانی فطرت کی خباثت، حیوانیت اور درندگی کو عریاں کرکے پیش کیا گیا ہے۔ یہ لرزہ خیز افسانے گناہ، خون اور موت کی تصویریں ہیں۔ جنہیں پڑھکر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائینگے۔ کتاب مجلد ہے اور مسٹر سوبھا سنگھ آرٹسٹ نے اس کا ٹائیٹل بنایا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ: ساقی بکڈپو، دہلی

چندہ سالانہ چھ روپے
ششماہی تین روپے آٹھ آنے
مع محصول ڈاک، فی پرچہ ۱۰
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جرعات

سال ساقی کے دو خاص نمبر
شائع ہوتے ہیں۔ مستقل
خریداروں سے ان کی
قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

جلد ۲۵ | ساقی دہلی۔ بابت جون سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۶

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

کاغذ کی گرانی کا شکوہ سُنتے سُنتے آپ کے کان پک گئے ہونگے لیکن ؎

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں مدعائے ضروری الاظہار

اب ایک اور نئی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ ہفتوں مہینوں کاغذ ہی نہیں ملتا۔ کاغذیوں نے اپنی دکانیں جی کے دل کی صاف کر دی ہیں تاکہ کسی کو کوئی شکایت ہی نہ رہے۔ لیکن اگر اب بھی کوئی چوگنی قیمت پر کاغذ خریدنا چاہے تو اہلِ دل کاغذی ضرورت کو پورا کر دیتے ہیں۔ اس دست غیب کی روک تھام اب تک حکومت نہیں کر سکی۔ اب پھر حکومت اور کاغذیوں کی گفت و شنید ہو رہی ہے۔ یہ کام صرف باتوں سے نہیں طے ہو سکتا۔ اس کے لئے حکومت ہند کو سختی سے کام لینا پڑے گا۔ ورنہ ملک کا قیمتی لٹریچر اس نفع بازی کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ اور اس نقصانِ عظیم کی تلافی کبھی بھی نہ ہو سکے گی۔ ساقی کے لئے ہم وقتاً فوقتاً کاغذ خریدتے رہے ہیں اور اس کا بالکل لحاظ نہیں کیا کہ کس قیمت پر خرید رہے ہیں۔ جس قیمت پر بھی ملا لے لیا۔ ورنہ نہ کاغذ ملتا اور نہ رسالہ شائع ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ساقی اب تک ٹھیک وقت کے ساتھ ماہ بماہ شائع ہوتا رہا ہے اور اُمید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح شائع ہوتا رہے گا لیکن جو مالی نقصان اس وقت ادارے کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے اس کی تلافی شاید آئندہ کئی سال میں بھی نہیں ہو سکے گی۔ موجودہ زیر باری کو کچھ کم کرنے کے لئے ہمیں مجبوراً تھوڑا سا اضافہ سا چندے میں کرنا پڑ رہا ہے۔ یعنی بجائے پانچ روپے سالانہ کے یکم جون سے ساقی کا چندہ چھ روپے سالانہ ہوگا۔ اُمید ہے کہ ناظرین قدردانِ ساقی اس قلیل اضافے کو گوارا فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

ساقی کا آئندہ پرچہ افسانہ نمبر ہوگا۔ ایم۔ اسلم، اوپندر ناتھ اشک اور جناب امتیاز علی کے افسانے پڑھ کر آپ بے اختیار کہہ اٹھیں کہ ایسے افسانے جس زبان میں لکھے جاتے ہوں وہ زبان دُنیا کی کسی زبان سے پیچھے نہیں رہ سکتی۔ افسوس ہے کہ ہمارے بعض عمدہ افسانہ نگار اب تک اپنے افسانے نہیں بھیج سکے ہیں لیکن اُمید ہے کہ ان کے افسانے ساقی کے افسانہ نمبر میں آپ ضرور ملاحظہ فرمائیں گے۔ اسی پرچے میں کہیں اور جگہ افسانہ نگاروں کے نام درج کر دیئے گئے ہیں۔

تصحیح۔ مئی کے ساقی میں "باتیں" کے گیارھویں پارہ میں اُزیر احمد صاحب کے نام کے بعد بجائے تمنائی کے ارکوئی ہونا چاہئے ان کا نام جناب ازیر احمد ارکوئی ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

شاہد

ضروری اطلاع۔ ساقی کا چندہ یکم جون سے بجائے پانچ روپے کے چھ روپے سالانہ اور تین روپے ششماہی ہوگا۔

جو مسودے ساقی کے لئے موصول ہوتے ہیں انہیں حفاظت سے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاہم اس بارے میں دفتر ساقی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس لئے اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھا کیجئے۔

جو مضامین قابلِ اشاعت قرار پائیں گے صرف انہیں کے بارے میں مزید مراسلت کی جائے گی۔

مضامین ایڈیٹر ساقی کے نام بھیجنے چاہئیں۔

ساقی ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو بھیج دیا جاتا ہے۔ پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت ۱۵ تاریخ تک کرنی چاہئے۔ اس کے بعد دوبارہ پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ تعمیل ارشاد ممکن نہ ہوگی۔

جواب طلب امور کے لئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔

باتیں

جو لوگ پاکستان کے خلاف ہیں اور جو لوگ پاکستان کے موافق اور اکھنڈ ہندستان کے خلاف ہیں دونوں کے دلوں میں ایک ہی چور ہے۔ وہ چور یہ ہے کہ یہ معاملہ انگلستان طے کرے۔ فریقین اپنے بل بوتے پر اپنے مطالبے نہیں کر رہے ہیں۔ اگر اپنے بل بوتے پر دونوں فریق بھروسا کرتے تو وہ محسوس کرتے کہ ابھی تو پاکستان یا اکھنڈ ہندستان دھوکا دینے والے الفاظ یا فقرے ہیں۔ پہلے آزادی، مکمل آزادی، پہلے انگلستان کے اس ہلاک کن چنگل سے چھوٹنا ہے جس کی بدولت نو کروڑ مسلمان، تیس کروڑ ہندو اور ایک کروڑ کے قریب اوروں کی زندگی جہنم کی زندگی بن گئی ہے۔ اس کے بعد چاہے اکھنڈ ہندستان رہا چاہے دو تین یا چار سو دیشی جمہوری حکومتیں ہندستان میں قائم ہوئیں ہر حالت موجودہ حالت سے بدرجہا بہتر ہوگی۔ میری رائے میں شری راجگوپال چاری نے جو شگوفہ چھوڑا ہے اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ لوگ چونک پڑے۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے اگر یہ ضروری ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں سے کوئی ایسا راضی نامہ یا معاہدہ کر لیا جائے کہ ہم لوگ مل کر آزادی کے لئے لڑیں اور انگریزوں اور جاپانیوں کے حملوں سے آزاد کر کے اس ملک میں جو صوبہ دوسرے صوبوں سے الگ رہ کر حکومت قائم کرنا چاہے تو اس کے لئے دونوں راضی ہوں تو خلوص، محبت اور دیانت۔ اس کے ساتھ ایسا معاہدہ کر لینا چاہیئے۔ لیکن یہ پاکستان اس پاکستان سے زیادہ پاکیزہ اور بابرکت ہوگا جسے جناب جناح انگریزوں کی مدد سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ پاکستان اس پانی سے سینچ کر قائم کریں گے جس میں ہندو مسلمان دونوں بھائیوں کا خون ملا ہوگا۔ اب مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی پچھلی چوتھائی صدی کی زندگی کا ایک دور ختم ہو رہا ہے۔ ہمیں اب اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ جب انگریزی حکومت کہے کہ یہ تمہارا وطن ہے اس کے لئے کٹ مرو تب ہم اسے اپنا وطن مانیں اور اس کے لئے کٹیں مریں۔ ہم چالیس کروڑ ہندستانیوں کو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اسے اپنا وطن مانیں۔ ہمیں آپس میں سمجھوتہ کر کے وائسرائے کی کونسل میں گھس پڑنا چاہیئے۔ اور جو کچھ بھی اختیارات ملیں انہیں لیکر لاکھوں کی تعداد میں گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ میں پھیل جانا چاہیئے۔ اور اہل وطن کو آزادی کے لئے اور جاپانیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ جب مقابلے کی اسپرٹ پیدا ہوگی اس وقت انگریزی حکومت بھی دھوئیں کی طرح اُڑ جائے گی۔ ہندو مسلمانوں کو اب نئی رہبری کی ضرورت ہے۔ اگر کانگریس اور لیگ کے موجودہ لیڈر یہ نئی رہبری نہ کریں گے تو یہ کام ہندستان کے کمیونسٹ کر دیں گے۔ انہیں کے ہاتھوں ہندو مسلم اتحاد ہوگا۔ اور ہندستان آزاد ہوگا۔

قدم اُٹھتے ہیں غلط قافلہ سرداروں کے ۔۔۔ اُنہیں دھکیا کے بڑھیں قافلے والے آگے ۔۔۔ (فراق)

۔۔۔۔۔۔ ۱۳ ۔۔۔۔۔۔

کبھی آپ نے اس بات کو بھی سوچا کہ اگر میر، غالب، مومن، آتش، داغ، حسرت، فانی، جگر اور ہمارے دوسرے عشقیہ شاعر ڈھائی تین سو برس کی عمریں پاتے اور ان کی صحت و شاعرانہ صلاحیتیں قائم رہتیں تو ان کی وہ شاعری کیسی ہوتی جو وہ لگ بھگ ڈیڑھ سو برس کی عمر میں شروع کرتے۔ اور جو پختہ تر ہوتی جاتی۔ اور اگر ان کے کلام کے مشتاق حضرات بھی ڈیڑھ ڈیڑھ سو برس سے تین تین سو برس کی عمریں پاتے تو ان کیسی شاعری کا مطالبہ کرتے۔ آج ان شعرا کی سینکڑوں غزلیں اور ہزار ہا اشعار جنہیں ہم نشتر سمجھتے ہیں کیا ہمیں اس وقت بدمزہ نہ کر دیتے۔ اگر آپ بھی ایسا محسوس کرتے ہیں تو کیا آپ کو یہ ماننے میں تامل ہے کہ یہ تیر و نشتر کچے لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ شعرا باوجود اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کے کچھ کچے تھے اور چونکہ ہم بھی کچے ہیں اس لئے ان کا عشقیہ کلام ہمیں گھائل کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں اور آپ کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر اہل مشاعرہ کے بجائے مہاتما کرشن، مہاتما بدھ، مہاتما زرتشت، مہاتما عیسیٰ، حضرت محمد، اور سنسار بھر کے رشی منی [illegible] عالم فاضل، پیر مرد ماہ اور تمام پختہ کار ہستیاں یہ عشقیہ اشعار سنتیں تو ان بے شمار اشعار میں سے جنہیں ہم [illegible] [illegible] حضرت [illegible] زندگی کی تڑپ [illegible] کی ترجمانی نہیں [illegible]

تو بجائے ان تیروں اور نشتروں میں موجود ہے؟ یہ سمجھنا بڑی بھاری خود فریبی ہے کہ جن برگزیدہ ہستیوں کا جس مرتبہ کی ہستیوں کا اوپر ذکر آ شاعری کی قدر کیا سمجھیں۔ شاعرانہ حقیقت بھی اس کے برعکس ہے۔ وہی شعر بڑا شعر ہے وہی شاعری پُرعظمت شاعری ہے جو ایسی پسندیدگی حاصل کر سکے جو ایسی ہستیوں کے ذوق اور وجدان سے ہم آہنگ ہو۔ مثلاً اگر اس عشقیہ شعر ؎

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے (فانی)

یا اس شعر ؎ جب پرسشِ غم وہ کرتے ہیں کیا جانیئے کیا ہو جاتا ہے — کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے (۔)

سے یہ عشقیہ شعر ؎

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے (غالب)

یا یہ شعر ؎ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں (اقبال)

ہمیں نسبتاً زیادہ بلند معلوم ہوتے ہیں تو کیوں؟ اس لئے کہ زندگی، عشقیہ زندگی کے جن مقامات کی طرف غالب کا شعر اور اقبال کا شعر ہمیں لے جاتے ہیں وہ اُن مقامات سے قریب ہیں جہاں مہاتماؤں کی زندگی، دُنیا کے بڑے لوگوں کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ ہم اور آپ سو برس تک اگر ترقی کرتے جائیں اور داخلی طور پر پختہ ہوتے جائیں تو غالب اور اقبال کے شعر پر وجد کریں گے لیکن فانی کے مذکورہ بالا دونوں اشعار کے دائرۂ اثر سے گذر چکے ہوں گے۔ ورنہ اس میں شک نہیں کہ اپنے حدود میں فانی کے اشعار تغزل کی جان ہیں کیا کیا جائے کہ زندگی میں جس بات، جس حالت، جس کیفیت و تجربہ کو جتنی عظمت حاصل ہے اتنی ہی عظمت اُسے شعر میں بھی حاصل ہوگی۔ کم بڑی بات ایک زیادہ بڑی بات سے شاعری کی دُنیا میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ میں اکثر اپنے طلبا سے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا جو چیز زندگی میں بڑی نہیں اُسے شاعری بڑی نہیں بنا سکتی۔ انگریزی مصنف جارج مور نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بڑا ادب ادبی نہیں (Great literature is seldom literary ———) ہم جب عشقیہ یا غیر عشقیہ اشعار سنیں یا پڑھیں چاہیئے کہ اس کا اندازہ لگائیں کہ اس شعر میں داخلی پختگی کتنی ہے۔ ڈیڑھ سو برس کی عمر کو جانے دیجئے صرف اتنا سوچئے کہ جس شعر کو ہم چٹیلا اور رچا ہوا سمجھتے ہیں وہ تیس چالیس برس کے آدمی کے احساسات کا حامل ہے یا ستر بہتر برس کے پختہ کار دل و دماغ والے انسان کے احساسات کا آئینہ دار ہے۔ رہے ہمارے شعرا سو زیادہ تر وہ اپنے ارتقا کی منزلیں چالیس برس کے ادھر ہی طے کر لیتے ہیں اور بعد کو ماضی کا بوجھ اپنی پیٹھ سے ہلکا نہیں کر سکتے۔ اسی لئے بوڑھے ہو کر یعنی پختہ ہو کر بھی وہ جوان شعر یعنی کچے یا نیم پختہ شعر کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے مشاقی یا کہنہ مشقی بڑی چیز ہوتے ہوئے بھی ایک خطرناک چیز ہے جو شاعر کی ترقی یافتہ زندگی کو اس کی داخلی نشو و نما کو شاعری کے ماضی کے چنگل میں پھنسا دیتی ہے۔ میں نے بائیس برس کی عمر میں یہ شعر کہا تھا ؎

اپنے ہوئے، پرائے ہوئے پر جفا ہوئے — تم دیکھتے ہی دیکھتے اُف کیا سے کیا ہوئے

تقریباً پندرہ برس بعد جب میں اشاعت کے لئے اپنے کلام کی ترتیب دینے لگا تو اس شعر کو دیکھ کر میں کچھ شرمایا۔ اگرچہ میرے اس شعر کو کم لیکن سینکڑوں دوسرے لوگ جو اچھے خاصے انسان تھے، بہت کافی سر دھن چکے تھے ـــ میں نے اب اس شعر کو یوں کر دیا ؎

باقی نہیں ہے اب تمہیں برقِ نگاہِ عشق — تم دیکھتے ہی دیکھتے اُف کیا سے کیا ہوئے

میرا دوسرا شعر بھی کوئی آیت نہیں ہے لیکن پہلے شعر میں اور دوسرے شعر میں جو فرق ہے وہ قابلِ توجہ ہے۔ دوسرے شعر سے ملتے جلتے میں نے شعر بھی اس واقعے کے کچھ بعد ہی کہے ؎

اپنے جلووں سے بھی برقِ حُسن کو ہی احتراز — اب نگاہِ شوق کو بھی دور جانا چاہیئے

نگاہِ اہلِ شوق برقِ حُسن سے بھی بڑھ چلی — ترے جمال و دید پر بھی اب ترا گماں نہیں

میں تو یہی کہوں گا کہ عمر بھر بہ کمالِ روانی و سلاست و ترنم و حسنِ بیان ایسی شاعری کرتے رہنا جس کے بارے میں اس سے زیادہ ہم نہ کہہ سکیں کہ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔ اپنے بالوں میں نہیں بلکہ اپنے دل و دماغ اور اپنی روح میں خضاب لگانے کے برابر ہے۔

کیا عشقیہ شاعری کا کوئی ایسا اہم پہلو ہے جس کی ترجمانی خدائے سخن میر نے نہیں کی۔ اگر ہے تو بتائیے وہ کون پہلو ہے۔ آپ شاید یہ کہیں کہ وہ طربیہ یا نشاطیہ پہلو ہے۔ بجا لیکن طربیہ و نشاطیہ اشعار میر کے یہاں بھی ایسے ملتے ہیں اور وہ اشعار جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مثلاً ؎

بُرقعے کو اٹھائے ہوئے وہ بُت اگر آئے　　　　اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے

یا ؎

کیونکہ نقاشِ ازل نے نقشِ ابرو کے کیے　　　　کام تھا اک مُنہ پہ تیرے کھینچنا شمشیر کا

میں جو چیز میر کے یہاں نہیں پاتا یا جہاں تک مجھے یاد آتا ہے جو چیز میر کے یہاں نہیں ہے وہ ہے عشقیہ جذبات کو براہِ راست اور بے کم و کاست دو ٹوک طریقے پر بیان کر دینے کے بجائے ان جذبات کا یا جنسی نفسیات و کیفیات کا تجزیہ و تحلیل۔ میر کی عشقیہ بنیادی اور اساسی در elemental کا چیز ہے۔ شدتِ احساس، بنیادی ردعمل، عشقیہ زندگی کے احساسات و معیار بیان کرنے میں میر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ لیکن داخلی معاملہ بندی، ذہنیات کا طریقِ عمل (process)، ان کی روشس، تلازمِ خیالات (association of ideas)، جذبات کی پیچیدگی، جذبات کا تضاد اور ٹکراؤ، نفسیاتِ حسن و عشق کی تہیں، ان کے نیم واضح نیم فراموش پہلو، جذبات کے دروبست، حسن و عشق کے کردار کی نیرنگیاں، نفسیاتِ حسن و عشق کے نازک موقعے اور نازک مقامات! یہ ایک پوری کائنات تھی جس کی خلقت میر کے بعد ہوئی۔ کچھ شعر میر کے مجھے ضرور ایسے یاد آتے ہیں جن میں چند نیم واضح کیفیتیں اُجاگر کی گئی ہیں۔ مثلاً ؎

جفائیں دیکھ لیاں کج ادائیاں دیکھیں　　　　بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر　　　　اُس بیوفا کو راہ پہ لانا ضرور تھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو　　　　ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

اجنبیتی ملاقات کب تک رہیگی　　　　کبھو دل سے بھی تو مرا یار ہوگا

کیا ہے دیکھو ہو جو ادھر ہر دم　　　　اور چتون میں پیار سا ہے کچھ

وجہِ بیگانگی نہیں معلوم　　　　تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

اِن اشعار میں نازک باتیں کہی گئی ہیں۔ تحت الشعور احساسات، ماورائی جذبات و تجربے پیش کئے گئے ہیں۔ فطرتِ حسن پر بھی کچھ اشعار میں روشنی پڑتی ہے۔ لیکن میر کا سب سے نمایاں رنگ ایسے اشعار میں ہے جن میں سامنے کی باتیں، دو ٹوک انداز میں کہی گئی ہیں۔ مثلاً ؎

جو یوں ساری رات بھر میر روتا رہیگا　　　　تو ہمسایہ کا ہیکو سوتا رہیگا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہا یہ دل　　　　تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

تڑپے ہو جبکہ سینے میں اُچھلے ہے دو دو ہاتھ　　　　گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر　　　　ہے پیارے ہنوز دلی دور

میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے　　　　جان ہے تو جہان ہے پیارے

ہاں تو حسن و عشق کی وہ بے شمار نیم واضح کیفیتیں، وہ نیم محسوس بلکہ قریب قریب نامحسوس نفسیاتی حقیقتیں میر کے بعد اُردو شاعری میں ظاہر کی گئیں۔ مومن پہلا غزل گو ہے جس نے تغزل کے اس پہلو کو چمکایا۔ دورِ حاضر کی غزل گوئی بھی جذبات نگاری کی بہ نسبت غالبؔ و قوتِ جذبات، فلسفۂ جذبات، تحلیل و تجزیۂ جذبات کی طرف خاص طور پر مائل رہی ہے۔ ایسے اشعار:—

پیام زیرِ لب ایسا کہ کچھ سُنا نہ گیا　　　　اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا　　　　(یگانہ)

دکھانا پڑیگا اُسے زخمِ دل　　　　اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا　　　　(حالی)

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری　　　　کہ میں نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی　　　　(جگر)

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں　　　　محبت کا زمانہ آ رہا ہے　　　　(〃)

مدتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں　　　　اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں　　　　([illegible])

جو تری آنکھوں کو محبت نہیں کہتے اے دوست　　　　آج اب مجھ سے تری رنجش بیجا بھی نہیں　　　　(〃)

آج تو درد بھی کم ہے — آج تو کوئی آیا ہوتا (راقم الحروف)
اہلِ دل کو تیرا پیمانِ وفا — یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں (〃)
اب چلا ہے مجھ کو سکونِ نامحسوس — حجاب دردِ محبت اٹھائے جاتے ہیں (〃)

یا ایسے اشعار جن میں صرف حسن کی ادائیں حسن کے حرکات و سکنات یا محض شکر و شکایت نہیں ہیں بلکہ حسن کی فطرت و کردار کے نازک رموز بیان کئے گئے ہیں یا ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

حسبِ منشا دلِ پُر شوق کی باتوں کا جواب — دے دیا شرم میں ڈوبی ہوئی انگڑائی نے (سراج لکھنوی)
لبِ جاناں ہیں پھر صرفِ تبسم — پناہ اس التفاتِ شادماں سے (حسرت موہانی)
کھلیں نہ حسن کی فطرت کے راز عاشق پر — برت خلوص بھی، جھوٹی قسم بھی کھائے جا (راقم الحروف)
نگاہِ یار بزمِ ناز میں سند دیتی ہے کیا کیا — تغافل ہائے پیدا سے نوازش ہائے پنہاں کو (〃)

میر اور تمیر کے زمانہ کے بعد کہے گئے۔ یہ اشعار ایک نئی آگاہی و فرزانگی کا پتہ دیتے ہیں۔ ایسے اشعار نے اُردو تغزل میں رمزیت پیدا کی، حسن و عشق کی کردار نگاری کو خارجی حرکات و سکنات کے بیان سے آگے بڑھا کر اس میں داخلیت و معنویت پیدا کر دی اور اسباب و علل کا ایک داخلی سلسلہ قائم کیا۔ اس طرح ہماری نئی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی۔ لیکن اس قسم کی شاعری میں اغلاق و اہمال پیدا ہو جانے کا بہت ڈر رہتا ہے۔ بہت سے شاعر ایسی باتیں کہنے میں بسا اوقات بہک جاتے ہیں۔ لفظوں اور ترکیبوں کا شاہکار ہونے سے بچنے کے لئے یہاں بھی واقعیت کا دامن مضبوطی سے تھامنا چاہیئے۔

(۵)

میں نے سماجی مسائل پر اپنے طلبا سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بارہا کہا ہے کہ دُنیا میں جنگ کا عذاب اُن حکومتوں کی وجہ سے ہے جن میں اہلِ دولت، اہلِ ثروت اور اہلِ حکومت خود اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں کے ساتھ ظلم و بے انصافی برتتے ہیں۔ پہلے ایک حکومت خواہ وہ بظاہر جمہوری ہو ایسا نظام قائم کرتی ہے جو اہلِ حکومت کے ہم نسل و ہم قوم افراد کو مستقل طور پر غریب اور غلام اور دُنیا کی برکتوں سے محروم رکھے، اس کے بعد دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کو غلام بنانے اور لوٹنے کے لئے جنگ کرتی ہے۔ انگلستان کو لے لیجئے۔ وہاں کی آبادی لگ بھگ چھ کروڑ ہے۔ ہندوستان سے انگلستان کو ہر سال ڈھائی ارب روپوں کا فائدہ ہے۔ لیکن اگر یہ رقم انصاف کے ساتھ تمام انگریزوں میں ہر سال بانٹ دی جائے تو فی کس ہر سال چالیس روپے کے قریب پڑینگے یعنی ساڑھے تین روپے مہینہ ہر انگریز کو ہندوستان سے ملے گا۔ ظاہر ہے کہ ساڑھے تین روپے مہینہ پانے کے لیے کسی قوم کے افراد کسی دوسری قوم کو غلام ہرگز نہیں بنائیں گے اور انگلستان میں تو ساڑھے تین روپے مہینہ کچھ ہوتا ہی نہیں۔ مارکس نے اسی لئے تو کہا تھا کہ دُنیا کے مزدوروں کے مفاد میں کوئی تصادم نہیں اور ایک ملک کے مزدور دوسرے ملک کے مزدوروں سے کبھی جنگ کرنا نہیں چاہیں گے۔ ہم پر انگریزوں کا راج نہیں ہے بلکہ کچھ ہزار انگریزوں کا راج اور ظالمانہ راج چھ کروڑ انگریزوں اور چالیس کروڑ ہندستانیوں پر ہے۔ البتہ چھ کروڑ انگریزوں پر جو ظلم ہے وہ اس ظلم سے کم ہے جو ہندوستانیوں پر ہے۔ اس لئے جنگ کے عذاب کا تنہا سبب سرمایہ دارانہ نظام ہے اور یہی نظام ملوکیت یا دوسرے ملکوں کو غلام بنائے رکھنے کا بھی سبب ہے۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان میں بھی نازیت یا فاشیت کا جو نظام ہے وہ اسی نظام اسی طرزِ حکومت کی ابھری ہوئی تصویر ہے جو انگلستان، امریکہ، فرانس، ہالینڈ اور دنیا بھر میں قائم ہے، سوا روس کے۔ اگر انگلستان کے چھ کروڑ آدمی ایسا نظام قائم کریں جس میں سو فی صدی انگریز مساوی طور پر خوشحال ہوں تو ہندستان کو وہ فوراً آزاد کر دیں گے۔ کیونکہ دُنیا کا چھوٹے سے چھوٹا ملک دُنیا کے بڑے سے بڑے ملک کو غلام بنا کر اور لوٹ کر اکیا رگی یا سال بہ سال اتنی دولت نہیں پا سکتا کہ اس چھوٹے سے چھوٹے ملک کا ہر باشندہ یا اس کے آدھے باشندے بھی کوئی خاص فائدہ حاصل کر سکیں۔ یاد رہے کہ جب تک دُنیا بھر میں اشتراکی حکومت قائم نہ ہوگی جنگ کے بادل دُنیا پر منڈلاتے رہیں گے۔

(۶)

پاکستان اور اکھنڈ ہندستان کے متعلق ایک معرکہ آرا تجزیہ ہمارے ملک کے فاضل اور جیالے [illegible]
[illegible]

ایسی مفصّل اسکیم بنائیں جس کو عمل میں لاکر اس ملک کے سوفی صدی آدمیوں کو زیادہ سے زیادہ خوش حال، تندرست، تعلیم و تربیت یافتہ اور خوش اخلاق بنایا جاسکتا ہو اور ہندستان کی مختلف قومیتیں اور ملتیں اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کو جائز طور پر فروغ دے سکیں۔ جب ایک اسکیم یا نظام پر اتفاق ہوجائے گا تو سیاسی پھوڑا بھی پھوٹ جائے گا اور ہماری سیاسی زندگی سے سب فاسد مادّہ نکل جائے گا۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم کیسا پاکستان چاہتے ہیں کیسا اکھنڈ ہندستان چاہتے ہیں کیسا سوراج چاہتے ہیں۔ سقراط کے وقت سے آج تک دُنیا بربادی اور مصیبتوں کا شکار اس وجہ سے رہی کہ الفاظ کے ٹھوس مفہوم متعین نہیں کئے جاتے تھے۔ اُن کے نتائج نہیں سوچے جاتے تھے ان کے مطالب و مقاصد کی تفصیل و تشریح صاف صاف نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً پاکستان میں بینک یا افراد کے لئے قرض لینے اور دینے کے متعلق، زمینداری کا نظام، جاگیرداری کا نظام رکھنے، مٹانے یا بدلنے کے متعلق، بے روزگاری کے متعلق، امیر اور غریب، مزدور اور سرمایہ دار کے متعلق کیا قانون بنائے جائیں گے۔ کیا محض اسلامی شریعت سے یا محض زکوٰۃ کے قانون سے پاکستان میں رہنے والوں کا دلدر دور ہو سکیگا۔ کیا خلفاء اور اماموں کے بس کی یہ بات تھی۔ پیغمبروں کی بھی حکومت ہوتی تو کیا اُن کے بس کی بھی یہ بات تھی کہ مشینوں کے ذریعے سے چلنے والے کارخانوں، مشین کے ذریعہ سے ہونے والی زراعت اور سرمایہ داری کی اس جدید خوفناک شکل کو جسے جوائنٹ اسٹاک کمپنی کہا جاتا ہے قائم یا رائج رکھتے ہوئے پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کو (ہندوؤں کو جانے دیجئے) ذلّت مصیبت اور افلاس کے دلدل سے نکالا جاسکتا ہے۔ اپنی قوم کے ساتھ بے ایمانی اچھی چیز نہیں ہے۔ پاکستان والے اور اکھنڈ ہندستان والے پہلے صاف صاف اس کا اعلان کریں کہ وہ اپنی قوم کے راجاؤں، نوابوں، مہاجنوں، تعلقہ داروں، کارخانوں اور بینکوں کے حصّہ داروں سے کون کون حقوق چھینیں گے اور انہیں چھین کر اپنے ہم مذہبوں کی (غیر مذہب والوں کو جانے دیجئے) جو ٹھوس اور مستقل مدد کریں گے اس کی تفصیل بیان کریں۔ جہاں یہ مطالبہ قوم کی طرف سے کیا گیا سب بھید بھرم کھل جائے گا اور معلوم ہوجائے گا کہ پاکستان کے طرفدار موٹے موٹے راجے مہاراجے بیرسٹر اور نوابوں کے غریب مسلمانوں کے متعلق نہایت ناپاک ارادے ہیں اور اسی طرح ہندو سبھا کے لیڈروں اور بہت سے کانگریس کے لیڈروں کے متعلق یہ بھید کھل جائے گا کہ اکھنڈ ہندستان کے پردے میں غریبوں کے لئے وہ نہایت ناپاک ارادے رکھتے ہیں۔ مجھے تو برنارڈ شا کا وہ قول یاد آتا ہے کہ جو شخص اشتراکی نہیں ہے وہ شریف انسان نہیں۔ غریب ہندوؤ اور غریب مسلمانو اپنے لیڈروں سے ہوشیار ——— پہلے اپنے لیڈروں سے نو کروڑ مسلمانوں، تیس کروڑ ہندوؤں اور ایک کروڑ دوسرے مذہب والیوں کی روٹیوں، بے روزگاری، افلاس، تعلیم اور عملی مساوات کے سوالات طے کراؤ۔ پہلے ان معاملات کو حل کرنے کی مفصل اور ٹھوس اسکیم بناؤ، پہلے ایک آئین مرتب کراؤ تب پاکستان اور اکھنڈ ہندستان کا نام لینے دو۔ اس کے پہلے ہرگز نہیں۔

فراق گورکھپوری!

شعر و شاعر

شعر و شاعر ایک خاص واقعہ کی یادگار ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ آرٹ اگر پیٹ پوجا کا ذریعہ و حیلہ بن جاتا تو آرٹ آرٹ نہیں رہتا۔ یہ شعلہ سینا ہے اس شعلے سے روٹی نہیں پکائی جاتی۔ بلکہ اس سے چوب کلیمی اور ید بیضا پیدا کئے جاتے ہیں۔

(۱)

اندیشۂ تاریک کا انجام ہلاکت — ہے خوب بھی ناخوب بھی انداز نظر سے
جس بادِ سحر میں نہیں پیغامِ بہاراں — غنچے کبھی کھلتے نہیں اس بادِ سحر سے

(۲)

بلبل کا اگر سوزِ جگر ہو نہ چمن میں — محروم رہے صحنِ چمن آتشِ گل سے
ممکن نہیں ہنگامہ بپا بزم میں ہو جائے — رندوں کے اگر جام بھرے جائیں نہ مل سے

(۳)

رنگینیٔ مینا میں نہیں کیف کا جوہر — نشے سے الگ چیز ہے یہ کسوتِ مینا
خلاقِ عصا و یدِ بیضا ہے یہ بجلی — چولھے کی امیں آنچ نہیں شعلۂ سینا

(۴)

بے سوز اگر شمع ہو افسردہ ہے محفل — جگنو سے شبستانوں کو روشن نہیں کرتے
سینے سے لگے رہتے ہیں "الماس کے ٹکڑے" — گھنگرو کی طرح پاؤں میں چھن چھن نہیں کرتے

امین حزیں سیالکوٹی

بے روزگار بوڑھا

آج کل ایک بہت دلچسپ خدمت میرے سپرد ہے یعنی پڑھے لکھے بے روزگاروں کو مشورہ دینا کہ وہ کہاں اور کس طرح روزگار حاصل کریں۔ بنگال میں جتنی اس طرح کے بے روزگاروں کی کثرت ہے اتنی شاید کہیں اور نہ ہو، روز امیدواروں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ہر شخص اپنے دُکھ درد کی داستان سُنا کے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ملازمت کا سب سے زیادہ مستحق وہی ہے، امیدوار یہ سمجھتا ہے کہ ملازمت کی تقسیم صاحب ہی کے ہاتھ میں ہے، حالانکہ یہاں سوائے "نیک مشورے" کے اللہ کا نام ہے اور بس، باوجودیکہ ہر امیدوار کو مجھے یہ تلخ حقیقت بتانی پڑتی ہے لیکن امیدوار ہیں کہ مانتے ہی نہیں، بدستور چلے آتے ہیں ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کی جیتی جاگتی تصویریں بنے ہوئے۔

ایک دن ایک صاحب ملنے آئے، عمر قریب پچاس کے۔ وضع قطع اور چہرے بشرے سے گزشتہ خوشحالی اور موجودہ افلاس کے آثار نمایاں، کوٹ میلا اور پھٹا ہوا لیکن اچھے کپڑے کا، قمیص بھی کالر کے نیچے رفو کی ہوئی، پھچڑے دار کالر میں ایک ازار بند نما ٹائی بندھی ہوئی، رنگ جھلسا ہوا مگر کسی زمانے میں گورا رہا ہوگا، بال بڑھے ہوئے، ڈاڑھی بھی چار پانچ روز سے استرے کی محتاج، آنکھیں جلتی ہیں، ان سے ضعف و نقاہت نمایاں جیسے ابھی طویل بیماری اُٹھائی ہو، قدم لغزیدہ لغزیدہ نظریں لرزیدہ لرزیدہ۔ میز کے پاس آ کے کھڑے ہوگئے، اشارہ پا کے کرسی پر بیٹھ گئے، کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن سانس پھول رہی تھی، ان کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ اپنی جانب خاص توجہ کا مطالبہ کرتی تھی، میں نے ان کی دلجمعی کے لئے بنگلہ زبان[1] میں گفتگو شروع کی، اور کہا: "آپ کی طبیعت شاید اس طرف کچھ خراب تھی۔"

جواب سے پہلے انہیں کھانسی آئی، اس کے بعد کہنے لگے، "جی نہیں، کچھ یوں ہی بخار آگیا تھا، میری بیوی کی طبیعت البتہ خراب ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیماری کو چھپانا چاہتے ہیں اس ڈر سے کہ کہیں اس کی وجہ سے انہیں ملازمت نہ ملے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے کیوں ایسا سوال کیا، لہذا میں نے ہمدردانہ طور پر ان کی بیوی کی علالت کے متعلق دریافت کرنا زیادہ مناسب خیال کیا کیونکہ اس کی انہیں دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔

کہنے لگے: "وہ دو برس سے بیمار ہیں، اب اُٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہوگیا ہے، علاج کے لئے روپیہ پیسہ نہیں، نوکری کی تلاش میں آیا ہوں کہ اگر مل جائے تو علاج کروں۔"

میں نے کہا: "مگر آپ کی عمر زیادہ ہے۔ اس عمر میں ملازمت ملنی آسان نہیں۔"

جواب ملا: "ابھی میری عمر پچاس برس کی بھی تو نہیں ہے، ابھی میں اچھی طرح کام کر سکتا ہوں، دس بارہ میل پیدل چل سکتا ہوں، بیس بائیس میل سائکل چلا سکتا ہوں، پلیٹ فارم بھر ریل کے ساتھ ساتھ دوڑ سکتا ہوں، سات آٹھ گھنٹے بیٹھ کے آفس میں کام کر سکتا ہوں۔"

ہر جملے پر کھانسی آ آ کے یہ کہے جاتی تھی کہ جو یہ کہہ رہے ہیں وہ بات پہلے سچ ہو تو ہو مگر اب نہیں ہے، اگر ان کے لہجہ میں زہرخند کی کیفیت نہ ہوتی تو مجھے ضرور ہنسی آگئی ہوتی، پھر بھی میرے مُنہ سے نکل گیا: "ہزاروں نوجوان آپ سے زیادہ طاقتور بیٹھے ہیں انہیں تو ملازمت ملتی نہیں آپ کو کیسے مل جائیگی؟"

میرے اس کہنے نے نشتر کا کام کیا اور پھوڑا پھوٹ نکلا۔ کہنے لگے: "کیا جوانوں ہی کی ضرورتیں ہیں، بڈھوں کی نہیں، اور پھر میں ایسا بڈھا بھی نہیں، میں سچ کہتا ہوں میری ضرورتیں جوانوں سے زیادہ ہیں۔ اس وقت مجھے ملازمت کی ضرورت ان سے کہیں زیادہ ہے، میری بیوی بیمار پڑی ہے، بے دوا درمن، میرے پانچ بچے ہیں، بھوکے پیاسے ننگے، مجھے گھر جاتے ڈر معلوم ہوتا ہے، جب میں ان کی بھوکی آنکھوں کو دیکھتا ہوں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں، وہ مُنہ سے کچھ نہیں کہتے، میری بیمار بیوی بھی مجھے دیکھ کے اپنے ستے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتی ہے مگر ان کا یہ

[1] [illegible] امیدواروں کو عموماً انگریزی ہی میں بات کرنی پڑتی ہے کہ ان کی انگریزی [illegible] قابلیت کا [illegible]

سب کرنا میرے دل پر اور چھریاں چلاتا ہے، اگر وہ مجھ سے تقاضہ کرتے مجھے خالی ہاتھ جانے پر بُرا بھلا کہتے تو مجھے اس سے بہت کم تکلیف ہوتی جتنی اب ہوتی ہے۔"

میں خاموش سنتا جارہا تھا، ادھر مواد تھا کہ اُبلا چلا آتا تھا، کھانسی برابر آرہی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جھٹکے مواد کو دل کی گہرائیوں سے نکالے لارہے ہیں۔ میں نے روکنا مناسب نہ سمجھا اور سنتا گیا، کہہ رہے تھے:۔

"میں کسی سے بھیک نہیں مانگ سکتا۔ ایسا کرتے مجھے شرم آتی ہے۔ میں شریف خاندان کا آدمی ہوں، ہم لوگ پہلے بہت خوشحال تھے۔ آج کل کے فلاں وزیر ہمارے گھر پر آکے گھنٹوں دل بہلایا کرتے تھے، فلاں صاحب میری ماں کو چچی اور میری بیوی کو بھابی پکارتے تھے، اب جب سے بُرے دن آئے ہیں کوئی جھانکتا نہیں، میں سچ کہتا ہوں اب کوئی نہیں آتا۔ اب میرے گھر پر کوئی نہیں آتا، کہیں ملاقات ہوجاتی ہے تو کترانا چاہتا ہے، فلاں وزیر صاحب نے اس دن مجھے ایک تعارفی خط دیا، لکھا تھا: میں انہیں پہلے سے جانتا ہوں۔ یہاں انہوں نے دانت پیس کر کہا: دیکھا آپ نے میں جانتا ہوں، ہوں، جانتا ہوں، میں نے مکان سے نکلتے ہی خط پھاڑ کے نالی میں پھینکدیا۔

پہلے میری تندرستی بڑی اچھی تھی، لوگ پہلوان کہا کرتے تھے اور اب آپ بیمار کہتے ہیں، فاقے اور پریشانیوں نے کمزور کردیا ہے تو بیماری کیسے نہ آئے۔ بعض وقت مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ خالی بیماری ہی آ آکے کیوں رہ جاتی ہے موت کیوں نہیں آتی؟"

اپنا نہیں کھانسی بڑے زور سے آنے لگی، وہ رک کے کھانسنے لگے، کھانسنے کے بعد کہا: "آپ کو یہ میری بکواس بُری معلوم ہوتی ہوگی مگر کیا کروں کسی سے کہنا چاہتا تھا، آپ ہی سے کہدیا، آپ خود انصاف سے کہیے جوانوں کو یہ سب پریشانیاں کہاں ہوتی ہیں؟ اور اگر ہر چیز جوانوں ہی کے لئے ہے تو پھر بڈھوں کو زہر دلوا دیجئے۔ ہر وقت گھٹ گھٹ کے مرنے سے ایک دفعہ مرجانا اچھا ہے"۔

میں نے دل کڑا کرکے کہا: "بُرا نہ مانئے مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر جوانوں کے نقطۂ نظر سے بھی تو دیکھئے۔ اگر وہ چند ملازمتیں جو خالی ہوتی ہیں زیادہ عمر کے لوگوں کو مل جایا کریں تو جوان کہاں جائیں"۔ میں نے ابکی دفعہ بڈھے کی جگہ "زیادہ عمر" کا ٹکڑا استعمال کیا، کیونکہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ان کے دل کو بڈھے کے لفظ سے تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے

کہا: ان میں بہتوں کے ماں باپ بڈھے اپاہج ہونگے جن کا سارا سہارا بیٹے کی کمائی پر ہوگا؟

کہنے لگے "تو پھر گورنمنٹ سب کی ضرورتوں کے لحاظ سے انہیں نوکری دے"۔

میں نے کہا: "آپ کہتے تو ٹھیک ہیں مگر یہ میرے بس کی بات نہیں، اور آپ کچھ اُن کا بھی تو خیال کریں جو ملازم رکھنا چاہتے ہیں، وہ پہلے اپنی ضرورت کا خیال کرینگے یا دوسروں کی۔ وہ تو یہی چاہیں گے کہ انہیں اپنے روپے کا بہتر سے بہتر معاوضہ ملے یعنی ایسے شخص کو ملازم رکھیں جو سب سے زیادہ اچھا کام کرسکے، ظاہر ہے کہ زیادہ عمر کے لوگ جوانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ چند خاص خاص جگہوں کے لئے تو زیادہ عمر کا ہونا مناسب ہوسکتا ہے لیکن عام طور سے نہیں"۔

وہ سُن کے تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر کہنے لگے "لیکن اس خیال سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا، کہتے شرم آتی ہے، لیکن میں نے کل سے خالی تین چار دفعہ پانی پیا ہے، ایک دانا نہیں کھایا۔ اب تک کپڑا لتا، زیور اسباب بیچ کے کسی نہ کسی طرح اپنا اور گھر والوں کا پیٹ پالتا رہا۔ ایک نقلی سونے کی زنجیر رہ گئی تھی، کل اسے بھی ایک روپیہ چودہ آنے میں بیچ ڈالا، ایک روپیہ ڈاکٹر کو دیا"۔

میں نے کہا "ایک روپیہ"۔

کہنے لگے: "جی ہاں، وہ کمپونڈر ڈاکٹر، اب ہماری اوقات بڑے ڈاکٹر کو تو بلانے کی ہے نہیں، کمپونڈر بھی اب دو روپے لینے لگا ہے لیکن مجھ سے ایک ہی لیتا ہے، دس آنے دوا کے دام بھی لئے، چار آنے بچے تھے۔ تین آنے میں تینوں بچوں کیلئے دودھ اور روٹی لادی۔ ایک آنہ وقت بے وقت کے لئے رکھ چھوڑا ہے"۔ یہ کہہ کے انہوں نے جیب سے اکنّی نکال کے میز پر رکھدی، اس اکنّی میں اس وقت کچھ ایسی بات معلوم ہوتی تھی کہ ہم دونوں کی نگاہیں اس پر جم گئیں اور دیر تک جمی رہیں۔

میں اس کے بعد تھوڑی دیر سوچتا رہا کہ ان سے کیا کہوں اور کس طرح، بالآخر دل مضبوط کرکے میں نے کہا: "میں آپ کی ایک ایک بات کو سچ سمجھتا ہوں لیکن آپ یقین جانیئے میں بھی مجبور ہوں، کوئی ایسی ملازمت فی الحال نظر نہیں آتی جو میں آپ کو دلا سکوں"۔

کہنے لگے "تو پھر میرا نام رجسٹر ہی کرلیجئے"۔

میں نے کہا: "بڑی خوشی سے لیکن میں کہہ نہیں سکتا کہ کب تک آپ کو ملازمت مل سکے گی۔ رجسٹر میں کئی ہزار نام ...

ابھی تک ملازمت نہیں مل سکی"

میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ یہ سن کے خاموش ہوجائیں گے مگر مجھے حیرت سی ہوئی جب انہوں نے کہا "اچھا رجسٹر کر لیجئے"

ان کے جانے کے بعد دیر تک "اچھا رجسٹر کر لیجئے" میرے دماغ میں گونجتا رہا۔ اس ایک جملے میں جو امید موہوم کی دنیا جھلک رہی تھی اس کی دلدوزی کو میں بیان نہیں کر سکتا حالانکہ مجھے اپنی قدرتِ بیان پر کچھ کم ناز نہیں، خود بخود یہ شعر زبان پر آگیا ؎

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا ہے بہت
دوستو، آواز دیتے جاؤ ساحل سے مجھے

اس شعر کا جیسا اس وقت لطف آیا ویسا کبھی نہ آیا تھا۔ میں یہ شعر پڑھتا جاتا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے انسانوں کے سروں کا ایک سیاہ سمندر نظر آتا تھا جس میں کچھ سفید سروں کے بلبلے ڈوبتے نظر آتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اتنا اثر لینے کے بعد میں نے کیا کچھ کوشش نہ کی ہوگی کہ انہیں کہیں کوئی ملازمت مل سکے۔ کلکتہ کی تمام بڑی بڑی کمپنیوں کو لکھا مگر ہر جگہ سے یہی جواب آیا کہ ہم کو اتنی عمر کے آدمی کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم نہیں ان کا کیا حشر ہوا۔ پھر وہ نہ آئے، شاید انکا سفید سر بھی سیاہ سروں کے سمندر میں ڈوب گیا۔

فضل احمد کریم فضلی

نذرِ شاہد

اشاروں سے وعدے کئے جا رہے ہیں
فریبِ محبت دئے جا رہے ہیں

تری خیر ساقی ترے میکدے میں
نگاہوں سے ساغر پئے جا رہے ہیں

طبیعت تو جینے سے گھبرا چکی ہے
مگر وائے قسمت جئے جا رہے ہیں

ترے در کو کعبہ سمجھتی ہے دنیا
ترے در پہ سجدے کئے جا رہے ہیں

کہاں ہم اٹھے ہیں ترے در سے خالی
تجھے اپنے دل میں لئے جا رہے ہیں

نگاہِ تنفر۔ نگاہِ عنایت
دئے جا رہے ہیں۔ جئے جا رہے ہیں

یہ ہم ہیں کہ کرتے ہیں کفرانِ نعمت
یہ وہ ہیں کہ سب کچھ دئے جا رہے ہیں

مری منزلِ شوق تو دو قدم ہے
کہاں مجھکو رہبر لئے جا رہے ہیں

کبھی چاک کرتے ہیں بخیہ نادامن
کبھی اپنا دامن سئے جا رہے ہیں

بہزاد لکھنوی

چرائی ہوئی ڈائری

آج کی صحبت میں میں آپ کو ایک مشہور اور ترقی پسند افسانہ نگار کی ڈائری کے چند مختلف اوراق سناتا ہوں جس کے افسانے عوام اور خواص دونوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ لیکن میں آپکو اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ اس روزنامچہ میں بھی اس کے تخیلات اور اس کے اسلوب بیان کی جھلک دیکھ لیں۔

وہ میرا عزیز ترین دوست ہے۔ میں نے اس کو ہر ہر پہلو سے دیکھا ہے اور میں جانتا ہوں کہ صداقت اس کا اصولِ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں تصنع اور ریاکاری نہیں ہوتی۔ جو کچھ اسکے دل میں ہوتا ہے وہ اسے ظاہر کر دینے میں بالکل نہیں جھجکتا بچا ہے اس کا یہ بیان دوسروں کے لئے ہو چاہے خود اپنے لئے! ایک دفعہ اتفاقاً مجھے اس کی ڈائری نظر پڑی اور میں نے اُسے پڑھنا شروع کر دیا لیکن میں ابھی تھوڑا ہی سا پڑھنے پایا تھا کہ اس نے یہ کہکر "ڈائری میرے ہاتھ سے چھین لی کہ یہ بہت پرائیویٹ ہے"۔ مگر جتنا حصہ میں پڑھ چکا تھا اس سے مجھے بڑی حیرت اور لذت محسوس ہوئی اور میں نے ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہوگا میں یہ ڈائری ضرور پڑھونگا۔ چنانچہ میں نے اسے چرا لیا۔ اور اب اسے کہیں کہیں سے آپ کو بھی سناتا ہوں۔

ان صفحات میں گوناگوں کیفیات درج ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ تمام ڈائری میں ایک طرح کا ربط اور تسلسل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیچ بیچ بیتی ہوئی زندگی کا ایک سادہ و دلکش فلم ہے جس کے مختلف مناظر میں تنوع ہونے کے باوجود لچک اور ایک دوسرے میں ضم ہو جانے کی صلاحیت ہے۔ مزید برآں اس روزنامچے کو پڑھکر ذہن میں اس کے افسانوں کا پس منظر مرتب ہو جاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جو واردات اُس کے افسانوی کرداروں کو پیش آتی ہیں بسا اوقات وہ خود بھی اُن میں مُبتلا ہے۔

—— ۱ ——

۴ر اکتوبر

آج کافی رات گئے روزنامچہ لکھنے بیٹھا ہوں، اور یہ اس لئے کہ میں بہت دیر تک اپنی بالکنی میں کھڑا ایک رُوح پرور تماشہ دیکھتا رہا۔ اس نشیمن کا رُخ میرے مکان کی پچھلی جانب ہے جہاں قطار کے لمبے لانبے دیو آسا درخت آسمان کی آوارہ ہواؤں سے سرگوشیاں کیا کرتے ہیں۔ ان کے قدموں میں سبزۂ خوابیدہ بچھا ہوا ہے، اور اس مختصر سے پُر سحر مرغزار کو دیکھ کر مجھ پر ہمیشہ ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہو جاتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب اس کے شمالی گوشے سے سمندر کی سرکش لہریں اپنے جذبات کے جوش میں اس ننھے سے چمن زار کو آغوش میں لے لینے کے لئے قریب سے قریب تر آ جانا چاہتی ہیں۔ اور قریب اور قریب، لیکن نہیں آسکتیں۔ بلکہ صرف ایک جھاگ کی شکل بنا کر چند گز کے فاصلے پر مچلتی رہ جاتی ہیں۔ میں حسب معمول اس نظارے سے جو اب میری تنہائیوں کا رفیق اور میری دلبستگی کا اکیلا سامان رہ گیا ہے، سرور حاصل کر رہا تھا کہ میں نے اسٹیج کے (Change of scene) کی طرح اس چمن میں ایک اور روپ دیکھا۔ میرے ہمسائے یہودی بڑھوسی عواکیل کی لڑکی نامِ غدا، پندرہ سولہ کا سن، اپنے ہم جلیسوں کے ساتھ چاندنی رات کا لطف اُٹھانے آئی، اور وہ سب مل کر کوئی ایسا کھیل کھیلنے لگے جو کسی طویل اور قدیم داستان کا ایک محیر کن ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے وہ کھیل یاد نہیں اور نہ اُن لڑکوں کے چہرے یاد ہیں جن کے ساتھ وہ اپنے حسن و شباب سے بے خبر، معصوم اور الھڑ، قدم قدم پر فتنے جگاتی بڑی آزادی اور بیباکی سے گھُل مل رہی تھی، میں صرف اسے دیکھتا رہا اور دیکھتا گیا، گویا تمام کائنات اس ایک نقطے میں سمٹ آئی تھی ـــ'

کسی نے اُسے پکارا "لیلی!" اور میں نے آپ ہی آپ کہا واقعی یہ پھول ہے۔ اس میں سوسن کی مانند نزاکت اور رعنائی ہے۔ لیکن یہ ابھی کھلا ہوا پھول نہیں، بلکہ غنچۂ نوشگفتہ ہے، گلِ نوبہار! اور جوں جوں میری نظریں اس پر جمتی گئیں، طائر خیال ماضی کے کسی بھولے بسرے آشیانے کی طرف پرواز کر تا گیا اور مجھے اس دوشیزۂ سرمست کے خدوخال میں ایک اور چہرہ نظر آنے لگا جس نے میری حیاتِ گذشتہ کو رنگین بنا دیا تھا۔ اور آہستہ آہستہ وہ بھولی ہوئی صورت میرے دل و دماغ پر اسقدر مسلط ہوئی کہ میں مجسم تمنا بن گیا۔ کاش اس تمام عمر، تمام علم اور تمام اثاثے کے بدلے مجھے پھر کوئی [illegible] کے دن دیدے [illegible] مگر نہیں۔ [illegible]

حدود سے نکل کر تو ہم سوسائٹی کے وضع کئے ہوئے قوانین میں جکڑ جاتے ہیں اور ہم کو الگ الگ مضبوط قلعوں میں مقید کر دیا جاتا ہے۔ اس لڑکی نے ناحق دس بارہ سال پہلے کی بات یاد دلادی۔ اب میں کہاں اور وہ بچپن کی شہزادی کہاں؟ وہ تو گویا زندگی کی ندی پر ایک شاداب درخت کا سایہ تھی۔ زندگی بہا کی۔ سایہ جھکولے لیتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ درخت وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ ندی اب بھی بہتی ہے۔ اس کی سطح خالی ہو گئی مگر اس کے سینے میں ایک عکس، ہلکا سا نقش سہی، اب بھی باقی ہے، اسے کون مٹا سکتا ہے؟ میرے دل میں بے اختیار آیا کہ میں اسے جا کر بتا دوں کہ میں وہی ہوں! تم کو تو یاد ہوگا؟ وہ گذری ہوئی دلچسپیاں؟ وہ بیتی ہوئی باتیں؟ لیکن میں اب یہ سب کچھ کیسے کہہ سکتا ہوں؟ اس کی تو شادی ہو گئی ہے۔ انجان اور اجنبی۔ وہ کیوں سنے گی۔ اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ محبوب کو اپنی محبت ضرور ہی جتائی جائے؟ دل کے صنم کدے میں اسکی یاد ہی کیوں نہ محبت کی شمع روشن رکھے!

اور یہ سطور لکھتے لکھتے میرے ذہن میں ایک افسانے کا پلاٹ تیار ہو گیا ہے جس میں میں ایک ایسا کردار پیش کرونگا جو اپنی شدید اور انتہائی محبت کا علم اپنی محبوبہ کو نہیں ہونے دیتا مبادا کہ اس سے اس کو کسی قسم کا نقصان پہونچ جائے۔ وہ اپنے درد کو اپنے ہی دل میں محفوظ رکھتا ہے۔ گویا وہ اپنی محبوبہ کو ایک بیش بہا شے دیدیتا ہے مگر اس کا معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ یہ محبت کا ایک مثالی کردار ہوگا ——۔

——— (۲) ———

یکم جنوری ———

آج کتاب زندگی کا ایک اور ورق الٹ گیا۔ زمانے کی اس کروٹ نے سال گذشتہ کو ہمیشہ کے لئے ماضی کی آغوش میں سلا دیا اور اب وہ صرف اس لائق رہ گیا ہے کہ ہم اس کا جائزہ لے لیں۔ جو جو کچھ اس دوران میں بیتا ہے اس پر تبصرہ کر لیں۔ اس کے روشن اور اجلے پہلو پر ذرا خوش ہوں اور تاریک و مغموم رخ پر اداس۔ لیکن میرے نزدیک پچھلا سال بہت اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی سال میں نے اپنی افسانہ نگاری کا عروج پایا۔ میں نے اس سال دو درجن سے زائد افسانے لکھے اور یہ سمجھنے میں مجھے مطلق غلط فہمی نہیں ہے کہ ان میں سے بعض اس سال کے بہترین افسانے ہیں۔ مجھے ان کے پلاٹ یاد ہیں اور میں ایک نقاد کی طرح جب ان پر تبصرہ کرتا ہوں تو ان میں جدت، تازگی اور زندگی کی لہر پاتا ہوں۔ میں نے ان افسانوں سے اپنے لئے ایک دنیا بنائی ہے اور میری تمنا ہے کہ میں اسی میں گم رہوں۔ میرا ذہن کردار تخلیق کئے جائے اور میں انکو کردار میں نکھارا ہوں۔

مجھے اپنی افسانوی کامیابیوں اور مبصروں کی داد و تحسین سے جہاں خوشی ہوتی ہے، وہاں لوگوں کے اعتراضات بھی مجھے ایک لمحہ فکر یہ دیتے ہیں۔ میری تحریروں میں جو جو نقائص نکالے جاتے ہیں میں اُن پر سرسری نگاہ ڈالتا ہوا نہیں گذر جاتا بلکہ ان پر غور کرتا ہوں اور اُن لوگوں کو اپنا کرمفرما سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

ان دنوں سب سے زیادہ اعتراض یہ ہے کہ میں شوخ نگار ہوں۔ میرے افسانوں میں عریانی بہت ہے اور میں نازک سے نازک موضوعات پر اس قدر آزادی اور بے باکی سے اظہار خیال کرتا ہوں کہ بعض اوقات اخلاقیات کو مجروح ہونے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے۔ میں نے اس اعتراض پر بہت کافی سوچا، اس لئے نہیں کہ میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں، بلکہ محض اس لئے کہ اگر ادبیات میں سوائے اخلاقیات کے کسی اور چیز کی گنجائش نہیں ہے تو میں لکھنا لکھانا بالکل چھوڑ دوں یا کم از کم لکھنے سے پہلے اپنے خیالات و الفاظ پر اخلاقیات کا سنسر بٹھا دوں، جس کے معنی یہ ہونگے کہ میری تحریروں میں سے بے ساختگی اور صداقت بالکل مٹ جائے۔ لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ میرے ذہن میں اس اعتراض یا عیب کا (اسے آپ جو جی چاہے کہیں) ایک ہی جواب پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی بصورت استفسار، یعنی "کیا آرٹ کے لئے معلم اخلاق ہونا ضروری ہے؟ کیا آرٹ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اخلاقیات کی قیود سے بالکل آزاد ہو جائے اور پھر بھی آرٹ رہے؟"

——— (۳) ———

۱۸ مارچ ———

کل میں نے اس سلسلے میں کہ "میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں" ایک افسانہ نگار کا مضمون پڑھا، جس میں انہوں نے اس بات پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے کہ ان کے افسانے طبع زاد ہوتے ہیں میری طبیعت میں فوراً شرارت ناچنے لگی اور میں نے سوچا، یہ عنوان تو پرانا ہو چکا اس کی بجائے یہ کیسا رہے گا۔

"میں افسانہ کیونکر چراتا ہوں"

اس عنوان پر کتنے ادیب لکھنے کی جرأت کر سکیں گے؟ کتنے لوگ ہیں جو سچ سچ بتا دیں کہ انہوں نے اپنے فلاں افسانے کا پلاٹ

فلاں افسانہ یا فلاں مصنف سے چرایا ہے۔ چرانے کو جانے دیجئے ذرا زبان سخت ہو جائے گا۔ وہ یہی اقبال کر لیں کہ ان کے زیادہ تر افسانے دوسروں کے رہین منت ہیں۔ اور دوسروں کے متعلق سوچتے سوچتے بالآخر میں اپنے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے اپنے تئیں سے کہا: پہلے تم یہی بتا دو تمہارے کتنے افسانے خود تمہاری اپنی پیداوار ہیں؟ کیا تم کو اقرار نہیں کہ تمہارے افسانے "بہار و خزاں" کا پلاٹ، جس نے تمہاری شہرت کو چار چاند لگائے، ایک ایسی کہانی سے ماخوذ ہے جو ایک معمولی رسالے میں ایک معمولی ادیب کے قلم سے شائع ہوئی؟ اور پھر "قفس کی تیلیاں" کے متعلق کیا رائے ہے؟ کیا اس کا بنیادی خیال تم نے ٹیگور کے افسانے سے نہیں لیا؟ ... غرض اس قسم کے بہت سے خیالات میرے دماغ میں گردش کرنے لگے اور میں اپنے بعض اُن افسانوں کے متعلق جن پر مجھے ناز ہے تذبذب کے عالم میں رہ گیا کہ کہیں یہ سچ تو نہیں؟

میں نے یکایک محسوس کیا کہ یہ سوال محض مذاق اور شرارت کی حد سے نکل کر خاصی سنجیدگی اختیار کر گیا ہے۔ اور اسی روشنی میں جب میں نے اپنے چند افسانوں کا تجزیہ کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے اپنے تازہ ترین افسانے "وہ فسردہ نگاہیں" کو لیا اور اس کے متعلق سوچتا رہا کہ اس نے میرے ذہن میں جنم کیونکر لیا؟ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کے پلاٹ نے کس طرح نشو و نما پائی؟ اور میں بہت کچھ سوچ بچار اور بہت دیر تک غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہونچا کہ انسانی ذہن یقینی ایک خالی تختی ([illegible]) کی مانند ہے جس پر مختلف النوع نقوش، ذاتی تجربے اور مشاہدات کے ساتھ ساتھ اجاگر ہوتے رہتے ہیں اور ان اثرات کو پروان چڑھانے کے لئے خود انسانی ذہن کو ایک مستور قوت ودیعت کی گئی ہے۔ اسی کے بل پر ہمارے تاثرات ڈھلتے ہیں اور ہم ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔ مستقبل حال میں اور حال ماضی کی گود میں پرورش پاتا ہے! بس اسی طرح افسانہ نگار کسی خاص چیز سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ پچھلے اثرات کی روشنی میں ایک نامکمل سی تصویر کا دھندلا سا خاکہ دیکھنے لگتی ہے۔ اس کا حساس ذہن اس خاکے میں رنگ بھرنے لگتا ہے اور جب افسانہ نگار الفاظ کے ذریعے اپنا مافی الضمیر پوری قدرت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے تو وہ ایک مکمل سراپا، ایک مجسمہ، ایک نکھری سی تصویر بن جاتی ہے۔ میرا افسانہ "وہ فسردہ نگاہیں" اسی خیال آفرینی اور اثر خیزی کی ایک مثال ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے ایک انگریزی فلم (Queen Christina) دیکھا تھا، جو ملکہ کی آنکھوں پر کیا گیا تھا۔ اور کیمرے نے انہیں اس قدر نمایاں کر دیا تھا کہ وہ میرے نفس تحت الشعور میں محفوظ ہو گئیں۔ اور اب جو سالہا سال گذرنے کے بعد میں نے یہ کہانی لکھی تو اُن ہی آنکھوں کو غیر ارادی طور پر اس قدر نمایاں جگہ دی کہ اس کا ([illegible]) ہی ان سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر میرے افسانے کا اس فلم سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا پلاٹ اس سے کہیں اثر پذیر نہیں ہوا۔ اس لئے کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے یہ افسانہ اس فلم سے چرایا ہے۔ ہاں، جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں ایک دیئے سے دوسرا دیا جلتا ہے۔ ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا ہے۔

---

۱۲ مئی

دن بھر رحمان علوی کے افسانوں کا نیا مجموعہ پڑھتا رہا۔ ان افسانوں کی خصوصیت جنسی تعلقات کا پُرجوش و رنگین بیان ہے۔ کہیں کہیں مزاح اور طنز بھی نظر آتی ہے۔ مگر یہ کوئی ایسی زبردست خوبیاں نہیں ہیں جن کی وجہ سے ان افسانوں کو اس قدر اچھالا جائے۔ پھر بھی ان اخبارات و رسائل میں ان افسانوں کا چرچا ہے اور علوی کی افسانہ نگاری پر مقالے شائع کئے جا رہے ہیں، لیکن ایسا کیوں ہے؟ کیا ہمارے نقاد ہمیشہ پروپیگنڈے کے زیر اثر رہیں گے؟

مجھے علوی پر رشک آتا ہے کہ اُسے افسانہ نگاری میں وہ جگہ بہت جلد مل گئی جو میں نے اب جا کر حاصل کی ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض افسانہ نگاروں کو عظمت نصیب ہوتی ہے، بعض کو شہرت۔ بعض کو دونوں، اور بعض کو کچھ بھی نہیں۔ گویا یہ بھی اُس کی دین ہے جسے چاہے نوازے۔ یا اس کی دین نہیں تو رسائل کے ایڈیٹروں کا کرم ہے جسے چاہیں بڑھائیں۔ علوی کی شہرت اسی لئے روز بروز ترقی پا رہی ہے کہ ایڈیٹروں سے اس کے تعلقات ہیں۔ جب ہی تو اس کے ہر افسانے کو خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو بڑی شان سے چھاپا جاتا ہے، اور میں حیران ہوں کہ ہمارے دیس میں عظمت اور شہرت بھی دوستی کے سہارے پلتی ہیں۔ لیکن صرف ہندوستان پر یہ الزام شاید زیادتی ہوگی۔ دنیا کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ ملکوں میں بھی یہ پروپیگنڈا، یہ دوست نوازی، یہ وطن پروری بڑی زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ علوی خوش قسمت ہے کہ وہ اس خطے کا رہنے والا ہے جہاں کے ذرے کو بھی آفتاب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مجھے علوی سے کوئی پرخاش نہیں، بلکہ میں نے اس کے بعض افسانوں کی فراخدلی سے داد دی ہے۔ مگر میں یا تو اس [illegible] کی

افسانہ نگاری کا اشتہار دیا جاتا ہے اس سے خواہ مخواہ جز پیدا ہوتی ہے اور سمجھدار قارئین کی نظروں میں ایسے ادیبوں کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ پھر بھی پروپگنڈا کام کرتا ہے۔ زیادہ تر لوگ تو دوسروں کی آرا اور اشتہارات کے مبالغوں ہی سے مرعوب ہوتے ہیں۔ اسی لئے علوی کے افسانوں کو مقبولیت حاصل ہے۔ یا پھر ان افسانوں کی پسندیدگی کی وجہ ان کا موضوع اور طرز بیان ہے یعنی جسمانی بھوک اور اس کا ہیجان بپا کرنے والا بیان۔ جب ہی تو ایک سال میں اُسکے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہوگئے۔ اس کے برخلاف اچھے افسانہ نگاروں کے مجموعے بہت کم کتابی صورت میں چھپتے ہیں۔ لیکن ایک زمانہ آئے گا جب پروپگنڈا کا اثر زائل اور تعمیری ادب کی تحقیق اور چھان بین ہوگی۔ کس افسانہ نگار کا نام زندہ رہیگا اور کون کونسے افسانے ہمیشہ تابندہ رہیں گے، یہ فیصلہ مستقبل کے بطن میں محفوظ ہے۔ جب صحیح تنقید نگاری کا رواج ہوگا، جب درحقیقت عمدہ افسانے کی قدر ہوگی تو تاریخ اُن ناموں کا ذکر کرنے سے ہرگز نہیں جھجکے گی جنہیں واقعی آسمانِ ادب پر روشن ستاروں کی طرح جگمگانے کا حق ہے۔

(۵)

۷ر جولائی

میں نے افسانہ نگاری میں جو نئی راہ اختیار کی ہے، لوگ اس پر متعجب ہیں۔ فانوس کے افسانہ نمبر میں میرا تازہ افسانہ شائع ہوا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب نے چند باتیں بڑی دلچسپ لکھی ہیں:- ".... ادھر کچھ عرصے سے ہم ان کے افسانوں میں تبدیلی دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاں اب وہ پہلی سی حسن و عشق کی حکایتیں نہیں ہوتیں، بلکہ اب زندگی کی دوسری کیفیات ان کا مرکزِ نگاہ بن گئی ہیں۔ رومان نگاری اب یہ قریب قریب ترک کر چکے ہیں، اسکی بجائے حیات اور اسکی تلخیاں ان کا موضوع بنتی جا رہی ہیں۔"

اسے پڑھکر میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی، کیونکہ جس تبدیلی کی طرف ان سطور میں اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف افسانہ نویسی ہی میں نہیں بلکہ میری زندگی میں بھی واقع ہو گئی ہے۔ مجھے بھی احساس ہے کہ میرے تخیلات میں وہ شاعرانہ رنگینیاں نہیں رہیں۔ میرے تصورات میں وہ عزلیاتی ولولے نہیں رہے۔ میری جولانگاہ اب یہی دُنیا ہی ہے جو کی زندگی اور یہی اس کا غیر متناسب نظام ہے۔ لیکن کیوں؟ ایسا کیوں؟

یہ اس لئے کہ وہ میری طالب علمی کے دن تھے کالج کا زمانہ ہوتا بھی خوش باش اور ہر قسم کی فکروں سے آزاد ہوتا ہے۔ زندگی اور اس کی تلخیوں کو اُن کے اصلی رنگ روپ میں دیکھنے کا مجھے کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ پھر میرے افسانے ادب برائے ادب کا نمونہ کیوں نہ ہوتے؟ ان میں ادب برائے زندگی کی صلاحیت کیسے پیدا ہوتی؟ اور اب جو میں آسمان سے زمین پر اتر آیا، خیالی بستی کی بجائے اسی چلتی جاگتی دُنیا سے واسطہ پڑا، جہاں خوشیاں کم اور دُکھ زیادہ ہیں، جہاں آرام قلیل اور آزار بہت ہیں تو میرے احساسات بھی بدل گئے۔ میرا ذہن نئی نئی تصویریں بنانے لگا اور گذشتہ خاکے، حسن و رومان کے شگفتہ نقوش، خود بخود دھندلے ہوتے گئے۔ ممکن ہے ان لوگوں کے لئے جو میرے جذباتی افسانوں کو پڑھکر میرے متعلق کوئی خاص رائے قائم کر چکے ہیں، جو مجھے صرف حسن و محبت کا داستان گو سمجھتے ہیں، میرے افسانوں کے موضوع کی تبدیلی باعثِ تعجب ہو، لیکن میں مجبور ہوں، میرے تخیل کو اب اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ پھر ایک دفعہ ماضی کی طرف لوٹ جائے۔ ایک دفعہ پھر انہی رومانی داستانوں کو دُہرانے لگے۔ اب رُوح سے زیادہ جسم کشمکش میں ہے۔ اسی کے آرام سے رُوح کو بھی سکون ملتا ہے۔ جب تک جسم ابتلا میں رہے رُوح کی خلش برقرار رہے گی۔ رُوح سے میرا مطلب ذہنی احساسات ہیں جو جسم اور جان کے ساتھ ساتھ ہیں، وہ نہیں جو جسم سے غیر متعلق ہے۔

(۶)

۱۳ر نومبر

آج مجھے ملازم ہوئے پورا ایک سال ہو گیا۔ اس عرصے میں میں گنتی کے چند افسانے لکھ سکا۔ مجھے لکھنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی، لیکن اس دوران میں میں نے وہ وہ تجربے حاصل کئے ہیں جو تمام عمر یاد رہیں گے کہ ان میں مٹھاس کم اور کڑواہٹ زیادہ ہے۔ ملازمت بھی کیسی بیہودہ چیز ہے؟ انسان تھوڑی سی دولت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے! اس کی آزادی، اس کی بے فکری، اس کی حمیت، غرض اس کی ہر وہ شریفانہ خصوصیت جو انسانیت کا تقاضہ ہے۔ اس سے چھین لی جاتی ہے۔ افسر اور ماتحت کے تعلقات خود اپنی جگہ ایک مستقل باب ہے۔ افسر ہنسے تو ماتحت کو ہنسنا ضروری۔ افسر کسی پر ناراض ہو تو ماتحت کو اس کی ہاں میں ہاں ملانا لازمی، چاہے وہ جانتا ہو کہ افسر غلطی پر ہے۔ لیکن اس کو ٹوک دینے کی اس میں ہمت نہیں

ہوتی۔ اس کی کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ جس قیمت پر بھی ممکن ہو افسروں کی خوشنودی حاصل کرے اور موقع پڑنے پر وہ اپنی حدود سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ اسکی غیرت اور عزت دھری رہ جاتی ہے۔

چند سال ہوئے میں نے ایک افسانہ لکھا تھا "کلرک" یہ میری طالب علمی کی یادگار ہے۔ اس افسانے کو آج میں نے خاص طور پر پڑھا، لیکن اس حصے میں جہاں میں نے اس کلرک کی دفتری زندگی بیان کی ہے، مجھے رنگ کچھ پھیکا نظر آیا۔ اسے اور زیادہ گہرا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اس پھیکے پن کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت میں روزگار اور نوکری کی پابندیوں سے ناآشنا تھا۔ وہ تمام تاثرات جن پر اس افسانے کا دارومدار ہے میرے ذاتی نہیں تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ملازمت اختیار کرنے کے بعد انسان کس قدر مجبور اور غیر انسان ہو جاتا ہے۔ اور اب سوچتا ہوں کہ یہ افسانے میں پھر سے لکھوں۔ کسی پابند ملازمت کی زندگی نئے سرے سے بیان کروں اور اسکے پلاٹ کیلئے مجھے دور نہیں جانا پڑیگا۔

---

۲۴ دسمبر

آجکل جدید رجحانات اور نئے نئے قسم کے افسانے ہماری دنیا میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ زبان اور لٹریچر کے حق میں نیک فال ہے۔ لیکن "ترقی پسند" افسانوں کے نام سے جس نوع کا ادب پیش کیا جا رہا ہے اسے مدِنظر رکھتے ہوئے کم از کم میں تو "ترقی پسند افسانہ نگار" کہلانا ہرگز گوارا نہیں کروں گا۔ ان افسانوں کا بنیادی خیال محض جنسی تعلقات اور نفسانیت ہے، اور یہ ترقی پسند افسانہ نگار اسی ایک خیال کو ہیر پھیر کر اور اسی طرح طرح کے پلاٹ بنا کر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے ہاں محض تو ہینی کی حد تک بڑھی ہوئی عریانی کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ عریاں افسانے ہمارے عوام میں قدرتی طور پر مقبول ہوتے ہیں اس لئے یہ سیلاب بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ مگر اس قسم کی چیزوں کو "ترقی پسند ادب" کہہ کر ادب کو کیوں بدنام اور مجروح کیا جاتے؟ آخر لٹریچر اور کوک شاستر میں کوئی تو امتیاز ہونا چاہیئے۔ ادب ایک نازک فن ہے اس کی حدود سے ذرا تجاوز کیا اور واضح پاکیزگی جاتی رہی! لیکن ہمارے نوجوان افسانہ نگار ان نزاکتوں اور فنی لوازمات کو نہیں سمجھتے یا سمجھنا نہیں چاہتے۔

مجھے اپنے گذشتہ خیالات یاد آتے تو ہنسی آگئی۔ ایک زمانہ میں میں بھی آرٹ برائے آرٹ اور ادب برائے ادب کا حامی تھا، مگر اب یہ رائے بدل چکی ہے۔ بیشک، آرٹ اگر معلم اخلاق نہ ہو تو بھی آرٹ رہتا ہے لیکن اگر مخرب اخلاق ہو تو اس کی قدر یقیناً کم ہو جاتی ہے۔ کم از کم وہ پاکیزہ آرٹ نہیں رہتا جو اس آرٹ سے یقینی بہتر ہوتا ہے جو خیال کو بلندی کے بجائے پستی کی طرف لے جائے۔ ادب کا بھی یہی حال ہے۔ اگر ہم اس میں عریانی اور جنسی تعلقات کو نازیبا طور پر نمایاں جگہ دیدیں تو یہ ادب کہاں رہے گا؟ اور پھر، اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جنسی لٹریچر کی ہمارے ہاں کمی تو نہیں!

"ادب جمیل" کے سالنامہ میں ایک افسانہ "رضائی" پڑھا۔ یہ ایک مشہور افسانہ نگار خاتون کے ذہن کی پیداوار ہے اور اس میں جنسیت ایک نئے زاویے سے جلوہ گر ہوئی ہے۔ افسانے کے کیا کہنے! تحریر کا زور لائقِ تحسین، مگر موضوع وہ کہ جسے ادب کے لطیف تصورات برداشت نہیں کر سکتے۔ اور میں حیران ہوں کہ یہ افسانہ ایک عورت کے قلم سے ہے جو ہندوستانی بلکہ خالص مشرقی ہے لیکن محض آرٹ کے دھارے پر وہ کس قدر تیزی سے بہا جا رہی ہے؟ مگر یہ سب کچھ شاید ردِّ عمل ہے۔ ہندوستان میں عورت اور اسکے جذبات و احساسات کو ہمیشہ دبا کر رکھا گیا۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا اس کو ذرا بھی موقع نہیں ملا۔ عورت اسی کا بدلہ لے رہی ہے اور لیتی رہے گی۔ یہاں تک کہ مرد چیخ اٹھیں گے اور وہ ہنستی رہے گی۔ آخر ایک وقت آئے گا جب عورت کی ہنسی قہقہے میں اور مرد کی چیخ سسکی میں تبدیل ہو جائیگی ——— اور پھر کچھ نہ ہوگا، بس شاید سناٹا۔

(اس مضمون کا کچھ حصہ بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہو چکا ہے)

صادق الخیری

دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ کی جاتی۔ اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی، بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اسقدر گڑبڑایا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں۔ اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں جو نظر آئیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں۔ گھر کی مرغی دال برابر والا مضمون، گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رُلتی پھرتیں۔ مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہوگا ہی کیا۔ یہ ادب نہیں پھکڑ مذاق، پرانے عشق کے سڑیل قصے اور جی جلانے والی باتیں ہونگی۔ یعنی بے پڑھے رائے قائم۔ مجھے خود یقین نہیں آتا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں۔ شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا اور خودستائی بھی، یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں اور ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے اُن کا ایک مضمون "یکہ" نظر آیا۔ میں اور عظیم پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دُھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آگئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منہ بنانے لگے۔ وہ ایک ہوشیار تھے۔ بولے "لاؤ میں تمہیں سناؤں"

اور یہ کہکر وہ ایک مضمون جو ہمیں سنانے تو صحیح معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہوگئی۔ ایک تو اُن کے مضمون اور پھر اُن کی اپنی ہی زبانی معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اُڑ رہی ہیں۔

جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے "تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں" اور انہوں نے چھیڑنا بھانے رُخ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔ جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہوگئی۔

[illegible] اُن کے مضمون [illegible] کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی۔ حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے۔ مگر یہاں تو اُن کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور بھلا جب وہ شخص کسی کا مذاق اڑاتا تھا تو جی چاہتا تھا کہ بچوں کی طرح زمین پر مچل جائیں اور رو دیں۔ کس قدر طنز بھری مسکراہٹ اور کٹتے ہوئے جملے۔ میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اُڑایا اور میں نے بدزبانی کی ——!

کبھی کہتے: "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو" اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے اس لئے جی جلتا تھا کہ یہ مذاق اُڑا رہے ہیں۔

اُن کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہوگئیں۔ اُن کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ اُن کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب کہی گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ افوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے اِن رُلنے والی کتابوں میں ایک ایک لفظ پر اُنکی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں، وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال، وہ پیلی نیلاہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی، پژمردہ اودے ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت توڑے ہوئے ناہموار دانت اور وہ لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک، دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ۔ اور پھر اُن ہاتھوں پر ورم آگیا تھا۔ پتلی پتلی پچھی جیسی ٹانگیں، جن کے سرے پر ورم سے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے کی طرف ہی جایا کرتے تھے۔ اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کپڑوں بنیانوں کی تہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر چند اُلٹی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے۔ نہیں مانتا مسکرائے جاتا ہے۔ [illegible] [illegible] ہو کر وہ لعد کھانسی کے عذاب نازل کر رہا ہے اور [illegible]

قہقہہ نہیں چھوڑتا۔ کونسا دُنیا اور دین کا دُکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا مگر پھر بھی رُلا نہ سکا۔ اسی دُکھ میں، جلن میں ہنستے کیا نہیں ہنساتے رہنا کسی انسان کا کام نہیں۔ ماموں کہتے تھے "زندہ لاش"! خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر بیانمار، بےچین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دُنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن کی حیثیت سے نہیں ایک عورت بن کر جب اُن کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اُٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا اُن کا دل! اس میں کتنی جان تھی! منہ پر گوشت نام کو نہ تھا مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آ جانے سے چہرہ خوبصورت ہو گیا تھا کنپٹیاں بھر گئی تھیں، پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے۔ موت کی سی جلا چہرے پر آ گئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آ گئی تھی جیسے حنوط کی ہوئی لاش! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں، جو ذرا سی بات پر ناچ اُٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اُٹھتی اور یہی آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اُٹھتیں۔ ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بیکس ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آ جاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی، پھر وہی رقص پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ خانم پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں، ان میں اتنی جان ہی کب تھی مگر وہ ہیرو اُن کے تخیل کا ہیرو ہے۔ وہ اُن کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے۔ جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا کودتا دوڑتا دیکھتا ہے ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی خانم اس ہیرو کو دیکھ لیتی!

شاید اوروں کے لئے خانم کچھ بھی نہیں لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیرکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھابی جان، نانی اماں، شیخانی، والد صاحب، بھتیجے، بھتیجی، بہشتی، یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا بالکل یہی، اور اب بھی گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا۔ اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لئے ایکٹنگ کیا کرتے تھے ہم ہنستے چلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ خانم کو پڑھتی ہوں یہی معلوم ہوتا ہے خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھائی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں۔ وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔

یہ کھرپا بہادر، جس کا پہلا ٹکڑا "روح لطافت" میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دُنیا جہان کی شرارتیں کروا لیتا ہے۔ وہ خود تو دو قدم نہیں چل سکتا لیکن ہمزاد چوریاں کر، شرارتیں کرتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں ایک بیمار کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دُنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا۔ وہ جو کچھ نہ تھے افسانہ میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے۔ کچھ تو چاہیے ناچنے کے لئے ۔۔۔!

شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے، روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا۔ قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں والد صاحب کمزور کہہ کر معاف کر دیتے ہر ایک دلجوئی میں لگا رہتا مگر بیمار کو بیمار کہو تو اُسے خوشی کب ہو گی۔ ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا۔ بغاوت اور بڑھتی غصہ بڑھتا۔ مگر بے بس سب نے ان کے ساتھ گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی تو انہیں بھی انسان سمجھے انہیں بھی کوئی ڈانٹے انہیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہٰذا ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ فسادی بن گئے۔ جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان۔ لیٹے لیٹے کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہو گئی۔ اچھا خاصہ گھر میدان جنگ بن گیا۔ اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود۔ بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے۔ اور کمزور لاچار ہر دم کا روگی تھیٹر کا ولین ہیرو بن گیا۔ اور کیا چاہیئے تھا۔ ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں۔ زبان بد سے بدتر ہو گئی۔ دُنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دُنیا انہیں چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا اُن سے کھنچنا شروع کیا اتنا ہی وہ لپٹے۔ آخر میں تو خدا معاف کرے اُن کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کبھی بھائی نہ

میرے بھائی نہیں اور بھائی آواز سُنکر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی "یہ سانپ جنا تھا میں نے!"

مرنے سے پہلے قابلِ رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں انسان بنکر کہتی ہوں، جی چاہتا تھا جلدی سے مرجائیں۔ آنکھوں میں دم ہے مگر دل دُکھانے سے نہیں چوکتے۔ عذاب دوزخ بن گئے ہیں۔ ہزاروں کہانیوں اور افسانوں کا ہیرو ایک ولین بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا اب بھی کوئی اُسے پیار کرے، بیوی پوجا کرے، بچے محبت دیکھیں بہن واری جائیں اور ماں کلیجہ سے لگائے۔

ماں نے تو واقعی پھر کلیجہ سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستہ پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی۔ مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی۔ یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہو گئے، ورم بڑھ گیا، آنکھیں چُندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار اُن کی ہی رہی۔ جو چاہا نہ ملا۔ اسکے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی۔ انسان کس قدر پُرہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی صبح چار بجے آج سے ۴۴ برس پہلے جو ننھا سا کمزور بچہ پیدا ہوا تھا زندگی کا ناٹک کھیل چکا تھا۔ ۲۰ اگست کو صبح چھ بجے شمیم نے آکر کہا "منے بھائی ختم ہو رہے ہیں اُٹھو"

"وہ کبھی بھی ختم نہ ہونگے۔۔۔ بیکار مجھے جگا رہے ہو۔۔۔" میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

"ارے کمبخت تجھے یاد کر رہے ہیں" شمیم نے کچھ پریشان ہو کر بتایا۔

"اُن سے کہدو اب حشر کے دن ملیں گے۔۔۔ ارے شمیم وہ کبھی نہیں مرسکتے" میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی، کمرہ سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ کتابیں ہٹا دی گئی تھیں۔ دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لُڑھک رہی تھیں، دُونوں بچے پریشان ہو ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابی انہیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں۔ سوکھی سوکھی آہیں ان کے کلیجے سے نکل رہی تھیں۔ آنسو بند تھے۔

"منے بھائی!" میں نے اُن پر جھک کر کہا۔ ایک لمحہ کو آنکھیں اپنے محور پر گھمیں ہونٹ سرکے اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی۔ سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں۔ جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منے بھائی" نہ جانے کس نے کہا۔

"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے" مجھے خیال آیا۔

اور آج میں اُن کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں "ناممکن، وہ کبھی نہیں مرسکتے۔ ناممکن" وہ جئیں گے جب تک اُن کا ایک لفظ بھی جی سکتا ہے وہ نہیں مرسکتے۔ اُن کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے؟ میرے لئے تو وہ مر کر جئے! اور نہ جانے کتنوں کے لئے وہ مر کر پیدا ہونگے۔ اور برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ ان کا پیغام دُکھ سے لڑو، مفلسی سے لڑو، نفرت سے لڑو۔۔۔ اور مر کر بھی لڑتے رہو۔ یہ کبھی نہ مرسکے گا۔ اُنکی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ نیک نہیں تھے، پارسا نہ ہوتے اگر اُنکی صحت اچھی ہوتی۔ وہ جھوٹے تھے، اُن کی زندگی جھوٹی تھی۔ سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا، ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں، ماں باپ کو دُکھ دیا۔ بیوی کو دُکھ دیا، بچوں کو دُکھ دیا اور سارے جگ کو دُکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذابِ دُنیا بنکر نازل ہوتے تھے اور اب دوزخ کے سوا اُن کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ایک بار تو ضرور اس دوزخ میں جانا پڑیگا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دُنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنسکر تیر کھائے اور تیر اندازوں کو کڑوے تیل میں تلا وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس میں وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھکر دوزخ کا داروغہ بھی جل اُٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا، کیڑے اُس کی کھال کو کھا رہے ہونگے، ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہونگی۔ مُلاؤں کے فتووں سے اُس کی گردن دب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم چیرا جا رہا ہوگا مگر وہ ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہونگی، نیلے مُردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہونگے مگر کوئی اُسے رُلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصہ سے اکڑی ہوئی، بانہیں انجکشنوں سے گُدی ہوئی، کولہے میں امرود برابر پھوڑا آخری دم، اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہو گئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے۔ "یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت اپنا حصّہ لینے آن پہونچیں" یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا۔ دل چاہیئے، پتھر کا کلیجہ ہو مرتے وقت چُٹکلے کرنے کیلئے!

اُن کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے۔ ایک لفظ ہو جو یاد رکھے۔ یہاں کی پوری کتابیں ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ جانے تھا کیا مجن!

ب پالی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ اور زبان تھی کہ قینچی۔ اسقدر رہتے تھے
کالتی تھی کہ ہم کر رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے اُن کی گاڑی نہیں چلی۔ دُنیا بدل گئی
خیالات بدل گئے ہیں۔ ہم لوگ بدزبان ہیں اور مُنہ پھٹ۔ ہم دل
تا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری سوشل ازم اور بیکاری نے ہم
ن کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔
پوشیدہ دُکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اُگلتے ہیں۔ وہ
دُکھی تھے۔ نادار، بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز؛
بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا مُنہ چڑا دیتے تھے۔ دُکھ میں ٹھٹھا لگا
تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے۔ زندگی کے ہر معاملہ پر
مر دُکھ کو نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اسقدر شوقین کہ دُنیا کا کوئی انسان ہو اُس سے
تی "کھر یا بہادر" میں جو شاہ تنکر اُن کے حالات ہیں وہ ایک میراثن
معلوم ہوتے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں
ں ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کہ یا اللہ یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں
ہی ہیں مگر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ اُسی میراثن نے بتایا ہو۔
اور تو اور بھنگن، بہشتی، راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔
ں تک کہ کچھ دن ہسپتال میں رہے تو وہاں جب رات کو خاموشی
اتی آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اُڑایا کرتے۔
روں قصّے سنتے اور سناتے وہی قصّے "سوانہ کی روحیں" "بھارانی
اب" "چپکی" بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے۔ اور زندگی
کتنے جھوٹ ہیں۔ یہی بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں بہت سی
بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔ چونکہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات
ین کرتا تھا۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں۔ فضول سی۔ خصوصاً
ار تو بالکل ردی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی صورت میں
کر کے لکھ دیا ہے۔ شریر بیوی تو بالکل فضول ہے مگر اپنے زمانے
ڑی چلتی ہوئی چیز تھی۔

"چپکی" ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ اس قدر
مارا انسان، جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ
ر نہ دیکھا، تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ اُفوہ وہ چپکی
اموش نگاہوں کے پیام، وہ ہیرو کا اُس کی حرکتوں سے مسحور
نا اور پھر خود مصنف کی زندگی ——— کس قدر مکمل جھوٹ۔

یہ عظیم بھائی نہیں ان کا ہمزاد بولتا تھا جو اُن کے جسم سے دُور ہو کر حسن و عشق کی
عیاشیاں کر آتا تھا۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں اتنی بالکل نئے
ادب میں نہ تھی کہ وہ کھل باتیں نہ لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے
مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویاں
گل بکاؤلی، زہر عشق، وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انہیں "پرانی"
کہہ دیا گیا تھا۔ لیکن اب پھر یہ فیشن نکلا ہے کہ وہی پرانا سینہ کا اتار چڑھاؤ،
پنڈلیوں کی گاؤدمی، رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی
سمجھتے تھے۔ اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی اُن کے یہاں عام ہے۔
اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات تو
عریاں دیکھتے تھے مگر خود اُسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے۔

وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بہت
بچّہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے۔
ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ "نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے
ہیں اور اوپر سے اُن پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں "اماں کھاتا"
معلوم ہوتا ہے" وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ
میں جنس بہت نمایاں رہتی ہے یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر
ہیں۔ ہماری شاعری مصوری قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا
ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جائیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔
یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں اُن کا رنگ غائب ہو کر وہی "الف
لیلہ" کا رنگ غالب آگیا۔

انہیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (میں محترمہ سے معافی
مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے "یہ عورت بہت پیارے
جھوٹ بولتی ہے۔" انہیں شکایت تھی کہ میں بہت ہی اُلٹے سیدھے جھوٹ
بولتی ہوں میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں اور اُن کے جھوٹ بھرے پیٹ
کی مسکراہٹیں! اللہ جانے اُن کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم اُن کے افسانوں کو عموماً "جھوٹے" کہا کرتے تھے۔ جہاں انہوں
نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسنے لگے "قصر صحرا لکھنے
لگے؟" وہ اُن کی گپوں کو "قصر صحرا" کہتے تھے۔ عظیم بھائی کہتے "یہ سوکھی
دُنیا میں جھوٹ بغیر کوئی رنگینی نہیں! بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ
اس میں ملا دو"

وہ یہ بھی کہتے تھے "جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو قصر صحرا
ہے"

اس پر ماموں کہتے "ارے اس زندہ لاش کو منع کرو کہ یہ کفر ہے" اس پر وہ ماموں کے توہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اُڑاتے تھے۔

انہیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا لیکن کہتے تھے۔ "دُنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزیدار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزیدار ہے" کہتے تھے "میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر بنوا دیتا۔ بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا۔ مزے سے آمدنی ہوتی"

انہیں دھوکہ باز اور مکار آدمی سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کہتے تھے "دھوکہ اور مکاری مذاق نہیں، عقل چاہیئے ان چیزوں کے لئے ـــ"

انہیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا۔ مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں اُن کا۔ عموماً پیسے دیکر دھول میں ناچتے ہوئے فقیروں کو اس شوق سے دیکھا کرتے تھے کہ ان کا انہماک دیکھکر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انہیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے کبھی انہیں نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے اسکے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس پر کاغذ چڑھا کر کہدیا کرتے تھے کچھ نہیں قانونی کتاب ہو۔ جھوٹ تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لیئے عجیب عجیب حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

یزید کے بڑے مداح تھے اور امام حسینؑ کی شان میں ہجو اس کیا کرتے تھے۔ لوگوں سے گھنٹوں بحث ہوتی تھی۔ کہتے تھے "میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امام حسینؑ کھڑے ہیں، اُدھر سے یزید لعین آیا، آپ کے پیر پکڑ لئے، گڑگڑایا، ہاتھ جوڑے تو آپ کا خون جوش مارنے لگا اور اُسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بس میں نے بھی اس دن سے یزید کی عزت شروع کر دی۔ جنت میں تو اُن کا ملاپ بھی ہو گیا پھر ہم کیوں لڑیں ـــ"

سیاست سے کم دلچسپی تھی کہتے تھے "بابا ہم لیڈر ین نہیں سکتے تو پھر کیوں کھپیں۔ لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کچھ کرنا دھرنا ہمیں نہیں آتا۔" بہت سال ہوئے کچھ مضامین ریاست میں

سیاسیات اور اکنومکس پر لکھے تھے وہ نہ جانے کیا ہوئے۔

مذہب کا جنون سا تھا، مگر آخر میں آکر بحث کم کر دی تھی اور کہتے تھے "بھئی تم لوگ تو ہنسے گئے ہو، میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا کرونگا ـــ لہٰذا چُپ ہی اچھا ہوں"

پردہ کے خلاف تو کبھی سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے "یہ پرانی بات ہو گئی۔ اب پردہ روکے سے نہیں رُک سکتا۔ اس معاملے میں ہم کر چکے ـــ اب تو نئی پریشانیاں ہیں"

لوگ کہتے تھے، دوزخ میں جاؤ گے تو فرماتے تھے "یہاں کونسی اللہ میاں نے جنت دیدی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پروا نہیں ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بیکار جائے گا کیونکہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں"

کبھی کہتے کہ "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم تو مر جائیں گے، جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لینگے"

یہی وجہ ہے کہ سب انہیں باغی اور دوزخی کہتے ہیں۔

وہ کہیں بھی جائیں میں دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی اُن کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں یا دوزخ کے فرشتوں کو جلا کر مسکرا رہے ہیں۔ مولویوں کو اُلجھا رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں اُن کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتہ اُن کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔ فرق ہی کیا ہے ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں۔ دوزخی کا کیا ٹھکانا؟

عصمت چغتائی

آم کے ٹوکرے

خزانے کے تمام کلرک جانتے تھے کہ منشی کریم بخش کی رسائی بڑے صاحب تک بھی ہے چنانچہ وہ سب اُس کی عزّت کرتے تھے۔ ہر مہینے اپنی پنشن کے کاغذ بھرنے اور روپیہ لینے کے لئے جب وہ خزانے میں آتا تو اس کا کام اسی وجہ سے جلد جلد کر دیا جاتا تھا۔ پچاس روپے اس کو اپنی تیس سالہ خدمات کے عوض ہر مہینے سرکار کی طرف سے ملتے تھے۔ ہر مہینے دس دس کے پانچ نوٹ وہ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑتا اور اپنے پرانے وضع کے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیتا۔ چشمے میں سے خزانچی کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھتا اور یہ کہہ کر "اگر زندگی ہوئی تو اگلے مہینے پھر سلام کرنے کے لئے حاضر ہوں گا" بڑے صاحب کے کمرے کی طرف چلا جاتا۔

آٹھ برس سے اس کا یہی دستور تھا۔ خزانے کے قریب قریب ہر کلرک کو معلوم تھا کہ منشی کریم بخش جو مطالباتِ خفیفہ کی کچہری میں کبھی محافظ دفتر ہوا کرتا تھا بے حد وضعدار، شریف الطبع اور حلیم آدمی ہے۔ منشی کریم بخش واقعی ان صفات کا مالک تھا۔ کچہری میں اپنی طویل ملازمت کے دوران میں افسرانِ بالا نے ہمیشہ اس کی تعریف کی۔ بعض منصفوں کو تو منشی کریم بخش سے محبت ہو گئی تھی۔ اُنکے خلوص کا ہر شخص قائل تھا۔

اس وقت منشی کریم بخش کی عمر پینسٹھ سے کچھ اوپر تھی۔ بڑھاپے میں آدمی عموماً کم گو اور حلیم ہو جاتا ہے مگر وہ جوانی میں بھی ایسی ہی طبیعت کا مالک تھا۔ دوسروں کی خدمت کرنے کا شوق اس عمر میں بھی ویسے کا ویسے ہی قائم تھا۔

خزانے کا بڑا افسر منشی کریم بخش کے ایک مربّی اور مہربان جج کا لڑکا تھا۔ جج صاحب کی وفات پر اُسے بہت صدمہ ہوا تھا۔ اب وہ ہر مہینے اُن کے لڑکے کو سلام کرنے کی غرض سے ضرور ملتا تھا۔ اس سے اُسے بہت تسکین ہوتی تھی۔ منشی کریم بخش انہیں چھوٹے جج صاحب کہا کرتا تھا۔

پنشن کے پچاس روپے جیب میں ڈال کر وہ برآمدہ طے کرتا اور چھوٹے جج صاحب کے کمرے کے پاس جا کر اپنی آمد کی اطلاع کراتا۔ چھوٹے جج صاحب اس کو زیادہ دیر تک باہر کھڑا نہ رکھتے۔ فوراً اندر بلا لیتے اور سب کام چھوڑ کر اُس سے باتیں شروع کر دیتے۔

"تشریف رکھئے منشی جی صاحب ــــ فرمائیے مزاج کیسا ہے؟"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے ــــ آپ کی دعا سے بڑے مزے میں گذر رہی ہے۔"

"میرے لائق کوئی خدمت؟"

"آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت تو فرمائیے۔ خدمت گذاری تو بندے کا کام ہے۔"

"آپ کی بڑی نوازش ہے۔"

اس قسم کی رسمی گفتگو کے بعد منشی کریم بخش جج صاحب کی مہربانیوں کا ذکر چھیڑ دیتا۔ اُن کے بلند کردار کی وضاحت بڑے فدویانہ انداز میں کرتا اور بار بار کہتا "اللہ بخشے مرحوم فرشتہ خصلت انسان تھے۔ خدا اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔"

منشی کریم بخش کے لہجے میں خوشامد وغیرہ کی ذرہ بھر ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا محسوس کر کے کہتا تھا۔ اس کے متعلق جج صاحب کے لڑکے کو جو اب خزانے کے بڑے افسر تھے اچھی طرح معلوم تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اسکو عزّت کے ساتھ اپنے پاس بٹھلاتے تھے اور دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

ہر مہینے، دوسری باتوں کے علاوہ منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا ذکر بھی آتا تھا۔ موسم آنے پر جج صاحب کے لڑکے کی کوٹھی آموں کا ایک ٹوکرہ پہونچ جاتا تھا۔ منشی کریم بخش کو خوش کرنے کے لئے وہ ہر مہینے اس کو یاد دہانی کرا دیتے تھے "منشی صاحب، دیکھئے اس موسم پر آموں کا ٹوکرہ بھیجنا نہ بھول جائیے گا ــــ پچھلی بار آپ نے جو آم بھیجے تھے اُس میں سے تو صرف دو میرے حصے میں آئے تھے۔"

"کبھی یہ تین ہو جاتے تھے کبھی چار اور کبھی صرف ایک ہی رہ جاتا تھا۔"

منشی کریم بخش یہ سنکر بہت خوش ہوتا تھا "حضور ایسا کبھی ہو سکتا ہے ــــ جونہی فصل تیار ہوئی میں فوراً ہی آپ کی خدمت میں ٹوکرہ لے کر حاضر ہو جاؤں گا ــــ دو کیجئے، دو حاضر کر دوں گا۔"

یہ باغ کس کے ہیں؟ — آپ ہی کے تو ہیں"

کبھی کبھی چھوٹے جج صاحب پوچھ لیا کرتے تھے: "منشی جی آپکے باغ کہاں ہیں؟"

"دیناتگر میں حضور — زیادہ نہیں ہیں۔ صرف دو ہیں۔ اس میں سے ایک تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو دے رکھا ہے جو ان دونوں کا انتظام وغیرہ کرتا ہے"

مئی کی پنشن لینے کے لئے منشی کریم بخش جون کی دوسری تاریخ کو خزانے گیا، دس دس کے پانچ نوٹ اپنے خفیف طور پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر اس نے چھوٹے جج صاحب کے کمرے کا رخ کیا۔ حسب معمول ان دونوں میں وہی رسمی باتیں ہوئیں۔ آخر میں آموں کا ذکر بھی آیا جس پر منشی کریم بخش نے کہا: "دیناتگر سے چٹھی آئی ہے کہ ابھی آموں کے منہ پر چیپ نہیں آیا جونہی چیپ آگیا اور فصل پک کر تیار ہو گئی میں فوراً پہلا ٹوکرہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا — چھوٹے جج صاحب اس دفعہ ایسے تحفہ آم ہونگے کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ ملائی اور شہد کے گھونٹ نہ ہوئے تو میرا ذمہ۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ چھوٹے جج صاحب کے لئے ایک ٹوکرہ خاص طور پر بھروا دیا جائے اور سواری گاڑی سے بھیجا جائے تاکہ جلدی اور احتیاط سے پہونچے۔ دس پندرہ روز آپ کو اور انتظار کرنا پڑیگا"

چھوٹے جج صاحب نے شکریہ ادا کیا۔ منشی کریم بخش نے اپنی چھتری اٹھائی اور خوش خوش گھر واپس آگیا۔

گھر میں اس کی بیوی اور بڑی لڑکی تھی۔ بیاہ کے دوسرے سال ہی جس کا خاوند مر گیا تھا۔ منشی کریم بخش کی اور کوئی اولاد نہیں تھی مگر اس مختصر سے کنبے کے باوجود پچاس روپوؤں میں اس کا گذر بہت ہی مشکل سے ہوتا تھا۔ اسی تنگی کے باعث اس کی بیوی کے تمام زیور ان آٹھ برسوں میں آہستہ آہستہ بک گئے تھے۔

منشی کریم بخش فضول خرچ نہیں تھا۔ اس کی بیوی اور وہ دونوں بڑے کفایت شعار تھے مگر اس کفایت شعاری کے باوصف تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی ان کے پاس نہیں بچتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ منشی کریم بخش چند آدمیوں کی خدمت کرنے میں بےحد مسرت محسوس کرتا تھا۔ ان چند خاص خاص آدمیوں کی خدمت گذاری [illegible] سے [illegible] دلی عقیدت تھی۔

[illegible] میں سے ایک تو جج صاحب کے لڑکے تھے، دوسرے ایک اور افسر تھے جو ریٹائر ہو کر اپنی زندگی کا بقایا حصہ ایک بہت بڑی کوٹھی میں گذار رہے تھے۔ ان سے منشی کریم بخش کی ملاقات ہر روز صبح سویرے کمپنی باغ میں ہوتی تھی۔

باغ کی سیر کے دوران میں منشی کریم بخش ان سے ہر روز پچھلے دن کی خبریں سنتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ بیتے ہوئے دنوں کے تار چھیڑ دیتا تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنی بہادری کے قصے سنانا شروع کر دیتے تھے کہ کس طرح انہوں نے لائل پور کے جنگلی علاقے میں ایک خونخوار قاتل کو پستول، خنجر دکھائے بغیر گرفتار کیا اور کس طرح انکے رعب سے ایک ڈاکو سارا مال چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کبھی کبھی منشی کریم بخش کے آم کے باغوں کا بھی ذکر آجاتا تھا۔

"منشی صاحب کہیئے ابکی دفعہ فصل کیسی رہے گی؟"

"ڈپٹی صاحب پچھلی دفعہ چونکہ آم بہت ہوئے ہیں اس لئے یہ فصل کچھ کمزور ہی رہے گی"

"پچھلے سال آپ نے جو آم بھجوائے تھے بہت ہی اچھے تھے — بے حد لذیذ تھے"

"انشاءاللہ، خدا کے حکم سے ابکی دفعہ بھی ایسے ہی آم حاضر کروں گا — ایک ہی بوٹے کے ہونگے۔ ویسے ہی لذیذ، بلکہ پہلے سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہونگے"

اس آدمی کو بھی منشی کریم بخش ہر سال موسم پر ایک ٹوکرہ بھیجتا تھا۔ کوٹھی میں ٹوکرہ نوکروں کے حوالے کر کے جب وہ ڈپٹی صاحب سے ملتا اور وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تو منشی کریم بخش نہایت انکساری کے کام لیتے ہوئے کہتا: "ڈپٹی صاحب آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں — اپنے باغ ہیں۔ اگر ایک ٹوکرہ یہاں لے آیا تو کیا ہو گیا۔ بازار سے آپ ایک چھوڑ کئی ٹوکرے منگوا سکتے ہیں — یہ آم چونکہ اپنے باغ کے ہیں اور باغ میں صرف ایک بوٹا ہے جس کے سب دانے گھلاوٹ خوشبو اور مٹھاس میں ایک جیسے ہیں اس لئے یہ چند تحفے کے طور پر لے آیا"

آم دینے کے بعد جب وہ کوٹھی سے باہر نکلتا تو اسکے چہرے پر تمتماہٹ ہوتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی روحانی تسکین اسے محسوس ہوتی تھی جو کئی دنوں تک اسکو مسرور رکھتی تھی۔

منشی کریم بخش اکہرے جسم کا آدمی تھا۔ بڑھاپے نے اسکے بدن کو ڈھیلا کر دیا تھا مگر یہ ڈھیلا پن بدصورت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسکے پتلے پتلے ہاتھوں کی سپیدی ہوئی رگیں، [illegible]

چہرے کی گہری لکیریں اُس کی متانت و سنجیدگی میں اضافہ کرتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑھاپے نے اس کو نکھار دیا ہے۔ کپڑے بھی وہ صاف ستھرے پہنتا تھا جس سے یہ نکھار اُبھر آتا تھا۔

اُس کے چہرے کا رنگ سفیدی مائل زرد تھا۔ پتلے پتلے ہونٹ دانت نکل جانے کے باعث اندر کی طرف سمٹے رہتے تھے ہلکے سرخ تھے۔ خون کی اس کمی کے باعث اس کے چہرے پر ایسی صفائی پیدا ہوگئی تھی جو اچھی طرح منہ دھونے کے بعد تھوڑی دیر تک قائم رہا کرتی ہے۔

وہ کمزور ضرور تھا۔ چھیاسٹھ برس کی عمر میں کون کمزور نہیں ہو جاتا مگر اس کمزوری کے باوجود اس میں کئی کئی میل پیدل چلنے کی ہمت تھی۔ خاص طور پر جب آموں کا موسم آتا تو وہ ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو آموں کے ٹوکرے بھیجنے کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ بیس پچیس برس کے جوان آدمی نہیں کیا کریں گے۔ بڑے اہتمام سے ٹوکرے کھولے جاتے تھے۔ اُن کا گھاس پھوس الگ کیا جاتا تھا۔ داغی یا گلے سڑے دانے الگ کئے جاتے تھے اور صاف ستھرے آم نئے ٹوکروں میں گن گن کر ڈالے جاتے تھے۔ منشی کریم بخش ایک بار پھر اپنا اطمینان کرنے کی خاطر ان کو گن لیتا تھا تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اُٹھانا پڑے۔

آم نکالتے اور ٹوکروں میں ڈالتے وقت منشی کریم بخش کی بہن اور اس کی بیوی کے منہ میں پانی بھر آتا۔ مگر وہ دونوں خاموش رہتیں۔ بڑے بڑے رس بھرے خوبصورت آموں کا ڈھیر دیکھ کر جب ان میں سے کوئی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتی: "کیا ہرج ہے اگر اس ٹوکرے میں سے دو آم نکال لئے جائیں" تو منشی کریم بخش سے یہ جواب ملتا: "اور آجائیں گے۔ اتنا بیتاب ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

یہ سنکر وہ دونوں چپ ہو جاتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔

جب منشی کریم بخش کے گھر میں آموں کے ٹوکرے آتے تھے تو گلی کے سارے آدمیوں کو اس کی خبر لگ جاتی تھی۔ عبداللہ نیچے بند کا لڑکا جو کبوتر پالنے کا شوقین تھا دوسرے روز ہی آ دھمکتا تھا اور منشی کریم بخش کی بیوی سے کہتا تھا: "خالہ، میں گھاس لینے کے لئے آیا ہوں کل خالوجان آموں کے دو ٹوکرے لائے تھے۔ اُن میں جتنی گھاس نکلی ہو مجھے دیدیجئے۔"

ہمسائی تھا جس نے کئی مرغیاں پال رکھی تھیں۔ اسی روز شام کو تشریف لے آتی تھی اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا کرتی

تھی: "پچھلے برس جو تم نے مجھے ایک ٹوکرہ دیا تھا بالکل ٹوٹ گیا ہے اگر ابھی ایک ٹوکرا دیدو تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

دونوں ٹوکرے اور ان کی گھاس یوں چلی جاتی تھی۔

حسب معمول اس دفعہ بھی آموں کے دو ٹوکرے آئے گلے سڑے دانے الگ کئے گئے۔ جو اچھے تھے اُن کو منشی کریم بخش نے اپنی نگرانی میں گنوا کر نئے ٹوکروں میں رکھوایا۔ بارہ بجے سے پہلے پہلے یہ کام ختم ہو گیا۔ چنانچہ دونوں ٹوکرے غسل خانے میں ٹھنڈی جگہ رکھ دئے گئے تاکہ آم خراب نہ ہو جائیں۔

ادھر سے مطمئن ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد منشی کریم بخش کمرے میں چارپائی پر لیٹ گیا۔

جون کے آخری دن تھے۔ اس قدر گرمی تھی کہ دیواریں توے کی طرح تپ رہی تھیں۔ وہ گرمیوں کے موسم میں عام طور پر غسلخانہ کے اندر ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹا کرتا تھا۔ یہاں موری کے رستے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آجاتی تھی لیکن اب کہ اس میں دو بڑے بڑے ٹوکرے پڑے تھے، اس کو گرم کمرے ہی میں جو بالکل تنور بنا ہوا تھا چھ بجے تک وقت گذارنا تھا۔

ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب آموں کے یہ ٹوکرے آتے اُسے ایک دن آگ کے بستر پر گذارنا پڑتا تھا مگر وہ اس تکلیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ قریباً پانچ گھنٹے تک چھوٹا سا پنکھا بار بار پانی میں تر کرکے جھلتا رہتا۔ انتہائی کوشش کرتا کہ نیند آجائے مگر ایک پل کے لئے بھی اُسے آرام نصیب نہ ہوتا۔ جون کی گرمی اور ضدی قسم کی مکھیاں کب سونے دیتی ہیں۔

آموں کے ٹوکرے غسلخانے میں رکھوا کر جب وہ گرم کمرے میں لیٹا تو پنکھا جھلتے جھلتے ایک دم اس کا سر چکرایا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سانس اکھڑ رہا ہے اور وہ سارے کا سارا گہرا تیل میں اُتر رہا ہے۔ اس قسم کے دورے اُسے کئی بار پڑ چکے تھے اس لئے کہ اس کا دل کمزور تھا، مگر ایسا زبردست دورہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ سانس لینے میں اس کو بڑی دقت محسوس ہونے لگی۔ سر بہت زور سے چکرانے لگا۔ گھبرا کر اس نے آواز دی اور اپنی بیوی کو بلایا۔

یہ آواز سنکر اُس کی بیوی اور بہن دونوں دوڑی آئیں۔ دونوں جانتی تھیں کہ کئے اس قسم کے [illegible] ٹوٹا پھا اس کی بہن نے [illegible]

کہا کہ ڈاکٹر کو بلا لاتے تاکہ وہ طاقت کی سوئی لگا دے۔ لیکن چند منٹوں ہی میں منشی کریم بخش کی حالت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ بیقراری اس قدر بڑھ گئی کہ وہ چارپائی پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اُس کی بیوی اور بہن نے یہ دیکھ کر شور برپا کر دیا جس کے باعث آس پاس کے کئی آدمی جمع ہو گئے۔

بہت کوشش کی گئی کہ اس کی حالت ٹھیک ہو جائے لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے تین چار آدمی دوڑائے گئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی واپس آئے منشی کریم بخش اپنی زندگی کے آخری سانس لینے لگا۔ بڑی مشکل سے کروٹ بدل کر اُس نے عبداللہ نیچہ بند کو جو اُس کے پاس ہی بیٹھا تھا اپنی طرف متوجہ کیا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "تم سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں اپنی بیوی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

سب لوگ باہر چلے گئے۔ اُس کی بیوی اور لڑکی دونوں اندر داخل ہوئیں، رو رو کر اُن کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ منشی کریم بخش نے اشارے سے اپنی بیوی کو پاس بلایا اور کہا: "دونوں ٹوکرے آج شام ہی کو ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کی کوٹھی پر ضرور پہونچ جانے چاہئیں۔ پڑے پڑے خراب ہو جائیں گے۔" اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر اُس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا: "دیکھو تمہیں میری قسم ہے۔ میری موت کے بعد بھی کسی کو آموں کا راز معلوم نہ ہو۔ کسی سے نہ کہنا کہ یہ آم ہم بازار سے خرید کر لوگوں کو بھیجتے تھے۔ کوئی پوچھے تو یہی کہنا کہ دینا نگر میں ہمارے باغ ہیں ..... بس ..... اور دیکھو جب میں مر جاؤں تو چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی صاحب کو ضرور اطلاع بھیج دینا۔"

چند لمحات کے بعد منشی کریم بخش مر گیا۔ اس کی موت سے ڈپٹی صاحب اور چھوٹے جج صاحب کو لوگوں نے مطلع کر دیا۔ مگر وہ دونوں چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شامل نہ ہو سکے۔

سعادت حسن منٹو

ایتلافات خیال

غمکدے میں آج مہماں آ گئی — نغمہ شاہد کے وصف زندگی
وہ بھی کیا دن تھے کہ جب وحشی زندگی — رکھتی تھی ہم سے ہی عہد بندگی
ہر نفس ہے موت ہر دم ہے حیات — چاند سے ہے چاندنی کی ملک تابوت
ماہ لیکن زندگی کا تاج ہے! — زندگی پر چاندنی کا راج ہے
چاند کی اس مسکراہٹ کی قسم — خود بخود آنکھیں ہوئی جاتی ہیں نم
بات کہنے کی نہیں پر کیا کریں! — کچھ تراشے قہقہوں کے جمع ہیں!
بزم ہائے تہنیت کے واسطے — ان تراشوں ہی کے جھومر بن گئی
تاکہ محفل میں ہنسیں خود اور ہنسائیں — اور اس غمگین دنیا کو بھلائیں!
میری مدہوشی پہ کوئی ہنس پڑا؟ — ہنسیں! نغموں کا اک طوفاں اٹھا!
نغمۂ جانسوز کا یہ زیر و بم! — نیش زن ہے مثل مژگان صنم!
نقرئی خوابوں کی اک کان ہے یہ — نغمے یا آتش خنداں ہے یہ!
بس گئیں نغموں سے دل کی بستیاں — اور ہیں آوارہ فضا میں مستیاں

نغمۂ شاہد ہے یا برق تپاں
اُٹھ رہا ہے دل کی دنیا سے دھواں
اُٹھ رہا ہے دل کی دنیا سے دھواں

زندگی اک دودکش بن جائیگی — قبر پر انساں کی گھر تک آئیگی!
اکثر انساں گوشت کی ہیں لوتھڑے — مخمل و کمخواب میں لپٹے ہوئے!
مصر کے اہرام ان کے شاہکار! — سو رہے ہیں جن میں ان کے تاجدار
آہ! تاریخوں کو نیند آتی نہیں! — موت دروازے پہ چلاتی نہیں!!

ہو رہا ہے بند دروازہ کہیں!
ہو رہا ہے بند دروازہ کہیں!!
ہو رہا ہے بند دروازہ کہیں!!
تم میں کوئی کھولنے والا نہیں؟

عرش تیموری

جب تہذیب جنم لے رہی تھی

انگریزی میں ایک کہاوت ہے جس کا ترجمہ ہے "جب آدم پھاوڑا چلاتے تھے اور حوا چرخہ چلاتی تھیں اس وقت شریف کون تھا؟" یہاں ہمیں اس سے تو بحث کرنی نہیں کہ شرافت کا لفظ کب شرمندہ معنی ہوا یا کبھی ہوا بھی کہ نہیں اور نہ اس امر کی تصدیق آسان ہے کہ ابو البشر نے پھاوڑا چلایا یا کاتنا اور بننا ام البشر کا مشغلہ تھا۔ البتہ چاہے دنیا کی پہلی عورت کو یہ فن معلوم رہا ہو یا نہیں اس کی پوتیوں پر پوتیوں کی تحقیق و تجسس ضرور اس فن کی تخلیق کی کیونکہ بننا ایک ایسی پرانی ایجاد ہے جس کی ابتدا نہ کسی کو معلوم ہے اور نہ کوئی اس کے جاننے کی فکر ہی کرتا ہے۔

اتر میں رہنے والوں کا جانوروں کے بال اور سمور سے پوشاک تیار کرنا تو بہت بعد کی چیز ہے۔ اس سے کہیں پہلے دکھن میں بسنے والی بستیاں خس و خاشاک اور پتوں کو بن کر ایسی ٹوکریاں بنانا جانتی تھیں جن میں دونوں ہاتھوں سے زیادہ چیزیں سما سکتی تھیں۔ انہیں اپنے غار اور جھونپڑوں کی سخت اور نرم زمین پر بچھانے کے لئے چٹائیاں بنانا بھی آتا تھا اور غالباً اپنا تن ڈھکنے کے لئے خس و خاشاک کو بُن کر پوشاک بنا لیا کرتی تھیں۔ دنیا ابھی نئی تھی جب عدن کے پورب (غالباً ہندوستان یا چین) میں ایک شخص جبل [illegible] نامی گلہ بانوں کا سردار تھا۔ اس کی ماں [illegible] اور بیوی اور بیٹی پتے اور چھال کی چٹائیاں اور خیمے بنانے میں بہت مشاق تھیں۔ انہوں نے ڈوریاں بنانا ایجاد کیا اور ان سے چٹائیوں کو ٹانکنا اور خیمے کے سروں کو باندھنا رائج کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جس میں تہذیب انسانی کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی اور تب ہی سے عورت نے لباس و غذا کی طرف توجہ کی اور اپنے ناخن تدبیر سے ایسے فنون کی تخلیق کی جو بعد میں اس کا طرۂ امتیاز بن گئے۔ کاتنا بننا اور رنگنا جیسے حسین فن اسی کے ذوق لطیف اور دست نازک کے رہین منت ہیں۔ وہ ایک عورت ہی تھی جس نے سن کے پیڑ سے پہلے پہل ریشہ نکال کر دھاگا بٹا۔ سردی کے زمانہ میں اونچی اونچی پہاڑیوں پر بھیڑیں [illegible] تو کچھ اون نوچ کر اپنے شیرخوار بچے کے لئے لباس تیار کرنے کی ابتدا ایک عورت ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ سن اور اون کے لمبے دھاگے بٹنے کی کوشش میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ایک تکلی پر رکھ کر اسے گول پھرانا شروع کیا اور پھر ایک سرا پکڑ کر کھینچا تو مضبوط بٹا ہوا دھاگا نکلنے لگا۔ اس طرح تکلے کی ایجاد بھی ایک عورت ہی کے جذبۂ تجسس کی ممنون ہے۔ یہ تکلا پہلے ہاتھ سے پھر چرخے سے گھمایا جانے لگا۔ صنف نازک میں خوبصورتی اور سنگار سے فطری ذوق ہی اس کا ذمہ دار تھا کہ سن اور اون کے سادہ رنگوں سے اکتا کر اسے زیادہ جاذب نظر رنگوں کی تلاش ہوئی۔ چھالوں پھولوں اور پتوں کے عرق میں دھاگوں کو ڈبو ڈبو کر رنگ برنگی پوشاکیں تیار ہونے لگیں اور لباس پر طرح طرح کے بیل بوٹے بننے لگے۔

یہ عورتیں جن کا ہم نے اب تک ذکر کیا اس زمانے میں تھیں جب لوگ تلاش معاش میں جگہ جگہ مارے پھرتے تھے۔ زراعت کی ایجاد اور تعمیر کے فن سے آگاہی ہو جانے پر عورت کو کسی قدر اطمینان نصیب ہوا اور اسے اپنا دستور العمل بنانے کا موقع ملا۔ اب جنگل کی محدود طور پر پیداوار اس کے لطیف احساسات کے لئے ناگزیر تھی۔ سن اور روئی کی کاشت عمل میں آئی اور کپڑوں کی بناوٹ میں نزاکت پیدا کی جانے لگی۔ اون کے لئے بھیڑیں زیادہ تعداد میں پالی جانے لگیں۔ کیونکہ اب ان کے لئے چراگاہیں کاشت کی جا سکتی تھیں۔ گلہ بانی اور بھی فائدہ مند پیشہ ہو گیا۔ کیونکہ گوشت کے علاوہ اون بھی مصرف میں آنے لگا تھا۔ اس طرح عورتوں نے بننے کے ہنر کو ترقی دیکر اون کو ایک قیمتی تجارتی چیز بنا دیا۔

جبکہ باقی دنیا میں بہیمیت اور وحشت کا دور دورہ تھا چین کے لوگ کئی لحاظ سے متمدن کہے جا سکتے تھے۔ خصوصاً شہنشاہ ہوانگٹی کی حکومت میں رعایا بہت خوش حال تھی اور بادشاہ رعیت کی بہبودی کیلئے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے [illegible] اور ناپ کے پیمانے مقرر کر رکھے تھے تاکہ خریدار دھوکا نہ کھا سکیں۔ اس نے کشتیاں ایجاد کیں اور [illegible] دریاؤں کے ذریعہ چین کے مختلف مقامات میں مراسلت اور تجارت شروع ہو گئی۔ اسی کے دوران حکومت میں دھاتوں کی [illegible] اگرچہ ملکی حکومت کے معاملات میں بہت منہمک رہتا پھر بھی [illegible]

چنانچہ اس کی حسین ملکہ سیلنگ شیہ نے اپنے پائیں باغ میں بیٹھے بیٹھے ایک مکروہ کیڑے کا مطالعہ کر کے کر دیا۔ اس باغ میں شہتوت کے درخت بکثرت تھے اور چونکہ ان کی پتی ریشم کے کیڑوں کو بہت مرغوب ہے اس لئے یہ کیڑے وہاں بڑی تعداد میں تھے۔ ملکہ گھر کے کسی کام میں ہاتھ نہ لگاتی اور دوپہر کے وقت گرمی سے بچنے کے لئے گھنے درختوں کے نیچے آ بیٹھتی تھی۔ ایک دن حسب معمول جب وہ باغ میں آئی تو درختوں کی ایسی آواز اس کے کانوں میں آنے لگی جیسے کہ پانی برس رہا ہو لیکن آسمان پر ابر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ سنتی رہی اور تجسس کی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی۔ یکایک اس نے دیکھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے مکروہ کیڑے جو خوبصورت شہتوت کے درختوں پر چڑھا کرتے تھے اور جن سے وہ نفرت کیا کرتی تھی کہ وہ اسکے خوشنما درختوں کو خراب کرتے رہتے تھے، پتیاں کھانا بند کر کے اپنے لئے خول (cocoons) تیار کر رہے ہیں۔ ملکہ کی کنیزوں نے اسے بتایا کہ یہ کیڑے اسی طرح تین دن اور تین رات تک خول کاتتے رہیں گے۔ پھر جبکہ اپنے کو پوری طرح بند کر کے ہوا اور دھوپ سے محفوظ کر لیں گے تو ماہ کامل تک اسی کے اندر سوتے رہیں گے اور پورا چاند ہوتے ہی خول کے ایک سرے پر سوراخ کر کے خوبصورت تتلیاں بن کر اڑ جائیں گے۔

سیلنگ شیہ نے خول میں سے تتلیوں کا نکلنا کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ بے چینی سے اس وقت کا انتظار کرنے لگی۔ تین دن کے بعد آواز بند ہو گئی اور باغ میں پہلے جیسی خاموشی پھر ہو گئی۔ ملکہ دن گنتی رہی اور آخر جب چودھویں رات کا چاند نکلا تو سینکڑوں کی تعداد میں تتلیاں اڑتی نظر آئیں۔ لیکن ملکہ کو ان پتنگوں پر کوئی اچنبھا نہیں ہوا بلکہ ان کے گھر کی ساخت پر حیرت ہونے لگی۔ درجنوں خالی سنہرے خول زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں چن لیا، ان کا بغور مطالعہ کیا، ان میں سے نرم ریشمی دھاگے نکالے اور اس کو یہ احساس ہونے لگا کہ یہ دھاگے تو ان سے بھی زیادہ ملائم اور باریک ہیں جن سے خود اس کا لباس بنا ہوا تھا۔ اسی فکر میں غرق سیلنگ شیہ بے اعتنائی سے ان خولوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔ کبھی دھاگے کھینچ کر ان کی مضبوطی کا اندازہ لگاتی تو کبھی ہاتھوں سے مل کر ان کی ملائمت کو دیکھتی۔ یکایک یہ خیال اس کے ذہن میں آیا کہ ایسے دھاگے بننے کی کوشش ہی کیوں کی جائے۔ کیوں نہ اس کیڑے کے کاتے ہوئے دھاگے ہی سے اپنے لئے پوشاک بنی جائے!

جب ریشم کے کیڑوں کے خول بنانے کی دوسری فصل آئی تو ملکہ اپنی کنیزوں کو لیکر باغ میں پہونچی اور جونہی کہ خول بن کر تیار ہوئے اس نے سب جمع کرائے اور دھاگا کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ پہلے تو اس کوشش میں دھاگے ٹوٹ ٹوٹ گئے۔ لیکن اس مشکل کو ملکہ نے بآسانی حل کر لیا۔ اس نے خولوں کو گرم پانی میں ڈلوا دیا تاکہ اندر کے کیڑے مر جائیں، ریشم ملائم پڑ جائے اور آسانی سے کھولا جاسکے۔ اس طرح ریشم کھلتا گیا اور لکڑیوں پر لپٹتا گیا۔ اس سنہرے چمکدار دھاگے سے سیلنگ شیہ نے خود ایک چھوٹا سا کپڑا بنا اور اسے زیب تن کر کے اپنی دلفریب ایجاد کو دیکھتی اور خوش ہوتی تھی۔ اس کے بعد سے اس کا معمول تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے خول جمع کرتی، ریشم کے دھاگے کھولتی اور اپنے لئے لباس تیار کیا کرتی۔ درباری عورتوں پر ملکہ کا تتبع فرض تھا۔ محل میں ہر عورت کا یہی شغل بن گیا۔ شہتوت کے باغ لگنے اور ریشم کے کیڑے پلنے لگے۔ لازم تھا کہ عوام بھی محل والوں کی تقلید کریں۔ تھوڑی ہی مدت میں چین کے تمام لوگ سارے ریشم میں ملبوس نظر آنے لگے۔ چنانچہ جب شہتوت کے درختوں میں نئی پتیاں نکلتی ہیں تو اب بھی ملک کے تمام مرد عورتیں اور بچے ہر سال مندروں میں جاکر ملکہ سیلنگ شیہ کی پوجا کرتے ہیں۔ اسے ریشم کی دیوی کہتے ہیں کیونکہ اس نے اپنی عقل اور اپنے ہی ہاتھوں سے ریشم کا کاتنا اور بننا معلوم کر کے اپنی قوم کو مالا مال کر دیا۔

تین ہزار سال تک اس قیمتی بھید کو ساری چینی قوم اپنے سینوں میں محفوظ کئے رہی۔ دوسرے ملکوں سے سیاح اور تاجر آتے، بازاروں اور شہروں میں پھرتے پھراتے، ریشم کی صنعت کا راز معلوم کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے لیکن ان کیڑوں کی کاریگری انہیں معلوم نہ ہوسکی۔ شروع میں تو چینیوں کو اپنی اس غیر معمولی صنعت پر اس قدر فخر تھا کہ حکام نے ریشم کا ملک سے باہر بھیجنا جرم قرار دے رکھا تھا۔ [illegible] اور چاول خرید سکتے تھے۔ لیکن دھاگے کی بنی ہوئی اشیاء اور دیگر سامان دستکاری ملک سے باہر لے جاسکتے تھے۔ [illegible] کی نفیس چیزیں لیکن ان تک کسی کی دسترس نہ تھی۔ رفتہ رفتہ چینی تاجروں کو زیادہ دولت کی [illegible]

[illegible]

سے ملا ہو سکت بڑی رشمی کپڑا زیادہ مقدار میں دوسرے ممالک کو پہونچنے لگا۔

پہاڑوں کو کاٹتی ایران سے چین کو ایک بہت پرانی سڑک جاتی ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ دنیا کی قدیم ترین سڑک ہے۔ شروع میں یہ ایک پگڈنڈی تھی پھر ہوتے ہوتے پرانی دنیا کے تجارتی قافلوں کا سب سے بڑا شاہراہ عام بن گیا۔ یہ سڑک مشرق قریب کو مشرق بعید سے ملاتی تھی۔ بحیرۂ روم کے ساحل پر بسنے والے چین اور ہندوستان کی دستکاریوں اور صنعتوں کے اشتیاق میں اسی راستے سے آتے جاتے تھے۔ ایرانی تاجر ریشم کے گٹھے خفیہ یا ظاہر طریقوں سے چین سے لے لے آتے تھے لیکن انہیں ریشم کے کیڑوں کا راز نہ معلوم ہو سکا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر دنیا کو زیر نگیں کرنے کے شوق میں جب ہندوستان تک پہونچا تو یہاں پہلے پہل اُس نے روئی کا درخت دیکھا۔ اسکے بعد سے اُس کی کاشت یونان میں شروع ہوئی۔ جب وہ ریشم کی صنعت گاہوں تک پہونچا تو ریشم کے گٹھے ہی خرید کر نہیں لایا بلکہ بہت سا کچا ریشم بھی فراہم کیا لیکن اُسے بھی معلوم ہو سکا کہ کچا ریشم پیدا کیسے ہوتا ہے۔ یہ چین کا وہ قدیم راز تھا جسے ہونیا الافاتح عالم بھی نہ جان سکا۔

ابتدائی عیسوی صدیوں میں روما کے محلوں میں لوگ ایرانی تاجروں سے خریدی ہوئی ریشمی پوشاکوں میں ملبوس پھرتے تھے۔ رومن ان کے دھاگوں کو کھول کر از سر نو اپنے مذاق کی وضع کے کپڑے بھی بن لیا کرتے تھے۔ لیکن یہ کپڑے انہیں بہت مہنگے پڑتے۔ حکومت روما کے دور میں ریشم کا استعمال صرف امرا تک محدود تھا۔ تیسری صدی عیسوی کے ایک رومن بادشاہ آرلین ([illegible]) نے اس کی گرانی کے سبب خود ریشم پہننا گوارہ نہ کیا اور نہ اپنی ملکہ کو اس کے استعمال کی اجازت دی۔ رومنوں کے بھاری لباس کے مقابلہ میں چونکہ ریشم بہت ہی ہلکا تھا اس لئے وہ اسے "بنی ہوئی ہوا" کہا کرتے تھے۔

آخر کار اس بھید کا طلسم چین ہی کی ایک شہزادی نے توڑا۔ ۱۲۰ء کے لگ بھگ اس شہزادی کی شادی ایک ہندوستانی حکمراں، جو ختن سے ہونے والی تھی، بادشاہ جانتا تھا کہ چین کی شہزادی ریشمی لباس زیب تن کرنے کی عادی ہوگی۔ لہذا اُس نے شہزادی کے پاس کہلا بھیجا کہ ہندوستان میں روئی کے کپڑے بنتے ہیں اُسے یہاں ریشم نہ مل سکے گا۔ شہزادی نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کچھ شہتوت کے بیج اور کچھ ریشم کے کیڑوں کے انڈے اپنے عروسی لباس میں چھپا لئے اور اپنا نیا گھر بسانے ختن کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس زمانے میں اس جرم کی سزا موت تھی، لیکن شہزادی کی یہ قانون شکنی لوگوں پر ظاہر نہ ہو سکی اور وہ بلا کسی مزاحمت کے چین کی سرحد پار کر گئی۔ ختن کی ملکہ بننے کے بعد اس نے ریشم کے کیڑے پالنے شروع کئے لیکن اس کے شوہر کے دربار میں جو چین کے ایلچی تھے ملکہ کی اس حرکت سے بہت برافروختہ ہوئے۔ ملکہ کے خلاف سرتابی کرنے کی مجال تو نہ تھی پھر بھی ملک کے اس راز کو محفوظ رکھنے کا انہوں نے تہیہ کر لیا۔ اور ایک دن ان سفیروں نے بادشاہ کو یہ پٹی پڑھائی کہ ملکہ اپنے باغ میں ایک خاص قسم کے کیڑے پال کر زہریلے سانپوں کو نوید دے رہی ہے۔ بادشاہ نے بے تامل وہ باغ نذر آتش کرا دیا اور اس طرح ریشم کے کیڑے جل کر خاکستر ہو گئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد یہ راز ہندوستانیوں کو معلوم ہو ہی گیا جب اس دستکاری کا بھید کھل گیا تو [illegible]ء میں چار چینی لڑکیوں کو جاپان بھیجا گیا تاکہ وہاں کے باشندوں کو بھی وہ ریشم کے کیڑے پالنے کے طریقے بتائیں۔ لیکن [illegible]ء تک مغربی دنیا کے سب سے بڑے شہر قسطنطنیہ میں بھی ریشم بنانے کا ہنر راز سربستہ ہی رہا۔ شہنشاہ جسٹینین اسی زمانے کا بہت بیدار مغز بادشاہ تھا اور اسے اپنے ملک کی تجارت کو فروغ دینے کی ہر وقت فکر رہتی تھی۔ سکندر اعظم کی طرح اسے بھی دوسرے ملکوں کی نئی چیزوں کی جستجو رہتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایران میں بسنے والے دو عیسائی درویش سلطنت چین میں مدت دراز تک رہنے کے بعد قسطنطنیہ آئے۔ ظاہر ہے کہ کسی ملک میں عرصہ تک رہنے سہنے سے وہاں کی بہتیری باتوں سے واقفیت ہو ہی جاتی ہے۔ ان درویشوں نے بادشاہ سے ریشم کے کیڑوں اور ریشم کی پیداوار کے متعلق سب حالات بیان کئے۔ جسٹینین نے ان سے وعدہ لیا کہ جب دوبارہ قسطنطنیہ آئیں تو ریشم کے کیڑوں کے کچھ انڈے اپنے ساتھ ضرور لائیں۔ کہا جاتا ہے کہ [illegible]ء میں یہ درویش اپنے عصا کے خول میں چھپا کر انڈے لاتے اور انہیں کی نگرانی میں کیڑے پیدا ہوئے، کیڑوں نے خول کاتے اور حسب دستور اس میں سوراخ کر کے تتلیاں اُڑ گئیں۔ الغرض بادشاہ نے اپنے محل کے اندر ریشم کی کاشت اور اس سے کپڑے بننے کا کام شروع کیا۔ جسٹینین نے بہت چاہا کہ ملک میں اسکے سوا دوسرا ریشم کی صنعت کا راز نہ جانے اسی غرض سے کسی کو اس کی کاشت کی اجازت نہ دی لیکن قسطنطنیہ چین نہ تھا۔ وہاں تو محل کے اندر بھی [illegible]

مغربی دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ریشم کی صنعت شروع ہو گئی۔ [illegible]

[illegible]

لعنت

ایکا ایکی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پیٹ میں کوئی پھڑپھڑا رہا ہے۔ اس کی طبیعت بے چین ہو گئی ۔۔۔ اس کی مصیبت کو زیادہ کرنے کے لئے ایک ور ہستی بے قرار تھی ۔۔۔ وہ، وہ گھبرا سی گئی۔

وہ بیٹھی ننھے ننھے کپڑے سی رہی تھی آنے والے مہمان کے لئے ۔۔۔ مہمان جس کے لئے گھر میں ان ننھے ننھے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس کی آمد اس کے لئے سوہانِ رُوح بن رہی تھی، ماں ہو کر بھی اُسے ہونے والے بچے سے نفرت تھی ۔۔۔ اس کی غربت میں اضافہ کرنے والا بچہ ۔۔۔ ہندوستان کے بدحالوں میں ایک اور کا اضافہ ۔۔۔

"ہر ایک بچہ اپنی قسمت ساتھ لیکر آتا ہے" یہ الفاظ اُسے کانوں میں گونجتے سنائی دیے، مگر ایسا ہوتا بھی ہے؟ اُسے یقین نہ آتا تھا ۔۔۔ وہ تو بچے کی پیدائش کو والدین کے لئے ایک لعنت سمجھتی تھی ۔۔۔ لعنت، ماں کا خون چوسنے والا، باپ کے منہ سے نوالہ چھیننے والا ۔۔۔ بچہ ۔۔۔ لعنت۔

وہ ان دنوں بہت زیادہ یاسیت کی طرف مائل تھی ۔۔۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی دنوں سے اس کا پیٹ ایکا ایکی پھڑپھڑانے لگتا ۔۔۔ گویا کوئی تڑپ رہا ہو ۔۔۔ اس کا زرد رنگ اور بھی زرد ہو جاتا ۔۔۔ وہ پہروں پیٹ تھامے بیٹھی رہتی ۔۔۔ گذر اوقات کے لئے وہ سلائی کا کام کیا کرتی تھی۔ اس نئی تکلیف کے باعث وہ کام بھی نہ کر سکی ۔۔۔ دایہ کی فیس، زچگی کی اور ضروریات کے لئے بھی روپے کی ضرورت تھی۔ مگر اس نے کام نہ کیا تو ۔۔۔ اس کا پیٹ اور پھڑپھڑانے لگا ۔۔۔ وہ ہلدی سے بھی زیادہ زرد ہو گئی۔

"تاجو! تمہیں آج کیا ہو رہا ہے" ناظم پاس بیٹھا ایک مثل پڑھ رہا تھا۔ اس نے گم سم بیوی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو کئی بار دیکھا تھا مگر اُسے دفتر کے کئی کیس مکمل کرنے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ تاجو سے اچھی طرح باتیں نہ کر سکا۔ لیکن تاجو کی حالت زیادہ دگرگوں ہوتے دیکھ کر وہ چونکا۔ اُسے تاجو کا پیٹ پھڑپھڑاتا دکھائی دے رہا تھا ۔۔۔ وہ اپنی حماقت پر شرمندہ ہو گیا۔

تاجو کی سہیلیاں بچے جننے کی بڑی خواہشمند تھیں ۔۔۔ انہوں نے جب بھی کسی کا حسین و جمیل، موٹا تازہ بچہ دیکھا، اُسے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور لگیں اُسے پیار کرنے ۔۔۔ کھیتی میں بیج اگر اچھا پڑے تو خوشے بھی اچھے لگتے ہیں ۔۔۔ ایک اچھا خوشہ دیکھ کر وہ بھی ایسے ہی بیج کی خواہشمند ہو جاتی تھیں ۔۔۔ عورت بھی تو ایک کھیتی ہے ۔۔۔ مگر اُسے بچے پیدا کرنے سے نفرت تھی، وہ جانتی تھی کہ کثرت اولاد ہی تباہی کا موجب بنتی ہے۔

اس کے ہاں جب پہلی لڑکی پیدا ہوئی تو وہ بالکل خوش نہ تھی حالانکہ اس کی سہیلیاں اُسے مبارکباد دینے آئی تھیں۔ "بالکل تمہاری شکل ہے" ایک نے کہا۔

"تم سے بڑھ کر ہو گی" دوسری بولی۔

مگر وہ خاموش رہی تھی ۔۔۔ وہ خاموش تھی، اُسے کوئی خوشی نہ تھی، ایک ماں اور پیدا ہو گئی تھی، بچے جننے کے لئے، غلاموں کی تعداد بڑھانے کیلئے ۔۔۔ مگر اسکی خاموشی کے معنی غلط لے گئے۔

"لڑکی یا لڑکا ۔۔۔ یہ خدا کی دین ہے بیٹا" تاجو کی ماں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ لڑکی یا لڑکا تاجو کے نزدیک بے معنی الفاظ تھے ۔۔۔ بات ایک ہی تھی، خدا کی لعنت کا اظہار لڑکی یا لڑکا ۔۔۔ انجیل کے الفاظ "خدا نے کہا میں تیرے درد حمل کو بہت بڑھاؤں گا تو درد کے ساتھ بچے جنے گی" زور زور سے اسکے کانوں میں گونجنے لگے۔

کمرے میں خاموشی تھی ۔۔۔ دیوار پر کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا ۔۔۔ ٹک ٹک ۔۔۔ مسلسل ٹک ٹک، بعض اوقات جب وہ اکیلی ہوتی تو وہ پہروں اُسے دیکھتی رہتی ۔۔۔ ایک مسلسل ٹک ٹک، یہ ٹک ٹک کبھی بند نہ ہو گی ۔۔۔ وہ اکثر سوچتی، عورت اور کلاک ۔۔۔ مسلسل بچے جننا اور مسلسل ٹک ٹک ٹک ٹک ۔۔۔ بچہ ۔۔۔ لعنت بن کر ماں باپ کی زندگی کو ختم کرتا ہے ۔۔۔ کلاک کی ٹک ٹک وقت کو کھا رہی ہے ۔۔۔ ٹک ٹک ۔۔۔ اس وقت اُسے یہ ٹک ٹک بری معلوم ہو رہی تھی ۔۔۔ بہت بُری معلوم ہو رہی تھی ۔۔۔ بہت بُری۔ اُس نے چاہا کہ وہ قینچی پھینک کر اُسے توڑ ڈالے ۔۔۔ مگر یہ کلاک اُسے جہیز میں ملا تھا ۔۔۔ ٹک، تاجو، تیری عمر کا ایک اور لمحہ کم ہو گیا۔ اسکے پیٹ میں پھر کوئی حرکت کر رہا تھا۔

اس خاموش فضا میں کلاک کی ٹک ٹک کے ساتھ [illegible]

تاجو کی بیٹی بیٹھی جیسے کہ اس لعنت کو پورا کر رہی ہے۔ جو شجر ممنوعہ کے پھل کھانے کی وجہ سے اس پر پڑی تھی ۔۔۔ تاجو بھی حوا کی بیٹی تھی ۔۔۔ وہ اس لعنت سے [illegible] کرتی تھی مگر [illegible] ملامت کی کتنا [illegible] اس کی کوئی

قلم کاغذ پر دوڑ رہا تھا ـــــ وہ میز پر بیٹھا سامنے مثلوں کا انبار لگائے تھا ـــ یہ کام اُسے مکمل کر کے صبح دفتر لے جانا تھا ـــ اس انبار کو اٹھا کر ــــ بدقسمت کلرک ـــ نجمہ اپنا دکھ بھول کر ناظم کی طرف دیکھنے لگی ـــــ ناظم ـــ نجمہ۔

نجمہ کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ناظم کی قسمت میں کلرک ہونا لکھا تھا۔ شادی سے پہلے وہ سنتی تھی کہ ناظم آئی سی ایس کے مقابلے کا امتحان دے رہا ہے۔ شادی کے بعد اس کے فائنینس کے مقابلہ کا امتحان دیا۔ پھر پی سی ایس اور پھر ـــ چالیس روپے کی کلرکی۔ وہ ایم۔ اے تھا۔ خوشرو، وجیہہ۔ ذہین، مگر یہ کچھ اس کے کام نہ آیا۔ وہ، وہ کچھ بھی نہ بن سکا نجمہ شادی سے پہلے میکے میں خواب دیکھا کرتی تھی ـــــ بنگلے، موٹر کاریں، دعوتیں، سیریں، ـــ اعلیٰ طبقے کے سارے لوازمات یکے بعد دیگرے ہر وقت اس کے سامنے رہتے ـــ وہ خیال ہی خیال میں تصوّر کے حسین پروں پر اڑا کرتی ـــ اس کی زندگی کس قدر مصروف ہوگی، آئی سی ایس کی بیوی ـــ پارٹیاں، کلب، سنیما۔ ملاقاتیں، سوشل کاموں میں حصہ ـــ وہ کتنی مصروف ہوجائے گی۔ مگر اس کے یہ حسین خواب مدھم پڑتے گئے ـــ آخر اُسے گھر ملا لیکن کرایہ کا ـــ اوسط درجے کا گھر کرایہ زیادہ ـــ باقی رقم میں دونوں کا گذارہ مشکل تھا، نجمہ کی کفایت شعاری کے باوجود مالی مشکلات دُور نہ ہوسکتی تھیں۔ ناظم نے ملازمت کے علاوہ دو ایک طلبا کی ٹیوشن لے رکھی تھی۔ دفتر کا کام اس قدر زیادہ کہ بے چارہ دن بھر کرتے کرتے تھک جاتا۔ کچھ گھر بھی لے آتا تھا ـــ وہ صبح سویرے چلا جاتا اور کہیں رات گئے واپس لوٹتا۔ نجمہ گھر کا سارا کام کاج کرتی، اس سے جو وقت بچ جاتا وہ ہمسایہ کے لوگوں کے کپڑے سی لیتی، اس طرح چار پانچ روپے کی اور آمد ہوجاتی۔

ناظم کا قلم برابر چل رہا تھا ـــ نجمہ قمیص سی رہی تھی اور ننھی بچی قدسیہ مٹی میں لت پت فرش پر سو رہی تھی۔ وہ تھک کر وہیں سوگئی تھی ـــ ماں میں اتنی سکت نہ تھی کہ اُسے اُٹھا کر چارپائی پر ڈال دیتی۔ باپ کام میں مصروف تھا ـــ قدسیہ کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل بھر آیا ـــ بدقسمت بچی ـــ اپنی ماں سے زیادہ بدنصیب۔ ماں کا بچپن تو خوشحالی میں گذرا تھا۔ مگر یہ پیدا ہی ہوئی غربت میں ـــ ایک لاش۔ بے جان اور سرد ـــ پچھلی گرمیوں میں ایک دن ایک تانگے والا گھوڑا تیزی سے دوڑاتے سڑک پر جا رہا تھا کہ اچانک گھوڑا گرا [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

سے جان گھوڑے پر پتھر مارے۔ وہ جلن سے یہ نقارہ دیکھ رہی تھی بھاگا جا رہا تھا۔ اس میں زندگی تھی۔ اس کی رتی کی کے سہارے تانگے پر سوار چلے جا رہے تھے۔ وہ بے جان ہوکر گرا ـــ اس کی ہوئی ـــ ان چار آدمیوں کا کام رکا نہیں ـــ ایک اور تانگہ آیا ہو گئے ـــ بچے آئے، ننھے اور خوبصورت بچے، بے جان لاش لے تماشہ تھی۔ وہ پتھر مارنے لگے۔ وہی چار ٹانگیں جنہیں بر کہا جاتا تھا اکڑ گئیں ـــ حسین بچے اور بدصورت لاش ـــ سارا منظر ڈراؤنا معلوم ہونے لگا تھا، بالکل ڈراؤنا ـــ پتھر اُس کی کھوپڑی پر لگے ـــ ایک آواز پیدا ہوئی ـــ بھدی سی پتھر زمین پر گر گیا ـــ ایک، دو، تین، چار ـــ پتھر چل رہے تھے گھوڑا خاموش تھا ـــ ان پتھروں سے بے پروا ـــ وہ مر چکا نے سوچا وہ بھی تو مُردہ ہے، جذبات کی موت، اس کی موت اس پر بھی برستے تھے مگر وہ بے حس تھی ـــ پتھر خود بخود گر جاتے بے حس ـــــ اس کی قدسیہ بھی تو اس وقت بے جان لاش تھی۔

ٹک ٹک بدستور جاری تھی۔ ناظم کا قلم کاغذ پر چل رہا کا سانس برابر جاری تھا اور نجمہ کے پیٹ میں بچہ پھڑپھڑا رہا سب زندہ تھے، وہ بھی زندہ تھی۔ اُسے زندہ رہنا تھا۔ کلاک بھی ٹک کئے جا رہا تھا ـــ یہ لعنت کب تک جاری رہیگی۔ حوا کی بیٹیاں کیوں یوں گرفتار ہیں۔ ہر عورت کا پیٹ پھڑپھڑاتا ہے۔ مگر وہ پر بھی خوش ہے۔ اس کی قدسیہ کمسن اور معصوم بچی بھی اس سے نہیں بچ سکتی ـــ آج شام کو ماں بیٹی بیٹھی تھیں کہ ان کا لڑکا اعظم آیا۔ وہ قدسیہ سے ایک آدھ برس بڑا ہوگا۔ وہ کھیلا کرتا تھا۔ وہ خوش خوش تھا۔ اس کے پاس ایک کھلونا تھا۔ قدسیہ کی طرف آیا۔

"سیّو! "اُس نے توتلی زبان میں کہا "یہ لو" اور قدسیہ چھوڑ کر اسکے ساتھ کھیلنے لگی ـــ بھولی قدسیہ۔

کلاک کی آواز بار بار اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ـــ وہ ابھی بچہ ہی تھی کہ وہ اس آواز سے مانوس ہوگئی ـــ گھر کا ڈرائنگ روم یاد آگیا ـــ ایک کمرہ [illegible] [illegible]

[illegible]

شبیہ ـــ اُسے اس سے کتنی محبت تھی، وہ بچپن میں اکٹھے رہے، اکٹھے کھیلے، وہ بھی اسکے لئے کھلونے لایا کرتا تھا۔ مگر ـــ

کلاک کی ٹک ٹک دنوں، ہفتوں اور سالوں میں تبدیل ہوتی گئی، وہ بڑھتی گئی اور تبسم سے تعلق کم ہوتی گئی اور آخر ـــ اُسے کمرہ گھومتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ زندگی گزر جاتی ہے اس کے مدہم نقوش رہ جاتے ہیں وہ انہیں نقوش میں سے قدسیہ کو دیکھ رہی تھی۔ مگر فرق کتنا تھا ـــ وہ ہمیشہ تتلی کی طرح سجی سجائی رہا کرتی تھی۔ بال سنوارے ہوئے بالوں میں سرخ ربن، جارجیٹ کا فراک۔ جانگیہ، دن میں کئی کئی بار منہ دھلانا۔ مگر قدسیہ، وہ تو مٹی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔ ننگے پاؤں، پریشان بال اور معمولی پاپلین کا فراک۔

ہمسایہ کا لڑکا بڑی دیر تک کھیلتا رہا۔ نجمہ کام میں مصروف تھی، تھوڑی دیر بعد اس کی ماں بھی آ گئی۔

"بہن قدسیہ اور اعظم ایک دوسرے سے کتنا پیار کرتے ہیں!" اس نے آتے ہی کہا اور وہ دونوں کو دیکھنے لگی۔

"جی ہاں! بڑا پیارا بچہ ہے اعظم"

"دیکھو نا! آج بازار گیا تو ضد کرنے لگا کہ کھلونے لے دو، اسکے ابا نے اسے کھلونے دے دئے۔ گھر آیا تو ان میں سے ایک کھلونا کار لیکر کہنے لگا۔ ماں! قدسیہ اور میں اس پر سیر کرینگے"

وہ بڑے مزے سے یہ کہانی بیان کر رہی تھی۔ اعظم کی ماں!

"اس کے ابا نے مجھے بھیجا ہے، میں دونوں کو دیکھنے آئی ہوں"

"ہاں بہن! دونوں ایک دوسرے سے بڑا پیار کرتے ہیں"

اعظم کی ماں پہر بھر بیٹھی ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اس نے اعظم کے لباس کیلئے کپڑے کا حساب پوچھا۔ آنے والے ماہ وہ بازار سے کپڑا منگوانے گی۔ وہ بڑی ہمدرد عورت تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ جا چکی تھی اور نجمہ پھر کھانا پکانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

وہ انہیں خیالات میں محو تھی کہ ناظم نے قدامت کے لئے قلم رکھ دیا اور بلند آواز سے "اوہ!" کہا۔

نجمہ چونکی۔

"میری بچی [illegible] رہی ہے" وہ ننھی سی قمیص کی طرف دیکھکر مسکرایا۔

"قدسیہ [illegible] کھیلتے کھیلتے سو گئی ہے"

[illegible] ہونٹوں پر [illegible] ـــ [illegible]

[illegible] ـــ [illegible] کی پیشانی پر

بوسہ دیا۔

بوسہ، نجمہ کو اپنے ماتھے پر وہی بوسہ محسوس ہوا ـــ ایک دن ناظم نے اُسے بھی اسی طرح اٹھایا تھا ـــ ایک شعلہ کی طرح اس کا بدن دہک رہا تھا۔ گرم اور سُرخ۔ اور پھر اس نے گرم گرم ہونٹوں پر ناظم کے گرم ہونٹ تھے۔

اس کا پیٹ ـــ ایک اور لعنت، غلاموں کی تعداد میں اضافہ، دُنیا کی مصیبتوں میں ایک اور مصیبت ـــ یہی اس کم بخت کی تقدیر میں لکھا تھا، اعظم نے آج کھیلتے ہوئے قدسیہ کا کرتہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا ـــ بہبہ حوا کی بیٹی، لعنت ـــ ٹک ٹک ـــ سارا کمرہ گھوم رہا تھا، اس کے پیٹ میں بچہ پھر تڑپ اٹھا ـــ

شیر محمد اختر

خندۂ مسرت

انگریز مصنف Max Eastman کی کتاب "ذوقِ تفنن" (Sense of Humour) ایک مستند اور مشہور کتاب ہے۔ فاضل مصنف نے مزاح کا نفسیاتی نقطۂ نظر سے گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس مضمون کو پہلی دفعہ سائنٹفک طریقے پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ باذوق حلقوں میں اس کتاب کو قدر و عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

میں ہر مہینے اس کتاب کے ایک ایک باب کا ترجمہ پیش کرتا رہوں گا۔

فلسفہ کے تقریباً ہر نئے نظام نے ہنسی کی ساحرانہ تشریح کرتے وقت اُسے ضمنی حیثیت دی ہے۔ تنقیدی مواد کا ایک جزو کل سے ہٹا لیا جاتا ہے ذہانت کی اُڑتی سی کلی کو گوارا کر لیا جاتا ہے اور چند پھُسپھُسے مذاق ٹھونس دیے جاتے ہیں جو بالکل بے لطف اور بے جان ہوتے ہیں اور پیش کرنے پر سرے سے مذاق معلوم ہی نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزاج میں ایک غیر فطری ترحم اور اُلجھن کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا صحیح ادراک سے بہت کم تعلق ہے۔ میرے نزدیک اس نظریہ میں نقص یہ ہے کہ ہم ہنسی کو تشریحِ انسانی کا ایک ضروری حصہ خیال کرنے کی بجائے اسے فروعی حیثیت دے دیتے ہیں۔

اس چھوٹی سی دماغی بستی میں جسے فلسفی کائنات کہتے ہیں شاید مذاق اور دوستانہ دل لگی کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس لئے ہنسی ان فلسفیوں کو ایک ادنیٰ اور خارجی مسئلہ معلوم ہوتا ہے اور اُن کی وسیع قیاس آرائیاں اُسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتیں مگر ایک معمولی آدمی کو جو اپنی کھڑکی میں سے روز مرہ زندگی کے بہاؤ کی طرف جھانکتا ہے اور اس کا رُخ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اُسے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں رہتا ہے جو اس کے لئے ایک مسکراہٹ کا سامان پیدا کر سکے۔

وہ تشریحات جو ہنسی کو دوسرے کارناموں کی محض ایک ضمنی پیداوار قرار دیتی ہیں اور اسے ایک تکان کی واردات، ایک طغیانی یا تماس کی حالت بتاتی ہیں۔ انسان کے اس امتیازی جوہر سے جو اُسے دوسرے حیوانوں سے ذرا زیادہ دلآویز بنا دیتا ہے۔ بہت بے انصافی برتتی ہیں۔

تقریر کے بعد ہنسی سب سے بڑی طاقت ہے جو سماج کو فلک بخشتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی غول پسند جبلت کا لاینفک حصہ ہے۔ تنہائی میں وہ شخص بے چین ہی نہیں ہوتا بلکہ بجنسہٖ سے [illegible] کی خواہش جس کے دل میں ہو وہ بے شک ظاہر کر [illegible]

اپنی فطرت کا ہیم استعمال کرنا چاہتا ہے۔ مسکراہٹ ایک خوش آمدید۔ اور ہمدردی، اور ہنسی ایک خیر مقدم ہے کسی آنے والے دوست کا! جہاں نوازی اور خوشی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ گویا یہ کہتا ہے: "میں آپ کا ہمنوا ہوں۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی!" یہ مسکراہٹ پگڈنڈی ہے جس پر دو وجود ملتے ہیں اور نہ مسکرانا گویا ملاقات کی اعلان کرنا ہے۔

شاید کوئی مکانکی واردات یہ بیان کر سکے کہ یہ جبلت [illegible] کی ان خوبصورت شکنوں، اور دلنواز لہکوں میں کیوں رہتی ہے اور طرزِ عمل سے کیوں ظاہر نہیں ہوتی۔ کتے اس جبلت کا اظہار اپنی دُم [illegible] ہیں اور یہ صحیح ہے کہ ہم بھی اسے اپنے کانوں کی مدد سے زیادہ [illegible] طریقے پر ادا کر سکتے ہیں۔ کتے اپنی عقبی گرمجوشی اور تپاک ظاہر کرنے کے لئے بُری طرح دُہرے ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم اُن کی بے زبانی [illegible] رکھیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ انسان کی ہنسی میں بھی ایک سماجی [illegible] مضمر ہے۔

ہنسی کے ارتقا میں ایک فیصلہ کن اثر شاید یہ بھی تھا کہ ایسے روشن اسلوبِ بیان کی ضرورت محسوس ہوئی جو آسانی [illegible] بصارت میں گھُل مل سکے۔ مسکراہٹ شخصیت کی بڑی بڑی خو [illegible] متحرک نچوڑ ہے۔ یہ چہرے کے خطوط کی اتنی مکمل اور نازک تصو [illegible] کہ چہرے کے ملاح کے ہلکے سے ہلکے حملہ کا سراغ لگانے کے [illegible] ڈاکٹر ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں تو مسکراہٹ ہی سے [illegible] میں مدد لیتے ہیں۔

معمولی مسکراہٹ میں اگر سانس، آواز اور اشارے کا [illegible] کر دیا جائے تو یہ قہقہہ بن جاتا ہے۔ دراصل یہ دو مختلف چیزیں [illegible] سے ایک ہی ہیں۔ وہ حقیقت [illegible] کوشش کی ہے [illegible]

یہ مسرت جس طرح لطیف اور پیچیدہ ہے اسی طرح واحد اور مسلسل بھی ہے۔ یہ مسکراہٹ سماجی مسرت کا اظہار ہے اور ایک ایسی خداداد نعمت ہے جس کے بغیر ہماری زندگی اپنی موجودہ حالت کا ایک ڈھانچہ بن کے رہ جاتی۔

چارلس فوریر میں یہ مسرت اس قدر غالب تھی کہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ سماجی انجذاب کا قانون علم سیاسیات میں وہی منصب ادا کر سکتا ہے جو علم طبیعات میں کشش ثقل کا قانون۔ اس کے احساس کی اس فراوانی کا شاید یہ ردِ عمل تھا کہ چارلس فوریر خود کبھی نہیں ہنسا۔ اپنے افعال پر اس قسم کا غیر ضروری دباؤ ڈالنے ہی سے اکثر جذبات تیز ہو جاتے ہیں اور میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو آنکھوں کے ذریعے سے ہلکے طور پر مسکراتے ہیں اُن کی دوستی پر ہمیں پورا اعتماد ہو جاتا ہے اور وہ لوگ جو غیر مخلص قہقہہ لگاتے ہیں انہیں ہم عیش کا ساتھی سمجھتے ہیں، غم کا رفیق نہیں جانتے۔

یونان اور روم کے سب مشہور معلم اخلاق اور ہندی عالموں کی یہ رائے ہے کہ فرمائشی قہقہہ عقل و ہمت کی دلیل نہیں۔ لیکن میرے خیال میں صحت مند رُوح کی پکی نشانی یہ ہے کہ آدمی کے تمام چہرے پر دوستانہ بشاشت اُس کے گلے میں اتر جائے اور بے روک ٹوک اُس کے جسم کے ہر رگ اور پٹھے میں دوڑ جائے۔

مجھے وہ مسکراہٹ دلکش معلوم ہوتی ہے جو دفعتاً پیدا ہو۔ پہلے پہلے اُوپر کا ہونٹ شدت سے جنبش کرتا ہے اور کچھ اس طرح کھل جاتا ہے کہ تمام دانت چمکنے لگتے ہیں اور مُنہ پہلے سے ذرا زیادہ گلابی ہو جاتا ہے۔ گالوں میں خم پیدا ہوتا ہے۔ آنکھیں چمک اُٹھتی ہیں اور بھوؤں اور پلکوں کو نہایت ہی خفیف طور پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ نیک فطرت اور طیب خاطر کے لچکدار تابندہ خطوط اُن کی چمک دمک کو اور بھی چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ایسی زندہ جنبشیں شراب، پھول یا بادل کے رنگوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ یہ اسی روشنی کا منبع ہیں جس میں انسان اپنی تاریک منزل تک پہنچنے کیلئے بیتاب اور بے باک کوشش کر رہا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر واضح بات فلسفیوں کے صرفِ نظر کیوں ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہنسی اور حقارت کی ہنسی میں صحیح تمیز نہیں کی، حالانکہ ان دونوں کا مزاج متضاد ہے اور اُن کی اعصابی بناوٹ بھی مختلف ہے۔ یہ بات اس سے ظاہر ہے کہ ہم ہنستے وقت چہرے کے دونوں طرف استعمال کرتے ہیں مگر حقارت سے مسکرانے کے لئے ہم اکثر ایک ہی طرف استعمال کر سکتے ہیں۔ ککر دنیا ([illegible]) کو ظاہر کر کے چھوٹے چھوٹے سانس لینا یا ہا ہا کی آواز پیدا کرنا ہنسی سے (انسانی دور) ہے بلکہ یہ ایک کتے کے دانت اس کی دُم سے دُور ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم معتبر حیاتیاتی اور حسیاتی وجوہ کی بنا پر آغاز ہی سے ہنسی کے موضوع سے حقارت کی بحث خارج کرتے ہیں۔

صرف حقارت آمیز ہنسی ہی نہیں بلکہ اس کی کج خلق اولاد مثلاً تمسخر، آوازہ کسنا، تضحیک، لولو ہو ہو۔ ملامت۔ تعریض، کلبی اور معنوی چھان بین بھی اس بحث سے خارج ہیں۔

لفظ sarcasm کا اصل مطلب کتوں کی طرح گوشت چیرنا پھاڑنا ہے۔ اور یہ ہونٹوں کا نہیں بلکہ دانتوں کا فعل ہے۔ مزاح کے کلبی نظریہ کا نام بھی کتے سے نکلا ہے۔ حتیٰ کہ لفظ sardonic [illegible] جس کا مادہ یونانی لفظ [illegible] ہے جو ابتدا میں جانوروں کے متعلق استعمال کیا جاتا تھا اور ہماری زبان میں اس کا مطلب "اپنے دانت دکھاؤ" ہے۔ بیشک یہ ممکن ہے کہ ان الفاظ میں جن احساسات کا اظہار ہے آدمی کی مختلف حالتوں کی طرح ہنسی میں مل کر جذبات کی نئی لذتیں پیدا کرتے ہوں مگر ان میں سے کوئی بھی ہنسی کی رُوح اور تخلیق میں شامل نہیں ہے کیونکہ ہنسی کا عمل ایراد نہیں قبول ہے، یہ زحمت نہیں مسرت ہے، تضحیک نہیں فرحت ہے۔ چالیس روزہ بچے کو ہی دیکھئے! حقیقت میں یہی اس کا جنم دن ہے کہ اس دن اس کا ایک ساتھی پیدا ہوتا ہے۔

ابتدائی خوش آمدید کی پہلی کارگر مسکراہٹ جو سماجی رابطے کے لئے ناگزیر ہے۔ ہر نوع کی ہنسی اور مسکراہٹ کی تخلیق اسی سے ہوتی ہے۔ اگر ہمیں اس بات کا صحیح احساس ہو کہ سماجی جذبہ اور جبلت ہمارے شعوری وجود میں کس طرح داخل ہو کر اس پر چھا جاتے ہیں تو ہم اندازہ لگا سکیں گے کہ اس پہلی مسکراہٹ سے بعد میں کیا کیا فائدے اُٹھائے جاتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ انسانی فطرت متذکرہ صدر جذبات کا مرکب ہے۔ ہمارے معجزاتی وجود کی تخلیق صرف اُسی حالت میں ہو سکتی تھی اگر اس کا واسطہ دوسروں سے بھی پڑتا۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر یہ وجود خلوت میں بھی اپنا سماجی پہلو قائم رکھے۔ مثال کے طور پر کوئی خیال آنے پر آپ ہی آپ ہنس دے۔ یونہی کھسیانہ ہو کر مسکرا دے یا بادِ نسیم کی آمد اور گل کی چٹک پر باغ باغ ہو جائے۔

وہ لوگ جو آداب مجلس کے کسی دقیانوسی معیار کے خواب پریشاں میں مبتلا ہیں ان تمام رس پھلوں کو ہنسی خوشی سے قبول نہیں کریں گے جو شدید انتظار کے دوران میں یا نہایت غیر متوقع طور پر ہماری جھولی میں آگریں۔ لیکن نسیم ایجابی خوشی کے وقت میزبان جو دور تک نہ ہو مسکراہٹ پیدا کرتا ہے۔ غمگین آدمی کے رونے کی بہ نسبت خوش

آدمی زیادہ ہنستا ہے اور نسبتاً کم التہاب پر۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہنسی جماعتی وسائلِ دولت کے نظم و نسق میں قدرتی ارتقا کی وجہ سے "سماجی خوشی" کا ذریعہ ترسیل ہونے کی بجائے خوشی کی "سماجی ترسیل" کا ذریعہ بن گیا ہے اور ہمارے نظامِ عصبی میں عام طور پر خوشی اور تسکین کا مترادف بن گیا ہے۔

ہنسی کامیابی اور زندگی کی دلیل ہے۔ صرف شاعروں کے گیتوں ہی میں نہیں ـــــ بلکہ مذہبی رسوم میں بھی اسے ایسا ہی مانا گیا ہے۔ ہنسی کو معبدوں سے صرف ہمارے مذہب زدہ زمانے میں ہی دیس نکالا ملا ہے اور صرف آنسوؤں ہی کو دیوتاؤں تک پہونچنے کے لئے مناسب ذریعہ قرار دیا گیا۔

رومن تہوار [illegible] کے دوران میں دو نوجوان قربانگاہ پر خون آلودہ خنجر سے چھوئے جاتے تھے اور جب دودھ میں بھیگی ہوئی مٹی بھر اون سے ان کی پیشانی کا خون صاف کیا جاتا تو رواج کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ ہنسیں۔ یہ ہنسی دنیا میں اُن کی نجات کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

تمام پرانے اور سیدھے سادے مذہبوں میں جو ہمارے مذہب کی طرح موت اور غمی سے زیادہ وابستہ ہیں اور جن کے پیروکار اپنے دیوتاؤں کی حقیقت میں واقعی یقین رکھتے تھے۔ ان تمام مذاہب میں ہنسی نے اپنا منصب ادا کیا ہے۔

نہ صرف انسان ہی دنیا کی برکتوں کیلئے دعا مانگتے وقت دیوتا کے سامنے ہنستے تھے بلکہ خود کروڑوں دیوتا جو غیر فانی زندگی کے مظہر ہیں بہم ملکر لازوال قہقہے لگاتے تھے۔

ان باتوں کے بعد یہ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفیوں نے آنسوؤں، آہوں اور ماتمے کی ملال انگیز غمگین شکنوں کو تو بامعنی مان لیا ہے مگر ہنسی کو اس طرح ٹال دیا ہے جیسے کہ وہ قدرت کی کوئی غلطی یا قابلِ مواخذہ جرم ہے۔

میں ہنسی کے مسئلہ کو ٹالنے کی کوشش نہیں کرونگا بلکہ اس کو انسانی جوہر کا سب سے ضروری حصہ سمجھتے ہوئے اور اگر دنیا میں کوئی ہنسی خندہ آور چیز نہ ہوتی تو بھی اس کا وجود مانتے ہوئے یہ بیان کروں گا کہ یہ اپنے اصلی حلقۂ اثر سے باہر جاکر کس طرح مذاق کی تنقید اور قدر شناسی میں کام آنے لگی۔

فضل اقبال

زرد چراغ

گل کرو، پھینک دو پہلے ہی کو یہ زرد چراغ
آج بھی عیش کے لمحات فسردہ کیوں ہوں

ملگجی شمع کے پرتو میں جوانی کا خمار
خود بخود اک نئے احساس سے تھرا جائے
مجھکو منظور نہیں، میری مسرت کی بہار
ایک مغموم تصور ہی سے گھبرا جائے

جگمگاتے ہوئے ریشم کا پرانا ملبوس
جسمِ افسردہ کی زردی کو چھپا ہی لے گا
رات کے وقت بہرحال یہ نیلا فانوس
تم سمجھتی ہو کہ خلوت کو سجا ہی لے گا

کل یہی ساز یہی گیت یہی جامِ شراب
جھلملاتی ہوئی دیوار پہ تھراتے تھے
رات یہ شمع۔ یہ تارے۔ یہ سنہرا مہتاب
خلوتِ عیش میں کچھ سرد ہوئے جاتے تھے

دھندلے دھندلے سے ابھی ریشمیں پردوں کے ادھر
حسنِ غربت کے نظارے بھی یہاں کیوں دیکھوں
جنکے چہروں سے مجھے اپنے گناہ آئیں نظر
ایسے وہ چاند ستارے بھی یہاں کیوں دیکھوں

ہاں ہٹا دو مری نظروں سے یہ بجھ رہے زرد چراغ
میرے گاتے ہوئے جذبات فسردہ کیوں ہوں

چند نظمیں

ایک چیخ

میں نے کل رات ایک چیخ سنی — درد سے کروٹیں بدلتی ہوئی
اک گلی سے بگولا بن کے اُڑی — شہر کی وسعتوں پہ پھیل گئی
خامشی کا طلسم ٹوٹ گیا — اور فضاؤں کو رعشہ چھوٹ گیا
میں جونہی پھینک کر قلم لپکا — چیخنی کھولنے ہی والا تھا
کہ مری انگلیاں اکڑسی گئیں — اور کہیں میری آنکھیں گڑسی گئیں
دفعتاً اس گلی کے کونے سے — میں نے دو چار قہقہے سُنے
قہقہوں کی ردا میں لپٹی ہوئی
چند سکّوں کی کھنکھناہٹ تھی

التماس

ہے میرے دل میں بھی شوقِ منزل مگر کوئی راہ بھی دکھائے — یہ کیا کہ دل ہیں دھڑکتا جائے مگر کبھی سامنے نہ آئے
اگر میں اب پاؤں توڑ بیٹھا ہوں، اسمیں میرا قصور کیا ہا — اگر وہ مجھکو سہارا دیدے تو اُسکی رحمت سے دُور کیا ہے
بجا کہ مایوس ہو چکا ہوں، بجا کہ نومید ہو چکا ہوں — مگر یہ کس نے کہا کہ میں داغِ عشق سینے کو دھو چکا ہوں
تو اپنے اک بندۂ حزیں کو سہارا دینا گوارا کرلے — وگرنہ تو اذن دے کہ یہ دامنِ طلب پارا پارا کرلے
بس اتنا کہدے: "ندیم! وہ سامنے کھڑا ہے حریم میرا!"
تو تیری مسکن میں، قسم تیری۔ مرمٹے گا قلبِ دو نیم میرا!

عمل کی باتیں

ختم کر دوست۔ ابد اور ازل کی باتیں — آج تو پھولوں کے کیوں کرتا ہے کل کی باتیں
داستاں کوئی اس اُجڑی ہوئی دُنیا کی سُنا — اور پھر شوق سے کر شمس و زحل کی باتیں
شاداب سدرہ و طوبیٰ سے ہے یارانہ ترا — بھول بیٹھا ہے گلاب اور سمن کی باتیں
کیا زمانے کے نئے بُت نہیں دیکھے تُو نے — کہ سُناتا ہے مجھے لات و ہبل کی باتیں
چلہ کش رہنے میں اک کیف سا ملتا ہے ضرور — کام آئیں گی مگر اب تو عمل کی باتیں
دُعا لتا رہتا ہوں میں شعلوں میں اشعار اپنے
تجھکو کس طرح سُناؤں میں غزل کی باتیں

احمد ندیم قاسمی

چھیلا میاں

انسانی کاریگری یہ سمجھی گئی ہے کہ اس کا ہاتھ سدھا ہوا ہو۔ ایسا سدھا ہوا کہ اگر لوہار ہے تو جہاں ہتوڑے کی پہلی چوٹ پڑی وہیں اور چوٹیں بھی پڑیں۔ بڑھئی ہے اور پلنگ کے پلنے بناتا ہے تو چاروں ایک ڈھال کے ہوں۔ یعنی جتنے پرزے وہ بناتے ان میں دیکھنے والے کو فرق نظر نہ آئے۔ لیکن اللہ میاں کا کمال اس میں ہے کہ انسان ہوں یا حیوان سب اپنی شان میں الگ۔ مجال ہے کہ ایک کی صورت دوسرے سے مل جائے۔ انگوٹھے کے نشان ہی دیکھ لو ہر آدمی کے جدا ہیں۔ صورت تو صورت سیرت میں بھی سب کی اختلاف ہے۔ جیسی وضع وضع کی شکلیں ویسی ہی طرح طرح کے خیالات اور سب اپنی اپنی دھن میں پکے۔ اپنے اپنے حال میں مگن۔

چھیلا میاں کو تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ ان کے انتقال کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ یہ تو شاید جس سے پوچھو گے وہ بتا نہیں سکے گا کہ ان کا اصلی نام کیا تھا۔ کہاں پیدا ہوئے؟ لڑکپن کیسا گزرا؟ جوانی میں کیا کرتے رہے اور دلی میں کب آئے؟ لیکن آدمی تھے عجب مزے دار، مرنجان ومرنج۔ بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان۔ ہمیشہ سدا سہاگن بنے رہتے۔ رنڈیوں میں ان کی بڑی آؤ بھگت تھی۔ سنا ہے شہر کی اکثر گانے والیاں مرید بھی ہوگئی تھیں۔ کیا تعجب ہے؟ یہ عقیدے کی بڑی پکی ہوتی ہیں۔ پھر چھیلا میاں کسی کو دکھ دیتا نہیں۔ کیا مقدور کسی کے ہاں پان تک کھالیں۔ تعلق بس اتنا ہی رکھتے کہ گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے ہر ایک کے ہاں الگ تھلگ بیٹھے باتیں سنا کرتے۔ کوئی صلاح کی بات ہوتی تو آہستہ سے کہہ دیتے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

ہاں ایک چیز تھی جس پر مدتوں لوگوں کی چہ میگوئیاں رہیں اور کسی پر بھید نہیں کھلا کہ آیا یہ رنڈیوں کے خفیہ ایجنٹ ہیں یا کوئی بیماری ہے کہ جہاں گانے بجانے کا جلسہ ہو تا حضرت سب سے پہلے موجود۔ اور اس طرح جیسے انہی کے ہاں جلسہ ہے۔ نک سے شک تک سارا انتظام، کوئی کہے نہ کہے اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ سلیقے کے بھاری پھر کم، درویش وضع آدمی تھے۔ لوگوں کو کیا برا تھا۔ مفت کا انتظام کرنے والا ملتا۔ ہر ایک کو قرینے سے بٹھاتے۔ گانے والیوں کی الگ خاطر۔ شوقینوں کا جدا خیال۔ وقت کی چیزیں گواتے۔ کسی کو بے کیف ہونے کا موقع نہ ملتا۔ پھر کفایت شعار ایسے کہ جس تقریب کا سو روپے تخمینہ ہوتا یہ پچھتر میں جلسہ کی رونق دوبالا کر دیتے۔ طوائفوں کو چون وچرا کرنا حرام تھا۔ جسے جو کچھ مٹھی بند کرکے دے دیا، سوسو کرکے لے گئی۔ نہ سازندوں کے نخرے اٹھانے پڑتے نہ نائکہ بھویں چڑھاتیں۔

رفتہ رفتہ چھیلا میاں کی یہ شہرت عام ہوگئی اور اب لوگ نہیں دے کر بلانے لگے۔ جو لوگ جلسوں سے بھاگتے تھے کہ کون رنڈیوں کے پیچھے میں پڑے۔ نقصان مایہ کے ساتھ اگر محفل میں بدمزگی پیدا ہوجائے تو میں شماتتِ ہمسایہ بھی اٹھائے۔ وہ بھی مجروں کے لئے تیار ہوگئے۔ میاں کو بلایا اور کہہ دیا کہ اتنی رقم میں جلسہ ہونا چاہیئے۔ میاں کی مراد بر آئی کمر باندھی اور مستعد۔ آپ ہی طائفے انتخاب کرتے، محفل جماتے اور اس رقم میں سے بھی کچھ نہ کچھ بچا دیتے۔ بعض بعض موقعوں پر تو بعد میں معلوم ہوا کہ صاحب خانہ کی رقم جوں کی توں رہی اور جلسہ ہوگیا۔ اگر کو حیرت تھی کہ آخر ان کو اس قدر ناچ گانے سے دلچسپی کیوں ہے؟ درد مول لیں اور نفع بظاہر کوئی نہیں۔

ہماری ٹولی کی چھیلا میاں سے بہت پرانی یاد اللہ تھی۔ جس میں ہم جاتے خوب آؤ بھگت کرتے۔ کبھی ویسے بھی کسی کوٹھے پر نکل اور وہاں یہ حضرت ہوئے تو ہلدی لگی نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا، ہم میں ایک دو ایسے بھی تھے جو ہر وقت اس ٹوہ میں رہتے کہ چھیلا کو یہ آپ کو سوختِ غیر کو لذت کی کیا بیماری ہے؟ مفت خدا واسطے کے لئے اپنی جان کو عذاب میں مبتلا کرنا کہاں کی خیرخواہی ہے پھر خدا اور رسول کے خلاف۔ قومی وملکی مفاد کی صریحاً مخالفت۔ تو ان عیش پرستیوں اور فضولیات سے بھاگنا چاہتی ہے۔ لیڈروں کی کوششیں ہیں کہ سماج ایسی لعنتوں سے پاک ہو۔ برعکس اس کے چھیلا میاں گانے مجرے اور حسن پرستیوں پر فدا ہیں۔ اور جتنا ان سے ہو سکے قدمے، سخنے، درمے برابر ترغیب دئے جا رہے ہیں۔ اور لطف قوم کے نوجوانوں میں ان کا اثر زیادہ ہے۔ حالانکہ ان احمقوں سے قوم کو بچانا چاہیئے۔

واقعہ بھی یہ تھا کہ ہر جلسہ میں بڈھے اور عیاشوں کے

متبانوں کی نسبت نوجوانوں اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں کی مدارات زیادہ کرتے اور طرح طرح سے ان کے دل لبھانے کی کوشش کرتے۔ میری ان سے اکثر ملاقات ہوتی اور جب وہ ملتے میں ضرور ٹٹولتا، لیکن وہ بڑے گہرے تھے۔ ملنگانہ انداز میں ہنس کر ٹال جاتے۔ درویش صورت آدمی سے زیادہ اصرار بھی مناسب نہیں۔ ممکن ہے کوئی اہلِ خدمت ہوں۔ اللہ کی طرف سے ان کی یہی ڈیوٹی ہو۔ دوسرے انہیں کسی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ کبھی کسی کے پان کے ٹکڑے کا شرمندۂ احسان ہوتے نہیں دیکھا۔ جب کہیں مل گئے اپنا ہی کچھ کھلا پلا دیا۔ پانوں کی ڈبیا ہر وقت عمدہ مہاراج پوری پانوں سے بھری ہوئی رومال میں بندھی رہتی۔ جلسوں میں بھی ناممکن تھا کہ صاحبِ خانہ کی کسی چیز کو ہاتھ تو لگا لیں۔ ساری ساری رات بھوکے پیاسے بیٹھے رہتے اور کیا مجال کہ وہاں کا پانی تو پئیں۔

چند روز ہوئے ہمارے دوستوں میں ایک صاحب ولایت سے بیرسٹر ہو کر آئے۔ یاروں نے جلسہ مانگا۔ دولت مند ماں باپ کے بیٹے تھے۔ جلسہ دینے میں کیا عذر تھا۔ جلسہ ہوا مگر کیسا جلسہ؟ نئی قسم کا۔ رنڈیوں کے بدلے انگریزی بھان متی بلائے گئے۔ مسمریزم کے کھیل ہوئے اور آخر میں دوستوں کے اصرار سے قوالوں کی ایک چوکی نے تھوڑی دیر دھیر دھپڑ کر لی۔ کسی کو مزہ آیا یا نہیں آیا۔ جلسہ ہو گیا۔ ہماری پارٹی بھی شریک تھی اور ہمارا خیال تھا کہ چھیلا میاں بھی ضرور آئیں گے۔ اس لئے کہ شہر کا کوئی تفریحی جلسہ ایسا نہ ہوتا جہاں وہ نہ جاتے۔ بلانے نہ بلانے سے انہیں بحث نہ تھی۔ یہ دیکھ کر ہمیں تعجب ہوا کہ چھیلا میاں ندارد ہیں۔ کم از کم وہ اس جدید قسم کے جلسہ کا رنگ تو دیکھنے آتے۔ انتظام میں ان کا دخل نہ سہی۔ کوئی انجانے تو نہ تھے کہ کوئی انہیں ٹوکتا۔

دوسرے دن صبح کو میں خدا جانے کس کام کو جا رہا تھا کہ سامنے سے چھیلا میاں دکھائی دیے۔ میں نے لپک کر ان کا راستہ روکا اور چھوٹتے ہی پوچھا "حضرت رات کو رفیق صاحب کے ہاں آپ کو نہیں دیکھا۔"

روکھی پھیکی صورت بنا کر کہنے لگے "بس میاں اب ہمارے ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ بج چکی جتنی بجنی تھی۔ جس قوم کے ہونہار اپنی زندگی کی شیرینیوں کو اپنے ہاتھ سے کھاری سمندر میں دھکیلنے لگیں وہ ترقی کر چکی۔"

میں حیران کہ یہ کہتے کیا ہیں۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان۔ کہاں ترقی و تنزل کا کیا ذکر۔ ان کی شکل دیکھنے لگا۔

بولے "میری طرف کیا دیکھتے ہو۔ جھوٹ نہیں کہتا سچ کہتا ہوں، جیتا رہا تو دکھا دوں گا کہ یہ ساری نئی تانتی دھوبی کے کتے بن کر رہ جائیگی گھر کے نہ گھاٹ کے۔"

میں۔ میں پوچھتا ہوں کھیت کی آپ کہتے ہیں کھلیان کی۔

چھیلا۔ کھیت کے کھلیان ہونے میں کچھ دیر نہیں رہی۔ بنیادیں پڑ گئی ہیں۔

میں۔ اجی میں یہ پوچھتا ہوں کہ رات کے جلسے میں آپ نہیں آئے۔

چھیلا۔ میں بہرا نہیں۔ اسی کا جواب دے رہا ہوں۔

میں۔ میاں! آپ تو آج کچھ اکھڑی اکھڑی سی باتیں کر رہے ہیں۔

چھیلا۔ (ٹھنڈا سانس لیکر) برخوردار تم کیا جانو کل سے میرے دل پر کیا گذر رہی ہے!

میں۔ (چھیلا میاں کا منہ دیکھ کر) کیا ہوا؟ کوئی خلاف مرضی سانحہ پیش آیا؟

چھیلا۔ ارے میاں میں کیا اور میری مرضی کیا۔

میں۔ پھر؟

چھیلا۔ میاں رات کو جو تمہارے دوست کے ہاں جلسہ ہوا ہے اس نے میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہماری قوم کسی طرح روحانی یا مادی ترقی نہیں کر سکے گی۔ تم ہی ایمان سے کہو حواسوں کے بغیر انسان کی زندگی، زندگی ہوتی ہے۔

میں۔ ہرگز نہیں! مگر.....

چھیلا۔ اگر مگر سے مجھے نفرت ہے۔ میری سنو!

میں۔ فرمائیے؟

چھیلا۔ اور حواس کا چاق چوبند ہونا زندہ رہنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

میں۔ بیشک۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے!

چھیلا۔ پھر حواس کے چاق چوبند رہنے کا ذریعہ؟ بولو۔ چپ کیوں ہو گئے؟

میں۔ آپ ہی بتائیے؟

چھیلا۔ ان کی غذا پہونچانا۔

میں۔ ان کی غذا کیا ہے؟

چھیلا۔ جاؤ بھی! حواس کی غذا نہیں جانتے؟ اچھا حواس کے ہیں؟

میں۔ پانچ!

چھیلا۔ کیا کیا؟

میں۔ باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ

چھیلا۔ باصرہ کی غذا کیا ہے؟ اچھی صورتوں کو دیکھنا! سامعہ کو قوت پہونچانے کے لئے ضروری ہے کہ اچھے نغمے سُنے جائیں۔ شامّہ محبت، کے پھولوں کی بوسونگھ کر جیتی ہے۔ ذائقہ عمدہ عمدہ مزیدار غذاؤں سے برقرار رہتا ہے اور جب تک ایسی چیزیں نہ چھوئی جائیں جن سے دل میں گدگدی ہو، لامسہ کو مُردہ سمجھو۔

میں۔ (بات کاٹ کر) اچھا آپ رات والے جلسے کے شاکی ہیں۔

چھیلا۔ لاحول ولاقوۃ۔ مجھے شکایت سے کیا واسطہ؟ مگر یاد رکھو کہ اب ہندوستان کوئی ترقی نہیں کرسکتا۔ حواس کی غذاؤں سے چشم پوشی کرکے حواسوں میں رہنا، یعنی چہ؟ اور جب آدمی بدحواس ہوگیا تو کس مصرف کا رہا۔ صاحبزادے یہ لوگ اپنی غلامی سے نکل کر دوسروں کے غلام بن رہے ہیں۔ ہندوستانی قسم کے جلسوں میں ایک ایک حس تک الگ الگ غذا پہونچنے کے علاوہ اپنی دولت بھی کہیں باہر نہیں جاتی۔ رنڈیاں کماتی ہیں رنڈوے کھاتے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے خدا جانے چھیلا میاں کو کیا بات یاد آئی کہ یکایک بخیر صاحب سلامت کئے روانہ باش۔ میں دو چار منٹ تک تو اُن کو جاتے دیکھتا رہا۔ پھر دل میں سوچنے لگا کہ چھیلا میاں کو ہم تو یونہی اوٹ پٹانگ ایک رنڈیوں کا پیر سمجھتے تھے لیکن یہ حضرت تو بہت دور نکلے۔ ان کا دماغ بھی انقلاب پسند ہے۔ سچ ہے۔ انقلابی ہونے کے لئے کسی خاص جوڑے اور رنگ کی ضرورت نہیں۔ کوئی چولا کوئی رنگ ہو اور کوئی نظریہ، صرف دھن کا پکا اور ہاتھ کا سچا ہونا چاہیئے۔

اشرف صبوحی!

پہلی رات کا چاند

دُور تک سطحِ زمیں پر ہے فلک چھایا ہوا
جیسے محکوموں کے دل میں اپنے حاکم کا خیال
ننھے بادل آسماں کے منہ پہ ہیں پھوڑوں کے داغ
جن کی کثرت میں لرزتی ہے درخشندہ لکیر
جیسے کانپے عیش اِن کے حلقۂ آغوش میں
بھوکی پیاسی پتلی دبلی ایک دوشیزہ کا جسم
رات کی دھندلاہٹوں میں جگمگاتی ہے
آڑی ترچھی ٹیڑھی بینگی اور خم کھائی
یعنی میرے خستہ و مجروح سینے کی خ
کھود کر گہرا جسے کرتا ہے رنجِ روز
جس سے اکثر رِستا رہتا ہے درخشن
مسکراتی ہے لکیر اور پھیلتا جاتا ہے نُور
میں اک انساں ایسے ہی جیسے اک انساں کا غلام
دہر کی آلائشِ مکروہ میں لتھڑا ہوا
ڈھونڈتا ہوں روشنی، رخشندگی تابندگی
یہ لکیر۔ اک تنگ اور چھوٹی گلی اک
گال پر ٹپکے ہوئے آنسو کی اک باریک
جا رہی ہے نور میں لپٹی ہوئی، بھیگی
ایک نامعلوم، پُراسرار منزل کی طرف
اور ادھر سایوں میں لپٹا۔ کر رہا ہوں
اس میں وہ محبوبہ جس کو آج تک دیکھا

مخمور جالندھری

ولی کے پہلے کی دکھنی شاعری

دکھنی شاعری کی ابتدا ۸۰۰ھ میں ہوئی ہے۔ ابتدائی نظم کے نمونے اسی زمانے کے ملتے ہیں۔ اور ۹۰۰ھ سے لیکر ۱۱۰۰ھ تک دکھنی شاعری کے معراج کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد دکن کے بہت بڑے حصّہ میں دکھنی کے بجائے شمالی ہند کی زبان یا بالفاظِ دیگر اُردو مروّج ہونے لگی۔ ولی کا زمانہ ۱۱۰۰ھ کا ہے۔ بقول بعض ۱۱۱۹ھ اور بعض کے خیال کے مطابق ۱۱۴۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس موقع پر ہم صرف ولی کے زمانہ تک کی غزلوں کی صراحت کریں گے۔

دکھنی شاعری کا بڑا ذخیرہ مثنوی کی صورت ہی میں ملتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنی ایک کتاب میں جو دکھنی مثنویوں کے عنوان سے مرتب کی گئی ہے تقریبًا دو سو طویل مثنویوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایسی مختصر مثنویاں جو پچیس تیس شعر یا اس سے کم و زیادہ کی ہیں جن کو ہم نے متروک کر دیا ہے۔ اگر ان کو شامل کر لیا جائے تو پھر ان کی تعداد تین چار سو تک پہونچ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف غزلوں کی جانب دکھنی شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے۔ جو ذخیرہ اب تک ہمدست ہوا ہے اس میں سلطان محمد قلی، عبداللہ قطب شاہ، اور سلطان علی عادل شاہ کے سوا دوسرے ایسے خوش نصیب یک نصیب دو چار شعرا ہی ہیں جن کا نام غزل نگاری کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہو۔ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم کو اپنے لئے زیادہ مفید اور سودمند تصوّر کیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ غزل معشوق کے راز و نیاز اور اس کے کرشمہ اور انداز کا بیان اور معشوق سے گفتگو کا نام ہے۔ اس لئے دکنی شعرا میں اُنہوں نے ہی ایسی خیال آفرینی کی ہو جن کو یہ باتیں میسّر تھیں۔ جن کی نظروں میں ہر وقت شاہد و ساقی رہا کرتے تھے۔ جن کا ماحول ہی بتانِ طناز کی جلوہ گری تھا۔ جن کے آٹھوں پہر ہوشان سیمیں تن کی صحبت میں مے گلگوں کے جاموں میں بسر ہوتا تھا۔ چنانچہ جن شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے یعنی سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور۔ ان کی زندگی جس طرح معشوقوں اور محبوبوں میں بسر ہوتی تھی وہ تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے سوا اگرچہ غواصی، شوقی، نصرتی، ہاشمی وغیرہ کی غزلیں ملتی ہیں لیکن انکی تعداد کم ہے۔

غزلوں کے متعلق مزید صراحت کے پہلے اس وقت کے تمدن اور معاشرت پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ اُسوقت کی معاشرت کا ایک خاکہ پیش نظر ہو جائے۔

سلطان محمد قلی اپنے بچپن سے ایک عاشق مزاج اور رند مشرب شاہزادہ تھا۔ جس کی ابتدائی زندگی سے لیکر مرنے تک معشوقوں میں بسر ہوئی۔ سلطانی محل میں ہر ایک ملک اور ہر مذہب کی عورتیں جمع تھیں۔ اگر ان میں دکن اور گجرات کی نازک بدن اور گل اندام رانیوں کی فراوانی تھی تو وہیں ایران اور ترکستان کی گل رخسار اور گل رخ حرموں کا بھی جمگھٹا تھا۔ ہر وقت عیش و نشاط کی محفل گرم رہا کرتی، موسیقی کی دلکش نغمہ نوازی دماغ کو مسرور کرتی قلب کو سرور پہونچاتی۔ مے ناب کے دور مدہوش کرتے تھے۔ بقول ڈاکٹر زور: "اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں خوبی حسن و نغمہ کی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں اور کئی مذہبوں اور ہر وضع قطع کی نازنین آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی آرائش و زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور رجانی و رعنائی کے بے پناہ جذبات کا مظاہرہ کرتی رہتی تھیں"۔

اسی طرح اس کے نواسہ سلطان عبداللہ کا دورِ حکومت بھی اس کی یاد تازہ کرتا تھا۔ جب بادشاہ اس قسم کے شاہد و ساقی پسند ہوں تو ظاہر ہے کہ ملک کی کیا حالت ہوگی۔ چنانچہ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں گولکنڈہ میں بیس ہزار سے زیادہ طوائفیں آباد تھیں۔ اور ہر سال ہندوستان کے مختلف شہروں سے جن میں گجرات، بنگال، دہلی، آگرہ، لاہور حتیٰ کہ کابل بھی شامل تھا۔ طوائفیں گولکنڈہ میں آتی اور یہا بس جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی کوئی تقریب خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی بغیر طوائف کے انجام نہیں پاتی تھی۔ عیش و عشرت، رقص و سرود کی محفلیں عام طور سے ہوتی تھیں۔ ہر شخص نغمہ و طرب کا دلدادہ تھا۔ گولکنڈہ کی فضا ہی نغمہ نواز ہوگئی تھی۔

اور دوسری طرف بیجاپور میں بھی ابراہیم اور علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں یہی حالت تھی۔ بزم عیش و طرب گرم رہا کرتی۔ موسیقی اور نغمہ

کے جلسے ہوتے ساقیان مہ وش و نازنینانِ گلبدن اور زاہد فریب رانیاں زینت محفل ہو کر صحبت کو گرماتی۔ ان ماہ جبینوں کی جلوہ آرائی۔ معطر لباسوں اور نیم برہنہ جسموں اور قیمتی جواہرات کی ضیا پاشی سے محفل کا سماں دو بالا ہوجاتا۔ اور ساغر کے دور سے گلگوں کے سرور سے طبیعتا مسرور و مدہوش رہا کرتی تھیں۔

اس وقت کی عام معاشرت میں سادگی، بلند مشربی، عالی دماغی کا وجود نابود ہونے لگا تھا۔ تمدن اور رسمی شائستگی میں پیچیدگی او بیجا نے جگہ لے لی تھی۔ عالیشان عمارات کی زیبائش اور آراستگی میں سونے کو پانی کی طرح بہایا جارہا تھا۔ جنت نظیر باغوں، فردوس منظر گلز اور رشک ارم خیابانوں کی چمن بندی اور گلشن آرائی میں بے دریغ روپیہ صرف ہو رہا تھا۔ یہ تھی وہ فضا، یہ تھا وہ ماحول، جبکہ گولکنڈ بیجاپور میں دکھنی شاعری کا بول بالا تھا۔

اس کے ساتھ دکھنی شعرا کے لئے جو نمونہ پیش نظر تھا وہ حافظ و سعدی۔ کلیم و خسرو اور حسن کی غزلیں تھیں۔ اسی کو ماڈل قرار دیکر دکھ نے اپنی غزلیں لکھیں۔

فارسی شاعری یا فارسی غزل کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا اس میں یا تو عشقیہ مضامین ہیں یا پھر ان کو تصوف کی جانب منسوب کر عشق حقیقی کا رنگ دیا جاسکتا ہے۔ فلسفہ یا اخلاق یا اور کوئی موضوع غزلوں کی پامال زمین میں نہیں مل سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس نمونہ کو آگے جو غزل سرائی ہوئی ہوگی تو اس میں بھی سوا ان ہی موضوع کے اور کوئی موضوع تلاش کرنا عبث اور بے سود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعر علمبردار اور ناخدا قدیم شاعری اور اس کے موضوع پر حرف زنی کرتے اور اردو شاعری کو موضوع کے لحاظ سے تہی مایہ قرار دیتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں ولی اور میر سے لیکر حالی تک جو غزل نگاری ہوتی رہی ہے وہ حقیقت سے دور اور اصلیہ کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ لیکن اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ دکنی غزلیں حقیقت پرداز تھیں اور دکنی شعرا غزلوں میں بھی حقیقت نگاری کر تو بیجا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس امر کی صراحت کردی گئی ہے کہ زیادہ تر سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور نے غزل سرائی کی ہے اور ان کے ایوانوں میں خوبی اور رعنائی کے مجسم پیکروں کی کمی نہیں تھی۔ رخساروں کی گلگونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آنکھوں پہر لطف اندوز کا پورا سامان مہیا تھا۔ اس لئے اگر انہوں نے معشوق کی تعریف اور توصیف کی ہے تو گویا انہوں نے اصلیت کو پیش نظر رکھ کر واقعہ کیا ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جن دوسرے شعرا نے غزلیں لکھی ہیں ان کے متعلق بھی کہا ہے کہ ان کے لئے معشوقوں کی کمی نہیں تھی۔ فرضی معشوق تلاش کرنے اور اس کے عشق میں سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ گولکنڈہ اور بیجاپور حسینان جہاں کے مرکز بن گئے تھے۔ ان لوگوں کی غزلوں میں زمانہ مابعد کی غزلوں کی طرح مبالغہ آمیزی کی بہت نہیں ہے۔

اب ہم سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کے غزلوں کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں تین سو سے زیادہ غزلیں ہیں۔ اس کی بہت ساری غزلوں میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے اور اس نے جگہ جگہ اس امر کا اقرار کیا ہے کہ وہ اپنے حقیقی کو چھپا نہیں سکتا، جب منصور جیسا عاشق بھی اس کو چھپا نہ سکا تو اس کی کیا مجال جو اس کو چھپا سکے، اور اقرار کرتا ہے کہ مجھے کی ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن دیکھنے والوں کے لئے دنیا تیرے ہی حسن کا ایک عکس ہے۔ اس دنیا کو حکما اور فیلسوف اپنے علم و فضل و دانش کے زور سے نہیں سمجھ سکے۔ اسلئے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنیکے بجائے پیا کے نام کا ترانہ عیش گانا بہتر ہے۔

سلطان نے اپنی کئی غزلوں میں خواجہ حافظ کے غزلوں کی ترجمانی کردی ہے۔ حافظ کی پوری کی پوری غزل سلطان نے اپنی ز میں کامیابی سے منتقل کردی ہے۔

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ سلطان کی زندگی عیش و عشرت سے معمور تھی اور اسی کی بدولت اس کی شاعری پروان چڑھی۔ سلطان کی غزلیں حسن کی جھلی اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اس نے اپنی غزلوں میں اپنی محبوبوں اور پیاریوں کے حسن رنگینی، انداز معشوقی، راز و نیاز محبوبی دل نوازیاں، غمزہ بازی و کرشمہ سازی کے ایسے ایسے فوٹو کھینچے ہیں کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ اس کی تشبیہیں اور استعارے لا ہیں اس کی غزلیں حسن و عشق کی شیریں اور پُر لطف داستان ہی نہیں ہیں بلکہ اس نے وصال کے پُرکیف و سرور مرقع ایسے عریاں

میں پیش کئے ہیں کہ کسی مصور کو بھی ایسی عریاں فوٹو پیش کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ راز و نیاز کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو سلطان کے جولانیٔ قلم سے چھوٹ گیا ہو۔ حسن اور شباب کی رنگا رنگ رنگینیوں اور جذبات کی جولانیوں کے اظہار میں اس سے بڑھ کر شاید ہی کسی شاعر نے اظہار خیال کیا ہو۔

اس کے ساتھ ہی ایک عمدہ غزل کے جو لوازم قرار دئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سادگی شیرینی اور حلاوت، رنگینی وغیرہ، یہ سب کچھ اسکے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

سلطان محمد قلی کے بعد عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ کا نام آتا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا کا پورا جانشین تھا۔ اسی طرح اس نے عیش و عشرت میں اپنی زندگی بسر کی۔ لیکن اس کے کلام میں وہ خوبی اور رنگینی اور حلاوت اور شیرینی نہیں پائی جاتی جو اس کے نانا سلطان قلی کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ سلطان عبداللہ کا ایک مختصر دیوان موجود ہے۔ اس میں بجز غزلوں کے کوئی اور صنف سخن نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شاعری کے کسی اور صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اسکے کلام میں جیسا کہ لکھا گیا ہے، اگرچہ وہ خوبی اور نزاکت نہیں پائی جاتی جو محمد قلی کے کلام میں پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس نے بھی اپنے ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ اور اپنا ہی حال دل سنایا ہے۔ اور آپ بیتی واقعہ کو شعر کی صورت دی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے ساتھ سلطان علی عادل شاہ کا تذکرہ بحیثیت غزل نگاری کے ضروری ہے۔ اگرچہ اس کے دیوان میں صرف ۱۸ غزلیں موجود ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ شاہی کی غزلیں بھی حقیقت نگاری کا مرقع ہیں۔ رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی میں شاہی بہت کامیابی سے اپنے تخیل کو کام میں لایا ہے۔

معشوق کی وہی زلف سیاہ، رخسار گلگوں اور چشم فتاں کی تعریف ہے۔ اس کی ترچھی نگاہ سے عاشق کا دل گھائل ہوتا اور تیر نظر کو اس کا دل و جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا۔ معشوق کی جدائی کا صدمہ اس سے سہا نہیں جاتا۔ زمانہ فراق میں رات کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو چین نصیب ہوتا ہے۔ کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہوتا۔ اس کے آنسو نکلتے ہیں۔ جدائی میں ایک ایک پل ایک ایک سال معلوم ہوتا ہے۔ وہ موم کی طرح پگھل جاتا ہے یہ اور اسی قسم کے خیالات ہیں لیکن ان کو نئی نئی تشبیہوں اور تمثیلوں سے پیش کیا گیا ہے۔

سلاطین گولکنڈہ کے بعد اس دور کے دوسرے شعرا جن کی غزلیں دستیاب ہوئی ہیں دو چار ہی ہیں۔ اگرچہ اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ دوسرے شعرا نے بھی صنف غزل میں خیال آفرینی کی ہے لیکن وہ سب اب ناپید ہیں۔ جن دو چار شعرا کی غزلیں ملتی ہیں ان کی تعداد بھی کمتر ہے۔ ان کے غزلوں میں بھی وہی سب کچھ ہے جو ایک اچھی غزل میں ہونا چاہتے۔ زمانہ مابعد کے شاعروں اور ان میں جو ایک فرق ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ مابعد میں فرضی معشوق کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف ہونے لگی۔ اس کی کمر بال سے باریک بننے لگی اور منہ نقطہ سے کمتر بننے لگا۔ بہر حال ایک ایسا معشوق پیدا ہونے لگا جس کا وجود نابود تھا۔ لیکن دکنی شعرا کا معشوق فرضی نہیں ہوتا تھا اور وہ اس قسم کی مبالغہ آمیز تعریف نہیں کرتے تھے۔

اگر ولی کے پہلے کی ضخیم مثنویوں کی تعداد بیان کی جائے تو بلا مبالغہ سینکڑوں تک پہونچ سکتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر جملہ شاعروں کی غزلوں کو جمع کیا جائے تو ان کا مجموعہ زیادہ ضخیم نہیں ہو سکتا۔ ان میں بڑا حصہ سلاطین کی غزلوں کا بھی ہوگا۔

یہ موقع تھا کہ بعض غزلیں بھی پیش کی جاتیں مگر ایک تو طوالت مضمون اور دوسرے دکنی زبان ہونے کے لحاظ سے اس وقت ان سے زیادہ لطف بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ولی کے پہلے کی دکنی غزلیں حقیقت بردار ہوتی تھیں۔ جو کچھ اس میں بیان کیا جاتا تھا وہ سب کچھ اصلیت ہوتی تھی اب یہ اور بات ہے اس سے کوئی فائدہ تھا یا نہیں؟ اس میں شک نہیں کہ وہ بھی اردو ادب کی خدمت تھی اور دکنی شعرا نے اس فرض کو اپنی حد تک اچھی طرح انجام دیا ہے۔ ان کا کام موجودہ اور آنے والی نسل کے لئے شرمندہ کرنے والا نہیں بلکہ فخر کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی

دو بنگالی نظمیں

ازلی بیباک

ہمدم! سنو میں خدا کا سہارا حاصل کرکے ہمیشہ کے لئے نڈر انسان بن گیا ہوں!

اور جیسے ہی اُس کے بحرِ کرم کا قطرہ مل گیا گویا اُسے کونین کی دولت مل گئی۔ وہ نڈر بن گیا۔ خوف کی آنکھیں اندھی ہوگئیں۔ ہمدم! اُس۔ صراطِ مستقیم میں کوئی بندھن نہیں، کوئی رکاوٹیں نہیں۔ اور جتنے بندھن ہیں اُنہیں پاش پاش کرنے کے لئے خود وحدہٗ لاشریک انسانوں۔ دلوں میں بے پناہ بجلی موجوں کی طرح بہتا رہتا ہے۔ اس کی بھیانک تباہ کن شمشیر ہمیشہ بلند ہوکر ناچتی رہتی ہے۔

آؤ، آج میں اُنہیں اپنی یوم پیدائش کی کہانی سُناتا ہوں جنہیں مجھ پر اعتماد نہیں، جو مجھے کافر و ملعون جیسے القاب سے مخاطب کرتے ——— ہمدم! ہمدم!! آہ! سنو! جب میں نے پہلی مرتبہ دُنیا میں آنکھیں کھولیں ——— زبردست آندھی نے اپنی تمام تر چیرہ دستیوں کے ساتھ میر خیر مقدم کیا! گھر کی چھت طوفان کا لقمہ بن گئی اور دروازے تھپیڑے کا مقابلہ نہ کرنے کے بعد چور چور ہوگئے۔ گویا میری آمد کے ساتھ صورِ اسرافیل نے اپنی بند زبان کا تکمہ کھول دیا تھا اور ہر طرف تباہی و بربادی کے مناظر نمایاں ہوگئے تھے ——— مگر! میرے کانوں میں فوراً "اللہ اکبر" کی میٹھی آواز پہونچی آئی اور پہلی بار آنسوؤں کے ساتھ میرے حلق سے چیخ نکلنے لگی ——— اس مقدس آواز کا پیچ و تاب، اس کی برق آسا کڑک میری نبض سما گئی اور ذی روح وغیرِ ذی رُوح مخلوق میرے اِرد گرد جمع ہوگئی!

یوم پیدائش کا وہی خوفناک طوفان مجھے کتنی معلوم اور غیر معلوم راہوں میں پھینکتا رہتا ہے اس کا کوئی شمار نہیں۔ پہاڑوں، جنگلوں سمندروں اور ریگستانوں کی آغوش میں کھیلتا رہا۔ بھیانک پہاڑیاں اور گھاٹیاں میری آرامگاہ بنیں۔ اُف! نہ جانے کتنی دفعہ میں نے یوم پیدائش کی وہ اذان سُنی ہے ——— اور اس اذان نے مجھے کہاں کہاں نہیں پہونچایا! میں نے ان راہوں میں تکالیف و مصائب کی برچھیوں انی کو دل میں پیوست کیا ہے، خون کے آنسو رویا ہوں، بھوک کی شدت برداشت کی ہے ——— لیکن ان تمام ستم رانیوں کے باوجود میں نے اس کی "رحمت" حاصل کرلی۔ اس کی بارشِ کرم میرے ساتھ ہے!

میں نے نڈر اور باغی انسان بن کر تمام بندھنوں کے ساتھ جنگ کی ہے کیونکہ یوم پیدائش ہی سے میں سپاہی بن کر آیا ہوں۔ یہی میری حقیقت ہے۔ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ دُنیا کی کوئی رکاوٹ، کوئی بندھن مجھے اپنی "راہ پیشقدمی" سے منحرف نہ کرسکے ——— لیکن نہیں معلوم میرے اس خواب کس کی آواز نے چور چور کر ڈالا! عقب سے کس نے مجھے آواز دی۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ جو مجھے عقب سے پکارتا ہے میں کان بند کر ہوں۔ کبھی گھوم کر نہیں دیکھتا۔ میرا اصول کمزور نہیں ہے ——— یہ کس کی آواز محبت ہے جو مجھے کھینچے لئے جارہی ہے؟ یہ کون ہے جس نے میر قدم میں بجلی کی سی سرعت پیدا کر دی ہے؟ یہ کون ہے جو مجھ سے بار بار کہتا ہے: "اے نادان! یہ وہ راہ نہیں ہے چل ابھی اور آگے چل!"

میرے دماغ میں بغاوت کی جتنی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں ——— ہمدم! اس کا "سہارا" پاکر سرد ہوگئیں۔ میرے دل کے اندر قسم کی ویرانی سی برس رہی ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کسی محبوب ترین چیز نے جدائی اختیار کرلی ہے۔ نہ جانے جدائی کا یہ دُکھ کیوں دل کے گوشہ میں جاگ اُٹھتا ہے ———!

وہ کون ہے؟ اللہ! خالقِ ارض و سما! میرا ان داتا!

وہ کون ہے؟ میری تلاش کا حاصل! مسرتوں کا خزانہ!

کیا میں وہی ہوں؟ کیا میں وہی ہوں؟

میں نے اس کے ساتھ پیمانِ محبت اُستوار کیا ہے ——— آہ! وہ کتنا اچھا ہے ———! کبھی تو مجھے گہری اور بھیانک تاریک گھاٹیوں میں پھینک دیتا ہے اور کبھی اپنی مقدس نور کی لہروں میں بہادیتا ہے!

میں شہابِ ثاقب اور کرۂ نور کی طرح آزاد ہوکر بھاگا جارہا تھا ——— جاتے جاتے میں نے کتنی بھول کی۔ خدا [illegible]

چھوٹتے ہوئے دیکھا لیکن گھٹاٹوپ خطائیں کر گذرا — آج یہ سب نمایاں تاریک گناہ میرے حافظے سے ہمیشہ کے لئے خاک آلود ہو گئے ہیں!
گذشتہ باتوں کو کیوں یاد کروں؟ کیونکہ میرے ان ناپاک گناہوں نے مقدس راہ میں گندگی نہیں پھیلائی — میری کشتی کا رتھ ابھی حسب سابق مضبوط اور نئی راہوں میں بڑھا چلا جا رہا ہے! ہمدم! جانتے ہو جس ندی کی بیکل موجیں سمندر کی پیاس سے نہیں مر سکتی ہیں — ایسے صاف و شفاف پانی کو کوئی غلاظت ناپاک کیسے کر سکتی ہے —!

میرا لخت جگر موت کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو گیا، آنکھیں اشک غم سے بھیگ گئیں — آہ! اُس اکلوتے بچے کا سوگ! وہ چند فانی لمحوں کے لئے سنہرے آسمان سے حنا کی خوشبو لیکر آیا تھا! میں اپنے اس بچے کا غم بھلا نہ سکا اور میرا غیر مطمئن دل دکھ کی بانسری کی لہروں میں ڈوب گیا — دوستوں نے میری اس بیکلی کو دیکھکر کہا: "شفقت پدری ہے یا ہیجان بھر؟"

آہ! یہ کیسا راز ہے کہ جو تصویریں میری آنکھوں سے گذرتی ہیں وہ تا دم زیست واپس نہیں آتیں — کیا وہی میری زندگی کا ساتھی ہے جو مجھ سے بچھڑ جاتا ہے؟ — میری رُوح روز ازل سے چیخ چیخکر کہتی ہے "بہت دیر ہو گئی پیارے! کیونکہ کامیابی کے ساتھ نگاہ کرم کا رشتہ بھی ختم ہو گیا!"

پھر میں نے محبت کی راہ میں گامزن ہو کر پیش قدمی شروع کی — مگر یہ کون ہے جو مجھے پیچھے گھسیٹنے لگا —؟ کون؟ — ملعون شیطان! جہالت کی تاریکی!

میں نہیں جانتا کون ہے؟ اور کون جان سکتا ہے!
ظلم و ستم کی یہ بھیانک شمشیریں، آلام و مصائب کے گھنگھور بادل اور شر و فساد کی سیاہی آلود شکلیں — اس طرح رقص زمین پر جا رہی ہیں جیسے دیوالی کی روشن مشعلوں کو دیکھکر پتنگے ایک جگہ سمٹ آتے ہیں! میں ان خوفناک مناظر سے خوف نہیں کھاتا کیونکہ میں ازلی سپاہی ہوں۔ میں دُنیا کے کسی بندھن کو نہیں مانتا۔ میں صرف اُسی کی پوجا کرتا ہوں وہی جو تمام قوتوں سے برتر و اعلیٰ ہے۔ کیا پھر جہنم کا قیدی شیطان! مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ سکتا ہے —؟

یکایک میں نے اپنی نگاہوں کے سامنے آسمان کی پہنائیوں میں لامحدود سیاہ نیلے لباس میں ملبوس عظیم الشان خوبصورت قوس قزح کو دیکھا — میں نے اس کی طرف تیر کا نشانہ کیا — لیکن شیطان قوس قزح کا دامن پکڑ کر مجھے گھسیٹتے ہوئے اندھیری گھاٹیوں میں لے گیا۔
میں نے دیکھا خالق ارض و سما کی تیز شمشیریں فضا میں ناچنے لگیں اور تباہی و بربادی کا بھیانک طوفان پھر نمودار ہوا ہے۔ میں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگا کر قوس قزح کے سینے میں تیروں کی بارش کر دی اور شیطان کے ناپاک سر میں ٹھوکریں ماریں۔ میں نے دیکھا جیسے وہ اللہ کے عرش کو چھو آیا ہے!

آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا — یہ کیا! یہ تو میرا پروردگار ہے۔ میری خوشی و مسرت ہے! شیطان کہاں؟ یہ تو خوشی کے رس کا گھنگھور شہد ہے! وہی غیر معمولی شہد کا شیریں چشمہ شانتی کی راگنیاں بکھیرتے ہوئے بہتا رہتا ہے — وہ امرت، وہ شیریں اور مدھر شہد اس کے لئے مخصوص ہے جو اُس کی حقیقت کا شناسا ہو!

میں اللہ کا سپاہی ہوں، مجھے کسی بندھن کا خوف نہیں — اُس کی تیز برق آسا تلوار تمام بندھنوں کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے!
طوفان میرے روز پیدائش کا ساتھی ہے۔ میں دنیا میں مجروح آیا ہوں — "جہاد، جہاد" — بغاوت میرا نغمہ ہے۔ میری بانسری کی یہی لے ہے! دُنیا کی خستہ اور مرجھائی ہوئی کلیوں اور خس و خاشاک کے سر پہ بلندی کا تاج رکھکر بڑھا جا رہا ہوں!
دُنیا کا کوئی آسمان، کوئی شہاب ثاقب، کوئی پردہ، کوئی زنجیر اور کوئی قید خانہ مجھے اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ میں آزاد ہوں، بیباک ہوں، سر بلند ہوں!!!
شب و روز یہی مجھے ان داتا اپنی رحمت میں کھینچ کرتے جاتا ہے ———— میں اُسی فاتح سے ڈرتا ہوں، اسی کے سامنے سر عبودیت خم کرتا ہوں ————!!"

صدائے غیب

اے خدائے لایزل! کب تک تیرا فردوس بریں گندے انسانوں سے کثیف رہے گا؟
اس سرزمین پر گناہ و معصیت کا دیو مسلط ہے!
کب تک بربریت شکوک اور بھوت پریت کا بول بالا رہے گا؟
ظالم کی دل شکن ضربیں کمزور انسانوں کی زندگیاں مٹا رہی ہیں ــــــ ان کی حریص زبانیں خون چوس چوس کر بڑھتی جا رہی ہیں۔
اے پالن ہار! تیری راہِ حقیقت! انسانوں کے خوف سے کانپ رہی ہے ــــــ اور روحِ شکست کی کمزوری سے خودکشی کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہے ــــ آج "انسانیت" خواب نوشیں میں کروٹیں لے رہی ہے اور "بزدلی" آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہے ــــ دیکھ رہی ہے ہماری پتھریلی زندگی میں سوراخ کر رہی ہے۔ مفلسی اور تنگدستی کے پر نکل آتے ہیں۔ اور ہمارے کمزور منصوبوں نے چمگادڑ کے شکستہ مکان میں اقامت کے ڈیرے باندھے ہیں۔ امید کی قندیل دل کے اندھیرے گوشے میں مردہ ہے ــــ اے ہماری حیات و موت کے مالک! ٹمٹماتی ہوئی شمع کو زندگی عطا کر، اُسے حقیقی روشنی سے ہمکنار کر!!

ہاں! ہمیں روشنی دکھا! تاکہ ہماری نا اُمیدی کے سیاہ اور خوفناک بادل چھٹ جائیں۔ خوف کی آنکھیں اندھی ہو جائیں اور ہر جگہ چراغِ امید جگمگا اٹھے!

مولا! کب تک سچائی کا دامن خالی رہے گا؟ کب تک خواہش مند دلوں میں "صبر" کی زنجیر لٹکتی رہے گی ــــ اے کنگالوں کے ہمدم! اے مفلسوں کے ساتھی! وہ کب تک ظلم کی سنگین ضربیں برداشت کرتے رہیں ــــ ان کی زبان سے تو آہ بھی نہیں نکلتی۔ وہ تیرے ہی نام کا ہر وقت مالا جپتے ہیں۔ اَن داتا! ان کی آنکھیں تیری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ وہ تجھ سے مدد طلب کر رہے ہیں۔ مدد ہاں مدد!! وہ نہیں چاہتے کہ تو انکی عبادت اور دعا کی قیمت دے! پالن ہار! انہیں صرف تیرا سہارا چاہیئے۔ صرف تیرا اے خالقِ ارض و سما!!

میں نے سنا ہے تو ظالم کا انیس نہیں۔ ستم پرور کا دوست نہیں۔ تو مظلوم کا مددگار ہے۔ جا اور اس کے دروازے پر بیٹھ جا! بیٹھ جا دیکھ اب اس نے اپنے ہاتھوں سے گھر کا دروازہ کھول دیا ہے۔

تاریکی کی عمیق گھاٹیوں میں مظلوم کی روحیں سسک کر رہ گئی ہیں۔ وہ جو چند بچے نکلے ہیں اُن پر اے بارالٰہا! رحم کے پھول نچھاور کر دے! مجرم! کے قصور سے آنکھیں پھیر لے۔

دیکھ! دیکھ!! اے رحیم! کمزوروں کے جسم کانپ رہے ہیں، انہیں سہارا دے! ظالم کی آنکھیں قہقہہ لگا رہی ہیں۔ ان کی کشتیٔ حیات بحرِ فنا میں غرق کر دے۔ اور اندھے اور گونگے جو راستہ بھول گئے ہیں انہیں اپنا راستہ دکھا۔ نہیں نہیں بلکہ تو اپنا مستحکم رتھ بھیج تاکہ ہم اس میں سوار ہو کر جائیں اور اپنے جگر کے گھاؤ دکھائیں جو رِس چکے ہیں، کچھ رِس رہے ہیں۔

مغرب میں تیرا قہر، تیرا عذاب اور تیری بلائیں ہوائیں مل کر سانس لے رہی ہیں ــــ لیکن مشرق میں تیری سزائیں کیوں خاموش ہیں؟ تو یہاں کے بحرِ حیات میں بھی طوفان کی ہولناکیاں کیوں نہیں بھیج دیتا ہے ــــ اے دانائے راز! کیا ہم تیری مخلوق نہیں؟ کیا ہمیں تو وجود میں نہیں لایا؟ جو بلائیں اور طوفان قیامت تو نے مغرب کے گوشہ گوشہ میں بھیجا ہے ــــ کیا وہی موت کی خوفناک آندھی مشرق میں بھیجنے سے تجھے خوف معلوم ہوتا ہے؟ ہم تو تیرے ہی سہارے اور تیرے ہی آسرے پر جی رہے ہیں۔ سانس کی ہر رفتار میں ایک امید نظر آتی ہے اور وہ ہے تیری مدد کی اُمید! اَن داتا! ظالم کی سفاکیاں اب بھیانک تاریکیوں میں لپٹ کر بھیانک بن گئی ہیں ــــ تو ہمیں یقین دلا اور کہہ دے کہ اب ظلم و ستم کی آندھیاں بند ہو جائیں گی ــــ اس "یقین" کے اندر ہمیں دائمی سکون، ابدی مسرت اور لازوال محبت نظر آئے گی۔ کوئی پروا نہیں ہمارے جسم گل سڑ جائیں مگر تیرے در کے بھکاری کبھی تجھ سے برگشتہ نہیں ہو سکتے۔

اے خدائے محبت! ہم دیکھ رہے ہیں کہ محبت، خوشی اور سکون اس دُنیا میں ہم سے بغلگیر ہونگے لیکن تیری جدائی میں ہم ہزاروں یں رو رو کر بسر کر دیں گے۔ آ۔ اور ایک بار ہمیں آسرا تو دیدے!

کہدے اے مولا! بول اے خالقِ ارض وسما!

کہ اندھے بھکاری کی یہ دعا کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔

تو ہمیں قوت دے، ہماری اندھی آنکھوں کو اُمید کا چراغ دکھا ــــ اے قہر ذوالجلال!

ہم نے بہتیری اذیتیں سہیں، ذلت کے اندھیرے غاروں میں ہاتھ پاؤں مارا کئے ــ اب ہمیں دائمی آزادی کی خوشخبری سُنا دے!

اے اُمید! ماں کے ہم سب بیٹوں کی سختیاں دُور کر دے ــــ دیکھ اے معبود! تیرے رحم وکرم کا بدر کامل صاف وشفاف آسمان کی چھاتی پر ضوفگن ہے۔ اب ہماری آس بندھ گئی ہے کہ ہمارا کشکول گدائی تیرے کرم سے بھر جائے گا!

ہم کنگال ہیں، غریب ہیں، بھکاری ہیں، مسکین ہیں! آ، ایک مرتبہ ہماری چوکھٹ ہی تک آ اور دیکھ کہ ہماری آہیں اور سسکیاں کتنی انگیز ہوتی ہیں۔ ہماری کراہ میں کتنا اضطراب ہے۔ سرمایہ داروں کے محلات میں تو آخر کب تک بیٹھا رہیگا؟

ــ تو قوت ہے، محبت ہے، عیش وطرب ہے، تو رحیم ہے۔ ہماری اس دُعا کو قبول کرلے اور گھوم کر ایک نظر اپنے اس بھکاری اور ٹھکرائے ہوئے ــــے کو دیکھ!

سنو! سنو! بھکاریو، کنگالو، گوش دل سے سُنو ــ طول طویل بلندی سے کس کی آواز آرہی ہے "آمین!" یہ کس کی آنکھیں رو رہی ہیں آنسوؤں کے قطرے سے زمین میں سیلاب آگیا ہے۔ جسم میں سنسنی دوڑ گئی ہے۔

آؤ، جشنِ شادمانی منائیں، ناچیں۔ ہماری دعائیں بارگاہ ایزدی میں قبول ہوگئیں ــــ وہ دیکھو بالآخر رب عظیم! عرش بریں سے اُتر کر بھکاری جھونپڑیوں میں اُتر آیا ہے!

قاضی نذر الاسلام؛

مترجمہ۔ محمد یونس احمر؛

غزلیات

نوائے سرمدی

کوئی کیفیت ہی نہیں وہ الٹا اثر جو اپنا دکھا نہ دے
کرے غم بھی کیا جو ہنسا نہ دے وہ خوشی بھی کیا جو رُلا نہ دے

تیرے ہجر کا یہ اثر ہوا تجھے پا رہا ہوں قریب سا
ترے وصل سے یہی خوف ہے کہ وہ دردِ ہجر اُٹھا نہ دے

یہ طلسمِ غیب و شہود کیا یہ فریبِ ہجر و وصال کیا
کہ چھپے تو پیشِ نظر رہے جو ملے تو اپنا پتا نہ دے

کرے بے نیازِ نصیب جو، ہے وہ چیز چشمِ کرم تری
یہی کہہ رہی ہیں مشیتیں اُسے دے تو جس کو خدا نہ دے

تری داستاں ہو دلِ حزیں کہ چراغِ بزمِ حیات ہے
ابھی جگمگائیں حقیقتیں جو انہیں بھی رنگِ خفا نہ دے

مرے جرمِ عشق کے سوا سے کبھی تحمل کے ساتھ نہ لے سکے
یہی ڈر ہے تیری نگاہ سے کہ معاملے کو دبا نہ دے

ابھی اور آگ لگی رہے مرے دل کی آگ دبی رہے
کوئی اور غم دے زمانے کو مرے غم کو اور زمانہ دے

میں ہوں تجھ سے تیرے قریب تر تو ہے مجھ سے میرے قریب تر
یہ تکلفات بھی کیوں رہیں یہ حجابِ زیست اٹھا نہ دے

مرے عشق کا بھی تو ٹھیک کیا ترے حسن کا بھی ٹھکانا کیا
یہ مٹا کے بھی نہ ابھار دے وہ ابھار کر بھی مٹا نہ دے

دلِ ناصبور کی تیرگی تھی انقلاب کی شام ہے
کہ یہ زندگی تو ہے زندگی اسے موت ہی کا بہانہ دے

میں جیسے تمنا کے ہوں مطمئن میں جیسے بتا کے خموش ہوں
یہ سکوتِ ناز سے خوف ہے کہ کہیں وہ بات بڑھا نہ دے

وہ ہو بے اثر کہ ہو با اثر مری التجا ہے یہ چارہ گر
کہ تو کر علاجِ مرض مگر مجھے زندگی کی دعا نہ دے

یہ عجیب جلوۂ حسن ہے یہ عجیب قرب و وصال ہے
ملے کھل کے اور پتہ نہ دے رہے دل میں اور ٹھکانہ دے

تری یادِ شمعِ حیات ہے تو میں کیسے ہجر میں سانس لوں
کہ یہ نرم نرم ہوائے غم کہیں یہ کنول بھی بجھا نہ دے

یہ عجیب الٹی سی بات ہے یہ عجیب رازِ حیات ہے
کرے غم بھی کیا جو نہ کم پڑے وہ خوشی بھی کیا جو ٹھکانہ دے

دلِ بے عماد ترے ہی دم سے فضائے غم کی ہو تازگی
کوئی پیچ و تاب نہیں ہے وہ کہ جو کیفِ موجِ صبا نہ دے

کھلے گیسوؤں کی بھی نکہتیں رخِ یار میں ہیں بسی ہوئی
وہ فراق شاعرِ صبح ہے کہ جو بوئے جامِ شبانہ دے

فراق گورکھپوری

غزل

شاد و افتادِ ہر نفس مت پوچھ
حضرتِ قاضی و عسس مت پوچھ

ہائے مت پوچھ ہمنفس مت پوچھ
ہم ہیں شائستۂ قفس مت پوچھ

خامکاریٔ بوالہوس مت پوچھ
حسل و حسرتِ نفس مت پوچھ

(ق)

حاصلِ اکتساب سرما ہے
اعتبارِ نفس نفس مت پوچھ

خون بھی ہے رگِ حمیت میں
کیوں نہیں لوگ ... مت پوچھ

پھول کانٹوں میں تو نے دیکھا ہے
مجھ سے حالاتِ پیش و پس مت پوچھ

کیا مری آرزو سے واقف ہے
ودکا و دقیقہ رسی مت پوچھ

آشیان و چمن کے ولدادہ — دیکھی وسعت قفس۔ مت پوچھ
چیتاں ہے۔ فریب آزادی — شرح اجمال کو ترس مت پوچھ
قتل کا حکم ہی سہی۔ لیکن — پڑ جو اسکے گلے میں رس۔ مت پوچھ

شاد کب تک مری خدا دادی
ہند و" فرعون مصر" بس مت پوچھ

شاد عارفی

غزل

عشق، ہوس انجام نہیں ہے — راہِ محبت عام نہیں ہے
ہجر نصیبوں کی دنیا میں — صبح نہیں ہو شام نہیں ہے
تیری تجلی عام ہے، لیکن — تاب تجلی عام نہیں ہے
عہدِ جوانی، عہدِ محبت — ہوش و خرد کا نام نہیں ہے
تیرا قفس پھر تیرا قفس ہے — قید میں کیا آرام نہیں ہے
بادہ کش میخانہ، الفت — دُرد کش انجام نہیں ہے
پہلے نہ تھی بدنام محبت — آج ہوس بدنام نہیں ہے
قیس نہیں ہے ہر دیوانہ — عشق جنون خام نہیں ہے
رند تیرے بدنام ہیں کیا کیا — تیری نظر بدنام نہیں ہے
تلخی غم کچھ اور بڑھاؤ — بادہ بقدر جام نہیں ہے

عشق ہے حسرت دولت سرمد
اور یہ دولت عام نہیں ہے

حسرت ترمذی

غزل

رازِ ناکامی کو عالم آشکارا کیجئے — اشکِ حسرت جو گرے آنکھوں کا تارا کیجئے
رشتۂ امید بھی ہو دست وحشت تا بہ کے — دامنِ زخمِ جگر کو پارا پارا کیجئے
قطرۂ ناچیز کی اتنی رسے بربادیاں — جی میں آتا ہے کہ دریا سے کنارا کیجئے
کھل گیا رنگِ محبت پردہ داری ہو چکی — جو چھپایا تھا کبھی اب آشکارا کیجئے
وہ قیامت کا ہو دن کچھ اور دن آج بھی — حشر ہوتا ہے جہاں چرچا تمہارا کیجئے
زندگی کروٹ بدلنے کو ہے کیا جائے کدھر — آپ کیوں خاموش ہیں کچھ تو اشارا کیجئے
دیر کی صورت نگاری کا وہ نقشہ ہی نہیں — ہم ہیں اور شیخ حرم۔ کیونکر گزارا کیجئے
بربط ہستی میں پھر چھیڑو ہم خامشی کا راگ — بے صدائے تار شکستہ۔ گوارا کیجئے
(جہاں) تک کی عمر۔ ہیری میں کسی جستجو — عمر رفتہ کیا پلٹتی ہے۔ پکارا کیجئے

عبداللطیف تپش

مرثیۂ جدید

شہادت حقیقت کا عرفان ہے

مگوں ہے ترا جام ہی بزم میں ۔ یہ حالت سرِ بام ہی بزم میں!
فتیلہ نہیں ہے کہ روغن نہیں ۔ ترا ہی دیا ہے کہ روشن نہیں
شجر اور جتنے ہیں بالیدہ ہیں ۔ تری ڈالیاں ہی خزاں دیدہ ہیں
اُدھر ذرّہ ذرّہ مہ و مہر ہے ۔ اِدھر مہر بے ضو، یہ کیا سحر ہے
اُدھر ندی نالے ہیں طوفاں بدوش ۔ اِدھر بحر تیرا حریفِ خروش
گُلِ تر کی کثرت ہے گلزار میں ۔ تو ہی دب گیا جھاڑ جھنکار میں
نئی زندگی غیر کو مل گئی ۔ بنا تیری ہی زیست کی ہل گئی

تو ہی محو ہے خوابِ خرگوش میں!
یہ کیوں پڑے کیوں ترے ہوش میں؟

۲

تو اے وارثِ ذوالفقارِ علیؑ ۔ امینِ رموزِ خفی و جلی
ہلالِ فلک کسکے پرچم پہ تھا؟ ۔ قدم کس کا تختِ کے و جم پہ تھا؟
رگِ جاں میں کیا خون باقی نہیں ۔ ترے سر میں کیوں کج سودا نہیں؟
حسینؑ و حسنؑ کسکے اجداد تھے؟ ۔ وہ نخچیر تھے یا کہ صیاد تھے؟
نہ صدق و صفا ہے نہ فقر و غنا ۔ یہ ترکہ آبا کا تیرا کیا ہوا؟
نہ جرأت ہی باقی نہ بیباکیاں ۔ نمایاں ہیں آنکھوں کی نمناکیاں

تری سینہ کوبی یہ گریہ ترا!
کہاں تک رواہے خدارا بتا!

۳

شہیدانِ حق کی حیات و ممات ۔ ہے وہ مہرِ تابندۂ کائنات
جو مشعل ہو دنیائے تاریک کی ۔ سمجھ تجھکو کیا رمز باریک کی؟
صداقت کا دل میں اگر درد ہو ۔ نہ کر شین و شیون کہ تو مرد ہو
صداقت پہ مٹنے پر آمادہ ہو ۔ ہے مسلم تو اک مردِ آزادہ ہو
حسینؑ و حسنؑ ہیں انہیں کا امام ۔ نہیں جنکی گردن میں باطل کا دام
یزیدوں سے جو خوف کھاتے نہیں ۔ کبھی انکے بہکے میں آتے نہیں
جنہیں لَو لگی ہے اسی ذات کی ۔ جو مالک ہے ارض و سماوات کی
وہی اہل ہیں حبِ شبیرؑ کے ۔ ثنا خواں ہیں جو انکی تقدیر کے

شہادت ہے شبیرؑ کی شان ہے
شہادت حقیقت کا عرفان ہے

امین حزیں سیالکوٹی

زندگی میری نظر میں

جس زمانے میں میری شاعری کی ابتدا ہوئی، اُس زمانے میں ترقی پسندی کے لفظ یا تخیل کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس وقت علامہ اقبال مرحوم زندہ تھے۔ لیکن ان کی شاعری کے خلاف بھی ایک ردِ عمل ضرور شروع ہو چکا تھا۔ ادبی طبقہ اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی کوئی "حرف دلآویز" سننے کے لئے بیتاب تھا۔ میرے نزدیک یہی وجہ ہے کہ میری نظمیں "اے عشق کہیں لے چل"، "اعتراف محبت"، اور "دیس سے آنے والے بتا" وغیرہ بے حد مقبول ہوئیں۔ اور لوگوں نے میری توقع سے زیادہ ان کی پذیرائی کی۔

مَیں اقبال کو اپنے زمانے کا ایک بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں۔ ہم نے صدیوں کے بعد ایک ایسا شخص پیدا کیا جس کا ہاتھ زمانے کی نبض پر تھا اور جو زمانے کے دل کی دھڑکن کو پہچانتا تھا۔ اقبال کی ذہنی توانائی، اس کی فراست، اس کے ادراک اور اس کی صناعی کی داد نہیں دی جا سکتی۔ البتہ اس کے کلام میں ایک چیز جس کی خطرناک حد تک کمی نظر آتی ہے، یہ ہے کہ انسان اور فطرت پر اس کی نظر ایک فن کار کی نظر بن کر نہیں پڑتی جس نظر سے وہ انسان اور فطرت اور ان کے باہمی تعلق کو دیکھتا ہے، اس کی تہ میں یہ احساس نہیں پایا جاتا کہ تخلیق کا مقصد ایک لازوال حسن، ایک جاودانی مسرت اور ایک ابدی لذت کی پیدائش ہے۔ اقبال فطرت اور انسان کے باہمی آہنگ کو نہیں دیکھتا۔ انکے مشترکہ سرچشمے کا اُسے احساس نہیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرت اور انسان کے درمیان ایک ازلی کشمکش اور ایک دائمی آویزش کا قائل ہے، وہ فطرت کو انسان کے لئے ایک آلۂ کار سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔ وہ فطرت پر انسان کی برتری کا قائل ہے اور فطرت پر غلبہ پانے کا اُسے حقدار سمجھتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اقبال دُنیا کی کسی دو چیزوں میں آہنگ کا قائل نہ تھا۔ اس کے جس مفروضے پر بھی آپ نظر ڈالیں اس سے یہی پایا جاتا ہے کہ اسکے نزدیک ہر چیز دوسری چیز پر غالب آنے اور اس کو اکھاڑنے کیلئے بیتاب ہے۔ اس کی شاعری میں عقل پر عشق کے لیے فطرت پر انسان کی حکومت، حسن پر افادیت کی فوقیت اور فرد قوم کی فضیلت کے تصورات بار بار آتے ہیں۔ اس کے ہاں خودی اور عمل کے نظریے بھی اسی کشمکش کے احساس کا قدرتی نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ صرف فطرت ہی پر غلبہ پانے کے لئے انسانوں کو نہیں ابھارتا بلکہ خود انسانوں کے اندر ایک جماعت کو دوسری جماعتوں پر یا زیادہ جماعتوں کو دوسری جماعتوں پر حکومت کرنے کی بھی تبلیغ کرتا ہے۔ اس تمام تخیل میں جو بنیادی اعتراض نہی ہے، یہ ہے کہ شاعر کی نگاہ فطرت اور انسان یا انسانوں کے باہمی ربط اور آہنگ کو دیکھ سکتی ہے، نہ اُنکے باہمی تعاون کی ضرورت ہی کو سمجھتی ہے۔ اقبال کے فلسفے کا نچوڑ یہ ہے کہ انسانوں کے کسی نہ کسی گروہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی خودی کی تربیت اس طریقے سے کرے کہ دوسرے گروہوں کی خودی پر غلبہ پانے کی راہیں آسان ہو جائیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ ہر انسانی ضمیر کی خلوت گاہ بقول راشد "خودی کی جو ننھی سی قندیل" روشن ہے۔ اسے بھی چمکنے کا وہی حق حاصل ہے جو کسی برتر سے برتر چراغاں کو ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک دُنیا کے اس نگار خانے کی زینت و آرائش کا بڑا راز یہی ہے کہ اس کی ہر قندیل اپنی جگہ روشن رہے۔ اور دوسری قندیلوں سے مل کر اور ان کو ہم آہنگ ہو کر اس نگار خانہ میں رنگ اور نور کا ایک سیلاب برپا کرتی رہے۔ کوئی ایک قندیل دوسری قندیلوں کو اپنے ساتھ جنگ آزمائی کی دعوت نہ دے، نہ اسے چیلنج کرے۔ نہ اسے بجھا کر خود شعلۂ جوالہ بن جانے کی خواہش رکھے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی محسوس کیا کہ دُنیا کو پیدا کرنے والی ہستی کا مقصد حسن اور مسرت کو عالمگیر اور دائمی بنانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہمارے چاروں طرف حسن و رنگینی اور نور و سرور کا ایک سیلاب ہے۔ جو ہر چیز پر چھا رہا ہے۔ خدا نے جہان فطرت کے ساتھ کے اندر ایک سادہ اور دلکش حسن پیدا کیا ہے۔ وہیں انسان کے وجود میں بھی ایسی حسین صلاحیتیں رکھدی ہیں کہ وہ فطرت کی زینت میں اضافے کا باعث ہوں، اور اس کے لئے غازہ و گلگونہ کی گلکاریاں بہم پہنچاتے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان نے فطرت کے حسن اور اپنی اہمیت کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اکثر فطرت کو اپنی ہوسناکاری اور زیاں کاری کا شکار بنایا ہے۔ وہ فطرت کا دوست بننے کی

بجائے اس کا رہزن بن گیا ہے۔ یا اس کی رہنمائی کے پردے میں اس کی صورت کو مسخ کرنے میں مصروف رہا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان دُنیا بھر کے جذبات سے زیادہ لطیف جذبے کو جس کا نام عشق ہے، اپنی شیطنت اور ہوس کا آلۂ کار بنا کر رہ گیا ہے۔ انسان نے فطرت کی اس نعمت کو فطرت کے حضور میں عبودیت کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی بجائے اکثر اس پر غالب آنے کا بہانہ بنایا ہے۔ انسان کی اس مکاری یا غلط فہمی کی وجہ سے فطرت کے ساتھ اور اپنے آپ کے ساتھ بارہا اس کی ٹکر ہوئی ہے۔ یہ ٹکر کہیں جرائم کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے کہیں جنگ کی شکل میں اور کہیں معاشی مقابلہ بن کر۔ یہ سب مصیبتیں اس عقیدے کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ جو ایک انسان کی خودی پر دوسرے انسانوں کی خودی کو غالب دیکھنے کا قائل ہے۔ ہم رنگی اور اتحاد کا نہیں۔

جن لوگوں نے میرے کلام کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی اپنی شاعری میں فلسفہ، سیاست یا اس قسم کے دوسری بیرونی اور دُور از کار عناصر کو داخل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ مجھے احساس ہے کہ میری شاعری اس آرزو کی پیداوار ہے کہ میں زندگی کے حسن کو زیادہ سے زیادہ روشن کر سکوں۔ مجھے کبھی تو مرجھائی ہوئی کلیوں کا حسن لبھاتا ہے، کبھی نغمے کی دلاویزی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کبھی رنگ اور نور کی فراوانی دیکھ کر دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اور کبھی دنیا کے تمام رنگ و بو اور نور و نغمہ کی تمثیل یعنی عورت کے جسم کی دل کشی پر مرمٹا ہوں میری زندگی میں غم انگیز واقعات کی کمی نہیں۔ لیکن ان واقعات نے آج تک مجھے کبھی زندگی سے بیزار نہیں کیا۔ زندگی سے نفرت نہیں دلائی۔ بلکہ شاید زندگی کی ان ہی شوخیوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی لازوال حقیقتوں سے قریب تر ہوتا چلا گیا ہوں۔

میں نے جب شعر کہنا شروع کیا تھا تو شاعری کے افادی مقصد کا وہ تصور کہیں موجود نہ تھا۔ جسے آج ترقی پسندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس تخیل نے کافی فروغ پالیا۔ لیکن میں اس کو مغربی فیشن کی تقلید سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ ترقی پسندی بھی یورپ والوں کی نقالی ہی کا ایک کرشمہ بن کر رہ گئی ہے۔ اسے بھی مغربی عقل و فراست کے خزانوں سے اسی طرح چرایا گیا ہے۔ جس طرح کئی اور عقیدے، رسمیں اور رواج ان کے ہاں سے ہم نے چرائے ہیں۔ اقبال کی افادی شاعری میں فطرت، انسان کی ایک کنیز سہی۔ لیکن خوبصورت اور دل قریب تر ہے۔ مگر ہمارے ترقی پسندوں کی شاعری کے ہاں تو اس کا چہرہ اتنا گھناؤنا اور مکروہ نظر آتا ہے کہ ایک خوش مذاق شاعر اسے دُور سے دیکھنے کی بھی تاب نہیں لا سکتا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ شاعر کا کام، زندگی کے حسن کو خود دیکھنا اور دوسروں کو دکھانا ہے۔ زندگی کے ناسوروں کے علاج کی کوشش کرنا اس کا کام نہیں۔ زندگی میں "ہر کارے و ہر مردے" کا اصول ہر جگہ کار فرما ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی ہی سے اس کی مثال مل سکتی ہے۔ مثلاً درزی کا کام آپ کے جسم کو چھپانا اور ایسے لباس سے چھپانا ہے جو آپ کے جسم پر خوبصورت معلوم ہو۔ لیکن اگر آپ کے پاؤں پر کوئی زخم ہو تو آپ درزی سے اس بات کی توقع نہیں رکھتے کہ وہ آپ کے جسم پر پوشاک پہنانے سے پہلے آپ کے زخم کا علاج بھی خود کرے۔ کون نہیں جانتا کہ زخموں کو اچھا کرنا جرّاح یا طبیب کا کام ہے۔ اسی طرح شاعر کا کام۔ زندگی سے حسن حاصل کر کے انسانوں کی رُوح کو زیبائش دینا ہے۔ اس کا کام اُن کی رُوحوں کے چھپے ہوئے زخموں کو نمایاں کرنا یا ان کے علاج کی کوشش کرنا ہرگز نہیں۔ اسی لئے میں آج تک اس نام نہاد ترقی پسندی کا قائل نہیں ہو سکا۔ جو ہمارے ملک میں بدقسمتی سے رواج پا رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے نے بعض ایسے ناگوار مسئلے ہمارے سامنے لا رکھے ہیں۔ جن سے گریز ممکن ہے، نہ مصالحت۔ سیاست میں عوام کی آواز اور خیالات کا اثر بڑھ گیا ہے۔ اقتصادی کشمکش ہمہ گیر ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری دُنیا کے نیم وحشی اور پسماندہ سے پسماندہ ملک بھی اس کے تاثرات سے نہ بچ سکے۔ بلکہ شاید مہذب ملکوں سے کہیں زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ تجارتی لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری نے سماج کے ہر ایک طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اور بے شمار گروہ اور ملک ہماری دُنیا کے خوبصورت جسم پر بڑے بڑے ناسور بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم شاعر بھی انسان ہونے کی حیثیت سے ان اثرات کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔ لیکن ہمارا ان ناسوروں کی جراحی کر کے انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا ایک اناڑی کی کوشش سے کم نہ ہوگا۔ ان کا علاج تو سیاسی اور اقتصادی ماہروں کے ہاتھ میں ہے۔ اور انہیں پر علاج کا فرض عائد ہوتا ہے۔

شاعری افراد اور اقوام کے لئے ایک لطیف اور لذیذ غذا تو بن سکتی ہے۔ جو ان کے ذائقے کی تشفی کرے اور ان کی عمدگی کو برقرار رکھے لیکن اس سے بیمار اور بوڑھی قوموں کے حق میں "معجونِ شباب" کا کام لینا میرے نزدیک بہت بڑی زیادتی ہے۔ ترقی پسندی کی تحریک کو جس قدر بھی فروغ اب تک حاصل ہوا ہے اس کا باعث اس کے بنیادی

ری کی دلکشی نہیں بلکہ اس کے لیبل کی دلکشی ہے۔ اس کے لیبل کو
لر ذہن سب سے پہلے ترقی کے لفظ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اور
وگ اسی وجہ سے ترقی پسندوں کے پھیلائے ہوئے جال میں
ں جاتے ہیں۔ اس تخیل نے مزدور، کسان اور فقیر کی اہمیت کو
یاں کیا ہے لیکن اس نے حکمت اور صناعی کے اس مفہوم کا
ر کر دیا ہے۔ جس نے شکسپیر، کالیداس، حافظ، سعدی اور غالب
ام کو زندہ کیا تھا۔

مجھے اور میرے ہم خیال شعرا کو جن کے فن کا مقصد زندگی کی
لکی پرستش اور پرورش کرنا ہے۔ عام طور پر رجعت پسند کہا جاتا
ہمیں عام طور پر فراری کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ور ان
ں پسند شاعروں کو فراری نہیں کہا جاتا۔ زندگی کے بعض مکروہ اور
ر پہلوؤں کو نمایاں کر کے زندگی سے نفرت اور بیزاری پیدا
تے ہیں میرے خیال میں اگر کوئی چیز ہمیں زندگی کے قریب لا سکتی ہے
ا صرف زندگی کے حسن کا احساس ہے۔

میرے نزدیک شاعر کے لئے اپنے آپ کو کسی سیاسی یا
ساوی نظام سے وابستہ کرنا ضروری نہیں۔ وہ نظام سرمایہ داری
اشتراکیت، جمہوریت ہو یا فاشیت، شاعر کے لئے ان میں ایک
قابل توجہ نہیں۔ شاعر کی قدریں یعنی (ایی ہے کہ ہمم) ان سب سے
ادر آزاد ہیں شاعر کی مثال شہد کی مکھی کی سی ہے۔ جو زندگی کے باغ
سن کی شادابیوں اور رنگینیوں کا رس لیکر دوسرے انسانوں کی
ت اور تسکین کا سامان تیار کرتی ہے۔ اس کا کام باغ کو صیاد یا
ی کے نقطۂ نظر سے دیکھنا نہیں۔ نہ ان کے کام میں دخل دینا اسکے
کی بات ہے۔

شاعری پر میں نے اس لئے آپ سے مفصل گفتگو کی کہ میں
شاعری کو اپنی زندگی سے علیحدہ نہیں جانتا۔ یہی میری زندگی کا تارو
اور یہی میری زندگی کی روح رواں ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کو کسی
افی چیز کے بغیر سمجھنا اور سمجھانا ویسے بھی ناممکن ہے۔ ایک عرصہ ہوا
سلئے ایک سانٹ لکھا تھا جس میں میں نے اس احساس کو واضح
نے کی کوشش کی تھی کہ زندگی اپنی تمام ہمہ گیری کے باوجود ایک
ا چیز ہے جسے سمجھنا ہمارے لئے بیحد دشوار ہے۔ یہ سانٹ میں آپکو
ناتا ہوں اس میں میں نے زندگی کو ایک پرندے سے تشبیہہ دی
جو راستہ بھول گیا ہو۔ کہیں پہونچنا چاہتا ہو۔ لیکن افق کی پہنائیاں
ہی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں، اور وہ آخرکار انہیں پہنائیوں

کے قفس میں قید ہو کر رہ گیا ہو۔

زندگی مست ہے اُس طائر ناداں کی طرح
جو ہو تنہا نگراں دور فضاؤں کی طرف
مہ و خورشید کی زر کار ضیاؤں کی طرف
محو نظارہ کبھی نرگس حیراں کی طرح
اور کبھی بال فشاں بوئے خیاباں کی طرح
مسکراتی ہوئی شاداب گھٹاؤں کی طرف
وادیٔ کوہ کی مستانہ ہواؤں کی طرف
نکہت گل کدۂ وسیل بیاباں کی طرح
آرزو اڑنے کی کرتی رہے بیتاب سدا
پر نظر آئے نہ تسکین کا انداز اس کو
یونہی ترساتی رہے حسرت پرواز اس کو
نا رسائی کی خلش سے رہے بیخواب سدا
کبھی آرام نہ دے حسرت پرواز جسے
اپنا انجام نظر آئے نہ آغاز جسے

(مرسلہ، اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی) **اختر شیرانی**

منظومات:-

سحرِ سامری

جب فطرتِ محبت جھلکے گی آدمی میں
کچھ شان موت کی بھی نکلے گی زندگی میں

صبحیں جھلک رہی ہیں چہرے کی تازگی میں
اُلجھی ہوئی ہیں راتیں زلفوں کی برہمی میں

شانِ ربوبیت بھی ہے اُسی کا فری میں
جب تک ہے حُسن باقی سب کچھ ہے آدمی میں

کیا لن ترانیاں ہیں آنکھوں کی خامشی میں
موسیٰ کے معجزے ہیں اس سحرِ سامری میں

جوشِ بہار دیکھو اِک ایک پنکھڑی میں
گلشن مہک رہا ہو جیسے کلی کلی میں

ہے اس کی اک نظر میں امروز اور فردا
دُنیا بھی ہے اسی میں عقبیٰ بھی ہے اسی میں

خلوت میں اس کی دور حرص و آز میں نہیں ہے
ہے وقت دید اس کا دن میں نہ رات ہی میں

مانوس ہیں جو آنکھیں وہ ہیں رمیدہ خو بھی
کچھ شانِ عشق بھی ہے اندازِ دل کشی میں

کچھ گھٹ چلا تجاہل کچھ ہو چلا تغافل
یارب زیادتی ہو کچھ اور اس کمی میں

ہے ان کے رنگ و بو میں کچھ خونِ دل بھی شامل
میری بھی کچھ جھلک ہے کلیوں کی تازگی میں

اس مستِ ناز میں کیا کافر ادائیاں ہیں
مستی ہے بانکپن میں شوخی ہے سادگی میں

چونکا دے مجھکو ساقی غفلت کی زندگی سے
احساس بھر کے دیدے پیمانۂ خودی میں

تجھ سے ہیں شعر و نغمہ سب جاں نواز لیکن
کچھ رس ہے راگنی میں اور جس ہو شاعری میں

نجمہ تصدق

دخترِ ہند

ایک لڑکی بیکس و مجبور و زار
خاک پر بیٹھی ہوئی ہے دلفگار

چیتھڑوں سے جسمِ لاغر ہے ڈھکا
کائناتِ دل میں ہے محشر بپا

آنکھ میں ہے نیند کا ہلکا خمار
گیسوئے خمدار پر گرد و غبار

قلب میں الجھن پریشان و حزیں
ایک کُرتا زیبِ تن نیم آستیں

ایک پھٹی اوڑھنی اوڑھے ہوئے
جس کے آنچل جا بجا اُدھڑے ہوئے

اندرونی دُکھ کی سچی داستاں
کہہ رہی ہے اُس کی چشمِ خوں فشاں

بیکسی، بے چارگی کا سرفراز
دستِ نازک بھیک کی خاطر دراز

آہ یہ آفات یہ بربادیاں
ہند کی اور آہ یہ شہزادیاں

آہ اے ہندوستانِ خستہ حال
تجھ کو کرتے ہیں جب بیتاب ہیں تیرے لال

آہ اے جنت نشاں ہندوستاں
تو کہاں اور یہ تری حالت کہاں

کاش پھر آ جائیں روز و ماہ و سال
تو ہو اور تیرا وہی جاہ و جلال

سعیدہ تمیز ملیح آبادی

قلندر خاں

(تباہی ناچ کی آواز آتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد بیک گراؤنڈ میں چلی جائے۔ پھر آتے ہوئے گھوڑوں کے سموں کی آواز آئے ——)

پہریدار:۔ کون ہے۔

سوار:۔ قلندر خاں کی بے پناہ تلوار سلامت رہے۔

پہریدار:۔ گذر جاؤ۔

(رقص کی آواز فوراً گراؤنڈ میں آجائے۔ اور پھر ایکا ایکی خاموش ہو جائے۔)

سوار:۔ سردار قلندر خاں کو مژدہ ہو کہ خان زادہ شہباز خاں اپنے دوست شیر خاں کے ساتھ کل شام آفرید آباد پہونچ جائیگا۔ دونوں نوجوان اپنے بزرگوں اور قبیلے کے لوگوں کو سلام بھیجتے ہیں۔

قلندر خاں:۔ ہم نے اُن کا سلام قبول کیا۔ پر جس روز ہم نے ان خود سر ہندوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا اُس دن ہمیں پیغام پہونچا تھا کہ وہ دونوں آج پہونچ جائیں گے۔

سوار:۔ سفر کی تھکان دُور کرنے کیلئے آج رات وہ پشاور میں قیام کریں گے۔

قلندر خاں:۔ تھکان، آفریدی بچے اور تھکان۔ افسوس مغلیہ تہذیب کی افیون سے قلندر خاں کا بیٹا بھی نہ بچ سکا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ان کی تعلیم کے لئے آگرے کی بجائے سمرقند یا ایران میں کوئی جگہ بہتر رہے گی۔ لیکن تم نے خواہ مخواہ اصرار کیا کہ انہیں آگرے بھیجو۔ گلاب خاں اب میں تم سے کیا کہوں۔ اب دیکھنا ہے تمہارا لونڈا کیا بن کے آتا ہے۔

گلاب خاں:۔ خان اُنہیں آنے تو دو۔ ہم خود انہیں دیکھ لیں۔

قلندر خاں:۔ خیر جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب ہمیں ان کے مستقبل کی فکر کرنی چاہیئے۔ لیکن تم نے یہ رقص کیوں بند کر دیا۔ مشعلوں کی روشنی میں چمکتی ہوئی تلواریں ہم پسند کرتے ہیں۔ انہیں دیکھکر ہماری رگ رگ میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ناچتے جاؤ۔ ناچتے جاؤ۔

(رقص پھر شروع ہو اور آہستہ آہستہ فیڈ ہو جائے۔)

(وقفہ)

شہباز خاں اور شیر خاں:۔ (ایک ساتھ) خان اعظم ہم قدم بوسی کی اجازت چاہتے ہیں۔

قلندر خاں:۔ آفریدی بچے آبائی تلوار چوما کرتے ہیں۔ قدم بوسی مغلی رسم ہے۔ لیکن۔ لیکن تم نے یہ لباس کیسا پہن رکھا ہے۔ بخدا تم تو اچھے خاصے خواجہ سرا معلوم ہوتے ہو۔

شہباز:۔ (حیرانی سے) خواجہ سرا۔

قلندر خاں:۔ خاموش رہو۔ کیوں گلاب خاں تمہارا اس لباس کے متعلق کیا خیال ہے۔

گلاب خاں:۔ مغل رؤسا اس طرح کا لباس پہنتے ہیں خان۔

قلندر:۔ یہ مغلیچے ہیں یا آفریدی۔

شہباز:۔ آپ نے میری توہین کی ہے خان۔ آپ میرے باپ ہیں لیکن ایسے الفاظ میں برداشت نہیں کر سکتا۔

قلندر خاں:۔ (طنزیہ) اوہو۔ تم ایسے الفاظ برداشت نہیں کر سکتے۔ میں بھی ایسی گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔ نکالو اپنی تلوار۔

شہباز:۔ میری تلوار خود بخود میان سے باہر نکل آئے گی۔ آپ کی تلوار پہلے باہر نکلنی چاہیئے۔

قلندر:۔ تو دیکھتے کیا ہو میدان میں کیوں نہیں آتے۔

(میانوں سے تلواریں نکالنے کی آواز)

قلندر خاں:۔ چلو پہلا وار تم کرو۔

(تلواریں ٹکراتی ہیں۔ یہ آوازیں ذیل کے ٹکڑے میں متواتر آتی رہیں۔)

گل بانو:۔ خان خان۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ارے کوئی انہیں سمجھائے۔ کسی نے آج تک باپ بیٹے کو بھی لڑتے دیکھا ہے۔ میں کیا کروں۔ میرا بچہ۔ میرا بچہ۔ دس سال کے بعد وطن واپس آیا ہے۔ میں نے اس کی پیشانی بھی تو ابھی تک نہیں چومی۔ گلاب خان تم ہی انہیں سمجھاؤ۔

قلندر خاں:۔ خاموش رہو۔ مردوں کی باتوں میں دخل دینے کیلئے تمہیں کس نے کہا ہے۔

گل بانو:۔ تم ہی جانے دو بیٹا۔ تم ہی جانے دو۔ تمہارے باپ کو تو

نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ مان جاؤ بیٹا۔ دیکھو میں تم سے التجا کرتی ہوں۔
قلندر خاں۔ میرا وار روکو شہباز، ایسا نہ ہو کہ ماں کی باتیں سنتے ہوئے تم اپنے باپ کے ہاتھوں گھائل ہو جاؤ۔

(تلواروں کی جھنکار زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔)

شہباز۔ وار روک لئے ابا۔ ایسا نہ ہو کہ بیٹے کو سمجھاتے ہوئے آپ خود زخمی ہو جائیں۔ شہباز کی تلوار آگرے کی سانوں نے بہت تیز کر رکھی ہے۔
قلندر خاں۔ جی جی بھی خوش ہو گیا۔ اگر تمہاری تلوار تمہاری گفتگو ہی کی طرح تیز ہے تو مجھے آگرے کی سانوں کا قائل ہونا پڑے گا۔ لو وار سنبھالو، لیجیے! اِرتم نے مغلیہ تلواروں میں نہیں دیکھے ہونگے۔
شہباز۔ ابا تلوار مغل کی ہو یا آفریدی کی۔ ہوتی تو لوہے کی ہے۔ اور لوہے کا استعمال وہی کر سکتا ہے جس کے اندر گرم گرم لہو ہو۔
قلندر۔ تمہارا لہو اتنا گرم نہیں ہو سکتا جتنا تمہارے باپ کا ہے۔ وہ لوہے کو تمہاری گردن کی طرح مروڑ سکتا ہے۔ تلوار چھوڑ دو۔
شہباز۔ یہ لیجیے۔

(تلوار کی آواز بند ہو جاتی ہے۔)

قلندر۔ اب آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔ تم واقعی سچے آفریدی ہو جو تمہارے آفریدی ہونے پر شک کرے وہ خود آفریدی نہیں ہے۔ (ہنستا ہے) گلاب خان دیکھا، میں نے کیسا شاندار بیٹا پیدا کیا ہے۔

(ہنستا ہے۔ شہباز خاں بھی ہنستا ہے)

قلندر۔ تم بیوقوفوں کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو شیر خان۔ اٹھاؤ تلوار۔ تم بھی تو مجھے شہباز کی طرح عزیز ہو۔ کیا میں تمہارے بازوؤں کا بل نہیں دیکھنا چاہتا۔ (ہنستا ہے)
گلاب خاں۔ (ہنستے ہوئے) اسکے ساتھ میں لڑوں گا۔

(قلندر۔ گلاب۔ شیر۔ شہباز سب ہنستے ہیں۔)

قلندر۔ ہم آج کی خوشی میں ایک جشن منانا چاہتے ہیں۔ جس میں آفریدی آباد کے تمام بہادر شریک ہوں گے اور اس کے لئے دنبے وغیرہ ہمارے دونوں بیٹے مہیا کریں گے۔
شیر اور شہباز۔ جتنے آپ ارشاد فرمائیں۔
قلندر خاں۔ شاباش۔ شاباش ـــــ گلاب خاں کیا خیال ہے تمہارا۔ پاس کا علاقہ مناسب رہیگا۔ سنا ہے ان لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ مویشی ہیں۔
گلاب خاں۔ [illegible]

قلندر۔ تو کل صبح تم چند جوان جو راستوں سے اچھی طرح واقف ہوں انکے ساتھ کر دینا۔ اس طرح ان کی تفریح بھی ہو جائے گی اور جشن کیلئے دنبے بھی مہیا ہو جائیں گے۔ اور اب جبکہ تم کو کھا پی کر صبح تمہیں باہر جانا ہو گا۔

(وقفہ) (فیڈ ان فیڈ آؤٹ)

گل بانو۔ شہباز کے ابا، شہباز کے ابا۔
قلندر۔ (جیسے کچھ سوچتے ہوئے) کیا کہتی ہو۔
گل بانو۔ میں پوچھتی ہوں یہ آجکل تم کیا سوچتے رہتے ہو۔
قلندر۔ میں سوچ رہا ہوں شہباز کو یہ ایکا ایکی کیا ہو گیا ہے نہ شکار نہ تلوار بندوق کی مشق۔ جب دیکھو چپ چاپ بیٹھا، بات پوچھو تو "ہوں" "ہاں"۔ اسکے بعد پھر وہی چپ۔
گل بانو۔ اب وہ خیر سے جوان ہو گیا ہے نا۔
قلندر۔ تو کیا ہوا۔
گل بانو۔ میرا خیال ہے ـــ میرا خیال ہے ـــــ
قلندر۔ مجھ سے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ صاف صاف کہو۔ تمہیں کیا کہنا ہے۔
گل بانو۔ میں کہتی ہوں اب شہباز جوان ہو گیا ہے۔ اس کی شادی کر دینی چاہیئے۔ شاید تنہائی محسوس کر رہا ہے۔
قلندر۔ تنہائی ـــ کیسی تنہائی ـــ شادی ـــ کیسی شادی ـــ
گل بانو۔ ویسی ہی جیسی کہ تمہاری اور میری ہوئی۔ آج کہتے کیا ہے۔ کل کہو گے اولاد کیا ہوتی ہے۔ بھئی حد ہو گئی۔
قلندر۔ شادی کا بوجھ اٹھانے سے پہلے اسے محنت و مشقت کا عادی بننا ہو گا۔ مغلیہ فیشن کا جو اثر اس کے دماغ پر ہوا ہے اسے دور کرنا چاہتا ہوں اور باقی رہی تنہائی جس کا ذکر تم نے سو وہ میرے لئے ایک بے معنی چیز ہے۔ جب تک مرد کی رانوں میں گھوڑا، ہاتھ میں اچھی بندوق اور تلوار ہو، وہ کبھی تنہا نہیں ہے۔ تنہائی کیسی، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تنہائی کیا بلا ہے۔ کیا دنیا میں ایک عورت ہی تنہائی دور کرنے کے لئے رہ گئی ہے۔ ان پہاڑوں کی تمام دلچسپیاں کیا بالکل فنا ہو گئی ہیں۔ کیا بندوقوں کی نالیں ٹیڑھی ہو گئی ہیں۔ کیا آفریدیوں کی ساری بارود گیلی ہو گئی ہے۔
گل بانو۔ لیکن۔
قلندر۔ لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں اس کی بہتری تم سے کہیں زیادہ [illegible]

اس لونڈے کی تنہائی کیسے دور ہو سکتی ہے۔

(وقفہ)

قلندر: گلاب خان آفریدی تلواریں زنگ آلود ہو گئی ہیں۔ اب انہیں کسی سان کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے چھاپہ مارنے کیلئے پشاور کا علاقہ موزوں رہیگا۔

گلاب: لیکن خان مغلوں سے تو ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے۔

قلندر: معاہدہ۔ (ہنستے ہوئے) معاہدے ہمیشہ توڑنے کیلئے کئے جاتے ہیں۔ خود مغل ہی کئی بار اپنے وعدے توڑ چکے ہیں۔

گلاب: پر اس وقت تو وہ ہماری دوستی کا دم بھرتے ہیں۔

قلندر: دوستی۔ (طنزیہ ہنسی ہنستا ہے) اس لئے کہ وہ آج کل دکن میں لڑ رہے ہیں۔ اور ہم سے نپٹنے کی ان میں طاقت نہیں ہے۔ انکی دوستی کی بس یہی وجہ ہے۔

گلاب: میرا خیال ہے کہ پہل ہماری طرف سے نہیں ہونی چاہیئے۔ انکی طرف سے ہو تو وہ اور بات ہے۔

قلندر: غلط بات ہے گلاب خان۔ میں تو اس بات کا قائل ہوں جسکی پہل اسی کی جیت۔ اس کے علاوہ اس وقت تو ہمارے پیش نظر ایک ایسی چیز ہے جس پر ہمارے قبیلے کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ایک عرصے سے آفریدی تلواریں اپنے میانوں میں سو رہی ہیں۔ مجھے ڈر ہے اگر کچھ عرصہ یہی حال رہا تو وہ کبھی بیدار نہ ہوں گی۔ اور تو اور ذرا اپنے نظیر اور میرے شہباز ہی کو دیکھو، ہر وقت افسردہ اور پژمردہ بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ رانوں کے نیچے گھوڑا ہے، نہ ہاتھ میں بندوق ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہے ہیں۔ بے عمل اور بے حرکت۔ تم ہی کہو اگر ہمارے ہی فرزند ایسی مثال پیش کرینگے تو باقی نوجوانوں کا کیا بنے گا۔

گلاب: کچھ بھی ہو ہمیں مغلوں سے نہیں الجھنا چاہیئے۔

قلندر: بھائی یہاں قبیلے کی زندگی کا سوال ہے۔ اور تم بے عملی کی تعلیم دے رہے ہو۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہتے ہو۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ کبھی نہیں ہونے دونگا۔ میں مغلوں سے لڑونگا اور ضرور لڑونگا۔ غضب خدا کا پورے تین مہینے ہو گئے میں نے اب تک بندوق بھی نہیں چلائی۔ یوں کام نہیں چلے گا۔

گلاب: تو اس جنگ میں تم گلاب خان کو اپنے ساتھ نہ پاؤ گے۔

قلندر: کیا کہا۔ پیچھے جا رہے ہو۔ تو یہ سچ نکلا کہ تم مغلوں کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔ اب تک تو میں اس افواہ کو جھوٹ سمجھتا رہا۔ پر آج۔ آج مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ تم غدار ہو۔

گلاب: (گھبرائے ہوئے لہجے میں) گلاب خان کو اتنے سستے داموں کوئی نہیں خرید سکتا۔ تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ میں غدار

قلندر: خاموش رہو۔ میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ تمہارا مقدمہ جرگے کے سامنے پیش ہوگا۔ وہی فیصلہ کرے گا کون غدار ہے۔

(وقفہ۔ ہماہمی پیدا کی جاتی ہے۔)

قلندر: بھائیو اب تم ہی فیصلہ کرو۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دو۔ خوب غور کر لو۔ تاکہ بعد میں کسی کو شکایت کا موقع نہ مل سکے۔

(ذیل کا ٹکڑا سرگوشیوں میں سنائی دے)

آواز ۱: قلندر خان ٹھیک کہتا ہے۔

آواز ۲: گلاب خان واقعی غدار ہے۔

آواز ۳: اس کا ثبوت مل چکا ہے۔

آواز ۴: مغل کے ہاتھ بک چکا ہے۔

آواز ۵: گردن زدنی ہے۔

آواز ۶: اسے گولی سے اڑا دینا چاہیئے۔

قلندر: صاحبو تم کس نتیجے پر پہنچے ہو۔

ایک آدمی: ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ گلاب خان غدار ہے۔

دوسرا: ہاں، گلاب خان غدار ہے۔

تیسرا: یہ مغلوں کا پٹھو ہے۔

چوتھا: ہمیں تباہ کرنا چاہتا ہے۔

ہجوم: غدار! غدار! غدار!

قلندر: تو کہو تم اس کے لئے کیا سزا تجویز کرتے ہو۔

ہجوم: سزائے موت۔

ایک آدمی: اب ہم اپنے سردار کی بھی رائے پوچھنا چاہتے ہیں۔

قلندر: سزائے موت۔ مجھے تمہاری رائے سے اتفاق ہے۔ کیوں شیر خاں تم کیا چاہتے ہو۔

شیر خاں: خان میں اپنے باپ کیلئے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔ آپ مجھے اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں۔ آپ سے یہ میری پہلی اور آخری درخواست ہے کہ میرے باپ کی جان بخشی کی جائے۔

قلندر: جرگے کا فیصلہ میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ گلاب خان اپنا

صفائی نہیں کر سکتا۔
شیر خاں۔ لیکن ــــ لیکن۔
قلندر۔ میں تمہارے جذبات خوب سمجھتا ہوں بیٹا لیکن میں مجبور ہوں۔ میں غدار کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تم سے بھی زیادہ ہمدردی کا مستحق ہوں اس لئے کہ گلاب خاں میرا دوست ہے۔ لیکن لیکن اسکے باوجود اُسے یہ فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔
شیر خاں۔ مرنا ہوگا۔
قلندر۔ ہاں۔ کل صبح جس وقت حقاب اپنے شکار کے لئے نکلتا ہے گلاب خاں کو گولی سے اُڑا دیا جائیگا۔

(وقفہ۔ وائلن پر چند لمحوں کے لئے کوئی دردناک چیز بجائی جائے۔
فائر کی آواز۔ میوزک فیڈ آؤٹ۔ ڈھلے پر چوٹ پڑے۔ پھر
ہا ہی ہو جائے۔)

قلندر خان۔ (خطیبانہ لہجے میں) بہادرو۔ تم جانتے ہو کہ یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ آج تمہیں پشاور کی طرف کوچ کرنا ہے۔ پشاور جہاں مغل رؤسا کے گھروں میں دولت کے انبار لگ رہے ہیں۔ جہاں منڈیوں پر اتنا غلہ ہے کہ اُونچے اُونچے پہاڑ بن گئے ہیں۔ جہاں زرد وز جھولوں والے خوبصورت گھوڑے ہنہناتے ہیں۔ جہاں بندوقوں کے کندھوں پر سونے اور چاندی کے پترے چڑھے ہیں۔ جہاں تلواروں کے دستوں میں جواہرات جگمگاتے ہیں۔ ہاں جہاں فراوانی ہی فراوانی ہے۔ آج تم ایسی مہم پر جا رہے ہو جس میں اگر تم کامیاب ہوگئے تو بے شمار دولت تمہارے قدموں میں ہوگی۔ کہو تم تیار ہو۔
ہجوم۔ ہم تیار ہیں، خان ہم تیار ہیں۔

(وقفہ۔ گھوڑوں کے سموں، فائروں، تلواروں کے ٹکرانے
دبی دبی چیخیں اور قلندر خان کے گونجتے ہوئے قہقہوں
کی آوازیں۔ ذیل کا ٹکڑا ان آوازوں پر سپرامپوز کیا
جائے ــــ)

آفریدی آگئے۔
آفریدی آگئے۔
قلندر خان آگیا۔
آفریدی آگئے۔

قلندر خان۔ شاباش۔ شاباش۔ بڑھے چلو۔ ہماری منزل قریب ہے۔
(قہقہوں کی آواز۔ موسیقی کی لہریں جو کبھی سنائی
دیں اور کبھی ڈوب جائیں۔)

قلندر۔ شاباش بڑھے چلو، بڑھے چلو۔
(بہت سی آوازیں)
پشاور آگیا۔ پشاور آگیا۔

قلندر خان۔ بھائیو، بزدل مغلوں نے شہر کے دروازے بند کر لئے ہیں۔ اب ہمیں محاصرہ کرنا پڑے گا۔ اس وقت تک جب وہ تنگ آکر لڑنے یا ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔ شہر کے گرد گھیرا ڈال لو اور کسی قسم کی مدد دشمن تک نہ پہنچنے دو۔ شمالی دروازے کے باہر شیر خان کا دستہ مقیم ہوگا۔ مغربی دروازے کی نگرانی شہباز خان کے ذمے ہے۔ باقی میں سنبھال لونگا۔ یاد رہے شب خون سے بچنے کے لئے عشا کی اذان کے بعد ڈیرے کی تمام شمعیں گل کر دی جائیں۔ صرف سرداروں کے خیموں میں روشنی رہ سکتی ہے۔

(وقفہ۔ اذان کی آواز۔ پھر خراٹوں کی آوازیں آئیں اور کبھی
کبھی پہریدار کے قدموں کی چاپ سنائی دے)

شہباز خان (اپنے آپ سے) شہر کا محاصرہ کئے ہمیں کتنے دن ہو گئے ہیں۔ لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مغلوں کے بندوقچی آہستہ آہستہ ہماری صفوں کو خالی کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری گولیاں شہر پناہ کے وزنی پتھروں سے اپنا سر پیٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں لیکن نہ جانے ہمارے بوڑھے سردار کے سر میں کیا سودا سمایا ہے کہ محاصرہ اٹھانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اگر یہی حال کچھ اور دن جاری رہا تو ہماری فوجوں کا بالکل صفایا ہو جائے گا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس جنگ وجدل کی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ شروع شروع میں تو یہ واقعی بڑی دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اب تو میں اس سے تنگ آگیا ہوں۔ چاروں طرف گلی سڑی لاشیں۔ زخمیوں کی چیخ و پکار۔ (آہ بھرتے ہوئے) کاش وہ آگرے کے دن کبھی ختم نہ ہوتے۔ (چونکتے ہوئے) کون۔
نادرہ۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے لئے ایک پیغام لائی ہوں۔ ایک ایسی ہستی کا پیغام جو تمہیں بہت عزیز ہے۔
شہباز۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ صاف صاف کہو تم کیا کہتی ہو۔
نادرہ۔ آگرے کے دن یاد کرو۔

(اس مقام پر سلفونی پر کوئی دھیمے سُروں والا نغمہ چھیڑ دیا جائے)

رات کا سماں ہے چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے [illegible]
[illegible]

شہباز ہی میرا بیٹا ہے۔

(وقفہ)

(سرگوشیوں میں ذیل کی گفتگو سنائی دے)

ایک آدمی:۔ نہیں خان نہیں۔ تمہیں اپنی جان اس طرح خطرے میں نہیں ڈالنی چاہیئے۔

دوسرا:۔ دیوار بہت اونچی ہے خان۔ بہت اونچی ہے۔

قلندر:۔ باتوں میں وقت نہ ضائع کرو۔ صبح ہوا چاہتی ہے۔ اور دشمن کے بیدار ہونے سے پہلے ہمیں فصیل کے اس طرف پہونچ جانا چاہیئے۔

پہلا آدمی:۔ لیکن ہمیں ایک بار پھر سوچ لینا چاہیئے۔

قلندر:۔ خاموش رہو۔ اگر تم نہیں جانا چاہتے تو صاف صاف کہدو میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔

آوازیں:۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم مرتے دم تک تمہارا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

قلندر:۔ شاباش۔ تو ساری باتیں تم نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اندر پہونچ کر ہمیں دروازے کے محافظوں پر اس تیزی سے دھاوا بولنا ہے کہ ایک بار بوکھلا اٹھیں۔ ان کی گھبراہٹ سے فائدہ اٹھا کر ہم اپنے لشکر کے لئے دروازہ کھول دیں گے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ کام بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہو۔ تو لو سب سے پہلے میں دیوار پر چڑھتا ہوں۔

ایک آدمی:۔ کمند ٹھیک ہے نا خان۔

قلندر:۔ گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔

(وقفہ)

(دفعتاً فائروں کی آوازیں۔ تلواروں کی جھنکار۔ دبی دبی چیخیں سنائی دیں۔ ذیل کا ٹکڑا ان آوازوں پہ سپرامپوز کی جائیں۔)

شبخون۔ شبخون۔

آفریدی آگئے۔ آفریدی آگئے۔

بھاگو۔ بھاگو۔

قلندر:۔ شاباش۔ شاباش۔ بچنے نہ پائے ـــــ دروازہ کھول دو۔ دروازہ کھول دو۔

(دور تک دروازہ کھلنے کی آواز۔ اور اس کے ساتھ ہی جنگ کا شور بلند ہو۔ چند لمحوں کے بعد یہ آوازیں بیک گراؤنڈ میں چلی جاتی ہیں۔)

ایک آدمی:۔ قلندر خان۔ قلندر خان۔

قلندر:۔ کیا ہے۔

آدمی:۔ تمہارا بیٹا!

قلندر:۔ کہاں؟

آدمی:۔ وہ ـ وہ ـ دیکھو چند مغلوں کے ساتھ ہمارے سپاہیوں سے لڑ رہا ہے۔

قلندر:۔ دیکھو۔ تم لوگ اس کے گرد گھیرا ڈال لو۔ اور جس طرح ہو سکے اُسے گرفتار کر کے شہر کے باہر جنگل میں لے چلو۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ (بلند آواز میں) شیر خان۔ شیر خان میرے ساتھ آؤ۔

(جنگ کا شور بلند ہو کر عقب میں چلا جائے۔)

(وقفہ)

شہباز:۔ (ڈرتے ہوئے لہجے میں) کون؟

قلندر:۔ قلندر خان آفریدی۔ تمہارا باپ۔

شہباز:۔ میں میں .....

قلندر:۔ خاموش۔ شیر خاں اس کی مشکیں کھول دو۔ منہ کیا تک رہے ہو مشکیں کھول دو۔ تمہارا طمنچہ کہاں ہے شیر خاں۔ وہی جو تم نے اپنے مرے ہوئے باپ کی نشانی کے طور پر رکھا ہے ـــ شکریہ! ـــ شہباز اس درخت کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔

شیر خان:۔ کیا کر رہے ہو خان؟

قلندر خان:۔ شہباز میرا بیٹا ہے دوست نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو آفریدی باپ اپنے بیٹوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

(فائر کی آواز۔ چیخ۔ اور جیسے کوئی دھڑام سے گرے)

آوازیں:۔ یہ تم نے کیا کیا خان۔

قلندر خان:۔ وہ میرا بیٹا تھا۔ اور غدار بیٹوں کا یہی حشر ہے۔ شیر خان تم نے دیکھ لیا۔ غدار بیٹوں کو خود اُن کے باپ سزا دیا کرتے ہیں ـــ

(فیڈ آؤٹ)

ابو سعید قریشی

دو غزلیں

مسرور بھی ہوں خوش بھی ہوں لیکن خوشی نہیں
تیرے بغیر زیست تو ہے زندگی نہیں
اس آستاں پہ ہے جو مرا سر جھکا ہوا
رنگِ نیاز ہے یہ کوئی بندگی نہیں
بے نور ہو چکا ہے زمانہ مرے لئے
نکلا ہوا ہے چاند مگر چاندنی نہیں
جس دردِ عاشقی کو سمجھتا ہوں جان و روح
کمبخت وہ بھی دل میں کبھی ہے کبھی نہیں
اے غم ہی ڈال دے مرے دستِ سوال پر
میں کیا کروں خوشی کو جو تیری خوشی نہیں
کچھ دیر اور رہنے دے خودداریٔ جنوں
دامن تو چاک ہونا ہے لیکن ابھی نہیں
ساقی نگاہِ ناز سے للہ کام لے
سو جام پی چکا ہوں مگر بے خودی نہیں
رکھنا پڑے گی تم کو تہی دامنی کی لاج
مجھ کو کمی ضرور ہے تم کو کمی نہیں
بہزاد صاف صاف میں کہتا ہوں حالِ دل
شرمندۂ کمال مری شاعری نہیں

جاتا تھا نامرادِ دل کیا آسی بے وفا کے پاس
کاوشِ آرزو مجھے لے گئی قضا کے پاس
غیر کو کس امید پر داغِ جگر دکھائیں ہم
ایک نگاہِ لطف بھی جب نہیں آشنا کے پاس
چھا گیا میری روح پر بن کے سرورِ بے خودی
خواب نہیں طلسم تھا دیدۂ نیم وا کے پاس
شیفتہ دل، فگار دل، ایک نحیف و زار دل
نذر کیا حضورِ دوست تھا یہی بے نوا کے پاس
رونقِ محفلِ طرب آ میری بزمِ وجد میں
نغمۂ بے صدا کہاں مطرب خوشنوا کے پاس
لے دمِ واپسیں ٹھہر آئے ہیں شرمسار وہ
کیا کریں ہاتھ اب نہ رہا قضا کے پاس

ساقی کا افسانہ

افسانہ نمبر حسبِ دستور جولائی کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا کاغذ کی نایابی کی وجہ سے یہ خاص نمبر بہت ضخیم نہیں ہوگا لیکن چیدہ چیدہ افسانوں کا ایسا مجموعہ آپ کی نظر سے کم گزرا ہوگا۔ مندرجہ ذیل حضرات کے افسانے شریک ہونے کی امید ہے:-

قاضی نذرالاسلام؛ ایم اسلم؛ حجاب امتیاز علی؛ کرشن چندر؛ سعادت حسن منٹو؛ اوپندر ناتھ اشک؛ قیسی رامپوری؛ بھارت چند؛ ظفر قریشی؛ شیلا امیر؛ فضل احمد کریم فضلی؛ سنتوش کیشپ؛ صادق الخیری؛ عصمت چغتائی؛ انصار ناصری؛ مدھوسودن؛ جاں نثار اختر؛ نریندر ناتھ سیٹھ؛ محمد حسن عسکری؛ مہندر ناتھ؛ عرش تیموری؛ ریاض رؤفی؛ انور؛ پرتھوی ناتھ شرما۔

ان کے علاوہ مشہور شعرا کی افسانوی نظمیں بھی شریک ہوں گی قیمت عمر مستقل خریداروں سے قیمت الگ نہیں لی جائے گی۔

عظیم بیگ چغتائی

- خانم — قیمت للہ
- کولتار — ، ۶ار
- چمکی — ، عہ
- روح ظرافت — ، عہ
- ادمحور — ، عہ
- پھریری — ، ۶ار
- چغتائی کے افسانے — ، ۳ر
- بھیانک — ، عہ
- دیکھا جائے گا — ، عہ
- مسنر کرما جلے — ، عہ
- روح لطافت — ، عہ
- کمزوری — ، عہ
- شہزوری — ، ۸ر
- قل بوث — ، عہ
- شریر بیوی — ، عہ
- سوانح کی روحیں — ، ۸ر
- مزاحیگی — ، ۱۲ر
- کیوں اور کیسے — ، ۱۲ر
- لفٹنٹ — ، ۶ر
- کھرپا بہادر — ، عہ
- چینی کی انگوٹھی — ، ۸ر
- قسرض — ، ۵ر
- فرزند سرحد — ، ۵ر
- قدرداں — ، ۵ر
- تفویض — ، ۵ر
- قرآن اور پردہ — ، عہ
- حدیث اور پردہ — ، عہ
- رقص و سرود — ، ۴ر
- مضامین چغتائی — ، ۱۲ر
- معجون آتشی — ، ۱۲ر
- چغتائی نمبر — عہ

ایم اسلم

- نرگس — قیمت عہ
- گنہگار — ، عہ
- رقاصہ — ، عہ
- طلسم سامری — ، عہ

بہزاد لکھنوی

- نغمۂ نور — قیمت عہ
- کیف و سرور — ، عہ
- موج طہور — ، عہ
- چراغ طور — ، عہ

مولانا عنایت اللہ

- نجم السحر — قیمت عہ
- سلامبو — ، عہ
- ہیملٹ — ، عہ
- ہیرودیاس — ، ۱۲ر
- انطونی کلابطرہ — ، عہ
- دانتے کا جہنم — ، ۱۲ر
- خواب پریشاں — ، ۴ر

مشہور مصنفین

- دھواں — قیمت ۶ار
- جنازے — ، عہ
- کلیاں — ، عہ
- ہمدردی — ، عہ
- کہکشاں — ، ۶ار
- ایشیا کے بڑے لوگ — ، ۶ار
- اتاترک — ، ۶ار
- دوسری جنگ عظیم — ، ۶ار

- سحر بنگال — قیمت عہ
- نرگس جمال — ، عہ
- سرگذشت عروس — ، عہ
- پروین و ثریا — ، عہ
- فاؤسٹ — ، عہ
- چندرا موہنی — ، عہ
- نجمہ نوری — ، ۱۲ر
- سلے — ، ۸ر
- ریڈیو ڈرامے — ، عہ
- تعلیم زدہ بیوی — ، ۸ر
- محبت و نفرت — ، عہ
- لال قلعہ کی ایک جھلک — ، عہ
- دلی کا آخری دیدار — ، ۱۲ر
- اخوان الشیاطین — ، عہ
- ید قدرت — ، ۵ر
- چار چاند — ، ۸ر
- نغمات موت — ، ۶ر
- ترکی میں مغرب
- مشرق کی کشمکش — ، ۶ار
- لالہ رخ — ، ۶ار
- زینۂ مینا — ، ۳ر
- سات تارے — ، عہ
- سودیشی ریل — ، عہ
- روح سیاست — ، ۸ر
- انقلاب کشمیر کا
- دوسرا رخ — ، ۶ار
- فرانسیسی افسانے — ، ۴ر
- مسلمانوں کی حیات
- سیاسی — ، عہ
- شعلے — ، عہ
- ادب زریں — ، ۸ر
- لیڈر — ، ۳۰ر

ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو دھلی

رسیلے، جھکتے جگمگاتے اور دہکتے ہوئے افکار کا

خیال افروز مجموعہ

جلوہ گاہ

محمور جالندھری

زندگی کی عریاں تصویر اور سماج کے دامن کی دھجیاں اڑتی ہوئی دیکھنی ہوں تو محمور کا کلام ملاحظہ فرمایئے۔ محمور پنجاب کے مشہور، نوجوان اور ترقی پسند شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ جلوہ گاہ کے دلفریب مناظر دل و نگاہ پر بجلیوں کا کام کرتے ہیں۔ فردوس منظر گردپوش، مضبوط جلد، ضخامت ۲۱۵ صفحات۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ۔ محمور جالندھری۔ لال کرتی جالندھر چھاؤنی

نرگس یہ ایک ناول ہے جس میں ایک طوائف کی دردناک عبرت انگیز زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ نہایت غمناک کہانی ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گناہ آلود زندگی گزارنے والی کے پہلو میں ایک حساس اور محبت کرنے والا دل دھڑکتا رہتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو اس کی تباہی و بربادی کس طرح ہوتی ہے؟ یہ آپ کو نرگس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ کتاب مجلد اور رنگین گردپوش سے آراستہ۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک۔

رقاصہ اس کتاب میں سات بھیانک کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں انسانی فطرت کی خباثت، حیوانیت اور درندگی کو عریاں کرکے پیش کیا گیا ہے۔ یہ لرزہ خیز افسانے گناہ، خون اور موت کی تصویریں ہیں۔ جنہیں پڑھکر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائینگے۔ کتاب مجلد ہے اور مسٹر سوبھا سنگھ آرٹسٹ نے اس کا ٹائیٹل بنایا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصولڈاک۔

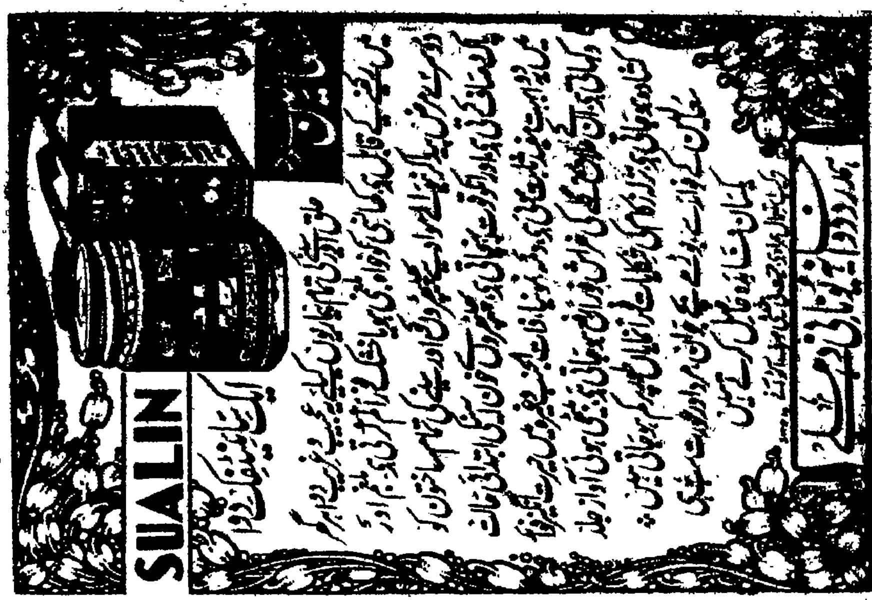
ملنے کا پتہ۔ ساقی بکڈپو دھلی

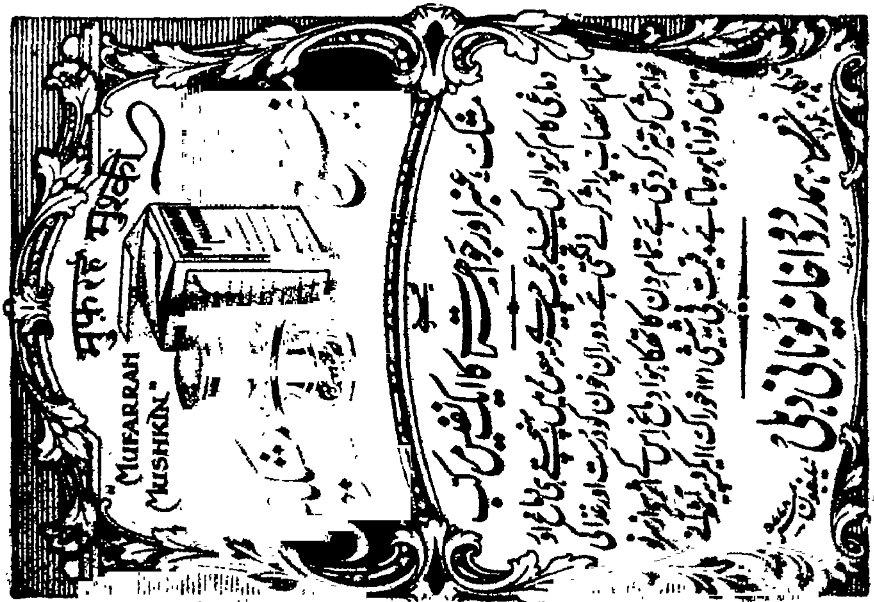
تارکا پتہ: حنا، لکھنؤ — ٹیلیفون نمبر ۱۲۹

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے کارخانہ کی تیار کردہ اشیا استعمال کر رہے ہیں اُن کو مخفی نہیں کہ کارخانہ نے ۱۸۳۹ء سے ابتک سو سال سے زیادہ زمانہ میں اُن کے سامنے ہمیشہ خالص چیز پیش کی۔ زمانہ کی رفتار کے موافق جن لوگوں سے ہمارے کارخانہ کی روز افزوں ترقی نہ دیکھی گئی انہوں نے کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے اور کارخانہ کی تیار کردہ اشیا کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں صرف اس لئے پھیلائیں تاکہ وہ اپنی تیار کردہ ان اشیا سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں کلام ہے۔ اگرچہ وہ اشیا خوشبو وغیرہ کے لحاظ سے بوجہ انگریزی عطروں کی آمیزش ہونے کے ہمارے تیار کردہ مال سے بہتر معلوم ہوتی ہیں۔ اور قیمت میں بھی ارزاں ہیں۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپکو دھوکا دیا گیا۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض وقت اس قسم کی آمیزش صحت کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے اُن خریداروں سے خصوصاً جو کارخانہ کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں۔ اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے۔ اور یقین کیجئے کہ خالص سودیشی عطریات روغنیات و تمباکو وغیرہ منگانے کے لئے آپ کو اپنے قدیم کارخانہ کو مندرجہ ذیل پتہ کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ۔





Printed at the Mahbob-ul-mataba Press, Delhi and published by Shahid Ahmad B. A. (Hons) from the office of the "SAQI" Delhi.

Only Cover Printed at the Calcutta Art Press, Katra Baryan, Delhi.

کیسے دھتکار دوں۔

پارو۔ تم ....

نینا۔ جب وہ میرے پاس بیٹھا چُپ چاپ خلا میں دیکھتا رہتا ہے تو مجھے اُس پر رحم آجاتا ہے۔

پارو۔ تم اس سے نفرت نہیں کرتیں نینا۔ تم اُسے پسند کرتی ہو۔

نینا۔ ہم سب بچپن میں اکٹھے کھیلے ہیں ......

پارو۔ تم اس سے نفرت نہیں کرتیں نینا۔ تم اُسے پسند کرتی ہو۔ تم اُس سے محبت کرتی ہو۔

نینا۔ میں بدن سنگھ کو نہیں بھولی۔

پارو۔ ہم خود نہیں جانتے ہمارے من میں کیا ہے۔

نینا۔ میں جانتی ہوں، میں بدن کا انتظار کر رہی ہوں۔ سال کے ایک ایک دن اس کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ لیکن کندن سنگھ سے بھی نفرت نہیں۔ مجھے اس سے کیونکر نفرت ہو سکتی ہے ـــــ تمہارے بھائی سے مجھے کیونکر نفرت ہو سکتی ہے۔

پارو۔ تم میری پروا نہ کرو۔ تم اپنے دل کو ٹٹولو۔ اگر وہاں اس کے لئے کوئی جگہ ہو اسے اپنا لو۔ نہیں تو اسے جواب دیدو ـــ کورا جواب دیدو۔

نینا۔ اُس نے میری اتنی مدد کی ہے۔ اُس نے مجھ پر اتنے احسان کئے ہیں۔

پارو۔ تم ان احسانوں کی پروا نہ کرو۔ تم اپنے دل کو ٹٹولو۔

نینا۔ میں سچ کہتی ہوں۔ میں ہر سال، سال کے ایک ایک دن اس کا انتظار کرتی رہی ہوں۔

پارو۔ (غصّہ کو زبردستی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے) لیکن تم اس کو بھی تو نہیں ٹھکراتیں۔ تم سال کے ایک ایک دن، دن کے ایک ایک پل بدن کا انتظار کرو ـــ میں تمہیں نہ روکوں گی۔ لیکن آسا کے ایک باریک سے تار پر اُسے نہ لٹکا رکھو نینا۔

(بیک گراؤنڈ میں دُور عورتوں کے گانے کی مبہم سی آواز سُنائی دیتی ہے۔)

ـــ میں تم سے پرارتھنا کرتی ہوں ـــ اس باریک تار کو بھی کاٹ دو۔

(مہری آتی ہے)

مہری۔ کندن سنگھ آئے ہیں۔

پارو۔ بسنت پوجا شروع ہو گئی ہے میں جاتی ہوں۔ تم کندن سنگھ کو آج بالکل جواب دیدو۔ آسا کی اس دھیمی دھیمی آنچ میں اسے تل تل کر کے نہ جلاؤ۔

(چلنے لگتی ہے)

نینا۔ کہاں چلی ہو پارو .....

پارو۔ تم آج اسے ....

نینا۔ تم کندن سنگھ کو لے جاؤ۔ تم اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔ وہ مجھے اتسو میں چلنے کو کہے گا۔

پارو۔ تم آج اُسے جواب دیدو۔ تم اُسے ٹھکرا دو۔ اسے اچھی طرح بتا دو کہ تمہارے دوارے سے اُسے کچھ نہ ملیگا۔

(چلی جاتی ہے۔ نینا پھر بے دلی سے باہر کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ کندن سنگھ داخل ہوتا ہے۔)

کندن۔ نینا۔

(نینا چُپ رہتی ہے)

کندن۔ میں تمہیں آج لینے آیا ہوں۔ نینا۔

(نینا چُپ رہتی ہے)

کندن۔ نینا تم نے وعدہ کیا تھا۔

(نینا چُپ رہتی ہے)

کندن۔ تم آج بھی اسی طرح اُداس اور اکیلی سی کھڑکی میں بیٹھی ہو۔ تمہاری نظر اسی طرح کھڑکی میں ٹکی ہوتی ہے۔ اُٹھو نینا۔ دیکھو بسنت اتسو اپنے پورے جوبن پر ہے۔

(دُور میلے سے گانے کی ہلکی ہلکی آواز اُٹھتی ہے جو آہستہ آہستہ اُونچی ہوتی جاتی ہے۔)

رنگ راس کرو پھاگن میں
ہوئے پورن پچھلے بھاگ ری

(یہ آواز اور راس کے ساتھ اتسو میں شامل ہونے والوں کا شور اُونچا اُٹھ کر اسٹیج پر چھا جاتا ہے۔ اور پھر یکدم بند ہو جاتا ہے)

ـــ دیکھو دیکھو لڑکیاں اپنے چیر کمر سے باندھ رہی ہیں۔ تمہارے پاؤں میں کیا ذرا بھی گدگدی نہیں ہوتی۔

(نینا چُپ رہتی ہے)

کندن۔ تمہارے ہونٹ اُن کے سُر میں سُر ملانے کے لئے نہیں تھرتھراتے۔ دلبی سالن لیکر تم کتنا گایا کرتی تھیں کتنا ناچا کرتی تھیں ـــ تمہیں کیا ہو گیا ہے نینا۔ دیکھو تمہاری سب سہیلیاں زندگی سے جھلملاتے بسنتی کپڑے پہنے گا رہی ہیں۔ جیسے جھلا رہی ہیں۔ اور تم یہ اداس اور مغموم لباس پہنے اِس کھڑکی میں ان منی سی بیٹھی ہو۔

نینا۔ تم جاؤ کندن، تم اتسو میں حصّہ لو۔

کندن۔ میں تمہارے بنا نہ جاؤں گا۔ میں اس بار تمہیں ضرور لیکر جاؤں گا۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔

نینا۔ نہیں کندن میں نہ جاؤں گی۔